جس میں

تمام شیعہ عقائد و مسلمات کو قرآن کریم، احادیث معصومین اور عقل سلیم کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے اور دیگر فرقہائے اسلام کے مقابلہ میں دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ سے
شیعہ اصول عقائد کی برتری واضح کی گئی ہے اور ہر موضوع پر ملاحدہ و منکرین کے جملہ شکوک و شبہات کو عقلی و نقلی ادلہ سے علوم قدیمہ و جدیدہ کی روشنی میں رد کیا گیا ہے

رسالہ اعتقادیہ

مصنف: سرکار صدوق العلماء رئیس الفقہاء والمحدثین حضرت ابوجعفر محمد علی بن الحسین بن موسیٰ بن بابویہ القمی علیہ الرحمۃ

مترجم رسالہ

محقق اسلام مولانا سید منظور حسین بخاری اعلیٰ اللہ مقامہٗ

شارح

سرکار صدر المحققین سلطان المتکلمین حجۃ الاسلام والمسلمین
حضرت علامہ الشیخ محمد حسین النجفی مدظلہ العالی علی رؤس المومنین

مکتبہ السبطین
269/9 بی سیٹلائٹ ٹاؤن، سرگودھا

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ

اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو (لوگوں) کو خدا کی طرف بلائے اور اچھے اچھے کام کرے اور کہے کہ میں بھی یقیناً (خدا کے) فرمانبرداربندوں میں سے ہوں

احسن الفوائد

فی

شرح العقائد

جس میں

تمام شیعہ عقائد و مسلمات کو قرآن کریم، احادیث معصومینؑ اور عقل سلیم کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے اور دیگر فرقہائے اسلام کے مقابلہ میں دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ سے شیعہ اصول و عقائد کی برتری واضح کی گئی ہے اور ہر ہر موضوع پر ملاحدہ و منکرین کے جملہ شکوک و شبہات کو عقلی و نقلی ادلہ سے علوم قدیمہ و جدیدہ کی روشنی میں رد کیا گیا ہے

رسالہ اعتقادیہ

مُصنّفہ: سرکار صدوق العلماء رئیس الفقہاء والمحدثین حضرت ابو جعفر محمد بن علی بن الحسین بن موسیٰ بن بابویہ القمی علیہ الرحمۃ

مترجم رسالہ

مُحقّق اسلام مولانا سید منظور حسین بخاری اعلیٰ اللہ مقامہٗ

شارح

سرکار صدر المحققین سلطان المتکلمین حجۃ الاسلام والمسلمین

حضرت علامہ الشیخ محمد حسین النجفی

مدظلہ العالی علیٰ رؤس المومنین

ناشر

مکتبۃ السبطین

زاہد کالونی

عقب جوہر کالونی

سرگودھا

نام کتاب — احسن الفوائد فی شرح العقائد

تصنیف — سرکار صدر المحققین سلطان المتکلمین حجۃ الاسلام والمسلمین
حضرت علامہ الشیخ محمد حسین النجفی مدظلہ العالی علی روس المومنین

طابع : سید اظہار الحسن رضوی

طباعت: اظہار سنز پرنٹرز

۹۔ ریٹی گن روڈ لاہور فون: 042-37220761

کمپوزنگ — سید حسن ولاسی 0307-6719282 048-3214705

ھدیہ — روپے

جامعہ علمیہ سلطان المدارس الاسلامیہ

زاہد کالونی عقب جوہر کالونی سرگودھا

فہرست

احسن الفوائد فی شرح العقائد

قطعہ تاریخ کتاب ہذا

نتیجہ فکر: شاعر اہلِ بیتؑ سید وزیر حسین شیرازی سرگودھا

اب تک چھپی نہ ہوگی ایسی کتاب شاید
تفصیل سے ہوں جس میں شیعوں کے سب عقاید
جس سے وزیرؔ ہر اک کرتا ہو اِستفادہ
وہ مخزنِ ہدایت ہے "احسن الفوایدؔ"

۴ ۹ ۳ ۱ ھ

پیشِ لفظ

علم کلام کی تدوینؒ اور علماءِ شیعہ کی خدماتؒ

مندرجہ ذیل مضمون جس کا عنوان اوپر مذکور ہے آج سے چند سال قبل رسالہ علمیۃ المبلغ کے خصوصی نمبر محمدیہ جنتری میں شائع ہو کر قوم سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ اب جب کہ ہماری کتاب "احسن الفوائد فی شرح العقائد" طبع ہو رہی ہے، ہم نے موضوع کی مناسبت کے لحاظ سے اس مضمون کو بطور مقدمہ اس میں شامل کرنا انسب خیال کیا۔ چنانچہ مفید اضافہ کے بعد قند مکرر سمجھ کر اسے درج کیا جا رہا ہے اور اس مضمون کے آخر میں حضرت شیخ صدوق علیہ الرحمہ کے مختصر حالات اور ان کے رسالہ اعتقادیہ کی اہمیت پر کچھ تبصرہ بھی کر دیا گیا ہے اور یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا ہے کہ حتی الامکان ہماری یہ علمی پیش کش ہر حیثیت سے مکمل و مختتم ہو۔ وما توفیقی الا باللہ

علم کلام کی تعریف

علم کلام وہ علم ہے کہ جس میں اعتقاداتِ حقہ ایمانیہ اور معارف اسلامیہ ربانیہ کا ادلہ و براہین تفصیلیہ یقینیہ سے اثبات اور ان پر وارد شدہ اعتراضات کے جوابات دیے جائیں ۔ ان اعتقادات و معارف کا اصل الاصول مسئلہ توحید ہے۔

علم کلام کی فضیلت، عقلِ سلیم کی روشنی میں

اربابِ دانش و بینش پر مخفی و مستور نہیں ہے کہ کسی علم کی رفعت و بلندی یا خست و پستی کا معیار و میزان اس علم کے موضوع کی شرافت یا خساست ہوتی ہے۔ جس علم کا موضوع جس قدر عظیم و خطیر ہوگا، اسی قدر وہ علم جلیل القدر و عظیم الشان ہوگا اور جس علم کا موضوع جس قدر خسیس و حقیر ہوگا اسی قدر وہ علم بے قدر و قیمت و خسیس ہوگا۔ بنابریں چونکہ علم کلام کا موضوع ذاتِ باری و ما یتعلق بہ ہے، ظاہر ہے کہ ذاتِ باری ہر شئے سے اشرف و اعلیٰ اور افضل و ارفع ہے، بلکہ باقی اشیاء کو اس ذاتِ ذوالجلال

کے فضل و کمال کے ساتھ کوئی نسبت ہی نہیں۔ "این التراب و رب الارباب" تو جس علم کا موضوع یہ ذاتِ بابرکات ہوگی وہ علم یقیناً دیگر سب علوم وفنون سے اشرف واعلیٰ ہوگا۔ کمالایخفی۔

علم کلام ومتکلمین کی فضیلت، احادیثِ معصومینؑ کی روشنی میں

اس علم کی عظمت وجلالت اور اس کی اہمیت وافادیت کے پیشِ نظر لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کرنے کے لیے حافظانِ دین وحامیانِ شرعِ متین، حضرات ائمہ معصومین صلوات اللہ علیہم اجمعین نے مختلف طرق واسالیب سے اس علم کی عظمت وجلالت لوگوں کے ذہن نشین کرانے کی مسلسل کوشش فرمائی ہے۔ کبھی تو براہِ راست اس علم کی شرافت وبزرگی بیان فرمائی اور کبھی اس علم کے علماء کی عظمت شان ورفعتِ مکان کا تذکرہ فرمایا۔ چنانچہ پہلے سلسلہ میں:

سرکار ختمی مرتبت ﷺ فرماتے ہیں: اول الدین معرفة الجبار۔ دین کی اصل بنیاد معرفتِ باری ہے۔ (کتاب توحید الشیخ الصدوق علیہ الرحمہ)

اسی طرح حضرت امیر علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: "اول الدین معرفته"۔ دینِ حق کی پہلی کڑی معرفتِ خالق ہے۔ (نہج البلاغہ)

ان حقائق سے ظاہر ہے کہ اس علم کو باقی سب علوم پر ترجیح وتقدیم حاصل ہے۔ اور دوسرے سلسلہ میں حضرات معصومین علیہم السلام نے اس علم کے علماء کی رفعت وعظمت بیان کرتے ہوئے انھیں عباد وزہاد بلکہ دیگر سب علوم کے علماء وفضلا پر افضلیت واشرفیت کی سند عطا فرمائی ہے۔ چنانچہ:

معاویہ بن عمار بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کیا کہ آپ کے شیعوں میں سے ایک شخص ایسا ہے جو آپ کی فرمائشات، تعلیمات کو کثرت کے ساتھ نقل کرتا ہے اور اس کے ذریعہ مخالفین کے دلوں میں مذہب حق کو جاگزین کرتا ہے اور کمزور شیعوں کے اعتقاد کو محکم ومضبوط۔ آیا وہ افضل ہے یا وہ عبادت گزار وزاہد شب زندہ دار، جو اس سابقہ فضیلت سے محروم ہے؟ آں جناب نے فرمایا کہ وہ عالم جو مخالفین کا دفاع کرے اور ہمارے ضعیف الاعتقاد شیعوں کے اعتقاد کو محکم کرے، وہ ایسے ہزار عابدوں سے بہتر وبرتر ہے۔ (اصول کافی)

اسی طرح انہی حضرات سے منقول ہے کہ:

علماء شیعتنا مرابطون فی الثغر الذی یلی ابلیس و عفاریتهٗ یمنعونهم عن الخروج علی ضعفاء و شیعتنا و عن ان یتسلط علیهم ابلیس و شیعته النواصب الا فمن

انتصب لذلك من شيعتنا كان افضل ممن جاهد الروم و الترك و الخزر الف الف مرة لانه يدفع عن اديان محبينا و ذالك يدفع عن ابدانهم

فرمایا ہمارے شیعوں کے علماء اعلام اس سرحد پر ڈیرہ زن ہیں جو شیطان اور اس کے سرکش اعوان وانصار سے ملتی ہے، وہ شیاطین کو اور ان کے پیروکار خوارج ونواصب کو ہمارے کمزور شیعوں پر خروج کرنے اور ان پر مُسلّط ہونے سے روکتے ہیں ۔ آگاہ ہوجاؤ کہ ہمارے (علماء) شیعہ میں سے جو شخص اس مہم کو سر کرنے کے لیے سینہ سپر ہوجائے وہ ترک وخزر کے کفار سے جہاد کرنے والوں سے ہزار ہزار مرتبہ افضل واعلیٰ ہے ۔ کیونکہ یہ عالم دین ہمارے محبوں کے دین کی حفاظت وحراست کرتا ہے اور وہ مجاہد ان کے بدنوں کی حفاظت کرتا ہے ۔ پس جو فرق دین اور ابدان میں ہے وہ ہی تفاوت ان کی محافظت کرنے والوں کے اجروثواب میں بھی ہے ۔

اور جناب امام علی نقی علیہ السلام سے مروی ہے:

لو لا من يبقى بعد غيبة قائمكم من العلماء الداعين اليه و الدالين عليه الذابين عن دينه بحج الله والمنقذين لضعفاء عباد الله من شباك ابليس و مردته و من فخاخ النواصب الذين يمسكون ازمة قلوب ضعفاء الشيعة كما يمسك السفينة سكانها لمايبقى احد الا ارتد عن دين الله اولئك هم الافضلون عند الله عزوجل

فرمایا: اگر قائم آلِ محمدؑ کی غیبت کبریٰ کے بعد ایسے علمائے اعلام موجود نہ ہوتے جو آنجناب کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں اور ان جناب کے وجو دِ ذی جود کی دعوت دیتے اور راہبری کرتے ہیں اور ان کی دین حق سے دلائل ربانیہ کے ساتھ مدافعت کرتے ہیں اور کمزور بندگانِ خدا کو شیاطین کے شکنجوں سے اور ان ناصبیوں اور خارجیوں کے دام تزویر سے نجات و چھٹکارا دلاتے ہیں، جو کمزور شیعوں کے دلوں کی باگ ڈور کو اس طرح پکڑتے ہیں جس طرح کشتی اپنے اندر بیٹھنے والوں کو پکڑتی ہے، تو ایک آدمی بھی ایسا باقی نہ رہتا جو دین الٰہی سے مرتد اور برگشتہ نہ ہوجاتا ۔ (پس اس دَور پُرفتن و پُرآشوب میں جو کچھ دین ودیانت موجود اور اسلام وایمان کے کچھ آثار مشہود ہیں یہ سب ایسے علمائے اعلام و متکلمین اسلام کے وجو دِ ذی جود کے برکات ہیں) اس لیے یہ حضرات خداوند عالم کے نزدیک سب لوگوں سے افضل ہیں ۔ (مُنیۃ المرید واحتجاج طبرسی)

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ آں جنابؑ نے فرمایا کہ جس شخص کا مطمح نظر یہ ہو کہ

اہلِ ایمان سے نصاب وخوارج کا دفاع کرے اور ان کے ناقص العیار مذہب کے نقائص وعیوب نکال کر انھیں ذلیل وخوار کرے اور سرکار محمدؐ و آلِ محمد علیہم السلام کے مذہب حق کی صداقت وحقانیت کو ثابت کرے، تو خداوند عالم ملائکہ جنّت کا مطمحِ نظر، اس کے لیے مکانات وقصور تعمیر کرنا قرار دے دیتا ہے اور اس کی ہر ہر دلیل وحجّت کے عوض جو وہ مخالفین پر قائم کرتا ہے، خداوند عالم جنّت میں اس قدر ملائکہ کو اس کے مکانات وعمارات کی تعمیر میں لگا دیتا ہے جن کی تعداد روئے زمین والے لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے اور طاقتور اتنے ہیں کہ ان میں سے ایک ایک فرشتہ سب زمینوں اور آسمانوں کو اٹھا سکتا ہے۔ پس ایسے عالم مجاہد کے لیے جنّت میں اس قدر نعمات ومحلات ہیں کہ لا یعرف قدرھا الا رب العالمین کہ ان کی جلالت ومنزلت کا صحیح اندازہ رب العالمین ہی لگا سکتا ہے (عماد الاسلام وغیرہ)

ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے اس قسم کی احادیث فضیلت بیان کرکے اپنے شیعوں اور نام لیواؤں کو علم کلام کی تحصیل کی جو ترغیب وتحریص دلائی ہے، اس سے خود ان سرچشمہ ہائے علم ومعرفت کی اس علم کے ساتھ لگاؤ ووابستگی اور اس کی ترویج وترقی میں دلچسپی لینے کا قدرے اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔

ائمہ اہل سنت کی مخالفت علم کلام

جس زمانہ میں حضراتِ معصومین علم کلام کی ترویج وترقی کے لیے یہ مساعی جمیلہ فرما رہے تھے یہ ایسا دور تھا کہ اس میں آج کل کے علم بردارانِ علم کلام کے ائمہ وبزرگان کے اس سلسلہ میں سرد مہری وجمود کا یہ عالم تھا کہ وہ اس علم کی تعلیم وتعلّم کی حرمت کے فتوے صادر کر رہے تھے اور اس کے پڑھنے والوں کی ہر طرح توہین وتذلیل کرکے ان کی ہمتوں کو پست کرنے میں مشغول تھے۔ اگر یقین نہ آئے تو جناب شبلی نعمانی کی کتاب "علم الکلام" حصہ اول صفحہ ۲۸ ملاحظہ کریں، وہ لکھتے ہیں:

"علم الکلام کے پیدا ہونے کے ساتھ محدثین اور اربابِ ظاہر نے نہایت زور شور سے مخالفت کی۔ امام شافعی، احمد بن حنبل، سفیان ثوری اور اکثر محدثین نے اس علم کو حرام بتایا۔ امام غزالی "احیاء العلوم" میں عقائد کے ذکر میں لکھتے ہیں: والی التحریم ذھب الشافعی و مالک واحمد بن حنبل و سفیان و جمیع اھل الحدیث من السلف۔ امام شافعی کا قول تھا کہ اہل کلام کو درے لگانے چاہئیں۔ امام احمد بن حنبل کہتے تھے کہ اہل کلام زندیق ہیں"۔

لیکن بایں ہمہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام جو کہ دین اسلام کے صحیح محافظ ونگہبان اور اس کی حفاظت وحراست کے طور وطریق سے کماحقہ واقف وآگاہ تھے، وہ جہاں خود بھی بتعلیم الٰہی اس علم کے سب سے

بڑے عالم تھے، وہاں وہ اس کی سرپرستی فرماتے ہوئے اپنے شیعوں کو بھی اس علم کا عالم بنانا چاہتے تھے۔ اس لیے مختلف طریقوں سے اس کی طرف ترغیب وتحریص دلاتے رہتے، جیسا کہ ابھی اوپر اس کا ایک شمہ بیان ہو چکا ہے اور اس کی کچھ تفصیل عنقریب آرہی ہے۔ فانتظر

ایک عظیم شُبہ اور اس کا ازالہ

جہاں بیسیوں احادیث مُعتبرہ میں اس علم کی عظمت وجلالت اور اس کے علماء کی رفعت اور بلندی مرتبہ کا ذکر موجود ہے، وہاں ان کے بالمقابل چند ایک احادیث ایسی بھی مل جاتی ہیں، جن سے بعض اصحابِ قشر وارباب ظاہر، علم کلام کی مذمت سمجھتے ہیں۔ ان احادیث میں سے ایک حدیث وہ ہے جو امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

ویل لاصحاب الکلام یقولون ھذا ینقاد و ھذا لاینقاد و ھذا ینساق و ھذا لا ینساق وھذا نعقله وھذا لا نعقله۔

فرمایا: اصحابِ کلام کے لیے افسوس ہے کہ (جو دینی مسائل میں موشگافیاں کرتے ہوئے) کہتے ہیں یہ مسئلہ صحیح ہے اور یہ غیر صحیح اور یہ ہمارے قواعد کلامیہ پر پورا اترتا ہے اور یہ نہیں اترتا، اور یہ ہم سمجھتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے۔ (اصول کافی)

نیز انہی معادنِ قدس وطہارت سے مروی ہے کہ فرمایا: ھلك المتکلمون و نجی المسلمون۔ اہلِ کلام ہالک اور تسلیم کرنے والے ناجی ہیں۔ (ایضاً) الی غیر ذٰلك من الاخبار۔ اس شبہ کا جواب باصواب کئی طرح دیا جاسکتا ہے۔

جواب اول: بموجب "الاحادیث یفسر بعضھا بعضا" کہ بعض احادیث دوسری بعض کی تفسیر وتشریح کرتی ہیں۔ خود ان ہی بزرگوار کے کلامِ حق ترجمان میں ان مجمل احادیث کی توضیح وتشریح موجود ہے۔ وہ اس طرح کہ متکلمین دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ کہ جو اپنے مدعا کے اثبات اور مدمقابل کے اسکات میں اس امر کی پروا نہیں کرتے کہ آیا ان کے ادلہ وبراہین معادن علم ویقین سے ماخوذ بھی ہیں یا نہیں؟۔ بلکہ جو کچھ غلط یا صحیح ان کے اذہانِ ناقصہ وآرائے کاسدہ میں ہے وہ ہی کہہ گزرتے ہیں۔ اور دوسرے ایسے مُتشرّع اور متدین متکلم ہوتے ہیں جو اس سلسلہ میں پیغمبر اسلامؐ اور ان کی اولادِ اطہار علیہم السلام کی تعلیمات وارشادات سے سرمو تجاوز وتخطی نہیں کرتے۔ حضرات معصومینؑ نے ان دو گروہوں کے اختلافِ طبائع کے پیش نظر اول الذکر گروہ کی مذمت اور ثانی الذکر حضرات کی مدح فرمائی ہے۔ اس

تاویل کی شاہد وہ روایت ہے جو اصولِ کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی جو آپؑ نے اس وقت ارشاد فرمائی جب کہ ایک شامی ان جناب کے اصحاب سے مناظرہ کرنے کے لیے آیا تو آپؑ نے جناب یونس بن عبدالرحمٰن کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "یایونس لوکنت تحسن الکلام"۔ اے یونس کاش تم علم کلام میں مہارت رکھتے ہوتے اور آج اس شامی سے بحث کرتے۔ اس پر یونس نے عذر خواہی کرتے ہوئے عرض کیا کہ آقاؑ! میں نے اس لیے اس کے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی کہ میں نے آپؑ کو اہل کلام کی مذمت کرتے ہوئے سنا ہے۔ امام علیہ السلام نے فرمایا: "انما قلت لھم و یل اذا ترکوا ما اقول و صاروا الی ما یریدون"۔ (اے یونس تجھے مطلب سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے) میں نے ان کی مذمت اس صورت میں کی ہے کہ اگر وہ اسے ترک کر دیں جو کچھ میں کہتا ہوں۔ اور وہ اپنی ...... خودساختہ دلیلوں سے کام لیں۔ (اصول کافی صفحہ ۹۹ طبع نولکشور)

پس معلوم ہوا کہ اگر اس علم کا سرچشمہ ائمہ ہدیٰ کو قرار دے کر انہی سے فیض حاصل کیا جائے تو اس صورت میں نہ صرف یہ کہ یہ علم جائز، بلکہ مُستحب بلکہ بعض حالات میں واجب ثابت ہوتا ہے۔ ہاں ان کی تعلیماتِ مقدسہ کو پسِ پشت ڈال کر اپنے قیاسی واختراعی دلائل سے کام لینا جائز نہیں ہے۔ ورنہ ان تمام لوگوں کو ناجی تسلیم کرنا پڑے گا جو صراطِ مستقیم سے منحرف ہیں۔ مگر وہ اپنی گمراہی کو اپنے قیاسات سے عین رشد وہدایت تصور کرتے ہیں۔ ولا یقول بہ احد۔

جواب دوئم: متکلم دو طرح کے ہوتے ہیں۔ کچھ فطرتاً ایسے کمزور واقع ہوتے ہیں کہ اگرچہ وہ حق کی تائید کرنا چاہیں لیکن وہ اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے، بلکہ مخالف سے مغلوب ومقہور ہو کر بجائے حق کی نصرت و تائید کے الٹا اس کی توہین وتذلیل کا باعث بن جاتے ہیں۔ دوسرے ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اس مہم سے کماحقہٗ عہدہ برآ ہونے کی اہلیت رکھتے ہیں اور مخالفین کا ناطقہ باحسن وجہ بند کر سکتے ہیں۔ حضرات معصومینؑ نے اول الذکر کو اس کی ممانعت فرمائی ہے اور ثانی الذکر کو اس کی ترغیب وتحریص دلائی ہے۔ اس کا ثبوت بھی کلامِ معصومؑ سے ملاحظہ ہو:

امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے بعض اصحاب کو کلام سے روکا، اور بعض کو اس کا حکم دیا، تو حاضرین میں سے بعض نے یہ استفسار کیا کہ مولا! اس میں کیا راز ہے کہ آپؑ نے ایک کو کلام کی ممانعت فرمائی ہے اور دوسرے کو اس کا حکم دیا ہے؟۔ امام عالی مقامؑ نے فرمایا: "ھذا ابصر بالحجج و ارفق منہ"۔ کہ "میں نے اس لیے اسے اجازت دی ہے کہ یہ ادلہ قائم کرنے میں اس پہلے شخص سے زیادہ بالبصیرت اور کلام کرنے میں زیادہ رفق ومدارات برتنے والا ہے"۔

پس ان حقائق سے واضح ہوگیا کہ ان حضرات کی ممانعت فقط بعض مخصوص لوگوں کے لیے بعض مخصوص وجوہ کی بنا پر ہے، نہ علیٰ الاطلاق۔ کما لا یخفی علی من له آنی العلم بالکلام۔ اس کے اہل کو تو یہاں تک اس طرف متوجہ فرمایا ہے کہ ارشاد فرمایا: "خاصموهم و بينوا لهم الهدى الّذی انتم علیه و بينوا لهم ضلالتهم و باهلوهم فی علی علیه السلام"۔ تم مخالفین سے مباحثہ کرو اور ان کے سامنے اپنی ہدایت و حقانیت کا بیان کرو، جس پر تم ہو۔ اور ان کی ضلالت و گمراہی کو ان پر واضح کرو۔ اور علی علیہ السلام کے سلسلہ میں مباہلہ بھی کرنا پڑے تو کر گزرو۔ (کتاب العیون والمحاسن الشیخ المفیدؒ)

جواب سوم: ائمہ اطہار علیہم السلام کے بعض اخبار و آثار سے واضح و آشکار ہوتا ہے کہ جس کلام و جدال کی ممانعت و قدح وارد ہوئی ہے، اس سے مراد وہ کلام ہے جو بطریق غیر احسن ہو۔ اور جس کی مدح و ثنا وارد ہوئی ہے اس سے مراد وہ جدال ہے جو بطریق احسن ہو۔ چنانچہ امام حسن عسکری علیہ السلام سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں یہ روایت پیش کی گئی کہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دین کے بارے میں جدال و کلام کرنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ یہ سُن کر امام علیہ السلام نے فرمایا:

لم ينهه مطلقا و لكنه نهى عن الجدال الّتي هي غير احسن اما تسمعون قول الله:
وَ لَا تُجَادِلُوٓا اَهۡلَ الۡكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ، و قوله تعالىٰ: فَادۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّكَ بِالۡحِكۡمَةِ وَ الۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ وَ جَادِلۡهُمۡ بِالَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ ۔الخ

یعنی آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیٰ الاطلاق جدال و کلام کی ممانعت نہیں فرمائی، بلکہ اس جدال سے روکا ہے جو غیر احسن طریقہ پر ہو۔ کیا تم خداوند عالم کا یہ ارشاد نہیں سنتے؟ کہ اہل کتاب کے ساتھ جدال نہ کرو مگر احسن طریقہ سے۔ (عنکبوت: ۴۶)۔ دوسرے مقام پر ارشاد فرماتا ہے: اپنے پرورگار کے راستہ کی طرف حکمت اور موعظۂ حسنہ کے ساتھ دعوت دو۔ اور احسن طریقہ کے ساتھ کلام و جدال کرو۔ (نحل: ۱۲۵)

(احتجاج طبرسیؒ)

اس سے معلوم ہوا کہ صرف جدال غیر احسن ممنوع ہے، نہ جدال احسن۔ بلکہ وہ تو شرعاً مرغوب و مطلوب ہے۔ وھو المقصود۔

علم کلام کی تدوین

اگرچہ علم کلام کے مخترع و موجد کے بارے میں لوگوں نے بہت اختلاف کیا ہے اور ہر شخص نے اپنی اپنی تحقیق کے مطابق اس فضیلت کا تاج کسی شخص کے سر پر رکھا ہے۔ بعض نے واصل بن عطا کو اس شرف سے نوازا ہے (اوائل سیوطی) اور بعض نے ابوالہذیل علاف کو اس فضیلت کا تاج پہنایا ہے (الکلام شبلی) لیکن ہماری ناقص رائے ان سب حضرات سے مختلف ہے۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ دیگر اسلامی علوم مثل فقہ و تفسیر و اخلاق وغیرہ کی طرح اس جلیل القدر علم کا سرچشمہ بھی خود صاحبِ شریعت غرا و مبلغ قانونِ اسلام مدینۃ العلوم حضرت سرکار ختمی مرتبتؐ ہی ہیں۔ اگر کسی صاحب کو اس امر کی صداقت میں کچھ شک و شبہ ہو تو وہ آنحضرتؐ کے ان احتجاجات و استدلالات کو ملاحظہ کرے جو آں جنابؐ نے مختلف مذاہب و ادیان کے لوگوں کے سامنے پیش فرما کر ان کے مذاہب باطلہ کا ابطال اور مذہب اسلام کا اثبات بطریق احسن فرمایا ہے۔ اس سلسلہ میں احتجاج طبرسیؒ اور رابع بحار الانوار کا مطالعہ ہی کافی ہے اور آں جنابؐ کے بعد اس علم کی اہمیت و عظمت کے پیشِ نظر ان کے حقیقی جانشین حضرات ائمہ طاہرین صلوات اللہ علیہم اجمعین یکے بعد دیگرے اپنے اپنے دَور میں بحسب تقاضائے ظروفِ زمان و مکان اس علم کی نشر و اشاعت فرماتے رہے اور اپنے مدرسہ الٰہیہ سے متعدد باکمال تلامذہ پیدا کر کے لوگوں کی رشد و ہدایت اور نجاح و فلاح کے لیے بہت کچھ سامان مہیا فرما دیا۔

اس سلسلہ میں حضرت امیرالمومنین علیہ الصّلوٰۃ والسلام مثل دیگر فضائل و فواضل کے دیگر سب معصومینؑ سے پیش پیش نظر آتے ہیں، بلکہ صاحب "اعیان الشیعہ" نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے: ھو اوّل من سنّ ما یسمّی علم الکلام۔ آپ پہلے وہ بزرگ ہیں جنھوں نے علم کلام کی طرح ڈالی۔ صاحبِ "اعیان الشیعہ" اعلی اللہ مقامہ کی یہ رائے گرامی ہماری ناقص رائے سے کچھ تضاد و تباین نہیں رکھتی۔ کیونکہ آں جناب کا علم بھی تو مشکوٰۃ نبوت کے نور سے ہی مقتبس و مکتسب ہے۔ دروازے سے وہی کچھ ملتا ہے جو مکان کے اندر ہو۔ (انا مدینۃ العلم و علی بابھا) اس سلسلہ میں آں جناب کے وہ خطبات و احتجاجات جو آپ نے مختلف مکاتیب اور اپنے مدمقابلین کے ادعائے خلافت کے ابطال میں ارشاد فرمائے ہیں۔ بالخصوص اس امر کا قطعی ثبوت ہیں۔ جناب ابوالائمہ الطاہرینؑ کی طرح ان کے بعد دیگر سب ائمہ دینؑ بھی اس علم کی ترویج و ترقی میں برابر حصہ لیتے رہے ہیں۔ خاص کر حضرات امامین ہمامین حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اور پھر ان میں سے بھی حضرت صادق

علیہ السلام نے اس سلسلہ میں وہ زرّیں خدمات انجام دی ہیں جو رہتی دنیا تک سنہری حروف سے لکھی جائیں گی اور ہمیشہ اہلِ علم وانصاف سے خراجِ تحسین وآفرین حاصل کرتی رہیں گی۔

حضرت صادق علیہ السلام کے علم کلام کو زیادہ ترقی دینے کے علل و اسباب

اس کی مُتعدّد وُجوہ ہیں:

وجہ اول: چونکہ اس وقت حکومت بنی امیہ کو زوال آرہا تھا، اور حکومت بنی عباسیہ کا سنگ بنیاد رکھا جا رہا تھا۔ اول الذکر اپنی حکومت کو بچانے اور ثانی الذکر اپنی حکومت کو بنانے کی تدابیر میں مشغول ومُنہمک تھے۔ اس طرح حضرات صادقین علیہما السلام کو اسلامی حقائق کے نشرواشاعت اور بالخصوص علم کلام کی ترویج وترقی کا اچھا موقع مل گیا۔

وجہ دوم: اب تک کلام کا کام صرف اسلامی عقائد ونظریات کا اثبات تھا۔ لیکن جب حضرت صادق علیہ السلام کے عصر میں منصور دوانقی نے دنیا کی تمام زبانوں کی علمی ومذہبی کتب کا عربی زبان میں ترجمہ کرانا شروع کیا، تو ان کو پڑھ کر سینکڑوں مُسلمانوں کے عقیدے متزلزل ہو گئے۔ اس لیے اس وقت علم کلام کے دوسرے شعبے کی طرح ڈالی گئی اور یہ دوسرا شُعبہ علم کلام وہ تھا جو فلسفۂ یونان کے مقابلہ کے لیے ایجاد ہوا۔ اس طرح علم کلام اگرچہ ابتدا میں ایک مختصر اور سادہ سا علم تھا لیکن رفتہ رفتہ اس میں جن چیزوں کا اضافہ ہوتا گیا ان کے اعتبار سے اب علم کلام دو چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے۔

① اِسلامی عقائد کا اِثبات۔

② فلسفۂ مُلاحدہ و دیگر مذاہبِ باطلہ کا رَدّ۔

اندریں حالات چونکہ مُسلمانوں کے عقائد میں تزلزل پیدا ہو رہا تھا، اس کے ازالہ کے لیے حضرت امام صادق علیہ السلام نے اس طرف خاص توجہ مبذول فرمائی، اور علم کلام کی ترویج وترقی میں نمایاں حصّہ لیا۔

وجہ سوم: چونکہ اوّل اوّل اسلام فقط عربوں تک ہی محدود تھا، جن کی طبیعتوں میں ایک قسم کا جمود وخمود پایا جاتا ہے۔ لیکن جُوں جُوں اسلام کو زیادہ وسعت ہوئی اور ایرانی ویونانی اور تبتی وغیرہ اقوام اسلام کے حلقہ میں آنی شروع ہوئیں تو عقائد کے متعلق نکتہ آفرینیاں اور باریک بینیاں زیادہ شروع ہو گئیں۔ اس طرح اس علم کی اہمیت وعظمت اور بڑھ گئی اور عام وخاص اس کی اہمیت وافادیت کو ماننے پر مجبور ہو گئے۔ حضرت صادقؑ نے تعلیماتِ اسلامیہ کی نشرواشاعت کے لیے جو مدرسۂ عالیہ

قائم کیا تھا جس میں اطراف واکنافِ عالم سے آئے ہوئے تقریباً چار ہزار مُتعطّشانِ علوم ربانیہ یعنی طلبہ علومِ دینیّہ کسب فیض کر کے اپنی تشنگی علم و معرفت کو بجھاتے تھے۔(از مُعتبر مُحقّق حلی علیہ الرحمہ صفحہ ۵ طبع ایران)اس مدرسہ عالیہ سے جہاں اور اسلامی علوم وفنون مثل فقہ و حدیث وتفسیر اور اخلاق کے ہزاروں فضلاء فارغ التحصیل ہو کر نکلے،وہاں اس نے بیسیوں باکمال متکلّم بھی پیدا کیے جنھوں نے اس علم جلیل کی نشر واشاعت میں حصّہ لیا۔

ایضاح: مخفی نہ رہے کہ ہم نے اس سلسلہ میں صرف انہی اصحاب وعلماء کا اجمالی تذکرہ کیا ہے جنھوں نے صرف تقریر سے نہیں بلکہ بذریعہ تحریر بھی اس علم جلیل کی نشر واشاعت میں حصّہ لیا۔ اسی طرح یہاں ان کی صرف انہی کتب کا تذکرہ کیا جائے گا جو انھوں نے اسی موضوع پر لکھی ہیں۔

بعضؔ علماء کرام کا تعارفؔ

① عیسٰی بن روضہ: جناب نجاشی نے اپنی کتاب رجال نجاشی صفحہ ۲۰۸ پر لکھا ہے: "کان متکلما جید الکلام و له کتاب فی الامامة" کہ یہ بڑے بلند پایہ متکلّم تھے۔انھوں نے مسئلہ امامت میں ایک کتاب لکھی ہے۔اگر چہ ابن ندیم نے اور بعض دیگر اربابِ رجال نے یہ لکھا ہے کہ جناب علی بن اسماعیل میثمی......"اول من تکلم علی مذهب الامامیه و صنف کتابا فی الامامة سماه بالکامل"۔ کہ یہ پہلے بزرگوار ہیں جنھوں نے مذہب امامیہ میں مسئلہ امامت پر کتاب لکھی جس کا نام انھوں نے کامل رکھا۔(فہرست ابن ندیم) لیکن صاحبِ "اعیان الشیعہ" نے اس سے اِختلاف کرتے ہوئے جناب عیسٰی بن روضہ کو پہلا مُصنّف قرار دیا ہے اور بظاہر انہی کی رائے گرامی صحیح معلوم ہوتی ہے۔کیونکہ یہ جناب میثمی پر مُتقدم ہیں۔کیونکہ یہ بزرگ منصور دوانقی کے عہد میں تھے۔اور جناب میثمی ہارون و مامون کے دور میں۔(متوفی اواسط قرن دوم)

② عبدالرحمٰن بن احمد العسکری: جناب نجاشی نے اپنے رجال صفحہ ۱۶۴ طبع بمبئی پر ان کے متعلّق لکھا ہے: "متکلم من اصحابنا احسن"۔ یہ ہمارے حضراتِ شیعہ میں سے بڑے متکلّم اور عمدہ مُصنّف ہیں۔انھوں نے امامت کے موضوع پر ایک کتاب بنام "کامل" تصنیف فرمائی۔(قرن دوم)

③ ابو جعفر محمد بن علی المعروف بمومن طاق: علم کلام کے بڑے ماہر تھے۔ابن ندیم نے فہرست صفحہ ۲۵۰ پر ان کے متعلّق لکھا ہے: کان متکلما حاذقا۔کہ وہ بڑے ماہر اور حاذق متکلّم تھے۔ انھوں نے اپنے مناظرات کی وجہ سے مخالفین پر قافیہ حیات تنگ کر دیا تھا۔اسی لیے وہ ان کو مومن طاق کی بجائے

شیطانِ طاق کہتے تھے۔ سوادِاعظم کے امام اعظم کے ساتھ مختلف موضوعات و مسائل پر ان کے بڑے دلچسپ مناظرات کتب سیرو تواریخ میں موجود ہیں۔ بوجہ خوفِ طوالت ان سب کا بیان تو یہاں نہیں ہو سکتا البتہ برادرانِ ایمان کے جلائے ایمان کی خاطر ان کا ایک مختصر سا مناظرہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

مومنؒ طاق کا ایکؒ دِلچسپؒ مناظرہؒ

ایک مرتبہ امام اعظم نے ان سے طنزاً کہا کہ: "تم چونکہ "رجعت" کے قائل ہو، اس لیے مجھے پانچ سو دینار قرضہ دے دو، زمانہ رجعت میں جب ہم واپس آئیں گے، اس وقت واپس لے لینا"۔ مومن طاق نے برجستہ کہا کہ: "مجھے قرضہ دینے میں تو کوئی تامل نہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ رجعت کے احکام میں سے ایک حکم یہ بھی ہے کہ اس زمانہ میں دشمنانِ اہلِ بیتؑ مسخ ہو کر اٹھیں گے۔ لہٰذا تم مجھے اس امر کا کوئی ضامن دے دو کہ جب تم اس وقت اٹھو گے تو انسان ہی ہو گے۔ (مجالس المومنین) ابن ندیم نے ان کی آٹھ تصانیف کا تذکرہ کیا ہے جن میں سے مندرجہ ذیل کتب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ کتاب الامامۃ، کتاب الرد علی المعتزلہ، کتاب الرد علی المفوضہ، کتاب الاستطاعہ۔ (متوفی اواسط قرن دوم)

④ زرارہ بن اعین: جناب نجاشی نے ان کے متعلق لکھا ہے: "شیخ اصحابنا فی زمانه و متقدمهم و کان قاریا فقیها متکلما شاعرا ادیبا"۔ یہ جناب اپنے زمانے میں ہمارے اصحاب شیعہ کے بزرگ اور فضل و کمال میں ان پر متقدم تھے اور وہ بیک وقت قاری، متکلم، شاعر اور ادیب تھے۔ جناب شیخ صدوقؒ کا بیان ہے کہ میں نے ان کی ایک کتاب استطاعت و جبر کے مسئلہ پر دیکھی ہے۔ (اواسط قرن دوم)

⑤ حمران بن اعین: صاحب "اعیان الشیعه" نے لکھا ہے: "کان معروفا بعلم الکلام"۔ یہ بزرگوار علم کلام میں بہت مشہور و معروف تھے۔ انھوں نے امامت کے موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ (اواسط قرن دوم)

⑥ ہشام بن الحکم: یہ وہی بزرگوار ہیں جن کے متعلق حضرت صادق علیہ السلام نے فرمایا تھا: "لاتزال مؤیدًا بروح القدس ما نصرتنا بلسانك" کہ اے ہشام جب تک تم اپنی زبان سے ہماری نصرت کرتے رہو گے روح القدس سے تمھاری تائید ہوتی رہے گی۔ (اصول کافی) ابن ندیم نے ان کے متعلق لکھا ہے: "کان حاذقا بصناعة الکلام حاضر الجواب"۔ کہ جناب ہشام علم کلام میں بہت حاذق و ماہر اور بڑے حاضر جواب تھے۔ (فہرست ابن ندیم صفحہ ۲۵۰ طبع مصر)

ہشام کی حاضر جوابی کا ایک عجیب واقعہ

دربارِ خلافت میں چونکہ جناب ہشام کے جرم تشیّع کا عموماً تذکرہ ہوتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ یہ دربار ہارونِ عباسی میں تشریف رکھتے تھے کہ یحییٰ بن خالد برمکی نے ان سے پوچھا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی وفات کے بعد جب حضرت علیؑ و عباسؓ نے آں حضرتؐ کی وراثت میں جھگڑا کیا تھا اور ابوبکر کے پاس گئے تھے، ان دونوں میں سے حق پر کون تھا؟ جناب ہشام کہتے ہیں کہ یہ سوال سُن کر میں قدرے گھبرایا، کہ اگر یہ کہتا ہوں کہ عباسؓ حق پر تھے تو ایمان رخصت ہوتا ہے اور اگر یہ کہتا ہوں کہ علیؑ حق پر تھے تو جان جاتی ہے۔ لیکن صادق علیہ السلام کی دعا کا اثر تھا کہ اس کا بہترین جواب فوراً میرے ذہن میں آگیا۔ میں نے یحییٰ سے کہا کہ: جب جناب داؤد علیٰ نبینا و آلہ علیہ السلام کے پاس دو فرشتے جھگڑا لے کر آئے تھے (جس کا تذکرہ قرآن مجید سورہ ص آیت ۱۸ میں بالتفصیل مذکور ہے) تو بتایئے ان دونوں میں سے حق پر کون تھا اور باطل پر کون؟" یحییٰ نے کہا: "وہ تو فرشتے تھے۔ دونوں حق پر تھے۔ ان کا آپس میں درحقیقت کوئی جھگڑا نہ تھا، بلکہ وہ جناب داؤد کو ایک حکم پر تنبیہ کرنے آئے تھے"۔ جناب ہشام کہتے ہیں کہ میں نے کہا: بس بعینہٖ اسی طرح حضرت علیؑ و عباسؓ کا بھی درحقیقت آپس میں ہرگز کوئی جھگڑا نہ تھا، وہ تو خلیفہ اول کو وراثت پیغمبر کا مسئلہ سمجھانے کے لیے آئے تھے۔ ہارون نے جناب ہشام کے اس جواب کو بہت پسند کیا اور یحییٰ برمکی اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ (از مجالس المومنین وغیرہ)

ان جناب نے علم کلام میں متعدد کتب تصنیف فرمائیں جن میں سے مندرجہ ذیل کتب خاص طور پر قابل ذکر ہیں: ① کتاب الامامت ② کتاب الدلالات علیٰ حدوث الاشیاء ③ کتاب الرد علیٰ الزنادقہ ④ کتاب الرد علیٰ اصحاب الاثنین ⑤ کتاب التوحید ⑥ کتاب الرد علیٰ اہل الطبائع ⑦ کتاب الرد فی الجبر و القدر، ⑧ کتاب المعتزلہ ⑨ کتاب الرد علیٰ من قال بامامۃ المفضول۔ (اواخر قرن دوم)

⑦ ابوالحسن علی بن اسماعیل بن شعیب بن میثم التمار معروف بہ میثمی: یہ بزرگوار جناب میثم جو کہ حضرت امیر علیہ السلام کے اصحابِ اخیار میں سے تھے، کے پوتے ہیں، ان کے متعلق ابن ندیم اور دیگر بعض علماء رجال مثل ابوعلی حائری صاحبِ "منتہی المقال" نے یہ رائے ظاہر کی ہے: "اوّل من تکلم علی مذھب الامامیۃ و صنف کتابا فی الامامۃ"۔ کہ یہ پہلا شخص ہے جس نے مذہب امامیہ کے مطابق علم کلام میں حصّہ لیا اور امامت کے موضوع پر کتاب لکھی۔

(منتہی المقال صفحہ ۲۰۷۔۲۰۸ و فہرست ابن ندیم صفحہ ۲۴۹ طبع مصر)

لیکن ان کی اولیت پر صاحبِ "اعیان الشیعہ" اعلیٰ اللہ مقامہ نے جو ایراد کیا ہے، ہم اس کا تذکرہ جناب عیسیٰ بن روضہ کے حالات میں کر چکے ہیں۔ یہ جناب بڑے متکلّم و مناظر تھے۔ ابوالہذیل علّاف اور نظام وغیرہم کے ساتھ ان کے بڑے معرکۃ الآرا مناظرات کتب سیر و تواریخ میں مذکور ہیں۔ ان کا فقط ایک مناظرہ جو انھوں نے ابوالہذیل علّاف کے ساتھ کیا تھا، قارئین کرام کی ضیافت طبع کے لیے یہاں درج کیا جاتا ہے۔

جنابؒ میثمی کا ابوالہذیلؒ کے ساتھ ایکؒ عجیبؒ مناظرہؒ

جناب میثمی نے ابوالہذیل سے پوچھا: کیا یہ ٹھیک ہے کہ شیطان سب اچھے کاموں سے روکتا ہے اور سب برے کاموں کا حکم دیتا ہے؟۔ ابوالہذیل نے کہا کہ: ہاں یہ ٹھیک ہے۔

کیا یہ ہوسکتا ہے کہ وہ سب اچھے کاموں سے روکے اور سب برے کاموں کا حکم دے۔ لیکن ان سب اچھے یا برے افعال کی معرفت نہ رکھتا ہو؟ (میثمی نے کہا)

نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ (ابوالہذیل نے جواب دیا)

تو اس سے ثابت ہوا کہ شیطان تمام اچھے اور برے افعال کا عالم ہے؟ (میثمی نے کہا)

ہاں اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے (ابوالہذیل نے جواب دیا)

کیا جسے تم اپنا امام سمجھتے ہو وہ تمام امورِ خیر و امورِ بد سے واقف ہے؟ (میثمی نے استفسار کیا)

نہیں، وہ ان سب امور کے عالم نہیں۔ (ابوالہذیل نے جواب دیا)

تو معلوم ہوا کہ شیطان ان سے زیادہ عالم ہے۔ (میثمی نے کہا)

یہ سُن کر ابوالہذیل بہت شرمندہ ہوا اور خاموش ہو کر رہ گیا۔ (از مجالس المومنین وغیرہ)

جنابؒ میثمی کا دُوسرا مناظرہؒ

دل چاہتا ہے کہ یہاں جناب میثمی کا ایک اور دلچسپ اور مُفید مناظرہ بھی قارئین کرام کی جلاء ایمانی کی خاطر درج کر دیا جائے۔ یہ جناب جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، ہارون و مامون عباسی کے عہد میں تھے، اور ابوالہذیل کے معاصر۔ ملاحدہ اور مخالفین کے ساتھ آپ کے معرکۃ الآراء مناظرے ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب حسن بن سہل (وزیر مامون) کے دربار میں گئے تھے، حسن کے پاس ایک دہریہ بیٹھا ہوا تھا۔ جناب میثمی نے سلسلہ کلام کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا۔ حضرات! آج

میں نے ایک عجیب چیز دیکھی ہے۔ سب حاضرین نے دریافت کیا: کیا دیکھا ہے؟ فرمایا: ایک کشتی ہے جو کسی ملاح کے بغیر لوگوں کو دریائے دجلہ کے آر پار لے جا رہی ہے اور لا رہی ہے۔ دہریہ نے حسن بن سہل کو خطاب کرتے ہوئے کہا: حضور! آپ اس شخص کی باتوں پہ توجہ نہ دیں۔ کیونکہ یہ دیوانہ معلوم ہوتا ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ عقل و شعور نہ رکھنے والی کشتی ملاح کے بغیر لوگوں کو ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک لے جائے؟ جناب میثمی نے مُلحد سے فرمایا: جو بات میں نے بیان کی ہے یہ زیادہ تعجب خیز ہے یا وہ جس کے تم قائل ہو کہ آسمان سے بارش خودبخود برستی ہے، شمس و قمر خودبخود جاری وساری ہیں۔ اور یہ تمام نظام عالم بغیر کسی چلانے والے کے خودبخود چل رہا ہے۔ جناب میثمی کا کلام سُن کر دہریہ مبہوت اور لاجواب ہو گیا۔

ابن ندیم نے ان کی دو کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ کتاب الامامۃ اور کتاب الاستحقاق۔ (قرن دوم)

خاندانِ نوبخت کا اجمالی تذکرہ

مذکورہ بالا حضرات کے بعد علم کلام کی خدمت کے سلسلہ میں خاندانِ نوبخت کا ذکر آتا ہے۔ یہ خانوادہ ولایت اہل بیتؑ میں مشہور و معروف ہے اور علم کلام میں انھوں نے جو زریں خدمات انجام دی ہیں ان کا اپنوں اور بیگانوں سب کو اقرار ہے۔ چنانچہ اپنوں میں سے صاحب ریاض نے اس خاندان کے متعلق لکھا ہے: "بنو نوبخت طائفة معروفة من متكلمي الامامية"۔ اور بیگانوں میں سے شبلی نعمانی صاحب نے اپنی کتاب "علم الکلام" صفحہ ۴۱ پر لکھا ہے: "علم کلام کی ترقی کے ذکر میں خاندانِ نوبخت کا ذکر بھی ضروری ہے۔ فضل بن نوبخت ہارون الرشید کے خزانۃ الحکمۃ کا افسر تھا۔ اور فارسی زبان کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا کرتا تھا۔ اسماعیل جو نوبخت کا پوتا تھا، بہت بڑا عالم اور علم کلام کا ماہر تھا۔ اس کے ہاں ایک خاص مجلس مقرر ہوا کرتی تھی جہاں متکلمین جمع ہوا کرتے تھے اور مسائل کلام پر مباحثے کرتے تھے۔ علم کلام میں اس کی بہت سی تصانیف ہیں، جن میں کتب ذیل کا تذکرہ ابن الندیم نے کیا ہے۔ کتاب ابطال القیاس، نقض کتاب عبث الحکمت علیٰ الراوندی، نقض التاج علیٰ الراوندی، کتاب تثلیث الرسالۃ، اسماعیل کا بھانجا حسن بن موسیٰ اس خاندان میں سب سے زیادہ نامور ہوا۔ ابن الندیم نے اس کی نسبت لکھا ہے کہ وہ متکلم بھی تھا اور فلاسفر بھی۔ فلسفہ یونان کی بہت سی کتابیں اسی کے حکم اور اہتمام سے ترجمہ کی گئیں۔ ابوعثمان دمشقی، اسحاق ثابت بن قرۃ جو مشہور مترجم گزرے ہیں، اس کے دربار میں ہمیشہ حاضر رہتے تھے۔ اس کی ایک تصنیف کا تذکرہ آگے آئے گا"۔

اس جلیل القدر خاندان میں بہت سے نامور متکلّم گزرے ہیں جن کی تعداد صاحب اعیان الشیعہ نے توستائیس تک پہنچائی ہے لیکن ان میں سے جو آسمانِ عظمت پر آفتاب بن کر چمکے وہ یہ ہیں:

⑧ فضل بن نوبخت: جس کا تذکرہ شبلی کے کلام میں ابھی اوپر ہو چکا ہے۔ (اواخر المائۃ الثانیہ)

⑨ فضل بن شاذان: جناب شیخ ابوعلی حائری نے اپنی کتاب منتہی المقال صفحہ ۲۴۱ پر ان کے متعلق لکھا ہے: "وکان ثقۃ اجل اصحابنا الفقہاء والمتکلمین ولہ جلالۃ فی ھذہ الطائفۃ وھو فی قدرہ اشھر من ان نصفہ"۔ جناب فضل بہت قابل وثوق اور ہمارے فقہا و متکلمین میں بہت جلیل القدر تھے اور وہ طائفہ امامیہ میں خاص عظمت وجلالت کے مالک ہیں۔ اور وہ اپنی قدر وعظمت کے لحاظ سے اس سے اشہر و اعرف ہیں کہ ہم ان کی کچھ تعریف وتوصیف کریں۔ شیخ نجاشی نے لکھا ہے کہ انھوں نے مذہب حق کی تائید ونصرت میں ایک سو اسّی کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے بہت سی کتابیں علم کلام میں ہیں، جن میں سے مندرجہ ذیل کتب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:

① کتاب الرد علی اہل التعطیل ② کتاب الرد علی الثنویہ ③ کتاب الرجعۃ ④ کتاب الرد علی الغالیہ ⑤ کتاب التوحید ⑥ کتاب الرد علی الفلاسفہ ⑦ کتاب الخصائل فی الامامۃ۔ (قرن سوم ۲۶۵ھ)

⑩ جناب حسن بن موسیٰ نوبختی: ان کا تذکرہ بھی شبلی کے کلام میں آگیا ہے۔ ابن ندیم نے ان کی بہت سی کتب شمار کی ہیں، جن میں سے یہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

① کتاب الآراء والدیانات ② کتاب الرد علی اصحاب التناسخ ③ کتاب الامامۃ وغیرہا۔ (۳۱۰ھ)

⑪ ابوسہل اسماعیل بن علی بن اسحاق: شیخ طوسی نے فہرست اور نجاشی نے اپنے رجال میں ان کے متعلق لکھا ہے: کان شیخ المتکلمین من اصحابنا ببغداد و وجھہم۔ کہ وہ بغداد میں ہمارے علمائے متکلمین کے شیخ اور ان کے سردار تھے۔ اور ان کی ایک خاص مجلس ہوتی تھی جس میں علماء حاضر ہوتے تھے۔ ابن ندیم نے ان کی مُتعدّد تصانیف کا تذکرہ کیا ہے، جن میں یہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کتاب التنبیہ، امامت میں کتاب الرد علی الغلاۃ، کتاب نقض رسالۃ الشافعی، کتاب حدوث العالم، کتاب ابطال القیاس۔ باقی وہی ہیں جن کا تذکرہ شبلی نے بھی کیا ہے۔ جب شلمغانی نے دعویٰ مہدویت کیا تو اس نے جناب اسماعیل کو بھی اپنی بیعت کا دعوت نامہ بھیجا، اور اس میں اپنے مُعجزات دکھانے کا بھی تذکرہ کیا۔ جناب اسماعیل کے سر کے اگلے حصّہ پر بال نہیں تھے۔ جب قاصد دعوت نامہ لایا تو جناب اسماعیل نے فرمایا: ہمیں ان کے دیگر مُعجزات کی ضرورت نہیں۔ اگر تمھارا مہدی میرے سر کے بال ہی اگادے تو میں اس پر ایمان لے آؤں گا۔ قاصد نے واپس جاکر شلمغانی کو یہ پیام دیا۔ شلمغانی

نے ایسی چپ سادھی کہ پھر زندگی بھر ان سے خط وکتابت نہ کی۔ رجال نجاشی صفحہ ۲۱۷ (۳۱۱ھ)

⑫ ابراہیم بن اسحاق بن ابی سہل نوبختی: یہ بزرگوار بھی علم کلام میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ انھوں نے اس علم میں ایک جلیل القدر کتاب بنام "یاقوت" تصنیف فرمائی۔ جس کی شرح حضرت علامہ حلی علیہ الرحمہ نے لکھی ہے اور مقدمہ میں اس کے مُصنّف کی بہت تعریف وتوصیف فرمائی ہے۔ (قرن چہارم)

⑬ محمد بن عبد الرحمٰن بن قبہ رازی: یہ وہی بزرگوار ہیں جن کا کتب اصول فقہ کے مبحث اصل برأت میں بکثرت ذکر خیر آتا ہے۔ بڑے جلیل القدر عالم و متکلّم تھے۔ ابن ندیم نے فہرست صفحہ ۲۵۰ پر ان کے متعلّق لکھا ہے: "من متکلمی الشیعة و حذاقهم"۔ یہ شیعوں کے بڑے حاذق اور ماہر علمائے متکلمین میں سے تھے۔ جناب نجاشی نے لکھا ہے یہ بزرگوار پہلے مُعتزلی تھے۔ بعد ازاں مذہب امامیہ قبول فرمایا۔ مزید برآں نجاشی نے ان کے متعلّق لکھا ہے: "متکلم عظیم القدر حسن العقیدة"۔ (صفحہ ۲۶۵)

نجاشی اور ابن ندیم نے علم کلام میں ان کی چند کتابوں کا تذکرہ کیا ہے جیسے کتاب الانصاف، کتاب الامامة، کتاب الرد علی المزید، کتاب المستثبت وغیرہا۔ (متوفی اوائل قرن چہارم)

⑭ ابو الحسین محمد بن بشر سوسنجری: معروف یہ حمدانی منسوب بہ آل حمدان۔ پہلے مُعتزلی العقیدہ تھے۔ پھر مذہب شیعہ خیر البریہ اختیار کیا۔ اور اپنے سابق استاد ابو القاسم بلخی کے نظریاتِ فاسدہ کی تردید میں ایک کتاب بھی لکھی۔ جناب نجاشی نے ان کے متعلّق لکھا ہے: "متکلم جید الکلام" کہ وہ علم کلام کے بڑے جید عالم تھے۔ ابن ندیم نے مسئلہ امامت میں ان کی دو کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ المقنع اور المنقذ۔ ان کے زہد وورع کا یہ عالم تھا کہ ابن بطہ نے اپنی فہرست میں ذکر کیا ہے: "انه حج علی قدمیه خمسین حجة"۔ کہ انھوں نے پیدل چل کر پچاس حج کیے۔ (اوائل قرن چہارم)

⑮ حسن بن ابی عقیل عمانی: مشہور عالم و فقیہ و متکلّم تھے اور حضرت ثقۃ الاسلام کلینی قدس سرہ کے معاصر تھے۔ اگرچہ ان پر فقہ غالب تھا اور انفعال آبِ قلیل وغیرہ بعض مسائل فقہ میں مخصوص آراء رکھتے تھے لیکن علم کلام میں بھی صاحبِ تصنیف ہیں۔ چنانچہ اس علم میں ان کی ایک کتاب بنام الفرد الکر کا تذکرہ ملتا ہے۔ (اوائل قرن چہارم)

⑯ علی بن حسین مسعودی: یہ بزرگوار علاوہ مورخ شہیر ہونے کے بڑے جلیل القدر متکلّم بھی تھے۔ ان کی کتاب اثبات الوصیۃ موضوع امامت پر حال ہی میں نجف اشرف میں چھپی ہے۔ ان کے مذہب اور اس کتاب کے ان کی طرف انتساب کے بارہ میں اگرچہ قدرے اختلاف ہے لیکن حق

یہ ہے کہ یہ کتاب ان ہی کی تالیف ہے۔ اور یہ بزرگوار شیعہ علمائے کبار میں سے ہیں۔ ولاقامۃ الدلائل محل اخر۔ علاوہ بریں علم کلام میں ان کی دو اور کتابوں کے نام بھی ملتے ہیں۔ ① کتاب الصفوۃ در مبحث امامت ② کتاب الاستبصار۔ (۳۲۶ھ قرن چہارم)

⑰ ابو جعفر محمد بن جریر ابن رستم الطبری الآملی: علمائے امامیہ میں سے جلیل القدر عالم و متکلم تھے۔ اکثر کم علم لوگوں کو اشتباہ ہو جاتا ہے اور وہ محمد بن جریر طبری صاحب تاریخ طبری و تفسیر ابن جریر کو یہ ہی ابو جعفر ابن رستم آملی سمجھ بیٹھتے ہیں۔ اور پھر صاحب تاریخ طبری کے تشیّع کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ اس طرح ان کی مشہور عالم تاریخ کو نا قابل اعتبار قرار دینے کی مذموم سعی کرتے ہیں اور اس اشتباہ کی وجہ بظاہر ان ہر دو حضرات کی کنیتوں اور ان کے اور ان کے والدین کے اسموں کا اشتراک ہے۔ کیونکہ دونوں کی کنیت ابو جعفر اسم محمد اور والد کا نام جریر ہے۔ ان کا باہمی امتیاز ان کے دادا کے نام سے ہوتا ہے۔ ہمارے ابن جریر کے دادا کا اسم گرامی رستم ہے اور ابن جریر (سنی) کے دادا کا نام یزید ہے۔ ان دونوں کو ایک سمجھنا جہالت یا تجاہل کی دلیل ہے۔ جناب ابو جعفر کی مسئلہ امامت پر مشہور تصنیف المسترشد فی الامامت ہے، جو حال ہی میں نجف اشرف میں طبع ہوئی ہے۔ (اواسط قرن چہارم)

⑱ ابو القاسم علی بن احمد الکوفی: علمائے متکلمین میں سے بڑے جلیل القدر عالم تھے اور کثیر التصنیف والتالیف، ان کی کتب میں سے زیادہ مشہور کتاب "الاستغاثہ فی بدع الثلاثہ" ہے جو ماضی قریب میں نجف اشرف میں چھپ چکی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے مسئلہ امامت پر ایک کتاب بنام "الاوصیاء" بھی لکھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آخر میں ان کے مذہب میں کچھ اختلاط ہو گیا تھا۔ واللہ العالم۔ (قرن چہارم ۳۵۲ھ)

⑲ محمد بن احمد بن جنید اسکافی: بڑے جلیل القدر عالم و متکلم تھے۔ نجاشی نے ان کے متعلق لکھا ہے: ثقۃ جلیل القدر صنف فاکثر۔ (صفحہ ۲۷۲) کہ ابن جنید بڑے ثقہ اور جلیل القدر عالم اور کثیر التصنیف مُصنّف تھے، اگرچہ ان کی زیادہ شہرت فقہی اعتبار سے ہے اور وہ فقہ میں بعض آراء بھی رکھتے ہیں۔ لیکن علم کلام میں بھی بلند مقام رکھتے ہیں۔ ابن ابی الحدید مُعتزلی شرح نہج البلاغہ میں بہت سے مقامات پر ان کے مقالات کلامیہ کو نقل کرتا ہے۔ ان کی کتب کلامیہ میں سے مندرجہ ذیل کتب خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جن کا تذکرہ نجاشی نے کیا ہے۔ "الشہب المحرقۃ تبصرۃ الوارد" "نور الیقین" اور "ازالۃ الران"۔ (قرن چہارم ۳۸۱ھ)

⑳ ابو جعفر محمد بن علی بن الحسین بن موسیٰ بن بابویہ القمی: یہ عالم ربانی و نور شعشعانی رئیس

المحدّثین اپنی علمی و عملی جلالت و شہرت کی بنا پر ہر قسم کی تعریف و توصیف سے مُستغنی ہے۔ اگرچہ ان کی زیادہ شہرت ایک عظیم الشان فقیہ اور جلیل القدر محدث ہونے کی حیثیت سے ہے۔ مگر بنظر غائر ان کے حالات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بزرگوار تمام علوم متداولہ میں مہارت رکھتے تھے اور جدل و کلام میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت شہید ثالث اعلیٰ اللہ مقامہ نے مجالس المومنین میں جناب رکن الدولہ دیلمی وغیرہ سے ان جناب کے بعض مکالمات علمیہ کلامیہ کو نقل فرمایا ہے۔ ہم یہاں بغرض افادۂ عام ان کے بعض مکالماتِ علمیہ درج کرتے ہیں:

جب حضرت شیخ صدوق کے فضل و کمال کی شہرت تمام اطراف و اکناف میں پھیل گئی تو بادشاہ رکن الدولہ آپ کی ملاقات کا مُشتاق ہوا۔ چنانچہ انھوں نے بڑے احترام و اہتمام سے حضرت شیخ قدس سرہ کو اپنے ہاں دعوت دی۔ جب آپ تشریف لائے تو ان کی بہت تعظیم و تکریم کی اور اپنے پہلو میں ان کو جگہ دی۔ رسمی مزاج پرسی کے بعد اس طرح سلسلہ کلام کا آغاز ہوا:

رکن الدولہ: جناب شیخ اس بزم میں کچھ ایسے فضلا بھی موجود ہیں جو ان مخصوص اشخاص کے بارہ میں جن پر حضرات شیعہ طعن و تشنیع کیا کرتے ہیں۔ باہم اختلاف رکھتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ طعن ضروری ہے اور بعض اسے غیر ضروری بلکہ ناجائز بتلاتے ہیں۔ آپ کی اس مسئلہ میں کیا رائے ہے؟۔

شیخ صدوق: اے بادشاہ خداوند عالم کا یہ قانون ہے کہ اس کے بالمقابل جو جھوٹے خدا ہیں، جب تک ان کی نفی نہ کی جائے وہ اپنی توحید کا اقرار قبول نہیں کرتا، جیسا کہ کلمہ توحید لا الٰہ الا اللہ اس پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح اپنے نبی اعظم کی نبوت کا اقرار بھی اس وقت تک قبول نہیں کرتا جب تک اس کے بالمقابل تمام جھوٹے مدعیانِ مثل مسیلمہ کذاب و اسود عنسی و سجاح وغیرہ کی نبوت باطلہ کا انکار نہ کیا جائے، اسی طرح وہ حضرت امیرالمومنینؑ کی امامت کا اقرار بھی ہرگز قبول نہیں کرتا جب تک غلط مدعیان و متصدیانِ خلافت سے بیزاری اختیار نہ کی جائے۔

رکن الدولہ نے جناب شیخ کے جواب متین کو بہت پسند کیا اور مدح و ثنا کے بعد جناب شیخ سے التماس کیا کہ ہم ان لوگوں کا انجام معلوم کرنا چاہتے ہیں جو ظلم و ستم سے مسند آرائے خلافت ہو گئے تھے؟۔

شیخ صدوق: سورۂ برائۃ کے واقعہ نے اس امر کا فیصلہ کر دیا ہے۔ یعنی یہ کہ ان لوگوں کو اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی تعلق و واسطہ نہیں ہے اور یہ کہ حضرت علیؑ کی امامت آسمان سے نازل ہوئی ہے۔

رکن الدولہ: اس قصہ کی تفصیلات سے آگاہ فرمائیں ۔
شیخ صدوق: تمام مخالف وموالف مورخین اس امر پر متفق ہیں کہ جب سورہ برائت نازل ہوئی تو آنحضرت ﷺ نے ابوبکر کو بلاکر فرمایا کہ اس سورہ کو مکہ میں جاکر کفار ومشرکین کے سامنے میری طرف سے علی الاعلان پڑھ کر سناؤ۔ چنانچہ ابوبکر لے کر روانہ ہوئے۔ ابھی تھوڑا ہی راستہ طے کیا تھا کہ جبرئیل امینؑ نازل ہوئے اور تحفہ درود وسلام کے بعد عرض کیا: خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: "لا یودی عنك الا انت او رجل منك" ۔ اس سورہ کی تبلیغ آپ خود کریں یا وہ شخص کرے جو آپ سے ہو۔ چنانچہ آں حضرت ﷺ نے حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کو حکم دیا کہ جاکر ابوبکر سے سورہ برائت لے لو اور خود موسم حج میں لوگوں کو پڑھ کر سناؤ۔ چنانچہ آں جناب نے تعمیل ارشاد کی اور اس وظیفہ دینی کو انجام دیا۔ (مزید تسکین کے لیے یہ کتب ملاحظہ ہوں: در منثور جلد ۳ صفحہ ۲۰۹، تفسیر کبیر فخرالدین رازی جلد ۲ صفحہ ۵۸۴، مسند امام احمد بن حنبل، ترمذی، دلائل بیہقی، مُصنّف ابن ابی شیبہ، بخاری و مُسلم وغیرہ۔ (از فلک النجاۃ جلد ا صفحہ ۲۷۹)
پس اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ فلاں آں حضرتؐ سے نہ تھا، اور جب آں حضرتؐ سے نہ ہوا تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آں حضرتؐ کا پیروکار بھی نہ تھا۔ کیونکہ ارشاد قدرت ہے: من تبعنی فانہ منی۔ (سورۃ ابراہیم :۳۶) جو میری اتباع کرے گا وہ مجھ سے ہوگا اور جب آپؐ کا پیروکار نہ ہوا تو پیغمبر کی زبانی خدا اور رسول کا دوست بھی نہ ہوگا۔ کیونکہ ارشاد رب العزت ہے: قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ و یغفرلکم ذنوبکم۔ (آلِ عمران :۳۱) ظاہر ہے کہ جب دوست خدا اور رسول نہ ہو تو ان کا دشمن ہوگا۔ نتیجہ واضح ہے کہ محبّت خدا اور رسول ایمان اور ان کا بغض کفر ہے۔

- اور اسی روایت سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ حضرت علیؑ پیغمبر اسلامؐ میں سے ہیں اور اس روایت کے علاوہ اور بھی بکثرت روایات سے یہ امر ظاہر ہے۔ جیسا کہ آیت مبارکہ: "افمن کان علی بینة من ربه و یتلوہ شاھد منه" (ھود :۱۷) کی تفسیر میں وارد ہے کہ **شاھد منه** سے مراد حضرت امیرالمومنین علیہ السلام ہیں۔
- اسی طرح جنگ احد میں جب اکثر اصحاب راہِ فرار اختیار کر گئے اور حضرت علیؑ بڑی دلیری و دلجمعی سے دادِ شجاعت وحق نصرت ادا کر رہے تھے اور ہاتف غیبی "لا فتی الا علی لا سیف الا ذوالفقار" کی ندا کر رہا تھا، تو جناب جبرئیلؑ نے حاضر ہوکر عرض کیا: یارسول اللہ! مواسات و

ہمدردی اس کا نام جو علی ادا کر رہے ہیں ۔ آں حضرتؐ نے فرمایا: بھلا علی کیونکر ایسا نہ کریں ۔ "انہ منی و انا منہ" ۔ اس وقت جبریلؑ نے کہا: "و انا منکما" ۔ اور میں آپ دونوں میں سے ہوں ۔ (مدارج النّبوّت جلد ۲ صفحہ......)

اس واقعہ سے معلوم ہو گیا کہ جس شخص کو خداوند عالم قرآن مجید کی چند آیتیں لوگوں تک پہنچانے کا حق دار نہیں سمجھتا ، اسے امامت کبریٰ اور تمام قرآن کی تبلیغ کا اہل کیونکر سمجھ سکتا ہے؟

رکن الدولہ: جو کچھ آپ نے افادہ فرمایا ہے وہ بالکل واضح اور صحیح ہے ۔ رکن الدولہ کے مقربین میں سے ایک شخص ابو القاسم نامی دربار میں موجود تھا ۔ اس نے بادشاہ سے اجازت طلب کی کہ وہ حضرت شیخ کی خدمت میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہے ۔ چنانچہ اجازت ملی اور وہ اس طرح گویا ہوا:

ابو القاسم: جناب شیخ! یہ کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ امت ضلالت و گمراہی پر اجماع کرے، حالانکہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا ہے: "لا تجتمع امتی علی الضلالۃ" ۔ میری امت گمراہی پر جمع نہ ہوگی ۔

شیخ صدوق: امت لغت عرب میں، بمعنی جماعت ہے اور جماعت کا کم از کم تین افراد کے مجموعہ پر بھی اطلاق ہو سکتا ہے ۔ اور بعض نے کہا ہے کہ ایک مرد و زن کے مجموعہ کو بھی جماعت کہا جاتا ہے اور خداوند عالم نے تو فقط ایک شخص کو بھی امت کہا ہے ۔ چنانچہ اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کے بارہ میں فرمایا ہے: "ان ابراھیم کان امۃ قانتا للہ حنیفا" (نحل: ۱۲۰) لہٰذا بنا بر تسلیم صحت حدیث عین ممکن ہے کہ اس سے حضرت علیؑ اور ان کے حقیقی پیروکار مراد ہوں ۔

ابو القاسم: جو کچھ بھی ہو حدیث سے ظاہر یہی ہوتا ہے کہ اسے سوادِ اعظم کے معنی پر محمول کرنا چاہیے جو تعداد میں زیادہ ہیں ۔

شیخ صدوق: ہم نے جہاں تک غور و فکر کیا ہے قرآن میں متعدد مقامات پر کثرت کی مذمت اور قلت کی مدح دیکھی ہے ۔ ارشادِ قدرت ہے: "ولکن اکثرھم یجھلون" (انعام: ۱۱۱) "و لکن اکثرھم فاسقون" (آل عمران: ۱۱۵) " اکثر الناس لا یشکرون" (یوسف: ۳۸) "الذین اٰمنوا و عملوا الصالحات و قلیل ما ھم" (ص: ۳۸) "و قلیل من عبادی الشکور" (سبا: ۱۳) "و ما اٰمن معہ الا قلیل" (ھود: ۱۱) نیز اس امر کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ خداوند عالم نے لفظ امت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے چند ہدایت یافتہ لوگوں پر اطلاق کیا ہے ۔ چنانچہ فرماتا ہے: "و من قوم موسیٰ امۃ یھدون بالحق و بہ یعدلون" (اعراف: ۱۵۹) اسی طرح ہمارے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

امت کے بعض افراد کے بارہ میں ارشاد فرمایا ہے: "و ممن خلقنا امۃ یھدون بالحق و بہ یعدلون" (اعراف: ۱۸۱) حضرت شیخ کا مدلل و مکمل جواب باصواب سُن کر ابوالقاسم خاموش ہو گیا علاوہ بریں اگر لفظ "امت" کو عمومی معنی پر بھی محمول کیا جائے تو بنابر صحت حدیث، مطلب یہ ہوگا کہ تمام امت کبھی ضلالت و گمراہی پر مجتمع نہ ہوگی۔ لہٰذا اگر ایک یا دو فرد بھی مخالف ہو جائیں تو دیگر تمام افراد کی غلطی کا امکان باقی رہے گا اور مُتعلقہ مسئلہ میں تو بنابر اتفاق فریقین حضرت علیؑ اور ان کے مخصوص اتباع بلکہ تمام بنی ہاشم مخالف تھے۔ جیسا کہ بخاری شریف جلد صفحہ...... طبع مُجتبائی دہلی میں بھی تصریح موجود ہے۔ پھر رکن الدولہ نے سلسلہ کلام جاری کرتے ہوئے کہا:

رکن الدولہ: یہ کس طرح ممکن ہے کہ آں حضرتؐ کی وفات کے بعد باوجود قرب عہد آپؐ کی امت میں سے بہت سے لوگ ارتداد کا شکار ہو جائیں؟۔

شیخ صدوق: اس میں کونسی بات محلِ تعجب ہے، جب کہ خود خداوند عالم خبر دیتا ہے: "و ما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل افان مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم" (آلِ عمران: ۱۴۴) محمدؐ نہیں ہیں مگر اللہ کے رسول، ان سے پہلے بھی اللہ سبحانہ کے رسول گزر چکے ہیں۔ اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو کیا تم اپنے پچھلے پاؤں (کفر کی طرف) پلٹ جاؤ گے؟۔

آں حضرتؐ کی وفات حسرت آیات کے بعد کچھ لوگوں کا ارتداد، قومِ موسٰی کے ارتداد سے زیادہ تعجب خیز نہیں ہے۔ جس کا تذکرہ قرآن میں موجود ہے۔ حضرت موسٰی زندہ تھے، فقط تیس دن کا وعدہ کر کے کوہِ طور پر گئے اور اس دوران حضرت ہارونؑ کو اپنا جانشین بھی مقرر کر گئے تھے۔ مگر بحکمِ ایزدی تیس کے بجائے چالیس دن کر دیے گئے اور قوم صبر نہ کر سکی۔ حضرت ہارونؑ روکتے رہ گئے، مگر سامری نے ایک گوسالہ بنا کر لوگوں سے کہنا شروع کیا کہ یہ تمھارا خدا ہے۔ اور لوگوں نے اس کی پرستش شروع کر دی اور حضرت ہارونؑ کو اس قدر مجبور کر دیا کہ قریب تھا کہ ان کو شہید کر دیں، جیسا کہ خداوند عالم نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے: "یا ابن ام ان القوم استضعفونی و کادو یقتلوننی" (اعراف: ۱۵۰) پس جس طرح ایک اولوالعزم نبی کی زندگی میں فقط چند روز کی غیبت کی وجہ سے لوگ گمراہ ہو سکتے ہیں، اس کے بعد اس کے نامزد خلیفہ کی مخالفت کر سکتے ہیں، تو یہ اس امت کے لیے کیونکر ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کی وفات کے بعد ان کے حقیقی خلیفہ سے روگردانی کر کے چاہِ ضلالت میں جا گرے؟

 رکن الدولہ نے حضرت شیخ کے جواب باصواب کو بہت پسند فرمایا۔ یہ مکالمہ بہت طویل ہے۔

حضرت شیخ نے اور بھی چند اہم اختلافی مسائل کو بڑی عمدگی کے ساتھ حل فرمایا ہے۔ بنظرِ اختصار ہم باقی ماندہ حصّہ کو نظر انداز کرتے ہیں۔

حضرت شیخ صدوق علیہ الرحمہ کی تصنیفات و تالیفات میں علم کلام کی بھی چند کتب کے نام ملتے ہیں، جن میں سے بعض مطبوع و موجود ہیں۔ ① التوحید، ② النبوۃ ③ اثبات الوصیۃ لعلیؑ ④ اثبات النص علی الائمہ ⑤ التقیہ ⑥ الشوریٰ ⑦ ابطال الغلو والتقصیر ⑧ ابطال الاختیار و اثبات النص ⑨ اکمال الدین ⑩ رسالہ اعتقادیہ۔ (قرن چہارم ۳۸۱ھ)

(۲۱) اسماعیل بن عباد: المعروف بالصاحب۔ مشہور و معروف فاضل جلیل اور جامع بین السعادتین الوزارۃ الدنیویہ والجلالۃ العلمیہ تھے۔ علاوہ اپنی ادبی مہارتوں کے وہ علم کلام میں بھی خاص مقام رکھتے ہیں۔ علم کلام میں ان کی دو کتابوں کا نام ملتا ہے۔ ① کتاب اسماء اللّٰہ وصفاتہ اور ② کتاب الانوار وکتاب الدیانہ۔ ہر دو امامت کے موضوع پر ہیں۔

(۲۲) محمد بن محمد الحارثی المعروف بالشیخ المفیدؒ: یہ بزرگوار اپنی عظمت وجلالت اور معروفیت و شہرت کی وجہ سے محتاجِ تعارف نہیں اور بھلا اس شخص کی وصف ہو ہی کیونکر سکتی ہے جس کو امامِ زمانہؑ "الاخ الرشید" کے جلیل القدر خطاب سے مخاطب فرمائیں۔ (احتجاج طبرسی) اور ان کی وفات حسرت آیات پر خود مرثیہ لکھیں۔ (فوائد رضویہ جلد ۲ صفحہ......)

ابن ندیم نے ان کے متعلق لکھا ہے: انتهت رياسة متكلمي الشيعة اليه۔ شیخ کے دور میں شیعہ متکلمین کی ریاست آپ کے پاس تھی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان کی ریاست کو فقط علم کلام میں منحصر قرار دینا ان کی کسرِ شان کا موجب ہے۔ حق یہ ہے کہ وہ جناب اپنے عہد میں علی الاطلاق تمام علوم اسلامیہ میں رئیس کل تھے۔ خواہ حدیث ہو، تفسیر ہو یا کلام، علمائے مخالفین کے ساتھ انھوں نے بڑے بڑے مناظرات کر کے کلمہ حق کو بلند کیا۔ مذہب حق کی ترویج و ترقی کے سلسلہ میں ان کا یہ دستور تھا کہ وہ جہاں کہیں سُن لیتے تھے کہ فلاں جگہ فلاں مذہب کا بہت بڑا عالم رہتا ہے، تو باوجود اپنی عظمت و جلالت کے خود اس کے پاس تشریف لے جاتے اور اس سے مباحثہ کر کے وہاں شیعیت کے نہ مٹنے والے نقوش چھوڑ آتے۔

اگر خوفِ طوالت دامن گیر نہ ہوتا تو ہم کچھ واقعات ہدیہ قارئین کرتے۔ ہاں محض اس خیال کے پیشِ نظر کہ ان کی افادات عالیہ سے ہمارے قارئین کرام یکسر محروم نہ رہ جائیں، ان کا ایک مختصر، مگر معرکۃ الآراء مناظرہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

جنابؒ شیخ مُفید کا قاضی عبدالجبارؒ کے ساتھ ایکؒ عظیم الشان مناظرہؒ

جب جناب شیخ مُفید علیہ الرحمہ نے قاضی عبدالجبار مُعتزلی کے متعلق سنا کہ وہ آسمانِ عظمت و شہرت پر مہر نیمروز کی طرح چمک رہا ہے۔ جناب شیخ نے حسب عادت اس کے ساتھ مناظرہ کرنے کے لیے رخت سفر باندھا اور بروز جمعہ قاضی صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ دیکھا کہ قاضی صاحب جامع مسجد میں منبر پر جلوہ فگن ہیں اور مسجد لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی ہے اور مختلف لوگ ان سے مختلف مسائل پوچھ رہے ہیں، اور وہ ان کا جواب دے رہے ہیں۔ جناب شیخ بھی اسی جمعیت میں جا کر بیٹھ گئے اور جب فرصت میسر ہوئی تو اٹھ کر قاضی صاحب سے یوں مخاطب ہوئے:

حضرت شیخ: میں ایک مسافر آدمی ہوں، مجھے اجازت ہے کہ میں بھی ایک مسئلہ پوچھ لوں؟

قاضی: ہاں ضرور پوچھیے!

شیخ مرحوم: آپ حدیث غدیر (من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ) کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ آیا یہ حدیث صحیح ہے؟۔

قاضی: ہاں یہ حدیث صحیح ہے۔

شیخ: آپ لفظ "مولا" سے کیا معنی مراد لیتے ہیں؟

قاضی: اولیٰ بالتصرف۔

شیخ: اگر یہ حدیث صحیح ہے، اور "مولیٰ" کے معنی بھی "اولیٰ بالتصرف" ہیں تو پھر آپ کے خلفاء کی خلافت کیا ہوئی؟

قاضی: حدیث غدیر اگرچہ صحیح ہے لیکن پھر بھی روایت ہے اور ہمارے خلفاء کی خلافت درایت ہے اور روایت، درایت کا مقابلہ نہیں کرسکتی، بلکہ درایت بہرحال روایت پر مقدم ہوتی ہے۔

شیخ: جناب شیخ نے بحث کا رخ بدلتے ہوئے فرمایا کہ جو شخص امام برحق کے خلاف خروج کرے آپ اس کے متعلق کیا فتویٰ دیتے ہیں؟

قاضی: وہ کافر ہے (پھر استدراک کرتے ہوئے کہا) نہیں بلکہ فاسق ہے۔

شیخ: آپ چوتھے مرتبہ پر علیؑ کی خلافت و امامت کے متعلق کیا کہتے ہیں؟

قاضی: یقیناً وہ امام المسلمین وخلیفۃ رسول رب العالمین تھے۔

شیخ: تو پھر آپ طلحہ و زبیر اور معاویہ و ام المومنین عائشہ کے متعلق کیا فتویٰ صادر کرتے ہیں جنھوں

نے علیؑ کے برخلاف خروج کیا اور بغاوت پھیلائی؟۔

قاضی: جنگ جمل اور صفین والوں نے بعد میں توبہ کر لی تھی۔

شیخ: قاضی صاحب! ان کا جنگ کرنا یہ درایت ہے اور توبہ کرنا روایت۔ اور آپ خود ابھی ابھی کہہ چکے ہیں کہ روایت جس قدر بھی مُعتبر ہو وہ درایت کا مقابلہ نہیں کرسکتی اور درایت بہرحال روایت پر مقدم ہوتی ہے۔

قاضی لاجواب ہوکر بولا: آپ کا نام کیا ہے؟

شیخ: میں آپ کا مخلص محمد بن محمد حارثی ہوں۔

قاضی: "انت المفید حقاً"۔ آپ صحیح معنوں میں مُفید ہیں۔ یہ کہا اور اٹھ کر شیخ کے بغل گیر ہوگیا اور انھیں اپنی جگہ پر بٹھایا۔ (از مجالس المومنین وغیرہ)

حضرت شیخ مُفید نے علم کلام میں مُتعدّد کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، جیسے الافصاح (در مسئلہ امامت) العیون والمحاسن، اوائل المقالات، شرح عقائد شیخ صدوق علیہ الرحمہ وغیرہ۔ یہ سب کتابیں عراق و ایران میں کئی بار چھپ کر دنیائے علم وفضل سے خراج آفرین و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ مخالفین جناب شیخ کے مناظرات اور ان کی خداداد قوتِ اِستدلال اور ان کے فضل و کمال سے کس قدر ہراساں و نالاں تھے؟ اس کا اندازہ مورخ ابن خلکان کے ان الفاظ سے ہوسکتا ہے جو اس نے حضرت شیخ کی وفات حسرت آیات کے متعلّق لکھے ہیں۔ وہ لکھتا ہے: لما مات شیعة ثمانون الف رافضی و اراح الله منه الناس۔ جب شیخ مُفید کا انتقال ہوا تو اسی ہزار رافضیوں نے ان کے جنازہ کی تشییع کی، اور خدا نے لوگوں (اہل جماعت) کو ان سے راحت پہنچائی۔ (از وفیات الاعیان۔ قرن پنجم ۴۲۸ھ)

(۲۳) علی بن الحسین الموسوی المعروف بالسیّد المرتضٰی علم الہدیٰ: یہ عالم جلیل حضرت علامہ السیّد رضی جامع نہج البلاغہ کے بڑے بھائی اور حضرت شیخ مُفید علیہ الرحمہ کے ارشد و اکمل تلامذہ میں سے تھے۔ وہ اپنے زمانے کے بہت بڑے فاضل جلیل اور متکلّم نبیل تھے۔ سرکار علامہ حلی نے اپنے خلاصۃ الرجال صفحہ ۴۶ میں ان کے متعلّق لکھا ہے: "متوحد فی علوم کثیرة مجمع علیٰ فضله متقدم فی علم الکلام و الفقه"۔ کہ جناب سید علوم کثیرہ، بالخصوص اصولِ فقہ و فقہ اور ادب و کلام میں یگانہ تھے۔ اور ان کی عظمت و جلالت اور فضل و کمال پر سب کا اجماع و اتفاق ہے۔ علم کلام میں ان کی کتاب "الشافی" جو کہ قاضی ابوبکر باقلانی کی کتاب "المغنی" کا کافی و شافی جواب ہے اور خود آج تک بے جواب ہے۔ نیز اسی موضوع پر ان کی دوسری کتاب الفصول المختارہ ہے جو کہ ان کے استاد وحید

حضرت شیخ مفید علیہ الرحمہ کی کتاب العیون والمحاسن اور مجالس کا گویا ایک جامع خلاصہ ہے۔ نجف اشرف، عراق میں دومرتبہ چھپ چکی ہے۔

جناب شیخ مفیدؒ کے بعد ریاست امامیہ انہی کی طرف منتقل ہوئی تھی۔ علم وفضل کا یہ آفتاب ۴۳۶ھ میں غروب ہوا۔ (قرن پنجم ۴۳۶ھ)

(۲۴) ابوالفتح شیخ محمد بن عثمان کراجکی: بڑے جلیل القدر عالم ومتکلم تھے۔ شیخ عباس قمی مرحوم نے فوائد رضویہ جلد ۲ صفحہ ۵۷۱ پر ان کے ترجمہ میں ان الفاظ کے ساتھ ان کا ذکر کیا: "شیخ اجل اقدم اعلم فاضل متکلم فقیہ محدث ثقة جلیل القدر شیخ مشائخ طائفة و تلمیذ شیخ مفید است"۔

اس شیخ جلیل نے علاوہ دیگر علوم وفنون کے علم کلام میں بھی متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں۔ من جملہ ان کے کتاب التعجب اور کتاب التفضیل ہردو مسئلہ امامت میں ہیں اور کتاب کنز الفوائد تو ان کے فضل وکمال کا بہترین شاہکار ہے، جس میں انھوں نے مختلف موضوعات پر نہایت محققانہ بحثیں فرمائی ہیں۔ (قرن پنجم ۴۴۶ھ)

(۲۵) ابویعلی محمد بن حسن بن حمزہ جعفری: یہ بزرگوار حضرت شیخ مفید کے داماد اور ان کے جانشین تھے۔ اور فقہ وکلام میں بڑے ماہر تھے۔ شیخ نجاشی نے اپنے رجال صفحہ ۲۸۸ پر ان کے متعلق فرمایا ہے: "متكلم وفقيه قيم بالامرين جميعا"۔ ابویعلیٰ فقہ وکلام دونوں میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ یہ عالم جلیل بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، جو اکثر سوالوں کے جوابات پر مشتمل ہیں۔ علم کلام میں بھی انھوں نے چند کتابیں لکھی ہیں۔ من جملہ ان کے مندرجہ ذیل کتب ہیں جن کا ذکر جناب نجاشی نے کیا ہے۔ (۱) المسئلة، (۲) الرد علی الغلات، (۳) الموجز فی التوحید، (۴) مسئلہ فی ایمان آباء النبی علیہم السلام وغیرہا۔ (متوفی قرن پنجم ۴۶۳ھ)

(۲۶) ابوجعفر محمد بن الحسن الطوسی المعروف بشیخ الطائفہ: یہ فخر الشیعہ وذخر الشریعہ اس سے کہیں اجل وارفع ہیں کہ ان کی تعریف وتوصیف میں کچھ قلم فرسائی کی جائے۔ حضرت شیخ مفید اور جناب سید مرتضیٰ علم الہدیٰ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ کتب اربعہ میں سے دو کتابیں "تہذیب الاحکام" اور "استبصار" اسی بزرگوار کے فضل وکمال کا شاہکار ہیں۔ اس جامع الفنون والعلوم عالم جلیل نے علاوہ دیگر علوم وفنون کے علم کلام میں بھی متعدد کتب تصنیف فرمائیں۔ من جملہ ان کے مندرجہ ذیل کتب کا شیخ نجاشی نے ذکر فرمایا ہے:

(۱) کتاب المفصح فی الامامة، (۲) المدخل الی علم الکلام، (۳) تلخیص الشافی (یہ کتاب شافی مصنفہ

جناب سید مُرتضٰی علم الہدیٰ کا جامع خلاصہ ہے اور مطبوعہ موجود ہے۔ (قرن پنجم ۴۶۵ھ)
۴۷

۴۸ شیخ سدید الدین محمود بن علی الحمصی الرازی الحلی: مشہور عالم و متکلّم ہیں۔ مرحوم شیخ عباس قمی نے فوائد رضویہ جلد ۲ صفحہ ۲۶۵ پر ان کے متعلّق لکھا ہے: علامہ مُتبحّر متکلّم۔ اور علم کلام میں ان کی چند کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ من جملہ ان کے کتاب المنقذ من التقلید و المرشد الی التوحید، کتاب التبیین فی التحسین و التقبیح و ھدایۃ الھدایۃ۔ یہ وہی بزرگوار ہیں کہ فخرالدین رازی اپنی تفسیر میں مختلف مسائل پر ان کے اِحتجاجات و استدلالات کو نقل کر کے ان کے جوابات دینے کی کوشش کرتا ہے، لیکن وہ اس سلسلے میں بہت ہی کھسیانے پن کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جیسا کہ جواب دہی میں اس کی عادت ہے۔ قاموس اللغت جلد ۲ صفحہ ۱۹۹ میں ان کے متعلّق لکھا ہے: محمود بن علی الحمصی متکلم اخذ عنہ الامام فخر الدین الرازی۔ کہ محمود بن علی الحمصی اتنے عالم جلیل ہیں کہ امام فخرالدین رازی نے ان سے اِستفادہ کیا ہے۔ (قرن ششم)

۴۹ السیّد مُرتضٰی بن السیّد حسین الرازی: آپ بہت جلیل القدر عالم و فاضل تھے۔ علماء متاخرین مثل علامہ مجلسیؒ و مُقدّس اردبیلی و امثالہم اپنی کتب میں ان کی کتب سے حوالے لیتے ہیں۔ مشہور ہے کہ آپ جب حج بیت اللہ الحرام پر تشریف لے جا رہے تھے تو راستہ میں امام غزالی کی رفاقت کا اتفاق ہوا۔ اور ان کے درمیان حدیث غدیر پر گفتگو شروع ہوئی۔ چنانچہ سید نے دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ سے اس حدیث کی صحت اور دلالت پر امامت امیرالمومنین غزالی پر ثابت کردی۔ غزالی بے ساختہ کہہ اٹھا: انت علم الھدیٰ، انت علم الھدیٰ۔ چنانچہ پھر ان کا یہ لقب مشہور ہوا۔ مگر یہ یاد رہے کہ یہ بزرگوار اور ہیں اور حضرت سید مُرتضٰی علم الہدیٰ برادر حضرت رضی، شاگرد شیخ مُفیدؒ اور بزرگ ہیں۔ جس سے متاثر ہو کر غزالی نے اپنا رسالہ "سرالعالمین" لکھا۔ جس میں اس حدیث کی صحت کا اِقرار کرتے ہوئے غاصبین خلافت علویہ پر کڑی تنقید کی ہے۔ سید کی "تبصرۃ العوام" بہت نافع اور سود مند کتاب ہے۔ (قرن ششم)

۵۰ ابوالمکارم السیّد حمزہ بن علی بن زہرہ حسینی معروف بہ سید ابن زہرہ: یہ سید بزرگوار بہت جلیل القدر عالم فاضل اور متکلّم تھے۔ جناب ابن زہرہ کا تمام خانوادہ ہی ایک علمی خاندان ہے۔

چنانچہ ان کے والد ماجد جناب السیّد علی اور جد امجد جناب ابوالمحاسن اور برادر معظم ابوالقاسم سید عبداللہ اور بھتیجا جناب سید محمد بن عبداللہ۔ اسی طرح ان کے دیگر تمام اعمام اور بنی عم علماء وفضلاء تھے۔ انھوں نے دیگر اسلامی علوم کے علاوہ علم کلام میں بھی چند کتب لکھیں۔ جیسے قبس الانوار فی نصرۃ العترۃ الاخیار، رسالہ در اعتقاد امامیہ وغیرہ۔ (قرن ششم ۵۸۵ھ)

(۳۱) قطب الدین راوندی: آپ کا اسم گرامی سعد بن ہبۃ اللہ ہے۔ آپ بلند پایہ عالم وفاضل اور جامع الفنون تھے۔ آپ نے مختلف علوم وفنون میں متعدد کتب نافعہ رائقہ تصنیف وتالیف فرمائیں۔ جن میں سے دو چار علم کلام میں بھی ہیں۔ ① جواہر الکلام ② ایقاظ الھجعۃ فی البرہان علی الرجعۃ ③ زہرۃ المباحثۃ وغیرہ۔ (قرن ششم ۵۷۳ھ)

(۳۲) نصیر الدین محمد بن محمد الطّوسی معروف بہ محقّق طوسی: یہ بزرگوار صرف فیلسوف اور متکلّم ہی نہیں، بلکہ افضل الحکماء والمتکلّمین، سلطان المحقّقین علامہ البشر العقل الحادی عشر ہیں۔ (فوائد رضویہ)

یہ وہی بزرگوار ہیں کہ جب کتب فلسفہ وکلام میں ان کا نام آجائے تو علمائے فریقین کی گردنیں جھک جاتی ہیں۔ ان کی جلالت قدر اور عظمت شان میں سب مخالف وموالف رطب اللّسان نظر آتے ہیں۔

اس جامع المعقول والمنقول عالم جلیل نے علاوہ دیگر علوم وفنون کے علم کلام میں بھی متعدد کتب تصنیف فرمائیں، جن میں سے "تجرید" سب سے زیادہ مشہور ہے اور یہ وہی کتاب ہے جس کی علمائے فریقین نے اب تک بیسیوں شروح لکھی ہیں۔ اور ہنوز سلسلہ جاری ہے۔ دوسری کتاب "قواعد العقائد" ہے۔ تیسرا رسالہ "الجبر والاختیار" ہے۔

علاوہ بریں کتاب "شرح اشارات واخلاق ناصری" و "شرح مجسطی" و "اوصاف الاشراف" بھی اسی بحر بے کنار کے جواہر آبدار ہیں۔ یہ بزرگوار اخلاقِ حسنہ میں اپنے ائمہ کرام علیہم السلام کے اخلاقِ جمیلہ کا صحیح نمونہ تھے۔

جنابِ محقّق طوسی علیہ الرحمۃ کے خلق جمیل کا ایک عجیب واقعہ

ایک دفعہ کسی گستاخ نے ان کو ایک خط لکھا، جس میں اس نے ان کو "یا کلب ابن کلب" (معاذ اللہ) کہہ کے خطاب کیا، جس کے جواب میں جناب محقّق طوسی علیہ الرحمہ نے اس کو لکھا: اے عزیز! تو نے جو مجھے کلب کہا ہے، اس میں تجھے اشتباہ ہوا ہے۔ کیونکہ کتے کے خواص وفصول میرے خواص و فصول سے جدا ہیں۔ وہ چار ٹانگوں پر چلتا ہے، مگر میں دو پر چلتا ہوں۔ اس کے ناخن لمبے لمبے ہوتے

ہیں اور میرے چوڑے ہیں، اس کی جلد بالوں سے ڈھکی رہتی ہے اور میرے جسم پر اتنے بال نہیں، وہ بھونکنے والا حیوان ہے اور میں بولنے والا انسان ہوں۔ اسی طرح کلب اور اپنے امتیازی خواص بیان کر کے اسے خط بھیج دیا۔ جس کا یہ اثر ہوا کہ وہ گستاخ عرقِ انفعال میں غرق ہو گیا، اور معافی مانگنے پر مجبور ہوا۔ (فوائد رضویہ جلد ۲ صفحہ ۴۰۹)

دعا ہے کہ خداوند عالم تمام اہل ایمان کو بالعموم اور ان میں سے اہل علم حضرات کو بالخصوص محقق طوسی کی طرح اپنے ائمہ کرام علیہم السلام کی تقلید و تاسی کی توفیق مرحمت فرمائے۔ فضل و کمال کا یہ مہر نیمروز قرن ہفتم ۶۷۳ھ میں غروب ہوا۔ اور کاظمین میں امامینؑ کی جانب سر مدفون ہوا۔ (قرن ہفتم)

(۴۳) **شیخ علی بن سلیمان البحرینی**: بڑے جلیل القدر عالم و متکلم تھے۔ انھوں نے علم کلام میں ایک کتاب لکھی، جس کا نام "اشارات" ہے۔ (قرن ہفتم)

(۴۴) السیّد رضی الدین ابوالقاسم علی بن موسیٰ بن جعفر بن طاؤس معروف بسید ابن طاؤس: اس سید اجل ازہد، اعبد اور قدوۃ العارفین و مصباح المتہجدین صاحب کرامات باہرہ و مناقب فاخرہ کی مدح و ثنا سے قلم و زبان عاجز و حیران ہے۔ علی بن حمزہ شاعر نے ان جناب کے حق میں کیا خوب کہا ہے:

فهٰذا عليٌّ بن موسىٰ بن جعفرٌ
شبيه عليٍّ بن موسىٰ بن جعفرٌ

سرکار علامہ حلیؒ نے اپنی کتاب منہاج الصلاح میں ان جناب کے بارے میں لکھا ہے: "وكان اعبد من رأيناه من اهل زمانه"۔ یہ بزرگوار اپنے دور میں ان تمام لوگوں سے بڑے عابد و زاہد تھے جن کو ہم نے دیکھا ہے۔ سادات بنی طاؤس سب کے سب فضلاء و اتقیاء تھے۔ چنانچہ حضرت سید کے برادر معظم جمال الدین السیّد احمد بن موسیٰ بن جعفر بھی بڑے عابد و زاہد اور عالم و فاضل اور تقریباً اسّی کتب کے مصنف و مولف تھے۔ اسی طرح ان کے بھتیجے غیاث الدین السیّد عبدالکریم بن السید احمد (مذکور) صاحب فرحۃ الغری بھی عالم و فاضل تھے۔ اسی طرح سید صاحب کے دو فرزند ارجمند جناب السیّد محمد اور جناب سید علی بھی فضلاء و اتقیاء میں سے تھے۔

سدتم الناس بالتقى و سواكم
سودته البيضاء و الصفراء

مختلف عناوین پر سید نے بیسیوں کتب جلیلہ نافعہ لکھیں۔ ان میں سے چند علم کلام کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں: (۱) طرائف در مذہب طوائف (۲) کشف المحجۃ لثمرۃ المہجۃ (۳) سعد السعود (۴) کتاب الاختصاص

⑤ طرف وغیرہا۔ زہد وتقویٰ اور علم وفضل کا یہ آفتاب عالم تاب ۵ ذی القعدہ ۶۶۴ھ میں غروب ہوا۔ (قرن ہفتم)

۳۵ میثم بن علی البحرینی بہت بلند پایہ متکلّم و فیلسوف تھے۔ انھوں نے علم کلام میں متعدد کتب تصنیف فرمائیں، جن میں سے مندرجہ ذیل کتب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ① شرح اشارات (جو ان کے استاذ محترم شیخ علی بن سُلیمان البحرینی کی کتاب اشارات کی شرح ہے) ② قواعد النجاۃ فی القیامۃ فی امر الامامۃ، ③ استقصاء النظر فی امامۃ الائمہ الاثناعشر، ④ شرح نہج البلاغہ معروف بشرح ابن میثم بحرانی بھی ان کے فضل و کمال کا بہترین شاہکار ہے۔ یہ عالم جلیل علاوہ متکلّم و فیلسوف ہونے کے علومِ ادبیہ میں بھی خاص مقام رکھتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار آبدار ان ہی کی جودتِ طبع کا نتیجہ ہیں۔

طلبت فنون العلم ابغی بها العلی

فقصر عما سموت به القل

میں نے مختلف علوم طلب کیے اور میری غرض یہ تھی کہ سربلندی حاصل کروں لیکن میرے ارادہ میں میری قلت مال حائل ہوگئی۔

تبین لی ان المحاسن کلها

فروع و ان المال هو الاصل

تلخ تجربات کے بعد مجھ پر یہ بات واضح ہوئی کہ جس قدر خوبیاں ہیں وہ سب فرع ہیں اور مال ان کی اصل ہے۔

ان اشعار کے متعلق ان کے اور علمائے نجف کے درمیان ایک عجیب وغریب واقعہ بھی رونما ہوا، جسے بوجہ خوفِ طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے۔ شائقین کتاب مجالس المومنین اور لولوء البحرین کی طرف رجوع فرمائیں۔ (قرن ہفتم)

۳۶ حسن بن داؤد حلی: صاحبِ رجال مشہور، انھوں نے علم کلام میں دو منظوم کتابیں تصنیف فرمائیں۔ ① الدر الثمین فی اصول الدین، ② الخریدۃ العذرا فی العقیدۃ الغرا۔ (اواخر قرن ہفتم یا اوائل قرن ہشتم)

۳۷ حسن بن یوسف المعروف بہ علامہ حلی: یہ وہ ہی علامہ حلی ہیں کہ جن کے فضل و کمال اور عظمت وجلال کے تذکروں سے شرق وغرب اور بر و بحر چھلک رہے ہیں۔ اگر چہ ان کی زیادہ تر شہرت اصولِ فقہ اور فقہ میں ہے، لیکن چونکہ یہ بحر العلوم اور جامع المعقول والمنقول تھے، اس لیے

انھوں نے دوسرے علوم وفنون کی طرح علم کلام میں بھی متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں۔ جیسے ① شرح تجرید الکلام جو ان کے استاذ علامہ حضرت مُحقق طوسی علیہ الرحمہ کی کتاب تجرید کی مُختصر مگر بہت مُفید شرح ہے اور اکثر مدارس دینیہ میں داخل نصاب ہے۔ ② منہاج الکرامہ۔ یہ وہی کتاب ہے جس کے رد میں ابن تیمیہ حرانی نے ایک کتاب بنام "منہاج السنہ" لکھی اور پھر شیعیانِ حیدر کرار کی طرف سے جناب علامہ سید مہدی قزوینی البصری نے کتاب "منہاج الشریعہ" لکھ کر ہمیشہ کے لیے مخالفین کا ناطقہ بند کر دیا۔ ③ نہج الحق ۔ یہ وہی کتاب ہے جس کا جواب فضل بن روز بہان مشہور فاضل سنی نے بنام "ابطال الباطل" لکھا۔ جس کے جواب میں العالم السری حضرت قاضی نور اللہ شوستری معروف بہ شہید ثالث علیہ الرحمہ نے قلم اٹھایا، اور "احقاق الحق" نامی مشہور عالم کتاب لکھی اور کچھ اس انداز سے مدلل جواب لکھا گویا کہ مخالفین کی رگِ حیات کو کاٹ دیا کہ پھر انھیں آج تک اس کے جواب میں قلم فرسائی کی جرأت نہ ہوسکی۔ نیز ماضی قریب میں جناب شیخ محمد حسن مُظفر نجفی نے بھی اسی ابطال الباطل کے رد میں تین جلدوں میں ایک کتاب دلائل الصدق لکھی جا احقاق الحق کی طرح بہت دلچسپ ہے، اسی طرح سرکار علامہ کی مسئلہ امامت میں "الفین" بھی بہت مشہُور ومقبول ہے۔ ⑤ الیقین فی امرۃ امیرالمؤمنین ۔ بہر حال اس بحرالعلوم نے کم وبیش چالیس کتابیں علم کلام میں تصنیف فرمائیں ۔شاہ خدا بندہ کے دربار میں سرکار علامہ کا مذاہب اربعہ کے اکابر علماء کے ساتھ مذہب امامیہ کی صداقت و حقانیت پر مناظرہ کر کے ان سب کو لاجواب کرنا اور بادشاہ کا ان کے دلائل سے متاثر ہوکر مذہب شیعہ قبول کر لینا بہت مشہُور اور دلچسپ ہے اور بنظر اختصار ہم اسے درج کرنے سے قاصر ہیں۔ شائقین کتاب روضات الجنات، مجالس المومنین، سفینۃ البحار وغیرہ کتب کی طرف رجوع فرمائیں ۔ ہاں محض اس خیال سے کہ ناظرین کرام اس مناظرہ جلیلہ کے افادات سے بالکل محروم نہ رہ جائیں، اس کا ایک مُختصر سا تتمہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

علامہ حلی کے ایک تاریخی مناظرہ کا تتمہ

جب سرکار علامہ نے مختلف فیہا مسئلہ میں مذاہب اربعہ کے علماء کو لاجواب کر کے مذہب حق کے موقف کو دلائل و براہین کے ساتھ ثابت کر دیا تو بادشاہ نے ان سے خواہش کی کہ وہ اسی مجلس میں مذہب شیعہ کی حقانیت پر ایک جامع تقریر کریں۔ سرکار علامہ نے اس کی استدعا کو قبول کر لیا اور خطبہ پڑھنا شروع کیا۔ اثنائے خطبہ میں انھوں نے حسب فرمانِ نبویؐ آں حضرتؐ پر صلوات بھیجنے

کے بعد ان کی آل اطہارؑ پر صلوات بھیجی ۔ اس پر ایک نام نہاد موصلی سید آتش زیر پا ہو کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ جناب! غیر انبیاء پر صلوات بھیجنا جائز نہیں ۔ سرکار علامہ نے جواباً فرمایا کہ قرآن کی رو سے غیر انبیاء پر صلوات بھیجنا جائز ہے ۔ چنانچہ ارشادِ رب العزت ہے :

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ○ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ (البقرۃ: ۱۵۵، ۱۵۷)

"اے رسولؐ! ان صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دو کہ جن پر جب کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو وہ (جزع فزع نہیں کرتے بلکہ) کہتے ہیں : ہم خدا کے لیے ہیں اور اسی کی طرف پلٹ کر جائیں گے ۔ ایسے لوگوں پر خداوند عالم صلوات بھیجتا ہے" ۔

معلوم ہوا کہ جو بھی مصیبت پر صبر کرے اس پر صلوات بھیجنا جائز ہے ۔ موصلی نے کہا تو آلِ محمدؐ پر کون سی مصیبت نازل ہوئی تھی جس پر وہ صبر کر کے صلوات کے مستحق قرار پاتے ہوں؟ ۔ جناب علامہ نے فرمایا کہ اہل بیت نبویؐ پر اس سے بڑھ کر اور کیا مصیبت آئے گی کہ تجھ ایسا ناخلف بھی یہ کہتا ہے کہ میں سید اور آلِ رسولؐ ہوں ۔ یہ سننا تھا کہ "فبہت الذی کفر"۔ سرکار علامہ نے قرن ہشتم ۷۲۶ھ میں وفات پائی ۔

(۳۸) محمد بن الحسن معروف بہ فخر المحققین : یہ عالم جلیل سرکار علامہ حلی کے خلف رشید اور ان کے علم و عمل کے صحیح وارث تھے ۔ اور سرکار علامہ کی زندگی میں ہی انھوں نے علمی میدان میں وہ بلند مقام حاصل کر لیا تھا کہ علامہ مرحوم نے انھیں اپنی نامکمل تصانیف کے تکمل کرنے کی وصیت فرمائی تھی ۔ یہ بزرگوار اپنے تحقیقی و علمی کارناموں کی وجہ سے علمی حلقوں میں فخر المحققین کے جلیل القدر لقب سے یاد کیے جاتے ہیں ۔ انھوں نے علم کلام میں ایک کتاب بنام "الکافیہ الوافیہ" لکھی ۔ (متوفی قرن ہشتم)

(۳۹) مقداد بن عبد اللہ السیوری الحلی المعروف بفاضل مقداد : بڑے جلیل القدر عالم و متکلم تھے ۔ ان کی کتاب "کنز العرفان فی شرح آیات الاحکام" بہت مشہور و مقبول ہے ۔ انھوں نے علم کلام میں متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں ، جیسے "شرح نہج المسترشدین" اور "شرح باب حادی عشر" جو عراق و عجم وغیرہ کے اکثر مدارس دینیہ میں داخل نصاب ہے ۔ "شرح فصول اللوامع الالٰھیہ فی المباحث الکلامیہ" وغیرہ ۔ (اواخر قرن ہشتم)

(۴۰) حسن بن محمد بن راشد حلی : صاحب ریاض العلماء (علی ما نقل عنہ) نے ان کے متعلق لکھا ہے : "المتکلم الفاضل الجلیل" ۔ انھوں نے علم کلام میں ایک کتاب بنام "مصباح المھتدین فی اصول الدین" لکھی ۔ (قرن نہم)

(۴۱) محمد بن ابی جمہور الاحسائی: شیخ عباس مرحوم نے فوائد رضویہ جلد ۲ صفحہ ۳۸۲ پر ان کا ان الفاظ کے ساتھ تذکرہ کیا ہے: "عالم، عارف، حکیم، متکلّم، مُحقّق مدقق فاضل، محدث خبیر، مُتبحّر، ماہر" اور علم کلام میں ان کی چار کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ المجلی شرح باب حادی عشر، زاد المسافرین فی اصول الدین اور اس کی شرح مسمی بہ کشف البراہین۔ انھوں نے مخالفین کے ساتھ بڑے بڑے مناظرات بھی کیے جن میں سے بعض کا تذکرہ مجالس المومنین اور روضات الجنات میں اور تمام نامہ دانشوراں میں مذکور ہیں۔ (قرن دہم) "المجلی" ہمارے پاس موجود ہے، اس کے دیکھنے سے ان کا رجحان تصوف وعرفان کی طرف معلوم ہوتا ہے۔

(۴۲) احمد بن محمد الاردبیلی النجفی المعروف بہ مقدس اردبیلی: بہت بلند پایہ عالم ربانی اور فقیہ صمدانی تھے۔ ان کی وثاقت وجلالت اور فضل ونبالت، زہد ودیانت اور ورع وامانت اس سے مشہُورتر وافزوں تر ہے کہ قلم اس کا احاطہ کر سکے۔ اگرچہ وہ ایک عظیم المرتبت فقیہ کی حیثیت سے زیادہ مشہُور ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ بہت بلند پایہ متکلّم بھی تھے۔ چنانچہ شیخ عباس قمی مرحوم نے اپنی کتاب "الکنی والالقاب" جلد ۳ صفحہ ۱۶۶ پر ان کے متعلّق لکھا ہے: "کان متکلما فقیہا عظیم الشان جلیل القدر رفیع المنزلت اورع اہل زمانہ واعبدھم واتقاھم"۔ علم کلام میں ان کی مشہُور کتاب "حدیقۃ الشیعہ" ہے۔ (قرن دہم ۹۹۳ھ)

(۴۳) الشیخ علی بن عبد العالی معروف بہ مُحقّق کرکی و مُحقّق ثانی: یہ شیخ عالی مقدار اپنے وقت میں مروج مذہب وملت اور رئیس مشائخ اجلہ تھے اور بہت بلند مرتبہ عالم و فاضل اور فقیہ و متکلّم تھے۔ اگرچہ ان کی شہرت زیادہ تر ایک فقیہ نبیہ ہونے کی حیثیت سے ہے اور ان کی فقہی کتاب "جامع المقاصد" فقہاء کی نگاہ میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ لیکن علم کلام میں بھی ان کی کافی خدمات ہیں۔ ان کا رسالہ جعفریہ اور نفحات اللاہوت خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

جناب شاہ طہماسب صفوی کے عہد میں یہ شیخ الاسلامی کے منصب رفیع پر فائز تھے اور بادشاہ ان کی بہت تعظیم وتکریم کرتا تھا، اور یہاں تک کہتا تھا کہ در حقیقت بادشاہ آپ ہیں۔ چونکہ آپ نائب امام ہیں، آپ کا نائب ہوکر آپ کے حکم کے مطابق حکومت کرتا ہوں۔ اور اس نے اپنی تمام قلمرو سلطنت میں ایک شاہی فرمان بھیجا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ مُجتہد جامع الشرائط کے حکم کی مخالفت بموجب فرمانِ امام عالی مقام شرک کے برابر ہے۔ لہٰذا جو شخص بھی حضرت مُحقّق کرکی کے کسی حکم کی مخالفت کرے گا وہ ملعون اور ہماری بارگاہ سے مردود و مطرود ہوگا۔

مُحقّق کرکی کی حاضر جوابی کا ایک عجیب واقعہ

ایک بار آپ شہنشاہ کی بارگاہ میں تشریف فرما تھا کہ بادشاہِ روم کا سفیر بھی شرف یاب ہوا۔ اثناءِ گفتگو میں اسے شرارت سوجھی اور کہنے لگا: اے شیخ آپ کے مذہب وطریقہ کے اختراع کا مادہ تاریخ ہے۔ "مذہب ناحق" (۹۰۶) شاہانِ صفویہ کی بادشاہت کی تاریخ ہے۔ جس سے آپ کے مذہب کا بطلان ظاہر وعیاں ہوتا ہے۔ شیخ نے برجستہ جواب دیا کہ ہم عربی الاصل ہیں، اور ہماری اصل زبان عربی ہے نہ عجمی۔ لہٰذا اگر آپ لفظ مذہب کو ضمیر جمع متکلّم (نا) کی طرف مضاف کردیں تو یوں جملہ بنے گا: "مذہبنا حق" (ہمارا مذہب حق ہے) فبہت الذی کفر و بقی کانما القم حجر۔ ان کے فرزندار جمند شیخ عبدالعالی بھی بہت عالم وفاضل اور متکلّم تھے۔ (۱۸ ذی الحجہ ۹۴۰ھ قرن دہم)

⑭ **غیاث الدین منصور بن صدر الدین الحسینی الاشتکی**: یہ بزرگوار بہت بلند پایہ عالم عامل اور فاضل کامل تھے۔ یہ علامہ سید علی خان شارح صحیفہ کاملہ کے جدامجد ہیں۔ اور شیراز کے مدرسہ منصوریہ کے بانی ہیں۔ شاہ طہماسب صفوی مرحوم کے عہد معدلت انگیز میں "صدر صدور الممالک" کے جلیل القدر لقب سے مُلقّب اور صدرالصدور کے مرتبہ عالیہ پر فائز تھے۔ علم کلام میں ان کی چند کتابیں ہیں۔ حجۃ الکلام، حواشی برالہیات شفا و اشارات وغیرہ۔ (۹۴۰ھ قرن دہم)

⑮ **قاضی نور اللہ بن شریف الدین الحسینی الشوستری معروف بہ شہید ثالث**: بہت بلند پایہ عالم عظیم الشان متکلّم فصیح البیان تھے۔ باوجود ناملائم حالات سے دوچار ہونے کے علم کلام میں بہت سی کتب جلیلہ تصنیف فرمائیں۔ ان میں سے مندرجہ ذیل کتب بہت مشہور ومُفید ہیں:

① "احقاق الحق"۔ اس کا تذکرہ علامہ حلی کے حالات میں ہوچکا ہے۔ ② مصائب النواصب

③ الصوارم المحرقہ عقائد امامیہ۔ یہ بزرگوار ان مظلوم علمائے شیعہ میں سے ہیں جنھیں تشیّع کے جرم میں جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔ انھیں جہانگیر نے مُفسد ملاؤں کے فتویٰ کے مطابق شہید کرایا۔ ان کی مزار آگرہ میں مشہُور و معروفِ انام اور زیارت گاہِ خاص وعام ہے۔ (قرن یازدہم ۱۰۱۹ھ)

⑯ **محمد بن الحسین العاملی الحارثی المعروف بہ شیخ بہاؤ الدین العاملی**: یہ بزرگوار اسلام کی ان نادر شخصیتوں میں سے ایک ہیں، جنھیں صحیح معنوں میں جامع العلوم والفنون کہا جاسکتا ہے۔ یہ عالم جلیل القدر اپنے علمی وتحقیقی کارناموں کی بدولت آسمانِ شہرت وعظمت کے درخشندہ ستارے سمجھے جاتے ہیں۔ اگرچہ بالعموم ان کا شمار متکلمین میں نہیں کیا جاتا، جس کی

وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس فن میں ان کی کوئی مبسوط تصنیف نہیں ملتی۔ لیکن چونکہ یہ بزرگوار جامع الفنون ہونے کی وجہ سے ہر فن مولا تھے، ان کی کتاب "کشکول" معروف بہ "کشکول بہائی" جو کہ مصر وایران وغیرہ میں کئی بار چھپ چکی ہے، جہاں اس میں اور سینکڑوں موضوعات پر طبع آزمائی کی گئی ہے، وہاں مباحث کلامیہ کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ علاوہ بریں جناب شیخ بہائی کا ایک مختصر رسالہ بنام "عقائد الشیعہ" بھی ہے، جو ایران میں ایک مجموعہ رسائل کے ہمراہ شائع ہو چکا ہے۔ مرحوم شیخ، شاہ عباس صفوی کے عہد معدلت انگیز میں "شیخ المشائخ" کے عہدہ جلیلہ پر فائز تھے۔ اور اسی بادشاہ کے نام پر انھوں نے "جامع عباسی" نامی کتاب لکھنا شروع کی تھی، جسے بعد میں ان کے تلمیذ رشید جناب نظام الدین ساوجی نے مکمل کیا۔ (قرن یازدہم ۱۰۳۰ھ)

(۴۷) **محمد محسن ابن مرتضی کاشانی المعروف بہ ملا محسن فیض:** یہ بزرگوار بڑے جامع الفنون و العلوم اور کثیر التصنیف والتالیف عالم جلیل و فاضل نبیل تھے۔ بروایت علامہ جزائری مرحوم نے مختلف علوم وفنون میں تقریباً دو سو کتب تحریر فرمائیں۔ علم کلام میں بھی انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں سے مندرجہ ذیل کتب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ المعارف فی اصول الدین، علم الیقین، عین الیقین، منہاج النجاۃ۔ اگرچہ ان کتب میں ایک معمولی سا نقص یہ ہے کہ ان میں تصوف وعرفان کی ہلکی سی جھلک پائی جاتی ہے جس کا سبب اور پھر اس کا عذر سرکار فیض نے اپنے رسالہ انصاف مطبوعہ ایران میں کر دیا ہے، جس کا قبول نہ کرنا دیانت بلکہ انسانیت کے منافی ہے۔ جو حضرات مرحوم محسن فیض کے مسلک وعقیدہ کے متعلق مختلف شکوک واوہام میں مبتلا ہیں۔ انھیں رسالہ انصاف کا مطالعہ کرکے اپنے شکوک وشبہات کو دور کرنا چاہیے۔ (قرن یازدہم ۱۰۹۱ھ)

(۴۸) **عبدالرزاق بن علی بن الحسین لاہجی:** یہ بزرگوار بہت جلیل القدر عالم فاضل اور حکیم و متکلم تھے۔ صدر المحققین ملا صدرا الشیرازی کے تلمیذ رشید اور ان کے داماد اور سرکار محسن فیض کاشانی کے ہم زلف تھے۔ انھوں نے اپنی گرانقدر تصانیف کے ذریعہ علم کلام کے لٹریچر میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ ان کی کتب کلامیہ درج ذیل ہیں: (۱) تجرید محقق طوسی کی دو شرحیں لکھیں۔ ان میں سے ایک بنام شوارق مطبوع وموجود ہے۔ (۲) گوہر مراد (۳) سرمایہ ایمان وغیرہ۔

ان کا ایک فرزند ارجمند مسمّی بہ مرزا حسن بھی فاضل آدمی تھا۔ اس نے مسئلہ امامت میں ایک کتاب بنام "شمع یقین" تصنیف کی جو کہ مطبوع ہے۔ (قرن یازدہم ۱۰۵۱ھ)

(۴۹) عبدالرزاق رانگوئی شیرازی: عالم و فاضل اور متکلّم تھے۔ یہ فاضل لاہجی کے معاصر تھے۔ انھوں نے علم کلام میں محقق طوسی کے رسالہ قواعد العقائد کی شرح لکھی۔ (قرن یازدہم)

(۵۰) محمد بن ابراہیم معروف بہ ملا صدرا الشیرازی: یہ بہت عظیم الشان حکیم و فیلسوف اور جلیل القدر عالم و متکلّم تھے۔ ان کی کتاب اسفارِ اربعہ تمام دنیا کے حکماء و فضلا کا مرکز توجہ بنی ہوئی ہے۔ اوران سے خراجِ تحسین لے چکی ہے۔ یہ بزرگوار عظیم فلسفی و متکلّم ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے متقی و پرہیز گار بھی تھے۔ چنانچہ شیخ عباس قمی مرحوم نے لکھا ہے کہ وہ چھ مرتبہ پیادہ پا حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے اور ساتویں بار جا رہے تھے کہ راستہ میں بصرہ کے اندر وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ انھوں نے علم کلام میں چند کتب تصنیف فرمائیں۔ (قرن یازدہم)

(۵۱) محمد باقر بن محمد الحسینی الاسترآبادی معروف بہ میر محمد باقر داماد: یہ بزگوار عالی مقدار بہت بڑے عالم محقّق، نحریر و فاضل خبیر اور متکلّم و حکیم اور جامع المعقول والمنقول تھے۔ ع

عقلیش از قیاس عقل بروں

نقلیش از قیاس فزوں

ان کی علمی جلالت قدر کا اندازہ لگانے کے لیے یہی کافی ہے کہ صدر المحققین شیرازی اسی بزرگوار کا تلمیذ اور علمی میدان میں ان ہی کا کاسہ لیس ہے۔ علاوہ اس کے کہ علوم حکمیہ وغیرہ میں سرآمد روزگار تھے۔ عمل و عبادت میں بھی بے نظیر تھے۔ ان کی عبادت و زہادت، علمی جلالت و وجاہت اور عملی عظمت و ثقاہت کے سلسلہ میں ان کے متعلق کتب سیر میں بکثرت حکایات درج ہیں۔ یہاں ان تمام کے نقل کرنے کی تو گنجائش نہیں، دو چار مختصر حکایات تبرکاً نقل کی جاتی ہیں:

(۱) شیخ عباس قمی نے بحوالہ حدائق المقربین میر محمد صالح نقل کیا ہے کہ میر باقر داماد مرحوم عبادت کے معاملہ میں انتہا کو پہنچے ہوئے تھے اور قرآن مجید کی بکثرت تلاوت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض ثقات نے نقل کیا ہے کہ وہ ہر رات پندرہ پارے پڑھتے تھے۔

(۲) نیز شیخ موصوف نے فوائد رضویہ میں لکھا ہے کہ ان کی علمی و عملی مصروفیات کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ بعض لوگوں نے نقل کیا ہے کہ انھوں نے چالیس سال کی مدت مدید تک سونے کے لیے اپنے پاؤں دراز نہیں کیے۔ لکھائی و پڑھائی کا کام کرتے ہوئے بیٹھے بیٹھے چند منٹ آرام کر لیتے تھے۔ شیخ نے اس حکایت کو عجائباتِ روزگار میں سے شمار کیا ہے اور واقعی بنا بر صحت عجیب ہے۔ وایّ عجیب

۴ اہلِ علم اور بالخصوص معاصرین کے درمیان جو کچھ باہمی کد وکدورت اور منافرت ہوتی ہے وہ عیاں راچہ بیاں کی مصداق ہے۔ (الامن رحم اللہ و قلیل ماھم) مگر محقق عماد سید محمد باقر داماد کا دامن عفت ان آلائشات کی لوث سے منزہ و مبرا تھا۔ چنانچہ حضرت شیخ بہائی جو ان کے معاصر جلیل تھے، ان کے ساتھ ان کے مخلصانہ مراسم و روابط ضرب المثل تھے۔ ان کے اس باہمی خلوص و محبت اور مواخات کا ایک عجیب واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ شاہ عباس صفوی اپنے شاہانہ شان وشکوہ کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے نکلا اور یہ دونوں بزرگوار بھی اس کے ہم کاب تھے۔ سید داماد مرحوم جسیم و لحیم اور عظیم الجثہ تھے، اس کے برعکس حضرت بہائی بالکل نحیف ونزار اور دُبلے پتلے تھے۔ بادشاہ نے چاہا کہ دونوں بزرگواروں کی باہمی محبت وخلوص کی آزمائش کرے۔ چنانچہ سید صاحب کی خدمت میں پہنچا، جو کہ سب کے آخر میں آہستہ آہستہ گھوڑے پر تشریف لا رہے تھے۔ اور بوجہ ثقل جثہ چہرہ مبارک پر تکان کے آثار آشکار تھے اور جناب شیخ کا گھوڑا سب سے آگے آگے اس طرح جولان کرتا ہوا جا رہا تھا کہ گویا اس پر کوئی سوار ہی نہیں۔ شاہ نے سید کی خدمت میں عرض کیا: یا سیدنا! آپ ان شیخ صاحب کو بھی دیکھتے ہیں، یہ کس طرح گھوڑے کے ساتھ کھیلتے کودتے ہوئے جا رہے ہیں اور آپ کی طرح سکینہ ووقار کے ساتھ نہیں چلتے۔ سید نے شاہ کا یہ کلام سُن کر فرمایا: اے بادشاہ! اس میں شیخ کا کوئی قصور نہیں۔ گھوڑا اس فرحت وانبساط میں کہ آج حضرت شیخ اس کی زین پر سوار ہیں، تیز تیز چل رہا ہے۔ بادشاہ سید کا یہ جواب باصواب سُن کر خاموشی سے شیخ کی خدمت میں پہنچ گیا اور عرض کیا: شیخنا! ذرا سید صاحب کی حالت دیکھیے کہ انھوں نے اپنی جسامت وموٹاپے کی وجہ سے گھوڑے کو بھی مصیبت وتکان میں ڈال رکھا ہے۔ عالم دین کو تو آپ کی طرح پتلا دبلا اور خفیف المؤنہ ہونا چاہیے۔ شیخ نے بادشاہ کا یہ کلام سُن کر فرمایا: سید کے گھوڑے پر تکان کے جو آشکار ہیں، سید کی ظاہری جسامت کی وجہ سے نہیں ہیں بلکہ یہ ان کے اس علم کے بوجھ کی وجہ سے ہیں جس کے اٹھانے کی پہاڑ بھی تاب وتوانائی نہیں رکھتے۔ بادشاہ شیخ کا یہ جواب سُن کر اور دو علماء دین کی باہمی خالص اخوت والفت دیکھ کر فوراً گھوڑے سے اُتر آیا، اس نعمت پر سجدۂ شکر ادا کیا کہ اس کے پاس دو ایسے عالم باعمل موجود ہیں۔ (روضات الجنات وغیرہ)

دل چاہتا ہے کہ موجودہ دور کے مولوی صاحبان کی حالتِ زار بیان کرنے کے لیے وہ واقعہ درج کر دیا جائے جو رسالہ "اصلاح" کے کسی شمارہ میں دیکھا تھا۔ ہوا یوں کہ دو مولوی صاحبان کسی جگہ

اکٹھے کسی صاحب کے ہاں جا کر مہمان ہوئے۔ اتفاق سے ان میں سے ایک صاحب کہیں قضائے حاجت وغیرہ کے لیے باہر تشریف لے گئے، میزبان نے خلوت کو غنیمت سمجھا، دوسرے مولوی صاحب سے کہا کہ: ماشاء اللہ آپ کی شکل وشمائل سے تو علم وفضل کے آثار ہویدا و آشکار ہیں۔ مگر یہ مولوی صاحب جو آپ کے ہمراہ ہیں، یہ بھی کچھ جانتے ہیں؟ مولوی صاحب نے فوراً کہا: نہیں جناب! یہ تو بالکل گدھے ہیں۔ اتنے میں دوسرے مولوی صاحب واپس پہنچ گئے اور اب یہ دوسرے مولوی صاحب باہر تشریف لے گئے۔ اب میزبان نے اپنے سابقہ رویہ کا اعادہ کرتے ہوئے وہی سوال ان سے بھی کیا۔ انھوں نے بھی بلا تأمل یہی فتویٰ صادر فرمایا کہ ان کے ساتھی گدھے اور علم وفضل سے بھی بالکل کورے ہیں۔ میزبان خاموش ہوگیا۔ جب کھانے کا وقت ہوا تو اس نے ایک توبرا نخود (چنے) کا بھر کر مولوی صاحبان کی خدمت میں پیش کیا اور عرض کیا: حضور نوش فرمائیں۔ مولوی صاحبان حیران و پریشان ہو کر کبھی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں اور کبھی میزبان کی طرف۔ غیظ وغضب کی نگاہیں اٹھتی ہیں۔ میزبان ان کی یہ سراسیمگی دیکھ کر بولا! جناب اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ آپ دونوں نے ایک دوسرے کے بارہ میں گدھا ہونے کا فیصلہ کیا تھا اور گدھوں کی بہترین غذا نخود کے دانے ہیں۔ دونوں حضرات شرمندہ اور خجل ہوئے۔ آپ نے ملاحظہ کیا کہ جب تک علماء کی سیرتیں پاکیزہ اور کردار بلند تھا، بادشاہ ان کی خدمت ان کی تعظیم وتکریم کو واجب اور اپنے لیے سرمایہ سعادت سمجھتے تھے اور جب ان کی سیرتیں داغدار اور کردار ناہنجار ہوگئے تو آج یہ عالم ہے کہ ؏

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

سچ ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (سورۃ الرعد: ۱۱)

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

محقق عماد میر باقر داماد، مشکل نویسی میں مشہور ہیں اور ان کی کتب اس سلسلہ میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ کسی شخص نے آپ کی بعض کتب کی بعض عبارات پر کچھ ایرادات کرکے بغرض جواب آپ کی خدمت میں بھیجے۔ جناب نے اس کے جواب میں ایک مفصل مکتوب ارسال فرمایا۔ جس میں یہ بھی لکھا: "این قدر شعور باید داشت کہ سخن من فهمیدن هنر است نہ با من جدال کردن و بحث نام نهادن"۔ "اس قدر

شعور رکھنا ضروری ہے کہ میرے کلام کا مطلب سمجھنا تمھارے لیے ہُنر اور کمال ہے، نہ یہ کہ میرے ساتھ مجادلہ کرکے اس کا نام علمی مباحثہ رکھنا"۔ (فوائد رضویہ جلد ۲ صفحہ ۴۴۲)

محقّق داماد کی یہ فرمائش بہت گرانقدر و متین ہے۔ واقعاً علماء اعلام کے کلام حقیقت ترجمان کا حقیقی مطلب و مفہوم سمجھنا ہی عام لوگوں کے کمال کی دلیل ہے، نہ کہ اپنی کم عقلی و کوتاہ اندیشی سے ان پر زبانِ اعتراض دراز کرنا۔ مگر افسوس اکثر لوگوں کا رویہ بموجب ارشادِ خداوندی یہی ہے کہ:

كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ (سورۂ یونس: ۳۹)

جس چیز کا علمی احاطہ نہ کرسکیں اس کو جھٹلانا شروع کردیتے ہیں اور یہ روش انتہائی مضر اور خطرناک ہے۔ خدا محفوظ رکھے۔ بہرحال اس عالم جلیل نے دیگر علوم وفنون کے علاوہ علم کلام میں مندرجہ ذیل کتب لکھیں: ① نبراس الضیاء ② تقویم الایمان ③ عیون المسائل ④ تقدیسات وغیرہ۔ (قرن یازدہم ۱۰۴۱ھ ۱۰۴۲ھ)

(۵۲) **محمد بن الحسن الشیروانی الاصفہانی معروف بہ ملا مرزا:** بہت جلیل القدر عالم و فاضل اور علوم کثیرہ میں مُتبحّر کامل تھے۔ علم کلام میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ دیگر تصنیفاتِ کثیرہ کے علاوہ علم کلام میں بھی مُتعدد رسائل لکھے، جیسے رسالہ در توحید، رسالہ در نبوت، رسالہ در امامت، رسالہ در صداقت کلام اللہ، رسالہ در معنی بداء، رسالہ در جبر واختیار، رسالہ در احباط وتکفیر، وغیرہا

یہ بزرگوار پہلے نجف اشرف میں مقیم تھے۔ شاہ سُلیمان صفوی ان کو اصفہان میں لے گئے اور بالآخر وہیں بروز جمعہ ۲۹ ماہ رمضان ۱۰۹۸ھ میں وفات پائی۔

(۵۳) **السیّد محمد بن السیّد حیدر الحسینی الحسنی الطباطبائی معروف بمرزا رفیع الدین:** یہ سید بزرگوار بہت عظیم المرتبت عالم، حکیم، متکلّم و متالہ اور مُحقّق و مدقق فاضل تھے۔ ان کی عظمت و جلالت کے اثبات کے لیے یہی امر کافی ہے کہ یہ سرکار علامہ مجلسیؒ کے استاد ہیں۔ انھوں نے دیگر علوم وفنون کے علاوہ علم کلام میں بھی بعض کتب جلیلہ تصنیف فرمائیں۔ جیسے شجرۃ الالٰہیۃ اور اس کا جامع خلاصہ "ثمرۃ الالٰہیۃ"۔ (۷ شوال ۱۰۹۹ھ قرن یازدہم)

(۵۴) **السیّد علی خان ابن السیّد خلف ابن السیّد الموسوی الحویزی:** یہ سید نبیل بہت عالی مرتبہ عالم و فاضل اور جامع العلوم تھے۔ دینی ودنیوی دونوں سعادتوں پر فائز تھے۔ حویزہ اور اس کے اطراف کی عنانِ حکومت ان کے ہاتھ میں تھی۔ مختلف موضوعات پر ان کی مُتعدد کتب ہیں۔ علم کلام میں بھی کتاب "النور المُبین" لکھی۔ مخفی نہ رہے کہ فاضل اجل سید علی خان صاحب شرح صحیفہ کاملہ

وغیرہ کتب جلیلہ اور بزرگوار ہیں۔ (متوفی اواخر قرن یازدہم)

۵۵ **محمد باقر ابن محمد تقی مجلسی الاصفہانی معروف بہ علامہ مجلسیؒ**: یہ بزرگوار فقط عالم شہیر و محدث بصیر ہی نہیں بلکہ رئیس المحدثین و مروج المذہب والدین و ناشر آثار الائمۃ الطاہرینؑ ہیں۔ اگرچہ وہ ایک محدث جلیل ہونے کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں، لیکن وہ علم کلام میں بھی پوری پوری دستگاہ رکھتے تھے۔ بحار الانوار کی بعض مجلدات (مثلاً ۱۔ ۲۔ ۳۔ ۱۴ وغیرہ) اس امر پر شاہد صادق موجود ہیں۔ سرکار علامہ کی علم کلام میں دو کتابیں موجود ہیں۔ ① حق الیقین فی اصول الدین، جس کا اردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔ ② رسالہ لیلیہ، جس میں عقائد حقہ کا مختصر تذکرہ موجود ہے۔ اسے "لیلیہ" اس لیے کہا جاتا ہے کہ سرکار علامہ نے اسے ایک ہی شب میں تحریر فرمایا تھا۔ اس عالم علوم ائمہ اطہارؑ و غواص بحار اخبار کے مذہب شیعہ پر اس قدر احسانات ہیں کہ قوم شیعہ کبھی ان سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ مذہب اہل بیتؑ کے اس بطل جلیل کے متعلق شاہ عبدالعزیز دہلوی نے "تحفہ" میں لکھا ہے کہ: "اگر مذہب شیعہ را دین مجلسی گفتہ شود بے جا نیست"۔ آسمانِ عظمت و جلالت کا یہ بدر منیر ۱۱۱۰ھ میں غروب ہوا۔

۵۶ **یوسف بن احمد البحرانی**: یہ بزرگوار بہت بڑے عالم عامل محدث، ورع کامل، فاضل متبحر و متتبع ماہر، صاحبِ حدائق ناظرہ فی احکام العترۃ الطاہرہ، یہ وہ عظیم الشان کتاب ہے کہ جس کے متعلق علمائے اعلام کا یہ فیصلہ ہے کہ "ھو کتاب جلیل لم یعمل فی کتب الامامیۃ مثلہ" کہ اس کی مثل کتب امامیہ میں کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ (منتہی المقال للشیخ ابی علی الحائریؒ) اگرچہ اس عالم ربانی اور فاضل صمدانی کی زیادہ شہرت فقہ و حدیث میں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بزرگوار علم کلام میں بھی مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ چنانچہ اس علم میں انھوں نے تین کتابیں تصنیف فرمائیں۔ ① سلاسل الحدید فی تقیید ابن ابی الحدید۔ ② اعلام القاصدین الیٰ مناہج اصول الدین۔ ③ النفحات الملکوتیہ فی الرد علی الصوفیہ۔ علم و عمل کا یہ مہر تاباں قرن دوازدہم ۱۱۸۶ھ کربلا معلیٰ میں غروب ہوا اور سرکار سید الشہداءؑ کے رواق مبارک میں پائنتی کی طرف جو دروازہ ہے، وہاں مدفون ہوا۔

۵۷ **سید نعمت اللہ بن عبداللہ المعروف بہ علامہ جزائری**: آپ حضرت علامہ مجلسیؒ اور آقا حسین خوانساریؒ اور فاضل جلیل ملا محسن فیضؒ کے شاگردِ رشید اور بہت بلند پایہ کے عالم و فاضل، ماہر کامل، محدث جلیل، محقق نبیل، متکلم عدیل تھے۔ تحصیل علوم وفنون میں انھوں نے جس قدر مصائب و آلام جھیلے ہیں شاید ہی کسی نے اس قدر رنج و آلام جھیلے ہوں گے۔ بالآخر ان کی محنت و مشقت ٹھکانے لگی اور بفضلہ تعالیٰ علم و عمل کے مدارجِ عالیہ و مراتب سامیہ پر فائز ہوئے اور مرجع فضلاء و علماء

قرار پائے اور سر آمد روزگار بنے ۔"فان اللہ لا یضیع اجر المحسنین" ۔ انھوں نے جہاں دیگر علوم اسلامیہ میں گرانقدر کتب تصنیف و تالیف فرمائیں ، وہاں علم کلام میں بھی چند کتب جلیلہ لکھیں ۔ شرح توحید شیخ صدوق قاطع اللجاج شرح احتجاج طبرسی انوارِ نعمانیہ کا ایک مُعتد بہ حصّہ مباحث کلامیہ پر مشتمل ہے اور شرح اعتقادیہ شیخ صدوق علیہ الرحمہ ۔ سید مرحوم کی تمام کتب فوائد بہیہ اور لطائف علمیّہ سے لبریز ہیں اور قابلِ استفادہ واستفاضہ ہیں ۔ (قرن دوازدہم ۱۱۱۲ھ)

۵۸ جمال الدین محمد بن محقق آقا حسین خوانساری: صاحب ہدیۃ الاحباب قدس سرہٗ نے ان کا ان الفاظ کے ساتھ تذکرہ فرمایا ہے: "عالم محقق مدقق حکیم متکلم فقیہ نبیہ جلیل القدر صاحبِ تصانیف رائقہ " یہ پہلے بزرگوار ہیں جنھوں نے فارسی زبان میں کلام اللہ کا ترجمہ کیا ۔ انھوں نے دیگر موضوعات کے علاوہ علم کلام میں بھی بعض رسائل مُفیدہ تصنیف فرمائے ہیں ۔ من جملہ ان کے ایک رسالہ اصولِ دین میں ہے ۔ (متوفی ۲۶ ماہ رمضان ۱۱۲۵ھ قرن دوازدہم)

۵۹ الشیخ محمد بن الحسن معروف بہ شیخ حر عاملی: حضرت شیخ عباس قمی علیہ الرحمہ نے فوائد رضویہ جلد ۲ صفحہ ۴۷۳ پر ان جناب کے تذکرہ کی ان الفاظ کے ساتھ ابتدا کی ہے: عالم فاضل محقق مدقق متبحر جامع کامل صالح ورع ثقہ فقیہ نبیہ محدث حافظ شاعر ادیب اریب جلیل القدر عظیم الشان...... الخ ۔ اگرچہ ان جناب کی شہرت زیادہ تر ایک جلیل القدر محدث خبیر ہونے کی حیثیت سے ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بزرگوار جامع العلوم تھے ۔ ان کی کتاب مُستطاب وسائل الشیعہ کے اخبار و آثار پر اجتہاد کا دارومدار ہے ۔ انھوں نے وہ تمام مستند احادیث اس میں جمع فرمائی ہیں جن کا تعلق احکامِ شرعیہ فرعیہ کے ساتھ ہے ۔ خواہ وہ احادیث کتب اربعہ کی ہوں یا دیگر کتب مُعتبرہ کی ۔ اگر اس کے ساتھ ثقۃ الاسلام حضرت علامہ محدث نوری قدس سرہٗ کی "مُستدرک الوسائل" بھی شامل کرلی جائے اور اِستنباطِ احکام کے وقت ان کتب جلیلہ کو پیشِ نظر رکھا جائے تو جس قدر تتبع و تفحص ایک فقیہ جامع الشرائط پر لازم ہوتا ہے ۔ اس کا حق ادا ہوجاتا ہے ۔ یہ عالم جلیل اپنے وقت میں شیخ الاسلامی کے درجۂ رفیعہ پر فائز تھے اور قیام مشہد مقدس میں تھا ۔ بہرحال اس بزرگوار نے علاوہ دیگر علوم شرعیہ کے خاص کر علم کلام میں بھی چند کتب جلیلہ لکھ کر اس علم کی نشرواشاعت میں حصّہ لیا ہے ۔

① اثبات الہداۃ بالنصوص والمعجزات ② رسالہ در مسئلہ رجعت ③ رسالہ در ردِّ صوفیہ ④ رسالہ در خلق کافر ⑤ رسالہ تواتر قرآن...... اس آفتابِ علم نے اکیس ماہ رمضان المبارک ۱۱۰۴ھ کو مشہد مقدس میں غروب فرمایا ۔ (قرن دوازدہم)

⑥⓪ سلیمان بن عبداللہ الماحوزی البحرانی: محقق مدقق جامع جمیع علوم، خطیب، شاعر، حافظ مؤرخ، محدث، متکلم، صاحبِ تصانیف کثیرہ نافعہ در علومِ مختلفہ۔ علم کلام میں بھی چند کتابیں لکھیں۔ جیسے ① ہدایۃ القاصدین الی اصول الدین ② فصل الخطاب ③ کتاب الاربعین درامامت ④ صواب النداء فی مسئلہ البداء ⑤ شرح باب حادی عشر۔ یہ بزرگوار عالم ربانی الشیخ یوسف البحرانی صاحب حدائق ناضرہ کے والد علامہ الشیخ احمد کے استاد ہیں۔ شیخ مرحوم حدائق ناضرہ میں ان کے اقوال پر کافی نقد و تبصرہ کرتے ہیں۔ (۱۷ رجب ۱۱۲۱ھ قرن دوازدہم)

⑥① سید دلدار علی ابن سید محمد معین النیشاپوری لکھنوی: معروف بجناب "غفران مآب" بڑے جلیل القدر عالم اور عظیم الشان متکلم تھے۔ عراق میں شیخ اکبر شیخ جعفر کبیر صاحبِ کشف الغطا اور سید جلیل السید مہدی بحرالعلوم سے علومِ نقلیہ و عقلیہ کی تکمیل کرنے اور ان سے اجازہ اجتہاد لینے کے بعد ہندوستان میں تشریف لائے اور سرزمین لکھنؤ کو اپنا مرکز قرار دے کر ہندوستان کو اپنے انوارِ علمیہ سے منور کرنا شروع کیا۔ ہندوپاک میں آج کل جس قدر علمی شمعیں روشن ہیں ان میں بہت حد تک ان ہی جناب کے فیوض و برکات شامل ہیں۔ انھوں نے علمِ کلام میں پانچ جلدوں کے اندر ایک عظیم الشان کتاب بنام عماد الاسلام تحریر فرمائی جس کی تین جلدیں کتاب التوحید، کتاب العدل، کتاب النبوۃ چھپ کر دنیائے علم و فضل سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ لیکن افسوس کہ اس کی باقی دو جلدیں کتاب الامامت و کتاب المعاد آج تک منظر عام پر نہ آسکیں۔ وہ مسودے کی شکل میں اب تک قوم شیعہ کے جمود و خمود کا مرثیہ پڑھ رہی ہیں۔ ہم مرحوم کے عقیدت مندوں اور قوم کے مخیر حضرات، دردِ مذہب و ملت رکھنے والے افراد سے بالعموم اور ان کے اخلاف و اقارب سے بالخصوص التماس کریں گے کہ وہ ان کی طباعت کی طرف خصوصی توجہ مبذول فرما کر اس علمی خزانہ کو قوم کے ہاتھوں تک پہنچانے کا کوئی جلد انتظام و اہتمام فرمائیں۔ ان اللہ لایضیع اجر المحسنین۔ (قرن سیزدہم)

⑥② سید محمد بن السیّد دلدار علی المعروف بہ سلطان العُلماء: یہ جلیل القدر عالم جناب غفران مآب مولانا سید دلدار علی صاحب کے خلف رشید تھے۔ انھوں نے بھی اپنے والد بزرگوار کی طرح علم کلام کی بڑی خدمت کی اور اس میں گرانقدر آثار چھوڑے۔ ان میں سے مندرجہ ذیل کتب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ① طعن الرماح (یہ کتاب تحفہ اثنا عشریہ کے بعض ابواب کا جواب باصواب ہے) ② ضربت حیدریہ بجواب شوکت عمریہ بارقۂ ضیغمیہ وغیرہا۔ (اواخر قرن سیزدہم)

⑥③ سید حسین بن سید دلدار علی معروف بہ سید العُلماء: یہ عالم جلیل و فاضل نبیل بھی جناب

غفران مآب کے خلف صدق تھے۔ انھوں نے بھی اپنے والد معظم اور برادرِ مکرم کی طرح علم کلام کی بڑی خدمت کی اور قابلِ قدر کتب تصنیف فرمائیں۔ جیسے حدیقۂ سلطانیہ، افاداتِ حسینیہ وغیرہما۔ (اواخر سیزدہم)

۶۴ سید محمد قلی بن سید محمد حسین النیشاپوری لکھنوی: یہ جناب غفران مآبؒ کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے۔ اور بہت بزرگ مرتبہ عالم اور متکلم متبحر تھے۔ انھوں نے اعلائے کلمۃ الحق کے لیے بڑے قلمی ولسانی جہاد کیے۔ انھوں نے علم کلام میں متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں، جو اکثر وبیشتر تحفہ اثناعشریہ کے مختلف ابواب کے جوابات پر مشتمل ہیں۔ جیسے سیف ناصری، تقلیب المکائد، برہانِ سعادت وغیرہا۔ (متوفی قرن سیزدہم ۱۲۶۰ھ)

۶۵ مرزا محمد الدہلوی المتخلص بالکامل معروف بہ شہید رابع: یہ بزرگوار بہت بڑے عالم شہیر وطبیب قدیر اور مجاہد کبیر تھے۔ ان کے مصنّفات جلیلہ میں سے کتاب "نزہۂ اثناعشریہ" ہے۔ یہ جلیل القدر کتاب بارہ جلدوں میں ہے۔ جس کی بعض جلدیں زیورِ طبع سے آراستہ ہوچکی ہیں اور بعض مجلّدات تاحال منظر عام پر نہیں آسکیں۔ یہ کتاب تحفۂ اثناعشریہ کا مکمل ومدلل جواب باصواب ہے۔ بعض ثقہ لوگوں کا بیان ہے کہ مصنّف ممدوح نے یہ کمال کیا کہ جن دنوں شاہ عبدالعزیز تحفہ کی تالیف (بلکہ سرقہ) میں مشغول تھا تو انھیں اس کا پتا چلا، انھوں نے کسی آدمی کے ذریعے سے یہ انتظام کیا کہ ہر روز جو مقدار شاہ عبدالعزیز لکھتا وہ اسے نقل کرکے ان کی خدمت میں پہنچادیتا، اور یہ اس کا جواب باصواب لکھ دیتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جوں ہی کتاب تحفہ اثناعشریہ جو کہ بارہ ابواب پر مشتمل ایک جلد ہے، چھپ کر منظر عام پر آئی تو اس کا بارہ جلدوں میں مکمل جواب بنام نزہۂ اثناعشریہ منصۂ شہود پر آگیا۔ کہتے ہیں کہ اس کا شاہ صاحب پر اتنا اثر ہوا کہ رنج والم میں گھل گھل کر مرگیا۔ کیونکہ جس کتاب کو وہ لاجواب سمجھ رہا تھا اس کے چھپتے ہی اس کا بارہ جلدوں میں مکمل اور مدلل جواب موجود پایا لیکن بموجب ع

اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی

یہ ہی کتاب اس مجاہد کبیر کی شہادت کا باعث بنی۔ ایک متعصب والی ریاست جھجّر نے انھیں علاج معالجہ کے بہانہ سے اپنے ہاں طلب کیا اور پھر زہر سے شہید کرادیا۔ یہ بزرگوار ہندوستان میں شہید رابع کے لقب سے مشہور ہیں۔ (قرن سیزدہم)

۶۶ سید عبداللہ شبر بن سید محمد رضا الکاظمی: یہ سید عالی گوہر جلیل القدر محدث عظیم المرتبت فقیہ اور وسیع النظر متتبع عالم ربانی اور اپنے وقت میں علامہ مجلسی ثانی کے لقب سے مشہور تھے اور کثیر

التصنیف والتالیف تھے۔ انھوں نے علوم شرعیہ میں مُتعدّد کتب جلیلہ تصنیف وتالیف کی ہیں، ان کی کتب کی تعداد ساٹھ سے زائد ہے۔ ان میں سے مندرجہ ذیل کتب علم کلام میں لکھی ہیں:
① حق الیقین دو جلد ② البلاغ المُبین ③ جامع المعارف کی جلد اول اور دوم ④ توحید اور دیگر اصول عقائد میں ہیں۔ (قرن سیزدہم ۱۲۴۲ھ)

۶۷ مرزا ابوالحسن محمد بن سُلیمان تنکابنی: آپ علمائے شیعہ میں ممتاز درجہ رفیعہ رکھتے ہیں۔ اور کثیر التصانیف والتالیف عالم ہیں۔ نیز آپ کو بڑے باکمال اساتذہ اور جہابذہ کی ایک جماعت کثیرہ سے علمی استفادہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ جن کا تذکرہ انھوں نے اپنی کتاب قصص العُلماء میں کیا ہے۔ مُتعدّد علوم وفنون میں کتب تصنیف وتالیف کی ہیں۔ ان کی کتاب قصص العُلماء بہت مشہُور ہے۔ علم کلام میں بھی انھوں نے چند کتب لکھی ہیں، جیسے: ① شرح تجرید فارسی ② الفیہ منظومہ در توحید و عدل ③ منظومہ در امامت ④ منظومہ علم کلام ⑤ رسالہ ہفتاد و دو ملت۔ (قرن سیزدہم)

۶۸ مرزا محمد بن عبدالنبی بن عبدالصانع استرآبادی: یہ عالم جلیل علوم عقلیہ ونقلیہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے اور مختلف علوم وفنون میں اسّی کے قریب کتب نافعہ رائقہ تصنیف وتالیف کیں، جن میں چند علم کلام میں بھی ہیں۔ (قرن سیزدہم)

۶۹ شیخ مہدی بن ابی ذر النراقی: یہ شیخ عالم فاضل کامل بارع جلیل اور فقیہ ومتکلم نحریر اور جامع علوم وفنون تھے۔ علامہ احمد نراقی صاحبِ معراج السعادت واستاد رئیس المجتہدین الشیخ مرتضٰی انصاری قدس سرہٗ کے والد ماجد تھے۔ علاوہ دیگر علوم وفنون کے علم کلام میں ایک بہت نفیس رسالہ مسمّی انس الموحدین مطبوع وموجود ہے۔ یہ شیخ جلیل طالب علمی کے وقت درس وتدریس میں اس قدر انہماک رکھتے تھے کہ جب ان کے گھر سے خطوط آتے تھے تو ان کو پڑھتے نہیں تھے، تاکہ مبادا ان میں کوئی ایسی خبر درج ہو جس کے پڑھنے سے ان کے حواس پراگندہ ہوں اور تعلیم میں حرج ہو۔ حتی کہ ان کے والد ماجد قتل ہوگئے، گھر والوں نے ان کو اس واقعہ ہائلہ کی خبر دی۔ مگر انھوں نے حسب معمُول اس خط کو بھی نہ پڑھا۔ جب کافی دن گزر گئے اور یہ گھر نہ تشریف لے گئے تو اب گھر والوں نے ان کے استاد کو خط بھیجا کہ وہ ان کو اس واقعہ کی اطلاع دیں اور گھر بھی بھیجیں۔ چنانچہ جب درس پڑھنے کے لیے خدمت استاد میں حاضر ہوئے تو ان کو مغمُوم ومہموم پایا۔ سبب دریافت کرنے پر انھوں نے ان سے فرمایا کہ تمھارے والد صاحب بیمار یا مجروح ہیں۔ تم گھر جاؤ۔ انھوں نے عرض کیا: خدا ان کی حفاظت کرے گا۔ آپ درس دیں۔ بالآخر مجبوراً استاد کو ان کے والد کے قتل ہونے کی تصریح کرنا

پڑی ۔ خلاصہ یہ کہ گھر تشریف لے گئے اور وہاں تین دن قیام کر کے تمام امور کا انتظام کیا اور پھر واپس آکر تحصیل علم میں مشغول ہو گئے ۔ اسی طرح پورے تیس سال علم کی تکمیل میں صرف کیے ۔ یہاں تک کہ یگانہ روزگار اور فرید اعصار بن کر افق فضل وکمال پر چمکے اور کاشان کو اپنے فیوض و برکات کی نشر و اشاعت کا مرکز قرار دیا ۔ (فوائد رضویہ جلد ۲ صفحہ ۶۷۰)

ان کی جامع السعادات اور مُشکلات العلوم بہت ہی مشہور اور مُتمتّع بہ کتب ہیں ۔ آج کل کے طلبد ینیّہ ذرا اپنے حالات وکوائف کا ان بزرگوں کے حالات وکوائف کے ساتھ موازنہ کریں جو گھر جانے اور درس میں ناغہ کرنے اور سلسلہ تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر قوم کے لیے بوجھ بننے کے لیے بہانے تلاش کرتے پھرتے ہیں ۔ واللہ الموفق ۔ (۱۲۰۹ھ قرن سیزدہم)

⑦⓪ **سُلیمان بن احمد آل عبد الجبار القطیفی البحرانی:** یہ بہت بڑے فاضل جلیل اور مُحقّق نبیل تھے ۔ دیگر موضوعات کے علاوہ علم کلام میں بھی مُتعدد کتب لکھیں، جیسے :① ارشاد البشر فی شرح الباب الحادی عشر، ② رسالہ در مسئلہ رجعت ③ رسائل در اصولِ خمسہ ④ کتاب الرد علی النصاریٰ وغیرہا (قرن سیزدہم ۱۲۹۶ھ)

⑦① **مرزا حسین بن مرزا محمد تقی النوری الطبرسی معروف بہ محدث نوری:** ان بزرگوار کے تلمیذ رشید ثقۃ الاسلام حضرت الشیخ عباس القمیؒ نے ہدیۃ الاحباب میں ان الفاظ کے ساتھ تذکرہ فرمایا ہے :"شیخنا الاجل الاعظم و عمادنا الارفع الاقوم صفوۃ المتقدمین و المتاخرین خاتم الفقهاء و المحدثین ثقة الاسلام و ناشر آثار الائمة الطاهرينؑ عليهم السلام" ۔ بہر حال ان کی جلالتِ قدر وعظمت شان حد بیان سے باہر ہے ۔ اگرچہ ایک محدث خبیر ونقاد بصیر ہونے کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں مگر وہ علم کلام میں بھی پوری دسترس رکھتے ہیں ۔ چنانچہ ان کی کتاب کشف الاستار عن وجہ الغائب عن الابصار اس امر پر شاہد عدل موجود ہے ۔ حدیث میں ان کی مُستدرک الوسائل اس قدر عظمت کی حامل ہے کہ فقہاء عظام کا فیصلہ ہے کہ استنباط احکام کے وقت جب تک وسائل کے ساتھ اس کی طرف بھی رجوع نہ کر لیا جائے تو اس وقت تک فقیہ اپنے فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا ۔ (متوفی ۱۳۲۰ھ قرن چہاردہم)

⑦② **السیّد اعجاز حسین بن السیّد محمد قلی خان لکھنوی:** یہ بزرگوار بھی اپنے برادر معظم حضرت علامہ السیّد حامد حسین صاحب قبلہ کی طرح بہت بڑے عالم عامل و فاضل کامل اور متکلم ماہر تھے ۔ بعض اہل خبر کا بیان ہے کہ کتاب مُستطاب استقصاء الافحام جو کہ ملا حیدر آبادی کی منتہی الکلام کا مکمل اور مدلل جواب ہے ۔ اسی بزرگوار کے قلم اعجاز رقم کا نتیجہ ہے ۔ لیکن چونکہ سرکار مولانا حامد حسین صاحب قبلہ بھی اس کی

تصنیف میں ان کے ساتھ شریک تھے۔ انھوں نے اس کو انہی کے نام پر شائع فرمادیا۔ واللہ العالم۔ (قرن چہاردہم)

⑬ الشیخ محمد بن الشیخ محمد مہدی الخالصی الکاظمینی: آپ بہت بڑے عالم اجل وفاضل اکمل اور متکلّم ماہر تھے۔ مرحوم حافظ قرآن مجید ہونے کے ساتھ ساتھ حُرفی القول بھی تھے۔ اپنے نظریات کے اظہار میں کسی کی ملامت یا عوام کالانعام کی غوغا آرائی کی مُطلقاً کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے اگرچہ ان کی بعض آراء سے علماء اعلام کو اختلاف تھا اور اہلِ علم کے درمیان ایسے باہمی اختلافات ہوتے ہی رہتے ہیں مگر ان کے نپٹنے کا وہ طریقہ نہیں ہوتا جس طرح بعض جہال نے ان کی مخالفت کی اور سوقیانہ انداز میں اپنی زبان درازی سے کام لیا، وہ کسی طرح بھی اہل علم کے شایانِ شان نہیں۔ بہرحال مرحوم شیخ نے مندرجہ ذیل کتب کے ذریعہ علم کلام کی زرّیں خدمات انجام دیں۔ ① احیاء الشریعہ جلد اول کا اکثر حصّہ خدا در طبیعت۔ یہ کتاب ایک دہریہ کے خلاف لکھی گئی اور الشیخیہ والاسلام وغیرہ۔ (قرن چہاردہم سنہ ۱۳۹۴ھ)

⑭ علی بن عبد اللہ البحرانی: ان کا شمار بحرین کے علمائے کبار میں ہوتا ہے۔ بہت بڑے عالم و متکلّم تھے۔ علم کلام میں انھوں نے دو مُفید کتابیں تصنیف فرمائیں: ① لسان الصدق جو کہ بعض نصرانیوں کی کتاب میزان الحق کا رد ہے۔ ② منار الوریٰ فی اثبات امامۃ الائمۃ الاثنا عشر۔ (اوائل قرن چہاردہم)

⑮ مفتی محمد عباس ابن سید علی شوستری الجزائری اللکھنوی: آپ سید العُلماء مولانا سید حسین و سلطان العُلماء مولانا سید محمد کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے۔ بہت بلند پایہ فقیہ ومتکلّم و بے بدل ادیب، نغز گو شاعر اور کثیر التّصنیف والتالیف مُصنّف تھے۔ علاوہ دیگر علوم وفنون کے علم کلام میں بھی متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں جو اکثر و بیشتر "تحفہ اثنا عشریہ" کے ردود ہیں۔ جیسے صوارم الٰہیات، جواہر عبقریہ وغیرہ۔

جو حضرات حضرت مفتی صاحب کے مکمل سوانح حیات اور ان کی علمی نگارشات کے نمونہ جات دیکھنے کے طلبگار رہیں انھیں ان کی مفصل سوانح عمری تجلیات، نوشتہ مرزا عزیز لکھنوی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ (قرن چہاردہم)

⑯ السیّد حامد حسین بن السیّد مفتی محمد قلی نیشاپوری اللکھنوی: جناب شیخ عباس قمی نے اپنی کتاب ہدیۃ الاحباب صفحہ ۱۷۔ پر ان جناب کا بایں الفاظ ذکر کیا ہے: سید اجل علامہ وفاضل ورع فہام، حجۃ الاسلام والمسلمین ناشر مذہب آبائہ الطاہرین۔ انھوں نے علم کلام کی جو زرّیں خدمات انجام

دیں وہ ماء الذہب سے لکھنے کے قابل ہے۔

عبقات الانوار اسی معدن علم و فضل کے ان جواہر آب دار میں سے ہے جس کی نظیر کتب کلامیہ میں نہیں ملتی اور عرب و عجم کے علماء اس کی تعریف و توصیف بلکہ اس کے عدیم النظیر ہونے میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ چنانچہ صاحب ہدیۃ الاحباب صفحہ ۷۷ پر رقمطراز ہیں: "ہر کس کہ عبقات را مطالعہ کند خواہد دانست کہ در فن کلام سیما در مبحث امامت از صدر الاسلام تا اکنوں احدے بداں منوال سخن نرانده و برآں نمط تصنیف نپرداختہ" جو شخص بھی عبقات کا مطالعہ کرے گا وہ یہ اقرار کرنے پر مجبور ہو جائے گا کہ فن کلام بالخصوص مبحث امامت میں ابتدائے اسلام سے لے کر آج تک کسی متکلم نے ایسا کلام نہیں کیا۔ اور نہ کسی مصنّف نے ایسی طرز کی کتاب لکھی ہے۔ حق یہ ہے کہ صاحبِ ہدیہ نے کتاب کی اس تعریف و توصیف میں کوئی مبالغہ نہیں فرمایا۔ واقعاً یہ کتاب ایسی ہی ہے۔ یہ کتاب تقریباً تیس مجلدات پر مشتمل ہے اور باایں ہمہ خصوصیات تحفہ اثنا عشریہ کے فقط باب ہفتم (جو کہ مسئلہ امامت میں ہے) کا جواب ہے۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ اس کتاب کو شائع ہوئے ہو چکا ہے۔ مصنّف کتاب نے دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ کے تیز حربوں سے اہل باطل کی کمر کو کچھ اس طرح توڑا ہے کہ انھیں آج تک ہنگامہ آرائی اور اس کتابِ جلیل کے جواب پر قلم فرسائی کی جرأت و ہمت نہیں ہو سکی۔ ہاں اب سننے میں آرہا ہے کہ پنجاب ضلع جھنگ کے ایک دینی مدرسہ کے بعض مدرس حضرات اس کتابِ جلیل کے بعض مجلدات کا جواب لکھنے کی لاحاصل سعی کر رہے ہیں۔ خیر جواب تو وہ کیا لکھیں گے کیونکہ جب تک اپنی تمام مذہبی کتب کو صفحہ عالم سے حرفِ غلط کی طرح نیست و نابود نہ کر دیں اس وقت تک اس کتاب کا جواب لکھا جا سکتا ہی نہیں۔ ہاں وہ اپنا مُنہ چڑھانے کی ضرور کوشش کریں گے اور اپنے چیلے چانڈوں سے داد بھی ضرور لیں گے، اگرچہ علمی حلقوں میں انھیں فضیحت و رسوائی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ لیکن ان کی بلا سے، ان کا تو مقصد ہی صرف یہ ہے کہ اتنی بڑی علمی کتاب کے جواب میں قلم فرسائی کریں۔ ع

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا ۱؎

(اوائل قرن چہاردہم)

(۷۷) سید ناصر حسین ابن سید حامد حسین: صاحب عبقات الانوار کے یگانہ روزگار عالم علامہ و فاضل فہامہ خلف رشید اور سب کمالات و آثار میں اس بحر ذخار کے صحیح وارث ہیں۔

کما قال الشاعر:

شرف تتابع کابر عن کابر   کالرمح انبوباً علی انبوب

یہ جناب مدۃ العمر دیگر علمی و تحقیقی مشاغل کے ساتھ ساتھ عبقات الانوار کی تتمیم و تکمیل میں بھی مشغول رہے اور وہ اس سلسلہ میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے اور اس کی چند جلدیں تحریر فرمائیں ۔ افسوس کہ اس علمی ذخیرے کی فقط چند جلدیں اب تک قوم کے ہاتھوں تک پہنچی ہیں ۔ دیگر مجلّدات ایک محفوظ خزانہ کی طرح ابھی تک لکھنؤ کے مشہور عالم کتب خانہ ناصریہ کی زینت بنی ہوئی ہیں ۔ خدا کرے کہ کسی طرح اس کتاب جلیل کی باقی مجلّدات بھی چھپ کر شائقین تک پہنچ جائیں ۔ سنا ہے کہ ایران میں اس کی طباعت کا کام شروع ہو گیا ہے ۔ خدا کرے یہ خبر صحیح ہو، پہلے بھی ایران میں اس کی بعض مجلّدات چھپی تھیں ۔ نہ معلوم کن حالات کی بنا پر یہ سلسلہ مسدود ہو گیا تھا ۔ تقاعد ہم کہ اس دور میں اس کتاب کے ایک جامع خلاصہ کی اشد ضرورت ہے ۔ دیکھیے یہ سعادت کس کے حصہ میں آتی ہے ۔ بہتر ہوتا کہ اسی خاندان کا کوئی چشم و چراغ اس اہم کام کو انجام دے دیتا ۔ (قرن چہاردہم)

برسبیلِ تذکرہ

چونکہ یہاں کتاب "تحفہ اثناعشریہ" کا ذکر آ گیا ہے تو یہاں برسبیل تذکرہ کچھ اس کتاب اور کچھ اس کے جوابات کے بارے میں تبصرہ کر دینا فائدہ سے خالی نہ ہوگا ۔ سو مخفی نہ رہے کہ اگرچہ عوام بلکہ اکثر خواص میں بھی مشہور یہی ہے کہ کتاب تحفہ اثناعشریہ شاہ عبدالعزیز دہلوی کی تصنیف ہے ۔ چنانچہ نزہتہ اثناعشریہ، صارم تبار، سیف ناصری، صوارم الٰہیات اور حسام الاسلام وغیرہ کتب جلیلہ کی تصنیف تک یہی خیال عام تھا کہ یہ کتاب شاہ صاحب موصوف کے قلم باطل رقم کا نتیجہ ہے، لیکن جناب سلطان العلما سید محمد طاب ثراہ کے آخری ایام میں یہ انکشاف ہوا کہ یہ کتاب دراصل صواقع

---

[۱] اڑھائی تین سو صفحہ کا ایک رسالہ بنام "حدیث ثقلین" جو کہ مدرسہ محمدی پور سید شریف ضلع جھنگ کے بعض مدرسین کی کاوش قلم کا نتیجہ ہے جس میں عبقات الانوار کی حدیث ثقلین کے متعلق دو جلدوں کے جواب دینے کی ناکام کوشش کی گئی ہے اور جناب علامہ حامد حسین صاحب نے ناقابل رد دلائل سے جو یہ ثابت کیا تھا کہ حدیث ثقلین میں "کتاب اللہ و عترتی اھل بیتی" کے الفاظ موجود ہیں، مجیب نے بزعم خود اس متواتر حدیث کی سند میں خدشہ واقع کر کے یہ ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے کہ حدیث میں "کتاب اللہ و سنتی" وارد ہے ۔ ہم نے اپنی عنقریب شائع ہونے والی کتاب (ان شاء اللہ) "تحقیقات الفریقین فی حدیث الثقلین" میں اس رسالہ کا تار و پود بکھیر کے رکھ دیا ہے اور ہمت شکن جواب باصواب تحریر کر دیا ہے ۔ امید ہے اب ان کو یارائے سخن آرائی نہ ہوگا ۔ (منہ عفی عنہ)

...... ملا نصر اللہ کابلی کا سرقہ اور اس کا ترجمہ ہے۔ اصل صواقع کا قلمی نسخہ دستیاب ہوگیا تھا جس سے یہ انکشاف ہوا۔ چنانچہ اس وقت سے جو کتابیں تحفہ کے جواب میں لکھی گئیں ان کے حواشی پر صواقع کی اصل عبارات بھی درج کردی جاتی تھیں۔ جس کے بعد یہ بات روزِ روشن سے بھی زیادہ واضح ہوجاتی ہے۔

بہر حال اصل کتاب تحفہ بارہ ابواب پر مشتمل ہے جس کے ہر باب کے جواب میں نزہتہ اثنا عشریہ کی ایک ایک جلد لکھی گئی۔ اس کے علاوہ تحفہ کے مختلف ابواب کے جواب میں علماء شیعہ کثرہم اللہ فی البریہ نے جو جوابات لکھے ان کی تفصیل مع تفصیل ابواب تحفہ درج ذیل ہے:

تحفہ کے باب اول میں شاہ صاحب نے اس کا دعویٰ کیا تھا کہ مذہب شیعہ ایجاد کردہ عبداللہ بن سبا یہودی ہے۔ اس کے جواب میں کتاب سیف ناصری جناب علامہ محمد قلی خان صاحب مرحوم ایک لاجواب کتاب ہے۔

باب دوم تحفہ: بیان مکائد شیعہ میں ہے اس باب کا جواب نزہتہ میں نہیں ملتا مگر جناب علامہ مفتی محمد قلی خان صاحب مرحوم نے تقلیب المکائد میں ایسا مدلل جواب دیا ہے کہ قابل دید ہے۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے جس کو بہت عرصہ ہوا ۱۲۹۲ھ ہجری میں بمقام دہلی چھپی تھی۔

باب سوم تحفہ میں ذکر اسلافِ شیعہ ہے۔ اس کا جواب نزہتہ اثنا عشریہ جلد سوم میں شائع ہوگیا ہے۔ مگر افسوس وہ نسخہ بھی کمیاب ہے۔ صرف کتب خانہ سرکار مولانا السیّد ناصر حسین صاحب قبلہ مرحوم میں موجود ہے۔

باب چہارم تحفہ: اقسام اخبار شیعہ اور احوال رجال اسانید میں ہے اس کا جواب جلد چہارم نزہتہ اثنا عشریہ میں صرف شائع ہوا بلکہ چھپ بھی گیا ہے، اگرچہ وہ بھی نادر الوجود ہے۔

اس کتاب سے علامہ مرحوم کی غزارت علمیّہ کا اور بھی پتا چلتا ہے کہ خدا نے کیسی لیاقت علمی عطا فرمائی تھی۔ کیونکہ باب امامت و مطاعن میں صدہا کتابیں سلف سے آج تک لکھی جا چکی ہیں۔ ان دو موضوعات پر کچھ تحریر کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے بخلاف اس بحث کے ہم جہاں تک جانتے ہیں یہ پہلی کتاب ہے جو اس جامعیت اور معقولیت سے لکھی گئی۔

باب پنجم تحفہ: ذکر الہیات شیعہ میں ہے اس کا جواب بھی مکمل نزہتہ اثنا عشریہ جلد پنجم میں شائع ہو چکا ہے۔ اس سلسلہ سے اور بھی یقین ہوتا ہے کہ باب دوم تحفہ کا جواب بھی علامہ نے ضرور لکھا ہوگا، اگرچہ ہم کو نہیں ملا۔

اس باب پنجم کے جواب میں جناب غفران مآب مولانا السیّد دلدار علی صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ

نے بھی صوارم الٰہیات تحریر فرمائی جو اسی زمانہ میں چھپ گئی تھی۔

باب ششم تحفہ: نبوت کے متعلق ہے جس کا جواب جناب غفران مآب طاب ثراہ نے حسام الاسلام میں تحریر فرمایا۔ اس باب کا جواب نزہتہ میں نہیں ملتا۔

باب ہفتم تحفہ امامت کے متعلق ہے اس کا جواب جناب غفران مآب نے شروع کیا۔ مگر ناتمام رہا۔ پھر جناب مفتی محمد قلی خان صاحب مرحوم نے برہان السعادۃ لکھی اور جناب سلطان العُلماء مرحوم نے بوارق موبقہ اور جناب مفتی محمد عباس صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ نے جواہر عبقریہ تحریر فرمایا اور کتاب مُستطاب عبقات الانوار نے جو تیس جلدوں میں ہے، اس کا ایسا خاتمہ کیا کہ قیامت تک اہل سنت سے اس کا جواب نہیں ہوسکتا۔ مگر افسوس کہ ہنوز یہ کتاب ناتمام ہے اور باوصفیکہ مسودات موجود ہیں مگر ترتیب و تالیف اس کی انجام نہیں پائی۔ خداوند عالم جلد کچھ ایسے اسباب مہیا کرے کہ یہ کتاب مکمل شائع ہوجائے۔ اللّٰھم آمین

باب ہشتم تحفہ امورِ معاد کے متعلق ہے جس کا جواب جناب غفران مآب طاب ثراہ نے احیاء السنّۃ میں تحریر فرمایا ہے۔

باب نہم تحفہ مسائل فقہیہ میں شاہ صاحب نے لکھا تھا۔ جس کا جواب نزہتہ جلد نہم میں دیا گیا یہ کتاب بھی چھپ چکی ہے۔

باب دہم ردِّ مطاعن خلفاء ثلثہ میں ہے۔ جس کا جواب کتاب تشئید المطاعن میں اس شرح و بسط سے مرقوم ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ کیونکر ایسی کتاب لکھی گئی۔ اس باب میں طعن الرماح جناب سلطان العُلماء خاص بحث فدک میں اور بارقہ ضیغمیہ خاص بحث مُتعہ میں قابل دید ہے۔ جس کا جواب رشید الدین خان نے شوکت عمریہ میں لکھا اور اس کا جواب ضربت حیدریہ میں دیا گیا جو دو جلدوں میں ہے۔

باب یازدہم: خواص مذہب شیعہ میں ہے، جس کا جواب مفتی محمد قلی خان صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ نے مصارع الافہام میں تحریر فرمایا۔

باب دوازدہم: تولا و تبرا میں ہے۔ جس کا جواب جناب غفران مآب طاب ثراہ نے ذوالفقار میں تحریر فرمایا۔ جزاھم اللہ احسن الجزآء۔

(۸) سید ظہور حسین لکھنوی: یہ بزرگوار بہت عظیم القدر جلیل الشان عالم و فاضل تھے اور منقول و معقول میں برابر مہارت تامہ رکھتے تھے۔ بالخصوص حسب شنید مُعتبر معقولات میں تو اپنے وقت میں

ان کا کوئی عدیل نہ تھا۔ تمام زندگی تعلیمی وتدریسی اور علمی مشاغل میں گزری۔ مختلف علوم وفنون میں گرانقدر تصانیف بھی چھوڑیں مگر فلک ناہنجار کی کج رفتاری سے اکثر منظر عام پر نہ آسکیں۔ علم کلام میں ان کے بعض رسائل مطبوعہ موجود ہیں۔ جیسے: ① کتاب التوحید ② کتاب العدل ③ کتاب النبوۃ ④ اصولِ کافی کی بڑے علمی رنگ میں شرح لکھنا شروع کی تھی۔ مگر افسوس یہ سلسلہ بعض ابواب کی شرح سے آگے نہ بڑھ سکا۔ (قرن چہاردہم)

(۷۹) سید ابوالقاسم ابن سید حسین الرضوی القمی اللاہوری: بہت بزرگ مرتبہ عالم ومتکلم تھے۔ پنجاب میں ان کی علمی خدمات سنہری حروف کے ساتھ لکھے جانے کے قابل ہیں۔ مرحوم نے علاوہ تفسیر وغیرہ کے علم کلام میں بہت سے کتب ورسائل تصنیف فرمائے۔ ان میں سے مندرجہ ذیل کتب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ① معارف الملۃ الناجیہ والناریہ ② برہان المتعہ ③ عشرہ کاملہ ④ شرح تجرید۔ علاوہ بریں ان کی تفسیر بے نظیر (لوامع التنزیل تیرھویں پارے تک) بھی مباحث کلامیہ کا ایک عمدہ شاہکار ہے۔ (قرن چہاردہم ۱۳۲۴ھ)

(۸۰) سید علی بن سید ابوالقاسم معروف بہ علامہ حائری: آپ مولانا ابوالقاسم رضوی کے خلف رشید ان کے علم وعمل کے صحیح وارث اور بہت بلند پایہ عالم جلیل ومتکلم نبیل تھے۔ مرحوم سید بڑے حُرفی القول تھے۔ دین کے معاملے میں بہت سخت تھے اور کسی قسم کی لومۃ لائم کی پروا نہیں کرتے تھے۔ پنجاب میں اب جو کچھ علمی چہل پہل ہے اس فضا کے بنانے میں مرحوم حائری کی مساعی جمیلہ کو بہت کچھ دخل ہے۔ انھوں نے علم کلام کی بڑی خدمت کی اور اس میں گرانقدر آثار باقیہ چھوڑے۔ جیسے ① "غایۃ المقصود فی احوال المہدی الموعود" چار جلد ② موعظہ حسنہ ③ موعظہ غدیر ④ موعظہ مباہلہ ⑤ فتاویٰ حائری ⑥ منہاج السلامۃ ⑦ بشارات احمدیہ، وغیرہا۔

ان کے علاوہ ان کی تفسیر بے نظیر لوامع التنزیل (جو کہ ان کے والد ماجد کی تفسیر کی تتمیم وتکمیل ہے اور بجائے خود سورۂ قمر تک لکھی گئی ہے) بھی جہاں کتب تفسیر میں ایک بہت بلند اور ممتاز مقام رکھتی ہے بلکہ جامعیت وافادیت میں تمام کتب تفاسیر پر گوئے سبقت لے گئی ہے، وہاں مباحثِ کلامیہ کا بھی اس میں ایک سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن افسوس کہ قوم کے بے حسی اور ناقدردانی کی وجہ سے آج تک یہ پوری تفسیر بے نظیر منظر عام پر نہ آسکی، اور یہ بے نظیر علمی ذخیرہ لاہور کے اندر مرحوم علامہ کے مکتبہ میں ضائع ہو رہا ہے۔ میں نے خود اس کا ملاحظہ کیا ہے۔ بہت بوسیدہ، کرم خوردہ اور خستہ حالت میں ہے۔ اگر کچھ عرصہ اور اسی حالت میں گزر گیا اور اس کی طباعت کا کچھ انتظام

نہ ہوسکا تو پھر وہ نا قابلِ طباعت ہوجائے گی ۔ مرحوم کے صاجزادے جناب سید ابوالفضل صاحب رضوی زید مجدہ حقوقِ طباعت مفت دینے پر تیار ہیں، بشرطیکہ کوئی قابلِ وثوق آدمی اس کی طباعت کے فرائض اپنے ذمے لے لے ۔ شائد ع

مردے از غیب آید و کارے بکند

واللہ الموفق والمعین ۔ (قرن چہاردہم)

(۸۱) سید اسماعیل الطبرسی النوری: یہ بزرگوار فقہ و اصول اور کلام میں مشہور فاضل جلیل ہیں ۔ انھوں نے دیگر فنون کے علاوہ علم کلام میں بھی تین جلدوں میں ایک بڑی عمدہ کتاب موسوم بہ کفایۃ الموحدین تصنیف فرمائی جو کہ ایران میں کئی بار چھپ کر عوام و خواص کے لیے موردِ استفادہ بنی ہوئی ہے ۔ (قرن چہاردہم)

(۸۲) شیخ احمد بن عبداللہ التبریزی الکوزہ کنانی: آپ بڑے جلیل القدر فاضل ہیں ۔ آپ کے آثار جلیلہ سے علاوہ دیگر کتب کے علم کلام میں تین جلدوں میں ایک عظیم الشان کتاب ہدایت الموحدین بھی ہے جو کہ مطبوع و متداول ہے ۔ (قرن چہاردہم)

(۸۳) محمد جواد بن شیخ حسن البلاغی: مرحوم بلاغی کا شمار حوزہ علمیہ نجف اشرف کے علمائے کبار کی صفِ اول میں ہوتا ہے ۔ بہت بڑے عالم و متکلّم و مجاہد تھے ۔ ان کی ساری عمر مذہب اسلام سے دفاع کرنے میں گزری ۔ انھوں نے اسلام کی نصرت و تائید اور نصرانیت وہابیت اور دہریت کی رد میں متعدّد کتابیں تصنیف فرمائیں جو سب کی سب چھپ کر خواص و عوام میں مقبولیت حاصل کر چکی ہیں ۔ جیسے: "الھدیٰ الی دین المصطفیٰ" دو جلد "الرحلة المدرسیہ" تین جلد "رسالۃ التوحید و التثلیث" "نصائح الھدیٰ" وغیرہا ۔ (قرن چہاردہم ۱۳۵۶ھ)

(۸۴) الشیخ محمد حسین بن الشیخ علی آلِ کاشف الغطاء: یہ نابغہ عصر ان علمائے اعلام میں سے تھے کہ جن کی ذات والاصفات پر اسلام و مسلمان جس قدر فخر و مباہات کریں وہ کم ہے ۔ مرحوم شیخ جامع العلوم والفنون شخصیت کے مالک تھے اور تقریر و تحریر ہر دو کے بادشاہ تھے ۔ اور علاوہ دیگر علوم و فنون کے علم کلام میں بھی انھیں پوری پوری دسترس اور مہارتِ تامہ حاصل تھی ۔ انھوں نے متعدّد کتب تصنیف فرما کر اس علم کی افادیت میں معتد بہ اضافہ فرمایا ۔ ان کی مندرجہ ذیل کتب خاص طور پر قابل ذکر ہیں: الدین و الاسلام چار جلد (لیکن آخری دو جلدیں تا حال طبع نہیں ہوسکیں) اصل الشیعہ و اصولھا (اس کا ترجمہ اردو بھی چھپ چکا ہے ہم ہر پڑھے لکھے آدمی سے اس کے مطالعہ کی پرزور سفارش

کرتے ہیں)الایات البینات اور المراجعات الریحانیہ وغیرہا۔(قرن چہاردہم ۱۳۶۴ھ)

(۸۵) سید غلام حسنین کنتوری: آپ بہت جلیل القدر و عظیم المرتبت عالم جلیل و متکلّم نبیل اور علومِ قدیمہ و جدیدہ میں مہارت تامہ رکھنے والے بزرگ تھے اور طبیعین و دہریین کے نظریات فاسدہ کی تردید میں انھیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ سید احمد خان نیچری نے جو مذہب کش تحریک شروع کی تھی آپ اپنی دوربین نگاہوں سے اس کے مضر اثرات کو بھانپ گئے تھے اور اس کے خلاف علمی محاذ قائم کر کے اس کے نظریاتِ فاسدہ کا تار و پود بکھیر کے رکھ دیا۔ آپ نے علم کلام کی بڑی بیش قیمت خدمات انجام دیں اور گرانقدر تصانیف سے اس کی افادیت میں اضافہ فرمایا۔ خاص طور پر ان کی اِنتصار الاسلام ہر سہ جلد بہت مشہُور اور مُفید ہے۔ علاوہ بریں مفارقاتِ حسینیہ و عُثمانیہ مائتین جلد سوم بھی اس سلسلہ میں خاص مقام رکھتی ہیں۔ (قرن چہاردہم)

(۸۶) شیخ عبد العلی الہروی الطہرانی: آپ بہت بلند پایہ فیلسوف و متکلّم اور فاضل تھے۔ پنجاب میں جو کچھ علمی فضا موجود ہے اس میں بہت حد تک اس عالم جلیل کی برکات کا دخل بھی ہے۔ اگر بالفرض آپ کا اور کوئی فیض نہ ہوتا، سوائے سرکار مولانا محمد سبطین صاحب مرحوم کے توان کی عظمت وجلالت کے اثبات کے لیے کافی تھا۔ آپ کی تقاریر عالیہ کا ایک نفیس مجموعہ بنام "مواعظ حسنہ" کئی بار چھپ کر مقبولیت عامہ حاصل کر چکا ہے۔ جو مباحث کلامیہ سے لبریز ہے، اس کتاب اور مولانا سید محمد سبطین صاحب مرحوم کی کتب میں علاوہ اس کے کہ ان کے بیان کردہ معارف، نبوت و امامت میں قدرے افراط موجود ہے۔ ایک نقص اور بھی ہے، اور وہ یہ کہ ان کتب میں بعض غامض اور مُشکل مسائل قدرے مجمل انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ جنھیں کم تعلیم یافتہ طبقہ کما حقہ سمجھ نہیں سکتا، اس لیے بعض ناسمجھ لوگ ان کو پڑھ کر بعض عقائد فاسدہ مثلاً غلو و تفویض کا شکار ہو جاتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ ان کتب کا مطالعہ بڑی دقت نظر اور بیدار مغزی کے ساتھ کیا جائے، تاکہ معارفِ نبوت و امامت کے سلسلہ میں ہر قسم کی افراط و تفریط سے دامن محفوظ رہے۔ واللہ العالم (قرن چہاردہم)

(۸۷) سید نجم الحسن لکھنوی: آپ لکھنو کے اکابر علماء اعلام و فقہائے کرام اور متکلمین عظام میں سے تھے۔ سرکار نجم الملّت نے بھی سرکار ناصر الملّت کے دوش بدوش بہت جلیل القدر علمی خدمات انجام دیں اور ان دو بزرگوں کا باہمی اتفاق و اتحاد بھی ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ دعا ہے کہ خداوند عالم تمام اہل علم کو ایسے اتحاد و اتفاق کی توفیق مرحمت فرمائے۔ علم کلام کے سلسلہ میں مرحوم کا ایک نہایت نفیس و عمدہ رسالہ شریفہ بنام "النّبوۃ و الخلافۃ" نظر قاصر سے گزرا ہے۔ علاوہ بریں دیگر

مختلف موضوعات پر رسائل لکھے ۔ جناب نجم الملّت کو حضرت مفتی محمد عباس مرحوم کی شاگردی و دامادی کا شرف بھی حاصل تھا۔ (قرن چہاردہم)

(۸۸) سید محمد مہدی بن سید محمد صالح کاظمی القزوینی : آپ بہت بلند پایہ عالم و متکلّم اور مجاہد تھے ۔ ان کی ساری زندگی مذہب و ملت کی خدمت میں گزری۔ علم کلام میں بہت سی کتب تصنیف فرمائیں ۔ جیسے: (۱) منہاج الشریعہ جو ابن تیمیہ کی منہاج السنہ کا جواب ہے ۔ (۲) بوار الغالین جو فرقہ غالیہ کے نظریاتِ باطلہ کے ابطال میں عمدہ کتاب ہے (۳) ہدی المنصفین در رد شیخیہ (۴) ذکری الجمہور (۵) ظہور الحقیہ وغیرہا۔ (قرن چہاردہم)

(۸۹) سید علی اظہر کھجوی : آپ صوبہ بہار کھجوہ کے بہت بزرگ مرتبہ عالم و متکلّم تھے ۔ نصرتِ مذہب اہل بیتؑ میں متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے (۱) ذوالفقار حیدری (۲) ارسال الیدین اور ان کا جاری کردہ رسالہ (۳) "اِصلاح" جو بحمدہٖ تعالیٰ اب تک جاری و ساری ہے۔ خاص طور پر رسالہ قابل ذکر ہے جس نے جلیل القدر مذہبی خدمات انجام دی ہیں اور دے رہا ہے۔ کثرہ اللہ اشاعتہ (قرن چہاردہم)

(۹۰) سید حشمت علی خیر اللہ پوری : آپ بہت بلند مرتبہ عالم دین و محافظ شرع مبین تھے ۔ پنجاب میں ان کی خدمات دینیّہ کی فہرست طویل ہے۔ علم کلام میں انھوں نے متعدد رسالے تصنیف فرمائے جن میں سے رسالہ معراجیہ غایت المرام فی ضرورۃ الامام خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ (قرن چہاردہم)

(۹۱) السیّد عبد الحسین آلِ شرف الدین الموسوی العاملی : بڑے بلند پایہ عالم و متکلّم و مجاہد تھے ۔ ساری عمر مذہبِ حق کی نصرت اور دینِ اسلام کی خدمت میں گزری ۔ اور علم کلام میں متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں جو فریقین سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں ۔ جیسے "المراجعات" یہ ان کی ایک مصری عالم سے مسئلہ امامت پر باہمی خط و کتابت کی تفصیلی روئیداد پر مشتمل ہے اور بڑی عمدہ و دلچسپ کتاب ہے۔ فارسی اور اردو میں بھی اس کے تراجم چھپ چکے ہیں ۔ "الفصول المہمہ فی تالیف الامہ" "اجوبہ مسائل جار اللہ" "حول الرؤیہ" وغیرہا۔

ان کے علاوہ مرحوم کی اور بھی بہت سی گرانقدر تالیفات تھیں جو بعض حوادثِ روزگار کا شکار ہو گئیں ۔ جس کا تذکرہ مرحوم نے اپنی بعض تصانیف میں بڑے دردناک الفاظ میں کیا ہے ۔

(اواخر قرن چہاردہم ۱۳۷۹ھ)

(۹۲) السیّد محسن بن سید عبد الکریم المعروف بہ علامہ سید محسن امین عاملی : یہ وہی باغیرت فرزند اسلام اور بطل حریت عالم شہیر و مجاہد کبیر ہے کہ جب اس نے ایک مصری عالم کے متعلق یہ سنا کہ وہ کہتا

ہے کہ: مذہب شیعہ میں علمی یا مالی لحاظ سے کوئی بلند شخصیت نہ گزری ہے اور نہ اب ہے، تو اس غیور عالم جلیل نے اتنی سی بات سے متاثر ہو کر کتاب لاجواب "اعیان الشیعہ" لکھنا شروع کر دی، جو کئی سال کی مسلسل کد و کاوش کے بعد چونتیس مجلّدات تک پہنچی تھی کہ مرحوم مُصنّف کا انتقال ہوگیا۔ ان کے لائق فرزند ارجمند جناب سید حسن الامین نے اس کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا۔ موصوف اب تک اس کی مزید بیس مجلّدات لکھ چکے ہیں۔ مجموعی طور پر چوّن جلدیں ہو چکی ہیں اور ہنوز تکمیل کی منزل دور ہے۔ وفقہ اللہ للاتمام۔

یہ بزرگوار بہت کثیر التصنیف والتالیف ہیں۔ علاوہ دیگر موضوعات کے علم کلام میں بھی کئی کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں سے مندرجہ ذیل کتب خاص اہمیت کی حامل ہیں:
(۱) نقض الوشیعہ (۲) البرہان علی وجود صاحب الزمانؑ (۳) اقناع اللائم فی اقامۃ الماتم۔ علاوہ بریں مجلّدات معادن الجواہر فی علوم الاوائل والاواخر بھی مباحث کلامیہ سے لبریز ہیں۔ علاوہ بریں اعیان الشیعہ مجلّد اول کا مُعتدبہ حصّہ مباحثِ کلامیہ پر مشتمل ہے۔ (اواخر قرن چہاردہم)

(۹۳) سرکار مولانا سید محمد سبطین صاحب سرسوی
(۹۴) مولانا سید محمد ہارون صاحب زنگی پوری
(۹۵) مولانا محمد رضی صاحب زنگی پوری
(۹۶) مولانا سید راحت حسین صاحب گوپالپوری
(۹۷) مولانا سید علی حیدر صاحب کھجوی۔ (قرن چہاردہم)

یہ پانچوں بزرگوار بڑے جلیل القدر عالم و متکلّم تھے۔ انھوں نے بہت عظیم الشان خدماتِ دینیہ انجام دیں، اور اپنی گرانقدر کتبِ کلامیہ سے علم کلام کے لٹریچر میں بہت مُفید اضافہ فرمایا۔ اول الذکر مرحوم کی خلافتِ الٰہیہ ہر سہ جلد مصحف ناطق ہر سہ جلد، اسلامی نماز اور الصراط السوی، نیز ان کا علمی اور تحقیقی رسالہ البرہان اور ثانی الذکر مرحوم کی کتاب توحید القرآن، امامت القرآن، علوم القرآن اور ثالث الذکر مرحوم کی ابطالِ مادیت، فوز الشیعہ، کشف الظلام اور رابع الذکر مرحوم کی کتاب بسط الیدین ماخذ ہذا صفاتِ ثبوتیہ اور خامس الذکر مرحوم کی جواہر قرآن اور تصویر عزا خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ شکر اللہ مساعیہم الجمیلۃ۔

(۹۸) حافظ علی محمد:

(٩٩) حکیم امیر الدین: یہ ہر دو بزرگوار علومِ عربیہ کے ماہر اور جید عالم دین تھے اور ثانی الذکر تو حکمتِ یونانی میں بھی مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ ہر دو بزرگوار پہلے بڑے متعصب سنی تھے۔ مکمل بارہ سال مذہبی تحقیقات میں صرف کیے۔ اسلام کے تقریباً ہر فرقہ کی مذہبی کتب کا مطالعہ کیا، علماء سے مناظرے و مباحثے کیے۔ اس طویل مباحثہ و مجاہدہ کے بعد بموجب ارشادِ قدرت: والذین جاهدوا فینا لنهدینهم سبلنا۔ (سورۃ العنکبوت: ٦٩)

ان پر یہ حقیقت واضح و آشکار ہوئی کہ تمام ادیانِ عالم میں دین اسلام برحق ہے اور پھر مذاہب اسلام میں سے مذہب شیعہ خیر البریہ صحیح مذہب ہے۔ چنانچہ انھوں نے بلاخوف لامۃ لائم اپنے تشیع کا اعلان کر دیا۔ ان کی بڑی مخالفت ہوئی۔ ہر طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہونے لگی مگر ان کے کوہِ عزم و ثبات میں کوئی تزلزل واقع نہ ہوا۔ پہلے تو فرداً فرداً سب کو اپنی تبدیلی مذہب کے حقیقی علل و اسباب بتاتے رہے لیکن جب یہ سلسلہ طوالت پکڑ گیا تو دونوں بزرگواروں نے مل کر اپنی بارہ سالہ تحقیقات کا نچوڑ "فلک النجاۃ فی الامامۃ والصلوٰۃ" ایسی جلیل القدر و عظیم الشان کتاب کی شکل میں شائع کر دیا۔ جس نے ہمیشہ کے لیے قال وقیل کا دروازہ بند کر دیا۔ آج ہم فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ اس عظیم کتاب کو شائع ہوئے ربع صدی سے زائد عرصہ گزر چکا ہے مگر تا حال کوئی مخالف اس کا جواب نہیں لکھ سکا۔ حضرت مولانا امیر الدین صاحب مرحوم کا ایک رسالہ بھی اس موضوع پر موجود ہے، بنام "ابطال الاستدلال لاہل الزیغ والضلال"۔

مرحوم بڑے عبادت گزار اور خلیق و ملنسار تھے۔ (اواخر قرن چہاردہم)

علمائے عصر دامت برکاتہم

علمائے معاصرین کی ایک جمع کثیر و جم غفیر اپنی بضاعت و استطاعت کے مطابق علم کلام میں خدمات جلیلہ انجام دینے میں مشغول و منہمک ہے۔ زاد اللہ توفیقاتهم۔

ان کے اسماء گرامی کی فہرست بہت طویل ہے اور مضمون خلاف توقع بہت لمبا ہو چکا ہے۔ نیز اور بعض وجوہ کی بنا پر ان کے اسی اجمالی بیان پر ہی اکتفا کی جاتی ہے۔ دعا ہے کہ خداوند عالم ان سب حضرات کی توفیقات خیر میں اضافہ فرمائے اور انھیں بیش از پیش خدماتِ دینیہ انجام دینے اور علم کلام کو بامِ عروج تک پہنچانے کے لیے مؤید و مسدد فرمائے۔ ع

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

مُختصر سوانح حیات حضرتؒ شیخ صدوقؒ علیہ الرحمہ

اس عالم ربانی و فاضل صمدانی، نقاد اخبار و ناشر آثار ائمہ اطہار شیخ القمیین، رئیس المُحدّثین صدوق العُلماء البارعین کا اسم گرامی محمد بن علی بن حسین بن موسیٰ بن بابویہ القمی اور کنیت ابو جعفر اور مشہور لقب "شیخ صدوق" ہے۔ یہ بزرگوار وہی ابن بابویہ ہیں جن کی روایت کردہ احادیث عام کتب حدیث میں ملتی ہیں اور ان کا نام صفِ علماء میں کالشمس فی رابعۃ النہار مشہور و معروف ہے۔

آپ کی ولادت حضرت صاحب العصر والزمان کی دعا سے ہوئی

حضرت شیخ طوسی اور دیگر بعض اعلام نے نقل کیا ہے کہ حضرت شیخ صدوق علیہ الرحمہ کے والد ماجد جناب شیخ علی بن حسین کی شادی اپنے عم محترم محمد بن موسیٰ بن بابویہ کی دختر نیک اختر سے ہوئی تھی لیکن ان سے ان کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ چنانچہ انھوں نے جناب ابوالقاسم حسین بن روح نوبختی (جو کہ حضرت قائم آلِ محمدؐ کے تیسرے نائب خاص تھے) کی خدمت میں مکتوب ارسال کیا کہ وہ حضرت صاحب العصر والزمان کی خدمت میں عرض کریں کہ وہ بارگاہِ ایزدی میں سفارش کریں کہ خداوند عالم ان کو ایسی اولاد عطا فرمائے جو فقیہ ہو۔ چنانچہ آپ نے آں جنابؑ کی خدمت میں شیخ کی استدعا پیش کی۔ ناحیہ مُقدّسہ سے جواب ملا کہ ہم نے بارگاہِ الٰہی میں دعا کی ہے، مگر اس بیوی سے ان کی اولاد نہ ہوگی۔ لیکن عنقریب ان کو ایک دیلمیہ کنیز دستیاب ہوگی جس سے ان کو دو فقیہ بیٹے عطا ہوں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور وہ دو فرزند ایک یہی جناب شیخ محمد بن علی اور دوسرے ان کے بھائی حسین بن علی متولد ہوئے۔ جب پڑھنے لکھنے کے قابل ہوئے تو ان کی ذہانت و فطانت اور قوتِ حافظہ اس قدر تیز تھی کہ جو کچھ دوسرے طلبہ یاد نہیں کر سکتے تھے، یہ اسے بآسانی حفظ کر لیتے تھے۔ لوگ ان کی قوتِ حافظہ سے تعجب کرتے اور پھر کہتے: یہ خُصُوصی امتیاز ان کو حضرت امام عصر علیہ السلام کی دعائے مبارکہ کی وجہ سے حاصل ہوا۔ (روضات الجنات)

حضرت شیخ صدوق کی جلالت قدر و عظمت شان علماء اسلام کی نگاہ میں

رئیس المُحدّثین کی جلالت قدر و عظمت شان محتاجِ بیان نہیں ہے بلکہ وہ آفتاب آمد دلیل آفتاب کی مصداق ہے۔ تاہم دو چار اعلام کی تصریحات پیش کی جاتی ہیں۔

حضرت شیخ الطائفہ شیخ طوسی علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب فہرست صفحہ ۱۵۶، ۱۵۷ طبع نجف میں تحریر فرمایا ہے:

محمد بن علی بن حسین بن موسی بن بابویہ القمی جلیل القدر یکنی ابا جعفر کان جلیلا حافظا للاحادیث بصیرا بالرجال ناقداً للاخبار لم یر مثلہ فی القمیین فی حفظہ و کثرۃ علمہ لہ نحو ثلاث ماۃ مصنف و فہرست کتبہ معروف

یہ شیخ جن کی کنیت ابو جعفر ہے، بڑے جلیل القدر اور حافظ حدیث، علم رجال کے ماہر، اخبار کے ناقد تھے۔ اہلِ قم میں (جو کہ ہمیشہ سے مرکز علم و علماء رہا ہے) ان کے مثل کوئی عالم کثرتِ حفظ اور کثرتِ علم کے لحاظ سے نہیں دیکھا گیا۔ ان کی تصانیف قریباً تین سَو ہیں۔ اور ان کی فہرستِ کتب مشہور ہے۔ حضرت علامہ حلی علیہ الرحمۃ خلاصۃ الرجال میں صفحہ...... پر ان کے متعلق لکھتے ہیں:

محمد بن علی بن حسین بن موسیٰ بن بابویہ القمی ابوجعفر نزیل الری شیخنا و فقیہنا و وجہ الطائفۃ بخراسان و رد بغداد سنۃ خمس و ثلاثماۃ و سمع منہ شیوخ الطائفۃ و ہو حدیث السن کان جلیلا حافظا للاحادیث بصیراً بالرجال ناقد اللاخبار لم یر فی القمیین مثالہ فی حفظہ و کثرۃ علمہٖ لہ نحو من ثلاثمائۃ مصنف ذکرنا اکثرہا فی کتابنا الکبیر

حضرت شیخ حر عاملی اعلیٰ اللہ مقامہ نے امل الآمل میں صفحہ ۶۵ پر ان کے متعلق شیخ طوسی، علامہ حلی اور نجاشی کی عبارات کے نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

محمد بن علی بن الحسین بن موسی بن بابویہ القمی یکنی ابا جعفر کان جلیلا حافظا للاحادیث بصیر بالرجال ناقداً اللاخبار و لم یر فی القمیین مثلہ فی حفظہ و کثرۃ علمہ لہ نحو من ثلاثماۃ، مصنف قالہ الشیخ و العلامۃ و النجاشی

ان تمام عبارات کا مطلب تقریباً وہی ہے جو حضرت شیخ طوسی علیہ الرحمۃ کی عبارت کا ہے۔

حضرت شیخ عباس قمی علیہ الرحمۃ نے فوائد رضویہ جلد ۲ صفحہ ۵۰۵ میں ان کے حالات کی ابتداء ان الفاظ کے ساتھ کی ہے:

محمد بن علی بن الحسین بن موسی بن بابویہ القمی ابًا و الدیلمی امًا، ابوجعفر العالم الجلیل و المحدث النبیل نقاد الاخبار و ناشر آثار الائمۃ الاطہار علیہم السلام عماد الملۃ

والمذھب والدین شیخ القمیین و ملاذ المحدثین شیخ مشائخ الشیعة و رکن من ارکان الشریعة و شیخ الحفظه و وجه الطائفة المستحفظه رئیس المحدثین و الصدوق فیما یرو یه عن الائمة الطاھرین صلوات اللہ علیھم اجمعین

بہرحال آپ بہت بڑے ثقہ متورع عالم دین اور حافظ و ناشر احادیث سید المرسلینؐ و آلہ الطاہرینؑ تھے۔ آج جو کچھ ائمہ طاہرینؑ کے آثار و اخبار ہمارے پاس موجود ہیں ان کا کافی حصہ آپ کے قلم مبارک کے برکات کا نتیجہ ہے۔

جناب نے شیعیانِ رَے کی خواہش پر اپنے افادات کا مرکز شہرِ رَے کو قرار دے کر وہیں رحل اقامت ڈالا تھا، اور وہیں تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے۔ اور خراسان بلکہ کوفہ و بصرہ، مصر و مدائن اور قزوین وغیرہ کے شیعہ، آپ کے ہی فتاویٰ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اور آں جناب سے ہی مسائل دینیہ دریافت کر کے ان پر عمل کرتے تھے۔ چنانچہ جناب نے ان کے جوابات میں بعض رسائل بھی لکھے ہیں جن کے نام آپ کی فہرست وکتب میں مرقوم ہیں۔

آپؒ کی تصنیفات و تالیفاتؒ

اوپر علمائے اعلام کا کلام حق ترجمان نقل ہو چکا ہے کہ حضرت شیخ صدوق کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد قریباً تین سو ہے۔ لیکن مقام افسوس ہے کہ ان میں سے اکثر حوادث زمانہ کا شکار ہوگئیں۔ جو کتب فی الحال موجود اور موردِ استفادہ ہیں ان کے نام یہ ہیں:

① من لا یحضرہ الفقیہ۔ یہ ہماری ان کتبِ اربعہ میں سے ایک کتاب ہے جن پر مدارِ تشیّع ہے۔ ② عیون اخبار الرضاؑ ③ معانی الاخبار ④ کتابُ الخصال ⑤ کتابُ الامالی ⑥ اکمال الدین و اتمام النعمۃ ⑦ علل الشرائع ⑧ ثوابُ الاعمال ⑨ عقابُ الاعمال ⑩ کتابُ التوحید ⑪ صفاتُ الشیعہ ⑫ حقوق الاخوان ⑬ فضل الشیعہ ⑭ رسالہ عقائد شیعہ

آپ کی وفات اور ایک کرامت کا ظہور

آپ کی وفات ۳۸۱ھ میں ہوئی۔ حضرت شہزادہ عبدالعظیم حسنی کے مضافات میں شہرِ رَے میں مدفون ہوئے۔ آج کل وہاں ایک عالی شان قبہ اور عمدہ باغیچہ موجود ہے اور وہاں بعض اور اعلام کی قبور بھی موجود ہیں۔

اس کرامت کی تفصیل جس طرح کہ روضات الجنات میں مرقوم ہے، یہ ہے کہ قریباً ۱۲۳۸ھ میں جب کہ ایران میں فتح علی شاہ قاچار مرحوم کی بادشاہت تھی، بارش کی شدت کی وجہ سے آپ کے مرقد مُقدّس میں شگاف پڑ گیا۔ اس کی اصلاح کی غرض سے معمار مقبرہ میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ نیچے ایک سرداب میں حضرت شیخ مدفون ہیں۔ ان کی نعش مبارک بالکل صحیح سلامت موجود ہے، سوائے شرمگاہ کے دوسرا جسم ننگا ہے۔ بڑے جسیم و وسیم ہیں۔ انگلیوں پر مہندی کے نشانات تک موجود ہیں۔ جسم کے اردگرد کفن کے کہنہ ٹکڑے فتیلوں کی شکل میں پڑے ہیں۔ یہ خبر طہران میں مشہور ہوگئی، حتی کہ مرحوم فتح علی شاہ قاچار تک بھی پہنچی۔ چنانچہ وہ امراء و اعیانِ سلطنت کے ہمراہ وہاں پہنچے۔ عمائد و اعیان نے بادشاہ کا اندر داخل ہونا قرینِ مصلحت نہ دیکھا۔ مگر دوسرے امناء و اعیان داخل ہوئے اور حقیقت الامر کی تصدیق کی۔ پھر قبر کی اِصلاح کر دی گئی اور ملک معظم کے حکم سے اس پر ایک عالی شان مقبرہ تعمیر کیا گیا اور یہ واقعہ علماء کرام اور ثقات عظام بلکہ تمام خواص و عوام میں اس قدر مشہور ہے کہ اس کے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ اعلیٰ اللہ مقامہ فی فرادیس الجنان۔

رسالہ اعتقادیہ اور اس کی پیشِ نظر شرح پر مُختصر تبصرہ

حضرت شیخ صدوق کا رسالہ اعتقادیہ ہر قسم کی تعریف و توصیف سے اجل و ارفع ہے اور جس وقت سے یہ لکھا گیا ہے برابر ہر دور میں علماء اعلام و فضلائے عظام کے لیے مورد استفادہ و استفاضہ اور ان کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ بڑے بڑے علماء اعلام نے اس کی شرحیں لکھی ہیں اور مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے کیے ہیں۔ اس کے مندرجات کی صحت و جامعیت اور وثاقت کے لیے یہی امر کافی ہے کہ شیخ الطائفہ شیخ طوسی علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب میں "کتاب دین الامامیہ" سے تعبیر فرمایا ہے۔

خریت فن رجال: عالم ربانی آغا بزرگ طہرانی اعلیٰ اللہ مقامہ نے اپنی کتاب الذریعہ الیٰ تصانیف الشیعہ جلد ۲ صفحہ ۲۲۶ طبع نجف میں اس رسالہ کے متعلق لکھا ہے:

الاعتقادات للشیخ ابی جعفر محمد بن علی بن الحسین بن موسی بن بابویہ القمی المتوفی بالرای ۳۸۱ سنہ طبع مکرراً اولہ الحمد للہ رب العلمین وحدہ لا شریك لہ املاہ فی نیشابور فی مجلس یوم الجمعۃ ثانی عشر شعبان ۳۶۸ سنہ ھ لما سالہ المشائخ الحاضرون ان یملی علیھم وصف دین الامامیۃ علی وجہ الایجاز ولہ اسماہ السیخ فی الفھرس بدین الامامیۃ ذکر فیہ جمیع اعتقادات الفرقۃ

الناجية الضرورية منها وغير الضرورية الوفاقية منها و غير الوفاقية وله شروح و ترجمة نذكرها في خالها

یعنی رسالہ اعتقادیہ مولفہ شیخ ابو جعفر...... کئی مرتبہ طبع ہو چکا ہے جس کی ابتداء اس طرح ہے: الحمد لله رب العالمين وحده لا شريك له...... حضرت شیخ نے بتاریخ بارہ شعبان ۳۶۸ھ بروز جمعہ اسے لکھوایا تھا، جبکہ علماء حاضرین نے آپ سے استدعا کی تھی کہ مختصر طور پر مذہب امامیہ کے عقائد و اصول ان کو لکھوادیں۔ اسی بنا پر حضرت شیخ طوسی علیہ الرحمۃ نے فہرست میں اسے "دین امامیہ" سے موسوم کیا ہے۔ اس رسالہ میں حضرت شیخ نے فرقہ ناجیہ کے تمام اعتقادات کو بیان کیا ہے، خواہ وہ ضروری ہوں یا غیر ضروری، اتفاقی ہوں یا غیر اتفاقی۔ اس کی بہت سی شرحیں اور ترجمے ہیں، جن کا ہم مناسب مقامات پر ذکر کریں گے۔ جیسا کہ حضرت آغا بزرگ صاحب طہرانی نے فرمایا ہے۔ یہ درست ہے کہ رسالہ اعتقادیہ میں بعض مختلف فیہ مسائل بھی موجود ہیں۔ ایسا نہیں کہ آیاتِ محکمات کی طرح اس کا بیان کردہ ہر ایک عقیدہ بلاچون وچرا اور بلا تاویل وتامل واجب القبول ہو۔ ہاں وہ اختلافی عقائد "النادر کالمعدوم" کا حکم رکھتے ہیں۔ کما لا یخفی علی الناظر الخبیر۔ اس رسالہ شریفہ کا موجودہ بامحاورہ ترجمہ ہمارے ایما پر قوم کے مشہور محقق نوجوان مولوی سید منظور حسین بخاری مولف سیاست معاویہ ویزید وغیرہ کے قلم کا نتیجہ ہے اور ہم نے اس پر نظر ثانی کر کے جابجا مناسب اصلاح کر دی ہے۔

اس رسالہ کے متعدد شروح وحواشی میں سے ایک شرح یہی احسن الفوائد بھی ہے جس کا یہ مقدمہ لکھا جارہا ہے۔ اس شرح کی جامعیت وافادیت اور اس کی تحقیقات کا صحیح اندازہ تو حضرات اہلِ علم مطالعہ کے وقت ہی لگائیں گے، ہم اس کے متعلق کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتے۔ کیونکہ اس میں خودستائی کی بو آتی ہے۔ "مشک آنست کہ خود ببوید نہ عطار بگوید"۔ البتہ اظہار حقیقت اور شکرانہ نعمت کے طور پر اتنا عرض کرنا شاید بے جانہ ہو کہ اس شرح کے ذریعہ شیعہ علم کلام میں ایک معتد بہ اضافہ ہوگا۔ اور طریقہ بیان اس پر شاہد ہے۔ ہر ہر موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور عقلی ونقلی دلائل قاطعہ وبراہین ساطعہ قائم کیے گئے ہیں۔ اختلافی مسائل وعقائد میں علماء متقدمین و متاخرین کے تحقیقات ونظریات کا لب لباب پیش کیا گیا ہے۔ ہر ہر موضوع پر ملاحدہ ومنکرین کے جملہ شکوک وشبہات کو عقلی ونقلی علوم قدیمہ وجدیدہ کی روشنی میں زائل کیا گیا ہے۔ اور تمام موضوعات پر شیعہ اصول وعقائد کی برتری ثابت کی گئی ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہ کتاب بفضلہٖ تعالیٰ مسائل اصولیہ وکلامیہ میں قرآن کریم ،احادیث معصومینؑ اور علماءِ مُتقدمین ومتاخرین کی تحقیقات کا نچوڑ ہے ۔ اس کتاب کے مدلل و مبرہن ہونے کا یہ عالم ہے کہ کوئی بات بھی مُعتبر حوالہ و سند کے بغیر معرض تحریر میں نہیں آئی ۔ الغرض نہ اس نے کسی طالبِ حق و حقیقت کے لیے کوئی عذر چھوڑا ہے اور نہ کسی مخالف و معاند کے لیے کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی رکھی گئی ہے ۔ ان حقائق کی روشنی میں بلاخوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایسی جامع و مکمل کتاب اس سے قبل اگر کسی بھی زبان میں نہیں تو کم ازکم اردو زبان میں تو نہیں لکھی گئی ۔ و ذلك فضل الله يوتيه من يشاء ۔ مگر اس کے باوجود یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ یہ کتاب ہر قسم کے لفظی ومعنوی عیوب واسقام سے خالی ہوگی ۔ بتقاضائے بشریت لفظی یا معنوی خطا کا سرزد ہونا ناممکن نہیں ہے ۔ امید ہے کہ قارئین کرام بقول اقبال ؏

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا

الفاظ کی بجائے معانی و مطالب پر زیادہ توجہ مبذول فرمائیں گے اور اگر کہیں کوئی سقم نظر آئے تو بجائے زبانِ اعتراض دراز کرنے کے ایسے مقامات کی قلم عفو سے اصلاح کریں گے ۔ دعا ہے کہ خداوندعالم ہماری اس ناچیز سعی کو شرفِ قبولیت بخشے،اور اس کے فیض کو یوم القیام تک عام وتام فرمائے ۔

بجاہ القائم من آل العباء و جدہ المصطفیٰ وآلہ البررة الاتقیاء مصابیح الدجی و اعلام الهدیٰ و منار التقی و العروة الوثقیٰ علیہ و علیہم صلوات الملك العلی الاعلیٰ

حررہ المتمسك بالثقلین

الاحقر محمد حسین النجفی

۱۴؍ ذی الحجہ ۱۳۸۴ھ بمطابق ۱۷؍ اپریل ۱۹۶۵ء

دیباچہ طبع ثانی

خدائے کریم کے احسان عمیم سے بطفیل سرکار معصومین صلوات اللہ علیہم اجمعین وہ وقت بھی آگیا کہ ہم "احسن الفوائد فی شرح العقائد" مُفید اضافہ جات اور مزید تحقیقات کے ساتھ دوسری بار ابنائے ملک وملت کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں ......اس کی پہلی اشاعت کے بعد جہاں ہم ان علم دوست اصحاب واحباب کے سپاس گزار ہیں جنھوں نے حد سے زیادہ اس کتاب کی قدر افزائی فرمائی، وہاں ان حضرات کے لیے بھی دعا گو ہیں جنھوں نے نہ صرف تقریر و تحریر کے ذریعہ بلکہ اور بھی مختلف تخریبی صورتوں سے اس کے اور اس کے مُصنّف کے خلاف ہنگامہ آرائی فرمائی ۔ رب اھد قومی انھم لا یعلمون ۔

اس اشاعت میں جہاں تک ممکن تھا اس کتاب کو بہر لحاظ پہلے سے زیادہ مکمل و مدلل اور عام فہم بنانے کی کوشش کی گئی ہے، نیز باطنی حسن کے ساتھ ساتھ ظاہری زیبائش و آرائش کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے ۔ امید واثق ہے کہ علمی وقومی حلقوں میں ہماری اس تازہ پیش کش کو بنظر استحسان دیکھا جائے گا ۔ ان شاء اللہ العزیز ۔

احقر محمد حسین النجفی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَ صَلَّی اللّٰہُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِہِ الطَّیِّبِیۡنَ الطَّاھِرِیۡنَ وَ حَسۡبُنَا اللّٰہُ وَ نِعۡمَ الۡوَکِیۡلُ

باب — باب اول

فی صفة اعتقاد الامامية فی التوحید — توحید باری تعالیٰ کے بارہ میں شیعہ امامیہ کا اعتقاد

(اس باب میں معرفتِ توحید حق نیز خداوند عالم کی ذات وصفات سے متعلق بعض آیات متشابہات کی توضیح وتشریح مذہب امامیہ کے اصول کے مطابق بیان کی گئی ہے۔)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ وَ الصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الۡاَنۡبِیَآءِ وَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ وَ اٰلِہِ الطَّیِّبِیۡنَ الطَّاھِرِیۡنَ الۡمَعۡصُوۡمِیۡنَ وَ لَعۡنَۃُ اللّٰہِ عَلٰی اَعۡدَآئِھِمۡ اَجۡمَعِیۡنَ

تمہید سدید

رسالہ شریفہ وعجالہ لطیفہ معروف بہ "اعتقادیہ حضرت شیخ صدوق علیہ الرحمہ" کی جامعیت و وثاقت اور افادیت، مگر اس کے انتہائی اختصار کے پیش نظر مدتِ مدید وعرصہ بعید سے یہ تمنا تھی کہ اس کی ایک مبسوط ومفصل اور مکمل و مدلل شرح لکھی جائے لیکن ہمیشہ دیگر دینی وملی مشاغل کی کثرت اس نیک مقصد کو عملی جامہ پہنانے سے مانع رہی۔ حتی کہ گزشتہ سال بعض اہلِ علم احباب الطیاب نے بھی اس کی شرح لکھنے پر اصرار فرمایا۔ اپنی دیرینہ تمنا اوران احباب اخیار کے مخلصانہ اصرار نے اس امر پر آمادہ کیا کہ دیگر مشاغل سے کچھ وقت نکال کر اس اہم دینی کام کو انجام دیا جائے۔ چنانچہ بفضلہٖ و عونہ تعالیٰ "احسن الفوائد فی شرح العقائد" لکھنا شروع کر دی ہے۔ سچ ہے: "کل امر مرھون باوقاتہ" امید کامل ہے کہ ہماری اس علمی وتحقیقی پیشکش کو سوائے حاسدین کے باقی تمام طبقات کی طرف سے بنظر استحسان وپسندیدگی دیکھا جائے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ بہر حال "السعی منا والاتمام من اللہ۔"

و ھو حسبی و نعم الوکیل نعم المولیٰ و نعم النصیر

صانع عالم کا وجود بدیہی ہے یا نظری؟

چونکہ سرکار مُصنّف علام قدس سرہٗ نے شاید مسئلہ اثبات صانع کو اس کی بداہت اور اس کے فطری ہونے کی وجہ سے نظر انداز کر دیا ہے۔ جیسا کہ انھوں نے اسی رسالہ کے آٹھویں باب میں اس مطلب کی تصریح فرمائی ہے۔ اس لیے ہم اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اس پر تبصرہ کرتے ہیں۔

مخفی نہ رہے کہ معرفتِ ایزدی کے بدیہی یا نظری ہونے کے بارے میں تین قول ہیں۔

① اول یہ کہ یہ معرفت بالکل بدیہی ہے اور کسی دلیل و برہان کی محتاج نہیں ہے۔

② دوم یہ کہ کچھ بدیہی ہے اور کچھ نظری

③ سوم یہ کہ بالکل نظری و کسبی ہے اور محتاج دلیل و برہان ہے۔

"وخیر الامور اوسطھا" درمیانہ قول ہی اقرب الی الرشد والصواب ہے۔ دوسرے دونوں قول افراط و تفریط کی وجہ سے نا قابل قبول ہیں۔ اس درمیانے قول کا مطلب یہ ہے کہ خدائے رحمٰن ورحیم کی اس قدر اجمالی معرفت تو بالکل بدیہی اور فطری ہے کہ اس عالم کا ضرور صانع علیم اور خالق قدیر و حکیم موجود ہے۔ ہاں البتہ اس کی پوری معرفت کہ آیا وہ واحد ہے یا شریک رکھتا ہے، وہ جسم رکھتا ہے یا نہیں، کسی مکان میں ہے یا لا مکان ہے۔ آنکھوں سے دکھائی دیتا ہے یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ

ان حقائق کی معرفت البتہ نظری اور محتاج دلیل و برہان ہے۔ اس بیان سے ان تمام مختلف آیات و روایات کے درمیان بطریق احسن جمع و توفیق ہو جاتی ہے جن میں سے بعض اس معرفت کی بداہت اور بعض اس کے نظری ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ کما لا یخفٰی۔

خالق کائنات کی ہستی کا اجمالی اِقرار بدیہی ہے

جیسا اوپر بیان کیا جا چکا ہے خلاقِ عالم کی ہستی کا اجمالی ثبوت بدیہی و فطری ہونے کی وجہ سے کسی دلیل و برہان کا محتاج نہیں ہے۔ خدا کی ذات کا اقرار و اعتراف انسان کی اصل فطرت میں داخل ہے۔ "فطرة الله التی فطر الناس علیھا" (روم: ۳۰) جس طرح کل کا جزو سے بڑا ہونا اور اجتماع و ارتفاع نقیضین کا محال ہونا اور فاقد کا معطی شے نہ ہو سکنا یا جس طرح برف کی برودت اور آگ کی حرارت بدیہی و ضروری ہے، اسی طرح یہ امر بھی بدیہی و فطری ہے کہ معلول کا بلا علّت، اثر کا بلا مؤثر، فعل کا بلا فاعل، مصنُوع کا بلا صانع، بنا کا بغیر بانی اور جنایت کا بغیر جانی، صادر ہونا ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے مشرکین کو بھی وجودِ صانع سے یارائے انکار نہ تھا۔ جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے:

وَ لَئِنۡ سَاَلۡتَہُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ لَیَقُوۡلُنَّ اللّٰہُ (سورۃ لقمان:۲۵)

اگر تم ان سے پوچھو کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا؟ تو وہ پکار اٹھیں گے کہ اللہ نے۔

بھلا واجب الوجود اور خالق ہر موجود کے، وجود مسعود ہی میں شک ہو تو پھر کسی شے کا وجود کیونکر ثابت ہوسکتا ہے؟

اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (سورۃ ابراھیم: ۱۰)

"آیا اس خدا کی ہستی میں کوئی شک ہوسکتا ہے جو آسمان و زمین کا خالق ہے"۔

ولقد احسن من قال:

وکیف یصح فی الاذہان شیء اذا احتاج النہار الی الدلیل

یعنی اگر روز روشن بھی دلیل و برہان کا محتاج ہو تو پھر اور کوئی شے کیونکر ذہن میں آسکتی ہے۔

اربابِ معقول جانتے ہیں کہ معرّف اور دلیل کے لیے مدلول و معرف سے اعلیٰ و اعرف اور زیادہ واضح ہونا ضروری ہوتا ہے۔ بنابریں اگر ذاتِ باری تعالیٰ کا اثبات بھی دلیل و برہان کا محتاج ہو تو لازم آئے گا کہ وہ معرّف اور دلیل ذاتِ قادر و قیوم سے زیادہ واضح و روشن ہو۔ حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام دعائے عرفہ میں اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

کیف یستدل علیك بما ھو فی وجودہ مفتقر الیك ایکون لغیرك من الظھور ما لیس لك حتی یکون ھو المظھر لك متی غبت حتی تحتاج الی دلیل یدل علیك......عمیت حین لا تراك علیھا رقیبا الدعاء

"بارِ الٰہا! تجھ پر ان چیزوں سے کس طرح استدلال کیا جاسکتا ہے جو خود اپنے وجود میں تیری محتاج ہیں۔ آیا تیرے غیر کے لیے اس قدر ظہور و وضوح ہے جو تیرے لیے نہیں؟ تاکہ وہ تیرے لیے ظاہر کنندہ قرار پائے۔ یا اللہ! تو کب غائب تھا کہ دلیل کا محتاج ہو؟ وہ آنکھ اندھی ہوجائے جو تجھے اپنے اوپر نگران نہیں دیکھتی"۔

ہر چہ ہست از قامتِ ناساز بے اندام ما است
ورنہ تشریفِ تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

یہی وجہ ہے کہ علم الانسان کے ماہرین نے اس مسئلہ پر بہت بحث و تمحیص کی ہے کہ انسان جب بالکل فطری حالت میں تھا، یعنی جس وقت علوم و فنون اور تہذیب و تمدّن کا نام و نشان نہ تھا، اس وقت اس نے پہلے اصنام کی پرستش کی تھی یا خدا کی؟ مادیین کے سوا، دیگر تمام علماء محققین کا اس امر پر

اتفاق ہے کہ انسان نے پہلے خدا تعالیٰ کی پرستش کی تھی۔ چنانچہ محقق مکس مولر اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

"ہمارے اسلاف نے خدا کے آگے اس وقت سر جھکا یا تھا جب کہ وہ خدا کا نام بھی نہ رکھ سکے تھے"۔

یہی سبب ہے کہ جس زمانہ سے دنیا کی تاریخ معلوم ہے دنیا کے ہر حصہ میں خدا تعالیٰ کا اعتقاد موجود تھا۔ ثوری، مصری، کلدانی، یہود، اہلِ فنشیہ سب کے سب خدا کے قائل تھے۔ پلوٹارک کہتا ہے:

"اگر تم دنیا پر نظر ڈالوگے تو بہت سے ایسے مقام ملیں گے یہاں نہ قلعے ہیں نہ سیاست نہ علم نہ صناعت نہ حرفت نہ دولت۔ لیکن ایسا کوئی مقام نہیں مل سکتا جہاں خدا نہ ہو"۔

(از علم الکلام)

ہاں چونکہ اکثر یہ فطری احساس خارجی اسباب سے دب جاتا ہے، اس لیے خداوند عالم نے جا بجا اسی فطرت کو متنبہ کیا ہے، اور اس کے فرستادگان کا چونکہ سب سے بڑا نصب العین دعوت الی التوحید ہی تھا، اس لیے جب بھی انھوں نے کہیں خالق عالم کے وجود میں شک وریب کے آثار دیکھے، فوراً اسی فطرت انسانیہ کو جھنجوڑا۔ اور تعجب خیز انداز سے خطاب فرمایا:

کما قال عز شانہ: قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ

(سورۃ ابراھیم:۱۰)

"ان کے رسولوں نے فرمایا: کیا تمھیں اس خدا تعالیٰ کے وجود میں شک وشبہ ہے جو زمین و آسمان کا خالق ہے؟"۔

منقول ہے کہ محقق دوانی اثبات واجب الوجود پر ایک رسالہ لکھنے بیٹھے۔ ان کی خادمہ نے ان سے دریافت کیا کہ کس موضوع پر خامہ فرسائی کرنا چاہتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا: اثبات صانع پر! خادمہ نے فوراً یہی آیت پڑھی: أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ۔ بھلا اس خدا کے وجود میں بھی شک ہے جو زمین و آسمان کا خالق ہے۔ دوانی نے قلم رکھ دیا اور اپنے ارادہ کو ترک کر دیا۔

حضرت امام رضا علیہ السلام توحید کے متعلق ایک طویل حدیث شریف کی ابتداء میں فرماتے ہیں: "الحمد للہ الملھم عبادہ الحمد وفاطرھم علی معرفۃ توحیدہ" "سب تعریفیں اس خدا کے لیے ہیں جس نے اپنے بندوں کو اپنی حمد وثنا کرنے کا طریقہ بتلایا اور ان کو اپنی معرفت توحید پر پیدا کیا۔ (کتاب التوحید)

حقیقت یہ ہے کہ خالق عالم کا وجود آفتاب و ماہتاب کے وجود سے بھی زیادہ بدیہی اور

واضح ہے ۔ اور ہرگز کسی دلیل و برہان کا محتاج نہیں ہے ۔ مگر خارجی اسباب واثرات سے بعض اوقات یہ فطری و بدیہی احساس اس قدر دب جاتا ہے کہ محض تنبیہ واشارہ اسے بیدار کرنے کے لیے کافی نہیں ہوتا ۔ اس لیے خدا اور اس کے نمائندگان نے اس پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ تجربی اور حسی مقدمات کے ذریعہ استدلال بھی کیا ہے جس کے کچھ نمونے ابھی ذیل میں پیش کیے جائیں گے ان شاء اللہ ۔ بہرحال چونکہ ہستی باری تعالیٰ کا مسئلہ بالکل فطری اور بدیہی تھا، اس لیے قرآن مجید میں اس پر زیادہ بحث نہیں کی گئی ۔ صرف بعض تنبیہات اور بعض استدلالی اشارات پر اکتفا کیا گیا ہے اور یہی ہونا بھی چاہیے ۔ کیونکہ کسی بدیہی مسئلہ کو موضوع بحث و استدلال بنانا اور اس پر طول وطویل دلائل پیش کرنا جہاں خلافِ حکمت ہے وہاں اس سے ایک سہل و آسان مسئلہ خواہ مخواہ مشکل اور نظری بن جاتا ہے ۔ الغرض اگر فطرت انسانیہ بالکل مسخ نہ ہوجائے تو خالق کائنات کی ہستی کا مسئلہ ہر قسم کے شک وشبہ سے بالا نظر آتا ہے اور اسی طرح فطرتی و بدیہی ہے جس طرح خود اپنے وجود اور اپنی ہستی کا مسئلہ بدیہی ہے ۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

یہاں یہ شبہ پیش کیا جاسکتا ہے بلکہ پیش کیا بھی جاتا ہے کہ اگر صانع عالم کی ہستی کا اقرار انسانی فطرت میں داخل ہونے کی وجہ سے فطری و بدیہی ہے تو پھر منکرین خدا کی یہ ہنگامہ آرائی اور غوغا نوائی کیسی ہے؟ اس شبہ کا ازالہ تین وجہوں سے کیا جاسکتا ہے ۔

① وجہ اول: ابھی اوپر بیان ہو چکا ہے کہ یہ فطری احساس بعض اوقات خارجی اسباب واثرات مثل ماحول وسوسائٹی کی خرابی، غلط تعلیم اور مادیات میں حد سے زیادہ مشغولیت وغیرہ امور کی وجہ سے دب جاتا ہے ۔ جیسا کہ حدیث میں وارد ہے:

"کل مولود یولد علیٰ فطرۃ الاسلام ثم ابواہ یہودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ"

"ہر بچہ فطرتِ اسلامی پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں" ۔

② وجہ دوم: بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی شے کی شدتِ ظہور اور فرطِ وضوح بھی اس کے لیے باعثِ خفا ہوجاتا ہے ۔ جیسا کہ آفتاب اور چمگادڑ کی مثال سے یہ امر واضح ہے: ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

بعض ادعیہ مبارکہ میں اسی امر کی طرف اشارہ ہے: "یا خفیا من فرط الظهور"۔ "اے وہ ذات جو کثرتِ ظہور کی وجہ سے مخفی ہے"۔ بعض دعاؤں میں یہ الفاظ موجود ہیں: "یا من احتجب بفرط ظهوره عن نواظر خلقه" اے وہ ذات جو اپنی شدتِ ظہور کے باعث اپنی مخلوق کی آنکھوں سے اوجھل ہے۔ علاوہ بریں چونکہ اشیاء کی معرفت اور صحیح قدر وقیمت ان کی اضداد سے ہوتی ہے۔ اگر تاریکی نہ ہوتی تو نور کی معرفت نہ ہو سکتی تھی۔ اور نہ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا۔ سچ ہے: "تعرف الاشیاء باضدادها" چنانچہ "قصص اختراعیہ" میں ہے کہ ایک مرتبہ دریا کی سب چھوٹی مچھلیاں مل کر سب سے بڑی مچھلی کے پاس گئیں اور جا کر اس سے یہ استدعا کی کہ ہم مدت سے پانی کا نام سنتی آئی ہیں، ذرا ہمیں اس کا مشاہدہ کرا دیجیے۔ بڑی مچھلی نے کہا: تم پہلے مجھے وہ جگہ دکھا دو جہاں پانی موجود نہ ہو، تا کہ میں تمھیں بتلاؤں کہ یہ پانی ہے۔ (الدین والاسلام) ولقد اجاد من افاد۔ ؎

اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے   خضر کیوں کر بتائے کیا بتائے

بلاتشبیہ حضرت رحمٰن وانسان کا باہمی معاملہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ حضرت انسان نے ابھی عالم رنگ و بو میں قدم بھی نہ رکھا تھا کہ الطاف و مراحم الٰہیہ کی اس پر بارش شروع ہوگئی۔ عالم آب وگل میں آیا تو ذرہ ذرہ میں جمالِ معبود کا جلوہ موجود پایا، اور انوار ربانیہ کے تشعشع نے اس کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ اس لیے وہ بعض اوقات غفلت کا شکار ہو کر اس کے وجود ہی میں تردد کرنے لگا، بلکہ انکار تک نوبت پہنچ گئی۔ مگر ان دو قسم کے لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے معمولی سی تنبیہ کافی ہوتی ہے۔ ؎

چندیں ہزار ذرہ سراسیمہ می دوند
در آفتاب و غافل ازاں کافتاب چیست

(۴) وجہ سوم: منکرین خدا کی اکثریت ایسے لوگوں کی ہے کہ اگرچہ وہ آثارِ قدرتِ الٰہیہ کو مشاہدہ کرتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ عجیب وغریب آثار بغیر کسی مؤثر علیم اور یہ صنائع محکمہ بغیر کسی صانع کے موجود نہیں ہو سکتے ہیں۔ مگر وہ شہواتِ نفسانیہ اور لذاتِ جسمانیہ میں اس قدر منہمک ہوتے ہیں کہ وہ کسی صورت مین ان سے دست بردار ہو کر تکالیفِ شرعیہ کے زیر بار نہیں ہونا چاہتے۔ اور چونکہ فطرتاً ان کے نفوس میں خوفِ عذابِ اُخروی کے تصور سے اضطراب وانقباض پیدا ہوتا ہے وہ اسے زائل کرنے کے لیے مختلف ظنون واوہام اور خیال ہائے خام سے خود واجب الوجود کا ہی انکار کر دیتے ہیں۔ چنانچہ خداوند عالم نے ان لوگوں کی یہ کیفیت ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے:

وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (سورۃ یونس:۶۶)

"جو لوگ اللہ سبحانہ کے علاوہ دیگر شرکاء کی اتباع و پیروی کرتے ہیں، ان کے پاس کوئی دلیل و برہان نہیں ہے، بلکہ وہ محض ظن و گمان کی پیروی کرتے ہیں۔ اور وہ خیالی باتیں کرتے ہیں"۔

اسی بنا پر مادیین کے بڑے بڑے لیڈر مثل سٹالن، لینن وغیرہ کے بیانات موجود ہیں کہ:

"ہمارا سب سے اہم اور پہلا مقصد دین کا ختم کرنا ہے۔ کیونکہ دین ہی ہمیں اپنے مقاصد کے حصول کے سلسلہ میں بعض ذرائع، مثل مکر و فریب اور کذب و افتراء کے اِستعمال سے روکتا ہے اور خواہشاتِ نفسانیہ کے پورا کرنے پر قدغن کرتا ہے"۔

(الشیوعیۃ والاسلام)

اسے کہتے ہیں: "جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے"۔ یہ گروہ سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ اس کے لیے ارشاد و ابلاغ اور انذار و تبشیر کچھ سود مند نہیں ہوتی۔ الا من رحم اللہ و قلیل ما ھم۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا و من شر الشیطان و من الغوایۃ و الخذلان۔

بہرکیف مذکورہ بالا حقائق کے پیشِ نظر حضرت مصنّف علامؒ اور ان کی طرح بعض دیگر علمائے اعلام نے بھی اثباتِ صانع سے بحث نہیں کی۔ اور اثباتِ توحید سے ہی سلسلۂ کلام کی ابتدا کی ہے۔ ہم بھی ضرور ان حضرات کی تاسّی کرتے۔ مگر عصر حاضر کے تقاضے مجبور کرتے ہیں کہ اس موضوع پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔ اگرچہ ابتدائے آفرینشِ عالم سے ہمیشہ ایسے کچھ کم عقل اور کج فطرت انسان موجود رہے ہیں جو صانع عالم کے وجود ایسے بدیہی و فطری مسئلہ میں شاک و متردد یا صریح طور پر منکر تھے۔ مگر موجودہ دور جہاں مادی ترقی، سائنسی ارتقاء، اور جدید انکشافات کے اعتبار سے عصر طلائی، عصر نور اور عصر ارتقائی اور نہ معلوم کن کن عمدہ ناموں سے یاد کیا جاتا ہے، وہاں دینی و روحانی طور پر تنزل و انحطاط کے لحاظ سے دورِ کفر و الحاد اور عصر زندقہ و فساد بھی کہلاتا ہے۔ اس عصر نے مذہبی اقدار پر کاری ضربیں لگائی ہیں۔ اور دین و مذہب کی طرف سے عام لوگوں کو بے گانہ و بدگمان کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ اب ملاحدہ و زنادقہ یعنی منکرین دین ہدیٰ و خدا کی تعداد میں کافی اضافہ ہو گیا ہے، جو خود بھی مختلف قیاساتِ فاسدہ و خیالاتِ کاسدہ کی بناء پر خالق کائنات کی ذات جامع جمیع صفات کا انکار کرتے ہیں اور مزید برآں مختلف ابلیسی شکوک و شبہات سے سادہ لوح اور بے خبر لوگوں کے اعتقاد پر

بھی ڈاکا ڈالتے رہتے ہیں۔ اگر چہ یہی علوم جدیدہ ان لوگوں کے لیے جن کی چشم بصیرت بالکل بند نہیں ہوگئی، اور فطرتِ صحیحہ میں ہنوز کچھ رمق حیات باقی ہے، کحل البصیرت ثابت ہورہے ہیں، اور ان علومِ جدیدہ واستکشافاتِ مُفیدہ نے ان کو صانع عالم کی ہستی کا اقرار اور مذہب بالخصوص مذہب اسلام کی حقانیت وصداقت کا اعتراف کرنے پر مجبور کردیا ہے۔ اور ان میں سے جو پہلے ہی قائل ہیں' ان کے نور ایمانی کو جلاء روحانی حاصل ہورہی ہے۔ ؎

علم را بر جاں زنی یارے بود
علم را بر تن زنی مارے بود

قل کل یعمل علیٰ شاکلتہٖ

جیسا کہ کتاب "خدا موجود ہے" کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح وعیاں ہوتی ہے، جس میں مغرب کے چالیس سائنسدانوں کی شہادت موجود ہے کہ صانع عالم موجود ہے۔ ان سائنسدانوں میں سائنس کے مختلف شعبوں کے ماہر شامل ہیں۔ جیسے شُعبہ طبیعیات، ریاضی وکیمیا، حیوانات وحشرات، حیاتیات وعضویات، اراضیات وباغیات اور طبیات وفلکیات وغیرہا۔ بہرحال دریں صورت ضرورت اور سخت ضرورت ہے کہ موجودہ دور کے انسان کے شکوک وشبہات کو علم قدیم وجدید کی روشنی میں دلیل و برہان کے ساتھ زائل کیا جائے اور اس طرح نئی پود کی اصلاح کا بھی سامان مہیا کیا جائے۔

لیہلك من هلك عن بینة ویحیی من حی عن بینة

استدلال بر وجود خدا بطریق فلاسفہ وحکماء

مخفی ومستور نہ رہے کہ اثباتِ صانع عالم (جلت قدرتہ) کے مختلف ومتعدد طرق ومسالک ہیں مثلاً: ① طریقہ حکماء ربانیین ② طریقہ علماء متکلمین ③ طریقہ عرفاء شامخین۔ بعض ارباب معرفت نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ: الطرق الی معرفة رب الارباب بقدر انفاس العباد (وهذا حق لایعتریه شك ولا ارتیاب) اس مختصر شرح میں اس قدر تو گنجائش نہیں ہے، اور نہ ہی ضرورت ہے کہ ان تمام طرق کے تمام دلائل وبراہین ذکر کیے جائیں۔ ہاں بموجب "مالا یدرك كله لا یترك كله" ہم یہاں بطور نمونہ "مُشتے از خروارودانہ از انبار" ان طرقِ سہ گانہ میں سے چیدہ چیدہ چند دلائل قاطعہ وبراہین ساطعہ ذکر کرتے ہیں۔ اور آخر میں ان بعض مہم شکوک وشبہات کا ازالہ بھی کریں گے جو اس مقام پر پیش کیے جاتے ہیں، تاکہ یہ مبحث ہر لحاظ سے مکمل ومختتم ہوجائے۔

① **دلیل اول:** عقلاء روزگار کا اس امر پر اتفاق ہے کہ جو چیز علم وتصور انسانی میں آسکتی ہے وہ تین حال سے خالی نہیں ہے۔ یا واجب الوجود ہوگی۔ (جس کے لیے لذاتہ وجود ضروری ولازمی ہو اور عدم ناممکن) یا ممتنع الوجود ہوگی (جس کے لیے لذاتہ عدم ضروری ہو اور وجود ناممکن) یا ممکن الوجود ہوگی، جس کے لیے لذاتہ نہ وجود ضروری ہو اور نہ عدم بلکہ اس کے لیے وجود و عدم دونوں برابر ہوں) ہم دیکھتے ہیں کہ اس عالم آب وگل میں کچھ چیزیں عرصہ وجود میں آتی ہیں اور پھر پردہ عدم میں روپوش ہوجاتی ہیں اور آمد و رفت کا یہ سلسلہ نباتات وحیوانات وغیرہ میں برابر جاری وساری ہے۔ اب یہ چیزیں یا تو واجب الوجود ہیں یا ممتنع الوجود یا ممکن الوجود۔ کیونکہ کوئی بھی چیز ان تین صورتوں میں سے باہر متصوّر نہیں ہوسکتی۔ جیسا کہ ابھی اوپر بیان کیا جاچکا ہے، اب یہ واجب الوجود تو ہو نہیں سکتیں۔ کیونکہ اگر واجب الوجود ہوتیں تو کبھی معدوم نہ ہوتیں، اور نہ ممتنع الوجود ہوسکتی ہیں۔ کیونکہ اگر ممتنع الوجود ہوتیں تو کبھی عالم وجود میں قدم نہ رکھتیں۔ پس لامحالہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ ممکن الوجود ہیں۔ پس جب ان کا ممکن الوجود ہونا قطعاً ثابت ہوگیا تو اس سے ذات واجب (جل مجدہٗ) کا وجود مسعود بھی قطعی طور پر ثابت ہوجاتا ہے۔ کیونکہ ابھی اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ ممکن کے لیے وجود و عدم برابر ہے۔ یعنی وہ کسی موجد اور وجود عطا کرنے والے کے بغیر خودبخود وجود میں نہیں آسکتا۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ کسی معطی و موجد نے اسے خلعتِ وجود عطا کی ہے۔ اب اس وجود دہندہ کے متعلق چار ہی احتمال متصوّر ہوسکتے ہیں: ① یا تو بعینہٖ اسی ممکن نے ہی اپنے آپ کو وجود دیا ہے ② یا اس کی جزء نے اسے وجود عطا کیا ہے ③ یا ممتنع الوجود نے اسے خلعت وجود بخشی ہے ④ یا واجب الوجود نے اسے نعمت وجود مرحمت فرمائی ہے...... پہلی شق بالبداہت باطل ہے، کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ شے اپنے وجود سے پہلے موجود ہو۔ اور پھر اپنے آپ کو وجود دے اور یہ بالکل محال اور ناممکن ہے۔ اسی طرح دوسری شق بھی باطل ہے۔ کیونکہ جزء ہرگز موجد کل نہیں ہوسکتی۔ اس سے بھی وہی خرابی لازم آتی ہے جو پہلی شق میں لازم آتی ہے۔ تیسری شق بھی بداہۃً باطل ہے۔ کیونکہ بلا امتیاز مذہب وملت تمام عقلا روزگار حتی کہ دہریہ کا بھی بشرطیکہ ان میں عقل تسلیم کی جائے) اس امر پر اتفاق ہے کہ فاقد شیء معطی شیء نہیں ہوسکتا۔ یعنی جس کے پاس جو چیز موجود نہ ہو وہ چیز دوسرے کو نہیں دے سکتا۔ لہٰذا جب ممتنع الوجود خود موجود نہیں ہے تو پھر وہ دوسری اشیاء کو کیونکر وجود عطا کرسکتا ہے؟ ان ھذا الا اختلاق۔ پس جب یہ تینوں شقیں باطل ہوگئیں تو اب سوائے چوتھی شق کو صحیح تسلیم کرنے کے اور کوئی چارہ کار باقی نہیں رہ جاتا۔ یعنی یہ کہ ان تمام اشیاء کو ایک ذات مجتمع جمیع کمالات نے خلعت وجود عطا فرمائی ہے۔

جو واجب الوجود ہے۔ اس کا اپنا وجود اصلی وذاتی ہے۔ تمام کائنات اپنی ہستی و وجود میں اس کی محتاج ہے مگر وہ کسی کا محتاج نہیں۔ "یا ایھا الناس انتم الفقراء الی اللہ واللہ ھو الغنی الحمید" (فاطر: ۱۵) "اے لوگو! تم سب خدا کے محتاج ہو مگر خدا سب سے بے نیاز ہے"۔ وہ ازلی و ابدی ہے اور دائمی و سرمدی۔ وہ ایسی باقی رہنے والی ذات ہے کہ اسے فنا نہیں۔ (ھو الاول و الاخر و الظاھر و الباطن) کل من علیھا فان و یبقی وجہ ربك ذوالجلال و الاکرام (سورۃ الرحمن: ۲۷)۔ ذالك اللہ رب العالمین۔

یہ دلیل جلیل مختلف طریقوں سے بیان کی جاتی ہے مگر ہم نے اسے نہایت سہل وسادہ اور ذہن نشین ہونے والے انداز سے بیان کیا ہے۔ اس دلیل جمیل کی حرف بحرف تائید مزید امام ثامن ضامن حضرت امام رضا علیہ افضل التحیۃ والثنا سے منقول شدہ مختصر دلیل سے بھی ہوتی ہے جو آپ نے اس سلسلہ میں ایک سائل کے ایک سوال کے جواب میں بیان فرمائی تھی۔ ارشاد فرماتے ہیں:

انك لم تكن ثم كنت و قد علمت انك لم تكون نفسك و لا كونك من ھو مثلك

پہلے ایک وقت تھا جس میں تو موجود نہ تھا، پھر وجود میں آیا، اور تجھے معلوم ہے کہ تو نے اپنے آپ کو پیدا نہیں کیا (کہ عقلاً محال ہے) اور یہ بھی تجھے یقین ہے کہ جو شخص تیری طرح (ممکن الوجود) ہے اس نے بھی تجھے خلق نہیں کیا (کیونکہ وہ خود اپنے وجود میں محتاج غیر ہے، لہٰذا "خفتہ را خفتہ کے کند بیدار؟") اس لیے ماننا پڑے گا کہ تیرا خالق وصانع تیری جنس سے خارج ہے اور وہ واجب الوجود ہے۔

ھو الذی خلق من الماء بشرا فجعلہ نسبا و صھراً

۲ دلیل دوئم: عالم حادث ہے اور جو چیز حادث ہے، یعنی عدم کے بعد وجود میں آئی ہے اور ازلی نہیں ہے، وہ اپنے وجود میں کسی معطی وجود (علت) کی محتاج ہے۔ اور یہی معطی وجود ہی خدا ہے۔ اس استدلال کا دوسرا مقدمہ یعنی یہ کہ جو حادث ہے وہ محتاج علت ہے۔ بدیہی ہے اور کسی دلیل و برہان کا محتاج نہیں۔ ہاں اس کا پہلا مقدمہ کہ عالم حادث ہے۔ یہ محتاج دلیل ہے۔ اور اس پر متعدد ادلہ و براہین قائم کیے گئے ہیں۔ ہم اختصار کے پیشِ نظر یہاں چند ادلہ ذکر کرتے ہیں۔

حدوثِ عالم کی پہلی دلیل

اس عالم میں تغیر وتبدل اور فنا وزوال کا سلسلہ جاری ہے۔ کون شخص یہ نہیں جانتا کہ ایک زمانہ تھا کہ ہم پردۂ عدم میں مستور تھے، اور پھر عنقریب ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ ہم اسی پردۂ عدم میں

جا چھپیں گے۔ ہمارا وجود دو عدموں کے درمیان اس طرح محصور ہے جس طرح نورِ زمین شبِ گزشتہ اور شبِ آئندہ کی دو تاریکیوں میں گھرا ہوا ہے۔ اس پر نور کی یہ آمد و رفت بآوازِ بلند پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ نور زمین کا ذاتی نہیں ہے، بلکہ مُستعار و عطاء غیر ہے۔ اگر ذاتی ہوتا تو کبھی زائل نہ ہوتا۔ اسی طرح موت و حیات کی کش مکش اور وجود کی آمد و رفت اس امر کی واضح دلیل ہے کہ کائنات کے لیے موجد کا وجود اسی طرح ضروری و لازمی ہے جس طرح آفتاب کے لیے نور، آتش کے لیے حرارت، چار کے لیے زوجیت، تین کے لیے فردیت، اسی موجود مسعود کو جس کا وجود اصلی و ذاتی ہے، اہل اسلام، اللہ سبحانہٗ واجب الوجود اور خدائے معبود کہتے ہیں۔ اس آیت مبارکہ میں اسی دلیل کی طرف اشارہ ہے:

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ (سورة البقرة:۲۸)

تم کس طرح اللہ جل جلالہ کا انکار کرتے ہوں؟ حالانکہ تم موجود نہ تھے، اس نے تمھیں وجود عطا کیا پھر تم سے یہ وجود چھین لے گا۔

دوسری دلیل

عقل و مشاہدہ اس امر کے شاہد عادل ہیں کہ عالم کی ہر شے محدود و متناہی ہے۔ کوئی زمان اور مکان ایسا نہیں جس کی ابتداء و انتہاء نہ ہو۔ دن رات، مہینہ و ہفتہ، سال اور صدی، ہر ایک کی ابتداء ہے اور انتہا۔ اسی طرح ہر مکان کی مساحت و مسافت محدود و مُتعیّن ہے۔ غرض عالم کے تمام بسائط و مرکبات محدود و متناہی ہیں۔ بسائط کا محدود ہونا تو ظاہر ہے۔ اور مرکب، چونکہ انہی محدود بسائط سے مرکب ہے، لہٰذا وہ بھی متناہی ہی ہوگا۔ لہٰذا جب عالم کے تمام بسائط و مرکبات متناہی و محدود ہیں تو عالم بھی ضرور محدود و متناہی ہوگا۔ اور اس کی ضرور کوئی ابتداء ہوگی۔ کیونکہ عالم انہی بسائط و مرکبات کے مجموعہ کا دوسرا نام ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اجزاء تو متناہی ہوں مگر مجموعہ غیر متناہی اور غیر محدود ہو؟

تیسری دلیل

یہ عقلاً مُسلّم ہے کہ کسی ثانی کا وجود اول کے بغیر اور ثالث کا وجود بدوں ثانی کے، وعلیٰ ہذا القیاس رابع کا وجود بغیر ثالث کے (وھلم جرًا) عقلاً محال و ناممکن ہے۔ اعداد کا سلسلہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو، مگر اول کے بغیر کسی طرح نہیں چل سکتا۔ اگر اول ہی معدوم ہو تو تمام سلسلہ نیست و نابود ہوگا، بالکل اسی طرح اگر اس عالم کے لیے کوئی ابتداء نہ ہو تو یہ تمام سلسلہ وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔ قرآن کریم میں اسی دلیل کی طرف اشارہ ہے:

لَقَدۡ اَحۡصٰىهُمۡ وَعَدَّهُمۡ عَدًّا (سورۃ مریم: ۹۴)

وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيۡهِمۡ وَاَحۡصٰى كُلَّ شَىۡءٍ عَدَدًا (سورۃ الجن: ۲۸)

خداوند عالم نے ان سب کا احاطہ کر رکھا ہے، اور ان کو کما حقہ شمار کیا ہوا ہے، اور ان کی سب چیزوں پر محیط ہے اور ان تمام کا احصا کیے ہوئے ہے۔ (علم الکلام)

چوتھی دلیل

یہ دلیل چند مقدمات پر موقوف ہے۔

① عالم میں دو قسم کی چیزیں پائی جاتی ہیں۔

① جوہر۔ یعنی وہ چیزیں جو خود قائم ہیں، جیسے درخت، پتھر، پانی وغیرہ۔

② عرض۔ یعنی وہ چیزیں جو بذاتِ خود قائم نہیں بلکہ کسی دوسری چیز میں پائی جاتی ہیں۔ جیسے رنگ و بو اور ذائقہ وغیرہ۔

② کوئی جوہر عرض سے خالی نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ جس قدر جواہر ہیں وہ کسی نہ کسی صورت اور ہیئت میں ہوتے ہیں اور صورت و ہیئت عرض ہیں۔ نیز تمام جواہر میں کسی نہ کسی قسم کی حرکت پائی جاتی ہے۔ اور حرکت عرض ہے۔ غرضیکہ کوئی جوہر عرض سے خالی نہیں ہوسکتا ہے۔

③ عرض حادث ہے۔ یعنی پیدا ہوتا ہے اور فنا ہو جاتا ہے۔

④ جو چیز کبھی عرض سے خالی نہ ہوسکتی ہو وہ بھی ضرور حادث ہوگی۔ کیونکہ اگر وہ قدیم ہو تو پھر عرض کا بھی قدیم ہونا لازم آئے گا۔ کیونکہ جو دو چیزیں باہم لازم و ملزوم ہوں ان دونوں کا حکم ایک ہوتا ہے۔ اگر ایک قدیم ہے تو دوسری بھی ضرور قدیم ہی ہوگی، ورنہ لازم و ملزوم میں فصل زمانی لازم آئے گا اور یہ محال ہے۔ حالانکہ عرض کا حادث ہونا واضح و آشکار ہے تو لامحالہ جوہر بھی حادث ہی ہوگا۔

اب ان مقدماتِ چہارگانہ سے استدلال اس طرح کیا جائے گا کہ عالم دو حال سے خالی نہیں۔ جوہر ہوگا یا عرض، اور چونکہ جوہر اور عرض دونوں حادث ہیں، لہٰذا ضروری ہے کہ عالم بھی حادث ہو اور جب یہ ثابت ہوگیا کہ عالم حادث ہے تو ضرور ہے کہ کوئی ذات ایسی ہو جو اسے وجود دے۔ اب اگر وہ ذات بھی حادث ہو تو اس کے لیے بھی کوئی وجود دینے والی اور ذات تسلیم کرنا پڑے گی۔ اس طرح اگر یہ سلسلہ کسی ایسی ذات جامع جمیع کمالات پر جا کر ختم ہو...... کہ جو واجب الوجود ہے اور اس کا وجود اصلی و ذاتی ہے اور وہی خدائے عزوجل ہے تو فبہا، ورنہ دور یا تسلسل لازم آئے گا،

اور یہ دونوں محال ہیں ۔ لہٰذا پہلی صورت ہی متعین ہو گی۔

پانچویں دلیل

تمام اعداد و مقادیر محدود ہوتے ہیں ۔ اجرامِ فلکیہ اور مادے کے ذرات کی تعداد معین ہے ۔ ہر لمحہ کے اجزائے وقت کی تعداد بالکل معین ہوتی ہے ۔ زمین سورج کے گرد معین بار پھرتی ہے ۔ سلسلہ علّت و معلول کی کڑیاں بھی عددِ معین میں ہیں ۔ اسی طرح تمام اعمالِ فطرت کا بھی کوئی آغاز ہوگا ۔ کیونکہ لامتناہی طور پر پیچھے ہٹنا ناقابل فہم ہے ۔ (تاریخ فلسفہ جدید جلد ۲ صفحہ ۶۳۱ بحوالہ رسالہ حدوث عالم)

☆ فلاسفر مغرب ڈیورنگ کہتا ہے: "اس زمانے سے پہلے جس میں تغیرات واقع ہونے شروع ہوئے، ایک سرمدی ہستی ہوگی جس کے اندر تغیرات و اختلافات کا وجود نہیں ہوگا ۔ اس وقت وجود عین ذات ہوگا" ۔ (تاریخ فلسفہ جدید جلد ۲ صفحہ ۶۳۱)

☆ ڈیکارٹ کہتا ہے: " خدا کے سوا میں اور کسی شے کا تخیل ہی نہیں کرسکتا، جس کا وجود اس کی حقیقت میں وجوباً داخل ہو" ۔ (ترجمہ تفکرات صفحہ ۱۵۲ بحوالہ رسالہ حدوث مادہ مولانا محمد رضی صاحب مرحوم)

یہ حکمائے مغرب کے آراء ہیں ۔ مگر تعجب ہے ان بعض حکماء اسلام پر جو باوجود عالم کو حادث تسلیم کرنے کے پھر بھی اسے قدیم بالنوع اور وجود میں خدا کے ساتھ قدیم جانتے ہیں ۔ حالانکہ انواع کا بوجہ کلی ہونے کے خارج میں سوائے افراد کے کوئی وجود ہی نہیں ہے ۔ اور جب افراد حادث ہیں تو پھر نوع کو قدیم قرار دینا بالکل ایک غیر معقول نظریہ ہے ۔ کما لا یخفی......

معصومؑ نے اس نظریۂ فاسدہ کے بطلان پر اس طرح تنبیہ فرمائی ہے: "کیف یکون خالقاً لمن لم یزل معہ" ۔ " بھلا خدا ایسی چیز کا کیونکر خالق ہوسکتا ہے جو ازل سے اس کے ساتھ ہے" ۔

لہٰذا ان حقائق کی روشنی میں عقل سلیم بلا چون و چرا یہ تسلیم کرتی ہے کہ ائمہ طاہرین صلوات اللہ علیہم اجمعین کا یہ ارشاد واجب الاعتقاد ہے ۔ اور سراسر حق ہے کہ: "کان اللہ و لم یکن معہٗ شیء" ۔ " خداوند عالم موجود تھا، اور اس کے ساتھ کوئی شے موجود نہ تھی" ۔

بہرکیف تمام عقلاء روزگار اور حکماء نامدار عالم کے حادث ہونے پر متفق الکلام ہیں ۔ جیسا کہ فاضل شہرستانی نے "نہایۃ الاقدام" میں اور دیگر علماء اعلام نے یہ دعویٰ کیا ہے ۔ اور بڑے بڑے حکماء قبل از اسلام مثل: ارسطو و فیثا غورث، سقراط اور افلاطون وغیرہم کا بھی یہی نظریہ ہے، اور اسی پر تمام انبیاءؑ اور اولیاءؒ کا اتفاق ہے..... حضرت علامہ مجلسیؒ رسالہ اعتقادیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

و لا بد ان تعتقد ان العالم حادث ......فان علی المعنی الذی ذکرناہ اجماع جمیع الملیین و الاخبار بہ متظافرۃ متواترۃ ......

"یہ اعتقاد رکھنا ضروری ہے کہ عالم حادث ہے ۔ اس مطلب پر تمام اہلِ ملل و ادیان کا اجماع و اتفاق ہے ۔ اور اس سلسلہ میں اخبار متظافرہ و متواترہ موجود ہیں" ۔

طالبانِ حق و حقیقت کے لیے اس مطلب کے اثبات کے لیے یہی مختصر ادلہ و براہین کافی ہیں ۔ وہ اہل علم حضرات جو تفصیل دیکھنے کے شائق ہوں وہ کتاب "ارتباط انسان باجہان" مطبوعہ ایران کی طرف رجوع کریں ۔ اور جب ان دلائل سے عالم کا حادث ہونا ثابت ہوگیا تو لامحالہ اس کے ایک محدث وجود دہندہ ذات کا اقرار کرنا پڑے گا جس کا وجود اپنا ذاتی ہے ۔ اسی کو ہم خدا کہتے ہیں ۔

اِستدلال بروجودِ خدائے کریم بطریقۂ متکلمین

اگرچہ علمائے متکلمین نے مختلف طرق سے اثبات باری تعالیٰ پر استدلال قائم کیے ہیں ۔ مگر ان کا بہترین طریقہ استدلال اثر کو دیکھ کر موثر، مخلوق کو دیکھ کر خالق اور مصنوع کو دیکھ کر صانع پر استدلال کرنا ہے ۔ جسے حکماء "دلیل اِنّی" کہتے ہیں ۔ اور یہ وہ آسان و سہل قاطع برہان ہے کہ جسے علماء اعلام تو بجائے خود نسوان و صبیان اور عوام کالانعام بھی بآسانی سمجھ سکتے ہیں ۔ کیونکہ یہ طریقہ استدلال بالکل فطری و جبلی ہے ۔ چنانچہ جب ایک بدو سے یہ سوال کیا گیا کہ : "بما ذا عرفت ربک؟" "تو نے اپنے پروردگار کو کیونکر پہچانا ہے؟" تو اس نے فوراً یہ فطری جواب دیا:

"البعرۃ تدل علی البعیر و اثر الاقدام یدل علی المسیر اسماء ذات ابراج و ارض ذات فجاج لا یدلان علی اللطیف الخبیر؟"

"جب اونٹ کی مینگنی اونٹ پر اور نشاناتِ قدم، چلنے والے پر دلالت کرتے ہیں تو کیا یہ برجوں والا آسمان اور گھاٹیوں والی زمین ، مل کر ایک لطیف و خبیر صانع عالم کی ذات پر دلالت نہیں کرتے؟" ۔

یہی دلیل جمیل تھوڑے سے تغیّر الفاظ کے ساتھ سید الموحدین حضرت امیرالمومنین علیہ السلام سے بھی منقول ہے ۔ فرمایا:

البعرۃ تدل علی البعیر و الروثۃ تدل علی الحمیر و اثار القدم تدل علی المسیر فھیکل علوی بھذہ اللطافۃ و مرکز سفلی بھذہ و الکثافۃ کیف لا یدلان علی اللطیف الخبیر

"(چھوٹی سی) مینگنی اُونٹ پر، لید گدھے پر، اور نشاناتِ قدم چلنے پر دلالت کرتے ہیں۔ کیا آسمان نیلگوں باوجود اپنی لطافت کے اور فرش زمین پر باوجود اپنی کثافت کے ایک خدائے لطیف وخبیر پر دلالت نہیں کرتے؟"

اس طریقہ استدلال کی آسانی وعمدگی ہی کا نتیجہ ہے کہ جب ایک ایسی بوڑھی عورت سے سوال کیا گیا جو چرخہ کات رہی تھی کہ تو نے اپنے رب کو کس طرح پہچانا ہے؟ تو اس نے فوراً یہ جواب دیا: "بمغزلی ھذا" (او قالت بدولابی ھذا) "میں نے اسے اس چرخہ سے پہچانا ہے"۔ "فانی ان حرکته تحرک وان لم احرکه سکن"۔ "جب میں اسے حرکت دیتی ہوں تو یہ حرکت کرنے لگتا ہے اور جب حرکت نہیں دیتی تو یہ رُک جاتا ہے"۔ پس جب یہ معمولی سا چرخہ بغیر کسی چلانے والے کے نہیں چل سکتا تو پھر اتنے بڑے عالم کا نظام کیونکر کسی ناظم ومدبر کے بغیر چل سکتا ہے؟ جب جناب رسولِ خداﷺ نے اس بڑھیا کا یہ استدلال سنا تو بہت محظوظ ہوئے اور فرمایا: "علیکم بدین العجائز"۔ "بوڑھی عورتوں والے دین کو لازم پکڑو"۔ یعنی دلیل وبرہان سے مذہب اختیار کرو۔ اگرچہ وہ دلیل اس طرح سادہ وسہل ہی کیوں نہ ہو۔ جس طرح اس بڑھیا کی ہے۔ کیونکہ بنا بر مشہور اصولِ عقائد میں تقلید جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ سرکار علامہ حلی علیہ الرحمۃ نے اس امر پر دعویٰ اجماع فرمایا ہے۔

اجمع العلماء كافة علىٰ وجوب معرفة الله تعالىٰ و صفاته الثبوتية و السلبية و ما يصح عليه و ما يمتنع عنه و النبوة و الامامة و المعاد بالدليل لا بالتقليد

(شرح باب حادی عشر، صفحہ ۴ و ۵)

"تمام علماء نے اس بات پر اجماع واتفاق کیا ہے کہ خداوند عالم کی ہستی اور اس کی صفاتِ ثبوتیہ وسلبیہ، اسی طرح نبوت وامامت اور قیامت کی معرفت واجب ہے، اور وہ بھی دلیل وبرہان کے ساتھ نہ کہ تقلید کے ساتھ"۔

قرآن کے طرزِ استدلال سے اس طریقہ کی تائید

چونکہ منطقی دلائل اور عقلی براہین نہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے اور نہ وہ اس کے لیے مُفید ہو سکتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ افہام وتفہیم اور کسی مطلب کے اثبات کا ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جو عام فہم ہو۔ تاکہ اسے ہر شخص سمجھ سکے۔ اس امر کی اہمیت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب کہ وہ مطلب ہر خاص وعام، مرد وعورت، خورد وکلاں، عالم وجاہل، شہری وبدوی، سب کو سمجھانا مقصُود ہو۔ بنا بریں

چونکہ مذکورہ بالا طریقہ استدلال بالکل عام فہم و آسان ہے اور ایسے محسوسات پر مبنی ہے جو ہر وقت انسان کے پیشِ نظر رہتے ہیں۔ اس لیے حکیم مُطلق ہادیٔ سبل یعنی خدائے عزوجل نے قرآن مجید میں جابجا اسی طریقہ استدلال کو اختیار فرمایا ہے۔ چند آیات یہاں پیش کی جاتی ہیں:

① ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ (سورۃ البقرۃ:۱۶۴)

بالتحقیق آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے ادلنے بدلنے میں اور ان کشتیوں میں جو سمندر میں وہ کچھ لے کر چلتی ہیں جس سے لوگوں کو نفع پہنچتا ہے۔ اور اس پانی میں، جسے خدا نے آسمان سے اتارا اور جس کے ذریعہ سے زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کر دیا اور ہر قسم کا چلنے والا اس میں بکثرت پھیلا دیا، اور ہواؤں کے چلنے میں اور ان بادلوں میں، جو آسمان و زمین کے مابین مُعلّق ہیں۔ سمجھنے والے لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں موجود ہیں"۔

چونکہ انسانی فطرت ہے کہ وہ اثر کو دیکھ کر مؤثر (اثر کرنے والے) کا حال معلوم کر لیتا ہے۔ جیسا کہ اوپر واضح کیا جا چکا ہے۔ اسی لیے خالق فطرت نے بھی اپنی ہستی کے اثبات کے سلسلہ میں یہی فطری آثار پیش کیے ہیں کہ جن کے رموز و اسرار میں معمولی غور و فکر کرنے سے واضح و آشکار ہو جاتا ہے کہ ان کا کوئی ضرور مؤثر و فاطر ہے۔ اس آیت مبارکہ میں خلاقِ عالم نے اپنی صنعت و قدرت کے دس عظیم الشان آثار کو واضح و آشکار فرما کر فطرتِ انسانی کو جھنجھوڑا ہے کہ جب وہ معمولی سے اثر کو دیکھ کر ایک بڑے مؤثر کو معلوم کر لیتی ہے، وہ دھواں دیکھ کر آگ کا پتا لگا لیتی ہے۔ اور تحریر دیکھ کر کاتب کا حال معلوم کر لیتی ہے۔ آوازِ سُن کر بولنے والے کا سراغ لگا لیتی ہے، تو یہ دس جلیل القدر آثار دیکھ کر کیوں ان کے خالق، خدائے جبار کے موجود ہونے کا یقین نہیں کرتی؟ حضرت انسان مشاہدہ و وجدان کی بنا پر علم و یقین رکھتا ہے کہ ایک چھوٹا سا مکان بھی بغیر کسی بنانے والے کے نہیں بن سکتا، کپڑا بغیر بننے والے کے تیار نہیں ہو سکتا، روٹی بغیر کسی پکانے والے کے پک نہیں سکتی۔ ایک معمولی سی چکی بغیر کسی پھرانے والے کے پھر نہیں سکتی، ہَل بغیر کسی چلانے والے کے چل نہیں سکتا۔ ایک ڈھیلا بغیر

کسی ہلانے والے کے ہل نہیں سکتا۔ تو پھر کیا یہ اتنا بڑا آسمان جس میں سینکڑوں ایسے آفتاب موجود ہیں جن میں سے ہر ایک زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے، جس میں کروڑوں ثوابت و سیارے، ستارے موجود ہیں (آج تک دوربین کے ذریعہ تقریباً بیس کروڑ ستارے نظر آچکے ہیں...... جو بجائے خود ایک عظیم الشان مقدار حجم اور خاص روش و رفتار اور خواص و آثار رکھتے ہیں۔ بغیر کسی بنانے والے کے خود بخود بن گیا ہے؟ یہ اتنی بڑی زمین (جس کا قطر ۷۹۸۰ میل ہے اور محیط چار کروڑ میٹر ہے) جو ہزاروں قسم کے فوائد و عوائد اور لاکھوں قسم کے عجائب و غرائب کا مرکز ہے۔ بغیر کسی صانع حکیم کے معرضِ وجود میں آگئی ہو، یہ شب و روز کی باقاعدہ یکے بعد دیگرے آمد و رفت کا سلسلہ خود بخود قائم ہوگیا؟ یہ بارش جو ہزاروں کاموں میں کام آتی ہے، یہ بغیر کسی برسانے والے کے خود بخود برسنا شروع ہوگئی؟ ہزاروں قسم کے ازہار و اثمار سے لدے ہوئے اشجار، ہزاروں قسم کے مختلف الالوان نباتات، لاکھوں قسم کے چرند اور حیوانات جن کے فوائد و خواص اور حالات و آثار اور ان کی خلقت کے رموز و اسرار دیکھ کر بڑے بڑے فلاسفر و سائنس دان حیران و سر بگریبان ہوجاتے ہیں (اس سلسلہ میں علم الحیوانات، علم النباتات کی مخصوص کتب دیکھی جائیں) کیا یہ سب اشیاء بغیر قادر علیم اور صانع حکیم کے پیدا کرنے کے خود بخود عالم وجود میں آگئیں۔ لا واللہ! کوئی عقل سلیم اور طبع مستقیم اسے ہرگز باور نہیں کرسکتی ہے۔ ولنعم ما قیل: ؎

فوا عجبا کیف یعصی الالٰہ   ام کیف یجحدہ جاحد

و فی کل شیء لہ آیۃ   تدل علی انہ واحد

"تعجب ہے کہ خداوند عالم کی کس طرح نافرمانی کی جاتی ہے یا کس طرح انکار کرنے والے اس کی ذات کا انکار کرتے ہیں، حالانکہ ہر ایک شے میں اس کی نشانیاں موجود ہیں، جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اس کی ہستی یگانہ ہے"۔

۲) ایک اور مقام پر ارشادِ قدرت ہے:

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝ (سورۃ یونس: ۵)

"وہ خدا ہی تو ہے جس نے سورج کو روشن قرار دیا ہے۔ اور چاند کو نور اور چاند کی منزلیں مقرر کیں تاکہ تم برسوں کی گنتی اور حساب سمجھ لیا کرو۔ اللہ نے ان سب چیزوں کو برحق پیدا کیا ہے۔ سمجھنے والے لوگوں کے لیے وہ اپنی آیتیں کھول کر بیان کرتا ہے"۔

اس آیت مبارکہ میں بھی خلاق عالم نے اپنی حکیمانہ صنعت و حرفت کے چند اعلیٰ نمونے پیش کر کے لوگوں کو اپنی ربوبیت و خدائی کے اقرار کرنے کی دعوت دی ہے۔

③ ایک اور جگہ یوں ارشاد ہوتا ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۝ (سورۃ الرعد:۲)

"اللہ وہی ہے جس نے آسمانوں کو بغیر ایسے ستونوں کے جن کو تم دیکھتے ہو بلند کیا، پھر عرش پر (اس کا حکم) غالب آیا اور سورج اور چاند کو مطیع کر لیا۔ ہر ایک مدت معینہ تک کے لیے رواں ہے۔ تمام معاملات کی تدبیر خود کرتا ہے (اور) نشانیاں کھول کر بیان کرتا ہے تا کہ تم اپنے پروردگار کی ملاقات کا یقین کر لو"۔

اس آیت مبارکہ میں بھی خدائے بزرگ و برتر نے اپنی قدرت کے آثار کو پیش فرما کر اپنی معرفی کرائی ہے۔

④ ایک اور محل پر یوں ارشاد فرماتا ہے:

وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (سورۃ الرعد:۳)

"اور وہ وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں بھاری بھاری پہاڑ اور دریا مقرر کیے اور ہر قسم کے پھلوں میں اس میں دو دو طرح کے پیدا کر دیے۔ دن کو وہ رات سے ڈھانپ دیتا ہے بے شک اس میں فکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں موجود ہیں"۔

اس آیت مبارکہ میں بھی خالق حکیم نے اپنی ہستی کے اثبات کے لیے اپنے حکمت آمیز آثارِ قدرت کو پیش کر کے اربابِ عقل و خرد کو دعوتِ فکر دی ہے۔

⑤ ایک اور جگہ اس طرح ارشاد ہوتا ہے:

وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۫ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝ (سورۃ الرعد:۴)

اور زمین کے مختلف قسم کے ٹکڑے ایک دوسرے کے پاس پاس ہیں اور انگوروں کے

باغ اور کھیتیاں اور کھجور کے درخت ایک ہی جڑ سے کئی اُگے ہوئے اور علیحدہ علیحدہ اُگے ہوئے کہ یہ سب ایک ہی پانی سے سینچے جاتے ہیں، اور ان کے پھلوں کے بارے میں ہم ایک دوسرے پر برتری دے دیتے ہیں۔ بے شک اس میں عقل رکھنے والوں کے لیے نشانیاں موجود ہیں۔ (ترجمہ مقبولؒ)

اس آیت وافی ہدایت میں قادرِ مُطلق نے اپنی قدرت کاملہ کا ایک عجیب کرشمہ ذکر کر کے صاحبانِ عقل وفہم کو اپنی قدرت کاملہ کے اعتراف کی دعوتِ فکر دی ہے۔ زمین بھی ایک، پانی بھی ایک، جنس بھی ایک، بلکہ اصل بھی ایک، مگر بایں ہمہ طعم و ذائقہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ سب کا ذائقہ یکساں کیوں نہیں ہے؟ اگر نیچر و طبیعت ہی سب کچھ کرتی ہے تو طبیعت تو سب کی ایک ہے۔ پھر یہ اختلاف کہاں سے آ گیا ہے؟ ہے کوئی جواب ان منکرین خدا طبیعیین کے پاس؟ اگر ہے تو لائیں؟ "قل هاتوا برهانكم ان كنتم صادقين"۔

ایک مُفید حکایت

اسی مطلب کے ساتھ ملتی جلتی ایک نہایت عمدہ حکایت بعض کتب میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ ایک عالم نے بارگاہِ ایزدی میں یہ التجا کی کہ: بارِ الٰہا! دہریین و طبیعیین کے مقابلہ میں مجھ پر کسی ایسی دلیل کا القا فرما کہ جس میں کوئی فلسفی تشکیک جاری نہ ہو سکے۔ وہ یہ دعا کر کے سو گیا۔ خواب میں دیکھا کہ ایک شخص یہ آیت پڑھ رہا ہے:

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ﴿۱۹﴾ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ﴿۲۰﴾ (سورۃ الرحمن: ۱۹و۲۰)

یعنی خداوند عالم نے دو دریا جاری کیے ہیں (ایک شیریں اور ایک شور) دونوں مل کر چلتے ہیں، دونوں کے درمیان ایک حجاب و پردہ ہے۔ لہٰذا وہ ایک دوسرے پر نہیں چڑھتے (ایک کا پانی دوسرے میں نہیں ملتا)

طبیعت و نیچر کے پرستار بتلائیں پانی کی طبیعت کا تقاضا تو اتصال وامتزاج ہے۔ وہ کون سی چیز ہے جو آبِ شیریں کو آبِ شور کے ساتھ مل جانے سے مانع ہے؟ آیا وہ قدرتِ ربانیہ اور مشیّتِ الٰہیّہ کے علاوہ کوئی چیز ہو سکتی ہے؟...... خلاصہ یہ کہ: ؎

برگِ درختاں سبز در نظر ہوشیار

ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ

(آلِ عمران:۸۳)

ائمہ طاہرینؑ کے طرز استدلال سے اس طریقہ کی تائید مزید

اس طریقہ استدلال کی انہی خوبیوں کے پیشِ نظر جن کا تذکرہ ابھی اوپر کیا جا چکا ہے، حکماء ربانیین وہادیانِ دین مبین یعنی حضرات ائمہ طاہرین صلوات اللہ علیہم اجمعین نے بھی اس سلسلہ جلیلہ میں عامۃ الناس کے لیے یہی طریقہ استدلال اختیار فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام "البعرۃ تدل علی البعیر الخ" والے ارشاد باسداد کے بعد فرماتے ہیں:

بصنع اللہ یستدل علیہ و بالعقول تعتقد معرفتہ و با التفکر تثبت حجتہ معروف بالالات مشہور بالبینات

یعنی خداوند عالم کی مصنوعات ومخلوقات سے اس کی ذات پر استدلال کیا جاتا ہے۔ اورعقول وافہام سے اس کی ذات کا اعتقاد رکھا جاتا ہے اورغوروفکر سے اس کی دلیل و حجت ثابت اور راسخ ہوتی ہے۔ وہ بہت ادلہ واضحہ سے معروف اور بینات لائحہ سے مشہور ہے۔

و اذا نظرت الی الکواکب نظرہ
فتری الکواکب للمکوکب شاھدا

"جب تم ستاروں کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھو گے تو ان ستاروں کو اس ہستی کے وجود پر شاہد پاؤ گے جس نے ان کو ستارہ بنایا ہے"۔

ایک زندیق نے ایک مرتبہ بحق ناطق حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا: صانع عالم کے وجود پر کیا دلیل ہے؟ آپؑ نے فرمایا:

وجود الافاعیل دلت علی ان صانعًا صنعھا الا تریٰ اذا نظرت الی بناء مشید مبنی علمت ان لہ بانیًا و ان کنت لم تر البانی و لم تشاھدہ

"یعنی یہ آثارِ قدرت، ایک صانع حکیم کے وجود پر دلالت کرتے ہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ جب کہیں ایک محکم ومضبوط بنا ہوا مکان دیکھو تو تمھیں یقین ہوجاتا ہے کہ ضرور کسی بنانے والے نے اسے تعمیر کیا ہے۔ اگرچہ تم نے ظاہری آنکھوں سے معمار کو نہ دیکھا ہو"۔

اربابِ عقل ودانش غور فرمائیں کہ یہ دلیل جمیل باوجود مختصر ہونے کے کس قدر جامع اور مقنع ہے

کون ہوشمند انسان ہے جو اس حقیقت کا انکار کرے کہ کوئی بھی مکان بغیر کسی معمار کے نہیں بن سکتا، تو جب ایک چھوٹا سے مکان کسی بنانے والے کے بغیر نہیں بن سکتا تو اتنا بڑا آسمان جس کی عظمتِ شان کے سامنے بڑے بڑے فلاسفہ وسائنس دان اپنے ہیچمدان ہونے کا یقین واذعان کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں، کیونکر کسی صانع حکیم اور قادر کریم کے بغیر عرصہ وجود میں آسکتا ہے؟۔

اصول کافی، علل الشرائع اور بحار الانوار جلد ۲ میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ ابوشاکر عبداللہ دیصانی زندیق، حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یا جعفر بن محمد و لنی علی معبودی؟ اے جعفر! مجھے میرے معبود کی طرف راہبری فرمائیے۔ آں جنابؑ نے فرمایا: تمھارا نام کیا ہے؟ دیصانی اٹھ کر چلا گیا اور کوئی جواب نہ دیا۔ جب اپنے اصحاب میں پہنچا تو انھوں نے اس سے دریافت کیا کہ تو نے اپنا نام کیوں نہ بتایا؟ دیصانی نے کہا: اگر میں اپنا نام (عبداللہ) بتا دیتا تو وہ (امامؑ) مجھ سے پوچھتے کہ وہ اللہ کون ہے، جس کا تو عبد ہے؟ تو پھر میں کیا جواب دیتا؟ اصحاب نے کہا: اب دوبارہ ان کے پاس جاؤ۔ مگر ساتھ ہی یہ شرط لگادو کہ میرا نام نہ پوچھیں۔ چنانچہ یہ دوبارہ خدمت امام میں شرفیاب ہوا۔ اور جا کر وہی سابقہ سوال کیا۔ مگر ساتھ ہی یہ شرط لگادی کہ میرا نام نہ پوچھیں۔ امامؑ نے فرمایا: بیٹھ جاؤ! اتنے میں ایک چھوٹا سا بچہ کھیلتا ہوا وہاں سے گزرا جس کے ہاتھ میں مرغی کا ایک انڈا تھا۔ امامؑ نے فرمایا: اے بچے ذرا یہ انڈا مجھے دیدو۔ چنانچہ امامؑ نے بچے سے وہ انڈا لے کر فرمایا:

یا ویصانی هذا حصن مکنون له جلد غلیظ و تحت الجلد الغلیظ جلد دقیق وتحت الجلد الرقیق ذهبة مائعة و فضة ذائبة فلا الذهبة المائعة تختلط بالذهبة المائعة فهی علی حالها لم یخرج منها خارج مصلح فیخبر عن اصلاحها و لم یدخل فیها داخل مفسد فیخبر عن افسادها لا یدری للذکر خلقت ام للانثی تنفلق عن مثل الوان الطراديس اتری له مدبراً؟ فاطرق رأسه ملیا ثم قال اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شریك له و اشهد ان محمدا عبده و رسوله و انك اما و حجة من الله علیٰ خلقه و انا تائب مما کنت فیه

”اے دیصانی! یہ ایک پوشیدہ قلعہ ہے اس کے اوپر ایک موٹی جلد ہے۔ اور موٹی جلد کے نیچے ایک پتلی جلد ہے اور اس کے نیچے بہنے والا سونا اور پگھلی ہوئی چاندی ہے، نہ بہنے والا سونا پگھلی ہوئی چاندی کے ساتھ مخلوط ہوتا ہے اور نہ ہی پگھلی ہوئی چاندی بہتے ہوئے سونے کے ساتھ خلط ملط ہوتی ہے۔ یہ انڈا اسی حالت پر رہتا ہے نہ تو کوئی

اصلاح کرنے والا اندر سے نکلا ہے جو یہ بتائے کہ اس نے اندر اصلاح کی ہے اور نہ کوئی خراب کرنے والا اس کے اندر داخل ہوا ہے جو اس کے خراب ہونے کی اطلاع دے۔ یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اس کے اندر نر ہے یا مادہ...... یکایک یہ پھٹتا ہے اور طاؤس کی مانند رنگ برنگا چوزہ باہر نکل آتا ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے (یا اس کا کوئی ناظم و مدبر ہے؟ دیصانی نے تھوڑی دیر سر نیچے جھکانے اور غور وفکر کرنے) کے بعد کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور نہ اس کا کوئی شریک ہے۔ اور یہ بھی گواہی دیتا ہوں کہ جناب محمدﷺ اس کے بندۂ خاص اور اس کے رسول ہیں اور آپ امام برحق اور مخلوق پر حجت خدا ہیں۔ اور میں اپنے سابقہ عقیدہ سے توبہ کرتا ہوں"۔

وَ فِی الۡاَرۡضِ اٰیٰتٌ لِّلۡمُوۡقِنِیۡنَ وَ فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ (سورۃ الذاریات:۲۰ و ۲۱)

ایک عجیب حکایت

اس سلسلہ میں بعض کتب معتبرہ کے اندر ایک عجیب حکایت موجود ہے جو اپنی افادیت کے پیشِ نظر یہاں نقل کی جاتی ہے۔ ایک بادشاہ اعتقادِ خداوندی کے بارے میں اقرار وانکار کی کش مکش میں مبتلا تھا۔ مگر اس کا وزیر با تدبیر نہایت عقلمند اور دیندار آدمی تھا۔ جب اسے بادشاہ کی اعتقادی کمزوری کا علم ہوا تو وہ بادشاہ کو جادۂ مستقیم پر لانے اور شک وشبہ کی پُرخار وادی سے نکالنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ بڑے غور وخوض کے بعد ایک نہایت عمدہ تدبیر اس کے ذہن میں آگئی۔ اس نے مخفی طور پر (تاکہ بادشاہ کو علم نہ ہو) بہت سے معمار ومزدور اکٹھے کر لیے۔ اور شہر کی آبادی سے بہت دُور ایک لق ودق صحرا میں اینٹ گارا، لکڑی وغیرہ، ضروری سامان مہیا کر کے ایک عالی شان مکان کی تعمیر شروع کرادی۔ مکان مکمل ہوا، وہاں ایک بہت عمدہ باغیچہ بھی لگوادیا۔ پانی کی نہریں بھی جاری کرادیں۔ جب یہ سب کام مکمل ہو گیا تو وہاں سے سب معمار ومزدور بلا لیے اور مکان کو بالکل خالی کرادیا۔ اور پھر بادشاہ کو سیر وتفریح کے بہانے اس طرف لے گیا۔ جب بادشاہ نے اس بے آب وگیاہ جنگل میں ایسا عالی شان مکان اور پھر عمدہ باغیچہ اور پانی کی بہتی ہوئی نہریں ملاحظہ کیں تو حیران وششدر ہو گیا۔ اس حیرانی کے عالم میں وزیر سے مخاطب ہو کا کہ یہاں یہ عظیم الشان قصر کس نے تعمیر کرایا ہے؟ وزیر نے موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے عرض کیا: حضور! یہ خود بخود بن گیا ہے۔ بادشاہ نے تعجب خیز لہجہ میں سوال کیا: ہائیں خود بخود بن گیا ہے؟ یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ وزیر نے بڑے سکینہ ووقار کے ساتھ جواب

دیا کہ حضور! ہوا چلی، کہیں سے اینٹیں آگئیں، کہیں سے گارا آگیا، پھر اتفاق سے ایک اینٹ کے اوپر دوسری اینٹ جڑتی چلی گئی اور اسی طرح یہ شہتیر اور دروازے کی لکڑیاں بھی کہیں سے اڑ کر آگئیں اور یہاں آکر پیوست ہوگئیں۔ اور اس طرح یہ مکان مکمل ہوگیا، اور باغیچہ کا بھی یہی حال ہے۔ اتفاقاً کہیں سے بیج آگیا، اور ناہموار زمین اتفاق سے ہموار ہوگئی، اور اسی طرح یہ نہر بھی اتفاق سے جاری ہوگئی اور اس پانی کی آبیاری سے یہ بیج اگا اور یہ باغیچہ تیار ہوگیا۔ وزیر کا یہ جواب سن کر بادشاہ غیظ و غضب میں ڈوب گیا۔ اور آتش زیر پا ہو کر قہر آلود نگاہوں سے وزیر کی طرف دیکھتے ہوئے تند و تیز لہجہ میں کہا: کیا تم میں اتنی جرأت پیدا ہوگئی ہے کہ بادشاہ سے تمسخر کرتے ہو؟ بھلا مکان بغیر بنانے والے کے کس طرح بن سکتا ہے اور باغیچہ بغیر لگانے والے کے کس طرح لگ سکتا ہے؟...... وزیر باتدبیر نے بڑے ادب و احترام کے ساتھ دست بستہ ہو کر عرض کی: حضور گستاخی معاف۔ اگر یہ ایک مختصر سا مکان اور یہ چھوٹا سا باغیچہ اور یہ معمولی سی، نہر کسی بانی و باغبان اور کسان کے بغیر نہیں بن سکتے تو یہ اتنی بری کائنات کیونکر کسی قادرِ مطلق، صانع حکیم کے بغیر عالم وجود میں آسکتی ہے؟ اس وقت بادشاہ کی چشم بصیرت سے غفلت کی پٹی دُور ہوئی، اور شکوک و شبہات کے وہ تمام بادل جو اس کے آسمانِ اعتقاد پر چھائے ہوئے تھے چھٹ گئے۔ صدقِ دل سے صانع عالم کی ذات جامع جمیع صفات کا قائل ہوگیا، اور سمجھ گیا کہ وزیر نے یہ تمام تدبیر اسی کی اصلاح حال کے لیے کی ہے۔ اس لیے اس کا شکریہ ادا کیا۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚۖ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۶۴﴾ (سورۃ حم مومن: ۶۴)

حضرت امیر المومنین علیہ السلام اسی دلیل جلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "وھل یکون بناء من غیر بان او جنایة من غیر جانٍ" (نہج البلاغة) "بھلا کوئی مکان بغیر بانی کے اور کوئی جنایت بغیر جانی کے ہوسکتی ہے؟"...... اللہ اللہ! اثبات صانع ایسے عظیم الشان مسئلہ کے متعلق یہ مختصر کلام معجز نظام کس قدر جامعیّت کا حامل ہے۔ سچ ہے: "کلام الامام امام الکلام"۔ اسی طرح اس سلسلہ میں حضرت امیر علیہ السلام کا یہ کلام حق ترجمان بھی بڑی جامعیّت و افادیت کا حامل ہے: "عرفت ربی بفسخ العزائم و نقض الھمم عن مت ففسخ عزمی فنقض ھمی فعرفت ان المدبر غیری"۔ "مَیں نے اپنے رب کو عزم و ارادہ کے توڑنے سے پہچانا ہے۔ مَیں ارادہ کرتا ہوں مگر وہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اس سے مَیں نے یہ یقین کر لیا ہے کہ مدبر مَیں نہیں بلکہ کوئی اور ذات ہے۔ (بحار الانوار جلد ۲)

اس طرح اس موضوع پر انہی جناب سے ایک مختصر مگر جامع جواب مروی ہے۔ آپؑ سے

دریافت کیا گیا: اِثباتِ صانع پر کیا دلیل ہے؟ فرمایا: "ثلاثۃ اشیاء: تحویل الحال و ضعف الارکان و نقض الھمۃ"۔ "تین چیزیں دلیل ہیں۔ اوّل ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف تبدیل کرنا، دوم اعضا و جوارح میں ضعف و کمزوری کا پیدا ہونا، سوم ارادہ کا ٹوٹ جانا"۔ (بحار الانوار جلد ۲)

خُلَاصَۂ کَلَام یہ کہ مصنوع کو دیکھ کر صانع کا، اور اثر کو دیکھ کر مؤثر کا تصور اور اس کے وجود کی تصدیق ایک فطری اور بدیہی امر ہے۔ منکرین خدا بتلائیں کہ دنیا میں کوئی ایسا صحیح الدماغ شخص ہے جو مکان کو دیکھے مگر مکان بنانے والے کا تصور اور اس کے وجود کی تصدیق نہ کرے۔ کتاب دیکھے اور اس کے مُصنّف و مؤلف کا تصور نہ کرے۔ ؎

بلوحے گر ہزاراں نقش پیدا ست
نیاید بے قلم آں یک الف راست

خدا کی ہستی کے موضوع پر ایک دلچسپ مکالمہ

صاحب رسالہ دین و شریعت نے ایک منکر خدا کے ساتھ اپنا ایک عجیب مکالمہ نقل کیا ہے، جو اس مقام کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔ افادۂ ناظرین کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ لکھتے ہیں: "ایک دفعہ ایک ایسے صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے جو اللہ تعالیٰ کی ہستی کے بارے میں شک رکھتے تھے اور اس پر بحث کرنا چاہتے تھے۔ راقم سطور نے اپنی جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکال کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس کاغذ پر جو حروف لکھتے ہوئے ہیں وہ کسی لکھنے والے نے نہیں لکھے ہیں بلکہ آپ سے آپ لکھے گئے ہیں، تو کیا آپ میری اس بات کو مان لیں گے؟ یا اس کا امکان بھی تسلیم کرلیں گے؟ انھوں نے کہا: نہیں، یہ بالکل ناممکن ہے۔ پھر مَیں نے کہا: اور اگر اسی طرح مَیں اپنی گھڑی کے متعلق آپ سے کہوں کہ یہ کسی بنانے والے نے بنائی نہیں ہے بلکہ آپ سے آپ یہ بن گئی ہے یا اپنے اس فونٹن پن کے بارہ میں دعویٰ کروں کہ یہ کسی بنانے والے نے بنایا نہیں ہے بلکہ یونہی آپ سے آپ بن کر آسمان سے گر پڑا ہے یا اگر کسی دوڑتی ہوئی موٹر کے متعلق مَیں آپ سے کہوں کہ اس کو کسی نے بنایا نہیں ہے بلکہ یہ آپ سے آپ بن گئی ہے اور کوئی ڈرائیور اس کو چلا نہیں رہا ہے بلکہ یہ آپ سے آپ دوڑ رہی ہے اور ہر موڑ پر خود ہی قاعدہ کے مطابق مڑ جاتی ہے۔ تو کیا آپ میری ان باتوں کو باور کرسکیں گے؟ تو ان صاحب نے جواب دیا کہ ان میں سے تو کسی بات کو بھی عقل تسلیم نہیں کرسکتی۔ میں نے ان سے کہا: اللہ کے بندے! موٹر، فونٹن پن اور گھڑی

جیسی چیزوں کے متعلق تو آپ کی سمجھ میں نہیں آسکتا کہ یہ آپ سے آپ بن گئی ہیں اور اس کاغذ پر لکھے ہوئے ٹیڑھے ترچھے حروف کے متعلق بھی آپ کی عقل کسی طرح نہیں مان سکتی کہ آپ سے آپ لکھے گئے ہیں لیکن چاند، سورج یہ ایک حیرت انگیز حکیمانہ نظام کے ساتھ چل رہے ہیں، اور ان سے بھی عجیب تر انسان کی ہستی ہے۔ اس کا دل و دماغ اور اس کی آنکھیں اور اس کے کان اور اس کی زبان ان سب کے متعلق آپ کی عقل مان سکتی ہے کہ یہ بغیر کسی کے بنائے آپ سے آپ ہی بن سکتے ہیں۔ پھر مَیں نے ان سے کہا کہ: بس آپ کے نزدیک یہ بات بالکل بدیہی اور نا قابلِ بحث ہے کہ کاغذ کے اس پرزہ پر جو کچھ لکھا ہوا ہے اسے کسی لکھنے والے نے لکھا ہے اور اس گھڑی، فونٹن پن کو کسی بنانے والے نے بنایا ہے اور موٹر بھی کسی کارخانہ میں بنی ہے اور اگر وہ چل رہی ہے تو یقیناً چلانے والے کے چلانے سے چل رہی ہے۔ اسی طرح یہ بات اس سے بھی زیادہ بدیہی اور قطعاً نا قابلِ بحث ہے کہ یہ چاند، سورج اور انسان، حیوانات اور یہ ساری کائنات کسی حکیم وخبیر اور کسی کامل القدرۃ ہستی کی بنائی ہوئی ہے اور اس میں شک وبحث کرنا اپنی فطرت کے مسخ ہوجانے یا عقل سے اپنے بالکل کورے ہونے کا ثبوت دینا ہے۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِمَنۡ کَانَ لَہٗ قَلۡبٌ اَوۡ اَلۡقَی السَّمۡعَ وَ ہُوَ شَہِیۡدٌ ﴿۳۷﴾

(سورۃ قٓ:۳۷)

ہر رنگ میں جلوہ ہے تیری قُدرت کا
جس پھُول کو سُونگھتا ہُوں بُو تیری ہے

استدلال بر وُجودِ خُدا بطریقہء عرفاء شامخین

کلام معصومین صلوات اللہ علیہم اجمعین میں غور وخوض کرنے سے معلُوم ہوتا ہے کہ جو طرق اوپر بیان کیے گئے ہیں، یہ مکتب معرفت الٰہی کے ابتدائی سبق کی حیثیت رکھتے ہیں اور کتابِ قرآن کی ابجد ہیں۔ ان سے مخالف کی زبان بند ہوسکتی ہے۔ مُنکر کو قائل کیا جاسکتا ہے لیکن اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ اس سے حقیقی لذت معرفتِ پروردگار سے لطف اندوز ہو، اور نفس ایمان کو جلا ہو تو یہ سراسر خیال ہی خیال ہے، وہ خدا جس کی ہستی ہماری دلیل کی بنا پر ہے وہ تو اپنی ہستی میں ہماری دلیل اور اپنی مخلوق کا محتاج ہوگا۔ تعالیٰ اللہ عن ذٰلك علوًّا کبیرًا۔ کس قدر کند ذہن ہوگا وہ طالبِ معرفت جو اپنی تمام زندگی معرفت کی اسی ابجد خوانی میں صرف کردے اور "یا من دل علیٰ ذاتہ بذاتہٖ" اور "اعرفوا اللہ باللہ" کے

مقام منیع تک رسائی حاصل کرنے کی سعی نہ کرے۔ اس لیے ہادیانِ دین وسالکانِ مسلک معرفت رب العالمین یعنی حضرات ائمۂ طاہرینؑ چاہتے تھے کہ بتدریج اپنے موالیان باتمکین کو عرفان کی ان آخری مقاماتِ عالیہ کی سیر کرائیں ۔ جن پر وہ خود فائز المرام تھے۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ خدائے قدوس کی معرفت خدا ہی کے ذریعہ کرتے ہیں اور بجائے اس کے کہ وہ مخلوق کو خالق کا معرف اور آلۂ معرفت بنائیں۔ اس کے برعکس وہ مخلوق کو خالق کے ذریعہ پہچانتے ہیں اور اسی طریقہ کار کی کاملین کو تعلیم بھی دیتے ہیں۔

چنانچہ سید الموحدین حضرت امیرالمومنین علیہ السلام "دعائے صباح" میں خداوند عالم کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں: "یا من دل علی ذاتہ بذاتہ و تنزہ عن مجالسۃ مخلوقاتہ" اے وہ بزرگ و برتر خدا جو اپنی ذات پر خود ہی دلالت کرتا ہے اور اپنی مخلوق کے ساتھ مشابہت سے منزہ و مبرا ہے۔

اس سلسلہ میں ثانی الثقلین حضرت امام حسین علیہ السلام کا دعائے عرفہ والا کلام حق ترجمان پہلے پیش کیا جا چکا ہے۔ جس میں آپؑ فرماتے ہیں: "کیف یستدل علیك بما هو فی وجوده مفتقر الیك" ...... الخ ...... بارِ الہا! ان چیزوں سے تیری ہستی پر کیونکر استدلال کیا جا سکتا ہے جو اپنی ہستی میں خود تیری محتاج ہیں...... الخ

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام دعائے ابوحمزہ ثمالیؒ میں فرماتے ہیں: "الهی بك عرفتك و انت دللتنی علیك و لولا انت لم ادرما انت"۔ اے میرے معبود! تو نے ہی اپنی معرفت کے متعلق میری راہبری فرمائی۔ اگر تو نہ ہوتا تو میں یہ سمجھ ہی نہ سکتا کہ تو کیا ہے؟

کتب سیر و تواریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ائمۂ طاہرینؑ کے بعض اصحابِ کاملین معرفت کے اسی درجہ رفیعہ پر فائز تھے۔ چنانچہ اصولِ کافی میں جناب منصور بن حازم سے مروی ہے کہ انھوں نے حضرت صادق آلِ محمد علیہ السلام کی خدمت میں اپنے اس مناظرہ و مباحثہ کی روئداد بیان کی جو انھوں نے ایک جماعت مخالفین کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے ضمن میں انھوں نے امام کی خدمت میں عرض کیا کہ میں نے ان لوگوں سے کہا: "ان الله جل جلاله اجل و اعز و اکرم من ان یعرف بخلقه بل العباد یعرفون بالله"۔ یعنی "خداوند عالم کی ذاتِ بابرکات اس سے کہیں اجل و اعلیٰ ہے کہ وہ اپنی مخلوق کے ذریعہ سے پہچانی جائے، بلکہ اس کی مخلوق اس کے ذریعہ سے پہچانی جاتی ہے۔ امام عالی مقام جناب منصور کا یہ کلام سن کر مسرور و شادکام ہوئے اور فرمایا: "یرحمك الله"۔ "خدا تم پر رحم و کرم فرمائے"۔

یہ بزرگوار اپنے تمام نام لیواؤں کو معرفت کے اسی مرتبہ عظمیٰ تک لے جانے کے متمنی نظر آتے

ہیں۔ چنانچہ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کا یہ ارشاد اصول کافی میں موجود ہے۔ فرمایا:

اعرفوا اللّٰہ باللّٰہ و الرسول بالرسالۃ و اولی الامر بالامر بالمعروف

اللہ سبحانہ کو خود اللہ سے اور رسول کو رسالت سے اور اولی الامر کو امر بالمعروف سے پہچانو

اب رہا یہ امر کہ معرفت کا یہ بلند مقام کس طرح حاصل ہوتا ہے؟ اس کی کیفیت کیا ہے؟ اس کا طریقہ اکتساب کیا ہے؟ تو اس کے متعلق اگرچہ علماء اعلام نے بہت کچھ طویل کلام کیا ہے، اور واقعاً اس سلسلہ میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ جس کے لیے اس شرح کے اوراق متحمل نہیں ہیں۔ مگر ہمارا نظریہ یہ ہے کہ بموجب فارسی ضرب المثل کے کہ: "حلوائے نانتانی تا نخوری ندانی"۔ یہ امر حال سے تعلق رکھتا ہے، نہ مقال سے، اس کے لیے "علم الاخلاق" کی سیر کر کے "تخلقوا باخلاق اللہ" کے عملی مظاہرہ کی ضرورت ہے۔ "ولقد اجد من افاد"۔

ہاں مجرد شو مجرد را ببیں
دیدن ہر چیز را شرط است ایں

ولنعم ما قیل:

بسر قصہ سیمرغ و قصۂ ہدہد
کسے رسد کہ شناسائے منطق الطیر است

سبحانك لا علم لنا الا ما علمتنا انك انت العزيز الحكيم اللهم ارزقنا حلاوة معرفتك الكاملة بجاه النبي و عترته الطاهرة

فرقہ دہریہ کے چند شکوک و شبہات کا ازالہ

انکار وجودِ باری تعالیٰ کے سلسلہ میں مادیین و دہریین کے بزعم خود دلائل کو ہم نے شکوک و شبہات سے اس لیے تعبیر کیا ہے کہ اگر ان کو میزانِ عقل و دانش پر جانچا جائے تو وہ دلائل کہلانے کے حقدار ثابت نہیں ہوتے، بلکہ بموجب ارشادِ قدرت: "وَ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ" (جاثیہ:۲۴) ان کے پاس علم و یقین نہیں بلکہ جو کچھ ہے وہ سراسر اَوہام و ظنون ہیں۔ "اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا" (یونس:۳۶) سطورِ بالا میں منکرین کے انکار کی وجوہات تفصیل سے ذکر ہو چکی ہیں، اگرچہ مذکورہ بالا بیاناتِ شافیہ کے بعد مزید کچھ خامہ فرسائی کی چنداں ضرورت نہ تھی، کیونکہ وہ بیاناتِ طالبانِ حق و متلاشیانِ حقیقت کو راہِ راست پر لانے کے لیے کافی ہیں۔ تاہم ہم چاہتے ہیں کہ قدیم و جدید ملاحدہ و

دہریہ جن شکوک و شبہات کی بنا پر وجودِ باری تعالیٰ کا انکار کرتے ہیں، ان میں سے چند اہم شبہات کا یہاں ذکر کر کے ان کے مکمل جوابات پیش کر دیں، تاکہ یہ مبحث کسی لحاظ سے بھی تشنۂ تکمیل نہ رہ جائے۔

شبہ اولیٰ اور اس کا جواب

اور یہی شبہ دہریہ کے قصر انکار کا سنگ بنیاد ہے۔ وہ یہ کہ: ہر وہ چیز جو حواسِ خمسہ ظاہریہ (لامسہ، ذائقہ، شامہ، سامعہ، باصرہ) سے محسوس و مشاہدہ نہ ہو، اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اور چونکہ خدائے تعالیٰ ان حواس کے ساتھ محسوس نہیں ہوتا، لہٰذا (معاذاللہ) وہ موجود نہیں ہے۔" اگر معمولی غور و فکر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس شبہ کا ازالہ کسی دلیل و برہان کا محتاج نہیں ہے، بلکہ یہ بالکل واضح البطلان ہے۔ کیونکہ مشہور و مسلّم اُصول ہے کہ: "عدم الوجدان لا یدل علی عدم الوجود" کسی شے کا نہ پانا اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ دور جانے کی ضرورت نہیں، خود انسان کے اندر اس امر کے کئی شواہد و دلائل موجود ہیں۔ مثلاً رُوح، عقل، حافظہ، لذت و رنج، صحت و سقم، محبّت و عداوت اور بھوک و پیاس وغیرہ کئی ایسی اشیاء ہیں جن کا وجود نا قابلِ انکار ہے۔ مگر یہ سب سوائے حواسِ باطنیہ اور اپنے خواص و آثار کے حواسِ ظاہریہ کے ساتھ محسوس نہیں ہوتیں۔ حتی کہ انہی حواسِ ظاہریہ میں جو قوتیں موجود ہیں، یعنی چھونے، چکھنے، سُونگھنے، سننے اور دیکھنے کی قوت، وہ خود محسوس نہیں تو کیا کوئی عقل مند فقط اس وجہ سے کہ یہ چیزیں ظاہری حواس کے ساتھ محسوس نہیں ہوتیں، ان کے وجود کا انکار کر سکتا ہے؟ قدیم زمانہ کے دہریے اسی اصول غیر معقول کی بنا پر نفس و رُوح کے وجود کا انکار کرتے ہوئے اسی ظاہری ہیکل کو ہی انسان کہتے تھے۔ مگر آج موجودہ دور کی سائنسی تحقیقات جدیدہ اور انکشافاتِ مُفیدہ بالخصوص علم تنویم قوتِ مقناطیسی اور علم احضار الارواح نے ان کے نظریات کو باطل کر کے ان کو رُوح کے وجود کا اقرار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اور ان کے لیے معرفتِ خدا کا ایک نیا باب کھول دیا ہے۔ اسی وجہ سے مخبر صادق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: "من عرف نفسه فقد عرف ربه"۔ "جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا، اس نے اپنے رب کو پہچان لیا"۔

مگر افسوس یہ لوگ اللہ سبحانہ کو فراموش کر بیٹھے اور اس ذات قہار نے ان کو اپنے نفس بھی بھلا دیے۔ جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: "نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ" (سورۃ الحشر:۱۹) یہ لوگ خدائے عزوجل کو بھول گئے اور خدا نے ان کو ان کے نفوس بھلا دیے۔

گندم از گندم بروید جو زِ جو ۔۔۔ از مکافاتِ عمل غافل مشو

حقیقت الامر یہ ہے کہ انسانی علم جیسا کہ ارشادِ باری ہے: " وَمَآ اُوۡتِيۡتُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِيۡلًا " (بنی اسرائیل: ۸۵) بہت ہی ناقص اور محدود ہے اس لیے ہمارا علم ان تمام حقائق کو جو خیال میں آسکتے ہیں معلوم کرنے سے قاصر ہے۔ بایں ہمہ روز بروز کئی ایسی چیزوں کے وجود کا انسان کو علم ہوتا رہتا ہے کہ جو پہلے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتیں۔ اور پھر بھی حواس ظاہریہ سے محسوس نہیں ہوسکتیں۔ قوتِ برقیہ (بجلی) کو دیکھیے، اس کے دریافت ہونے سے پہلے اس کا کون خیال کرتا تھا؟ اس کے خواص و آثار کا کسے علم تھا؟ اتفاقیہ طور پر یہ قوت دریافت ہوگئی، اور آج ہم اس سے ہزاروں فائدے حاصل کر رہے ہیں اور باوجود کہ وہ عالم طبیعیّات میں سے ہے، آج تک اس کا مشاہدہ نہیں ہوسکا۔ مگر ہر شخص اس کے خواص و آثار دیکھ کر اس کے موجود ہونے کا یقین رکھتا ہے۔ اسی طرح قوتِ مقناطیسی کا وجود بھی اپنے آثار و لوازم کی بنا پر حتمی و یقینی ہے۔ مگر آج تک کسی شخص نے اسے آنکھ سے نہیں دیکھا۔ کیا کوئی صحیح الدماغ انسان اس کے آثار دیکھنے کے باوجود اس کے موجود ہونے کا انکار کرسکتا ہے؟ طرفہ تماشا یہ کہ خود مادۂ اثیر (ایتھر) ہی کو لے لیجیے، جسے یہ فرقہ اصل کائنات قرار دیتا ہے۔ کیا انھوں نے اس کو اپنے حواسِ خمسہ میں سے کسی حاسہ کے ساتھ ادراک کیا ہے؟ حاشا و کلا، ہمارے اسی مادی عالم میں کئی ایسی چیزیں موجود ہیں کہ خورد بین استعمال کیے بغیر ہمارے حواس ان کا ادراک نہیں کرسکتے، تو پھر کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اسی عالم میں کچھ ایسی چیزیں بھی موجود ہوں کہ جن کو ہمارے حواس ظاہریہ باوجود آلات کے استعمال کرنے کے بھی درک نہ کرسکیں۔ جیسا کہ نا مبردہ اشیاء کی یہی کیفیّت ہے۔ پس ان حقائق سے ثابت ہوگیا کہ جب ہمارے حواس اس قدر عاجز و کمزور ہیں کہ اسی مادی عالم کی بعض اشیاء کا بھی ادراک نہیں کرسکتے لیکن وہ اشیاء یقیناً موجود ہیں، تو اگر دوسرے عالم کی بعض اشیاء کا ادراک نہ کرسکیں تو اس میں کون سی تعجب کی بات ہے۔ لہٰذا محض اس بنا پر خداوند عالم کی ہستی کا انکار کرنا کہ اسے ہمارے حواسِ خمسہ درک نہیں کرسکتے، باوجودیکہ اس کہ ہستی کے بے شمار آثار موجود ہیں۔ بالکل خلافِ عقل و دانش بات ہے۔ ؎

و جمیع اوراق الغصون دفاتر　　　مشحونة　بادلة　التوحید

یعنی ہمہ عالم کتابِ حق تعالیٰ است

اور یہ آثار بے شمار بتلاتے ہیں کہ ان کی موجودگی میں ان کے مؤثر کا انکار کرنا عین حماقت و جہالت ہے۔ ؎

تجلت لوحدانیة الحق انوار　　　فدلت علی ان الجحود هو العار

شبہ ثانیہ اور اس کا جواب

اگرچہ قدمائے زنادقہ و فلاسفہ کا اس مادی عالم کی اصل اور اشیاء ارضی و سماوی کی خلقت کے بارے میں باہم بڑا اختلاف ہے اور ہر ایک نے علیحدہ علیحدہ ایک نظریہ قائم کیا ہے، لیکن زمانہ حال میں جس امر پر ان کی رائے مُستقر اور قائم ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اس عالم ارضی و سماوی کی تمام اشیاء کی اصل دو امر ہیں۔ مادہ اور اس کی حرکت ۔ یہ دونوں قدیم ہیں ۔ اور ازل سے ان کے درمیان تلازم ہے ۔ پہلے کوئی شے نہ تھی ۔ فضا ذراتِ مادیہ سے لبریز تھی ۔ پھر یکایک ان ذرات و اجزاء میں تموج اور حرکت پیدا ہوئی، اور اس سے کائنات ارضی یعنی جمادات و نباتات اور حیوانات بنے ۔ اور اسی سے اجرام سماوی یعنی آفتاب و ماہتاب اور ستارے خود بخود معرضِ وجود میں آگئے (اس پیدائش کی کیفیت اور تفصیل سے یہاں بحث کرنا خارج از مقصد ہے) خلاصہ یہ کہ یہ فرقہ کائنات کی اصل "مادہ" کو قرار دیتا ہے، اور اسے قدیم کہتا ہے ۔ اس بنا پر وہ وجودِ خدا کا منکر ہے ۔

یہ شُبہ بچند وجہ باطل اور نا قابلِ قبول ہے ۔

① وجہ اول: تمام فلاسفہ و دہریہ کا اس امر پر تقریباً اتفاق ہے کہ مادہ میں نہ عقل ہے نہ شعور ۔ نہ حس ہے، نہ حرکت اور نہ اس میں حیات و زندگی ہے، مگر مشاہدہ شاہد ہے کہ کائنات میں کروڑوں چیزیں ایسی موجود ہیں جو زیور حیات سے آراستہ اور زینتِ عقل و شعور سے مرصع و مزین اور نعمتِ حس و حرکت سے مالا مال ہیں ۔ اور یہ اصول بلا امتیاز مذہب و ملت تمام حکماء بلکہ تمام عقلاء کے نزدیک مُحقّق و مُسلّم ہے کہ "فاقد شئ معطی شئ" نہیں ہوسکتا۔ یعنی جس کے پاس جو چیز موجود نہ ہو وہ دوسرے کو نہیں دے سکتا، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مادہ ہی اصل کائنات ہے اور وہی مبدأ عالم ہے اور خود اس میں عقل و شعور اور حرکت و حیات نہیں ہے، تو کائنات میں عقل و حیات کہاں سے آگئی؟

اہلِ سائنس نے یہ امر معلوم کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ اس میں آج تک کامیاب نہ ہو سکے ۔ اور انھوں نے اس سلسلہ میں مُتعدّد نظریات قائم کیے ۔ لیکن بالآخران کو یہ اقرار کرنا پڑا ہے کہ وہ اس مُعمہ کو حل کرنے میں ہرگز کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے ۔ بھلا کوئی عقل سلیم اس بات کو کیونکر تسلیم کر سکتی ہے کہ ایک بے عقل و شعور شے، صاحبِ عقل و ادراک اور ذی حیات ہستی کو پیدا کر دے ۔ مالکم کیف تحکمون؟

② وجہ دوم: یہ امر مُسلّم و مبرہن ہے کہ حرکت بلا محرک پیدا نہیں ہوسکتی تو مادہ میں وہ حرکتِ اولین

کیونکر پیدا ہوئی؟ وہ حرکت کس نے پیدا کی؟ اس حرکت اولین کا باعث وسبب کیا تھا؟ سائنس اور فلسفہ آج تک اس سوال کا کوئی تسلی بخش جواب پیش نہ کر سکا۔ اور نہ ہی آئندہ اس سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ اس گتھی کو سلجھا سکے۔

دہریت میں یہ بڑا نقص ہے کہ وہ ان یا ان جیسے دیگر سوالات کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکتی۔ قرآن نے تو پہلے ہی صاف صاف کہہ دیا تھا کہ: "وَ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ" (جاثیہ: ۲۴) کہ وہ دولتِ علم ویقین سے تہی دامن ہے۔ ہر دعویٰ کے لیے ثبوت ضروری ہوتا ہے۔ کوئی دعویٰ بلا دلیل قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اگر ان میں ہمت وجرأت ہے تو وہ اپنے دعاوی کو دلائل و براہین سے ثابت کریں کہ مادہ ازل سے موجود ہے۔ بے جان مادہ میں زندگی پیدا کرنے کی طاقت موجود ہے۔ اس میں خودبخود حرکت پیدا ہوئی۔ ایک ہی مادہ سے مختلف الانواع چیزیں پیدا ہوسکتی ہیں بے عقل وبے حس مادہ باعقل وباحس اشیاء کو پیدا کر سکتا ہے؟

کیا دہریوں کو ان اُمور کا علم ہے؟ قرآن بتلاتا ہے کہ ان کو علم نہیں ہے۔ سائنس دانوں کو اِعتراف ہے کہ ان کو کوئی علم نہیں۔ بعد ازاں دہریت کے پاس رہ ہی کیا جاتا ہے؟ ہم دعویٰ کے ساتھ کہتے ہیں کہ تمام رُوئے زمین کے ملاحدہ ودہریہ قیامت تک ان سوالات کے تحقیقی جوابات نہیں دے سکتے۔ ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔

ان حقائق کے پیشِ نظر ماننا پڑتا ہے کہ یہ کائنات ایک ایسے حی وقیوم، خالق حکیم اور قادرِ علیم کی قدرتِ کاملہ کا نتیجہ ہے، جو "علی کل شیء قدیر" کا مصداق ہے اور عقل وشعور اور حیات ووجود اس کا عین ذات ہے۔ اور تمام کائنات کی بادشاہت اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ ۡ وَ هُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ ۙ (سورۃ الملک:۱)

اسی لیے اسلام بلا کسی تذبذب کے پورے وثوق واطمینان کے ساتھ کہتا ہے کہ موت وحیات کو خداوند عالم نے پیدا کیا ہے۔ اور موت وحیات کے آلات واسباب کا بھی وہی خالق ہے۔ سب اسباب وواقعات اس کے زیر حکم ہیں۔

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (سورۃ الملک:۲)

③ وجہ سوم: اس تمام شبہ کا دارومدار اس بات پر ہے کہ مادہ قدیم وازلی ہے۔ مگر ادلۂ قطعیہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ خود مادہ بھی دیگر مادیات کی طرح حادث ہے، نہ کہ قدیم۔ یہاں اس کے حدوث کے چند دلائل ذکر کرتے ہیں۔

حدوثِ مادہ کی پہلی دلیل

پرستارانِ مادہ قائل ہیں کہ عالم کے تمام تغیّرات وتبدلات حادث ہیں اور ماہرین طبقات الارض کا بھی اس امر پر اتفاق ہے کہ نباتات وحیوانات کی تمام انواع پہلے موجود نہ تھیں ۔ مدت مدید کے بعد کتم عدم سے عرصہ وجود میں جلوہ گر ہوئیں ۔ پس اگر ان تمام تغیّرات وتبدلات کی علّت مادہ اور اس کی حرکت ہے اور یہ تغیّرات اس کے معلول، تو جب یہ علّتِ قدیم ہے تو معلول کیوں حادث ہے؟ علّت ومعلول میں یہ تفریق وجدائی عقلاً محال وناممکن ہے ۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ علّت تو قدیم ہو مگر اس کے معلولات حادث ہوں؟ جب علّت موجود تھی تو اس کے معلولات کیوں لاکھوں برس بعد وجود میں آئے ۔ یہاں اگر یہ عذر پیش کیا جائے کہ یہ اس قدر طویل زمانہ استعداد کی انتظار میں گزرا کہ معلومات میں استعداد پیدا ہو جائے تو پھر وجود میں آئیں ۔ تو اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ جب اس کی اِستعداد کی علّت بھی وہی مادۂ قدیمہ ہے تو وہ استعداد اس سے قبل کیوں پیدا نہ ہوگئی؟ یہاں اگر یہ کہا جائے کہ مادہ قدیمہ نے اپنے ارادہ واختیار سے ان چیزوں کی تخلیق کے لیے جو وقت چاہا مقرر کردیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مادہ میں تو علم وارادہ اور عقل وشعور ہے ہی نہیں، تو وہ ان کی تخلیق کا وقت کیونکر معین کر سکتا ہے؟

خُلاصۂ کلام یہ کہ اگر علّت قدیم ہے، تو پھر یا تو تغیّرات وتنوعات کو بھی قدیم تسلیم کیا جائے حالانکہ ان کا حادث ہونا اظہر من الشّمس ہے ۔ اور ہم اس موضوع پر پہلے کافی تبصرہ کر چکے ہیں اور یا پھر مادہ کو بھی ان تبدلات کی طرح حادث مانا جائے ۔ اور یہی درست ہے کہ ایک وقت تھا کہ نہ مادہ تھا نہ مادیات نہ ان کے تغیّرات اور تنوعات ۔ قادر قیوم خدائے مُختار نے ان کو پردۂ عدم سے نکال کر خلعتِ وجود سے سرفراز فرمایا۔

هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا ① (سورۃ الدھر:۱)

دوسری دلیل

اس عالم میں جس قدر تغیّر وتبدّل اور تحوّل وتنوّع مادہ میں پایا جاتا ہے، اتنا کسی اور شے میں نہیں ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ مادہ میں ارادہ واختیار اور علم وادراک نہیں ہے ۔ لہٰذا یہ تو ممکن نہیں ہے کہ اس کے ان تغیّرات وتبدّلات کی علّت اس کے ارادہ کو قرار دیا جائے کہ وہ اپنے ارادہ واختیار سے یہ مختلف شکلیں وصورتیں بدلتا رہتا ہے ۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ ایک قدیم وقدیر اور علیم وبصیر ایسی ذات والاصفات موجود

ہے، جو اپنے ارادہ واختیار سے اس مادہ میں مناسب تغیّر وتبدّل کرتی رہتی ہے۔ یہ امر سابقاً مبرہن کیا جا چکا ہے کہ جس چیز میں تغیّر وتبدّل ہو وہ حادث ہوتی ہے۔

تیسری دلیل

یہ قاعدہ ہے کہ جس چیز کا وجود اصلی اور ذاتی ہو اس میں تغیّر وتبدّل ناممکن ہوتا ہے۔ کیونکہ کسی چیز میں تبدّل اسی وقت ہو سکتا ہے کہ جب کسی اور شے کو اس کے وجود میں دخل ہو۔ اور ظاہر ہے کہ قدیم اور واجب الوجود میں کسی کا دخل ممکن نہیں ہے۔ مگر یہ امر بالمشاہدہ ثابت ہے کہ مادہ میں بے شمار تغیّرات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے ماننا پڑے گا کہ مادہ قدیم نہیں ہے۔

يَآيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۞ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۞ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۞ (سورۃ الفطار:۸)

اے انسان! تجھے اپنے کریم پروردگار کے بارے میں کس چیز نے دھوکا دیا، جس نے تجھے پیدا کیا، تو تجھے درست بنایا، اور مناسب اعضاء دیلے، اور جس صورت میں اس نے چاہا تیرے جوڑ بند بنا گئے۔ (ترجمہ فرمانؒ)

چوتھی دلیل

اس عالم رنگ و بو میں حضرت انسان علم و ادراک، فہم و فراست، صنعت و حرفت، فضل و کمال، ارادہ و اختیار اور طاقت و قدرت میں تمام کائنات پر فوقیت رکھتا ہے۔ مگر اس کے باوجود ایک مچھر بھی نہیں پیدا کر سکتا، تو عقل انسانی یہ کس طرح باور کر سکتی ہے کہ ایک بے عقل و شعور اور بے حس و حرکت اور بے جان مادہ نے حضرت انسان کو اور دیگر صنائع و بدائع کو پیدا کیا ہے۔ لہٰذا عقل مادہ کو حادث اور مخلوق ماننے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ خود مخلوق ہے، خالق نہیں ہے۔

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۞ (سورۃ الطور:۳۵)

کیا یہ لوگ کسی کے (پیدا کیے) بغیر ہی پیدا ہو گئے ہیں یا یہی لوگ (مخلوقات کے) پیدا کرنے والے ہیں؟ (ترجمہ فرمانؒ)

پانچویں دلیل

مُسلّم ہے کہ جس طرح ممکن اپنے وجود میں واجب الوجود سے کمتر ہوتا ہے اسی طرح یہ بھی

ضروری ہے کہ وہ اپنی صفات میں واجب کی صفات سے کمتر ہو۔ لیکن اگر مادہ کو قدیم اور اصل تسلیم کر لیا جائے تو معاملہ اس کے برعکس معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ بنا بریں مادہ و حرکت میں جس سے بقول دہریہ، یہ کائنات پیدا ہوئی ہے، علم و ادراک اور ارادہ و اختیار کا کہیں نام و نشان تک نہیں ہے۔ مگر کائنات میں یہ سب صفتیں بدرجہ اتم و اکمل موجود ہیں تو کیا اثر اپنے موثر سے اور مصنوع اپنے صانع سے بڑھ سکتا ہے اور کیا "فاقد شی مُعطی شی" ہوسکتا ہے؟ کیا ایسے خلافِ عقل نظریہ کو عقل سلیم وطبع مستقیم تسلیم کر سکتی ہے؟ مالکم کیف تحکمون؟

(علم الکلام کاندھلوی) ؎

ذات نا یافته از هستی بخش نتواند که شود هستی بخش

ان دلائل ساطعہ و براہین قاطعہ سے واضح و آشکار ہو گیا کہ مادہ کو قدیم اور مبدأ کائنات قرار دینا بالکل ایک ایسا لغو اور بے ہودہ نظریہ ہے کہ جسے عقل سلیم ہرگز صحیح تسلیم نہیں کر سکتی۔

اِستعجاب

تعجب ہے کہ دہریوں نے اس موقعہ پر اپنے ایک مشہور قاعدہ کو بھی خیر باد کہہ دیا ہے۔ وہ یہ کہ وہ بلا مشاہدہ کسی چیز کو نہیں مانتے۔ ہم دریافت کرتے ہیں کہ کیا انھوں نے مادہ اور اس کی حرکتِ قدیم کا مشاہدہ کیا ہے؟ اس مقام پر اگر وہ یہ جواب دیں کہ ہم نے اگرچہ مادہ اور اس کی حرکتِ قدیمہ کا مشاہدہ تو نہیں کیا، مگر اس کے آثار یعنی تغیّرات و تبدلات سے یہ کشف کیا ہے کہ ان کا کوئی موثر ضرور ہے۔ تو ہم کہیں گے کہ ہمارا بھی بعینہٖ یہی استدلال ہے کہ جب ہم اس عالم میں ایسے عجیب وغریب آثار دیکھتے ہیں کہ جن کے فہم و ادراک سے عقول و افہام حیران اور سر بگریبان ہیں تو ہم یہ ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان آثار کی موثر کوئی ایسی ہستی ہے جو علم و فضل، ارادہ و اختیار، قدرت و حکمت اور حیات وغیرہ صفاتِ کمالیہ سے بدرجہ اتم و اکمل متصف ہے۔ ذلك الله رب العالمین۔

اور اگر یہ کہا جائے (جیسا کہ موجودہ زمانہ کے بعض زنادقہ و دہریہ کہتے ہیں) کہ یہ سب صفات مادہ میں موجود ہیں تو ہماری اور ان کی تمام بحث و نزاع ہی ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ پھر حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں رہ جاتا۔ فقط نام کا فرق ہے، جسے ہم خداوند عالم کہتے ہیں، اسے وہ مادہ کہہ رہے ہیں۔ ؎

الکل الی ذاك الجمال یشیر و لقد اجاد من افاد

ہندو نے بتوں میں جلوہ پایا تیرا
آتش پہ مغوں نے راگ گایا تیرا

دہری نے کیا دہر سے تجھ کو تعبیر
انکار کسی سے نہ بن آیا تیرا
(حالی)

یا صنم یا صنم از خلق جہاں می شنوم
ایں صنم کیست کہ عالم همه دیوانه اوست

شبہ ثالثہ اور اس کا جواب

اس کائنات کا کوئی مبدأ نہیں ہے۔ نہ خدا نہ مادہ، بلکہ یہ عالم اتفاقاً ظہور پذیر ہوگیا ہے۔
حقیقت الامر یہ ہے کہ جب دہریوں کا مذکورہ بالا دلائل وغیرہ سے ناطقہ بند کیا جاتا ہے کہ ایک بے عقل و بے حس اور بے ارادہ واختیار اور بے طاقت و بے حیات مادہ کیونکر یہ عجائب وغرائب سے بھرا ہوا عالم پیدا کرسکتا ہے؟ تو ان لوگوں پر قافیہ حیات تنگ ہوجاتا ہے اور بموجب "وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ" (سورۃ التوبہ:۲۵) اور زمین اپنی وسعت کے باوجود اس طرح تنگ ہوجاتی ہے کہ ان کے لیے "نہ جائے ماندن اور نہ پائے رفتن" والا معاملہ درپیش آجاتا ہے تو اس وقت یہ لوگ بمفحوای "الغریق یتشبث بکل حشیش" (ڈوبتے کو تنکے کا سہارا) اس ذہنی کش مکش وتذبذب کے عالم میں وہ وہ عجیب مذبوحی حرکات کرتے ہیں اور ایسے ایسے مہمل ومزخرف جوابات دیتے ہیں کہ جو ان کے مزعومہ مادہ کی طرح عقل وشعور سے بالکل خالی ہوتے ہیں۔

انہی جوابات میں سے ایک جواب یہی ہے جو اس شبہ ثالثہ میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ کائنات کی کوئی اصل نہیں ہے۔ محض صدفۃً واتفاقاً ظہور پذیر ہوگئی ہے۔ ان کے اس جواب باصواب پر یہ مشہور عربی مثل منطبق ہوتی ہے کہ "فرّمن المطر و قام تحت المیزاب"۔ یعنی "بارش سے بھاگا اور پرنالہ کے نیچے کھڑا ہوگیا"۔ ان بے چاروں نے جس امر سے گھبرا کر اس جواب کا سہارا لیا تھا، اتنی خرابیاں اس نظریہ میں نہ تھیں۔ جس قدر اس جواب میں ہیں۔

ہم ذیل میں نہایت اختصار کے ساتھ واضح وآشکار کرتے ہیں کہ یہ جواب بچند وجہ ناقابل سماعت اور یہ شبہ بچند وجہ درجۂ اعتبار سے ساقط ہے۔

① وجہ اول: یہ نظریہ بالکل بدیہی البطلان ہے۔ کیونکہ اس کا تو مطلب یہ ہے کہ فعل بغیر فاعل کے اور اثر بغیر موثر کے واقع ہو جو کہ صاف ترجیح بلا مُرجح ہے۔ اور یہ ایسے ہی محال و ناممکن ہے جیسے ایک کا دو کے برابر یا جیسے دو اور دو کا مل کر تین ہونا، کوئی بھی شخص جسے مبدأ فیض سے معمولی عقل و شعور ملا ہے وہ کبھی ایسے خلافِ عقل و فطرت نظریہ کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ "اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰی لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ" (سورۃ ق:۳۷)

② وجہ دوم: اگر صدفہ و اتفاق کے مشہور معنی لیے جائیں یعنی کسی فعل و اثر کا اس کے فاعل و مؤثر سے بلا قصد و ارادہ ظاہر ہونا اور یہ معنی ان لوگوں نے کیے ہیں جو بے عقل اور بے حس و حیات مادہ کو مبدأ کائنات تصور کرتے ہیں، اور پھر ان پر مذکورہ بالا اعتراضات کیے جاتے ہیں تو وہ ان سے بچنے کے لیے یہ راستہ اختیار کرتے ہیں کہ یہ کائنات مادہ سے بلا ارادہ و اختیار محض اتفاقاً پیدا ہو گئی ہے۔

تو یہ شق بھی مثل سابق باطل ہے۔ کیونکہ بفرض محال، اگر چند لمحات کے لیے ایسے صدفہ و اتفاق کو ممکن بھی تسلیم کر لیا جائے، تاہم یہاں یہ اتفاق باور نہیں کیا جا سکتا، اور اس کی وجہ یہ ہے: یہ مسلّم ہے کہ جو کام اتفاق سے انجام پذیر ہو، وہ پراگندہ اور غیر منظم ہوتا ہے۔ اس میں نہ نظم و نسق ہوتا ہے اور نہ ترکیب و ترتیب۔ مگر کائنات میں وہ نظم و ضبط اور عمدہ ترتیب پائی جاتی ہے کہ عقلاء روزگار اور بڑے بڑے سائنس دان اسے دیکھ کر انگشت بدنداں نظر آتے ہیں۔ اور آج اس علمی دور میں بڑے بڑے سائنس دان اور فیلسوفِ عالم اسی کامل نظام کو مشاہدہ کر کے صانع حکیم کے وجود کا اقرار و اعتراف کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ مگر حکیم روحانی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے آج سے تقریباً تیرہ سو برس پیشتر عالم کی اسی نظم و ترتیب سے صانع عالم کے وجود مسعود پر استدلال فرمایا تھا۔ چنانچہ جناب مُفضل سے فرماتے ہیں:

یا مفضل اول العبر و الادلة علی الباری جل قدسہ ھیئة ھذا العالم و تالیف اجزائہ و نظمھا علی ما ھی علیه فانك اذا تاملت العالم بفکرك و میزته بعقلك وجدته كالبیت المبنی المعد فیه جمیع ما یحاج الیه عبادہ فالسماء مرفوعة كالسقف و الارض ممدودة كالبساط و النجوم مضیئة المصابیح و الجواھر مخزونة كالذخائر و الانسان مالك ذالك البیت و ضروب النبات مھیاة لمآربه و صنوف الحیوان مصروفة فی مصالحه و منافعه ففی ھذا دلالة واضحة علی ان العالم مخلوق بتقدیر و حكمة و نظام و ان الخالق له واحد وھو الذی نظمه بعضاً الی بعض جل قدسه و لا الٰه غیرہ تعالٰی عما یقول الجاحدون و جل وعظم عما ینتحله الملحدون

اے مُفضل! وجو دِ باری تعالیٰ پر تمام دلائل قاطعہ سے پہلی قطعی دلیل اس عالم کی شکل وصورت اور اس کی نظم وترتیب ہے۔ کیونکہ اگر تم اپنی عقل وفکر سے اس عالم میں غور وتامل کرو گے تو تمھیں معلوم ہوگا کہ یہ عالم ایک ایسے گھر کی مانند ہے کہ جس میں بندگانِ خدا کی بود وباش اور رہائش، آسائش کے سب اسباب مہیا ہیں۔ چنانچہ یہ بلند آسمان مثل چھت کے اور یہ پہناور زمین مثل فرش کے ہے۔ اور یہ چمکتے ہوئے ستارے مثل قندیل کے اور جواہر مثل ذخیروں کے ہیں۔ اور حضرت انسان اس گھر کا مالک و مُتصرف ہے۔ اور یہ مختلف قسم کی نباتات اس کی حاجات پورا کرنے کے لیے اور یہ حیوانات اس کے ضروریات ومصالح کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ اس سلسلہ تخلیق میں اس امر پر واضح دلالت موجود ہے کہ اس عالم کی تخلیق تقدیر وتدبیر اور حُسنِ انتظام کا نتیجہ ہے۔ اور اس کا خالق حکیم مالک ہے اور اسی نے عالم کے بعض اجزا کو دوسرے بعض اجزاء کے ساتھ مربوط کیا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے، جو کچھ مُلحد ومُنکر کہتے ہیں، اس سے اس کی ذات والاصفات اجل وارفع ہے۔ (از رسالہ توحید مُفضل [1])

سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے کوئی بات ذوق اس کی
کوئی جانے تو کیا جانے کوئی سمجھے تو کیا سمجھے

یہ امر انسانی جبلّت وفطرت میں داخل ہے کہ جب وہ کسی چیز کو مرتب ومُنظّم دیکھتا ہے تو یقین کر لیتا ہے کہ کسی عقلمند ودانشمند نے اسے ترتیب دیا ہے۔ اور اگر وہ کہیں چند چیزوں کو بے ترتیب اور بے سلیقہ رکھا ہوا دیکھے، تو اسے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ چیزیں آپ سے آپ اکٹھی ہوگئی ہوں۔ مگر حُسنِ ترتیب کی صورت میں یہ خیال اسے ہرگز پیدا نہیں ہوسکتا۔ اس کی واضح مثال یوں فرض کریں کہ آپ مرزا غالب یا ڈاکٹر اقبال کا کوئی شعر لیں اور اس کے الفاظ کو الٹ پلٹ کر کسی ناخواندہ آدمی کو دے کر کہیں کہ وہ ان الفاظ کو اس طرح ترتیب دے کہ اصل شعر بن جائے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہزار طرح الٹ پلٹ کرے گا۔ مگر اتفاقیہ طور پر کبھی یہ نہ ہوگا کہ مرزا غالب یا ڈاکٹر اقبال کا اصل شعر نکل آئے۔ حالانکہ الفاظ وحروف اور جملے وہی ہیں۔ صرف معمُولی سی ترتیب کا ہیر پھر ہے۔ بنا بریں

---

[1] یہ رسالہ شریفہ اور رسالہ اہلیلج معارف توحید کے سلسلہ میں از حد مُفید ہیں۔ علامہ مجلسیؒ نے ہر دو رسائل کو بحار الانوار جلد ۲ میں درج کیا ہے۔ نیز رسالہ "توحیدِ مُفضل" کا فارسی ترجمہ بھی فرمایا ہے اور علیحدہ علیحدہ بھی عراق وایران میں شائع ہوچکے ہیں۔ اور اردو زبان میں مولانا سید محمد ہارون صاحب مرحوم زنگی پوری نے ان کا ترجمہ بنام "توحید الائمہ" شائع کیا ہے۔ عارف کامل عالم فاضل حضرت سید ابن طاؤس علیہ الرحمہ نے اپنے رسالہ "کشف المحجہ" میں سفر وحضر میں ان کو زیر مطالعہ رکھنے کی وصیت فرمائی ہے۔ لہٰذا مومنین کو ان رسائل شریفہ سے استفادہ کرنا چاہیے۔ (شارح عفی عنہ)

کوئی سلیم العقل انسان کیونکر یہ باور کرسکتا ہے کہ یہ نظامِ عالم جو اس قدر باقاعدہ مرتب و مُنظّم اور موزوں ہے، خود بخود پیدا ہوگیا ہے؟ قرآن مجید میں بھی اثباتِ صانع عالم کے سلسلہ میں اسی طریقہ سے استدلال کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

صُنۡعَ اللّٰہِ الَّذِیۡۤ اَتۡقَنَ کُلَّ شَیۡءٍ (سورۃ النمل:۸۸)

یہ خداوند عالم کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو محکم طریقہ سے بنایا ہے۔

مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ ہَلۡ تَرٰی مِنۡ فُطُوۡرٍ (سورۃ الملك:۳)

صانع عالم کی اس کاریگری میں تمھیں کہیں بھی فرق نظر نہ آئے گا۔ پھر دوبارہ نظر دوڑاؤ کیا کوئی خلل دکھائی دیتا ہے؟

وَ خَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ فَقَدَّرَہٗ تَقۡدِیۡرًا (سورۃ الفرقان:۲)

خداوند عالم نے ہر شے کو پیدا کیا اور اس کے لیے ایک اندازہ مقرر کیا۔

عالم کی اسی موزونیت اور حُسنِ ترتیب کو دیکھ کر بڑے بڑے فیلسوف اور سائنس دان معبود برحق کا اقرار کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ چنانچہ:

☆ ملین ایڈورڈ کہتا ہے: "انسان اس وقت سخت حیرت زدہ ہوجاتا ہے جب یہ دیکھتا ہے کہ ان مکرر اور ناطق مشاہدات کے ہوتے ہوئے ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ یہ تمام عجائبات صرف بخت واتفاق کے نتائج ہیں۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہنا چاہیے کہ مادہ کی عام خاصیّت کے نتائج میں یہ فرضی احتمالات اور عقلی گمراہیاں ہیں، جن کو لوگوں نے علم المحسوسات کا لقب دے رکھا ہے۔ لیکن علم حقیقی نے ان کو بالکل باطل کر دیا ہے۔ فزیکل سائنس جاننے والا کبھی اس پر اعتقاد نہیں رکھ سکتا۔

☆ مشہور حکیم ہربرٹ اسپنسر کہتا ہے: یہ اسرار جو روز بروز زیادہ دقیق ہوتے جاتے ہیں، جب ہم ان پر زیادہ بحث کرتے ہیں تو یہ ضرور ماننا پڑتا ہے کہ انسان کے اوپر ایک ازلی اور ابدی قوت ہے جس سے تمام اشیاء وجود میں آئی ہیں۔

☆ پروفیسر لینی لکھتا ہے: خدائے قادر و توانا اپنی عجیب وغریب کاریگریوں سے میرے سامنے اس طرح جلوہ گر ہوتا ہے کہ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ اور میں بالکل دیوانہ بن جاتا ہوں۔ ہر چیز میں گو وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو، اس کی کس قدر عجیب قدرت، کس قدر عجیب حکمت، کس قدر عجیب ایجاد پائی جاتی ہے۔

☆ ایزک نیوٹن کہتا ہے: کائنات کے اجزاء میں باوجود ہزاروں انقلابات زمان و مکان کے جو

ترتیب اور تناسب ہے وہ ممکن نہیں کہ بغیر کسی ایک ایسی ذات کے پایا جا سکے جو سب سے اول ہے اور صاحب علم اور صاحب اختیار ہے۔

☆ کیمل فلاماریاں حکیم فرانس کہتا ہے: تمام اساتذہ اس بات کے سمجھنے سے قاصر ہیں کہ وجود کیونکر ہوا۔ اور یہ کیونکر برابر چلا جاتا ہے اور اسی بنا پر ان کو مجبوراً ایک ایسے خالق کا اقرار کرنا پڑتا ہے جس کا موثر ہونا ہمیشہ اور ہر وقت قائم ہے۔ (بحوالہ الکلام شبلی)

کس قدر تعجب ہے کہ جب کہ تحقیقاتِ جدیدہ و تدقیقاتِ مُفیدہ کی انتہا ہوگئی ہے اور کائنات کے ہزاروں سربستہ راز فاش ہو چکے ہیں، اور سائنس اپنے معراجِ کمال تک پہنچ چکی ہے۔ اس کے باوجود بڑے بڑے فلاسفر اور سائنسدان بڑے غور و خوض کے بعد خداوند عالم کی ہستی کے ثبوت میں وہی استدلال پیش کر سکے ہیں جو قرآن نے آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے نہایت سادہ اور قریب الفہم طریقہ سے پیش فرمایا تھا: "اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ" (سورۃ الرعد:۴)

پروفیسر لینی کا یہ قول کہ: "ہر چیز میں گو وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو، کس قدر عجیب قدرت، کس قدر عجیب حکمت، کس قدر عجیب ایجاد پائی جاتی ہے" اربابِ عقل و فکر کو اس صد رنگ کائنات کی اشیاء میں قدرتِ کاملہ نے جو کرشمہ سازیاں اور حکمت آمیزیاں فرمائی ہیں، ان میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ کیونکہ جوں جوں انسان کائنات کی بزرگ یا خورد اشیاء میں غور و فکر کرتا ہے۔ خالق عالم کی عظمت و جلالت کا نقش صفحہ ذہن میں زیادہ اجاگر ہوتا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خداوند عالم نے اپنے کلام پاک میں بار بار نگار خانہ کائنات کی مختلف اشیاء میں غور و فکر کرنے کی ترغیب دلائی ہے۔

① کبھی ارشاد فرماتا ہے: اَوَلَمۡ یَتَفَکَّرُوۡا فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ ۟ مَا خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ مَا بَیۡنَہُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَقِّ (سورۃ الروم:۸)

② کبھی اس طرح حکم دیتا ہے: قُلِ انۡظُرُوۡا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ (سورۃ یونس:۱۰۱)

③ کبھی فرماتا ہے: اَفَلَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَی الۡاِبِلِ کَیۡفَ خُلِقَتۡ ﴿۱۷﴾ وَ اِلَی السَّمَآءِ کَیۡفَ رُفِعَتۡ ﴿۱۸﴾ وَ اِلَی الۡجِبَالِ کَیۡفَ نُصِبَتۡ ﴿۱۹﴾ وَ اِلَی الۡاَرۡضِ کَیۡفَ سُطِحَتۡ ﴿۲۰﴾ (سورۃ الغاشیہ:۱۷ تا ۲۰)

④ کہیں اس طرح فرماتا ہے: اَوَلَمۡ یَرَوۡا اِلَی الۡاَرۡضِ کَمۡ اَنۡۢبَتۡنَا فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ زَوۡجٍ کَرِیۡمٍ (سورۃ الشعراء:۷)

⑤ اور کہیں کائنات میں غور و فکر نہ کرنے پر یوں تہدید فرماتا ہے: اَوَلَمۡ یَنۡظُرُوۡا فِیۡ مَلَکُوۡتِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنۡ شَیۡءٍ (سورۃ الاعراف:۱۸۵)

اور اسی بنا پر معصومین علیہم السلام نے ہدایت فرمائی کہ: "اذا اردتم ان تنظروا الی عظمته فانظروا الی عظم خلقه"۔ یعنی جب چاہو کہ خالق کائنات کی عظمت و جلالت معلوم کرو تو اس کی مخلوق کی عظمت میں غور و فکر کرو۔ (اصول کافی)

انسانی جسم کے معجزات

ذیل میں ہم کائنات کی ایک عظیم اور ایک حقیر مخلوق کی خلقت پر کچھ تبصرہ کرتے ہیں۔ یہ حقیقت واضح ہے کہ نگارخانہ کائنات میں اشرف المخلوقات حضرت انسان ہے۔ انسانی بدن الٰہی صنعت و تخلیق کا ایک حیرت انگیز اعجاز ہے۔ جسے دیکھ کر عقل سر بسجود ہو جاتی ہے۔ ماہرین ارحام نے تکوین جنین کا، ہر منزل اور ہر درجے پر، تماشا دیکھنے کے بعد اس حقیقت سے نقاب اٹھایا ہے کہ بدنِ انسانی کی ترکیب خلیوں سے ہوتی ہے۔ آغاز میں یہ خلیہ ایک ہوتا ہے۔ پھر دو، پھر چار، اور پھر آٹھ میں متضاعف ہو کر بدن کی تشکیل کرتا ہے۔ بعض خلیے کان، بعض آنکھ، بعض ناک اور بعض دیگر اعضاء کی تشکیل پر لگ جاتے ہیں۔ یہ آج تک بھی نہیں ہوا کہ چند خلیے سازش کر کے کان کی جگہ ناک اور ناک کی جگہ آنکھیں بنا ڈالیں یا پیچھے کوئی دم چسپاں کر دیں۔ یہ اس لیے کہ ایک ہمہ بین آنکھ ان کی نگرانی کر رہی ہے جس کی قہرمانیت کے سامنے تمام کائنات سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہے۔

وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (سورۃ آلِ عمران: ۸۳)

ارض و سما کی ہر چیز مشیت ایزدی کو بجا لانے پر مجبور و مجبول ہے۔

آج علم ترقی کرتے کرتے خیامِ قدس کے اسرار تک بے نقاب کرنے پر تُل چکا ہے اور دوسری طرف تعلیم یافتوں میں ایک دو فی صدی آدمی بدستور ایسے موجود ہیں جو اللہ کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ جن کے نقطۂ خیال سے تکوین و تدوین کی یہ کارگاہِ جلیل کسی ناظم و آمر کے بغیر چل رہی ہے۔ اور تخلیق کے روح افروز خوارق خودبخود دسرزد ہو رہے ہیں۔ ان کج فہمی کے مُجسّموں سے صرف اتنا پوچھنا ہے کہ اگر یہ سب کچھ خود بخود ہو رہا ہے اور کوئی نگران آنکھ پیچھے موجود نہیں تو پھر رحم مادر میں خُلیوں نے تمھیں انسانی شکل کیوں دی۔ گدھا کیوں نہ بنا دیا؟ یا سر گدھے کا اور دم بندر کی کیوں نہ لگا دی؟ ایک اچھا خاصا پروں والا گدھ کیوں نہ بنا دیا؟ مینڈک اور کچھوے کی شکل کیوں نہ دے دی؟ انسانی پیٹ سے آج تک کوئی بکری پیدا نہ ہوئی؟ بکری کے پیٹ سے مرغی نے کیوں نہ جنم لیا۔ اور کبوتر کے انڈوں سے تیتر کیوں نہ نکلا؟ ہے کوئی جواب ان منکرین خدا کے پاس؟ اگر ہے تو لاؤ اور اگر نہیں تو آؤ

ہمارے ہم نوا بن کر کہو:

هُوَ الَّذِیۡ یُصَوِّرُکُمۡ فِی الۡاَرۡحَامِ کَیۡفَ یَشَآءُ (سورۃ آلِ عمران:۶)

"وہ صرف اللہ ہی ہے جو اپنی مشیت قاہرہ کے مطابق ماؤں کے ارحام میں تمھاری صورتیں بناتا ہے"۔

کیا ہے تجھ کو کتابوں نے کورِ ذوق اتنا
صبا سے بھی نہ ملا تجھ کو بوئے گل کا سراغ

(اقبالؒ)

جسم انسانی کے مختلف مناظر

①	چار طبائع:	حرارت، برودت، یبوست، اور رطوبت
②	چار ارکان جسم:	آگ، ہوا، مٹی، پانی
③	چار اخلاط:	صفرا، خون، بلغم، سودا
④	نو طبقات:	سر، مُنھ، گردن، سینہ، پیٹھ، کمر، ران، ساق، پاؤں
⑤	ستون:	۲۴ ہڈیاں
⑥	رسیاں:	۷۵۰ پٹھے
⑦	خزانے:	دماغ، نخاع، پھیپھڑے، دل، جگر، تلی، معدہ، انتڑیاں، گُردے
⑧	مسالک وشوارع:	۳۶۰ عروق
⑨	نہریں:	۳۹۰ وریدیں
⑩	دروازے:	آنکھیں، کان، ناک، پستان، مُنھ، اور شرمگاہیں

انوکھا شہر

جسم انسانی کو ایک شہر سمجھیے، جس میں مختلف اعمال ہو رہے ہیں۔ مثلاً:

①	باورچی:	معدہ ایک باورچی کی طرح غذا پکا رہا ہے
②	عطار:	کوئی عطار غذا کا جوہر نکال کر جزو بدن بنا رہا ہے
③	حکیم:	جگر ایک طبیب کی طرح غذا میں تیزاب ملا رہا ہے
④	جاروب کش:	انتڑیاں، جلد، گُردے اور پھیپھڑے غلاظت کو جسم سے باہر پھینک رہے ہیں

⑤ شعبدہ باز: کوئی صناع، خون کو گوشت میں تبدیل کر رہا ہے
⑥ بھٹا: ہڈیاں اینٹوں کی طرح پک کر مضبوط بن رہی ہیں
⑦ جولاہا: کوئی بافندہ اعصاب اور جھلیاں بُن رہا ہے
⑧ درزی: کوئی درزی زخموں کو سی رہا ہے
⑨ کاشت کار: کسی کاشت کار کی قلبہ رانی کی وجہ سے جسم کے کھیت میں گھاس کی طرح بال اگ رہے ہیں
⑩ رنگ ساز: کوئی صباغ دانتوں کو سفید، بالوں کو سیاہ، اور خون کو سرخ بنا رہا ہے
⑪ بت تراش: کوئی بت تراش ماں کے پیٹ میں ایک خوب صورت بچہ تراش رہا ہے

ایک چھوٹی سی کائنات

① زمین: جسم انسانی
② پہاڑ: ہڈیاں
③ معاون: مخ
④ ستارے: عقل، قوتِ متفکّرہ ومتخیلہ وغیرہ
⑤ سمندر: پیٹ
⑥ نہریں: رگیں
⑦ بدررویں: انتڑیاں
⑧ نباتات: بال
⑨ میدان: ماتھا، اور پیٹھ
⑩ ہوا: تنفس
⑪ صبح کی روشنی: مُسکراہٹ
⑫ بارش: رونا
⑬ ظلمت: غم
⑭ موت: نیند یا جہالت
⑮ حیات: بیداری یا علم
⑯ بہار: بچپن
⑰ گرما: جوانی
⑱ برفباری: سفید بال
⑲ رعد و برق: غصہ

انسان میں حیوانیت

① شیر کی طرح بہادر
② شترمرغ کی طرح گم راہ

③ خرگوش کی طرح بزدل
④ بلبل کی طرح گویا
⑤ کوے کی طرح ہوشیار
⑥ گدھے کی طرح بدآواز
⑦ اُلو کی طرح خودفراموش
⑧ مرغی کی طرح مُفید
⑨ لومڑی کی طرح پُرکار
⑩ چوہے کی طرح مضر
⑪ بھیڑ کی طرح سادہ لوح
⑫ گھوڑے کی طرح وفادار
⑬ ہرن کی طرح تیز خرام
⑭ سانپ کی طرح بے وفا
⑮ کچھوے کی طرح سست رو
⑯ مور کی طرح حسین
⑰ اُونٹ کی طرح مُطیع
⑱ گدھ کی طرح بدوضع
⑲ چیتے کی طرح سرکش
⑳ ہدہد کی طرح مسعود
㉑ قطاۃ کی طرح رہبر
㉒ الو کی طرح منحوس

چھوٹی سی کائنات

کسی بڑے کارخانے میں تشریف لے جائیے۔ انجن کسی ایک طرف کمرے میں ہوگا، اور ہر طرف مختلف پرزے مختلف اعمال سرانجام دے رہے ہوں گے۔ کہیں تلواریں بن رہی ہوں گی، کہیں تیل نکالا جا رہا ہوگا، ایک طرف ٹین کے ڈبے تیار ہو رہے ہوں گے اور دوسری طرف لوہا پگھل رہا ہوگا۔ پس یہی حالت کائنات کی ہے۔ اس کارگاہِ عظیم کے مختلف اعمال پر ذرا نگاہ ڈالو۔ دریا بہہ رہے ہیں، ہوائیں چل رہی ہیں، آفتاب روشنی کے طوفان اٹھا رہا ہے، درخت اگ رہے ہیں اور بادل برس رہے ہیں۔ گو اس کارگہ حیات کا ہر منظر مختلف فرائض کی بجا آوری میں مصروف ہے لیکن انجن صرف ایک ہی ہے۔ یعنی اللہ جل جلالہ وعم نوالہ۔

ادھر جسم انسانی کو دیکھو، بال اگ رہے ہیں، آنسو بہہ رہے ہیں، دل دھڑک رہا ہے، سانس چل

رہی ہے، کان سُن رہے ہیں، آنکھیں دیکھ رہی ہیں، اور دماغ سوچ رہا ہے۔ اور اس کارخانے کے انجن کا نام روح ہے۔ روح جسم کے کس حصّے میں رہتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر بال اور ہر قطرۂ خون میں۔ لیکن اگر آپ چاقو سے کسی حصّہ جسم کو کرید کر رُوح کو دیکھنا چاہیں تو آپ کو کامیابی نہیں ہوگی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کائنات کے ہر ذرے میں جلوہ گر ہے۔ لیکن روح کی طرح دکھائی نہیں دیتا۔ انسانی جسم حقیقۃً ایک چھوٹی سی کائنات ہے جس میں روح اسی طرح کام کر رہی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کائناتِ ارض وسما میں۔ ؎

تونے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

(اقبالؒ، از دو قرآن)

انسان کی اسی عجیب وغریب خلقت کی بابت حضرت صادق علیہ السلام حدیث اہلیلج میں فرماتے ہیں: "و العجب من مخلوق یزعم ان اللہ یخفی علی عبادہ و ہو یری اثر الصنع فی نفسہ بترکیب یبہت عقلہ و تالیف مبطلٍ حجتہ"۔ یعنی ان لوگوں سے تعجب ہے جو یہ گمان کرتے ہیں کہ خداوند عالم اپنے بندوں پر پوشیدہ ہے، حالانکہ وہ اپنے اندر خداوند عالم کی مبہوت کرنے والی ترکیب اور ان کی حجت کو باطل کرنے والی ترتیب کی صورت میں اس کی قدرتِ کاملہ کے آثار دیکھ رہے ہیں۔ انسانی اعضاء وجوارح میں قدرتِ کاملہ نے کیا کیا صنائع وبدائع عمل میں لائے ہیں؟ اور کیا کیا اسرار و رموز ان میں ودیعت فرمائے ہیں؟ ان کے سمجھنے کے لیے پورا "علم تشریح الاعضاء" بھی کافی نہیں ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے رسالہ "توحید مُفضل" میں مخاطب کے فہم وادراک کے مطابق ان حقائق کے چہرہ سے کچھ نقاب اٹھایا ہے۔ رسالہ "دو قرآن" میں بھی اس پر کافی بحث کی گئی ہے۔ اس لیے ارشاد قدرت ہے: "وَ فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ" (سورۃ الذاریات:۲۱) خود تمہارے نفوس میں خالق کے وجود کی بے شمار نشانیاں موجود ہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے؟ اسی لیے تو سید الموحدین جناب امیر المومنین علیہ السلام غافل انسان کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

اتزعم انك جرم صغير
و فيك انطوى العالم الاكبر

کیا تو یہ گمان کرتا ہے کہ تو ایک چھوٹا سا جسم ہے حالانکہ تیرے اندر تو عالم کبیر سمویا ہوا ہے

و انت الکتاب المبین الذی
باحرفہٖ یظہر المضمر

اورتو وہ واضح کتاب ہے کہ جس کے حروف سے مضمرات اور پوشیدہ راز ظاہر ہوتے ہیں

دائک منک و لا تشعر
دوائک فیک و لا تبصر

تیرا مرض تجھ ہی سے ہے مگر تجھے شعور نہیں اور تیری دوا و علاج بھی خود تجھ میں موجود ہے مگر تو دیکھتا نہیں ہے۔ (دیوان منسوب بہ حضرت علی علیہ السلام)

یہ تو تھا اشرف المخلوقات کا تذکرہ۔ اب ذرا اخس المخلوقات کا ذکر بھی سن لیں۔ اس عالم میں سب سے زیادہ صغیر وحقیر مخلوق مچھر اور چیونٹی کو سمجھا جاتا ہے۔ مگر صانع حکیم نے انہی کے خلقت میں اپنی عجیب قدرت کاملہ کا وہ ایمان افزا مظاہرہ فرمایا ہے کہ عقل انسانی حیرت زدہ ہو جاتی ہے۔ مچھر ہی کو لے لیجیے، اس میں وہ سب اعضاء و جوارح موجود ہیں جو ہاتھی میں موجود ہیں۔ اور اس پر طرہ یہ کہ اس میں دو عضو ایسے پائے جاتے ہیں جو ہاتھی میں نہیں پائے جاتے، دو پر، اور دو زائد ٹانگیں۔ اسی طرح چیونٹی میں خالق حکیم نے جس کاریگری کا نمونہ پیش کیا ہے، وہ بہت ہی تعجب خیز ہے۔ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام اپنے ایک خطبہ میں اسی چیونٹی کی خلقت اور اس میں جو آثارِ قدرت نمایاں ہیں، ان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

و لو فکروا فی عظیم القدرۃ و جسیم النعمۃ لرجعوا الی الطریق و خافوا عذاب الحریق و لکن القلوب علیلۃ و الابصار مدخولۃ الا ینظرون الی صغیر ما خلق کیف احکم خلقہ و اتقن ترکیبہ و خلق لہ السمع و البصر و سوی لہ العظم و البشر انظروا الی النملۃ فی صغر جثتہا و لطافۃ ھیئتہا لا تکاد تنال حظ البصر و لا بمستدرک الفکر کیف دبت علی ارضہا و صبت علی رزقہا تنقل الحبۃ الی جحرہا و تعدھا فی مستقرھا تجمع فی حرھا لبردھا و فی وردھا لصدرھا مکفولۃ برزقہا مرزوقۃ موفقہا لا یغفلہا المنان ولا یحرمہا الدیان و لو ف الصفا الیابس و الحجر الجامس و لو فکرت فی مجادی اکلہا فی علوھا و سفلہا و ما فی الجوف من شراسیف بطنہا و ما فی الراس من عینہا و اذنہا لقضیت من خلقہا عجبا و لقیت من وصفہا تعبا فتعالی الذی اقامہا علی قوائمہا و بناہا علی دعائمہا لم یشرکہ فی فطرتہا فاطر و لم یعنہ فی خلقہا قادر (الی ان قال) فالویل لمن جحد المقدر و انکر المدبر زعموا انہم کالنبات مالہم زادع و لا لاختلاف صورھم صانع و لم یلجاوا الی حجۃ فیما ادعوا ولا تحقیق لما دعوا و ھل یکون بناء من غیر بان او جنایۃ من غیر جان

اگر یہ (منکرین ربوبیت) خدائے قادر و قیوم کی عظیم الشان قدرتوں اور جلیل القدر نعمتوں میں غور و فکر کرتے تو یقیناً راہ راست پر آجاتے اور آتش جہنم کے عذاب سے ڈرتے ۔ مگر افسوس کہ ان کے دل بیمار اور آنکھیں عیب دار ہیں ۔ کیا یہ لوگ خداوند عالم کی صغیر و حقیر مخلوق کو نہیں دیکھتے کہ اس صانع حکیم نے اس کی خلقت کو کس طرح محکم و متقن بنایا ہے اور اس کے لیے کسی طرح کان ، آنکھ ، ہڈی اور چمڑا تیار کیا ہے ۔ چیونٹی کو دیکھو کہ جو اس قدر صغیر الجثہ ہے کہ قریب ہے کہ آنکھوں سے دکھائی نہ دے اور حاسہ فکر سے درک نہ ہو ۔ مگر بایں ہمہ کس طرح زمین پر چل رہی ہے اور اپنا رزق تلاش کر رہی ہے ۔ دانے کو اپنی بل میں لے جا کر گرمیوں میں سردیوں کے لیے اور داخل ہوتے وقت نکلنے کے وقت تک کے لیے بطور خوراک جمع کر لیتی ہے ۔ خداوند عالم نے اس کے رزق کی کفالت اپنے ذمہ لے لی ہے ۔ لہٰذا خدائے منان اس کے مناسب حال اسے روزی پہنچاتا رہتا ہے ۔ اگرچہ وہ خشک پتھر ہی میں کیوں نہ ہو ۔ اگر تم اس (چیونٹی) کے کھانے کے اوپر اور نیچے والے مقامات اور اس کے پیٹ کی پسلیوں اور اس کے سر میں جو آنکھ اور کان ہیں ، ان میں غور و فکر کرو ، تو تمھیں اس کی عجیب خلقت سے بڑا تعجب ہوگا ۔ اور اس کی تعریف و توصیف میں تھکان محسوس کرو گے ۔ کس قدر بڑی عظمت والا ہے وہ خدا جس نے تنہا اسے پیدا کیا ہے ، کسی دوسرے نے اس کی تقدیر و خلقت میں اس کے ساتھ شرکت یا اس کی اعانت نہیں کی ہے...... افسوس ہے اس شخص پر جو (ان آثارِ قدرت کی موجودگی میں) مقدر و مدبر کے وجود کا انکار کرتا ہے ۔ یہ بدبخت لوگ گمان کرتے ہیں کہ یہ خودرو پودے کی طرح خود بخود پیدا ہو گئے ہیں ۔ ان کا کوئی خالق نہیں ہے ۔ اور ان کی مختلف صورتوں کا کوئی صانع نہیں ہے ۔ ان کے پاس اپنے اس نظریۂ فاسدہ پر کوئی دلیل و برہان نہیں ہے ۔ بھلا کوئی مکان بغیر بانی کے اور کوئی جنایت بغیر جانی کے ہو سکتی ہے ۔ (نہج البلاغہ)

سبحان اللہ ! کس قدر جامع اور مکمل استدلال ہے ۔ سچ ہے : "کلام الامام امام الکلام" امام عالی مقام کے اس کلام معجز نظام میں چیونٹی کے جن خواص و آثار کی طرف اشارات کیے گئے ہیں ، اگر ہم ان کی تشریح و توضیح کرنا چاہیں تو اس کے لیے کئی صفحات درکار ہیں ، جس کے لیے اوراقِ کتاب متحمل نہیں ۔ اسی لیے اسی اجمالی بیان پر اکتفا کرتے ہیں ۔ اس تحریر سے مقصد صرف آیات انفسیہ اور آیات آفاقیہ کی طرف ناظرین کرام کی توجہ مبذول کرانا تھا ۔ جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے :

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿۵۳﴾ (سورۃ حٰم سجدہ: ۵۳)

ہم ان لوگوں کو اپنی ذات کی آیات وعلامات دکھلائیں گے ۔ آفاق میں اور خود ان کے نفوس میں، تاکہ ان پر واضح ہو جائے کہ خدا برحق ہے ۔ کیا تمھارے پروردگار کے اثبات کے لیے یہ امر کافی نہیں ہے کہ وہ ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے؟

ان حقائق کی روشنی میں کوئی بھی صحیح الدماغ انسان کہہ سکتا ہے کہ یہ کائنات بغیر کسی خالق حکیم کے محض بخت واتفاق سے یا ایک بے عقل اور بے حس وحیات مادہ سے اتفاقاً صادر ہوگئی ہے ۔ مالکم کیف تحکمون؟

④ وجہ سوم: اوپر وجہ دوم میں بالتفصیل یہ امر مُحقّق و مبرہن کر دیا گیا ہے کہ یہ کائنات جو عجیب و غریب صنائع و بدائع سے لبریز ہے بے عقل وادراک اور بے حس وحیات مادہ سے محض بطور بخت و اتفاق کے ہرگز ظہور پذیر نہیں ہو سکتی ۔ ایسا ہونا عقلاً ناممکن اور محال ہے ۔ اس وجہ سوم میں ہم یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ اگر بفرض محال چند لمحوں کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ ایسا ہونا ممکن ہے، تب بھی اس عالم کا اتفاقاً پیدا ہونا بدستور ناممکن ومحال رہتا ہے ۔ کیونکہ یہ حقیقت اپنے مقام پر مُسلّم ہے کہ جو امر محض اتفاق کا نتیجہ ہو (بنا بر تسلیم اتفاق) اس میں استمرار ودوام نہیں ہوتا ۔ مثلاً ایک آدمی نے کنواں کھودنا شروع کیا تو اتفاقاً اسے ایک گراں بہا خزانہ مل گیا ۔ یا ایک شخص نے کسی پرندہ کو تیر مارا ۔ مگر پرندہ تو بچ گیا اور وہ تیر اس شخص کے دشمن کو لگا اور وہ ہلاک ہو گیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ شخص جب بھی کنواں کھودنے کے لیے گڑھا کھودے تو اسے گنج ہی مل جائے، یا جب ہی وہ شکار پر تیر چلائے تو شکار کے بجائے اس کا ایک دشمن ہی ہلاک ہو جائے ۔ مگر یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ خلقت زمین وآسمان وغیرہ کو ہزاروں بلکہ لاکھوں سال گزر گئے مگر اس میں تاحال ہرگز کسی قسم کا کوئی خلل واضطراب واقع نہیں ہوا ۔ لیل ونہار اور شمس وقمر وغیرہ اشیاء بڑی حُسن وخوبی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں ۔

لَا الشَّمۡسُ یَنۡۢبَغِیۡ لَهَاۤ اَنۡ تُدۡرِكَ الۡقَمَرَ وَ لَا الَّیۡلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَ كُلٌّ فِیۡ فَلَكٍ یَّسۡبَحُوۡنَ ﴿۴۰﴾ (سورۃ یٰسٓ:۴۰)

ثوابت اپنے مقام پر ثابت اور سیارے اپنے اپنے مرکز ومحور کے اردگرد گھوم رہے ہیں:

وَ الشَّمۡسُ تَجۡرِیۡ لِمُسۡتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ ﴿۳۸﴾ (سورۃ یٰسٓ:۳۸)

تمام اجناس وانواع بدستور جاری وساری ہیں:

فَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبۡدِیۡلًا ۚ وَ لَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحۡوِیۡلًا ﴿۴۳﴾ (سورۃ الفاطر:۴۳) مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ هَلۡ تَرٰی مِنۡ فُطُوۡرٍ ﴿۳﴾ ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ

كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ﴿۴﴾ (سورة الملك: ۳ و ۴)

لہٰذا عالم کا یہ انتظام ودوام اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ یہ عالم ایک خالق علیم وصانع حکیم کی صنعت وکاریگری کا نتیجہ ہے اور وہی مدبر ومنظم اس کے دوام کا انتظام کر رہا ہے۔ (از ہذا ہو اللہ)

ایک چشم بصیرت رکھنے والا انسان تخلیق وتکوین کے یہ معجزات دیکھ کر یہ اقرار کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ ضرور کوئی نگران ان کی نگرانی کر رہا ہے اور کوئی زبردست دماغ اس عالم میں مصروف عمل ہے۔ چنانچہ پروفیسر ولیم سیکبر انڈ کہتا ہے:

کیا کوئی شخص سنجیدگی سے خیال کرسکتا ہے کہ کائنات میں یہ نظم وہدایت عناصر کی اتفاقیہ آمیزش سے پیدا ہوگئی ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی نہر اپنے سے مرتفع سطح پر بہہ سکے۔

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَ هُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ

(سورة يوسف: ۱۰۵)

اور ہم آسمان اور زمین میں (خدا کے وجود اور اس کی قدرت کی) کتنی ہی نشانیاں موجود ہیں، مگر یہ لوگ ان سے روگردانی کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔

وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غَافِلِيْنَ (مومنون: ۱۷)

ہم اپنی مخلوق سے غافل نہیں ہیں۔

ڈارون کے نظریہ ارتقاء کا ابطال

شبہ رابعہ:

ان لوگوں نے جب دیکھا کہ مذکورہ بالا نظریات اختیار کرنے سے خدا پرستوں کے اعتراضات سے گلوخلاصی نہیں ہوتی، نہ بے حس وحرکت اور بے عقل وشعور مادہ سے یہ پیکر عقل و ادراک اور ذی حیات مخلوق پیدا ہوسکتی ہے۔ اور نہ ہی اتفاقیہ طور پر ایسا ہونا ممکن ہے، تو ان میں سے بعض جدت پسند اشخاص (مثل ڈارون وغیرہ) نے ان مفاسد ومحاذیر سے بچنے کے لیے ایک اور راہ تلاش کی جو خلافِ عقل ودانش اور بالکل مہمل و مزخرف ہونے میں سابقہ نظریات سے کمتر نہیں ہے۔ اور وہ نظریہ نشوو ارتقاء ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات میں اس وقت جو مختلف انواع واقسام کے حیوانات موجود ہیں، ابتداء میں اسی طرح علیحدہ علیحدہ خلق نہیں ہوئے، بلکہ اصل میں ایک ہی نہایت

سادہ لوح اور معمولی احساس و شعور والی نوع تھی۔ پھر تنازع بقا اور انتخاب طبعی کے قانون سے اس نے رفتہ رفتہ تدریجی ترقی کی اور منازل ترقی طے کرتے کرتے موجودہ حالت تک پہنچی۔ حضرت انسان ہی کو لے لیجیے۔ یہ اصل میں بندر تھا، اس سے ترقی کی اور منازل ترقی طے کرتے کرتے موجودہ انسانی شکل تک پہنچا۔ لہٰذا انسان بندر کی ہی ایک ترقی یافتہ فرد ہے۔ اور بندر بھی پہلے کسی اور پست درجہ کی نوع سے تعلق رکھتا تھا۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس

خلاصہ یہ کہ ابتدائے خلقت میں انسان موجودہ شکل و صورت پر پیدا نہیں ہوا، تا کہ یہ اعتراض وارد ہو کہ ایک بے عقل و ادراک، اندھا اور بہرا مادہ ایسے با عقل و ہوش اور صاحبِ علم و عرفان حضرت انسان کو کیونکر پیدا کر سکتا ہے؟

جواب: یہ شبہ بھی شبہاتِ سابقہ کی طرح بچند وجہ مردود ہے۔ اور اصولِ عقل و فطرت کے خلاف ہونے کی وجہ سے سراسر ظنون و اوہام کی اختراع ہے۔

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ۚ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (سورۃ یونس:۳۶)

① وجہ اول: یہ نظریہ ان (دہریہ) حضرات کے اپنے مُسلمہ اصول کے مخالف ہے۔ کیونکہ ان کا اُصول ہے کہ جب تک کوئی چیز آنکھوں سے دکھائی نہ دے اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہوتا اور وہ اپنے اسی اصول غیر معقول کی بنا پر صانع عالم کی ہستی کا انکار کرتے ہیں۔ اب یہاں ہم ان سے دریافت کرتے ہیں کہ آیا تمھارا نظریہ کسی چشم دید مشاہدہ پر مبنی ہے؟ کیا تم نے کبھی بچشم خود کسی بندر کو انسان بنتے دیکھا ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو ثبوت پیش کرو۔ "ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین"۔ اور اگر جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہوگا، تو پھر جس امر کو تم نے دیکھا نہیں اس کے قائل کیونکر ہوئے ہو؟ اگر ایمان بالغیب ہی لانا ہے تو مُسلمانوں کے نظریہ صحیحہ کو تسلیم کر لو کہ خالق قادر نے ابتداء ہی میں تمام انواع کو اسی موجودہ شکل و صورت پر علیحدہ علیحدہ خلق فرمایا ہے۔

② وجہ دوم: شریعت اسلامیہ کے نا قابل تاویل نصوص قطعیہ موجود ہیں کہ خداوند عالم نے زمین کے موالید ثلاثہ (جمادات نباتات اور حیوانات) کو موجودہ شکل میں علیحدہ علیحدہ خلق فرمایا ہے۔ مگر ان لوگوں کے پاس اپنے اس نظریہ ارتقا کی صحت پر ہرگز کوئی قطعی دلیل نہیں ہے۔ انھوں نے اس سلسلہ میں جس قدر دلائل یا بالفاظِ دیگر شبہات پیش کیے ہیں وہ ظنون و اوہام اور تخمین خام سے متجاوز نہیں ہیں۔ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا۔

نظریۂ ارتقاء کی پہلی دلیل

مثلاً ان کی ایک دلیل یہ ہے کہ کچھ اعضاء کے نشانات بعض حیوانات میں مشاہدہ کیے جاتے ہیں اور وہ ایسے اعضاء کے آثار تھے جو حیوانات میں پائے جاتے ہیں ۔ جیسے پیروں کے غیر مکمل نشانات جن کے پیشِ نظر یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہر نوع کی بطورِ اِستقلال تخلیق نہیں ہوئی ۔ کیونکہ اس نظریہ کا تقاضا یہ ہے کہ ہر نوع کے لیے جتنے اعضا درکار ہیں اس میں اتنے ہی اعضا موجود ہوں ۔ کچھ کمی و بیشی نہ ہو۔ مگر بعض حیوانات میں زائد اعضاء کے آثار بتلاتے ہیں کہ یہ سابقہ نوع کے تھے اور اس کے لیے ضروری تھے ۔ مگر جب نوع تبدیل ہوئی تو نیست و نابود ہونے لگے ۔ فقط ان کے آثار و نشانات باقی رہ گئے ۔ یہ سابقہ نوع ان اعضاء سے خالی تھی اور پھر اس میں دوسری نوع کے آثار شروع ہو گئے، تاکہ اسے اس قابل بنا دیں کہ وہ یہ دوسری نوع بن سکے ۔ اس کی تائید میں یہ لوگ قدیم ہڈیوں کے کچھ ڈھانچے بھی پیش کرتے ہیں جس کے پیشِ نظر یہ کہتے ہیں کہ انسان اصل میں انسان نہیں تھا بلکہ پہلے بندر تھا۔ (معاذ اللہ)

مگر ان کی یہ نام نہاد دلیل جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے ظن و تخمین سے زائد کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور اس سے سوائے ظن کے اور ہرگز کچھ حاصل نہیں ہوتا اور اعتقادیات میں ظن حجّت نہیں ہے ۔

اس سے یقین اس وقت حاصل ہوتا جب کہ سوائے اس نتیجہ کے جو انھوں نے اخذ کیا ہے اور کوئی احتمال قائم نہ ہوتا۔ مگر جب اور بھی احتمالات موجود ہیں تو پھر یہ دلیل مُفید یقین نہیں ہو سکتی ۔

کیونکہ :اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال ۔

اس دلیل کا پہلا جوابؔ

کوئی کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ ممکن ہے ان زائد اعضا میں کچھ ایسے فوائد و مصالح مُضمر ہوں جو تم پر مخفی و مستور ہیں، جیسا کہ نباتات و حیوانات میں بکثرت چیزوں کے فوائد و حِکم تم پر مخفی و مستور ہیں ۔ جیسا کہ علم فزیالوجی کی کتب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے ۔ پس جب تمھارا علم ناقص ہے اور کائنات کی ہر شے کے فوائد و خواص پر حاوی نہیں تو پھر تم کس طرح یہ بات بطور یقین کے کہہ سکتے ہو کہ ان زائد اعضاء میں سوائے تبدیلی نوع کے اور کوئی فائدہ نہیں ہے ۔ کیا عدمِ علم دلیل عدم بن سکتی ہے؟

دُوسرا جوابؔ : یہ اِستقراء ناقص اور غیر تام ہے ۔ بعض انواع میں یہ تغیّر دیکھ کر تمام انواع کے متعلق یہ حکم لگانا غیر یقینی ہے ۔ اور اس سے زیادہ سے زیادہ ظن و گمان ہی پیدا ہوتا ہے، جو کہ مُفید

طلب نہیں ہے۔

تیسرا جواب : اگر اس تدریجی ارتقاء کی کوئی اصلیت اور حقیقت ہوتی تو لازم تھا کہ اس ارتقاء کے کچھ آثار ہر ہر زمانہ میں واضح اور آشکار ہوتے، اور ایک مُعتد بہ زمانہ گزرنے کے بعد انواع میں اس ترقی کا کچھ ایسا نتیجہ ظاہر ہوتا جو مشاہدہ و محسوس ہوتا۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ تقریباً ایک لاکھ سال کے بعد نوع میں مکمل تغیر و تبدل واقع ہوتا ہے۔ تو جس زمانہ کے اجمالی حالات تاریخ سے معلُوم ہوئے ہیں اس کی مدت کم وبیش چھ سات ہزار سال ضرور ہے تو اس طویل عرصہ میں ضروری تھا کہ اس تدریجی ترقی کے کچھ نہ کچھ آثار واضح و آشکار ہوتے۔ کوئی سافل نوع، عالی نوع میں داخل ہوتی، خود نوع انسانی ہی کسی اور نوع (مثلاً فرشتہ) میں داخل ہونے کے کچھ علامات ظاہر ہوتے۔ موجودہ بندروں ہی میں انسان بننے کے کچھ علائم رونما ہوتے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ نتیجہ صفر ہے۔ آج بھی ہر نوع اسی طرح موجود ہے جس طرح آج سے ہزارہا برس پہلے موجود تھی۔ وہی اعضاء و جوارح، وہی عادات و خصائل وہی شکل و شمائل، کسی نوع کا ترقی کرکے دوسری نوع میں داخل ہونا ثابت نہیں ہے۔ لہٰذا ڈارون صاحب کا یہ نظریہ محض وہم پرستی ہے۔ حقیقت سے اسے کوئی تعلق نہیں ہے۔ "وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا" (سورۃ فرقان: ۲۳)

اس نظریہ کی دُوسری دلیل اور اس کا جواب

اس نظریہ کے قائلین یہ دلیل بھی پیش کرتے ہیں کہ چونکہ بندر و انسان میں بعض چیزوں میں باہمی مشابہت پائی جاتی ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ انسان کی اصل بندر ہے۔ ان کی یہ دلیل بھی بچند وجہ علیل ہے اور درجہ اعتبار سے ساقط ہے۔

① اوّلاً: اس لیے کہ یہ محض ایک ظنی مفروضہ ہے۔ اگر اس باہمی مشابہت ہی کی بنا پر بندر کو اصل اور انسان کو اس کی فرع بنانا جائز ہے، تو پھر اگر کوئی یوں کہہ دے کہ انسان اصل اور بندر اس کی فرع ہے تو اس کا ڈارون کے پاس کیا جواب ہے؟

② ثانیاً: اس لیے کہ خالق حکیم نے تخلیق و تکوین کا نظام کچھ اس طرح قائم کیا ہے کہ ہر جنس کے ماتحت جو انواع موجود ہیں، ان میں کچھ نہ کچھ باہمی مشابہت ضرور پائی جاتی ہے، تو اگر باوجود لوازم و آثار کے اختلاف اور فوائد و خواص کے افتراق کے محض اس معمُولی سی باہمی مشابہت کی وجہ سے بعض انواع کو اصل اور بعض کو فرع قرار دینا صحیح ہو تو اس اصول کے تحت یہ بھی جائز ہوگا کہ کوئی شخص یہ

کہہ دے کہ "سرو" کا درخت کھجور کے درخت سے بنا ہے۔ یا کھجور کا درخت "سرو" کے درخت سے بنا ہے، یا زیتون، انگور سے یا انگور، زیتون سے پیدا ہوا ہے۔ گائے بھینس سے یا بھینس گائے سے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ آیا کوئی عقلمند اس دھاندلی کو روا رکھ سکتا ہے؟ کیا عقلِ سلیم و فطرتِ صحیحہ اس بے راہروی کو اختیار کرنے کی اجازت دیتی ہے؟

۳ ثالثاً: اس لیے کہ اگر یہ بات درست ہوتی کہ انسان بندر سے ترقی کر کے انسانیت کے درجہ پر پہنچا ہے اور یہ بندر کی ہی فرد کامل ہے، تو لازم تھا کہ انسان کسی مرحلہ پر بھی کسی صفت میں بندر سے پیچھے نہ رہتا۔ بلکہ ہر ہر مرحلہ پر اس سے آگے بڑھا ہوا ہوتا، حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ جب ایک عام انسان ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے، وہ عقل و جسم کے اعتبار سے اس قدر کمزور ہوتا ہے کہ نہ وہ چلنے پھرنے اور اٹھنے بیٹھنے یا معمولی حرکت کرنے پر قادر ہوتا ہے اور نہ ہی اسے اچھی اور بُری اور مُفید و مضر چیز میں تمیز ہوتی ہے۔ نہ نافع کا اِکتساب اور مضر سے اِجتناب کرنے کی لیاقت رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اسے یہ بھی شعور نہیں ہوتا کہ ماں کی چھاتی کس طرح مُنھ میں لینی ہے۔ کافی جد و جہد کے بعد اسے دودھ پینے کا طریقہ آتا ہے۔ مگر اس ساری کمزوری اور نادانی کے باوجود جب وہ ترقی کرنے پر آتا ہے تو ایک محقق و مدقق عالم و فیلسوف بن جاتا ہے اور تمام اشیاء عالم کو اپنی خداداد عقل و تدبیر سے مسخر کر لیتا ہے اور نظامِ شمسی و قمری پر اپنی ہمت کی کمندیں ڈالنے لگتا ہے۔ مگر بندر کی یہ کیفیت ہے کہ وہ پیدا ہوتے ہی اکثر حیوانات کی طرح کافی حرکت کرنے پر قادر ہوتا ہے اور پرورش میں ماں کے ساتھ معاون و مددگار ہوتا ہے۔ مناسب غذا کھا لیتا ہے، مُفید و مضر کی پہچان رکھتا ہے۔ غرض کہ اس میں اسی وقت وہ سوجھ بوجھ ہوتی ہے جس کا عشر عشیر بھی انسانی نومولود بچے میں نہیں ہوتا۔ اس اختلاف و افتراق سے یہ امر پایہ یقین کو پہنچ جاتا ہے کہ انسان ہرگز بندر سے ترقی کر کے پیدا نہیں ہوا۔ اگر ایسا ہوتا تو ابتداء پیدائش میں کسی طرح بھی وہ بندر سے کمتر نہ ہوتا۔ حالانکہ وہ بالمشاہدہ مذکورہ بالا امور میں اس سے پست تر اور کمتر ہے۔ مگر اس کے باوجود بڑا ہو کر انسان عقل و جسم میں بندر پر بدرجہا فوقیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس سے بندر و انسان کے ایک ہی اصل سے ہونے والا نظریہ بالکل تارِ عنکبوت کی طرح کمزور بلکہ باطل ہو جاتا ہے۔ "وَاِنَّ اَوۡهَنَ الۡبُيُوۡتِ لَبَيۡتُ الۡعَنۡكَبُوۡتِ" (العنکبوت: ۴۱) پس اس باہمی تفاوت و اختلاف کی موجودگی میں یہ کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ بندر اور انسان کی اصل ایک ہے اور یہ کہ بندر ہی ترقی کر کے انسانی منزل تک پہنچا ہے۔ وَمَا لَهُمۡ بِذٰلِكَ مِنۡ عِلۡمٍ ۚ اِنۡ هُمۡ اِلَّا يَظُنُّوۡنَ (سورۃ الجاثیہ: ۲۴)

یہی حقائق تھے کہ جنھوں نے بڑے بڑے حکمائے یورپ کو ڈاروِن کی اس تھیوری کی مخالفت

ورد کرنے پر مجبور کیا۔ تندل کہتا ہے: "یہ نظریہ بالکل غلط ہے"۔ اور "فرخو برلین" کہتا ہے: "نظریہ ارتقاء کسی ٹھوس علمی قاعدہ پر مبنی نہیں ہے"۔ ڈاکٹر دوستون کہتا ہے: "ہم ادلہ صحیحہ کی بنا پر کہتے ہیں کہ انسان کبھی بندر نہ تھا، بلکہ ابتدائے آفرینش ہی میں انسان تھا"۔ "کامل فلاریوں" نے بھی ایسا ہی افادہ فرمایا ہے۔ (بحوالہ سائنس اور اسلام)

⑤ **شُبہ خامسہ** : یہ لوگ خالق کائنات کی ذات والاصفات کا انکار کر کے عجیب ذہنی کش مکش اور عقلی تذبذب واضطراب میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ گرگٹ کی طرح تلون مزاجی اور تبدل طبعی کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کوئی شبہ پیش کرتے ہیں اور کبھی کوئی۔ کبھی کوئی عذر تراش کرتے ہیں اور کبھی کوئی۔ گویا ان کا ہر شخص زبان حال سے پکار رہا ہے: ؎

کبھی جھکتا ہوں مینا پر کبھی گرتا ہوں ساغر پر
مری بے ہوشیوں سے ہوش ساقی کے بکھرتے ہیں

بہر حال اپنے انکار پر جب سابقہ عذر ہائے لنگ سے کام نہیں بنتا تو ایک اور عذر بارد پیش کرتے ہیں اور وہ یہ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی جسم میں بعض اجزاء جیسے مرد کے پستان، یا حشفہ کا چمڑا وغیرہ بے فائدہ ہیں، اسی طرح بعض ایسے موجودات بھی دیکھنے میں آتے ہیں کہ ان کی خلقت میں کوئی مصلحت نہیں بلکہ ان کا وجود سراسر شر و فساد ہے۔ جیسے عقرب و سانپ وغیرہ زہریلی اشیاء۔ پس اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خالق کائنات کوئی علیم و حکیم اور قادر و قیوم ذات نہیں ہے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ یہ سب مادہ کے تخلیقی آثار ہیں۔

یہ شبہ بھی بچند وجہ درجہ اعتبار سے ساقط و ہابط اور ناقابلِ اِستناد ہے۔

① **وجہ اوّل**: اس مقام پر صاحبِ "رسالہ حمیدیہ" نے صانع عالم کی ہستی کا اقرار و انکار کرنے والوں کی مثال ان دو شخصوں کے ساتھ دی ہے (یہ مثال دراصل امام جعفر صادق علیہ السلام کے املا کردہ رسالہ توحید مُفضل سے ماخوذ ہے) جو کسی نہایت عالی شان رفیع البنیان کوٹھی میں داخل ہوں جس میں مُتعدّد محکم و مضبُوط کمرے اور نشست گاہیں موجود ہوں، دروازوں، جنگلوں سے آراستہ ہو، بر آمدے بہت عمدہ ہوں، ان کمروں میں اعلیٰ درجہ کے فرش فروش بچھے ہوں، بڑے بڑے پلنگ، عمدہ کرسیاں، میز اور بیش قیمت ظروف نہایت سلیقہ و قرینہ سے اپنی اپنی جگہ موجود ہوں۔ اس کے چاروں طرف نہایت خوب صورت سیر گاہیں نظر آ رہی ہوں۔ اس کے ارد گرد ایسی چمن بندی کی گئی ہو کہ بیل بوٹے قطار اندر قطار ایستادہ ہوں۔ قسم قسم کے پھولوں کی کیاریاں مناسب جگہ پر بنی ہوئی

ہوں ۔ پانی کے چھوٹے چھوٹے چشمے بہہ رہے ہوں اور فوارے جاری وساری ہوں ۔ نیز پانی کے حوض لبالب پُر ہوں ۔ غرض کہ آرائش وزیبائش اور عیش و آرام کے تمام سامان مہیا ہوں، جو شخص بھی اسے دیکھے اس کے معمار وصناع کی کاریگری پر عش عش کر اٹھے، اور اس کی حکمت وتدبیر کی تعریف و توصیف کرنے پر مجبور ہوجائے ۔ بہرکیف یہ دونوں شخص اس کوٹھی میں داخل ہوں، اور اس کی ہر ہر چیز کو بنظر غائر دیکھتے اور معمار کی عجیب صنعت وحرفت کی داد دیتے ہوئے ایک ایسی جگہ پر پہنچ جائیں کہ جہاں ایک ایسا روشندان دیکھیں یا اس میں کوئی لکڑی پڑی ہوئی دیکھیں یا کوئی خلا دیکھیں جس کی مصلحت ان کی سمجھ میں نہ آسکے ۔ اس وقت ان میں سے ایک شخص تو یہ کہے کہ اس کوٹھی کا بنانے والا اگرچہ ہماری نظروں سے غائب ہے لیکن اس بات میں تو ذرا بھی شک وشبہ نہیں ہے کہ وہ ہے ضرور، اور اس کوٹھی کی تعمیر میں اس نے جس کاریگری کا مظاہرہ کیا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں علم و قدرت اور تدبیر وحکمت بدرجۂ اتم واکمل موجود ہے ۔ ہاں البتہ اس کوٹھی میں بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جن کی حکمت ومصلحت ہماری سمجھ میں نہیں آرہی ۔ مگر چونکہ اکثر چیزوں کی حکمت واضح وآشکار ہے جو اس کے معمار کے حکیم و مدبر ہونے کی بین دلیل ہے، اس لیے ان بعض چیزوں میں بھی ضرور کوئی مصلحت اور حکمت ہوگی جو اس وقت ہماری سمجھ میں نہیں آرہی ۔ مگر دوسرا شخص یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد یہ کہے کہ اس کوٹھی کو کسی علیم وحکیم اور مہندس معمار نے نہیں بنایا، ایک تو اس لیے کہ میں نے اسے بچشم خود دیکھا نہیں اور دوسرے اس لیے کہ اگر وہ حکیم ہوتا تو یہاں بعض چیزیں بلا فائدہ نہ ہوتیں اور پھر کچھ سوچ کر وہاں موجودہ پہاڑ کی طرف اشارہ کرکے کہے کہ مدت ہائے دراز میں ہوائیں چلتی رہیں اور اس پہاڑ کی طرف سے مٹی اور پتھر حرکت کرکے آتے رہے اور چشمہ و بارش کے پانی کی آمیزش سے گارا بن گیا اور ایک طویل عرصہ گزرنے کے بعد تدریجی طور پر یہ محل خودبخود اس مواد سے تیار ہوگیا ۔ اس طرح عرصہ دراز تک ہوائیں چلتی رہیں کہ یہ سامان اِدھراُدھر سے اڑ کر یہاں جمع ہوکر کمروں میں خودبخود آراستہ ہوگیا ۔

اب فیصلہ اربابِ عقل و دانش پر ہے کہ وہ اس شخص کے بارہ میں کیا حکم دیتے ہیں کہ جو اس تعمیر کو ایک مدبر وحکیم و ذی عقل وحیات ذات کی طرف منسوب کرتا ہے اور اس شخص کی نسبت کیا فیصلہ صادر کرتے ہیں جو اس تعمیر کو ایک ترابی مادہ اور اس کی حرکت کی طرف نسبت دیتا ہے؟ اور ان میں سے کس کا نظریہ قرین عقل ودانش ہے ۔

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ (سورۃ العنکبوت: ۴۳)

کس قدر تعجب کی بات ہے کہ دہریہ تو اس عجائب وغرائب سے لبریز عالم کو ایک بے عقل وشعور مادہ کی طرف منسوب کریں اور اپنی حکمت و دانائی کے مدعی ہوں اور جو اس عالم کے عجیب وغریب نظام اور اس کے انصرام واستحکام کو خدائے حکیم کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ ان کو جاہل و نادان قرار دیتے ہیں۔ خلافِ عقل و فطرت بات کا بلا دلیل و برہان ماننا اور منوانا اور مطابق عقل و فطرت امر کا انکار کرنا اور اس کے قائلین کا مذاق اڑانا سراسر اندھیر اور سینہ زوری نہیں تو اور کیا ہے؟ مگر ع

جو چاہے ان کا حسن کرشمہ ساز کرے

اگرچہ اس شبہ کے ازالہ میں یہی بے نظیر مثال والی تقریر دلپذیر کافی ووافی ہے مگر ہم مزید اطمینانِ قلب کے لیے ذیل میں بعض اور وجوہ بھی بیان کرتے ہیں۔

(۲) وجہ دوم: یہ ایک مُسلمہ قانون ہے کہ کسی چیز کے معلوم نہ ہوسکنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ واقع میں موجود ہی نہیں ہے۔ بنا بریں ہم اس عالم کی اکثر و بیشتر اشیاء کے حِکَم و مصالح سے آگاہی حاصل کرچکے ہیں، اور ان میں جو محیر العقول فوائد ومصالح موجود ہیں، ان کے چہرہ سے نقاب کشائی کرچکے ہیں تو عقل سلیم یہی کہتی ہے کہ جس صانع حکیم کے اکثر آثارِ صنعت میں بے شمار اسرار و رموز موجود ہیں ضرور ان بعض اشیاء میں بھی کوئی نہ کوئی حکمت ہوگی۔ جس تک تا حال ہماری رسائی نہیں ہوئی۔ لہٰذا اس کی گہرائی تک رسائی حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا چاہیے۔ اگرچہ انسانی علم بہت ہی ناقص ہے۔ "وَمَآ أُوْتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا" (بنی اسرائیل:۸۵) اس لیے یہ تو ممکن نہیں ہے کہ وہ تمام اسرار قدرت کو بے نقاب کرسکے۔ مگر وہ مسلسل تگ و تاز سے اپنے معلومات کے ذریعہ بہت سے مجہولات کو حاصل کرسکتا ہے۔ آج کل کے انکشافات جدیدہ اور آلاتِ مُفیدہ انسان کے اسی جذبہ تحقیق وجستجو کے ناقابلِ انکار آثار و شاہکار ہیں۔ بایں ہمہ کسی چیز کی حکمت و مصلحت کو نہ سمجھ سکنے کو اپنی کم علمی پر محمول کرنا چاہیے، نہ اس امر پر کہ اس چیز میں کوئی مصلحت ہی نہیں۔ ایسا کرنا دانشمندی نہیں بلکہ سراسر حماقت ہے۔ یہ بات اس وقت درست ہوتی جب کہ ہم کائنات کی تمام چیزوں کی کنہ حقیقت معلوم کرچکے ہوتے اور اس کے باوجود بعض اشیاء کی کوئی مصلحت نظر نہ آتی۔ مگر جب یہ حقیقت مُسلّم ہے کہ علوم وفنون کی موجودہ ترقی کے دور میں بھی ہمارے مجہولات کی تعداد معلومات سے کہیں زیادہ ہے تو پھر یہ نظریہ کیونکر درست ہوسکتا ہے کہ جس چیز کی مصلحت ہم معلوم نہیں کرسکے، اس میں کوئی مصلحت ہی نہیں ہے۔ خداوند عالم نے ایک گروہ کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا ہے: "بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ" (سورۃ یونس:۳۹) کہ وہ جس چیز کا احاطہ علمی نہ رکھتے ہوں اسے جھٹلا دیتے ہیں۔ دو چار

مجہول چیزوں کو دیکھ کر بکثرت معلوم چیزوں سے بھی دست بردار ہو جانا خردمندوں کا کام نہیں ہے۔

③ وجہ سوم: ہم انسانی علمی و عملی کمزوریوں کے اعتراف کے باوجود یہ کہنے کو تیار ہیں کہ ایسا نہیں ہے کہ ہمیں اعتراض میں نامبردہ اشیاء کی مصلحت کا بالکل کچھ علم نہیں ہے، بلکہ بفضلہٖ تعالیٰ ان کے بعض فوائد و عوائد معلوم ہو چکے ہیں۔ اور روز بروز جوں جوں سائنس اور دیگر علوم جدیدہ ترقی کرتے جاتے ہیں تو اس سے جہاں دیگر اربابِ مذاہب، اپنے مذاہب کی بقاء و سالمیت کو خطرہ میں محسوس کر کے خائف و ہراساں نظر آتے ہیں وہاں مُسلمان اسلام کی صداقت و حقانیت کو اور اجاگر و روشن ہوتے ہوئے دیکھ کر خوش و خرم ہو رہے ہیں۔ آج یہی علوم ہماری دینی ترقی کا زینہ بن رہے ہیں اور اصول و احکام اسلام کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کر رہے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علومِ دینیہ اور صحیح تحقیقاتِ جدیدہ کے درمیان ہرگز کسی قسم کا کوئی اختلاف اور تصادم نہیں ہے۔ مثلاً ہم یہاں ایسے چند احکام کا تذکرہ کرتے ہیں جن کی فلاسفی علوم جدیدہ کی بدولت معلوم ہوتی ہے۔

① شارع مُقدّس نے فرمایا تھا: "فر من المجذوم فرارك من الاسد"۔ "کوڑھ والے مریض سے اس طرح دور بھاگو جس طرح شیر سے بھاگتے ہو"۔ آج کی ڈاکٹری تحقیق میں ثابت ہو چکا ہے کہ جذام کے جراثیم شکل و صورت میں ہو بہو شیر کی مانند ہوتے ہیں۔ آج دنیا والوں کو اس تشبیہ بلیغ کی حقیقت معلوم ہوئی ہے۔

② شارع اسلام ﷺ نے فرمایا ہے کہ روٹی کھانے کے بعد اگر انگلیوں پر کچھ غذا لگی ہوئی ہو تو انگلیاں چاٹ لو۔ جب تک موجودہ تحقیقات بروئے کار نہیں آئی تھیں، متجددین کا طبقہ اس حکم یا اس جیسے دوسرے احکام کا مذاق اڑاتا تھا۔ مگر آج کی طبی و سائنسی تحقیقات سے یہ امر پایہ تحقیق تک پہنچ چکا ہے کہ انسانی انگلیوں پر کچھ ایسا قدرتی مواد موجود ہے جو غذا کے ہضم و تحلیل میں بہت ممد و معاون ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ آج حضرت شارع علیہ السلام کے اس حکم کی مصلحت کو معلوم کر کے حیران ہوتے ہیں۔

③ ابھی کل تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ آفتاب اپنے مرکز پر ساکن ہے اور سیارے اس کے اردگرد چکّر لگاتے ہیں۔ مگر قرآن نے آج سے قریباً چودہ سو سال پیشتر یہ اعلان کیا تھا کہ:

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۚ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۝۳۸ (سورۃ یٰسٓ: ۳۸)

"آفتاب اپنے محور و مُستقر پر جاری ہے۔ یہ خدا کے غالب و دانا کی تقدیر ہے"۔

موجودہ تحقیقات سے قبل بے دین لوگ شریعت مُقدّسہ کے اس اعلان کا تمسخر اڑاتے تھے اور دیندار حضرات اس کی مناسب تاویل کرنے پر مجبور تھے۔ مگر موجودہ تحقیقات جدیدہ نے ثابت کر دیا

ہے کہ آفتاب متحرک ہے نہ کہ ساکن ۔

④ حشفہ والا چمڑا بظاہر بے فائدہ سمجھا جاتا ہے ۔ مگر اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں اس کی موجودگی اور بعد میں اس کا قطع کر دینا بھی فوائد سے خالی نہیں ہے ۔ چونکہ یہ مقام بڑا نرم ونازک ہوتا ہے اور بچہ ابتداء میں اس کی کما حقہ نگہداشت سے غافل ہوتا ہے لہٰذا خطرہ تھا کہ اسے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے، اس لیے صانع حکیم نے اس پر غلاف چڑھا دیا، تاکہ سر حشفہ کی حفاظت ہوتی رہے ۔ مگر بلوغ سے قبل ختنہ کو لازم قرار دے دیا ۔ اور اس میں جو فوائد ہیں، ان کا آج منصف مزاج غیر مسلمان ڈاکٹر بھی اقرار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ چنانچہ :

ڈاکٹر کویراج ہرنام داس اپنے رسالہ ہدایت نامہ خاوند صفحہ ۴۸ پر رقمطراز ہے: ”تمام مسلمان اصحاب بچپن کی حالت میں ہی اپنے لڑکوں کے اس پردہ کو کٹوا دیتے ہیں، اس فعل کو ختنہ کہتے ہیں ۔ طبی نکتہ نگاہ سے مجھے مسلمانوں کی یہ رسم بہت ہی پسند ہے“ ۔

جدید تحقیق کے مطابق ”حشفہ“ جاذب ہوتا ہے ۔ ماں کے پیٹ میں غلیظ مواد سے بچنے کے لیے قدرت نے اس پر چمڑے کا غلاف چڑھا دیا ہے ۔

اسی طرح عقرب وسانپ وغیرہ زہریلے جانور جو پہلے عبث وبے فائدہ سمجھے جاتے تھے، آج کل کی تحقیقات مظہر ہیں کہ اس فضا کے اندر کچھ ایسے زہریلے مواد موجود ہیں کہ اگر یہ زہریلے حشرات وحیوانات انھیں جذب نہ کریں تو انسانوں کی ہلاکت واقع ہو جائے ۔ علاوہ بریں یہی اشیاء بعض امراض مزمنہ کے علاج میں بطور دوا بھی استعمال ہوتی ہیں ۔ اور بھی ان کے وجود سے بہت سے فوائد ہیں جو عند التامل معلوم ہو سکتے ہیں ۔ ابھی تک ہمارے علوم ناقص اور تحقیقات تشنہ تکمیل ہیں ۔ روز بروز نئی تحقیقات وتجربات سے کئی اسرار کائنات فاش ہو رہے ہیں جو آج سے قبل پردہ خفا میں تھے ۔

ڈاکٹر کویراج ہرنام داس اپنے رسالہ ہدایت نامہ صحت صفحہ ۵۹ پر لکھتا ہے: ”اپنڈ سائٹس کا فائدہ آج تک کوئی معلوم نہ ہو سکا، تاہم خدا کا کوئی کام حکمت کے سوا نہیں ہے ۔ امید ہے تجربوں سے جلدی پتا لگ جائے گا“ ۔ بلکہ اب تو ثابت ہو چکا ہے کہ اپنڈکس ایک قسم کا ”الارم“ ہے، جو غلیظ مواد آنتوں میں ہونا چاہیے تھا، وہ اس میں جمع ہوتا رہتا ہے ۔ اور جب نقصان کی نوبت آتی ہے تو یہ اپنڈکس درد کی صورت میں الارم دیتی ہے ۔ اس طرح اصل انتڑیاں محفوظ رہتی ہیں ۔

④ وجہ چہارم: شبلی نے ابن رشد سے اس شبہ کا یہ جواب نقل کیا ہے کہ دنیا میں جو برائی پائی جاتی ہے وہ بالذات نہیں، بلکہ کسی نہ کسی بھلائی کے تابع ہے ۔ مثلاً غصہ بری چیز ہے ۔ لیکن اس حاسہ کا نتیجہ

ہے جس کی بدولت انسان حفاظت خود اختیاری کرتا ہے۔ اگر یہ حاسہ نہ ہو تو انسان ایک قاتل کے مقابلہ میں اپنی جان بچانے کی بھی کوشش نہ کرے۔ فسق و فجور بری چیزیں ہیں۔ مگر یہ اسی قوت سے متعلق ہیں جس پر نسل انسانی کی بقا منحصر ہے۔ آگ گھروں کو جلا دیتی ہے۔ شہر کے شہر اس سے تباہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر آگ نہ ہو، انسان کا زندگی بسر کرنا محال ہو جائے۔ ان اچھی چیزوں سے اس تاریک پہلو کی جدائی بظاہر ناممکن ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایسی آگ پیدا کی جائے جس سے کھانا تو پکایا جاسکے مگر مسجد میں جلانا چاہیں تو نہ جل سکے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ موجوداتِ عالم میں جو کچھ موجود ہے وہ دو حال سے خالی نہیں ہے۔ یا وہ خیر محض ہیں یا ان میں خیر کا پہلو غالب ہے۔ ایسی کوئی چیز موجود نہیں جو سراسر شر ہو، یا اس میں خیر و شر کا پلہ برابر ہو یا شر کا پلہ بھاری ہو۔ "آزمائے جس کا جی چاہے"۔ "ولا ینبئك مثل خبیر...... و الوجود خیر من العدم" بہر حال نظامِ عالم میں بزعم خویش جو برائیاں ہمیں نظر آتی ہیں ان کے متعلق کون شخص یہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ یہ واقعی نقائص ہیں۔ جب کہ نظامِ عالم کا پورا سلسلہ ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہی نہیں ہے۔ لہٰذا اتنی سی بات پر خداوند عالم کے کمال اور عزت و جلال کا کیونکر انکار کیا جاسکتا ہے؟ خصوصاً جب کہ ہمارے علم کی آخری سند ہے: "وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا" (بنی اسرائیل:۸۵) مگر افسوس...... "ما قدروا الله حق قدرہ" لوگوں نے خداوند عالم کی قدر نہیں کی، ورنہ یہ جرأت نہ کرتے۔ مگر ع

کرم ہائے تو مارا گستاخ کرد

ڈارون: پیدائش فروری ۱۸۰۹ء وفات اپریل ۱۸۸۲ء

چارلس رابرٹ ڈارون، اپنی تھیوری اور اپنے نظریے کی وجہ سے مشہور ہے، اسی نے کہا تھا کہ ایک نوع، دوسری نوع میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کے اس نظریہ کو ڈاروِنزم کا نام دیا گیا۔ وہ گزشتہ چند صدیوں کے بعض مادہ پرست لوگوں کی لادینی اور خدا سے انکار کا باعث بنا۔ مشہور امریکی مصنف جان کلوور مونیسا لکھتا ہے کہ: "آخر کار اس کی ضمیر نے اس کو جھنجھوڑ دیا۔ باطن میں چھپے ہوئے اس کے فطری شعور نے اسے اپنے ہی فلسفے کے خلاف کر دیا۔ اور وہ بعد میں خدا کی ازلی اور ابدی طاقت کا معترف ہو گیا۔ جرمن دانشور "بخنر" نے اپنی کتاب "اصل الانواع" میں یہ اعتراف کیا ہے کہ: "محال ہے کہ بالغ عقل، دنیا کے اس حیرت انگیز نظام اور اس کی ہم آہنگی کو دیکھ کر یہ کہے کہ دنیا کا کوئی عالیقدر سرچشمہ اور حکمت والا خالق نہیں ہے"۔

سابقہ ابحاث کا خلاصہ

مذکورہ بالا بیانات شافیہ اور ابحاثِ کافیہ سے یہ امر کالشمس فی نصف النہار واضح و آشکار ہو جاتا ہے کہ خالق کائنات کے وجود کا اقرار بالکل بدیہی و فطری ہے۔ اور ہر قسم کے شکوک وشبہات سے بلند وبالا ہے۔ اسی بنا پر حکیم فرفوریوس نے کہا ہے کہ: "جو امور بداہتِ عقل سے ثابت ہیں من جملہ ان کے ایک مسئلہ ثبوت صانع عالم بھی ہے"۔ اور حکیم ابن مسکویہ کہتے ہیں: حکماء میں سے کسی سے بھی نہ منقول نہیں ہے کہ اس نے وجود صانع کا انکار کیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ حکماء تو بجائے خود آج تک عقلاء میں سے کسی عقلمند آدمی نے بھی ہستی صانع کا انکار نہیں کیا۔ اگر کسی شخص نے صانع کا انکار یا اس کی ہستی میں تردد وتذبذب کا اظہار کیا ہے تو عقلائے روزگار نے اسے زمرۂ عقلائے کا مگار سے شمار نہیں کیا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ ایسا شخص صاحبِ عقل کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ کیونکہ عقل کی تعریف (بالاثر) جو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے بیان فرمائی ہے، یہ ہے:

العقل ما عبد بہ الرحمن و اکتسب بہ الجنان (اصول کافی)

عقل وہ ہے جس سے خداوند عالم کی عبادت کی جائے اور جنّت حاصل کی جائے۔

و من کان ذا عقل اجل بعقلہٖ

و افضل عقل عقل من یتدین

لہٰذا بنا بریں جو شخص خدائے رحمٰن کی عبادت اور جنّت کا حاصل کرنا تو درکنار خود معرفت پروردگار سے بھی تہی دامن ہے وہ کسی طرح بھی عقل مند کہلانے کا حق دار نہیں ہے۔ ایسے شخص میں جو چیز موجود ہے جسے عام لوگ عقل کہتے ہیں وہ درحقیقت "نکرا" اور "شیطنت" ہے۔ جو عقل کے ساتھ شباہت تو رکھتی ہے مگر حقیقۃً عقل نہیں ہے۔ کیونکہ اگر وہ فی الواقع عقل ہوتی تو اس کا حامل معرفتِ خالق عالم اور اس کی عبادت سے اس طرح غافل وذاہل نہ ہوتا۔

اِثباتِ صانع پر ایک اِقناعی دلیل

عقل کے نزدیک ضررِ محتمل کا دفع کرنا اور اس سے بچاؤ کی تدبیر اختیار کرنا لازم ہے۔ یعنی جہاں کسی قسم کے ضرر پہنچنے کا محض احتمال و اندیشہ بھی ہو، وہاں عقلِ سلیم بطور وجوب اس کے دفع کرنے اور اس سے بچاؤ کی کوئی تدبیر اختیار کرنے کا حکم کرتی ہے، چہ جائیکہ جب وہ ضرر یقینی و حتمی ہو، چنانچہ مشاہدہ شاہد ہے کہ اگر کوئی غیر ثقہ آدمی یا کوئی بچہ کسی شخص کو یہ خبر دے کہ فلاں جگہ ایک شیر یا

اژدہا بیٹھا ہے جو شخص بھی اس طرف سے گزرتا ہے وہ اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ تو اگرچہ اس شخص کو اس مخبر کی اس خبر پر یقین نہ ہو مگر محض اس خیال سے کہ شاید یہ سچ کہہ رہا ہو، اور مبادا اسے کوئی ضرر پہنچ جائے، اس لیے وہ یا تو اس مقام پر جاتا ہی نہیں، اور اگر جائے بھی تو بچاؤ کی کوئی نہ کوئی تدبیر کر کے جاتا ہے۔ اور یہی طریق کار عقل و فطرت کے عین مطابق ہے۔ مگر مُتعلقہ مسئلہ میں پہنچ کر مُنکرین خدا کے نزدیک یہ اصول بدل جاتے ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بنابر مشہور ایک لاکھ چوبیس ہزار صادق القول معصوم عن الخطاء انبیاءؑ و مرسلینؑ اور ان سے بھی زائد ان کے اوصیاء طاہرینؑ اور کروڑوں علمائے دین، بلکہ تمام متدینین و ملیین یہ کہتے رہے اور کہہ رہے ہیں کہ خداوند عالم موجود ہے، اور اس صانع حکیم نے اس مادی عالم کے علاوہ ایک اور عالم آخرت جس میں جنّت و دوزخ ہے، بھی پیدا کیا ہے۔ جس میں مرنے کے بعد بطور جزا یا سزا لوگوں کو رہنا ہے۔ کیا یہ حالات اگر کسی عقلمند آدمی کے سامنے ہوں تو اس کی عقل اسے حقیقتِ حال کا سنجیدگی سے جائزہ لینے اور متانت سے غور و فکر کرنے پر مجبور نہیں کرتی؟ کیا عقل اسے یہ سوچنے پر آمادہ نہیں کرتی کہ قطع نظر ان ادلہ و براہین کے جو صانع عالم کی ہستی پر قائم ہیں، حقیقت امر دو حال سے خالی نہیں۔ یا خدا ہے (اور یقیناً ہے) یا نہیں ہے (اور یقیناً یہ شق باطل ہے) اگر نہیں ہے تو اسے ماننے اور نہ ماننے والے مرنے کے بعد سب برابر ہوں گے، نہ کوئی حساب و کتاب ہوگا، اور نہ جنّت و دوزخ۔ لیکن اگر وہ موجود ہوا، تو ماننے میں فائدہ اور نہ ماننے میں ضرر و نقصان کا اندیشہ ہے۔ کیا صحیح عقل اس ضرر سے بچنے کا حکم نہیں کرتی؟ لیکن باوجودیکہ بقول بعض محققین حقیقی اجماع و اتفاق جس طرح محسوسات میں موجب یقین و اطمینان ہوتا ہے، اسی طرح معقولات میں بھی باعثِ علم و اذعان ہوتا ہے۔ لیکن یہ کج فطرت لوگ اس جم غفیر اور جمع کثیر کے اجماع و اتفاق سے بھی ہرگز متاثر نہیں ہوتے بلکہ بایں ہمہ اپنے انکار پر اصرار کر رہے ہیں۔ لہٰذا دریں حالات کون دشمن عقل ایسے لوگوں کو صاحبِ عقل تسلیم کر سکتا ہے۔ یہی مختصر اور سادہ مگر مقنع دلیل حکماء روحانیین یعنی حضرات ائمہ طاہرین صلوات اللہ علیہم اجمعین سے بھی منقول ہے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل اشعار آبدار حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی طرف منسوب ہیں:

قال المنجم و الطبیب کلا هما

لن یبعث الاموات قلت الیکما

"منجّم اور طبیب دونوں نے کہا کہ مردے کبھی زندہ نہ ہوں گے۔ مَیں نے ان کے جواب میں کہا: بس الگ رہو"۔

ان صح قولکما فلست بخاسر
اوصح قولی فالخمار علیکما

”اگر بالفرض تمہاری بات صحیح ہوئی تو اس میں میرا کوئی نقصان نہیں لیکن اگر میرا قول صحیح نکل آیا تو پھر تم دونوں کو ضرور نقصان اٹھانا پڑے گا“۔

(دیوان منسوب بہ حضرت علیؑ)

ایسا ہی ایک استدلال حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک مرتبہ ایک دہریہ آنجنابؑ کی خدمت میں یہ مشورہ دینے آیا کہ: ”آپ نماز روزہ وغیرہ خودساختہ احکام کی بے فائدہ پابندی کر کے کیوں لطفِ حیات ضائع کرتے ہیں۔ حیاتِ مُستعار سے پورا پورا فائدہ اٹھانا اور لطف اندوز ہونا چاہیے“۔

امام عالی مقامؑ نے فرمایا کہ:

”اگر یہ پابندیاں فی الواقع خودساختہ ہی ہیں، اور کوئی حاکم مُطلق موجود نہیں تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ موت کے بعد اس پابندی پر کوئی باز پرس نہ ہوگی۔ لہٰذا تمہارے قول کے مطابق مجھے کوئی خمیازہ نہ بھگتنا پڑے گا۔ لیکن اگر ہمارا نظریہ درست ہوا تو بتاؤ تمہاری یہ آزادیاں تمھیں آئندہ کہاں لے جائیں گی؟“ (بحارالانوار جلد ۲)

امامؑ کے اس کلامِ ہدایت التیام کا یہ اثر ہوا کہ وہ دہریہ مشرف بہ اسلام ہوگیا۔ امام علیہ السلام کے اس کلام مُعجز نظام کا جس طرح اس دہریہ پر اثر ہوا تھا وہ تو آپ نے سُن لیا۔ یہاں ایک اور گم گشتہ وادئ ضلالت کا تاثر بھی ساعت فرمالیجیے جو غلط تعلیم اور غلط سوسائٹی سے متاثر ہوکر اسلام کا جوا اپنی گردن سے اتار کر دہریت کی تاریک وادئ ضلالت میں قدم رکھ چکا تھا اور بڑی بڑی دلیلوں سے اس کی تسلی نہ ہوتی تھی۔ مگر جب توفیق ایزدی شامل حال ہوئی تو امام علیہ السلام کا یہی کلامِ حق ترجمان پڑھ کر صراطِ مستقیم پر گامزن ہوگیا۔ اور اس کے تمام عقدے حل ہو گئے۔ اس کے اپنے الفاظ میں اس کی داستان سنیے۔ کہتے ہیں: ”ایک دن مَیں ایک مذہبی رسالہ پڑھ رہا تھا۔ پڑھتے پڑھتے میری نظر ایک دلیل پر پڑی، جسے صادق آلِ محمدؑ نے خدا کی ہستی کے ثبوت میں ایک دہریہ کے سامنے پیش فرمایا تھا (پھر یہی سابقہ روایت نقل کی ہے) یہ روایت پڑھ کر میرے ہاتھ سے رسالہ گر پڑا۔ اور میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضور مجھ ہی کو مخاطب فرما کر کہتے ہیں کہ: ”لیکن اگر میں صادق القول ہوں تو یہ آزادیاں تمھیں آئندہ کہاں لے جائیں گی؟“ آنکھیں دیکھتی تھیں مگر ان

لفظوں کے سوا کچھ دکھائی نہ پڑتا تھا۔ کان سنتے تھے مگر یہی ایک فقرہ، میری نیند اچاٹ ہوگئی اور کھانا پینا چھوٹ گیا۔ عجب حالت تھی، دل میں خوف، جسم کو لرزہ، زبان خاموش اور دماغ میں اسی ایک فقرہ کی صدائے بازگشت: "لیکن اگر میں صادق القول ہوں تو تمہاری آزادیاں تمہیں آئندہ کہاں لے جائیں گی؟"...... آٹھ دس روز تک میری یہی حالت رہی، اور میں یہ لکھتے ہوئے آج بھی بے انداز خوشی اور سرور محسوس کرتا ہوں کہ بطفیل چہاردہ معصومینؑ آخر میں دل و دماغ نے وہ سوال حل کر لیا جو سالہا سال تک میرے لیے ایک معمہ رہا تھا۔ (رسالہ میں شیعہ کیوں ہوا از حلمی)

سچ ہے: "ما یخرج من القلب یقع فی القلب"۔ یعنی "دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے"۔ خدا کرے ہماری یہ کتاب بھی اسی طرح گم گشتگان وادی ضلالت و سرگردانِ ورطہ غوایت کے لیے باعث رشد و ایمان اور شمع ہدایت و ایقان ثابت ہو۔ بجاہ النبی و آلہ الاطہار علیہم السلام۔

وجودِ باری تعالیٰ کے متعلق ایک سوال اور اس کا جواب

بعض بے بصیرت لوگوں کے اذہانِ ناقصہ میں عموماً یہ سوال چکر لگاتا رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کس طرح وجود میں آیا؟ جب کہ ہر موجود کے لیے عقلاً کسی موجد کا ہونا ضروری ہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جس طرح عقل کا یہ فیصلہ ہے کہ کسی بھی موجود کے لیے ایک موجد کا ہونا ضروری ہے، اسی طرح یہی عقل یہ بھی کہتی ہے کہ اس تمام کائنات کا کوئی ایسا موجد ہونا چاہیے جو کسی موجد کے بغیر آپ سے آپ موجود ہو ورنہ ہر موجود کے لیے ایک موجد درکار ہوگا اور یہ سلسلہ کہیں بھی جا کر نہ رکے گا۔ خدا تو کہتے ہی اس کو ہیں جو سب کا خالق ہو اور خود کسی کا مخلوق نہ ہو۔ اگر وہ بھی کسی کا مخلوق ہو تو پھر وہ خدا نہیں رہے گا، بلکہ خدا وہ ہوگا جس نے اس کو پیدا کیا۔

ایمان باللہ کے اخلاقی فوائد

مذکورہ بالا تمام حقائق سے ایک ناظر خبیر کو یقین ہو جاتا ہے کہ صانع عالم موجود ہے اور اسی ہستی کا اقرار واجب و لازم ہے۔ اگر اسی مسئلہ "ہستی صانع" کو دیکھا جائے تو اس کے کئی اخلاقی فوائد ہیں۔ ہم یہاں بعض فوائد کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ایمان باللہ کا پہلا فائدہ

ایمان باللہ کا پہلا اخلاقی فائدہ یہ ہے کہ یہ تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے۔ جب یہ یقین مبدل بہ

شک ہوجائے تو انسان جوشِ عمل سے عاری ہوجاتا ہے۔ پھر حُسنِ عمل کی ہزار سعی کے باوجود انصاف کے حدود کو قائم نہیں رکھ سکتا اور وہ شیطان کا آلہ کار بن جاتا ہے۔ کیونکہ جب کسی محاسب اعلیٰ کا یقین ہی نہ ہو تو سعی وعمل کا جائزہ لینے کی کیا ضرورت۔ جب کوتوال ہی موجود نہیں تو چور کو چوری سے کیا امر مانع ہوسکتا ہے؟ منکرین کے گروہ میں جو کچھ حُسنِ عمل پایا جاتا ہے وہ ان کے باطنی تذبذب کا نتیجہ ہے۔ یعنی منکر لوگ اگرچہ بظاہر منکر خدا ہیں اور آخرت کے خطروں سے بے پرواہی کا مظاہرہ کرتے ہیں مگر دل کے گوشہ میں یہ اندیشہ ضرور رکھتے ہیں کہ مبادا اس وسیع وعریض کائنات کا کوئی خالق و مالک ہو جو مرنے کے بعد ہمیں زندہ کرکے باز پرس کرے۔ دوسری طرف بعض مدعیانِ ایمان شب و روز گناہ کی آلودگیوں میں ملوث نظر آتے ہیں، اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ ان کا یہ اقرار لفظی اور رسمی ہے، وہ عین حالت رکوع وسجود میں بھی شک کرتے رہتے ہیں کہ شاید خدا موجود نہ ہو، اور ہمارے یہ رکوع و سجود تضیع اوقات ہوں۔ اسی لیے قرآن کریم مناظر قدرت کی طرف برابر توجہ دلاتا ہے۔ وہ قدرت کی صنعت بھری رنگ آمیزیوں اور گل کاریوں کو انسان کے سامنے پیش کرکے پوچھتا ہے کہ یہ سب کچھ موجود ہے۔ کیا یونہی پیدا ہوگیا؟ مظاہرِ عالم اور مناظر قدرت میں تحقیقی نظر ڈالنے سے بالآخر ضرور انسان شک کی دیوار سے پار ہوکر خالق بر و بحر کے سامنے اپنی بندگی کا اقرار کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَآمِنُوا خَيْرًا لَّكُمْ (سورۃ النساء: ۱۷۰)

ایمان باللہ کا دوسرا اخلاقی فائدہ

ایمان باللہ کا دوسرا اخلاقی فائدہ یہ ہے کہ انسانی نگاہ میں اتنی وسعت پیدا ہوجاتی ہے جتنی خدا کی سلطنت وسیع وعریض ہے۔ انسان اس نعمتِ ایمان سے محروم ہو تو پھر اس کی نگاہ اسی تنگ دائرہ تک محدود رہتی ہے جہاں تک اس کی اپنی قدرت، علم اور اس کے مطلوبات محدود ہوتے ہیں۔ وہ اسی دائرہ میں اپنے حاجت روا تلاش کرتا ہے، طاقتوروں سے ڈرتا ہے، اور کمزوروں کو دباتا ہے۔ لیکن خدا پر ایمان لانے کے بعد اس کی نگاہ تمام کائنات تک پھیل جاتی ہے۔ "هر ملك ملكِ ماست، كه ملكِ خدائے ما است" اب ہر چیز سے اس کا ایک ہی رشتہ قائم ہوجاتا ہے۔ اب اس کی دوستی، دشمنی، محبت یا نفرت اپنے نفس کے لیے نہیں ہوتی بلکہ خدا کے لیے ہوتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ میں جس خدا کا بندہ ہوں اس کی خدائی میرے خاندان یا میرے ملک یا صرف امراء یا غرباء تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ رب العالمین اور خالق السماوات والارضین ہے۔ "وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا" (آلِ عمران: ۸۳)

لہٰذا اللہ پر ایمان رکھنے والا کبھی تنگ نظر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ وسیع النظر اور عالی دماغ ہوتا ہے۔

ایمان باللہ کا تیسرا فائدہ

ایمان باللہ سے عزت نفس اور خودداری کی لازوال دولت ہاتھ آتی ہے اور انسان ذلت و پستی کے گڑھے سے دائمی نجات حاصل کر لیتا ہے۔ جب تک خدا پر ایمان نہیں ہوتا، تو انسان ہر طاقتور، ہر بظاہر نافع یا ضار اور ہر شاندار چیز کے سامنے جھکتا ہے۔ اس سے خائف رہتا ہے۔ اس سے امیدیں رکھتا ہے۔ مگر جب وہ خدا پر ایمان لاتا ہے تو سمجھتا ہے کہ جن کے سامنے یہ ہاتھ پھیلا رہا تھا جن کو نافع یا مضر سمجھ رہا تھا، وہ تو خود خدا کے قادر و قیوم کے محتاج ہیں۔ وَلَا یَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا یَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَیٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا (سورۃ الفرقان:۳) اسی کی طرف سے نصرت عطا ہوتی ہے۔ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ (سورۃ آلِ عمران:۱۲۶) رزق بھی وہی دیتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِیْنُ (سورۃ الذاریات:۵۸) وہی مارتا اور جلاتا ہے۔ وَاللّٰهُ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ (سورۃ آلِ عمران:۱۵۶) ضرر و نفع کا وہی مالک ہے۔ وَاِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ یُّرِدْكَ بِخَیْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ (سورۃ یونس:۱۰۷) غرض کہ تمام قوتوں اور طاقتوں کا سرچشمہ وہی ہے۔ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعَذَابِ (سورۃ البقرۃ:۱۶۵) لہٰذا اس ایمان کے بعد انسان دنیا کی تمام قوتوں سے بے نیاز اور بے خوف ہو جاتا ہے اور خدا کے سوا اب اس کی گردن کسی اور کے سامنے نہیں جھکتی۔

ما سوی اللہ را مسلماں بندہ نیست
پیش فرعونے سرش افگندہ نیست

ایمان باللہ کا چوتھا فائدہ

اِس ایمان کی وجہ سے انسان غرور و تکبّر ایسی صفاتِ رذیلہ سے منزّہ و مبرّا ہو جاتا ہے اور خودداری اور عزت نفس کے ساتھ ساتھ اس کے اندر تواضع و انکساری بھی پیدا ہو جاتی ہے، جو کہ اخلاقِ جمیلہ میں سے ایک بہت بڑا خلق ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ خدا کے قادر کے سامنے بالکل بے بس ہے۔ "وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ" (سورۃ الانعام:۱۸) بلکہ وہ جانتا ہے کہ صرف وہی نہیں بلکہ تمام عالم خدا کا محتاج اور خدا سب سے بے نیاز ہے۔ وَاللّٰهُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ (سورۃ محمد:۳۸) وہ تمام نعمتوں کا سرچشمہ خدا ہی کو سمجھتا ہے۔ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (سورۃ النحل:۵۳) لہٰذا اس عقیدہ کے باعث وہ سراپا اِنکسار بن جاتا ہے۔ چنانچہ ارشادِ قدرت

ہے: وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (سورۃ الفرقان: ۶۳) خدائے رحمٰن کے خالص بندے وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں، اور جب جاہل لوگ ان سے جہالت آمیز باتیں کرتے ہیں تو وہ سلام کر کے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔

ایمان باللہ کا پانچواں فائدہ

ایمان باللہ سے انسان کے اندر امید و رجا کی ایک اطمینان بخش کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور مایوسی اور شکستہ دلی اس کے نزدیک نہیں بھٹکتی۔ اس کے پاس ایمان کا لازوال خزانہ موجود ہے۔ اگرچہ تمام ظاہری اسباب و وسائل اس کا ساتھ چھوڑ جائیں لیکن خدا پر بھروسا اور اعتماد کا دامن کبھی اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کا خدا بڑا رحیم و کریم ہے۔ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ (سورۃ الاعراف: ۱۵۶) وہ سمجھتا ہے کہ خدا کی رحمت سے ناامید ہونا کفر ہے۔ اِنَّهٗ لَا یَایْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (سورۃ یوسف: ۸۷) وہ یقین رکھتا ہے کہ خدا ظلم وستم نہیں کرتا۔ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (آلِ عمران: ۱۸۲) اس کا ایمان ہے کہ خدا اپنے بندوں کی داد و فریاد سنتا ہے۔ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (سورۃ البقرۃ: ۱۸۶) لہٰذا وہ سکون و طمینانِ قلب کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (سورۃ الرعد: ۲۸) اس رجاء و اطمینانِ قلب سے انسان کے اندر صبر و استقامت اور توکل علی اللہ ایسے صفاتِ جلیلہ پیدا ہوتے ہیں اور دنیا کے سخت سے سخت مشکلات و مصائب بھی اس کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہیں کر سکتے۔ وَمَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَی اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ (سورۃ طلاق: ۳) اسے یقین ہوتا ہے کہ اللہ نصرت کرے تو دنیا کی کوئی طاقت اس پر غالب نہیں آسکتی۔ اِنْ یَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ (سورۃ آلِ عمران: ۱۶۰) یہی وجہ ہے کہ مشکلات و مصائب کے ہجوم کے وقت حزن و ملال اس کے نزدیک بھی نہیں بھٹکتا۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا (سورۃ حم السجدہ: ۳۰) وہ یقین رکھتا ہے جو بلا و مصیبت آتی ہے وہ تقدیر الٰہی کے تحت آتی ہے اور وہی اسے دور کرتا ہے۔ قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَاۤ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَی اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (سورۃ التوبۃ: ۵۱)

ایمان باللہ کا چھٹا فائدہ

ایمان باللہ سے بزدلی اور کمزوری دور ہوتی ہے اور شجاعت و شہامت ایسی صفاتِ جلیلہ پیدا ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ بزدلی دو چیزوں سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک اپنی جان اور اپنے اہل وعیال اور

مال کے ساتھ محبت، دوسرے یہ خوف کہ یہ نقصان پہنچانے اور ہلاک کرنے کی طاقت انہی اشیاء میں ہے جو بطور آلہ استعمال ہوتی ہیں۔ ایمان باللہ ان دونوں خوفوں کی جڑ کاٹ کر کے رکھ دیتا ہے۔ مومن باللہ کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ مال و اولاد محض چند روزہ دنیا کی زینت ہیں۔ یہ خود فانی اور ان کی محبت بھی فانی ہے۔ اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِیْنَةُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ الْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَیْرٌ اَمَلًا (سورة الکھف:۴۶) اس لیے وہ اپنی محبت کا مرکز لازوال شئے کو قرار دیتا ہے۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ (سورة البقرۃ: ۱۶۵) نیز وہ یقین رکھتا ہے کہ دنیا کی یہ حیات بہرحال مُستعار ہے، جسے دوام اور پائیداری حاصل نہیں۔ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ (سورة الجمعة:۸) موت سے مفر نہیں۔ اَیْنَ مَا تَكُوْنُوْا یُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ (سورة النساء:۷۸) اس لیے وہ فطری طور پر خواہش کرتا ہے کہ کیوں نہ جان قربان کر کے وہ دائمی و ابدی زندگی حاصل کی جائے جسے فنا و زوال نہیں ہے۔ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَرِحِیْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (سورة آلِ عمران:۱۶۹ و ۱۷۰)

رہا دوسرا خوف تو مومن یقین کامل رکھتا ہے، ان چیزوں میں ہلاک کرنے یا نقصان پہنچانے کی حقیقی طاقت نہیں ہے۔ اگر خدا کا اذن نہ ہو تو یہ تمام طاقتیں کسی کا بال بیکا نہیں کر سکتیں۔ وَمَا هُمْ بِضَآرِّیْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (سورة البقرۃ: ۱۰۲) وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا (سورة آلِ عمران:۱۴۵) اس لیے وہ ان چیزوں سے نہیں ڈرتا۔ ہاں اگر ڈرتا ہے تو محض خدا سے۔ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (سورة آلِ عمران:۱۷۵) وہ جانتا ہے کہ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ (آلِ عمران:۱۷۳) فَنِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ (سورة الحج:۷۸) اس یقین و اذعان کا نتیجہ ہے وہ اپنی جان اور اپنا مال سب خدا کے سپرد کر دیتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ (سورة التوبة:۱۱۱) اس کی موت و حیات بس خدا کے لیے ہو جاتی ہے۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (سورة الانعام:۱۶۲)

ایمان باللہ کا ساتواں فائدہ

اس ایمان سے حرص و ہوس اور حسد ایسے صفات رذیلہ دور ہو جاتے ہیں، اور ان کی جگہ قناعت و استغناء ایسے صفاتِ جمیلہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ ع

کہ پائی میں نے استغناء میں معراجِ مُسلمانی

جب اسے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ رزق قدرتِ کاملہ کے ہاتھ میں ہے، جسے جس قدر چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ (سورۃ الرعد:۲۶) تو وہ اس کے حصول کے لیے ذلیل اور ناجائز ذرائع استعمال نہیں کرتا، بلکہ ہمیشہ باعزت طریقہ سے اپنا رزق تلاش کرتا ہے اور جو کچھ کم یا زیادہ مل جاتا ہے اس پر قناعت کرلیتا ہے۔ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ (سورۃ آلِ عمران:۷۳) عزت و ذلت خدا کے قبضہ قدرت میں ہے۔ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (سورۃ آلِ عمران: ۲۶) وہ جانتا ہے کہ عزت و ذلت اور رزق کی وسعت یا تنگی وغیرہ امور میں جو باہمی اختلاف و تفاوت پایا جاتا ہے وہ خدا نے کئی مصالح و حِکم کے پیشِ نظر اس نظام میں خود جاری فرمایا ہے۔ اسے انسان نہ بدل سکتا ہے اور نہ ہی اسے بدلنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ (النحل:۷۱) وَ لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ (سورۃ النساء:۳۲)

ایمان باللہ کا آٹھواں اخلاقی فائدہ

ایمان باللہ سے تمدّن کو یہ فائدہ پہنچتا ہے کہ اس عقیدہ سے افراد میں پاکیزگی و پرہیزگاری اور احساس ذمہ داری پیدا ہوتا ہے۔ اور قانون کی پابندی اور باہمی نظم و ضبط کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور تمام افراد ایک سلک میں منسلک نظر آتے ہیں۔ جب انسان یقین رکھتا ہے کہ وہ جہاں بھی جائے خدا کی وسیع و عریض مملکت سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا۔ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (سورۃ البقرۃ:۱۱۵) اور یہ بھی ایمان رکھتا ہے کہ خدا پر اس کی کوئی حرکت یا سکون مخفی و مستور نہیں ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَ لَا فِي السَّمَآءِ (سورۃ آلِ عمران:۵) وہ خدا کو علیم بذات الصدور سمجھتا ہے اور یہ اذعان بھی رکھتا ہے کہ ایک دن ضرور اس نے بارگاہِ ایزدی میں حاضر ہونا ہے۔ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ (سورۃ البقرۃ: ۲۲۳) وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (سورۃ البقرۃ:۲۰۳) اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ جہاں خدا بڑا غفور رحیم ہے، وہاں اس کی گرفت بھی بڑی سخت ہے۔ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ (سورۃ البروج:۱۲) تو اس سے اس کے اعمال و افعال کی پاکیزگی اور سیرت کی بلندی، پندار و کردار میں ہم آہنگی پر جو کچھ اثر مرتب ہو سکتا ہے وہ "عیاں راچہ بیاں" کا مصداق ہے۔

(مقتبس از رسالہ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول)

خداوندعالم کی کنہ حقیقت تک رسائی ممکن نہیں ہے

اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ صانع عالم کی اس قدر اجمالی معرفت بدیہی وفطری ہے کہ اس عالم کا ایک قادر و علیم صانع اور خالق حکیم موجود ہے۔ جس سے بعونہٖ تعالیٰ بطریق احسن واکمل ہم عہدہ برآ ہو چکے ہیں (والحمد للہ علی احسانہٖ) لیکن اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ اس ذاتِ ذوالجلال کی کنہ حقیقت تک رسائی حاصل کرے تو:

"ایں خیال است و محال است و جنوں"

محقق شیخ بہائی علیہ الرحمہ اپنے رسالہ اعتقادات الامامیہ میں تحریر فرماتے ہیں: وان کنه ذاته مما لا تصل الیه ایدی العقول والافکار۔ خداوندعالم کی کنہ ذات تک عقول وافکار کی رسائی نہیں ہوسکتی۔

اسی طرح علامہ مجلسیؒ نے بھی اپنے "رسالہ اعتقادیہ لیلیہ" میں افادہ فرمایا ہے: وانه لا یمکن الوصول الی کنه ذاته او صفاته۔ خدائے عزوجل کی ذات یا صفات کی اصل حقیقت تک رسائی ممکن نہیں ہے۔

یہ وہ مشکل مرحلہ ہے کہ یہاں انبیاء عظام واوصیاء کرام بھی بارگاہِ قدس میں اپنے عجز کا اقرار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ "سبحانك ما عرفناك حق معرفتك" حق بھی یہی ہے کہ حریم خالق کی ذات تک مخلوق کے عقول واوہام کی رسائی ناممکن ومحال ہے۔ اور خداوندعالم کی کنہ حقیقت کی معرفت ممتنع ہے۔ "این التراب و رب الارباب" یعنی "چه نسبت خاك را با عالم پاك"۔ اس سلسلہ میں خود ارشادِ قدرت ہے: وَلَا يُحِيطُونَ بِهٖ عِلْمًا (سورۃ طٰہٰ:۱۱۰) کہ لوگ خداوندعالم کی ذات کا احاطہ علمی نہیں کر سکتے۔ ادعیہ مبارکہ میں وارد ہے: "سُبْحَانَ مَنْ لَّا يَعْلَمُ مَا هُوَ اِلَّا هُوَ"۔ "پاک ہے وہ ذات جس کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ (دُعائے مشلول)

سیدالانبیاء والمرسلین ﷺ فرماتے ہیں: ان الله احتجب عن العقول کما احتجب عن الابصار و ان الملأ الاعلیٰ یطلبونه کما تطلبونه انتم۔ خداوندعالم کی حقیقت عقول وافہام کی دسترس سے اسی طرح بلند وبالا اور پوشیدہ ہے جس طرح آنکھوں سے مخفی ومحجب ہے اور عالم بالا کی مخلوق اسے اسی طرح تلاش کرتی ہے جس طرح تم اسے تلاش کرتے ہو۔ (از ہدایت الموحدین) ولنعم ما قیل ؎

توان در بلاغت به سحبان رسید
نه در کنه همچونِ سحبان رسید

سید الموحدین حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

الحمد لله الذی لا یبلغ مدحته القائلون و لا یحصی نعمائه العادون و لا یودی حقه المجتهدون الذی لا یدرکه بعد الهمم و لا یناله غوص الفطن الذی لیس لصفته حد محدود و لا نعت موجود و لا وقت معدود و لا اجل ممدود ...... الخ (نہج البلاغہ)

"سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس کی مدح وثنا تک بولنے والے نہیں پہنچ سکتے اور نہ شمار کرنے والے اس کی نعمتوں کو گن سکتے ہیں اور نہ کوشش کرنے والے اس کے حقوق ادا کر سکتے ہیں، اسے بلند ہمتیں درک نہیں کر سکتیں اور نہ ہی عقل وزیرکی کی گہرائیاں اس کی کنہ حقیقت تک رسائی حاصل کر سکتی ہیں۔ اس کی کوئی حد مقرر نہیں، نہ اس کی تعریف کے لیے سرحد موجود ہے اور نہ ہی اس کی ابتداء کے لیے کوئی وقت اور انتہا کے لیے کوئی مدت ہے" ...... الخ

اسی طرح حضرت امام زین العابدین علیہ السلام صحیفہ سجادیہ کی پہلی دعا کے تحمید میں فرماتے ہیں: الحمد لله الاول بلا اول کان قبله و الاخر بلا آخر یکون بعده الذی قصرت عن رویته ابصار الناظرین و عجزت عن نعته اوهام الواصفین ...... الخ ...... سب حمد وثنا اس خدائے جل وعلا کے لیے ہے جو ایسا اول ہے کہ اس سے پہلے کوئی اول نہیں اور ایسا آخر ہے کہ اس کے بعد اور کوئی آخر نہیں۔ وہ اتنا اجل وارفع ہے کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں اسے دیکھنے سے قاصر اور وصف کرنے والوں کے عقول واوہام اس کی تعریف وتوصیف سے عاجز ہیں۔

نیز آنجناب دعائے دوشنبہ میں فرماتے ہیں: کلت الالسن عن غایة صفته و العقول عن کنه معرفته۔ زبانیں اس کی انتہائی توصیف کرنے سے عاجز اور عقلیں اس کی حقیقی معرفت تک رسائی حاصل کرنے سے قاصر ہیں۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: ان کل ما تصوره احد فی عقله او وهمه او خیاله فالله سبحانه غیره و ورائه لانه مخلوق و المخلوق لا یکون من صفات الخالق (شرح اصول کافی) جو شخص اپنے عقل یا وہم یا خیال میں خدا کی ذات کا کوئی خیالی تصور قائم کرے، اسے سمجھ لینا چاہیے کہ خدا اس کے علاوہ کچھ اور ہے۔ کیونکہ جو کچھ اس کے ذہن میں آجائے وہ اس کے ذہن کی مخلوق ہے۔ مگر خدا خالق ہے مخلوق نہیں ہے۔

حضرت صادق آلِ محمد علیہ السلام فرماتے ہیں: کیف اصفه بالکیف و هو الذی کیف الکیف حتی صار کیفا فعرفت الکیف بما کیف لنا الکیف۔ خلاصہ یہ کہ بھلا میں خداوند عالم کو کیفیت و چگونگی

کے ساتھ کس طرح متصف کرسکتا ہوں، حالانکہ خدا نے ہی کیفیّت کو پیدا کیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ کیفیّت بن گئی۔ اور اسی کے بنانے سے ہم نے کیفیّت کو پہچانا، لہٰذا خالق اپنی مخلوق کے ساتھ کیونکر متّصف ہوسکتا ہے۔

اسی بنا پر حضرت امیرالمومنین علیہ السلام فرمایا کرتے تھے: "لا تقدر عظمة الله علی قدر عقلك فتكون من الهالكين"۔ خدائے قدوس کی عظمت و جلالت کا اندازہ اپنی ناقص عقل سے نہ لگاؤ، ورنہ ہلاک ہونے والوں میں سے ہوجاؤ گے۔

چونکہ حقیقتِ خداوندی تک رسائی حاصل کرنا لوگوں کے لیے ممکن نہ تھا، بلکہ اس کی ذات میں غور وخوض کرنے سے ضلالت وگمراہی کا شدید خطرہ تھا، اسی لیے پیشوایانِ دین نے اس سلسلہ میں مزید غور وخوض کرنے کی ممانعت فرمادی ہے۔ چنانچہ اس مضمون کی مُتعدد روایات اصول کافی وغیرہ کتب مُعتبرہ میں موجود ہیں۔ تکلموا فی خلق الله و لا تکلموا فی الله فان الکلام فی الله و لکن...... الخ (فرمان امام محمد باقر علیہ السلام)

نیز انہی بزرگوار سے مروی ہے، فرمایا: ایاکم و التفکر فی الله و لکن اذا اردتم ان تنظروا الی عظمة الله فانظروا الی عظیم خلقه۔ اللہ سبحانہ کی کنہ ذات میں غور وفکر مت کرنا، ہاں جب تم اس کی عظمت وجلالت دیکھنا چاہو تو اس کی مخلوق کی عظمت میں غور وتامل کرلینا۔

مخلوق خدا میں جس قدر چاہو گفتگو کرو۔ مگر خود خداوند عالم کی ذات کے متعلّق کلام نہ کرو۔ کیونکہ اس کی ذات میں گفتگو کرنے والے کو حیرانی وپریشانی میں اضافہ کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

اسی طرح حضرت صادق علیہ السلام سے منقول ہے، فرمایا: تکلموا فی کل شیء و لا تتکلموا فی ذات الله۔ ہر شے میں گفتگو کرو۔ مگر خداوند عالم کی ذات کے بارے میں کلام نہ کرو۔

نیز انہی حضرت سے یہ بھی مروی ہے کہ: من نظر فی الله کیف هو هلك۔ جو شخص اللہ سبحانہ کی کیفیّت میں غور وفکر کرے گا کہ وہ کس طرح ہے، وہ ہلاک ہوجائے گا۔

آیت مبارکہ: "وَاَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی" (سورۃ النجم: ۴۲) کی تفسیر میں حضرت صادق آلِ محمدؐ سے مروی ہے: اذا انتهی الکلام الی الله فامسکوا۔ جب سلسلۂ کلام خدائے رحمٰن تک پہنچ جائے تب فوراً خاموش ہوجاؤ۔

کم از کم کس قدر معرفتِ خدا ضروری ہے؟

خلاصہ یہ کہ خالق کائنات کے متعلق یہی اجمالی عقیدہ رکھنا کافی ہے کہ وہ واجب الوجود ہے اس کائنات کا خالق اور ہر کمال سے متصف اور ہر نقص سے منزہ و مبرا اور ذات وصفات میں بے مثل و بے مثال ہے۔"لیس کمثله شیٔ" خلاصہ یہ کہ سورۂ توحید کے مطالب پر ایمان رکھنا کافی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ قُلۡ ہُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ۚ﴿۱﴾ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۚ﴿۲﴾ لَمۡ یَلِدۡ ۬ۙ وَ لَمۡ یُوۡلَدۡ ۙ﴿۳﴾ وَ لَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ﴿۴﴾

اے میرے حبیبؐ! کہہ دو اللہ ایک ہے، وہ تمام عالم سے بے نیاز ہے۔ اس سے کوئی پیدا نہیں ہوا، اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے۔ اور نہ کوئی اس کا ہمسر ونظیر ہے۔

چنانچہ حضرت امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: من قرأ قل ھو اللہ احد و اٰمن بھا فقد عرف التوحید ...... جو شخص سورۃ قل ھو اللہ احد کو سمجھ کر پڑھے، اور اس پر ایمان لائے، اس نے توحید کی معرفت حاصل کر لی۔ (از عیون اخبار الرضا)

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے منقول ہے، فرمایا: ان اللہ عز و جل علم انہ یکون فی اٰخر الزمان اقوام متعمقون فانزل اللہ تبارک و تعالیٰ قل ھو اللہ احد و الاٰیات من سورۃ الحدید الی قولہ علیم بذات الصدور فمن رام وراء ذلک فقد ھلک۔ خداوند عالم کو علم تھا کہ آخری زمانہ میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو (مباحث توحید میں) بہت غور وتعمق سے کام لیں گے، اس لیے اس نے سورۂ توحید اور سورۃ حدید کی پہلی چند آیتیں علیم بذات الصدور تک نازل کر دیں۔ لہٰذا اب جو شخص اس سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرے گا وہ ہلاک ہو جائے گا۔ (بحار الانوار جلد ۲)

جناب ہشام روایت کرتے ہیں کہ ایک زندیق نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کیا: ان اللہ تعالیٰ ما ھو؟ کہ خداوند عالم کیا ہے؟ فقال ھو شیٔ بخلاف الاشیاء ارجع بقولی شیٔ الی انہ شیٔ بحقیقۃ الشیئیۃ غیر انہ لا جسم و لا صورۃ و لا یحس و لا یجسس و لا یدرک بالحواس الخمس لا تدرکہ الاوھام و لا تنقصہ الدھور و لا تغیرہ الازمان...... الخ۔

فرمایا: وہ ایک شے ہے مگر دوسری اشیاء سے مختلف ہے۔ اس کو شے کہنے سے میری مراد یہ ہے کہ وہ حقیقت شے کے اعتبار سے فی الحقیقت شے ہے اور موجود ہے (کیونکہ وہ واجب الوجود ہے اور باقی اشیاء کا وجود بوجہ امکان عارضی ہے) نہ وہ جسم ہے اور نہ صورت نہ وہ ظاہری حواس سے محسوس

ہوسکتا ہے اور نہ باطنی حواس سے محسوس ہوسکتا ہے اور نہ حواس خمسہ سے اسے درک کیا جاسکتا ہے۔ نہ وہم اس کا احاطہ کرسکتا ہے اور نہ زمانوں کا گزرنا اس میں کسی قسم کا نقص یا تغیّر پیدا کرسکتا ہے۔
(بحارالانوار جلد ۲ بحوالہ احتجاج)

فتح بن یزید جرجانی بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت امام رضا علیہ السلام سے سوال کیا: "عن ادنیٰ المعرفة"۔ "کم از کم معرفتِ خداوندی کس قدر ضروری ہے؟"۔ فقال: "الاقرار بانه لا اله غيره و لا شبه له ولا نظير له و انه قديم مثبت موجود غير فقيد و انه ليس كمثله شئ"۔ (توحید شیخ صدوقؒ) فرمایا: "یہ اقرار کرنا کہ خدا کے سوا اور کوئی معبود برحق نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی ہمسر و نظیر ہے۔ وہ ہمیشہ سے موجود ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا۔ کوئی شے اس کی مانند نہیں ہے"۔

خداوند عالم کی کنہ حقیقت تک انسانی عقل و فہم کی رسائی نہ ہوسکنے کی ابن ابی الحدید مُعتزلی نے بہت صحیح تصویر کشی کی ہے۔ ؎

فيك يا اعجوبة الكون غدا الفكر كليلا　　انت صيّرت ذوى اللب و بلبلت العقولا
كلما اقدم فكرى فيك شبرا فر ميا ن　　ناكصا يخبط فى عميا لا يهتدى سبيلا

"اے عجوبہ کائنات! تیرے متعلّق عقل و فکر درماندہ ہوگئے ہیں، تو نے صاحبانِ عقل کو مُتحیّر اور عقول و افہام کو پریشان کردیا، میں جب بھی اپنے جوادِ فکر کو مہمیز کرکے اسے تیرے بارے میں ایک بالشت آگے بڑھاتا ہوں تو وہ الٹے پاؤں اندھا دھند ایک میل پیچھے ہٹ جاتا ہے اور کوئی راستہ نہیں پاتا"۔

اس حدیث شریف کا مطلب بھی یہی ہے جو جناب امیر علیہ السلام سے مروی ہے۔ فرمایا: "من سئل عن التوحيد فهو جاهل" "جو شخص ذاتِ خداوندی کی حقیقت کے بارے میں سوال کرے وہ جاہل ہے۔" "و من اجاب عنه فهو مشرك" "اور جو ایسے سوال کا جواب دے وہ مشرک ہے۔" "و من عرفه فهو ملحد" "جو شخص حقیقتِ ایزدی کی معرفت کا دعویٰ کرے وہ مُلحد ہے۔" "و من لم يعرفه فهو كافر"۔ اور جو شخص (بقدرِ ضرورت) اپنے خالق کو نہ پہچانے وہ کافر ہے۔
(از تحفہ امامیہ در حقیقت مذہب شیعہ)

شیخ سعدی نے بھی اس مطلب کو اپنے مخصوص انداز میں یوں ادا کیا ہے: ؎

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وهم
وز هرچه گفته اند و شنیدم و خوانده ایم

دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر
ماهمچناں در اول وصفِ تو مانده ایم

عقلاً بھی یہ بات مُسلّم ہے کہ کسی چیز کی حقیقی معرفت اس وقت ہو سکتی ہے کہ جب اس کی جنس و فصل معلوم ہو، اور جس ذات والاصفات کی کوئی جنس و فصل ہی نہ ہو تو پھر بھلا اس کی حقیقی معرفت کیونکر حاصل ہو سکتی ہے؟ بہرحال ہم شکار معرفت کردگار کے صیادوں کو یہ مشورہ دے کر اس بحث کو یہاں ختم کرتے ہیں کہ اس سلسلہ میں اپنا وقت عزیز ضائع نہ کریں ۔ ؎

عنقا شکار کس نه شود دام باز چیں
کاینجا همیشه باد بدست است دام را

مُحقّق شیخ بہائی علیہ الرحمۃ اپنی کتاب "اربعین" میں بذیل شرح حدیث دوم فرماتے ہیں: "المراد بمعرفة الله تعالیٰ الاطلاع علی نعوته و صفاته الجلالية بقدر الطاقة البشرية و اما الاطلاع علی حقيقة الذات المقدسة مما لا مطمح للملائكة المقربين و الانبياء والمرسلين فضلا عن غيرهم و كفیٰ فی ذلك قول سيد البشر ما عرفناك حق معرفتك "۔ معرفتِ خداوندی حاصل کرنے سے مراد یہ ہے کہ طاقتِ بشری کے مطابق اس کے صفات و کمالات پر اطلاع حاصل کی جائے لیکن جہاں تک اس کی اصل ذات کی حقیقت معلوم کرنے کا تعلق ہے، غیر تو بجائے خود ملائکہ مقربین، انبیاء و مرسلین بھی اس کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

اس سلسلہ میں جناب سید البشر ﷺ کا ارشاد ہی کافی ہے کہ:
"بارِالٰہا! ہم نے تجھے اس طرح نہیں پہچانا جس طرح پہچاننے کا حق ہے"۔

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِیَ فَعَلَيْهَا ؕ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۱۰۴﴾

(سورۃ الانعام: ۱۰۴)

صفاتِ ثبوتیہ اور اُن کے عین ذات ہونے کا بیان

یہ ایک مُسلمہ حقیقت ہے کہ کسی شے کی معرفت حاصل کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس شے کے صفات کی معرفت حاصل کی جائے۔ اس طرح موصوف کی خودبخود فی الجملہ معرفت حاصل ہوجاتی ہے۔ یہاں اگر ہم اس طریقۂ کار سے معرفتِ پروردگار حاصل کرنا چاہیں تو اس میں مُشکل یہ ہے کہ عند التحقیق خداوندعالم کی صفاتِ حقیقیہ یعنی صفاتِ ذات (نہ کہ صفاتِ فعل) اس کی عین ذات ہیں، نہ کہ زائد برذات۔ جیسے کہ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

اول الدین معرفته و کمال معرفته التصدیق به و کمال التصدیق به توحیده و کمال توحیده الاخلاص له و کمال الاخلاص له نفی الصفات عنه لشهادة کل صفةٍ انها غیر الموصوف و شهادة کل موصوف انه غیر الصفة فمن وصف الله سبحانه فقد قرنه و من قرنه فقد ثنّاه و من ثنّاه فقد جزّاه و من جزّاه فقد جهله و من جهله فقد اشار الیه و من اشار الیه فقد حدّه و من حدّه فقد عدّه و من قال فیم فقد ضمنه و من قال علام فقد اخلیٰ منه۔

سلسلۂ دین کی پہلی کڑی خداتعالیٰ کی معرفت ہے اور کمالِ معرفت اس کی تصدیق اور کمال تصدیق اس کی توحید ہے اور کمال توحید اس کے لیے اخلاص ہے اور کمالِ اخلاص صفاتِ (زائدہ) کی نفی کرنا ہے۔ کیونکہ ہر صفت شہادت دیتی ہے کہ وہ موصوف کی غیر ہے۔ اور ہر موصوف شاہد ہے کہ وہ اپنی صفت کا غیر ہے۔ پس جس شخص نے صفاتِ (زائدہ) سے خدا کی توصیف کی، اس نے خدا کا ساتھی قرار دیا۔ اور جس نے ساتھی قرار دیا اس نے دوئی پیدا کی اور جس نے دوئی پیدا کی وہ اس کے لیے جز کا قائل ہوگیا، اور جو جزء کا قائل ہوا، وہ درحقیقت اس ذات کا جاہل اور اس سے بےخبر ہے، جو اس سے بےخبر ہے اس نے اسے قابل اشارہ سمجھ لیا، اور جس نے اسے قابل اشارہ قرار دیا اس نے اسے محدود کردیا، اور جس نے اس کی حد بندی کردی، اس نے اسے شمار کردیا اور جس نے اس کے متعلق یہ کہا کہ وہ کس چیز میں ہے اس نے اسے کسی چیز کے اندر تصور کیا اور جس نے یہ کہا وہ کس چیز پر ہے اس نے دیگر مقامات کو اس سے خالی فرض کرلیا۔ (نہج البلاغہ)

آں جنابؑ کے ان کلماتِ شریفہ میں توحید کے بہت سے معارف وحقائق بیان کر دیے گئے ہیں۔ مگر یہاں ان ارشاداتِ طریفہ کے نقل کرنے سے ہمارا مقصد صرف صفاتِ زائدہ برذات کی نفی پر استشہاد کرنا ہے، صفاتِ ذات اور صفاتِ فعل کی تعریف اور ان کا باہمی فرق ہم دوسرے باب میں بیان کریں گے، جہاں حضرت مُصنّف علام اس مسئلہ کا ذکر کریں گے۔ اس اتحاد کا مطلب یہ ہے کہ یہاں ذات وصفات میں اثنینیت ودوئت نہیں ہے کہ ذات اور ہو اور صفت اور بلکہ جو آثار ونتائج بالعموم صفات سے ظاہر ہوتے ہیں، وہ یہاں خود ذاتِ واجب الوجود سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ ذات بھی ہے اور صفت بھی۔ اسی ذاتِ واحد ویکتا کو مظہر آثارِ علم ہونے کی بنا پر عالم اور مظہر آثارِ قدرت ہونے کی وجہ سے قادر اور مظہر آثارِ حیات ہونے کے اعتبار سے حی اور مظہر آثارِ سماعت ہونے کے باعث سمیع کہا جاتا ہے۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس۔ بنابریں کوئی لمحہ بھی ایسا متصوّر نہیں ہوسکتا کہ خداوند عالم کی ذات ان صفاتِ کمالیہ سے خالی وعاری ہو۔ "بل هو علم كله قدرة كله سمع كله بصر كله حياة كله و هكذا"۔ بخلاف ممکنات کی صفات کے کہ وہ زائد برذات ہوتی ہیں۔ یعنی ان پر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ اس وقت ان میں نہ علم ہوتا ہے نہ قدرت نہ حیات نہ سماعت نہ بصارت (الی غير ذلك من الصفات) بعد میں جب علم آیا تو عالم کہلائے، اعضاء میں توانائی آگئی تو قادر بنے، نیستی سے نکل کر عرصہ ہستی میں قدم رکھا تو حی قرار پائے۔ وقس على هذا سائر الصفات ...... مگر ذاتِ احدیت میں ایسا نہیں ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

لم يزل ربنا عز و جل و العلم ذاته و لا معلوم و السمع ذاته و لا مسموع و القدرة ذاته و لا مقدور فلما احدث الاشياء و كان المعلوم وقع العلم منه على المعلوم و السمع على المسموع و البصر على المبصر و القدرة على المقدور (توحید شیخ صدوقؒ)

ہمارا پروردگار ہمیشہ سے عین علم تھا، حالانکہ ابھی معلوم موجود نہ تھا۔ وہ عین سمع وبصر تھا حالانکہ ابھی سننے اور دکھائی دینے کے قابل کوئی چیز موجود نہ تھی۔ وہ ہمیشہ سے عین قدرت تھا، حالانکہ ابھی کوئی مقدور (آثارِ قدرت کو قبول کرنے والا) نہ تھا۔ بعد میں جب اس نے اشیاء کو پیدا کیا اور معلوم موجود ہوا تو علم اس پر پوری طرح منطبق ہوا۔ اور سمع مسموعات پر اور بصر مبصرات پر اور قدرت مقدورات پر واقع ہوئی۔

برادرانِ اسلامی نے یہاں اس صحیح مسلک کے علاوہ ایک اور راستہ اختیار کیا ہے۔ وہ ذات و

صفات میں علیحدگی کے قائل ہیں۔

چنانچہ فاضل شہرستانی نے اپنی کتاب الملل والنحل طبع ایران صفحہ ۴۲ پر لکھا ہے:

قال ابوالحسن الباری تعالیٰ عالم بعلم قادر بقدرتہ حی بحیاتہ مرید بارادتہ متکلم بکلام سمیع بسمع بصیر ببصر

یعنی ابوالحسن اشعری کہتے ہیں کہ خداوند عالم علم و قدرت، حیات و ارادہ اور سمع و بصر کے ذریعہ عالم و قادر، حی و مرید اور سمیع و بصیر ہے۔

خلاصہ یہ کہ ذات علیحدہ ہے اور صفات علیحدہ ہیں۔

حضرات ائمہ معصومین علیہم السلام نے اس نظریہ فاسدہ کی بڑی شد و مد کے ساتھ رد فرمائی ہے۔ حسن بن خالد بیان کرتے ہیں:

سمعت علی بن موسیٰ الرضا علیہما السلام یقول لم یزل اللہ تبارک و تعالیٰ قادراً حیاً قدیماً سمیعاً بصیرا فقلت لہ یابن رسول اللہ ان قوما یقولون انہ عز و جل لم یزل عالمًا بعلم و قادرًا بقدرۃ و حیا بحیاۃ و قدیما بقدم و سمیعاً بسمع و بصیرا ببصر فقال علیہ السلام من قال بذلک و دان بہ فقد اتخذ مع اللہ الٰہۃ اخریٰ و لیس من ولایتنا علی شئ ثم قال علیہ السلام لم یزل اللہ عز و جل عالماً قادرا حیا قدیماً سمیعاً بصیرا بذاتہ تعالیٰ عما یقول المشرکون و المشبہون علوا کبیرا (بحار الانوار جلد ۲)

میں نے حضرت امام رضا علیہ السلام کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ہمارا پروردگار ہمیشہ سے عالم و قادر و حی و قیوم اور سمیع و بصیر رہا ہے۔ میں نے عرض کیا: فرزند رسولؐ! کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ خداوند عالم علم و قدرت، حیات و قدم اور سمع و بصر کے ذریعہ عالم و قادر، حی و قیوم اور سمیع و بصیر ہے۔ آنجناب نے فرمایا: جو شخص اس کا قائل ہے اور اسے اپنا دین قرار دیتا ہے اس نے گویا خدا کے ساتھ اور بہت سے معبود بنا لیے ہیں اور اسے ہماری ولایت کے ساتھ کوئی تعلّق و واسطہ نہیں۔ پھر فرمایا: خداوند عالم ہمیشہ سے بذاتہ عالم و قادر، حی قدیم اور سمیع و بصیر رہا ہے۔ مشرک اور تشبیہ دینے والے لوگ جو کچھ کہتے ہیں، خدا کی ذات اس سے کہیں بلند و بالا ہے۔

اس نظریہ کی اجمالی رد تو کلام معصومؑ میں آ گئی ہے، اس کی تھوڑی سی تفصیل یہ ہے کہ اگر صفاتِ باری کو زائد بر ذات تسلیم کیا جائے تو یہ دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو یہ صفات ہمیشہ سے اس

میں ہوں گی یا بعد میں اس میں پیدا ہوئی ہوں گی۔ پہلی صورت میں تعدد قدما لازم آئے گا۔ یعنی جتنی صفتیں مانی جائیں گی اتنے ہی اور قدیم ماننے پڑیں گے جو قدیم ہونے میں خدا کے شریک ہوں گے۔ حالانکہ قدیم ایک ہی ہے اور دوسری صورت میں دو خرابیاں لازم آئیں گی۔ اول یہ کہ اس کی ذات محل حوادث قرار پائے گی، اور یہ واضح ہے کہ جو ذات محل حوادث ہو، وہ واجب الوجود اور قدیم نہیں ہوسکتی۔ دوم یہ کہ اس سے لازم آئے گا کہ وہ ان صفات کے پیدا ہونے سے پہلے ان اوصافِ حمیدہ سے عاری ہو۔ یعنی نہ عالم ہو اور نہ قادر، نہ حی ہو اور نہ سمیع وبصیر، جو ذات ایسی ہو وہ ناقص ہوگی۔ اور اپنی تکمیل میں محتاجِ غیر۔ لہٰذا ایسی ذات معبود و مسجود اور واجب الوجود نہیں ہوسکتی۔ بنا بریں ماننا پڑے گا کہ صفاتِ کمالیہ حقیقیہ عین ذات ہیں، نہ کہ زائد بر ذات۔ وھو المقصود

اس تمام طویل سمع خراشی کا خلاصہ یہ نکلا کہ صفات کے ذریعہ سے بھی ذاتِ باری کی کنہ حقیقت معلوم نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ جب یہ صفات عین ذات ہیں تو یہ نتیجہ بآسانی نکالا جاسکتا ہے کہ جس طرح ذات کی کنہ تک ہمارے عقول و افہام کی رسائی ناممکن ہے اسی طرح ان صفات کی تہ تک بھی رسائی محال ہے۔ ؎

زہے ذاتے صفاتش عین ذات است
عقول از درک آں ھیہات ھیہات

ہاں مختلف مظاہر صفات جلال و جمال کو دیکھ کر ان کے موصوف باکمال کا اجمالی تصور ضرور ہوجاتا ہے اور یہی مقدار معرفت ہمارے لیے کافی بھی ہے۔

عباراتنا شیٔ و حسنک واحد
فکل الی ذاک الجمال یشیر

خداوند عالم کی صفاتِ کمالیہ غیر محدود ہیں

مذکورہ بالا حقائق سے ایک اور امر بھی واضح و آشکار ہوجاتا ہے، وہ یہ کہ خداوند عالم کی صفات کمالیہ غیر محدود اور بے شمار ہیں۔ کیونکہ جب یہ مُحقّق و مبرہن ہوگیا کہ اس کی صفاتِ حقیقیہ عین ذات ہیں، اور یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ خالق عالم کی ذات غیر محدود ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی صفات بھی یقیناً غیر محدود اور غیر مُنحصر ہوں گی۔ علاوہ بریں اور دو طریقہ سے بھی اس مطلب کو ثابت کیا جاسکتا ہے:

اولاً: اس طرح کہ ان صفات کا ثبوت موجبِ کمال اور ان کی نفی باعثِ نقص ہے۔ اور چونکہ

خداوند عالم ہر کمال سے متصف اور ہر نقص سے منزہ و مبرا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ کمالِ باری غیر محدود ہے۔ لہٰذا صفاتِ کمال غیر محدود ہوں گی۔

ثانیاً: اس طرح کہ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو صفاتِ ثبوتیہ کی بازگشت صفاتِ سلبیہ ہی کی طرف ہوتی ہے۔ جیسا کہ علماء محققین کی تحقیق ہے اور حضرت مُصنّف علام کا بھی یہی نظریہ ہے۔ جیسا کہ دوسرے باب میں بیان ہوگا۔

عرفوا اضافاتا و سلبا و الحقیقة لیس توجد

ابھی اوپر ثابت کیا جا چکا ہے کہ ذاتِ احدیت کی طرح صفاتِ ذاتیہ کی کنہ حقیقت تک بھی ہماری رسائی ممکن نہیں ہے۔ ہمارے عقول و افہام علم و قدرتِ باری اور اس کی حیات اور سمع و بصر وغیرہ صفاتِ جلیلہ کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ لہٰذا ان صفات کے اثبات سے در حقیقت مقصود ان صفات کے اضداد کی نفی کرنا ہوتا ہے۔ مثلا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا عالم ہے تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ جاہل نہیں ہے۔ اور جب یہ کہتے ہیں کہ وہ قادر ہے تو مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ عاجز نہیں ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ ع "و بضدھا تتبین الاشیاء" اور چونکہ اعدام و اسلوب غیر محدود اور غیر متناہی ہیں۔ اس لیے صفاتِ ثبوتیہ و سلبیہ بھی غیر محدود ہوں گی۔ و ھو الحق الحقیق بالاتباع۔ بایں ہمہ جو کچھ کتب کلامیہ میں مشہور ہے وہ یہ ہے کہ صفاتِ ثبوتیہ آٹھ ہیں۔ اور اسی طرح صفاتِ سلبیہ بھی آٹھ ہیں۔ غالبًا سب سے پہلے جناب مُحقّق طوسی علیہ الرحمۃ نے تجرید میں یہ نظریہ قائم کیا اور پھر حضرت علامہ حلی علیہ الرحمۃ نے اپنی کتب کلامیہ میں اس کی تائید و تشئید فرمائی۔ اور اس طرح رفتہ رفتہ اسے شہرتِ عامہ حاصل ہوگئی۔

باوجود صفاتِ کمالیہ کے غیر محدود ہونے کے صرف آٹھ صفات میں انحصار کی وجہ

باوجود صفاتِ کمالیہ کے غیر محدود ہونے کے اس انحصار کی بظاہر دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں:

اول یہ کہ ان حضرات کا مقصد صرف صفاتِ ذاتیہ حقیقیہ کا بیان کرنا مقصود ہے۔ دیگر صفات مثل خالق و رازق وغیرہ جو صفاتِ اضافیہ محضہ اور صفاتِ فعلیہ ہیں، ان کا بیان کرنا مقصود نہ تھا۔

دوم یہ کہ عند التامل دیگر تمام صفات کی بازگشت انہی آٹھ صفات کی طرف ہوتی ہے یہی صفات اصل الاصول اور مرکزی صفات ہیں۔ بلکہ اگر مزید غور و تامل کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام صفات کی بازگشت فقط دو صفات (علم و قدرت) کی طرف ہوتی ہے۔ کما لا یخفیٰ علیٰ اولی الابصار...... بلکہ اگر اس سے بھی زیادہ دقتِ نظر سے کام لیا جائے تو تمام صفات کی بازگشت

واجب الوجود کی طرف ہے۔ جیسا کہ حضرت شہید ثانی علیہ الرحمۃ کی تحقیق انیق ہے۔

فیکفی فی معـرفته تعالیٰ اعتقاد وجوب وجوده و علمـه و قـدرته بل اعتقاد وجوب وجوده فتامل

خدائے تعالیٰ کی معرفت کی بابت اتنا اعتقاد رکھنا کافی ہے کہ وہ واجب الوجود اور عالم وقادر ہے، بلکہ صرف اس قدر عقیدہ رکھنا ہی کافی ہے کہ وہ واجب الوجود ہے۔

علمائے محققین نے اس مقام پر پوری پوری داد تحقیق دی ہے۔ اور بڑے شد و مد کے ساتھ صفاتِ باری کا غیر محدود ہونا ثابت کیا ہے۔ بالخصوص فقیہ نبیہ حکیم الاسلام جناب شیخ محمد حسین آلِ کاشف الغطاء مرحوم نے "الدین والاسلام" میں اس موضوع پر بہت عمدہ اور سیر حاصل بحث فرمائی ہے۔ بہرکیف "تأسـیًا بالعلمـاء وجریا علیٰ منوالھم"۔ ہم بھی ذیل میں چند صفاتِ ثبوتیہ اور سلبیہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ساتھ ان کے ثبوت پر چند اجمالی دلائل و براہین بھی پیش کریں گے۔

چند صفاتِ ثبوتیہ کا بیان

① پہلی صفت: "خدا قادر ہے عاجز نہیں"

اس صفتِ جلیلہ کے اثبات پر چند ادلہ عقلیہ و نقلیہ قائم ہیں۔

① **دلیل اول:** خود ذاتِ احدیت کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۰﴾ (البقرۃ:۲۰) (خدا ہر چیز پر قادر ہے)

② **دلیل دوم:** عاجز ہونا نقص اور قادر ہونا کمال ہے۔ اور چونکہ خداوند عالم ہر نقص سے مبرا اور ہر کمال سے متصف ہے، لہٰذا ماننا پڑے گا کہ وہ قادرِ مطلق ہے۔

③ **دلیل سوم:** بغیر قدرتِ کاملہ کے صانع و خالق عالم ہونا محال ہے۔ لیکن چونکہ اس کا صانع عالم ہونا مسلّم ہے، لہٰذا اسے قادر علی الاطلاق بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔

④ **دلیل چہارم:** عجیب و غریب آثارِ قدرت کا وجود خالق کی قدرتِ کاملہ کی بین اور واضح دلیل ہے۔

⑤ **دلیل پنجم:** اس کا دوسروں کو قدرت عطا کرنا خود اس کے قادر ہونے کی قطعی دلیل ہے۔ کیونکہ فاقد شی، معطی شی نہیں ہو سکتا۔

⑥ **دلیل ششم:** انبیاء واوصیاء اور آسمانی کتب کا اس کے قادرِ مُطلق ہونے پر اتفاق ہے۔ اور ان کا یہ اتفاق بوجہ ان کی عصمت کے حجت ہے۔

مخفی نہ رہے کہ انہی بیاناتِ شافیہ سے خداوند عالم کی قدرت کا عام ہونا بھی ثابت ہوجاتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں جو بعض نظریاتِ فاسدہ ہیں، ان کا بطلان بھی ظاہر ہوجاتا ہے۔ مثلاً:

① حکماء کہتے ہیں: "الواحد لا یصدر عنه الا الواحد" ایک ہستی سے ایک ہی چیز صادر ہوسکتی ہے۔

② ثنویہ یہ کہتے ہیں کہ: خدا شر پر قادر نہیں۔

③ اور نظام یہ کہتا ہے کہ: خدا امر قبیح پر قدرت نہیں رکھتا۔

④ اسی طرح بلخی اور جبائی اور راگ الاپتے ہیں۔ پہلا نظریہ فاعل موجب و مُضطر کے بارے میں ہے۔ جیسے آگ سے صرف حرارت اور برف سے برودت صادر ہوتی ہے لیکن خداوند عالم چونکہ فاعل مُختار ہے، لہٰذا اس پر یہ قاعدہ منطبق نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح دوسرے نظریاتِ فاسدہ کا فساد و بطلان بھی واضح وعیاں ہے۔ کیونکہ مُسلمہ قاعدہ ہے کہ جب مقتضی موجود ہو اور مانع مفقود، تو مقتضی اپنا اثر کرتا ہے۔ یہاں مؤثر و مقتضی خدائے قادر و مُختار کی ذات والاصفات ہے۔ اس میں کوئی نقص و عجز ہے نہیں، اور تمام مقدورات میں بوجہ امکانِ ذاتی اثر قبول کرنے کی استعداد موجود ہے۔ پھر خالق کے ہر شے پر قادر ہونے سے کیا چیز مانع ہے؟ ہاں یہ اور بات ہے کہ قدرت رکھتے ہوئے بھی خدا بعض امور مثلاً شرور و قبائح کو بجا نہیں لاتا لیکن کس کام پر قدرت رکھنا اور ہے اور اس کا کرنا یا نہ کرنا اور؟

② دُوسری صفت: "خداوند عالم عالم ہے جاہل نہیں"

اس کا علم ہر شے کو محیط ہے۔ وہ ہر کلی اور جزئی امر کا عالم ہے۔ خلقتِ اشیاء سے پہلے اسے اسی طرح ان کا علم ہوتا ہے جس طرح خلقت کے بعد ہوتا ہے۔ اس امر کے چند اجمالی دلائل یہ ہیں:

① **دلیل اول:** آیاتِ قرآنیہ ہیں، جیسے: "وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ" (بقرہ:۲۹) (خدا ہر شے کا علم رکھتا ہے) "لَا تَخْفَىٰ مِنكُمْ خَافِيَةٌ" (الحاقۃ:۱۸) (خدا پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے) "وَمَا يَعْزُبُ عَن رَّبِّكَ مِن مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ" (سورۃ یونس:۶۱) (تمھارے پروردگار سے کائنات کا کوئی ذرہ بھی پوشیدہ نہیں ہے)

② **دلیل دوم:** علم صفت کمال اور جہل صفتِ نقص ہے۔ اور چونکہ خالق عالم ہر صفتِ کمال سے متصف اور ہر نقص وعیب سے خالی ہے، لہٰذا اسے عالم تسلیم کرنا ضروری ہے۔

③ **دلیل سوم**: اس کی مخلوق میں گوناگوں قسم کی حکمتیں اور مصلحتیں پائی جاتی ہیں، جن میں سے بعض کا ذکر سابقًا ہو چکا ہے۔ یہ اس کے کمال کی بین دلیل ہیں۔ غیر عالم ایسی محکم متقن اشیا ہرگز پیدا نہیں کر سکتا۔

④ **دلیل چہارم**: دوسروں کو علم و فضل عطا کرنا خود اس کے علیم و خبیر ہونے کی قطعی دلیل ہے۔

⑤ **دلیل پنجم**: چونکہ خداوند عالم ہر چیز کا خالق ہے۔ "قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ" (رعد:۱۶) تو یہ کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ خالق کو اپنی مخلوق کا علم نہ ہو۔

☆ انہی دلائل سے بعض فلاسفہ کے اس قول کا بطلان ظاہر ہو جاتا ہے کہ خدا کو جزئیات کا علم نہیں ہے۔ (معاذ اللہ)

③ تیسری صفت: "خداوند عالم مُختار ہے، مجبور و مُضطر نہیں ہے"

وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، جو نہیں چاہتا نہیں کرتا۔ وہ اپنے افعال و اعمال میں اس طرح مجبور نہیں ہے جیسے آگ جلانے میں، آفتاب چمکنے میں، اور پانی بہنے میں۔ ذیل میں اس مطلب پر چند اجمالی عقلی و نقلی دلیلیں پیش کی جاتی ہیں۔

① **دلیل اول**: ارشادِ قدرت ہے: "رَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ" (قصص:۶۸) "يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ" (آلِ عمران:۴۰) تمہارا پروردگار جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے منصب نبوت و امامت کے لیے اختیار فرماتا ہے اور خدا جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔

② **دلیل دوم**: مجبور و مُضطر ہونا نقص ہے۔ لہٰذا ذاتِ ایزدی میں کسی نقص کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے برخلاف فاعل مُختار ہونا کمال ہے۔ لہٰذا خداوند عالم کو یقینًا مُختار ہونا چاہیے، جو کہ ہر کمال کا مرکز ہے۔

③ **دلیل سوم**: اگر خدا تعالیٰ کو فاعل مُختار نہ مانا جائے بلکہ اسے فاعل موجب و مُضطر تسلیم کیا جائے تو تین خرابیوں میں سے ایک خرابی ضرور لازم آئے گی۔ یا تو عالم کا قدیم ہونا لازم آئے گا، کیونکہ فاعل مُضطر کا اثر اس سے کبھی جدا نہیں ہو سکتا۔ جیسے آتش سے حرارت علیحدہ نہیں ہو سکتی، یا خدا کا حادث ہونا۔ کیونکہ وہ عالم میں موثر ہے۔ اور جب اثر حادث ہے تو اس کا موثر بھی حادث ہوگا۔ یا علّت تامہ سے معلول کی علیحدگی و جدائی لازم آئے گی اور جب یہ تینوں شقیں بالبداہت باطل ہیں، لہٰذا خالق عالم کو فاعل مُختار ماننا پڑے گا۔

④ **دلیل چہارم:** جو ادلہ و براہین خدا کے قادر ہونے کے سلسلہ میں قائم کیے گئے ہیں وہی دلائل اس کے مختار ہونے پر بھی دلالت کرتے ہیں ۔ کیونکہ فاعل مجبور کو قادر نہیں کہا جاسکتا۔ کما لا یخفی۔

① چوتھی صفت: "خداوند عالم زندہ ہے"

وہ ازل سے زندہ ہے اور ابد تک زندہ رہے گا۔ اسے کبھی فنا و زوال نہیں ہے ۔ اس امر کے اثبات کے لیے چند ادلہ کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے ۔

① **دلیل اول:** خود اس کا ارشاد ہے: هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ (بقرة:۲۵۵) وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (سورة الرحمن:۲۷) كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (سورة قصص:۸۸)

② **دلیل دوم:** جب اس کا عالم و قادر ہونا ثابت ہو چکا تو اس سے بالبداہت اس کی حیات بھی ثابت ہو جاتی ہے ۔ کیونکہ علم و قدرت حیات کی فرع ہے ۔ بغیر حیات کے ان کا وجود ناممکن ہے ۔

③ **دلیل سوم:** عالم میں ہر وقت ہونے والے نئے نئے تغیرات و تبدلات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک حی و قیوم کے قبضہ قدرت میں نظامِ کائنات کی زمام ہے ۔"تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ" (سورۃ الملک :۱) "كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ" (سورۃ الرحمٰن :۲۹)

④ **دلیل چہارم:** موت، جسم و روح کے باہمی ربط و تعلق کے خاتمہ کا نام ہے ۔ یا بالکل مادی نقطہ نگاہ سے اجزاء جسم کے پریشان ہونے کو موت سمجھا جاتا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے: ؎

زندگی کیا ہے ؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے ؟ انہی اجزا کا پریشاں ہونا

بہرکیف چونکہ ذاتِ احدیت جسم و جسمانیات سے منزہ و مبرا ہے، جیسا کہ صفاتِ سلبیّہ میں اس امر کو مبرہن کیا جائے گا۔ تو پھر اُسے موت کیسے آسکتی ہے؟

⑤ پانچویں صفت: "خداوند عالم مدرک ہے"

ادراک سے ان چیزوں کا علم مراد ہے جو بذریعہ حواس معلوم ہوتی ہیں ۔ بالفاظ دیگر اس سے جزئیات کا علم مراد ہے ۔ بہرحال علم عام ہے اور ادراک خاص ۔ اسی بنا پر خدا کے مدرک ہونے کو علیحدہ صفت شمار کیا گیا ہے ۔ اس مطلب کے اثبات پر یہاں ایک عقلی اور دوسری سمعی دلیل کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے ۔

① **دلیل اول:** "لَا تُدۡرِکُہُ الۡاَبۡصَارُ ۫ وَ ہُوَ یُدۡرِکُ الۡاَبۡصَارَ ۚ وَ ہُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ " (الانعام:۱۰۳) خدا کو آنکھیں نہیں درک کرسکتیں۔ ہاں وہ آنکھوں کو درک کرسکتا ہے۔ کیونکہ وہ لطیف وخبیر ہے۔

② **دلیل دوم:** جب اسے ہر چیز کا علم ہے جیسا کہ اوپر ثابت کیا جاچکا ہے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسے بغیر حواس ان چیزوں کا بھی ضرور علم ہوگا جو بذریعہ حواس معلوم ہوتی ہیں۔ نیز جب وہ ہر چیز کا کامل علم رکھتا ہے تو اس میں جس طرح کلیات شامل ہیں اسی طرح ہر شے میں جزئیات بھی داخل ہیں۔ لہٰذا اسے عالم جزئیات تسلیم کرنا پڑے گا۔

⑥ چھٹی صفت: "خداوندعالم صادق ہے کاذب نہیں ہے"

اس کا ہر قول وفعل صدق وراستی پر مبنی ہے۔ اس میں کذب وافتراء کا شائبہ تک نہیں ہے۔ اس پر مندرجہ ذیل دلائل دلالت کرتے ہیں۔

① **دلیل اول:** خود اس کا ارشاد ہے: "اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ " (آل عمران:۹) خداوند عالم وعدہ خلافی نہیں کرتا "قل صدق اللّٰہ" اے میرے حبیب! کہہ دو کہ خدا سچ کہتا ہے۔

② **دلیل دوم:** جھوٹ بولنا فعل قبیح ہے۔ اور خدا کا دامن ربوبیت تمام قبائح وشنائع کی آلودگیوں سے منزہ ومبرا ہے۔

③ **دلیل سوم:** اس نے اپنے کلام حمید میں جھوٹوں پر لعنت کی ہے۔ "لَّعۡنَتَ اللّٰہِ عَلَی الۡکٰذِبِیۡنَ " (سورۃ آلِ عمران:۶۱) تو اب اگر آپ بھی جھوٹ کا ارتکاب کرے تو خود بھی اس لعنت کی زد میں آجائے گا۔ (معاذ اللّٰہ)

④ **دلیل چہارم:** صدق وراستی کمال ہے اور خداوند عالم ہر لحاظ سے کامل اور ہر کمال سے متصف ہے۔ لہٰذا اسے صادق ماننا لازمی ہے۔

⑤ **دلیل پنجم:** جھوٹ کا ارتکاب جہالت یا عجز کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ یعنی یا تو جھوٹ بولنے والے کو اس بات کے جھوٹ ہونے کا علم نہیں ہوتا۔ یا کسی ذاتی غرض کے لیے جھوٹ بولنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اور خداوند عالم نہ جاہل ہے اور نہ عاجز۔ لہٰذا اس کے متعلق ارتکابِ کذب کا احتمال ہی نہیں ہوسکتا ہے۔ اس لیے لامحالہ اسے صادق تسلیم کرنا پڑے گا۔ وھو المطلوب۔

⑦ ساتویں صفت: "خداوندعالم قدیم ہے حادث نہیں ہے"

وہ ازلی وابدی اور سرمدی ہے۔ ہر شے سے اول اور ہر شے کے اخیر ہے۔ ہمیشہ سے ہے اور

ہمیشہ رہے گا۔ نہ اس کی کوئی ابتدا ہے اور نہ کوئی اِنتہا۔ حضرت باقر العلوم علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ وہ کب سے ہے؟ فرمایا: "متی لم یکن حتی اخبرك متی كان" وہ کب نہ تھا، تاکہ میں تجھے بتاؤں کہ وہ فلاں وقت سے ہے۔ اس پر چند اجمالی دلائل ملاحظہ ہوں:

① **دلیل اول:** ارشادِ قدرت ہے: "هُوَالْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ" (حدید: ۳) وہ اول و آخر اور ظاہر و باطن ہے۔ نیز فرمایا ہے: "وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ" (واقعہ: ۶۰) یعنی ہم سے پہلے کوئی شے نہ تھی۔

② **دلیل دوم:** اگر اس کی بھی کوئی ابتداء ہو اور اس پر کسی وقت عدم طاری ہو سکتا ہو تو یہ خدا بھی کسی موثر و خالق کا محتاج ہوگا۔ جو اسے عدم سے نکال کر عرصہ وجود میں لائے۔ لہٰذا وہ واجب الوجود نہیں رہے گا۔ حالانکہ وہ واجب الوجود ہے۔

③ **دلیل سوم:** اگر ازلی نہ ہو تو محتاج صانع ہوگا۔ جیسا کہ ابھی اوپر بیان ہوا ہے۔ اور جو محتاجِ غیر ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ احتیاج ممکن ہونے کی علامت ہے۔

④ **دلیل چہارم:** یہ امر مُسَلَّم ہے کہ جو ازلی ہو وہ ابدی ضرور ہوتا ہے۔ یعنی جس کی ابتداء نہ ہو اس کی انتہاء بھی نہیں ہوتی۔ کیونکہ کسی چیز کو فنا و زوال اس لیے لاحق ہوتا ہے کہ اس کی علّت فاعلی ختم ہو جاتی ہے یا علّت فاعلی اپنا فیض قطع کر لیتی ہے۔ اور جس ذات کی کوئی علّت ہی نہ ہو اس کے لیے فانی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

⑤ **دلیل پنجم:** واجب الوجود کہتے ہی اس کو ہیں جس کا وجود ذاتی اور اصلی ہو۔ اور جس کا وجود ذاتی اور اصلی ہو اس کے لیے عدم یقیناً محال ہوتا ہے۔ اور جس کے لیے عدم محال ہو وہ یقیناً ازلی اور ابدی ہوگا۔ وھو المطلوب۔

⑧ آٹھویں صفت: "خداوند عالم مرید ہے مکرہ و مجبور نہیں"

خداوند عالم جو کچھ کرتا ہے وہ اپنے ارادہ و اختیار سے کرتا ہے، وہ اپنے افعال و اقوال میں مجبور نہیں ہے۔ وہ "فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ" (سورۃ ہود: ۱۰۷) کا مصداق ہے۔

نیز وہ اپنے بندوں سے اعمالِ صالحہ بجا لانے کو پسند اور برے اعمال کو ناپسند کرتا ہے۔ جو دلائل خداوند عالم کے فاعل مُختار ہونے کے سلسلہ میں پیش کیے گئے ہیں وہی دلائل اس کے مرید و کارِہ ہونے پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ فلا نطیل الکلام بالتکرار۔

تنبیہ: مخفی نہ رہے کہ ہم نے بنا بر مشہور ارادہ کو صفات ذاتیہ میں شمار کیا ہے، ورنہ ہماری ذاتی تحقیق دیگر بعض علماء محققین کی طرح یہ ہے کہ ارادہ صفاتِ فعلیہ میں سے ہے۔ جیسا کہ ہم اس امر پر باب ششم میں تبصرہ کریں گے۔ ان شاء اللہ

⑨ نویں صفت: "خداوند عالم متکلّم ہے"

خداوند عالم کے متکلّم ہونے پر چند دلائل قاطعہ کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

① **دلیل اول:** خود اس کا ارشاد ہے: "وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا" (سورۃ النساء: ۱۶۴) خدا نے جناب موسیٰؑ سے کلام کیا۔

② **دلیل دوم:** جب تک من جانب اللہ خطاب، کلام نہ ہو، اس وقت تک غرض خلقت کا اظہار و ابراز ممکن نہیں ہے۔

③ **دلیل سوم:** قرآن مجید اور دیگر کتب سماویہ اور احادیث قدسیہ سب کلام اللہ ہونے پر شاہد عادل موجود ہیں۔

④ **دلیل چہارم:** چونکہ اظہارِ مقصد کے لیے کلام کرنا ایک کمال ہے۔ اور خداوند عالم چونکہ ہر کمال سے مزین و متّصف ہے، لہٰذا اسے متکلّم ماننا ضروری ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ خدا تعالیٰ کے متکلّم ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ بھی ہماری طرح کلام کرتا ہے۔ کیونکہ کلام حروف و اصوات سے مرکب ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ عرض ہے۔ اور قائم بالغیر۔ بنابریں حادث ہے۔ اور جس کے ساتھ حادث قائم ہوگا وہ محل حوادث ہوتا ہے۔ جیسا کہ ابھی صفاتِ سلبیّہ کے ذیل میں اس کی وضاحت کی جائے گی۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ خدا کے متکلّم ہونے کا یہ مطلب ہے کہ وہ جس چیز میں چاہے کلام پیدا کر دیتا ہے۔ جس طرح کوہِ طور پر درخت میں کلام پیدا کر کے حضرت موسیٰؑ کو شرفِ ہم کلامی بخشا تھا۔ نیز واضح رہے کہ کلام حادث ہے اور صفاتِ فعل میں سے ہے۔

⑩ دسویں صفت: "خداوند عالم سمیع و بصیر ہے"

وہ بغیر کان اور آنکھ کے ہر آواز کو سنتا اور ہر قابل دید شے کو دیکھتا ہے۔ اس پر بالاختصار دو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں۔

① **دلیل اول:** جیسا کہ خود اس کا ارشاد ہے: "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَّ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ" (سورۃ طور: ۱۱) کوئی چیز خدا کے مانند نہیں ہے اور وہ سمیع و بصیر ہے۔ "اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا

بَصِيرًا"۔ (سورۃ النساء:۵۸)

④ دلیل دوم: اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ مخلوق میں سمع و بصر (سننے اور دیکھنے) کی صفت پائی جاتی ہے، تو اگر خالق میں یہ صفت موجود نہ ہو تو لازم آئے گا کہ خالق ناقص اور مخلوق کامل ہے۔ علاوہ بریں قرآن شاہد ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے چچا آذر کو بتوں کی پوجا پاٹ سے یہ کہہ کر روکا تھا کہ: "يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِىْ عَنْكَ شَيْئًا" (سورۃ مریم:۴۲) تم ایسی چیز کی پرستش کیوں کرتے ہو، جو نہ سُن سکتی ہے اور نہ بول سکتی ہے۔ اور نہ ہی تمھیں کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معبود ایسا ہونا چاہیے جو سُن بھی سکتا ہو اور دیکھ بھی سکتا ہو۔ اور نفع و نقصان بھی پہنچا سکتا ہو۔ اگر معبود برحق سمیع و بصیر نہ ہوتا تو آذر پلٹ کر کہہ سکتا تھا کہ اے ابراہیمؑ تمھارا معبود بھی تو سمیع و بصیر نہیں ہے۔ اس طرح جناب ابراہیمؑ کی دلیل ختم ہو جاتی۔ مگر آذر کا یہ ایراد نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ یہ جانتے تھے کہ ابراہیمؑ جس معبود کی پرستش کی دعوت دے رہے ہیں اس میں یہ نقص نہیں ہے۔

ہاں یہ یاد رہے کہ اس کے سمیع و بصیر ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ کان سے سنتا اور آنکھ سے دیکھتا ہے۔ ورنہ وہ صاحب اجزاء ہونے کی وجہ سے مرکب ہو جائے گا۔ اور جو مرکب ہو وہ حادث و ممکن ہوتا ہے۔ لہٰذا واجب الوجود نہیں رہے گا۔ لہٰذا تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ بغیر سمع و بصر کے سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے۔ جیسا کہ اوپر ثابت کیا جا چکا ہے۔

⑪ گیارھویں صفت: "خداوند عالم حکیم ہے"

اس کے تمام افعال مبنی بر حکمت ہوتے ہیں۔ اس کا کوئی فعل یا قول عبث و بے فائدہ نہیں ہوتا۔ اس مطلب پر یہ چند اجمالی دلائل دلالت کرتے ہیں۔

① دلیل اول: خود اس کا ارشاد ہے: "كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا" (سورۃ النساء:۱۶۵)......"وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ" (سورۃ البقرۃ:۹۵)......"اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ"۔ (سورۃ مومنون:۱۱۵) "کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تمھیں عبث و بے فائدہ پیدا کیا ہے اور کیا تم ہماری بارگاہ میں پلٹ کر نہیں آؤ گے؟"

② دلیل دوم: عبث و بے فائدہ کام کرنا نقص و عیب ہے۔ اور خالق کا دامن قدس ہر نقص و عیب

سے پاک وصاف ہے۔

③ **دلیل سوم:** حکیم وعلیم ہونا کمال ہے اور واجب الوجود کے لیے ہر کمال کا جامع ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا اسے حکیم ماننا پڑے گا۔

④ **دلیل چہارم:** کائناتِ عالم میں بے شمار رموز واسرار اور مصالح وحکم کا پایا جانا ان کے خالق و صانع کے حکیم مُطلق ہونے کی نا قابلِ رد دلیل ہے۔

⑫ بارھویں صفت: ”خداوند عالم عادل ہے“

وہ نہ کبھی کسی اچھے کام کو ترک کرتا ہے، نہ کبھی کسی برے کام کا ارتکاب کرتا ہے۔ نہ کبھی کسی قسم کا ظلم وستم کرتا ہے، اور نہ ہی کسی قسم کی بے انصافی کرتا ہے۔ اس کی تفصیل اگرچہ ”افعال العباد“ میں متن کے اندر آرہی ہے۔ مگر یہاں بھی اس کے عادل ہونے پر چند قطعی دلائل و براہین کی طرف اِشارہ کیا جاتا ہے۔

① **دلیل اول:** رب العباد کا ارشاد ہے: ”شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ“ (آلِ عمران: ۱۸)...... ”وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ“ (آلِ عمران: ۱۸۲)...... ”وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا“ (سورۃ الکہف: ۴۹)...... ”وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ“ (سورۃ غافر: ۳۱) خداوند عالم ظلم کرنے کا ارادہ بھی نہیں کرتا۔

② **دلیل دوم:** خدا نے دوسروں کو عدل وانصاف کرنے کا حکم دیا ہے۔ ”اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ“ (سورۃ النحل: ۹۰)...... ”اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى“ (سورۃ المائدہ: ۸)...... اگر خود اس پر عمل پیرا نہ ہو تو معاذ اللہ ”خود میاں فضیحت و دیگراں را نصیحت“ کا مصداق بن کر ”اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ“ (سورۃ البقرۃ: ۴۴) کی زد میں آجائے گا۔ ”سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا“ (سورۃ بنی اسرائیل: ۴۳)

③ **دلیل سوم:** اس نے ظالموں پر لعنت کی ہے۔ ”اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ“ (سورۃ الاعراف: ۴۴) عدل نہ کرنے کی صورت میں یہ لعنت معاذ اللہ خود اس کی عدالتِ قدس تک پہنچ جائے گی۔

④ **دلیل چہارم:** ظلم وستم اور بے انصافی فعل قبیح ہے اور خداوند عالم کی رداء کبریائی تمام شرور و قبائح کی آلائشات سے پاک وصاف ہے۔ کیونکہ اگر وہ فعل قبیح کا ارتکاب کرے تو حقیقت حال چار حال سے خالی نہیں ہے: ① یا تو وہ اس کے قبح سے ناواقف ہوگا ② یا عالم، مگر اس

کے ترک کرنے سے عاجز ③ یا اس کے بجالانے کی طرف محتاج ④ یا ترک پر قادر بھی ہوگا اور بجا آوری پر مجبور بھی نہ ہوگا۔ مگر ویسے بلا فائدہ اس کا ارتکاب کرے گا۔ اور یہ تمام صورتیں باطل ہیں۔ کیونکہ: ① پہلی صورت میں اس کا جاہل ہونا لازم آتا ہے۔ حالانکہ "وھو بکل شیء علیم" کا مصداق ہے۔ ② اور دوسری صورت میں اس کا عاجز ہونا لازم آئے گا۔ حالانکہ وہ "علیٰ کل شیء قدیر" ہے۔ ③ اور تیسری صورت میں اس کا محتاجِ غیر ہونا لازم آئے گا۔ حالانکہ وہ غنی مُطلق ہے۔ "و ان اللہ لغنی عن العالمین"۔ ④ اور چوتھی صورت میں اس کا عبث کار ہونا لازم آئے گا۔ حالانکہ ابھی اوپر ثابت کیا جا چکا ہے کہ وہ حکیم علی الاطلاق ہے۔ لہٰذا لامحالہ اسے عادل ماننا پڑے گا۔

⑤ **دلیل پنجم:** عدل وانصاف صفت کمال ہے۔ لہٰذا واجب الوجود کا اس سے متصف ہونا ضروری ہے۔

بنظر اختصار انہی چند صفاتِ ثبوتیہ کے ذکر پر اکتفا کی جاتی ہے۔ ورنہ ع

سفینہ چاہیے اس بحرِ بے کراں کے لیے

چند صفاتِ سلبیّہ کا بیان

ان صفات کو صفاتِ جلال بھی کہا جاتا ہے۔ جس طرح صفاتِ ثبوتیہ کو صفاتِ جمال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ صفاتِ سلبیّہ سے مراد وہ صفات ہیں جو شانِ خداوندی کے لائق نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کا پایا جانا باعث نقص وعیب ہے۔ اور دامن ربوبیت ہر عیب ونقص سے منزہ ومبرا ہے۔ اور یہ صفات بھی مثل صفات جمال (ثبوتیہ) کے غیر محدود ہیں۔ مگر ہم بنظر اختصار ذیل میں ان میں سے چند صفات کا ان کے ثبوت کے چند اجمالی دلائل وبراہین سمیت تذکرہ کرتے ہیں۔

① پہلی صفت: "خداوند عالم مرکب نہیں ہے"

اس کے اجزا خارجیہ ہیں۔ جیسے انسانی بدن، مثلاً ہاتھ، پاؤں، سر اور آنکھ، کان وغیرہ اجزاء سے مرکب ہے اور نہ ہی اس کے اجزائے ذہنیہ ہیں جیسا کہ مثلاً انسان جنس وفصل (حیوان وناطق) سے مرکب ہے۔ اس پر مندرجہ ذیل دلائل قائم کیے جا سکتے ہیں:

① **دلیل اول:** اگر اسے مرکب مانا جائے تو وہ اپنے اجزاء کا محتاج ہوگا اور جو محتاجِ غیر ہو وہ ممکن

ہوتا ہے، نہ کہ واجب الوجود، واجب کی شان تو غنائے مُطلق ہے۔

② **دلیل دوم:** اگر اسے مرکب فرض کیا جائے تو اس کے اجزاء دو حال سے خالی نہ ہوں گے۔ یا واجب ہوں گے یا ممکن۔ اور یہ دونوں صورتیں باطل ہیں۔ کیونکہ اگر ان کو واجب فرض کیا جائے تو مرکب حقیقی حاصل نہ ہوگا۔ کیونکہ مرکب حقیقی میں اجزاء کا ایک دوسرے کی طرف محتاج ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اور یہ احتیاج شانِ واجب کے خلاف ہے۔ اور اگر محتاج ہوں تو پھر وہ اجزاء واجب نہ رہیں گے اور اگر ممکن ہوں تو اجزاء ممکنہ کا مجموعہ بھی ممکن ہوگا۔ وہ واجب کس طرح ہوسکتا ہے؟

③ **دلیل سوم:** ہر مرکب کسی نہ کسی مرکِب (ترکیب دہندہ) کا محتاج ہوتا ہے جو اس کے اجزاء کو مناسب مقدار اور مناسب محل میں ترکیب دے۔ لہٰذا اگر خدا مرکب ہو تو اس کے لیے کوئی موجد و مرکِب تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس طرح وہ خدا جسے خدا مانا تھا خدا نہیں رہے گا۔

④ **دلیل چہارم:** اگر اسے مرکب فرض کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ اس کا وجود اجزاء کے وجود کے بعد ہے۔ کیونکہ مرکب اجزا کے بعد وجود میں آتا ہے۔ حالانکہ اوپر صفاتِ ثبوتیہ میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ خداوند عالم قدیم ہے۔ وہ ہر شے سے پہلے ہے، اس پر کوئی چیز سابق نہیں ہے۔ بنابریں حقائق تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ مرکب نہیں ہے، بلکہ بسیط محض ہے۔ نیز انہی بیانات سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ جب خدا کے اجزاء ذہنیہ (جنس و فصل) بھی نہیں ہیں تو اس کی حقیقی تعریف نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ حد تام جنس و فصل قریب سے مرکب ہوتی ہے۔ کما برھن علیہ فی الکتب المنطقیۃ۔

② **دوسری صفت: "خداوند عالم جسم نہیں رکھتا"**

اس امر کے بعض دلائل یہ ہیں:

① **دلیل اول:** جو دلائل و براہین خداوند عالم کے مرکب نہ ہونے پر دیے گئے ہیں، وہی دلائل اس کے جسم و جسمانی نہ ہونے پر بھی دلالت کرتے ہیں۔ کیونکہ عند التحقیق ہر جسم مرکب ہوتا ہے۔ لہٰذا جو دلائل خدائے عزوجل کے مرکب ہونے کی نفی کرتے ہیں وہی دلائل اس کی جسمیت کی نفی پر بھی دال ہیں۔

② **دلیل دوم:** ہر جسم کسی نہ کسی مخصوص مادہ و صورت کی طرف محتاج ہوتا ہے اور جو محتاج ہو وہ

واجب الوجود نہیں ہوسکتا۔

③ **دلیل سوم:** ہر جسم اپنے تحقق اور وجود میں زمان و مکان کا محتاج ہوتا ہے اور یہ احتیاج نقص اور علامت امکان ہے، اور شانِ واجب الوجود کے منافی ہے۔

④ **دلیل چہارم:** مُتعدّد روایاتِ مُعتبرہ میں خدا کے جسم کی نفی وارد ہوئی ہے۔ اصول کافی میں حمزہ بن محمد سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی خدمت میں عریضہ لکھا، جس میں خدا تعالیٰ کے جسم وصورت کے بارے میں سوال کیا تھا۔ آپؑ نے جواباً تحریر فرمایا: "سبحان من لیس کمثلہ شیء و ھو لا جسم و لا صورۃ"۔ پاک ہے وہ ذات جس کی کوئی مثل ونظیر نہیں۔ وہ نہ جسم رکھتا ہے اور نہ صورت۔

③ تیسری صفت: "خداوند عالم جوہر وعرض نہیں ہے"

جوہر سے مراد وہ ممکن ہے جو اپنے وجود میں موضوع کا محتاج نہ ہو۔ بالفاظ سہل وسادہ جو خود بخود قائم ہو، اور عرض سے مراد وہ ممکن ہے جو اپنے وجود میں کسی موضوع کا محتاج ہو۔ بالفاظ دیگر قائم بالغیر ہو۔ جیسے رنگ و بو وغیرہ۔ مندرجہ ذیل دلائل خدا کے جوہر وعرض ہونے کی نفی کرتے ہیں:

① **دلیل اول:** جوہر وعرض ممکن کے صفات میں سے ہیں۔ اور خدا واجب الوجود ہے۔ لہٰذا اگر وہ جوہریت وعرضیت کے ساتھ موصوف ہو تو اس کا ممکن ہونا لازم آئے گا۔

② **دلیل دوم:** جوہر اپنے کمال میں عرض کا، اور عرض اپنے وجود میں جوہر کا محتاج ہوتا ہے، اور یہ اِحتیاج ممکن کے خواص و آثار میں سے ہے۔ جو محتاج ہو وہ کبھی واجب الوجود نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ واجب تو "فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ" (آلِ عمران: ۹۷) کا مصداق ہوتا ہے۔

③ **دلیل سوم:** جوہر جسم ہوتا ہے اور ابھی خدا کا جسم ہونا باطل کیا جا چکا ہے۔ اور عرض لازم جسم ہے۔ لہٰذا خدا تعالیٰ نہ جوہر ہوسکتا ہے اور نہ عرض۔ "لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ ج وَ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ" (سورۃ حٰم شوریٰ: ۱۱)

④ **دلیل چہارم:**............والی روایت میں وارد ہے: "انہ لیس بجسم و لا صورۃ و لا عرض و لا جوھر بل ھو مجسم الاجسام و مصور الصور و خالق الاعراض و الجواھر"۔ (توحید شیخ صدوق علیہ الرحمہ) خداوند عالم نہ جسم رکھتا ہے اور نہ صورت اور وہ نہ جوہر ہے اور نہ عرض، بلکہ وہ جسموں کو جسم اور صورتوں کو صورت بنانے والا اور اعراض وجواہر کا خالق ہے۔

④ چوتھی صفت: "خداوند عالم محل حوادث نہیں ہے"

اس کا مطلب یہ ہے کہ خداوند عالم پر وہ حالات طاری نہیں ہوتے جو مخلوق پر طاری ہوتے رہتے ہیں۔ جیسے خواب و بیداری، جوانی و پیری، حرکت و سکون اور صحت و مرض و امثالہا۔ اور اس پر مندرجہ ذیل دلائل دلالت کرتے ہیں:

① **دلیل اول:** یہ تمام امور جسم و جسمانیات کے لوازم و آثار میں سے ہیں۔ اور چونکہ خداوند عالم جسم و جسمانیات سے منزہ و مبرا ہے، لہٰذا وہ محل حوادث نہیں ہو سکتا۔

② **دلیل دوم:** ان حالات و عوارض سے متصف ہونا دلیل نقص و کمزوری ہے۔ اور خداوند عالم ہر نقص و عیب سے پاک ہے۔

③ **دلیل سوم:** یہ سب امور خدائے بزرگ و برتر کے مخلوق ہیں۔ لہٰذا خالق اپنی مخلوق سے ہرگز متصف نہیں ہو سکتا۔

④ **دلیل چہارم:** چونکہ یہ امور حادث ہیں، لہٰذا ماننا پڑے گا کہ وہ ایک وقت میں یقیناً نہ تھے، اس لیے خدا تعالیٰ اس وقت ان سے یقیناً متصف بھی نہ ہوگا۔ اب ان کے وجود کے بعد اگر اسے ان سے متصف فرض کیا جائے تو دو حال سے خالی نہیں۔ ① یا تو ان سے متصف ہونا باعثِ کمال ہوگا، ② یا موجب نقص۔ اور یہ دونوں صورتیں یہاں ناممکن ہیں۔ پہلی صورت میں دو خرابیاں لازم آتی ہیں ① ایک تو یہ کہ ایک وقت خدا کو اس کمال سے خالی و عاری تسلیم کرنا پڑے گا، حالانکہ اس کے تمام کمالات بالفعل ہوتے ہیں، وہ کسی وقت بھی کسی کمال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ ② دوسرے اس طرح اس کا تحصیل کمال میں محتاجِ غیر ہونا لازم آئے گا۔ اور دوسری صورت کا بطلان بھی واضح ہے کہ جن امور سے اتصاف موجبِ نقص ہو وہ ذاتِ باری کے لیے کیونکر روا ہو سکتے ہیں۔ "لَا تَاۡخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوۡمٌ" (بقرہ:۲۵۵)

⑤ پانچویں صفت: "خداوند عالم کسی چیز میں حلول نہیں کرتا"

خداوند عالم کسی شے میں اس طرح حلول نہیں کرتا جس طرح کوزے میں پانی یا جسم میں روح۔ جیسا کہ نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اور صوفیہ، عرفاء و اولیاء کے بارے میں یہ اعتقاد رکھتے ہیں، اور اس پر چند قطعی دلائل قائم ہیں۔

① **دلیل اول:** حلول کرنے والا اپنے محل کا محتاج ہوتا ہے۔ اور یہ احتیاج ممکن کے خواص سے ہے۔ واجب الوجود کسی چیز کا محتاج نہیں ہوسکتا۔

② **دلیل دوم:** جو چیز کسی چیز میں حلول کر جائے دوسری جگہ اس کے وجود سے خالی ہوجاتی ہے۔ حالانکہ خداوند عالم لامکان ہے اور علمی احاطہ کے اعتبار سے ہر جگہ موجود ہے۔

③ **دلیل سوم:** جس چیز کے حالات میں تبدیلی واقع ہوجائے وہ زوال پذیر ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر خدا کے لیے حلول ممکن ہو اور آج کسی چیز میں اور کل کسی چیز میں حلول کرے تو وہ فانی ہوجائے گا۔ حالانکہ وہ ازلی اور ابدی ہے۔ اس کے لیے فنا و زوال ناممکن ہے۔

④ **دلیل چہارم:** حلول میں حال کے لیے جوہر یا عرض ہونا ضروری ہے۔ جوہر کی مثال تو اوپر مذکور ہے اور عرض کی مثال یہ ہے، جیسے پھول میں خوشبو یا آگ میں حرارت، حالانکہ اوپر ثابت کیا جاچکا ہے کہ خدا کی ذات جوہر و عرض ہونے سے اعلیٰ وارفع ہے۔ لہٰذا اس کے لیے حلول کرنا بھی ناممکن ہوگا۔

⑥ چھٹی صفت: "خداوند عالم کسی شے کے ساتھ متحد نہیں ہوتا"

جیسا کہ بعض فرقہائے باطلہ اپنے رہبروں اور بزرگوں کے متعلق یہ نظریہ فاسدہ رکھتے ہیں کہ خدا ان کے ساتھ متحد ہوجاتا ہے، اور اس حالت میں وہ یہ راگ الاپتے ہیں: ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

اور یہ بچند وجہ باطل ہے۔

① **دلیل اول:** اتحاد کی اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ دو چیزوں کا اس طرح باہم مل کر ایک ہوجانا کہ ان کے اتحاد سے حجم میں نہ کوئی کمی واقع ہو نہ زیادتی۔ اس طرح کا اتحاد عقلاً محال و ناممکن ہے۔ لہٰذا خدا کے لیے کیونکر درست ہوسکتا ہے۔

② **دلیل دوم:** اگر بالفرض خداوند عالم کسی شے سے متحد ہو تو وہ دوسری شے دو حال سے خالی نہیں۔ واجب ہوگی یا ممکن؟ اگر واجب ہو تو واجب الوجود ایک سے زائد ہوجائیں گے جو کہ باطل ہے (اس کی تفصیل مبحث توحید میں آرہی ہے) اور اگر ممکن ہو تو اتحاد کے بعد جو حاصل ہوگا وہ اگر واجب ہوا تو انقلابِ ممکن بواجب لازم آئے گا اور اگر ممکن ہوا تو انقلاب واجب بہ

ممکن لازم آئے گا۔ اور یہ انقلاب بالکل محال و ناممکن ہے۔ پس اتحاد کو باطل تسلیم کرنا پڑے گا۔

③ **دلیل سوم:** اس قسم کا اتحاد بالکل غیر معقول ہے۔ کیونکہ اگر اتحاد میں ہر دو کا وجود محفوظ ہے تو پھر دو میں اتحاد حاصل نہیں ہوا۔ اور اگر ہر دو معدوم ہو گئے اور کسی تیسری چیز نے جنم لے لیا تو بھی اتحاد نہ ہوا۔ اور اگر ایک موجود ہے اور دوسرا معدوم، تو اس صورت میں بھی اتحاد ثابت نہیں ہوتا۔ پس معلوم ہوا کہ یہ اتحاد نا قابل قبول اور نا قابل فہم ہے۔ اس لیے محال اور ناممکن ہے۔

④ **دلیل چہارم:** اور اگر اتحاد کے مجازی معنی مراد لیے جائیں کہ کون و فساد کے ذریعہ ایک چیز کا دوسری چیز بن جانا، جیسے پانی کا بخارات بن جانا، تو اس معنی کے اعتبار سے بھی خداوند عالم کے لیے اتحاد ناممکن ہے۔ اس لیے اس کے لیے کون و فساد (بننا اور بگڑنا) محال ہے۔ کیونکہ یہ امر صفاتِ ممکن میں سے ہے۔

⑦ ساتویں صفت: "خداوند عالم محتاج نہیں ہے"

خداوند عالم اپنی ذات وصفات میں کسی زمان یا مکان یا آلات و اسباب یا کسی وزیر و مشیر کا محتاج نہیں ہے۔ بلکہ تمام کائنات اس کی محتاج ہے اور وہ سب سے مستغنی و بے نیاز ہے۔ اس پر مندرجہ ذیل دلائل دلالت کرتے ہیں:

① **دلیل اول:** خود اس کا ارشاد ہے: "اَنۡتُمُ الۡفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَ اللّٰهُ هُوَ الۡغَنِىُّ الۡحَمِيۡدُ" (سورۃ فاطر:۱۵) تم سب خدا کے محتاج ہو۔ مگر وہ سب سے بے نیاز ہے۔ "اِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ عَنِ الۡعٰلَمِيۡنَ" (سورۃ آلِ عمران:۹۷) خداوند عالم تمام کائنات سے بے نیاز ہے۔ "اَللّٰهُ الصَّمَدُ" (سورۃ الاخلاص:۲) اللہ بے نیاز ہے۔

② **دلیل دوم:** احتیاج ممکن کے خواص و آثار میں سے ہے۔ واجب الوجود ہوتا ہی وہ ہے جو سب سے بے نیاز ہو۔ اگر وہ محتاجِ غیر ہو تو واجب نہیں رہے گا، بلکہ ممکن بن جائے گا اور یہ ناممکن ہے۔

③ **دلیل سوم:** اگر وہ کسی غیر کا محتاج ہو تو وہ غیر، خدا بننے کا زیادہ حقدار ہو گا بہ نسبت اس محتاج کے خدا ہونے کے۔ لہٰذا اس طرح جسے خدا تسلیم کیا ہے اس کی خدائی سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔

④ **دلیل چہارم:** اِحتیاجِ غیر نقص و عیب ہے۔ اور خداوند عالم تمام نقائص و عیوب سے منزہ و مبرا ہے اور بے نیاز ہونا صفتِ کمال ہے اور خداوند عالم تمام صفاتِ کمالیہ سے متصف ہے۔

لہٰذا ماننا پڑے گا کہ وہ محتاجِ غیر نہیں ہے۔

⑧ آٹھویں صفت: "خداوند عالم مُتحیّز نہیں ہے"

خداوند عالم مُتحیّز نہیں ہے اور اس کا کوئی مخصوص مکان نہیں ہے۔ وہ مکان و زمان کی قید سے آزاد ہے۔ اس کے چند بعض دلائل یہ ہیں:

① **دلیل اول:** مکان کی احتیاج اسے ہوتی ہے جو جسم یا جسمانی ہو۔ لیکن چونکہ وہ جسم و جسمانیات سے منزہ ہے، لہٰذا اس کے لیے مکان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

② **دلیل دوم:** اِحتیاجِ مکان علامتِ امکان ہے۔ اور واجب الوجود کا دامنِ قدس اس کی آلائش سے صاف ہے۔

③ **دلیل سوم:** جو چیز مکان میں ہو اس کے لیے حرکت و سکون لازم ہوتا ہے۔ اور اوپر ثابت کیا جا چکا ہے کہ خداوند عالم محل حوادث نہیں ہے۔

④ **دلیل چہارم:** اخبار اہل بیتؑ میں اس سے مکان کی نفی کی گئی ہے۔ چنانچہ ابی بصیر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں، آں جنابؑ نے فرمایا: "ان اللّٰہ تبارك و تعالیٰ لا یوصف بزمان و لا مکان و لا حرکۃ و لا انتقال و لا سکون بل ھو خالق الزمان و المکان و الحرکۃ و السکون و الانتقال تعالیٰ عما یقول الظالمون علوا کبیرا"۔ (بحار الانوار جلد ۲ بجوالہ امالی شیخ صدوقؒ) خداوند عالم زمان و مکان اور حرکت و سکون اور نقل و انتقال کے ساتھ متصف نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ زمان و مکان، حرکت و سکون اور نقل و انتقال کا خالق ہے، وہ اس سے بلند و بالا ہے جو کچھ ظالم لوگ اس کے بارے میں کہتے ہیں۔

⑨ نویں صفت: "خداوند عالم صفات زائد بر ذات نہیں رکھتا"

اس امر کی تفصیل اوپر بیان ہو چکی ہے۔ اس کا اعادہ و تکرار کر کے ہم تطویل لاطائل کا ارتکاب نہیں کرتے۔ سطور بالا کا مطالعہ کیا جائے۔ نیز اس مطلب کی مزید وضاحت دوسرے باب کے ذیل میں کی جائے گی۔

⑩ دسویں صفت: "خداوند عالم کے لیے جسمانی لذت و رنج نہیں ہے"

یہ امر محتاج بیان نہیں ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جب وہ جسم و جسمانیات سے ہی منزہ و مبرا

ہے تو پھر ہماری طرح اس کے لذائذ جسمانیہ اور خواہشات نفسانیہ سے لذت اندوز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

⑪ گیارھویں صفت: "خداوند عالم مرئی نہیں ہے"

یعنی وہ ان ظاہری آنکھوں سے دنیا و آخرت میں دیکھا نہیں جا سکتا۔ اس مطلب پر نقلی و عقلی چند اجمالی دلائل و براہین ذیل میں ذکر کیے جاتے ہیں ۔

① **دلیل اول:** خود اس کا ارشاد ہے: "لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَ هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَ هُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ" (سورۃ الانعام:۱۰۳) آنکھیں اسے درک نہیں کر سکتیں لیکن وہ آنکھوں کو درک کرتا ہے اور وہ لطیف و خبیر ہے۔ نیز حضرت موسیٰؑ نے قوم کے بے جا اصرار "اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً" (سورۃ النساء:۱۵۳) (ہمیں کھلم کھلا خدا دکھائیے) سے مجبور ہو کر سوالِ رؤیت کیا تھا، تو ان کو یہ جواب ملا تھا: "لَنْ تَرٰىنِیْ" (سورۃ الاعراف:۱۴۳) "اے موسیٰؑ تم مجھے کبھی نہیں دیکھ سکتے"۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ عربی زبان میں حرف "لن" ابدی نفی کے لیے مقرر ہے۔ لہٰذا اس آیت میں ہمیشہ کے لیے رؤیت باری کی نفی کر دی گئی ہے۔ لہٰذا وہ نہ دنیا میں دیکھا جا سکتا ہے اور نہ آخرت میں ۔

② **دلیل دوم:** کسی چیز کے دیکھنے کے لیے چھ چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ ① وہ چیز دیکھنے والے کی جہت مقابل میں ہو ② کوئی شکل و صورت رکھتی ہو ③ کوئی رنگ بھی رکھتی ہو ④ کسی مکان میں ہو ⑤ دیکھنے والے اور اس میں زیادہ فاصلہ نہ ہو۔ اسی طرح درمیان میں کوئی چیز حائل بھی نہ ہو ⑥ روشنی ہو، تاریکی نہ ہو۔ بدیہی ہے کہ یہ تمام صفات جسم و جسمانیات کے ہیں ۔ اور اوپر مُحقّق و مبرہن کیا جا چکا ہے کہ خالق عالم جسم اور اس کے جملہ آثار وخواص سے منزہ و مبرا ہے۔ لہٰذا اس کے دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔

③ **دلیل سوم:** جو چیز دیکھی جا سکے وہ محاط اور محدود ہو جاتی ہے۔ اور خداوند عالم ت و ہر چیز کو محیط ہے۔ کما قال عز و جل من قائل انه بکل شیء محیط (فصلت:۵۳) خداوند عالم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ لہٰذا جو محیط کل ہو کوئی چیز کس طرح اس کا احاطہ کر سکتی ہے؟

④ **دلیل چہارم:** ایک آدمی نے حضرت امیرالمومنین علیہ السلام سے سوال کیا: یا امیرالمومنین! هل رائت ربك حين عبدته؟ کیا آپ نے عبادت کرتے وقت کبھی اپنے رب کا مشاہدہ کیا

ہے؟ "قال و یلك ماكنت اعبد ربا لم اره" فرمایا: میں تو ایسے خدا کی عبادت کرتا ہی نہیں جسے دیکھ نہ لیا ہو۔ قال وکیف رایته؟ سائل نے سوال کیا: آپ نے اسے کس طرح اور کس حال میں دیکھا ہے؟ قال و یلك لا تدركه الابصار بمشاهدة العیون و لكن رأته القلوب بحقائق الایمان۔ فرمایا: افسوس ہے تیرے لیے اسے ظاہری آنکھیں مشاہدہ نہیں کرسکتیں بلکہ دل اسے حقائق ایمانیہ کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ ؎

کیف یحکی الرب ام کیف یریٰ
فلعمـری لیس ذا الا فضول

⑫ بارھویں صفت: "خداوند عالم ہرگز کسی فعل قبیح کا ارتکاب نہیں کرتا"

اور اس کے دلائل اوپر خداوند عالم کے عادل ہونے کے ضمن میں بیان کیے جاچکے ہیں۔ اعادہ کی ضرورت نہیں ہے، وہاں رجوع کیا جائے۔

⑬ تیرھویں صفت: "خداوند عالم بے مثل و بے مثال ہے"

یعنی پوری کائنات میں کوئی چیز اس کے مشابہ و مانند نہیں ہے اور نہ کوئی شے اس کی ہمسر و نظیر ہے۔ اس پر مندرجہ ذیل دلائل دلالت کرتے ہیں:

① **دلیل اول:** خود اس کا ارشاد ہے: "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ" (سورۃ حم شوریٰ: ۱۱) کوئی چیز اس کی مثل و مانند نہیں ہے۔ "وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ" (سورۃ الاخلاص: ۴) کوئی اس کا ہمسر و نظیر نہیں ہے۔

② دلیل دوم: یہ امر بدیہی ہے کہ ہر صانع اپنی مصنوع اور ہر خالق اپنی مخلوق کے ہر لحاظ سے مغائر ہوتا ہے۔ اور چونکہ کائنات کی ہر چیز خدا کی مخلوق ہے، لہٰذا خدائے عزوجل ان میں سے کسی بھی شے کے ساتھ مشابہہ نہیں ہوسکتا۔ اسی بنا پر حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: "ان کل ما تصوره احد فی عقله او وهمه او خیاله فالله سبحانه غیره و ورائه لانه مخلوق و المخلوق لا یکون من صفات الخالق"۔ (ہدایت الموحدین بحوالہ شرح اصول کافی) ہر وہ چیز جو کسی کے عقل یا وہم یا خیال میں سما سکے، اللہ سبحانہ اس کے علاوہ اور اس کے ماوراء ہے۔ کیونکہ عقل و وہم میں آنے والی چیز مخلوق ہے۔ اور کوئی مخلوق اپنے خالق کے مشابہ نہیں ہوسکتا

ہے۔ کئی روایات میں وارد ہے کہ: "ھو شیء لا کالاشیاء"۔ "خداوند ایک شے ضرور ہے۔ مگر وہ دوسری اشیاء کی مانند نہیں ہے"۔ (اصول کافی)

فھو لا کیف و لا این له　　　وھو رب الکیف و الکیف یحول

"اس کی نہ کوئی کیفیت ہے اور نہ اس کے لیے کوئی مکان ہے۔ وہ تو کیفیت و مکان کا رب ہے۔ لہٰذا وہ ان سے متصف کیونکر ہو سکتا ہے؟"

جل ذاتا و صفاتا و علا　　　و تعالیٰ ربنا عمّا نقول

"جو کچھ ہم بیان کرتے ہیں اس سے اس کی ذات اور اس کی صفات اجل و ارفع ہیں"۔

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وھم
وز ھرچه گفته اند و شنیدم و خوانده ایم

ازالۂ شُبہ

انہی حقائق سے ایک شبہ کا ازالہ بھی ہو جاتا ہے، جو اس مقام پر بعض کم فہم حضرات کی طرف سے کیا جاتا ہے کہ:

"ایسے خدا کے وجود کا کیونکر اِقرار کیا جا سکتا ہے کہ جو جسم و جسمانیات سے منزہ ہے۔ اور آنکھوں سے دیکھا نہیں جا سکتا۔ عقل و وہم میں اس کی کیفیت نہیں آ سکتی۔ اس کی کنہ حقیقت تک رسائی ممکن نہیں۔ مگر بایں ہمہ علم و قدرت وغیرہ صفاتِ جلیلہ کے ساتھ متصف ہے؟"۔

اگرچہ سابقہ مباحث میں اس قسم کے شبہات کے مفصل جوابات دیے جا چکے ہیں، تاہم چونکہ اس شبہ میں قدرے جدت و تنوع ہے، اس لیے یہاں بالاختصار اس کا ازالہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جب یہ مُسلّم و مُحقّق ہے کہ اس عالم میں امکان و حدوث کے جملہ آثار و خواص پائے جاتے ہیں، اور یہ بھی بدیہی امر ہے کہ کوئی حادث و ممکن بغیر کسی مُحدِث و مُوجد کے عرصہ ہستی میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ لہٰذا عقلِ سلیم مجبور کرتی ہے کہ اس عالم کے لیے کوئی ایسا مُوثر و مُوجد ہونا ضروری ہے جس میں ممکن یا حادث کے آثار و علامات موجود نہ ہوں، اسی موجد و موثر کائنات کا نام "خدا" ہے۔ اگرچہ اس کی حقیقت تک ہماری عقلوں کی رسائی نہ ہو سکے۔ جس طرح انسان ایک عمدہ قسم کی گھڑی دیکھ کر یہ یقین کر لیتا ہے کہ اس کا ایک بنانے والا ضرور ہے، جو صنعتِ ساعت سازی میں کامل دستگاہ رکھتا ہے، لیکن اگر اس کے ایسے بعض اوصاف جو گھڑی سازی میں دخل نہیں رکھتے، اس کو معلوم نہ ہو سکیں۔ مثلاً یہ کہ اس کا رنگ

سفید تھا یا سیاہ ۔ اس کا قد دراز تھا یا کوتاہ ۔ وہ جوان تھا یا بوڑھا ۔ تو اس بنا پر اس کے موجود اور کامل صناع ہونے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں کیا جاسکتا ۔ بعینہٖ اسی طرح عجائب وغرائب سے مملو ومشحون اس عالم کو دیکھ کر یہ یقین ہوجاتا ہے کہ اس کا ایک ایسا صانع وخالق ضرور موجود ہے جو ہر کمال سے متصف اور ہر نقص وعیب سے منزہ ومبرا ہے ۔ اب اگر یہ معلوم نہ ہوسکے کہ اس کی اصل حقیقت وماہیت کیا ہے؟ تو اس سے اس کے موجود ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ وھذا اوضح من ان یخفی ۔

اے بروں از وہم و قال و قیل من
خاک بر فرقِ من و تمثیل من

اس عالم میں ہزاروں چیزیں ایسی ہیں جن کی حقیقت ہمیں معلوم نہیں ہے ۔ جو چیزیں سب سے زیادہ انسان کے قریب ہیں، جیسے: عقل، فہم، نفس اور روح ۔ اسے ان کی حقیقت کا بھی علم نہیں ہے ۔ اسی لیے حدیث میں وارد ہے: "من عرف نفسه فقد عرف ربه" ۔ " جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا" ۔

این منك الروح فی جوهرها
هل تراها او ترى كيف تجول

(اے معرفت خدا کے دعویدار! ذرا بتا تو سہی کہ) روح اپنی حقیقت کے اعتبار سے تیرے کس عضو میں ہے ۔ کیا تو نے کبھی اسے دیکھا ہے، یا اس بات کا مشاہدہ کیا ہے کہ وہ کس طرح جولان کرتی ہے؟

چودھویں صفت: (توحید کا بیان) "خداوند عالم واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے

نہ ذات میں، نہ صفات میں، نہ افعال میں اور نہ عبادت میں ۔ غرضکہ وہ ہر اعتبار سے واحد و یکتا ہے اور یہی خالص توحید اسلام کا طرۂ امتیاز ہے ۔ کیونکہ خداوند عالم کی ہستی کا اجمالی اقرار واعتقاد تو تمام مذاہب میں پہلے بھی موجود تھا، اور اب بھی ہے ۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں موجود ہے: وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (سورۃ لقمان: ۲۵) "اگر تم کفار سے دریافت کرو کہ آسمان وزمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے" ۔ ان میں اگر کوئی نقص ہے تو وہ توحید کا ہے ۔ ان میں یا تو توحید سرے سے ہے ہی نہیں، اور اگر ہے بھی تو وہ ناقص ہے ۔ کوئی ثنویت کے مخمصہ میں مبتلا ہے اور کوئی تثلیث کے غیر معقول مُعمہ میں الجھا ہوا ہے اور کوئی اس سے بھی زائد معبودوں کی عبادت کے چکر میں پڑا ہوا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو جو کچھ کدوکاوش اور وحشت ہے وہ صرف عقیدۂ

قال الشیخ الربانی ابوجعفر محمد   اس رسالہ کے مُصنّف شیخ جلیل عالم ربانی وفقیہ صمدانی ابوجعفر محمد

....

توحید خالص سے ہے۔ چنانچہ ارشادِ قدرت ہے:

ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗۤ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا (سورۃ المومن:۱۲)

وَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ (سورۃ الزمر:۴۵)

"جب خدائے واحد کو پکارا جاتا ہے تو تم انکار کر دیتے ہو اور اگر اس کے ساتھ کوئی شریک قرار دے دیا جائے تو تم اقرار کر لیتے ہو"...... "اور جب خدائے وحدۂ لاشریک کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے جو قیامت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اسی بنا پر کفار مکہ کی نگاہ میں پیغمبر اسلام ﷺ کا اگر کوئی بڑا جرم تھا تو یہی کہ وہ ان کے مُتعدّد خداؤں کو نظر انداز کر کے صرف ایک خدا کا کلمہ پڑھانا چاہتے تھے۔ خلاقِ عالم نے ان کی اس ناراضی کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ (سورۃ ص:۵)

کیا اس رسول نے مُتعدّد خداؤں کو فقط ایک خدا بنا دیا ہے۔ یہ عجب بات ہے؟

بہرحال جیسی صاف اور نکھری ہوئی توحید اسلام نے پیش کی ہے ایسی خالص توحید کسی مذہب نے پیش نہیں کی۔ دیگر مذاہب میں یا تو توحید فی الذات ہی کا فقدان ہے اور اگر توحید ذاتی ہے تو توحید فی الصفات ندارد۔ اور اگر توحید فی الصفات ہے تو توحید فی الافعال عنقا ہے۔ اور اگر بالفرض وہ موجود ہے تو توحید فی العبادت کا قحط ہے۔ بہرصورت ان کی توحید ناقص ہے۔

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ (سورۃ التوبۃ:۳۰)

"یہودی کہتے ہیں عزیر خدا کا بیٹا ہے، اور نصرانی کہتے ہیں کہ مسیح خدا کے بیٹے ہیں۔ یہ لوگ سابقہ کفار کے قول کی برابری کرتے ہیں"۔

مجوسی یزدان واہرمن دو خداؤں کے قائل ہیں۔ آریہ سماج اگرچہ دوسرے ہندوؤں سے کم سہی تاہم وہ خدا، مادہ اور روح تینوں کو قدیم تسلیم کر کے نئی قسم کی تثلیث کے قائل ہو گئے ہیں۔ اسلام نے خالص توحید پر اس قدر زور دیا ہے کہ شرک کو ناقابل معافی جرم قرار دے دیا۔ جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (سورۃ النساء:۴۸)

خداوند عالم شرک کو (بلا توبہ) ہرگز معاف نہیں کرتا۔ اور اس کے علاوہ جو گناہ ہیں، وہ

بن علی بن حسین بن موسی بن بابویہ القمی   بن علی بن حسین بن موسیٰ بن بابویہ القمی فرماتے

جسے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے

جناب جابر بن عبداللہ انصاریؓ آنحضرت ﷺ سے نقل کرتے ہیں، فرمایا: "من مات یشرک باللہ دخل النار"۔ جو شخص اس حال میں مرے کہ وہ شرک کرتا تھا، وہ داخل جہنم ہوگا۔

(بحار الانوار جلد ۲، عقاب الاعمال صدوقؒ)

شرک سے اجتناب کرنا اس قدر محبوبِ خدا فعل ہے کہ اس سے جنّت حاصل ہوجاتی ہے۔ چنانچہ جناب رسولِ خدا ﷺ فرماتے ہیں: "من مات و لم یشرک باللہ شیئا دخل الجنة"۔ جو شخص اس حالت میں مرے کہ اس نے کسی چیز کو خداوند عالم کا شریک قرار نہ دیا ہو، وہ بلا شبہ داخل جنّت ہوگا۔

(توحید شیخ صدوقؒ)

اور حقیقی موحدین کا مقام حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام یہ بیان فرماتے ہیں کہ: "ان اللہ حرم اجساد الموحدین علی النار" خداوند عالم نے موحدین کے اجسام کو آتش جہنم پر حرام کر دیا ہے۔

(توحید شیخ صدوق، بحار الانوار جلد ۲ مجلسی)

حضرت امام رضا علیہ السلام اپنے آباء و اجداد طاہرینؑ کے سلسلہ سند سے آنحضرت ﷺ سے روایت کرتے ہیں: "التوحید ثمن الجنة" جنّت کی قیمت توحید ہے۔ (دوم بحار الانوار)

جناب رسولِ خدا ﷺ نے تو موحدین کے جنّتی ہونے پر قسم یاد فرمائی ہے۔ چنانچہ سرکار علامہ مجلسیؒ عقائد و امالی کی حوالہ سے بحار الانوار جلد ۲ میں ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: "والذی بعثنی بالحق بشیرا لا یعذب اللہ بالنار موحدا ابدا و ان اهل التوحید لیشفعون فیشفعون"۔ مجھے اس ذات کی قسم جس نے مجھے برحق بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ خداوند عالم اہل توحید کو ہرگز آتش جہنم میں عذاب نہیں کرے گا۔ اور یہ لوگ شفاعت کریں گے اور ان کی شفاعت مقبول ہوگی۔

توضیح: یہاں دو باتوں کی وضاحت کر دینا ضروری ہے:

① اوّل یہ کہ جن اہل توحید کا ان احادیث میں بے حساب اجر و ثواب بیان کیا گیا ہے ان سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی توحید حضرات ائمہ طاہرین علیہم السلام سے ماخوذ ہے، نہ وہ لوگ جن کی توحید ابلیس لعین سے حاصل کی ہوئی ہے۔ چنانچہ احمد غزالی نے کہا ہے: "من لم یتعلم التوحید من ابلیس فهو زندیق"۔ "جو شخص شیطان سے توحید حاصل نہ کرے وہ ملحد و زندیق ہے"۔

۲ دوم یہ کہ کوئی کج فہم ان احادیث سے یہ نہ سمجھ لے کہ عقیدہ توحید کی درستی جنتی اور ناجی ہونے کے لیے کافی ہے اور عمل کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اسے حضرت امام رضا علیہ السلام والی وہ حدیث پیشِ نظر رکھنی چاہیے، جس میں آپؑ نے کلمہ توحید کا ثواب بیان کرنے کے بعد فرمایا تھا: "بشرطها و شروطها و انا من شروطها"۔ "یہ ثواب چند شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔ اور من جملہ ان شرائط کے ایک سرط میری امامت کا اقرار اور میری اطاعت بھی ہے"۔ (عیون اخبار الرضاؑ)

بہرحال اطاعتِ شیطان کے ساتھ توحید خالص کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اب ہم ذیل میں توحید ذاتی پر چند ادلہ و براہین ذکر کرتے ہیں۔ اس کے بعد توحید کے بعض دیگر اقسام کا مختصر تذکرہ ان کے اجمالی دلائل کے ساتھ کریں گے۔

توحیدِ ذاتی کے دلائل و براہین

۱ **توحید کی پہلی دلیل**: جس طرح اس کائنات کا وجود اپنے خالق کی ہستی اور وجود پر دلالت کرتا ہے اسی طرح اس کا نظم و ضبط اور باہمی ربط و ارتباط اور اس کا دوام و استقرار اس امر پر بھی قطعی دلالت کرتا ہے کہ اس کا خالق و مدبر ایک ہی ہے، جیسے اعضاء بدن، ہاتھ، پاؤں، سر و مُنھ وغیرہ متعدّد ہیں مگر ان کا مجموعہ ایک ہی انسان ہے۔ اسی طرح ثریٰ سے ثریا تک اور آسمان سے زمین تک ہر چیز کا مناسب مقدار اور اعلیٰ و اکمل نظام پر گامزن ہونا، اس بات کی بین دلیل ہے کہ اس کا ناظم اعلیٰ ایک ہی خدائے پاک ہے۔ وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ (سورة یٰسٓ:۳۸) اگر ایک سے زائد ناظم و مدبر ہوتے تو عالم میں یہ اتحاد و یک جہتی اور یہ نظم و ضبط ہرگز نہ ہوتا، بلکہ اختلاف و افتراق اور بے ترتیبی و بدنظمی کے آثار نمایاں و آشکار ہوتے۔

جناب ہشام بن الحکم کے سوال پر حضرت صادق آلِ محمد علیہ السلام نے توحید باری تعالیٰ پر اسی دلیل جمیل کی طرف اشارہ فرمایا ہے، ہشام نے عرض کیا: "مالدلیل علی ان الله واحد"۔ "فرزند رسول اس بات پر کیا دلیل ہے کہ خداوند عالم ایک ہے؟"۔ "قال اتصال التدبیر و تمام الصنع کما قال عز و جل لوکان فیهما الهة الا الله لفسدتا"۔ فرمایا: تدبیر کا اتصال و ارتباط اور صنعت کا کامل و تمام ہونا خدا کے

واحد احد لیس کمثلہ شیء قدیم — اس کی مثل و مانند نہیں ہے وہ ہمیشہ اسی طرح رہا ہے اور

ایک ہونے کی دلیل ہے۔ اگر ایک سے زائد خدا ہوتے تو زمین و آسمان تباہ ہو جاتے۔ ؎

و فی کل شیء لہ أیة — تدل علی انہ واحد

② **توحید کی دوسری دلیل:** جناب آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت خاتم الانبیاء ﷺ تک جس قدر انبیاء و مرسلین تشریف لائے سب یہی کہتے رہے کہ معبود برحق ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور اسی وحدہ لاشریک کی توحید کا پرچار کرتے رہے۔ اور اسی کو منوانے کے لیے مصائب و آلام جھیلتے رہے۔ قرآن جو خدا کا آخری پیام ہے، اس میں کئی بار اعلان ہوا ہے: "اللہ لا الہ الا ھو" اللہ کے سوا اور کوئی معبود برحق نہیں ہے۔ اگرچہ کئی انبیاء کے ارشادات و تعلیمات قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ مگر اختصار تفصیل میں جانے سے مانع ہے۔ اجمالاً اتنا ہی کافی ہے کہ قرآن خبر دیتا ہے:

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِیۡۤ اِلَيۡهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ ﴿۲۵﴾ (سورۃ انبیاء: ۲۵)

"اے حبیب! آپ سے پہلے جس قدر ہم نے رسول بھیجے ہر ایک کی طرف ہم نے یہی وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری ہی عبادت کرو"۔

یہ قرآن سے استدلال نہیں تا کہ منکر قرآن پر حجت نہ ہو سکے۔ بلکہ یہ ایک تاریخ مُسلمہ کے ساتھ تمسک ہے کہ ہر آنے والے پیغمبر نے آکر یہی پیغام دیا ہے کہ خدا کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس سے بالبداہت یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا ایک ہی ہے۔ کیونکہ اگر اس کے علاوہ کوئی اور معبود بھی ہوتا تو اس کے بھی تو کچھ انبیاء اور نمائندے آتے اور اس کے وجود کے بھی تو بالآخر کچھ آثار نمایاں ہوتے۔ لہٰذا اس کے آثار کا فقدان اس کے نہ ہونے کا واضح برہان ہے۔ سید الموحدین حضرت علی علیہ السلام نے اسی دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: "و اعلم یا بنی لو کان لربك شریك لا تتك رسلہ و لرأیت اثار ملکہ و سلطانہ و لعرفت افعالہ و صفاتہ و لکنہ واحد کما وصف نفسہ لا یضادہ فی ملکہ احد" "اے بیٹا حسنؑ! تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر تمھارے رب کا کوئی شریک ہوتا تو اس کے بھی کچھ رسول تمھارے پاس آتے اور تم ضرور اس کی مملکت و سلطنت کے کچھ آثار دیکھتے اور تم اس کے افعال و صفات سے آگاہ ہوتے لیکن (چونکہ ایسا کچھ نہیں، لہٰذا) وہ ایک ہے، جیسا کہ اس نے اپنی توصیف کی ہے۔ اس کی حکومت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے"۔ (نہج البلاغہ)

وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنۡ يَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنۡ هُمۡ

لم یزل و لا یزال سمیعًا بصیرًا علیمًا حکیمًا حیًا قیومًا عزیزًا قدوسًا	ہمیشہ ایسا ہی رہے گا کہ بغیر کانوں کے سنتا اور بغیر آنکھوں کے دیکھتا ہے وہ سب کچھ جانتا ہے وہ ایسا حکیم ہے کہ اس کا کوئی کام عبث نہیں، زندہ، قائم و دائم ہے، غالب اور پاکیزہ ہے۔

اِلَّا یَخۡرُصُوۡنَ (سورۃ یونس:۶۶)

۳ **توحید کی تیسری دلیل**: اگر دو خدا فرض کیے جائیں اور ہر ایک کامل القدرۃ والاختیار ہو (جیسا کہ شانِ ربوبیت ہے) اور ان میں سے ایک کا ارادہ کسی شے کو پیدا کرنے کے متعلق ہو تو سوال یہ ہے کہ دوسرا خدا اس پہلے خدا کی مخالفت و مزاحمت پر قادر ہے یا نہیں؟ پس اگر دوسرا خدا پہلے خدا کی مخالفت پر قادر ہے، اور اس کے ارادہ کو ملتوی کرا سکتا ہے، تو پہلا خدا بوجہ عجز و قصور خدا نہیں رہے گا۔ اور یہ قاہر و غالب خدا قرار پائے گا اور اگر دوسرا خدا پہلے خدا کی مخالفت پر قادر نہیں بلکہ اس کی موافقت و ہمنوائی کرنے پر مجبور ہے تو پھر یہ دوسرا عاجز و مجبور ہونے کی وجہ سے خدا نہیں رہ سکے گا۔ خدا پہلا ہی ہوگا۔ کیونکہ خدا کے لیے قادر و مختار اور غالب و قہار ہونا ضروری ہے۔

قُلۡ هُوَ رَبِّیۡ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَیۡهِ تَوَكَّلۡتُ وَاِلَیۡهِ مَتَابِ (سورۃ الرعد:۳۰)

۴ **توحید کی چوتھی دلیل**: ایک زندیق نے ایک مرتبہ حضرت صادق آلِ محمد علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا: یہ کیوں جائز نہیں کہ ایک سے زائد خدا ہوں؟ آپؑ نے فرمایا کہ تمھارا یہ قول کہ دو خدا ہوں، تین حال سے خالی نہیں ہے۔ یا تو دونوں قدیم اور قوی ہوں گے یا ہر دو ضعیف و ناتواں ہوں گے یا ایک قوی و توانا اور دوسرا کمزور و ناتواں ہوگا۔ اور یہ تینوں صورتیں باطل ہیں۔ کیونکہ ہر دو مضبوط اور طاقتور ہیں، تو کیوں ایک خدا دوسرے کو اپنے راستے سے ہٹا کر ربوبیت کے ساتھ مُنفرد نہیں ہو جاتا (کیونکہ مستقل اور بلا شریک ہونا کمال ہے) اور اگر دونوں ضعیف ہیں تو پھر دونوں خدائی کے لائق نہیں۔ اور اگر ایک قوی اور دوسرا ضعیف ہے، تو پھر خدا وہی ایک ہوگا جو قوی ہے۔ دوسرا کمزور و ناتواں خدا نہیں ہو سکتا۔

علاوہ بریں اگر دو ہوں تو وہ ارادہ و تدبیر میں یا تو ہر اعتبار سے متفق ہوں گے یا مختلف، مگر جب ہم نظامِ عالم کو دیکھتے ہیں کہ وہ بڑی عمدگی سے جاری و ساری ہے، شب و روز کی آمد و رفت باضابطہ ہے، شمس و قمر کا طلوع و غروب مقررہ اوقات پر ہوتا ہے تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ مدبر و منتظم ایک ہی ہے۔ (احتجاج طبرسیؒ)

عالما قادرا غنيا لا يوصف بجوهر و لا	عالم و قادر ہے اور ایسا غنی ہے کہ سب اس کے محتاج ہیں
جسم و لا صورة و لا عرض و لا خط	مگر وہ کسی کا محتاج نہیں ہے اس کی ذات ایسی بے مثال

ازالۂ شُبہ

امام عالی مقام علیہ السلام کی یہ دلیل بہت ہی محکم و متقن ہے۔ مگر فقط یہ شبہ عائد کیا جاسکتا ہے کہ:

"ممکن ہے دونوں خدا قوی و توانا ہوں۔ مگر وہ اتفاق سے ہر کام انجام دیتے ہوں۔ لہٰذا ان میں اختلاف نہیں ہوتا اس لیے آثار میں اختلاف نہیں ہے"۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا دونوں میں سے ہر ایک کا ارادہ اور اس کی قدرت کائنات کی تخلیق اور اس کے نظام کو چلانے کے لیے کافی ہے یا کافی نہیں ہے؟ یا ایک کا ارادہ کافی ہے اور دوسرے کا ناکافی۔ اگر پہلی شق کو اختیار کیا جائے تو اس سے لازم آئے گا کہ معلول واحد پر دو مستقل علتیں جمع ہوں، اور ایک اثر کے دو مستقل موثر ہوں جو کہ محال ہے۔ علاوہ بریں جب ایک خدا تخلیق کائنات اور اس کے نظام کی بقا کے لیے کافی ہے تو دوسرے کا وجود و عدم برابر ہوگا۔ اور جس کا وجود و عدم برابر ہو اور اس کی کوئی ضرورت نہ، وہ خدا کیسے ہوسکتا ہے؟ واجب الوجود تو وہ ہوتا ہے کہ سب اس کے محتاج ہوں، اور وہ سب سے بے نیاز ہو۔ اس کے علاوہ اس صورت میں ہر دو خدا جب ایک دوسرے کے مشورے کے محتاج اور مرضی کے پابند ہوں گے تو بوجہ احتیاج ممکن الوجود ہوجائیں گے اور دونوں واجب الوجود نہیں رہیں گے۔

اور دوسری صورت میں دونوں خدائی کے نا اہل قرار پائیں گے اور تیسری شق میں خدا ایک ہی ہوگا۔ ضعیف و عاجز خدا نہیں ہوسکتا۔ قُلۡ یٰۤاَهۡلَ الۡکِتٰبِ تَعَالَوۡا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍۢ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَکُمۡ اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشۡرِکَ بِهٖ شَیۡئًا وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعۡضُنَا بَعۡضًا اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُوۡلُوا اشۡهَدُوۡا بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ (سورۃ آلِ عمران: ۶۴)

۴ توحید کی پانچویں دلیل: اگر دو خدا فرض کیے جائیں تو پھر یہ فرض کرنا بھی ممکن ہوگا کہ ایک خدا چاہتا ہے کہ ایک وقت مخصوص میں ایک چیز مثلاً زید کو پیدا کرے اور دوسرا چاہتا ہے اسے پیدا نہ کرے، یا ایک چاہتا ہے کہ مثلاً زید کو مالدار بنائے، دوسرا اسے نادار رکھنا چاہتا ہے، یا ایک زید کو مارنا چاہتا ہے اور دوسرا اسے زندہ رکھنا چاہتا ہے۔ اب صورتِ حال تین حال سے خالی نہیں۔ یا دونوں کا مقصد پورا ہوگا، اور یہ محال ہے، کیونکہ اس طرح اِجتماعِ نقیضین لازم آتا ہے۔ یا ایک اپنے مقصد

و لا سطح	ہے کہ اسے جو ہر وعرض اور جسم (جس میں طول وعرض اور عمق ہو) وشکل وصورت
و لا ثقل	وہ عرض ہے جو مادہ میں سمایا ہوا ہے۔ اور خط (سطح کا وہ کنارہ جس میں فقط طول ہو)
و لا خفة	و سطح (جسم کا وہ کنارہ جس میں طول و عرض ہو مگر عمق نہ ہو) وغیرہ صفات سے
و لا سکون	متصف نہیں کیا جا سکتا (کیونکہ وہ جسم وجسمانیات سے منزہ ہے ۔ نہ تو اس میں ثقل
و لا حرکة	ہے اور نہ خفت نہ حرکت ہے نہ سکون ۔

میں کامیاب ہوجائے گا اور دوسرا ناکام رہے گا۔ تو ظاہر ہے کہ پھر خدا وہی ہوگا جو قادر وقوی ہوگا۔ جو مغلوب ومقہور ہوجائے وہ خدا نہیں ہوسکتا۔ یا وہ باہم لڑتے اور جھگڑتے رہیں گے اور کسی کا بھی مقصد حاصل نہ ہوگا۔ تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں نظام عالم درہم برہم ہوکر رہ جائے گا۔ پس جب یہ تینوں شقیں باطل ہوگئیں تو اس سے ایک سے زائد خداؤں کا ہونا بھی باطل ہوجائے گا۔ قرآن مجید کی اس آیت میں اسی دلیل جمیل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (سورۃ الانبیاء:۲۲) اگر زمین وآسمان میں زیادہ خدا ہوتے تو زمین وآسمان کا سلسلہ درہم برہم ہوکر رہ جاتا۔ اب اربابِ عقل وادراک غور فرمائیں کہ : ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (سورۃ یوسف:۳۹) الگ الگ خدا بہتر ہیں یا وہ خدا جو واحد وقہار ہے؟

⑥ توحید کی چھٹی دلیل: یہ حقیقت ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ تخلیق کائنات اور نظام عالم کے چلانے میں مُنفرد ویگانہ ہونا عین کمال اور شرکت نقص ہے اور چونکہ خدا کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر کمال سے متصف اور ہر نقص سے منزہ ومبرا ہو، لہٰذا اسے واحد ویگانہ تسلیم کرنا ضروری ہے۔ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا (سورۃ النساء:۴۸) جو شخص شرک کرتا ہے وہ گناہِ عظیم کا مرتکب ہوتا ہے۔

⑦ توحید کی ساتویں دلیل: جیسا کہ دلیل دوم میں بیان کیا جا چکا ہے جس قدر انبیاء ومرسلین آئے، سب نے خدا کا یہی پیغام لوگوں تک پہنچایا کہ وہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ لہٰذا حقیقتِ حال دو حال سے خالی نہیں ہے۔ یا تو ان کا بھیجنے والا (خدا تعالیٰ) اس بات میں صادق ہوگا، اور اس کے نمائندے بھی صادق ہوں گے، اس طرح مقصدِ توحید حاصل ہے۔ یا وہ اس سلسلہ میں معاذ اللہ کاذب ہوگا، اس طرح جسے خدا تسلیم کیا تھا اس کی خدائی سے بھی دست بردار ہونا پڑے گا۔ یا اس طرح ہوگا کہ اس نے تو انبیاءؑ ومرسلینؑ کو یہ کہا تھا کہ خدا دو ہیں۔ مگر انبیاء نے معاذ اللہ آکر غلط بیانی سے کام لیتے

و لا مکان و لا زمان و انه تعالیٰ متعال من جمیع صفات خلقه خارج عن الحدین حد الابطال و حد التشبیه و انه تعالیٰ شیء لا کالاشیاء احد صمد لم یلد فیورث و لم یولد فیشارك و لم یکن له

اور نہ زمان و مکان کی حدود اس کا احاطہ کر سکتی ہیں (غرضکہ وہ بے مثال ذات اپنی مخلوق کی تمام صفاتِ ناقصہ سے منزہ و مبرا ہے اور بلند و بالا ہے۔ خداوند عالم ابطال و تشبیہ کی دونوں حدوں سے خارج ہے (یعنی نہ تو وہ ایسا ہے کہ اس سے فضل و کمال کی بالکل نفی کی جائے اور نہ ہی اس کے کمال کو اس کی مخلوق کے کسی کمال سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے) وہ اپنی حیثیت سے ایک چیز تو ہے مگر دوسری چیزوں کی طرح نہیں، وہ یکہ و تنہا اور بے نیاز ہے، اس سے کوئی پیدا نہیں ہوا کہ وہ اس کا وارث بن سکے اور نہ وہ خود کسی سے پیدا ہوا ہے، تاکہ اس کی ذات و صفات میں شریک ہو سکے، نہ اس کا کوئی ہمسر و نظیر ہے، نہ اس کی

ہوئے یہ کہہ دیا کہ خدا ایک ہے۔ اس صورت میں دو خرابیاں ہیں۔ ایک یہ کہ یہ امر عصمتِ انبیاء کے منافی ہے۔ حالانکہ ان کی عصمت مُسلّم ہے۔ دوم اس طرح خداوند عالم پر یہ الزام عائد ہوگا کہ اس نے معاذ اللہ جھوٹوں کی مُعجزات کے ساتھ تصدیق و تائید کی جو کہ شانِ خداوندی کے خلاف ہے۔ پس جب یہ سب صورتیں باطل ہیں تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ خدا ایک ہی ہے۔ وھو المطلوب۔

⑧ **توحید کی آٹھویں دلیل:** اگر دو خدا مانے جائیں تو یہ امر تین حال سے خالی نہیں۔ یا تو ان میں سے ہر ایک دوسرے کا محتاج ہوگا، یا ہر ایک دوسرے سے بے نیاز ہوگا۔ یا ایک محتاج ہوگا اور دوسرا مُستغنی و بے نیاز۔ اور یہ تینوں صورتیں باطل ہیں۔ پہلی صورت میں کوئی خدا بھی نہ رہے گا۔ کیونکہ احتیاج غیر علامت امکان اور شان خداوندی کے منافی ہے۔ اور دوسری صورت میں بھی معبود کوئی نہ رہے گا۔ کیونکہ خدا تو وہ ہوتا ہے جس کی طرف ہر کوئی محتاج ہو، اور ہر ایک اس کا نیاز مند ہو۔ اگر اس سے استغنا و بے نیازی ممکن ہو تو وہ خدا نہیں رہے گا۔ اور تیسری صورت میں خدا وہی ہوگا جو سب سے بے نیاز ہو اور جو محتاج و نیاز مند ہوگا وہ خدا نہ بن سکے گا۔

ان دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ سے واضح و آشکار ہو گیا کہ جو لوگ ایک خدا کے علاوہ زائد معبودوں کے قائل ہیں، ان کے پاس سوائے محض دعویٰ کے کوئی دلیل و برہان نہیں ہے۔ جیسا کہ ارشادِ رب العباد ہے: وَمَنْ يَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ (سورۃ المومنون: ۱۱۷)

كفوا احد ولا ضد له و لا شبه و لا صاحبة ولا مثل ولا نظير ولا شريك له لا تدركه الابصار و هو يدرك الابصار و لا الاوهام و هو يدركه لا تأخذه سنة و لا نوم و هو اللطيف الخبير	کوئی ضد ہے اور شبہ، نہ تو اس کی کوئی زوجہ ہے اور نہ کوئی اس کا شریک ہے اور نہ نظیر و مثیل غرضیکہ وہ ہر حیثیت سے بے مثل اور بے مثال ہے۔ وہ ایسا لطیف وخبیر ہے کہ آنکھیں اسے دنیا و آخرت میں نہیں دیکھ سکتیں، ہاں وہ اپنی مخلوق کی آنکھوں کی ہر حالت سے باخبر رہتا ہے، اس کی ذات ایسی بلند و بالا ہے کہ انسانی وہم وخیال کی بلند پروازیں بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتیں، البتہ وہ اپنے بندوں کے دل و دماغ کے تصورات سے ہر وقت پوری طرح باخبر رہتا ہے، اس کو نیند نہیں، بلکہ اونگھ بھی نہیں آتی۔

توحیدِ صفاتی کا بیان

اس کا مطلب یہ ہے کہ خداوند عالم کی صفاتِ حقیقیہ ذاتیہ عین ذات ہیں۔ ذات وصفات میں کسی وقت بھی تفریق وجدائی متصوّر نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ اس کی کما حقہ وضاحت مباحثِ سابقہ میں کی جا چکی ہے۔ خداوند عالم کے علاوہ جس قدر مخلوق ہے ملائکہ مقربین ہوں اور خواہ انبیاء و مرسلین یا ائمۂ معصومین صلوات اللہ علیہم اجمعین سب کی صفاتِ کمالیہ زائد بر ذات ہیں۔ اس سے کسی بزرگوار حتی کہ سرکار ختمی مرتبت ﷺ کا استثنا بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ آیت مبارکہ: "وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ" (نساء: ۱۱۳) وغیرہ سے ثابت ہے جس طرح ان کا وجود مسعود تخلیق ایزدی کا ثمرہ ہے اسی طرح ان کی صفاتِ جلیلہ بھی عطیۂ موہبتِ الٰہیہ کا نتیجہ ہیں، اس مرتبہ توحید میں کوئی بھی خداوند عالم کا شریک وسہیم نہیں ہے۔ [1]

---

[1] **ایک اعتراض اور اس کا جواب:** کچھ عرصہ ہوا ہمارا ایک مضمون بعنوان "اقسامِ توحید" بعض قومی جرائد میں شائع ہوا تھا۔ پھر پمفلٹ کی صورت میں طبع ہوا، جس میں توحید کے اقسام وانواع پر قدرے تفصیل کے ساتھ مدلل طریقہ پر تبصرہ کیا گیا تھا۔ جس کا خلاصہ سطور بالا میں پیش کر دیا گیا ہے۔ اس رسالہ میں ہم نے صفحہ ۶ تا صفحہ ۸ میں توحید صفاتی کا تذکرہ کرتے ہوئے ثابت کیا تھا کہ خدے تعالیٰ کی صفات عین ذات ہیں۔ مگر ہماری صفات زائد بر ذات ہیں۔ بایں معنی کہ ذات وصفات میں تفکیک وتفریق موجود ہے۔ ایک وقت تھا کہ علم وقدرت وحیات وغیرہ صفات ہمیں حاصل نہ تھیں، جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے: وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (سورۃ النحل: ۷۸) قدرت نے آلاتِ کسب واکتساب مرحمت فرمائے جن سے یہ صفات حاصل ہوئیں ...... بعد ازاں صفاتِ باری کی قدرے وضاحت کر کے بالآخر صفحہ ۸ پر لکھا: پس اس مرتبہ توحید میں کوئی خداوند عالم کا سہیم و

خالق کل شیء لا الہ الا ھو لہ الخلق و الامر تبارك الله رب العالمین و من قال بالتشبیه فه مشرك و من نسب الی الامامیة غیر ما وصف فی التوحید فھو کاذب

ہر چیز اس کی پیدا کی ہوئی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور عبادت کے لائق نہیں ہے، پیدا کرنا اور حکمرانی کرنا اسی کا حق ہے۔ تبارک اللہ رب العالمین۔ جو شخص خداوند عالم کو (اس کی مخلوق سے) تشبیہ دے وہ مشرک ہے اور جو شخص توحید سے متعلق ان عقائد کے علاوہ جن کا ہم نے ذکر کیا ہے کچھ اور غلط عقائد شیعوں کی طرف منسوب کرے وہ جھوٹا اور الزام تراش ہے۔

شریک نہیں ہے۔ باقی سب مخلوقات کی صفات زائد بر ذات ہیں حتی کہ اس سلسلہ میں سرور کائنات ﷺ کو بھی مستثنیٰ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ جیسا کہ آیات مبارکہ: و علمك ما لم تكن تعلم (نساء:۱۳)، ما كنت تدری ما الکتاب و لا الایمان و لکن جعلناه نورا نهدی به من نشاء (شوریٰ:۵۲) و علمناه من لدنا علما (کھف:۶۵) اس پر دال ہیں۔ صفحہ ۸ اس پر بعض مدعیان علم معقول نے ایک غیر معقول ایراد وارد کرتے ہوئے پہلے تو ہم پر یہ اتہام لگایا ہے کہ ہم نے جناب رسالت مآب ﷺ کو بھی آیت مبارکہ: "اخرجکم من بطون امھاتکم لا تعلمون (نحل:۷۸) خدا نے تمھیں بحالت لاعلمی پیدا کیا، اس سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا، اور یہ کہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں آیت مبارک: "ما کنت تدری ما الکتاب و لا الایمان" تم نہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے، اور ایمان کیا ہے، کو پیش کیا ہے، اس کے بعد بزعم خود ہماری غلطی ثابت کرتے ہوئے ازالہ یوں فرمایا ہے کہ صفت عین ذات اور صفت ذاتی میں فرق ہے، اور پھر علم رسول کو صفت ذاتی قرار دیا ہے۔ جیسے جسم کے لیے طول، عرض، عمق یا شمس کے لیے صفت اشراق اور نار کی صفت احراق جو زائد بر ذات تو ہے مگر وجود میں اشراق شمس سے جدا نہیں اور احراق نار سے جدا نہیں...... پس علم ذواتِ مقدسہ انبیاء وائمہ علیہم السلام کی صفت زائد بر ذات ہے جو وجود میں ان ذواتِ مقدسہ سے جدا نہیں ہے...... پھر آیت مبارکہ: "ما کنت تدری ما الکتاب و لا الایمان" کی بزعم خویش یہ تفسیر بیان کی ہے کہ یہاں قضیہ سالبہ ہے جس میں موضوع کا موجود ہونا ضروری نہیں ہوتا، بلکہ موضوع کے عدم کی صورت میں بھی قضیہ سالبہ صادق ہوتا ہے۔ مثلاً "زید لیس بقائم" زید کھڑا نہیں ہے۔ اس وقت بھی صادق ہے کہ جب زید موجود ہو کھڑا نہ ہو اور اس وقت بھی صادق ہے کہ جب زید موجود نہ ہو۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے رسول (ﷺ) جس طریقہ سے وجود ہمارا عطیہ ہے اسی طریقہ سے ایمان و علم کتاب بھی ہمارا عطیہ ہے۔ بظاہر جب تم موجود نہ تھے تو نہ ایمان کو جانتے تھے اور نہ تمھیں علم کتاب تھا۔" یہ تقریر بچند وجہ باطل پذیر ہے۔

اولاً: ہماری عبارت کو نقل کرنے میں علمی دیانت داری سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ ہم نے صراحتاً تو کجا اشارۃً بھی کہیں نہیں لکھا۔ یہ آیت مبارکہ "اخرجکم من بطون امھاتکم" جناب رسولِ خدا ﷺ کو شامل ہے۔ جیسا کہ ہماری منقولہ بالا عبارت سے واضح ہے۔ اس طرح عبارت کو غلط انداز میں پیش کر کے عمداً لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی مذموم کوشش کی گئی ہے۔ بھلا جو شخص آنحضرتؐ کو ان کے ارشاد کے مطابق "کنت نبیاً و آدم بین الماء و الطین" خلقت آدمؑ سے بھی پہلے درجہ نبوت کبریٰ پر فائز جانتا ہو۔ (احسن الفوائد صفحہ......) اس کے متعلق یہ وہم و گمان بھی کیا جاسکتا ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کو اس آیت

و کل خبر یخالف ما ذکرت فی التوحید فھو موضوع مخترع و کل حدیث لا یوافق کتاب اللہ فھو باطل

اور جن عقائد کو ہم نے توحید کے ضمن میں بیان کیا ہے اگر کوئی روایت ان کے خلاف پائی جائے تو وہ یقیناً وضعی اور جعلی ہوگی کیونکہ جس حدیث و روایت کا مضمون کتابِ خدا کے موافق نہ ہوگا وہ روایت سراسر باطل ہے۔

کا مشمول تسلیم کرتا ہے، ہماری عبارت پر ایک سرسری نگاہ کرنے سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت عامۃ الناس کے لیے پیش کی گئی ہے اور آنحضرت ﷺ کے متعلق "علمك مالم تكن تعلم" اور "ما کنت تدری ما الکتاب...... الخ" پیش ہوئی ہیں۔
ثانیاً: اگر اس فرق کو تسلیم بھی کر لیا جائے جو صفت عین ذات اور صفت ذاتی کے درمیان قائم کیا گیا ہے تب بھی علم کو انبیاء و ائمہ کی صفت ذاتی قرار دینا مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر درست نہیں ہے۔ (الف) جو صفت ذاتی ہے اس میں تشکیک (شدت وضعف، زیادتی و کمی، اولیت و اولویت نہیں ہوتی بلکہ یہ تشکیک تو موصوف کے غیر ذاتی صفت کے ساتھ متصف ہونے میں ہوتی ہے، جیسا کہ منطق کی علمی کتاب سلم العلوم صفحہ ۲۰ پر مرقوم ہے: "ولا تشکیك فی الماھیات ولا فی العوارض بل فی اتصاف الافراد بھا فلا تشکیك فی الجسم و لا فی السواد بل فی اسود"۔ تشکیک نہ ماہیات میں ہے اور نہ عوارض میں، بلکہ افراد کے عوارض کے ساتھ متصف ہونے میں ہے۔ حالانکہ یہاں علم رسولؐ میں اضافہ اور ازدیاد کا ہونا بنصِ قرآنی "رب زدنی علما" (طٰہٰ: ۱۱۴) ثابت ہے۔ کتب احادیث میں مختلف طرق و انحاء سے علم انبیاء و ائمہ کے سال بسال ماہ بماہ ہفتہ بہ ہفتہ، لحہ بہ لحہ ازدیاد کی بابت مستقل ابواب موجود ہیں۔ بعد ازیں علم کو کس طرح ان حضرات کی صفت ذاتی قرار دیا جا سکتا ہے؟ (ب) قرآن مجید میں کئی ایسی آیات موجود ہیں جن سے ذواتِ انبیاء اور ان کے علم کے درمیان علیحدگی اور جدائی ظاہر ہوتی ہے۔ جیسے وہ آیت مبارکہ جس میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے: "و لما بلغ اشدہ اٰتیناہ حکما و علما" (یوسف: ۲۲) اور جب یوسفؑ اپنی جوانی کو پہنچے تو ہم نے ان کو حکم (نبوت) اور علم عطا کیا۔ (ترجمہ فرمانؒ)...... اور جب وہ اپنی پوری قوت کو پہنچ گیا ہم نے اس کو حکمت و علم عطا کیا۔ (ترجمہ مقبولؒ)...... (مزید تفسیر و تشریح کے لیے تفسیر مجمع البیان جلد ا صفحہ ۵۹۲، تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۲۵۵) تفسیر صافی دیکھی جا سکتی ہیں...... اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں وارد ہے: "و لما بلغ اشدہ واستوی اٰتیناہ حکما و علما" (سورۃ القصص: ۱۴) اور جب موسیٰ اپنی جوانی کو پہنچے اور (ہاتھ پاؤں نکال کے) درست ہو گئے تو ہم نے ان کو حکمت اور علم عطا کیا۔ (ترجمہ فرمانؒ) اور جب کہ موسیٰ اپنی پوری قوت کو پہنچے اور خوب ہاتھ پاؤں نکالے تو ہم نے ان کو فیصلہ کی قوت اور علم عطا کیا۔ (ترجمہ مقبولؒ) مزید وضاحت کے لیے تفسیر صافی صفحہ ۳۷۹، مجمع البیان جلد ۲ صفحہ ۲۴۴، تفسیر برہان جلد ۳ صفحہ ۲۲۴ دیکھی جا سکتی ہے۔ بعد ازیں کیونکر یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ علم ذوات انبیاء و ائمہ علیہم السلام سے جدا نہیں ہے۔ (ج) آیت مبارکہ: "نحن نقص علیك احسن القصص بما اوحینا الیك ھذا القراٰن و ان کنت من قبلہ لمن الغفلین" (یوسف: ۳) اس قرآن میں ہم نے جو کچھ تمہاری طرف وحی کی اس میں سب سے اچھا قصہ (اب) ہم تم سے بیان کرتے ہیں اور پہلے تم اس سے ضرور ناواقف تھے۔ ہم تم پر قرآن نازل کر کے تم سے ایک نہایت قوی قصہ بیان کرتے ہیں اگرچہ تم اس سے پہلے (اس سے) بالکل بے خبر تھے۔ (ترجمہ فرمانؒ) اور اس کی مانند دوسری آیات سے بھی آنحضرت ﷺ کی ذات اور علم کے درمیان جدائی مترشح ہوتی ہے

وان وجد فی کتب علمائنا فھو مدلس۔ ا
اگر اس قسم کی کوئی روایت ہمارے علماء کی کتب میں موجود ہو تو وہ مدلس سمجھی جائے گی ۔ ا

ا حدیث کے من جملہ ان اقسام کے جو نا قابل قبول ہیں، ایک قسم خبر مدلس بھی ہے۔ تدلیس دلس بمعنی تاریکی سے موخوذ ہے۔ چونکہ اس خبر کا کذب مخفی ہوتا ہے اس لیے اسے مدلس کہا جاتا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ ① تدلیس در اسناد ② تدلیس در شیوخ، تدلیس در اسناد دو طرح متصور ہو سکتی ہے۔ اول یہ کہ یہ روایت کرنے والا کسی ایسے معتبر آدمی سے روایت نقل کرے جس سے اس کی ملاقات ہو اور وہ اس کا ہمعصر ہو۔ مثلاً اس طرح کہے: قال فلاں یا سمعت عن فلان۔ حالانکہ اس نے وہ روایت بیان نہ کی ہو۔ دوم سلسلہ سند میں کوئی ضعیف راوی ہو اس کو درمیان سے نکال دے اور اس کی جگہ کسی اچھے راوی کا نام رکھ دے۔ ایسی کارروائی سے اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ حدیث معتبر بن جائے اور تدلیس در شیوخ کا یہ مطلب ہے کہ وہ اپنے شیخ سے کوئی روایت نقل کرے مگر کسی غرض کے تحت چاہے کہ اسی (شیخ) کی شناخت نہ ہو سکے۔ لہٰذا اس کے مشہور نام کی بجائے اسے کسی غیر معروف لقب یا کنیت یا شہر کی نسبت کے ساتھ یاد کرے۔ اگرچہ ایسا کرنا بھی ناجائز ہے مگر اس پر کوئی خاص ضرر مرتب نہیں ہوتا مگر پہلی قسم کا ضرر بہت زیادہ ہے اور بوجہ ارتکابِ کذب حرام ہے۔ (ہدیۃ المحدثین صفحہ ۸۱، نہایت الدرایہ صفحہ ۱۰۳) اسی قسم کی احادیث برادرانِ اسلامی کی کتب میں بکثرت موجود ہیں جن پر ان کے اکثر عقائد و اعمال کا دارومدار ہے اور مدلسین کی جو تخریبی غرض و غایت تھی وہ

بنابریں حقائق علم کو کیونکر ان کی صفت ذاتی قرار دیا جاسکتا ہے۔ (د) یہ علم نتیجہ روح نبوتی و اماممتی ہے، جسے روح القدس بھی کہا جاتا ہے اور جب یہ روح نبی و امام کی صفت ذاتی نہیں ہے بلکہ خلقت کے بعد عطا ہوتی ہے، جیسا کہ احادیث کثیرہ سے ثابت ہے تو جو چیز اس کی فرع ہے وہ کیونکر صفت ذاتی قرار دی جاسکتی ہے۔ ان ھذا الا اختلاق۔ ثالثاً: یہ درست ہے کہ قضیۂ سالبہ جس طرح باوجود موضوع کے موجود ہونے کے صرف محمول کے انتفاء کی وجہ سے صادق ہوتا ہے اسی طرح بعض اوقات موضوع کے انتفاء سے بھی صادق آتا ہے۔ مگر یہ فیصلہ کرنا کہ فلاں جگہ فلاں قضیۂ سالبہ کا صدق موضوع کے انتفاء کی وجہ سے ہے یا محمول کے انتفاء کے سبب سے ہے۔ یہ فیصلہ ہر جگہ دلائل اور قرائن ادلہ خارجیہ پر غور کرنے کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا یہ مسئلہ خالص عقلی تو ہے نہیں بلکہ نقلی ہے۔ لہٰذا قرآن کے حقیقی مفسرین کی طرف رجوع کرنا پڑے گا کہ آیا یہاں اس مسئلہ کی کیا نوعیت ہے؟ احادیث معصومینؑ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک حالت ایسی تھی کہ ذاتِ نبی موجود تھی مگر علم کتاب وغیرہ نہ تھا جیسا کہ اصول کافی صفحہ..... تفسیر صافی صفحہ ۴۵۴، برہان جلد ۴ صفحہ ۱۳۳ میں اس آیت کی تفسیر میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی یہ حدیث وارد ہے کہ "بلی لقد کان فی حال لا یدری مالکتاب و لا الایمان حتی

و الاخبار التی یتوهمها	وہ روایات جن کے دیکھنے سے جاہلوں اور کم سواد لوگوں کو یہ وہم پیدا
الجهال تشبیها لله تعالی	ہوتا ہے کہ (ان میں) خداوندعالم کو اس کی مخلوق سے تشبیہ دی گئی ہے تو
بخلقه فمعانیها محمولة	ان کے معانی بھی وہی مراد لینے چاہئیں جو اس قسم کی آیاتِ قرآنیہ کے سلسلے

مُسلمانوں نے اپنی غفلت سے پوری کردی۔ اطمینان کے لیے برادرانِ اسلامی کی مذہبی کتب کی سیر کرنا کافی ہے۔ ہماری کتب احادیث میں اس قسم کی احادیث "النادر فی حکم المعدوم" کا حکم رکھتی ہیں اور یہ نتیجہ ہے ہمارے علماء اعلام ومحدثین عظام کی جدو جہد اور کدو کاوش کا، جو انھوں نے احادیث کے جمع وترتیب اور ان کی تصحیح میں کی ہے۔ شکر الله سعیهم و جزل اجرهم۔

توحیدِ افعالی کا بیان

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ افعال تکوینیہ جن پر کوئی بشر من حیث البشر ذاتی طور پر طاقت و قدرت نہیں رکھتا، جیسے خلق کرنا، رزق دینا، مارنا اور جلانا یا مریض کو شفا دینا، یا اس قسم کے دیگر افعال تکوینیہ ان میں خداوندعالم کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں آیات و روایات حد احصاو شمار سے متجاوز ہیں۔ اس مسئلہ کی اگرچہ پوری وضاحت تو وہاں کی جائے گی جہاں متن رسالہ میں غلو و

بعث الله عز و جل الروح " لخ۔ ہاں آں حضرت ﷺ ایک ایسی حالت میں موجود تھے کہ انھیں علم کتاب وایمان نہ تھا، یہاں تک کہ خدا نے ان کو وہ روح عطا فرمائی جس کا آیت میں تذکرہ ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ بات اس وقت کی ہے کہ جب آنحضرتؑ کی ذات موجود تھی مگر یہ علم نہ تھا (لیکن یہ ملحوظ رہے کہ یہ عالم ظاہری میں آنے سے پہلے کی بات ہے۔ لہٰذا بعد ازیں بھی یہ کہنا کہ یہ قضیہ سالبہ صادق بانتفاء موضوع ہے۔ تفسیر بالرائے نہیں تو اور کیا ہے؟ و من فسر القرآن برأیه فلیتبوأ مقعده من النار (مجمع البیان) یہی وجہ ہے کہ مولانا محمد سبطین صاحب سرسوی نے مسئلہ قراءت وکتاب کے موضوع پر جس موضوع پر جناب شیخ ہروی اور علمائے لکھنو کے درمیان طویل بحث ہوئی تھی ایک مبسوط کتاب بنام کشف الاسرار لکھی ہے جس میں اس آیت پر مفصل گفتگو کی ہے۔ اس میں انھوں نے بھی اتنا تو تسلیم کرلیا ہے کہ خلقتِ روحانی کے بعد روح نبوتی کے اتصال تک ان پر ایک حال ایسا گزرا ہے۔ کشف الاسرار صفحہ ۳۶۶۔ اسی لیے ہم نے بھی اصول الشریعہ صفحہ ۴۳ پر لکھا ہے کہ: اس وقت ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ کتنا وقت اس حالت میں گزرا۔ آیا یہ کیفیت کسی وقت میں تھی یا مکان میں یا صرف ایک حالت تھی؟ مگر محتاط سے محتاط لفظوں میں اتنا تو اس آیت مبارکہ سے بعبارۃ النص واضح ہوتا ہے کہ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ آنحضرت ﷺ موجود تھے لیکن وحی نبوت کا سلسلہ ہنوز جاری نہ ہوا تھا۔

وقدمنا الی ما عملوا من عمل فجعلناه هباء منثورا (فرقان: ۲۳)

و قل للذی یدعی فی العلم فلسفة حفظت شیئًا و غابت عنك اشیاء

علی ما فی القرآن کل شی ھالك الا وجھه ★ میں لیے جاتے ہیں ۔ مثلاً قرآنِ حکیم میں ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے : "کل شیء ھالك الا وجھه" (قصص:۸۸) یعنی وجہ خدا کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔

تفویض کے موضوع پر مُصنّف علام بحث کریں گے ۔ مگر یہاں بھی بعض آیات و روایات کا اجمالاً تذکرہ کیا جاتا ہے...... ارشادِ قدرت ہے : ① هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (سورۃ الحشر:۲۴) ترجمہ : وہ اللہ پیدا کرنے والا، تصویر بنانے والا ہے اور اس کے لیے بہترین نام ہیں ۔ اس آیت مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ خداوند عالم ہی خالق و مصور ہے ۔ ② اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (سورۃ الزخرف : ۳۲) آیا وہ تمھارے رب کی رحمت کو تقسیم کرتے ہیں، ہم نے زندگانی دنیا میں ان کے مابین ان کی روزی تقسیم کردی ہے ۔ اس آیت سے کالشمس فی نصف النہار واضح و آشکار ہوتا ہے کہ خدا ہی رازق اور قاسم رزق ہے ۔ ③ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۴۰ (سورۃ الروم:۴۰) ④ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (سورۃ الرعد: ۱۶) یا انھوں نے اللہ کے ایسے شریک مقرر کیے ہیں ۔ جنھوں نے اسی کی سی مخلوق پیدا کردی ہے کہ ان پر مخلوق کی شناخت مُشتبہ ہوگئی ہو۔ تم یہ کہہ دو کہ اللہ ہر چیز کے پیدا کرنے والا ہے اور وہ یکتا و زبردست ہے ۔ ⑤ اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ (سورۃ النمل:۶۴) آیا وہ کون ہے جو خلقت کی ابتدا کرتا ہے، پھر اس کو دوبارہ پھیر دے گا، اور وہ کون ہے جو آسمان و زمین میں سے تم کو رزق دیتا ہے ۔ کیا خدا کے ساتھ کوئی اور خدا ہے؟ ⑥ وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ (سورۃ القصص:۶۸) اور تمھارا پروردگار جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور مُنتخب کرتا ہے ۔ ⑦ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (سورۃ الانعام:۱۷) اگر اللہ تم کو کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اس کا دفع کرنے والا نہیں ہے اور اگر وہ تم کو کوئی خیر و خوبی پہنچائے تو وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ۔...... اس سے معلوم ہوا کہ نفع و نقصان کا مالک خداوند عالم ہی ہے ۔ ⑧ قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝۶۳ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ۝۶۴ (سورۃ الانعام:۶۳ و ۶۴) تم کہہ دو کہ خشکی اور تری کے اندھیروں سے تم کو نجات کون دیتا ہے ۔ جس سے تو رو رو کے چپکے دعا مانگتے ہو کہ اگر اس نے اس سے ہم کو بچا لیا تو ہم ضرور شکر گزار بن

جائیں گے۔ کہہ دو کہ اللہ تم کو ان (اندھیروں) سے اور ہر رنج سے نجات دیتا ہے، پھر تم (اس کا) شریک کرتے ہو۔ ⑨ اَمَّنۡ یُّجِیۡبُ الۡمُضۡطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَ یَکۡشِفُ السُّوۡٓءَ وَ یَجۡعَلُکُمۡ خُلَفَآءَ الۡاَرۡضِ ؕ ءَ اِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ (سورة النمل: ۶۲) آیا وہ کون ہے جو مُضطر کی دعا قبول کرلیتا ہے جب بھی وہ دعا مانگے اور تکلیف کو رفع کردیتا ہے اور تم کو زمین کا حاکم مقرر کرتا ہے۔ آیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا ہے؟۔ ان آیاتِ کریمہ سے ظاہر ہے کہ دعاؤں کا سننے والا اور مہالک سے نجات دینے والا خداوند عالم ہی ہے۔ ⑩ الَّذِیۡ خَلَقَنِیۡ فَہُوَ یَہۡدِیۡنِ ۙ﴿۷۸﴾ وَ الَّذِیۡ ہُوَ یُطۡعِمُنِیۡ وَ یَسۡقِیۡنِ ﴿۷۹﴾ وَ اِذَا مَرِضۡتُ فَہُوَ یَشۡفِیۡنِ ﴿۸۰﴾ وَ الَّذِیۡ یُمِیۡتُنِیۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡنِ ﴿۸۱﴾ (سورة الشعراء: ۷۸ تا ۸۱) جس نے مجھے پیدا کیا پس وہی مجھے راہ بتائے گا، اور وہ وہی ہے جو مجھے کھانا کھلاتا ہے، اور مجھے پانی پلاتا ہے۔ اور جب میں بیمار ہوجاتا ہوں تو وہ مجھے شفا دیتا ہے، اور وہ وہی ہے جو مجھے موت دے گا، پھر مجھے زندہ کرے گا...... اس سے ظاہر ہے کہ خالق و رازق محی و ممیت اور شافی خدا ہی ہے۔ ⑪ اَلَا لَہُ الۡخَلۡقُ وَ الۡاَمۡرُ ؕ تَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۵۴﴾ (سورة الاعراف: ۵۴) آگاہ رہو کہ بنانا اور حکم دینا اسی کا کام ہے اللہ کل عالموں کا پرورش کرنے والا صاحب برکت ہے۔ ⑫ قُلۡ اَفَاتَّخَذۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ لَا یَمۡلِکُوۡنَ لِاَنۡفُسِہِمۡ نَفۡعًا وَّ لَا ضَرًّا (سورة الرعد: ۱۶) تم کہو کہ کیا اس کو چھوڑ کر تم نے ایسوں کو اپنا ولی بنا لیا ہے جو اپنے آپ کے لیے کسی نفع کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ کسی نقصان کا۔ ⑬ وَ مَا بِکُمۡ مِّنۡ نِّعۡمَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ (سورة النحل: ۵۳) اور جو نعمت (بھی) تم کو ملی ہے وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ ⑭ وَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اٰلِہَۃً لَّا یَخۡلُقُوۡنَ شَیۡئًا وَّ ہُمۡ یُخۡلَقُوۡنَ (سورة الفرقان: ۳) اور انھوں نے اسے چھوڑ کر ایسے خدا بنا لیے ہیں جو ایک چیز بھی نہیں بناتے بلکہ خود بنائے جاتے ہیں۔ ⑮ وَ خَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ فَقَدَّرَہٗ تَقۡدِیۡرًا ﴿۲﴾ (سورة الفرقان: ۲) اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا۔ پھر اس کا ایسا اندازہ کر دیا جیسا کہ اندازہ کرنے کا حق ہے۔ ⑯ اَمَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ اَنۡزَلَ لَکُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنۡۢبَتۡنَا بِہٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَہۡجَۃٍ ۚ مَا کَانَ لَکُمۡ اَنۡ تُنۡۢبِتُوۡا شَجَرَہَا ؕ ءَ اِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ ؕ بَلۡ ہُمۡ قَوۡمٌ یَّعۡدِلُوۡنَ ﴿۶۰﴾ (سورة النمل: ۶۰) آیا وہ کون ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور تمھارے لیے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ذریعہ سے بارونق باغات پیدا کر دیے تمھاری تو یہ طاقت نہ تھی کہ تم ان باغوں کے درختوں کو اگا لو۔ کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے (ہے تو نہیں) لیکن یہ لوگ ہیں کہ حق سے منحرف ہوئے جاتے ہیں۔ ⑰ ہَلۡ مِنۡ خَالِقٍ غَیۡرُ اللّٰہِ یَرۡزُقُکُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۫ۖ فَاَنّٰی تُؤۡفَکُوۡنَ ﴿۳﴾ (سورة الفاطر: ۳) ”آیا اللہ کے سوا کوئی اور پیدا کرنے والا بھی ہے جو آسمان و زمین سے تم کو روزی دے دے، سوائے اس کے کوئی معبود نہیں۔ پھر تم کدھر بہکے چلے جاتے ہو“۔ معلوم ہوا کہ رازق و خالق خدا ہی ہے۔

⑱ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ۝۴۹ (سورة الشوریٰ:۴۹) "آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہی خدا ہی کے لیے (مُسلّم) ہے، وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے بیٹیاں عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے بیٹے عنایت فرماتا ہے۔ معلوم ہوا کہ خالق رازق اور اولاد دینے والا خدا ہی ہے"۔ ⑲ اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۝۱۹ (سورة حم الشوریٰ:۱۹) اللہ اپنے کل بندوں پر مہربان ہے جسے چاہتا ہے جس طرح چاہتا ہے رزق عطا فرماتا ہے۔ ⑳ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ (سورة الرعد:۲۶) اللہ جس کے لیے چاہتا ہے رزق وسیع کر دیتا ہے، اور (جس کے لیے چاہتا ہے) تنگ کر دیتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ رزق کم و زیادہ کرنا بھی قبضۂ قدرت میں ہے۔ ㉑ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۶ (سورة آلِ عمران:۲۶) "کہہ دو کہ اے اللہ! اے سلطنت کے مالک تو جس کو چاہتا ہے سلطنت عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہتا ہے سلطنت چھین لیتا ہے اور جسے چاہتا ہے تو عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے تو ذلت دیتا ہے۔ تمام خیر و خوبی تیرے ہی ہاتھ میں ہے، بے شک تو ہر شے پر قادر ہے"......اس آیت مبارکہ سے واضح ہوتا ہے کہ خدا ہی مالک الملک ہے اور عزت و ذلت اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ ㉒ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ۝۵۸ (سورة الذاریات:۵۸) اس آیت سے روز روشن کی طرح واضح ہے کہ: "روزی دینے والا خدا ہی ہے اور وہ بڑی قوت و طاقت والا ہے"۔

توحید کا یہی وہ مرتبہ ہے جہاں پہنچ کر اکثر لوگ اپنے پیشواؤں کی محبت میں مبتلا ہو کر جادۂ اعتدال سے ہٹ جاتے ہیں اور توحید افعالی کا دامن چھوڑ کر شرک کے عمیق گڑھوں میں جا گرتے ہیں۔ "من حیث لا یشعرون" (نحل:۲۶) اسی لیے ہمارے ہادیانِ دین یعنی ائمہ طاہرین علیہم السلام نے ایسے لوگوں کے خیالات کی بڑی پُر زور تردید فرمائی ہے۔ جو ان امور میں مخلوق کو خالق کا شریک قرار دیتے ہیں، اس قسم کی احادیث بہت زیادہ ہیں۔ ان میں سے بعض کو ہم باب "غلو و تفویض" میں ذکر کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ یہاں فقط ایک دو احادیث شریفہ ذکر کی جاتی ہیں۔

① حضرت امام رضا علیہ افضل التحیۃ والثناء بارگاہِ خدا جل و علا میں جو مناجات کرتے تھے، اس میں فرماتے ہیں:

اللهم لا تليق الربوبيته الا بك و لا تصلح الالٰهية الا لك فالعن النصارىٰ الذين صغروا عظمتك و العن المضاهئين الذين نسبوك بالاجسام لقولهم من بريتك اللهم انا

عبيدك و ابنا عبيدك لانملك لانفسنا نفعا و لا ضرا و لا موتا ولا حيوة ولا نشورا . اللهم من زعم انا ارباب فنحن عنه براء و من زعم ان الينا الخلق و علينا الرزق فنحن اليك منه براء كبرائة عيسىٰ ابن مريم من النصارىٰ اللهم انا لم ندعهم الىٰ ما يزعمون فلا تؤاخذنا بما يقولون و اغفرلنا ما يزعمون...... (عيون اخبار الرضاؑ)

بارِ الہا! ربوبیت تیری شان کے لائق ہے۔ اور معبود ہونے کی صلاحیت تو ہی رکھتا ہے۔ یا اللہ! تو نصاریٰ پر لعنت بھیج، جنھوں نے تیری عظمت و جلالت کو کم کر دیا ہے۔ اور اپنی مخلوق میں سے ان لوگوں پر بھی لعنت بھیج جو نصاریٰ کے ساتھ مشابہت رکھتے ہوئے تجھے جسموں کے ساتھ نسبت دیتے ہیں۔ یا اللہ! ہم تیرے بندے ہیں، اور تیرے بندوں کے بیٹے ہیں۔ ہم بذاتِ خود نہ اپنے نفع کے مالک ہیں اور نہ نقصان کے اور نہ موت وحیات کے اور نہ حیات بعد الموت کے۔ یا اللہ! جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ ہم رب ہیں، پس ہم اس سے بیزار ہیں۔ اور جو شخص یہ گمان کرے کہ ہم خلق کرتے اور ہم رزق دیتے ہیں تو ہم اس سے اس طرح بیزار ہیں جیسے جناب عیسیٰ علیٰ نبیّنا وآلہ وعلیہ السلام نصاریٰ سے بیزار ہیں۔ بارالہا! جو کچھ یہ لوگ گمان کرتے ہیں، ہم نے ان کو اس کی دعوت نہیں دی۔ اس لیے تو ہم سے ان کے بدعقیدہ کا مواخذہ نہ کر۔ اور جو کچھ یہ گمان کرتے ہیں تو ہمیں اس کی معافی دے۔

ان بزرگواروں کو وسیلہ اور شفیع ماننے کا صحیح مفہوم وہی ہے جو جناب امام صاحب العصرؑ نے بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ احتجاج علامہ طبرسیؒ میں احمد بن دلال سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ شیعوں میں مسئلہ تفویض کے متعلق نزاع بہت زور پکڑ گئی۔ بعض حضرات یہ کہتے تھے کہ خدوندعالم نے یہ امور حضرات معصومینؑ کے سپرد کیے ہیں اور بعض اس کی نفی کرتے تھے۔ ایک مردمومن نے کہا کہ تم آپس میں کیوں جھگڑتے ہو۔ اور جناب محمدؒ بن عثمان حضرت امامِ زمانہؑ کے نائبِ خاص کی طرف کیوں رجوع نہیں کرتے؟ سب نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ اور جناب شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عرض مدعا کیا۔ جناب شیخ نے اس مسئلہ کو حضرت صاحب الزمانؑ کی خدمت میں پیش کیا۔ جس کا ناحیہ مقدسہ سے یہ جواب باصواب برآمد ہوا:

ان الله خلق الاجسام ف قسم الارزاق لانه ليس بجسم و لا حال فى جسم انه سميع بصير فاما الائمة فيسئلونه فيخلق و يسئلونه فيرزق اجابة لمسئلتهم و اعظاما لشانهم

یعنی اللہ عزوجل نے ہی جسموں کو پیدا کیا ہے اور اسی نے ہی ان کا رزق تقسیم کیا ہے۔ کیونکہ نہ تو وہ جسم ہے اور نہ ہی کسی جسم میں حلول کرتا ہے۔ تحقیق وہ سننے اور دیکھنے والا ہے۔ باقی رہے ائمہؑ

و معنی الوجه الدین و الوجه الذی یؤتی الله منه و یتوجه الیه و فی القرآن یوم یکشف

اس مقام پر وجہ کے معنی دینِ اسلام کے ہیں یا اس وسیلہ کے بھی ہوسکتے ہیں جس کے ذریعہ سے معرفتِ خدا حاصل کی جاتی ہے اور اس کی وجہ سے خدا کی طرف توجہ کی جاتی ہے بنابریں مطلب یہ ہوگا کہ دینِ اسلام اور وسیلۂ خدا کے سوا باقی ہر چیز فنا ہوجائے گی۔ اسی طرح ایک اور آیت میں ارشاد

طاہرینؑ سو وہ خدا تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں۔ پس وہ خلق فرماتا ہے۔ اور یہ اس سے سوال کرتے ہیں اور وہ رزق عطا فرماتا ہے، وہ ان کے سوال کو پورا کرتے ہوئے اور ان کی شان و شوکت کو بڑھاتے ہوئے ان کے سوال یعنی شفاعت کو مسترد نہیں فرماتا۔ (احتجاج طبرسی و بحار الانوار)

توحیدِ عباداتی کا بیانؒ

اور اس کا مطلب یہ ہے کہ مقامِ عبادت میں کسی کو خداوند عالم کا شریک قرار نہ دیا جائے۔ جیسا کہ کلمہ توحید "لا الہ الا اللہ" کا مفاد ہے کہ سوائے خداوند عالم کے اور کوئی معبود برحق نہیں ہے۔ اور اس کے علاوہ اور کوئی ذات پرستش کے لائق نہیں ہے۔ بت پرستوں کو اسی بنا پر مشرک قرار دیا گیا ہے کہ وہ خود ساختہ اصنام کی عبادت کرتے تھے اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتے تھے وہ ہرگز ان کو حقیقی خدا نہیں سمجھتے تھے، بلکہ وہ تو ان بتوں کی عبادت کو باعثِ تقربِ خدا قرار دیتے تھے۔ چنانچہ خلاقِ عالم نے ان کے اس نظریۂ فاسدہ کی اس طرح ترجمانی فرمائی ہے: وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (سورۃ الزمر: ۳)

"اور جن لوگوں نے اس کے سوا اوروں کو اپنا کارساز بنالیا ہے (وہ یہ کہتے ہیں کہ) ہم تو ان کی پرستش صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہم کو خدا کے نزدیک کردیں۔ ضرور خدا تعالیٰ ان تمام باتوں کو جن میں وہ آپس میں اختلاف کیا کرتے ہیں، فیصلہ فرمادے گا"۔

اس کے باوجود ان کو اصطلاحِ شرعِ اقدس میں "مشرک" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـــًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۱۹۱﴾ وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۲﴾ (سورۃ الاعراف: ۱۹۱ تا ۱۹۲) "کیا ان کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کوئی چیز پیدا نہیں کرتے، اور وہ خود ہی پیدا کیے جاتے ہیں اور نہ وہ ان (شریک ٹھہرانے والوں) کی کوئی مدد کرسکتے ہیں، اور نہ اپنی ذات ہی کی مدد کرتے ہیں"۔ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (سورۃ الاسریٰ: ۲۳) "تمہارے پروردگار نے یہ

عن ساق و یدعون	ہوتا ہے: یوم یکشف عن ساق (سورۃ القلم: ۴۲) روز قیامت
الی السجود و هم	جب کشف ساق ہوگا۔ اور لوگوں کو سجدہ کا حکم دیا جائے گا (اس مقام پر
سالمون والساق وجه	اگر "ساق" کا معنی "پنڈلی کھولنا" لیا جائے، جیسا کہ بعض عامہ کا خیال ہے

فیصلہ کر دیا ہے کہ سوائے اس کے اور کسی کی عبادت نہ کرو"۔ معلوم ہوا کہ غیر خدا کی پرستش خواہ کسی نوعیت کی ہو اور خواہ کسی نیت وارادہ سے ہو، اگرچہ سجدۂ تعظیمی ہی ہو، وہ شرک فی العبادت ہے۔ جس سے اجتناب واجب ولازم ہے۔ ارشادِ قدرت ہے: فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (سورۃ حم مومن: ۱۴) "اخلاص کے ساتھ اللہ سبحانہ کی عبادت کرو"۔ اور اخلاص کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ اس کی عبادت میں کسی غیر کو شریک نہ کیا جائے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾ (سورۃ الکھف: ۱۱۰) "پس جس کو اپنے پروردگار کے حضور میں جانے کی امید ہو اسے لازم یہ ہے کہ نیک عمل بجا لائے۔ اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے"۔ (ترجمہ مقبولؒ) خدا اور رسول اور اوصیاء رسول کو تو یہ بھی گوارا نہیں ہے کہ اگرچہ بظاہر عبادت خدا کی ہو مگر اس سے قصد ریا وسمعہ ہو، چنانچہ خداوند عالم ریاکاروں کی مذمت کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے: يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا (سورۃ النساء: ۱۴۲) "یہ لوگ محض لوگوں کے دکھانے کے لیے عبادت کرتے ہیں۔ اللہ کا ذکر تو بہت ہی کم کرتے ہیں"۔ اصول کافی میں آیت مبارکہ: وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾ (سورۃ الکھف: ۱۱۰) کی تفسیر میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: "الرجل يعمل شيئا من الثواب لا يطلب به وجه الله انما يطلب تزكية الناس يشتهى ان يسمع به الناس فهذا الذى اشرك بعبادة ربه"۔ "آدمی کوئی کارِ ثواب کرتا ہے، لیکن اس کی غرض خوشنودئ خدا نہیں ہوتی بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس کی مدح وثنا کریں کہ فلاں بڑا عبادت گزار ہے۔ یہ شخص عبادتِ خدا میں شرک کا مرتکب ہوا ہے"۔ بکثرت احادیث شریفہ میں وارد ہے کہ: "الرياء شرك"۔ "ریا شرک ہے"۔ اس لیے ایسا عمل درجۂ قبولیت حاصل نہیں کر سکتا۔ حضرت باقر العلومؑ فرماتے ہیں: "ولا يقبل الله عمل مرائى"۔ "خداوند عالم ریاکار کا عمل قبول نہیں کرتا"۔

ان حقائق کی روشنی میں ان کے مشرک ہونے میں کیا شک وشبہ باقی رہ جاتا ہے جو نماز وغیرہ عبادیات میں اپنے مرشد کے تصور کو ضروری سمجھتے ہیں۔ کیا یہ صاف مرشد پرستی نہیں ہے؟ اسی طرح ان لوگوں کی جہالت اور ضلالت اور شرک میں کوئی کلام نہیں جو نماز میں حضرت امیرالمومنینؑ یا دیگر ائمۂ طاہرینؑ کے تصور کو ضروری سمجھتے ہیں، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ سورہ الحمد کی آیت "اياك نعبد و اياك

الامر و شدته یا حسرتی علی ما فرطت فی جنب الله	اگر یہاں ساق سے مراد قیامت کی سختی اور مخفی امور کا ظاہر تو یہ خدا وند عالم کی نسبت تشبیہ و تجسیم کا اِقرار ہوگا) اور

نستعین" کا خطاب حضرت امیر المومنینؑ کو ہے۔ جیسا کہ پنجاب کے بعض غالی و مُفوضہ قسم کے جاہل مدعیانِ تشیع کے متعلق مُعتبر ذرائع سے مسموع ہوا ہے۔ اعاذنا اللہ من امثال ھذہ الخرافات۔ یہ ہیں توحید کے وہ چار اساسی وبنیادی مراتب جن کا اعتقاد اہل ایمان کو رکھنا ضروری ہے۔ ان کے اعتقاد کے بغیر ایمان کامل نہیں ہوسکتا۔ پس حقیقی اور سچا خدا پرست وہ ہے جو ان چاروں قسم کے شرک سے پاک اور چاروں قسم کی توحید میں کامل ہو۔ توحید فی الذات، توحید فی الصفات، توحید فی الطاعۃ توحید فی العبادت کا صحیح عقیدہ رکھتا ہو، اور دین برحق وہ ہے جس میں تعلیم توحید اس درجہ مکمل ہو کہ شرک کا شائبہ تک نہ پایا جائے۔ اور یہی تعلیم اسلام ہے۔ (پیغام توحید مولانا محمد سبطین صاحب مرحوم)

رزقنا اللہ حلاوۃ التوحید و التفرید و جنبنا من وساوس الشیطان العنید بجاہ النبی و آلہ سادۃ العبید انہ قریب مجیب

توحید کے بعض دیگر مراتب کا اجمالی بیان

مذکورہ بالا مراتب کے علاوہ توحید کے بعض اور مراتب بھی ہیں جو ایمان کی تکمیل میں دخیل ہیں۔ ان کا جاننا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک......

① "توحید فی التوکل" ہے۔ اہل ایمان کو چاہیے کہ وہ اپنے تمام امور میں خداوند عالم ہی کی ذات پر توکل و بھروسا کریں۔ جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴿۱۲۲﴾ (سورۃ آلِ عمران: ۱۲۲) چاہیے کہ اہل ایمان اللہ ہی پر توکل کریں۔ کیونکہ "وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ" (سورۃ الطلاق: ۳) جو لوگ اللہ پر توکل کرتے ہیں اللہ سبحانہ ان کے لیے کافی ہوتا ہے...... معانی الاخبار جلد ۲ صفحہ ۷۶ میں ایک طویل حدیث کے ضمن میں آنحضرتؐ سے توکل کا یہ مفہوم منقول ہے۔ فرمایا: "العلم بان المخلوق لا یضر و لا ینفع و لا یعطی و لا یمنع و استعمال الیاس من الخلق فاذا کان العبد کذلک لم یعمل لاحد سوی اللہ و لم یرج و لم یخف سوی اللہ و لم یطمع فی احد سوی اللہ ھـذا ھوالتوکل"۔ یہ یقین رکھنا کہ کوئی بھی مخلوق نہ ضرر پہنچا سکتی ہے اور نہ نفع، نہ کچھ دے سکتی ہے اور نہ روک سکتی ہے۔ غرض کہ پوری طرح مخلوق سے مایوس ہونا جب آدمی اس طرح متوکل بن جائے تو اس وقت وہ جو عمل بھی کرتا ہے وہ

وفی القرآن ونفخت فیه من روحی و هو روح مخلوقه جعل الله منها فی آدم وعیسیٰ وانما قال روحی کما

ہونا مراد لیا جائے تو بے شک یہ بات قابل پذیرائی ہوسکتی ہے اسی طرح آیت مبارکہ بھی ہے: اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ" (زمر:۵۶) حسرت اور افسوس کرتے ہوئے ایک شخص کہے گا کہ میں نے خداوند کریم کے پہلو میں کوتاہی سے کام لیا ہے، اس مقام پر جنب اور پہلو سے مراد اطاعت وفرمانبرداری ہے۔ ایک اور جگہ فرمایا: "ونفخت فیه من روحی" (حجر:۲۹) میں نے آدم علیہ السلام میں اپنی روح کو پھونکا اس سے

....

صرف خدا کے لیے، وہ امید نہیں کرتا مگر خدا سے۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتا سوائے خدا کے اور اسے سوائے خدا کی ذات کے اور کسی سے کوئی طمع ولالچ نہیں ہوتا۔

۲) "توحید فی الامر والنهی"۔ چنانچہ اس کا ارشاد ہے: الا له الخلق والامر (اعراف:۵۴) الا له الحکم (انعام:۶۲) ولله الدین الخالص (زمر:۳) حقیقی آمر وناہی وہی ہے۔ انبیاء واولیاء اس کے اوامر ونواہی پر عمل کرانے اور اس کے احکام کو نافذ کرنے کے لیے تشریف لائے ہیں۔ لہٰذا جہاں خالق اور مخلوق کی اطاعت میں اختلاف واقع ہوجائے، وہاں اللہ کے احکام کو مقدم رکھنا چاہیے۔ حضرت امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں: لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق۔ جہاں خالق کی نافرمانی لازم آتی ہو، وہاں مخلوق کی اطاعت روا نہیں ہے۔ (نہج البلاغہ)

۳) "توحید فی مالکیة النفع والضرر" یعنی نفع ونقصان کا مالک خداوند عالم ہی کو سمجھنا چاہیے۔ اوپر توحید افعالی کے بیان میں کئی ایک ایسی آیات ذکر ہوچکی ہیں جن میں خداوند عالم کا یہ ارشاد مذکور ہے کہ وہ ہی نفع وضرر کا مالک ہے۔ "امن یجیب المضطر اذا دعاه ویکشف السوء" (نمل:۶۲) لہٰذا مومنین کو سوائے خدا کے اور کسی سے خائف وہراساں نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ ع

ماسوا اللہ را مسلماں بندہ نیست

۴) "توحید فی الطاعة" یعنی جن لوگوں کی اطاعت خدا نے واجب نہ کی ہو، ان کی اطاعت کرنے اور ان کو اپنا ہادی ورہبر قرار دینے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: امر الناس بمعرفتنا والرد الینا والتسلیم لنا وان صاموا وصلوا وشهدوا ان لا اله الا الله وجعلوا فی انفسهم ان لا یردوا الینا کانوا بذلك من المشرکین۔ (هدایة الموحدین) لوگوں کو ہماری معرفت حاصل کرنے اور ہماری طرف معاملات کو لوٹانے اور ہمارے احکام کو تسلیم کرنے کا حکم دیا گیا

قال بیتی و عبدی و جنتی ای مخلوق و ناری و سمائی و ارضی و فی القرآن بل یداہ مبسوطتان یعنی نعمۃ الدنیا

مراد خداوند عالم کی پیدا کردہ روح مراد ہے جس سے آدم وعیسیٰ علیہما السلام کو پیدا کیا گیا تھا۔ خداوند پاک نے "روح" کو جو اپنی طرف نسبت دی ہے، تو وہ ایسے ہی ہے جیسا کہ اس نے دُوسرے مقامات پر میری زمین ، میرا آسمان، میرا

ہے اور اگر وہ روزے رکھیں، نمازیں پڑھیں، شہادتِ توحید دیں لیکن اس کے باوجود ان کا یہ ارادہ ہو کہ وہ اپنے معاملات کو ہماری طرف نہیں لوٹائیں گے تو وہ مشرک قرار پائیں گے۔

نوٹ: ان تمام مراتبِ توحید کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ معمُولی سی غفلت کرنے سے انسان شرک خفی یا جلی میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ چنانچہ ارشادِ قدرت ہے: وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ (سورۃ یوسف:۱۰۶) اکثر لوگ اس حال میں خدا پر ایمان لاتے ہیں کہ اس کے ساتھ ساتھ مشرک بھی ہوتے ہیں...... تفسیرِ صافی میں بحوالہ تفسیر عیاشی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: یہ آیت مبارکہ ایسے لوگوں کے بارے میں اتری ہے جو اس قسم کی باتیں کرتے ہیں کہ اگر فلاں شخص نہ ہوتا تو میں مرجاتا۔ اگر فلاں شخص نہ ہوتا تو مجھ پر ایسی اور ایسی مصیبت نازل ہوجاتی۔ اگر فلاں شخص نہ ہوتا تو میرا کنبہ اور قبیلہ ہلاک ہوجاتا۔ کیا تم غور نہیں کرتے کہ ایسا کہنے والا اختیاراتِ خداوندی میں غیروں کو شریک کرتا ہے؟ کیونکہ رزق دینا اور بلا و مصیبت کا دفع کرنا خاص خداوند عالم کا کام ہے۔ اس پر کسی شخص نے خدمتِ امامؑ میں عرض کیا کہ ایسے مواقع پر اگر کوئی شخص یوں کہے کہ خداوند عالم فلاں شخص کے باعث مجھ پر احسان نہ کرتا تو میں ہلاک و برباد ہوجاتا۔ یہ کہنا کیسا ہے؟ امام عالی مقامؑ نے فرمایا: اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

فرقہ مجسّمہ کا تذکرہ

یہ فرقہ جو "مجسّمہ و مشبّہ" کے نام سے مشہُور ہے، یہ اہل سنت والجماعت کا ہی ایک فرقہ ہے، یہ خداوند عالم کے لیے جسم اور اس کے تمام اعضاء وجوارح مثل ہاتھ، پاؤں، آنکھ، ناک، اور قلب و زبان وغیرہ کا قائل ہے۔ یہ فرقہ پہلی صدی ہجری کے بعد پیدا ہوا۔ اس کے بانی مضرو کہمش اور احمد ہجیمی بیان کیے جاتے ہیں۔ اسی فرقہ کا ایک عالم داؤد ظاہری تو یہاں تک کہا کرتا تھا: "اعفونی عن الفرج واللحیتہ واسئلونی عما وراء ذلک"۔ اعضاء خداوندی میں سے مجھے فقط فرج اور داڑھی کے متعلق معاف کرو (ان کے متعلق سوال نہ کرو) ان کے علاوہ جس عضو کے متعلق مجھ سے چاہو سوال کرو (میں اس کی

بہشت وغیرہ کے الفاظ سے ان چیزوں کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔ اس مقام پر یہ لغت مجازی طور پر ہے۔ منجملہ دیگر آیات کے قرآن حکیم میں وارد ہے: "بل یداہ مبسوطتان" (مائدہ:۶۴) خدا کے دونوں ید کھلے ہیں۔ ید بمعنی نعمت اور دونوں ید سے دنیا و آخرت کی نعمت مراد ہے نہ کہ ہاتھ۔ ایک اور مقام پر یوں

و نعمة الاخرة و فی القرآن و السماء بنیناها باید و الا ید القوة

کیفیت بتانے کے لیے حاضر ہوں) (الملل والنحل شہرستانی صفحہ ۴۸ طبع ایران) اگر اس فرقہ باطلہ کی مزید خرافات اور دعاوی باطلہ دیکھنے ہوں تو اسی کتاب یا اس موضوع پر جو دوسری کتب لکھی گئی ہیں، ان کا مطالعہ کیا جائے۔ جیسے الفصل ابن حزم ظاہری اور المذاہب اشعری وغیرہ۔ ہمارے ائمۂ طاہرینؑ نے ایسے نظریات فاسدہ کی بڑے شد و مد سے رد فرمائی ہے۔ اور ایسے نظریات کو مشرکانہ و کافرانہ خیالات قرار دیا ہے۔ یہاں بطور نمونہ فقط ایک طویل حدیث کا ایک حصہ نقل کیا جاتا ہے۔ یونس بن ظبیان جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے آنجناب کی خدمت میں بعض لوگوں کے خیالات کا اظہار کیا جو خداوند عالم کے جسم اور اعضاء و جوارح کے بارے میں رکھتے تھے۔ آپ تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے تھے، یہ سنتے ہی سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا: اللهم عفوك عفوك۔ پھر فرمایا: "یا یونس من زعم ان لله وجها کالوجوه فقد اشرك و من زعم ان لله جوارح کجوارح المخلوقین فهو کافر بالله فلا تقبلوا شهادته و لا تاکلو ذبیحته تعالیٰ عما یصفه المشبهون بصفة المخلوقین"۔ جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ خدا کا مُنہ ہے وہ مشرک ہے اور جو یہ گمان کرتا ہے کہ مخلوق کی طرح خدا کے بھی اعضاء و جوارح ہیں وہ کافر ہے۔ تم اس کی گواہی قبول نہ کرو، نہ ان کے ہاتھ کا ذبیحہ کھاؤ۔ خدا ان باتوں سے بلند و بالا ہے، جو اسے مخلوق کے ساتھ تشبیہ دینے والے لوگ بیان کرتے ہیں۔ (بحار الانوار جلد ۲)

خلاصہ یہ کہ: "من شبه الله بخلقه فهو مشرك" جو شخص خدا کو اس کی مخلوق کے ساتھ تشبیہ دے وہ مشرک ہے۔ (عیون اخبار الرضا)

بہرحال اس فرقہ باطلہ کے نظریات فاسدہ جنگل کی آگ کی طرح کم عقل و علم سادہ لوح مُسلمانوں میں پھیلنے شروع ہو گئے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ قرآن مجید میں کچھ آیاتِ متشابہات اس قسم کی تھیں جن سے ایک ظاہر بین شخص کو اس قسم کا توہم ہو سکتا تھا کیونکہ عوام الناس بلکہ اکثر خواص بھی قرآنی آیات و متشابہات کی صحیح تاویل اور ان کے حقیقی مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں، اور نہ ہی سب لوگ

و منہ قولہ تعالیٰ واذکر عبدنا داؤد ذوالاید یعنی ذوالقوۃ و فی القران یا ابلیس ما منعک ان تسجد لما خلقت بیدی یعنی بقدرتی و قوتی و فی القرآن

ارشاد فرماتا ہے: و السماء بنینٰھا باید (ذاریات: ۴۷) ہم نے آسمان کو اید سے بنایا۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی قوت اور طاقت سے بنایا، نہ کہ ہاتھوں سے بنایا، اس امر کی تائید ایک اور آیت سے بھی ہوتی ہے: واذکر عبدنا داؤد ذالاید (ص:۱۷) یعنی یاد کر ہمارے داؤدؑ کو جو اید والا تھا۔ مراد یہ ہے کہ وہ صاحبِ ہمت تھا ابلیس کا ذکر کرتے ہوئے ایک اور مقام پر قرآن مجید میں خداوند عالم ابلیس کو مخاطب کر کے ارشاد فرماتا ہے: یا ابلیس ما منعک ان تسجد لما خلقت بیدی (ص:۷۵) اے ابلیس تو نے اس کو سجدہ کیوں نہیں کیا

حقیقی و مجازی معنوں میں امتیاز کر کے ان کے موارد استعمال کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے جہاں اس قسم کے الفاظ دیکھے انھیں ان کے ظاہری اور لغوی معنوں پر حمل کر کے خدا کے لیے جسم و اعضاء کے قائل ہو گئے اور اس طرح اپنی توحید خراب کر کے آخرت بھی برباد کر بیٹھے۔ من حیث لا یشعرون۔ چونکہ آیات متشابہات کا ذکر آ گیا ہے ان کے بارہ میں چند ضروری امور کا ذکر ناگزیر ہے۔ یہ حقیقت ہر قسم کے شک و شبہ سے بلند اور تمام مکاتیب فکر کے مُسلمانوں کے نزدیک مُسلّم ہے کہ قرآن مجید میں کچھ آیاتِ محکمات ہیں اور کچھ متشابہات ہیں۔ جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے: مِنۡهُ اٰيٰتٌ مُّحۡكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الۡكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ (سورۃ آلِ عمران:۷)

آیاتِ متشابہاتؑ کا مفہُوم

اس وقت اس سے بحث کرنا مقصُود نہیں کہ آیاتِ متشابہات کے قرآن میں رکھنے سے قدرتِ کاملہ کا منشاء و مقصد کیا ہے؟ یہاں صرف یہ بتلانا مقصُود ہے کہ آیت متشابہ کا مفہُوم کیا ہے؟ اور اسے کون سمجھ سکتا ہے۔ اربابِ علم جانتے ہیں کہ متشابہ کے معنی یہ ہیں کہ "ما اشتبہ بہ مراد المتکلمّ"۔ "وہ کلام جس سے متکلّم کی مراد مُشتبہ ہو جائے اور ہر شخص اس کے مقصد کو نہ سمجھ سکے"۔

☆

و الارض جمیعا قبضته یوم القیمة یعنی ملکه لایملکها معه احد و فی القرآن و السموات مطویات بیمینه یعنی بقدرته	جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا تھا۔ یہاں منشاء خداوندی یہ ہے کہ جسے میں نے اپنی قوت و قدرت سے پیدا کیا۔ "والارض جمیعا قبضته یوم القیامة" قیامت کے روز تمام زمین خدا کے قبضہ میں ہوگی یعنی اس کی ملکیت میں ہوگی کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں ہوگا۔ اور قرآن میں ہے :والسمٰوٰت مطویات بیمینه (زمر:۶۷) تمام آسمان خدا کے دائیں ہاتھ میں لپیٹ دیلے جائیں گے مطلب یہ ہے

سوائے خدا ورسول اور آلِ رسولؐ کے اور کوئی شخص متشابہاتؒ کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکتا

چونکہ کلام متشابہ میں ایک سے زائد معنوں کا احتمال ہوتا ہے اس لیے اس کلام کا صحیح مفہوم ہر وہ شخص نہیں سمجھ سکتا جو اس زبان پر عبور رکھتا ہو جس زبان میں وہ کلام ہے، بلکہ اس کا حقیقی مطلب یا خود متکلّم سمجھتا ہے یا وہ شخص جسے متکلّم اپنا منشا بتا دے ۔ اسی بنا پر مذکورہ بالا آیت کے بعد خدا فرماتا ہے : وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ (سورۃ آلِ عمران:۷) کہ قرآنی متشابہات کی حقیقی تاویل خود خدا جانتا ہے، یا وہ ذواتِ قدسی صفات جانتے ہیں جو علم میں راسخ ہیں اور علمِ لدُنّی و وہبی کے حامل ہیں اور مُعلّم بتعلیم اِلٰہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے بزرگوار جناب رسولِ مختارﷺ اور ان کی عترتِ اطہارؑ ہی ہوسکتے ہیں ۔ آنحضرتؐ کے بارہ میں ارشادِ ربُ العزت ہے :وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (سورۃ النحل:۴۴) اے میرے حبیبؐ ! ہم نے قرآن تمھاری طرف نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے لیے بیان کرو کہ ان کی طرف کیا نازل کیا گیا ہے ۔ اور منشائے قدرت کیا ہے؟ اور آنحضرتؐ کے بعد ان کی عترتِ طاہرہؑ کے متعلق خدا فرماتا ہے : ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا (سورۃ الفاطر:۳۲) پھر ہم نے اپنی کتاب (کے علم) کا وارث ان لوگوں کو بنایا ہے جن کو ہم نے اپنے تمام بندوں میں سے مُنتخب کرلیا ہے ۔ ینابیع المودۃ، ارجح المطالب، فرائد السمطین حموینی وغیرہ کتب میں کئی ایسی روایات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مخصوص مُصطفٰے بندوں سے مراد آلِ رسولؐ ہیں ۔ اور ان کی تشخیص و تعیین کے لیے مُسلّم بین الفریقین حدیث ثقلین ہی کافی و وافی ہے :"انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللّٰہ و عترتی اھل بیتی ما ان تمسکتم بھما لن تضلوا بعدی و انھما لن یفترقا حتی یردا علیَّ الحوض" لہٰذا آیاتِ متشابہات کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے جناب رسولِ خداؐ اور ائمۂ ہدیٰ کی بارگاہِ قدس میں حاضر ہونا ضروری ہے، اس کے بغیر کبھی یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا ۔ ولنعم ما قیل:

و فی القرآن و جآء ربك و الملك صفا صفا یعنی و جاء امر ربك و فی القرآن کلا انھم عن ربھم لمحجوبون یعنی عن قولہ و فی القرآن	کہ اس کی قدرت میں ہوں گے و جاء ربك و الملك صفات صفا (سورۃ الفجر) تمھارا پروردگار تب آئے گا اور فرشتے صف بصف حاضر ہوں گے یہاں خدا کے آنے سے مراد امر خداوندی کے ہیں یعنی تمھارے پروردگار کا حکم آئے گا۔ کلا انھم عن ربھم لمحجوبون (مطففین:۱۵) یعنی وہ لوگ یقیناً اپنے پروردگار سے محجوب رہیں گے۔ مطلب یہ کہ خداوند کریم ان کو اپنے ثواب سے محروم کردے گا

یا رَب عجیب راز یہ قرآں میں بھر دیا محکم کہیں، کہیں متشابہ ترا کلام
دُنیا کو اہلِ بَیتؑ کا محتاج کر دیا اب تک مُفسّروں کا اُلجھنا دلیل ہے

اور چونکہ رسولؐ و آلِ رسول علیہ وعلیہم السلام نے ان آیات مبارکہ کے وہی معانی بتلائے ہیں جو متن رسالہ میں مذکور ہیں۔ لہٰذا انھیں صحیح تسلیم کرنا پڑے گا اور یہ ماننا پڑے گا کہ خداوند عالم کا منشاء وہی ہے جو اس ترجمانِ وحی خانوادہ نے بیان کر دیا ہے۔ ان معانی کے علاوہ جو شخص من گھڑت معنی تراشے گا وہ بوجہ تفسیر بالرائے ہونے کے سراسر ضلالت و گمراہی ہوگی۔ قال رسول اللہ ﷺ: "من فسر القرآن برأیہ فلیتبوأ مقعدہ من النار"۔ جو شخص قرآن کی تفسیر و تاویل اپنی ذاتی رائے سے کرے وہ اپنی جگہ جہنم میں مہیا سمجھے۔ (متفق بین الفریقین)

ایک عقلائی مُسلمہ قاعدہ کا بیان

ایک مُسلمہ قاعدہ و قانون ہے کہ جب کوئی مطلب براہین عقلیہ اور دلائل شرعیہ سے مُحقق و مبرہن ہوجائے اور پھر کوئی نقلی دلیل اس کے بظاہر مخالف معلوم ہو تو وہ اگر خبر واحد ہو تو اسے مسترد کر دیا جاتا ہے اور اگر کوئی قرآنی آیت یا متواتر روایت ہو تو اس کی کوئی ایسی تاویل کرنا واجب ہوتی ہے کہ اس کا مفہوم دلائل عقلیہ اور آیاتِ محکمات سے ثابت شدہ مطلب سے مُتصادم و مخالف نہ ہونے پائے۔ چنانچہ مُحقق شیخ بہائی اپنے رسالہ "اعتقادات الامامیہ" میں اسی قاعدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "و نحمل آیات القرآن علی ظاھرھا الا ما قام الدلیل علی خلافہ کقولہ تعالیٰ: ید اللہ فوق ایدیھم"...... الخ۔ یعنی ہم آیاتِ قرآنیہ کو ان کے ظاہری معانی پر ہی محمول کرتے ہیں۔ ہاں جب وہ کسی عقلی دلیل سے مُتصادم ہوں تو پھر ان کی تاویل کرتے ہیں۔ جیسا کہ آیت مبارکہ "ید اللہ" میں لفظ "ید" کی تاویل لازم ہے۔

هل ينظرون الا ان ياتيهم الله فى ظلل من الغمام و الملئكة اى عذاب الله و فى القرأن وجوه يومئذ ناضرة الى ربها ناظرة يعنى مسرقة تنظر ثواب ربها و فى القرأن و من يحلل عليه غضبى

هل ينظرون الا ان ياتيهم الله فى ظلل من الغمام (البقرہ:۲۱۰) کیا وہ لوگ اس بات کا انتظار کررہے ہیں کہ خداوند عالم بادلوں کے سایہ میں ان کے پاس آئے، یعنی اس کا عذاب آئے۔ وجوہ یومئذ ناظرۃ الی ربھا ناظرۃ (سورۃ القیامۃ) روزِ قیامت اکثر چہرے چمکتے ہوئے اور اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ خداوند عالم کی رحمت اور ثواب کا اِنتظار کررہے ہوں گے۔ و من یحلل علیہ غضبی فقد ھوی (سورۃ طٰہٰ:۸۱) جس پر میرا غضب نازل ہوگا، وہ ہلاک ہوجائے گا۔ یہاں غضب خداوندی سے

بنابریں اصول، بھی ان آیات کے ظاہری معنوں سے ہٹ کر انہی معانی کو اختیار کرنا لازم ہے جن کا مُصنّف علام نے ذکر کیا ہے۔ کیونکہ جب سابقہ مباحث میں دلائل عقلیہ و نقلیہ سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ خدوند عالم جسم وجسمانیات سے منزہ و مبرا ہے۔ اور یہ کہ اس کا دامن ربوبیت تمام شرور و قبائح اور عیوب ونقائص سے پاک وصاف ہے تو اب اگر کسی متشابہ آیت کا ظاہری مفہوم اس کے مخالف معلوم ہوتا ہو تو لازماً اس کے ایسے معنی مراد لیے جائیں گے جن سے یہ ظاہری تصادم ختم ہوجائے کیونکہ قرآن میں فی الحقیقت ہرگز کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جیسا کہ خود ارشادِ قدرت ہے: "ولو كان من عند غير الله لوجدوا فيه اختلافات كثيرا" (سورۃ النساء:۸۲) اگر یہ قرآن غیر اللہ کا کلام ہوتا تو ضرور اس میں اختلاف موجود ہوتا۔ قرآن میں اختلاف کا نہ ہونا اس کے کلام خدا ہونے کی ایک قطعی دلیل ہے۔ خُصُوصًا جب کہ ان معانی کی تائید لغت عرب اور اس کے محاورات سے بھی ہوتی ہو۔ جیسا کہ ہماری مُتعلقہ آیات میں مُصنّف کے بیان کردہ معانی و مفاہیم کی محاورات ولغاتِ عرب سے تائید مزید ہوتی ہے تو پھر ان معانی کے اختیار کرنے میں کیا مانع ہوسکتا ہے؟ چنانچہ......

تاویل الآیاتؑ

حضرت مُصنّف نے "کشفِ ساق" کے جو معنی مراد لیے ہیں، یہ محاورۂ عرب کے عین مطابق ہیں۔ عربوں کا یہ دستور ہے کہ وہ کسی امر کی انتہائی شدت کو "کشفِ ساق" سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ جنگ کی شدت و حدت کا تذکرہ کرنا چاہیں تو کہتے ہیں: "قامت الحرب على ساق" جنگ ساق پر کھڑی ہوگئی۔ یعنی بہت سخت ہوگئی۔ شاعر حماسی سعد بن خالد کہتا ہے:

فقد هوی و غضب الله عقابه و رضاه ثوابه و فی القرآن تعلم ما فی نفسی ولا اعلم ما فی نفسك ای تعلم غیبی و لا اعلم غیبك و فی القرآن و یحذركم الله نفسه یعنی انتقامه و فی القرآن

اس کا عذاب اور رضا الٰہی سے ثواب مراد ہے۔ تعلم ما فی نفسی و لا اعلم ما فی نفسك (سورة المائدة:۱۱۶) میرے نفس کی اندرونی کیفیت کو تو جانتا ہے مگر میں تیرے نفس کی پوشیدہ چیزوں کو نہیں جانتا۔ یعنی تو تو میرے راز کو جانتا ہے لیکن میں تیرے بھیدوں سے واقف نہیں ہوں۔ و یحذركم الله نفسه (سورۃ آلِ عمران:۳۰) خداوند عالم تم کو اپنے نفس سے ڈراتا ہے۔ یعنی اپنے انتقام سے خوف دلاتا ہے۔

کشف لهم عن ساقها و بدالهم من الشر الصراح

کہ ان (دشمنوں) کے لیے جنگ بہت سخت ہوگئی اور خالص شروفساد ظاہر ہوگیا۔

اور یہ ایسے صاف وصریح وصحیح معنی ہیں کہ اہل خلاف کے بعض اہل انصاف، اہل علم بھی ان کی صحت کا اقرار کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ چنانچہ مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی اپنے ترجمہ قرآن صفحہ ۱۰۴۳ حاشیہ ۲ مطبوعہ قاسمی دہلی پر رقمطراز ہیں: "یوم یكشف عن ساق کے لفظی معنی ہیں کہ جس دن پنڈلی کھول دی جائے گی اور یہ عرب کا محاورہ ہے۔ اور پنڈلی کھولنے سے سختی اور مصیبت کا پیش آنا مراد ہوتا ہے۔ کیونکہ کوئی بڑا مشکل کام کرنا پڑتا ہے تو آدمی پاجامہ یا تہبند اونچا کرکے اس کے کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ یا دریا میں اُترنا ہوتا ہے، تو اس طرح بھی کپڑا اٹھانا پڑتا ہے۔ اور مُفسّرین نے کہا ہے کہ مراد ہے مصیبت کا کھل جانا، ہم نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے: جس دن پردہ اٹھایا جائے گا"۔

اسی طرح "ید" کے جو معانی حضرت شیخ نے بیان فرمائے ہیں، ان کے علاوہ: "ما منعك ان تسجد لما خلقت بیدی" (ص:۷۵) میں "ید" کے دو اور معنی بھی ممکن ہیں۔ ایک بمعنی "نعمت"۔ اس طرح اس آیت کے معنی یہ ہوں گے: "اے شیطان تجھے کس چیز نے روکا کہ اسے سجدہ کرے، جسے میں نے اپنی دونوں (اخروی ودنیوی) نعمتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے"۔ (کذا فی الانتصاف مطبوعہ برحاشیہ تفسیر کشاف جلد ۲ صفحہ ۳۳۵ طبع مصر)

حضرت شیخ مُفید علیہ الرحمہ نے اس معنی کو متن والے معنی پر یہ کہہ کر ترجیح دی ہے کہ اس صورت میں تکرار لازم آتا ہے۔ کیونکہ قوت وقدرت کے ایک ہی معنی ہیں۔ دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ ایک "ید" بمعنی قوت اور دوسرا بمعنی نعمت ہو، تو اس صورت میں معنی یہ ہوں گے جسے میں نے اپنی قوت و

ان اللہ و ملائکتہ یصلون علی النبی و فیہ ھو الذی یصلی علیکم و ملئکتہ و الصلوۃ من اللہ رحمتہ و من الملئکۃ استغفار تزکیۃ و من الناس

ان اللہ و ملئکتہ یصلون علی النبی یا ایھا الذین اٰمنوا صلوا علیہ (سورۃ الاحزاب) خدا اور اس کے فرشتے پیغمبرؐ پر درود بھیجتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی اس پر درود بھیجا کرو۔ ایک دوسری جگہ فرمایا: "ھو الذی یصلی علیکم و ملائکتہ" (احزاب:۴۳) خدا اور فرشتے تم پر درود بھیجتے ہیں۔ یہاں خدا کے درود بھیجنے سے اس کی رحمت نازل کرنا مراد ہے اور فرشتوں کے درود بھیجنے سے مراد طلب مغفرت اور پاکیزگی بیان کرنا ہے، اور لوگوں کے درود بھیجنے سے دعا مراد ہے۔

نعمت سے پیدا کیا ہے۔ اسی طرح "وجہ" کے دو معنی تو وہی ہیں جو متن میں مذکور ہیں، ان کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں خود ذات ایزدی مراد ہو۔ کیونکہ "وجہ" (بمعنی چہرہ) کا مجازاً ذات پر بھی اطلاق ہوتا رہتا ہے۔ اب معنی یوں ہوں گے: ہر شے ہلاک ہوگی، سوائے ذات باری کے۔ (کذا فی التفسیر البیضاوی جلد ۲ صفحہ ۳۶ طبع مصر و کذا فی الکشاف جلد ۲ صفحہ ۱۸۱)

نیز "وجہ" کا اطلاق دین پر بھی کیا جاتا ہے۔ کیونکہ جس طرح چہرہ ذریعہ معرفت ہوتا ہے اسی طرح دین بھی ذریعہ معرفت ہوتا ہے۔ بعض روایات میں یہ وارد ہے کہ اس سے مراد حضرات ائمہ طاہرینؑ ہیں جو کہ معرفتِ خدا کا ذریعہ ہیں۔ کما لا یخفی۔ یہ سب معانی احادیث اہل بیتؑ میں مذکور ہیں۔

ان معانی کی تائید میں ہم یہاں بعض اخبار معصومیہ پیش کیے دیتے ہیں۔ جناب محمد بن مُسلم روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت امام محمدؑ باقر علیہ السلام سے آیت مبارکہ "یا ابلیس" لخ کے بارے میں سوال کیا، آپؑ نے فرمایا: الید فی کلام العرب القوۃ و النعمۃ قال اللہ و اذکر عبدنا داؤد ذالاید...... و السماء بنینھا باید ای بقوۃ...... و یقال لہ عندی ایادی کثیرۃ ای فواضل و احسان و لہ عندی ید بیضاء ای نعمۃ۔ "ید" کلام عرب میں بمعنی قوت اور نعمت استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ آیت یاداؤد اور آیت و السماء...... میں "ید" انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ نیز محاورات میں کہا جاتا ہے: فلاں شخص کے مجھ پر "ایادی کثیرۃ" ہیں۔ یعنی ان کے بہت سے مجھ پر احسانات ہیں۔ اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کا مجھ پر "ید بیضاء" ہے۔ یعنی مجھ پر اس کا احسان ہے۔ (توحید شیخ صدوق وغیرہ)

محمد بن عبید بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت امام رضا علیہ السلام سے آیت مبارکہ: "بل یداہ مبسوطتان" کے بارے میں دریافت کیا، فرمایا: "یدی" کا مطلب ہے: "بقُدرتی و قُوّتی"

دعاء و فی القرآن و مکروا و مکر الله و الله خیر الماکرین و فی القرآن یخادعون الله و هو خادعهم و فیه الله یستهزیء بهم و فی القرآن سخر الله منهم و فیه نسوا الله فنسیهم کما قال عز و جل و لا تکونوا کالذین نسوا الله فانسیهم انفسهم لانه عز وجل فی الحقیقة لا یمکر و لا یخادع و لا یستهزء و لا یسخر و لا ینسی تعالی الله عن ذلک علوا کبیرا

"مکروا و مکر الله و الله خیر الماکرین" (سورۂ آلِ عمران: ۵۴) انھوں نے مکر کیا تو خدا نے بھی مکر کیا۔ اور خداوند عالم تمام مکر کرنے والوں سے بہتر مکر کرنے والا ہے۔ اسی طرح ایک مقام پر ارشاد فرماتا ہے: "یخدعون الله و هو خادعهم (النساء: ۱۴۲) وہ لوگ خدا سے دھوکا کرتے مگر خدبھی ان کے ساتھ ایسا ہی کرنے والا ہے۔ ایک دوسری جگہ بھی ایسا ہی فرماتا ہے: "الله یستهزی بهم و یمدهم" (البقرہ: ۱۵) خدا ان کے ساتھ ہنسی مذاق کرتا ہے اور انھیں ڈھیل دیتا ہے۔ ایسی ہی آیات میں سے ایک یہ بھی ہے: "نسوا الله فنسیهم" (التوبة: ۶۷) وہ لوگ خدا کو بھول گئے اور خدا نے انھیں بھلا دیا۔ "سخر الله منهم" خداوند عالم ان سے استہزاء کرتا ہے۔ ان تمام آیاتِ قرآنیہ کا منشاء و مطلب یہ نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر کلام سے مُستفاد ہوتا ہے، بلکہ یہاں خداوند عالم کے مکر، تخریہ، استہزاء خدع اور اس کے بھول جانے کا مطلب ایسا کرنے والوں کے لیے ان کے اعمال کی جزاء اور افعال کا بدلہ ہے، حقیقت میں خدا نہ مکر کرتا ہے اور نہ ہی دھوکا دیتا ہے۔ ہنسی مذاق مسخرہ پن اور نسیان وغیرہ عوارض تو عیوب میں داخل ہیں۔ اور خلاق عالم کی ذات ان تمام عیبوں سے بلند و بالا اور مبرا و منزہ ہے۔

(بحار الانوار جلد ۲) ابی حمزہ کہتے ہیں کہ میں نے جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے آیت: "کل شیء هالك الا وجهه" (قصص: ۸۸) کے متعلق دریافت کیا۔ آپؑ نے فرمایا: ان الله اعظم من ان یوصف بالوجه و لکن معناه کل شیء هالك الا دینه۔ خداوند عالم کی شان اس سے اعلیٰ و ارفع ہے کہ اس کی چہرہ کے ساتھ توصیف کی جائے۔ آیت کا معنی یہ ہے: ہر چیز ہلاک ہوجائے گی سوائے اس کے دین کے۔ (توحید شیخؒ) ابن مُغیرہ بیان کرتے ہیں کہ ہم حضرت صادق علیہ السلام کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ ایک آدمی نے آپؑ سے اسی آیت (کل شیء هالك) کے معنی دریافت کیے، آپؑ نے فرمایا: "نحن وجه الله الذی یؤتی منه"۔ اس "وجہ" سے مراد ہم ہیں۔ جن کے ذریعہ خدا تک رسائی ہوتی ہے۔ (بحار الانوار جلد ۲، توحید وغیرہ)

ولیس یرد فی الاخبار الآحاد التی یشنع بھا اھل الخلاف	جن آیات کا تذکرہ ہم نے اس باب میں کیا ہے اور جن سے بظاہر تشبیہ کا وہم پیدا ہوسکتا ہے، ان کے الفاظ کے مترادف شیعہ کتب و احادیث

اسی طرح مُصنّف کے تمام بیان کردہ معانی و مفاہیم کی تائید میں بکثرت روایات موجود ہیں جو ان کی کتاب توحید اور بحار الانوار جلد ۲، تفسیر برہان وغیرہ تمام کتب مُعتبرہ میں مل سکتی ہیں۔ مگر ہم بنظرِ اختصار اسی مقدار پر اقتصاء کرتے ہیں۔ شائقین تفصیل مذکورہ بالا کتب کی طرف رجوع کریں۔

جن آیاتِ شریفہ میں مکر، خدیعہ اور استہزاء وغیرہ الفاظ کا اطلاق باری تعالیٰ پر ہوا ہے یہ اطلاق "من باب المجاز و المشاکلہ و المقابلۃ" ہے۔ یعنی کفار کے مکر، خدیعہ و استہزاء وغیرہ افعال شنیعہ کے بدلہ پر انہی الفاظ کا اطلاق کیا گیا ہے۔

فریقین کے علماء کی یہ تحقیق ہے کہ خداوند عالم کے اسماء باعتبار غایات و بلحاظ نتیجہ لیے جاتے ہیں نہ کہ باعتبار مبادی و مآخذ، مثلاً: خداوند عالم رحمٰن و رحیم ہے اور رحمت کے لغوی معنی ہیں: دل کی وہ رقت و نرمی، جو لطف و رحمت کی مقتضی ہو۔ اب اگر اس کے مبدأ کے اعتبار سے معنی لیے جائیں تو خدا کے لیے دل ثابت کرنا پڑے گا۔ اگر دل ثابت ہوگیا تو اس سے اس کا جسم ہونا بھی لازم آئے گا جو کہ محال ہے۔ پس ماننا پڑے گا کہ وہ رحمٰن ہے باعتبار نتیجہ و غایت کے، یعنی لطف و مرحمت کرنے والا ہے۔ (بیضاوی جلد ۱ صفحہ ۴ طبع مصر)

یہی حال خدا کے قہر و غضب کا ہے۔ اور یہی کیفیت زیر بحث آیات مبارکہ میں "مکر و خدیعہ" وغیرہ الفاظ کے اطلاق کی ہے کہ خلاقِ عالم ان لوگوں کو جو اپنے زعم باطل میں خدا کے ساتھ مکر و فریب اور تمسخر و استہزاء کرتے ہیں ان کے ان افعال شنیعہ اور حرکات قبیحہ کی وہی جزا دیتا ہے جس کے وہ مستحق ہیں۔ چونکہ ان افعال کی جزا ان افعال سے ملتی جلتی ہے، لہٰذا مجازاً اُس پر مکر وغیرہ الفاظ کا اطلاق کر دیا گیا ہے۔ اسے اِصطلاحِ علمِ بدیع میں "مشاکلہ" کہا جاتا ہے۔ جیسے یہ ارشادِ قدرت اسی بنا پر ہے: "وَ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا" (سورۃ حٰمٓ شوریٰ: ۴۰) کہ برائی کی جزاء بھی اسی کی طرح برائی ہے۔ حالانکہ واضح ہے کہ جزاء میں کوئی برائی نہیں ہوتی۔

نیز اس آیت میں بھی یہی مشاکلہ کارفرما ہے: "فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ" (سورۃ البقرہ: ۱۹۴) جو شخص تم پر ظلم و تعدی کرے تم بھی اس پر اسی طرح ظلم و تعدی کرو۔ حالانکہ ظالم کا مقابلہ اور دفاع قطعاً ظلم نہیں ہے مگر اسے بطور مشاکلہ و مماثلہ مجازاً ظلم کہا

الا بمثل هذه الالفاظ و معانیها معانی الفاظ القرآن	میں بعض ایسی اخبار بھی پائی جاتی ہیں جن پر شیعوں کے بعض مخالفین اور بے دین لوگ حملہ کرتے ہیں۔ ان کا مطلب بھی وہی مراد لیا جائے گا جو متذکرہ بالا آیات میں پیش کیا جا چکا ہے۔

گیا ہے۔ اس قسم کے محاورات کلام عرب میں شائع و ذائع ہیں۔ کما لا یخفی علی من له ادنی المام بکلام العرب۔ و اسماء الله تعالیٰ انما توخذ باعتبار الغایات التی هی افعال دون المبادی التی تکون انفعالات۔ (بیضاوی جلد ۱ صفحہ ۴)

اہل سنت کے علماء محققین کی بھی یہی تحقیق ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر بیضاوی جلد ۱ صفحہ ۱۹ طبع......

یجازیهم علی استهزائهم سمی جزاء الاستهزاء باسمه کما سمی جزاء السیئة السیئة

اما المقابلة باللفظ او لکونه مماثلا له فی القدر کذا فی التفسیر

الکشاف جلد ۱ صفحہ ۳۵ طبع مصر سمی

جزاء الاستهزاء باسمه کقوله و جزاء

سیئة سیئة مثلها و من

اعتدی علیکم

فاعتدوا

علیه

ان

هذه تذکرة

فمن شاء اتخذ الی ربه سبیلا

باب الاعتقاد
فی صفات الذات وصفات الافعال

قال الشیخ ابوجعفر اعتقادنا فی صفات الذات هوان کلما وصفت الله تعالیٰ من صفات ذاته فانما نرید بکل صفة منہا نفی ضدها عنه عزو جل و نقول لم یزل الله عزو جل سمیعا بصیرا علیما

دُوسرا بابؒ
خداوند کریم کی صفاتِ ذات اور صفاتِ فعل

حضرت شیخ ابوجعفر ابن بابویہ رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جب ہم خدا کی کوئی ایسی صفت بیان کرتے ہیں جس کا تعلّق اس کی ذات سے ہوتا ہے تو ہماری غرض اس مقام پر اس صفت کے ضد کی نفی کرنا ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا ہمیشہ سے سمیع و بصیر ہے۔ علیم و حکیم ہے صاحب قدر و عزت ہے اور ایسا زندہ قائم ہے کہ اسے زوال

دُوسرا بابؒ صفاتِؒ ذاتؒ اور صفاتِؒ فعل کے بیان میںؒ

بالفاظ سہل وسادہ صفاتِ خداوندی کی تین قسمیں ہیں: ① کیونکہ وہ صفات یا تو ذات ایزدی کے لیے ہمیشہ ثابت ہوں گی ② یا ہمیشہ اس سے منفی ہوں گی ③ یا کبھی ثابت اور کبھی منفی ہوں گی۔ **پہلی قسم** کی صفات کا تعلّق چونکہ ذاتِ باری سے ہے، اس لیے ان کو ① صفاتِ ذاتیہ اور ② صفاتِ کمالیہ ③ صفاتِ جمالیہ ④ صفاتِ حقیقیہ اور ⑤ صفاتِ ذات الاضافہ کہا جاتا ہے۔

اور یہ بنابر مشہور آٹھ ہیں: ① قدرت ② علم ③ حیات ④ ارادہ ⑤ ادراک ⑥ قدم ⑦ تکلم ⑧ صدق۔ اگرچہ عندالتحقیق خداوند عالم کی صفاتِ کمالیہ بے شمار اور غیر محدود ہیں۔ جیسا کہ اس مطلب پر سابقہ مباحث میں تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جاچکی ہے اور یہ امر بھی ثابت کیا جاچکا ہے کہ چونکہ یہ صفات عین ذات ہیں۔ یعنی ذات اور صفات میں کسی وقت بھی تفکیک و جدائی متصوّر نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا جس طرح ذات ایزدی کی کنہ حقیقت تک ہمارے عقول وافہام کی رسائی ممکن نہیں، اسی طرح ان صفات کی حقیقت تک بھی رسائی ناممکن ہے۔ اسی بنا پر حضرت مُصنّف علام نے فرمایا ہے کہ جب ہم خداوند عالم کو ان صفات کے ساتھ متّصف کرتے ہیں تو درحقیقت مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ان صفاتِ جمیلہ کی اضداد کی نفی کی جائے۔ مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ خداوند عالم ہے تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ جاہل نہیں ہے اور جب یہ کہا جاتا ہے کہ خدا قادر ہے تو مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ عاجز نہیں ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ ورنہ ہم علم و قدرت خداوندی کی اصل حقیقت و کیفیّت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اس مطلب

حکیما قادرا عزیزا حیا قیوما واحدا قدیما و ھذہ صفات ذاتہ و لا تقول انہ عزوجل لم یزل خلاقا فاعلا شائیا مریدا راضیا ساخطا رازقا	نہیں، وہ قدیم ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ۔ یہ سب صفتیں اس کی ذات سے متعلق ہیں اور عین ذات کہلاتی ہیں ۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ خداوند عالم ازل سے ہی خالق اور شروع سے ہی فاعل ہے ۔ اور اس کا ارادہ و مشیّت ہمیشہ سے اپنی مخلوق کے ساتھ متعلق رہا ہے ۔ وہ ابتدا سے ہی (بعض پر) راضی ہے کسی پر ناراض ہے ۔

جلیل کی تفصیل بھی پہلے گزر چکی ہے ۔

دوسری قسم کی صفات کو صفاتِ سلبیہ کہا جاتا ہے، جن کا تفصیلی تذکرہ سابقہ مباحث میں ہو چکا ہے ۔
تیسری قسم کی صفات کو صفاتِ فعلیہ اور صفات اضافات محضہ کہا جاتا ہے ۔ کیونکہ ان کا تعلق فعل خداوندی کے ساتھ ہوتا ہے نہ کہ ذات کے ساتھ جیسے خالق و رازق و محیی اور ممیت وغیرہ صفات ۔ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ خداوند عالم سے خلق و رزق وغیرہ افعال صادر نہیں ہوئے تھے، لہٰذا اس وقت وہ خالق و رازق اور محیی و ممیت نہیں تھا ۔ ہاں بعد میں جب اس نے یہ کام انجام دیئے تو وہ خالق و رازق کہلایا...... اسی جامع بیان سے صفاتِ ذاتیہ اور صفاتِ فعلیہ کا باہمی فرق بھی نمایاں ہو جاتا ہے ۔

صفاتِ ذات و فعل کا باہمی فرق

اس مقصد کی بقدر ضرورت توضیح یہ ہے کہ وہ صفاتِ جلیلہ جن کا ذاتِ باری میں ہمیشہ پایا جانا ضروری ہو، اور ان کی اضداد سے اس کا متّصف ہونا بوجہ لزوم نقص در ذات درست نہ ہو ۔ انھیں صفاتِ ذات کہا جاتا ہے، جیسا علم و قدرت اور حیات و امثالہا ۔ کیونکہ خلاقِ عالم کو کسی وقت بھی ان صفات کی اضداد یعنی جہل و عجز اور موت سے متّصف نہیں کیا جا سکتا ۔ اس لیے کہ اس سے اس کی ذات میں نقص لازم آتا ہے ۔ اور وہ صفات جن سے اس کا ہمیشہ متّصف ہونا ضروری نہ ہو بلکہ ان کی اضداد سے بھی اسے متّصف کرنا صحیح ہو، کیونکہ اس سے ذات باری میں کوئی نقص لازم نہیں آتا ۔ تو ان کو صفتِ فعل کہا جاتا ہے ۔ جیسے خلق و رزق و امثالہا ۔ کیونکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ ایک وقت وہ تھا کہ خداوند عالم موجود تھا، لیکن بالفعل خالق اور رازق نہ تھا، بلکہ اب بھی بعض چیزوں کا خالق نہیں ہے ۔ یہ ہے صفاتِ ذات جو کہ عین ذات ہیں اور صفاتِ فعل میں جو کہ زائد بر ذات ہیں، باہمی فرق جو کہ مُصنّف علام کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے اور حضرت ثقۃ الاسلام کلینی قدس سرہ نے بھی اصول کافی میں

وقاہا متکلما لان ھذہ الصفات افعالہ و ھی محدثہ لا یجوز ان یقال لم یزل اللہ موصوفا بھا

وہ برابر ہمیشہ سے روزی دے رہا ہے، سخاوت کر رہا ہے اور ازل سے ہی کلام پیدا کرنے والا ہے۔ اس قسم کی تمام صفات فعلی کہلاتی ہیں اور حادث ہیں۔ اس لیے یہ مناسب نہیں کہ خداوند عالم کو ایسی صفات کے ساتھ ہمیشہ سے متصف مانا جائے۔

میں ان کے درمیان یہی فرق بیان فرمایا ہے۔ اور بھی بہت سے محققین نے اسی طرح افادہ فرمایا ہے۔ بہر حال صفاتِ باری کا مبحث بہت طویل الذیل اور معرکۃ الآراء ہے۔ یہاں اس سے زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ اور نہ ہی ضرورت۔ مزید تفصیل کے شائقین کتب مبسوط مثل "عماد الاسلام" وغیرہ کی طرف رجوع کریں۔

هٰذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ
وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ
لِلْمُتَّقِينَ

باب الاعتقاد فی التکلیف

قال الشیخ ابوجعفر اعتقادنا فی التکلیف هوان اللہ تعالیٰ لم یکلف عبادہ الا دون ما یطیقون کما قال تعالیٰ: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا

تیسرا بابؒ
بندوں کی شرعی تکلیف کس قدر ہے؟

جناب شیخ ابوجعفر فرماتے ہیں کہ ہم اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ خدائے لم یزل نے اپنے بندوں کوان کی طاقت سے کم ہی تکلیف دی ہے۔ جیسا کہ وہ خود بھی ایک مقام پر ارشاد فرماتا ہے: "لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا" (بقرہ:۲۸۶) یعنی اللہ کسی نفس کواس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

تیسرا بابؒ تکلیف شرعی کے حسن اور اس کی مقدار کے بیان میںؒ

علماء متکلمین نے "تکلیف" کی ماہیت وحقیقت معلوم کرنے میں بڑی موشگافیاں کی ہیں۔ جن کا یہاں نقل کرنا چنداں مُفید نہیں ہے، بہر حال اس کی شرعی تعریف یہ ہے: "خداوند عالم کا اپنے بندوں کوبعض ایسے افعال کی بجا آوری یاان کے ترک کرنے کاحکم دیناجن میں فی الجملہ مُشقّت ہو،اور یہ حکم وعدۂ ثواب یاوعیدِ عقاب پر بھی مشتمل ہو"۔ یہ تکلیف دو قسم کی ہے۔ ایک تکلیفِ عقل، دوئم تکلیفِ شرعی۔ ان ہر دوتکالیف کی تفاصیل بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

شرعی تکلیف کی خوبی وعمدگی

جہاں تک شرعی تکلیف کے حسن اور اس کی عمدگی کاتعلّق ہے وہ اربابِ دانش وبینش پر پوشیدہ نہیں ہے۔ اگر چہ اس سلسلہ میں اجمالاً اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ یہ تکلیف خدائے حکیم نے عائد کی ہے۔ اورسابقہ مباحث میں ثابت کیا جاچکاہے کہ خدائے تعالیٰ کاکوئی فعل عبث اور حکمت ومصلحت سے خالی نہیں ہوتا، اور نہ ہی وہ کسی فعل قبیح وشنیع کاارتکاب کرتاہے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ یہ تکلیف ضرور کسی نہ کسی غرض وغایت کے تحت ہی عمل میں آئی ہے۔ ورنہ اس کاعبث ہونالازم آئے گا۔ اور خدا ہرگز کوئی عبث کام نہیں کرتا۔) اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾ (سورۃ المومنون:۱۱۵) ہاں البتہ اس کافائدہ مُکلّف ہی کی طرف عائد ہوتاہے نہ کہ خدا کی طرف۔ کیونکہ وہ ہر چیز سے بےنیاز ہے۔ مزید برآں ہم ذیل میں اس کی حسن وخوبی پر تنبیہ غافل وتنشیط عاقل کی خاطر

و الوسع دون الطاقة و	اور وسعت طاقت سے کم درجہ کو کہا جاتا ہے۔ امام جعفر صادق علیہ
قال الصادق علیه السلام	السلام فرماتے ہیں بخدا اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے بندوں کو ان کی
و الله ما کلف الله العباد	طاقت سے بھی کم تکلیف دی ہے۔

ایک تفصیلی دلیل ذکر کرتے ہیں۔ جس سے شرعی تکلیف کے فوائد وعوائد نکھر کر آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہوجائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تکلیف ہی وہ خدائی عطیۂ کبریٰ اور موہبتِ عظمیٰ ہے کہ جس کی وجہ سے حضرت انسان اور عام حیوان میں امتیاز قائم ہے، ورنہ صاف ظاہر ہے کہ اگر انسان سے حلال و حرام، حسن وقبح اور صحیح وغلط امور کے سمجھنے اور ان کی پابندی کرنے کی ذمہ داری ختم ہوجائے اور اس کا مطمحِ نظر صرف یہ ہو کہ جو چیز کھانے کے قابل مل جائے اس سے تنورِ شکم کو پُر کرلے اور تسکین شہوت کے لائق جو چیز مل جائے اس سے جنسی خواہش کی تسکین کرلے، تو پھر اس میں اور ایک حیوان میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے، بلکہ اس صورت میں اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو ایسا انسان حیوان کے برابر ہی نہیں بلکہ اس سے بھی بدتر ہوجاتا ہے۔ چنانچہ ارشادِ رب العزت بھی اس کا مؤید ہے: أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ (سورۃ الاعراف:۱۷۹) کہ ایسے لوگ چوپایوں کی مثل ہیں، بلکہ ان سے بھی بدتر۔ کیونکہ حیوان اگر کھانے اور شہوت مٹانے میں حلال وحرام اور جائز وناجائز کا امتیاز نہیں کرتا تو وہ عقل وادراک کی قوت نہ ہونے کی وجہ سے مجبور ومعذور ہے۔ لیکن حضرت انسان اگر عقل وشعور رکھنے کے باوجود اس تفریق وتمیز کا قائل وعامل نہ ہو تو یقیناً عقل سلیم یہی فیصلہ کرتی ہے کہ وہ حیوانات وحشرات سے بھی بدتر ہے۔ لہٰذا اس نعمتِ عظمیٰ پر خلاق عالم کا جس قدر شکریہ ادا کیا جائے وہ کم ہے کہ اس نے نعمتِ عقل کے ساتھ دولت تکلیف سے بھی نوازا ہے۔ تکلیف کے اسی حسن اور اس کی اسی خوبی کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے امام چہارم حضرت امام زین العابدین علیہ السلام صحیفہ کاملہ کی پہلی دعا میں فرماتے ہیں:

الحمد لله الذی لو حبس عن عباده معرفة حمده علی ما ابلاهم من مننه المتتابعة و اسبغ علیهم من نعمه المتظاهرة لتصرفوا فی مننه فلم یحمدوه و توسعوا فی رزقه فلم یشکروه و لو کانوا کذلك لخرجوا من حدود الانسانیة الی حد البهیمیة فکانوا کما وصف فی محکم کتابه ان هم الا کالانعام بل هم اضل سبیلا

"تمام تعریفیں اس خدا کے لیے ہیں کہ جو اگر اپنے بندوں کو اپنے حمد وشکر کی معرفت سے باز رکھتا باوجود ان مسلسل عطیات کے جو اس نے مرحمت فرمائے ہیں، اور باوجود

الّا دون ما یطیقون لانه انما	اسی بنا پر اس نے دن رات میں صرف پانچ نمازیں اور سال بھر
کلفهم فی کل یوم و لیلة	میں صرف ماہِ رمضان المبارک کے تیس روزے اور دو سو درہموں

اپنی اِن پے در پے نعمات کے جو اس نے ارزانی فرمائی ہیں تو وہ ان کے انعامات میں تصرف تو کرتے مگر اس کی حمد وثنا نہ کرتے اور اس کے رزق سے نفع اندوز ہوتے مگر اس کا شکر ادا نہ کرتے اور اگر وہ اس طرح کرتے تو پھر اس طرح ہوجاتا کہ انسانیت کے حدود سے نکل کر چوپاؤں کے حدود میں داخل ہوجاتے اور اس طرح ہوجاتے جس طرح خداوند عالم نے اپنی محکم کتاب میں ارشاد فرمایا ہے کہ وہ چوپاؤں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ راہِ راست سے بھٹکے ہوئے ہیں"۔
اسی لیے تو یہ کہا گیا ہے: ؎

لعمرک ما الادیان الا سعادة
و ما الناس لو لا الدین الا بهائم

"تیری زندگی کی قسم یہ دین سراسر سعادت ہی سعادت ہے اور اگر یہ دین نہ ہو (جو کہ چند تکالیف شرعیہ کے مجموعہ کا نام ہے) تو لوگ مثل چوپاؤں کے ہوکر رہ جائیں"۔

شرعی تکلیف کے شرائط

خالق حکیم نے ایسا بھی نہیں کیا کہ ہر جائز و ناجائز غلط اور صحیح تکلیف ہر ایک شخص پر ہر ایک حال میں ٹھونس دی ہو، بلکہ جب تکلیف و مُکلّف کے شرعی حدود اور اس کے قواعد وضوابط پر ایک اجمالی نگاہ ڈالی جاتی ہے تو مُحسن حقیقی کے انعام و احسان کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ اور ارشادِ قدرت: "وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ" (الحج: ۷۸) اور "يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ" (البقرة:۱۸۵) کی حقانیت وصداقت اجاگر ہوجاتی ہے اور اسلام کا دین فطرت ہونا روزِ روشن کی طرح واضح و آشکار ہوجاتا ہے۔

مخفی نہ رہے کہ اس سلسلہ میں چار قسم کی شرائط موجود ہیں۔ بعض کا تعلق خود مُکلِف (تکلیف دہندہ) کی ذات سے ہے اور بعض کا ربط مُکلّف (جس پر تکلیف عائد کی جارہی ہے) سے ہے اور بعض کا واسطہ خود تکلیف اور بعض کا ارتباط مُکلّف بہ (فعل) کے ساتھ ہے۔ ہم یہاں بنظرِ اختصار قسم اول کے شرائط کو نظر انداز کر کے دیگر بعض شرائط کا اجمالاً ذکر کرتے ہیں:

خمس صلوة و کلفهم فی السنة صیام ثلثین یوما و کلفهم فی کل	میں پانچ درہم سالانہ زکوٰۃ اور ساری عمر میں صرف ایک دفعہ حج کو واجب اور فرض قرار دیا ہے۔

شرط اول: یہ کہ مُکلّف موجود ہو۔ کیونکہ معدوم پر کسی قسم کی تکلیف عائد کرنا بالبداہت باطل ہے۔
شرط دوم: یہ کہ مُکلّف بالغ و عاقل ہو۔ کیونکہ اطفال و مجانین پر شرعی تکالیف عائد کرنا عقلاً قبیح اور پھر مخالفت کی صورت میں ان کو سزا دینا سراسر شنیع اور ظلم صریح ہے۔ وما ربك بظلام للعبید۔ (فصّلت:۴۶)

شرط سوم: یہ کہ مُکلّف تکالیف کا مفہوم و مطلب سمجھنے کی اہلیت ولیاقت رکھتا ہو۔ اور اسے اس طرح مطلب سمجھا بھی دیا جائے کہ وہ سمجھ جائے۔ تکلیف قبل البیان درست نہیں ہے۔ وما ارسلنا من نبی الا بلسان قومه...... (ابراہیم:۴) وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا۔ (اسراء:۱۵)

شرط چہارم: یہ کہ وہ تکلیف مُکلّف کے لیے ممکن العمل ہو۔ اور اس کی طاقتِ برداشت سے باہر نہ ہو۔ کیونکہ کسی شخص کو اس کی طاقت برداشت سے زیادہ تکلیف دینا سراسر ظلم و جور ہے۔ اور الطاف و مراحم ربانیہ کے منافی ہے۔ مثلاً ایک زمین گیر اپاہج کو دوڑنے یا بلا اسباب ہوا میں اڑنے کی تکلیف دینا، یا کسی انسان کو پہاڑ سر پر اٹھانے کا حکم دینا، یا اسے اس امر کا پابند کرنا کہ خدا کی طرح کوئی مخلوق پیدا کرے اور پھر تعمیل نہ کرنے کی صورت میں اسے سزا دینا۔ اس امر کی قباحت و شناعت میں کیا کلام ہوسکتا ہے؟ اس لیے خداوند عالم بار بار ارشاد فرماتا ہے: "لا یکلف الله نفسا الا وسعها"۔ (بقرہ:۲۸۶) خدائے رحیم کسی نفس کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ ان مُسلمانوں کی ذہنیت پر تعجب ہے جو تکلیف مالا یطاق کو جائز قرار دیتے ہیں۔ وہ افعال جو طاقت و قدرت کے تحت ہیں، اور وہ افعال جو طاقت و قدرت سے باہر ہیں، ان کا باہمی فرق تو گدھے بھی سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے ابوالہذیل علاف مُعتزلی کہا کرتا تھا کہ: "حمار بشر اعقل من بشر لان حمار بشر لو اتیت به الی جدول صغیر و ضربته فانه یطفره و لو اتیت به الی جدول کبیر و ضربته فانه لا یطفره و یروغ عنه لانه یفرق بین ما یقدر علی طفره و بین ما لا یقدر علیه و بسر لا یفرق بین المقدور و غیر المقدور" (استقصاء النظر صفحہ ۸) بشر (اشعری) کا گدھا خود بشر سے زیادہ عقلمند ہے۔ کیونکہ اگر تم اس کے گدھے کو کسی چھوٹے سے نالہ پر لے جاؤ اور اسے عبور کرنے کے لیے ایڑ لگاؤ تو وہ اسے جست لگا کر عبور کر جائے گا لیکن اگر اسے کسی بڑے نالہ پر لے جاؤ تو اسے جس قدر مارو پیٹو وہ ہرگز جست نہیں لگائے گا۔ اس

مائی دراھم خمسة دراھم و کلفھم فی العمر حالانکہ بندوں کی طاقت اس سے زیادہ ہے۔
حجة واحدة و ھم یطیقون اکثر من ذلك

....

لیے کہ وہ سمجھتا ہے کہ کہاں جست لگا کر عبور کرنے پر قادر ہے اور کہاں قادر نہیں ہے؟ مگر جناب بشر مقدور اور غیر مقدور میں کوئی فرق نہیں سمجھتا۔ اس لیے تکلیف مایطاق اور تکلیف مالایطاق کو جائز قرار دیتا ہے۔ و ما قدروا اللہ حق قدرہ...... (انعام:۹۱) لھم قلوب لا یفقھون بھا۔ (اعراف:۱۷۹)

شرط پنجم: یہ کہ وہ تکلیف ایسے امر کے متعلق ہو کہ اسے اس کی بجا آوری پر ثواب اور تعمیل نہ کرنے کی صورت میں عذاب کا استحقاق حاصل ہو۔ کیونکہ اگر جزاء وسزا نہ ہو تو پھر محسن و مسیٔ اور صالح وطالح کا مساوی ہونا اور اس طرح تکلیف کا عبث ہونا لازم آئے گا۔ افنجعل المسلمین کالمجرمین ...... (قلم:۳۵) مالکم کیف تحکمون۔ (یونس:)

شرط ششم: یہ کہ وہ تکلّف جو کسی امر کے بجالانے کے متعلق ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ امر حرام نہ ہو، اور اگر کسی امر کے ترک کے متعلق ہے تو وہ واجب نہ ہو۔ کیونکہ اگر ایک ہی امر ایک ہی اعتبار سے واجب بھی ہو اور حرام بھی ہو تو اس طرح اجتماعِ ضدین لازم آئے گا جو کہ محال ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ مطلب بالکل واضح ولائح ہو جاتا ہے کہ ان شرائط کی موجودگی میں خالق حکیم پر تکلیف کا عائد کرنا فقط جائز ہی نہیں، بلکہ ضروری ولازمی ہے۔ ورنہ مخلوق کی خلقت کا عبث وبے فائدہ ہونا لازم آئے گا جو کہ بالضرورة باطل ہے۔ "اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰکُمۡ عَبَثًا وَّاَنَّکُمۡ اِلَیۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ" (سورة المومنون:۱۱۵) (کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تمھیں بے فائدہ پیدا کیا ہے اور تم ہماری بارگاہ میں پلٹ کر نہیں آؤ گے؟)...... وَ مَا خَلَقۡنَا السَّمَآءَ وَ الۡاَرۡضَ وَ مَا بَیۡنَہُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِکَ ظَنُّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا ۚ فَوَیۡلٌ لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنَ النَّارِ (سورة صٓ:۲۷) خدا تعالیٰ نے زمین و آسمان کی خلقت عبث نہیں فرمائی۔ ایسا خیال کافر ہی کرتے ہیں۔

نیز اگر خالق اکبر انسانی خلقت میں قوائے شہویہ و غضبیہ وغیرہ محرکاتِ معصیت ودیعت فرما کر گناہوں سے روک تھام کا کوئی انتظام نہ فرمائے تو اس طرح خالق عالم پر اغراء برامر قبیح اور تحریص بر فعل شنیع کرنے کا سنگین الزام عائد ہوگا۔ جس سے اس کی شانِ ربوبیت کہیں اجل وارفع ہے۔ تعالیٰ اللہ عن ذلك علوًا کبیرًا۔

وَ مَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَ الۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ (ذاریات:۵۶)

باب الاعتقاد

فی افعال العباد

قال الشیخ اعتقادنا فی افعال العباد انہا مخلوقۃ خلق تقدیر لاخلق تکوین و معنی ذلک انہ لم یزل اللہ عالماً بمقادیرھا

چوتھا باب

افعال العباد کے متعلّق ہمارا عقیدہ

حضرت شیخ ابو جعفر علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ بندوں کے افعال کے متعلّق ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ وہ تقدیری خلقت کے اعتبار سے پیدا کیے ہوئے ہیں نہ کہ خلقت تکوینی کے لحاظ سے اور خلق تقدیری کے معنی یہ ہیں کہ خداوند عالم ہمیشہ سے اپنے بندوں کے افعال اور ان کی اچھائی و برائی کے اندازوں سے واقف و آگاہ رہا ہے۔

چوتھا باب

افعال العباد کے متعلّق ہمارا عقیدہ

یہ مسئلہ فی الحقیقت مسئلہ "جبر واختیار" کا ایک شُعبہ ہے، جو کہ اسلامی مسائل میں سے معرکۃ الآراء مسئلہ ہے اور قدیم الایام سے مُسلمانوں کے درمیان اختلاف کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ حالانکہ اگر بنظر عدل وانصاف دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ اس قدر پیچیدہ نہ تھا جتنا کہ اسے بنا دیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص تعصّب وعناد کی پٹی آنکھوں سے اتار کر سنجیدگی کے ساتھ اس موضوع پر غور وفکر کرے تو حقیقتِ حال اس پر منکشف ہو جاتی ہے۔ مُصنّف علام نے جو یہ فرمایا ہے کہ بندوں کے افعال بہ خلق تقدیری مخلوقِ خدا ہیں نہ کہ خلق تکوینی، اور اس کا مطلب انھوں نے یہ بیان فرمایا ہے کہ خدا نے ان کو خود ایجاد و خلق نہیں فرمایا۔ ہاں وہ ہر ایک فعل کو اس کے صادر ہونے اور ظہور پذیر ہونے سے پہلے جانتا ہے۔ اس پر حضرت شیخ مُفید اعلیٰ اللہ مقامہ نے یہ کہہ کر کہ یہ ایک خبر ضعیف کا مضمون ہے، بہت لے دے فرمائی ہے۔ حالانکہ اس قسم کی مُتعدّد روایات سوم بحار الانوار وغیرہ کتب احادیث میں موجود ہیں۔ دو روایتیں ملاحظہ ہوں:

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "افعال العباد مخلوقۃ للہ خلق تقدیر لا خلق تکوین واللہ خالق کل شیء" اسی طرح رسالہ ذہبیہ میں حضرت امام رضا علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: "وافعال العباد مخلوقۃ خلق تقدیر لا خلق تکوین"۔ بہر حال جب دونوں بزرگواروں کا مقصد ایک ہی

ہے کہ خداوند عالم ہمارے افعال کا خالق وموجد نہیں ہے، ہاں وہ ہمارے افعال اور ہمارے آغاز و انجام کا عالم ضروری ہے، تو پھر یہ بحث کرنا کہ یہ ایک حدیث کا مضمون ہے یا متعدد احادیث کا مفاد ہے آیا "خلق" بمعنی "علم" استعمال ہوا ہے یا نہیں؟ اسے محتاط سے محتاط لفظوں میں بظاہر لفظی نزاع ہی کہا جاتا ہے۔ بہرکیف اس مسئلہ کی افادیت واہمیت کے پیشِ نظر ہم اس پر قدرے تفصیلی گفتگو کرکے اس کے جملہ پہلوؤں پر کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

افعالِ تکوینی وافعالِ تشریعی کا باہمی اِمتیاز

قبل اس کے کہ اصل موضوع پر گفتگو کی جائے بطور تمہید یہ جاننا ضروری ہے کہ بندوں کے افعال دو قسم کے ہیں۔ ① کچھ "افعال تکوینیہ" ہیں جیسے صحت و مرض، قد و قامت کی درازی یا کوتاہی اور رنگ کی سفیدی یا سیاہی، خوبصورتی یا بدصورتی وغیرہ۔ اور ② کچھ "افعال تشریعیہ" ہیں۔ جیسے نماز پڑھنا، روزے رکھنا یا زنا کاری وشراب خواری کا ارتکاب کرنا، وامثالہا۔ پہلی قسم کے بارہ میں تمام مکاتیب فکر کے ساتھ تعلق رکھنے والے مُسلمانوں کا اتفاق ہے کہ ان میں انسان کے ارادہ واختیار کو کوئی دخل نہیں، بلکہ وہ ان افعال میں مجبور محض ہے۔ ہاں جو کچھ اختلاف ہے وہ دوسری قسم کے افعال میں ہے۔ اس سلسلہ میں امتِ اسلامیہ کے اندر تین قول ہیں: ① جبر یعنی یہ کہ انسان بالکل بے اختیار ہے وہ جو کچھ نیک یا بد کرتا ہے فی الحقیقت اس سے خود خدا کراتا ہے۔ ② تفویض یعنی یہ کہ جو کچھ کرتا ہے بندہ ہی کرتا ہے۔ خدا کے اختیار یا اس کی قدرت کو اس میں کچھ بھی دخل نہیں ہے۔ ③ نہ کامل جبر اور نہ مکمل اختیار۔ "بل الامر بین الامرین" حقیقت اور دونوں نظریوں کے بین بین ہے۔ یہ تیسرا قول مذہب امامیہ کا مُختار ہے۔ پانچویں باب میں اس کی کماحقہ وضاحت کی جائے گی۔ ان شاء اللہ۔ یہاں فقط جبر واختیار کے اقوال کی رد کرکے تیسرے قول کے فی الجملہ مُختار ہونے کی تائید کرنا مقصُود ہے۔ اس پر ذیل میں چند ادلۂ عقلیّہ ونقلیّہ قائم کیے جاتے ہیں۔

افعال کی اوپر جو تقسیم کی گئی ہے، یہ کلام معصومؑ سے ماخوذ ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے یہی جبر واختیار کا مسئلہ دریافت کیا تو آنجنابؑ نے فرمایا: "ما استطعت ان تلوم العبد علیه فهو فعله و مالم تستطع ان تلوم العبد علیه فهو فعل الله يقول الله للعبد لم عصيت لم فسقت لم شربت الخمر لم زنيت فهذا افعل العبد و لا يقول لم مرضت لم قصرت لم ابيضضت لم اسوددت لانه من فعل الله فی العبد" (طرائف، بحار الانوار جلد۳) جس فعل پر تم بندہ کی ملامت کرسکو وہ

بندہ کا فعل ہے اور جس پر تم اس کی ملامت نہ کر سکو وہ اللہ سبحانہ کا فعل ہے۔ چنانچہ خداوند عالم بروز قیامت بندہ سے یہ باز پرس تو کرے گا کہ تونے کیوں نافرمانی کی؟ فسق و فجور کیوں اختیار کیا؟ شراب کیوں پی؟ زنا کیوں کیا؟ اس لیے کہ یہ بندہ کے افعال ہیں۔ لیکن خدا بندہ سے یہ نہیں پوچھے گا کہ تو مریض کیوں ہوا تھا؟ تیرا قد چھوٹا کیوں تھا؟ تو سفید کیوں تھا، اور تو سیاہ کیوں تھا؟ اس لیے کہ یہ خدا تعالیٰ کے افعال ہیں۔ اگرچہ دیدہ و دل رکھنے والے حضرات کے لیے اس نزاعی مسئلہ کا فیصلہ کرنے کے لیے امام عالی مقام کا یہی کلام حقیقت ترجمان کافی ہے۔ مگر ہم اس موضوع پر مزید تسلی و اطمینان کے لیے چند عقلی و نقلی دلائل قائم کرتے ہیں۔

نظریۂ جبر کی ردّ اور بندوں کے فاعل بااختیار ہونے پر ادلۂ عقلیہ

① **دلیل اول:** یہ کہنا کہ بندے اپنے افعالِ تکلیفیہ میں مجبور ہیں، بالبداہت باطل ہے۔ کیونکہ انسان کی حرکاتِ اختیاریہ جیسے اٹھنا، بیٹھنا، کھانا پینا، چلنا پھرنا وغیرہ اور حرکاتِ اضطراریہ مثل حرکت نبض اور حرکت مرتعش و رعشہ والے آدمی کی حرکت، اسی طرح مکان کی چھت سے بذریعہ سیڑھی اترنے والے شخص کی حرکت اور چھت سے گرنے والے کی حرکت کے درمیان جو فرق ہے وہ اس قدر واضح ہے کہ کوئی بھی عقلمند آدمی اس کا انکار نہیں کرسکتا۔ بلکہ بچے اور دیوانے بھی اسے سمجھتے ہیں۔ پس ہم پوچھتے ہیں کہ انسان جو اچھے کام مثلاً صوم و صلوۃ بجالاتا ہے یا برے کام، مثلاً زنا و چوری کا ارتکاب کرتا ہے، آیا اس کے یہ افعال از قسم حرکاتِ اختیاریہ ہیں یا از قسم حرکاتِ اضطراریہ؟ اس سلسلہ میں انسانی ضمیر و وجدان کا فیصلہ عیاں راچہ بیاں کا مصداق ہے۔ کل انسان علیٰ نفسہ بصیرۃ و لوالقی معاذیرہ۔ (قیامت: ۱۵)

② **دلیل دوم:** اگر انسان اپنے افعال میں مجبور ہوں اور درحقیقت فاعل خداوند عالم ہی ہو تو اس سے لازم آئے گا کہ انسانوں کی بجائے (معاذ اللہ) خود خداوند عالم کاذب و خائن اور فاسق و فاجر اور ظالم و جابر قرار پائے اور خود ہی حد و تعزیر کا مستحق ہو۔ اور انسانوں پر حد و تعزیر کو جاری کرنا اور ان کو سزا و جزا دینا محض ظلم اور بے انصافی پر مبنی ہو۔ تعالیٰ عما یقول الظالمون علوا کبیرا۔ ظلم ہے۔

③ **دلیل سوم:** اگر انسان اپنے اچھے اور برے کاموں میں فاعل مختار نہ ہوں تو لازم آئے گا کہ انبیاءؑ و مرسلینؑ کی غرضِ بعثت لغو و عبث ہو کر رہ جائے۔ کیونکہ اس صورت میں کافر و گنہگار لوگ بڑی جرأت و بے باکی کے ساتھ یہ کہہ کر انبیاءؑ کو خاموش کرسکتے ہیں کہ جب خدا ہی ہم سے کفر و عصیان کراتا ہے تو پھر ہم کس طرح ایمان لاسکتے ہیں۔ ــــ

در کوئے نیک نامی ما را گزر نہ دادند　　ما را نمی پسندی تغییر دہ قضا را

ہم تو خدا سے مقابلہ کی تاب وتوانائی نہیں رکھتے، تم جا کر خدائے عزوجل سے کہو کہ وہ ہم میں اسلام وایمان پیدا کرے۔

اہل انصاف بتائیں اس صورت میں انبیاء کرام علیہم السلام کے پاس سکوت وخاموشی سے بہتر اور کیا جواب ہوسکتا ہے؟ خلاصہ یہ کہ اس صورت میں ان کو ایمان لانے کی تکلیف دینے سے تکلیف مالایطاق لازم آتی ہے جس کا بطلان گزشتہ باب میں دلیل وبرہان سے کیا جا چکا ہے۔ ھذہ تذکرۃ فمن شاء اتخذ الی ربہ سبیلا۔

④ **دلیل چہارم**: اگر بندے اپنے افعال میں بااختیار نہ ہوں تو اس صورت میں مسئلہ ثواب وعقاب اور وجود جنت ونار اور انزال کتب وصحائف اور تشریع نظام شرایع سب لغو وبے فائدہ ہو کر رہ جائیں گے۔ کیونکہ اس صورت میں نہ کوئی اچھے کام کرنے پر مستحق مدح وثنا رہے گا اور نہ کوئی برا کام کرنے پر مستوجب سزا قرار پائے گا۔ حالانکہ قرآن کریم صالحین کی تعریف وتمجید اور کفار ومشرکین اور فاسقین کی مذمت وتنقید سے بھرا پڑا ہے۔ نیز اس طرح اول الذکر حضرات کے لیے جو وعدہ ہائے نعیم اور ثانی الذکر کے لیے جو وعیدہائے جحیم کی گئی ہیں اور اسی طرح دیگر قرآنی حقائق پر کیا اعتماد باقی رہ جاتا ہے؟ افنجعل المسلمین کالمجرمین مالکم کیف تحکمون۔ (سورۃ القلم: ۳۵)

⑤ **دلیل پنجم**: عقلی طور پر کوئی بھی انسانی فعل تین حال سے خالی نہیں ہے۔ ① یا تو بندے سے صادر ہوگا ② یا محض خدا سے سرزد ہوگا ③ یا خدا اور بندے کے اشتراک سے وجود میں آئے گا۔ اگر دوسری شق کو اختیار کیا جائے تو اس صورت میں گنہگار کو عذاب وعقاب کرنے میں سراسر ظلم وجور لازم آئے گا۔ کیونکہ اس بنا پر تو مدح یا مذمت جزا یا سزا کا حقدار خود خالق کردگار ہی قرار پاتا ہے جب گناہ خود خدا تعالیٰ نے کرایا ہے تو پھر آدمی کو سزا دینا چہ معنی دارد؟ اور اگر تیسری شق کو اختیار کیا جائے تو تب بھی یہی خرابی لازم آئے گی۔ کیونکہ اس صورت میں چونکہ خدا کی شرکت کے ساتھ فعل وجود میں آیا ہے اور خدا شریک غالب ہے، لہٰذا باوجود اشتراک عمل کے کمزور شریک کو سزا دینا اور اسے مورد الزام قرار دینا صریح ظلم ہے اور چونکہ خدائے قدوس کی ساحت اقدس ظلم وجور کی آلائش سے منزہ ومبرا ہے (وما یظلم ربک احدا۔ کہف: ۴۹) اس لیے ماننا پڑے گا کہ پہلی شق ہی صحیح ہے کہ بندہ ہی اپنے افعال کا خود فاعل ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ جزاء وسزا اور مدح ومذمت کا استحقاق رکھتا ہے۔

انا ھدیناہ السبیل اما شاکرا واما کفورا (دھر: ۳)

⑥ **دلیل ششم**: اگر انسان اپنے افعال میں مختار نہ ہو بلکہ اس کے اچھے اور برے افعال کا فاعل خدا ہی کو مانا جائے تو دریں صورت جہاں جہاں خداوند عالم نے ظالموں وکافروں اور گنہگاروں پر لعن طعن کیا ہے، جیسے: لعنة الله على الظالمين (اعراف: ۴۴) لعنة الله على الكاذبين (عمران: ۶۱) لعنة الله على الكافرين...... (بقرہ: ۸۹) وغیرہ تو اس لعنت کی بازگشت معاذ اللہ خود خدائے قدوس کی طرف ہوگی۔ اور وہی اس کا مستحق قرار پائے گا۔ تعالیٰ اللہ عما یقولون علوا کبیرا۔

اس موضوع پر ادلۂ شرعیہ

خداوند عالم نے قرآن مجید وفرقانِ حمید میں بچند وجہ عقیدۂ جبر کی نفی ورد فرمائی ہے۔

① **وجہ اول**: قرآن مجید میں بکثرت ایسی آیاتِ شریفہ موجود ہیں جن میں بالتصریح یا بالتلویح بندوں کا فاعل مختار ہونا بیان کیا گیا ہے۔ ذیل میں چند آیات بطورِ نمونہ مشتے از خروار پیش کی جاتی ہیں:

① لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (سورۃ البقرہ: ۲۵۶) "دین میں کوئی جبر واکراہ نہیں"۔

② اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۞ (سورۃ الدھر: ۳) "ہم نے انسان کو راہِ راست دکھا دیا ہے اب چاہے تو وہ شاکر بنے اور چاہے تو کافر بنے۔

③ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (سورۃ الکھف: ۲۹) اے رسولؐ! کہہ دو حق پروردگار عالم کی طرف سے ہے، جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے۔

④ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ۞ (سورۃ النباء: ۳۹) جو چاہے اپنے رب کی طرف رجوع کرے۔

صاحبانِ عقل و دانش غور فرمائیں کہ کس وضاحت وصراحت کے ساتھ انسان کے خود مختار ہونے کی ان آیات میں تصریح کی گئی ہے۔ جس فعل کا بجا لانا اور ترک کرنا اختیار میں ہو، اسی فعل کو ہی تو فعل اختیاری اور اس کے فاعل کو، فاعل مختار کہا جاتا ہے۔ بایں ہمہ جو شخص ایسی آیاتِ محکمات کو چھوڑ کر بعض متشابہ آیات کے ساتھ تمسک کرے تو اس کی کج فہمی اور کج سلیقگی کا کیا علاج؟ سچ ہے: فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ (سورۃ آلِ عمران: ۷) جن لوگوں کے دل ٹیڑھے ہوتے ہیں وہ فتنہ وفساد کی غرض سے متشابہات کی پیروی کرتے ہیں۔

② **وجہ دوم**: ایسی آیات بھی قرآن مجید میں بکثرت موجود ہیں جن میں خداوند عالم نے اپنی ذاتِ اقدس سے ظلم وجور اور کفر وشرک پر رضا مند ہونے کی نفی فرمائی ہے۔ دو چار آیاتِ مبارکہ بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

① وَ مَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ﴿۳۱﴾ (سورۃ المومن:۳۱) (ظلم کرنا تو بجائے خود) خداوند عالم اپنے بندوں پر ظلم کرنے کا ارادہ بھی نہیں کرتا۔ حالانکہ جبر کی صورت میں جزاوسزا سراسر ظلم و ستم ہے۔

② اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ (سورۃ النساء:۴۰) خداوند عالم ذرہ برابر بھی ظلم وجور نہیں کرتا۔

③ وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (سورۃ ھود:۱۰۱) ہم نے ہرگز ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ خود انھوں نے اپنے نفوس پر ظلم کیا۔

④ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۳۳﴾ (سورۃ النحل: ۳۳) لیکن وہ خود اپنے نفسوں پر ظلم کرتے تھے۔

⑤ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ (سورۃ النحل:۹۰) خداوند عالم عدل و احسان کا حکم دیتا ہے اور فحشاء منکر (افعالِ ناشائستہ) سے روکتا ہے۔

بھلا کوئی باعقل وانصاف آدمی یہ باور کرسکتا ہے کہ خدا تعالیٰ برے کاموں سے روکے اور پھر خود ہی جبراً بندوں سے کرائے۔ نعوذ باللہ من ھذہ العقیدۃ الفاسدۃ۔

⑥ وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَ نَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ (سورۃ الاعراف:۲۸) ...... وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ (سورۃ الزمر:۷) یہ لوگ جب خود کوئی برا کام کرتے ہیں تو (اس کے جواز میں یہ) کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آباء واجداد کو اسی طریقہ پر پایا ہے۔ اور خداوند عالم نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ اے رسولؐ! تم ان سے کہہ دو کہ خلاقِ عالم کبھی برے کاموں کا حکم نہیں دیتا...... اور نہ ہی وہ اپنے بندوں کے کفر پر راضی ہوتا ہے۔ انصاف شرط ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کسی طرح انسانی اختیار کا اِثبات اور جبر کا بطلان کیا جاسکتا ہے؟

③ **وجہ سوم**: وہ آیات ہیں جن میں انسانی افعال کی نسبت انسان ہی کی طرف دی گئی ہے اور آخر میں جزاء وسزا کو انہی کے افعال خیر یا شر کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔

① فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (سورۃ البقرۃ:۷۹) افسوس ہے ان لوگوں کے لیے جو کتاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں، اور پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔

② اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۷﴾ (سورۃ التحریم:۷) آج (بروزِ قیامت) تمھیں اسی کی جزاوسزا دی جائے گی جو کچھ تم کرتے تھے۔

③ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ ۭ بِمَا تَسْعٰى ﴿۱۵﴾ (سورۃ طٰہٰ: ۱۵) ہر آدمی کو اس کی کوشش کے مطابق جزا دی جائے گی۔

④ اَلْیَوْمَ تُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ (سورۃ المومن: ۱۷) آج ہر آدمی کو وہی جزا و سزا دی جائے گی جو کچھ اس نے کیا ہے۔

⑤ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (سورۃ الرعد: ۱۱) یعنی ؎

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

④ **وجہ چہارم**: وہ آیات ہیں جن میں کفار و مشرکین کو ایمان نہ لانے پر زجر و توبیخ کی گئی ہے اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ انھیں کفر اختیار کرنے پر کوئی مجبوری نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

① وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا (سورۃ الاسراء: ۹۴) لوگوں کو کیا چیز ایمان لانے سے روکتی ہے؟

② فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِیْنَ ۝۴۹ (سورۃ المدثر: ۴۹) ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ نصیحت سے روگرداں ہیں؟

③ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (سورۃ آلِ عمران: ۹۹) تم کیوں لوگوں کو راہِ خدا سے روکتے ہو؟

④ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ (سورۃ آلِ عمران: ۷۱) تم کیوں حق کو باطل کے ساتھ مخلوط کرتے ہو

⑤ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ (سورۃ صٓ: ۷۵) اے شیطان تجھے کس چیز نے روکا کہ تو اسے سجدہ کرے، جسے میں نے خلق کیا ہے؟

یہ آیاتِ مبارکہ بھی بندوں کے اختیار کے ثبوت اور "اشاعرہ" کے جبر و اضطرار کی نفی میں نص صریح ہیں۔ کیونکہ خداوند عالم نے ان آیات میں بندوں سے ان کے کفر و شرک اور عصیاں اختیار کرنے پر سوال کیا ہے کہ اس کا سبب کیا ہے؟ تو اگر اشاعرہ کا مذہب صحیح ہوتا تو بندے جواب میں عرض کر سکتے تھے کہ: بارِالہا! تو نے ہی تو ہم میں کفر و شرک پیدا کر کے ہمیں کفر و شرک پر مجبور کیا ہے۔ اور پھر ہماری سرزنش بھی کرتا ہے۔ لیکن ان کا سکوت اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ جبر والا نظریہ بالکل غلط اور باطل ہے۔ وھوالمقصود۔ اور یہ باطل نظریہ ہے کہ کفار مکہ بھی اس کے قائل نہ تھے۔

⑤ **وجہ پنجم**: وہ آیات ہیں جن میں کافروں اور گنہگاروں کا اپنا اقرار و اعتراف موجود ہے کہ کفر و گناہ خود انہی سے سرزد ہوا ہے۔

① مَا سَلَكَكُمْ فِیْ سَقَرَ ۝۴۲ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ ۝۴۳ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِیْنَ ۝۴۴ (سورۃ المدثر: ۴۲ تا ۴۴) جنتی لوگ مجرموں سے سوال کریں گے کہ تمھیں کس چیز نے داخل جہنم کیا ہے؟ تو وہ جواب دیں گے ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور مساکین کو طعام نہیں کھلاتے تھے۔

④ كُلَّمَآ اُلۡقِیَ فِیۡہَا فَوۡجٌ سَاَلَہُمۡ خَزَنَتُہَاۤ اَلَمۡ یَاۡتِکُمۡ نَذِیۡرٌ ۞ قَالُوۡا بَلٰی قَدۡ جَآءَنَا نَذِیۡرٌ ۬ۙ فَکَذَّبۡنَا وَ قُلۡنَا مَا نَزَّلَ اللّٰہُ مِنۡ شَیۡءٍ (سورۃ الملک:۸ و ۹) جب بھی کافروں کی کوئی فوج جہنم میں جھونکی جائے گی تو خازنانِ جہنم ان سے پوچھیں گے : کیا تمھارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا؟ وہ جواب دیں گے ہاں یقیناً ڈرانے والا (نبی) تو ضرور آیا تھا لیکن ہم نے اسے جھٹلا دیا اور کہا کہ خدا نے کوئی چیز نازل نہیں کی۔

⑤ وَ قَالُوۡا رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعۡنَا سَادَتَنَا وَ کُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوۡنَا السَّبِیۡلَا ۞ رَبَّنَاۤ اٰتِہِمۡ ضِعۡفَیۡنِ مِنَ الۡعَذَابِ وَ الۡعَنۡہُمۡ لَعۡنًا کَبِیۡرًا ۞ (سورۃ الاحزاب:۶۷ و ۶۸) کافر کہیں گے : بارِالٰہا! ہم نے اپنے بزرگوں کی اطاعت کی اور انھوں نے ہمیں گمراہ کر دیا۔ یا اللہ! تو ان پر دوہرا عذاب نازل کر اور ان پر بڑی لعنت بھیج۔

دیکھیے جہنمی بھی اِقرار کر رہے ہیں کہ کفر و عصیاں ہم ہی سے سرزد ہوا ہے۔ یا ان کی ضلالت کا سبب ان کے بزرگ بنے ہیں۔ لیکن انھوں نے اس اِلزام کا مورد خداوند عالم کو قرار نہیں دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اس سلسلہ میں خداوند عالم کو مورد الزام قرار دیتے ہیں، وہ ان دوزخیوں سے بھی بدتر ہیں۔

⑥ **وجہ ششم** :بعض آیات ایسی بھی موجود ہیں جن میں خلاقِ عالم نے برے بندوں سے اور ان کی برائیوں سے اپنی برائت و بیزاری ظاہر فرمائی۔ جیسے : اَنَّ اللّٰہَ بَرِیۡٓءٌ مِّنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ (سورۃ توبۃ : ۳) ظاہر ہے اگر خدا نے خود برائی کرائی ہوتی اور خود ان کے اندر اسے پیدا کیا ہوتا تو پھر ان سے برائت ظاہر کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

چنانچہ صاحب تفسیر "المیزان" نے شرح عقائد شیخ مُفید علیہ الرحمہ کے حوالے سے ایک روایت نقل فرمائی ہے کہ امام علی نقی علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ :"افعال العباد اھی مخلوقۃ للہ؟ آیا بندوں کے افعال خدا کے مخلوق ہیں؟"۔ فقال علیہ السلام: لوکان خالقاً لھا لما تبرأ منھا و قد قال سبحانہ ان اللہ بری من المشرکین و لم یرد البرائۃ من خلق ذاتھم و انما تبرء من شرکھم و قبائحھم۔ فرمایا: اگر خدا بندوں کے افعال کا خالق ہوتا تو ہرگز ان سے بیزاری ظاہر نہ کرتا۔ حالانکہ وہ ارشاد فرماتا ہے: "تحقیق خداوند عالم مشرکوں سے بیزار ہے"۔

اس آیتِ مبارکہ میں خدا نے مشرکین کی ذوات کے پیدا کرنے سے بیزاری ظاہر نہیں کی بلکہ ان کے شرک اور قبیح اعمال سے اپنی برائت ظاہر فرمائی ہے۔

نظریۂ تفویض کی ردّ

① مباحثِ توحید میں اس مطلب کو مُحقّق و مبرہن کیا جا چکا ہے کہ ہر ممکن الوجود شے، واجب الوجود کی محتاج ہے۔ اور یہ کہ کوئی ممکن ایک لمحہ کے لیے بھی واجب الوجود کے فیض وجود سے مُستغنی و بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ بنابریں یہ کہنا کہ بندہ اپنے افعال میں بالکل آزاد مُطلق ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ممکن کو واجب کی احتیاج نہیں ہے۔ اور یہ بات واضح البطلان ہے۔

② اس نظریہ سے خداوند عالم کا معطل ہونا لازم آتا ہے، جو کہ شانِ خداوندی کے منافی ہے۔ حسن بن وشلیح بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت امام رضا علیہ افضل التحیۃ و الثناء کی خدمت میں عرض کیا: "ان الله فوض الامر الی العباد" کیا خدا نے افعال کو بالکل بندوں کے سپرد کر دیا ہے؟...... فرمایا: "الله اعز من ذلك" خداوند عالم اس سے اجل وارفع ہے۔ پھر میں نے کہا: "فاجبرهم على المعاصی؟" تو کیا خدا نے بندوں کو گناہوں پر مجبور کیا ہے؟ فرمایا: "الله اعدل و احکم من ذلك"۔ خدا اس سے عادل تر ہے کہ اس طرح ظلم وجور کرے۔ (از توحید شیخ صدوقؒ)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "ان الناس فی القدر علی ثلاثة اوجه: رجل یزعم ان الله عزوجل اجبر الناس علی المعاصی فهٰذا قد اوهن الله فی سلطانه فهو کافر و رجل یزعم ان الله کلف العباد مایطیقون و لم یکلفهم ما لا یطیقون و اذا احسن حمد الله و اذا اساء استغفر الله فهٰذا مسلم بالغ"۔ (توحید شیخ صدوقؒ) یعنی قضاء و قدر کے متعلق لوگوں کے تین گروہ ہیں۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ خدا لوگوں کو گناہوں پر مجبور کرتا ہے۔ یہ گروہ چونکہ خدا کو اپنی حکمت میں ظالم و جائر سمجھتا ہے، لہٰذا یہ کافر ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو یہ گمان کرتا ہے کہ یہ معاملات لوگوں کے سپرد ہیں، چونکہ یہ گروہ خدا کو اپنی سلطنت وحکومت میں کمزور سمجھتا ہے، لہٰذا یہ بھی کافر ہے۔ تیسرا گروہ وہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ خدا نے لوگوں کو انہی امور کی تکلیف دی ہے جو ان کی قوتِ برداشت کے مطابق ہیں اور ان امور کی تکلیف نہیں دی جو ان کی طاقت سے زائد ہیں۔ یہ گروہ جب اللہ کی اطاعت وفرمانبرداری کرتا ہے تو اس کی حمد وثنا کرتا ہے۔ اور جب گناہ وعصیان کا ارتکاب کرتا ہے تو استغفار کرتا ہے۔ یہ گروہ ہی حقیقی طور پر مُسلمان ہے۔

ثبتنا الله بالقول الثابت فی الحیوة الدنیا و یوم یقوم الاشهاد

چند شکوک و شبہات کا ازالہ

بموجب "الفریق یتشبث بکل حشیش" جبر و اضطرار کے قائلین چند عقلی و نقلی رکیک اور مہمل شبہات کو اپنے نظریۂ فاسدہ کی تائید میں پیش کیا کرتے ہیں۔ مناسب ہے کہ ذیل میں بالاختصار ان کا تذکرہ کرکے ان کا ازالہ بھی کردیا جائے، تاکہ یہ مسئلہ ہر لحاظ سے بے غبار اور حقیقت بالکل آشکار ہوجائے۔

① پہلا شبہ: جو کچھ عالم میں واقع ہوتا ہے اور انسان جو کچھ اچھے یا بُرے کام کرتا ہے ان کی وقوع سے پہلے خداوند عالم کو ان کا علم تھا اور جو کچھ واقع نہیں ہوتا خداوند عالم کو ازل سے اس کے واقع نہ ہونے کا علم بھی تھا۔ پس جس امر کے وقوع کا قدرت کو علم ہے، واجب ہے کہ وہ واقع ہو، اور جس امر کے عدم وقوع کا قدرت کو علم ہے اس کے لیے واقع ہونا ممتنع ہے، ورنہ ہر دو صورت میں علمِ خداوندی جہل کے ساتھ تبدیل ہوجائے گا اور یہ محال ہے۔ اور ظاہر ہے کہ امر واجب و امر ممتنع دونوں انسان کی قدرت سے باہر ہیں۔ لہٰذا جبر ثابت ہوگیا۔ اسی خیالِ فاسد کی عمر خیام نے ترجمانی کرتے ہوئے کہا ہے: ؎

مے خوردنِ من حق زِ ازل می دانست   گر مے نخورم علم خدا جہل بود[1]

① پہلا جواب: اس شبہ کاسدہ کا مختصر مگر تحقیقی جواب یہ ہے کہ اس امر میں کوئی شک نہیں ہے کہ قدرتِ کاملہ کو ہر شے کا علم ہے۔ "و علمه قبل خلق الاشياء كعلمه بعد خلقها"۔ لیکن علم کو اپنے معلُوم کے وقوع یا عدم وقوع کی ہرگز علت نہیں قرار نہیں جاسکتا۔ بلکہ علم اپنے معلُوم کے تابع ہوتا ہے۔ اس میں موثر نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ موثر کے لیے متاثر سے قبل ہونا ضروری ہے، اور تابع اپنے متبوع سے بالذات مؤخر ہوتا ہے۔ مثلاً جب ایک ماہر فلکیات اشکال و اوضاعِ فلک کو دیکھ کر یہ پیشین گوئی کرتا ہے کہ فلاں وقت سورج گرہن اور فلاں وقت چاند گرہن لگے گا یا فلاں وقت قمر در عقرب لگے گا، تو کوئی صاحبِ عقل و علم یہ نہیں کہہ سکتا کہ اب آفتاب و ماہتاب وغیرہ مجبور ہیں کہ وہ اسی وقت میں منکشف و منخسف ہوں، بلکہ ہر صحیح العقل آدمی سمجھتا ہے کہ اس ماہر فلکیات کا علم اوضاع و اشکال کے تابع ہے، وہ اوضاع و اشکال اس کے علم کے تابع نہیں ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ بعض اوقات ہمارے علم میں (حساب وغیرہ مقدماتِ علم میں غلطی رہ جانے کی وجہ سے) غلطی ہوسکتی ہے۔

---

[1] عمر خیام کے شعر کا مفہوم یہ ہے: ؎

زندگی جینے کو دی تو جی میں نے   قسمت میں لکھا تھا پی، تو پی میں نے
میں نہ پیتا تو تیرا لکھا غلط ہوجاتا   تیرے لکھے کو نبھایا تو کیا برا کیا میں نے

جیسا کہ مشاہدہ شاہد ہے۔ لیکن علم باری میں غلطی کا اِمکان نہیں ہے۔ اسے جو علم کسی شخص کے متعلق اس کی خلقت سے پہلے تھا کہ فلاں شخص بڑا ہو کر اپنے ارادہ واختیار سے فلاں اچھا کام کرے گا اور فلاں شخص فلاں بُرے کام کا ارتکاب کرے گا۔ اب یہ لوگ کریں گے تو اسی طرح جیسے خدا کو پہلے ان کا علم ہے۔ لیکن علم باری کو ان میں موثر قرار دینا حقائق سے سراسر جہالت ہے۔ جو یہ کہتے ہیں وہ ایسے عقل وعلم کے دشمن ہیں کہ یہ بھی نہیں سمجھتے کہ کسی واقعہ کا علم ہونا اور بات ہے اور واقعہ کو واقعہ بنانا اور بات۔ خداوند عالم کو مومن کے ایمان لانے اور کافر کے کفر اختیار کرنے کا علم ہے، نہ یہ کہ خدا کے علم نے مومن کو مومن اور کافر کو کافر بنایا ہے۔ کما لا یخفٰی۔

بہرحال یہ امر موجودہ تحقیقی دور میں محتاج بیان نہیں رہا کہ معلوم اپنے علل واسباب کی وجہ سے موجود ہوتا ہے۔ کسی عالم کے علم یا جاہل کے جہل کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ تو اس شبہ کا تحقیقی و علمی جواب تھا۔

② **دُوسرا اِلزامی جوابؒ**: اب اس کا ایک اِلزامی جواب بھی سن لیں۔ اگر یہ درست ہے کہ جس چیز کا خدا کو علم ہو کہ ہوگی، وہ واجب ہو جاتی ہے۔ اور جس کے نہ ہونے کا علم ہو وہ ممتنع ومحال۔ لہٰذا ہر دو قدرت سے خارج...... تو ہم پوچھتے ہیں کہ خدا جو خود کام انجام دیتا ہے، آیا اس کو ان کا علم ہوتا ہے؟ اگر جواب نفی میں ہے تو جہل خدا لازم آتا ہے، اور اگر اثبات میں ہے تو لازم آئے گا کہ خدا بھی فاعل مُختار نہ رہے۔ عمر خیام کے شعر فاسد کا تحقیقی جواب شعر ہی میں جو جناب مُحقِّق طوسی نے دیا ہے وہ اہل ذوق کی ضیافتِ طبع کے لیے پیش کیا جاتا ہے: ؎

ایں نکتہ نگوید آنکہ او اہل بود زیرا کہ جواب شبہ اش سہل بود
علم ازلی را علتِ عصیاں کردن نزد عقلاء ز غایت جہل بود

③ **تیسرا جوابؒ**: علاوہ ازیں اس شبہ کا یہ الزامی جواب بھی دیا جا سکتا ہے کہ اگر یہ قاعدہ تسلیم کر لیا جائے کہ علم معلوم کی علت ہوتا ہے تو اس سے خدا کا فاعل مُختار ہونا باطل ہو جائے گا اور فاعل مُضطر قرار پائے گا، جو بالاتفاق غلط ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس طرح خلاقِ عالم بندوں کے افعال کو ان کے واقع ہونے سے پہلے جانتا ہے، اسی طرح اسے اپنے افعال کا بھی ان کے وقوع سے قبل یقیناً علم ہوتا ہے۔ مثلاً: اب ہم کہتے ہیں کہ اسے علم ہے کہ مثلاً فلاں سال میں زید کو پیدا کرے گا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس سال وہ اسے پیدا نہ کرنے پر قدرت رکھتا ہے یا نہیں؟ اگر یہ کہا جائے کہ ہاں، قدرت رکھتا ہے، تو بقول خیال خدا کے علم کا مبدل بجہل ہونا لازم آتا ہے اور اگر قدرت نہیں رکھتا تو اسی طرح

اس کا مجبور و مقہور ہونا ثابت ہوتا ہے، حالانکہ وہ قادر و مُختار ہے۔ "فما ھو جوابکم فھو جوابنا"۔

اگر نظر غائر سے اس مسئلہ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ جبر و اختیار انسانی بلند ہمتی و پست ہمتی کی پیداوار ہے۔ اسی عقیدۂ جبر نے اسلام اور مُسلمانوں کو بدنام کیا ہے کہ وہ اپنی ذاتی ناکامیوں اور پسپائیوں کو جبر و تقدیر کے حوالے کر دیتے ہیں۔ حالی نے اسی حقیقت کو اپنے انداز میں اس طرح بے نقاب کیا ہے:

جبریہ و قدریہ کی بحث و تکرار دیکھا تو نہ تھا اس کا مذہب پہ مدار
جو کم ہمت تھے ہوگئے وہ مجبور جو باہمت تھے بن گئے وہ مختار

۲ دُوسرا شبہ: چند متشابہ آیات ہیں، جن کے ساتھ "مجبرہ" تمسّک کرکے اپنے زعم باطل کو ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کرتے ہیں۔ یہ آیات مختلف الالفاظ ہیں۔ بعض میں اضلال اور بعض میں ختم و طبع وغیرہ الفاظ وارد ہیں۔ جیسے: ① یضل من یشآء و یھدی من یشآء (ابراھیم: ۴) ② و من یضلل اللہ فمالہ من ھاد (رعد: ۳۳) ③ یضل بہ کثیرا (بقرہ: ۲۶) ④ و من یضلل فاولئك ھم الخاسرون (اعراف: ۱۷۸) ⑤ ختم اللہ علی قلوبھم (بقرہ: ۷) ⑥ بل طبع اللہ علیھا (نساء: ۱۵۵) ان آیات سے بظاہر یہی مُستفاد ہوتا ہے کہ خدا خود گمراہ کرتا ہے، اور خدا ہی دلوں پر مہریں لگاتا ہے۔ جب خدا کسی کو گمراہ کر دے یا اس کے دل پر مہر لگا دے تو اسے کون ہدایت کر سکتا ہے؟

الجَوَابُ وَ اللہُ المُوَفِّقُ لِلصَّوَابِ: ان آیات کا اجمالی جواب تو یہ ہے کہ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ یہ آیات متشابہات ہیں اور علماء محققین کا اتفاق ہے کہ خواہ مقام اعتقاد ہو یا مقامِ عمل، متشابہ آیات و روایات کی ایسی تاویل واجب و لازم ہوتی ہے کہ جس سے وہ آیات محکمات کے موافق ہوجائیں اور ظاہری تضاد و اختلاف رفع ہوجائے، اور کسی صورت میں بھی انھیں اپنے ظاہری معنوں پر باقی نہیں رکھا جاسکتا۔ خلاقِ عالم نے ان لوگوں کی مذمت فرمائی ہے جو متشابہ آیات کی اِتباع کرتے ہیں۔ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ (سورۃ آلِ عمران: ۷) یعنی جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہوتی ہے وہ متشابہات کی اتباع کرتے ہیں، تاکہ فتنہ و فساد کھڑا ہو۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا: وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ (سورۃ آلِ عمران: ۷) حالانکہ ان آیات کی صحیح تاویل و تفسیر بجز خداوند عالم اور رَاسِخُونَ فی العلم کے اور کوئی شخص نہیں جانتا۔ انہی مذکورہ آیات ہی کو لے لیجیے۔ اگر ان کو اپنے ظاہری معنوں پر باقی رکھا جائے تو اس سے وہ سب خرابیاں لازم آئیں گی جو اوپر تکلیف مالایطاق اور جبر و اضطرار والے نظریہ فاسدہ کی تردید کے ضمن

میں بیان ہو چکی ہیں۔ اور ان کے علاوہ ایک اور زبردست خرابی یہ لازم آئے گی کہ خداوندعالم نے چونکہ قرآن مجید میں کئی مقامات پر اضلال (گمراہ کرنے) کی نسبت شیطان یا شیطان صفت بعض انسانوں کی طرف دی ہے۔ جیسے ان آیات سے ظاہر ہے: هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ۖ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ (سورۃ القصص:۱۵) شیطان تمہارا کھلم کھلا گمراہ کرنے والا دشمن ہے۔ وَ لَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا (سورۃ یٰس: ۶۲) شیطان نے تم میں سے بہت سوں کو گمراہ کر دیا ہے۔ وَ اَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ (سورۃ طٰهٰ:۷۹) فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کر دیا۔ وَ اَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿۸۵﴾ (سورۃ طٰهٰ:۸۵) ان کو سامری نے گمراہ کیا...... ظاہر ہے کہ خدائے حکیم نے شیطان و فرعون اور سامری وغیرہ، ملاعین کی مذمت و منقصت بیان کرتے ہوئے ہی اضلال کو ان کی طرف منسوب کیا ہے، نہ کہ مدح و ستائش کی بنا پر۔ اگر نعوذ باللہ ان کی طرح خود خدائے تعالیٰ بھی اس فعل شنیع کا ارتکاب کرتا جو پھر خاک بدہن قائل اس حیثیت سے خدا اور شیطان و فرعون و سامری میں کیا فرق رہ جاتا؟ مالکم کیف تحکمون؟ بہرحال مذکورہ بالا آیاتِ محکمہ اور دلائل متقنہ کے موافق ہو جائیں اور یہ ظاہری تصادم و تضاد ختم ہو جائے۔

② دُوسرا جوابؕ: مخفی نہ رہے کہ "اضلال" جو کہ باب افعال "اضلّ یضلّ" کا مصدر ہے، لغت و اصطلاح میں تین معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ① کسی خلافِ حق امر کی طرف اشارہ کرنا ② کسی کے اندر ضلالت و گمراہی پیدا کرنا ③ کسی چیز کو ہلاک کرنا، ضائع کرنا، عذاب وعقاب نازل کرنا۔ چنانچہ مندرجہ ذیل آیتوں میں یہی آخری معنی مراد ہیں۔ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ﴿۲﴾ (سورۃ الفیل:۲) کیا خدا نے ان کے مکر و فریب کو ضائع و برباد نہیں کر دیا تھا؟ وَ مَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾ (الرعد:۱۴) یعنی کافروں کی دعا و پکار ضائع اور غیر مقبول ہے۔ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ (سورۃ محمد:۱) جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور راہِ خدا سے روکا، خداوندعالم نے ان کے اعمال کو باطل کر دیا ہے۔ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ ﴿۴۷﴾ (سورۃ القمر: ۴۷) مجرم لوگ عذاب و جہنم میں ہیں۔

اسی طرح "اضلال" کے بالمقابل "اهدا" بھی لغت و اصطلاح کے اعتبار سے تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ① کسی امر حق کی طرف راہبری کرنا ② کسی کے اندر ہدایت کا پیدا کرنا ③ کسی شے کو ہلاک اور ضائع نہ کرنا، بلکہ اس پر اجر و ثواب عطا کرنا۔ چنانچہ مندرجہ ذیل آیت میں لفظ "ہدایت" اجر و ثواب دینے کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ وَ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ﴿۴﴾ سَيَهْدِيْهِمْ (سورۃ محمد:۴ و ۵) جو لوگ راہِ خدا میں شہید ہو گئے، خداوندعالم ہرگز ان کے عمل کو ضائع نہیں کرے گا، بلکہ عنقریب انھیں اجر و ثواب عطا فرمائے گا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ضلالت وہدایت کے ان معانی میں سے کون سے معنی خداوند عالم کے حق میں صحیح ہیں اور کون سے غلط اور محال؟ سو واضح رہے کہ ضلالت پہلے اور دوسرے معنی کے اعتبار سے باری تعالیٰ کے حق میں استعمال کرنا ممنوع اور ناجائز ہے۔ کیونکہ اس سے وہ تمام مفاسد لازم آئیں گے جو اوپر ذکر ہو چکے ہیں۔ ہاں تیسرے معنی یعنی ہلاک وضائع کرنے اور سزا دینے کے لحاظ سے اس لفظ کی نسبت خدائے قدوس کی طرف صحیح ہے اور ہدایت کے معانی سہ گانہ میں سے پہلے اور تیسرے معنی کے اعتبار سے اس لفظ کی نسبت خدائے قدوس کی طرف صحیح و درست ہے۔ بنابریں جن آیات میں خدا کے متعلق "اضل" یا "یضل" وغیرہ الفاظ وارد ہوئے ہیں، ان کے یہ معنی ہوں گے: "یعذب و یھلك و یبطل عمل من یشاء"۔ خدا جسے چاہے عذاب کرے اور اس کے عمل کو ضائع و اکارت کر دے۔ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾ (سورۃ البقرۃ:۲۶) لیکن وہ کسی نیک آدمی کے اعمال کو ضائع نہیں کرتا، اور نہ ہی اس کو عذاب کرتا ہے، بلکہ وہ فاسقوں و فاجروں اور ریاکاروں کو عذاب و عقاب کرتا ہے، اور ان ہی کے اعمال کو ضائع و اکارت کرتا ہے۔ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾ (سورۃ الفرقان: ۲۳) اور جہاں ھدیٰ یا یھدی وغیرہ وارد ہے وہاں یرشد راہِ راست کی طرف راہبری کرنا یا یثیب ویجزی، اجر و ثواب عطا فرمانا مراد ہے۔ پس اس تاویل جمیل کی بنا پر ان آیات سے جبر و اضطرار کا جو وہم ہوتا ہے وہ مرتفع ہو جاتا ہے۔ اور ان آیات کے معانی عقل صحیح و نقل صریح کے بالکل مطابق ہو جاتے ہیں۔

والحمد للہ علیٰ وضوح الحق و الحقیقۃ

③ **تیسرا جواب**: ان متشابہ آیات کا ایک اور جواب بھی دیا جا سکتا ہے، وہ یہ کہ چونکہ انسانی اعمال و افعال کی بنیادی قوتیں خدائے قہار کی عطا کردہ ہیں۔ اگرچہ ان میں تصرف کرنے میں انسان فاعل مختار ہے، اب اگرچہ ہدایت حاصل کرنا یا ضلالت میں مبتلا ہونا درحقیقت انسان کا ذاتی فعل ہے۔ لیکن چونکہ ان کی اصل بنیادی قوتیں خداوند عالم کی دی ہوئی ہیں، لہٰذا من باب المجاز اہداء و اِضلال کو اس کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔ خدا نے انسان کو یہ طاقتیں اس لیے عطا نہیں کیں کہ وہ ان کو اس کی معصیت و نافرمانی میں صرف کرے۔ مُنعمِ حقیقی کی غرض تو یہ ہے کہ انسان اس کی عطا کردہ قوتوں کو اس کی اطاعت و فرمانبرداری میں صرف کرے۔ جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾ (سورۃ النحل:۷۸) وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ (سورۃ الذاریات: ۵۶) وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ (سورۃ الزمر:۷) مگر انسان اپنے سوئے

اختیار سے معصیت ایزدی کا شکار ہو جاتا ہے۔

④ **چوتھا جواب**: باقی رہیں وہ آیات جن میں لفظ "ختم" و "طبع" وارد ہے۔ ان کی بھی کئی ایک مناسب تاویلیں کی جاسکتی ہیں۔

① **تاویل اول**: یہاں حقیقۃً تو کوئی مہر وغیرہ نہیں ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کے اندر کفر و شرک اس قدر راسخ ہو چکا ہے کہ اس کا نکلنا اور ایمان کا اس کی جگہ داخل ہونا ایسا ہی مشکل ہے جیسے کسی مہر کردہ شے سے کسی چیز کا نکالنا اور کسی اور چیز کا اس میں داخل کرنا، اسی مطلب کو بطور کنایہ "ختم" و "طبع" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

② **تاویل دوم**: جب کسی کافر کا کفر اور مشرک کا شرک اس حد تک راسخ ہو جاتا ہے کہ اب ہرگز اس کے راہِ راست پر آنے کا کوئی امکان نہیں رہتا تو ممکن ہے اس وقت خدائے قدیر ان کے قلب پر کوئی ایسی علامت مقرر کر دیتا ہو جسے "نقطہء سیاہ" سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ جسے انبیاء و ملائکہ دیکھ کر معلوم کر لیتے ہیں کہ یہ آدمی راہِ راست پر آنے والا نہیں ہے۔ پس وہ اس کی رشد و فلاح سے ناامید ہو کر اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔ اس تاویل کی تائید ان بعض روایات سے بھی ہوتی ہے جن میں وارد ہے کہ جب کوئی آدمی گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب میں ایک سیاہ نقطہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر آبِ توبہ سے اسے دھو ڈالے تو فبہا، ورنہ اگر پے در پے گناہ پر گناہ کرتا رہے تو برابر اس نقطے میں اضافہ ہوتا رہتا ہے حتی کہ پورا قلب تیرہ و تاریک ہو جاتا ہے۔ اور بالآخر اس سے قبولِ حق و حقیقت کی استعداد سلب ہو جاتی ہے۔ مندرجہ ذیل آیت شریفہ میں بھی اسی مطلب کی طرف اشارہ ہے: بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ (سورۃ النساء: ۱۵۵) ان کافروں کے مسلسل کفر و عصیاں کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ مقامِ تدبر ہے۔ آیات و روایات میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ کفار و عصاۃ کے کفر و عصیاں کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگائی گئی ہے، تو گویا ان کا اپنا اختیاری کفر و عصیان مہر لگنے کا سبب ہے۔ یہ نہیں ہے کہ پہلے مہر لگائی گئی ہو جس کی وجہ سے ان سے کفر و عصیاں سرزد ہوا ہو۔ جبر و اضطرار تب لازم آتا کہ آخری صورت ہوتی۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ پہلی صورت میں جبر ہرگز لازم نہیں آتا۔ ایسا ہی مندرجہ ذیل آیات میں اضلال و ازاغہ کی نسبت خداوند عالم کی طرف مکافاتِ عمل اور خود مکلفین کے اعمالِ سیئہ کے نتیجہ میں دی گئی ہے: فَلَمَّا زَاغُوٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (سورۃ الصف: ۵) جب وہ خود ٹیڑھے ہو گئے تو خلاقِ عالم نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ ﴿۳۴﴾ (سورۃ المومن: ۳۴) اسی طرح خداوند عالم گمراہ کرتا ہے اس شخص کو جو اسراف کرنے والا (حدودِ

الٰہی توڑنے والا) ہو۔ اور شک کرنے والا ہو۔ فتدبر و تشکر و لا تکن من الجاھلین

③ تیسرا شبہ: کتب احادیث میں کچھ ایسی روایات بھی موجود ہیں جن میں وارد ہے: "ان اللہ انا خلقت الخیر و الشر فطوبیٰ لمن اجریت علیٰ یدیہ الخیر"۔ یعنی خدا فرماتے ہے کہ میں نے خیر و شر کو خلق کیا ہے۔ اس شبہ کا جواب چند وجہ دیا جا سکتا ہے۔

① پہلا جواب: بعض روایات معتبرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی روایات جو موہم جبر ہیں، وہ سب جعلی و وضعی ہیں۔ چنانچہ کتاب توحید شیخ صدوق عیون اخبار الرضا اور احتجاج طبرسیؒ میں حسین بن خالد سے روایت ہے، وہ بیان کر ہیں کہ میں نے حضرت امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ کچھ لوگ آپ (ائمہ اہل بیتؑ) کی طرف جبر والا قول منسوب کرتے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ آپؑ کے آباء و اجداد کی طرف منسوب شدہ کچھ ایسی روایات ملتی ہیں جو جبر پر دلالت کرتی ہیں۔ ان روایات کی حقیقت کیا ہے؟ امام علیہ السلام نے فرمایا: اے فرزند خالد! اس سلسلہ میں جو روایات میرے آباء و اجداد کی طرف منسوب ہیں، ان کی تعداد زیادہ ہے۔ یا ان روایات کی جو خود پیغمبر اسلامؐ کی طرف منسوب ہیں؟ راوی نے عرض کیا: فرزند رسولؐ! اس قسم کی جو روایات آنحضرتؐ کی طرف منسوب ہیں، ان کی تعداد زیادہ ہے۔ امام عالی مقام نے فرمایا: پھر کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ جبر و تشبیہ والا قول آنحضرتؐ کی طرف منسوب نہیں کرتے؟

راوی نے عرض کیا: حضورؑ! ان کا خیال ہے کہ اس قسم کی سب احادیث وضعی و جعلی ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی آنحضرتؐ کی صحیح حدیث نہیں ہے۔ یہ سن کر امام علیہ السلام نے فرمایا: یہی کیفیت ان روایات کی ہے جو میرے آباء و اجداد کرام کی طرف منسوب ہیں۔ ان بزرگواروں میں سے کسی نے بھی کوئی ایسا ارشاد نہیں فرمایا۔ یا ابن خالد! انما وضع عنا الاخبار فی تشبیہ و الجبر و الغلاۃ الذین صغروا عظمۃ اللہ (عیون الاخبار صفحہ ۹۷)

② دوسرا جواب: ایسی روایات برادرانِ اہل سنت کی روایات کے مطابق اور ائمہ طاہرینؑ کی احادیث معتبرہ کے مخالف ہیں۔ اور ہمارے قواعد و اصول میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ ہر وہ روایت جو ہماری مسلمہ روایات کے مخالف اور مخالفین کے اصول کے مطابق ہو، تو ایسی روایات اگر سند کے اعتبار سے کمزور ہوں تو ان کو وضعی و جعلی تصور کیا جاتا ہے، اور اگر سند کے اعتبار سے قوی ہوں تو انھیں تقیہ پر محمول کیا جاتا ہے۔ لہٰذا بنا بریں اگر بالفرض ایسی روایات سند کے لحاظ سے قوی بھی ہوں تاہم تقیہ پر محمول ہوں گی۔ اس مضمون کی روایات ابن ماجہ وغیرہ کتب صحاح ستہ میں بکثرت موجود ہیں۔

"انا خلقت الخلق و خلقت الخیر و الشر فطوبیٰ لمن قدرت علی یدیہ الخیر"۔

③ **تیسرا جواب:** سابقہ جوابات سے قطع نظر کرتے ہوئے اگر بالفرض ان روایات کو مستند تسلیم کر لیا جائے، اور ان کو تقیہ پر بھی محمول نہ کیا جائے تو پھر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان روایات میں جو لفظ خیر و شر وارد ہے، اس کا وہ مفہوم نہیں ہے جس سے ہم یہاں بحث کر رہے ہیں۔ بلکہ "خیر" سے مراد وہ مخلوق ہے جو مُفید اور ملائم طبع ہو، جیسے گائے، بکری، پھل فروٹ وغیرہ۔ اور "شر" سے مراد وہ مخلوق ہے جو مضر اور ناملائم طبع ہے۔ جیسے سانپ، بچھو وغیرہ۔ چونکہ فرقہ "ثنویہ" کا خیال یہ ہے کہ خالق کائنات دو ہیں۔ خیرات (مُفید اشیاء) کا خالق "یزدان" اور شرور (مضر اشیاء) کا خالق "اہرمن" ہے۔ ائمہ طاہرینؑ نے اس فرقہ کے زعم باطل کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ خالق عالم ایک ہی ہے، اور تمھارے خیال میں جو اشیاء مُفید یا مضر ہیں ان سب کا خالق و مالک وہی ہے۔ قل اللہ خالق کل شیء، وھو الواحد القھار۔

④ **چوتھا جواب:** اس تیسرے جواب سے بھی صرفِ نظر کر کے اگر خیر و شر کا وہی مفہوم مراد لیا جائے جو کہ موردِ بحث ہے تو پھر یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ یہاں خیر و شر کے خلق سے مراد خلق تقدیری ہے۔ نہ خلق تکوینی۔ اور اس امر کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ بعض احادیث میں بجائے "اجریت" لفظ "قدرت علی یدیہ الخیر" وارد ہے۔ خلق تکوینی و تقدیری کا باہمی فرق متن رسالہ میں مذکور ہے۔ اور ہم نے بھی بحث کی ابتداء میں اس کی وضاحت کر دی ہے۔ لہٰذا پھر بھی ان روایات سے جبر والا قول لازم نہیں آتا۔ ایسا تب ہوتا کہ جب خلق سے مراد خلق تکوینی ہوتی۔ مگر ایسا نہیں ہے۔

④ **چوتھا شبہ:** اگر یہ کہا جائے کہ انسان فاعل مُختار ہے تو اس سے خدا کا عاجز ہونا لازم آتا ہے۔ کیونکہ بنابریں ایک کافر چاہتا ہے کہ وہ کفر اختیار کرے، اور خدا یہ چاہتا ہے کہ وہ ایمان لائے۔ مگر وہ کفر اختیار کر لیتا ہے، تو اس سے خدا کا عاجز ہونا لازم آتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں کافر کا مطلوب تو حاصل ہو گیا مگر خدا کا مقصود حاصل نہ ہو سکا۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ اچھے یا برے کام خدا ہی کراتا ہے۔ مومن کا ایمان اور کافر کا کفر خدا ہی کا فعل ہے۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ اشکال اس وقت وارد ہوتا کہ اگر خداوند عالم کافر کو جبراً مومن بنانے پر قادر نہ ہوتا۔ لیکن اگر وہ اس بات پر قادر ہونے کے باوجود ان مفاسد و محاذیر کے پیشِ نظر جو جبر کی صورت میں لازم آتے ہیں، اسے ایمان لانے پر مجبور و مقہور نہیں کرتا۔ اور کافر اپنے ارادہ سے کفر کو اختیار کر لیتا ہے، تو اس سے خدا تعالیٰ کا عجز و قصور کس طرح لازم آتا ہے؟ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا (سورۃ یونس:۹۹) اگر جبراً خدا چاہتا تو تمام لوگ مومن بن جاتے لیکن خدا

ایسا کرتا نہیں۔ مثلاً اگر کوئی حاکم اپنے غلام کو کسی امر کا حکم دے، اور اس کے بجا لانے یا نہ بجا لانے کا اسے اختیار دے دے، تو اگر اس صورت میں وہ تعمیل حکم نہ کرے، تو حاکم کو عاجز و کمزور نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں اگر حاکم اس سے بہر حال وہ کام انجام دلوانا چاہے، خواہ بالاختیار اور خواہ بالجبر اور پھر وہ اسے انجام نہ دے تو اس صورت میں البتہ حاکم کا عجز لازم آئے گا۔

اور ان دونوں صورتوں کا باہمی فرق واضح و آشکار رہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے مُتعلقہ مسئلہ میں پہلی صورت درپیش ہے، نہ کہ دوسری۔ لہٰذا خداوند عالم کا عجز ہرگز لازم نہیں آتا۔ یہ شبہ محض ابلہ فریبی ہے یا پھر خود فریبی، ورنہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

⑤ پانچواں شبہ: کچھ احادیث ایسی موجود ہیں جو احادیث طینت کے نام سے مشہور ہیں۔ ان سے بھی جبر کا قول ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ ان احادیث کا مضمون یہ ہے کہ مومن کی طینت پاک و پاکیزہ اور کافر کی طینت خبیث و نجس ہے، خلقت کے وقت ان دونوں طینتوں کو باہم مخلوط کر دیا گیا تھا۔ لہٰذا اگر مومن سے کسی وقت کوئی برائی سرزد ہوتی ہے یا کافر سے کبھی نیکی صادر ہوتی ہے تو یہ اسی آمیزش کا نتیجہ ہے۔ اس شبہ کا بچند وجوہ جواب دیا جا سکتا ہے:

احادیث طینت والے شبہ کے جوابات

① پہلا جواب: بعض علماء اعلام نے انہی وجوہ کی بنا پر جن کا ذکر دوسرے شبہ کے جوابات میں کیا جا چکا ہے ان اخبار کو ناقابلِ استدلال قرار دیا ہے۔ یہ جواب قابل مناقشہ ہے۔ کیونکہ اس قدر اخبار کثیرہ کا رد کر دینا بڑی جرأت و جسارت ہے۔

② دوسرا جواب: بعض محتاط علماء نے یہ روش اختیار کی ہے کہ یہ اخبار متشابہ ہیں۔ لہٰذا ان پر اجمالاً ایمان لاتے ہوئے اور ان کے حقیقی مفاہیم و معانی کے سمجھنے سے اپنے عجز و قصور کا اعتراف کر کے ان کو ائمہ معصومینؑ کی طرف لوٹانا چاہیے۔ جیسا کہ متشابہ آیات میں یہی رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ جواب اگرچہ فی نفسہٖ صحیح ہے مگر اس سے مخالف کی تسکین و تسلی نہیں ہوتی۔

③ تیسرا جواب: بعض حضرات نے ان اخبار کو تشبیہ پر محمول کیا ہے۔ یعنی مومن ایمان کے قبول کرنے اور عقائد حقہ کو تسلیم کرنے میں اس طرح ہے کہ گویا اس کی طینت پاک و پاکیزہ ہے۔ اور کافر کفر و شرک کی طرف جھکنے اور اعمالِ سیّئہ اختیار کرنے میں ایسا ہے گویا اس کی خلقت طینت خبیثہ سے ہوئی ہے، ورنہ فی الحقیقت ایسا نہیں ہے کہ مومن کی خلقت طینت لطیف و طیب سے اور کافر کی خلقت

طینت کثیف وخبیث سے ہوئی ہو۔ یہ سب بطورتشبیہ وتمثیل کے بیان ہوا ہے۔ یہ جواب بھی اشکال سے خالی نہیں ہے۔ کیونکہ اس باب کی اکثر احادیث اس قدر صریح ہیں کہ ان کا تشبیہ وتمثیل پر حمل کرنا بعید معلوم ہوتا ہے۔

④ چوتھا جوابؒ: چونکہ خالق حکیم وعلیم کوانسانوں کی خلقت سے پہلے اپنے ازلی وذاتی علم سے معلوم تھا کہ مومنین اپنے ارادہ واختیار سے ایمان لاکر اعمالِ صالحہ بجالائیں گے، اور کفار ومشرکین اپنی خواہش واختیار سے کفر وشرک کواختیار کریں گے۔ اس لیے اس نے مومن کوطینت علّیین اور کافر کوطینت سجّین سے پیدا کردیا، تاکہ مومن سہولت سے ایمان اور کافر آسانی سے کفر کواختیار کرسکے۔ کیونکہ اس طرح مومن کو کافر پر ترجیح حاصل ہوجاتی ہے اور ترجیح بلا مرجح لازم نہیں آتی اور پھر بھی یہ اختلاف طینت نیک یا بد اعمال بجالانے کی علّتِ تامہ نہیں ہے، بلکہ اس میں زیادہ سے زیادہ اِقتضا اور میلان، یعنی نیک یا بد کاموں کی طرف فقط جھکاؤ کا مادہ پایا جاتا ہے۔ جس سے جبر واکراہ اور اضطرار اور الجاء لازم نہیں آتا۔ یہ جواب بحمدہ تعالیٰ بالکل بے غبار ہے اور اس سے جملہ اشکالات مرتفع ہوجاتے ہیں۔

⑤ پانچواں جوابؒ: خداوند عالم نے تمام بندوں کی روحوں کوایک ہی جوہر سے پیدا کیا۔ اور ان میں قوائے شہویہ کوبھی خلق کردیا۔ اور ان روحوں کوفعل کے بجالانے اور ترک کرنے کا بھی اختیار دے دیا۔ پھر قدرتِ کاملہ نے "عالم ذر" میں جب ان کا امتحان لیا توبعض ارواح نے اطاعت وفرمانبرداری اور بعض نے معصیت ونافرمانی اختیار کی۔ اس وقت خلاقِ عالم نے ہر ایک روح کے لیے اس طینت کو اختیار کیا جو اس کے لیے مناسب حال تھی اور پھر دونوں طینتوں کو باہم مخلوط کردیا، اور اس اختلاط و امتزاج میں اصلیّت و فرعیّت کی رعایت کوملحوظ رکھا، جو روح مستحق لطف ومرحمت تھی اس پر لطف وکرم کو مبذول کیا اور جو روح مستوجب خذلان تھی، اس کو خذلان میں مبتلا کیا۔

اس جواب کو مرحوم مولانا سید ظہور حسین صاحب لکھنوی نے شرح اصول کافی میں اختیار کیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ اس سے جملہ اعتراضات برطرف ہوجاتے ہیں۔

اور ان سے پہلے محدث سید نعمت اللہ جزائری نے انوارِ نعمانیہ میں اور فاضل سید عبد اللہ شبر نے مصابیح الانوار میں اختیار فرمایا ہے اور لکھا ہے کہ یہ جواب باصواب بعض اخبار معصومینؑ سے مُستفاد ہوتا ہے۔ وھو فی محلہ۔

اشاعرہ کے مسئلۂ "کسب" پر تنقید

اب تک جس قدر عقلی و نقلی دلائل و براہین بیان کیے گئے ہیں ان سے روزِ روشن کی طرح واضح و آشکار ہو جاتا ہے کہ: "اِنسان اپنے افعالِ تکلیفیہ میں فاعل مختار ہے نہ کہ مجبور و مقہور"۔ اور یہ بھی عیاں ہو چکا ہے کہ: "اگر جبر یا تفویض والا قول اختیار کیا جائے تو اس سے بے شمار محاذیر و مفاسد لازم آتے ہیں"...... یہی وجہ ہے کہ جب "اشاعرہ" نے دیکھا کہ ان کے نظریہ پر مفاسد عدیدہ و اشکالاتِ شدیدہ لازم آتے ہیں تو انھوں نے بموجب "عذرِ گناہ بدتر از گناہ" ان اشکالات سے بچنے کے لیے ایک مُہمل مسئلہ "کسب" کو سپر بنانا چاہا۔ لیکن اس "کسب" سے مراد کیا ہے؟ اس میں کچھ اس طرح کھوگئے اور ایسے پا در گل ہوئے کہ باوجود سعیٔ بلیغ کے آج تک کوئی قابل فہم اور معقول معنی بیان نہ کر سکے۔ چنانچہ: ① بعض یہ کہتے ہیں کہ ارادہ بندے کا ہوتا ہے اور فعل خدا کا۔ یعنی جب انسان کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو خدا وہ کام پیدا کر دیتا ہے اور نہ کرنا چاہے تو قدرت اس کام کو پیدا نہیں کرتی۔ ② اور بعض یہ کہتے ہیں کہ کسب سے مراد یہ ہے کہ فعل تو بہر حال خدا ہی پیدا کرتا ہے، ہاں اس کا وصف کہ وہ طاعت ہے یا معصیت۔ یہ انسان کا کام ہے۔ ③ اور بعض نے اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ بندہ طاعت و معصیت کے صدور کا محل ہے۔ ④ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ وہ ایک ایسی قوت ہے کہ جس کی وجہ سے انسان کوئی مصمّم ارادہ کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے بعد فعل خدا ایجاد کرتا ہے۔ ⑤ اور بعض نے تو اس مقام پر ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ: ہم یہ تو ضرور کہتے ہیں کہ کسب بندہ میں موجود ہے لیکن اس کی حقیقت و کیفیت کیا ہے؟ ہم اس کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں...... یہی وجہ ہے کہ بعض علماء کا قول ہے کہ زندگی ختم ہو گئی لیکن تین چیزوں کا مطلب سمجھ میں نہ آسکا۔ ① حضراتِ اشاعرہ کا "کسب" اور ان کی ② "کلام نفسی" اور ③ فلاسفہ کا "حال"۔ ہمیں اس امر کی ضرورت نہیں کہ کسب کے ان معانی باطلہ کے ابطال میں اپنا وقت ضائع کریں۔ کیونکہ یہ معانی اس قدر واضح البطلان ہیں کہ یہ اپنے بطلان پر محتاج دلیل و برہان نہیں...... ناظرین کرام غور فرمائیں کہ آیا ایسا مذہب بھی انسان کے لیے نجات دہندہ ہو سکتا ہے جس کے مسائل ایسے رکیک اور خلافِ عقل و شرع اور ناقابلِ فہم و ادراک ہوں۔ مسئلہ کی نزاکت و اہمیت نے عنانِ بیان کو قدرے دراز کرنے پر مجبور کر دیا۔

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِیَ فَعَلَیْهَا ؕ وَمَآ اَنَا عَلَیْكُمْ بِحَفِیْظٍ (سورۃ الانعام: ۱۰۴)

باب الاعتقاد
فی نفی الجبر و التفویض

قال الشیخ اعتقادنا فی ذلك قول الصادق علیه السلام لاجبر و لا تفویض بل امر بین امرین

پانچواں بابؒ
جبر وتفویض کے بیان میں

جبر وتفویض کے متعلق ہم شیعیانِ اہلِ بیتؑ کا وہی عقیدہ ہے جو جناب صادق آلِ محمد علیہ السلام نے فرمایا ہے۔ یعنی نہ جبر ہے اور نہ تفویض بلکہ ایک ایسا امر ہے جو ان دونوں امروں کے بین بین ہے۔

پانچواںؒ بابؒ جبر وتفویض کا مسئلہؒ

یہ مسئلہ بھی سابقہ مسئلہ کی طرح بڑا معرکتہ الآراء اور مہتم بالشان مسئلہ ہے۔ اوپر ثابت کیا جا چکا ہے کہ یہ مسئلہ اختلافِ امت کی آماجگاہ بن کر افراط و تفریط کا شکار ہو چکا ہے۔ اگرچہ حضرات اشاعرہ خدا تعالیٰ کو افعالِ عباد کا خالق قرار دے کر بزعم خود اس کی قدرتِ مطلقہ کا اثبات اور اس سے ہر قسم کے شرکاء کی نفی کرتے ہیں۔ اور اسی طرح مُعتزلہ حضرات تفویض کا قول اختیار کر کے اس کی ساحت قدس کو جبر و جور سے منزہ و مبرا قرار دینے کی سعی کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں نظریے شانِ ربوبیت کے منافی ہیں۔ کیونکہ اشاعرہ کے قول کی بنا پر خداوند عالم کا ظالم و جابر اور مخلوق کا مظلوم و مقہور ہونا لازم آتا ہے، جو سراسر قبیح ہے اور شانِ خداوندی کے خلاف ہے۔ اور مُعتزلہ کے نظریہ کی بنا پر ممکن الوجود کا استقلال اور واجب الوجود سے اس کا استغناء و بے نیاز ہونا اور قادرِ مُطلق کا معطل ہونا لازم آتا ہے۔ اور یہ امر بھی قادر و قیوم کی شانِ قدرت و قیومیت کے منافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احادیثِ نبویہ میں قدریہ کی بہت مذمت کی گئی ہے۔ چنانچہ آں جنابؐ کی ایک مشہور و مُعتبر حدیث ہے، فرمایا: "لعنت القدریه علیٰ لسان سبعین نبیا"۔ قدریہ پر ستر انبیاءؑ کی زبانی لعنت کی گئی ہے۔ (شرح مقاصد جلد ۲ صفحہ ۱۴۳ طبع اسلامبول وغیرہ) اسی طرح ایک اور صحیح حدیث میں وارد ہے: "القدریة مجوس هذه الامة" کہ قدریہ اس امت کے مجوسی ہیں۔ (شرح مقاصد جلد ۲ صفحہ ۳۲ وغیرہ) ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص آنحضرتؐ کی خدمت بابرکت میں ایران سے حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا: تو نے جو کچھ دیکھا ہے اس میں سے جو چیز زیادہ تعجب خیز ہے اس کی مجھے خبر دو۔ اس نے عرض کیا کہ

فقيل و ما امر بين الامرين فقال ذلك مثل رجل رأيته على معصية فنهيته فلم ينتهه فتركته ففعل تلك المعصية	کسی شخص نے آنجنابؑ کی خدمت میں عرض کیا کہ اس بین بین امر سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: اس کی مثال یوں ہے کہ تم کسی انسان کو کسی برے کام پر آمادہ دیکھ کر منع کرو مگر وہ نہ رکے اور تم اسے اپنے حال پر چھوڑ دو، یہاں تک کہ وہ گناہ کر بیٹھے۔

میں نے ایک ایسی قوم (مجوس) کو دیکھا ہے، ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں سے نکاح کرتے ہیں اور جب ان سے کہا جائے کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ اللہ کی قضا و قدر میں ہمارے متعلق ایسا ہی مقرر ہے۔ یہ سن کر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: میری امت کے اواخر میں بھی کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو ایسی باتیں کہیں گے، وہ میری امت کے مجوسی ہوں گے۔

(شرح مقاصد جلد ۲ صفحہ ۱۴۳ و سفینۃ البحار وغیرہ)

اس قسم کی بکثرت احادیث کتب فریقین میں موجود ہیں۔ لیکن طرفہ تماشا یہ ہے کہ اشاعرہ (جبریہ) اور معتزلہ (تفویضیہ) میں سے ہر فریق اپنے مد مقابل کو ان احادیث کا مصداق قرار دیتا ہے وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ص وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ (سورۃ البقرہ: ۱۱۳) ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دونوں فریق ایک دوسرے پر ان احادیث کو منطبق کرنے میں سچے ہیں۔ کیونکہ جو کچھ احادیث سے مُستفاد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دونوں فریقوں پر قدریہ کا اطلاق ہوا ہے۔ اگرچہ جبریہ پر ان روایات کا انطباق زیادہ ظاہر ہے۔ کما لا یخفٰی۔

حضرت علامہ مجلسیؒ فرماتے ہیں: "سيتضع لك ان كلا منهما ضال صادق فيما نسب الى الاخر وان الحق غير ما ذهب اليه و هو الامر بين الامرين"۔ تم پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ دونوں گروہ گمراہ ہیں اور جو نسبت ایک دوسرے کی طرف دیتے ہیں اس میں سچے ہیں۔ کیونکہ حق ان دونوں نظریوں کے خلاف ہے اور وہ ہے امر بین الامرین۔

پس ان حقائق کی روشنی میں واضح ہو گیا کہ یہ دونوں نظریے بوجہ افراط و تفریط نا قابلِ قبول ہیں اور صحیح نظریہ ان نظریات کے علاوہ کوئی ایسا ہونا چاہیے جو افراط و تفریط کی زد سے محفوظ ہو۔

اسی نظریہ شریفہ کو ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے ان الفاظ میں پیش فرمایا ہے: "لا جبر و لا تفويض بل امر بين الامرين"۔ دین میں نہ جبر ہے نہ تفویض، بلکہ حقیقت ان کے بین بین ہے۔ انسان نہ تو مجبور محض ہے اور نہ مختار مُطلق، بلکہ معاملہ ان ہر دو کے درمیان ہے۔ اور یہ ایسا بہترین نظریہ ہے کہ

فلیس حیث لم یقبل منك فتركته كنت انت الذی امرته بالمعصیة	چونکہ اس شخص نے تمھاری بات قبول نہیں کی اور تم نے اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم نے اس کو گناہ کرنے کا حکم دیا ہے یا اس سے گناہ کرایا ہے۔

بعض اشعری علماء بھی اس کی حقانیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ چنانچہ علامہ فخرالدین رازی نے مسئلہ جبر و تفویض میں ابحاثِ طویلہ کے بعد لکھا ہے: "و نحن نقول الحق ما قال بعض ائمة الدین انه لا جبر و لا تفویض لکن امر بین الامرین"۔ اس مسئلہ میں حق بات وہی ہے جو بعض ائمہ دین نے فرمائی ہے کہ نہ بالکل جبر ہے اور نہ بالکل تفویض بلکہ حقیقت ان کے بین بین ہے۔ اس مضمون کی احادیث شہرت وکثرت میں حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں۔ لہٰذا ان کی صحت و وثاقت کے متعلق تو بحث کرنا عبث ہے۔ البتہ غور طلب امر یہ ہے کہ اس بین بین امر اور اس منزلہ ثالثہ سے مراد کیا ہے؟ یہ امر قابلِ توجہ اور لائق تفکر ہے۔ اس کے متعلق متعدد قول موجود ہیں۔ یہاں ان تمام اقوال کے نقل کرنے کی نہ گنجائش ہے، اور نہ ہی چنداں ضرورت۔ لہٰذا ہم ان میں سے فقط پانچ قول پیش کرتے ہیں۔ و فیها کفایة لمن له درایة۔

الامر بین الامرین کی تحقیق میں پہلا قول

یہ وہ قول ہے جسے حضرت شیخ مفید علیہ الرحمۃ نے اختیار فرمایا ہے۔ اس کا اجمالی بیان یہ ہے کہ جبر سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کو کسی فعل کے کرنے یا نہ کرنے پر اس طرح مجبور کرنا کہ اس کی اپنی طاقت و قدرت سلب ہو جائے۔ خلاصہ یہ کہ نظریہ جبر کا مطلب یہ ہے کہ خداوند عالم ہی انسان میں اطاعت یا معصیت کو خلق کر دیتا ہے۔ اور انسان کی قدرت اور اس کے ارادہ و اختیار کو اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا، اور تفویض یہ ہے کہ افعال عباد میں سے وجوب و حرمت کو اٹھا لیا جائے۔ اور انسانوں کو بالکل مُطلق العنان اور آزاد چھوڑ دیا جائے کہ جو ان کا جی چاہے سو کریں۔ جیسا کہ زنادقہ و ملاحدہ کہتے ہیں۔ ان دونوں نظریات کے درمیان جو واسطہ اور درمیانی نظریہ ہے وہ یہ ہے کہ خداوند عالم نے بندوں کو اپنے افعالِ نیک و بد پر قدرت و تمکنت دی ہے۔ اور ان کے لیے حدود و قیود شرعیہ بھی مقرر فرمائے ہیں۔ اور پھر تعمیل کے مرحلہ میں وعدہ وعید اور زجر و توبیخ کو بھی عمل میں لایا گیا ہے۔ اب نہ تو بندوں کو افعال پر قدرت عطا کرنے سے یہ لازم آتا ہے کہ خدا نے ان کو افعال پر مجبور کیا ہے۔ اور چونکہ حدود و قیود مقرر کر دیے ہیں، اور اوامر و نواہی کا سلسلہ قائم کر کے اطاعت و فرمانبرداری پر

وعدہ ہائے اجر و ثواب اور مخالفت و نافرمانی پر وعید ہائے عقاب و عذاب فرمائے ہیں۔ لہٰذا یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے ان کو بالکل مُہمل اور شتر بے مہار کی طرح آزاد چھوڑ دیا ہے۔ یہ ہے "الامر بین الامرین" اور واسطہ "بین القولین" حضرت صادق آلِ محمدؑ کے ارشاد مندرجہ متن رسالہ سے اس کی تائید مزید ہوتی ہے۔

دوسرا قول: وہ ہے جسے محدث جلیل ملا محمد امین استر آبادیؒ نے اپنی بعض کتب میں اختیار فرمایا ہے کہ "الامر بین الامرین" کے یہ معنی ہیں کہ انسان اس طرح مُطلق العنان نہیں ہیں کہ جو چاہیں کرتے پھریں، بلکہ ان کا ہر ہر قول و فعل ارادۂ الٰہیہ حادثہ پر مُعلّق ہوتا ہے، جس کا تعلق تخلیہ یا منع کے ساتھ ہوتا ہے کہ خدا چاہے تو ان کے اور ان کے مقصد کے درمیان حائل ہو جائے اور چاہے تو ان کو اپنے حال پر چھوڑ دے۔ چنانچہ بہت سی احادیث میں وارد ہوا ہے کہ کسی دوا یا جادو کی تاثیر اذنِ ایزدی تخلیہ پر موقوف ہوتی ہے۔ بندوں کی طاعت و معصیت کا معاملہ بھی اسی طرح ہے۔ ہر امر حادث کا وقوع پذیر ہونا اسی طرح اذنِ باری پر موقوف ہے جس طرح کوئی معلول اپنے وجود میں اپنے شرائط پر موقوف ہوتا ہے۔ یہ قول ہے تو عمدہ مگر اس میں نقص یہ ہے کہ عام فہم نہیں ہے۔

تیسرا قول: وہ ہے جو بعض احادیث سے مُستفاد ہوتا ہے۔ جیسا کہ "عیون اخبار الرضاؑ" میں حضرت امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ خداوند عالم ہی ہمارے افعال کا خالق و فاعل ہے۔ اور پھر ہمیں ان پر عذاب و عقاب بھی کرتا ہے۔ وہ جبر کا قائل ہے، اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ خداوند عالم نے پیدا کرنے اور رزق دینے کا کام ائمہ معصومینؑ کے سپرد کر دیا ہے وہ تفویض کا قائل ہے۔ جبر کا قائل کافر اور تفویض کا قائل مشرک ہے۔

راوی نے عرض کیا: فرزند رسولؐ! امر بین الامرین کیا ہے؟ فرمایا: جن امور کا خدا نے حکم دیا ہے ان کے بجالانے اور جن امور سے روکا ہے ان کے ترک کرنے کی انسان کو قدرت و طاقت دی ہے۔

راوی نے عرض کیا: آیا اس مرحلہ میں خداوند عالم کے ارادہ اور اس کی مشیّت کو بھی کوئی دخل ہے؟ فرمایا: جہاں تک طاعاتِ الٰہیہ کا تعلق ہے، ان میں اللہ سبحانہ کے ارادہ و مشیّت کے دخل کا یہ مطلب ہے کہ خدا ان کو حکم دیتا ہے اور ان پر رضا مند بھی ہے۔ اور ان کی بجا آوری پر معاونت و مساعدت بھی کرتا ہے اور گناہوں میں اس کی مشیّت اور اس کے ارادہ کا یہ مطلب ہے کہ وہ ان سے نہیں کرتا ہے اور ان کے اِرتکاب سے ناراض ہوتا ہے اور ان کی بجا آوری میں اس کا خذلان (ترکِ توفیق) شامل ہوتا ہے۔

راوی نے عرض کیا: آیا ان افعال میں خداوند عالم کی قضا کو بھی کچھ دخل ہے؟ فرمایا: بندے اپنے افعال نیک یا بد کی وجہ سے جس چیز (جزا یا سزا) کے مستحق ہوتے ہیں۔ خداوند عالم دنیا و آخرت میں ان کے بارہ میں وہی حکم اور فیصلہ نافذ کرتا ہے۔ کَلَامُ الْاِمَامِ اِمَامُ الْکَلَامِ۔

چوتھا قول: وہ ہے جسے بعض اعلام نے اختیار کیا ہے کہ جبر کا مطلب تو وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا اور تفویض کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے افعال میں اس قدر مستقل و مُستَبِدّ ہے کہ اگر خدا بھی اسے باز رکھنا چاہے تو نہیں رکھ سکتا۔ اور الامر بین الامرین کا یہ مطلب ہے کہ خداوند عالم نے انسان کو فاعل مُختار تو بنایا ہے لیکن وہ قادرِ مُطلق ہے۔ جب چاہے بندوں سے یہ قوت سلب کر سکتا ہے۔ لہٰذا بندے جس امر کو بجا لانا چاہتے ہیں وہ ان کو اس سے باز رکھ سکتا ہے۔ اور جس امر کو وہ نہیں کرنا چاہتے وہ ان سے اسے کرا سکتا ہے لیکن بے شمار مصالح و حِکَم کی بنا پر ایسا کرتا نہیں ہے۔

پانچواں قول: وہ ہے جسے غواص بحار اخبار حضرت علامہ مجلسی اعلیٰ اللہ مقامہٗ نے "بحار الانوار" میں اور فاضل سید عبداللہ شبر نے "مصابیح الانوار" میں اختیار فرمایا ہے۔ اس قول پر احادیث معصومینؑ پوری طرح منطبق ہوتی ہیں، اور عقلِ سلیم و طبعِ مستقیم اسے بآسانی قبول کرتی ہے۔ اس قول کا ماحصل یہ ہے کہ جس جبر کی آیات و روایات میں نفی کی گئی ہے، اس سے مراد اشاعرہ کا نظریہ فاسدہ ہے۔ اور جس تفویض کی تردید کی گئی ہے اس سے مراد مُعتزلہ کی تفویض ہے۔ (ان ہر دو نظریاتِ فاسدہ کی اوپر توضیح مع تردید گزر چکی ہے) اور وہ بین بین امر جسے ثابت کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ: خداوند عالم کی ہدایات اور اس کی توفیقات اور اس کے الطاف و مراحم کو انسان کے اعمالِ خیر میں اتنا دخل ہے جو جبر و اختیار کی حد تک نہیں پہنچتا۔ اور اسی طرح اس کے خذلان اور ترکِ توفیق کو بندوں کے گناہ و عصیان میں کسی قدر تعلق ضرور ہے، لیکن وہ اجبار و اکراہ تک مُنتج نہیں ہوتا، اور یہ ایسا وجدانی مسئلہ ہے کہ ہر انسان اپنے مختلف حالات و کوائف میں اس حقیقت کو اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔

اس مطلب کی حضرت علامہ نے ایک مثال پیش کر کے وضاحت فرمائی ہے کہ ایک آقا اپنے کسی ملازم سے کوئی ایسی فرمائش کرتا ہے جس کی بجا آوری کا طور و طریقہ بھی اسے اچھی طرح بتا دیتا ہے۔ اور مزید برآں اس کی بجا آوری پر کچھ انعام دینے کا وعدہ اور مخالفت کی صورت میں کچھ سزا دینے کی وعید و تہدید بھی کرتا ہے۔

اب اگر اسے کسی طرح یہ معلوم بھی ہو جائے کہ ملازم اس کی فرمانبرداری نہیں کرے گا۔ مگر وہ مذکورہ بالا مقدار پر اکتفا کرتے ہوئے اسے کچھ مزید تاکید وغیرہ نہ کرے اور نہ کوئی سہولت میسر کرے

تو اندریں حالات نافرمانی کی صورت میں اگر آقا ایسے غلام کو کچھ سزا دے تو کوئی عقلمند اس کی مذمت نہیں کرتا اور نہ ہی کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اس نے اپنے نوکر کو نافرمانی کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اور نہ ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسے بالکل مُہمل چھوڑ دیا ہے۔ لیکن اگر مذکورہ بالا مثال میں آقا مذکورہ بالا وعدہ وعید اور افہام و تفہیم پر اضافہ کرتے ہوئے ایسا انتظام کر دے کہ مثلاً ایک آدمی کو مقرر کر دے کہ وہ غلام کو اپنے آقا کی اطاعت پر ترغیب و تحریص دلاتا رہے۔ اور اس کی نافرمانی کی صورت میں اس کے عذاب وعقاب سے ڈراتا رہے اور اس طرح وہ غلام اپنے ارادہ واختیار سے فرمانبرداری کرے تو اندریں حالت بھی کوئی عقلمند یہ نہیں کہہ سکتا کہ آقا نے اپنے غلام کو اطاعت گزاری وفرمانبرداری پر مجبور کر دیا ہے۔

یا مثال یوں تصور کر لیں کہ ایک سردار نے اپنے دو ملازموں کو کسی کام کے لیے کہیں جانے کا حکم دیا کہ وہاں تک بآسانی پیدل چل کر پہنچ سکتے تھے اور دونوں کو فرمانبرداری کی صورت میں انعام و اکرام کا وعدہ اور نافرمانی کی صورت میں سزا کی وعید وتہدید بھی کی۔ اندریں صورت اگر وہ سردار اپنے ذاتی علم کی بنا پر کہ ان میں سے ایک ملازم بہر حال اطاعت کرے گا اور دوسرا نافرمانی کا مرتکب ہوگا۔ اگر پہلے کے لیے سواری کا بھی انتظام کر دے اور دوسرے کے لیے انتظام نہ کرے تو اب جسے اس نے سواری مہیا کر دی ہے، نہ اس کے متعلق یہ کہنا درست ہے کہ سردار نے اسے اطاعت کرنے پر مجبور کر دیا ہے اور نہ دوسرے ملازم کے بارہ میں یہ کہنا صحیح ہے کہ سردار نے اسے بالکل مُہمل اور مُطلق العنان چھوڑ دیا ہے۔ بل امر بین الامرین۔

باقی رہا یہ امر کہ خلاقِ عالم کن لوگوں پر یہ خُصُوصی لطف واحسان کرتا ہے اور کن پر نہیں کرتا، یہ مکلّفین کے اپنے حسن اختیار اور سوئے اختیار، صفائی باطن اور کدورت باطن، حسن طبیعت اور سوء طویت پر مُنحصر ہے۔ ؎

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ بنا تھا

☆

باب الاعتقاد فی الارادة والمشية

چھٹا باب
خُدا کی مشیّت اور ارادہ کے متعلق عقیدہ

قال الشیخ ابوجعفر اعتقادنا فی ذلك قول الصادق شاء الله واراد مثل ذلك و لم یحب و لم یرض شاء ان لایکون شیء الا بعلمه واراد

حضرت شیخ ابو جعفر علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: اس باب میں ہمارا عقیدہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے فرمان کے مطابق یہ ہے کہ خدا چاہتا ہے اور ارادہ بھی کرتا ہے لیکن پسند نہیں کرتا اور راضی نہیں ہوتا ان چار امور کی تفصیل یوں ہے کہ خُدا کے چاہنے اور ارادہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا یہ ارادہ ہے کہ جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے وہ اس

چھٹا باب، خدا کی مشیّت و ارادہ کا بیان

حضرت شیخ مُفیدؒ کی تنقید

حضرت شیخ مُفید علیہ الرحمۃ نے اس مقام پر جناب مُصنّف علام پر بڑی کڑی تنقید کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ مُصنّف نے اس باب میں جو کچھ ذکر کیا ہے اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اس میں صریح طور پر تضاد و تناقض پایا جاتا ہے۔ اور یہ ہر حدیث پر بلا تحقیق و تامل عمل کرنے کا نتیجہ ہے (پھر فرمایا ہے) اس مسئلہ میں حق یہ ہے کہ خداوند عالم ارادہ نہیں کرتا مگر افعال حسنہ کا اور نہیں چاہتا مگر اعمالِ خیر کو اور قبائح و شنائع کا ارادہ نہیں کرتا اور نہ ہی فواحش و مُنکرات کو چاہتا ہے۔ تعالیٰ عمّا یقول المبطلون علوًا کبیرًا۔ چنانچہ وہ خود ارشاد فرماتا ہے: وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ (سورۃ المومن :۳۱) خداوند عالم بندوں پر ظُلم و ستم کرنے کا ارادہ نہیں کرتا۔ پھر ارشاد فرماتا ہے: يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (سورۃ البقرۃ:۱۸۵) خدا تمھارے لیے آسائش کا ارادہ کرتا ہے اور تمھارے لیے تنگی و سختی کا ارادہ نہیں کرتا۔ ایک اور مقام پر فرماتا ہے: وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۔ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا (سورۃ النساء:۲۷)" خدا تو یہ ارادہ رکھتا ہے کہ تمھاری توبہ قبول کرے۔ لیکن وہ لوگ جو شہواتِ نفسانیہ کی پیروی کرتے ہیں وہ یہ چاہتے ہیں کہ تم راہِ راست سے بھٹک جاؤ"۔ اربابِ فکر غور فرمائیں کہ خلاقِ عالم نے ان آیاتِ مبارکہ میں کتنی وضاحت و صراحت فرمادی ہے کہ وہ ظُلم و ستم، سختی و تنگی اور ضلالت و گمراہی کا ارادہ نہیں کرتا، بلکہ بندوں کی آسائش و

و مثل ذلك و لم یحب ان یقال له ثالث ثلاثة و لم یرض لعبادہ الکفر و قال اللہ عزو جل انك لا تهدی من احببت و لکن اللہ یهدی من یشآء و قال تعالی و ما تشآؤن الا ان یشآء اللہ و قال عزو جل و لو شآء ربك لآمن من فی الارض کلهم جمیعا افانت تکرہ

کے علم کے بغیر نہ ہو اور وہ اس بات کو دوست نہیں رکھتا کہ اسے تین میں کا ایک کہا جائے اور اس کی عدم رضا مندی کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کے کفر پر راضی نہیں ہے۔ نیز خداوند عالم فرماتا ہے: ① اے رسولؐ تم کسی کو منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتے خدا جسے چاہتا ہے منزلِ مقصود تک پہنچاتا ہے۔ (قصص:۵۶) ② نیز فرماتا ہے تم لوگ تو کچھ چاہتے ہی نہیں مگر وہی جو خدا چاہتا ہے۔ (دہر:۳۰) ③ اس کا ارشاد ہے: اگر خداوند عالم (جبراً) چاہتا تو دنیا کے سب لوگ ایمان لے آتے۔ کیا تم ان لوگوں پر جبر

سہولت اور ان کی رشد و ہدایت کا ارادہ کرتا ہے۔ اور اگر خلاقِ عالم گناہ و عصیان کا ارادہ بھی کرتا ہے تو یہ ارادہ یقیناً سابقہ ارادہ کے منافی و متناقض ہوگا۔ حالانکہ خدائے حکیم کے عزم و ارادہ میں اختلاف نہیں ہو سکتا۔

حضرت شیخؒ کی تنقید شدید کا جوابؒ باصوابؒ

نہ معلوم حضرت شیخ مُفید اعلی اللہ مقامہ کی نگاہِ اقدس میں سرکار مُصنّف علام کے کلام حقائق ترجمان میں کون سا تضاد و تناقض پایا جاتا ہے؟ حالانکہ ان کی یہ فرمائش حضرت صادق آلِ محمد علیہ السلام کی ایک مستند و مُعتبر حدیث سے ماخوذ ہے۔ جو بروایت جناب فضیل بن یسار حضرت مُصنّف علام کی کتاب التوحید وغیرہ میں مذکور ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ حدیث قدرے غامض اور مُشکل ہے مگر اس باب میں حضرت مُصنّف علام نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اگر اسے بنظرِ غائر دیکھا جائے تو اس میں کسی قسم کا اختلاف و تضاد نظر نہیں آتا۔ اس کلام سے درحقیقت فرقہ جبریہ (اشعریہ) کی تردید مقصود ہے۔ کیونکہ ان کا یہ نظریہ فاسدہ بالتفصیل اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے اس کا فاعل حقیقی خدا ہے۔ لہٰذا عالم میں جو کچھ خیر یا شر اور مومن کا ایمان یا کافر کا کفر وقوع پذیر ہوتا ہے وہ خدا کے ارادہ و مشیت کا نتیجہ ہے۔ اور وہ ان پر رضا مند بھی ہے۔ امام معصوم علیہ السلام کے فرمان کا خلاصہ یہ ہے کہ اس قدر بات تو صحیح ہے کہ خداوند عالم کا حتمی ارادہ اس کی قطعی مشیت ہے کہ عالم میں جو کچھ واقع ہو، وہ اس کے علم میں ہو۔ کیونکہ وہ ہر واقع ہونے والی چیز کا اس کے واقع ہونے سے پہلے علم رکھتا ہے۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقع ہونے والی چیز کو پسند بھی کرے اور اس پر رضامند

الناس حتی یکونوا مومنین و قال عزوجل و ما کان لنفس ان تومن الا باذن اللہ کتابا موجلا و کما قال تعالیٰ و ما کان لنفس ان تموت الا باذن اللہ کتابا موجلا و کما قال تعالیٰ یقولون لوکان لنا من الامر شیء ما قتلنا ھھنا قل لو کنتم فی بیوتکم لبرز الذین کتب علیھم القتل الی مضاجعھم قال تعالیٰ و لو شاء ربك ما فعلوہ فذرھم و ما یفترون و قال تعالیٰ و لو

کرتے ہو کہ یہ سب مومن بن جائیں۔(یونس:۹۹) ۴ نیز اس کا فرمان ہے کوئی شخص بھی خدا کے اذن کے بغیر ایمان نہیں لاتا۔(یونس:۱۰۰) ۵ نیز اس کا ارشاد ہے ہر ذی حیات خدا کے معین کیے ہوئے وقت پر اسی کی اجازت سے مرتا ہے۔(عمران:۱۴۵) ۶ خدا فرماتا ہے: یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہمیں کچھ بھی غلبہ و اختیار ہوتا تو ہم اس مقام پر قتل نہ کیے جاتے۔ اے حبیبؐ! ان سے فرما دیجیے کہ جن لوگوں کا قتل ہونا مقرر ہو چکا تھا، وہ اگر اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو بھی ضرور اپنی اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل آتے۔(عمران:۱۵۶) ۷ فرمایا: اگر خداوند عالم (جبراً) چاہتا تو یہ لوگ ایسا نہ کرتے۔ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دو، اور انھیں افترا پردازی کرنے دو۔(انعام:۱۱۲) ۸ فرمایا: اگر خدا (زبردستی) چاہتا تو یہ لوگ شرک نہ کرتے۔(انعام:۱۰۷)

بھی ہو، بلکہ ان واقع ہونے والی چیزوں میں سے بعض اشیاء ایسی بھی ہوتی ہیں کہ خداوند عالم نہ ان کو دوست رکھتا ہے جیسے نصاریٰ کا اس کے متعلق "ثالث ثلاثۃ" (تین میں کا ایک) کہنا۔ کیونکہ اس نے خود اس عقیدۂ فاسدہ سے ممانعت فرمائی ہے کہ "انتھوا خیرالکم" (نساء:۱۷۱) عقیدۂ تثلیث سے باز آجاؤ۔ اس میں تمھاری بھلائی ہے اور نہ ہی ان پر رضا مند ہوتا ہے۔ جیسے کافروں کا شرک اور فاسقوں کا فسق و فجور۔ جیسا کہ وہ خود ارشاد فرماتا ہے: وَلَا یَرْضٰی لِعِبَادِہِ الْکُفْرَ (سورۃ الزمر:۷) کہ خدائے تعالیٰ بندوں کے کفر و شرک پر رضا مند نہیں ہے۔ اگر یہ خیال کیا جائے کہ جب خدائے علیم کو ہر شے کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے اس کا علم ہوتا ہے تو پھر ضروری ہے کہ وہ چیز علم الٰہی کے مطابق واقع بھی ہو، لہٰذا جب خدائے حکیم کو سرکار سید الشہداء علیہ السلام کی شہادتِ عظمیٰ کا علم تھا تو پھر امامِ عالی مقامؑ شہید ہونے پر اور قاتل نابکار شہید کرنے پر مجبور تھا، تو اس خیال محال کی باب چہارم میں بذیل "ازالہ شکوک و شبہات" مکمل رد کی جا چکی ہے اور اس زعم باطل کا تار پود بکھیرا جا چکا ہے اور دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ علم کبھی معلوم کے واقع ہونے کی علت نہیں ہوتا۔ اعادہ و تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔ اس مقام کی طرف رجوع کیا جائے۔ "ان فی ذلك لعبرة لاولی الابصار"۔

شآء اللہ ما اشرکوا و قال و لو شئنا لاتینا کل نفس ھدیھا و قال تعالیٰ فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام و من یرد ان یضلہ یجعل صدرہ ضیقا حرجا کانما یصعد فی السمآء قال تعالیٰ یرید اللہ لیبین لکم و یھدیکم سنن الذین من قبلکم و یتوب علیکم و قال یرید اللہ ان لا یجعل لھم حظا فی الاخرۃ و قال تعالیٰ یرید اللہ ان یخفف عنکم

⑨ اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو (جبراً) راہِ راست پر گامزن کر دیتے (سجدہ:۱۳) ⑩ نیز فرماتا ہے: جس شخص کے متعلق خدا کا یہ ارادہ ہو کہ اسے ہدایت فرمائے، اس کے سینہ کو کشادہ کر دیتا ہے اور جس کو اپنی رحمت سے دور رکھنا چاہتا ہے اس کے سینہ کو اس طرح تنگ کر دیتا ہے کہ گویا وہ آسمان پر چڑھنا چاہتا ہے (انعام:۱۲۵) ⑪ فرماتا ہے: خدا کا ارادہ ہے کہ وہ تمھارے لیے کھل کر بیان کر دے اور تمھاری توبہ قبول کرے (نساء:۲۸) ⑫ نیز فرماتا ہے: خدا کا ارادہ یہ ہے کہ وہ آخرت میں کافروں کو اپنے ثواب سے بالکل محروم رکھے (عمران:۱۷۶) ⑬ فرماتا ہے: خدا کی مشیت یہ ہے کہ تمھاری تکلیف میں

بعض متعلقہ آیاتؑ کے بارہ میں توضیحی بیانؑ

جناب مُصنّف علام نے اس مقام پر جو آیاتِ شریفہ نقل فرمائی ہیں ان میں سے بعض آیات ایسی بھی ہیں کہ جن سے بادی النظر میں جبر کا توہم ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض کوتاہ اندیش ان سے اپنے زعم باطل کی تائید میں تمسک بھی کیا کرتے ہیں۔ جیسے آیت نمبر (۳) اور آیت نمبر (۹، ۱۰) اور آیت نمبر (۱۱) وغیرہ۔ لیکن جو حقائق بابِ چہارم میں بیان ہو چکے ہیں، ان کو پیشِ نظر رکھ کر ان آیات میں معمولی غور و فکر بھی کر لیا جائے تو ان کا حقیقی مطلب واضح و آشکار ہو جاتا ہے اور جبر والا توہم خودبخود زائل ہو جاتا ہے۔ ذیل میں ان آیات مبارکہ پر اجمالاً کچھ تبصرہ کیا جاتا ہے۔ آیت نمبر ۳ کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ اس میں مشیت سے مراد مشیت قاہرہ ہے۔ یعنی خلاقِ عالم اپنی قدرتِ کاملہ کا اِظہار کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے کہ اگر وہ جبر و اکراہ سے چاہتا تو تمام لوگ مومن کامل بن جاتے مگر چونکہ ایسا کرنا اس کی حکمتِ بالغہ کے خلاف ہے لہٰذا وہ ایسا نہیں کرتا۔ اس مطلب کی تائید اسی آیتِ مبارکہ کے تتمہ سے بھی ہوتی ہے: اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾ (سورۃ یونس:۹۹) اے رسولؐ! کیا تم لوگوں کو مجبور کرتے ہو کہ وہ ضرور ایمان لے آئیں؟ مقصد یہ کہ اگر اس طرح جبر و اکراہ سے ان کو مومن بنانا مطلوب ہوتا تو خود خدا اس پر قادر تھا۔ اس تحقیقی بیان سے واضح و عیاں ہو گیا کہ یہ آیتِ مبارکہ نظریہ جبر کی رد پر دلیل محکم ہے، نہ کہ صحتِ جبر پر۔ ہر معمولی عقل و خرد رکھنے والا انسان سمجھ سکتا ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ

و قال تعالیٰ یرید الله بکم الیسر و لا یرید بکم العسر و قال و الله یرید ان یتوب علیکم و یرید الذین یتبعون الشهوات ان تمیلوا میلا عظیما و قال تعالیٰ ما الله یرید ظلما للعباد فهذا اعتقادنا فی الارادة و المشیة و مخالفونا یشنعون علینا فی ذلك و یقولون انا نقول ان الله اراد المعاصی و اراد قتل الحسینؑ بن علیؑ و

تخفیف کردے (نساء:۲۸) ⑭ نیز اس کا ارشاد ہے: اللہ تم پر سختی نہیں کرنا چاہتا بلکہ وہ تمھارے لیے آسانی کا خواہشمند ہے (بقرہ:۱۸۵) ⑮ نیز فرماتا ہے: خدا چاہتا ہے کہ تمھاری توبہ منظور کرے مگر جو لوگ اپنی خواہشات کے تابع ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم لوگ حق سے بالکل پھر جاؤ (نساء:۲۷) ⑯ نیز اس کا ارشاد ہے: خدا اپنے بندوں پر ظلم کرنے کا ارادہ بھی نہیں کرتا۔ (غافر:۳۱) خداوند عالم کے ارادہ و مشیّت کے بارے میں یہ ہے ہمارے اعتقادات کا خلاصہ۔ مگر ہمارے مخالفین باوجود ان تصریحات کے، ہم پر یہ طعنہ زنی کرتے ہیں کہ شیعہ اس بات کے قائل ہیں کہ بندوں سے خدا ہی گناہ کرواتا ہے اور خدا ہی کا یہ ارادہ تھا کہ جناب امام حسین علیہ السلام قتل ہوں، حالانکہ ہم

خدا تعالیٰ لوگوں کے اختیاری طور پر ایمان لانے کو بھی نہیں چاہتا۔ اگر ایسا ہی تھا تو پھر انبیاءؑ و مرسلینؑ کیوں مبعوث کیے؟ اور صحف و کتب کیوں نازل فرمائے؟ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ③ (سورۃ الدھر:۳) آیات نمبر ۹، ۱۰ کا بھی بعینہٖ وہی مطلب ہے جو مذکورہ بالا آیت نمبر ۳ کا ہے اور آیت نمبر ۱۱ سے ملتی جلتی آیات کی باب چہارم میں کماحقہ وضاحت کی جا چکی ہے۔ وہاں رجوع کیا جائے۔ خلاصہ یہ کہ اس آیت مبارکہ میں اسی عقیدہ: صحیحہ کی طرف اشارہ مقصود ہے جو اوپر باب پنجم میں بالوضاحت بیان ہو چکا ہے کہ "لا جبر و لا تفویض بل امر بین الامرین" الطافِ الٰہیہ جس شخص کے شامل حال ہو جائیں، اسے ایمان لانا اور راہِ راست پر آنا آسان اور جس سے توفیقِ الٰہی سلب ہو جائے اور خذلان ایزدی میں مبتلا ہو، اسے ایمان لانا اور صراطِ مستقیم پر گامزن ہونا، بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ توفیق و لطفِ الٰہی کن لوگوں کے شامل حال ہوتا ہے، اور کون لوگ اس سے محروم رہتے ہیں؟ اس کی توضیح بھی سابقہ باب میں کی جا چکی ہے۔ یعنی یہ کہ جو لوگ راہِ راست پر آنے اور اعمالِ صالحہ بجالانے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں، توفیق الٰہی ان کے شامل حال ہوتی ہے اور جو اس امر کی کوشش ہی نہیں کرتے وہ اس سعادت سے محروم رہتے ہیں۔ جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے: وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (سورۃ العنکبوت:۶۹) بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ (سورۃ النساء:۱۵۵) "جو تلاشِ حق و حقیقت

لیس ھکذا نقول و لکنا نقول ان اللہ اراد ان یکون معصیۃ العاصین خلاف طاعۃ المطیعین و اراد ان یکون المعاصی غیر منسوبۃ الیہ من جھۃ الفعل و اراد ان یکون موصوفاً بالعلم بھا قبل کونھا و نقول اراد اللہ ان یکون قتل الحسین معصیۃ لہ و خلاف الطاعۃ و نقول اراد اللہ ان یکون قتلہ منھیا عنہ غیر مامور بہ و نقول اراد اللہ تعالیٰ ان

ایسا نہیں کہتے بلکہ اس سلسلہ میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ خدا کا یہ ارادہ ہے کہ نافرمانوں کی نافرمانی اور اطاعت شعاروں کی اطاعت شعاری اس کے نزدیک برابر نہ ہو۔ نیز وہ تو چاہتا ہے کہ بُرے افعال کی نسبت بھی اس کی طرف نہ ہو۔ ہاں وہ گناہوں کے سرزد ہونے سے قبل ہی ہر ایک گناہ کے متعلق علم ضرور رکھتا ہے۔ نیز ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کا ارادہ تھا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کا قتل اس کی اطاعت کے خلاف اور اس کی معصیت و نافرمانی میں داخل ہو۔ اور اس بارے میں ہم یہ کہتے ہیں کہ خداوندعالم کے ارادہ کے مطابق قتل حسینؑ ممنوع تھا نہ مامور، اور یہ کہ آنجنابؑ کا قتل (قاتلوں پر) خدا کی ناراضگی کا باعث ہوا۔ ہاں خداوندعالم کا یہ ارادہ تھا کہ

میں جدوجہد کرتے ہیں ہم انھیں اپنے راستے دکھا دیتے ہیں اور جو لوگ اپنے کفر و شرک پر اڑے رہتے ہیں ان کی کفر کی وجہ سے خدا ان کے قلوب پر مہر لگا دیتا ہے“۔

تذنیب: اِرادۂ اِلٰہیّہ کے بارہ میں علمائے اَعلام کے درمیان بہت اختلاف ہے کہ آیا وہ صفاتِ ذات سے ہے اور ازلی ہے یا صفاتِ فعل سے ہے اور حادث ہے؟ بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ صفت عین ذات ہے اور ازلی ہے۔ ہاں اس کے مُتعلّقات متجدّد و حادث ہیں۔ اور بعض یہ کہتے ہیں کہ ارادہ صفاتِ فعل میں سے ہے اور حادث ہے۔ حادثات و متجددات کے حدوث و تجدد کے ساتھ ساتھ وہ بھی متجدد و حادث ہوتا رہتا ہے۔ اور بعض حضرات ارادہ کو بمعنی داعی اور محرک علی الفعل مراد لیتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ خدائے تعالیٰ کا محرک و داعی اچھے کاموں پر مبنی ہوتا ہے۔ ”یرید الیسر و لا یرید العسر و یشاء الایمان و لا یشاء الکفر“۔ اور بعض کے نزدیک علم و ارادہ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ ان کے نزدیک ارادۂ الٰہی بمعنی علم بالمصلحہ یا علم بالمفسدہ ہے۔ اور یہی علم مختلف اشیاء کے مختلف اوقات میں پیدا کرنے کا مرجح بنتا ہے۔ اگرچہ اکثر متکلمین کا رجحان پہلے اور آخری قول کی طرف ہے۔ یعنی یہ کہ ارادہ صفاتِ ذات میں سے ہے۔ اور اس کا مطلب علم بالمصلحہ یا علم بالمفسدہ ہے۔ لیکن بکثرت احادیث معصومین علیہم السلام سے دوسرے قول کی تائید و تقویت ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ ارادہ صفات

يكون قتله مستقبحاً غير مستحسن و نقول اراد الله تعالیٰ ان يكون سخطاً لله غير رضى و نقول اراد الله عز و جل ان لا يمنع من قتله بالجبر و القدرة كما منع منه بالنهی و القول ولو منع منه بالجبر و القدر كما منع منه بالنهی و القول لا ندفع القتل عنه كما اندفع الحرق عن ابراهيم حين قال الله تعالیٰ للنار التی القی فيها يا نار كونی برداً و سلاماً علی ابراهيم و نقول لم يزل الله تعالیٰ عالماً بان الحسين سيقتل جبراً و يدرك لقتله سعادة الابد

جناب کے قاتلوں کو اپنے قہر وغلبہ کی بنا پر ان کے قتل سے باز نہ رکھے جس طرح بذریعہ قول کے اس کی ممانعت کی تھی ۔ اگر وہ اپنی قدرتِ کاملہ سے زبردستی روکنا چاہتا تو یقیناً حضرت امام حسین علیہ السلام قتل نہ ہو سکتے ۔ جیسا کہ اس نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو آگ میں جلنے سے محفوظ رکھنے کے لیے آگ کو حکم دیا تھا کہ اے آگ تو ٹھنڈی ہوجا، اور ابراہیمؑ کے لیے سلامتی کا باعث بن جا ۔ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا کو ازل سے علم تھا کہ امام حسین علیہ السلام ظلم وجور سے شہید کیے جائیں گے اور اس شہادتِ عظمیٰ سے آپ ابدی سعادت حاصل کریں گے اور ان کے قاتل ابدی شقاوت وبدبختی کا شکار ہوں گے ۔

فعل سے ہونے کی وجہ سے حادث ہے ۔ چنانچہ ثقۃ الاسلام حضرت شیخ محمد بن یعقوب کلینیؒ نے انہی احادیث سے متاثر ہوکر اصول کافی میں ایک مستقل باب منعقد کیا ہے ۔ جس کا عنوان ہے: "باب الارادة و انها من صفات الفعل" اس باب کے ذیل میں انھوں نے متعدد احادیث معتبرہ درج فرمائی ہیں جو بالصراحت اس قول پر دلالت کرتی ہیں ۔ ذیل میں ایک دو حدیثیں بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں ۔ عاصم بن حمید بیان کرتے ہیں کہ مین نے حضرت صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا: "لم يزل الله مريداً" کیا خدائے تعالیٰ ہمیشہ سے مرید رہا ہے؟ "قال ان المريد لايكون الا المراد معه" ۔ فرمایا مرید نہیں ہوتا مگر یہ کہ مراد اس کے ساتھ ہوتی ہے (لہٰذا اگر ارادہ ازلی ہے تو کائنات کو بھی ازلی ماننا پڑے گا) پھر فرمایا: "لم يزل عالماً قادراً ثم اراد" خدا ہمیشہ سے عالم وقادر رہا ہے ۔ پھر بعد میں ارادہ فرمایا (تب مخلوق وجود میں آئی)

دوسری روایت صفوان بن یحییٰ سے مروی ہے ۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ خالق ومخلوق کے ارادہ میں کیا فرق ہے؟ امام علیہ السلام نے مخلوق کے ارادہ کی تشریح فرمائی ۔ پھر ارادۂ باری تعالیٰ کے متعلق فرمایا: "واما من الله

و یشقی قاتله شقاوة الابد و نقول ماشاء الله کان و ما لم یشأ لم یکن ھذا اعتقادنا فی الارادة والمشیة دون ما ینسبه الینا اھل الخلاف و المشنعون علینا من اھل الالحاد

بہر کیف ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ خدا جو چاہتا ہے وہ ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا۔ خداوند عالم کی مشیت اور اس کی ارادے وغیرہ کے متعلق ہمارے یہی عقائد ہیں۔ ہم ان لغویات اور بے سروپا امور سے قطعاً مبرا اور بے تعلق ہیں جو ہمارے مخالفین اور طعن و تشنیع کرنے والے ملحدین ہماری طرف منسوب کرتے ہیں۔

فارادته احداثه لاغیر ذلك" یعنی ارادۂ خداوندی بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ کوئی چیز پیدا کر دے۔ پھر کچھ کلامِ معجز نظام کے بعد فرمایا: "فارادة الله الفعل لاغیر" خدا کا ارادہ سوائے فعل کے اور کچھ نہیں ہے۔

ناظرین کرام! غور فرمائیں کہ ان احادیث شریفہ میں کس صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ارادہ صفات فعل میں سے ہے۔

بایں ہمہ بعض محققین کی فرمائش بہت متین ہے کہ ایسے دشوار گزار مقامات میں اجمالی عقیدہ ہی کافی ہوتا ہے۔ مثلاً: اِرادہ کے متعلق یہی اجمالی اعتقاد کافی ہے کہ خداوند عالم مرید ہے۔ یعنی اعمالِ حسنہ اور خیرات کا اِرادہ کرتا ہے، اور شرور و قبائح کا اِرادہ نہیں فرماتا۔ باقی رہا یہ امر کہ ارادہ کی کنہ حقیقت کیا ہے؟ اس بحث میں پڑنے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور جب بھی کوئی آیت یا روایت مذکورہ عقیدہ کے بظاہر منافی معلوم ہو تو اس کی مناسب تاویل کرنا ضروری ہے۔

صفاتِ ایزدی کی بحث میں یہ امر مبرہن کیا جا چکا ہے کہ جس طرح ذاتِ باری کی کنہ حقیقت تک ہمارے عقول واوہام کی رسائی نہیں ہو سکتی، اسی طرح اس کی صفات کی تہ تک بھی رسائی ناممکن ہے۔ لہٰذا اجمالی عقیدہ میں ہی سلامتی مضمر ہے۔

باب الاعتقاد

فی القضاء و القدر

قال الشیخ ابوجعفر اعتقادنا فی ذلك قول الصادق لزرارة حین ساله فقال ما تقول یا سیدی فی القضاء و القدر

ساتواں باب

قضاء وقدر کے متعلّق عقیدہ

جناب شیخ علیہ الرحمۃ قضا وقدر کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس کے متعلّق ہمارا وہی اعتقاد ہے جو جناب زرارہ بن اعین کے اس سوال کہ "میرے آقا! آپؑ قضا وقدر کے بارے میں کیا فرماتے ہیں" کے جواب میں حضرت صادق آلِ محمد علیہ السلام نے بیان

ساتواں باب قضاء وقدر کے بارے میں اعتقاد

مسئلہ قضا وقدر میں غور وخوض کرنے کی ممانعت

اربابِ دانش وبینش پر یہ امر مخفی ومستور نہیں ہے کہ مسئلہ قضا وقدر ان مسائل غامضہ اور عقائد عویصہ میں سے ہے کہ جن کی کنہ حقیقت تک بجز "راسخون فی العلم" کے دوسرے لوگوں کے عقول و افہام کی رسائی تقریباً ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ اس سلسلہ میں اپنے عقول ناقصہ اور آراء فاسدہ پر اعتماد کرکے افراط وتفریط کا شکار ہوکر راہِ راست اور طریق مستقیم سے منحرف ہو گئے اور ابدی ہلاکت میں پڑ گئے۔ ؎

دریں ورطہ کشتی فرو شد هزار   که پیدا نه شد تخته و بر کنار

چونکہ یہ مسئلہ بہت گہرا اور پُرخطر تھا، اس لیے حکماء ربانیین یعنی حضرات ائمہ طاہرین صلوات اللہ علیہم اجمعین نے اس میں غور وخوض کرنے اور بحث ومباحثہ کرنے سے بشدت تمام روکا ہے اور ممانعت فرمائی ہے۔ اور بظاہر یہ نہی سب لوگوں کے لیے مساوی حیثیت رکھتی ہے، خواہ علماء و حکماء ہوں اور خواہ جہلاء وسفہاء۔ حضرت شیخ مُفید علیہ الرحمۃ نے اس ممانعت کی جو یہ تاویل فرمائی ہے کہ یہ ممانعت تمام مکلفین کے لیے نہیں ہے بلکہ کمزور اور ضعیف العقل لوگوں کے لیے ہے۔ ہم جناب شیخ کی رائے سے اتفاق کرنے سے قاصر ہیں، بلکہ ہماری ناقص تحقیق میں حضرت مُصنّف علام کا نظریہ درست ہے کہ ان نواہی کو اپنے عموم پر باقی رکھنا چاہیے۔ تفصیل کے قائلین (کہ اس مسئلہ میں خواص لوگ بحث کرنے کے مجاز ہیں) اپنے مدعا پر جب تک اخبار اہل بیتؑ میں سے کوئی قوی

قال اقول ان الله تعالیٰ اذا جمع العباد یوم القیامة فسئلهم عما عهد الیهم و لم یسألهم عما قضی علیهم و الکلام فی القدر منهی عنه کما قال امیر المومنینؑ لرجل

فرمایا تھا، اور وہ یہ ہے کہ خدائے عزوجل جب بروزِ قیامت اپنے بندوں کو جمع کرے گا تو ان سے صرف ان امور کی بابت سوال کرے گا جن کا ان سے عہد واقرار لیا تھا، اور اس امر کے بارے میں ان سے باز پرس نہیں کرے گا جو اس نے اپنی قضا وقدر سے نافذ کیا ہوگا۔ مسئلہ قدر میں کلام اور گفتگو کرنے کی ممانعت کی گئی ہے، جیسا کہ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام نے مسئلہ قدر کے متعلق

شاہد پیش نہ کریں، ہم ان کی اس تاویل وتفصیل کو قبول نہیں کر سکتے۔ سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ ثالث بحار الانوار میں حضرت شیخ مُفید علیہ الرحمۃ والی تاویل نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

من تفکر فی شبه الواردة علی اختیار العباد و فروع مسئلة الجبر و الاختیار و القضاء و القدر علم سر نهی العصوم عن التکفر فیها فانه قل من امعن النظر فیها ولم یزل قدمه الا من عصمه الله بفضله

جو شخص بھی مسئلہ جبر واختیار اور مسئلہ قضا وقدر میں وارد شدہ شبہات میں غور وفکر کرے گا اسے ان مسائل میں غور وفکر کرنے کے متعلق معصومؑ کی ممانعت فرمانے کا راز معلوم ہو جائے گا۔ کیونکہ سوائے ان کے جن کو خدا محفوظ رکھے، مُشکل ہے کہ کوئی بھی شخص اس میں غور وفکر کرے اور اس کا قدم نہ پھسلے۔

قضاء وقدر کی حقیقت سوائے "راسخون فی العلم" کے اور کوئی نہیں سمجھتا

حقیقت یہ ہے کہ چونکہ یہ مسئلہ نظامِ ربوبیت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور ذاتِ احدیت کے نظامِ عالم کو چلانے کے متعلق ہے۔ اس لیے نہ اس کا ہم سے تعلق ہے اور نہ اس کے سمجھنے کی ہمیں تکلیف دی گئی ہے اور نہ ہی ہم اسے سمجھ سکتے ہیں۔ مشاہدہ شاہد ہے کہ جب ایک معمولی رئیس اپنی رعیّت کے نظم ونسق کو بحال رکھنے کے لیے ایک پروگرام مرتب کرتا ہے تو اس کی عام رعایا کو (جن میں عقلاء وعلماء بھی ہوتے ہیں) اس کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ اسی طرح جب کسی چھوٹی یا بڑی مملکت کا سربراہ اپنی مملکت کے نظام کو چلانے کے لیے کچھ پالیسیاں بناتا ہے تو سوائے ان مخصوص نفوس کے جن کو بادشاہ خود آگاہ کردے، دوسرے اہلِ مملکت کو (جن میں علماء وفضلاء وقانون دان اور سیاستدان سب ہی حضرات شامل ہوتے ہیں) ان پالیسیوں کا مُطلقاً کوئی علم نہیں ہوتا۔ اور ان کے پاس سوائے ظنون واوہام اور قیاس آرائیوں کے جو اکثر اوقات غلط ثابت ہوتی ہیں اور کچھ نہیں ہوتا، تو جب انسان کی کمزوری عقل وعلم کی یہ حالت ہے کہ وہ اپنے جیسے انسان کے پروگرام کو نہیں سمجھ سکتا، تو پھر

و قد سأله عن القدر فقال له بحر عميق فلا تلجه ثم سئله ثانية عن القدر فقال طريق مظلم فلا تسلكه ثم سأله ثالثة فقال سر الله فـلا تتكلفه و قال اميرالمومنين فی القدر الا ان القدر سر من سر الله تعالیٰ و ستر من ستر الله و حرز من حرز الله مرفوع فی حجاب الله مطوی عن

ایک شخص کے استفتاء پر ارشاد فرمایا تھا۔ مسئلہ قدر ایک گہرا سمندر ہے جس میں تجھے داخل نہ ہونا چاہیے ۔ اس نے پھر وہی سوال دُہرایا تو آپؑ نے فرمایا: وہ ایک تاریک راستہ ہے، اس پر نہ چل ۔ جب تیسری بار پھر اس شخص نے یہی سوال کیا تو حضرت نے فرمایا: وہ خدا کا ایک راز ہے ۔ اس کو معلوم کرنے کے لیے تو تکلف نہ کر۔ نیز جناب امیر علیہ السلام مسئلہ قدر کی بابت فرماتے ہیں: خبردار یہ اسرارِ الٰہی میں سے ایک سربستہ راز ہے اس کے مخفی پردوں میں سے ایک پردہ ہے ۔ اس کے خزانوں میں سے ایک چھپا ہوا خزانہ ہے ۔ حجاب قدرت میں وہ بلند

وہ کس بَل بوتے پر ربُّ العالمین کے پروگرام کو سمجھنے کی توقع رکھتا ہے؟ علاوہ بریں بروزِ حشر ہم سے اس کے متعلق کوئی باز پُرس بھی نہ ہوگی ۔ جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث سے ثابت ہے، جو کہ متن رسالہ میں درج ہے تو پھر اس بحث میں پڑنے اور اس کے دقائق میں غور و خوض کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ جب کہ اس بحث میں بہت سے خطرات موجود ہیں ۔ اندریں حالات اس سلسلہ میں گفتگو کرنا ایک عبث اور لایعنی کام نہیں تو اور کیا ہے؟

سچی بات تو یہ ہے کہ مسئلہ قضا و قدر ایک ایسا سربستہ راز ہے کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک نہ کوئی فلسفی و منطقی اسے کھول سکا ہے اور نہ آئندہ یہ امید کی جا سکتی ہے کہ کوئی اس عقدہ کو وا کر سکے گا۔ کیا خوب کہا حافظ شیرازی نے: ؎

حدیث از مطرب و مے گودر از دھر کمتر جو
که کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

حضرات ائمۂ اطہار علیہم صلوات الملک الجبار نے اگرچہ لوگوں کے اصرار سے مجبور ہو کر ان کے حالات و اطوار کے مطابق اس مسئلہ کو سمجھانا چاہا لیکن ”و ما اوتیتم من العلم الا قلیلا“ (بنی اسرائیل: ۸۵) کے مصداق لوگ ائمۂ طاہرینؑ کے ان تشریحی و توضیحی بیانات کو بھی نہ سمجھ سکے اور وہ احادیث بجائے خود احادیث معضلہ و آثار مشکلہ میں سے شمار ہونے لگیں اور علماء ابرار یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ: ” هذه الاحاديث من غوامض الاخبار و متشابهات الاثار الموكول علم حقيقتها الى معادن الوحی و الاسرار “

خلق اللہ مختوم بخاتم اللہ سابق فی علم اللہ و صنع اللہ عن العباد علمہ و رفعہ فوق شھاداتھم و مبلغ عقولھم لانھم لا ینالونہ بحقیقۃ الربانیۃ و لا بقدرتہ الصمدانیۃ و لا بعظمتہ انیۃ و لا بعزتہ	مقام پر ہے اور خلق خدا سے پوشیدہ ہے۔ اس پر خدا کی مہر لگی ہوئی ہے۔ وہ پہلے سے خدا کے علم میں ہے اور اس نے اپنے بندوں کو اس کے علم سے محروم رکھا، اور اسے ان کے مشاہدہ اور ان کی عقول وادراک کی حدود سے بہت ہی بلند و بالا رکھا ہے۔ کیونکہ بندے اس کی حقیقت ربانی کو نہیں پا سکتے، اور نہ ہی اس کی بے نیاز قدرت کا ادراک کر سکتے ہیں، اور نہ ہی ان کی نورانی عظمت کو پا سکتے ہیں اور

(مصابیح الانوار فی حل مشکلات الاخبار) اور اگر کچھ ان کے متعلق لکھا یا کہا تو وہ بھی بنا بر ظن و تخمین نہ کہ بطور جزم و یقین۔ واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم۔

مسائل قضا و قدر میں اجمالی اعتقاد رکھنا کافی ہے

انہی مذکورہ بالا حقائق کی بنا پر بعض علمائے محققین نے تو صاف صاف لکھ دیا کہ: "وجدیر بالمرء ان یقنع فی ھذہ الورطۃ باعتقاد ان اللہ سبحانہ مرید فقط و لا یرید شیئا من السیئات و القبائح قط دون ان یتعمق فی کنہ الارادۃ و المشیۃ ھذا ما یقتضیہ العقل و العدل و تقضی بہ ظواھر الکتاب و السنۃ"۔ (حاشیہ شرح عقائد للشیخ المفید علیہ الرحمۃ) یعنی انسان کے لیے اس مشکل مرحلہ پر بہتر یہ ہے کہ یہ اجمالی اعتقاد رکھے کہ خدا مرید ہے اور کسی قسم کے گناہ اور برائی کا ارادہ نہیں کرتا، باقی یہ امر کہ ارادہ و مشیتِ ایزدی کی کنہ حقیقت کیا ہے۔ اس میں غور و خوض نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ہے وہ امر جس کا عدل و عقل تقاضا کرتے ہیں اور ظواہر کتاب و سُنّت کا بھی یہی فیصلہ ہے۔

اسی طرح علامہ مجلسیؒ اپنے رسالہ اعتقادیہ میں فرماتے ہیں: "لیس لک التفکر فی شبہ القضاء و القدر و الخوض فیھا فان الائمۃ قد نھونا عن التفکر فیھما فان فیھا شبہ قویۃ یعجز عقول اکثر الخلق عن حلھا و قد ضل فیھا کثیر من العلماء فایاک و التفکر و التامل فیھا فانہ لا یزیدک الا ضلالا و لا یزیدک الا جھلا"۔ یعنی تمہارے لیے قضا و قدر کے مسائل اور ان کے متعلق شبہات میں غور و فکر کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے ہمیں اس امر کی ممانعت فرمائی ہے۔ اس لیے کہ ان میں اس قدر قوی شبہے ہیں کہ اکثر لوگوں کی عقلیں ان کے حل کرنے سے قاصر ہیں اور اس غور و خوض کی وجہ سے بہت سے اہل علم گمراہ ہو گئے ہیں، لہٰذا ان میں ہرگز غور و فکر نہ کرو۔ اس میں فکر کرنے سے

الوحدانية لانه بحر اخر مواج خالص لله عزوجل عمقه مابين السمآء و الارض عرضه ما بين المشرق و المغرب اسود كالليل الدامس كثير الحيات و الحيتان تعلو مرة و تسفل اخرىٰ فی قعره شمس تضیء

نہ اس کی عزت یکتائی تک ان کی رسائی ہوسکتی ہے۔ کیونکہ یہ موجزن اور تلاطم خیز سمندر صرف خدا ہی کے لیے ہے۔ اس کی گہرائی زمین و آسمان کے فاصلہ کے برابر ہے اور اس کا عرض مشرق سے مغرب تک اور اندھیری رات کی طرح تیرہ و تار ہے۔ اس میں بکثرت سانپ اور مچھلیاں موجود ہیں جو نیچے سے اوپر، اوپر سے نیچے آتی جاتی رہتی ہیں۔ اس کی گہرائی میں ایک سورج چمک رہا ہے۔

سوائے گمراہی اور جہالت میں اضافہ کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اور ایسے امور میں ایک عقل مند و متدین انسان کا یہی شیوہ ہونا چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ: "فعل الحكيم لا يخلوا عن الحكمة" خلاق حکیم کے ہر ہر فعل میں سینکڑوں حکمتیں کارفرما ہیں۔ اور اس کا کوئی کام بھی عبث و بے فائدہ نہیں ہے۔ جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (سورة الانبياء:۱۶) نیز ارشاد فرمایا: اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا (سورة المومنون:۱۱۵) نیز ارشاد فرمایا ہے: اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (سورة القمر:۴۹) ہمیں اس میں کوئی کلام نہیں جو کچھ کلام ہے وہ صرف اس میں ہے کہ انسان ضعیف البنیان قدرت کے افعال واقوال کے حقیقی علل واسباب کو سمجھنے کی لیاقت واہلیت نہیں رکھتا۔ الا من اعلمه الله تعالیٰ۔

اس نازک مسئلہ کی کچھ تشریح وتوضیح

ہاں چونکہ اس تحقیقی و سائنسی دور میں لوگ ہر ہر بات کی اصلیت وعلّت معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے بغیر ان کی متجسّسانہ طبیعت کی تسکین نہیں ہوتی۔ بالخصوص اس مسئلہ کے متعلق تو کئی قسم کی موشگافیاں کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے شاید نامناسب نہ ہوگا اگر ایسے افراد کی ضیافت طبع کے لیے اس مسئلہ پر کچھ تبصرہ کر دیا جائے۔ و باللہ التوفیق و بیدہ ازمة التحقیق۔

سو واضح ہو کہ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ جو کچھ کائنات میں ہوتا ہے وہ علم و ارادہ اور قضا و قدر الٰہی کے ساتھ ہوتا ہے، جیسا کہ متعدد روایات میں وارد ہے۔ چنانچہ امام زین العابدین علیہ السلام سے منقول ہے، فرمایا: "علم و شاء و اراد و قدر و قضیٰ و امضی فامضی ما قضی و قضی ما قدر و قدر ما اراد بعلمه كانت المشية و بمشيته كانت الارادة و بارادة كان التقدير و بتقديره كان القضاء و

لا ينبغي ان يطلع عليها الا الواحد الفرد الصمد فمن تطلع عليها فقد ضاد الله فی ملكه حكمه و نازعه فی سلطانه و كشف عن سره و ستره و باء بغضب	خدائے واحد و یکتا اور بے نیاز کے سوا کوئی اس پر مطلع نہیں ہو سکتا، اور جو شخص اس کی حقیقت کو معلوم کرنے کی کوشش کرے گا، وہ حکم خدا کی نافرمانی کرنے والا اس کی سلطنت میں جھگڑا کرنے والا، اسرارِ خداوندی کو فاش کرنے والا اور قہر و غضبِ الٰہی میں گرفتار ہونے والا قرار پائے گا۔

بقضائه كان الامضاء والخبر"۔ خداوند عالم جب کوئی کام کرتا ہے تو اس کام کو چھ مراتب طے کرنا پڑتے ہیں۔ علم، مشیّت ارادہ قدر قضا اور امضاء۔ امضاء اسی چیز کا فرماتا ہے جو پہلے قضا میں آتی ہے اور قضا میں وہی آتی ہے جو اس سے قبل قدر میں ہو اور قدر کے مرحلہ میں وہی چیز قدم رکھتی ہے جو پہلے ارادۂ الٰہی میں ہو۔ اس کے علم سے مشیّت، مشیّت سے ارادہ، ارادہ سے تقدیر، تقدیر سے قضا اور قضا کے بعد امضا ہوتا ہے۔ لیکن اس سے جبر و اکراہ لازم نہیں آتا اور نہ اس کا وہ مطلب ہے جو اشاعرہ نے سمجھا ہے کہ خداوند عالم ہمارے افعال کے خیر و شر کا خالق ہے۔ اور انسان مجبور محض ہے، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ چونکہ قضا و قدر کے متعدّد معانی میں سے ایک معنی "فیصلہ کرنا اور اندازہ لگانا" بھی ہیں اور قدرت کاملہ کا یہ فیصلہ اور اندازہ اس کے افعال تکوینیہ اور افعال تشریعیہ میں مختلف ہوتا ہے۔ افعال تکوینیہ (جیسے خلق کرنا، رزق دینا اور مارنا و جِلانا (زندہ کرنا) وغیرہ) ان میں اس کا فیصلہ و اندازہ یہ ہے کہ وہ جس طرح چاہتا ہے کائنات میں تصرف فرماتا ہے۔ اس سلسلہ میں اس کے ارادہ کی تکمیل میں کوئی امر مانع نہیں ہوتا اور نہ کوئی رکاوٹ ہوتی ہے۔ "لا راد لقضائه انما امره اذا اراد شيئا ان يقول له كن فيكون"۔ ان امور الٰہیّہ میں انسان مجبور ہے۔ چنانچہ "کتاب التوحید" میں بروایت عبداللہ بن میمون القداح حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے اور وہ جناب اپنے والد ماجد حضرت امام زین العابدینؑ سے اور وہ اپنے آباء و اجدادِ طاہرینؑ کے سلسلہ سند سے جناب امیرالمومنینؑ سے روایت فرماتے ہیں کہ حضرت امیرالمومنینؑ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ ایک آدمی مشیّت ایزدی کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے۔ آپؑ نے فرمایا: اس کو میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ جب اسے حاضر خدمت کیا گیا تو آپؑ نے اس مخاطب ہو کر فرمایا: "يا عبدالله خلقك الله لما شاء او لما شئت" اے بندۂ خدا! خدا نے تجھے پیدا کیا تو اس وقت کیا جب اس نے چاہا۔ یا جب تو نے چاہا؟ اس نے عرض کیا کہ "لما شاء" جب اس نے چاہا۔ پھر فرمایا: "فيمرضك اذا شاء او اذا شئت" جب وہ چاہتا ہے تو تجھے بیمار کرتا ہے، یا جب تُو چاہتا

من الله و مأويه جهنم و بئس المصير و روى ان امير المومنين عدل من عند حائط مائل الى مكان اخر فقيل له يا امير المومنين اتفر من

اس کا ٹھکانا یقیناً جہنم میں ہوگا۔ اور یہ بہت بُری بازگشت ہے۔ ایک دفعہ حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام ایک گرنے والی دیوار سے بچ کر گزر رے۔ کسی نے عرض کیا: یاامیرالمؤمنین! کیا آپ قضاء الٰہی سے بھاگنا چاہتے ہیں؟

ہے؟ عرض کیا: "اذا شاء" جب وہ چاہے۔ فرمایا: "فيد خلك حيث شاء او حيث شئت" پس جس حالت میں وہ چاہے اس میں تجھے رکھتا ہے، یا جس حالت میں تو چاہے؟ عرض کیا: "حيث يشاء" جس حالت میں چاہے۔ اس شخص کے یہ صحیح جوابات سن کر آپؑ نے فرمایا: "لو قلت غير هذا لضربت الذين فيه عيناك" اگر تو اس کے علاوہ کوئی اور جواب دیتا تو میں تیری گردن اڑا دیتا۔

ہمیں تو بہر حال راضی بالقدر والقضاء رہنے کا حکم ہے۔ چنانچہ حدیث قدسی میں وارد ہے: "من لم يرض بقضائي و لم يصبر على بلائي و لم يشكر على نعمائي فليخرج من ارضي و سمائي و ليطلب ربا سوائي"۔ جو شخص میری قضاو قدر پر راضی نہ ہو اور نہ میری بلا و مصیبت پر صبر کرے اور نہ ہی میری نعمتوں کا شکر ادا کرے، اسے چاہیے کہ میری زمین اور میرے آسمان سے نکل جائے، اور میرے سوا کوئی اور خدا تلاش کرے۔ (الجواہر السّنیّہ) اور جو افعال تشریعیہ میں (جیسے واجبات و محرمات وغیرہ احکام شرعیہ) تو ان میں اس کا فیصلہ و اندازہ یہ ہے کہ واجبات کا حکم دیتا ہے اور محرمات سے نہی فرماتا ہے اور ان احکام کی بجا آوری اور تعمیل کو انسان کے ارادہ و اختیار پر چھوڑ دیتا ہے (جیسا کہ سابقہ مسئلہ میں اس کی تفصیل ذکر ہو چکی ہے) لیکن بایں ہمہ وہ جانتا ہے کہ انسان اپنے ارادہ سے کس شق کو اختیار کرے گا۔ آیا واجبات پر عمل کرے گا، یا محرمات کا ارتکاب کرے گا۔ لیکن اس کے ذاتی علم سے انسان کا اپنے افعال میں مجبور ہونا لازم نہیں آتا۔ جیسا کہ سابقاً اس امر کو ثابت کیا جا چکا ہے کہ علم کو اپنے معلُوم کے وجود میں ہرگز کسی قسم کا کوئی دخل نہیں ہے۔ بلکہ وہ خود اپنے علل و اسباب کی وجہ سے وجود میں آتا ہے۔ عالم کے علم یا جاہل کے جہل کو اس کے وجود یا عدم میں کوئی مدخلیت نہیں ہے۔ اگر ہمیں کسی ذریعہ سے یہ علم ہو جائے کہ کل آفتاب فلاں بجے طلوع کرے گا، یا ہمیں یقین حاصل ہے کہ امام زمانہؑ ظہور فرمائیں گے، یا قیامت آئے گی، تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمارے علم کو آفتاب کے طلوع کرنے یا امامؑ زمانہ کے تشریف لانے یا قیامت کے آنے میں کچھ دخل ہے۔ بلکہ علم تو معلُوم کے تابع ہوتا ہے۔ علم کا تعلّق تو حقیقتِ واقعہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ پس اگر معلُوم کا حقیقت واقعیہ ہونا علم پر

قضاء اللہ فقال افر من قضا اللہ الی قدر اللہ و سئل الصادقؑ عن الرقی ھل تدفع من القدر شیئا فقال ھی من القدر۔

فرمایا: ہاں ! مَیں (غیر حتمی) قضاء خداوندی سے بھاگ کر (حتمی) تقدیر الٰہی کی طرف جاتا ہوں۔ حضرت صادق علیہ السلام سے کسی نے دریافت کیا کہ تقدیر خداوندی کو تعویذ روک سکتے ہیں۔ فرمایا: تعویذ بھی قدر میں سے ہی ہیں۔

موقوف ہوتو اس سے دور لازم آئے گا جو کہ بالبداہت باطل ہے۔ ہاں علم کا کمال یہ ہے کہ معلُوم کے مطابق ہو۔ چونکہ ہمارے علوم ناقص ہیں، اس لیے بعض، بلکہ اکثر اوقات اِنکشافِ خلاف ہوجاتا ہے لیکن علم ایزدی چونکہ سراسر صحیح اور کامل بلکہ اکمل ہے، لہٰذا وہاں اِنکشافِ خلاف نہیں ہوتا۔

یہ جو کچھ لکھا گیا ہے یہ اپنی طرف سے نہیں بلکہ معادنِ وحی وتنزیل کی فرمائشاتِ عالیہ سے ماخوذ و مستنبط ہے اور سب سے زیادہ جس حدیث شریف سے اس مطلب پر روشنی پڑتی ہے وہ شیخ شامی والی روایت ہے جو کہ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام سے منقول اور کتبِ فریقین میں موجود ہے۔ چنانچہ اصول کافی اور شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید مُعتزلی جلد ۴ اور شرح مقاصد جلد ۲ وغیرہ میں جناب اصبغ بن نباتہ سے روایت ہے کہ جناب امیرالمومنین علیہ السلام جنگ صفّین سے فراغت کے بعد واپس کوفہ تشریف لا رہے تھے تو ایک مقام پر آپ کے اصحاب میں سے ایک شامی شیخ نے آں جناب کی خدمت میں عرض کیا:

شیخ شامی: مولا! یہ فرمائیے کہ ہمارا صفّین کی طرف جانا خدا کی قضاء وقدر سے تھا؟

حضرت امیر علیہ السلام: خالق کائنات کی قسم! ہم کسی جگہ نہیں گئے اور کسی وادی میں نہیں اترے مگر خدائے تعالیٰ کی قضاء وقدر سے۔

شیخ شامی: تو پھر ہم نے اس سلسلہ میں جس قدر مصائب وآلام جھیلے، وہ سب رائیگاں گئے۔ اور اجر وثواب ختم ہوگیا۔ (کیونکہ پھر تو ہم مجبور تھے)

حضرت امیر علیہ السلام: اے شیخ جلدی نہ کرو۔ تم وہاں جانے اور پھر آنے میں مجبور و مُضطر نہ تھے، بلکہ یہ تکالیف تم نے اپنے ارادہ واختیار سے برداشت کی ہیں، لہٰذا تمھیں ان کا اجروثواب ضرور ملے گا۔

شیخ شامی: بھلا یہ کیونکر ہوسکتا ہے جب ہمارا جانا اور آنا قضا وقدر کے ماتحت تھا تو پھر تو ہم کو قضا وقدر مجبور کرکے وہاں لے گئی۔ (اختیار کہاں رہا)

حضرت امیر علیہ السلام: خدا تم پر رحم کرے۔ تم شاید یہ سمجھے ہوئے ہو کہ وہ قضا و قدر حتمی و لازمی تھی (جس کی وجہ سے تم مجبور تھے) حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہو تو پھر ثواب اور عذاب کا سلسلہ باطل ہو کر رہ جائے گا۔ اور خدا کے وعدہ ہائے (جنّت) اور وعید ہائے (دوزخ) بے کار محض ہو جائیں گے۔ اور اس کے اوامر و نواہی ساقط ہو جائیں گے۔ پھر تو نہ کوئی نیکوکار تعریف کا حقدار رہے گا، اور نہ کوئی بدکار، مذمت کا مستوجب ہوگا۔ یہ نظریہ تو دشمنانِ رحمٰن اور گروہِ شیطان، پرستارانِ اصنام کے برادران اور اس امت کے قدریہ و مجوس کا ہے، بے شک خداوند عالم نے کچھ تکالیف شرعیہ مقرر فرمائی ہیں۔ لیکن تعمیل اور عدم تعمیل کا لوگوں کو اختیار دیا ہے۔ اسی طرح بعض امور سے ڈرانے کے لیے نہی فرمائی ہے۔ وہ تھوڑے سے عمل پر اجر کثیر عطا فرماتا ہے۔ اس کی نافرمانی اسی لیے نہیں کی جاتی کہ وہ مغلوب و مقہور ہے اور نہ اس کی اطاعت و فرمانبرداری اس لیے کی جاتی ہے کہ اس نے مخلوق کو مجبور کر دیا ہے، اور نہ اس نے زمین و آسمان کو بے کار پیدا کیا ہے اور نہ ہی اس نے انبیاءؑ و مرسلینؑ کو عبث و بے فائدہ بھیجا ہے۔ "ذلك ظن الذين كفروا فويل للذين كفروا من النار"۔ (ص:۲۷)

☆ عیون الاخبار اور کتاب التوحید میں اس روایت کا تتمہ یوں مروی ہے کہ جب حضرت علیؑ نے یہ فرمایا کہ تم اس سفر میں مجبور نہ تھے، تو......

شیخ شامی نے عرض کیا: تو پھر وہ کونسی قضا و قدر تھی جس کے مطابق ہم نے یہ سفر کیا؟

حضرت امیر علیہ السلام نے فرمایا: "الامر من الله والحاكم" ثم تلا هذه الأية: وہ امر و حکم خداوندی تھا۔ پھر اس کے ثبوت میں کہ قضا بمعنی حکم استعمال ہوتی ہے۔ آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: "وقضىٰ ربك الا تعبدوا الا اياه و بالوالدين احساناً...... اى امر ربك" (اسرا:۲۳) یعنی تمھارے رب نے یہ حکم دیا ہے کہ تم عبادت نہ کرو مگر اپنے خدا کی اور اپنے والدین کے ساتھ احسان کرو۔

اِحتجاج طبرسی میں یہ تتمہ یوں مروی ہے:

شیخ شامی: وہ قضا و قدر کونسی ہے جس کا آپؑ نے ذکر فرمایا ہے؟

حضرت امیر علیہ السلام: "الامر بالطاعة والنهى عن المعصية والتمكين من فعل الحسنة وترك المعصية والمعونة على القرب اليه والخذلان لمن عصاه والوعد والوعيد والترغيب والترهيب كل ذلك قضاء الله فى افعالنا وقدره لاعمالنا اما غير ذلك فلا تظنه فان الظن له محبط للاعمال"۔ یعنی اس قضا و قدر کا مطلب یہ ہے کہ طاعت کا حکم دینا اور معصیت سے نہی کرنا، اچھے کام کے انجام

دینے، معصیت کے ترک کرنے کی طاقت دینا، قرب ایزدی حاصل کرنے پر امداد کرنا اور جو اس کی نافرمانی کرنا چاہے اسے اپنے حال پر چھوڑ دینا ۔ نیز (مقام اِمتثال میں) وعدۂ جنّت اور وعید (دوزخ)، (جنّت کی) رغبت دلانا اور (دوزخ سے) ڈرانا ہمارے افعال و اعمال کے متعلّق قضا و قدر الٰہی کا یہ مطلب ہے ۔ اس کے علاوہ اور کوئی گمان نہ کرنا ۔ کیونکہ ایسا گمان تمام اعمال کو حبط کر دیتا ہے ۔

بہرصورت تمام روایات کے آخر میں وارد ہے کہ شیخ شامی امام عالی مقام کے ان اجوبۂ شافیہ سے بہت مسرور و شادکام ہوا۔ اور عرض کیا: "فرجت عنی فرج الله عنك" آپؑ نے عقدہ حل کر کے مجھے کشائش عطا کی ۔ خدا آپؑ کو کشائش عطا کرے ۔ پھر شیخ نے خوشی میں یہ شعر انشاء کر کے پڑھے:

انت الامام الذی نرجوا بطاعته یوم النشور من الرحمن غفرانا

"آپؑ ہی وہ امام برحق ہیں کہ جن کی اطاعت سے ہمیں امید کامل ہے کہ خداوند عالم قیامت کے دن ہمیں بخش دے گا"۔

اوضحت من دیننا ما کان ملتبسا جزاك ربك بالاحسان احسانا

"آپؑ نے ہمارے دین میں سے ان امور کو واضح کر دیا ہے جو مُشتبہ تھے خداوند عالم آپؑ کو اس احسان کی جزا احسان کے ساتھ دے"۔

یہ روایت شریفہ اس امر پر بطور نص صریح دلالت کرتی ہے کہ افعال تشریعیہ میں قضا و قدر بمعنی امر بالطاعہ و نہی از معصیت ہے ۔ اور انسان اس کی تعمیل میں مُختار ہے نہ مجبور ۔ ہاں افعال تکوینیہ میں قضا و قدر کے معنی دوسرے ہیں جو اوپر بیان کر دیے گئے ہیں ۔

تکوینی قضا و قدر کی تقسیم

وہ قضا و قدر جس کا تعلّق افعال تکوینیہ کے ساتھ ہوتا ہے، اس کی دو قسمیں ہیں:

① قضاء مبرم و محتوم و قدر حتمی، جو ٹل نہیں سکتی ہے ۔ اس کے متعلّق جناب امیر علیہ السلام کا ارشاد ہے: "تذل الامور للمقادیر حتی یکون الحتف فی التدبیر" ۔ امور اس طرح تقدیر کے تابع ہوتے ہیں کہ بعض اوقات تقدیر کے خلاف تدبیر اختیار کرنے میں ہی ہلاکت مُضمر ہوتی ہے ۔ قال الصادق علیہ السلام: "اذا جاء القدر عمی البصر" ۔ جب قدر آجاتی ہے تو آنکھ اندھی ہو جاتی ہے ۔ ولنعم ما قیل: ؎

چوں قضا آید طبیب ابلہ شود روغنِ بادام خشکی می کند

② اور دوسری قضائے غیر محتوم و قدر جو کہ صدقہ دینے اور دعا و پکار کرنے یا اس قسم کے دیگر اسباب و وسائل اختیار کرنے سے ٹل جاتی ہے۔ جیسا کہ متعدد احادیث میں وارد ہے:

"لا یرد البلاء الا الصدقة ولا یرد القضاء الا الدعاء"

کہ بلا و مصیبت کو رد نہیں کرتا مگر صدقہ اور قضا کو رد نہیں کرتی مگر دعا۔

نیز ارشادِ قدرت ہے:

"قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ" (سورۃ الفرقان:۷۷)

"اے رسولؐ! کہہ دو: اگر تمہاری دُعا و پکار نہ ہو تو میرا پروردگار تمہاری کوئی پروا ہی نہ کرے"۔

لیکن مخلوق سے یہ امر مخفی رکھا گیا ہے کہ کن امور میں قضاء حتمی ہے اور کن میں قضاء غیر حتمی ہے تاکہ ان کی دعا و پکار اور صدقات و خیرات و تعویذات اور دیگر وسائل و اسباب کا سلسلہ برابر جاری و ساری رہے اور بارگاہِ قدس سے برابر ربط و تعلق برقرار و قائم رہے۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ (سورۃ الرعد: ۳۹)

سہل اللہ امورنا و وفقنا لما یحب و یرضیٰ

مذکورہ بالا مطلب کی مزید وضاحت

باب دہم میں بذیل

حقیقت بدا

کیجائے

گی

☆

انشاء اللہ

فانتظروا انی معکم من المنتظرین

☆

باب الاعتقاد	آٹھواں باب
فی الفطرة والهداية	فطرت اور ہدایت کی بابت عقیدہ
قال الشيخ ابوجعفر اعتقادنا فی ذلك ان الله تعالىٰ فطر جميع	حضرت شیخ ابو جعفر علیہ الرحمۃ فطرت اور ہدایت کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں ہمارا عقیدہ ہے کہ:

آٹھواں باب

فطرت وہدایت کے بیان میں

قبل اس کے کہ اصل مقصد پر دلائل پیش کیے جائیں، فطرت کے معنوں کی وضاحت ضروری ہے تا کہ مقصد کے اثبات میں آسانی ہو۔ نیز واضح ہو کہ فطرت کے معنی ہیں: "ما يقضيه الشئ لو خلی و نفسه بدون مانع"۔ یعنی جب کسی چیز کو اپنی اصلی حالت پر چھوڑ دیا جائے اور کوئی مانع موجود نہ ہو تو اس وقت وہ چیز جس حالت کا تقاضا کرے اس کو اس چیز کی فطرت کہا جائے گا۔ مثلاً جب یہ کہا جاتا ہے کہ سچ بولنا انسان کی فطرت ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی مانع موجود نہ ہو تو انسان کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ سچ بولے یا جیسے جب یہ کہا جائے کہ ثقیل چیز کا نیچے گرنا فطری وطبعی ہے تو اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ اگر کوئی مانع قوی موجود نہ ہو تو ایسی چیز نیچے ہی کو آتی ہے۔

اب یہ فطرت اکثر اوقات تو اپنی اصلی حالت پر برقرار رہتی ہے مگر کبھی کبھی بعض وجوہ کی بنا پر بدل بھی جاتی ہے۔ یعنی جب تک کوئی مانع قوی موجود نہ ہو تو وہ اصلی حالت پر برقرار رہتی ہے۔ اور جب کوئی مانع قوی آجائے تو وہ بدل جاتی ہے۔ مثلاً ابھی اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ انسان کی فطرت سچ کی متقاضی ہے۔ لیکن بعض اوقات ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ انسان جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ثقیل شے کا تقاضا تو نیچے گرنا ہے، لیکن بعض اوقات قسر قاسر سے خلافِ فطرت اوپر کو چلی جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جب خارجی دباؤ کا اثر ختم ہو تو پھر "كل شیء يرجع الى اصله"۔

اس تمہید کے بعد اب قابل غور امر یہ ہے کہ آیا انسان کی فطرت ہستی باری تعالیٰ کے اقرار کی مقتضی ہے یا انکار کی؟ اس امر کی کما حقہ تحقیق اس کتاب کے دیباچہ میں کی جا چکی ہے۔ اور ادلہ و

الخلق علی التوحید و ذلك قوله عز و جل فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا و قال الصادق علیه السلام

خداوند عالم نے تمام بندوں کو معرفتِ توحید پر پیدا کیا ہے، جیسا کہ وہ خود ارشاد فرماتا ہے: یہ اسلام وہ دین ہے جس پر خدا نے تمام آدمیوں کو پیدا کیا ہے (روم:۳۰) حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام

براہین قطعیہ سے توحید کا فطری و جبلی ہونا محقق و مبرہن کیا جا چکا ہے اور جو شخص بھی انسانی وارداتِ قلبیہ اور اس کے تقاضاہائے فطریہ اور اس کے عقائد مذہبیہ کی تاریخ سے واقفیت حاصل کرے گا، وہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گا کہ اقرار توحید صانع عالم انسان میں فطری و طبعی ہے۔ چنانچہ عقل سلیم و قرآنِ کریم اور احادیث پیمبر اسلامؐ وائمہؑ طاہرین صلوات اللہ علیہم اجمعین اور مشاہدۂ قطعیہ سے بھی اس امر کی تائید و تشئید ہوتی ہے۔ چنانچہ آیۂ مبارکہ: فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا (روم: ۳۰) کی تفسیر میں ائمۂ اطہارؑ کی متعدد احادیث کتب معتبرہ میں موجود ہیں، جن میں یہ وارد ہے کہ یہاں فطرۃ سے مراد توحید ہے۔ (تفسیر صافی و برہان) اسی طرح پیغمبر اسلامؐ کی یہ حدیث عند الفریقین مشہور و مسلّم ہے کہ: "کل مولود یولد علی الفطرۃ ثم ابواہ یھودانه او ینصرانه او یمجسانه"۔ یعنی "ہر بچہ فطرتِ اسلامیہ توحیدیہ پر پیدا ہوتا ہے۔ بعد ازاں اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی، یا مجوسی بنا دیتے ہیں"۔ اور مشاہدہ بھی شاہد ہے کہ جب بھی کسی خالی الذہن انسان سے یہ سوال کیا جائے کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو وہ فوراً یہ کہہ دیتا ہے کہ: "خدا نے"۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس امر کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وَ لَئِنۡ سَاَلۡتَہُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ لَیَقُوۡلُنَّ اللّٰہُ (سورة لقمان:۲۵)

"اے رسولؐ! اگر تم کفار سے یہ پوچھو کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ کہہ اٹھیں گے اللہ نے"۔

انسان تو انسان، یہاں تو یہ حالت ہے کہ ؎

ہر گیاھے کہ از زمیں روید وحدہٗ لا شریك له گوید

بالاختصار جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے حضرت مصنف علام کی فرمائش کی تائید مزید ہو جاتی ہے۔

توحید کے فطری ہونے کے متعلق ایک شبہ کا ازالہ

بعض اعلام نے اس نظریہ پر جو یہ اعتراض کیا ہے کہ: "لوکان الامر کذلك ما کان مخلوق الا موحداً فی وجودنا من المخلوقین من لا یوحد اللہ"۔ یعنی اگر یہ بات درست ہوتی (کہ توحید فطری امر ہے) تو پھر چاہیے تھا کہ تمام مخلوق موحد و خدا پرست ہوتی۔ حالانکہ ایسے آدمی موجود ہیں جو کہ توحید

فی قولہ تعالیٰ و ما کان اللہ لیضل قومًا بعد اذ ھدیھم حتی یبین لھم ما یتقون قال حتی یعرفھم ما یرضیہ و ما یسخطہ و قال فی قولہ تعالیٰ فالھمھا فجورھا و تقویھا

نے خدا کے اس ارشاد کہ "اللہ کسی کو ہدایت کرنے کے بعد اس سے توفیق سلب نہیں کرتا جس سے وہ گمراہ ہوجائے، یہاں تک کہ ان کے لیے وہ چیزیں کھول کر بیان کردے، جن سے بندوں کو ڈرنا چاہیے" (توبہ:۱۱۵) کی تفسیر میں کہ خدا کے کھول کر بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بطور اتمام حجت اپنے بندوں کے لیے وہ تمام

کے قائل نہیں ہے۔ یہ اعتراض بالکل درجہ اعتبار سے ساقط ہے۔ کیونکہ یہ اشکال اس خام خیالی پر مبنی ہے کہ توحید لوگوں کے اندر خلق کردی گئی ہے کہ وہ اس کی خلاف ورزی نہیں کرسکتے۔ اور یہ سراسر غلط ہے، کیونکہ اوپر واضح کردیا گیا ہے کہ کسی چیز کے فطری ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر مانع مفقود ہو اور کوئی رُکاوٹ موجود نہ ہو تو اس وقت کسی چیز کا فطری اثر ظاہر ہوتا ہے۔ جسے علمی الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ: "فطرت میں فقط اقتضاء پائی جاتی ہے، نہ الجاء و اکراہ"۔ لہٰذا موانع کی وجہ سے مُقتضائے فطرت میں تبدیلی ہوسکتی ہے۔ اس امر کا تذکرہ خود حدیث نبوی: "ثم ابواہ یھودانہ ......" میں موجود ہے۔ لہٰذا دنیا میں مُنکرین خدا موجود ہیں تو وہ یا تو برے ماحول اور غلط سوسائٹی کا شاہکار ہیں، یا شیاطین انسی وجنی کے دامِ تزویر میں گرفتار ہوکر یا خواہشاتِ نفسانیہ کی قید میں مُقید اور ظنون و اوہام کے مخمصے میں مبتلا ہوکر توحید کا انکار کرتے ہیں۔ جیسا کہ رب العزت نے اپنے کلام پاک میں اس امر کی خبر دی ہے:

وَ قَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيَا وَ مَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (سورۃ الجاثیۃ:۲۴)

یعنی (مُنکرین توحید) کہتے ہیں کہ سوائے زندگانی دنیا کے اور کوئی زندگی نہیں، ہم اب زندہ ہیں، پھر مرجائیں گے، اور ہمیں نہیں مارتا مگر زمانہ۔ ان لوگوں کی یہ باتیں کسی علم ویقین کی بنا پر نہیں بلکہ یہ ان کے محض ظنون واوہام ہیں۔

ایک اور مقام پر ان کے ان پریشان خیالات کو قدرت نے "خرص" یعنی گمان و تخمین سے تعبیر کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ

(سورۃ الزخرف: ۲۰)

قال بين لها ما تاتي و ما تترك من المعاصي و قال تعالیٰ انا هدينه السبيل اما شاكرًا و اما كفورًا	امور واضح طور پر بیان کردے جو اس کی خوشنودی کا باعث ہوں اور ان باتوں سے بھی آگاہ فرمادے جو اس کی ناراضی کا سبب ہیں۔ نیز انہی جنابؑ سے خدا کے اس ارشاد کہ خدا نے ہر آدمی کو بدکاری اور پرہیزگاری کے متعلق پہچان عطا کردی ہے کی تفسیر

دین اسلام کے دین فطرت ہونے نیز معیارِ صداقت کا بیان

انہی حقائق سے یہ امر بھی واضح ہوجاتا ہے کہ اسلام دین فطرت ہے۔ کیونکہ جس کی اصل الاصول فطری ہے، اس کے دیگر اصول و فروع بھی فطری ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض روایات میں "فطرت الله التی فطر الناس علیہا" (روم: ۳۰) کی تفسیر دین اسلام سے کی گئی ہے۔ چنانچہ کتاب توحید میں بروایت عبداللہ بن سنان حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ فطرت سے مراد دین اسلام ہے۔ اس حقیقت کی مختصر توضیح یہ ہے کہ اس وقت دنیا کے اندر بے شمار مذاہب و ادیان پائے جاتے ہیں اور ہر دین اس کا مدعی ہے کہ وہی دین، خدا کا پسندیدہ دین ہے۔ اور وہی انسانوں کی دنیوی نجاح اور اخروی فلاح کا کفیل ہے اور یہ کہ وہی برحق اور دوسرے سب ادیان باطل ہیں۔ سچ ہے: ؎

عاقل بعقل خود نازد و مجنوں بجنون
کل حزب بما لدیھم فرحون

لیکن ان کے اصول و فروع کا باہمی اختلاف اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ نہ تو یہ سب مذاہب صادق ہوسکتے ہیں اور نہ ہی سب کاذب (کیونکہ اجتماعِ ضدین وارتفاعِ نقیضین محال ہے) اندریں حالات عقلِ سلیم مجبور کرتی ہے کہ کوئی ایسا معیار ہونا چاہیے جس سے سچے اور جھوٹے مذہب کے درمیان اِمتیاز قائم کیا جاسکے۔ معیار و میزان کس چیز کو قرار دیا جائے؟...... یہ امر بہت غور طلب ہے۔ اگر آسمانی کتب کو معیار قرار دیا جائے تو اتفاق نہ ہوسکے گا۔ ہر صاحبِ دین علیحدہ کتاب پیش کردے گا۔ اگر علماء کو میزان قرار دیا جائے تو ان کا باہمی اختلاف معلوم، اگر عقول و افہام کو کسوٹی بنایا جائے تو ان کا اِفتراق مشاہد و محسوس۔ معیار تو ایسا ہونا چاہیے کہ جسے تمام ادیان بخوشی قبول کرلیں، اور ہر شخص خواہ جس مسلک کا سالک اور جس ملک کا ساکن اور جس نسل کا فرد ہو، اس معیار کو بلا چون و چرا تسلیم کرلے۔ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسا جامع و مانع مکمل معیار سوائے فطرتِ صحیحہ کے اور کوئی نہیں ہے۔ یہی فطرتِ سلیمہ ہی وہ چیز ہے جو بلا امتیاز رنگ و نسل اور بلا افتراق ملک و

قال عرفناه اما اخذًا و اما تارکا و فی قوله عزو جل و اما ثمود فهدیناهم فاستحبوا العمی علی الهدی قال و هم

میں مروی ہے ۔ فرمایا خدا نے وہ امور بھی بتادیے ہیں جن کو بجالانا چاہیے اور ان گناہوں سے بھی آگاہ کر دیا ہے جن سے اِجتناب کرنا چاہیے ۔ ایک اور مقام پر خداوند عالم فرماتا ہے: ہم نے انسان کو حق کا راستہ دکھا دیا ہے، اب اس کی مرضی خواہ وہ

ملت اور بلاتمیز مرد و زن سب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے ۔ لہٰذا یہی فطرت ہی معیارِ حق و باطل بننے کی صلاحیت رکھتی ہے ۔ لہٰذا اب صحیح اور قابلِ قبول دین وہی ہوگا جس کے اصول و آئین قوانین فطرت کے مطابق ہوں گے ۔

دینِ اسلام کے فطری ہونے کا اثبات

پس جب یہ امر مبرہن ہوگیا کہ کسی مذہب اور دین کی صداقت و حقانیت معلوم کرنے کا معیار فطرت ہے ۔ یعنی یہ کہ اس کے تمام اصول و عقائد اور فروع و احکام فطرتِ سلیمہ کے مطابق ہوں تو اب ہم بیانگِ دُہل اور بلا خوفِ رد کہہ سکتے ہیں کہ تمام ادیانِ عالم میں فقط دین اسلام ہی اس معیار پر پورا اترتا ہے اور تنہا یہی دین فطرت کہلانے کا حق دار اور خالق فطرت کا مقرر کردہ آئین ہونے کا دعویٰ کرسکتا ہے ۔ باقی جس قدر ادیان ہیں وہ اس معیار پر پورے نہیں اترتے ۔ اگر چہ اس دعویٰ کو مُتعدّد طرق و اسالیب سے ثابت کیا جاسکتا ہے مگر بنظرِ اختصار ہم یہاں صرف چند طرق کا اجمالی تذکرہ کرتے ہیں ۔

① **طریق اول:** یہ امر اپنے مقام پر مُحقّق و مبرہن کیا جا چکا ہے کہ انسان کی حقیقت یہی جسم مادی و محسوس نہیں ہے، جو چند عناصر سے مرکب ہے جو وقتاً فوقتاً بڑھتا اور گھٹتا رہتا ہے اور بالآخر فنا ہوجاتا ہے ۔ جیسا کہ مادیین کا خیال ہے ۔ بلکہ اس جسم کے ساتھ ایک اور ایسا جوہر لطیف بھی موجود ہے جو درحقیقت جوہر انسانیت ہے، جسے روح کہا جاتا ہے، جو آثار و خواص میں جسم سے بالکل مختلف اور مُتضاد ہے ۔ مثلاً جسم کثیف ہے اور وہ لطیف جسم مادی ہے، وہ نورانی، جسم فانی ہے اور وہ باقی ۔ الیٰ غیر ذلك من الفوارق الکثیرة ۔

یہاں اس بحث میں پڑنا مقصود نہیں ہے کہ انسان تین امور (جسم و روح اور نفس) یا دو امور (جسم و روح) کے مجموعہ کا نام ہے، بلکہ یہاں اصل مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ انسان میں مادی و روحانی دو جذبے ہیں اور چونکہ کوئی بھی دین انسان کی فلاح و بہبود اور ترقی کا ضامن و کفیل ہوتا ہے، لہٰذا کامل

یعرفون و سئل عن الصادق و ھدیناہ النجدین قال نجد الخیر و نجد الشر و قال و ما حجب اللہ علمہ عن العباد فھو موضوع	شکر گزار بنے یا کفر اختیار کرے (دہر:۳) اس کی تفسیر میں امامؑ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے انسان کو نیک و بد افعال کی معرفی کرادی ہے، اب ان کو بجالانا یا ترک کرنا اس کے متعلق ہے۔قولِ خدا"ہم نے قوم ثمود کو حق کا راستہ دکھا دیا، مگر انھوں نے ہدایت کے مقابلہ میں گمراہی کو پسند کیا" (حم سجدہ:۱۷) کی تفسیر میں حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ان لوگوں نے حق کو پہچاننے کے باوجود گمراہی کو اختیار کیا۔ارشادِ الٰہی :

دین اور دین فطرت وہ ہوگا جو انسان کے تمام جسمانی و رُوحانی شعبوں پر حاوی ہو۔ اور اس کے جسمانی و روحانی تقاضوں کو پورا کرنے پر قادر ہو اور اس کی دنیوی و دینی نجاح و فلاح کی کفالت کر سکتا ہو، اور ایسا دین جس میں انسان کے ان جملہ تقاضوں کو پورا کرنے کا خاص خیال رکھا گیا ہو، بجز دین اسلام کے اور کوئی دین موجود نہیں ہے، باقی تمام ادیان میں یہ نقص موجود ہے کہ ان میں یا تو محض مادی ترقی پر زور دیا گیا ہے جس سے انسان کی اخروی حیات کو قطعاً نظر انداز کر دیا گیا ہے یا فقط اخروی حیات اور روحانی غذا کو اس قدر اہمیت دی گئی ہے کہ دنیوی زندگی اور مادی تقاضوں کو بالکل کچل کر رکھ دیا گیا ہے۔ لیکن دین اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جو انسان کی اس کی زندگی کے ہر ہر شعبے میں رہبری کرتا ہے اور دین و دنیا کا بہترین امتزاج پیش کرتا ہے۔ اسلام دنیا کو مزرعہ آخرت قرار دیتے ہوئے بتلاتا ہے کہ جو کچھ کرو گے اس کا ثمرہ وہاں پاؤ گے، ترک دنیا، اسلام میں جائز نہیں۔ امام علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: "لیس منا من ترک الدنیا للأخرۃ و من ترک الأخرۃ للدنیا" وہ شخص ہم سے نہیں یعنی ہمارا پیروکار نہیں جو آخرت کے لیے دنیا اور دنیا کے لیے آخرت چھوڑ دے۔ اور یہی فطرت کا تقاضا ہے۔ اسلام میں روح و جسم کے تقاضوں کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، اور دونوں کی غذا بطریق احسن مہیا کی گئی ہے۔ یوں سمجھیے کہ دین اسلام اعتقاد و عمل کی ایک معجونِ مرکب ہے۔ جس کا اثر انسان کی دنیوی اور اخروی زندگی پر برابر پڑتا ہے جس طرح ہر معجون کے لیے کچھ اجزا ہوتے ہیں، جن کی مقدار کم و بیش ہوتی ہے، اسی طرح اسلام کی معجون میں نماز کی کچھ رکعتیں ہیں، صوم کے کچھ حدود ہیں۔ ان کو اخلاقِ حسنہ کی آنچ پر عقائد صحیحہ کے پانی میں قوام دے کر اس طرح تیار کیا گیا ہے کہ "تؤتی اکلھا کل حین (ابراہیم:۲۵) فیہ ماتشتہیہ الانفس و تلذ الاعین"۔

② طریق دوم: اسلام کے عقائد اور قوانین اس امر کے شاہد عادل ہیں کہ اسلام دین فطرت

عنهم و قال ان الله تعالیٰ احتج علی الناس بما اٰتیهم و عرفهم

"ہم نے انسان کو دونوں راستے دکھا دیے ہیں" (دہر:۳) کے متعلق کسی نے حضرت صادق علیہ السلام سے سوال کیا کہ ان دو راستوں سے مراد کونسے راستے ہیں؟ فرمایا: یہ نیکی اور بدی کے راستے ہیں۔ پھر فرمایا: خدانے جن باتوں کا علم اپنے بندوں سے مخفی رکھا ہے ان کی تکلیف بھی ان سے ساقط کر دی ہے۔ہاں جو احکام ان کے پاس بھیجے اور ان کا علم بھی عطا کیا (انہی کی بندوں کو تکلیف دی ہے) اور انہی کے ذریعہ ان پر حجت قائم کی ہے

ہے۔ یعنی انسان کی صحیح فطرت کے عین مطابق ہے۔ اس کے برعکس دیگر مذاہب فطرتِ انسانی کے بالکل مخالف ہیں۔ اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ لیکن اختصار مانع ہے۔ رہبانیت، ترک لذائذ، ایذاء نفس وغیرہ امور جو بعض مذاہب میں داخل ہیں، اسلام میں ان کا نام ونشان نہیں۔ اس میں لذائذ دنیا اور حظوظ عاجلہ اپنے مقررہ قواعدوضوابط کے ساتھ جائز ومباح ہیں۔ اسلام میں یہ سہولت پائی جاتی ہے کہ وہ انسان کی فطرت کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ کہیں اس کے خلاف نہیں جاتا، اور یہی امر اس کا مابہ الامتیاز ہے۔ ارشادِ قدرت ہے: يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (سورۃ البقرۃ:۱۸۵) نیز ارشادِ ایز دی ہے: وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ (سورۃ الحج: ۷۸)

دین اسلام کا کوئی اصولی یا فروعی مسئلہ ایسا نہیں جسے عقلِ سلیم اور مستقیم قبول کرنے سے ابا و انکار کرے، اسلام کے ہر ہر حکم میں اس قدر فوائد وعوائد اور ہر ہر نہی میں اس قدر مضار ومفاسد مُضمر ہیں کہ جب ان کی کنہ میں غور کیا جاتا ہے تو عقل انسانی حیران ہوکر رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جوں جوں علوم وفنون میں ترقی ہوتی جاتی ہے جس سے دیگر ادیانِ عالم کی جڑیں کھوکھلی ہورہی ہیں، وہاں اسلام کی صداقت وحقانیت بحمدہٖ تعالیٰ اور زیادہ روشن واُجاگر ہورہی ہے۔

④ **طریق سوم**: اسلام میں دو باتوں پر زور دیا گیا ہے (اول) یہ کہ انسان اپنی کوشش کے ساتھ ساتھ اپنے معاملات کو قدرتِ کاملہ کے سپرد کردے اور کامیابی وکامرانی حاصل کرنے میں اس کی ذات پر بھروسا کرے اور (دوم) یہ کہ مخلوقِ خدا کے ساتھ اپنے تعلقات وروابط اچھے رکھے۔ وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ (سورۃ النساء:۱۲۵) اس سے بہتر کس کا دین ہوسکتا ہے جو اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کردے اور مخلوقِ خدا کے ساتھ صلح وآشتی سے پیش آئے۔ اور یہی فطرت کا تقاضا ہے۔

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

پس ان حقائق کی روشنی میں معلوم ہوجاتا ہے کہ دین اسلام دین فطرت ہے، جو خالق فطرت کا مقرر کردہ دین ہے۔ فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا ؕ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا ؕ لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَلۡقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ ۙ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ (سورۃ الروم: ۳۰)

④ طریق چہارم: اسلام میں نجاح وفلاح کی بنیاد ایمان وعمل پر رکھی گئی ہے۔ اعتقاد صحیح کے بغیر عمل خواہ کتنا ہی عمدہ اور زیادہ کیوں نہ ہو، نجات کے لیے ناکافی قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح اعتقاد کیسا ہی مضبوط ہو، اگر اس کے ساتھ عمل صالح نہیں تو وہ بھی نجات کے لیے کافی نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں جہاں بھی کسی گروہ سے نجاتِ اخروی کا وعدہ کیا گیا ہے وہاں ایمان وعمل کو توام بیان کیا ہے۔ "ان الذین اٰمنوا و عملوا الصالحات" مکمل اسلام و ایمان کیا ہے؟ "الاقرار باللسان و التصدیق بالجنان و العمل بالارکان"۔ نجات کے لیے نہ تنہا اعتقاد کافی ہے اور نہ تنہا عمل۔ لیکن اسلام کے علاوہ جس قدر مذاہب ہیں، ان میں نجات کا دار و مدار ان دو میں سے فقط ایک پر رکھا گیا ہے۔ بودھ مذہب و جین مت میں عمل پر بہت زور دیا گیا ہے۔ لیکن اعتقاد کو ہرگز درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ اور یہودیت و مسیحیت نے عمل کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ پاپائے اعظم کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ رقم لے کر عملی خامیوں کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ (فاعتبروا یا اولی الابصار)

ان حقائق سے واضح ہوگیا کہ دین اسلام ہی دین فطرت ہے۔ اسی بنا پر ارشادِ قدرت ہے:

اِنَّ الدِّيۡنَ عِنۡدَ اللّٰهِ الۡاِسۡلَامُ (سورۃ آلِ عمران: ۱۹)

خداوند عالم کے نزدیک دین اسلام ہی برحق ہے۔

وَمَنۡ يَّبۡتَغِ غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِيۡنًا فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡهُ ۚ وَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ (سورۃ آلِ عمران: ۸۵)

جو شخص بھی دین اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرے گا وہ آخرت میں خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔

الحمد للہ الذی ھدانا لدینہ الذی ارتضاہ و سبیلہ الذی اجتباہ

باب الاعتقاد

فی الاستطاعت

قال الشیخ ابوجعفر اعتقادنا فی ذالک ما قاله موسیٰ بن جعفر علیهما السلام حین قال له یکون العبد مستطیعًا قال نعم بعد اربع خصال ان یکون مخلی السرب صحیح الجسم سلیم الجوارح له سبب وارد من الله تعالیٰ فاذا تمت هذه فهو مستطیع فقیل له مثل ای شئ

نواں باب

بندوں کی اِستطاعت کے متعلق عقیدہ

حضرت ابن بابویہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس مسئلہ میں ہمارا وہی عقیدہ ہے جو امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے ایک شخص کے جواب میں ارشاد فرمایا تھا جبکہ اس نے آنجنابؑ کی خدمت میں عرض کیا کہ یا ابن رسول اللہؐ! کیا بندوں کے لیے بھی کچھ قدرت و استطاعت ثابت ہے؟ فرمایا: ہاں، چار شرطوں کے بعد انسان مُستطیع ہو جاتا ہے۔ اول یہ کہ: اس کا راستہ صاف ہو کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ: وہ صحیح الجسم و تندرست ہو۔ تیسرے یہ کہ: اس کے اعضاء و جوارح صحیح و سالم ہوں اور چوتھی شرط یہ ہے کہ: خداوند عالم کی طرف سے ایک سبب خاص

نواں باب

اِستطاعت کا بیان

مسئلہ اِستطاعت میں اہل اِسلام کے اِختلاف کا اِجمالی بیان

دیگر اکثر مسائل کی طرح اس مسئلہ میں بھی مُسلمانوں کے درمیان اِختلاف ہے۔ اور یہ مسئلہ درحقیقت مسئلہ جبر و اختیار کے فروع میں سے ہے۔ چنانچہ بعض فرقے تو بندہ کی استطاعت و قدرت کے بالکل ہی مُنکر ہیں، اور بعض حضرات عند الفعل اس کے قائل اور قبل از فعل مُنکر ہیں۔ جیسا کہ کتاب "التوحید" میں عوف بن عبد ازدی سے مروی ہے، وہ اپنے چچا سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے جناب صادق علیہ السلام سے اِستطاعت کے متعلق سوال کیا۔ آپؑ نے از رُوئے تعجب فرمایا: "وقد فعلوا" آیا ان لوگوں نے اس مسئلہ میں بھی بحث شروع کر دی ہے؟ راوی نے عرض کیا: ہاں! "زعموا انها لا یکون الا عند الفعل و ارادة الفعل لا قبله" ان لوگوں کا گمان ہے کہ اِستطاعت فعل کرتے وقت تو ہوتی ہے مگر اس سے قبل نہیں ہوتی۔ آپؑ نے یہ سن کر فرمایا: "اشرك القوم" یہ لوگ مشرک ہیں۔

فقال یکون الرجل مخلی السرب صحیح الجسم سلیم الجوارح و لا یقدر ان یزنی الا ان یری امرأة فاذا وجد المرأة فاما ان یعصم فیمتنع کما امتنع یوسف و اما ان یخلی السرب بینه و بینها فیزنی فھو زان و لم یطع اللہ باکراہ و لم یعص بغلبة و سئل الصادقؑ عن قول اللہ عزو جل و قد کانوا یدعون الی السجود و ھم

خاص حاصل ہو۔ جس وقت یہ چاروں شرطیں انسان میں پائی جائیں ،اس وقت وہ مُستطیع کہلاتا ہے۔عرض کیا گیا: اس کی مثال کیا ہے؟...... آں جنابؑ نے فرمایا کہ: "ایک شخص بالکل آزاد ہے، کوئی روک ٹوک نہیں، بدن اس کا صحیح اور اعضاء اس کے سالم ہیں، بایں ہمہ اگر وہ زنا کرنا چاہے تو وہ اس پر قادر نہیں، جب تک اسے کوئی عورت نہ مل جائے۔اب جب عورت اسے مل گئی تو پھر یا تو وہ بتوفیق خداوندی زنا سے باز رہے گا، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام باز رہے تھے۔ یا اس عورت کے ساتھ تخلیہ میں زنا کرکے زانی کہلائے گا۔ پس نہ تو اس نے مجبور ہوکر خدا کی اطاعت کی ہے، اور نہ ہی خدا پر غلبہ پاکر اس نے اس کی نافرمانی کی ہے۔ خداوندعالم کے اس قول کہ: "لوگوں کو سجدہ کا حکم دیا جاتا تھا، اس حالت میں کہ وہ صحیح وسالم تھے" (سورۃ قلم:۴۳) کے بارے میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ: اس کا کیا مطلب ہے؟

اس مسئلہ میں شیعہ خیر البریہ کے نظریہ کا بیان

اس مسئلہ میں اہل حق کا یہ اعتقاد ہے کہ یہ قدرت بندہ میں فعل سے قبل اور اس کی بجا آوری کے وقت بلکہ امرونہی سے بھی پہلے موجود ہوتی ہے۔ جیسا کہ "کتاب التوحید" میں بروایت جناب ہشام بن سالم حضرت صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آنجنابؑ نے فرمایا: "ما کلف اللہ العباد کلفة فعل و لانھاھم عن شیٔ حتی جعل لھم الاستطاعة ثم امرھم و نھاھم فلایکون العبد اخذاً و لا بتارک الا باستطاعة متقدمة قبل الامر و النھی و قبل الاخذ و الترک و قبل القبض و البسط "۔ یعنی خداوندعالم نے اس وقت تک اپنے بندوں کو کسی امر یا نہی کی تکلیف نہیں دی، جب تک پہلے ان کو استطاعت عطا نہیں فرمائی۔ اس کے بعد ان کو کسی چیز کا حکم یا کسی چیز کی ممانعت فرمائی ہے۔ پس بندہ کسی امر پر عمل نہیں کرتا اور نہ ہی کسی ممنوع امر کو ترک کرتا ہے مگر اس استطاعت کے ذریعہ سے جو امرونہی اور فعل و ترک اور حرکت وسکون سے پہلے موجود ہوتی ہے۔ ہاں یہ درست ہے کہ یہ استطاعت وقدرت سب کی اپنی ذاتی اور استقلالی نہیں ہے بلکہ خداوندعالم کی عطا کردہ ہے۔ جیسا کہ جناب امیرالمومنین علیہ السلام

سالمون قال مستطيعون الاخذ بما امروا به و بترك ما نهوا عنه و بذالك ابتلوا و قال ابو جعفر فی التوراية مكتوب يا موسىٰ انی خلقتك و اصطفيتك و هديتك

فرمایا کہ یہ لوگ احکامِ خدا بجالانے اور ممنوع امور سے باز رہنے کی قدرت رکھتے تھے، اسی بنا پر ان کا امتحان لیا گیا تھا۔ امام پنجم حضرت باقر العلوم علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں کہ توریت میں یہ لکھا ہوا ہے کہ خداوند کریم نے فرمایا: اے موسیٰ! میں نے تمھیں پیدا کر کے اپنے بندوں سے چن لیا

نے ایک ایسے آدمی سے دریافت فرمایا تھا جو قضا و قدر کے مسئلہ میں گفتگو کر رہا تھا کہ: "ابا الله تستطيع ام مع الله ام من دون الله" کیا تو اللہ سبحانہ کے ذریعے مُستطیع ہے، یا اللہ جل شانہ کے ساتھ شریک ہوکر یا بغیر اللہ عزوجل کے خود بخود مُستطیع ہے؟ اس شخص نے جواب دیا: "لا بل بالله استطيع" نہیں جناب! مَیں تو اللہ کے ذریعے مُستطیع ہوں۔

آنجنابؑ نے اس کا یہ جواب باصواب سن کر ارشاد فرمایا:

"اما انك لوقلت غير هذا لضربت عنقك"

آگاہ باش! اگر تو اس کے علاوہ کوئی اور جواب دیتا تو میں تیری گردن اڑا دیتا۔

اور یہ امر بھی واضح ہے کہ استطاعت و قدرت انہی شرائط کی موجودگی میں حاصل ہوتی ہے، جو اس حدیث شریف میں مذکور ہے جو کہ متن رسالہ میں موجود ہے۔

کتاب التوحید میں ایسی ہی ایک روایت جناب امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے، اور اس کی مؤید اور بہت سی روایات کتاب التوحید اور بحار الانوار وغیرہ میں مروی ہیں۔

بہر حال اس مسئلہ میں بھی صحیح عقیدہ وہی ہے جو مسئلہ جبر و اختیار میں گزر چکا ہے کہ: "لا جبر و لا تفويض بل امر بين الامرين" اور یہ وہ معقول و مکمل نظریہ صحیح ہے کہ مخالفین کے بعض سرآمد روزگار علمائے اعلام بھی اس کی صحت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ چنانچہ:

علامہ فخر الدین رازی مسئلہ جبر و اختیار میں طویل گفتگو اور بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"و نحن نقول الحق ما قال بعض ائمة الدين لا جبر و لا تفويض بل امر بين الامرين"

اس مسئلہ میں حق بات وہ ہے جو بعض ائمہ دین (ائمہ اہل بیت علیہم السلام) نے فرمائی ہے کہ نہ جبر ہے نہ تفویض بلکہ امر اس کے بین بین ہے۔

سچ ہے: "الحق يعلوا و لا يعلىٰ عليه"

و قوتیك و امرتك بطاعتی و نهیتك عن معصیتی فان اطعتنی اعنتك علی طاعتی و ان عصیتنی لم اعنك علی معصیتی و لی المنته علیك فی طاعتك و لی الحجة علیك فی معصیتك لی	تجھے ہدایت فرمائی اور اپنی اطاعت کا حکم دیا اور نافرمانی سے منع کیا۔ اگر تم میری اطاعت کروگے تو میں تمھاری اعانت کروں گا' اور اگر تم نے میرے احکام کی خلاف ورزی کی تو میں دستِ تعاون روک لوں گا، جب تم میری اطاعت کروگے تو اس موقع پر میرا اعانت کرنا تم پر احسان ہوگا، اور نافرمانی کے وقت میری طرف سے تم پر حجت تمام ہوگی۔

ازالۂ شبہ

بعض روایات میں بندے کی استطاعت کی نفی وارد ہے، جیسا کہ اصول کافی وغیرہ میں ایسی بعض روایات موجود ہیں تو ان روایات کا جواب یہ ہے کہ ایسی سب روایات استطاعتِ مستقلہ کی نفی پر محمول ہیں۔ یعنی بندہ خود بخود بالذات مُستطیع نہیں ہے۔ اور یہ امر درست بھی ہے۔ جیسا کہ اوپر اس کی وضاحت کی جا چکی ہے۔ نیز ممکن ہے کہ یہ روایات مقام تقیہ میں وارد ہوئی ہوں۔ بہرکیف ان سے نفی استطاعت پر استدلال کرنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔

اِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيْلَ
اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا
كَفُوْرًا

☆

(سُوْرَةُ الدَّهْرِ:۳)

☆

باب الاعتقاد

فی البدأ

قال الشیخ ابوجعفر ان الیھود قالوا ان اللہ تبارک و تعالیٰ قد فرغ من الامر، قلنا بل ھو تعالیٰ

دسواں باب

عقیدۂ بدأ اور اس کی حقیقت

حضرت شیخ ابو جعفر علیہ الرحمہ فرماتے ہیں یہودی اس بات کے قائل ہیں کہ خداوند تبارک و تعالیٰ تمام کاموں سے فراغت پاکر اب بیکار ہو گیا ہے۔ مگر اس بارے میں ہمارا عقیدہ یہ ہے

دسواں باب

اعتقاد بدأ اور اس کی اصل حقیقت کا بیان

مسئلۂ بدأ کی اہمیت اور اس میں اختلاف کے نزاع لفظی ہونے کا بیان

مسئلہ بدأ ان معرکۃ الآرا اسلامی مسائل میں سے ہے کہ جن پر فریقین کی طرف سے ایک دوسرے پر بہت کچھ نقد و تبصرہ اور نقض و ابرام ہو چکا ہے۔ ہمارے برادرانِ اسلامی اپنی خوش فہمی سے یہ سمجھتے ہیں کہ مسئلہ بدأ مذہب امامیہ کے خصائص میں سے ہے، اس لیے حقیقت حال سے جہالت یا تجاہل کی وجہ سے ہمیشہ اہل حق پر زبانِ اعتراض دراز کرتے رہتے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس مسئلہ کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی یا پھر اپنی بعض مخصوص مصلحتوں کے تحت اسے غلط طریقہ پر پیش کر کے محل نزاع اور معرکۃ الآراء بنا دیا ہے۔ جیسا کہ اکثر اختلافی مسائل کی یہی کیفیت ہے۔ اگر چند لمحات کے لیے ہر قسم کے تعصّبات اور جذبات سے بالاتر ہو کر اس مسئلہ کی کنہ حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کی جائے اور اس مُعمہ کو حل کرنے کے لیے تھوڑے سے غور و فکر اور امعانِ نظر سے کام لیا جائے تو معلُوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں جو کچھ اختلاف ہے اس کی نزاع لفظی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ورنہ فی الحقیقت کوئی اختلاف نہیں ہے، بلکہ یہ مسئلہ فریقین کے نزدیک حقائق اسلامیہ سے ایک عظیم الشان حقیقت اور عقائد صحیحہ میں سے ایک صحیح عقیدہ ہے۔ اس کا اقرار و اعتقاد رکھنا صفاتِ الٰہیہ میں سے ایک نہایت اجل وارفع صفت یعنی ارادۂ باری اور صفتِ قدرت کے مظاہر میں سے ایک جلیل القدر مظہر کے اعتراف کے مترادف ہے۔ عقیدۂ بدأ کے ذریعہ یہودیوں یا ان کے ہم مسلک دوسرے ان لوگوں کے اس غلط نظریہ کی رد ہو جاتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ خدا نے جو کچھ کرنا تھا

کل یوم ھو فی شأن لا یشغلہ شان	کہ خدا ہر وقت کوئی نہ کوئی کام کرتا رہتا ہے اور ایک کام کا کرنا
عن شان یحیی و یمیت و یخلق و	اسے دوسرے کام سے باز نہیں رکھ سکتا۔ وہی زندہ کرتا ہے
یرزق و یفعل ما یشآء و قلنا	اور وہی مارتا ہے۔ وہی پیدا کرتا ہے اور وہی روزی دیتا

وہ کر چکا۔"جف القلم بما کان و ما ھو کائن"۔قلم خشک ہوگیا ہے اور اس نوشتہ میں اب کسی قسم کا تغیر وتبدل بھی نہیں ہوسکتا۔ یا یہ عقیدۂ فاسدہ رکھتے ہیں کہ خدا نے اپنے خدائی اختیارات اپنی بعض مخلوق کے حوالہ کر دیے ہیں اور اب خود معطل اور بیکار محض ہے۔"یقولون ید اللہ مغلولۃ" (مائدہ:۶۴) نیز اس سے ان فلاسفہ کے نظریۂ فاسدہ کی نفی کرنا بھی مطلوب ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ خدا نے فقط عقل اول کو خلق کیا ہے۔ اس کے بعد اس کی قدرت کی تاثیر ختم ہوگئی۔ بعد ازاں عقل اول نے عقل ثانی کو اور ثانی نے ثالث کو وہکذا...... یہاں تک کہ عقلِ عاشر نے تمام عالم کو پیدا کیا۔ اور بھی اس قسم کے بعض نظریات باطلہ ہیں، جن سے قدرتِ کاملہ کا تعطّل لازم آتا ہے۔ عقیدۂ بدأ سے ان سب خیالاتِ واہیہ کا بطلان واضح وعیاں ہوجاتا ہے۔ اس مسئلہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ لوگوں کے یہ خیالات غلط اور از قسم محالات ہیں، بلکہ سب اختیارات خود خداوند عالم کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ "بل یداہ مبسوطتان ینفق کیف یشاء" (مائدہ:۶۴) وہ صاحبِ ارادہ واختیار اور قادر وقہار ہے اور ہمیشہ اس کے فیوض و برکات اور کائنات میں اس کے تصرفات جاری وساری ہیں۔ جس امر کو چاہتا ہے مقدم کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے مؤخر کرتا ہے۔ کسی کو مارتا ہے، کسی کو جلاتا ہے۔ کسی کو مریض کرتا ہے، کسی کو شفا دیتا ہے۔ کسی کو وسعتِ رزق عطا کرتا ہے اور کسی کو تنگی معیشت میں مبتلا کرتا ہے، کسی سے سلطنت کو چھینتا ہے اور کسی کو عنانِ ملک عطا فرماتا ہے۔ صلہ رحمی وغیرہ، کارہائے خیر کی وجہ سے، کسی کی عمر بڑھاتا ہے اور قطع رحمی وغیرہ جرائم سے کسی کی عمر گھٹاتا ہے، زنا وغیرہ معاصی کے ارتکاب سے کسی کے رزق اور اس کی عمر کو کم کرتا ہے اور عفت و عدالت وغیرہ محاسن سے کسی کے رزق میں وسعت اور عمر میں طوالت کرتا ہے۔ جیسا کہ خود خلاقِ عالم کا ارشاد ہے: "کل یوم ھو فی شان" (رحمٰن:۲۹) خداوند عالم ہر روز نئی شان میں ہوتا ہے۔ "یمحوا اللہ ما یشاء و یثبت و عندہ ام الکتاب"۔ (رعد:۳۹) وہ جس چیز کو چاہتا ہے محو کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ثابت کر دیتا ہے۔ کیونکہ اس کے پاس ام الکتاب (لوحِ محفوظ) ہے۔"الا لہ الخلق والامر" (اعراف:۵۴) اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے خلق کرنا اور حکم دینا۔ کیونکہ ؏

یحوا اللہ ما یشآء و یثبت و عندہ ام الکتاب و انہ لا یحوا الا ماکان و لا یثبت الا مالم یکن و ھذا لیس

ہے جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے اور ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اللہ سبحانہ جس چیز کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ثابت کرتا ہے۔ کیونکہ اسی کے پاس ام الکتاب ہے (رعد:۳۹) وہ اسی چیز کو

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں

بلکہ ع

ہر لحظہ ہے خالق کی نئی شان نئی آن

اس مسئلہ میں منشاءِ اشتباہ کی نشاندہی

جس چیز نے اس مسئلہ کو زیادہ غامض و پیچیدہ بنا دیا ہے وہ لفظ "بداً" کا لغوی استعمال ہے۔ کیونکہ یہ لفظ عربی زبان میں عموماً ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ جدید معلومات کی وجہ سے سابقہ عزم و ارادہ یا سابقہ رائے کو ترک کر کے اس کے برخلاف کسی دوسرے عزم و ارادہ یا کام کو کرنا۔ ظاہر ہے کہ اس اعتبار سے اس لفظ کی نسبت باری تعالیٰ کی طرف ہرگز جائز نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس سے اس کا جہل لازم آتا ہے۔ اسی لغوی معنی کی آڑ لے کر مفاد پرست اغیار نے ہمیشہ اہل حق کو عوام الناس میں بدنام کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا۔ اور عوام الناس کو مذہب حق سے متنفر کرنے کے لیے یہ تاثر دینے کی سعی نافرجام کی کہ اس مذہب میں (معاذ اللہ) خداوند عالم کو جاہل سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ کہ اس میں خدا کے متعلق یہ نظریہ ہے کہ وہ آج کوئی کام شروع کرتا ہے یا کوئی رائے قائم کرتا ہے مگر کل جب اس پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ کام یا رائے غلط ہے تو اسے چھوڑ کر اس کے مخالف فعل یا رائے پر کاربند ہو جاتا ہے۔

سبحان اللہ...... ھذا بھتان عظیم...... بھلا کوئی متدین اور عقیل و فہیم انسان خدائے حکیم و علیم کے بارے میں ایسا اعتقاد رکھ سکتا ہے؟ اور ایسے امر کی نسبت اس کی ساحتِ قدس کی طرف دے سکتا ہے۔ حاشا و کلا۔ ؎

فأعظم الناس منذ کانوا ما قدر اللہ حق قدرہٖ

اس قسم کی افترا پردازیوں، فتنہ سازیوں اور حقائق کو غلط طریقہ پر توڑ مروڑ کر کے پیش کرنے کا نتیجہ ہے کہ آج باہمی فتنہ و فساد کا بازار گرم ہے اور علم و حقیقت کا فقدان ہے۔ ؎

ھکذا یفسد الزمان و یفنی علم فیہ و یدرس الاثر

ببدأ کما قالت الیھود و اتباعھم فنسبنا فی ذلك الی القول بالبدأ و تبعھم علی ذلك من خالفنا من اھل الاھوآء المختلفة و قال	محو کرتا ہے جو پہلے موجود ہوتی ہے اور اسی کو ثابت کرتا ہے جو پہلے موجود نہ ہو، یہ بدأ وہ نہیں جس کے یہودی اور ان کے اتباع قائل ہیں، اور اسی بدأ کو یہ ملعون یہودی ہماری طرف منسُوب کرتے ہیں اور ان کی دیکھا دیکھی مختلف اراء و اہواء رکھنے والے

ارباب علم وفہم جانتے ہیں کہ ہر لفظ کے ہر جگہ ایک ہی معنی مراد نہیں لیے جا سکتے، بلکہ لفظ کے متعلّق کے بدلنے سے اس کے مناسب حال معانی بھی بدلتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ اس امر کی بعض مثالیں سابقہ مباحث میں بعض آیاتِ متشابہات کے ضمن میں پیش کی جا چکی ہیں۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی تفسیر اتقان جلد...... صفحہ...... پر جملہ "اھدنا الصراط المستقیم" کے سات معانی تحریر کیے ہیں۔ جیسا نمازی ہوگا ایسے ہی اس کے حال کے مطابق اس کے معنی مراد لیے جائیں گے۔ اگر غیر ہدایت یافتہ ہے تو اس کا معنی ہوگا: "ارنا الصراط المستقیم" کہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ اور اگر ہدایت یافتہ ہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے: "ثبتنا" کہ ہمیں سیدھے راستہ پر ثابت قدم رکھ۔ اور اگر اسے ثبات بھی حاصل ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ: "زدنا معرفة" ہماری ہدایت و معرفت میں اضافہ فرما۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔

اسی اصول کے تحت جب اس لفظ (بدأ) کی نسبت خداوند عالم کی طرف دی جائے تو اس وقت اس کے لغوی معنی ظھور الخفاء (کسی چیز کا مخفی ہونے کے بعد ظاہر ہونا) مراد نہیں ہوتے بلکہ وہاں ذاتِ باری کے لیے اظہار اور لوگوں کے لیے ظہور مقصود ہوتا ہے۔ یعنی خداوند عالم کسی ایسے امر کا اظہار کرتا ہے جو لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔ جیسا کہ وہ قرآن میں ارشاد فرماتا ہے:

وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ (سورۃ الزمر: ۴۷)

ان لوگوں کے لیے خدا تعالیٰ کی طرف سے وہ کچھ ظاہر ہوا جس کا ان کو گمان بھی نہ تھا۔

لہٰذا "بدا اللہ" خدا کو فلاں معاملہ میں بدأ ہوا ہے، کا مطلب یہ ہوگا کہ "بدأ من اللہ" خدا کی طرف سے لوگوں پر ظاہر ہوا، نہ یہ کہ اللہ کے لیے ظاہر ہوا۔ اور اس طرح ممکن ہے کہ "للہ" میں جو "لام" ہے اسے بمعنی "من" لیا جائے، اور "لام" کا معنی "من" استعمال ہونا نحویوں کے نزدیک مُسلّم ہے۔ چنانچہ نحو کی مُعتبر ترین کتاب مغنی اللبیب جلد ۱ صفحہ ۱۷۸ طبع مصر پر لکھا ہے: الرابع عشر موافقة "من" نحو سمعت له صراخا و قول جریر:

لنا الفضل فی الدنیا و انفك راغم　　و نحن لكم یوم القیامة افضل

الصادق ما بعث الله نبيا قط حتى يأخذ عليه الاقرار لله بالعبودية و خلع الانداد و ان تعالیٰ يؤخر ما يشاء و يقدم

ہمارے مخالفین بھی ان کے ہم کلام ہوکر ہمیں مطعون کرتے ہیں۔ حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اللہ جل جلالہ نے اس وقت تک کوئی نبی نہیں بھیجا جب تک اس سے تین اقرار نہیں لے لیے: خدا کی معبودیت، خدا کے شریکوں سے بیزاری، اور یہ کہ خدا

....

خلاصہ مطلب یہ کہ لام کا چودھواں معنیٰ "من" کی موافقت ہے۔ جیسا کہ "سمعت له صراخا" اور "نحن منكم افضل" ہیں۔ لہٰذا اس لحاظ سے اس طرح اس لفظ کی نسبت باری تعالیٰ کی طرف بے غبار اور اس کی صحت بالکل واضح و آشکار ہو جاتی ہے۔

خداوند عالم کو کبھی جہل و نادانی کی وجہ سے بداءٔ نہیں ہوتا

سابقہ تحقیق متین سے معلوم ہو گیا کہ اس معنیٰ کے اعتبار سے ہرگز خدائے علیم کا معاذ اللہ جاہل ہونا لازم نہیں آتا۔ اسی لیے معصومین علیہم السلام نے فرمایا ہے: "ان الله لم يبدله من جهل"۔ خداوند عالم کو ہرگز کبھی جہالت کی وجہ سے بداءٔ نہیں ہوتا۔ نیز فرمایا ہے: "ما بدأ الله فی شئ الا كان فی علمه قبل ان يبدوله" خدا کو کسی امر میں بداءٔ نہیں ہوتا مگر یہ کہ بداءٔ سے پہلے اسے اس امر کا علم ہوتا ہے۔ بلکہ حضرت صادق علیہ السلام نے تو ایسے لوگوں کو بددعا دی ہے جو "بداءٔ" کو جہل خدا کا ثمرہ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ منصور بن حازم سے روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا: "هل يكون اليوم شئ لم يكن فی علم الله بالامس"۔ فرزند رسول! کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آج کوئی چیز واقع ہو جو کل خدا کے علم میں نہ تھی؟ "قال لا من قال هذا اخزاه الله" فرمایا: نہیں، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ جو شخص اس طرح کہے خدا اسے ذلیل و خوار کرے۔ پھر میں نے عرض کیا: "ارأيت ما كان و ما هو كائن الى يوم القيامة اليس فی علم الله" میرے آقا! کیا یہ درست ہے کہ جو کچھ گزر چکا ہے یا جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے وہ سب اللہ کے علم میں ہے۔ "قال بلى قبل ان يخلق الخلق"۔ فرمایا: ہاں! ان اشیاء کو پیدا کرنے سے پہلے خالق کو ان کا علم تھا۔ (اصول کافی)

ان الله لا يخفى عليه شئ فی الارض و لا فی السماء (عمران:۵)

کس قدر افسوسناک بات ہے کہ بایں ہمہ تصریحاتِ مخالفین یہ کہتے ہیں کہ مذہب شیعہ میں "عقیدہ بداءٔ" کے ذریعہ خداوند عالم کی تجہیل کی جاتی ہے۔ ع

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بو العجبی است

ما یشآء و نسخ الشرائع و الاحکام بشریعة نبینا و احکامه من	جس چیز کو چاہے مؤخر کرے اور جسے چاہے مقدم کرے ہمارے رسولؐ کی شریعت اور احکام سے پہلے تمام انبیاءؑ کی شریعتیں اور ان کے احکام منسوخ ہو گئے ہیں

اگر مخالفین میں ہمت و جرأت ہے تو اپنے مدعائے باطل کی تائید میں ہمارے کسی امام معصومؑ کا ارشاد یا کسی عالم دین کی تحقیق متین پیش کریں، ورنہ اس اِفتراء پردازی سے باز آئیں۔ کیونکہ ارشادِ قدرت ہے: "انما یفتری الکذب الذین لا یومنون" (سُورۂ نحل: ۱۰۵) "افتراء پردازی وہی لوگ کرتے ہیں، جو بے ایمان ہوتے ہیں"۔

خداوند عالم کے "بدأ" کے مختلف مظاہر ہم ہر روز مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ غنا کے بعد فقر، فقر کے بعد غنا، صحت کے بعد مرض، مرض کے بعد صحت، حیات کے بعد موت، موت کے بعد حیات۔ عزت کے بعد ذلت، ذلت کے بعد عزت وغیرہ۔ یہ سب "بدأ" ہی کے تو مظاہر ہیں۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ز وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ط بِیَدِكَ الْخَیْرُ ط اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (سورۃ آلِ عمران: ۲۶)

"عقیدۂ بدأ" کی اِصطلاحی تحقیق انیق

جب عقیدۂ بدأ کی لغوی حقیقت معلوم ہو چکی تو اب اِصطلاحی طور پر بھی اس کی قدرے توضیح کی جاتی ہے۔ اربابِ بصیرت پر مخفی و مستور نہیں ہے کہ خداوند کریم کے دو نظام ہیں۔ ایک "نظامِ تشریعی" اور دوسرا "نظامِ تکوینی"۔ نظامِ تشریعی میں جس چیز کا نام "نسخ" ہے (ایک حکم شرعی ختم کرکے اس کی جگہ دوسرا حکم نافذ کرنا) نظامِ تکوینی میں اس چیز کا نام بدأ ہے (کسی انسان کی ایک حالت کو ختم کرکے اسے دوسری حالت کے ساتھ بدل دینا) علمی الفاظ میں یوں سمجھیں کہ: "النسخ کانه بدأ تشریعی و البدأ کانه نسخ تکوینی"۔ نسخ گویا کہ تشریعی بدأ اور بدأ گویا کہ تکوینی نسخ ہے۔ نسخ میں زمان و مکان اور افراد کے بدلنے سے وقتاً فوقتاً احکام بدلتے رہتے ہیں۔ اور اس کی صحت و وقوع پر تمام فرقِ اسلامیہ کا اتفاق ہے۔ جیسا کہ ارشادِ قدرت بھی ہے:

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا (سورۃ البقرۃ: ۱۰۶)

"بدأ" میں بھی یہی ہوتا ہے کہ مختلف علل و اسباب سے خداوند عالم لوگوں کے حالات و کوائف کو بدلتا رہتا ہے۔ یہ ایک ایسی واضح اور روشن حقیقت ہے کہ کوئی عاقل و بابصیرت انسان اس کا انکار

ذلك و نسخ الکتاب بالقرآن — اور قرآنِ کریم سے سابقہ تمام کتبِ سماوی منسوخ ہوگئی ہیں۔
من ذلك و قال الصادقؑ من — حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام

نہیں کر سکتا۔ اس سے نہ تو خدا کی جہالت لازم آتی ہے اور نہ کوئی اور نقص و عیب، بلکہ اس سے اس کی قدرتِ کاملہ، شہنشاہیتِ مُطلقہ اور اختیاراتِ واسعہ کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی لیے معصومین علیہم السلام نے فرمایا ہے: "ما عبد الله بشئ مثل البدأ"۔ "عقیدۂ بدأ کی طرح کسی چیز کے ساتھ خدا کی عبادت نہیں کی گئی"۔ اور بروایت ہشام بن سالم حضرت صادق آلِ محمدؑ سے یوں مروی ہے: "ما عظم الله بمثل البدأ"۔ "جس طرح بدأ کے ذریعہ خدا کی عظمت وجلالت کا اِظہار ہوتا ہے اس طرح اور کسی شے سے نہیں ہوتا"۔ (اصول کافی)

ان لوگوں کی حالت قابلِ تعجب ہے جو احکامِ شرعیہ میں نسخ کو تو صحیح تسلیم کرتے ہیں مگر احکامِ تکوینیہ میں بدأ کو غلط سمجھتے ہیں۔ حالانکہ دونوں کی حقیقت مشترک ہے۔ وہ جو ایراد "بدأ" پر کرتے ہیں وہی اعتراض نسخ پر بھی وارد ہوسکتا ہے۔ لہٰذا جو جواب وہ نسخ کے بارے میں دیں گے، وہی "بدأ" کے بارے میں ہماری طرف سے سمجھا جائے۔ بدأ کی اور بھی مختلف طریقوں سے توضیح وتشریح کی گئی ہے۔ مگر جس طرح ہم نے اس کی وضاحت کی ہے وہ حضرت شیخ مُفید اعلی اللہ مقامہ کی "اوائل المقالات" میں اور حضرت سید میر محمد باقر داماد کی "نبراس الضیاء" میں بیان کردہ تحقیق کے مطابق ہے، جو عام فہم ہونے کے علاوہ بہت متین بھی ہے۔ شیخ الطائفہ جناب شیخ طوسی علیہ الرحمہ نے "عدۃ الاصول" میں اس مسئلہ کی جو تحقیق فرمائی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا میلان بھی اسی طرف ہے۔

"بدأ" خداوند عالم کے علم مخزون ومکنون میں ہوتا ہے، نہ کہ علم مکشوف میں

بکثرت روایات مُعتبرہ سے مُستفاد ہوتا ہے کہ خداوند عالم کے علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مخزون و مکنون، جس پر اس نے نہ کسی نبی مرسل کو مطلع کیا ہے اور نہ کسی ملک مقرب کو۔ اور دوسری قسم ہے علم مکشوف، جس پر وہ حسبِ مصلحت اپنے مقربانِ بارگاہ یعنی ملائکہ کرام اور انبیاء واوصیاء علیہم السلام کو آگاہ کرتا رہتا ہے۔ مُتعدّد احادیث معصومینؑ سے مُستفاد ہوتا ہے کہ "بدأ" پہلی قسم کے علم میں ہوتا ہے، نہ کہ دوسری قسم میں...... کیونکہ اگر دوسری قسم کے علم میں بھی "بدأ" واقع ہو تو اس سے اس کے مقربین بارگاہ کی تکذیب لازم آتی ہے، اور خدا ہرگز اپنے مقربین کی تکذیب نہیں کرتا۔ چنانچہ امام جعفر صادق اور حضرت امام محمد باقر علیہما السلام سے مروی ہے، فرمایا:

زعم ان اللہ عزوجل بدا فی ارشاد فرماتے ہیں کہ جس شخص کا خدا کے بارے

العلم علمان فعلم مخزون لم یطلع علیہ احدًا من خلقہ و علم علمہ ملائکتہ و رسلہ فما علمہ ملائکتہ و رسلہ فانہ سیکون فانہ لا یکذب نفسہ و لا ملائکتہ و لا رسلہ و علم مخزون عندہ یقدم منہ ما یشاء و یثبت ما یشاء (اصول کافی)

" خداوندعالم کے دو علم ہیں ۔ ایک علم مخزون، جس پر اس نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو بھی مطلع نہیں کیا۔ دوسرا وہ علم ہے جو اس نے اپنے ملائکہ اور رسل کو تعلیم دیا ہے ۔ پس جو علم اس نے اپنے ملائکہ اور انبیاء کو تعلیم دیا وہ ضرور ہو کر ہی رہے گا۔ کیونکہ خداوندعالم اپنی تکذیب نہیں کرتا۔ اور نہ ہی اپنے فرشتوں اور رسولوں کو جھٹلاتا ہے ۔ ہاں جو علم اس کے پاس مخزون و مکنون ہے اس میں جس طرح چاہتا ہے تقدیم و تاخیر کرتا رہتا ہے"۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

مذکورہ بالا اخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء و اوصیاء کے اخبار میں "بداٗ" واقع نہیں ہوتا۔ مگر کتبِ سیر و تواریخ میں کچھ ایسے آثار موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات ان کے اخبار میں بھی بداٗ واقع ہو جاتا ہے ۔ چنانچہ " مصابیح الانوار" میں بحوالہ "عیون اخبار الرضا" علیہ السلام سے مروی ہے کہ خداوندعالم نے ایک نبی کو وحی فرمائی کہ فلاں بادشاہ کو جا کر خبر دو کہ میں اسے فلاں وقت مارنے والا ہوں ۔ چنانچہ جب انھوں نے جا کر اطلاع دی تو بادشاہ چارپائی سے گھبرا کر گر پڑا۔ اور بارگاہِ الٰہی میں تضرع و زاری کرنے لگا کہ بارِالٰہا! مجھے اتنی مہلت دے کہ میرا بیٹا جوان ہو جائے اور میں اپنی آرزوؤں کو پورا کر لوں ۔ ادھر اسی نبی کو دوبارہ وحی ہوئی کہ اس بادشاہ کو اطلاع دو کہ میں نے اس کی عمر میں پندرہ سال کا اضافہ کر دیا ہے ۔ نبی نے عرض کیا: بارِالٰہا! تو جانتا ہے کہ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا (لہٰذا یہ دوسری خبر کس طرح بادشاہ کے گوش گزار کروں) ارشاد ہوا: تم عبدِ مامور ہو، تم پیغام پہنچاؤ۔

بر رسولاں بلاغ باشد و بس

نیز کتابِ مذکور میں بحوالہ اصول کافی باب الصدقہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ ایک یہودی جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور بجائے صحیح سلام کے کہا: "السام علیك" (جس کا معنی موت ہے) جنابؐ نے جواب میں فرمایا: "وعلیك" جب وہ چلا گیا تو صحابہ نے عرض کیا کہ حضورؐ! اس

شئ ولم یعلمہ امس فابرأ منہ و — میں یہ خیال ہو کہ اس کو آج جس چیز میں بداءٗ ہوا ہے کل اس
قال من زعم ان اللہ بدا لہ فی — سے بے خبر تھا، میں ایسے شخص سے بیزار ہوں،

نے آپ پر موت کے ساتھ سلام کیا۔ جنابؐ نے فرمایا: میں نے بھی ایسا ہی جواب دیا ہے۔ پھر فرمایا: یہ یہودی لکڑیاں کاٹنے جارہا ہے۔ ابھی اسے ایک سیاہ رنگ کا سانپ ڈسے گا۔ اور یہ ہلاک ہوجائے گا۔ مگر ہوا یہ کہ وہ کچھ دیر کے بعد بہت سی لکڑیاں لے کر وہاں سے صحیح وسالم گزرا۔ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! آپؐ نے تو فرمایا تھا کہ وہ ہلاک ہوجائے گا۔ آپؐ نے یہودی سے فرمایا: لکڑیاں نیچے اتارو۔ جب اس نے نیچے اتاریں تو دیکھا گیا کہ لکڑیوں میں ایک سیاہ رنگ کا بڑا سانپ موجود ہے جو ایک لکڑی کو مُنھ میں دبائے ہوئے بیٹھا ہے۔ آپؐ نے یہودی سے دریافت کیا کہ تم نے آج کونسا اچھا کام کیا ہے؟ اس نے عرض کیا کہ مجھے تو اس کے سوا کوئی کام یاد نہیں کہ میرے پاس دو عدد روٹیاں تھیں ایک خود کھائی اور دوسری ایک سائل کو دے دی۔ یہ سُن کر جنابؐ نے فرمایا: اسی صدقہ کی وجہ سے خدا نے یہ بلا دفع کردی ہے۔ پھر فرمایا: صدقہ انسان سے بری موت کو دور کرتا ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے متعلق بھی کتب میں مذکور ہے کہ انھوں نے ایک لکڑہارے کو موت کی خبر دی مگر وہ بچ گیا۔

اس اشکال کے کئی جوابات دیے جاسکتے ہیں۔ ہم فقط دو جوابات پر اکتفا کرتے ہیں۔

پہلا جوابؑ یہ ہے کہ ان بزرگواروں کی خبریں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ حتمی ویقینی اور غیر حتمی۔ اول الذکر میں بداءٗ نہیں ہوسکتا۔ مگر دوسری قسم میں بداءٗ واقع ہوسکتا ہے اور بعض اوقات وہ خود بھی اس امر کی طرف لطیف پیرایہ میں اشارہ فرمادیا کرتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت امیر علیہ السلام نے ۷۰ھ کے حوادث کی طرف اشارہ فرمانے کے بعد فرمایا تھا: "یمحوا اللہ ما یشاء و یثبت و عندہ ام الکتاب" (سورۃ الرعد: ۳۰) "خدا جسے چاہتا ہے محو کردیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ثابت کرتا ہے، اس کے پاس ام الکتاب ہے"۔

دُوسرا جوابؑ یہ ہے کہ چونکہ جن روایات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ انبیاء واوصیاء کی خبروں میں بداءٗ واقع نہیں ہوتا، ان میں اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اس سے ان بزرگواروں کی تکذیب لازم آتی ہے۔ لہٰذا اگر کسی وقت ان کی بعض اخبار میں بداءٗ واقع ہوجائے مگر اس کی مصلحت بھی ساتھ ہی ظاہر ہو کہ فلاں وجہ سے وہ خبر وقوع پذیر نہیں ہوئی۔ جیسا کہ ان واقعات میں اس بداءٗ

شئ بدا ندامة فهو عندنا كافر باللّٰه العظيم و اما قول الصادق ما بدا اللّٰه فی شئ كما بدأ له فی اسمٰعیل ابنی فانه یقول	اور فرمایا: جس کا گمان یہ ہو کہ خداوند عالم کو کسی شے کے بنانے کے بعد ندامت اور شرمندگی ہوتی ہے، وہ ہمارے نزدیک خدا کا منکر ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ: خدا کو ایسا بداً کبھی نہیں ہوا، جیسا کہ میرے بیٹے اسماعیل کے بارے میں

کی مصلحت مذکور ہے تو اس طرح چونکہ ان حضرات کی تکذیب لازم نہیں آتی، بلکہ الٹا ان کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت ہو جاتی ہے، لہٰذا اس صورت میں ان کی اخبار میں بداً کے واقع ہونے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

اس مسئلہ کی مزید وضاحت اور لوحِ محفوظ و لوح محو و اثبات کا بیان

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس اہم مسئلہ کی یہاں قدرے اور وضاحت کر دی جائے۔ آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ معصومیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم کے پاس دو لوحیں ہیں، ایک کا نام ہے لوحِ محفوظ۔ کائنات میں جو کچھ ہوتا رہتا ہے وہ سب اس میں بالتفصیل لکھا ہوا ہے۔ اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ دوسری کا نام ہے لوحِ محو و اثبات۔ اس کے نوشتہ جات میں مختلف علل و اسباب اور مصالح و حکم کے پیشِ نظر محو و اثبات اور تغیر و تبدل کا سلسلہ برابر جاری و ساری رہتا ہے۔ کیونکہ بعض امور بعض شروط کے ساتھ مشروط ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان شروط و اسباب میں تغیر و تبدل ہونے کی وجہ سے خود ان امور میں بھی تبدیلی کا واقع ہونا ناگزیر ہوتا ہے۔ مثلاً لوح محو و اثبات میں یوں لکھا ہوا ہوتا ہے کہ فلاں شخص کی عمر پچاس سال ہوگی۔ بشرطیکہ وہ کوئی ایسا کام انجام نہ دے جس سے اس کی عمر کی لمبائی یا کوتاہی پر اثر پڑتا ہو۔ لہٰذا اگر اس نے صلہ رحمی کی یا صدقہ دے دیا تو پچاس کو کاٹ کر اس کی جگہ ساٹھ سال درج کر دیا جاتا ہے۔ اور اگر اس نے قطع رحمی کا ارتکاب کیا تو بجائے پچاس کے چالیس سال لکھ دیے جاتے ہیں۔ لیکن لوحِ محفوظ میں پہلے سے اصل نتیجہ درج ہوتا ہے جو صلہ رحمی کی صورت میں ساٹھ اور قطع رحمی کی حالت میں چالیس سال ہے۔ اسی طرح لوحِ محو و اثبات میں یوں لکھا ہے کہ مثلاً فلاں شخص پر، فلاں وقت میں، فلاں مصیبت نازل ہوگی، بشرطیکہ اس نے اس وقت دعا نہ کی یا صدقہ نہ دیا۔ چنانچہ جب وہ شخص اس مقررہ وقت پر دعا یا صدقہ کو عمل میں لاتا ہے، تو لوح سے وہ مصیبت محو کر کے اس کی جگہ اس کی عافیت و سلامتی لکھ دی جاتی ہے۔ مگر لوحِ محفوظ میں بطورِ نتیجہ اس کی سلامتی ہی درج ہوتی ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔

ما ظهر لله سبحانه امر فی شئ کما ظهرکم فی ابنی اسمعیل اذا اخترمه قبلی لیعلم ان لیس بامام بعدی	ہوا ہے، آنجنابؑ کا اس ارشاد سے مطلب یہ ہے کہ خداوند عالم کی ایسی مصلحت کبھی ظاہر نہیں ہوئی، جیسے کہ میرے فرزند اسماعیل کے بارے میں ظاہر ہوئی ہے۔ میری زندگی میں اسے موت دے دی تاکہ لوگوں کو یہ بات معلوم ہوجائے کہ وہ میرے بعد امام نہیں ہے۔

اجل محتوم اور اجل غیر محتوم کا بیان

اس بیان حقیقت ترجمان سے واضح وعیاں ہوگیا کہ تقدیرات و آجال الٰہیہ دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک تقدیر و اجل مشروط، اور دوسری تقدیر و اجل غیر مشروط۔ جسے اجل مسمیٰ بھی کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے: "ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا ؕ وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ" (سورۃ الانعام: ۲) اجل و تقدیر مشروط کے تغیر و تبدل سے کمی وبیشی اور تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ مگر اجل غیر مشروط یعنی اجل مسمیٰ میں کسی قسم کی تقدیم و تاخیر یا زیادتی و کمی نہیں ہوسکتی۔ ارشادِ قدرت ہے: وَ مَا یُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّ لَا یُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ (سورۃ الفاطر: ۱۱) کسی شخص کی عمر نہ بڑھتی ہے اور نہ گھٹتی ہے مگر یہ کہ وہ کتاب (لوح) میں درج ہوتی ہے۔ اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کی زبانی قرآن مجید میں مذکور ہے کہ انھوں نے اپنی قوم کو یہ نصیحت کی: اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ﴿۱۰﴾ یُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا ﴿۱۱﴾ وَّ یُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِیْنَ وَ یَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّ یَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ﴿۱۲﴾ (سورۃ نوح: ۱۰ تا ۱۲) "تم خداوند عالم سے طلبِ مغفرت کرو۔ وہ تم پر آسمان سے موسلا دھار بارش برسائے گا اور مال و اولاد سے تمھاری مدد فرمائے گا اور تمھارے لیے باغات و نہریں جاری کرے گا"۔ مگر قوم نے اپنی حماقت و نالائقی سے ان کی اس زریں نصیحت پر عمل نہ کیا۔ لہٰذا وہ ہلاک و برباد ہوگئی۔ اور حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ گئی۔ معلوم ہوا کہ اگر قوم اس نصیحت پر عمل کر لیتی تو اس ابدی ہلاکت سے بچ جاتی۔ اسی طرح خلاقِ عالم "اہل القریٰ" کے بارہ میں ارشاد فرماتا ہے: وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ (سورۃ الاعراف: ۹۶) یعنی اگر یہ بستیوں والے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتیں نازل کرتے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ لہٰذا ان فیوض و برکات سے محروم رہ گئے۔ اسی بنا پر تو قرآن میں وارد ہے: قُلْ مَا یَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّیْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ (سورۃ الفرقان: ۷۷) اگر تمھاری دعا و پکار نہ ہو تو خدا تمھاری کوئی پروا نہ کرے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ جب آخری وحتمی فیصلہ لوحِ محفوظ میں لکھ دیا جاتا ہے تو پھر لوح محو واثبات میں اس کے لکھنے اور پھر اس میں بار بار تغیّر وتبدل کرنے میں کیا حکمت ومصلحت ہے؟ اس سوال کا کئی طرح جواب دیا جاسکتا ہے۔

اولاً یہ کہ چونکہ یہ امر نظام ربوبیت اور قضاوقدر کے متعلق ہے۔ لہٰذا اس کے متعلق جستجو کرنا ہم پر لازم نہیں، بلکہ ہم اسے کما حقہ سمجھ ہی نہیں سکتے۔ جیسا کہ ہم سابقاً مسئلہ قضاوقدر میں تفصیلاً اس موضوع پر گفتگو کر چکے ہیں۔ اور یہ حقیقت ظاہر ہے کہ ہمارے نہ جاننے سے اس میں حکمت کی نفی لازم نہیں آتی۔ کیونکہ عدم علم دلیل عدم نہیں ہوسکتا۔

ثانیاً یہ کہ بنابر احتمال کہا جاسکتا ہے (والعلم عند اللہ) کہ ممکن ہے کہ اس میں یہ مصلحت ہو کہ خلاقِ حکیم ان ملائکہ کرام پر جو اس محو واثبات کے کام پر مامور ہیں، بندوں کے ساتھ اپنے الطاف و مراحم کو واضح کرنا چاہتا ہے کہ وہ دار آخرت سے پہلے کس طرح اپنے بندوں کو ان کے اچھے یا برے اعمال کے ثمرات سے دوچار کرتا رہتا ہے اور کس طرح قانونِ مکافات کا عمل جاری وساری ہے۔

ثالثاً یہ کہ ممکن ہے کہ اس سے یہ غرض و غایت ہو کہ خداوند عالم اپنے سفراء یعنی انبیاء وائمہ کے ذریعہ یہ امر لوگوں کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہے کہ ان کے اعمالِ صالحہ کو ان کے احوال کی اصلاح میں اور ان کے اعمال سیئہ کو ان کے حالات کے بگاڑ میں کافی حد تک دخل ہے۔ اس طرح وہ اچھے اعمال کو شوق سے بجالائیں گے اور برے اعمال سے اجتناب کریں گے۔ کیونکہ لوحِ محفوظ میں جو کچھ لکھا ہے وہ درحقیقت ان کے اعمال وافعال اختیاریہ کا ہی نتیجہ وثمرہ ہے۔

رابعاً یہ کہ عین ممکن ہے کہ اس سے مقصود یہ ہو کہ محو واثبات کے طمع میں لوگوں کی دعا وپکار اور صدقات وخیرات کا سلسلہ جاری رہے، جو کہ بجائے خود ایک عبادت ہے۔ آیت مبارکہ: وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِيٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ﴿٦٠﴾ (سورۃ المومن:۶۰) میں "عبادتی" سے مراد دعا ہے۔ علاوہ بریں صدقات وخیرات میں تو غرباء ومساکین کا فائدہ بھی ہو جاتا ہے جو بہترین کارِ خیر ہے۔ "خیر الناس من ینفع الناس"۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ محو واثبات کا سلسلہ نہ ہوتا تو یہ دعا وپکار اور صدقات ومبرات کا سلسلہ بھی موقوف ہو جاتا۔ جس سے انسان ان سعادات وبرکات سے محروم ہو جاتا جن سے اب فیضیاب ہو رہا ہے۔ الی غیر ذلک من الحکم والاسرار۔ واللہ العالم بالحقائق

ولنعم ما قیل: ؎

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند
تو گدائے گوشہ نشینی حافظا مخروش

تحقیقات و روایاتِ اہلِ سُنّت سے مسئلہ "بدأ" کی تائیدِ مزید

اگر ٹھنڈے دل و دماغ سے اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور وفکر کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ برادرانِ اسلامی کو جو کچھ نفرت و وحشت ہے وہ "تقیہ"[1] کی طرح صرف لفظ "بدأ" سے ہے، ورنہ اس کے معنی و مفہوم کا وہ خود بھی ہماری طرح اقرار واعتراف کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کے چند علماء اعلام کی تحقیقات اور ان کی بعض روایات نقل کرتے ہیں، جن سے ہمارے مدعا کی حرف بہ حرف تائید ہوتی ہے۔

① علامہ زمخشری اپنی تفسیر کشاف جلد ۳ صفحہ ۲۷۱ طبع مصر میں بذیل آیت مبارکہ: وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُعَمَّرٍ وَلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهِ إِلَّا فِي كِتٰبٍ (سورۃ الفاطر: ۱۱) لکھتے ہیں: "وفیہ تاویل اٰخروھوان لایطول عمر انسان و لا ینقص الا فی کتاب و صورتہ ان یکتب فی اللوح ان حج فلان او غزا فعمرہ اربعون سنۃ و ان حج و غزا فعمرہ ستون سنۃً فاذا جمع بینھما فبلغ الستین فقد عمر و اذا افرد احدھما فلم یتجاوز بہ الاربعون فقد نقص من عمرہ الذی ھو الغایۃ و ھو الستون و الیہ ارشار رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم ان الصدقۃ والصلاۃ تعمران الدیار و تزید ان فی الاعمار الخ"...... اس آیت مبارکہ کی ایک اور تاویل یہ بھی ہے کہ کسی بھی انسان کی عمر بڑھتی یا گھٹتی نہیں مگر یہ کہ وہ پہلے کتاب (لوحِ محفوظ) میں موجود ہوتی ہے اور اس کی کیفیت یہ ہے کہ لوح (محو و اثبات) میں لکھا ہوا ہوتا ہے کہ اگر فلاں شخص نے فقط حج یا صرف جہاد کیا تو اس کی عمر چالیس سال ہوگی اور اگر وہ حج و جہاد ہر دو کو بجالایا تو پھر اس کی عمر ساٹھ سال ہوگی۔ پس اگر وہ ہر دو کو جمع کر دے اور ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ جائے تو اس کی عمر گویا بڑھ گئی ہے اور اگر فقط ایک چیز پر اکتفا کرے اور اس کی عمر چالیس سال سے متجاوز نہ ہو تو گویا اس کی عمر گھٹ گئی ہے۔ اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پیغمبر اسلام ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ صدقہ دینا اور صلہ رحمی کرنا شہروں کو آباد اور عمروں کو زیادہ کرتے ہیں۔

---

[1] ہم انشاء اللہ چالیسویں باب کے ذیل میں دلائل قاطعہ سے ثابت کریں گے کہ ان حضرات کو جو کچھ چڑ ہے وہ فقط لفظ "تقیہ" سے ہے، ورنہ جہاں تک اس کے مطلب و مفہوم کا تعلق ہے تو اس میں وہ ہمارے ساتھ متفق ہیں۔ فانتظروا انی معکم من المنتظرین

② اسی طرح علامہ قاضی بیضاوی نے اپنی تفسیر "انوارُ التنزیل" جلد ۲ صفحہ ۱۸۰ طبع مصر پر مذکورہ بالا آیہ وافی الہدایہ کی تفسیر میں لکھا ہے: و قیل الزیادۃ و النقصان فی عمر واحد باعتبار اسباب مختلفۃ اثبتت فی اللوح مثل ان یکون فیہ ان حج عمرو فعمرہ ستون سنۃ و الا فاربعون ۔ الخ ......اس عبارت کا مطلب تقریباً وہی ہے جو زمخشری کی عبارت کا بیان ہو چکا ہے۔

③ علامہ فخرالدین رازی نے اپنی تفسیر کبیر جلد ۵ صفحہ ۳۰۹ طبع مصر میں آیت مبارکہ: "یَمۡحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَ یُثۡبِتُ ۚۖ وَ عِنۡدَہٗۤ اُمُّ الۡکِتٰبِ" (سورۃ الرعد: ۳۹) کی تفسیر میں چند اقوال درج کیے ہیں۔ ان میں سے پہلا قول یہ بیان کیا گیا ہے کہ: "انہا عامۃ فی کل شئ کما یقتضیہ ظاھر اللفظ یحو من الرزق و یزید فیہ و کذا القول فی الاجل و السعادۃ و الشقاوۃ و الایمان و الکفر و ھو مذھب عمرو بن مسعود و القائلون بھذا القول کانوا یدعون و یتضرعون الی اللہ تعالیٰ فی ان یجعلھم سعداء لا اشقیاء و ھذا التاویل رواہ جابر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم"۔ "یہ محو و اثبات کا سلسلہ تمام اشیاء میں جاری و ساری ہے۔ جیسا کہ آیت کے ظاہری الفاظ بھی اسی امر کا تقاضا کرتے ہیں۔ خدا رزق میں کمی بھی کرتا ہے اور زیادتی بھی۔ اور یہی کیفیت موت و حیات اور سعادۃ و شقاوت اور کفر و ایمان کی ہے (کہ ان میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے) یہی عمرو بن مسعود (مشہور عالم اہل سنت) کا نظریہ ہے۔ اس قول کے قائل خداوند عالم کی بارگاہ میں انتہائی تضرع و زاری کے ساتھ دعا کرتے ہیں کہ وہ ان کو سعید بنائے نہ کہ شقی و بدبخت۔ اس تاویل کو جناب جابر بن عبداللہ انصاریؓ نے جناب رسولِ خداؐ سے روایت کیا ہے"۔

پھر آٹھواں قول یہ نقل کیا کہ: "انہ فی الارزاق و الحسن و المصائب یثبتہا فی الکتب و یزیلہا بالدعاء و الصدقۃ و فیہ حث علی الانقطاع الی اللہ تعالیٰ"۔ "یہ محو و اثبات فقط رزق اور مصائب و آلام کے معاملہ میں ہوتا ہے، پہلے خدا یہ امور لوح میں درج کرتا ہے، پھر دعا و صدقہ دینے کی وجہ سے زائل کر دیتا ہے۔ اس میں لوگوں کو خدا کی طرف متوجہ ہونے پر ترغیب و تحریص دلانا مقصود ہے"۔

یہی وہ بدأ ہے جس کے حضرات شیعہ خیرالبریہ قائل ہیں۔ تعجب ہے کہ فخرالدین رازی یہ سب حقائق لکھنے کے بعد صفحہ ۳۱۰ پر شیعوں پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "قالت الرافضۃ البدأ جائز علی اللہ" "رافضی لوگ کہتے ہیں کہ بدأ خدا پر جائز ہے"۔ ع

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

مگر یہ سوچ کر کہ "......را حافظ بناشد" یہ تعجب کم ہو جاتا ہے۔

④ علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی تفسیر درمنثور جلد ۴ صفحہ ۶۶۔۶۷ پر اس قسم کے اخبار و آثار نقل کیے ہیں جو بالصراحت بدأ پر دلالت کرتے ہیں۔ دو چار ملاحظہ ہوں: ① مُستدرک حاکم سے بسند صحیح ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے فرمایا: "لا ینفع الحذر من القدر و لکن یحو بالدعاء ما یشاء حتی القدر"۔ یعنی ڈرنا اور خوف کرنا قضاء و قدر سے نہیں بچا سکتا۔ ہاں البتہ خداوندکریم دعا کے ذریعہ سے چاہے تو قضا کو بھی محو کر دیتا ہے۔ ② جناب ابن مسعود کی یہ دعا نقل کی ہے کہ وہ بارگاہِ ایزدی میں دعا کیا کرتے تھے: "اللهم ان کتبتنی فی السعداء فاثبتنی فی السعداء و ان کتبتنی فی الاشقیاء فامحنی من الاشقیاء و اثبتنی فی السعداء فانك تحو ما تشاء و ثبت و عندك ام الکتاب"۔ اے اللہ! اگر تو نے مجھے سعداء میں لکھا ہے تو مجھے ان میں ثابت رکھ۔ اور اگر تو نے مجھے اشقیاء میں درج کیا ہے تو وہاں سے میرا نام محو کر کے سعداء میں درج کر۔ کیونکہ تو جسے چاہتا ہے محو کر دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے۔ تیرے ہی پاس ام الکتاب ہے۔ ③ نیز کعب کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ایک بار انھوں نے جناب عمر سے کہا: "لولا اٰیة فی کتاب الله لا نبئك بما هو کائن الی یوم القیامة قال ما هی قال قول الله یحو الله ما یشاء و یثبت و عنده ام الکتاب"۔ اگر قرآن میں ایک آیت نہ ہوتی تو میں تم کو قیامت تک ہونے والے واقعات بتا دیتا۔ عمر نے پوچھا وہ کونسی آیت ہے، تو انھوں نے کہا: یحو الله ما یشاء الاٰیة......

ان حقائق سے بحمدہ تعالیٰ واضح و آشکار ہوگیا کہ عقیدۂ بدأ عند الفریقین مُسلّم و مبرہن ہے۔ "من ینکره انما ینکره باللسان و قلبه مطمئن بالایمان"۔ اب بھی اگر کوئی لکیر کا فقیر اس بات پر مصر ہو کہ خدا کے لیے لفظ بدأ ان کی کتب سے دکھایا جائے تو وہ اپنی کتاب نہایہ ابن اثیر لغت بدأ، اور "انوار اللغۃ" حصہ اول باب الباء صفحہ ۳۳ پر یہ حدیث ملاحظہ کرے: "بدا الله ان یبتلیهم" جس کا ترجمہ مولوی وحید الزمان مترجم صحاح ستہ نے یہ کیا ہے: "اللہ کو یہی منظور ہوا کہ ان کو آزمائے"۔

الحمد لله علی وضوح الحجة و کشف المهجة

قل هذه سبیلی ادعوا الی الله

علیٰ بصیرة انا و من اتبعنی

و سبحان الله

و ما انا

من المشرکین

باب الاعتقاد

فی التناھی عن الجدل
والمرأ فی اللہ تعالیٰ

قال الشیخ ابوجعفر الجدل فی اللہ منھی عنہ لانہ یودی الی ما لا یلیق

گیارھواں بابؒ

خداوند عالم کے بارے میں جدلؔ جدال کی ممانعتؒ

حضرت شیخ قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ خداوند عالم کے بارے میں جدل وجدال، کج بحثی اور فضول گفتگو سے ممانعت کی گئی ہے۔ کیونکہ اس قسم کی غلط بحثیں ایسی چیزوں تک پہنچاتی ہیں جو

گیارھواں بابؒ مجادلہ کا بیان

اس باب میں حضرت مُصنّف علام نے دو باتوں پر زور دیا ہے۔

اول یہ کہ خداوند عالم کی ذات جامع جمیع صفات کی کنہ حقیقت میں بحث کرنا ممنوع ہے۔ کیونکہ اس سلسلہ میں مباحثہ ومبادلہ کرنے سے بجائے فائدہ کے الٹا دینی نقصان اور ضیاعِ ایمان ہوتا ہے۔

دوم یہ کہ جو لوگ کلام معصومینؑ سے کما حقہ واقف ہیں اور بطریق احسن استدلال و اِحتجاج قائم کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں ان کے لیے مخالفین مذہب سے گفتگو کرنا اور ان کو دعوت الیٰ الحق دینا اور بطور دفاع حکمتِ بالغہ سے ان کے اعتراضات کے جوابات دینا فقط جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن و مُستحب بلکہ بعض اوقات واجب ہوجاتا ہے۔ اور جو لوگ اس امر کی اہلیت نہیں رکھتے ان کے لیے ان امور میں مداخلت کرنا ناجائز وحرام ہے۔

چونکہ ہم ان دونوں امور پر کتاب کے ابتدائی صفحات میں سیر حاصل تبصرہ کرچکے ہیں اور ان مطالب کو دلائل وبراہین سے ثابت کرچکے ہیں، لہٰذا یہاں ان کے اعادہ وتکرار کی ضرورت نہیں ہے۔ نشان دادہ مقامات کی طرف رجوع کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ چونکہ کنہ حقیقتِ خداوندی تک ہمارے عقول وافہام کی رسائی ناممکن ہے اس لیے خداوند حکیم نے ہمیں اس کے سمجھنے کی تکلیف ہی نہیں دی جس پر دیگر ادلہ وبراہین کے علاوہ اصول کافی کی یہ روایت بھی دلالت کرتی ہے: جناب سہل نے بذریعہ خط حضرت امام حسن عسکریؑ سے استدعا کی کہ حقیقت باری سے آگاہ فرمائیں۔ آنجنابؑ نے ان کو جواب میں لکھا ہے: "سئلت عن التوحید و ھذا عنکم معزول"۔ "تو نے حقیقت توحید باری کے متعلق سوال کیا ہے، سو تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ امر تم سے ساقط ہے۔ یعنی تمھیں اس کے سمجھنے کی تکلیف

به و سئل الصادقؑ عن قول الله عز و جل و ان الی ربك المنتهی قال اذا انتهی الکلام الی الله فامسکوا و کان الصادقؑ یقول یابن آدم لو اکل قلبك طائر ما اشبعه و بصرك لو وضع علیه خرق ابرة لغطاه تریدان تعرف بهما ملکوت السموات و الارض ان کنت صادقًا فهذه الشمس

اس ذاتِ ایزدی کی شانِ قدوسیت کے ہرگز لائق نہیں ہوتیں۔ خدا کے اس قول کہ: "خدا کی طرف انتہا ہوتی ہے" کی تفسیر کے بارے میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا گیا۔ آپؑ نے فرمایا: "جب خدا کے بارے میں سلسلہ کلام شروع ہو تو اس وقت خاموش ہو جاؤ"۔ آپؑ یہ بھی فرمایا کرتے تھے: اے فرزند آدمؑ! تیرا دل تو اتنا ہے کہ اگر اسے کوئی پرندہ کھا جائے تو سیر نہ ہو، اور تیری آنکھ کی یہ کیفیت ہے کہ اگر اس پر سر سوزن (سوئی کا ناکہ) رکھ دیا جائے تو وہ چھپ جائے۔ کیا تو اپنی انہی دو طاقتوں کے بل بوتے پر آسمان و زمین کی سلطنت کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے؟

نہیں دی گئی۔ ہاں توحید باری کے متعلق اس قدر عقیدہ کافی ہے کہ: "الله واحد احد، لم یلد و لم یولد و لم یکن له کفواً احد خالق و لیس بخلوق یخلق تبارك و تعالیٰ ما یشاء من الاجسام و غیر ذلك و لیس بجسم و یصور ما یشاء و لیس بصورة علی ثنائه و تقدمت اسمائه ان یکون له شبیه هو لا غیر لیس کمثله شئ و هو السمیع البصیر"۔ اللہ ذات و صفات میں یگانہ ہے۔ نہ اس کے ہاں اولاد ہے اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے۔ وہ خالق ہے مخلوق نہیں، وہ جس قدر چاہتا ہے جسمانی اور غیر جسمانی مخلوق پیدا کرتا ہے لیکن خود جسم نہیں رکھتا۔ وہ جس قدر چاہتا ہے تصویر کشی فرماتا ہے لیکن خود صورت نہیں رکھتا۔ اس کی ذات اس سے اجل وارفع ہے کہ اس کا کوئی شبیہ و مثیل ہو۔ یہ اسی کی شان ہے، نہ کسی اور کی کہ اس کا کوئی مثیل و نظیر نہیں، وہ سننے اور دیکھنے والا ہے۔

ازالۂ شبہ:

یہاں اگر یہ شبہ عائد کیا جائے کہ: "جب مسئلہ توحید میں مزید غور و فکر اور مباحثہ و مجادلہ کرنا ممنوع ہے تو پھر اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ اس مرحلہ میں تقلید کی جائے۔ قطع نظر اس سے کہ اصولِ عقائد میں تقلید جائز ہے یا ناجائز؟"۔ اس شبہ کا جواب ظاہر ہے کہ اصل مسئلہ توحید اور صانع عالم کے اثبات میں غور و فکر اور مکالمہ و مباحثہ کرنا ممنوع نہیں ہے تاکہ یہ شبہ وارد ہو، بلکہ مقصد یہ ہے کہ خداوند عالم کی کنہ اور اصل حقیقت میں مجادلہ و مباحثہ اور گفتگو کرنا ممنوع ہے۔ جس کے جاننے کی

خلق من خلق الله ان قدرت فاملأ عينك منها فهو كما تقول و الجدل فی جميع امور الدين منهی عنه و قال اميرالمومنينؑ من طلب الدين بالجدل تزندق و قال الصادقؑ يهلك اصحاب الكلام و ينجو المسلمون ان المسلمين هم النجباء فاما الاحتجاج على المخالفين بقول الله و قول رسولهؐ و بقول الائمةؑ او بمعانی كلامهم لمن يحسن الكلام فمطلق و على من لا يحسن فمحظور محرم و قال الصادقؑ حاجوا الناس بكلامی فان حاجوكم كنت انا المحجوج لا انتم وروی عنهؑ انه قال كلام فی حق خير من سكون على باطل و روی ان ابا الهذيل

اگر تو اپنے دعوے میں سچا ہے تو اس سورج کو جو خدا کی ایک مخلوق ہے ذرا آنکھ بھر کر اس کی طرف تو دیکھ ۔ اگر تو نے ایسا کر لیا تو ظاہر ہو جائے گا کہ جیسا تو کہتا ہے بات ویسی ہی ہے ۔ دین کی باتوں میں مجادلہ کرنا ممنوع ہے ۔ حضرت امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں : جو شخص بذریعہ جدل و جدال دینی اعتقادات حاصل کرنے کی کوشش کرے گا وہ ملحد و زندیق ہو جائے گا ۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں : اصحاب کلام یعنی دین میں کج بحثی کرنے والے گمراہ ہو جائیں گے ۔ اور سر تسلیم خم کرنے والے نجات پا جائیں گے ۔ یہی تسلیم کرنے والے لوگ ہی نجیب و شریف ہیں ۔ ہاں خدا کے کلام، حدیث رسولؐ اور اقوالِ معصومین علیہم السلام یا ان بزرگواروں کے معانی کلام سے مخالفین پر احتجاج کرنا اور ان کے مقابلہ میں دلیل قائم کرنا اس شخص کے لیے جائز ہے جو خدا و رسولؐ اور معصومین علیہم السلام کے فرمودات کو بخوبی سمجھتا ہو اور اچھی طرح کلام بھی کر سکتا ہو ۔ اور جو ان صفات کا حامل نہ ہو اس کے لیے اس سلسلہ میں کلام کرنا حرام ہے ۔ حضرت صادق علیہ السلام فرمایا کرتے تھے : تم میرے کلام سے لوگوں پر حجّت قائم کرو ۔ اگر پھر بھی بحث میں وہ غالب آجائیں تو مغلوب میں ہوں گا نہ کہ تم آنجنابؑ نے یہ بھی فرمایا کہ باطل پر خاموشی سے امر حق میں گفتگو کرنا بہتر ہے ۔ منقول ہے کہ ایک بار

ہمیں تکلیف ہی نہیں دی گئی ۔ لہٰذا اس میں اجتہاد یا تقلید کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ کیونکہ اجتہاد یا تقلید وہاں ہوتی ہے جہاں شرعی تکلیف عائد ہو، اور اس سے عہدہ برآ ہونا ہو ۔ لیکن جہاں تکلیف ہی ساقط ہو وہاں اجتہاد یا تقلید کرنا چہ معنی دارد؟

تنبیہ: متن رسالہ میں ابوالہذیل علاف اور جناب ہشام بن الحکم کا شرائط مناظرہ طے کرنے کے سلسلہ میں جو واقعہ درج ہے، اس میں مناظرہ کرنے اور شرائط مناظرہ طے کرنے والوں کے لیے

العلاف قال لهشام بن الحکم اناظرك علی انك ان غلبتنی رجعت الی مذهبك و ان غلبتك رجعت الی مذهبی فقال هشام ما انصفتنی بل اناظرك علی اننی ان غلبتك رجعت الی مذهبی و ان غلبتنی رجعت الی امامی	ابوہذیل علاف نے جناب ہشام بن حکمؒ سے کہا: میں اس شرط پر آپ سے مناظرہ کرتا ہوں کہ اگر آپ مجھ پر غالب آجائیں تو میں تمھارا مذہب اختیار کرلوں گا اور اگر میں غالب رہا تو آپ میرے دین ومذہب کو قبول کرلیں۔ ہشام نے جواب دیا: تم نے انصاف نہیں کیا۔ میں تو اس شرط پر مناظرہ کرتا ہوں کہ اگر میں تم پر غالب آجاؤں تو آپ میرا مذہب اختیار کرلیں اور اگر کسی وجہ سے تم مجھ پر غالب آگئے تو میں اپنے امام کی طرف رجوع کروں گا یعنی اس امر کا جواب اپنے امام علیہ السلام سے طلب کروں گا۔

درسِ عبرت موجود ہے کہ وہ اس سلسلہ میں مذہب تبدیل کرنے والی احمقانہ شرط سے مکمل اِجتناب کریں۔ کیونکہ تبدیلی مذہب کی شرط تو وہ شخص کرے جس کی نگاہ میں اپنے مذہب کی صداقت مشکوک و مُشتبہ ہو، ورنہ جسے اپنے مذہب کی صداقت وحقانیت کا یقین کامل ہے وہ اپنے ایک مولوی ومناظر کی شکست کی صورت میں اپنے مذہب سے ہرگز دستبردار نہیں ہوسکتا۔ زیادہ سے زیادہ وہ مخالف کے ایراد واعتراض کے جواب میں اپنے کسی اور بڑے عالم دین کی طرف رجوع کرسکتا ہے۔ کیونکہ "فوق کل ذی علم علیم"۔ چونکہ شرائط ہی میں قریبًا نصف مناظرہ ختم ہوجاتا ہے، اس لیے بعض اوقات مخالفین ہمارے سادہ لوح مومنین سے ایسی ایسی کڑی شرائط لکھوالیتے ہیں کہ جن کا بعد میں مناظر کو خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں متعلق حضرات کو پوری پوری اِحتیاط سے کام لے کر اپنی قیاست وفراست کا ثبوت دینا چاہیے۔

مخفی نہ رہے کہ متن رسالہ میں جو ایسی بعض روایات موجود ہیں، جن سے علم کلام ومتکلمین کی مذمت مترشح ہوتی ہے، ہم نے اسی کتاب کے پیشِ لفظ میں بذیل "ایک عظیم شُبہ اور اس کا ازالہ" (صفحہ۱۷) ان کے حقیقی مطلب ومفہوم کی کماحقہ وضاحت کردی ہے۔ اس مقام کی طرف رجوع کیا جائے۔

باب الاعتقاد	بارھواں باب
فی اللوح و القلم	لوح وقلم کے متعلق عقیدہ
قال الشیخ اعتقادنا فی اللوح و القلم انهما ملکان	حضرت شیخ (ابن بابویہ رحمۃ اللہ علیہ) ارشاد فرماتے ہیں کہ لوح وقلم کے بارے میں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ وہ دو فرشتے ہیں۔

بارھواں باب لوح وقلم کا بیان

جو امر اہل مذہب میں مشہور اور بکثرت احادیث میں مذکور ہے وہ یہ ہے کہ لوح اس چیز کا نام ہے جس میں کائنات کے اندر قیامت تک ہونے والے تمام واقعات وحادثات کا حال مرقوم ہے اور قلم اس آلہ کو کہتے ہیں جس سے کوئی چیز لکھی جائے۔ خواہ وہ جس نوعیت و ماہیت کی بھی ہو۔ تفسیر قمی میں حضرت صادق علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: "اول ما خلق الله القلم فقال له اكتب فكتب ما كان و ما هو كائن الى يوم القيامة"۔ سب سے پہلے خدا نے قلم کو خلق فرمایا اور پھر اس سے کہا لکھ۔ پس اس نے جو کچھ گزر چکا ہے اور جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے سب لکھ دیا۔ لیکن اس سلسلہ میں جو کچھ حضرت شیخ صدوق علیہ الرحمہ نے تحریر فرمایا ہے کہ لوح وقلم دو فرشتوں کے نام ہیں، اس مضمون کی ایک روایت انہی کی کتاب معانی الاخبار میں موجود ہے، جو بہر حال خبر واحد ہے اور مقام اعتقاد میں اس پر اعتماد مشکل ہے۔

مصنفؒ کے بیان کردہ نظریہ پر جناب شیخ مفید کی تنقید

جناب شیخ مفید علیہ الرحمہ نے اس مقام پر مصنف علام کے بیان کردہ مطلب پر تنقید کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے: "و من ذهب الى ان اللوح و القلم ملكان فقد ابعد بذلك و نائى من الحق اذا الملائكة لا تسمى الواحا و لا اقلاما و لا يعرف فى اللغت اسم ملك و لا بشر لوح و لا قلم"۔ یعنی جن حضرات کا خیال ہے کہ لوح وقلم دو فرشتے ہیں، وہ اس سلسلہ میں حق سے بہت دور ہو گئے ہیں۔ کیونکہ ملائکہ کے نام لوح وقلم نہیں ہوتے۔ اور نہ ہی لغت میں کسی فرشتہ یا انسان کا نام آج تک لوح وقلم معلوم ہو سکا ہے۔

مُصنّفؒ کے بیان کردہ مسلکؒ اور مشہور نظریّہ کے درمیان جمع و توفیق

لیکن قولِ مشہور اور حضرت شیخ صدوقؒ کے قول میں اس طرح جمع و توفیق ممکن ہے کہ مشہور نظریہ کی بنیاد ان الفاظ کے ظاہری معنوں پر ہے اور شیخ کا مسلک ان الفاظ کے باطنی معنوں پر مبنی ہے: "لان للقرآن ظهرا و بطنا و للبطن بطنا الی سبعة ابطن" ۔ قرآن کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن، پھر باطن کا باطن ۔ یہاں تک کہ اس کے ساتھ سات باطن ہیں ۔ (تفسیر صافی و برہان وغیرہ) اور ان بواطن قرآنیہ کو سوائے وارثانِ علم قرآن یعنی سرکار محمدؐ و آلِ محمد علیہم السلام کے اور کوئی نہیں جانتا ۔ جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے: "وَ مَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ" (سورۃ آلِ عمران: ۷) علاوہ بریں یہ بھی ممکن ہے جیسا کہ علامہ مجلسیؒ نے فرمایا ہے کہ: واقعاً لوح و قلم دو ایسے فرشتے ہوں کہ ایک سے آلۂ تحریر کا کام اور دوسرے سے لوح (تختی) والا کام لیا جاتا ہو ۔ نیز ممکن ہے کہ لوح و قلم بنا بر مشہور اپنے ظاہری معنوں پر محمول ہوں ۔ لیکن ان کے حامل دو فرشتے ہوں اور مجازاً خود لوح و قلم کو فرشتہ سے تعبیر کر دیا گیا ہو ۔ بہر حال "لعل الایمان بمثل ذلك علی الاجمال اسلم من الخطاء و الضلال" (رابع و عشر بحار الانوار)

قولِ فیصل

اس قسم کے امور کی بے جا تاویلات کے متعلق حضرت علامہ مجلسیؒ ارشاد فرماتے ہیں:

"اقول ما ورد من الکتاب و السنة من امثال ذلك لا یجوز تاویله و التصرف فیه بمحض استبعاد الوهم بلا برهان و حجة و نص معارض یدعوا الی ذلك" (۱۴ بحار)

یعنی مَیں کہتا ہوں کہ اس قسم کے جو اُمور کتاب و سنت میں وارد ہوئے ہیں ان کی محض وہمی استبعاد کی بنا پر بغیر کسی دلیل و برہان اور بغیر کسی معارض کے تاویل کرنا جائز نہیں ہے بلکہ ایسے امور کو اپنے ظاہری معنوں پر باقی رکھنا چاہیے ۔

والله العالم بحقائق الامور

باب الاعتقاد	تیرھواں بابؒ
فی الکرسی	(کرسی کے متعلّق اعتقاد)
قال الشیخ اعتقادنافی الکرسی	حضرت شیخ صدوق علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ کرسی کے متعلّق
انه وعاء جمیع الخلق و العرش	ہمارا عقیدہ ہے کہ کرسی ایک ایسا عظیم ظرف ہے جس میں

تیرھواں بابؒ کرسی کا بیانؒ

کرسی کے متعلّق جو کچھ حضرت شیخ قدس سرہٗ نے بیان فرمایا ہے اس کی تائید بکثرت احادیث معصومین علیہم السلام سے ہوتی ہے۔ چنانچہ کتاب التوحید میں اس مضمون کی متعدّد احادیث موجود ہیں۔ یہاں صرف چند حدیثیں پیش کی جاتی ہیں۔

فضیل بن یسار بیان کرتے ہیں مَیں نے حضرت صادق علیہ السلام سے ارشادِ باری: "وسع کرسیه السموات و الارض" (سورۃ البقرۃ:۲۵۵) کہ خداوند عالم کی کرسی زمین و آسمان پر حاوی ہے، کی تفسیر پوچھی تو آپؑ نے فرمایا:" یا فضیل السموات و الارض و کل شئ فی الکرسی "۔"اے فضیل! زمین و آسمان اور ہر شے کرسی کے اندر موجود ہے"۔

دوسری حدیث جناب زرارہ سے مروی ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت صادق علیہ السلام سے دریافت کیا کہ آیت مبارکہ "وسع کرسیه السموات و الارض" کا کیا مطلب ہے۔ آیا زمین و آسمان کُرسی کو گھیرے ہوئے ہیں، یا کُرسی زمین و آسمان کو محیط ہے؟ فرمایا:"بل الکرسی وسع السموات و الارض و العرش و کل شئ فی الکرسی"۔ بلکہ کرسی زمین و آسمان کو محیط ہے، اور عرش اور ہر چیز کُرسی کے اندر ہے۔

اس قسم کی اور بھی مُتعدّد روایتیں موجود ہیں۔ اسی طرح کُرسی کے دوسرے معنی یعنی علم کے متعلّق بھی مُتعدّد روایتیں موجود ہیں۔

کُرسی کا مذکورہ بالا معنی کی کتبؒ لغت سے تائیدِ مزید

یہی نہیں کہ کرسی کا بمعنی علم ہونا صرف احادیث ائمہ اہلِ بیتؑ ہی میں وارد ہے، بلکہ بڑے بڑے ائمہ لغتِ عرب کے اقوال سے بھی اس کی تائید مزید ہوتی ہے۔ چنانچہ صاحب القاموس المحیط

و السموات و الارض و کل شئ خلق اللہ تعالیٰ و الکرسی فی وجہ آخر ھو العلم و قد سئل الصادقؑ عن قول اللہ تعالیٰ عزوجل وسع کرسیہ السموات و الارض قال ھو علمہ	زمین و آسمان اور عرش غرضیکہ اس میں خدا کی سب پیدا کردہ چیزیں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ کُرسی سے علم بھی مراد لیا گیا ہے۔ حضرت صادق علیہ السلام سے ارشاد ایزدی: "وسع کرسیہ السموات و الارض" (سورۃ البقرۃ:۲۵۵) (اللہ کی کرسی تمام آسمانوں اور زمینوں سے وسیع ہے) کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا گیا، آپؑ نے فرمایا: "کُرسی سے خدا کا علم مراد ہے"۔

جلد......صفحہ...... پر رقمطراز ہیں: "الکرسی العلم"۔ یعنی کرسی کے معنی ہیں "علم"۔ اسی طرح صاحبِ لسان العرب نے جلد ۸ صفحہ...... پر لکھا ہے: "الکرسی العلم"۔ نیز "منتہی الارب فی لغۃ العرب" میں کرسی کے معنی علم و دانش لکھے ہیں۔ وکذا فی "بیان اللسان" صفحہ ۶۴۵۔ اور در حقیقت کُرسی کے ان ہر دو معانی میں جو حضرت مُصنّف علام نے بیان فرمائے، کوئی اختلاف نہیں ہے، بلکہ صرف ظواہر و بواطن کا فرق ہے۔

کُرسی کے متعلق بعض لوگوں کا جو یہ خیال ہے کہ وہ ہماری کُرسیوں کی مانند
ایک کُرسی ہے، جس پر خداوند عالم معاذ اللہ جلوس فرماتا ہے،
تو یہ ایک انتہائی لغو اور مضحکہ خیز نظریہ ہے۔
اس کا ردہم معانی عرش کے ضمن میں
عنقریب بیان کریں گے
ان شاء اللہ
فانتظر

باب الاعتقاد

فی العرش

قال الشیخ ابوجعفرؒ اعتقادنا فی العرش انه جملة جمیع الخلق و العرش فی وجه اٰخر هو العلم

چودھواں باب

عرش کا بیان

جناب شیخ ابوجعفرؒ فرماتے ہیں: عرش کے بارے میں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ تمام مخلوقِ خدا کے مجموعے کا نام عرش ہے، اور علم خدا کو بھی عرش سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آیت مبارکہ "رحمٰن عرش پر

چودھواں باب عرش کا بیان

عرش کا صحیح مفہوم سمجھنے میں مسلمانوں کے اشتباہ کی اصل وجہ

عرش کے مشہور معنی لغت میں سریر الملک یعنی بادشاہ کا پایہ تخت کے ہیں۔ اسی وجہ سے بہت سے لوگوں کو مغالطہ ہوگیا، اور حقیقت سے دور ہو گئے۔ چنانچہ فرقہ مجسمہ اور حضرات قشیریین نے اس مطلب کو بار و برگ دے کر کچھ اس طرح پیش کیا کہ دنیوی شہنشاہوں کی طرح خداوند عالم کو ایک مجسم شہنشاہِ اعظم تصور کر کے عرش پر بٹھا دیا۔ اور اس کی جسامت اور قد و قامت کے متعلق یہاں تک لکھ دیا: "یئط بالعرش کما یئط الرحل بالراکب" ۔ کہ جب خدا عرش پر جلوہ افروز ہوتا ہے تو عرش اس طرح چرچراتا ہے جیسے نئی زین سوار کے بیٹھنے سے چرچراتی ہے۔ (کنز العمال جلد ا صفحہ ۷ ۵ وغیرہ) لیکن جب یہ امر اپنے مقام پر ادلہ عقلیہ ونقلیہ سے محقق و مبرہن کیا جا چکا ہے کہ خداوند عالم جسم و جسمانیات سے منزہ و مبرا ہے تو پھر اس کی ذاتِ والاصفات کے متعلق اس قسم کے واہیات اعتقادات رکھنے کی ہرگز کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ ہاں اصطلاحِ شریعت میں جن معنوں پر عرش کا اطلاق صحیح ہے اور لغت سے بھی فی الجملہ اس کی تائید ہوتی ہے، اس کا ذیل میں اجمالی تذکرہ کیا جاتا ہے۔

عرش کے معانی و مفاہیم کی تفصیل جمیل

مخفی نہ رہے کہ جو کچھ لغتِ عرب اور اصطلاحِ شرعِ انور سے مستفاد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ عرش کا کئی معانی پر اطلاق ہوا ہے۔

عرش کے پہلے معنی یہ ہیں کہ اس سے مراد عام مملکتِ خداوندی ہے۔ جیسا کہ حضرت مصنف علام

و سئل الصادقؑ عن قول اللہ عز و جل الرحمن علی العرش استویٰ فقال استویٰ من کل شئ فلیس شئ اقرب الیہ

غالب ہوگیا" (طٰہٰ:۵) کی تفسیر حضرت صادق علیہ السلام سے دریافت کی گئی ۔ فرمایا: خدا اپنی تمام مخلوق کے ساتھ یکساں نسبت رکھتا ہے ۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک چیز سے دوسری اس کے زیادہ نزدیک ہو اور وہ عرش جو تمام دنیا کا مجموعہ ہے،

نے بیان کیا ہے ۔ اور لغتِ عرب سے بھی عرش کے بمعنی ملک استعمال ہونے کی تائید ہوتی ہے ۔ چنانچہ شاعر عرب کہتا ہے: ؎

اذا ما بنو مروان ثلت عروشہم و اودت کما اودت ایاد و حمیر

یعنی بنی مروان کی مملکت اس طرح تباہ و برباد ہوگئی جس طرح ایاد و حمیر نامی قومیں تباہ ہوئی تھیں ۔

روایات اہل بیتؑ سے بھی اس معنی کی تائید مزید ہوتی ہے ۔ چنانچہ جناب سدیر روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت صادق علیہ السلام سے عرش و کرسی کے معانی دریافت کیے، آپؑ نے فرمایا: "ان للعرش صفات کثیرۃ مختلفۃ لہ فی کل سبب و وضع فی القرآن صفۃ علیحدۃ فقولہ رب العرش العظیم یقول رب الملک العظیم" ۔ یعنی عرش صفات و نعوت کثیرہ کا حامل ہے ۔ اور قرآن میں یہ لفظ جہاں جہاں استعمال ہوا ہے، ہر ہر مقام پر اس کے مناسب حال مختلف معنی مراد ہیں ۔ چنانچہ آیت مبارکہ: "و ھو رب العرش العظیم" (توبہ:۱۲۹) میں اس کے معنی ہیں کہ خدا ملک عظیم کا مالک ہے ۔ بنابریں آیت مبارکہ: "ان اللہ علی العرش استویٰ" کے معنی یہ ہوں گے کہ عظیم سلطنت پر غالب ہے، باقی اس بات کی تحقیق کہ ملک و سلطنت کو عرش سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے ۔ اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ کسی بادشاہ کی عظمت و جلالت کا مظہر اس کا عرش یعنی پایۂ تخت ہوتا ہے، اسی سے اس کی شان و شوکت ظاہر ہوتی ہے، اور یہاں یہ کیفیت ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے پروردگار کی عظمت و جبروت اور اس کی صنعت و کاری گری پر اس قدر شواہد و دلائل رکھتا ہے کہ جن کا عد و احصاء نہیں ہو سکتا ۔ ؎

و فی کل شئ لہ اٰیۃ تدل علیٰ انہ واحد

اس اعتبار سے اشیاء عالم کے مجموعہ کو خدا کا عرش کہنا صحیح ہے ۔ کیونکہ یہ اس کی شان و شوکت کا مظہر اتم ہے ۔

استواء علی العرش کے معنوں کی تحقیق

علاوہ ان معنوں کے جو مصنف علام نے بیان فرمائے ہیں، یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ خداوند عالم

من شئ فاما العرش الذی ھو جملة جمیع الخلق فحملة ثمانیة من الملائکة لکل واحد منھم ثمانیة اعین کل عین طباق

اس کو اٹھانے والے آٹھ فرشتے ہیں ۔ (حاقہ:۱۷) جن میں ہر ایک کی آٹھ آٹھ آنکھیں ہیں اور ان کی ہر آنکھ اتنی بڑی ہے کہ وہ ساری دنیا کو ڈھانپ سکتی ہے ۔

مملکت وسلطنت پر مسوی یعنی غالب ہے ۔ فرقہ مجسّمہ نے عرش کے معنی کی طرح "استواء" کے مفہوم سمجھنے میں بھی بڑی ٹھوکر کھائی ہے ۔ انھوں نے اس کے معنی سیدھے ہوکر بیٹھنے کے کیے ۔ اور یہ نہ سوچا کہ آیا یہ معنی شانِ ایزدی کے مطابق بھی ہیں یا نہیں؟ سچ ہے: "یك من علم راده من عقل باید" ہر لفظ کے ہر جگہ بلا لحاظ مورد و متعلّق ایک ہی معنی مراد لینا اپنی عقل وخرد کا جنازہ نکالنے کے مترادف ہے ۔ حالانکہ استواء کے صرف وہی ایک معنی نہیں جو ان حضرات نے لیے ہیں، بلکہ استواء لغتِ عرب میں بمعنی استیلاء وغلبہ بھی استعمال ہوتا رہتا ہے ۔ چنانچہ عرب کا ایک شاعر (لبیث) کہتا ہے:

قد استوی بشر علی العراق من غیر سیف و دم مھراق

ایک آدمی عراق پر مُسلّط وغالب ہوگیا ہے، بغیر کسی قسم کی شمشیر زنی اور خون ریزی کے ۔
اور یہی معنی شانِ ربوبی کے لائق ہیں ۔

عرش کے دوسرے معنی

عرش کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ اس سے مراد وہ جسم عظیم ہے جو خلاقِ عالم نے آسمانوں کے اوپر خلق فرمایا ہے جو آسمانوں اور زمینوں کو محیط ہے ۔ لیکن اس میں اختلاف ہے کہ آیا وہ کرسی کو محیط ہے یا کرسی اس کو محیط ہے ۔ اس سلسلہ میں روایات مختلف ہیں ۔ بعض روایتوں سے کرسی کا اس کو محیط ہونا ثابت ہے ۔ جیسا کہ ہم باب سیزدہم میں ایسی بعض روایتیں نقل کر چکے ہیں اور بعض دوسری روایات (جن کو علامہ مجلسیؒ نے تعداد میں زیادہ قرار دیا ہے ۔ وھو قدس سرہ اعلم بما قال وان کان عندنا محل نظر و تامل و لکن نقول اجلالا لمقامه الرفیع ان القول قوله :

واذا قالت حذام فصدقوھا فان القول ما قالت حذام

سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کرسی کو محیط ہے اور حکماء کے اقوال سے بھی اسی امر کی تائید ہوتی ہے ۔ ان کا خیال ہے کہ کرسی سے مراد فلک ہشتم اور عرش سے مراد فلک نہم ہے ۔ لیکن احادیثِ معصومینؑ میں عرش و کرسی کے جو اوضاع واشکال اور خواص بیان کے گئے ہیں، ان سے حکماء کے بیان کردہ معانی کی تصدیق نہیں ہوتی ۔ واللہ العالم

الدنیا واحد منہم علی صورۃ بنی آدم فھو یسترزق اللہ لاولاد آدم و واحد منہم علی صورۃ الثور یسترزق اللہ للبہائم کلھا و واحد منہم علی صورۃ الاسد یسترزق اللہ للسباع و واحد منہم علی صورۃ الدیك یسترزق للطیور فھم الیوم اربعة فاذا کان یوم القیٰمة صاروا ثمانیة و اما العرش الذی ھو العلم تحمله اربعة من الاولین فنوحؑ و ابراھیمؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ علیہم السلام

ان فرشتوں میں ایک فرشتہ آدمی کی شکل میں ہے جو اولادِ آدم کے لیے خدا سے روزی طلب کرتا رہتا ہے۔ دوسرا فرشتہ بیل کی شکل میں ہے جو چوپایوں کے واسطے رزق مانگتا ہے، تیسرا فرشتہ شیر کی صورت میں ہے جو درندوں کے لیے روزی طلب کرتا ہے، چوتھا فرشتہ مرغ کی ہیئت رکھتا ہے جو اللہ سے تمام پرندوں کے لیے رزق مانگتا ہے۔ حاملانِ عرش اس وقت یہی چار فرشتے ہیں مگر قیامت کے روز آٹھ ہوجائیں گے۔ لیکن جو عرش علم کے معنوں میں ہے اس کے اٹھانے والے چار تو اولین میں سے ہیں اور چار آخرین میں سے۔ جو اولین میں سے ہیں وہ حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، اور جناب عیسیٰؑ علیہم السلام ہیں اور جو

بہر حال بنابریں عرش ایک بہت بڑا جسم ہے جس کی خلقت زمین و آسمان کی خلقت سے پہلے ہوئی تھی۔ "و کان عرشه علی الماء" (ھود:۷) اور کئی روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جسم عظیم مختلف رنگ کے انوار سے خلق کی گیا ہے، اور اس کی جسامت اور بڑائی کا اندازہ اس روایت سے ہوتا ہے جسے علامہ شہرابن آشوب نے اپنی کتاب بیان التنزیل میں حضرت صادق علیہ السلام سے نقل کیا ہے (علی ما نقلہ فی البحار) عرش کے ستونوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے کہ ایک ستون سے دوسرے ستون تک دس ہزار سال تک ایک پرندا اڑسکتا ہے۔ ان ارکان میں سے ہر ہر رکن کے پاس اس قدر ملائکہ کرام دن رات تسبیح وتقدیس الٰہی میں مشغول ہیں جن کی تعداد سوائے ان کے خالق کے اور کوئی نہیں جانتا۔ شاید نئی روشنی کے بعض جدت پسند حضرات اس قسم کی احادیث کو بنظر استبعاد دیکھیں، ان کے رفع استبعاد کے لیے اتنا عرض کردینا کافی ہے کہ اگر وہ خداوند عالم کو علیٰ کل شیٔ قدیر جانتے ہیں تو پھر ان کا یہ استبعاد کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اور اگر ہنوز اس کی قدرت کاملہ میں ہی تردد ہے تو پھر انھیں پہلے اپنا اعتقاد صحیح کرنا چاہیے، اس کے بعد یہ استبعاد خودبخود دور ہوجائے گا۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ ارشادِ خداوندی اور فرمانِ نبویؐ سے زیادہ اہمیت اپنے جغرافیہ کے نقشوں کو دیتے ہیں۔ اگر خدا اور رسولؐ کسی شے کی نشاندہی کریں، لیکن وہ چیز ان کے نقشہ میں موجود نہیں ہے تو یہ حضرات اسے

و اما الاربعة من الأخرين فمحمدؐ و عليؑ و الحسنؑ و الحسينؑ صلوات الله عليهم هكذا روى بالاسانيد الصحيحة عن الائمة فى العرش و حملته و انما صار هؤلاء حملة العرش الذى هو العلم لان الانبياء الذين كانوا قبل نبينا محمد على شرائع الاربعة من	آخرین میں سے ہیں وہ جناب محمد مُصطفیٰ ﷺ، حضرت امیرالمومنین علی بن ابی طالبؑ، جناب امام حسنؑ اور حضرت امام حسین علیہم السلام ہیں۔ یہ خلاصہ ہے ان احادیث کا جو ائمہ علیہم السلام سے بسند صحیح عرش اور حاملانِ عرش کے بارے میں منقول ہوئی ہیں۔ ان ذواتِ مُقدسہ کے عرش بمعنی علم خداوندی کے حامل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جناب رسول خدا ﷺ سے قبل وہ انبیاءؑ جن کی شریعتوں پر سب انبیاءؑ عمل کرتے تھے، اور ان کے توسط سے ان کو علوم حاصل

باور کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔ ان کی اس کیفیّت کا اکبر الہ آبادیؒ اپنے مخصوص انداز میں یوں نقشہ کھینچا ہے: ؎

قائل خدا کے عرش کے کیونکر ہوں یہ عزیز جغرافیہ میں عرش کا نقشہ نہیں ملا

موجودہ نظامِ تعلیم کے ناقص ہونے کی طرف اشارہ

اور یہ اس نظامِ تعلیم کے برے اثرات ہیں جو انگریزوں نے مُسلمانوں کے مذہبی مُعتقدات کو کمزور کرنے کے لیے مُسلّط کیا تھا۔ اب اگرچہ ہم بفضلہٖ تعالیٰ جسمانی طور پر آزاد ہو چکے ہیں اور انگریز رختِ سفر باندھ کر یہاں سے جا چکا ہے مگر ہنوز ذہنی غلامی قریبًا بدستور باقی ہے۔ جس سے گلوخلاصی کرانے کے لیے محکمۂ تعلیم کے اربابِ بست وکشاد کو خُصُوصی توجہ کرنا چاہیے۔ خدا کرے وہ اپنے فرض منصبی کو سمجھیں اور موجودہ نظام وطرزِ تعلیم میں مناسب تغیّر وتبدل کرکے اصلاحِ احوال کریں۔ کیوں کہ ؎

اور یہ اہل کلیسا کا نظامِ تعلیم ایک سازش ہے فقط دین ومروّت کے خلاف

جہاں تک زبانی طور پر موجودہ نظامِ تعلیم کے ناقص بلکہ بعض وجوہ سے گمراہ کن ہونے کا تعلق ہے اس کا اقرار واعتراف ملک کے باخبر دردمندانِ دین کے علاوہ خود محکمۂ تعلیم کے اربابِ حل وعقد کو بھی ہے۔ خدا کرے کہ عملی طور پر بھی ان کو توفیق ہو کہ کوئی اصلاحی اقدام کرکے نئی پود کے مستقبل کو روشن اور تابناک بنائیں۔ اور آئندہ نسلوں کے مذہبی مُعتقدات اور اسلامی روایات کے تحفّظ کا کوئی مکمل انتظام وانصرام کریں۔ آج کل کی تعلیم بقول اکبر الہ آبادی یہ ہے: ؎

نوحؑ و ابراهیمؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ و من قبل هؤلاء صارت العلوم الیهم و کان صار العلم من بعد محمدؐ و علیؑ و الحسنؑ و الحسینؑ الی من بعد الحسینؑ من الائمة	ہوتے تھے وہ حضرت نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ و عیسیٰ علیہم السلام ہی تھے اور اسی طرح محمد مصطفیٰؐ، جناب امیرؑ، امام حسنؑ اور امام حسین علیہم السلام سے منتقل ہو کر بعد والے اماموں کو علم حاصل ہوا ہے۔

تعلیم جو دی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

اور اس تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ہمارے اکثر نوجوان زبان حال سے یہ کہہ کر مذہب کا جوا اپنی گردن سے اتار دیتے ہیں کہ: ؎

یہ آپ کا فرمانا بجا قرآن بھی ہے اللہ بھی ہے
مشکل تو یہ ہے لیکن کہ ادھر آنر بھی ہے اور تنخواہ بھی ہے

مُسلمانوں نے خداوند عالم سے یہ عہد و پیمان کر کے پاکستان ایسی عظیم سلطنت مانگی تھی کہ ہم اس میں اسلامی قانون رائج کریں گے۔ اور شریعت محمدی کے مطابق زندگی گزاریں گے۔ مقام ہزار شکر ہے کہ خدائے منان نے ہم پر بہت بڑا احسان کیا اور عدیم النظیر اسلامی سلطنت عطا فرمائی۔ مگر افسوس کہ ہم اپنا کیا ہوا عہد و پیمان بھول گئے۔ آج پاکستان بنے ہوئے بیس سال سے زائد عرصہ ہو رہا ہے مگر افسوس کہ آج تک اس کے اکثر قوانین و آئین غیر اسلامی ہیں۔ اس کا طرزِ تعلیم ہنوز مغربی نہج پر جاری وساری ہے۔ ہمارا اندازِ فکر غیر اسلامی ہے۔ ہمیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ قدرت کا وعدہ ہے: "ان شکرتم لازیدنکم" (ابراہیم:۷) اگر تم میرا شکر ادا کرو گے تو میں نعمتوں میں برابر اضافہ کرتا رہوں گا اور ساتھ ہی یہ تہدید بھی فرمائی ہے کہ: "لئن کفرتم ان عذابی لشدید" لیکن اگر تم نے کفرانِ نعمت کیا تو پھر یاد رکھو میرا عذاب بہت سخت ہے۔ خدا کی گرفت (اعاذنا اللہ منہ) دیر سے شروع ہوتی ہے، لیکن جب شروع ہو جائے تو بہت سخت ہوتی ہے۔ "ان بطش ربك لشدید" (بروج:۱۲) اصلاحِ احوال کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے، ورنہ خدانخواستہ کچھ عرصہ تک یہی لیل ونہار رہے تو وہ دن دور نہیں ہے جب:

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

یہ ایک جملہ مُعترضہ تھا جو کہ منقارِ قلم سے صفحہ قرطاس پر مُنقّش ہوگیا۔ عرشِ الٰہی کے دوسرے معنی کا ذکر ہو رہا تھا، اس بڑے جسم کو عرشِ خدا کہا جاتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ خداوند عالم اس پر تشریف رکھتا ہے بلکہ یہ محض اس کی عظمت و جلالت کی وجہ سے ہے۔ جس طرح خانہ کعبہ کو "بیت اللّٰہ" یا حضرت صالح علیہ السلام کی ناقہ کو "ناقۃ اللّٰہ" کہا جاتا ہے، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ خانہ کعبہ (معاذ اللّٰہ) خدا کا رہائشی مکان اور ناقۂ صالح اس کی سواری کا جانور ہے۔ بلکہ یہ اضافت و نسبت محض ان اشیاء کی عظمت و جلالت ظاہر کرنے کے لیے ہے۔

عرشِ الٰہی میں کیا ہے؟

اب رہا یہ امر کہ اس عرشِ اعظم میں ہے کیا؟ تو اس کا صحیح علم تو علام الغیوب کو ہی ہے یا ان بزرگواروں کو ہے جن کی خلقت عرش و فرش کی خلقت سے پہلے ہوئی۔ ہاں جو کچھ بعض احادیث سے ظاہر ہوتا ہے، اگرچہ ان امور پر یقین کرنا مُشکل ہے، وہ یہ ہے کہ جو کچھ کائنات میں موجود ہے اس کی مثال (بلا مادہ و مدت) عرشِ الٰہی میں موجود ہے۔ چنانچہ کتاب روضۃ الواعظین مولفہ حضرت شیخ فتال نیشاپوری میں جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے بسلسلہ سند ان کے آباء واجداد کے مروی ہے کہ فرمایا: "فی العرش تمثال ما خلق اللّٰہ فی البر و البحر و قال ھذا تأویل قولہ تعالٰی و ان من شئی الا عندنا خزائنہ"۔ عرش میں ہر اس چیز کی تمثال موجود ہے جسے خداوند عالم نے خشکی وتری میں پیدا کیا ہے اور یہی مطلب ہے اس آیت مبارکہ کا کہ کوئی چیز ایسی نہیں جس کا خزانہ ہمارے پاس نہ ہو۔

عرش کے تیسرے معنی

عرش کے تیسرے معنی یہ ہیں کہ اس سے مراد علم ہے جیسا کہ متن رسالہ میں مذکور ہے۔ چنانچہ آیت مبارکہ "وسع کرسیہ السموت والارض" کی تفسیر میں حضرت صادق آلِ محمد علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: "السموات والارض وما بینھما فی الکرسی والعرش العلم الذی لا یقدر احد قدرہ"۔ تمام آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، وہ کرسی کے اندر موجود ہے۔ اور عرش سے مراد خداوند عالم کا وہ علم ہے جس کا کوئی شخص اندازہ نہیں لگا سکتا۔ (کتاب التوحید) اس معنی کی مناسبت بھی ظاہر ہے کہ چونکہ بندوں کے لیے خلاقِ عالم کی معرفت اور اس کی قدرت کا ظہور علم ہی کی بدولت ہوتا ہے، اس لیے عرش کا اطلاق علم پر بھی جائز ہے اور اس علم کے حاملین بعض انبیاءؑ سلف اور ہمارے نبی اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ طاہرینؑ ہیں۔ اس کی وجہ متن رسالہ میں مذکور ہے کہ یہی بزرگوار اللّٰہ سبحانہ کے علم کے معدن اور خزانہ دار ہیں۔

عرش کے چوتھے معنی

اس سے مراد قلب مومن ہے۔ جیسا کہ حدیث قدسی میں وارد ہے: "لا یسعنی سمائی و الارض و یسعنی قلب عبدی المؤمن"۔ میری گنجائش آسمان میں ہے نہ زمین میں، ہاں اگر میری گنجائش ہے تو فقط اپنے بندۂ مومن کے دل میں"۔ ؎

جنھیں ہم ڈھونڈتے تھے آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے آخر اپنے خانۂ دل کے مکینوں میں

واضح رہے کہ عرش کے جو معانی و مفاہیم بیان کیے گے ہیں، ان میں سے اکثر مفاہیم میں کرسی بھی عرش کے ساتھ شریک ہے۔ اس میں بھی یہی سلسلۂ کلام جاری ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر ان کے درمیان کچھ فرق ہے تو فقط اس قدر ہے کہ جسم ہونے کی صورت میں کرسی عرش سے بڑی ہے یا عرش کرسی سے بڑا ہے۔

الاٰثار و الاخبار فی ذلک مختلفۃ و اللہ العالم بالاسرار او نوابہ القائمون مقامہ من الانبیاء و الائمۃ الاطہار علیہم صلوات الملک الجبار فی أناء اللیل و اطراف النہار

اظہارِ حقیقت

بعض احادیث میں حاملین عرش ملائکہ کرام کے جو شکل و شمائل بیان کیے گئے ہیں کہ بعض آدمی کی شکل پر ہیں اور بعض پرندے کی شکل میں۔ جیسا کہ متن رسالہ میں مذکور ہیں۔ اس کے متعلق ہم حضرت شیخ مُفید علیہ الرحمۃ کی تنقید کی تائید کرتے ہیں کہ: "و الاحادیث التی رویت فی صفۃ الملائکۃ الحاملین العرش احادیث احاد و روایات افراد لا یجوز القطع بہا و الوجہ الوقوف عندہا"۔ یعنی جو احادیث حاملانِ عرش ملائکہ کرام کی صفت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں، چونکہ یہ اخبارِ احاد ہیں، اس لیے ان کے مضمون پر قطع و یقین نہیں کیا جا سکتا۔ بہتر ہے کہ اس سلسلہ میں توقف سے کام لیا جائے۔

سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ نے یہ احادیث درج کرنے کے بعد لکھا ہے: "قد تحمل ہؤلاء الحملۃ علی ارباب الانواع التی قال بہا افلاطون و اضرابہ و ما یظہر من صاحب الشریعۃ لا ینا سب ما ذہبوا الیہ کما لا یخفی علی العارف بمصطلحات الفریقین"۔ ان حاملین عرش کو ان اربابِ انواع پر بھی محمول کیا جاتا ہے جن کے افلاطون اور ان کے ہم خیال حکماء قائل ہیں لیکن جو کچھ صاحبِ شریعت مُقدسہ کی تعلیمات سے ظاہر ہوتا ہے وہ اس کے خلاف ہے۔ جیسا کہ فریقین (حکماء و اربابِ شریعت) کی

اِصطلاحوں سے واقف کار حضرات پر مخفی نہیں ہے۔

حاملین عرش کے سلسلہ میں جن انبیاء کے اسماء گرامی مذکور ہیں یہ اولوالعزم پیغمبر اور تمام انبیاء کے سردار ہیں۔ چنانچہ اصول کافی و تفسیر صافی وغیرہ میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: جو حضرات انبیاءؑ و مرسلینؑ کے سردار ہیں اور جن پر وحی الٰہی کا دارو مدار ہے اور بمنزلہ قطبِ اسیائے وحی ہیں وہ پانچ ہیں۔ حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ۔ اور یہی حضرات صاحبانِ شریعت ہیں۔ چنانچہ ارشادِ قدرت ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَ مَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى (سورۃ الشوریٰ: ۱۳)

اور جناب ختمی مرتبت ﷺ ان تمام بزرگواروں سے افضل ہیں۔ کیونکہ اب دیگر حضرات کی شریعتیں منسوخ ہو چکی ہیں، مگر آپؐ کی شریعتِ مقدسہ قیامت تک جاری و ساری ہے۔ "حلال محمد حلال الی یوم القیامۃ و حرامہ حرام الیٰ یوم القیٰمۃ" (اصول کافی) ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا (سورۃ الجاثیہ: ۱۸)

آں حضرت ﷺ کے بعد یہ اشرفیت و افضلیت حضرت امیرالمومنینؑ اور دوسرے ائمہ طاہرینؑ کو حاصل ہے۔ تمام انبیاءؑ و مرسلینؑ کے علوم و فضائل اور کمالات کے مع شئ زائد یہی حضرات وارث ہیں اور یہی بزرگوار خداوند عالم کے علم کے خزینہ دار اور اس کے امین اور تمام کائنات عالم پر اس کی حجتیں ہیں۔ "فھم خزان علمہ فی ارضہ و سمائہ و امنائہ علی وجیہ و حججہ علی من فوق الارض و ما تحت الثریٰ"۔

پینتیسویں باب کے ذیل میں ہم جناب
رسولِ خدا و ائمہ ہدیٰؑ کی افضلیت پر
تفصیلی دلائل و براہین
پیش کریں
گے
ان شاء اللہ العزیز

ان فی ذلک لآیات لقوم یعقلون

☆

باب الاعتقاد فی النفوس و الارواح

پندرھواں باب

نفس اور روح کے متعلّق اعتقاد

قال الشیخ اعتقادنا فی النفوس انھا ھی الارواح التی بھا تقوم الحیوۃ و انھاالخلق الاول لقول النبی

جناب شیخ اعلی اللہ مقامہ بیان کرتے ہیں کہ نفس کے بارے میں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ نفوس سے مراد وہ ارواح ہیں جن پر انسانی زندگی کا دارومدار ہے اور انہی کے ساتھ اس کا قیام وابستہ ہے۔ مخلوقِ خداوندی میں سب سے پہلے انہی نفوس کو پیدا کیا گیا۔

پندرھواں باب نفس اور رُوح کے متعلّق اِعتقاد

اس باب میں سرکار مُصنّف علام نے چند امور کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ ① حقیقت نفس و روح ② اجسام سے پہلے ان کی خلقت ③ فناء اجسام کے بعد ان کی بقا ④ عالم ذر میں ان کا اقرار توحید ⑤ تناسخ کا ابطال۔ ذیل میں ہم ان تمام امور پر قدرے شرح و بسط کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں:

حقیقتِ نفس و رُوح کا معلُوم کرنا بہت مُشکل ہے

اتنا تو سب لوگ ہی جانتے ہیں کہ ایک ایسی چیز موجود ہے جسے ہم لفظ "انا" "من" اور "مَیں" سے تعبیر کرتے ہیں۔ جیسے "انا سعیت" "من کوشش نمودم" "مَیں نے کوشش کی"۔ وہی چیز جسے "انا" اور "من" اور "مَیں" سے تعبیر کیا جاتا ہے، رُوح اور نفس ناطقہ کہلاتی ہے۔ اسی سے انسان کی انسانیت ہے۔ اور اسی پر تکالیف شرعیہ کا دارومدار ہے اور اسی پر جزاوسزا کا انحصار ہے۔ لیکن نفس و روح کی حقیقت کیا ہے؟ یہ مسئلہ ان مسائل مشکلہ و دقائق غامضہ میں سے ہے کہ دنیا کے حکماء و علماء نے ابتدائے آفرینش سے لے کر ہمیشہ اس کی حقیقت کو معلُوم کرنے کے لیے مدتوں سرمارے اور ٹھوکریں کھائیں۔ مگر اس عقبہ دشوار گزار کو طے نہ کرسکے، اور نہ ہی آئندہ یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے ناخن علم وتدبیر سے اس عقدہ کو وا کرسکیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ روح کی حقیقت کا ادراک عام عقل انسانی کی دسترس سے بالاتر ہے۔ روح زبانِ حال سے عقلاء روزگار کو پکار پکار کر یہ کہہ رہی ہے: ؎

عنقا شکار کس نہ شود دام باز چیں   کاینجا ھمیشہ باد بدست است دام را

ان اول ما ابدع الله سبحانه هی النفوس المقدسة المطهرة فانطقها بتوحیده ثم خلق	جیسا کہ جناب سرور کائنات ﷺ کا ارشاد ہے کہ سب سے اول خدائے تعالیٰ نے مقدس اور پاکیزہ نفوس کو خلق فرمایا اور ان سے اپنی توحید کا اقرار اور عہد لیا، بعد ازاں اپنی تمام مخلوقات کو پیدا کیا

یہی وجہ ہے کہ جب بھی لوگوں نے انبیاءؑ و مرسلینؑ علیہم السلام سے روح کی حقیقت دریافت کی تو انھوں نے ہمیشہ اس کا مجمل جواب دینے پر اکتفا کیا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس کی حقیقت سمجھنے کی ان لوگوں میں اہلیت و قابلیت ہی نہیں ہے۔ چنانچہ جب یہودیوں نے سرکار ختمی مرتبت ﷺ سے حقیقت روح معلوم کرنے کی استدعا کی تو آنجنابؐ نے بحکمِ الٰہی فقط اتنا جواب دیا کہ روح میرے پروردگار کا ایک امر ہے۔ اس سوال و جواب کو قدرت نے ان الفاظ میں قرآن مجید کے اندر بیان کیا ہے: وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ، قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ (سورۃ الاسراء: ۸۵) "اے رسولؐ! یہ لوگ تجھ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ روح میرے پروردگار کے امور میں سے ایک امر ہے"۔ پھر قدرت نے تفصیلی جواب دہی سے پہلو تہی کرنے کی وجہ بھی بتا دی کہ: وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (سورۃ الاسراء: ۸۵) کہ تمھیں بہت ہی تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے تم اس کی حقیقت سمجھنے سے قاصر و عاجز ہو۔ چنانچہ مشہور ارشادِ نبویؐ (یا علویؑ) "من عرف نفسه فقد عرف ربه"۔ (جس شخص نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا) کے متعلق اکثر علماءِ محققین کی تحقیق یہ ہے کہ یہ ارشاد "تعلیق الامر علی المحال" کی قسم سے ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح خداوند عالم کی کنہ حقیقت کی معرفت محال و ناممکن ہے اسی طرح نفس و روح کی کنہ حقیقت معلوم کرنا بھی محال ہے۔ (بحار الانوار جلد ۱۴ وغیرہ) لیکن بایں ہمہ چونکہ خالقِ فطرت نے انسان کی فطرت میں تجسس و جستجو کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے اور حق یہ ہے کہ دنیا میں اس وقت جو کچھ چہل پہل اور رنگ و رونق موجود ہے وہ انسان کی اسی فطری و جبلی قوت کا نتیجہ ہے۔ اسی فطری تڑپ کا اثر ہے کہ آج چودھویں صدی کا انسان ارضی طاقتوں کو مسخر کرنے کے بعد چاند پر کمندِ ہمت ڈال رہا ہے[1]۔ بہرکیف ہمیشہ سے انسان کا یہ دستور رہا ہے کہ اسی فطری جذبہ سے سرشار ہو کر بعض ایسی چیزوں کی جستجو بھی شروع کر دیتا ہے جو فی الحقیقت اس کی دسترس سے بالاتر ہوتی ہیں۔ من جملہ ان امور کے ایک یہی نفس و روح کی حقیقت معلوم کرنے کا مسئلہ بھی ہے۔ چنانچہ جب سے حضرت

---

[1] بلکہ اسے اپنی بلند ہمتی کے دام میں گرفتار کر چکا ہے۔ (منہ عفی عنہ)

بعد ذلك سائر خلقه و اعتقادنا فيها انها خلقت للبقاء و لم تخلق للفناء لقول النبی ﷺ ما خلقتم للفناء بل خلقتم للبقاء

نیز نفوس کی بابت ہمارا اعتقاد ہے کہ انھیں باقی رکھنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے، نہ فنا کے واسطے۔ جیسا کہ جناب رسولِ خدا ﷺ کا ارشاد ہے کہ تمھیں فنا کے واسطے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ تمھاری پیدائش بقاء کے لیے ہوئی ہے۔

انسان نے ہوش سنبھالا ہے، وہ حقیقتِ روح کو اپنے دامِ عقل و دانش میں گرفتار کرنے کی جستجو میں مشغول رہا ہے۔ چنانچہ حکماء وفلاسفر کے آراء و انظار اس سلسلہ میں دس بیس نہیں سَو دو سَو نہیں، بلکہ بقول علامہ خوارزمی (درکتاب مُفید العلوم ومبید الھموم صفحہ...... طبع مصر) سات سَو تک پہنچ چکے ہیں۔ لیکن شوقِ تجسّس و جستجو کا پھر بھی یہ عالم ہے کہ "ہنوز روز اول است" والا معاملہ ہے۔ اور یہ اِختلافات مختلف نوعیّت کے ہیں۔ مثلاً پہلا اِختلاف تو حقیقتِ روح کے متعلق ہے کہ وہ کیا ہے؟ دوسرا اِختلاف اس کے حدوث وقدم کے بارے میں ہے کہ آیا روح قدیم ہے یا حادث؟ تیسرا اِختلاف یہ ہے کہ آیا وہ فانی ہے یا باقی۔ اور اگر باقی ہے تو فنا بدن، یعنی موت کے بعد کہاں جاتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے بیسیوں اختلافات ہیں جن سے کتب لبریز ہیں۔ بہرحال چونکہ سرکار مُصنّف علام اس مسئلہ کو متعرض ہوئے ہیں اور اس سلسلہ میں اور بھی بعض مسائل مُہمّہ ضمناً آگئے ہیں اور اس پر مُستزاد یہ کہ ان مباحث میں سرکار شیخ مُفید علیہ الرحمۃ نے اپنی شرح میں مُصنّف پر بڑی نکتہ چینی فرمائی ہے۔ اس لیے بعون اللہ تعالیٰ ارشاداتِ معصومین صلوات اللہ علیہم اجمعین کی روشنی میں بقدر وسعت وطاقت اس مسئلہ اور دیگر ضمنی مسائل پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔ یہ کفرانِ نعمت ہوگا اگر ہم یہ اعتراف نہ کریں کہ اس مرحلہ میں ہم نے علاوہ دیگر بیسیوں کتب کے خاص طور پر بحار الانوار جلد چہاردہم، انوار نعمانیہ اور رسالہ شریفہ ابطالِ تناسخ سے کافی اِستفادہ کیا ہے۔ شکر اللہ مساعی مولفیہا رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

اِطلاقاتِ رُوح

لفظ "رُوح" عربی زبان کا لفظ ہے۔ عربی زبان میں بالعموم اور قرآن و حدیث میں بالخصوص علاوہ اس معنی کے جو اس وقت محل بحث ہے اور متعدد معانی پر اس کا اطلاق ہوا ہے، یہاں صرف چند معنوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ (عند البعض)

① بمعنی قرآن۔ جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے: وَكَذٰلِكَ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا (سورۃ الشوریٰ: ۵۲) اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے قرآن کو بطور وحی تم پر نازل کیا۔

وانما تنقلون من دار الی دار وانھا فی الارض غریبۃ و فی الابدان مسجونۃ و اعتقادنا فیھا انھا اذا فارقت الابدان	ہاں تم ایک گھر سے دوسرے گھر کی طرف منتقل ہوجاتے ہو۔ یہ نفوس وارواح زمین میں مسافر اور بدنوں میں (بمنزلہ) قیدی کے ہیں۔ ہمارا یہ عقیدہ بھی ہے کہ جب یہ ارواح بدنوں سے علیحدہ ہوتی ہیں......

۲۔ بمعنی وحی۔ارشادِ قدرت ہے: يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ (سورۃ المومن:۱۵) خداوندعالم اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے وحی نازل کرتا ہے۔

۳۔ بمعنی ایمان ۔قرآن مجید میں وارد ہے: وَأَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِنْهُ (سورۃ مجادلہ:۲۲) خدانے ان کی روح یعنی ایمان سے مدد کی۔

۴۔ بمعنی نور۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: "خرج منه روح الایمان" یعنی اس سے نورِ ایمان سلب ہوگیا۔

۵۔ جناب جبریلؑ پر بھی اس کا اطلاق ہوا ہے۔

۶۔ اس کا اطلاق اس فرشتہ بھی ہوا ہے جو جسامت اور قدوقامت میں جناب جبریلؑ ومیکائیلؑ سے بھی بڑا ہے۔ تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا (سورۃ القدر:۴) شب قدر کو عام فرشتے اور روح نامی فرشتہ نازل ہوتے ہیں۔

۷۔ بمعنی رحمت ۔جیسا کہ بعض مفسّرین نے اس آیت میں لکھا ہے: يُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ (سورۃ النحل:۲) خدائے تعالیٰ رحمت کے ساتھ فرشتوں کو نازل کرتا ہے۔

۸۔ حضرت عیسیٰؑ پر بھی روح کا اطلاق ہوا ہے۔ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِنْهُ (سورۃ النساء:۱۷۱) جناب عیسیٰؑ اللہ کا اور اس کی روح ہیں۔

الی غیر ذٰلك من الاطلاقات

رُوح کے متعلّق چار اہم اقوال کا بیانؒ

ویسے تو روح کے متعلّق سینکڑوں اقوال ونظریات موجود ہیں، جیسا کہ ابھی اوپر اس کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے۔لیکن ان اقوال میں سے جو قول زیادہ مشہور اور اہم ہونے کی وجہ سے زیادہ قابلِ توجہ ہیں وہ چار ہیں۔

اوّل یہ کہ: روح اس کیفیّت کا نام ہے جو عناصر کی ترکیب کے بعد پیدا ہوتی ہے جسے اطبا مزاج کہتے ہیں۔ خلاصہ یہ روح بمعنی مزاج ہے۔

فهي باقية منها منعمة و منها معـذبة الى ان يردها الله عزوجل بقدرته الى ابدانها و قال عيسىٰ ابن مريم للحواريين	تو وہ اس حالت میں باقی رہتی ہیں کہ بعض مُنعم رہتی ہیں اور بعض مبتلائے عذاب، آخرکار خداوندعالم اپنی قدرتِ کاملہ سے ان کو ان کے اصلی بدنوں کی طرف لوٹا دے گا۔ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے حواریوں سے فرمایا: میں تم سے سچّی بات کہتا ہوں۔

دوم یہ کہ: روح اور بدن ایک ہی چیز ہے۔ یعنی اسی ہیکل محسوس و مشاہد جسے بدن کہتے ہیں، کا دوسرا نام رُوح ہے۔

سوم یہ کہ: رُوح ایک جو ہر درّاک ہے جس کا تعلق بدن کے ساتھ تدبیر و تصرف والا ہے۔ اس تعلق کے اِنقطاع کا نام موت ہے اور یہ جو ہر مادہ جسمانیہ اور اس کے عوارض سے منزہ و مبرا ہے۔

چہارم یہ کہ: روح ایک جو ہر درّاک ہے لیکن وہ ایک لطیف و نورانی جسم رکھتا ہے جو بدن میں اس طرح جاری وساری ہوتا ہے جیسے گلِ گلاب کے اندر پانی یا تلوں میں تیل اور انگارہ میں آگ، اس کے جسم سے خارج ہوجانے سے موت واقع ہوتی ہے۔

① پہلا قول بعض حکماء اور اکثر اطباء کا ہے۔ ② دوسرا قول طبیعیین و دہریین کا ہے، ③ تیسرا قول حکماء اشراقیین اور اکثر متکلمین اور کثیر علماء امامیہ کا ہے۔ اور ④ چوتھا قول بعض محققین علماء امامیہ اور بعض حکماء ربانیین کا مختار ہے۔

اب ہم ان چہارگانہ اقوال میں سے جو قول عقل و نقل کی رو سے صحیح معلوم ہوتا ہے اس کے اثبات کے ساتھ ساتھ دوسرے اقوال کے ابطال پر بھی چند دلائل پیش کرتے ہیں۔

پہلے قول کا ابطال

یہ قول بچند وجہ باطل ہے:

دلیل اول یہ کہ مزاج وقتاً فوقتاً تغیر پذیر ہوتا رہتا ہے۔ کبھی حرارت زیادہ ہوجاتی ہے اور کبھی برودت۔ کبھی یبوست کم ہوجاتی ہے اور کبھی رطوبت۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ مگر روح میں اس قسم کا کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ اس کے ادراک کی کیفیت ہر حال میں برابر باقی رہتی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ روح اور چیز ہے اور مزاج اور چیز۔

دلیل دوم: اگر روح اور مزاج ایک ہوتے تو لازم تھا کہ دونوں کا فعل ومُقتضاء بھی ایک ہی ہوتا، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ روح کی خواہش کچھ اور ہوتی ہے اور مزاج کا

بحق اقول لکم انه لا یصعد الی السماء الا ما نزل منها و قال الله جل ثنائه و لو شئنا لرفعنا بها و لکنه اخلد الی الارض	آسمان کی طرف وہی چیز بلند ہوتی ہے جو وہاں سے نازل ہوتی ہے۔ خداوندعالم اپنے کلام میں ارشاد فرماتا ہے کہ اگر ہم چاہتے تو اس (بلعم بن باعور) کو اپنی آیات کے سبب بلند مرتبہ عطا کر دیتے لیکن اس نے تو خواہشاتِ نفس کی پیروی کرتے ہوئے مادی زندگی کی

اقتضاء کچھ اور۔ مثلاً مزاج انسانی کا تقاضا یہ ہے کہ اگر بلندی پر ہو تو پستی کی طرف آئے لیکن ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ عین اس وقت روح بلندی کی طرف جانے کی خواہش کرتی ہے اور انسان اوپر سے اوپر چڑھتا جاتا ہے۔ اسی طرح مزاج کا تقاضا سکون ہے۔ کیونکہ اس میں ارضی مادہ غالب ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جب روح خواہش کرتی ہے تو بدن حرکت کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح کسی رعشے والے انسان کو دیکھیے اس کا بدن حرکت کر رہا ہے مگر اس کے روح کی یہ خواہش ہے کہ سکون اِختیار کرے۔ پس جب مزاج وروح کے آثار اور تقاضے علیحدہ علیحدہ ہیں تو پھر دونوں کو ایک شے کس طرح تصور کیا جا سکتا ہے؟

دلیل سوم: موجودہ دور میں تو یہ امر حسیات میں داخل ہے کہ روح کی حقیقت مزاج اور جسم کے علاوہ ہے۔ علم "احضارِ ارواح" کی وجہ سے بڑے بڑے مُنکرین روح بھی اس کے وجود کا اقرار کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں، بلکہ ان میں سے بعض مُنکرین، خدا کے وجود کا بھی اعتراف کر رہے ہیں اور اپنے سابقہ نظریہ کہ "ہر موجود شے کے لیے دکھائی دینا ضروری ہے" کو غلط ماننے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

دُوسرے قول کا ابطال

یہ قول بچند وجوہ درجہ اعتبار سے ساقط ہے۔

دلیل اول: یہ امر بداہتہً معلوم ہے اور کسی دلیل و برہان کا محتاج نہیں کہ جسم انسانی مُتغیّر ہوتا رہتا ہے۔ کبھی موٹا ہے۔ کبھی کمزور۔ کبھی بڑھ رہا ہے اور کبھی گھٹ رہا ہے۔ کبھی تندرست ہے اور کبھی بیمار لیکن روح بدن کے ان تمام حالات میں ایک ہی حالت پر باقی رہتی ہے۔ اس سے یہ قطعی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ جسم اور روح ایک چیز نہیں بلکہ الگ الگ دو حقیقتیں ہیں۔

دلیل دوم: ہر آدمی اپنے تمام اعضاء وجوارح کو اپنے نفس وروح کی طرف منسُوب کرتا ہے اور کہتا ہے میرا سر، میرے پاؤں، میرے ہاتھ، میرا بدن۔ ظاہر ہے کہ جسے منسُوب کیا جا رہا ہے یہ اور چیز ہے اور جس کی طرف نسبت دی جا رہی ہے وہ چیزے دیگر ہے۔ کسی صورت میں دونوں ایک

و اتبع ھویہ فمالم یرفع منہا الی اللکوت بقی یھوی فی الھاویۃ و ذلک ان الجنۃ درجات و النار درکات و قال عزوجل تعرج	طرف جھکا وُ اختیار کیا۔(اعراف:۱۷۶) پس ہر وہ چیز جو عالم ملکوت کی جانب بلند نہیں کی جاتی وہ آتشِ جہنم میں ڈالی جاتی ہے۔ کیونکہ بہشت میں بہت سے (اونچے) درجات ہیں اور دوزخ میں بہت سے (نچلے) درکات ہیں۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: ملائکہ اور روح اس کی

نہیں ہو سکتے۔

دلیل سوم: جسم کے اعتبار سے سب افراد انسانی زید بکر عمرو غیرہ برابر ہیں۔ جنسیت و نوعیت میں مساوی ہیں، لیکن بایں ہمہ وہ پھر بھی باہم مختلف ہیں۔ وہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے زید اپنے تئیں عمر کا غیر سمجھتا ہے۔ اور عمر اپنے آپ کو بکر کا غیر تصور کرتا ہے؟ پس معلوم ہوا کہ جسم کے علاوہ کوئی اور چیز ایسی ہے جس کی وجہ سے ایک ہی نوع کے افراد کے درمیان اختلاف وافتراق پایا جاتا ہے۔ اور وہ چیز وہی ہے جسے عربی میں "انا" فارسی میں "من" اور اردو میں "مَیں" کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس کو ہم نفس ناطقہ یا روح کہتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ جس چیز کی وجہ سے مشارکت ہے وہ اور ہے اور جس کی وجہ سے مفارقت ہے وہ اور ہے۔

دلیل چہارم: یہ امر بدیہی ہے کہ انسان کی کیفیت زندگی اور موت میں یکساں نہیں ہوتی۔ زندگی میں وہ کلام کرتا ہے، کام کاج کرتا ہے، ادراک و تعقل کرتا ہے وغیرہ وغیرہ اور مرنے کے بعد باوجود کہ وہی بدن موجود ہے، لیکن ان افعال میں سے کوئی فعل اب اس سے صادر نہیں ہوتا۔ پس معلوم ہوا کہ زندگی میں اس کے جسم کے اندر جسم کے علاوہ کوئی اور شے ایسی تھی جس کی وجہ سے اس سے یہ افعال صادر ہوتے تھے۔ جس کے چلے جانے کے بعد اب جسم بے کار ہو گیا ہے، وہی دوسری چیز نفس ناطقہ اور روح ہے۔ پس اس سے روزِ روشن کی طرح ظاہر ہے کہ جسم اور ہے اور روح اور جو دونوں کو ایک سمجھتا ہے گویا وہ موت وحیات میں فرق نہیں کرتا۔

تیسرے قول یعنی رُوح کے مجرد ہونے پر دلائل

دلیل اول: روح اپنے افعال میں مادہ کی محتاج نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا فعل، ادراک وعلم ہے۔ اور جب وہ اپنی ذات کا علم حاصل کرتی ہے تو اس وقت اس کو کسی آلۂ جسمانی کے استعمال کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی۔ پس جب وہ اپنے فعل میں محتاج مادہ نہیں تو اسے مجرد تسلیم کرنا پڑے گا۔

دلیل دوم: اگر روح مادی ہوتی تو چاہیے تھا کہ جسم کے قوی ہونے کے ساتھ قوی اور کمزور

پڑ جانے کے ساتھ کمزور پڑ جاتی۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جوں جوں جسم بوجہ قلت غذا کمزور ہوتا جاتا ہے اور کثافتِ جسمانیہ کم ہوتی جاتی ہے روح قوی سے قوی تر ہوتی جاتی ہے۔ جیسا کہ اہل ریاضات کرتے ہیں اور اس وقت ان پر عجیب وغریب نئے نئے انکشافات ہوتے ہیں۔ ادراک و تعقل کی حدت بڑھ جاتی ہے۔ کثرتِ غذا وغیرہ سے جس قدر جسم کا ثقل اور اس کی کثافت بڑھتی جائے اسی قدر رُوح ضعیف اور کمزور ہوتی جاتی ہے۔ اور اس کا ادراک وعلم کم ہوتا جاتا ہے۔ پس معلُوم ہوا کہ رُوح مادی نہیں بلکہ مجرد ہے۔

دلیل سوم: مادی وجسمانی چیز کی خاصیت یہ ہے کہ وہ جس قدر زیادہ کام کرے اسی قدر زیادہ تھک جاتی ہے۔ لیکن روح کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس کا کام یعنی اس کے ادراکات جس قدر بڑھتے جاتے ہیں اسی قدر اس میں اور زیادہ قوت اور بالیدگی آتی جاتی ہے۔ جس سے معلُوم ہوتا ہے کہ روح اور جسم کی اصل حقیقت میں فرق ہے۔ یعنی جسم مادی ہے اور رُوح مجرد۔

دلیل چہارم: مادی اشیاء خود اپنا ادراک واحساس نہیں کرسکتیں۔ کیونکہ مادہ میں شعور نہیں ہے لیکن روح کو ہروقت اپنا احساس وعلم ہے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ رُوح مادی نہیں ہے۔

دلیل پنجم: جسم اور جسمانی چیزوں کی قوتیں محدود ہوتی ہیں۔ اس لیے ان کے افعال بھی محدود ہوتے ہیں۔ لیکن روح اور نفس ناطقہ کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس کے معلُومات ومدرکات غیر محدود ہیں۔ پس معلُوم ہوا کہ جسم وروح کی حقیقت مختلف ہے۔ لہٰذا جب جسم مادی ہے تو روح کو مجرد ماننا پڑے گا۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

روح کے مجرد ماننے پر بالعموم اسلامی حلقوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ خداوند عالم کی ذات مجرد ہے۔ لہٰذا اگر روح یا کسی اور چیز کو بھی مجرد تسلیم کرلیا جائے تو اس میں شرک

قتلوا فی سبیل اللہ امواتًا بل احیاء عند ربھم یرزقون فرحین بمآ اٰتاھم اللہ من فضلہ | کیے گئے، انھیں مردہ خیال نہ کرو۔ کیونکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے پروردگار کے ہاں سے رزق پا رہے ہیں (آلِ عمران :۱۶۹) اور خدائے عزوجل نے اپنے فضل وکرم سے جو کچھ انھیں عطا کیا ہے اس پر وہ

لازم آتا ہے۔ کیونکہ بنابریں خدا اور رُوح کا جسم نہ رکھنے میں اِشتراک لازم آتا ہے۔ لیکن عندالتحقیق یہ شبہ بالکل کمزور ہے اور بچند وجہ مدفوع ہے۔

اولاً: اس لیے کہ یہ مساوات صفاتِ سلبیّہ میں سے ہے کہ خدا تعالیٰ بھی جسم نہیں رکھتا، اور روح بھی جسم نہیں رکھتی۔ اور یہ امر اپنے مقام پر ثابت ہو چکا ہے کہ صفاتِ سلبیّہ میں مساوات مماثلت ومشابہت کی مقتضی نہیں ہے۔ ایسا سمجھنا فاش غلطی ہے۔ کیونکہ اگر صفاتِ سلبیّہ میں مساوات بھی مشابہت ومماثلت کی مقتضی ہو تو پھر لازم آئے گا کہ تمام مختلف ماہیات وحقائق مساوی ہو جائیں۔ کیونکہ بعض سلوب میں وہ مشترک ہوتی ہیں۔ آپ جو بھی دو مختلف ماہیتیں لے لیں اور نہیں تو کم از کم یہ دونوں اس بات میں تو ضرور ہی شریک ہوں گی کہ ان دونوں میں ایک تیسری ماہیت والے خواص و آثار نہیں پائے جاتے۔ مثلاً گھوڑا اور گدھا دو مختلف نوعیں ہیں۔ لیکن ان صفات کے نہ پائے جانے میں باہم شریک ہیں جو انسان میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی طرح دو قدموں پر نہیں چلتے یا انسان علم وعقل کا حامل ہے لیکن گھوڑا اور گدھا عقل وعلم نہیں رکھتے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ اب گھوڑا اور گدھا کئی سلبی صفات میں باہم شریک ہیں۔ لیکن پھر بھی گھوڑا، گھوڑا ہے اور گدھا، گدھا۔ پس معلوم ہوا کہ صفاتِ سلبیّہ میں اشتراک مشابہت ومماثلت کا مقتضی نہیں، ورنہ لازم آئے گا کہ گھوڑا اور گدھا ایک ہو جائیں۔

ثانیاً: اس لیے کہ اگر روح کو مجرد تسلیم کر لیا جائے تو اس سے شرک لازم نہیں آتا۔ کیونکہ جس طرح خالق ومخلوق کی دوسری مشترکہ صفات جیسے سمع وبصر اور علم وقدرت وغیرہ کے معانی میں اختلاف ہے کہ جن معنوں کے اعتبار سے خدا سمیع وبصیر اور علیم وقدیر ہے ان معنوں کے اعتبار سے مخلوق سمیع و بصیر نہیں ہے۔ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ خالق کے تجرد اور رُوح کے تجرد کی حقیقت میں بھی اختلاف ہو۔ فقط لفظی اِشتراک کی وجہ سے حقیقت میں اشتراک لازم نہیں۔ کما لا یخفٰی۔

اگرچہ اس قول کو بالکل غلط محض تو قرار نہیں دیا جا سکتا ہے مگر چوتھا قول اقرب الی الصواب ہے۔ جیسا کہ ذیل میں عنقریب واضح ہوگا۔ یہاں مذکورہ بالا ادلہ کی صحت وسقم پر مزید نقض و ابرام کی گنجائش نہیں ہے۔

و قال تعالیٰ و لا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ امواتاً ﷺ و قال النبی صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم الارواح

خوش وخرم ہیں۔ اسی طرح ایک جگہ فرمایا: جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے جائیں انھیں مردہ نہ سمجھو (بقرہ:۱۵۴) کیونکہ وہ زندہ ہیں۔ صرف بات یہ ہے تمھیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہے۔ جناب

چوتھے قول یعنی رُوح کے جسم لطیف و نورانی ہونے پر دلائل

دلیل اول: ہر آدمی یقیناً جانتا ہے کہ وہ چیز جسے "انا" یا "من" یا "مَیں" کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے وہ صفاتِ جسمانیہ کے ساتھ متّصف ہوتی رہتی ہے۔ جیسے نقل و انتقال اور قیام وقعود وغیرہ۔ مثلاً کہا جاتا ہے: مَیں بیٹھا ہوں، مَیں کھڑا ہوں، مَیں جا رہا ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ جو چیز جسم کی صفات کے ساتھ متّصف ہو وہ جسم ہی ہوتی ہے۔

دلیل دوم: یہ کہ روح کلیات و جزئیات ہر دو کو ادراک کرتی ہے۔ جیسے آگ گرم ہے اور پانی ٹھنڈا ہے۔ اور یہ آگ گرم ہے اور یہ پانی ٹھنڈا ہے۔ اور یہ امر اپنے مقام پر واضح ہو چکا ہے کہ مدرک جزئیات جسم ہی ہوتا ہے۔ علاوہ بریں جزئی ادراک تو حیوانات میں بھی موجود ہے۔ لیکن ان کے اندر تو کوئی شخص، رُوحِ مجرد کا قائل نہیں ہے۔

دلیل سوم: یہ قول آیات و اخبار سے مستنبط ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس قول کے قائلین کے پاس اگر کوئی بہترین دلیل ہے تو وہ دلیل نقلی ہی ہے۔ کیونکہ آیات و روایات میں روح کے جو خواص و آثار بیان کیے گئے ہیں وہ اس کی جسمانیت پر دلالت کرتے ہیں۔ مثلاً احتجاج طبرسی میں بروایت ہشام بن الحکم حضرت صادق علیہ السلام کی ایک طویل حدیث مروی ہے جو ایک زندیق کے جواب میں آنجنابؑ نے ارشاد فرمائی۔ اس میں ایک جگہ آنجنابؑ رُوح کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں: "و الروح جسم رقیق قد البس قالبًا کثیفًا"۔ یعنی روح ایک جسم لطیف ہے جس پر ایک جسم کثیف (بدن) کا خول چڑھا دیا گیا ہے۔ یا جیسے وہ حدیث جو کتاب "منتخب بصائر الدرجات" میں بروایت جناب مُفضل حضرت صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ فرمایا: "مثل روح المومن و بدنه کجوھرة فی صندوق اذا اخرجت الجوھرة منه طرح الصندوق"۔ مومن کی روح اور اس کے بدن کی مثال ایک قیمتی جوہر اور صندوق کی سی ہے کہ جب اس سے وہ نفیس جوہر نکال لیا جائے تو صندوق پھینک دیا جاتا ہے۔ اس حدیث سے بھی ظاہر ہے کہ روح بدن کے اندر داخل ہے نہ یہ کہ اس سے خارج ہے اور بدن سے فقط تدبیر و تصرف والا تعلق رکھتی ہے۔ جیسا کہ اس تیسرے قول کے قائلین کا خیال ہے۔

جنود مجندة فما تعارف منها ایتلف و ما تناکر منها اختلف

رسولِ خدا ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ روحوں کے متعدد لشکر ہیں، جن لوگوں کی روحوں میں باہمی تعارف تھا وہ یہاں بھی ملے جلے رہتے ہیں اور جن کی روحوں میں باہمی نفرت تھی وہ لوگ یہاں بھی ایک دوسرے

دلیل چہارم: وہ روایات جو اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ ارواح کو ابدان سے دو ہزار سال قبل پیدا کیا گیا (جیسا کہ اس کی تفصیل عنقریب آرہی ہے) اسی طرح وہ احادیث جو اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ روحیں بدن کے فنا ہو جانے کے بعد باقی رہتی ہے۔ مثلاً وارد ہے کہ روح دفن تک جنازہ کے ادھر ادھر گھومتی رہتی ہے۔ پھر اسے جنّت یا دوزخ میں داخل کیا جاتا ہے، یا اس قسم کی اور احادیث جن میں روح کے لیے اجسام وابدان والے صفات وخواص بیان کیے گئے ہیں۔ اسی طرح آیتِ مبارکہ: يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ارْجِعِيٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾ فَادْخُلِي فِي عِبٰدِي ﴿٢٩﴾ وَادْخُلِي جَنَّتِي ﴿٣٠﴾ (سورۃ الفجر: ۲۷ تا ۳۰) میں نفس مطمئنہ یعنی روح کو خطاب کیا گیا ہے اور اس عباد الرحمٰن کے ساتھ جنّت میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح قبض روح کی جو کیفیّت آیت: لَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ (سورۃ الواقعہ: ۸۳) وغیرہ آیات وروایات میں مذکور ہے۔ اس سے بھی تجسم روح ظاہر ہوتا ہے۔ بہرحال ان تمام امور سے واضح ہوتا ہے کہ روح مجرد محض نہیں ہے بلکہ وہ ایک قسم کا لطیف اور نورانی جسم ضرور رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے مُتشرعین اور علماء ربانیین نے اسی قول کی طرف رجحان ومیلان فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت علامہ سید مُرتضیٰ علم الہدیٰ بھی اسی قول کے قائل ہیں۔ جیسا کہ ان کے رسالہ "اجوبہ مسائل الرائے" سے ظاہر ہے (علیٰ مانقل عنہ) علامہ فخرالدین رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں اسی قول کی طرف اپنے رجحان کا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے آیتِ مبارکہ: يسئلونك عن الروح کی تفسیر جلد ۵ صفحہ ۱۱۷ طبع مصر میں مفصل بحث کرتے ہوئے اس قول کے متعلق لکھا ہے: "فهذا مذهب قوی شریف یجب التامل فیه فانه شدید المطابقة لما ورد فی الکتب الالٰهیة من احوال الحیوة و الموت"۔ یعنی روح کے بارے میں یہ مذہب بہت ہی قوی اور متین ہے۔ اس میں غور و فکر واجب ولازم ہے۔ کیونکہ یہ قول ان مطالب سے جو کتبِ اِلٰہیّہ میں وارد ہوئے ہیں جیسے موت و حیات کی کیفیّت وغیرہ بہت مطابقت ومناسبت رکھتا ہے۔

سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ نے بحار الانوار کی چودھویں جلد میں نفس وروح کے مباحث کو نہایت شرح وبسط کے ساتھ بیان کرتے ہوئے اپنی تحقیق انیق کا یوں اظہار فرمایا ہے:

اقول بعد ما احطت خبراً بما قیل فی هذا الباب من الاقوال المتشتة و الآراء المتخالفة و بعض دلائلهم

و قال الصادق علیه السلام ان الله اخی بین الارواح فی الاظلة قبل ان یخلق الابدان بالفی عام فلو قد قام

سے مُتنفّر رہتے ہیں، امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ خداوند عالم نے ظلال واشباع (عالم ذر) میں جسموں کی پیدائش سے دو ہزار سال قبل روحوں کے درمیان اخوت اور بھائی چارہ

علیہا لا یخفی علیك انه لم یقم دلیل عقلی علی التجرد و لا علی المادیة و ظواهر الأیات و الاخبار تدل علی تجسم الروح و النفس و ان كان بعضها قابلاً للتاویل و ما استدلوا به علی التجرد لا یدل دلالة صریحة علیه و ان كان فی بعضها یماء الیه فما یحكم به بعضهم من تكفیر القائل بالتجرد افراط و تحكم كیف و قد قال به جماعة من علماء الامامیة و نحاریهم و جزم القائلین بالتجرد ارضا و خص شبهات ضعیفة مع ان ظواهر الأیات و الاخبار تنفیه ایضا جأته و تفریط فالامر مرود ان یكون جسما لطیفا نورانیا ملكوتیا داخلا فی البدن تقبضه الملائكة عند البیوت و تبقی معذبا او منعما بنفسه او بجسد مثالی، یتعلق به كما مر فی الاخبار و یبی عنه الی ان ینفخ فی الصور كما فی المستضعفین و لا استبعاد فی ان یخلق الله جسما لطیفا یبقیه ازمنة متطاولة كما یقول المسلمون فی الملائكة و الجن و یمكن ان یرضی فی بعض الاحوال بنفسه او بجسده المثالی و لا یری فی بعض الاحوال بنفسه او بجسده بقدرة الله سبحانه او یكون مجرداً یتعلق بعد قطع تعلقه عن جسده الاصلی بجسده المثالی و یكون قبض الروح و بلوغه الحلقوم و امثال ذلك تجوزاً عن قطع تعلقها او اجری علیها احكام ما تعلقت اولا به و هوالروح الحیوانی البخاری مجازاً

یعنی حقیقت روح کے متعلق آراء مختلف واقوال مُتفرّقہ اور فریقین کے بعض دلائل و براہین معلوم کر لینے کے بعد تم پر یہ بات واضح و آشکار ہوگئی ہوگی کہ روح کے مجرد و مادی ہونے پر کوئی (نا قابلِ تردید) دلیل عقلی قائم نہیں ہوسکی۔ ہاں آیات وروایات کے ظواہر روح کے جسم ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بھی بعض قابلِ تاویل ہیں۔ تجردروح کے قائلین نے اس کے تجرد پر جو دلائل قائم کیے ہیں وہ اس پر صریحی دلالت نہیں کرتے، اگرچہ ان میں فی الجملہ اس مطلب کی طرف کچھ تھوڑا سا اشارہ پایا جاتا ہے، لہٰذا تجردروح کے قائلین پر کفروشرک کا جو حکم لگایا جاتا ہے یہ محض افراط وسینہ زوری ہے جبکہ جید علماء امامیہ کی ایک جماعت اس امر کی قائل ہے۔ اسی طرح تجرد کے قائلین کا اپنے نظریہ پر جزم ویقین بھی جو کہ محض بعض شبہاتِ ضعیفہ پر مبنی ہے، حالانکہ ظواہر آیات وروایات اس کی نفی کر رہے ہیں سراسر تفریط اور جسارت ہے۔ بعد ازیں حقائق حقیقت امر دو حال سے خالی نہیں یا تو روح ایک جسم لطیف نورانی ملکوتی ہے جو بدن میں داخل ہے جسے موت کے وقت

قائمنا اھل البیت لورث الاخ الذی اخی بینھما فی الاظلة و لم یورث	قائم کیا۔ جب ہمارے قائم آلِ محمد علیہ السلام کا دور سلطنت آئے گا تو وہ لوگ جو عالمِ ذر میں ایک دوسرے کے

فرشتے قبض کر لیتے ہیں اور پھر عالم برزخ میں قیامت تک بنفسہ یا جسم مثالی کے ذریعہ مُنعم یا معذب رہتا ہے جیسا کہ روایات میں گزر چکا ہے۔ یا اس عالم برزخ میں نفخ صور تک اس سے بالکل غفلت برتی جاتی ہے (نہ اسے جزا دی جاتی ہے اور نہ سزا) جیسا کہ مستضعفین کے بارے میں وارد ہے۔ اور اس قول میں ہرگز کوئی عقلی اِستبعاد نہیں ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ خلاقِ عالم ایک جسم لطیف پیدا کر دے اور زمانہ کے دراز تک اسے باقی رکھے۔ جیسا کہ مُسلمانوں کا ملائکہ اور جنات کے متعلق یہی عقیدہ ہے اور وہ جسم لطیف قدرتِ خداوندی سے بعض اوقات بنفسہ اور بعض اوقات جسم مثالی کے ذریعہ بعض اَشخاص کو دکھائی بھی دے اور بعض حالات میں دکھائی نہ دے یا پھر یہ روح مجرد ہے۔ جسم اصلی سے قطع تعلق کے بعد جسم مثالی کے ساتھ تعلق پیدا کر لیتی ہے۔ بنابریں شق روح کا قبض ہونا اور (بوقت مرگ) اس کا حلقوم تک پہنچنا حقیقت پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کے بدن سے تعلق قطع کرنے کا کنایہ ہے۔ یا اس روح مجرد پر روح بخاری (جو کہ مادی ہے) والے احکام مجازاً جاری کیے گئے ہیں۔

علامہ سید نعمت اللہ الجزائری علیہ الرحمہ "انوارِ نعمانیہ" میں مباحثِ نفس و رُوح میں اپنی تحقیق پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

و الانصاف ان الروح و ان طوی عنا الاطلاع علی حقیقتھا و لذا قال الاکثر المراد من قولہ علیہ السلام "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" انہ لا یمکن معرفة النفس کما لا یمکن معرفة الرب لکن الذی اشارت الیہ الکتب و الاخبار علی ما قیل انہ یقرب من المذھب السابع و ھو انھا جسم لطیف سائر فی البدن و لیست مجردة

یعنی انصاف یہ ہے کہ اگرچہ روح کی حقیقت ہم پر مخفی ہے، یہی وجہ ہے کہ اکثر علماء نے حدیث "من عرف نفسہ ...." کے یہ معنی کیے ہیں کہ جس طرح خداوند عالم کی حقیقی معرفت ناممکن ہے اسی طرح نفس (روح) کی حقیقی معرفت بھی ناممکن ہے۔ مگر کتبِ سماویہ اور اخبار نبویہ وولویہ سے جو کچھ مترشح ہوتا ہے وہ روح کے متعلق ساتویں نظریہ کے قریب تر ہے۔ یعنی یہ کہ روح ایک جسم لطیف ہے جو جسم کے اندر جاری وساری ہے اور وہ مجرد محض نہیں ہے۔

انہی علامہ جزائری مرحوم نے "انوارِ نعمانیہ" میں یہ بھی لکھا ہے کہ: و نقل من شیخنا المفیدؒ انہ کان یقول بتجرد النفس فتاب الی اللہ سبحانہ و قال قد ظھر لنا انہ لا مجرد فی الوجود الا اللہ۔

الاخ من الولادة و قال الصادقؑ ان الارواح تلتقی فی الھوا فتعارف و تسائل فاذا اقبل روح من الارض فقالت الارواح

بھائی بن چکے ہیں وہ ایک دوسرے کے وارث بنائے جائیں گے، اور نسبی بھائیوں کو محروم رکھا جائے گا۔ انہی جناب (علیہ السلام) سے یہ بھی مروی ہے، فرمایا: روحیں ہوا میں ایک دوسرے سے ملاقات کرتی ہیں، اور ایک دوسرے کو پہچان کر سوال و جواب بھی کرتی ہیں۔ جب کوئی نئی روح زمین سے جاکر ان

یعنی حضرت شیخ مفیدؒ کے متعلق منقول ہے کہ وہ پہلے نفس کے مجرد ہونے کے قائل تھے۔ پھر بارگاہِ الٰہی میں اس قول سے توبہ کی، اور فرمایا: اب ہم پر یہ بات ظاہر ہوئی ہے کہ سوائے خداوند عالم کے کائنات میں اور کوئی چیز مجرد نہیں ہے۔

لہٰذا ان حقائق سے واضح و آشکار ہوگیا کہ اگرچہ تیسرے قول کی بالکل نفی نہیں کی جاسکتی مگر جو کچھ ظواہر قرآن و حدیث سے مُستفاد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ چوتھا قول ہی اقرب الی الحق والصواب ہے اور اسی قول کو سرکار علامہ مجلسی نے ایک مقام پر فاھوالاصوب کہہ کر اختیار فرمایا ہے۔

جناب علامہ سید علی خان شرح صحیفہ سجادیہ صفحہ ۴۰ پر تحریر فرماتے ہیں:

قال بعض علمائنا المتاخرین المستفاد من الاخبار عن الائمة الاطھار ان الروح شبح مثالی علی صورة البدن و کذلك عرفه المتالھون لمجاھدا فھم و حققه المحققون بمشاھداتھم فھولیس بجسما فی محض و لا بعقلا فی صرف بل برزخ بین الامرین و متوسط بین النشاتین من عالم الملکوت ۔

ہمارے بعض علماء متاخرین نے فرمایا ہے کہ روح کے متعلق جو کچھ ائمہ اطہارؑ کے اخبار سے واضح و آشکار ہوا ہے وہ یہ ہے کہ روح بدن کی شکل و صورت پر ایک جسم مثالی ہے۔ اسی طرح متالہین نے اپنے مجاہدات سے اور محققین نے اپنی تحقیقات سے اس کی معرفی کرائی ہے۔ پس بنابریں روح نہ تو بالکل جسمانی ہے اور نہ بالکل عقلائی، بلکہ ان ہردو کے بین بین ہے۔ واللہ العالم بحقائق الامور

رُوح کے قدیم و حادث ہونے کی بحث

چونکہ مُصنّف علام نے اس مبحث کی طرف بھی لطیف اشارہ فرمایا ہے، لہٰذا روح کی بحث نامکمل رہے گی اگر اس امر پر بھی کچھ روشنی نہ ڈالی جائے۔ اس سلسلہ میں بہت اِختلاف ہے کہ آیا روح قدیم ہے یا حادث۔ اور اگر حادث ہے تو پھر جسم سے پہلے پیدا ہوئی ہے یا جسم کی خلقت کے ساتھ۔ حکماء یونان اور ہنود جو کہ تناسخ ارواح کے قائل ہیں وہ روح کو قدیم اور ازلی وابدی جانتے ہیں، لیکن بعض حکماء

دعوه فقد افلت من هول عظیم ثم سئلوه ما فعل فلان و ما فعل فلان فكلما قال قد بقى رجوه ان يلحق بهم و كلما قال قد مات قالو هوى هوى قال تعالى و من يحلل عليه غضبى فقد هوى و قال تعالى

میں جا ملتی ہے، تو وہ روحیں ایک دوسری سے کہتی ہیں کہ: چونکہ یہ روح بہت ہی خوفناک مرحلہ سے گلوخلاصی کرا کے آئی ہے، اس لیے ابھی اسے اپنے حال پر چھوڑ دو۔ پھر اس سے وہ احوال پرسی کرتی ہیں کہ فلاں شخص کس حال میں ہے اور فلاں کا کیا بنا۔ اگر نئی روح یہ جواب دے کہ وہ ابھی زندہ ہے، تو وہ ارواح امید رکھتی ہیں (کہ ایک دن آ ملے گا) اور اگر وہ یہ کہہ دے کہ وہ مرگیا تو روحیں کہتی ہیں (افسوس) وہ ہلاک ہوا، ہلاک ہوا۔ چنانچہ

یونان اور تمام اربابِ ملل اس کے حدوث پر متفق ہیں ۔ کیونکہ ان کے نزدیک سوائے خداوند عالم کے اور کوئی قدیم نہیں ہے۔ ہاں ان کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا وہ خلقت جسم سے قبل پیدا ہوئی ہیں یا خلقت جسم کے ساتھ ۔ تو اس سلسلہ میں مُسلمان علماء محققین اس بات کے قائل ہیں کہ ارواح کی خلقت اجسام کی خلقت سے پہلے ہوئی ہے۔ اور بعض علماء قائل ہیں کہ خلقت اجسام کے ساتھ ارواح کی بھی خلقت ہوتی ہے ۔ پہلے امر یعنی روح کے حادث ہونے پر یہاں دلائل پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ تمام مکاتیب فکر کے ساتھ تعلق رکھنے والے مُسلمانوں کا اس نظریہ کی صحت پر اتفاق واجماع ہے ۔ اس لیے سردست دوسرے امر کے متعلق تحقیق حق کی جاتی ہے۔

خلقتِ اجسام سے پہلے خلقتِ ارواح کا بیان

سو واضح ہو کہ اکثر فرقہائے اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ ارواح کی خلقت ابدان واجسام کی خلقت سے پہلے ہوئی ہے۔ ان کے اس اعتقاد کی بنا علاوہ عقلی دلائل وبراہین کے سرورِ کائنات ﷺ کی ایک متفق علیہ حدیث شریف پر ہے کہ: "خلق الله الارواح قبل الاجساد بالفی عام" کہ خداوند عالم نے ارواح کو ابدان سے دو ہزار سال پہلے پیدا کیا۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ حدیث میں وارد شدہ اجساد سے مراد نوعِ جسد وبدن ہے جو کہ ایک بدن کی خلقت سے بھی متحقق ہو جاتی ہے ۔ جیسے حضرت آدم علیہ السلام کا بدن ۔ ورنہ اگر ہر ہر رُوح کو اس کے مخصوص ہر ہر بدن کی نسبت دیکھا جائے تو کئی کئی ہزار بلکہ کئی کئی لاکھ سال کا تقدم وتاخر لازم آتا ہے، اور اس سلسلہ میں یعنی ارواح کے ابدان سے دو ہزار سال یا اس سے بھی زائد عرصہ پہلے خلق ہونے کے متعلق اخبار حد تواتر تک پہنچے ہوئے ہیں ۔ جیسا کہ علامہ سید نعمت اللہ جزائری نے "انوارِ نعمانیہ" میں فرمایا ہے: "الاخبار الدالة على ان الروح مخلوقة

و من خفت موازینہ فامہ ھاویۃ و ما ادرٰیک ماھیۃ نار حامیۃ و مثل الدنیا و صاحبھا کمثل البحر و الملاح و السفینۃ و قال لقمٰن لابنہ یابنیّ ان الدنیا بحر عمیق و قد ھلک فیھا عالم کثیر فاجعل سفینتک فیھا الایمان

خداوند عالم فرماتا ہے جس شخص پر میرا عذاب نازل ہوجائے وہ ہلاک ہوجاتا ہے (طٰہٰ:۸۱) نیز فرمایا: جس شخص کا نامہ اعمال خفیف ہوگا، اس کا مقام ہاویہ میں ہوگا۔ تمھیں کیا خبر کہ ہاویہ کیا ہے؟ وہ بہت ہی گرم آتش ہے (القارعہ:۸ تا۱۰) دنیا اور اہل دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے سمندر ملاح اور کشتی کی ہے۔ جناب لقمان علیہ السلام نے اپنے فرزند سے کہا: اے بیٹا! دنیا ایک گہرا سمندر ہے جس میں بہت سے عالم ہلاک ہوگئے۔ تم اس میں ایمان باللہ کو کشتی اور تقویٰ و پرہیز گاری کو اپنا

قبل البدن بالفی عام اواکثر علی ما وردت بہ اخبار مستفیضۃ بل متواترۃ حق لا یبقی الریب فی تقدمھا"۔

یعنی وہ اخبار جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ارواح دو ہزار سال یا اس سے بھی زائد عرصہ ابدان سے پہلے پیدا ہوئے ہیں، حد استفاضہ بلکہ حد تواتر تک پہنچے ہوئے ہیں۔ جن کے دیکھنے کے بعد اس مطلب کی صحت میں ہرگز کسی قسم کا کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہ جاتا۔

اس قسم کی روایات کا کافی ذخیرہ علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ نے "چہاردہم بحار" میں جمع کر دیا ہے۔ یہاں دو چار روایتیں بغرض جلاء ایمانی ذکر کی جاتی ہیں۔ "بحار الانوار" میں بحوالہ "بصائر الدرجات" مروی ہے کہ ایک مرتبہ ایک آدمی جناب امیر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یا امیر المومنینؑ! بخدا میں آپؑ سے بے حد محبت کرتا ہوں۔ آنجنابؑ نے فرمایا: بخدا تو مجھے ہرگز دوست نہیں رکھتا۔ وہ شخص ناراض ہوکر کہنے لگا: یا علیؑ! گویا آپ میرے دل کی کیفیت بتلا رہے ہیں؟ جناب نے فرمایا کہ بات دراصل یوں ہے کہ خداوند عالم نے ارواح کو ابدان سے دو ہزار سال قبل پیدا فرمایا۔ پس جو روحیں وہاں آپس میں مانوس ہوئیں، وہ یہاں بھی مانوس ہوتی ہیں۔ اور جن میں وہاں میل ملاپ نہ تھا، ان کے اندر یہاں بھی انس نہیں ہے۔ اور میری روح وہاں تیری روح سے مانوس نہ تھی، یا بروایتے یوں فرمایا کہ میں نے تجھے وہاں نہیں دیکھا تھا۔ اس مضمون کی مُتعدد روایتیں کتاب مذکور میں مذکور ہیں نیز بحار میں بحوالہ اصول کافی اور "محاسن برقی" وغیرہ سے اس قسم کی مُتعدد روایتیں نقل کی ہیں جن میں وارد ہے کہ مختلف اوقات میں بعض مومنین نے حضرات ائمہ اطہارؑ کی خدمت میں عرض کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ بعض اوقات بغیر اس کے کہ ان کو یا ان کے اہل وعیال کو کوئی صدمہ پہنچے بلا وجہ ان

با اللہ عز وجل و اجعل	زادِ راہ اور توکل علیٰ اللہ کو اس کشتی کا بادبان بناؤ۔ پھر بھی اگر تم صحیح و
ادك فیھا تقوی اللہ و اجعل	سلامت اس سمندر سے پار اتر گئے تو یہ خدا کی خاص رحمت کا نتیجہ
شراعھا التوکل علی اللہ	ہوگا، اور اگر اس میں ہلاک و برباد ہو گئے

کی طبیعت محزون و پریشان کیوں ہوجاتی ہے؟ حضرات ائمہ علیہم السلام نے فرمایا کہ: چونکہ اہل ایمان کی روحیں ظاہری خلقت سے پہلے آپس میں مانوس تھیں، لہٰذا اس عالم میں جس وقت دنیا کے کسی گوشہ میں کسی مومن کا انتقال ہوجاتا ہے یا وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہوجاتا ہے تو پھر اس سے تم جہاں بھی ہو ضرور متاثر ہوجاتے ہو۔

عالم ذر و عہد الست کا اجمالی تذکرہ

عالم ذر میں اقرار ربوبیت ربّ العالمین ونبوت خاتم النّبیینؐ اور بمطابق بعض روایات اقرار ولایت ائمہ طاہرینؑ بھی اسی عقیدہ کے شئون میں سے ہے۔ جس کی تفاصیل مشہور و معلوم ہیں۔ جیسا کہ آیۂ مبارکہ: وَاِذۡ اَخَذَ رَبُّكَ مِنۡۢ بَنِیۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُهُوۡرِهِمۡ ذُرِّیَّتَهُمۡ وَاَشۡهَدَهُمۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِهِمۡ‌ۚ اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ‌ؕ قَالُوۡا بَلٰی‌ۚ شَهِدۡنَا‌ۚ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنۡ هٰذَا غٰفِلِیۡنَ ﴿۱۷۲﴾ (سورۃ الاعراف:۱۷۲)

"اور (اے رسولؐ) وہ وقت بھی یاد (دلاؤ) جب تمہارے پروردگار نے آدمؑ کی اولاد سے یعنی پشتوں سے (باہر) نکال کر ان کی اولاد سے خود ان کے مقابلہ میں اقرار کرا لیا (پوچھا) کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ تو سب کے سب بولے: ہاں ہم اس کے گواہ ہیں (یہ ہم نے اس لیے کہا کہ ایسا نہ ہو) کہیں تم قیامت کے دن بول اٹھو کہ ہم تو اس سے بالکل بے خبر تھے"۔ (ترجمہ فرمانؒ) کی تفسیر میں فریقین کے کتب تفاسیر و احادیث لبریز ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ خداوند عالم نے صلب آدم سے قیامت تک ہونے والی اولادِ ذکور و اناث کے ارواح کو جمع کر کے ان سے اپنی ربوبیت اور سرکار ختمی مرتبتؐ کی رسالت کا اقرار لیا اور ہماری روایتوں کے مطابق ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی امامت کا بھی اقرار لیا۔ چنانچہ بعض ارواح نے قبول کر لیا اور بعض نے انکار پر اصرار کیا اور بعض نے توقف و تردد کا اظہار کیا۔ (تفسیر برہان و تفسیر صافی وغیرہ)

بعض علماء کے عالم ذر اور تقدمِ خلقتِ ارواح کا اِنکار اور اُن کے شبہات کے جوابات

مذکورہ بالا حقائق کے باوجود مقام تعجب ہے کہ ہمارے مشاہیر علماء اعلام میں سے حضرت

فان نجوت فبرحمة الله و ان هلكت فبذنوبك لا من الله و اشد ساعات ابن آدم

تو یہ ہلاکت تمہارے گناہوں کے سبب سے ہوگی نہ کہ خدا کی طرف سے، فرزندِ آدم پر تین ساعتیں بڑی ہی سخت اور کٹھن ہیں۔ پیدائش کا دن، مرنے کا دن، اور قبر سے زندہ ہو کر اٹھنے کا دن، انہی

شیخ مُفید علیہ الرحمہ اور جناب سید اجل سید مُرتضیٰ علم الہدیٰ اور علامہ طبرسی صاحب مجمع البیان نے تقدم ارواح اور عالم ذر کے واقعہ کا سرے سے انکار کرتے ہوئے ان روایات صریحہ وصحیحہ کی بعید از کار تاویلات فرمائی ہیں۔ جب ان حضرات کے انکار کے علل واسباب پر نظر ڈالی جاتی ہے تو اس تعجب میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ تقدم ارواح کے انکار کی بنیاد ان حضرات کے اس خیال پر ہے کہ اس سے تناسخ لازم آتا ہے جو کہ باطل ہے۔ جیسا کہ حضرت شیخ مُفید علیہ الرحمہ نے اس مقام پر اپنی شرح اعتقادیہ میں اس امر کی تصریح فرمائی ہے اور دوسرے مطلب یعنی علم ذر کے انکار کا دارو مدار اس بات پر قرار دیا ہے کہ اگر کسی وقت ایسا واقعہ در پیش آیا ہوتا تو لازم تھا کہ وہ واقعہ ہمیں یاد بھی ہوتا یا کم از کم اس کے متعلق اجمالی علم تو ضرور ہوتا۔ لیکن جب کچھ بھی معلوم نہیں تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس قسم کا کوئی واقعہ کسی عالم میں در پیش نہیں آیا، اور حدیث "خلق الله الارواح قبل الاجساد بالفی عام" کی شرح اعتقادیہ میں یہ علیل تاویل فرمائی ہے کہ اس جگہ ارواح سے مراد ملائکہ ہیں۔ یعنی خداوند عالم نے ملائکہ کو آدمیوں سے دو ہزار سال قبل پیدا کیا۔ اور اپنے رسالہ مسائل سرویہ میں (علی ما نقل عنہ) اس کی یہ تاویل فرمائی ہے کہ اس سے مراد انسان کی مخصوص خلقت اور ہستی باری تعالیٰ پر آیاتِ اَنفسیہ و آفاقیہ کا موجود ہونا ہے جن کے ذریعہ خدا گویا کہ اپنے بندوں سے دریافت فرما رہا ہے: "الست بربکم" "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟" اور گویا انسان اپنی فطرتِ سلیمہ کی بنا پر بزبانِ حال کہہ رہے ہیں۔ "بلیٰ" "ہاں تو ضرور ہمارا پروردگار ہے!

احادیث آلِ رسولؐ کے مُشکل ہونے اور ان کو رَدّ کرنے کی مذمت کا بیانؒ

ان علماء اعلام کی جلالت قدر وعظمت شان کچھ لب کشائی کرنے سے مانع ہے، ورنہ یہ ایک تلخ حقیقت اور تکلیف دہ بات ہے کہ ایسے معمولی شبہات اور استبعادات کی بنا پر رسولؐ و آلِ رسولؐ کی احادیث مُعتبرہ کا انکار کر دیا جائے یا بلا کسی معقول ومدلل وجہ کے ان کی تاویل کر دی جائے۔ یہ ایک بہت بڑی جرأت اور جسارت ہے۔ حالانکہ ائمہ طاہرین علیہم السلام کی متعدد احادیث اس مضمون کی موجود ہیں کہ: "ان حديثنا صعب مستصعب لا يحتمله الا ملك مقرب او نبي مرسل او مومن امتحن الله

ثلث ساعات یوم ولد و یوم یموت و یوم یبعث حیًا و قد سلم اللہ علی یحیی فی ھذہ الساعات فقال اللہ تعالیٰ سلام علیہ یوم ولد و یوم یموت و یوم یبعث	تین اوقات پر خدا نے حضرت یحیٰی علیہ السلام کو سلامتی عطا فرمائی ہے۔ جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: یحیٰیؑ کے لیے سلامتی ہو جس روز وہ متولد ہوئے جس دن مریں گے اور جس روز زندہ ہوکر اٹھیں گے (مریم :۱۵)

قلبہ للایمان"۔ یعنی ہماری احادیث بہت مُشکل ہیں۔ ان کو ملک مقرب یا نبی مرسل یا مومن ممتحن ہی برداشت کرسکتا ہے۔ اصول کافی میں اسی عنوان کا ایک پورا باب موجود ہے۔ اسی مُشکل کے پیش نظر حضرات ائمہَ طاہرینؑ نے ہمیں ایک زریں اصول تعلیم دیا ہے کہ جب ہماری احادیث مُعتبرہ تمھارے پاس پہنچیں اور ان کا مطلب تمھاری سمجھ میں آجائے تو شکر خدا بجالاؤ۔ اور اگر مطلب سمجھ میں نہ آئے تو عالم آلِ محمدؐ (امامؑ) کی خدمت میں لوٹاؤ، تاکہ وہ تمھیں ان کا صحیح مفہوم بتلائیں۔ لیکن خبردار انکار نہ کرنا۔ "فان الانکار ھوالکفر" (اصول کافی) یہی وجہ ہے کہ ایسے حالات میں ہمیشہ محتاط علماء اعلام کا یہی طریقہ کار رہاہے اور ہے کہ جن احادیث مبارکہ کا تفصیلی علم ہوجائے فھوالمراد، ورنہ ان کے مضامین پر اجمالی ایمان کو کافی سمجھتے ہیں۔ بہرحال ان بزرگواروں کے ایرادات کے ادب کے ساتھ ذیل میں جوابات عرض کیے جاتے ہیں۔

ان کا پہلا شبہ یہ ہے کہ اگر ارواح کی خلقت کو ابدان سے پہلے تسلیم کیا جائے تو اس سے تناسخ لازم آتا ہے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ شبہ درحقیقت تناسخ کے مفہوم کو معلوم کرنے میں تسامح کرنے اور تناسخ کے باطل ہونے کی اصلی وجہ میں کما حقہ امعانِ نظر اور غور نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔

تناسخ کا صحیح مفہوم

تناسخ کے معنی اِصطلاحِ فلاسفہ و حکماء میں یہ ہیں کہ ایک انسان کا نفس ناطقہ یعنی روح اس کے جسم سے نکل کر بطور جزا یا سزا کسی دوسرے انسانی جسم میں چلا جائے (ابطال تناسخ۔ بحار الانوار کشکول بہائی) بنابریں واضح ہے کہ جو روح بدن سے پہلے خلق ہوچکی ہو اس کو بعد میں پیدا ہونے والے جسم میں داخل کرنا ہرگز تناسخ نہیں قرار پاتا۔

بطلانِ تناسخ کے اصلی وجوہ

اور تناسخ باوجودیکہ عقلی طور پر ممکن ہے لیکن شرع اقدس نے جو اس کو باطل قرار دے دیا ہے

حیا، و قـد سـلـم فیھا عیسٰی علیٰ نفسه فقـال و السلام علیّ	حضرت عیسٰیؑ نے بھی انہی تین اوقات میں اپنے اوپر سلامتی کا اظہار کیا ہے۔ جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں میرے لیے سلامتی ہے

اس کی دو وجہیں ہیں:

وجہ اول: یہ کہ اس سے حشر ونشر کا انکار لازم آتا ہے۔ کیونکہ قائلین تناسخ قیامت کے منکر ہیں۔ اور وہ جزاوسزا کے مقصد کو تناسخ (آواگون) کے ذریعہ پورا کر لیتے ہیں۔ حضرت مُصنّف علامہ نے بھی اٹھارھویں باب میں ابطال تناسخ کی یہی وجہ بیان فرمائی۔ "لان فی التناسخ ابطال الجنة و النار" کہ تناسخ کو صحیح ماننے سے جنّت ودوزخ کا بطلان لازم آتا ہے۔ اور فخرالدین رازی نے نہایۃ العُقُول میں لکھا ہے: "ان المسلمین یقولون بحدوث الارواح و ردھا الی الابدان لا فی ھذا العالم و التناسخیه یقولون بقدمھا و ردھا فی ما فی ھذا العالم و ینکرون الجنة و النار و انما کفروا من اجل ھذا الانکار" (بحوالہ اربعین بہائی) یعنی مُسلمان یہ کہتے ہیں کہ ارواح حادث ہیں اور دوسرے عالم میں ان کا تعلق ان ابدان کے ساتھ ہوگا۔ مگر اہل تناسخ ان کو قدیم جانتے ہیں اور اسی عالم میں ان کے نقل و انتقال کے قائل اور جنّت وجہنم کے منکر ہیں اور اسی انکار کی وجہ سے کافر سمجھے جاتے ہیں۔

وجہ دوم: یہ کہ اس سے روح ومادہ ہردو کا قدم لازم آتا ہے۔ کیونکہ تناسخ کے قائل ان ہردو کو قدیم مانتے ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں عالم کو بھی قدیم تسلیم کرتے ہیں اور وہ جو قدیم ہوتا ہے وہ ابدی بھی ضرور ہوتا ہے (کیونکہ "ما لا بد ایة له لانھایة له" مُسلّم قانون ہے) چنانچہ حضرت علامہ شیخ بہاؤالدین عاملی فرماتے ہیں: "ولیس انکارنا علی التناسخیة و حکمنا بکفرھم بمجرد قولھم بانتقال الروح من بدن الی أخر فان المعاد الجسمانی کذلك عنه کثیر من اھل الاسلام بل لقولھم بقدم النفوس و ترددھا فی اجسام ھذا العالم و انکارھم المعاد الجسمانی فی النشاة الاخرویة" (کتاب اربعین بذیل حدیث چہلم) یعنی ہمارا تناسخ والے نظریہ کا انکار کرنا اور اس کے قائلین پر کفر کا حکم لگانا محض اس لیے نہیں ہے کہ وہ ایک بدن سے دوسرے بدن کی طرف روح کے مُنتقل ہونے کے قائل ہیں۔ کیونکہ کثیر مُسلمانوں کے نزدیک معاد جسمانی اسی طرح ہے، بلکہ ہمارا یہ انکار اور ان کے کفر کا فیصلہ اس وجہ سے ہے کہ یہ لوگ نفوس وارواح کے قدیم ہونے کے قائل ہیں۔ نیز وہ یہ کہتے ہیں کہ روحیں اسی عالم میں قالب بدلتی رہتی ہیں۔ اور قیامت کوئی چیز نہیں ہے۔ "وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ" (سورۃ الجاثیہ:۲۴) یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم زندہ ہیں پھر مرجائیں گے اور ہمیں زمانہ

یوم ولدت و یوم اموت و یوم ابعث حیاً و الاعتقاد فی الروح انه لیس من جنس البدن و انه خلق اٰخر لقوله تعالیٰ ثم انشأناه خلقاً اٰخر و	جس روز میں پیدا ہوا، جس روز مروں گا، اور جس روز زندہ ہوکر اٹھایا جاؤں گا (مریم :۳۳) روح کے بارے میں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ وہ بدن کی جنس سے نہیں بلکہ ایک اور قسم کی مخلوق ہے۔ جیسا کہ خداوند عالم نے فرمایا: پھر ہم نے اس (انسان) کو ایک دوسری پیدائش میں پیدا کیا

ہی مارتا ہے۔ خدا فرماتا ہے: "وَمَا لَهُم بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ" (سورۃ الجاثیہ:۲۴) یہ ان کا گمان ہی گمان ہے، ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ بہر حال یہ امر ظاہر ہے کہ یہ دونوں نظر یے روح اسلام کے سراسر منافی ہیں۔ اور اسی وجہ سے اہل تناسخ کو کافر سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے اسلام نے اس عقیدۂ فاسدہ کی بڑی شد ومد سے رد فرمائی ہے۔ اور یہ بات واضح ہے کہ روح کی خلقت کو جسم کی خلقت سے پہلے ماننے کی صورت میں ان دونوں خرابیوں میں سے کوئی بھی خرابی لازم نہیں آتی۔ کیونکہ عام روایتوں میں تو ان کے تقدم خلقت کی مدت فقط دو ہزار سال بیان کی گئی ہے، حالانکہ دو ہزار سال کی تو حقیقت ہی کیا ہے، دو لاکھ بلکہ دو کروڑ یا اس سے بھی زائد عرصہ ارواح کی خلقت، اجسام سے پہلے تسلیم کر لی جائے تب بھی وہ حادث ہی ہوں گی۔ اس سے ان کا قدیم ہونا ہرگز نہیں آتا۔ اسی طرح دوسرا نقص یعنی انکار حشر ونشر بھی لازم نہیں آتا۔ کیونکہ اگر روح کی خلقت کو جسم سے پہلے تسلیم کر لیا جائے تو اس سے کسی طرح بھی حشر ونشر کا انکار لازم نہیں آتا، اور یہ امر انکار حشر پر دلالات ثلاثہ میں سے کوئی دلالت بھی نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس قول کے قائلین میں سے کوئی بھی معاذ اللہ منکر معاد نہیں ہے۔

حضرت شیخ مُفید اعلی اللہ مقامہٗ نے "ان تقدم ارواح" والی احادیث کی جو تاویلات فرمائی ہیں یہ ان کی ذاتی رائے ہے۔ جب تک کلام معصومین علیہم السلام سے ان تاویلات کی صحت پر کوئی قطعی شاہد نہ پیش کیا جائے اس وقت تک وہ ہرگز قابل قبول نہیں ہوسکتیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ قدس سرہٗ اس سلسلہ میں بہت مذبذب ہیں۔ کہیں کوئی تاویل فرماتے ہیں اور کہیں کوئی، جو ان کے عدم اطمینان قلب کی بین دلیل ہے۔ سرکار علامہ مجلسیؒ نے ان کی اس تاویل کے متعلق ارشاد فرمایا ہے جو ہم نے اوپر نقل کیا ہے۔ "والتاویل الذی ذکرہ للحدیث فی غایۃ البعد" یعنی شیخ مرحوم نے حدیث کی جو تاویل فرمائی ہے وہ بہت ہی بعید از کار ہے۔ (رابع عشر بحار)

اعتقادنا فی الانبیاء و الرسل و الائمة ان فیهم خمسة ارواح

ہمارا یہ بھی اعتقاد ہے کہ انبیاء و رسل اور ائمہ میں پانچ روحیں ہوتی ہیں

دوسرا شبہ: جو حضرت شیخ قدس سرہٗ اور ان کے اتباع نے عالم ذر والی احادیث پر عائد کیا ہے کہ اگر یہ واقعہ در پیش آیا ہوتا تو لازم تھا کہ ہمیں یاد بھی ہوتا۔ اس کا جواب علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ نے جلد سوم بحار الانوار اور دیگر محققین علماء ابرار نے یہ دیا ہے کہ: "اما ماذکرہ من انه لابد وان یذکر الانسان تلك الحالة فغیر مسلم مع بعد العهد و تخلل حال الجنینیة و الطفولیة وغیرهما بینهما و لا استبعاد فی ان ینسیه الله تعالیٰ لکثیر من المصالح مع انا لا نذکر احوال الطفولیة فای استبعاد فی نسیان ما قبلها" ۔ یعنی یہ کہنا کہ اگر یہ واقعہ در پیش آیا ہوتا تو ضروری تھا کہ ہمیں یاد بھی ہوتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا ہونا ضروری نہیں ہے ۔ کیونکہ: اولاً تو زمانہ زیادہ گزر چکا ہے، جس کے بعد فراموشی کا لاحق ہونا عین قرین عقل ہے ۔ ثانیاً: اس واقعہ اور ہمارے موجودہ زمانہ کے درمیان جنین اور طفولیت وغیرہ اور ان کے درمیان احوال و ازمان (علقه و مضغه وغیرہ) بھی حائل ہو چکے ہیں ۔ ثالثاً: ممکن ہے کہ اس نسیان میں کچھ مصالح و حکم موجود ہوں جن کی وجہ سے قدرتِ کاملہ نے وہ واقعہ ہمارے صفحہ حافظہ سے محو کر دیا ہو۔ رابعاً: جب ہم کو اپنے بچپن کے حالات یاد نہیں، جسے کوئی زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا، تو اگر اس سے بہت مدت پہلے کا واقعہ یاد نہ ہو تو اس میں کیا تعجب ہے؟ سرکار علامہ کے ان تحقیقی و الزامی جوابات کے علاوہ اس شبہ کے دو جواب اور بھی دیے جا سکتے ہیں ۔ ایک یہ کہ یہ واقعہ چونکہ تنہا روح کے ساتھ پیش آیا تھا جو کہ علیٰ اختلاف الانظار مجرد محض ہے، یا جسم لطیف و نورانی ۔ بہرکیف اس وقت اس پر یہ موجودہ مادی غلاف نہیں چڑھا تھا، لیکن جب وہ اس جسم کثیف میں مُقید ہوگئی تو سابقہ واقعات فراموش کر بیٹھی اگر کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ اسے وہ بھولا ہوا سبق یاد آ جائے تو اسے چاہیے کہ علائق جسمانیہ و شہوانیہ سے قطع تعلّق کر کے نورِ ایمان کو جلا دے اور ریاضاتِ شرعیہ کے ذریعہ اپنے روح کو کثافاتِ نفسانیہ سے صاف و شفاف کرے ۔ پھر دیکھے کہ بھولے ہوئے سبق کس طرح یاد آتے ہیں ۔ ولنعم ماقیل ؎

ہاں مجرد شو مجرد را ببیں ۔۔۔ دیدنِ ہر چیز را شرط است ایں

یہی وجہ ہے کہ جنھوں نے یہ مراحل طے کر لیے ہیں ان کی نگاہ بلند میں ماضی، مستقبل، اور حال برابر روشن ہوتے ہیں اور وہ علم ماکان و ما یکون کے عالم ہیں ۔ اور جب کسی بات کے معلوم کرنے کی طرف توجہ فرماتے ہیں تو ان کی نگاہوں میں یہ اشجار و احجار حاجب و حائل نہیں ہوتے اور

روح القدس و روح الایمان و روح القوة و روح الشھوة و روح المدرج و فی المومنین اربعة ارواح روح الایمان

① روح قدس ② روح ایمان ③ روح قوت ④ روح شہوت اور ⑤ روح مدرج۔ یعنی روح حس وحرکت اور مومنین میں چار روحیں ہوتی ہیں۔ ① روح ایمان

ان کو عالم ذر والے سب عہد و پیمان بالکل یاد ہیں۔ چنانچہ کتاب "الیواقیت والجواہر" مولفہ شیخ عبدالوہاب شعرانی مطبوعہ مصر جلد ا صفحہ ۱۰۶ میں لکھا ہے کہ: "کان علی بن ابی طالب یقول انی لا ذکر العھد الذی عھد الیّ ربی و اعرف من کان عن یمینی و من کان عن شمالی"۔ یعنی جناب علی بن ابی طالب (علیہ السلام) فرمایا کرتے تھے کہ مجھے وہ عہد و پیمان اچھی طرح یاد ہے جو میرے پروردگار نے مجھ سے لیا تھا، اور میں ان آدمیوں کو بھی پہچانتا ہوں جو اس وقت میرے دائیں اور بائیں طرف موجود تھے۔ ایسا ہی تفسیر فتح البیان جلد ۳ صفحہ ۴۰۹ پر مذکور ہے۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ یہ شبہ ایک عقلی استبعاد ہی ہے۔ جس کی وجہ سے قرآن و حدیث سے ایک ثابت شدہ مُسلمہ حقیقت کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کمالا یخفی۔

آیا جسم کے فنا ہونے کے ساتھ رُوح بھی فنا ہوجاتی ہے یا باقی رہتی ہے؟

روح کے سلسلہ میں تیسرا اختلاف یہ ہے کہ آیا وہ جسم فنا ہونے کے ساتھ فنا ہوجاتی ہے، یا اس کی فنا کے بعد باقی رہتی ہے؟ اور باقی رہنے کی صورت میں آیا اس کی فنا ناممکن ہے؟ سو واضح ہو کہ دہریین جو کہ روح و جسم کو ایک سمجھتے ہیں یا جو روح کو مزاج کے معنوں میں لیتے ہیں وہ اس بات کے قائل ہیں کہ جسم کی موت کے ساتھ روح بھی ختم ہوجاتی ہے اور نیست و نابود ہوجاتی ہے۔ لیکن جو نفس کو مجرد محض یا اسے جسم نورانی سمجھتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ روح فناء جسم کے بعد باقی رہتی ہے اور فنا نہیں ہوتی۔ اس امر پر اگرچہ حکماء یونان و متکلمین اسلام کا اتفاق ہے لیکن ان کے نظریوں میں فرق یہ ہے کہ حکماء اس کے فنا کو ناممکن سمجھتے ہیں کہ یہ فنا ہوسکتی ہی نہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک روح قدیم ہے اور جو چیز قدیم ہو وہ لازماً دائمی و ابدی بھی ہوتی ہے لیکن متکلمین اسلام اسے باقی ضرور مانتے ہیں لیکن قابلِ فنا تسلیم کرتے ہیں کہ اگر خدا چاہے تو اسے فوراً فنا کرسکتا ہے لیکن وہ فنا کرتا نہیں۔ مُسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ روح جسم سے مفارقت کرنے کے بعد علیٰ اختلاف الانظار استقلالی طور پر یا جسم مثالی کے ساتھ عالم برزخ میں مُنعّم یا معذب رہتی ہے (اس مطلب کی تحقیق سترھویں باب میں آرہی ہے)

علامہ مجلسیؒ اس سلسلہ میں رقمطراز ہیں کہ: "بقاء النفوس بعد خراب الابدان مذھب اکثر العقلاء

و روح القوة و روح الشهوة و روح المدرج و فی الکافرین و البهائم ثلثة ارواح روح القوة و روح الشهوة و روح المدرج و اما قوله تعالیٰ و یسئلونك عن الروح قل الروح من امر ربي	② روح قوت ③ روح شہوت اور ④ روح مدرج اور کافروں اور چوپایوں میں صرف تین روحیں ہوتی ہیں۔ ① روح قوت ② روح شہوت اور ③ روح مدرج۔ خداوند عالم کے اس قول میں کہ "لوگ تم سے حقیقت روح معلوم کرنے کی بابت سوال کرتے ہیں، تم ان سے کہہ دو کہ یہ میرے پروردگار کا ایک امر ہے"۔

و الملیین و الفلاسفة و لم ینکرہ الا فرقة قلیلة کالقائلین بان النفس هی المزاج و امثاله ممن لا یعبابهم و لا بکلامهم و قد عرفت ما یدل علیه من الاخبار الجلیة و قد اقیمت علی البراهین العقلیة (بحار ۳) یعنی بدنوں کے ختم ہونے کے بعد ارواح کا باقی رہنا اکثر عقلا اور اکثر ارباب ملل و فلاسفہ کا نظریہ ہے، سوائے ایک قلیل گروہ کے جو روح کو بمعنی مزاج سمجھتا ہے اور کسی نے اس مطلب کا انکار نہیں کیا اور اس قلیل گروہ کے کلام و اختلاف کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ تم سابقاً معلوم کر چکے ہو کہ اس نظریہ کی صحت پر جلی اخبار دلالت کرتے ہیں اور اس پر براہین عقلیہ بھی قائم کیے گئے ہیں۔

محقق شیخ بہائی نے بھی اپنی کتاب "اربعین" بذیل شرح حدیث چہلم میں اسی طرح افادہ فرمایا ہے۔ اور قیامت کے دن پھر خداوند عالم اپنی قدرتِ کاملہ سے اسے اپنے اصلی بدن کی طرف واپس لوٹا دے گا جس میں اس کا حشر و نشر ہوگا، اور اسی میں اسے سزا و جزا دی جائے گی۔ اور اس عقیدہ کی دلیل یہ ہے کہ اسلامی اصول کے مطابق چونکہ انسان کو عبث پیدا نہیں کیا گیا، بلکہ اس سے بہت سی تکالیف شرعیہ الہیہ متعلق ہیں، جس میں اصول و فروع سب داخل ہیں۔ ارشادِ قدرت ہے:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱۵﴾ (سورۃ المومنون:۱۱۵)

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ (سورۃ الذاریات:۵۶)

لہٰذا عدل و انصافِ خداوندی کا تقاضا یہ ہے کہ اسے اپنی طاعت یا معصیت پر ضرور سزا بھی دے، ورنہ تکالیف شرعیہ کا عبث و بے فائدہ ہونا لازم آئے گا، جو کہ عقلاً قبیح ہے۔ اور حکیم عادل کی حکمت و عدالت کے منافی ہے۔ پس اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ابدان کے فنا کے ساتھ ساتھ پروردگار عالم روحوں کو بھی فنا کر دیتا ہے تو مذکورہ بالا قاعدہ عقلائیہ کی مخالفت لازم آئے گی۔ حالانکہ حکیم علیٰ

فانه خلق اعظم من جبرئیل و میکائیل کان مع رسول الله و مع الملئکة و مع الائمة

روح سے مراد وہ روح ہے جو (قدر ومنزلت میں) جبرئیلؑ اور میکائیلؑ سے بھی ایک عظیم تر مخلوق ہے جو رسولِ خدا ﷺ اور ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کے ساتھ رہتی ہے

الاطلاق کبھی قاعدۂ حکیمانہ کی مخالفت نہیں کرتا۔ لہٰذا یہ امر ماننا پڑے گا کہ بدن کے فنا کے ساتھ روح فنا نہیں ہوتی، بلکہ جزاوسزا حاصل کرنے کے لیے باقی رہتی ہے۔ اب وہ جزاوسزا دو طریقہ پر مُتصوّر ہوسکتی ہے۔ بطور تناسخ یا بطور حشرونشر۔ لیکن چونکہ تناسخ باطل ہے۔ (جیسا کہ اٹھارھویں باب کے ذیل میں اسے ثابت کیا جائے گا) تو لامحالہ قیامت تک ان روحوں کا باقی رہنا بالضرور تسلیم کرنا پڑے گا، بلکہ اس کے بعد بھی، تاکہ وہ اپنے اعمال خیروشر کی پوری پوری جزا یا سزا پاسکیں۔ وهم فیها خالدون۔

جناب پیغمبر اسلام ﷺ کی متفق بین الفریقین حدیث شریف کہ: "خلقتم للبقاء لا للفنا" کہ "تمھیں بقا کے لیے پیدا کیا گیا ہے، نہ کہ فنا کے لیے" بھی اسی مطلب پر دلالت کرتی ہے۔ جسے مُصنّف علام نے اپنے مقصد کی تائید کے لیے ذکر فرمایا ہے۔ لیکن یہاں پر بھی حضرت شیخ مُفید علیہ الرحمۃ نے مُصنّف پر بے جا سخت تنقید فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں: والذی حکاه و توهمه هو مذهب کثیر من الفلاسفة الملحدین الذین زعموا ان النفس لا یلحقها الکون و الفساد و انها باقیة و هذا من اخبث قول و ابعده من الصواب۔ یعنی شیخ صدوقؒ نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ بہت سے مُلحد و بے دین فلسفیوں کا نظریہ ہے، جن کا یہ گمان ہے کہ نفس کون وفساد سے بالاتر ہے۔ فنا صرف جسم کے لیے ہے اور نفس باقی رہتا ہے۔ یہ بہت ہی خبیث اور درستی سے بہت دور قول ہے۔

ہم یہاں بھی اور اکثر مقامات کی طرح حضرت شیخ مُفیدؒ کی موافقت کرنے سے قاصر ہیں۔ کیونکہ مذکورہ عقیدہ صحیحہ سے ہرگز مُلحد حکماء کی موافقت لازم نہیں آتی۔ کیونکہ اس حدیث شریف کا دراصل مقصود یہ ہے کہ تمھاری خلقت محض اس لیے نہیں ہوئی کہ دنیا میں آکر چند روزہ زندگی بسر کرو اور پھر بالکل فنا ہوجاؤ۔ نہ کوئی باز پرس ہو اور نہ کوئی جزا اور نہ کوئی سزا۔ جیسا کہ دھریہ کا خیال ہے۔ اور قرآن مجید نے ان کے اس اعتقاد فاسد کی یوں خبر دی ہے:

وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ (سورۃ الجاثیہ: ۲۴)

وہ کہتے ہیں کہ ہماری تو صرف یہ زندگی ہے، اب زندہ ہیں، پھر مرجائیں گے اور ہمیں مارنے والا زمانہ ہی ہے۔

و هو من الملكوت و انا	اور اس روح کا تعلّق عالم ملکوت سے ہے (یعنی فرشتہ ہے) روح
اصنف فی هٰذا المعنی کتاباً	اور اس کے احوال کے متعلّق میں ایک کتاب لکھوں گا جس میں ان
اشرح فیه معانی الجمل	تمام مجمل باتوں کی تشریح و توضیح ہوگی (انشاء اللہ)

یعنی نہ کوئی خالق ہے اور نہ کوئی جزا و سزا۔ اسلام نے اس عقیدہ کی تردید فرمائی اور یہ حدیث بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اگر ایسا ہی ہے تو پھر انسان اور ایک عام حیوان مثل کلب و حمار میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے؟ اس لیے اس حدیث کا مطلب صرف یہ ہے کہ تمھاری روحیں فنا نہیں ہوتیں۔ البتہ اس دار دنیا سے دار آخرت کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں۔ جہاں اپنے اعمال کا عوض پاتی ہیں۔ فلاسفہ تو یہ کہتے ہیں کہ روحیں فنا ہو سکتی ہی نہیں۔

شیخ صدوق علیہ الرحمۃ یا دیگر مُسلمان علماء یہ تو ضرور کہتے ہیں کہ روحیں فنا نہ ہوں گی۔ لیکن وہ یہ نہیں کہتے کہ وہ فنا ہو سکتی ہی نہیں، بلکہ قدرتِ کاملہ جب چاہے انھیں فنا کرنے پر قادر ہے۔ لیکن اگر فنا کرنے میں مصلحت نہیں تو انھیں فنا نہیں کیا جاتا، تو اب فنا نہ ہو سکنے (جو فلاسفہ کا نظریہ ہے) اور فنا نہ ہونے (جو مُسلمان کہتے ہیں) میں جو فرق ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ اور اس کے باوجود پھر یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ مُصنّف علام نے فلاسفہ ملاحدہ کی ہمنوائی فرمائی ہے۔ "ان هذا الا اختلاق" (شارح مقاصد نے اس مطلب پر علاوہ نصوص قرآنیہ و حدیثیہ کی دلالت کے اجماعِ امت کا دعویٰ بھی کیا ہے) ان حقائق سے واضح و لائح ہو گیا کہ جسم کے فنا ہونے سے روح فنا نہیں ہوتی۔ یہی وہ صحیح عقیدہ ہے جو ایک مُسلمان کو رکھنا چاہیے۔

سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ اپنے رسالہ اعتقادیہ میں فرماتے ہیں: "ویجب الایمان بان الروح باق بعد مفارقة الجسد" لؔ اس بات پر ایمان رکھنا واجب ہے کہ جسم سے جدا ہونے کے بعد روح باقی رہتی ہے۔ ؎

ترا یک نکتۂ سر بستہ گویم اگر درسِ حیات از من بگیری
بمیری گر بہ تن جانے نہ داری دگر جانے بہ تن داری نہ میری اقبال

لیکن قبر میں عذاب و ثواب اور عالم برزخ میں جزا و سزا تنہا روح کو ہوتی ہے یا اسے جسم مثالی کے اندر رکھ کر دی جاتی ہے؟ اگرچہ اس مبحث کے اندر اس کا اجمالی تذکرہ موجود ہے لیکن ہم اس مسئلہ پر تفصیلی روشنی آئندہ باب ہفدہم میں ڈالیں گے۔ انشاء اللہ...... فانتظر

تتمّہ مُہمّہ

در بیان اِختلافِ انواعِ ارواح

مخفی نہ رہے کہ اب تک جس انسانی روح کے بارے میں ہم نے گفتگو کی ہے وہ ہر شخص میں صرف ایک ہی ہوتی ہے جو کہ متحد النوع اور متعدّد الافراد ہے۔ یہ متعدّد ارواح جن کا ذکر مُصنّف علام نے فرمایا ہے اور احادیث میں ان کا تذکرہ موجود ہے، یہ درحقیقت بعض قویٰ ہیں، جن کو من باب المجاز روح کہا گیا ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ موجوداتِ عالم میں سے ہر نوع کی روحیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ مثلا انسان، خرگوش، اور موش وغیرہ، باوجودیکہ ایک چیز میں باہم شریک ہیں، جیسے جسم دار ہونے میں یا حیوان ہونے میں لیکن بایں ہمہ انسان کی کوئی فرد گدھے کی فرد نہیں۔ اور گدھے کی کوئی فرد انسان نہیں۔ لہٰذا سوچنا چاہیے کہ وہ کونسی چیز ہے جس نے انسان کو انسان اور گدھے کو گدھا اور شیر کو شیر اور فیل کو فیل بنا رکھا ہے۔ وہ مابہ الامتیاز کیا ہے؟ اگر بنظر غائر اس امر کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان سب جانداروں کی روحیں الگ الگ خاص طور پر بنائی گئی ہیں اور ہر ہر نوع کا خاصہ جدا جدا ہے۔ نہ انسان کی روح میں شیر کے خواص پائے جاتے ہیں اور نہ شیر کی روح میں ان انسان کے خواص وعلیٰ ہٰذا القیاس۔ اس لیے ہر نوع کے خواص اور طبعی افعال اور جسمانی قویٰ ایک دوسرے سے جدا جدا ہیں۔ اور ان کی غذائیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اور بسر بردحیات کے طریقے جدا جدا ہیں جو حیوانات گوشت خور ہیں وہ نبات خور نہیں ہوسکتے اور جو نبات خور ہیں وہ گوشت خور نہیں ہوسکتے۔ اگر بجبر ایسا کیا گیا تو یہ امر ان کے لیے موجب ہلاکت ہوگا۔

ان حقائق سے بآسانی یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ہر ذی حیات کی روح دوسرے ذی حیات کی روح سے جداگانہ اور مختلف ہے۔ اسی طرح ہر ہر نوع کے ہر ہر فرد کی روح بھی علیحدہ ہے۔ اگرچہ متحد النوع ہے۔

رُوح کے بعض احوال کا بیان

احادیث میں روح کے مختلف حالات وکوائف مذکور ہیں، چونکہ یہ مبحث غیر معمولی طور پر طویل ہوگیا ہے اس لیے اس پر کچھ مزید خامہ فرسائی تو نہیں کی جاسکتی، البتہ یہاں فقط ایک حدیث پیش کی جاتی ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے آباء و اجداد طاہرین صلوات اللہ علیہم اجمعین کے سلسلہ سند سے جناب امیر المومنین علیہ السلام سے روایت فرماتے ہیں کہ آنجناب نے فرمایا:

ان الجسم ستة احوال الصحة و المرض و الحیوة و الموت و النوم و الیقظة کذالك الروح فحیاتها علمها و موتها جهلها و مرضها شکها و صحتها یقینها و نومها غفلتها و یقظتها حفظها (کتاب التوحید للصدوقؒ)

جس کی چھ حالتیں ہوتی ہیں ۔ صحت، مرض، حیات، موت، نیند اور بیداری ۔ اسی طرح روح کی بھی چھ حالتیں ہوتی ہیں ۔ پس روح کی حیات علم، اس کی موت جہالت، اس کا مرض شک، اور اس کی صحت یقین، اس کی نیند غفلت اور بیداری، حفظ اور یاد کرنا ہے ۔

لہٰذا عقلمند انسان وہ ہے جو ہمیشہ روح کے حالات وکوائف کا نگران رہے اور ان امور سے اس کی حفاظت کرے جن سے اس کی حالت میں نقص پیدا ہوتا ہے، تاکہ ان عیوب ونقائص روحانیہ سے محفوظ و مصئون رہ سکے، اور ان باتوں کو بجا لائے جن سے اس کی روح و مدارج ترقی پر فائز ہوتی ہے ۔ واللہ الموفق ۔ ان فی ذلك لآیات لقوم یتفکرون ۔

ایضاح

مخفی نہ رہے کہ روح القدس کی وجہ سے نبی و امام کی نوع ہرگز تبدیل نہیں ہوجاتی، جس طرح روح ایمان کی وجہ سے مومن کی نوع نہیں بدلتی ۔ کیونکہ انبیاء و مرسلینؑ ہوں یا ائمہ طاہرین علیہم السلام بنی نوعِ انسان کے ہی افراد کاملہ ہیں اور درحقیقت انہی ذواتِ مقدسہ کی بدولت انسان اشرف المخلوقات کہلاتا ہے ۔

اس مطلب کی مزید وضاحت اور روح القدس کی
حقیقت معلوم کرنے کے لیے ہماری
کتاب "اصول الشریعہ" کے
پہلے باب کی طرف
رجوع کیا
جائے

☆

باب الاعتقاد

فی الموت

قال الشیخ قیل لامیر المومنینؑ صف لنا الموت فقال علی الخبیر سقطتم ھو

سولھواں بابؒ

موت کے متعلق اعتقاد

جناب شیخ ابوجعفر علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ کسی شخص نے حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی بارگاہ میں عرض کیا کہ اے آقا موت کی کیفیت وحالت بیان کیجیے۔ حضرت نے فرمایا:

سولھواں بابؒ

موتؒ اوراس کی حقیقتؒ کا بیان

موت کے متعلق قدرے اختلاف ہے کہ آیا وہ امر وجودی ہے یا امر عدمی۔ تحقیق یہ ہے کہ موت ایک امروجودی ہے، جس کی یہ تعریف ہے: "الموت صفة وجودية مضادة للحيات" یعنی موت ایک صفت وجودی ہے جو حیات کی ضد ہے اس کی تائید آیاتِ قرآنیہ جیسے :اَلَّذِیۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَالۡحَیٰوۃَ (سورۃ الملک:۲) وغیرہ سے بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ ان آیاتِ مبارکہ میں خلاقِ عالم نے موت کو خلق فرمانے کا تذکرہ فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ جو چیز خلق کی جاتی ہے وہ وجودی ہی ہوتی ہے۔ کیونکہ عدم محض مخلوق نہیں ہوتا۔ مگر بعض نے اسے امر عدمی قرار دیتے ہوئے اس کے متعلق یہ کہا: "ھو عبارۃ عن عدم ھذہ الصفة" یعنی موت صفت حیات کے معدوم ہونے کا نام ہے۔ تعریف کی دو قسمیں ہیں۔ حقیقی اور لفظی ۔ تعریف حقیقی جنس وفصل قریب سے ہوتی ہے۔ جس سے مقصُود کسی شے کی حقیقت وماہیت کا معلُوم کرنا اور اسے تمام اعدا واغیار سے تمیز دینا ہوتا ہے۔ اور تعریف لفظی سے فقط شرح اسم اور بعض اغیار سے امتیاز دینا مطلُوب ہوتا ہے اور یہ مطلب بعض آثار ولوازم اور خواص کے ذکر کردینے سے بھی حاصل ہوجاتا ہے۔ مُصنّف علام نے موت کی تعریف بالآثار کرکے اس کی تعریفِ لفظی فرمائی ہے۔ لہٰذا ان پر یہ اعتراض عائد نہیں ہوتا کہ انھوں نے عنوان تو موت کی حقیقت بیان کرنے کا قرار دیا تھا لیکن اثنائے بحث میں فقط اس کے آثار ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مُصنّفؒ کوئی منطق کی کتاب نہیں لکھ رہے تھے کہ اس میں منطقی تعریف کے حدود وقیود کی پابندی کرتے، بلکہ وہ عقائد بیان کررہے ہیں۔

احد امور ثلثة یرد علیه	تم نے ایسے شخص سے سوال کیا جو حقیقت موت سے کما حقہ واقف ہے
اما بشارة بنعیم الابد و	(پھر فرمایا) جب کسی مرنے والے کے پاس موت آتی ہے تو وہ تین
اما بشارة بعذاب الابد و	چیزوں میں سے ایک چیز ضرور ہوتی ہے، یا تو دائمی نعمتوں کی بشارت
اما تخویف و تھویل و	اور خوشخبری ہوتی ہے یا دائمی عذاب وعقاب کی خبر ہوتی ہے اور یا مرنے
امر مبھم لا یدری من ای	والے کے لیے خوف وہراس ہوتی ہے اور مرنے والے کا انجام مبہم ہوتا

فلسفۂ موت وحیات کا بیان

اس مختصر تمہید سدید کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فلسفۂ موت وحیات پر مختصراً کچھ تبصرہ کر دیا جائے۔ یہ امر تو بالبداہت معلوم ومحسوس ہے کہ خلاقِ کائنات نے اپنی تمام ذی روح مخلوق کو موت وحیات کی دو آہنی زنجیروں میں کچھ اس طرح جکڑ دیا ہے کہ اس سلسلہ میں انسان بالکل بے بس اور مجبور ہے کہ نہ اسے دنیا میں آنے میں کچھ اختیار اور نہ یہاں سے جانے میں کوئی اختیار۔ بقول ذوق ؎

لائی حیات آئے قضا لے چلی، چلے اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

جناب امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ: "ما للانسان و للتکبر اوله نطفة و أخره جیفة"۔ بھلا انسان کو تکبّر اور کبریائی سے کیا تعلّق ہے؟ اس کی اول ایک نطفہ گندیدہ ہے اور آخر مردار اور کمزور وناتواں اس قدر ہے کہ "لا یملك لنفسه ضرا و لا نفعا و لا موتا و لا حیوة و لا نشوراً" کہ نہ اپنی موت کا مالک ہے، نہ حیات کا اور نہ اپنے نفع کا مالک ہے نہ نقصان کا اور نہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوکر اٹھنے کا اختیار رکھتا ہے۔ (نہج البلاغہ) (کلماتِ قصار ۴۵۳)

اس سلسلہ میں اجمالی جواب

اب رہا یہ سوال کہ اس سلسلہ موت وحیات کو کیوں جاری کیا گیا ہے۔ اس میں کیا کیا اسرار و رموز پوشیدہ ہیں؟ تو اس سوال کا سب سے پہلا اور مکمل جواب تو یہی ہے کہ جب ہم یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ خالق کائنات حکیم مطلق و مدبر کامل ہے اور یہ امر مُسلّم ہے کہ "فعل الحکیم لا یخلوا عن الحکمة" کسی حکیم کا کوئی فعل حِکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا، تو اگر بالفرض اس کے کسی فعل کی حقیقی حِکمت و مصلحت سمجھ میں نہ بھی آئے تو اس میں ہماری عقل وفہم کا قصور ہوگا، حکیم علی الاطلاق کے کسی فعل میں کوئی نقص وعیب نہیں ہوسکتا اور نہ وہ مصالح وحِکَم سے خالی ہوسکتا ہے۔

الفرق هو اما ولینا و المطیع	ہے اور وہ یہ نہیں جانتا کہ وہ (پہلے یا دوسرے) کس گروہ سے
لامرنا فهو المبشر بنعیم الابد	تعلق رکھتا ہے جو شخص ہمارا دوست اور فرمانبردار ہے اسے ابدی
و اما عدونا و المخالف لامرنا	نعمتوں کی خوشخبری دی جاتی ہے اور جو ہمارا دشمن اور ہمارے حکم
فهو المبشر بعذاب الابد	کی مخالفت کرنے والا ہے اسے ابدی عذاب کی خبر سنائی جاتی ہے

دوسرا جواب: اور دوسرا جواب یہ ہے کہ سلسلۂ موت وحیات کوئی ایسا غامض مسئلہ نہیں کہ اس کے اسرار ورموز تک انسانی عقول کی رسائی نہ ہو۔ آج تک عقل انسانی نے بھی اس کے بہت سے فوائد وعوائد معلوم کر لیے ہیں۔ نیز کتاب ربانی نے بھی اس سلسلہ میں ہماری کافی رہبری فرمائی ہے اور معصومینؑ کے ایسے فرامین بھی بکثرت موجود ہیں جو اس سلسلہ میں خضر راہ کا کام دیتے ہیں۔ ہم بنظر اختصار ذیل میں ان مصالح وحکم میں سے بعض کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

سلسلہ موت وحیات کی پہلی اور اہم مصلحت

ارشادِ قدرت ہے: اَلَّذِیۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَالۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا (سورة الملك : ۲) خداوند عالم وہ قادر وحکیم ہے جس نے موت وحیات کو اس لیے پیدا کیا تا کہ یہ معلوم ہو کہ تم میں سے زیادہ اچھے کام کرنے والا کون ہے؟ اس آیت مبارکہ نے فلسفۂ موت وحیات کے چہرہ سے نقاب الٹ دیا ہے۔ اور صاف صاف بتا دیا ہے کہ موت وحیات کی خلقت کا مقصد اقصیٰ اعمالِ صالحہ کا بجالانا اور اعمالِ سیئہ سے اجتناب کرنا ہے۔ چنانچہ آیتِ مبارکہ: وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ ﴿۵۶﴾ (سورة الذاریات:۵۶) سے بھی اسی مطلب کی تائید مزید ہوتی ہے۔ لہٰذا جو شخص جس قدر زیادہ اپنے اس مقصد خلقت کی تکمیل میں حصہ لے گا اسی قدر وہ نگاہِ خالق میں زیادہ مکرم ومعظم ہوگا۔ جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ (سورة الحجرات:۱۳) اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ مکرم ومحترم وہ ہے جو اس سے زیادہ ڈرتا ہے اور جو شخص جس قدر اس مقصد عظیم سے علیحدگی اور دوری اختیار کرے گا اسی قدر ساحت قدس سے دور اور مرتبہ انسانیت سے گرتا چلا جائے گا۔ حتی کہ گرتے گرتے بعض صورتوں میں عام حیوانات سے بھی بدتر ہو جائے گا۔ چنانچہ ارشاد قدرت ہے: لَہُمۡ قُلُوۡبٌ لَّا یَفۡقَہُوۡنَ بِہَا ۫ وَلَہُمۡ اَعۡیُنٌ لَّا یُبۡصِرُوۡنَ بِہَا ۫ وَلَہُمۡ اٰذَانٌ لَّا یَسۡمَعُوۡنَ بِہَا ؕ اُولٰٓئِکَ کَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ ہُمۡ اَضَلُّ (سورة الاعراف:۱۷۹) کچھ لوگ ایسے ہیں کہ ان کے قلوب تو ہیں لیکن ان سے سوچتے نہیں، کان ہیں لیکن (حق کو) سنتے نہیں، آنکھیں ہیں لیکن (حق کو) دیکھتے نہیں۔ ایسے لوگ مثل چوپایوں کے ہیں، بلکہ ان سے بھی گمراہ تر اور بدتر۔

و اما المبہم امرہ الذی لا یدری ماحالہ فھو المومن المسرف علی نفسہ لا یدری مایول الیہ حالہ یاتیہ الخبر مبھما مخوفا ثم لن یشوبہ اللہ تعالیٰ باعدائنا و لکن

لیکن وہ شخص جس کا امر مُشتبہ اور انجام مبہم ہے، وہ ایسا مومن ہے کہ جس کا عقیدہ تو درست ہے۔ لیکن اس نے اپنے نفس پر بوجہ نافرمانی خدا زیادتی کی ہے۔ اسے کچھ معلوم نہیں ہے کہ اس کا مآل اور انجام کیا ہوگا؟ ایسے شخص کے پاس (انجام کی) خوفناک اور مبہم خبر آتی ہے۔ خداوند عالم ایسے شخص کو ہمارے دشمنوں کے ساتھ ہرگز نہ ملائے گا، بلکہ

دُوسری مصلحت

سرکار سید الشہداء علیہ الاف التحیۃ والثناء کا ارشاد ہے: "خط الموت علی ابن آدم کما خط القلادۃ علیٰ جید الفتاۃ" یعنی موت فرزند آدم کے لیے اس طرح باعثِ زیب و زینت ہے جس طرح ہار نوجوان لڑکی کی گردن کی زینت ہوتا ہے۔ (نفس المہموم)

اس بلیغ تشبیہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ موت فرزند آدم کے لیے بمنزلہ زیور کے ہے جس کے بغیر اس کا حسن و جمال نکھرتا ہی نہیں۔ سچ ہے: ع

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا ہے

قاعدہ ہے کہ: "الاشیاء تعرف باضدادھا" کہ کسی شے کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ اس کی ضد سے ہوتا ہے۔ کما قال المتنبی: ؎

و نذیمھم و بھم عرفنا فضلہ　　و بضدھا تتبین الاشیاء

ہمیں موت کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اس لیے نہیں کہ ہم نے ہمیشہ زندہ رہنے کی تکالیف کو نہ خود جھیلا ہے اور نہ کسی کو اس بلا کے بے درماں میں مبتلا دیکھا ہے۔ ایک نبی کی امت سے دائمی حیات طلب کرنے کی حماقت سرزد ہوگئی تھی، پس ان سے پوچھیے کہ پھر ان پر کیا بیتی؟ واقعہ یوں ہے کہ ایک نبی کی امت نے ان کی خدمت میں یہ درخواست پیش کی کہ بارگاہِ ایزدی میں دعا فرمائیں کہ وہ سلسلہ موت کو موقوف کر دے۔ چنانچہ نبی نے دعا کی جو مستجاب ہوئی اور موت کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔ اب انھوں نے جو جینا شروع کیا تو نوبت بایںجا رسید کہ ایک شخص اپنے باپ اور دادا، اپنے دادا کے دادا، اسی طرح اپنے نانا اور پھر نانا کے نانا، وعلیٰ ہٰذا القیاس سب بزرگوں کو دیکھنے لگا۔ اور وہ زندہ درگور بوڑھے بچوں کی طرح پڑے ہیں، نہ چلنے پھرنے کی سکت، نہ خود اٹھ کر بول و براز کرنے کی طاقت

یخرجه من النار بشفاعتنا	ہماری شفاعت کی وجہ سے اسے ضرور آتش جہنم سے نکالے گا۔
فاعملوا و اطیعوا و لا تتکلوا و لا	پھر فرمایا تم عمل صالح کرو، واجب الاطاعت ہستیوں کی
تستصغروا عقوبة الله فان من	اطاعت کرو اور اپنے نفسوں یا خوش فہمیوں پر بھروسا کر کے بیٹھ
المسرفین من لا تلحقه شفاعتنا	نہ جاؤ، اور عذابِ خداوندی کو حقیر نہ سمجھو۔ کیونکہ کچھ ایسے گنہگار
الا بعد عذاب الله بثلثمائة الف	لوگ بھی ہوں گے جنھیں تین تین لاکھ سال تک عذابِ الٰہی
سنة و سئل عن الحسنؑ بن	میں گرفتار رہنے کے بعد ہماری شفاعت نصیب ہوگی۔ حضرت
علیؑ بن ابی طالبؑ ما الموت	امام حسن علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ موت کیا ہے؟

اور نہ ہاتھ ہلا کر خود کھانے پینے کی قدرت۔ لہٰذا ان کے عزیز ان کی خدمت میں مشغول اور ان زندہ درگور لاشوں کی دیکھ بھال میں مُنہمک ہو گئے اور سلسلہ کسب و اکتساب ختم ہو کر رہ گیا۔ دائمی حیات ان کے لیے ایک مصیبت عظمیٰ بن گئی اور ان کا نظامِ زندگی درہم برہم ہونے لگا اور وہ اس مطالبہ بے جا پر بہت نادم و پشیمان ہوئے۔ پھر پیغمبر کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ دعا کریں کہ خداوند عالم اسی سابقہ سلسلہ کو جاری و ساری فرمائے۔ چنانچہ انھوں نے دوبارہ دعا کی اور بدستور سابق سلسلہ موت و حیات جاری ہوا اور جب ملک الموت کی آمد و رفت شروع ہوئی تو اس وقت ان لوگوں نے آرام و اطمینان کا سانس لیا۔ (انوار نعمانیہ) ولنعم ما قال الحماسی ؎

و لا للمرء خیر فی حیاة　　　اذا ما عد من سقط المتاع

اس زندگی میں انسان کے لیے کوئی خیر و خوبی نہیں جب کہ وہ ردی کی ٹوکری کا مال شمار ہونے لگے۔ بقول متنبی۔ البتہ یہ درست ہے کہ: ؎

و اوفی حیاة الغابرین لصاحب　　　حیاة امرء خانة بعد مثیب

تیسری مصلحت

اگر سلسلہ موت نہ ہوتا تو دنیا میں جو کچھ چہل پہل چمک دمک اور رعنائی و دلربائی موجود ہے وہ ختم ہو کر رہ جاتی۔ کیونکہ یہ سب کچھ اسی جذبہ کا نتیجہ ہے کہ ہر انسان کو مرنے کا یقین ہے اس لیے وہ چاہتا ہے کہ اس نے جو کچھ یہاں کرنا ہے اسے جلد سرانجام دے لے، نہ معلوم کب فرشتہ اجل آ کر اس کے رشتہ نفس کو قطع کر دے۔ لیکن اگر اسے یہ یقین ہوتا کہ اس نے مرنا تو ہے ہی نہیں تو پھر ہر کام کی انجام دہی میں سستی و کاہلی سے کام لیتا کہ کیا جلدی ہے، آج نہیں تو کل کر لیں گے، کل نہیں

الذی جهلوه فقال اعظم سرور برد علی المومنین اذا نقلوا عن دار النکد الی نعیم الابد و اعظم ثبور یرد علی الکافرین اذا نقلوا من جنتهم الی نار لا تبید و لا تنفد و لما اشتد الامر بالحسین بن علیؑ بن ابی طالبؑ نظر الیه

جس سے لوگ ناواقف ہیں ۔ حضرتؑ نے فرمایا: مومنین کے لیے موت زبردست مسرت وشادمانی ہے ۔ کیونکہ موت کی وجہ سے ہی وہ دنیوی مصیبت کدہ سے چھٹکارا پاکر خدا کی ابدی نعمتوں کی طرف منتقل ہوجاتے ہیں ۔ مگر یہی موت کافروں کے لیے بہت بڑی بلا ومصیبت ہے ۔ اس لیے کہ موت ہی ان کو دنیوی نعمت کدوں سے نکال کر نہ بجھنے اور نہ ختم ہونے والی آگ کی طرف لے جاتی ہے (روزِ عاشوراء) جب کہ حضرت امام حسین بن علی بن ابی طالب علیہم السلام

تو پرسوں کرلیں گے ۔ وہکذا ۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ تمام کام ناقص اور ناتمام رہ جاتے اور دنیا کی یہ رونق اور یہ شان وشوکت ایک دم ختم ہوکر رہ جاتی اور انسان تنگیٔ معیشت وغیرہ مختلف تکالیف میں گرفتار ہوجاتا ۔ پس معلوم ہوا کہ دنیا کی تمام دل کشی اور دلربائی کا راز سلسلہ موت میں پوشیدہ ہے ۔ اسی مطلب کو مرزا غالب مرحوم نے اپنے خاص انداز میں یوں ادا کیا ہے: ؎

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

چوتھی مصلحت

موت سے انسان کو اپنے مقصد خلقت کی تکمیل میں کافی مدد ملتی ہے اور کبر ونخوت اور انانیت و خود بینی ایسے صفاتِ رذیلہ کو دور کرنے میں اس سے بہت مدد ملتی ہے اور اس سے بارگاہِ ایزدی میں سر تسلیم خم کرنے کا صالح جذبہ پیدا ہوتا ہے ۔ جیسا کہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے سرکش اور جبار وقہار انسانوں کو بھی اپنی سرکشی وطغیانی کے وقت جب کبھی موت کا تصور آجاتا ہے تو ان کے تمام خم وپیچ نکل جاتے ہیں اور طلسم کبر ونخوت ٹوٹ جاتا ہے ۔ اسی مطلب کو شاعر نے اس طرح ادا کیا ہے:

موت نے کر دیا ناچار وگرنہ انساں ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

پس ان حقائق سے معلوم ہوا کہ موت انسان کے لیے مقرب الی الطاعة (طاعتِ ایزدی کے قریب کرنے والی) اور مبعد عن المعصیة (نافرمانی سے دور کرنے والی) ہے اور اسی چیز کو اِصطلاحِ متکلمین میں "لطف" کہا جاتا ہے ۔ جس کی انجام دہی قدرتِ کاملہ پر لطفاً واجب ہے ۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر ہادیانِ دین نے موت کو بکثرت یاد کرنے کی تلقین فرمائی ہے ۔

من کان معه و اذا هو بخلافهم لانهم کانوا اذا شتدبهم الامر تغیرت الوانهم و ارتعدت فرائصهم و وجلت قلوبهم و وجبت جنوبهم و کان الحسینؑ و بعض من معه من خواصه تشرق الوانهم و تهدء جوارحهم و تسکن نفوسهم فقال بعضهم لبعض انظروا الیه لا یبالی بالموت فقال لهم الحسین صبرا بنی الکرام

سخت آزمائش میں مبتلا تھے۔ سخت جنگ ہو رہی تھی۔ آپؑ کے بعض اصحاب نے آپؑ کی طرف دیکھا کہ آپؑ کی حالت دوسرے لوگوں سے مختلف ہے۔ کیونکہ جب ان لوگوں پر معاملہ سخت ہوجاتا تھا تو ان کے رنگ متغیر ہوجاتے، کاندھے کانپنے لگتے، دل ہراساں ہوجاتے، اور پہلو شکستہ ہوجاتے تھے۔ مگر جناب سید الشہداء علیہ السلام اور ان کے بعض خاص احباب کی ان شدائد میں یہ کیفیت تھی کہ رنگ میں چمک، اعضاء میں سکون اور دلوں میں پوری طرح اطمینان تھا۔ ان کی یہ اطمینانی حالت دیکھ کر آنجنابؑ کے اصحاب ایک دوسرے کو کہتے تھے کہ دیکھو آنجناب علیہ السلام کو موت کی کوئی پرواتک نہیں ہے۔ جناب امام حسین علیہ السلام نے ان سے فرمایا: اے شریف زادو صبر کرو۔

موت کو بکثرت یاد کرنے کے فوائد

جناب سرور کائنات ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: "کفاکم بالموعظة الموت"۔ "تمھیں پند و نصیحت حاصل کرنے کے لیے موت کا یاد کرلینا کافی ہے"۔ (تحف العقول)

جناب امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں: "اکثروا ذکر الموت و یوم خروجکم من القبور و قیامکم بین یدی ربکم عزوجل تهون علیکم المصائب"۔ فرمایا: "مرنے، قبروں سے نکلنے اور بارگاہِ قدرت میں کھڑا ہونے کو بکثرت یاد کرو۔ اس سے تم پر دنیا کے مصائب و آلام آسان ہوجائیں گے"۔ (خصال شیخ صدوقؒ)

داؤد روایت کرتے ہیں کہ میں نے جناب امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ کوئی ایسی چیز تعلیم فرمائیں جس سے میں فائدہ حاصل کروں۔ فرمایا: "یا ابا عبیدة ما اکثر ذکر الموت احد الازهد فی الدنیا"۔ (بحار جلد ۳) "اے ابوعبیدة! کوئی شخص موت کو بکثرت یاد نہیں کرتا مگر یہ کہ وہ دنیا میں زاہد (بے رغبت) ہوجاتا ہے"۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: "ذکر الموت یمیت الشهوات فی النفس و یقلع غایت الغفلة و یقوی القلب بمواعد الله و یرق الطبع و یکسر اعلام الهویٰ و یطفی فار الحرص و یحقر

فما الموت الا قنطرة تعبر بکم عن البوس و الضرآء الی الجنان الواسعة و النعم الدائمة فایکم یکرہ ان ینتقل من سجن الی قصر و اما ھؤلاء اعدائکم کمن ینتقل من قصر الی السجن و عذاب الیم

یہ موت ایک پُل کی مانند ہے جو تمھیں اس تنگی وسختی اور ہولناک مصیبت سے پار کر کے وسیع وعریض باغات اور ابدی نعمتوں تک پہنچا دے گی۔تم میں کون ایسا شخص ہے جو اس دنیا کے قیدخانہ سے رہا ہوکر جنّت کے عالی شان محلوں میں جانا پسند نہیں کرتا؟اور یہ جو تمھارے دشمن ہیں ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو عظیم الشان محل سے نکل کر

الدنیا الحدیث“۔یعنی موت کا یاد کرنا نفس کی شہوات کو مارتا ہے،غفلت کی بیخ کنی کرتا ہے،اللہ کے وعدوں سے دل کو تقویت پہنچاتا ہے،طبیعت کو رقیق ونرم کرتا ہے،ہوا و ہوس کے جھنڈوں کو سرنگوں کرتا ہے،آتشِ حرص وہوس کو بجھاتا ہے اور نگاہوں میں دنیا کو حقیر کرتا ہے“۔(بحارالانوار جلد ۳)

بکثرت احادیث میں وارد ہے کہ جب گناہوں کے سیاہ بادل تمھارے سروں پر منڈلانے لگیں اور دنیا اپنے مادی جاہ وجلال کی طرف تمھیں کھینچے تو قبرستان میں جا کر عبرت ونصیحت حاصل کیا کرو۔گناہوں کے بادل چھٹ جائیں گے اور دنیا کی دھوکادہی وفریب کاری سے دامن محفوظ رہے گا۔

؎ ہر روز زیر زمیں لوگ چلے جاتے ہیں نہیں معلوم تہِ خاک تماشہ کیا ہے؟

معیارِ صداقت تمنائے موت ہے

سلسلہ موت کا جریان بتلاتا ہے کہ دنیا ہماری منزل وقرارگاہ نہیں ہے۔یہ تو ایک پل ہے جسے عبور کر کے ہم نے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنا ہے۔ارشادِ قدرت ہے:

وَ مَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ ؕ وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۴﴾

(سورۃ العنکبوت:۶۴)

زندگانیٔ دنیا تو ایک لہو ولعب اور بچوں کا کھیل ہے۔ہاں آخرت زندہ رہنے کا گھر ہے۔اے کاش لوگ اس حقیقت کو سمجھتے۔

اسی لیے متفق بین الفریقین حدیث میں وارد ہے کہ جناب رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا:”الدنیا سجن للمومن و جنة للکافر“۔یہ دنیا مومن کے لیے بمنزلہ قیدخانہ کے ہے اور کافر کے لیے بمنزلہ جنّت۔اور فطرت کا مُقتضا یہ ہے کہ انسان قید سے رہائی اور اصلی منزل تک پہنچنے کی تمنا اور خواہش کرتا ہے۔اسی سے لوگوں کے دعویٔ ایمان وایقان کو پرکھنے کا معیار قدرتِ کاملہ نے تمنائے موت کو قرار

ان ابی حدثنی بذلك عن رسول الله ان الدنیا سجن المؤمن و جنة الکافر و الموت جسر هؤلاء الی جنانهم و جسر هؤلاء الی جحیمهم ما کذبت و ما کذبت و قیل لعلی بن الحسین ما الموت قال للمومن کنزع ثیاب وسخة قملة اوفك قیود و اغلال ثقیلة و الاستبدال بافخر الثیاب و اطیبها روایح و اوطی المراکب وأنس المنازل و للکافر کخلع ثیاب فاخرة والنقل عن منازل انیسة و الاستبدال باوسخ الثیاب و اخشنها و اوحش المنازل و اعظم العذاب و قیل لمحمد بن علی الباقرؑ

قیدخانہ اور دردناک عذاب کی طرف منتقل ہو۔ میرے پدر بزرگوار نے میرے جد نامدار کی یہ حدیث مجھ سے بیان فرمائی ہے کہ دنیا مومن کے لیے قیدخانہ ہے اور کافر کے لیے جنّت اور موت مومنوں کے لیے جنّت میں داخل ہونے اور کافروں کے لیے دوزخ میں جانے کے واسطے ایک پل ہے۔ نہ میرے والد محترم نے جھوٹ بولا ہے اور نہ ہی میں نے جھوٹ بولا ہے۔ (یعنی یہ حدیث بالکل سچّی ہے) جناب امام زین العابدین علیہ السلام سے کسی نے موت کے متعلّق سوال کیا کہ یہ کیا چیز ہے؟ فرمایا: مومن کے لیے موت ایسی ہے جیسے ایک انسان میلے کچیلے اور جوؤں والے کپڑے اتار پھینکے یا ثقیل طوق وسلاسل کے بوجھ سے نجات پالے اور اس کے عوض معطّر لباس فاخرہ، زیب تن کرے، اور تیز رو سواریاں اور بہترین دلچسپ مکانات حاصل کرے۔ اس کے برعکس کافر کے لیے موت ایسی ہے، جیسے لباس فاخرہ اتار لیا جائے اور بہترین مرغوب طبع مکانات سے نکال کر ان کے عوض بہت گندا اور درشت لباس پہنایا جائے اور سخت وحشت ناک مکان میں قیام اور دردناک عذاب میں مبتلا کیا جائے۔ امام پنجم حضرت باقر العلوم علیہ السلام نے

دیتے ہوئے فرمایا: فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ (سورۃ البقرۃ:۹۴) تم اگر اپنے دعویٰ محبّت میں سچے ہو تو موت کی خواہش کرو۔ یہی وجہ ہے کہ جن کو اپنی حقانیت وصداقت اور دارِ آخرت کی آبادی وشادابی کا یقین کامل تھا، وہ موت سے ڈرنے کی بجائے موت سے کھیلا کرتے تھے۔ اور اکثر وبیشتر جنگ میں زرہ بھی استعمال نہ فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب امام الصدیقینؑ جنگ صفّین میں بغیر زرہ کے میدانِ کارزار میں تشریف لے جانے لگے تو کسی نے عرض کیا: آقائے نامدار! یہ بھی لڑنے کا کوئی طریقہ ہے؟ یہ سُن کر جنابؑ نے فرمایا: "و الله لا بن ابی طالب لانس بالموت من الطفل بثدی امه"۔ بخدا ابوطالبؑ کا بیٹا اس سے زیادہ موت سے مانوس ہے جتنا بچہ اپنی ماں کے سینہ سے

ما الموت قال هو النوم الذی یاتیکم فی کل لیلة الا انه طویل مدته لا ینتبه منه الا یوم القیمة فمن رأی فی منامه من اصناف الفرح ما لا یقادر قدره و من رأی فی نومه من اصناف الاهوال ما لا یقادر قدره

کسی شخص کے سوال پر کہ موت کیا چیز ہے؟ فرمایا: موت نیند کی مانند ہے، جو ہر رات تم کو آتی ہے مگر اس کی مدت اتنی لمبی ہے کہ موت کی نیند سونے والا قیامت سے پہلے بیدار نہیں ہوگا۔ تم میں سے بعض لوگوں کو خواب میں مختلف خوش کن چیزیں دیکھنے سے اس قدر فرحت و شادمانی حاصل ہوتی ہے جو تمھارے اندازے سے باہر ہے۔ اور بعض کو مختلف ہولناک چیزوں کے مشاہدہ کرنے سے اس قدر رنج والم حاصل ہوتا ہے جس کا وہ اندازہ نہیں کر سکتے۔

مانوس ہوتا ہے۔ (نہج البلاغہ) یہی وجہ ہے کہ جب شقی ازلی ابن ملجم مرادی نے قاتلانہ وار کیا تو پہلا جملہ جو دہن اقدس امامؑ سے نکلا جو آج تک سینہ تاریخ میں محفوظ ہے، یہ تھا: "بسم اللہ و باللہ علی ملة رسول اللہ فزت برب الکعبة" رب کعبہ کی قسم میں آج اپنے مقصد میں کامیاب و کامران ہوگیا۔ (تاسع بحار الانوار) حضرت امیر علیہ السلام تو پھر بھی بزرگ تھے، تلخ و شیریں چشیدہ تھے۔ امام تھے، مگر تاریخ شاہد ہے کہ اس مقدس خاندان کے تو خورد سال بچوں کا بھی یہ عالم تھا کہ وہ موت کو شہد سے زیادہ شیریں جانتے تھے۔ چنانچہ روز عاشورا جب شہزادہ قاسم نے میدانِ کارزار میں جانے کے لیے اپنے عم نامدار سرکار سید الشہداء علیہ السلام سے اذنِ جہاد طلب کیا تو جناب نے امتحاناً پوچھا: "بنی کیف عندك الموت؟" بیٹا قاسم! موت تمھارے نزدیک کیسی ہے؟ عرض کیا: عم محترم! "احلیٰ من العسل"۔ شہد سے زیادہ شیریں معلوم ہوتی ہے۔ (عاشر بحار الانوار)

عام لوگوں کے موت سے خائف ہونے کی وجہ

لیکن ہم ہیں کہ موت کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں اور اس سے حد درجہ گھبراتے ہیں۔ اس کی وجہ وہی ہے جو متن رسالہ میں حضرت ابوذرؓ کی زبانی مذکور ہے کہ ہم نے اپنی دنیا کو آباد اور آخرت کو خراب کر رکھا ہے۔ اس لیے آبادی کو چھوڑ کر خرابی کی طرف منتقل ہونے کو جی نہیں چاہتا۔ اسی جواب سے ملتا جلتا لیکن اس سے بھی زیادہ لطیف جواب باصواب وہ ہے جو سرکار سید الشہداءؑ نے اس شخص کو دیا تھا جس نے آپؑ سے یہ سوال کیا تھا کہ: "مالنا نکرہ الموت و انتم لا تکرھونه"۔ آقا! اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم لوگ موت سے گھبراتے ہیں لیکن آپ نہیں گھبراتے۔ آپؑ نے فرمایا:

"لانکم عمرتم منازلکم هذه و خربتم تلك المنازل فلا تحبون الانتقال من عمران الی

فکیف حال من فرح فی الموت و وجل فیه هذا هو الموت فاستعدواله و قیل للصادقؑ صف لنا الموت فقالؑ هو للمؤمن کاطیب ریح یشمه فینعس بطیبه فینقطع التعب و الالم کله عنه و للکافر کلسع الافاعی و لدغ العقارب و اشد قیل له فان قوما یقولون هو اشد من نشر بالمناشیر و قرض بالمقاریض و رضخ بالحجارة و تدویر قطب الارحیة فی الاحداق فقالؑ کذلك هو علی بعض الکافرین و الفاجرین الا ترون ان منهم من یعاین تلك الشدائد فـذلك الذی هو اشد من عذاب الدنیا

تم خود ہی اندازہ لگاؤ کہ موت کے وقت جب کہ حقیقی ثواب یا عذاب کا سامنا ہوگا تو اس وقت مرنے والے کی خوشی یا اس کی غمی کی کیا کیفیت ہوگی؟ یہ موت ہے تم اس کے لیے تیار ہو جاؤ۔ حضرت صادق علیہ السلام سے موت کے متعلق سوال کیا گیا کہ موت کی کیفیت بیان فرمائیے۔ آپؑ نے فرمایا کہ مومن کے لیے موت بہترین خوشبو کی مانند ہے جس کی عطر بیز ہوا کے سونگھنے سے انسان سو جاتا ہے اور اس کی تمام تکان و تکلیف یکسر ختم ہو جاتی ہے اور کافروں کے لیے موت ایسی ہے جیسے کسی کو سانپوں اور بچھوؤں نے کاٹ کھایا ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ حضرتؑ کی خدمت میں کسی نے عرض کیا کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ موت کی شدت آروں سے چیرنے اور قینچیوں سے کترنے، پتھر سے کوٹنے اور آنکھوں میں چکی کی کلی گھمانے سے بھی زیادہ سخت ہے۔ فرمایا: ہاں بعض کافروں اور گنہ گاروں کی حالت موت کے وقت ایسی ہی ہوتی ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ان میں سے بعض اس حالت کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں اور جھیلتے ہیں۔ پس یہ موت ان کے لیے دنیوی عذاب سے بھی زیادہ سخت ہوتی ہے۔ حضرت سے پوچھا گیا: اس کا

خراب و اما نحن فنقلنا کل ما عندنا من الاثاث الی تلك الدار نخربنا هذه و عمرنا تلك فنحن نحب الانتقال من خراب الی عمران"

اس کی وجہ یہ ہے کہ تم لوگوں نے اپنے دنیوی منازل کو تو آباد کر رکھا ہے لیکن اخروی گھروں کو خراب و برباد کر دیا ہے۔ اس لیے تم آباد جگہ کو چھوڑ کر خرابہ کی طرف منتقل ہونا پسند نہیں کرتے۔ لیکن ہمارا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ کیونکہ جو کچھ ہمارے پاس اثاثہ البیت تھا وہ سب ہم نے اس گھر (آخرت) کی طرف منتقل کر دیا ہے۔ اس طرح ہم نے اس دارِ دنیا کو تو خراب کر دیا ہے لیکن دارِ آخرت کو آباد و شاداب بنا دیا ہے۔ اس لیے ہم اس خرابہ سے آباد کی طرف منتقل ہونا پسند کرتے ہیں۔ (انوارِ نعمانیہ)

قیل له فمالنا فری کافرا یسھل علیه النزع فینطفی و ھو یتحدث و فیضحك و یتکلم و فی المومنین من یکون ایضا کك و فی المومنین و الکافرین من یقاسی عند سکرات الموت ھذه الشدائد فقالؑ ما کان من راحة للمومنین فھو من عاجل ثوابه و ما کان من شدة فھو تمحیصه من ذنوبه لیرد الی الاخرة نقیا طاھرا نظیفا مستحقا لثواب الله لیس له مانع دونه و ما کان ھناك من سھولة علی الکافرین فلیستوفی اجر حسناته فی الدنیا لیرد الی الأخرة و لیس له الا ما یوجب علیه العذاب و ما کان من شدة علی الکافرین ھناك فھو ابتدا عقاب الله عند نفاد حسناته ذلك بان الله عزو جل عدل لا یجور و دخل موسی بن جعفر علی رجل و قد غرق

کیا سبب ہے کہ بعض کفار پر بوقت مرگ جانکنی آسان ہو جاتی ہے۔ اور وہ نہایت خوشی و خرمی کی حالت میں باتیں کرتے اور ہنستے ہوئے مر جاتے ہیں۔ اور بعض مومنین کی بھی اسی طرح موت واقع ہوتی ہے۔ مگر اس کے برعکس کچھ مومن اور کچھ کافر نزع کے وقت موت کے شدائد سے دوچار ہوتے ہیں۔ آنجنابؑ نے فرمایا: جن مومنین کو جانکنی کے وقت راحت نصیب ہوتی ہے، ان کا ثواب جلد اسی دنیا میں شروع ہو جاتا ہے اور جن مومنین کو بوقت نزع شدت و تکلیف ہوتی ہے وہ ان کو گناہوں سے پاک کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ تاکہ بروز حشر صاف ستھرے اور طیب و طاہر اور مستحق ثواب خدا ہو کر اس طرح آخرت میں وارد ہوں کہ حصولِ ثواب میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ اور بعض کافروں پر بوقت مرگ جو سہولت و آسانی ہوتی ہے تو یہ اس کی دنیاوی نیکیوں کا (عادل حقیقی کی طرف سے) بدلہ ہے۔ تاکہ جب عرصہ قیامت میں آئے تو اپنے عقائد و اعمال سیئہ کی وجہ سے سوائے عذابِ الٰہی کے اور کسی چیز کا حقدار نہ ہو۔ اور عند الموت جن کفار پر شدت و سختی ہوتی ہے اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ چونکہ انھوں نے اپنے اعمال خیر کا بدلہ دنیا میں ہی حاصل کر لیا ہوتا ہے۔ اس لیے ان پر عذابِ خداوندی کی ابتدا یہیں سے ہو جاتی ہے۔ اور یہ اس وجہ سے ہے کہ خداوند کریم عادل ہے، وہ کسی پر ظلم و ستم نہیں کرتا۔ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام ایک ایسے شخص کے پاس تشریف لے گئے جو

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی کسی شخص نے یہی سوال کیا تھا کہ کیا وجہ ہے میں موت سے گھبراتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: "لك مال؟" کیا تمھارے پاس کچھ مال بھی ہے؟ اس نے عرض کیا: ہاں! فرمایا: "اقدمته امامك؟" ۔ آیا تو نے اسے اپنے آگے بھیج دیا ہے؟ اس نے عرض کیا: نہیں۔ فرمایا: "فمن ثم لاتحب الموت" ۔ اس موت سے گھبرانے کی یہی وجہ ہے۔ (بحار الانوار ۳)

فی سکرات الموت و هو لایجیب داعیا فقالوا له یابن رسول الله و ددنا لو عرفنا کیف حال صاحبنا و کیف الموت فقال ان الموت هو المصفی یصفی المومنین من الذنوب فیکون أخر الم یصیبهم و کفارة اخرو زرعلیهم و یصفی الکافرین من حسناتهم فیکون أخر لذة او نعمة او راحة تلحقهم و هو أخر ثواب حسنة لهم و اما صاحبکم فقد نخل من الذنوب نخلا و صفی من الاثام تصفیة و خلص حتی نقی کما ینقی الثوب من الوسخ و صلح لمعاشرتنا اهل البیت فی دارنا دارا لا بد و مرض رجل من اصحاب الرضاء فعاده الرضا فقال له کیف تجدك فقال لقیت الموت بعدك یرید به ما لقیه من شدة مرضه فقال له کیف لقیته فقال الما شدیدا فقال له ما لقیته و لکن لقیت ما ینذرك و یعرفك

موت وحیات کی کش مکش میں مبتلا اور سکراتِ موت کے پسینہ میں شرابور ہو رہا تھا، اور کسی بلانے والے کو جواب نہ دیتا تھا۔ کچھ حضرات نے امام علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا: اے فرزند رسولؐ! ہم چاہتے ہیں کہ اپنے ساتھی کی موجودہ حالت اور موت کی کیفیت معلوم کریں ۔ جنابؑ نے فرمایا: موت صاف کرنے والی ہے مومنوں کو گناہوں سے پاک و صاف کرتی ہے۔ یہ مومنین کے لیے آخری تکلیف ہے جو ان کو پہنچتی ہے۔ اور ان کے آخری گناہ کا کفارہ ہے اور یہی موت کافروں کو نیکیوں سے صاف اور تہی دامن کر دیتی ہے۔ اور یہ ان کے واسطے آخری عمل خیر کی آخری جزا ہے۔ پھر فرمایا: یہ تمھارا دوست گناہوں سے اس طرح پاک ہوگیا ہے جس طرح پاک ہونے کا حق ہے۔ اور تمام گناہوں کی آلائش سے اس طرح صاف ہوگیا ہے جس طرح کپڑا میل کچیل سے پاک و صاف ہوجاتا ہے اور اب ہم اہلِ بیتؑ کے ساتھ ہمارے دارالابد میں دائمی زندگی گزارنے کے قابل ہو چکا ہے۔ حضرت ثامن الائمہ امام رضا علیہ السلام کے اصحاب میں سے ایک بار ایک آدمی بیمار ہوگیا۔ آنجنابؑ اس کے پاس بیمار پرسی کے لیے تشریف لے گئے اور دریافت فرمایا: اپنے تئیں کس طرح پاتے ہو؟...... بیمار نے عرض کیا: حضورؑ! میں تو آپ کے بعد قریب قریب مر ہی چکا تھا۔ شدت مرض کا بیان مقصود تھا۔ فرمایا: آخر تو نے کس طرح موت کا مُنھ دیکھا ہے؟ اس نے عرض کیا کہ مجھے بہت ہی سخت رنج والم کا سامنا ہوا۔

موت کے لیے اِستعداد و آمادگی کیونکر حاصل ہوتی ہے؟

دعا ہے کہ خلاقِ عالم ہمیں موت کے لیے مُستعد و آمادہ ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور یہ استعداد یونہی حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے لیے کچھ کرنا بھی پڑتا ہے۔ چنانچہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے

بعض حالہ انما الناس رجلان مستریح بالموت و ستراح بہ فجدد الایمان باللہ و النبوۃ و الولایۃ تکن مستریحا ففعل الرجل ذلک و الحدیث طویل اخذنا منہ موضع الحاجۃ و قیل لمحمد بن علی بن موسی الرضا مابال ھؤلاء المسلمین یکرھون الموت فقال لانھم جھلوہ فکرھوہ و لو عرفوہ و کانوا من اولیاء اللہ حقا لا حبوہ و لیعلموا ان الاخرۃ خیرلھم من الدنیا ثم قال یا عبداللہ ما بال الصبی و المجنون یمتنعان من الدواء المنقی لبدنہ و النافی للالم عنہ فقال لجھلھم بنفع الدواء قال و الذی بعث محمدا بالحق نبیا ان من قد استعد للموت حق الاستعداد فھو انفع لھم من ھذا الدواء لھذا المعالج اما انھم لو عرفوا ما یؤدی الیہ الموت

امام علیہ السلام نے فرمایا وہ کیفیت جو تم پر گزری ہے وہ موت نہ تھی بلکہ ایک ایسی حالت تھی جس نے تمھیں موت سے ڈرایا، اس کی حالت کی کچھ معرفی کرائی ۔ پھر فرمایا: انسان دو طرح کے ہوتے ہیں ۔ ایک تو وہ جو موت کی وجہ سے راحت پاتے ہیں، دوسرے وہ جن کے مرنے سے دوسرے لوگ آرام حاصل کرتے ہیں ۔ اب تم توحید و رسالت اور ہماری ولایت کا اقرار کر کے تجدید عہد کر لو، تاکہ تمھیں راحت نصیب ہو۔ پس اس شخص نے ایسا ہی کیا۔ یہ حدیث بہت لمبی تھی ۔ ہم نے بقدر ضرورت اس کا کچھ حصّہ یہاں درج کر دیا ہے ۔ حضرت امام محمد تقی علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ ان مُسلمانوں کو کیا ہو گیا ہے جو موت کو ناپسند کرتے ہیں؟ حضرت نے فرمایا: چونکہ یہ لوگ موت کی حقیقت سے ناواقف ہیں اس لیے اس سے کراہت کرتے ہیں ۔ اگر یہ موت کی حقیقت سے آگاہ ہوتے اور خدا کے سچے دوست بھی ہوتے، تو ضرور موت کو پسند کرتے اور ان کو یقین ہو جاتا کہ آخرت ان کے لیے دنیا سے بہتر ہے ۔ پھر فرمایا: اے بندۂ خدا! کیا وجہ ہے کہ بچے اور دیوانے لوگ دوا نہیں پیتے؟ حالانکہ یہ دوا ان کے بدن کا تنقیہ و تطہیر اور بیماری کو ان سے دور و کافور کرتی ہے۔ سائل نے عرض کیا: اس لیے کہ یہ دوا کے نفع و فائدہ سے ناواقف ہیں ۔ آنجنابؑ نے فرمایا: مجھے قسم ہے اس پروردگار عالم کی جس نے جناب محمد مصطفیٰ ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث برسالت کیا ہے کہ جو شخص موت کے لیے کما حقہٗ مُستعد و آمادہ ہو تو موت اس کے لیے اس دوا سے بھی زیادہ

دریافت کیا گیا کہ موت کے لیے کس طرح استعداد حاصل ہوتی ہے؟ فرمایا: "اداء الفرائض و اجتناب المحارم و الاشتمال علی المکارم ثم لا یبالی اوقع علی الموت وقع الموت علیہ"۔ (کتاب درّۂ باہرہ

من النعم لاستدعوہ و احبوہ اشد مما یستدعی العاقل الحازم الدواء لدفع الافات و اجتلاب السلامات و دخل علی بن محمد علی مریض من اصحابہ و ھو یبکی و یجزع من الموت فقال لہ یا عبد اللہ تخاف من الموت لانک لا تعرفہ ارأیتک اذا اتسخت ثیابک و تقذرت فتاذیت من کثرۃ القذر و الوسخ علیک و اصابک قروح وجرب و علمت ان الغسل فی الحمام یزیل عنک ذلک کلہ اما ترید ان تدخلہ

سود مند ثابت ہوتی ہے جو بیمار مذکور کے لیے مُفید ہوتی ہے ۔ اگر ان لوگوں کو اس بات کا علم ہوتا کہ موت کی تمنا کرتے اور جس طرح ایک عقلمند مریض اپنے جسم کی سلامتی اور امراض کے دفعیہ کے لیے دوا کی خواہش کرتا ہے ۔ یہ لوگ اس سے بھی زیادہ موت کو چاہتے ۔ حضرت امام علی نقی علیہ السلام اپنے ایک صحابی کے پاس اس وقت تشریف لے گئے جب کہ وہ موت کی دہشت ناک حالت کو دیکھ کر رو رہا تھا ۔ امامؑ نے یہ کیفیت دیکھ کر اس صحابی سے فرمایا: اے بندۂ خدا! تو موت سے صرف اس لیے ڈر رہا ہے کہ تو اس کی حقیقت سے واقف نہیں ہے ۔ تمھارا کیا خیال ہے جب تمھارا لباس میلا کچیلا ہو جائے اور تمھیں اس کی نجاست و کثافت سے تکلیف محسوس ہونے لگے، اور اسی گندگی و غلاظت کی وجہ سے زخم اور خارش کی تکلیف میں مبتلا ہو جاؤ، اور تمھیں اس بات کا علم بھی ہو کہ حمام میں غسل کرنے سے ان تمام مُصیبتوں سے نجات مل جائے گی ۔ تو کیا تم اس وقت اس بات کو پسند نہیں کرو گے کہ اس میں جا کر

بحوالہ ثالث بحار) فرائض دینیّہ ادا کرنے ، محرماتِ شرعیہ سے اجتناب کرنے اور مکارم اخلاق حاصل کرنے سے، جب یہ تینوں امور حاصل ہو جائیں تو پھر انسان کو کوئی پروا نہیں کرنی چاہیے کہ وہ موت پر جا گرے یا موت اس پر آ گرے ۔

رزقنا اللہ الاستعداد للموت

و لما بعد الموت قبل

حلول الفوت بجاہ

النبی و آلہ

الطاہرین

فتغسل فیزول ذلك عنك و ما تكرہ ان لا تدخله فیبقی ذلك علیك فقال بلیٰ یابن رسول اللہ تعالیٰ قال ذلك الموت هو ذلك الحمام و هو آخر ما بقی علیك من تمحیص ذنوبك و تنقیتك من سیئاتك فاذا انت وردت علیه و جاوزته فقد نجوت من كل غم و هم و اذی و وصلت الی كل سرور و فرح فسكن الرجل و نشط و استسلم و غمض عین نفسه و مضی لسبیله و سئل عن الحسن بن علی العسكری

غسل کرو؟ اور کیا تم اس بات کو ناپسند نہیں کروگے کہ حمام میں نہ جاؤ اور اس مصیبت میں بدستور گرفتار رہو۔ صحابی نے عرض کیا: ہاں فرزند رسول! یقیناً اس حال میں غسل کرنا پسند کروں گا۔ حضرتؑ نے فرمایا: یہ موت اسی حمام کی مانند ہے جو کچھ تمھارے گناہ باقی رہ گئے ہیں، ان سے گلوخلاصی کرانے اور اپنے برے اعمال سے پاک ہونے کا آخری موقع یہی موت ہے۔ تم جب موت کے گھاٹ پر اتروگے اور پھر اس کے پار ہوجاؤگے تو تمھیں ہر رنج والم اور ہر مصیبت وغم سے چھٹکارا مل جائے گا اور ہر طرح کی مسرت و شادمانی اور راحت و اطمینان کے مقام تک پہنچ جاؤگے (امام کا یہ کلام سن کر) اس صحابی کا سب خوف و ہراس زائل ہوگیا اور اس کے اندر فرحت و انبساط کی لہر دوڑ گئی اور مرنے کے لیے سر تسلیم خم کردیا۔ چنانچہ آنکھیں بند کرلیں اور اپنے راستہ پر چل کر (مرحوم ہوگیا) جناب امام حسن عسکری علیہ السلام

دُعائے طولِ حیات کرنے کا طریقہ

ان حقائق سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ علیٰ الاطلاق طولِ عمر کی دعا کرنا مذموم ہے۔ ہاں اعمالِ صالحہ بجالانے اور خدماتِ دینیہ انجام دینے کی غرض سے اور وہ بھی مشروطی طور پر اس طرح کہ جب تک ان اعمالِ صالحہ بجالانے کی توفیق شاملِ حال رہے، اس وقت تک خداوند عالم زندگی عطا کرے اور جب خدا نخواستہ توفیقِ ایزدی سلب ہونے لگے اور انسان قہر و غضبِ الٰہی کا مستوجب قرار پانے لگے تو اس وقت قدرت اپنی بارگاہ میں بلالے۔ جیسا کہ ائمہ اطہارؑ سے اسی قسم کے ادعیہ مُعتبرہ مروی ہیں جن میں بارگاہِ رب العزت میں ہمیں عرض و نیاز کرنے کے طور و طریقے بتلائے گئے ہیں۔ چنانچہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام بارگاہ رب جلیل میں عرض کرتے ہیں: "اللھم عمرنی ما کان عمری بذلة فی طاعتك فاذا كان عمری مرتعا للشیطان فاقبضنی الیك قبل ان یسبق غضبك الی"۔ بارِ الٰہا! جب تک میری زندگی تیری اطاعت میں صرف ہو اس وقت تک مجھے زندہ رکھ اور جب میری

عن الموت ما هو فقال هو التصديق بما لايكون ان ابي حدثني بذلك عن ابيه عن جدی عن الصادقؑ انه قال ان المؤمن اذا مات لم يكن ميتا و ان الكافر هوالميت لان الله عزوجل يقول يخرج الحی من الميت و يخرج الميت من الحی قال جاء رجل النبیؐ فقال يا رسول الله ما لی اکره الموت؟ فقال انك قال؟ قال نعم فقالؐ اقدمته فقال لا قال لا قالؐ فمن ثم

سے سوال کیا گیا کہ موت کیا ہے؟ فرمایا: موت ان چیزوں کی تصدیق کرنے سے عبارت ہے جو ابھی تک وقوع پذیر نہیں ہوئیں ۔ پھر فرمایا: میرے والد محترم نے اپنے آباء و اجداد کے سلسلہ سند سے جناب امام جعفر صادق علیہ السلام کی یہ حدیث مجھ سے بیان کی ہے کہ جب مومن مرتا ہے تو وہ (درحقیقت) مردہ نہیں ہوتا، بلکہ کافر ہی درحقیقت مردہ ہے جیسا کہ کلام الٰہی میں موجود ہے کہ: "خدا وہ ہے جو زندہ کو میت سے اور میت کو زندہ سے پیدا کرتا ہے" (یونس:۳۱) یعنی مومن کو کافر سے اور کافر کو مومن سے پیدا کرتا ہے۔ یہی جناب امام یازدہم علیہ السلام) بیان

زندگی شیطان کی چراگاہ بننے لگے تو فوراً مجھے اپنی بارگاہ میں بلالے، قبل اس کے کہ میں تیرے غضب کا مستحق بنوں ۔ (صحیفہ کاملہ)

اس طرح ان آیات وروایات کے درمیان جمع بھی ہوجاتی ہے جن میں بظاہر اختلاف معلوم ہوتا ہے کہ بعض بارگاہِ ایزدی میں حضوری کی طلب اور موت کی آرزو کرنے پر دلالت کرتی ہیں ۔ اور بعض سے طلبِ موت کی مذمت ظاہر ہوتی ہے ۔ اس جمع بین الروایات کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص زندگی کو محض دنیا اور اس کے لذائذِ فانیہ حاصل کرنے کے لیے محبوب سمجھے اور موت کو مبغوض، تو یہ امر مذموم اور قبیح ہے ۔ لیکن اگر طاعتِ الٰہی بجالانے، خدا کی خوشنودی حاصل کرنے اور سعادتِ اخرویہ کے بکثرت وسائل واسباب مہیا کرنے کی غرض سے عمر دراز طلب کرے تو یہ امر شرعاً مرغوب اور مستحسن ہے۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاۗءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (سورۃ الکھف:۱۱۰)

ایک عام غلط فہمی کا ازالہ اور بیماری کے فوائد

یہاں اس غلط فہمی کا ازالہ کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جس میں اکثر عوام بلکہ بعض خواص بھی مبتلا ہیں ۔ ان کا خیال ہے کہ کسی قسم کی تکلیف کے بغیر اور بغیر بیماری کے جامِ مرگ نوش کرلینا بیمار رہ کر اور تکلیف جھیل کر مرنے سے بہتر ہے ۔ اس لیے وہ ناگہانی موت کو بیماری والی موت پر ترجیح دیتے

لا تحب الموت قال و جاء رجل عند ابی ذرؓ و قال ما لنا نکرہ الموت فقال لانکم عمرتم الدنیا و خربتم الأخرۃ فتکرھون ان تنقلوا من عمران الی خراب و قیل لہ	فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے جناب سرورِ کونین ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: مجھے کیا ہے کہ میں موت کو ناپسند کرتا ہوں۔ جنابؐ نے فرمایا: آیا تیرے پاس کچھ مال و دولت ہے؟ اس نے عرض کیا: ہاں۔ فرمایا: کیا تو نے اسے اپنے آگے بھیج دیا ہے؟ اس نے عرض کیا نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: اسی وجہ سے تو موت کو پسند نہیں کرتا۔ اپنی زندگی میں اس مال کو راہِ خدا میں خرچ کر کے آگے بھیج۔...... انہی جناب سے یہ بھی روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ

ہیں۔ یہ خیال سراسر غلط اور حقائق کے خلاف ہے۔ احادیثِ معصومین علیہم السلام سے اس خیال کی نفی ہوتی ہے۔ اخبار و آثار سے واضح و آشکار ہوتا ہے کہ بیماری بھی خدا کی ایک نعمت ہے جس سے انسان کو کئی ایک فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

اول یہ کہ اکثر اوقات صحیح المزاج آدمی یادِ خدا سے غافل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جب مریض ہوتا ہے تو یادِ خدا تازہ ہو جاتی ہے۔ اور توبہ کرنے کا ایک عمدہ موقع مل جاتا ہے۔ اس لیے احادیث میں مرض کو "بریدا لموت" (موت کا ایلچی) قرار دیا گیا ہے۔

دوم یہ کہ صحت کی حالت میں اکثر و بیشتر انسان وصیت کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، حالانکہ اگر کسی کو کچھ دینا ہے یا کسی سے کچھ لینا ہے، یا حقوق اللہ یا حقوق العباد اس کے ذمہ ہیں تو ان کی ادائیگی کی وصیت واجب و لازم ہوتی ہے۔ اور وصیت کی اس قدر تاکید ہے کہ محدث جزائری نے انوارِ نعمانیہ میں کتاب مُستطاب "روضۃ الواعظین" کے حوالہ سے جناب رسولِ خدا ﷺ کی یہ حدیث نقل کی ہے: "من مات بغیر وصیۃ مات میتۃ جاھلیۃ"۔ فرمایا: جو شخص بغیر وصیت کے مر جائے وہ جہالت کی موت مرتا ہے۔ نیز آپؐ کا ارشاد ہے: "لاینبغی لامرء منکم ان یبیت لیلۃ الا و وصیتہ تحت راسہ" فرمایا: مسلمان آدمی کو چاہیے کہ جب رات کو سوئے تو اس کی وصیت اس کے سر کے نیچے ہو۔ (وسائل الشیعہ) ظاہر ہے کہ ناگہانی موت میں اکثر اوقات انسان وصیت کرنے سے محروم رہ جاتا ہے۔

سوم یہ کہ مرض کی وجہ سے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ اور درجات کی بلندی کے اسباب مہیا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ روایت میں ہے کہ ایک دن کا بخار ایک سال کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا

كيف ترى قدومنا على الله تعالىٰ فقال اما المحسن فكالغائب يقدم على اهله و اما المسئ	ہم لوگ موت کو ناپسند کرتے ہیں؟ جناب ابوذرؓ نے فرمایا: اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے دنیا کو تو آباد و شاداب مگر آخرت کو برباد کر رکھا ہے، اس لیے آبادی کو چھوڑ کر بربادی کی طرف جانا تم پسند نہیں کرتے۔ کسی اور شخص نے عرض کیا کہ آپؓ کے خیال میں ہمارا اس وقت کیا حال ہوگا جب ہم خدا

ہے۔ اور جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: ایک رات کے بخار کا ثواب ایک سال کی عبادت کے برابر ہے۔ دو رات کے بخار کا ثواب دو سال کی عبادت کے برابر، اور تین رات کے بخار کا اجر ستر سال کی عبادت کے برابر ہے۔ (انوارِ نعمانیہ) ظاہر ہے کہ ناگہانی موت مرنے والا اس سعادت سے بھی محروم ہوتا ہے۔

چہارم یہ کہ مرض کی وجہ سے عیادت اور بیمار پرسی کرنے والوں کو بھی اجر و ثواب حاصل کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ چنانچہ جناب رسولِ خدا ﷺ سے مروی ہے، فرمایا: جب کوئی شخص کسی بندۂ مومن کی مزاج پرسی کرنے کے لیے گھر سے نکلتا ہے تو اس کے ہر ہر قدم پر ہزار ہزار نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور ستر ستر ہزار برائیاں محو کی جاتی ہیں۔ (انوارِ نعمانیہ) لیکن ناگہانی موت مرنے والے کے بارہ میں لوگ اس شرف سے بھی محروم رہتے ہیں۔ الی غیر ذلک من الفوائد الکثیرۃ۔ یہی وجہ ہے کہ اخبار و ادعیہ میں ناگہانی موت سے پناہ مانگی گئی ہے۔ اللھم انی اعوذبک من الموت الفجائۃ اعاذنا اللہ منہ۔

افادۂ جدیدہ

بعض اخبار و آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیٰ نبینا و آلہ و علیہ السلام کے زمانہ سے پہلے بیماری نہ تھی۔ لوگ اچانک مرجاتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بارگاہِ رب العزت میں دعا کی کہ بارالہا! کوئی ایسی علامت مقرر فرما جس سے مرنے والے کو بھی فائدہ ہو، اور پس ماندگان کو بھی تسلی ہو، اس وقت خداوند عالم نے بیماری مقرر کی۔ (اصول کافی)

پس ثابت ہوا کہ بیماری وہ چیز ہے کہ جسے انبیاء علیہم السلام نے مُنعم حقیقی سے بذریعہ دعا مانگ کر حاصل کیا ہے۔ لہٰذا مومن کو اس سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ اور نہ اس پر شکوہ و شکایت کرنا چاہیے، بلکہ صبر و شکیبائی سے کام لینا چاہیے۔ خداوند عالم چاہتا ہے کہ مومن کو جنّت میں داخل کرے اور چونکہ وہ بعض گناہوں کی لوث میں بھی ملوث ہو چکا ہے اس لیے اس کے بعض گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے اور اگر بالفرض اس سے بھی متجاوز ہوں تو پھر فشار قبر ان کا کفارہ قرار پاتا ہے اور اگر خدا نخواستہ اس

فکالابق یقدم علی مولاہ و ھو منه خائف قیل فکیف تری حالنا عند اللہ قال اعرضوا اعمالکم علی کتاب اللہ تعالیٰ حیث یقول	کے حضور میں حاضر کیے جائیں گے ۔ جناب نے فرمایا: پرہیزگار لوگ تو اسی طرح حاضر ہوں گے جس طرح ایک مسافر خوش وخرم ہوکر اپنے اہل و عیال کی طرف واپس آتا ہے لیکن بدکار اس طرح حاضر کیے جائیں گے جس طرح ایک بھگوڑا غلام اپنے آقا کے حضور میں خوف وہراس کی حالت میں حاضر ہوتا ہے ۔عرض کیا گیا آپ کے خیال میں خدا کے حضور ہمارا کیا حال ہوگا؟ فرمایا: تم اپنے اعمال کو قرآن پر پیش کرو۔ خدا فرماتا ہے

سے بھی زائد ہوں تو پھر عالم برزخ کے شدائد بھی کفارہ بن جاتے ہیں تاکہ قیامت کو پاک و صاف ہوکر داخل جنّت ہو سکے ۔اور اگر برزخ کے شدائد بھی کفارہ نہ بن سکیں تو قیامت کو جناب شفیع امتؐ اور ائمہ طاہرینؑ علیہم السلام کی شفاعتِ کبریٰ سے سب داغِ عصیاں دھل جائیں گے ۔

رزقنا اللہ شفاعتہم فی الدنیا و الأخرۃ و سھل علینا سکرات الموت و شدائد القبر و البرزخ بجاہ النبی و آلہ الطاھرین صلوات اللہ علیہم اجمعین

نینداور موت میں مشابہت

حکماء ربانیین یعنی ائمہ طاہرینؑ نے محض اس خیال کے پیش نظر کہ ہم موت سے خوف وہراس کرنا چھوڑدیں اور اس کے لیے ہر وقت مُستعد و آمادہ رہیں مختلف طریقوں سے موت کو بالکل آسان کرکے ہمارے سامنے پیش کیا ہے ۔ اس سلسلہ میں متن رسالہ میں مُتعدّد روایات موجود ہیں مگر بالخصوص جناب امام محمد باقر علیہ السلام نے موت کو النوم (نیند) کہہ کر موت اور نیند کے درمیان بڑی بلیغ تشبیہ قائم کی ہے ۔ اس کی بقدر ضرورت تفصیل یہ ہے کہ روح کو اپنے جسم کے ساتھ دو قسم کا تعلق ہے ایک ادراک و احساس کا دوسرا تدبیر و تصرف کا۔ نیند میں ادراک و احساس والا تعلق ختم ہوجاتا ہے ۔اس لیے آلات تعقل و ادراک اپنے گرد و پیش کے حالات سے بالکل بےخبر ہوجاتے ہیں ۔مگر اس حالت میں روح کا تدبیر و تصرف اور تغذیہ والا تعلق برقرار رہتا ہے، وہ جسم کی نشوونما اور بقا میں برابر مشغول رہتی ہے ۔ اور موت میں یوں ہوتا ہے کہ روح کے یہ دونوں قسم کے تعلق سے منقطع ہوجاتے ہیں، اب نہ ادراک و احساس رہتا ہے ۔ اور نہ تدبیر و تصرف، خلاق عالم نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں ادا فرمایا ہے:

وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ لِيُقْضَىٰ أَجَلٌ مُسَمًّى

ان الابرار لفی نعیم و ان الفجار لفی جحیم قال رجل فاین رحمة الله قال ان رحمة الله قریب من المحسنین

نیکوکار انسان خدا کی نعمتوں میں مسرت کی زندگی بسر کریں گے اور بدکار بندے جہنم میں رہیں گے (انفطار:۱۳) ایک آدمی نے انہی جناب سے دریافت کیا کہ رحمتِ خداوندی کہاں ہوگی؟ فرمایا: رحمتِ الٰہی خدا کے نیکوکار بندوں کے قریب ہوگی۔

"خدا وہی ہے جو تم کو رات کے وقت مارتا ہے۔ اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو۔ اسے جانتا ہے۔ پھر تم کو دن میں جلاتا (بیدار کرتا) ہے، تاکہ مقررہ وقت پورا ہو سکے"۔ (سورۃ الانعام:۶۰)

ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرماتا ہے:

اَللّٰهُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَ الَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا ۚ فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْهَا الْمَوْتَ وَ یُرْسِلُ الْاُخْرٰۤی اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾

خداوند عالم ہی روحوں کو ان کی موت کے وقت وفات دیتا ہے، اور جو نہیں مری ہیں ان کو ان کی نیند کے وقت (وفات دیتا ہے) جس کے متعلق اس نے موت کا فیصلہ کر لیا ہے، اسے روک لیتا ہے۔ اور دوسری روحوں کو ایک وقت مقرر تک چھوڑ دیتا ہے۔ اس میں غور وفکر کرنے والے لوگوں کے لیے قدرتِ کاملہ کی نشانیاں موجود ہیں۔ (سورۃ الزمر:۴۲)

مومن وکافر کی موت میں فرق

جناب امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے مومن وکافر کی موت کے درمیان جو فرق بیان فرمایا ہے یہ تفریق قرآن مجید میں نمایاں ہے۔ اللہ اللہ! موت کا وقت بھی عجیب کش مکش کا وقت ہوتا ہے۔ خصوصاً کفار وعصاۃ کے لیے۔ ان کے گزشتہ اعمال ان کے سامنے موجود ہوتے ہیں۔ ہر عمل کی صورت ان کے سامنے کھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ آنکھوں سے غفلت کا پردہ چاک ہو جاتا ہے۔ فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْیَوْمَ حَدِیْدٌ ﴿۲۲﴾ (سورۃ ق:۲۲)

خداوند عالم نے موت کا نقشہ بدیں الفاظ پیش کیا ہے:

كَلَّاۤ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ ﴿۲۶﴾ وَ قِیْلَ مَنْ ٚ رَاقٍ ﴿۲۷﴾ وَّ ظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿۲۸﴾ وَ الْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿۲۹﴾ اِلٰی رَبِّكَ یَوْمَىِٕذِ ﹰالْمَسَاقُ ﴿۳۰﴾ (سورۃ القیمۃ:۲۶تا۳۰)

جب روح ہنسلی تک آجائے گی اور کہا جائے گا: اس وقت کون ہے جھاڑ پھونک کر کے موت سے بچانے والا اور وہ سمجھے گا کہ یہ جدائی کا وقت ہے۔ اور پنڈلی سے پنڈلی

لپٹ جائے گی۔ وہ وقت تیرے پروردگار کی طرف ہنکائے جانے کا ہوگا۔

برے لوگوں کی موت کی کیفیت خالق موت و حیات نے اس طرح بیان فرمائی ہے:

وَ لَوْ تَرٰۤی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْۤا اَیْدِیْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ وَ كُنْتُمْ عَنْ اٰیٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۹۳﴾ وَ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ تَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ

(سورۃ الانعام: ۹۳و۹۴)

اگر تم دیکھو کہ جب ظالم و گنہگار لوگ شدائد موت میں مبتلا ہوں اور فرشتے ہاتھ کھولے یہ کہہ رہے ہوں اپنی روحوں کو نکالو۔ آج تم کو ذلت و رسوائی والی سزا ملے گی۔ کیونکہ تم خدا کے بارے میں غلط باتیں کرتے تھے۔ اور اس کی آیات سے تکبّر کرتے تھے۔ آج تم ہمارے پاس اسی طرح تنہا آئے ہو جس طرح ہم نے تم کو تنہا پیدا کیا تھا۔ اور جو کچھ مال و اسباب ہم نے تم کو دیا تھا، اسے آج اپنے پیچھے چھوڑ آئے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

وَ لَوْ تَرٰۤی اِذْ یَتَوَفَّی الَّذِیْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ ۚ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ ﴿۵۰﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ﴿۵۱﴾

اور کبھی تو دیکھے جس وقت فرشتے کافروں کی جان قبض کرتے ہیں کہ ان کے مُنھ اور پیٹھ پر مارتے ہیں اور کہتے ہیں جلنے کے عذاب کا ذائقہ چکھو۔ یہ تمھارے ہاتھوں کے کرتوتوں کا بدلہ ہے۔ خدا اپنے بندوں پر ہرگز ظلم و ستم نہیں کرتا۔ (الانفال: ۵۰ و ۵۱)

نیک لوگوں کی موت کا نقشہ اس سے بالکل علیحدہ ہے۔ ان کو بوقتِ مرگ جنّتِ نعیم کی بشارتیں سنائی جاتی ہیں۔ اور ہر طرف شادمانی کے اسباب نظر آتے ہیں۔ ارشادِ قدرت ہوتا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۰﴾ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ ۚ وَ لَكُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْۤ اَنْفُسُكُمْ وَ لَكُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴿۳۱﴾ (سورۃ حٰمٓ السجدۃ: ۳۰ و ۳۱)

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

فَلَوْلَاۤ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ﴿۸۳﴾ وَ اَنْتُمْ حِیْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْكُمْ وَ لٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ فَلَوْلَاۤ اِنْ كُنْتُمْ غَیْرَ مَدِیْنِیْنَ ﴿۸۶﴾ تَرْجِعُوْنَهَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۸۷﴾ فَاَمَّاۤ اِنْ كَانَ مِنَ

الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۸۸﴾ فَرَوْحٌ وَّ رَيْحَانٌ ۙ۬ وَّ جَنَّتُ نَعِيْمٍ ﴿۸۹﴾ وَ اَمَّاۤ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿۹۰﴾ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿۹۱﴾ (سورۃ الواقعۃ: ۸۳ تا ۹۱)

تو کیا جب جان گلے تک آپہنچتی ہے اور تم اس وقت (کی حالت) پڑے دیکھا کرتے ہو، اور ہم اس (مرنے والے) سے تم سے بھی زیادہ نزدیک ہوتے ہیں۔ لیکن تم کو دکھائی نہیں دیتا تو اگر تم کسی کے دباؤ میں نہیں ہو تو اگر (اپنے دعوے میں) تم سچے ہو تو روح کو پھیر کیوں نہیں دیتے۔ پس اگر وہ (مرنے والا خدا کے) مقربین میں سے ہے تو اس کے لیے آرام و آسائش ہے اور خوشبودار پھول اور نعمت کے باغ اور اگر وہ داہنے ہاتھ والوں میں سے ہے تو اس سے کہا جائے گا کہ تم پر داہنے ہاتھ والوں کی طرف سے سلام ہو، اسی لیے مومن خوش ہو کر عروسِ موت سے بغلگیر ہو جاتا ہے۔

؎ نشانِ مردِ مومن با تو گویم چو مرگ آید تبسّم بر لبِ او

ایقاظ و تنبیہ

اس باب کی ابتداء میں بسلسلہ کیفیّتِ موت حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام کا جو کلام حقیقت ترجمان موجود ہے وہ قواصم ظہور میں سے ہے۔ اور ان لوگوں کو جو خوابِ غفلت میں سوئے ہوئے ہیں اور زبانی دعوائے محبّت اہل بیت کر کے بغیر اس کے کہ ان کی اطاعت و فرمانبرداری کریں، اپنی اخروی نجات کے خواب دیکھتے ہیں، کو جھنجوڑ کر بیدار کر رہا ہے۔ آنجنابؑ نے تمام لوگوں کو تین گروہوں میں تقسیم فرما دیا ہے کہ بعض وہ ہیں جن کو موت کے وقت نعیم ابدی کی بشارت دی جاتی ہے، اور کچھ وہ ہیں کہ جن کو دائمی عذاب کی نذارت کی جاتی ہے۔ اور بعض وہ ہیں جن کا معاملہ مجمل و مبہم ہوتا ہے۔ نہ معلوم انجام کیا ہو۔ پھر آنجنابؑ واضح الفاظ میں ارشاد فرما رہے ہیں کہ نعیم ابدی کی بشارت کے لیے دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک ولایت اہل بیتؑ، دوسری اطاعتِ اہل بیتؑ۔ بلکہ اگر بنظر غائر حقائق کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ ولایت اہل بیتؑ بلا اطاعتِ اہل بیتؑ کے متحقق ہو ہی نہیں سکتی۔ جیسا کہ اصول کافی میں حضرت باقر العلوم علیہ السلام کا یہ فرمان موجود ہے: "لا تنال و لایتنا الا بالعمل و الورع"۔ ہماری ولایت عمل صالح اور حرام سے اجتناب کیے بغیر حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔ ؎

تعصی الا له و انت تظهر هـذا محال فی القياس بديع

لو كان حبك صادقًا لاطعته ان المحب لمن يحب مطيع

پھر یہ امر بھی بلا کسی اجمال وابہام کے بیان فرمادیا ہے کہ جو لوگ اہل بیتؑ کے دشمن اور ان کے احکام کے مخالف ہیں، وہ ابدی عذاب وعقاب میں مبتلا ہوں گے۔ ان کی نجات کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔

اسی طرح جناب امیر المومنین علیہ السلام نے ان خوش عقیدہ اور فریب خوردہ لوگوں کے ڈھول کا پول بھی کھول کے رکھ دیا ہے جو ائمہ اہل بیتؑ کی اطاعت وفرمانبرداری اور ان کی تاسّی وطاعت گزاری کے بغیر فقط زبانی جمع خرچ کرتے ہوئے علیؑ علیؑ کر کے سیدھے جنّت جانا چاہتے ہیں۔ حضرت سید الموحدینؑ نے واضح فرمادیا ہے کہ ایسے لوگوں میں اور دشمنانِ اہل بیت میں یہ فرق ہے کہ مخالفین مخلد فی النار ہوں گے اور یہ لوگ مخلد فی النار نہ ہوں گے۔ شفاعت اہل بیتؑ کی وجہ سے داخل جنّت ضرور ہوں گے۔ مگر اپنے اپنے گناہوں کی مقدار کے مطابق آتشِ دوزخ میں ان کی تطہیر ضرور کی جائے گی۔ حتی کہ کچھ بدعمل ایسے بھی ہوں گے جو تین تین لاکھ سال تک گرفتارِ عذاب رہنے کے بعد شفاعتِ اہل بیتؑ کا اِستحقاق پیدا کریں گے۔ الامان والحفیظ۔

ان امور کی مزید وضاحت باب شفاعت میں کی جائے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ ان حقائق کی روشنی میں ایسے لوگوں کا فرض ہے جو اس قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں کہ وہ اپنے نظریہ پر نظر ثانی کریں۔ اور فقط زبانی دعوی محبت اہل بیتؑ پر اعتماد و بھروسا کر کے عقائد واخلاق اور اعمال میں ان کی اطاعت وفرمانبرداری کرنے میں کوتاہی نہ کریں۔ کیونکہ افعال واقوال میں اہل بیت نبوّتؑ کی پیروی کے بغیر ہرگز ایمان کامل نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں ایمان کے ساتھ عمل کو توام بیان کیا گیا ہے۔ اور جہاں کہیں بھی جنّت یا ثواب کی بشارت دی گئی ہے وہاں ایمان کے ساتھ عمل صالح کی قید ضرور لگائی گئی ہے۔ "الذین اٰمنوا و عملوا الصالحات"...... "ان الذین اٰمنوا و عملوا الصالحات" کی بار بار تکرار نظر آتی ہے۔ سچ ہے:

عمل سے زندگی بنتی ہے، جنّت بھی، جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے، نہ ناری ہے

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: "شیعتنا من تابعنا فی افعالنا و لم یخالفنا"۔ ہمارے شیعہ وہ ہیں جو ہماری متابعت وپیروی کرتے ہیں اور ہماری مخالفت نہیں کرتے۔ (محاسن برقی)

ان الذین اٰمنوا و عملوا الصّٰلحٰت طوبیٰ لھم و حسن مآب

تتمۂ مُہمہ

درحضور ائمہؑ عندالاختصار

مخفی نہ رہے کہ من جملہ ان اعتقادات حقہ کے جن میں حضرات شیعہ خیر البریہ مُتفرد ہیں، یہ ہے کہ ہر مرنے والے کو خواہ نیک ہو یا بد۔ اور خواہ مُسلمان ہو یا کافر و منافق، جناب رسولِ خدا اور ائمہؑ ہدیٰ کی زیارت ہوتی ہے۔ ان کی زیارت سے اہل ایمان کے شدائد و مصائب، موت میں سہولت و آسانی اور اہل کفر وعناد کے شدائد میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس عقیدہ کی صورت پر اخبار متظافرہ و مُعتبرہ موجود ہیں، جن کی کافی مقدار "ثالث بحار الانوار" میں جمع کر دی گئی ہے، جن کے انکار یا تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ آیا حضرات معصومینؑ اپنے مراکز پر تشریف فرما ہوتے ہیں اور ہر مرنے والا یہ خیال کرتا ہے کہ وہ میرے پاس موجود ہیں۔ جس طرح آفتاب اپنے محور پر ہوتا ہے اور ہر شخص یہ خیال کرتا ہے کہ وہ میرے سر پر ہے، یا خود بنفسِ نفیس مرنے والے کے پاس تشریف لاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمیں غور وفکر کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ اجمالی ایمان کافی ہے۔ جیسا کہ غواص بحار الاخبار سرکار علامہ مجلسیؒ نے اپنے "رسالہ لیلیہ اعتقادیہ" میں ارشاد فرمایا ہے:

"ثم اعلم انه يجب الاقرار بحضور النبي و الائمة الاثنا عشر عليهم السلام عند موت الابرار و الفجار و المومنين و الكفار فينفعون المومنين بشفاعتهم في تسهيل غمرات الموت و سكراته عليهم و تشددون على المنافقين و اهل البيت عليهم السلام الى ان قال و يجب الاقرار به مجملا و التفكر في كيفيته انك انهم يحضرون في اجساده الاصلية او امثالية او بغير ذلك و لا يجوز التاويل بالعلم و انتقا الصور في القوى الخيالة فاز تحريف لما ثبت في الدين و تضيع لعقائد المومنين"

یعنی ہر نیک و بد اور مومن و کافر کی موت کے وقت جناب رسولِ خداؐ و ائمہؑ ہدیٰ کے حضور کا اعتقاد رکھنا واجب ہے۔ یہ ذواتِ مُقدسہ اہل ایمان کو اپنی شفاعت سے سکرات و شدائد موت میں فائدہ پہنچاتے ہیں اور اہل نفاق اور دشمنانِ اہل بیت کی شدتِ نزع میں اور اضافہ کا باعث بنتے ہیں۔ اس بات پر اجمالی ایمان رکھنا کافی ہے۔ اس امر میں غور وفکر کرنا لازم نہیں ہے کہ آیا یہ بزرگوار اپنے اصلی اجسادِ مبارکہ میں تشریف لاتے ہیں یا مثالی اجسام کے ساتھ یا کسی اور طریقہ سے؟ یہ تاویل کرنا جائز نہیں ہے کہ مرنے والے کو صرف علم ہوتا ہے یا یہ کہ قوتِ متخیلہ میں ان کی صورتیں

منتقش ہوجاتی ہیں۔ کیونکہ اس طرح کرنے سے ایک ثابت شدہ دین حقیقت میں تحریف اور اہلِ ایمان کے عقائد حقہ کی تضیع لازم آتی ہے۔

موت طبعی واخترامی کا بیان

موت کی دوقسمیں ہیں۔ ایک کوطبعی کہا جاتا ہے جو مرض وغیرہ خدا کے مقرر کردہ عام عادی علل و اسباب کے ماتحت واقع ہوتی ہے۔ دوسری کا نام ہے اخترامی وعادی اسباب کے ماتحت واقع نہیں ہوتی، بلکہ کسی ظالم کے زبردستی رشتہ حیات قطع کرنے سے واقع ہوتی ہے۔ جیسے قتل وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ پہلی قسم کی موت تو من جانب اللہ مُقدر ہوتی ہے جس کی تفصیل بعض سابقہ ابواب میں بلکہ قضاوقدر کے ضمن میں گزر چکی ہے۔ باقی رہی دوسری موت، اس کا علم تو خداوند عالم کو ضرور ہوتا ہے مگر اس نے یہ موت مُقدر نہیں کی ہوتی۔ بلکہ قاتل حکم خدا کی مخالفت کرتے ہوئے مقتول کے رشتہ حیات کو قطع کرتا ہے۔ اسی بنا پر مستحق عذاب وعقاب قرار پاتا ہے۔

باقی رہا یہ امر کہ قاتل مقتول کی شمع حیات گل نہ کرتا تو مقتول کس قدر
زندہ رہتا؟ اس کے متعلق قطعی طور پر کچھ نہیں جاسکتا۔
ممکن ہے ایک طویل عرصہ دارالبقاء
کی طرف رحلت
کرجاتا

واللہ العالم بحقائق الامور

☆

باب الاعتقاد

فی المسائلة فی القبر

قال الشیخ ابوجعفرؒ اعتقادنا فی المسائلة فی القبر انھا حق لا بد منھا فمن اجاب

سترھواں بابؒ

قبر میں سوال وجواب کے متعلّق عقیدہ

جناب شیخ ابوجعفر فرماتے ہیں کہ سوال قبر کے بارے میں ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ یہ برحق ہے اور یقیناً ہوگا

سترھواں بابؒ

قبر میں سوال وجوابؒ

قبر میں نکیرین کے سوال، فشارِ قبر اور عالم برزخ کے ثبوت پر تمام اہل ایمان بلکہ قریباً سب اہل اسلام کا اتفاق ہے۔ فقط ملاحدہ ودہریہ ان امور کے منکر ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ: "نموت و نحییٰ و ما یھلکنا الا الدھر" کہ ہم زندہ ہیں، پھر مرجائیں گے وبس۔ نہ کوئی سوال وجواب ہوگا اور نہ حساب و کتاب، نہ حشر ونشر ہوگا اور نہ جنّت و دوزخ۔ لیکن ان کا یہ خیال باطل اور زعم عاطل ہے (کما یستضح ان شاء اللہ) دیوان منسوب بہ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام میں وارد ہے: ؎

و لو انا اذا متنا ترکنا لکان الموت را حۃ کل حی

و لکنا اذا متنا بعثنا و نسئل بعدہ عن کل شیٔ

یعنی اگر یوں ہوتا کہ مرنے کے بعد ہم کو آزاد چھوڑ دیا جاتا تو پھر تو یقیناً موت ہر زندہ آدمی کے لیے باعثِ راحت وسکون ہوتی۔ لیکن (ایسا نہیں ہے) کیونکہ جب ہم مرجائیں گے تو اس کے بعد دوبارہ (قبر میں) زندہ کیے جائیں گے اور اس کے بعد ہر چیز کے متعلّق سوال وجواب ہوگا۔ اسی لیے کہا گیا ہے: ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے مرکے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ موت کا مرحلہ بھی بہت کٹھن ہے لیکن بعد والے مراحل ومنازل اس سے زیادہ خطرناک اور ہولناک ہیں۔ چنانچہ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام فرمایا کرتے تھے:

یا عباد اللہ ما بعد الموت لمن لا یغفرلہ اشد من الموت ...... القبر فاحذروا ضیقہ و ضنکہ و ظلمتہ ان القبر یقول کل یوم انا بیت العزلۃ انا بیت التراب انا بیت الوحشۃ انا بیت الدود و الھوام و القبر

بالصواب فاز بروح و ریحان فی قبرہ و بجنة النعیم فی الأخرة ومن لم یجب بالصواب	جو شخص ان سوالات کا صحیح جواب دے گا اسے قبر میں راحت اور خوشی و خوشبو اور آخرت میں جنّت نعیم حاصل ہوگی، اور جو شخص صحیح جواب نہ دے سکے گا

روضة من ریاض الجنة او حفرة من حفر النار (نہج البلاغة)

اے اللہ کے بندو! یاد رکھو اس شخص کے لیے جس کی بخشش نہ ہوئی ہو (اعاذنا اللہ منہ) موت کے بعد جو کچھ ہے وہ موت سے بھی زیادہ سخت و سنگین ہے (موت کے بعد) قبر کا مرحلہ ہے۔ پس قبر کی تنگی اور تاریکی سے ڈرو۔ قبر ہر روز (زبانِ حال سے) کہتی ہے: میں وحدت و تنہائی کا گھر ہوں، میں مٹی کا گھر ہوں، میں وحشت و گھبراہٹ کا گھر ہوں، میں کیڑوں مکوڑوں کا گھر ہوں۔ یاد رکھو! قبر یا جنّت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔ سھل علینا ھذہ المراحل۔

عالم برزخ اور اس کے بعض شدائد کا بیان

لغوی اِعتبار سے ہر اس چیز کو جو دو چیزوں کے درمیان حاجب و حائل ہو، اسے "برزخ" کہا جاتا ہے۔ ارشادِ قدرت ہے: "بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ" (سورة الرحمن:۲۰) ان ہر دو دریاؤں کے درمیان ایک حد فاصل ہے جس کی وجہ سے ایک دوسرے پر نہیں چڑھتا۔ اسی مناسبت سے موجودہ زندگی اور آخرت والی زندگی کے درمیان جو زمان حائل ہے یعنی موت سے لے کر قیامِ قیامت تک جو درمیانی زمانہ ہے اسے اصطلاحِ شریعت میں برزخ کہا جاتا ہے۔ "وَمِنْ وَرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ" (سورة مومنون:۱۰۰) بعض لوگ اس عالم کو عالم مثال، عالم اشباح، عالم ظلال وغیرہ اسماء سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ "ولا مشاحة فی الاصطلاح" اور یہ عالم برزخ والا مرحلہ بہت ہی مشکل ہے۔ ائمہ طاہرین علیہم السلام نے اس سے بہت ہی ڈرایا ہے، اور اس میں درپیش آنے والے مصائب و شدائد سے نجات حاصل کرنے کے لیے اعمالِ صالحہ کا ذخیرہ جمع کرنے کی تاکید شدید فرمائی ہے۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "واللہ ما اخاف علیکم الا البرزخ فاما اذا صار الامر الینا فنحن اولیٰ بکم" بخدا مجھے تمھارے متعلّق جس قدر خوف و ہراس ہے وہ عالم برزخ ہی کے متعلّق ہے لیکن جب قیامت کا دن ہوگا اور معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہوگا، تو اس وقت ہم تمھاری شفاعت کرنے کے سب سے زیادہ حق دار ہیں۔ (حق الیقین از علامہ سید عبداللہ شبرؒ)

فله نزول من حميم فی قبره و تصلية جحيم فی الأخرة واکثر ما يکون عذاب القبر	اس کی قبر میں آگ نازل ہوگی، اور بروز حشر اسے آتشِ جہنم میں جھونکا جائے گا، اور اکثر و بیشتر عذابِ قبر کا باعث

اسی طرح اصول کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے، راوی کہتا ہے: میں نے خدمت میں عرض کیا: میں نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: "کل شيعتنا فی الجنة علی ما کان فيهم" ہمارے سب کے سب شیعہ خواہ ان کے عمل کیسے ہی ہوں جنّت میں جائیں گے ۔ امامؑ نے فرمایا: "اما فی القيامة فکلکم فی الجنة بشفاعة النبی المطاع صلی الله عليه و اله و سلم او وصی النبی عليه السلام و لکن و الله اتخوف عليکم فی البرزخ" جہاں تک قیامت کا تعلّق ہے اس میں تو تم سب ہی جنّت میں داخل ہوگے، نبی مطاع یا ان کے اوصیاء کی شفاعتِ کبریٰ کی وجہ سے ۔ ہاں البتّہ خدا کی قسم مجھے تمھارے متعلّق اگر خوف ہے تو وہ برزخ کا ہے ۔ راوی نے عرض کی: آقا وہ برزخ کیا ہے؟ فرمایا: "القبر منذ موته الی يوم القيامة" وہ موت سے لے کر قیامت تک قبر والا درمیانی زمانہ ہے، جیسے کہ ارشادِ رب العزت ہے: "وَمِن وَرَآئِهِم بَرزَخٌ اِلٰی يَومِ يُبعَثُونَ" (سورة مومنون:۱۰۰) ان کے پیچھے عالمِ برزخ ہے یومِ حشر تک ۔

موت کے بعد قیامت تک درمیانی عرصہ میں انسان پر کیا گزرتی ہے؟

اگرچہ یہ مبحث بہت طویل الذیل ہے، جس کی تفصیل بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ۔ ہاں جو کچھ اخبارِ معصومین علیہم السلام سے ثابت ہوتا ہے اس کا جامع خلاصہ یہ ہے کہ جب انسان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر جاتی ہے تو وہ میت کے ساتھ ساتھ رہتی ہے ۔ جب میت کو دفن کیا جاتا ہے تو اسی جسم میں دوبارہ اس کی روح کو داخل کیا جاتا ہے ۔ باقی رہا یہ امر کہ آیا اسے تمام جسم میں داخل کیا جاتا ہے یا فقط کمر تک بالائی حصّہ میں؟ اس کی تفاصیل میں اختلاف ہے، اگرچہ اکثر روایات سے دوسرا قول ظاہر ہوتا ہے ۔ بہرکیف اتنا تو عقلاً بھی ثابت ہے کہ جب میت سے سوال و جواب ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ جب تک اس میں روح نہ ہو اور وہ تفہیم و تفہّم کے قابل نہ ہو، اس وقت تک اس سے سوال و جواب کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ بہرحال اس وقت خداوند عالم کے مقرر کردہ دو فرشتے جن کے صفاتی نام منکر و نکیر ہیں جو انتہائی قبیح المنظر اور ہولناک شکل و صورت رکھتے ہیں اور ان کی آواز بجلی کی کڑک کی طرح تند و تیز ہوتی ہے، قبر میں سوال و جواب کے لیے داخل ہوتے ہیں ۔ البتّہ اس امر میں قدرے اختلاف ہے کہ آیا ہر مرنے والے کے پاس خواہ مومن ہو یا کافر یہی دو فرشتے آتے ہیں یا بعض کے پاس کچھ اور ملائکہ آتے ہیں ۔ چنانچہ بعض روایات سے یہی معلوم ہوتا

من النميمة و سوء الخلق و الاستخفاف من البول و اشد ما يكون عذاب القبر على المومن الحق مثل اختلاج العين او شر ملة الحجامة و يكون	چغل خوری، بد خلقی اور پیشاب (کی نجاست کو خفیف) سمجھنے اور اس لیے اس سے اجتناب نہ کرنے سے ہوتا ہے) مومن کے لیے قبر میں سخت سے سخت عذاب آنکھ کے پھڑ کنے یا پچھنے لگانے کی تکلیف کے برابر ہوگا اور یہ اس کے

ہے کہ ہر مرنے والے کے پاس یہی دو فرشتے جاتے ہیں اور یہی مشہور بھی ہے۔ لیکن بعض روایات سے یہ مُستفاد ہوتا ہے کہ مومن کی قبر میں جو فرشتے آتے ہیں ان کے صفاتی نام مُبشر و بشیر ہیں۔ جو بہت ہی خوش منظر و خوبصورت اور خوش آواز ہوتے ہیں جو آکر مومن کو جنّت الفردوس اور خوشنودیٔ خدا کی بشارت دیتے ہیں۔ بہر حال جو شخص ان فرشتوں کے سوالات کے صحیح جوابات دے دے وہ اسے جنّت کی بشارت دے کر چلے جاتے ہیں اور جو صحیح جواب نہ دے سکے اسے آہنی گُرزوں سے سزا دیتے ہیں۔ فشارِ قبر کی تکلیف اس کے علاوہ ہے۔ اس کے بعد وہ فرشتے چلے جاتے ہیں اور انسان دوبارہ مر جاتا ہے۔ اب اس کا جسم تو وہیں قبر میں ہی رہ جاتا ہے، البتہ روح عالمِ برزخ میں مُنعم یا معذب رہتی ہے۔ اب اس امر میں اِختلاف ہے کہ آیا یہ جزا یا سزا تنہا روح کو دی جاتی ہے یا اسے جسم مثالی میں داخل کر کے دی جاتی ہے جو شکل وصورت میں تو دنیوی جسم کی مانند ہوتا ہے لیکن اس میں مادی گوشت و پوست وغیرہ اجزاء نہیں ہوتے۔ جو قول بکثرت اخبارِ مُعتبرہ سے پایۂ ثبوت تک پہنچا ہے وہ یہی دوسرا قول ہے۔ یعنی یہ کہ روح کو جسم مثالی میں رکھ کر جزا یا سزا دی جاتی ہے۔ مومنین کی روحیں وادی السلام (جو کہ سرزمین عراق میں نجف اشرف کے پاس ایک عظیم الشان قبرستان ہے) میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتی ہیں اور کفار و مشرکین اور نصاب و خوارج کی روحیں وادی برہوت (جو کہ یمن میں ایک وادی ہے) میں مُبتلائے عذاب وعقاب رہتی ہیں۔ ؎

قوی یقیں ہے مجھ کو دیکھ لیں وہاں یہ مومنین اٹھوں گا میں بروزِ حشر وادی السلام سے

عالم برزخ اور واقعات بعد الموت کے جملہ مباحث کا یہ ہے جامع خلاصہ جو آیات وروایات ائمۂ اطہارؑ اور بیاناتِ علماءِ کبار سے ماخوذ و مُستفاد ہے۔

باوجود علم باری کے پھر مُنکر ونکیر کے سوال کی کیا ضرورت ہے؟

مذکورہ بالا مطالب میں سے چند امور قدرے تشریح طلب اور مزید غور وفکر کے مُستدعی ہیں۔

امر اول: جب خود خداوند عالم کو لوگوں کے اعمال کا علم ہو تو پھر اس نے سوال و جواب کے لیے یہ

ذلك كفارة لما بقي عليه من الذنوب التي لم تكفرها الهموم و الغموم و الامراض و شدة النزع

ان گناہوں کا جو دُنیوی تکلیفوں، مُصیبتوں اور بیماریوں یا جان کنی کی سختیوں کے جھیلنے کے بعد بھی باقی رہ گئے تھے، کفارہ ہوگا

فرشتے مقرر کیوں کیے ہیں؟ اس سوال کا اجمالی مگر تحقیقی جواب یہ ہے کہ یقیناً خداوند عالم کو ذرّہ ذرّہ کا علم ہے۔ جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: "لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ" (سورۃ سباء: ۳) "اس کے علم سے زمین و آسمان میں کوئی ذرّہ بھی مخفی نہیں ہے"۔ وہ علیمٌ بذاتِ الصُّدور عالمُ السِّرّ و اَخفٰی ہے۔ لہٰذا اس نے اپنے معلومات میں اضافہ کی غرض سے یہ نظام قائم نہیں کیا بلکہ اس نے بعض ملائکہ کی یہی عبادت مقرر کی ہے، جیسے کراماً کاتبین کی عبادت کتابتِ اعمال ہے اور بعض کی عبادت بندگانِ خدا کی حفاظت و حراست ہے۔ اور بعض کی عبادت تسبیح و تہلیل اور بعض کی رکوع و سجود ہے۔ اور یہ اس کا نظامِ ربوبیت ہے۔ جس کی جو چاہی ڈیوٹی مقرر کر دی اور وہی ڈیوٹی اس کی عبادت ہو گئی۔ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ (سورۃ الانبیاء: ۲۶ و ۲۷)

اس میں کوئی شک نہیں قبر کے سوال و جواب کا اقرار ضروریاتِ دین میں سے ہے اور نہیں تو اس کے ضروریاتِ مذہب سے ہونے میں تو کوئی کلام ہی نہیں ہے۔ حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "من انکر ثلاثة اشیاء فلیس منا المعراج و المسائلة فی القبر و الشفاعة" (امالی شیخ صدوقؒ) جو شخص تین چیزوں کا اِنکار کرے وہ ہمارے شیعوں سے نہیں ہے، وہ تین امور یہ ہیں: معراج جسمانی، سوال قبر اور شفاعتِ رسولِ خداؐ و ائمہ ہدیٰؑ۔

امرِ دوم: آیا قبر میں ہر شخص سے سوال و جواب ہوتا ہے؟

لیکن قابلِ غور امر یہ ہے کہ آیا قبر میں ہر شخص سے سوال و جواب ہوتا ہے یا فقط بعض سے اور بعض کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے؟ اس کے متعلق اگرچہ مشہور یہی ہے کہ ہر مرنے والے سے قبر میں سوال و جواب ہوتا ہے، لیکن جو امر عترتِ طاہرہؑ کے اخبارِ مُعتبرہ سے پایۂ ثبوت تک پہنچ چکا ہے وہ یہ ہے کہ سوال و جواب خالص مومنین اور خالص کفار و مشرکین (جن میں ناصبی و خارجی بھی شامل ہیں) سے ہوتا ہے۔ باقی رہے اطفال، مجانین اور مستضعفین یعنی درمیانی طبقہ کے مُسلمین، ان کو بالکل نظر انداز کر کے اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ زمانہ برزخ میں نہ ان کے لیے کوئی جزا ہے اور نہ کوئی سزا۔ ان کی کیفیت یوں ہے جیسے کوئی سویا ہوا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب حشر و نشر ہوگا اور وہ محشور ہوں گے تو

عند الموت فان رسول الله كفن فاطمة بنت اسد ام اميرالمومنينؑ بقميصه بعد ما فرغ النساء	جب عورتیں جناب فاطمہؑ بنت اسد مادر امیرالمومنین علیہ السلام کے غسل سے فراغت پا چکیں تو جناب رسولِ خدا ﷺ نے اپنی قمیص مبارک میں ان کو کفن دیا

پکار اٹھیں گے: "مَنۡۢ بَعَثَنَا مِنۡ مَّرۡقَدِنَا؟" (سورۃ یٰس:۵۲) کس نے ہمیں ہماری خواب گاہ سے بیدار کر دیا ہے؟ "اِذۡ يَقُوۡلُ اَمۡثَلُهُمۡ طَرِيۡقَةً اِنۡ لَّبِثۡتُمۡ اِلَّا يَوۡمًا" (سورۃ طٰہٰ:۱۰۴) ان میں سے جو زیادہ اچھا ہے وہ کہے گا کہ تم تو فقط ایک دن (عالمِ برزخ میں) ٹھہرے ہو۔ اس سلسلہ میں روایات بکثرت ہیں۔ دو چار بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں۔

ابی بکر حضرمی حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: "لا يسئل فى القبر الا من محض الايمان محضا او محض الكفر محضا"۔ قبر میں سوال نہیں کیا جائے گا مگر اسی سے جو خالص مومن ہوگا یا خالص کافر۔ راوی نے عرض کیا: دوسرے لوگوں کی کیا حالت ہوگی؟ فرمایا: "يلهى عنهم" انھیں بالکل مہمل چھوڑ دیا جائے گا۔ (بحار الانوار جلد ۳)

اسی طرح عبداللہ بن سنان جناب صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں، آپؑ نے فرمایا: "انما يسئل فى القبر من محض الايمان محضا او الكفر محضا و اما سوى ذلك فيلهى عنه"۔ یعنی قبر میں صرف اسی سے سوال کیا جائے گا جو محض مومن ہوگا یا محض کافر، اور جو لوگ ان کے علاوہ ہیں انھیں نظر انداز کر دیا جائے گا۔ (اصول کافی)

اسی طرح جناب محمد بن مُسلم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں، فرمایا: "لا يسئل فى القبر الا من محض الايمان محضا او محض الكفر محضا (اصول کافی) الى غير ذلك من الاخبار الكثيرة المعتبرة"۔ انہی اخبار کے پیشِ نظر علمائے اعلام نے اپنی کتبِ اعتقادیہ وکلامیہ میں بطور جزم و یقین اسی نظریہ کا اظہار فرمایا ہے۔ چنانچہ سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ ثالث بحار الانوار میں اس سلسلہ میں مباحثِ طویلہ لکھنے کے بعد رقمطراز ہیں: "اعلم ان الذى ظهر من الايات الكثيرة و الاخبار المستفيضة و البراهين القاطعة هو ان النفس باقية بعد الموت اما معذبة ان كان ممن محض الكفر او منعمة ان كان ممن محض الايمان او يلهى عنه ان كان من المستضعفين" ...... الخ۔ یعنی جو کچھ آیات کثیرہ و اخبارِ مستفیضہ اور براہین قاطعہ سے ظاہر ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ موت کے بعد نفس باقی رہتا ہے یا گرفتارِ عذاب ہوکر، اگر خالص کافر ہو یا نعماتِ الٰہیہ سے متنعّم ہوتا ہے اگر خالص مومن ہے۔ اور اگر

من غسلها و حمل جنازتها علی عاتقه فلم یزل تحت جنازتها حتی اوردها فی قبرها و اضطجع	اس کے بعد ان کے جنازے کو قبر میں اتارنے تک اپنے کندھے پر اٹھایا۔ بعد ازاں خود بنفسِ نفیس قبر میں داخل ہوکر لیٹے، پھر کھڑے ہوکر

مستضعفین میں سے ہے تو اسے بالکل نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔

اسی طرح جناب علامہ سید عبداللہ شبر نے اپنی کتاب "حق الیقین" میں اس قسم کی بعض اخبار نقل کرنے کے بعد سرکار علامہ مجلسیؒ کی اس فرمائش کو نقل کرکے اس پر اظہار پسندیدگی فرمایا ہے۔

اسی طرح شیخ مُفید علیہ الرحمہ نے بھی تصحیح الاعتقاد میں اسی قول کو "والذی ثبت من الحدیث فی الباب ان الارواح بعد موت الاجساد علی ضربین" کہہ کر اختیار کیا ہے۔ لیکن انھوں نے ان احادیث سے جن میں مستضعفین کو نظر انداز کرنے کا تذکرہ موجود ہے، یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کی روحیں بالکل فنا ہوجاتی ہیں۔ لیکن ان احادیث شریفہ میں سے کسی حدیث سے بھی یہ امر ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ ان احادیث میں یہ کہیں مذکور نہیں ہے کہ ان کی روحیں فنا ہوجاتی ہیں، بلکہ صرف اس قدر موجود ہے کہ ان روحوں کو بالکل نظرانداز کرکے اپنی حالت پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور وہ عالم خواب کی طرح غنودگی میں پڑی رہتی ہیں۔ جیسا کہ بعض آیات سے بھی یہی ظاہر ہے۔

کما تقدم آنفا واللہ العالم

محدث سید جزائریؒ نے "انوار نعمانیہ" میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ ان درمیانے طبقہ کے لوگوں سے مراد جنھیں نظرانداز کر دیا جاتا ہے کم عقل، مجنون، دونبیوں کے درمیانی زمانہ والے لوگ اور وہ بوڑھے مرد وعورتیں ہیں جو زیادتیٔ عمر کی وجہ سے ضعیف العقل ہو گئے ہیں۔ کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو نہ خالص مومن ہیں اور نہ ہی انھیں خالص کافر کہا جاسکتا ہے۔ پس یہ لوگ قبور میں اپنے حال پر باقی رہتے ہیں، یہاں تک کہ خلاق حکیم بروزِ قیامت انھیں کامل العقل بنا کر ان کا اس طرح امتحان لے گا کہ آگ روشن کرکے ان کو اس میں داخل ہونے کا حکم دے گا، پس اگر وہ فرمانبرداری کرتے ہوئے اس میں داخل ہوگئے تو آتش نمرود کی طرح وہ آتش ان پر گلزارِ جنّت بن جائے گی۔ اور اگر مخالفت کی تو اس میں زبردستی دھکیل دیے جائیں گے۔ سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے "حق الیقین" میں اسی تاویل کو پسند فرمایا ہے۔ نیز علامہ مُحسن فیض نے اپنے رسالہ شریفہ "منہاج النجاۃ" میں اسی عقیدہ کو اختیار فرمایا ہے۔

فیہ ثم قام فاخذھا علی	اپنے ہاتھوں پر ان کی میت کو لے کر قبر میں اتارا، پھر ان کی طرف
یدیہ و وضعھا فی قبرھا ثم	جھک گئے اور کافی دیر تک ان سے کچھ آہستہ آہستہ فرمانے کے بعد
انکب علیھا یناجیھا طویلا و	دو مرتبہ فرمایا "ابنک ابنک" اس کے بعد قبر سے باہر تشریف لائے
یقول لھا ابنك ابنك	اور قبر پر مٹی کو ہموار کیا پھر قبر کی طرف جھک گئے، اس حالت میں

و ھو الحق الحقیق بالاتباع   و للناس فیما یعشقون مذاھب

امر سوم: قبر میں کن چیزوں کے متعلّق سوال ہوتا ہے؟

یہ امر قابلِ غور ہے کہ قبر میں جو سوال وجواب ہوتا ہے وہ آخر کن امور کے متعلّق ہوتا ہے؟ اس سلسلہ میں احادیثِ مُعتبرہ سے جو کچھ مُستفاد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہاں اصولِ عقائد اور بعض فروع کی پرسش ہوتی ہے۔ چنانچہ اصولِ کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک طویل روایت منقول ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قبر میں دو فرشتے آکر میت سے سوال کرتے ہیں: "من ربك" (تیرا رب کون ہے؟) "ما دینك" (تیرا دین کیا ہے؟) "من نبیك" (تیرا نبی کون ہے؟) "من امامك" (تیرا امام کون ہے؟) پس اگر میت ٹھیک جواب دے دے تو فرشتے اس کی قبر کی طرف جنّت کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔ اور اگر وہ صحیح جواب نہ دے سکے تو اس کے برعکس اس کے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں۔ یعنی جہنم کا ایک دروازہ اس کی قبر کی طرف کھول دیتے ہیں۔ غرضیکہ پوری جزا یا سزا تو قیامت میں مکمل حساب وکتاب کے بعد ہی ملے گی مگر جزاء وسزا کا کچھ سلسلہ اسی وقت سے شروع ہوجاتا ہے۔ نیز اسی کتاب مُستطاب میں انہی جنابؑ سے مروی ہے، فرمایا: قبر میں میت سے پانچ چیزوں کے متعلّق سوال کیا جاتا ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور محبّت اہل بیتؑ۔

"بحار الانوار" کی بعض روایات سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا امور کے علاوہ بعض اور امور کے بارے میں بھی سوال وجواب ہوتا ہے۔ چنانچہ سوم بحار میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے جو روایت مروی ہے، اس میں مذکور ہے کہ عقائدِ اِسلامیہ کے متعلّق پرسش کے بعد میت سے دریافت کیا جاتا ہے: "عن عمرك فیما افنیته و مالك من این اکتسبته و فیما اتلفته" کہ تو نے اپنی عمر عزیز کو کن باتوں میں ختم کیا؟ اور مال ومتاع حاصل کہاں سے کیا اور پھر اسے خرچ کہاں کیا؟ کتاب محاسن برقی میں بروایت ابوبصیر حضرت امام محمد باقر یا حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ جب مومن کا اِنتقال ہوتا ہے تو اس کی قبر میں اس کے ہمراہ چھ صورتیں داخل ہوتی ہیں، جو

ثم خرج و سوی علیھا التراب ثم انکب علی قبرھا فسمعوہ و ھو یقول لا الہ الا اللہ اللھم انی استودعھا ایاک ثم انصرف فقال لہ المسلمون	لوگوں نے سنا کہ آپؐ بارگاہِ احدیت میں یوں عرض کر رہے ہیں: خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اے اللہ! میں ان (فاطمہؑ) کو تیرے ہی حوالہ کرتا ہوں

ویسے تو سب ہی حسین ہوتی ہیں مگر ان میں سے ایک صورت بہت ہی زیادہ حسین و جمیل ہوتی ہے۔ یہ صورتیں اس طرح مومن کو اپنے گھیرے میں لے لیتی ہیں کہ ایک اس کی دائیں طرف کھڑی ہوجاتی ہے اور دوسری بائیں طرف، تیسری آگے کی طرف اور چوتھی پیچھے کی جانب، پانچویں پائنتی کی جانب اور جو زیادہ جمیل و حسین ہوتی ہے وہ اس کے سر کے اوپر منڈلاتی رہتی ہے۔ اور جس طرف سے فشارِ قبر ہو یہ صورتیں اسے روکنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اور یہ آخری صورت دیگر تمام صورتوں کی مساعدت کرتی ہے جب وہ مرحلہ ختم ہوجاتا ہے تو یہ زیادہ جمیل صورت دوسری صورتوں سے پوچھتی ہے کہ تم کون ہو؟ اس وقت دائیں طرف والی صورت کہتی ہے: میں اس مومن کی نماز ہوں، بائیں طرف والی کہتی ہے: میں اس کی زکوٰۃ ہوں، آگے والی کہتی ہے میں اس کا روزہ ہوں، پیچھے والی کہتی ہے میں اس کا حج و عمرہ ہوں۔ پاؤں والی کہتی ہے: میں برادرِ مومن کے ساتھ اس کا حُسنِ سلوک اور رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی ہوں۔ جب سب صورتیں اپنی اپنی معرفی کرالیتی ہیں تو پھر وہ مل کر اس زیادہ خوبصورت و خوش منظر صورت سے پوچھتی ہیں کہ تو کون ہے؟ وہ کہتی ہے میں آلِ محمدؐ کی ولایت ہوں۔

مخفی نہ رہے کہ یہ روایت تجسّم اعمال پر دلالت کرتی ہے۔ ہم مبحث قیامت میں اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ نیز اس روایت شریفہ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ولایت اہلِ بیتؑ صرف اس کمی کو پورا کرتی ہے جو بتقاضائے بشریت دیگر اعمال میں رہ جاتی ہے۔ ایسا نہیں کہ دیگر اعمال بالکل ندارد ہوں اور ولایت ان کے قائم مقام ہوجائے۔ فتدبر

امام محمد باقر علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: "من کان للہ مطیعا فھو لنا ولی و من کان للہ عاصیا فنحن منہ براء"۔ (اصول کافی) جو شخص خدا کا فرمانبردار ہے وہ ہمارا دوست و موالی ہے اور جو خدا کا نافرمان ہے ہم اس سے بیزار ہیں۔

امر چہارم: فشارِ قبر کا اثبات

فشارِ قبر یا اس قسم کے دیگر مسائل جو عالمِ برزخ اور عالمِ آخرت سے متعلق ہیں، یہ سب امور ایمان بالغیب میں داخل ہیں۔ جن پر ایمان رکھنا اہلِ ایمان کا فریضہ ہے۔ جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے:

یا رسول اللہ انار ایناك صنعت الیوم شیئا لم تصنعه قبل الیوم فقال فی الیوم فقدت براب طالب انها كانت لیكون عندها الشئ فتوثر نی به علی نفسها و ولدها و انی ذكرت یوم القیامة یوما و ان الناس یحشرون عراة فقالت و اسوتاه فضمنت

بعد ازاں آنجنابؐ واپس تشریف لائے۔ مُسلمانوں نے آپؐ کی خدمت بابرکت میں عرض کیا: یارسول اللہ! آج ہم نے آپ کو ایسا کام انجام دیتے ہوئے دیکھا ہے کہ اس سے قبل کبھی آپ نے ایسا نہیں کیا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: آج میں نے اپنے چچا بزرگوار جناب ابی طالبؑ کی نیکی و بھلائی کو گم کیا ہے۔ جناب فاطمہؑ کا یہ عالم تھا کہ جب ان کے پاس کسی قسم کی کوئی چیز ہوتی تھی تو اس سلسلہ میں مجھے اپنی ذات اور اپنی اولاد پر ترجیح دیتی تھیں۔ میں نے ان کے روبرو ایک دفعہ قیامت کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا کہ لوگ بروزِ قیامت برہنہ محشور ہوں گے، تو جناب فاطمہؑ نے گھبرا کر کہا: ہائے رُسوائی و بُرائی۔ تو مَیں نے ان کو ضمانت دی تھی

"یومنون بالغیب" اس امر کے برحق ہونے پر تمام اہلِ اسلام کا اتفاق ہے۔ چنانچہ شارح مقاصد جلد ۲ صفحہ ۲۲۰ پر لکھتے ہیں: "اتفق الاسلامیون علی حقیة سوال منكر و نكیر فی القبر و عذاب الكفار و بعض العصاة فیه"۔ تمام اہلِ اسلام کا قبر میں منکر ونکیر کے سوال کرنے اور کفار اور بعض گنہگاروں کے اس میں معذب ہونے پر اتفاق ہے۔ یہ وہ مُشکل منزل ہے کہ خدا محفوظ رکھے۔ کچھ مخصوص مومن کامل ہی اس سے سلامت رہیں گے، ورنہ اکثر لوگوں کو اس سے ضرور دوچار ہونا پڑے گا۔ چنانچہ اصول کافی میں جناب ابوبصیر سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا: "ایفلت من ضغطة القبر احد؟" فرزندِ رسولؐ! آیا کوئی شخص فشارِ قبر سے محفوظ بھی رہے گا؟ جنابؑ نے فرمایا: "نعوذباللہ ما اقل من یفلت من ضغطة القبر" ہم اس سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ کس قدر کم ہیں وہ لوگ جو اس سے بچ سکیں گے۔

(اعاذنا اللہ منہا بجاہ النبیؐ و آلہ الطاہرینؑ)

اہلِ عقل وایمان حضرات کے لیے اس اعتقاد میں ہرگز کسی قسم کا کوئی استبعاد نہیں ہے، کیونکہ جب یہ امر عقلاً ممکن ہے (اس سے کوئی استحالہ عقلیّہ لازم نہیں آتا) اور مخبرینِ صادقینؑ نے اس کے واقع ہونے کی خبر دی ہے تو اسے صحیح تسلیم نہ کرنے کی سوائے کمزوریٔ ایمان کے اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی حضرت محقّق طوسی علیہ الرحمہ نے تجرید میں اس امر کے اثبات پر یہی مختصر دلیل بایں الفاظ پیش کی ہے:

لها ان يبعثها الله كاسية و	کہ خدا تعالیٰ ان کو لباس کی حالت میں محشور کرے گا۔
ذكرت ضغطة القبر فقالت	اسی طرح ایک مرتبہ میں نے فشارِ قبر کا ذکر کیا تھا تو جناب
واضعفاه فضمنت لها ان	فاطمہؑ نے کہا تھا: ہائے میری کمزوری۔ تو میں نے ان کو
يكفيها الله تعالىٰ ذلك	ضمانت دی تھی کہ خدا ان کو اس سے محفوظ رکھے گا۔
فكفنتها بقميصي واضطجعت	اس لیے آج میں نے اپنی قمیص کا انھیں کفن دیا ہے

"عذاب القبر واقع لامكانه و تواتر السمع بوقوعه" عذاب واقع ہوگا، کیونکہ یہ امر عقلاً ممکن ہے اور سمعاً اس کا وقوع پذیر ہونا بالتواتر ثابت ہے۔

مغرب زدہ مُسلمانوں کے رویہ پر تنقید

مگر افسوس آج سوء اتفاق سے مُسلمانوں کا ایک خاصا طبقہ مغربی تہذیب وتمدن اور مغربی علوم جدیدہ سے اس قدر مرعوب ہے کہ وہ دیکھتا ہے تو مغرب کی آنکھ سے، سوچتا ہے تو مغرب کے دماغ سے اور سنتا ہے تو مغرب کے کان سے۔ یہ طبقہ ظاہری طور پر گو آزاد ہے لیکن ذہنی طور پر ہنوز بدستور سابق غلام ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک یہ ذہنی حریت حاصل نہیں ہوتی دوسری ہر قسم کی آزادی ہیچ ہے۔ خدا مُسلمانوں کی حالت پر رحم کرے اور انھیں اس ذہنی غلامی سے نجات دے۔ اب ان مغرب زدہ افراد کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ جب اس قسم کے مسائل سنتے ہیں جو ان کے حواس خمسہ کی دسترس سے بالا ہیں تو فوراً ان کی تاویل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگرچہ قدیم الایام سے یونان زدہ طبقہ موجود رہا ہے۔ جن کا محبوب مشغلہ ایسے دینی امور کی تاویلات علیلہ کرتا رہا ہے لیکن آج کل یہ بات بہت زوروں پر ہے۔ اور آج ایسے غیر محسوس امور کا انکار فیشن میں داخل اور ترقی یافتہ ہونے کی علامت سمجھا جاتا ہے اگر کوئی سائنسی مسئلہ دلائل و براہین سے بڑھ کر تجربہ و مشاہدہ کی حد تک پہنچ چکا ہو اور بعض ظواہر نصوص شرعیہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہو تو اس تطبیق میں کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ یہ ایک مستحسن امر ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں افراط یقیناً نقصان دہ ہے۔ کیونکہ اس سلسلہ میں جو سب سے زیادہ نقص ہے وہ یہ ہے کہ فلسفہ یونان ہو یا موجودہ سائنس اس کے نظریات روز بروز بدلتے رہتے ہیں۔ لہٰذا اگر اس کے نظریات کے مطابق نصوص شریعتِ مقدسہ کی تاویلات کا سلسلہ جاری رکھا جاتا تو آج تک شریعت کا مبارک حلیہ ہی بگڑ جاتا ہوتا۔ لیکن یہ دین کی حقانیت کی بین دلیل ہے اور خداوند کریم کا خاص فضل و کرم ہے کہ ہمیشہ ہر زمانہ میں بموجب "لكل فرعون موسىٰ" ہر فرعون صفت انسان کے مقابلہ میں

فی قبرھا لذلك و انکبت علیھا	اور ان کی قبر میں خود لیٹا ہوں۔ اور ان کی میت کی طرف اس لیے جھکا
فلقنتھا ما تسئل عنھا و انھا	تھا تاکہ ان کو وہ چیزیں بتادوں جن کی بابت ان سے سوال ہوناتھا۔

موسیٰ صفت علماء حق ایسے رہے ہیں جنھوں نے ایسے جہال و ضلال کی تاویلات کا ابطال کر کے شریعت کے مقدس چہرہ کو محفوظ رکھا ہے۔ شکر اللّٰہ سعیھم و کثر فی الاسلام امثالھم۔

ایرادات کے جوابات

حضرات متجددین کی طرف سے فشارِ قبر کے سلسلہ میں جو بعض ایرادات کیے جاتے ہیں، ذیل میں وہ ایرادات مع جوابات پیش کیے جاتے ہیں۔

پہلا اعتراض اور اس کا جواب:

بعض اوقات قبر کھود کر جب دیکھا جاتا ہے تو مردہ اسی طرح قبر میں موجود ہوتا ہے جس طرح دفن کیا گیا تھا۔ نہ سوال و جواب کے کچھ آثار آشکار ہوتے ہیں اور نہ فشارِ و عذابِ قبر کے کوئی علامات ہویدا ہوتے ہیں۔ اس اعتراض کا کئی طرح جواب دیا جاسکتا ہے۔

اولاً یہ کہ یہ محض ایک شبہ ہے جس کی وجہ سے قرآن و حدیث اور اتفاق مسلمین سے ثابت شدہ حقیقت کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ثانیاً یہ کہ موت کے بعد دوسرا عالم شروع ہوجاتا ہے اور اس کے حالات و کوائف ان مادی حواسِ ظاہرہ سے معلوم و محسوس نہیں ہو سکتے۔ ان حالات کے معلوم کرنے کے لیے اسی عالم کے حواس درکار ہیں۔ مرتے وقت فرشتے آتے ہیں۔ مگر سوائے مرنے والے کے اور کوئی شخص ان کا مشاہدہ نہیں کرسکتا۔ یہی کیفیت عالم برزخ کے حالات کی ہے۔

ثالثاً یہ کہ اس استبعاد کو رفع کرنے کے لیے یہ جواب بھی دیا جاسکتا ہے کہ آپ نے کئی دفعہ اس امر کا مشاہدہ کیا ہوگا کہ چند آدمی اکٹھے بیٹھے ہوئے ہیں، اور وہاں ایک آدمی سویا ہوا ہے، وہ خواب میں کوئی انتہائی ڈراؤنا، ہولناک اور پریشان کن منظر دیکھتا ہے اور یوں محسوس کرتا ہے کہ آگ میں جل رہا ہے، یا اسے سانپ بچھو کاٹ رہے ہیں۔ یا اس قسم کی کسی اور شدید تکلیف میں مُبتلا ہے۔ اور وہ اس وقت بہت داد و فریاد اور آہ و فغاں کرتا ہے۔ لیکن اس کے پاس سوئے ہوئے یا بیٹھے ہوئے لوگوں کو قطعاً اس کا کوئی احساس بھی نہیں ہوتا۔ نہ کوئی سانپ نظر

سئلت عن ربها فقالت الله ربي و سئلت عن نبيها فاجابت محمد نبي و سئلت عن وليها و امامها فارتج عليها و	چنانچہ جب ان سے پوچھا گیا کہ تمھارا رب کون ہے؟ تو انھوں نے جواب میں کہا کہ اللہ میرا پروردگار ہے اور جب نبی کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا محمدؐ مصطفےٰ میرے نبی ہیں۔ لیکن جب ان سے پوچھا گیا کہ تمھارا ولی اور امام کون ہے تو وہ یہ سن

آتا ہے اور نہ اس کے ڈسنے کے کچھ آثار دکھائی دیتے ہیں۔ حتی کہ اسی حالت میں بعض اوقات وہ سویا ہوا انسان گھبرا کر بیدار ہوجاتا ہے۔ اور حاضرین سے اپنی حالت کے بارے میں استفسار بھی کرتا ہے۔ مگر وہ اپنی لاعلمی ظاہر کرتے ہیں۔ پس اسی طرح اگر عالم برزخ کے فشارِ قبر کے حالات کا دنیا میں رہنے والے لوگوں کو علم نہ ہو تو اس میں کونسی تعجب خیز بات ہے؟...... یہ جواب محض استبعاد کو رفع کرنے کے لیے دیا گیا ہے۔ اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ فشار و عذابِ قبر بھی محض خواب کی طرح بے حقیقت ہوتا ہے۔

محقق شیخ بہائی علیہ الرحمۃ اربعین میں بذیل حدیث بستم رقمطراز ہیں:

و الذي يجب علينا هو التصديق المجمل بعذاب واقع بعد الموت و قبل الحشر في الجملة و اما كيفياته وتفاصيله فلم نكلف بمعرفتها على التفصيل و اكثرها مما لا تسعها عقولنا۔ الخ۔

"جو امر ہم پر واجب ہے وہ اس بات پر اجمالی عقیدہ رکھنا ہے کہ عالم برزخ میں قیامت سے قبل ضرور عذاب ہوتا ہے۔ باقی رہی اس کی کیفیت و تفصیل تو ہمیں اس کے معلوم کرنے کی تکلیف نہیں دی گئی۔ اور نہ ان کی حقیقت تک ہمارے عقول کی رسائی ممکن ہے"۔

دُوسرا اِعتراض اور اس کا جواب

بعض اوقات ایک انسان قبر میں دفن ہی نہیں ہوتا، بلکہ اسے تختہ دار پر لٹکا دیا جاتا ہے، یا دریا میں غرق ہوجاتا ہے، یا اسے درندے کھاجاتے ہیں تو اسے فشارِ قبر کیونکر ہوگا؟ یہ اعتراض انتہائی سطحی اور گھٹیا قسم کے ذہن کی پیداوار ہے۔ اور قدرتِ خداوندی کو بالکل محدود سمجھنے اور قبر کی حقیقت سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے، ورنہ جن لوگوں کو یہ یقین ہے کہ خداوند عالم "علیٰ کل شئ قدیر" ہے اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ قبر اسی جگہ کا نام ہے جہاں مرنے کے بعد انسان کا جسم ہو، خواہ ہوا میں ہو اور خواہ دریا میں یا کسی درندے کے پیٹ میں تو پھر وہ ہرگز اس قسم کا اعتراض نہیں کرسکتے۔ کیونکہ جو خدا قبر کے پیٹ میں میت کو فشار میں گرفتار کرسکتا ہے، وہی خدا دریا یا درندوں کے شکم کے اندر رکھ کر بھی مرنے والے کو

توقفت فقلت لها ابنك ابنك	کر (بوجہ حیا) خاموش ہوگئیں۔ میں نے انھیں یہ بتایا کہ تمھارا بیٹا امام
فقالت امامي ولدي فانصرفا	ہے۔ اس پر انھوں نے کہا کہ میرا بیٹا میرا امام ہے۔ اس کے بعد دونوں
عنها و قالا لا سبيل لنا عليك	فرشتے یہ کہتے ہوئے واپس چلے گئے کہ تم پر ہمارا کوئی بس نہیں ہے۔

فشار میں گرفتار کرسکتا ہے۔ ایک مرتبہ ایسا ہی سوال امام رضا علیہ السلام سے بھی کیا گیا تھا۔ چنانچہ جناب یونس کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ جو شخص تختہ دار پر لٹکا دیا جاتا ہے، آیا اسے بھی عذابِ قبر ہوتا ہے؟ امام علیہ السلام نے فرمایا: ان الله عز وجل يامر الهواء ان يضغطه۔ خداوند عالم ہوا کو حکم دے دیتا ہے کہ اسے فشار دے۔ (حق الیقین از علامہ شبر)

ان حقائق سے معلوم ہوا کہ قبر درحقیقت اسی عالمِ برزخ کا نام ہے۔ اِس مخصوص گڑھے کا نام نہیں جس میں میت کو دفن کیا جاتا ہے۔ اس کی تائید مزید آیتِ مبارکہ " وان الله يبعث من في القبور " (سورۃ حج: ۷) خدا تعالیٰ تمام اہلِ قبور کو محشور فرمائے گا۔ چونکہ یہ عالمِ برزخ ہے۔ اس لیے عالمِ دنیا اور عالمِ آخرت دونوں کے ساتھ فی الجملہ مشابہت رکھتا ہے۔ اِس لیے اِس کی جزا و سزا میں دنیوی اور اخروی جزا و سزا کے ساتھ کچھ نہ کچھ مشابہت و مناسبت موجود ہے۔

عالمِ برزخ کی جزا و سزا کی قرآنی آیات سے تائید

قیامتِ کبریٰ سے پہلے اچھی روحوں کو فی الجملہ جزا اور بُری روحوں کو فی الجملہ سزا دی جاتی ہے۔ چنانچہ منافقین کے متعلق قرآن مجید میں وارد ہے:

سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ (سورۃ التوبۃ: ۱۰۱)

ہم ان کو دو مرتبہ عذاب دیں گے اور پھر ان کو ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹایا جائے گا۔

ظاہر ہے کہ اس عذابِ عظیم سے مراد دوزخ کا عذاب ہے جو قیامت کے بعد ہوگا۔ اس سے قبل جو دو عذاب گزر چکے ہوں گے وہ عذاب دنیا اور عذابِ برزخ ہی ہوسکتے ہیں۔

آلِ فرعون کے بارے میں قرآن میں ہے:

وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ﴿۴۵﴾ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۣ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿۴۶﴾ (سورۃ المؤمن: ۴۵ و ۴۶)

آلِ فرعون پر بڑا عذاب الٹ پڑا آگ پر جس پر وہ ہر صبح و شام پیش کیے جاتے ہیں۔ اور جب قیامت قائم ہوگی تو (ندا آئے گی) آلِ فرعون کو پہلے سے زیادہ سخت عذاب میں ڈال دو۔

نامی کما تنام العروس فی خدرھا ثم ماتت موقة ثانیة و تصدیق ذلك فی کتاب اللہ قولہ

تم اس طرح آرام سے سو جاؤ جس طرح نئی دلہن اپنے حجلہ عروسی میں آرام سے سوتی ہے، پھر ان پر دوبارہ موت طاری ہوگئی۔ اس بات کی تصدیق قرآن میں خدا کے اس ارشاد سے ہوتی ہے کہ

قومِ نوح کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

اُغۡرِقُوۡا فَاُدۡخِلُوۡا نَارًا ۙ فَلَمۡ یَجِدُوۡا لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَنۡصَارًا ﴿۲۵﴾ (سورۃ نوح: ۲۵)

وہ لوگ غرق کیے گئے اور اس کے بعد ہی آگ میں ڈال دیے گئے۔

کلامِ عرب میں "فا" تعقیب بلامہلت کے لیے آتی ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قومِ نوح غرق ہوتے ہی آتشِ برزخی میں داخل کر دی گئی۔

ان آیتوں میں اس عذاب سے مراد عذابِ برزخ ہی ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ سخت گنہگاروں کو قیامت سے پہلے عذاب کا کچھ نہ کچھ ذائقہ چکھایا جاتا ہے۔ اسی طرح کامل مؤمنین کے لیے بھی قیامت سے پہلے فی الجملہ راحت و آرام کے اسباب مہیا کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ شہداء کے متعلق ارشادِ قدرت ہے:

وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ اَمۡوَاتًا ؕ بَلۡ اَحۡیَآءٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ یُرۡزَقُوۡنَ ﴿۱۶۹﴾ فَرِحِیۡنَ بِمَاۤ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ ۙ وَ یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِالَّذِیۡنَ لَمۡ یَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ مِّنۡ خَلۡفِهِمۡ ۙ اَلَّا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۱۷۰﴾ (سورۃ آلِ عمران: ۱۶۹ و ۱۷۰)

جو لوگ راہِ خدا میں شہید ہو گئے ان کو مردہ مت کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں، وہ مقرب بارگاہ ہیں، ان کو رزق ملتا ہے۔ خداوند عالم نے اپنے فضل و کرم سے ان کو جو کچھ دیا ہے وہ اس پر خوش ہیں اور جو لوگ ان کے پاس نہیں پہنچے ان کے متعلق بھی ان کو یہ مسرت ہے کہ (ان کی طرح) ان کو بھی کوئی حزن و ملال نہ ہوگا۔

اگر انسان کے اندر یقین موجود ہو تو ان تمام امور کا چشم بصیرت سے مشاہدہ کر سکتا ہے۔

کَلَّا لَوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عِلۡمَ الۡیَقِیۡنِ ﴿۵﴾ لَتَرَوُنَّ الۡجَحِیۡمَ ﴿۶﴾ (سورۃ التکاثر: ۵ و ۶)

افسوس کہ چشم بصارت نہیں بلکہ چشم بصیرت کور ہو چکی ہے۔

فَاِنَّهَا لَا تَعۡمَی الۡاَبۡصَارُ وَ لٰکِنۡ تَعۡمَی الۡقُلُوۡبُ الَّتِیۡ فِی الصُّدُوۡرِ ﴿۴۶﴾

(سورۃ الحج: ۴۶)

رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثۡنَتَيۡنِ وَاَحۡيَيۡتَنَا اثۡنَتَيۡنِ فَاعۡتَرَفۡنَا بِذُنُوۡبِنَا فَهَلۡ اِلٰى خُرُوۡجٍ مِّنۡ سَبِيۡلٍ	(اہلِ دوزخ کہیں گے) اے ہمارے پروردگار! تو نے ہمیں دو دفعہ موت دی، اور دوبار زندہ کیا۔ ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں کیا (جہنم سے) نکلنے کی ہمارے لیے کوئی سبیل ہے؟ (مومن :۱۱)

امرِ پنجم: یہ فشارِ قبر کن گناہوں کی وجہ سے ہوتا ہے

یہ فشارِ قبر کن گناہوں کی وجہ سے ہوتا ہے؟ اس سلسلہ میں جو کچھ مُصنّف علام نے افادہ فرمایا ہے، اس کی تائید مُتعدد روایات سے ہوتی ہے۔ چنانچہ ثالث بحار الانوار میں جناب ابن عباسؓ سے مروی ہے، فرمایا: "عذاب القبر ثلاثة اثلاث ثلث للغیبة و ثلث للنمیمة و ثلث للبول"۔ یعنی عذابِ قبر کے تین حصّے ہیں۔ ایک حصّہ غیبت (گلہ کرنے) کی وجہ سے، ایک حصّہ چغل خوری کے سبب سے، اور ایک حصّہ پیشاب سے اِجتناب نہ کرنے کے باعث ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض روایات و واقعات سے یہ بھی مُستفاد ہوتا ہے کہ بد خلقی بھی خُصُوصاً گھر والوں کے ساتھ فشارِ قبر کا موجب ہوتی ہے۔ چنانچہ سعد بن معاذؓ صحابی کا واقعہ مشہور ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس جلیل القدر صحابی کی وفات پر جناب رسولِ خدا ﷺ نے خاص اِہتمام سے اپنی نگرانی میں اسے غسل و کفن دلایا۔ جب جنازہ اٹھا تو جناب بغیر کفش و ردا کے جنازہ کے ہمراہ تھے۔ چاروں طرف سے کندھا دیا۔ خود اسے قبر میں اتارا اور پھر خود ہی لحد کو بند کیا۔ بایں ہمہ جب والدۂ سعدؓ نے بیٹے کو مخاطب کر کے یہ کہا: "یا سعد هنیئا لك الجنة" بیٹا سعد! تمھیں جنّت مبارک ہو۔ تو جنابؑ نے اسے جھڑک کر فرمایا: تو جزم و یقین کے ساتھ یہ کیسے کہہ سکتی ہے؟ تجھے معلوم نہیں کہ تیرے بیٹے کو اس وقت فشارِ قبر ہو رہا ہے۔ جب حضرتؑ واپس لوٹے تو صحابہ نے بڑے تعجب کے ساتھ عرض کیا: یارسول اللہ! آپؐ نے آج سعد کے ساتھ وہ حُسنِ سلوک فرمایا ہے جو کبھی کسی مرنے والے کے ساتھ نہیں فرمایا۔ آپؐ نے اپنی کفش و ردا کیوں اتاری تھی؟ فرمایا: چونکہ مشایعت کرنے والے ملائکہ کی یہی کیفیّت تھی۔ میں نے بھی ایسا کیا۔ عرض کیا گیا: آپؐ کبھی جنازہ کو دائیں طرف سے پکڑتے تھے اور کبھی بائیں طرف سے۔ اس کا سبب کیا تھا؟ فرمایا: جہاں سے جبرئیل کاندھا دیتے تھے، میں بھی وہیں کاندھا دیتا تھا۔ عرض کیا گیا: یارسول اللہ! آپؐ نے اس کو خود غسل دلایا، خود نمازِ جنازہ پڑھی، خود دفن کیا۔ مگر بایں ہمہ پھر فرماتے ہیں کہ اسے فشارِ قبر ہو رہا ہے؟ فرمایا: اس کی وجہ یہ ہے کہ: "انه کان فی خلقه مع اهله سوء" وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ قدرے بد خلقی کیا کرتا تھا۔ (اصول کافی)

اللہ اللہ! جائے عبرت ہے۔ اربابِ عقل و خرد غور کریں کہ کج خلقی کس قدر مُہلک صفتِ رذیلہ ہے، اور انسان کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کا اس قدر اہتمام و انتظام بھی اس کے مُہلک اثرات سے نجات نہیں دلا سکتا۔ (اعاذنا اللّٰہ و جمیع المومنین منه)

انہی حقائق سے یہ بھی معلُوم ہوگیا کہ اگر مذکورہ بالا رذائل کا ازالہ کر دیا جائے تو اس کٹھن منزل سے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ اسی طرح مُتعدّد احادیث سے معلُوم ہوتا ہے کہ جو مومن مرد یا مومنہ عورت شب جمعہ یا روزِ جمعہ کو مرے، خدا تعالیٰ اس کو فشارِ قبر سے محفوظ رکھتا ہے۔

چنانچہ "محاسن برقی" میں جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے، اور وہ اپنے آباء و اجداد طاہرینؑ کے سلسلۂ سند سے جناب رسولِ خدا ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ: آپؐ نے فرمایا: "من مات یوم الجمعة او لیلة الجمعة رفع عنه عذاب القبر"...... "جو شخص شبِ جمعہ یا بروزِ جمعہ مرے وہ عذابِ قبر سے محفوظ رہتا ہے"۔ اس قسم کی مُتعدّد احادیث موجود ہیں۔ بعض روایتوں میں خمیس بعد از زوال کا اضافہ بھی وارد ہے۔ اسی طرح بعض آثار سے مترشح ہوتا ہے کہ مشاہد مقدسہ میں دفن ہونے سے بھی اس عذاب سے نجات مل جاتی ہے۔ ولنعم ما قیل: ؎

اذا مت فادفنی الی جنب حیدر ابی شبر اکرم به و شبیرٖ

فلست اخاف النار عند جواره و لا اتقی من منکر و نکیر

رزقنا اللّٰہ الموت فی لیلة الجمعة او فی یومها و جعل مستقرنا عند النبی و آله الطاهرین

صلوات اللّٰہ علیه و علیهم اجمعین

امرِ ششم: عالمِ برزخ میں روحیں کس حال میں رہتی ہیں

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا ہے، یہ تو اصلی جسم مع الروح کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان واقعات کے بعد روح جسم سے مفارقت کر جاتی ہے، اور جسم قبر میں پڑا رہتا ہے۔ قیامت کو دوبارہ اسی جسم میں اس کی روح کو ڈال کر محشور کیا جائے گا۔ بہر حال اب یہاں جو چیز قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ اس کے بعد والا زمانہ برزخ جو قیامِ قیامت تک پھیلا ہوا ہے، اس میں جو روحیں نعماتِ الٰہیّہ سے متنعّم یا عذابِ ایزدی سے معذب ہوتی ہیں، ان کی کیفیّت کیا ہے؟ آیا یہ جزا و سزا تنہا روح کو دی جاتی ہے یا اسے جسم مثالی (جس کی تشریح سابقاً کی جا چکی ہے) میں داخل کر کے دی جاتی ہے۔ اس میں دو قول ہیں۔ اس مقام پر مُصنّف علام کے کلام سے اگرچہ پہلا قول مترشح ہوتا ہے مگر تاہم کلام مجمل ہے۔ حضرت شیخ مُفیدؒ نے

ہر دو قول کو جائز و ممکن قرار دیتے ہوئے پہلے قول کی طرف اپنا میلان ظاہر فرمایا ہے۔ لیکن جو امر معصومینؑ کی معتبر روایات اور اکثر علماء محققین کی تحقیقات سے پایۂ ثبوت کو پہنچا ہے وہ یہی ہے کہ روح کو جسم مثالی میں داخل کیا جاتا ہے۔ اور پھر وہ اڑ کر عالمِ ارواح میں پہنچ جاتی ہے۔ اگر مومن ہے تو وادی السلام میں اور بعض اوقات اپنی قبور کے پاس رہتی ہیں اور بعض اوقات جنّت دنیوی میں چلی جاتی ہیں۔ اور اگر غیر مومن ہے تو وادی برہوت میں قیام کرتی ہے اور بعض اوقات جہنم دنیوی میں معذب ہوتی ہیں۔ اور اسی جسم مثالی میں عالمِ برزخ کے اندر اسے جزا یا سزا دی جاتی ہے۔ اس قسم کی متعدّد روایاتِ معتبرہ کتبِ احادیث میں موجود ہیں جن کے پیشِ نظر علماء اعلام نے یہ نظریہ قائم کیا ہے۔ یہاں ان سب روایات کا عد احصا تو ممکن نہیں، فقط جلاء ایمانی کی خاطر ایک دو روایتیں درج کی جاتی ہیں۔ تہذیب الاحکام شیخ طوسی علیہ الرحمہ میں جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے، آپ نے یونس بن ظبیان سے دریافت فرمایا: "یقول الناس فی ارواح المومنین"۔ لوگ مومنین کی روحوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ یونس نے عرض کیا کہ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ: "فی حواصل طیر خضر فی قنادیل تحت العرش" کہ وہ عرشِ الٰہی کے نیچے قندیلوں کے اندر سبز رنگ کے پرندوں کے پوٹوں میں رہتی ہیں۔ امام علیہ السلام نے یہ سُن کر فرمایا: "سبحان الله المؤمن اکرم علی الله عز وجل من ان یجعل روحه فی حوصلة طائرا خضر"۔ مومن خداوند عالم کے نزدیک اس سے کہیں عزیز تر ہے کہ اس کی روح کو سبز رنگ کے پرندے کے پوٹے میں داخل کرے۔ پھر فرمایا: "اذا کان ذلك اتاه محمد و علی و فاطمة و الحسن و الحسین و الملائکة المقربون صلوات الله علیهم اجمعین"۔ کہ جب مومن مرنے لگتا ہے تو اس کے پاس پنجتن پاک علیہم السلام اور ملائکہ مقربین تشریف لاتے ہیں۔ پھر فرمایا: "ان المومن اذا قبضه الله تعالیٰ صیر روحه فی قالب کقالبه فی الدنیا فیاکلون و یشربون فاذا قدم علیهم القادم عرفوه بتلك الصورة"۔ جب مومن کی روح قبض ہو جاتی ہے تو خداوند عالم اس کی روح کو ایک ایسے جسم میں ڈال دیتا ہے جو اس کے دنیوی جسم کے ساتھ مشابہ ہوتا ہے۔ جب کوئی (نیا مرنے والا) ان کے پاس پہنچے تو وہ اس کو اسی صورت سے پہچان لیتے ہیں کہ یہ فلاں ہے۔ یہ روایات میں وارد ہے کہ اگر تم ان کو اس جسم میں دیکھو تو کہہ اٹھو یہ فلاں ہے، اور یہ فلاں۔ یہ بھی روایات میں موجود ہے کہ جب کوئی نئی روح ان میں جاتی ہے تو روحیں اس سے اپنے پس ماندگان کے حالات دریافت کرتی ہیں اور ان کی موت و حیات کے متعلق سوال کرتی ہیں اگر وہ یہ کہے کہ ہنوز زندہ ہیں تو امید کرتی ہیں کہ ان شاء اللہ مرنے کے بعد وہ ہمارے پاس آئیں گے اور اگر وہ یہ کہے کہ وہ مر چکے

ہیں تو وہ افسوس کرتی ہیں کہ چونکہ وہ ہمارے پاس نہیں آئے، لہٰذا وہ ہلاکت ایزدی میں مبتلا ہو گئے۔
علامہ جزائری فرماتے ہیں: "و الاخبار الواردۃ بھذہ الجنۃ و مکانھا و کیفیتھا مستفیضۃ ھل متواترۃ" یعنی اس برزخی جنّت اور اس کے مکان (وادی السلام) اور اس کی کیفیّت کے متعلّق وارد شدہ اخبار مُستفیض بلکہ متواتر ہیں۔ (انوارِ نعمانیہ)

غواص بحار اخبار ائمۂ اطہارؑ سرکار علامہ مجلسیؒ "ثالث بحار الانوار" میں عالم برزخ کے مباحث کو بالتفصیل لکھنے کے بعد بطور نتیجہ کلام تحریر فرماتے ہیں: "ثم یتعلق الروح بالاجساد المثالیۃ اللطیفۃ المشبھۃ باجسام الجن و الملائکۃ المضاھیۃ فی الصورۃ للابدان الاصلیۃ فینعم و یعذب" الخ۔ یعنی قبر کے سوال وجواب وغیرہ امور سے فراغت کے بعد ارواح کو اجسام مثالیہ لطیفہ میں داخل کر دیا جاتا ہے جو لطافت میں جنوں اور فرشتوں کے اجسام سے مشابہ اور شکل وصورت میں اپنے اصلی بدنوں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ ان کو انعام واکرام سے نوازا جاتا ہے یا انھیں عذاب وعقاب کیا جاتا ہے۔ اس جسم مثالی میں آنے کے بعد روح ہوا میں اڑ بھی سکتی ہے اور مسافاتِ بعیدہ کو چشم زدن میں طے بھی کر سکتی ہیں۔
(انوارِ نعمانیہ)

بلکہ سرکار علامہ مجلسیؒ کا تو یہ خیال ہے کہ عالمِ خواب میں انسانی روح اسی جسم مثالی کے قالب میں سیر وتفریح کرتی ہے۔ چنانچہ علامہ مرحوم فرماتے ہیں: "لا یبعد القول بتعلق الروح بالاجساد المثالیۃ عند النوم ایضا کما یشھد بہ ما یری فی المنام" (ثالث بحار) "نیند کے وقت روح کا جسم مثالی کے ساتھ تعلّق پیدا کرنا بعید نہیں ہے۔ جیسا کہ عالمِ خواب کے واقعات اس پر شاہد ہیں"۔

جسم مثالی والے نظریّہ پر وارد شدہ بعض شکوک وشبہات کا ازالہ

مذکورہ بالا مطلب پر جو بعض اعتراضات کیے جاتے ہیں ان کا ازالہ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔

پہلا شبہ

پہلا شبہ یہ ہے کہ اس سے تناسخ لازم آتا ہے، جو کہ مُسلمانوں کے نزدیک باطل ہے۔ لہٰذا یہ اجسادِ مثالیہ میں روحوں کے داخل ہونے والا قول غلط ہے۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ

یہ شبہ تناسخ باطل کا مفہوم نہ سمجھنے پر مبنی ہے۔ مُعترض نے معنی تناسخ میں اس امر کو تو یاد رکھا کہ

"نقل روح من بدن الی بدن" لیکن اس کے دوسرے قیود کو نظر انداز کر دیا کہ یہ نقل و انتقال اسی عالم مادی اور جسم مادی میں ہو اور وہ بھی بطور سزا یا جزا کے ہو، اور وہ بھی بطور سزا یا جزا کے ہو۔ ایسے مُعترض کی حالت پر یہ شعر اچھی طرح منطبق ہوتا ہے: ع

و قل للذی یدعی فی العلم فلسفة حفظت شیئا و غابت عنك اشیاء

حضرت محقق شیخ بہائی علیہ الرحمہ اس شبہ کا جواب دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

و ھذا توھم سخیف لان التناسخ الذی اطبق المسلمون علی ابطاله ھو تعلق الارواح بعد خراب اجسادھا فی ابدان اخر فی ھذا العالم و اما القول بتعلقھا فی عالم أخر بابدان مثالیة مدة البرزخ الی ان تقوم قیامتھا الکبریٰ فتعود الی ابدانھا الاصلیة باذن مبدعھا فلیس من التناسخ فی شئ (بحوالہ ثالث بحار الانوار)

یعنی یہ وہم بالکل باطل ہے۔ کیونکہ وہ تناسخ جس کے باطل ہونے پر تمام مُسلمانوں کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ اسی عالم مادی میں روحیں اپنے بدنوں کے خراب ہونے کے بعد دوسرے اجسام سے تعلّق پیدا کر لیں۔ لیکن یہ قول کہ ایک اور عالم (برزخ) میں روحوں کا تعلق قیامت تک ابدانِ مثالیہ کے ساتھ ہو جائے اور اس کے بعد اپنے خالق کے اذن سے پلٹ کر اپنے اجساد اصلیہ میں داخل ہو جائیں تو یہ ہرگز تناسخ باطل نہیں ہے۔ پس ثابت ہوا کہ تناسخ کے لیے اسی دنیا میں متبادل اجسام کا ہونا ضروری ہے، نہ کہ دوسرے عالم میں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ عالم برزخ اس عالم میں سے نہیں ہے۔ نیز تناسخ میں روح کا انتقال ایک بدن سے دوسرے جسم مادی کی طرف ضروری ہے اور جسم مثالی لطیف ہے نہ کہ مادی و کثیف۔

دوسرا شبہ:

روح نے دارِ دنیا میں اطاعت یا معصیت تو اس جسم مادی کے ذریعہ سے کی ہے تو چاہیے جزا و سزا بھی اسی جسم کے ساتھ ہو۔ اس جسم مثالی کے ساتھ تو اس نے نہ کوئی اطاعت کی ہے جو مستحق انعام و اکرام بنے اور نہ ہی اس کے ساتھ اس نے کوئی نافرمانی کی ہے تاکہ مستوجب عقوبت قرار پائے۔ لہٰذا جسم مثالی کے ساتھ اسے کس طرح جزا یا سزا دی جا سکتی ہے۔ یہ بات تو عدلِ خداوندی کے منافی ہے۔ اس شبہ کا کئی طرح جواب دیا جا سکتا ہے۔

اس شبہ کا پہلا جواب:

یہ اجسامِ مثالیہ انہی اجسامِ دنیویہ کے ظلال (سائے) اور انہی کے عکس و پرتو ہیں۔ دارِ دنیا میں

بھی روح کو ان کے ساتھ عالمِ خواب وغیرہ میں کچھ نہ کچھ ضرور تعلّق رہتا تھا، جیسا کہ اوپر علامہ مجلسیؒ کے کلام حقیقت ترجمان سے اس امر کا بیان ہو چکا ہے۔ لہٰذا اس دنیوی تعلّق و علاقہ کی وجہ سے عقلاً ارواح کو ان اجسامِ مثالیہ برزخیہ میں جزا یا سزا دینا جائز ہے۔ اس سے کوئی خرابی لازم نہیں آتی۔

دوسرا جواب:

یہ بھی دیا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے یہ اجسامِ مثالیہ ابدانِ دنیویہ عنصریہ کے اجزاء اصلیہ سے پیدا ہوئے ہوں۔ خداوند عالم کی قدرت سے یہ امر کچھ بعید نہیں ہے۔ لہٰذا ان اجسام میں روح کو جزا یا سزا دینا گویا اس جسم مادی دنیوی میں جزا یا سزا دینے کے مترادف ہے۔ چنانچہ آیت مبارکہ: "كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا" (سورۃ النساء:۵۶) کہ جب اہلِ جہنم کے چمڑے گل سڑ جائیں گے، تو ہم ان کے چمڑوں کو بدل دیں گے، سے پیدا شدہ سوال کہ اس دوسرے چمڑے نے کیا قصور کیا ہے کہ اسے آتشِ جہنم میں جلایا جائے؟ کا بھی یہی جواب دیا جاتا ہے کہ وہ دوسرا چمڑا چونکہ اسی اصل چمڑے کے مادے سے پیدا ہوا ہے، اس لیے گویا وہ وہی پہلا چمڑا ہی ہے۔ اس طرح بھی اس شبہ کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔

تیسرا جواب:

ممکن ہے عالم برزخ میں خود روح جسم مثالی کی شکل میں مصور و مجسّم ہو جائے۔ یہ احتمال روح کی جسامت والے قول کی بنا پر اور بھی قوی ہو جاتا ہے۔ بنابریں جزا و سزا اسی روح ہی کو دی جائے گی نہ کہ کسی اور چیز کو۔ اس تیسرے جواب کو صاحب خزینۃ الجواہر نے اختیار فرمایا ہے اور اس پر بعض شواہد بھی پیش فرماتے ہیں۔ "وان کان الاول اولی" بہر کیف جس جواب کو بھی اختیار کیا جائے اصل شبہ ہباءً منثورا ہو کر رہ جاتا ہے۔ فقدمنا الی ما عملوا من عمل فجعلناہ ہباء منثوراً۔

تتمہ مُہمّہ

مُصنّف علیہ الرحمہ نے حضرت فاطمہؑ بنت اسد کے متعلّق جو روایت نقل فرمائی ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بروز قیامت مردے برہنہ محشور ہوں گے۔ اسی طرح اور بعض روایات بھی بالصراحت اس امر پر دلالت کرتی ہیں۔ لیکن ان روایات کے بالمقابل بکثرت ایسی روایتیں بھی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت میں مردے اپنے کفنوں کے ساتھ اٹھائے جائیں گے۔

ان روایات میں یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ اپنے مردوں کو اچھے کفن دو۔ کیونکہ وہ بروز حشر انہی کفنوں میں محشور ہوں گے اور کفن کی عمدگی پر نازاں و فرحاں ہوں گے۔ (وسائل الشیعہ)

ان روایتوں میں بظاہر چونکہ تعارض و تضاد پایا جاتا ہے، اس لیے علمائے اعلام نے ان کے درمیان بچند وجہ جمع و توفیق فرمائی ہے۔

وجہ اول:

ممکن ہے کہ یہ اختلاف لوگوں کے ایمان و کفر کے اختلاف کی وجہ سے ہو۔ یعنی جو مومن ہوں گے، وہ کفنوں میں محشور ہوں گے اور جو کافر ہوں گے وہ برہنہ محشور ہوں گے۔ اور چونکہ مومن بہت کم ہیں، اس لیے تغلیباً یہ کہہ دیا گیا کہ گویا تمام لوگ عریاں محشور ہوں گے۔

وجہ دوم:

ممکن ہے عرصہ محشر کے مختلف مقامات پر لوگوں کے مختلف حالات ہوں۔ بعض مقامات پر کفن کے ساتھ ہوں اور بعض میں عاری ہوں، کیونکہ روز قیامت کوئی معمولی سا دن تو نہیں ہے بلکہ وہ "ان یوما عند ربك كالف سنة مما تعدون" (سورۃ حج:۴۷) قیامت کا ایک دن دُنیوی ایک ہزار سال کے برابر ہے، کا مصداق ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ ابتداء میں کفن موجود ہوں مگر بعد میں بوجہ شدت کہنگی پارہ پارہ ہو کر ختم ہو جائیں۔

وجہ سوم:

ممکن ہے کہ بروز حشر انسانوں کے ساتھ ان کے شرم و حیا کے مطابق سلوک کیا جائے۔ یعنی جو لوگ حیادار تھے وہ کفنوں میں محشور ہوئے تو جب بھی کسی انسان کی پردہ دری نہیں ہوگی۔ کیونکہ کوئی انسان کسی دوسرے کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ کیونکہ نفسا نفسی کا وہ عالم ہوگا کہ کسی کو کسی کا خیال تک نہ ہوگا۔

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ﴿۳۴﴾ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ﴿۳۵﴾ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ﴿۳۶﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ﴿۳۷﴾ (سورۃ عبس: ۳۴ تا ۳۷)

باب الاعتقاد

فی الرجعة

قال الشیخ ابوجعفر اعتقادنا فی الرجعة انها حق و قد قال اللہ عزوجل فی کتابه العزیز الم تر الی الذین خرجوا من دیارھم وھم الوف حذر الموت فقال لھم اللہ موتوا ثم احیاھم

اٹھارھواں باب

رجعت کے متعلق عقیدہ

جناب شیخ صدوق علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ رجعت کے متعلق ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ وہ برحق ہے جیسا کہ خداوند عالم اپنی کتاب عزیز میں فرماتا ہے: کیا تم نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جو ہزاروں کی تعداد میں تھے اور موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکل پڑے۔ خدا نے انھیں حکم دیا کہ تم مرجاؤ (جب وہ مر چکے تو) پھر انھیں زندہ کیا (بقرہ:۲۴۳)

اٹھارھواں بابؒ

عقیدۂ رجعت کا بیان

اگرچہ حضرت مُصنّف علام نے رجعت کے موضوع پر اس قدر جامع تبصرہ فرمادیا ہے جو ایک چشم بصیرت رکھنے والے طالبِ حق کے لیے کافی ووافی ہے لیکن مومنین کی مزید جلائے ایمان کی خاطر اس کی بعض تفاصیل ذکر کی جاتی ہیں اور اس بارے میں حضرات مشککین کے شکوک وشبہات زائل کرکے ان کی تسکینِ قلب کی بھی کوشش کی جاتی ہے۔

مفہوم رجعت کی تعیین اور اس کا ضروریاتِ مذہب سے ہونا

رجعت کا مطلب یہ ہے کہ جب حضرت امام عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ کا ظہور السرور ہوگا تو اس وقت جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، بعض دیگر انبیاء علیہم السلام، تمام یا بعض ائمہ طاہرین صلوات اللہ علیہم اجمعین، کامل مومنین اور بعض کفار ومنافقین بھی دوبارہ دارِ دنیا میں بھیجے جائیں گے تاکہ اہلِ بیت نبوت دنیا میں شہنشاہی کرسکیں۔ اور انبیاء وائمہ کے ظالموں اور قاتلوں سے اخروی عذاب وعقاب سے پہلے اِنتقام لیا جاسکے۔ چنانچہ ارشادِ قدرت ہے:

وَ لَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ (سورۃ السجدۃ:۲۱)

ہم ان لوگوں کو بڑے عذاب سے قبل چھوٹے عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔

کان ھولاء سبعین الف بیت و کان قد یقع فیھم الطاعون کل سنة فیخرج الاغنیاء لقوتھم و یبقی الفقراء لضعفھم فیقل الطاعون فی الذین یخرجون و یکثر فی الذین یقیمون فیقول الذین یقیمون لو خرجنا لما اصابنا الطاعون و یقول الذین خرجوا لو اقمنا لاصابنا کما اصابھم فاجمعوا ان یخرجوا جمیعا من دیارھم اذا کان وقت الطاعون فخرجوا جمیعھم فنزلوا علی شط فلما وضعوا رحالھم ناداھم اللہ موتوا فماتوا جمیعا فکنستھم	یہ لوگ ستر ہزار گھروں کے رہنے والے تھے اور ہر سال مرض طاعون میں مُبتلا ہوتے تھے ۔ مالدار تو اپنی دولت و طاقت کی بنا پر باہر نکل جاتے مگر غریب لوگ اپنی کمزوری اور غربت کی وجہ سے گھروں میں رہ جاتے (نتیجہ یہ ہوتا کہ) جو لوگ باہر نکل جاتے وہ بہت کم طاعون کا شکار ہوتے اور جو گھروں میں رہ جاتے وہ بکثرت اس میں مُبتلا ہوتے تو جو لوگ باقی رہ جاتے وہ یہ کہتے کہ کاش ہم بھی نکل سکتے تو طاعون سے محفوظ رہتے جو لوگ باہر نکل جاتے وہ یہ کہتے کہ اگر ہم بھی وہاں مقیم رہتے تو جس طرح ان لوگوں پر مصیبت نازل ہوئی ہے ہم بھی اس آفت میں گرفتار ہوجاتے (بالآخر) ان تمام لوگوں نے اس بات پر اتفاق کر لیا کہ اب جب وبائے طاعون کا وقت آئے تو تمام کے تمام گھروں سے نکل جائیں ۔ چنانچہ انھوں نے (مقررہ وقت پر) ایسا ہی کیا اور سب نے گھروں سے نکل کر ایک دریا کے کنارے جا کر رحل اقامت ڈال دیا۔ اس وقت خدا کے جبار نے آواز دی کہ تم سب کے سب مرجاؤ چنانچہ وہ تمام مرگئے

اور کامل مومنین اپنے ائمہ طاہرینؑ کی سلطنت اور ظالموں سے انتقام لینا دیکھ کر مسرور و شاد کام ہوں۔ یہ عقیدہ ضروریاتِ مذہبِ شیعہ خیر البریہ میں سے ہے ۔یعنی اس کا انکار کرنے والا اس مذہب حق سے خارج ہوجاتا ہے ۔ جیسا کہ احادیث کثیرہ میں معصومین علیہم السلام سے مروی ہے ۔ فرمایا: "لیس منا من لم یقر برجعتنا" جو شخص ہماری رجعت کا اقرار نہ کرے وہ ہم سے نہیں ہے ۔ (حق الیقین شبرؒ وغیرہ)

سرکار علامہ مجلسیؒ اپنے رسالہ اعتقادیہ میں فرماتے ہیں : "ویجب ان تومن بالرجعة فانھا من خصائص الشیعة و اشتھر ثبوتھا عن الائمة بین الخاصة و العامة و قد روی عنھم لیس منا من لم یومن بکرتنا" ۔ واجب ہے کہ تم رجعت پر ایمان رکھو کہ یہ رجعت شیعوں کے خصائص میں سے ہے ۔ اور اس کا مذہب اہل بیت ہونا شیعہ اور سنی دونوں کے درمیان مشہور و معروف ہے ۔ حضرات معصومینؑ سے مروی ہے کہ جو شخص ہماری رجعت کا اقرار نہ کرے وہ ہمارے مذہب سے خارج ہے ۔

المارة عن الطریق فبقوا بذلك ماشاء الله فمر بهم نبی من انبیاء بنی اسرائیل یقال له ارمیا فقال لو شئت یا رب لا حییتهم فیعمروا بلادك و یلدوا عبادك و یعبدونك مع من یعبدك فاوحی الله تعالیٰ الیه افتحب ان احییهم لك قال نعم یا رب فاحیاهم الله له و بعثهم معه فهؤلاء ماتوا و رجعوا الی الدنیا ثم ماتوا باجالهم فقال الله تعالیٰ اوكالذی مر علی قریة و هی خاویة علی عروشها قال انی یحیی هٰذه الله

راہگزاروں نے انھیں راستہ سے ہٹا دیا اور جب تک خدا نے چاہا، وہ اسی حال میں پڑے رہے۔ یہاں تک کہ انبیاء بنی اسرائیل میں سے ایک نبی کا وہاں سے گزر ہوا جس کو ارمیا کہا جاتا تھا (بروایتے اس نبی کا نام عزیر تھا) اس نبی نے خدا کی بارگاہ میں عرض کیا: اے پروردگار! اگر تیری مرضی و مشیّت ہو تو انھیں زندہ کر دے تاکہ یہ لوگ تیرے شہروں کو آباد و شاداب کریں، تیرے بندوں کو جنیں اور تیرے عبادت گزاروں کے ساتھ مل کر تیری عبادت کریں۔ خدا نے ان کو وحی کی کہ کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمھارے سبب سے انھیں زندہ کر دوں؟ انھوں نے عرض کیا: ہاں اے میرے پروردگار! چنانچہ خداوند تبارک و تعالیٰ نے اپنے نبی کے وسیلہ سے انھیں دوبارہ زندگی عطا کی اور ان سب کو آنجناب کے ساتھ روانہ کر دیا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ان لوگوں کی مرنے کے بعد دوبارہ دنیا میں رجعت ہوئی اور بعد میں اپنی مقررہ اجلوں پر وفات پائی۔

اسی طرح قرآن میں ایک مقام پر خدا فرماتا ہے:

رجعتؑ کا اثباتؑ

رجعت کی صحت و حقانیت اور اس کے وقوع پذیر ہونے پر علاوہ فرقہ مُحِقّہ کے اجماع و اتفاق کے آیاتِ متکاثرہ اور روایاتِ متواترہ بھی دلالت کرتی ہیں۔ مخالفین ہمیشہ اس مسئلہ کی وجہ سے اہل حق پر زبانِ طعن و تشنیع دراز کرتے ہیں جو کہ بالکل بلا وجہ ہے۔ کیونکہ رجعت میں عقلاً و نقلاً ہرگز کوئی اشکال نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا ہونا عقلاً ممکن ہے اور خداوند عالم کی قدرتِ کاملہ کے تحت ہے، ورنہ پھر مُعترضین کو قیامت کا بھی انکار کرنا پڑے گا اور اس کے ممکن ہونے کی سب سے قوی دلیل اس کا امم سابقہ میں وقوع پذیر ہونا ہے۔ (جیسا کہ ہم ذرا آگے چل کر ثابت کریں گے) لہٰذا جب یہ ممکن ہے اور مخبرین صادقین نے اس کے وقوع کی خبر دی ہے تو پھر اہلِ عقل و انصاف یہ بتائیں کہ اس کا انکار کرنا کہاں تک قرین عقل ہو سکتا ہے۔

بعد موتها فاماته الله مائة عام ثم بعثه قال کم لبثتَ قال لبثتُ یوما او بعض یوم قال بل لبثت مائة عام فانظر الی طعامك و شرابك لم یتسنة و انظر الی حمارك و لنجعلك آیة للناس و انظر الی العظام کیف ننشزها ثم نکسوها لحما فلما تبین له قال اعلم ان الله علی کل شی قدیر فهذا امات مائة عام ثم رجع الی الدنیا و بقی فیها ثم مات باجله و هو عزیر و روی انه ارمیا و قال الله تعالیٰ

اس شخص کا واقعہ یاد کرو جو ایک بستی کے پاس سے اس وقت گزرا جب کہ وہ اپنی چھتوں کے بل اوندھی پڑی ہوئی تھی۔ اس شخص نے (از راہِ تعجب) کہا کہ اس کے نیست و نابود ہوجانے کے بعد کیونکر خدا اسے دوبارہ زندہ کرے گا؟ اس پر خدا نے وہیں اس شخص کو سَو برس تک کے لیے موت دے دی۔ پھر اسے زندہ کر کے فرمایا: تم یہاں کتنی دیر ٹھہرے ہو؟ اس نے کہا: ایک روز یا اس سے بھی کچھ کم۔ خدا نے فرمایا: بلکہ تم تو یہاں سَو سال تک پڑے رہے ہو۔ اب اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو جن میں بدبو نہیں پڑی اور اپنے گدھے کو بھی دیکھو یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ ہم تمھیں انسانوں کے لیے اپنی خاص نشانی قرار دیں۔ اب (گدھے) کی ہڈیوں کی طرف ذرا دیکھو کہ ہم کس طرح انھیں زندہ کر کے ان پر گوشت چڑھاتے ہیں (بقرہ: ۲۵۹) پس جب اس پر اصل حقیقت واضح ہوگئ تو اس نے کہا کہ مجھے کامل یقین ہے کہ خدا ہر چیز پر پوری پوری قدرت رکھتا ہے۔ اب اس شخص کو دیکھو جو پورا سَو سال تک مرا رہنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوا، دنیا میں آیا اور اس میں زندہ رہا اور بالآخر مقررہ وقت پر انتقال کیا یہ بزرگوار جناب عزیرؑ اور بروایتے جناب ارمیا تھے۔

اثباتِ رجعت قرآنِ کریم کی روشنی میں

اس سلسلہ میں کئی آیاتِ شریفہ پیش کی جاسکتی ہیں، جن میں سے چار پانچ آیتیں تو جناب مُصنّف علام نے پیش کر دی ہیں اور ان کی وجہ دلالت بھی بالاختصار بیان فرما دی ہے، اگرچہ ان کی تشریح و توضیح کے سلسلہ میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے لیکن بخوفِ طوالت ہم اس کو نظر انداز کر کے مزید دو چار آیاتِ مبارکہ پیش کرتے ہیں جو کہ عقیدہ رجعت کی صحت و حقانیت پر دلالت کرتی ہیں۔

پہلی آیت مبارکہ

ارشادِ قدرت ہے:

فی قصة المختارین من بنی اسرائیل من قوم موسیٰ لمیقات ربه ثم بعثنا کم من بعد موتکم لعلکم تشکرون و ذلك انهم لما سمعوا کلام الله تعالیٰ قالوا لا نصدق به حتی نری الله جهرة فاخذتهم الصاعقة بظلمهم فماتوا فقال موسیٰ یا رب ما اقول لبنی اسرائیل اذا رجعت الیهم فاحیاهم الله فرجعوا الی الدنیا فاکلوا و شربوا و نکحوا النساء و ولدلهم الاولاد و بقوا فیها ثم ماتوا بآجالهم

قرآن مجید میں خداوند عالم نے جناب موسیٰؑ کی قوم بنی اسرائیل میں سے ان لوگوں کے قصے میں فرمایا ہے جن کو حضرت موسیٰؑ نے میقاتِ پروردگار کے لیے منتخب کیا تھا۔ ہم نے تمھیں مرنے کے اس لیے دوبارہ زندہ کیا ہے تاکہ تم میرا شکر کرو۔ واقعہ اس طرح ہے کہ قوم موسیٰ نے جب اللہ کا کلام سنا تو کہا ہم جب تک اللہ کو ظاہر بظاہر نہ دیکھ لیں اس وقت تک اس کی تصدیق نہ کریں گے ان کو اس کج بحثی اور زیادتی کی وجہ سے آسمانی بجلی نے موت کے گھاٹ اتار دیا (بقرہ:۵۵) جب وہ سب مر گئے تو جناب موسیٰؑ نے بارگاہِ احدیت میں عرض کیا اے میرے پروردگار جب میں اپنی قوم بنی اسرائیل کے پاس جاؤں گا تو انھیں کیا جواب دوں گا؟ اس پر خدائے قدیر نے ان کو زندہ کر دیا اس طرح ان سب کی دنیا کی طرف رجعت ہوئی۔ دنیا میں کھاتے پیتے رہے، شادیاں کیں اور ان کے ہاں اولادیں پیدا ہوئیں، اس طرح کافی عرصہ تک زندہ رہنے کے بعد اپنی مقررہ اجلوں پر پیک اجل کو لبیک کہا

هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۙ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾ (سورۃ التوبۃ:۳۳)

خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ ان کے دین کو دوسرے تمام ادیان پر غلبہ دے۔ اگرچہ مشرک اس بات کو ناپسند ہی کریں۔

ظاہر ہے کہ یہ غلبہ اب تک حاصل نہیں ہوسکا، حالانکہ قرآن کی صداقت میں تو کوئی مسلمان شک و شبہ کر نہیں سکتا، لہٰذا ماننا پڑے گا کہ ایک ایسا زمانہ آنا ضروری ہے جس میں دین اسلام کو مکمل تسلّط و غلبہ حاصل ہو، اور یہی زمانہ رجعت ہے، جیسا کہ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں متعدد روایات موجود ہیں۔ حتی کہ بعض مفسّرین اہل سنت نے بھی اس کی تفسیر میں صراحت کے ساتھ لکھ دیا ہے کہ: "ذلك عند نزول عیسی و خروج المهدی فلا یبقی اهل دین الا دخلوا فی الاسلام" (تفسیر فتح البیان و ابن کثیر وغیرہ) یعنی یہ وعدہ حضرت مہدی کے ظہور اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت پورا

و قال اللہ تعالیٰ یا عیسی ابن مریم اذ تحی الموتی باذنی فجمیع الموتی الذین احیاھم عیسی باذن اللہ تعالیٰ	خداوند عالم حضرت عیسٰی علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرماتا ہے "اے عیسٰیؑ! اس وقت کو یاد کرو جب کہ تم میرے اذن سے مردوں کو زندہ کرتے تھے" (مائدہ: ۱۱۰) اس سے ثابت ہوا کہ جو لوگ جناب عیسٰی علیہ السلام کے ہاتھوں پر بحکمِ خدا زندہ ہوئے

ہوگا۔ اس وقت تمام ادیان والے لوگ دین اسلام میں داخل ہوجائیں گے"۔

اس تفسیری بیان نیز تبادر الی الاذہان سے یہ بات بالکل واضح وعیاں ہے کہ غلبہ سے مراد ظاہری تمکنت وتسلّط جس کے لیے دوسرے ادیان کا بالکل نیست ونابود یا کالعدم ہوجانا ضروری ہے۔ نہ کہ غلبہ بالدلیل۔ کیونکہ یہ تاویل خود بوجہ بلا دلیل ہونے کے بالکل علیل ہے۔ کما لا یخفٰی

دوسری آیت مبارکہ:

خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

وَاِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِیۡثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَاۤ اٰتَیۡتُكُمۡ مِّنۡ كِتٰبٍ وَّحِكۡمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمۡ لَتُؤۡمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنۡصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقۡرَرۡتُمۡ وَاَخَذۡتُمۡ عَلٰی ذٰلِكُمۡ اِصۡرِیۡ ؕ قَالُوۡۤا اَقۡرَرۡنَا ؕ قَالَ فَاشۡهَدُوۡا وَاَنَا مَعَكُمۡ مِّنَ الشّٰهِدِیۡنَ ﴿۸۱﴾ (سورۃ آلِ عمران: ۸۱)

اور جس وقت خدا نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ میں تم کو کتاب اور حکمت دوں گا۔ پھر ایک رسول تمھارے پاس والی چیزوں کی تصدیق کرتا ہوا آئے گا تو تم ضرور بالضرور اس پر ایمان لانا، اور ضرور بالضرور اس کی مدد کرنا۔ پھر خدا نے فرمایا کہ کیا تم نے اس کا اقرار کیا؟ اور کیا تم نے میرا یہ بوجھ اپنے ذمہ لے لیا؟ تو سب نے کہا کہ ہم نے اقرار کیا۔ خدا نے فرمایا کہ اب تم سب گواہ رہو، اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہی دینے والا ہوں۔

یہ امر محتاجِ بیان نہیں ہے کہ خداوند عالم نے انبیاء کرامؑ سے جو عہد وپیمان لیا تھا وہ تا حال پورا نہیں ہوا۔ نہ تا حال حضرات انبیاء علیہم السلام نے کبھی اس دارِ دنیا میں جناب پیغمبر اسلامؐ کی نصرت وامداد کی ہے اور نہ ہی ظاہر ہو کر آں جناب پر ایمان لائے۔ حالانکہ اس وعدہ کی ایفاء بہرحال لازم ہے ورنہ عصمت تو کیا خود ان کی نبوّت بھی معرض خطر میں پڑ جائے گی۔ اس آیت کی تفسیر جو معادن وحی وتنزیل نے بیان فرمائی ہے اس میں مذکور ہے کہ یہ وعدہ زمانہ رجعت میں پورا ہوگا۔ حضرت عیسٰیؑ تمام

رجعوا الی الدنیا و بقوا فیہا ما بقوا ثم ماتوا باجالھم و اصحاب الکھف لبثوا فی کھفھم ثلثمائۃ سنین و ازدادوا تسعا ثم بعثھم اللہ فرجعوا الی الدنیا لیتسائلوا بینھم و قصتھم معروفۃ فان قال قائل ان اللہ تعالیٰ قال و تحسبھم ایقاظا و ھم رقود قیل لھم فانھم کانوا موتی و قد قال اللہ عزوجل یا ویلنا من بعثنا من مرقدنا ھذا ما وعد الرحمن و صدق المرسلون و ان قالوا کذلک فانھم کانوا موتی

ان سب کی دنیا میں رجعت ہوئی اور وہ دنیا میں زندہ رہے اور پھر اپنے مقررہ وقتوں پر وفات پا گئے۔ اسی طرح اصحابِ کہف بھی تین سَو نو برس تک غار میں مرے پڑے رہے۔ پھر دنیا میں ان کی رجعت ہوئی (کہف:۲۵) اور خدا نے انھیں دوبارہ زندہ کیا، تاکہ وہ ایک دوسرے سے سوال کریں۔ اصحابِ کہف کا یہ قصہ مشہُور ہے (اور کتب سیر و تواریخ و تفاسیر میں مذکور ہے) اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ خدا فرماتا ہے اے میرے حبیبؐ! تم خیال کروگے کہ وہ (اصحابِ کہف) بیدار ہیں، حالانکہ وہ تو سوئے ہوئے ہیں (کہف:۱۸) (لہٰذا سوکر اٹھنا تو رجعت نہیں ہے) اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ مر چکے تھے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں خداوند عالم کفار کی زبانی فرماتا ہے: ہائے افسوس کس نے ہمیں اپنی خواب گاہوں سے اٹھایا؟ (جواب میں کہا جائے گا:)

انبیاء کرام کی نیابت میں ان ہر دو فریضہ کا انجام دیں گے بلکہ انبیاء بنفسِ نفیس تشریف لاکر اس فرض سے سبکدوش ہوں گے اور رسولِ اسلامؐ کی مسند کے حقیقی وارث کی نصرت کا فریضہ انجام دے کر بالواسطہ خود نصرتِ رسولؐ کا فرض انجام دیں گے۔ (تفسیر صافی وغیرہ)

تیسری آیت مبارکہ:

خلاقِ عالم اپنے کلام میں فرماتا ہے:

وَ نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۝ (سورۃ القصص: ۵)

اور ہم یہ ارادہ رکھتے ہیں کہ ان لوگوں پر جو اس سرزمین میں کمزور کر دیے گئے ہیں، احسان کریں اور ان کو امام بنائیں اور ان کو ہم وارث قرار دیں۔

دُنیا جانتی ہے کہ جس قدر کمزور و ناتواں ہمارے ائمۂ اہلِ بیت علیہم السلام کو سمجھا گیا، اتنا کسی اور شخص کو نہیں سمجھا گیا۔ لیکن خداوند عالم نے ان کے ساتھ جو وراثتِ ارضیہ اور سلطنتِ آفاقیہ کا وعدہ کیا تھا وہ

و مثل هذا كثير فقد صح ان الرجعة كانت فی الامم السابقة فقد قال النبیؐ يكون فی هذه الامة ما كان فی الامم السابقة حذو النعل بالنعل و القذة بالقذة فيجب علی هذا الاصل ان يكون فی هذه الامة رجعة و قد نقل مخالفونا انه اذا خرج المهدیؑ نزل عيسیٰ ابن مريم من السماء فصلی خلفه و نزوله الی الارض

یہ وہی (یوم آخرت) ہے جس کا وعدہ رحمٰن نے کیا تھا۔ اور سچی خبر دی تھی خدا کے رسولوں نے (یٰس: ۵۲) پس اگر وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ کفار موت کے بعد اٹھیں گے مگر اس کے باوجود قبور کو مرقد (خواب گاہ) کہا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اصحابِ کہف کی بھی یہی کیفیت تھی وہ مردہ تھے جو دوبارہ زندہ کیے گئے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ جس طرح قبور کو مجازاً خوابگاہ کہا گیا ہے اسی طرح اصحابِ کہف کی موت کو مجازاً نیند سے تعبیر کیا گیا ہے اور موت اور نیند میں جو مشابہت ہے وہ مخفی نہیں ہے۔ اس کی مثل اور بھی بہت سی آیات موجود ہیں۔ پس ان حقائق کی روشنی میں ثابت ہوا کہ گزشتہ امتوں میں رجعت ہوتی رہی ہے اور آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ جو واقعات اگلی امتوں میں ہو چکے ہیں وہ بعینہٖ میری امت میں بھی ضرور ہوں گے جس طرح ایک کفش دوسرے کفش کے اور ایک تیر دوسرے تیر کے برابر ہوتا ہے۔ لہٰذا ہمارے مخالفین نے بھی یہ روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت مہدیؑ کا ظہور ہوگا تو اس وقت جناب عیسیٰ آسمان سے اتریں گے اور امامؑ کی اقتداء میں نماز پڑھیں گے۔

تاحال پورا نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس ایفائے عہد کے لیے کوئی زمانہ ضرور ہونا چاہیے۔ احادیث معدنِ عصمت وطہارت سے پتا چلتا ہے کہ یہ عہد زمانۂ رجعت میں پورا ہوگا۔ (تفسیر البرہان وصافی وغیرہ)

چوتھی آیت مبارکہ:

خداوند عالم کا فرمان ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ص وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ط يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ط وَ مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۵۵﴾ (سورۃ النور:۵۵)

ان سب لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے، اللہ نے یہ وعدہ کیا ہے کہ ضرور ان کو اس زمین میں جانشین بنائے گا۔ جیسا کہ ان سے پہلوں

رجوعه الی الدنیا بعد موته لان الله عزوجل قال انی متوفیك و رافعك الی و قال عزوجل و حشرنا هم فلم نغادر منهم احدا	حضرت عیسیٰؑ کا یہ زمین پر نازل ہونا اور دنیا میں رجوع کرنا ان کی موت کے بعد ہوگا۔ جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے: اے عیسیٰؑ میں تمھیں وفات دینے والا اور اپنی طرف اٹھانے والا ہوں (عمران: ۵۵) خداوند عالم ایک مقام پر فرماتا ہے: ہم انھیں اس طرح محشور کریں گے کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی نہ چھوڑیں گے (کہف: ۴۷) اور

کے جانشین بنایا تھا اور ضرور ان کے دین کو جو اس نے ان کے لیے پسند کرلیا ہے ان کی خاطر سے پائیدار کردے گا اور ضرور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔ اس وقت وہ میری ہی عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک نہ ٹھہرائیں گے اور جو اس کے بعد ناشکری کرے گا، پس نافرمان وہی ہیں۔ (ترجمہ مقبولؒ)

حقیقت یہ ہے کہ یہ وعدۂ خداوندی بھی ابھی تک پورا نہیں ہوا۔ چنانچہ ایک روایت میں وارد ہے کہ مُفضل نے حضرت صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا: فرزند رسولؐ! ناصبی لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ آیت فلاں وفلاں کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ حضرتؑ نے یہ سن کر فرمایا: لا یهدی الله قلوب الناصبة متی کان الدین الذی ارتضاه الله و رسوله متمکنا بانتشار الامن فی الامة و ذهاب الخوف من قلوبها و ارتفاع الشك من صدورها فی عهد هؤلاء و فی عهد علیؑ مع ارتداد المسلمین و الفتن التی کانت تثور فی ایامهم و الحروب التی تنشب بین الکفار و بینهم ۔" خدا تعالیٰ ناصبیوں کے دلوں کو ہدایت نہ کرے، بھلا ان لوگوں کے زمانہ میں (جن کے حق میں یہ آیت نزول بتاتے ہیں) اس دین کو جو خدا اور رسولؐ کا پسندیدہ ہے، کب اس طرح تمکنت حاصل ہوئی تھی کہ تمام امتِ اسلامیہ میں امن وامان قائم ہوا ہو۔ اور ان کے دلوں سے خوف وہراس اور شک وشبہات دور ہوگئے ہوں۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ ان کے درمیان جنگوں کا سلسلہ برابر جاری وساری رہا۔ (تفسیر صافی) لہٰذا اس آیت میں جو وعدہ بعض مخصوص ذواتِ قدسیہ سے کیا گیا ہے اس کے پورا ہونے کے لیے بھی ایک زمانہ درکار ہے، اور وہ زمانہ رجعت ہی ہے۔ جیسا کہ تفاسیر اہلِ بیتؑ میں وارد ہے۔ (ملاحظہ ہو تفسیر برہان وصافی وغیرہ)

پانچویں آیتِ مبارکہ:

ارشادِ ایزدی ہے:

وَحَرٰمٌ عَلٰی قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۹۵﴾ (سورۃ الانبیاء:۹۵)

و قال اللہ تعالیٰ و یوم نحشر من کل امۃ فوجا ممن یکذب بایاتنا فالیوم الذی یحشر فیہ الجمیع غیر الذی یحشر فیہ الفوج و قال اللہ عزوجل و اقسموا باللہ

دوسری جگہ فرماتا ہے: ہم ہر امت میں ایک گروہ کو جو ہماری آیات کو جھٹلاتا تھا محشور کریں گے۔ (نحل:۸۳)

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس روز (قیامت) تمام لوگوں کو محشور کیا جائے گا وہ دن اور ہے اور جس روز (رجعت) بعض گروہوں کو محشور کیا جائے گا وہ اور ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ ان لوگوں نے خدا کے نام کی سخت قسمیں کھائی ہیں کہ جو

جس بستی کو ہم نے ہلاک کیا ہے اس کے اہل پر رجعت حرام ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ آیت قیامت کے متعلق تو نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس میں تو سب لوگ ہی محشور ہوں گے خواہ وہ ہلاک شدگان ہوں اور خواہ اپنی طبعی موت مرنے والے ہوں۔ جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے: "و حشرناھم فلم نغادر منھم احدا" (کہف:۴۷) لہٰذا ماننا پڑے گا کہ یہ ہلاک ہونے والوں کا رجوع نہ کرنا کسی اور وقت سے متعلق ہے۔ اور وہ یہی زمانہ رجعت ہی ہے۔ جیسا کہ تفسیر قمی وغیرہ میں مروی ہے۔

اِثباتِ رجعت احادیثِ معصومینؑ کی روشنی میں

اس سلسلہ میں وارد شدہ روایات حدِ تواتر تک پہنچتی ہیں۔ اور بوجہ کثرت ان کا عد احصا یہاں ممکن نہیں ہے۔ محدث جلیل سید نعمت اللہ جزائری "انوارِ نعمانیہ" میں فرماتے ہیں: و الاخبار الدالۃ علی رجوع الحسین و امیرالمومنین علیھما السلام متواترۃ و فی رجوع سائر الائمۃ قریبۃ التواتر فلقد نقل بعض مشائخنا تقریباً من مأتی حدیث عن اربعین رجلا من ثقاۃ المحدثین من خمسین کتبا من الاصول المعتبرۃ۔ یعنی حضرت امام حسینؑ اور حضرت امیرالمومنینؑ کے زمانہ رجعت میں تشریف لانے کے متعلق تو روایات متواترہ ہیں۔ اور دوسرے ائمۂ طاہرینؑ کے متعلق بھی قریب بتواتر ہیں۔ ہمارے بعض مشائخ عظام (حضرت علامہ مجلسیؒ) نے اس سلسلہ میں تقریباً دوسو روایتیں قابلِ وثوق چالیس محدثین اور کتب معتبرہ میں سے پچاس معتبر کتابوں سے ("بحار الانوار" میں) نقل کی ہیں۔ "حق الیقین" مولانا سید عبداللہ شبر وغیرہ کتب مبسوطہ میں چالیس چالیس صفحوں تک یہ احادیث پھیلی ہوئی ہیں۔ خوفِ طوالت مانع ہے ورنہ کچھ اخبار ضرور یہاں درج کی جاتیں۔

عاقلاں را اشارتے کافیست

جهد ایمانهم لا یبعث الله من یموت بلی وعداً علیه حقاً و لکن اکثر الناس لا یعلمون	شخص مرجائے گا، خدا اسے زندہ نہیں کرے گا، حالانکہ خدا کا وعدہ حق ہے (وہ ضرور اٹھائے گا) مگر اکثر لوگ حقیقت حال سے بے خبر ہیں(نحل:۳۸)

کیفیت رجعت پر اجمالی ایمان رکھنا کافی ہے

باقی رہیں اس رجعت کی تفاصیل کہ آیا جناب رسولِ خدا اور تمام ائمہ ہدیٰ علیہ وعلیہم السلام تشریف لائیں گے یا بعض۔ اور تمام کے تشریف لانے کی صورت میں آیا سب بزرگوار یکبارگی تشریف لائیں گے یا یکے بعد دیگرے؟ اور یکبارگی تشریف لانے کی صورت میں آیا ان کی سلطنت و حکومت ان کی سابقہ ظاہری وجودی ترتیب کے مطابق ہوگی یا اس کے بالعکس؟ اور ان کی مدت حکومت و سلطنت کس قدر طویل ہوگی؟ یہ اور اس قسم کی دیگر بعض تفاصیل کے متعلق اخبار و آثار قدرے مختلف ہیں۔ بعض علماء اعلام نے اس اختلاف کا کھلے لفظوں میں اقرار کیا ہے۔ چنانچہ علامہ جزائری لکھتے ہیں: الحق ان الاخبار الواردة فی الرجعة مختلفة جدا مع کثرتها فمن جملة اختلافها ترتیب مل الائمة علیهم السلام......لخ ۔ یعنی حق و انصاف یہ ہے کہ رجعت کے بارے میں اخبار باوجود کثیر التعداد ہونے کے باہم بہت مختلف ہیں۔ من جملہ ان کے باہمی اختلاف کے ایک اختلاف یہ ہے کہ ائمہ اطہار علیہم السلام کی بادشاہی کی ترتیب کس طرح ہوگی؟

انہی اختلافات کے پیش نظر علمائے محققین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ان امور کے متعلق اجمالی ایمان و ایقان رکھنے اور تفاصیل کا علم حضرات ائمہ علیہم السلام کے سپرد کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ چنانچہ علامہ سید عبداللہ شبر (جنہیں مجلسی ثانی کا جاتا ہے) اپنی کتاب حق الیقین عربی جلد ثانی میں مکمل اڑتالیس صفحات تک مباحث رجعت لکھنے کے بعد بعنوان "تنبیہ" رقمطراز ہیں: "قد عرفت من الایات المتکاثرة و الاخبار المتواترة و کلام جملة من المتقدمین و المتاخرین من شیعة الائمة الطاهرین ان اصل الرجعة حق لا ریب فیه و لا شبة تعتریه و منکرها خارج من ربقة المومنین فانه من ضروریات مذهب الائمة الطاهرینؑ و لیست الاخبار فی الصراط و المیزان و نحوها مما یجب الاذعان به اکثر عدداً و اوضح سندًا و اصرح دلالة و افصح مقالة من اخبار الرجعة و اختلاف خصاصیاتها لا یقدح فی حقیقتها کوقوع الاختلاف فی خصوصیات الصراط و المیزان و نحوها فیجب الایمان باصل الرجعة اجمالاً و ان بعض المؤمنین و بعض الکفار یرجعون الی الدنیا و یکال تفاصیلها الیهم و الاحادیث فی رجعة

یعنی ذلك فی الرجعة و ذلك	یہاں اٹھائے جانے سے رجعت میں اٹھانا مراد ہے ۔ کیونکہ اس کے
انه یقول بعد ذلك لیبین	بعد خدا فرماتا ہے ۔ اس لیے ان کو اٹھائے گا، تاکہ خدا ان پر وہ بات
لھم الذی اختلفوا فیه	واضح کردے جس کی بابت یہ لوگ باہم اختلاف کرتے ہیں (نحل: ٦٤)

امیرالمومنینؑ و الحسینؑ متواترة معنیً و فی باقی الائمة قریبة من التواتر و کیفیة رجوعھم ھل علی الترتیب او غیرہ فکل علمھا الی اللہ سبحانہ و الی اولیائہ (ع)"۔ یعنی آیاتِ متکاثرہ، اخبارِ متواترہ اور بہت سے شیعہ علماء متقدمین ومتاخرین کے کلام سے ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ اصل رجعت برحق ہے۔ اس میں ہرگز کسی قسم کا کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ اور اس کا منکر زمرہ ایمان سے خارج ہے۔ کیونکہ یہ عقیدہ ضروریاتِ مذہب امامیہ میں سے ہے۔ صراط ومیزان وغیرہ وہ امور اخرویہ جن پر ایمان رکھنا واجب ہے کے متعلق جو روایات وارد ہیں وہ ان روایات سے، جو عقیدۂ رجعت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں، نہ سند کے لحاظ سے زیادہ معتبر ہیں اور نہ عدد کے اعتبار سے زیادہ ہیں، اور نہ دلالت کے لحاظ سے زیادہ واضح ہیں۔ رجعت کے بعض خصوصیات میں اختلاف موجود ہے (جس کی تفصیل بعد میں بیان ہوگی) لہٰذا اصل رجعت پر ایمان رکھنا ضروری ہے کہ اس میں بعض مخلص مومن اور بعض خالص کافر دوبارہ زندہ ہوں گے اور اس کی باقی تفصیلات کو ائمہ اطہارؑ کے سپرد کرو۔ حضرت امیرالمومنینؑ اور جناب سید الشہداءؑ کی رجعت کے بارے میں احادیث تواتر معنوی تک پہنچے ہوئے ہیں اور باقی ائمہ طاہرینؑ کی رجعت کے متعلق قریب بہ تواتر ہیں۔ باقی رہا یہ امر کہ جب وہ تشریف لائیں گے تو یکبارگی تشریف لائیں گے یا یکے بعد دیگرے۔ اور پھر سابقہ ترتیب کے مطابق یا اس کے خلاف۔ ان حقائق کو خداوند عالم اور اس کے اولیاء علیہم السلام کے سپرد کردو۔

رجعت کے بارے میں بعض شبہات کے جوابات

آخر کلام میں رجعت کے متعلق بعض شبہات کا ازالہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

پہلا شبہ اور اس کا جواب:

آخر عقیدہ رجعت میں کیا فائدہ ہے کہ ہم اس کے قائل ہوں؟ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ رجعت کا سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ سرکار محمد وآلِ محمد علیہم السلام کی سلطنت ربانیہ وحکومت الٰہیّہ قائم ہوگی۔ اور کفر وشرک صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے گا اور دینِ اسلام کا بول بالا ہوگا، اور اسے تمام ادیان پر غلبہ وتسلّط حاصل ہوگا، اس وقت شیعیانِ علی وموالیانِ آلِ عبا کی آنکھیں یہ ایمان

و التبیین یکون فی الدنیا لا فی الاخرۃ و ساجرد کتابا فی الرجعۃ ابین فیہ کیفیتہا و الادلۃ علیٰ

ظاہر ہے اس اختلاف کی وضاحت اور اس کا نتیجہ دنیا میں ہی ظاہر ہوتا ہے نہ آخرت میں، رجعت کے متعلق میں ایک مستقل کتاب لکھوں گا جس میں رجعت کی حقیقت اس کی صحیح کیفیت اور اس کے وقوع پذیر

افزا مناظر دیکھ کر ٹھنڈی ہوں گی اور ملت گریہ کن کو اسی دنیا میں آلِ رسول کی شہنشاہی دیکھ کر اور قاتلین عترتِ اطہار سے اِنتقام لیتے ہوئے دیکھ کر دائمی مسرت و شادمانی حاصل ہوگی۔ کیونکہ رجعت کے زمانِ سعادت قِران میں وہ سب کچھ ہوگا، جسے تشتھیہ الانفس و تلذ الاعین۔ یہ روح پرور مظاہرات دیکھ کر "یفرح المومنون بنصر اللہ" اہل ایمان خوش وخرم ہوں گے۔

زمانہ رجعت میں کیا ہوگا؟

ان سب امور کا تذکرہ جو اس وقت وقوع پذیر ہوں گے تو موجب طوالت ہے۔ ہاں مومنین کرام کی جلاء ایمانی کی خاطر مختلف احادیث شریفہ سے مُنتخب کر کے یہاں چند امور کی ایک اجمالی فہرست درج کی جاتی ہے۔

① امامِ زمانہ کے مُظفر و منصور لشکر میں جن وانس اور فرشتے شامل ہوں گے۔
② تمام حیوان وطیور درند و پرند اور چرند کی موجودہ باہمی نفرت مبدل بالفت ہوجائے گی اور وہ سب باہم مل جل کر نہایت خوشگوار زندگی بسر کریں گے۔
③ زمین اپنے تمام مخفی خزانے خدمت امام عالی مقام میں پیش کر دے گی۔
④ بارش بروقت ہوگی اور اس کی وجہ سے میوہ جات اور دیگر ہر قسم کی نعمات بکثرت ہوں گی۔
⑤ تمام اہلِ ایمان کے پاس مال و دولت کی اس قدر فراوانی ہوگی کہ حقوقِ مالیہ (زکوٰۃ وخمس وغیرہ) کا مستحق ملنا دشوار ہوجائے گا۔
⑥ امامِ زمانہ کے وجودِ ذی جُود کی برکت سے اہلِ ایمان کی عقلیں کامل ہوجائیں گی۔
⑦ لوگوں کے سینہ میں حسد اور بغض وکینہ کا جو غبار ہوگا وہ محبّت وآشتی کے پانی سے دھل جائے گا۔
⑧ موالیانِ اہلِ بیتؑ کی قوتِ بصارت وسماعت میں غیر معمُولی ترقی ہوجائے گی، یہاں تک کہ شرق وغرب میں رہنے والے مومنین ایک دُوسرے کو دیکھ کر باہم گفتگو کرسکیں گے۔
⑨ اہلِ ایمان کی تمام جسمانی بلیات وآفات اور امراض وعاہات دُور ہوجائیں گی۔
⑩ زمین عدل وانصاف اور آں جنابؑ کے مراحم والطاف سے لبریز ہوجائے گی۔

صحة کونها و القول بالتناسخ باطل و من دان بالتناسخ و هو کافر لان فی التناسخ ابطال الجنة و النار	ہونے پر محکم دلائل پیش کروں گا۔ تناسخ کا عقیدہ باطل ہے اور جو شخص اس کا قائل ہے وہ کافر ہے۔ کیونکہ تناسخ کے عقیدہ کی بنا پر جنّت و دوزخ کے عقیدہ کا غلط ہونا اور ان کے وجود کا انکار لازم آتا ہے

⑪ تمام ادیانِ باطلہ لوح کائنات سے حرفِ غلط کی طرح محو کر دیے جائیں گے۔ اور بجز دین حق اور کوئی مذہب اور دین باقی نہیں رہے گا۔

⑫ حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وآلہ وعلیہ السلام آنجنابؑ کی نصرت و ہمرکابی کا شرف حاصل کرنے کے لیے آسمان سے زمین پر نزول اجلال فرمائیں گے اور امام زمانہؑ کی اقتداء میں نماز ادا کریں گے۔

الیٰ غیرہ ذلک من الوقائع الوفیرة المفرحة للمومنین و المقرحة للمعاندین اکمال الدین من الرحمن لغایة المقصود و بحار الانوار وغیرھا اللھم عجل فرجه و سھل مخرجه و اکحل ناظرینا بنظرة منا الیه و اجعلنا من اعوانه و انصاره

دُوسرا شبہ اور اس کا جوابؒ

ہوسکتا ہے کہ کفار و منافقین رجعت میں رجوع کرتے ہی اپنے سابقہ گناہوں سے توبہ کرلیں تو پھر ان سے انتقام کس طرح لیا جائے گا۔ اس شبہ کا کئی طرح جواب دیا جاسکتا ہے۔

اوّلاً: رجعت چونکہ قیامت صغریٰ ہے، اس میں قیامت کبریٰ کی طرح باب توبہ بند ہوجائے گا۔ اس لیے اس وقت کفار و مشرکین اور ظالمین کی کوئی توبہ منظور نہ ہوگی۔ چنانچہ ارشادِ قدرت ہے: "یَوْمَ یَاْتِیْ بَعْضُ اٰیٰتِ رَبِّكَ لَا یَنْفَعُ نَفْسًا اِیْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ" (انعام:۱۵۸) یعنی "جب اللہ سبحانہ کی بعض نشانیاں ظاہر ہوجائیں گی تو کسی نفس کو اس وقت ایمان لانا فائدہ نہ دے گا، جو اس سے قبل ایمان نہ لا چکا ہوگا"۔ اس آیت مبارکہ کی تفسیر زمانہ رجعت کے ساتھ کی گئی ہے۔

ثانیاً: اس وقت ان لوگوں کو بطور مُکلف ہونے کے نہیں اٹھایا جائے گا تاکہ کسی عمل خیر یا شر کو بجالائیں۔ ان کو انتقام و عذاب کے لیے زندہ کیا جائے گا۔ لہٰذا ان کے توبہ کرنے یا اس کے قبول ہونے یا نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ثالثاً: جب عذاب کے نزول کا وقت ہو، اس وقت توبہ قبول نہیں ہوتی۔ جیسا کہ فرعون و قارون وغیرہ کے قرآنی واقعات سے ظاہر و ہویدا ہے۔

رابعاً: ممکن ہے کہ ان لوگوں کی شقاوت و طغاوت اس حد تک پہنچ چکی ہو کہ دوبارہ دنیا میں آنے کے

باوجود بھی توبہ نہ کریں گے۔ چنانچہ خداوند عالم بعض بدبخت لوگوں کے متعلق خبر دیتا ہے کہ وہ عذابِ الٰہی کو دیکھ کر دنیا میں دوبارہ آنے اور آکر عمل صالح کرنے کی استدعا کریں۔ لیکن ارشادِ قدرت: " وَلَوۡ رُدُّوۡا لَعَادُوۡا لِمَا نُهُوۡا عَنۡهُ " (انعام:۲۸) اگر بالفرض انھیں دوبارہ بھیج بھی دیا جائے تو یقیناً پھر بھی وہ انہی افعال ناشائستہ کا ارتکاب کریں گے۔ جن سے ان کو روکا گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ کچھ ایسے سرکش انسان بھی ہوتے ہیں کہ سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی عبرت و نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ چنانچہ رجعت کے متعلق بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے ذہن میں شیطان یہ بات ڈال دے گا کہ تمھیں آزادانہ زندگی گزارنے کے لیے بھیجا گیا ہے، لہٰذا وہ توبہ کے لیے موفق ہی نہ ہوسکیں گے۔

تیسرا شبہ اور اس کا جواب

رجعت کے عقیدہ سے تناسخ لازم آتا ہے۔ لہٰذا اسے تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ شبہ تناسخ کے معنی کو نہ سمجھنے یا پھر تجاہل عارفانہ کرنے پر مبنی ہے، ورنہ اگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو رجعت کو تناسخ سے ہرگز کوئی ربط و تعلق نہیں ہے۔ تناسخ میں ایک روح کا ایک جسم سے بطور جزا یا سزا دوسرے جسم میں منتقل ہونا ضروری ہے۔ لیکن رجعت میں ایسا ہرگز نہیں ہوگا، بلکہ اجسام بھی وہی ہوں گے اور روحیں بھی وہی ہوں گی، جو پہلے تھیں، جیسا کہ یہ امر احادیث رجعت سے کالشمس فی رابعۃ النہار واضح و آشکار ہے۔ لہٰذا مخالفین کا رجعت کے صحیح اسلامی عقیدہ سے اس بنا پر انکار کرنا کہ اس سے تناسخ لازم آتا ہے، بالکل غلط اور عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہے۔

واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم

تذئیل جلیل

دلائل رجعت کے ضمن میں حضرت مصنف علامہ نے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق وارد شدہ آیت کے ساتھ جو تمسک فرمایا ہے اس سے وفاتِ عیسیٰ مترشح ہوتی ہے جو کہ مسلمانوں کے مشہور نظریہ کے خلاف ہے۔ فریقین کے اکثر علماء محدثین و مفسرین اور متکلمین اس امر کے قائل ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ تاحال خداوند عالم کی قدرت کاملہ سے بقید حیات آسمان پر زندہ موجود ہیں۔ زمانہ رجعت میں دنیا میں تشریف لائیں گے اور پھر اپنی طبعی موت انتقال کریں گے۔ اس امر پر قریباً تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ اور فریقین کی روایات اس سلسلہ میں حد استفاضہ تک پہنچی ہوئی ہیں، بلکہ بعض علماء نے تو

ان کے تواتر کا بھی ادعا کیا ہے۔ ہاں ایک شاذ و نادر قول یہ ہے کہ ان کی وفات واقع ہوگئی۔ مگر یہ قول "النادر فی حکم المعدوم" کا مصداق ہے۔ قرونِ سابقہ میں اس مسئلہ کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ مگر پنجاب کے جدید نبی اور اس کے بعد اس کی امتِ مرزائیہ نے خواہ مخواہ اس مسئلہ کو غیر معمولی اہمیت دے کر معرکۃ الآراء بنا دیا ہے۔ آئے دنوں اس موضوع پر بڑے بڑے مناظرے اور مکالمے ہوتے رہتے ہیں، حالانکہ ہمارے خیال میں یہ سب کچھ عبث ہے۔ اس مسئلہ کو ہرگز اس قدر اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ حضرت عیسیٰؑ کو اس وقت زندہ تسلیم کیا جائے یا بالفرض انھیں مردہ مانا جائے کہ خدا ان کو دوبارہ زندہ کر کے دنیا میں بھیجے گا۔ بہر تقدیر اسے پنجاب کے اس بزرگ کی خانہ ساز نبوت کے ساتھ کیا ربط و تعلق ہے؟ حضرت عیسیٰؑ وفات پا گئے، لہٰذا قادیانی صاحب نبی ہیں۔ یہ کس منطقی شکل کا نتیجہ ہے؟ یا دلالاتِ ثلاثہ (مطابقی، تضمنی، اور التزامی) میں سے یہ دعویٰ کس دلالت سے ثابت ہے؟ کسی مدعی نبوت کی نبوت کے اثبات کا یہ ہرگز کوئی عقلائی طریقہ نہیں ہوسکتا۔ اثباتِ نبوت کے طرق و اسالیب اور ہیں اور کسی شخص کو نبی ماننے کے میزان و معیار اور۔ جن کا تذکرہ ہم اسی شرح میں بابِ نبوت کے ذیل میں کریں گے۔

هزار نكتهٔ باريك تر ز مو اين جاست
نه هر كه سر بتراشد قلندری داند

بہر حال مسلمانوں کو اس جدید امت کی فریب کاریوں اور ابلہ فریبیوں سے آگاہ رہنا چاہیے اور اس قسم کے لایعنی مسائل میں الجھ کر اپنا وقت عزیز ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

وفاتِ عیسیٰؑ پر کیے گئے استدلال کا جواب

چونکہ وفاتِ عیسیٰؑ کے قائلین قرآن مجید کی بعض آیات سے تمسک کیا کرتے ہیں، ان میں سے سر فہرست وہی آیت ہے جو متن رسالہ میں مذکور ہے: یا عیسی انی متوفیك و رافعك الی مطهرك من الذين كفروا......الایہ۔ جس کا ترجمہ کیا جاتا ہے: اے عیسیٰؑ! میں تجھے مارنے والا ہوں اور اپنی طرف بلند کرنے والا ہوں۔ (سورۃ آل عمران:۵۵)

اس استدلال کا بچند وجہ جواب دیا جاسکتا ہے۔

پہلا جوابِ باصواب

توفی، بابِ تفعل کا مصدر ہے، جس کا مادہ ہے: "وفا" جس کے معنی ہیں پورا ہونا، جس

طرح "ایفاء" کے معنی ہیں پورا کرنا۔ اس مصدر کے جس قدر مشتقات ہیں، ان سب میں یہی مصدری معنی کارفرما ہیں۔ خواہ وفیٰ، یوفی، توفیۃ ہو اور خواہ توفی، یتوفی، توفیاً ۔

ان کے معنی ہیں اخذ الشئی وافیاً یا اعطاء الشئی وافیاً۔ کسی شے کا پورا پورا اجر دینا، جیسے : "انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب" (سورۃ زمر: ۱۰) صابروں کو پورا پورا اجر دیا جائے گا۔ بنابریں "توفی" کے معنی ہوں گے پورا پورا لینا۔ چونکہ یہودیوں کا خیال تھا کہ انھوں نے حضرت عیسیٰؑ کو تختۂ دار پر لٹکا دیا ہے، لہٰذا ان کا جسم یہاں رہ جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ ان کی روح اٹھالی جائے گی۔ لیکن خدائے قادر نے اپنے نبی کو تسلی دی کہ فکر نہ کرو۔ میں تمھیں پورا پورا یعنی جسم و روح سمیت اٹھالوں گا۔ چنانچہ ایک مقام پر خداوند عالم یہودیوں کے اس زعم باطل "انا قتلنا المسیح عیسی ابن مریم رسول اللہ" (ہم نے عیسیٰؑ ابن مریم کو قتل کر دیا ہے) کی نفی کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے: "وما قتلوہ وما صلبوہ ولکن شبہ لھم (سورۃ النساء: ۱۵۷) وما قتلوہ یقینا بل رفعہ اللہ الیہ وکان اللہ عزیزا حکیما"۔ انھوں نے نہ ان کو قتل کیا ہے اور نہ سولی پر لٹکایا ہے۔ انھیں شبہ ہوا ہے (یا ان کی شبیہ بنادی گئی تھی) انھوں نے یقیناً اسے قتل نہیں کیا، بلکہ خدائے قادر نے ان کو اپنی بارگاہ کی طرف اٹھالیا۔ کیونکہ خدا غالب و حکمت والا ہے۔

ان قرآنی تصریحات کے باوجود حضرت عیسیٰؑ کو مردہ تصور کرنا بہت بڑی جرأت و جسارت ہے۔

دُوسرا جوابِ باصواب

ابھی اوپر ثابت کیا جا چکا ہے کہ "توفی" کے معنی پورا پورا لینے یا دینے کے ہیں۔ لہٰذا بنابریں یہاں یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اے عیسیٰؑ میں تمھاری عمر کو پورا کروں گا۔ اور تمھیں اپنی طرف اٹھالوں گا (اپنے وقت پر ماروں گا) لہٰذا خداوند عالم حسب وعدہ ہنوز ان کی عمر کو پورا کر رہا ہے۔ نزول کے بعد اپنے وقت پر ان کو وفات دے گا۔ چنانچہ اس وقت جو نصاریٰ موجود ہوں گے وہ ان پر ایمان بھی لائیں گے۔ جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے: "وان من اھل الکتاب الا لیومنن بہ قبل موتہ" (نساء: ۱۵۹) "اہلِ کتاب میں سے کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو جناب عیسیٰؑ کی وفات سے قبل ان پر ایمان نہیں لائے گا"۔

تیسرا جوابِ باصواب

"توفی" کے ایک معنی نیند بھی ہیں۔ چنانچہ ارشادِ قدرت ہے: "وھو الذی یتوفاکم باللیل و یعلم ما جرحتم بالنھار" (سورۃ الانعام: ۶۰) (خدا وہی ہے جو رات کے وقت تمھیں نیند دیتا ہے، اور جو کچھ

دن میں کرتے ہوا سے جانتا ہے) اسی لیے کہا جاتا ہے کہ: "النوم اخت الموت" نیند موت کی بہن ہے۔ لہٰذا اس آیت کا ترجمہ یوں ہوگا: "اے عیسیٰؑ! میں تم کو سلاؤں گا، اور پھر اس حالت میں بلند کرلوں گا"۔ چنانچہ بعض روایات میں وارد ہے کہ ان کو نیند کے عالم میں اٹھایا گیا تھا۔

چوتھا جوابٌ باصوابٌ

مذکورہ بالا اجوبۂ شافیہ سے قطع نظر کر کے اگر بالفرض چند لمحات کے لیے یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ "توفی" بمعنی موت ہی ہے تو پھر اس سے آنجنابؑ کی موت کا واقع ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ آیتِ مبارکہ میں "متوفیك" اور "رافعك" میں "واو" کے ساتھ جو عطف کیا گیا ہے، اس کے متعلق نحویوں کا اتفاق ہے کہ: "واو کے عطف میں ترتیب ملحوظ نہیں ہوتی"۔ مثلاً جب یہ کہا جائے کہ: "جاء زید و عمرو" زید اور عمرو آئے، تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ زید پہلے آیا اور عمرو بعد میں، بلکہ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہوا اور ممکن ہے دونوں اکٹھے آئے ہوں، بلکہ ممکن ہے عمرو پہلے آیا ہو، اور زید بعد میں۔ اس صورت میں تینوں احتمال برابر قائم ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہاں بھی یہی احتمالات ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا عین ممکن ہے کہ "رفع الی السماء" پہلے ہوا اور موت بعد میں واقع ہو۔ ظاہر ہے کہ:

"اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال"

اگرچہ اس سلسلہ میں اور بھی بہت سے جوابات دیے جاسکتے ہیں مگر طالبانِ حق وحقیقت کے لیے یہی چار جوابات کافی ووافی ہیں۔ ع

اگر در خانه کس است یك حرف بس است

جو شخص ان جوابات کو بنظرِ غائر دیکھ لے گا وہ اس سلسلہ میں منکرینِ حیاتِ مسیح کی پیش کردہ دیگر بعض آیات مثل: "وكنت عليهم شهيدا مادمت فيهم فلما توفيتني كنت انت الرقيب عليهم" (مائدہ: ۱۱۷) وغیرہ کے حقیقی مفہوم کو سمجھ کر ان کمزور استدلالات کے جوابات بآسانی دے سکے گا۔ و الله الهادی ۔ يا ايها الناس قد جاءتكم موعظة من ربكم و شفاء لما فی الصدور و هدی و رحمة للمومنين (سورۃ یونس: ۵۷)

عقیدۂ تناسخ کا ابطال اور اس کے اقسام کا بیانؒ

اگرچہ پندرھویں باب کے مباحث میں تناسخ (آواگان) کی تعریف بیان ہوچکی ہے، تاہم یہاں پھر بغرضِ افادہ اس کا اعادہ کیا جاتا ہے۔ حکماء کے نزدیک اس کی تعریف یہ ہے کہ ایک انسان

کی روح اس کے جسم سے نکل کر دارِ دنیا میں کسی دوسرے جسم انسانی کے اندر بطور جزا یا سزا چلی جائے۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ضمناً یہاں اختلافی تناسخ کے بعض دیگر اقسام کی تعریف بھی بیان کردی جائے۔ کیونکہ بعض ظاہر بین حضرات تناسخ اور ان کے درمیان فرق نہ کرنے کی وجہ سے بعض غلط فہمیوں میں مُبتلا ہوجایا کرتے ہیں۔ اس لیے ان کا تذکرہ بھی فائدے سے خالی نہیں ہے۔ وہ تین اِصطلاحیں یہ ہیں: ① **تماسخ**: اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی انسان کی روح کسی دوسرے حیوان کے بدن میں چلی جائے۔ ② **تراسخ**: اس کا مطلب یہ ہے کہ روح انسانی اس کے بدن سے نکل کر کسی معدنی جسم میں مُنتقل ہوجائے۔ ③ **تفاسخ**: اس کا مطلب یہ کہ روح انسانی کسی جسم نباتی میں تبدیل ہوجائے۔ "فاحفظه فانه مفید"۔ بہرحال عقیدۂ تناسخ جس کے آریہ سماج اور بعض حکماء قائل ہیں، اسلامی عقائد کے سراسر منافی اور خلاف ہے۔ اور اس کا قائل دائرۂ اِسلام سے خارج ہے۔ جس کی وجہ سابقہ مباحث میں بیان ہوچکی ہے کہ اس سے روحوں کا قدیم ہونا اور حشر ونشر کا انکار لازم آتا ہے۔ اور درحقیقت اس عقیدۂ فاسدہ کا دار و مدار ہی انہی دو چیزوں پر ہے۔ اور اس کے ابطال پر بیسیوں دلائل و براہین قائم کیے گئے ہیں۔ سب کے ذکر کرنے کی تو علاوہ عدم گنجائش کے یہاں ضرورت بھی نہیں ہے، لہٰذا فقط چند عام فہم اور محکم دلائل اس کے ابطال پر پیش کیے جاتے ہیں۔

اِبطالِ تناسخ پر پہلی اجمالی دلیل

تناسخ کا دارومدار حشر ونشر اور جسمانی معاد کے انکار پر ہے۔ چونکہ تناسخ کے قائل معاد کو صحیح نہیں سمجھتے اور عقلاً جزا وسزا کی تکمیل بھی ضروری ہے، اس کے لیے انھوں نے عقیدہ تناسخ اختراع کر رکھا ہے۔ لیکن جب دلائل قاطعہ کے ساتھ حشر ونشر کا برحق ہونا ثابت ہے جیسا کہ عنقریب بحث معاد میں ظاہر ہوگا، انشاء اللہ، تو اس سے خودبخود تناسخ کا بطلان بھی واضح وعیاں ہوجائے گا۔ کیونکہ جزا وسزا کے لیے معاد یا تناسخ میں سے ایک ہی صورت صحیح ہوسکتی ہے۔ دونوں صورتیں صحیح نہیں ہوسکتیں اور جب معاد کا عقیدہ صحیح ہے تو لامحالہ تناسخ کو غلط ماننا پڑے گا۔

دوسری دلیل

عقیدۂ تناسخ کی بنیاد ارواح کے قدیم ہونے پر رکھی گئی ہے۔ اور یہ امر پہلے باب میں دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ سے ثابت ہوچکا ہے کہ سوائے خداوند عالم کے دوسری تمام کائنات مع ارواح کے حادث ہے، نہ کہ قدیم۔ تو اس سے خودبخود تناسخ کا عقیدہ باطل ہوکر رہ جاتا ہے۔ کیونکہ یہ نظریہ

"بناء الفاسد علی الفاسد" کا مصداق ہے۔ اور جب مبنیٰ غلط ہے تو بنا بھی بالضرور غلط ہی ہوگی۔ کیونکہ ؎

خِشتِ اوّل چُوں نہد معمار کج تا ثُریّا می رَود دِیوار کج

تیسری دلیل

قائلین تناسخ نے اس فاسد عقیدہ کو محض اسی بناء پر تسلیم کیا ہے کہ اس سے نیک یا بد لوگوں کو ان کے اعمال صالحہ یا طالحہ کی جزا یا سزا مل سکے۔ کیونکہ ان کی غلط بین نگاہ میں اس سزا یا جزا کے دلوانے کا کوئی اور طریقہ نہ تھا۔ لیکن یہ امر واضح ہے کہ جزا یا سزا کے سلسلہ میں جزا یا سزا پانے والے شخص کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ فلاں عمل صالح یا طالح کی جزا یا سزا ہے اور اگر یہ معلوم ہی نہ ہو تو وہ جزا یا سزا بیکار محض بھی جائے گی۔ اور یہ امر وجدانی اور بدیہی طور پر معلوم ہے کہ آج تک کسی شخص کو یہ محسوس نہیں ہوا کہ وہ اس جنم میں اپنے کسی سابقہ عمل کی جزا یا سزا پا رہا ہے۔ اگر سب کو نہیں تو کم از کم کسی نہ کسی شخص کو تو ضرور یہ امر معلوم ہوتا۔ لیکن مشاہدہ اس کے خلاف شاہد ہے۔ لہٰذا واضح ہوا کہ اس جنم میں کسی کو کوئی جزا یا سزا نہیں مل رہی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تناسخ کا عقیدہ غلط ہے۔

چوتھی دلیل

اگر روحوں کا تناسخ جائز و صحیح ہوتا تو چاہیے تھا کہ روزانہ مرنے والوں اور پیدا ہونے والوں کی تعداد برابر رہتی۔ لیکن یہ امر مشاہدہ و وجدان کے خلاف ہے۔ کیونکہ بداہۃً معلوم ہے کہ کبھی مرنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور کبھی پیدا ہونے والوں کی۔ پہلی صورت میں بہت سی روحوں کا معطل و بیکار ہونا لازم آئے گا، جسے اہل تناسخ تسلیم نہیں کرتے اور دوسری صورت میں بعض نئی روحوں کا پیدا ہونا لازم آئے گا، جو کہ اہل تناسخ کے عقیدہ کے خلاف ہے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ تناسخ کا عقیدہ فاسد ہے۔

پانچویں دلیل

اگر عقیدہ تناسخ صحیح ہو تو اس سے لازم آئے گا کہ ہر روز چاہیے ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں مردہ حیوان یا انسان زندہ ہو جایا کریں۔ کیونکہ اہلِ تناسخ کے پاس اس امر کی کوئی قطعی دلیل موجود نہیں ہے کہ مرنے والے کی روح کو ضرور کسی تازہ پیدا ہونے والے جسم ہی کے اندر داخل ہونا چاہیے۔ لہٰذا بنا بر عقیدہ تناسخ جائز ہوگا کہ انسان جو آج مرا ہے اس کی روح اپنے اعمال کے مناسب

حال کسی مردہ آدمی یا کتے یا بندر وغیرہ حیوان کے جسم میں داخل ہوجائے اور وہ زندہ ہوجائے۔ لیکن آج تک کبھی ایک مرتبہ بھی ایسا ہوتے نہیں دیکھا گیا۔ اور نہ اس پر کوئی دلیل یا شاہد موجود ہے۔ لہٰذا اس سے لازم آتا ہے کہ عقیدۂ تناسخ بالکل غلط اور مہمل ہے۔

چھٹی دلیل

یہ امر غور وفکر سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی روح ابتدائے ولادت کے زمانہ میں بظاہر لا یعقل ہوتی ہے اور اس میں تعقل وادراک کی شان بہت کم محسوس ہوتی ہے۔ جوں جوں انسان بڑھتا جاتا ہے اس کے ادراکات و تعقلات بھی بڑھتے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ حد کمال تک پہنچتا ہے۔ اسی وجہ سے حکماء نے اِنسان کی اس قوت کے چار درجے قرار دیے ہیں۔ ① عقل ہیولانی ② عقل بالملکہ ③ عقل بالفعل اور ④ عقل مُستفاد۔ جب وہ بچہ ہوتا ہے، اس وقت اس کی عقل ہیولانی ہوتی ہے۔ جب کچھ بڑھتا ہے اور اس میں ہر شے کے سمجھنے کی قابلیت پیدا ہوتی ہے تو اس وقت عقل بالملکہ ہوتی ہے۔ جب اس سے بھی ترقی کرتا ہے اور بالفعل علوم حاصل کرتا ہے تو اس وقت اس کی عقل بالفعل ہوتی ہے اور جب اس سے بھی زیادہ ترقی کرتا ہے تو عقل مُستفاد کے درجہ پر فائز ہوجاتا ہے۔ اس مختصر سی تمہید کے بعد اب ہم کہتے ہیں کہ اگر تناسخ ارواح ممکن ہو یا واقع ہو تو اس سے لازم آئے گا کہ وہ روحیں جو عقل مُستفاد یا عقل بالفعل کے درجہ تک پہنچ چکی ہیں وہ پلٹ کر از سر نو عقل ہیولائی کے درجہ میں آجائیں۔ حالانکہ مشاہدہ شاہد ہے کہ کوئی شے فعلیت سے قوت کی طرف منتقل نہیں ہوتی۔ مثلاً کبھی کوئی بوڑھا آدمی دوبارہ بچہ ہوتا نہیں دیکھا گیا۔ کوئی حکیم و فیلسوف انسان دوبارہ طفل مکتب بنتا نہیں دیکھا گیا اور کبھی مضغہ وعلقہ پھر نطفہ نہیں بنتا۔ لہٰذا جب ایسا کبھی نہیں ہوا تو پھر وہ روح جو عقل مُستفاد یا عقل بالفعل کے درجہ تک پہنچ چکی ہے وہ کس طرح عقل ہیولائی کے درجہ میں آسکتی ہے، جو کہ لازمۂ تناسخ ہے۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ عقیدۂ تناسخ بالکل ایک بے بنیاد اور بے برہان عقیدہ ہے۔ جس کا کوئی صحیح العقل انسان قائل نہیں ہوسکتا۔

هاتوا برهانكم ان كنتم صادقين

ساتویں دلیل

تناسخ کا یہ چکّر ایسا ہے کہ جس کا کوئی آغاز نہیں قرار دیا جاسکتا۔ انسان ہونے کے لیے لازم ہے کہ اس سے پہلے نبات یا حیوان ہو اور نبات وحیوان ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے انسان

ہو، کیونکہ تناسخ کی بنیاد ہی صعود و ہبوط پر قائم ہے۔ یعنی وہ اچھے اعمال سے زندگی کے اعلیٰ طبقات کی طرف صعود کرتا ہے اور برے اعمال کی بدولت ادنیٰ طبقات کی طرف ہبوط کرتا ہے۔ اور یہ کھلا ہوا "دَور" ہے، جو عقلاً محال و ناممکن ہے۔

آٹھویں دلیل

اگر تناسخ کو صحیح تسلیم کیا جائے تو اس کے چکّر کو ازلی وابدی ماننا پڑے گا (کیونکہ اس نظریہ کی بنا پر ارواح قدیم ہیں) اور جب ان کا یہ چکّر قدیم ہے تو اس سے لازماً یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ نہ صرف وہ ارواح جو بار بار قالب بدلتی رہتی ہیں قدیم ہیں بلکہ وہ مادے بھی جو ان ارواح کو قالب مہیا کرتے ہیں ازلی اور ابدی ہوں۔ اور یہ زمین اور یہ نظامِ شمسی اور یہ قوتیں جو اس نظام میں کام کر رہی ہیں، یہ سب ازلی وابدی ہوں۔ لیکن عقل کا یہ فیصلہ ہے اور علمی تحقیقات اس پر شاہد ہیں کہ ہمارا نظامِ شمسی نہ ازلی ہے اور نہ ابدی۔ اس کتاب کے پہلے بابِ توحید میں حدوثِ عالم پر بکثرت دلائل پیش کیے جا چکے ہیں۔

نویں دلیل

اگر بعد والی زندگی ہمارے موجودہ جنم کے کرموں کا پھل ہے تو ظاہر ہے کہ برے کرموں کا پھل برا ہی ہونا چاہیے اور جب دوسرے جنم میں وہ برا پھل ہم کو ملا تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس برے پھل سے نیک اعمال صادر ہوں؟۔ لامحالہ اس سے برے اعمال ہی صادر ہوں گے اور پھر تیسرے جنم میں ان کا پھل اور بھی زیادہ برا ہوگا۔ اس طرح بدکار انسان کی روح ہمیشہ پست سے پست تر طبقات کی طرف گرتی چلی جائے گی، اور اس سے کبھی ابھرنے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ انسان سے حیوان تو بن سکتا ہے مگر حیوان سے انسان بننا ممکن نہیں ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو اس وقت انسان ہیں وہ کس حسن عمل کے نتیجے میں انسان ہوئے اور کہاں سے آئے؟ کیا انسانی عقل اس گتھی کو سلجھا سکتی ہے؟

دسویں دلیل

اس میں شک نہیں ہے کہ تناسخ کا اعتقاد اس سے بہتر ہے کہ موت کو فنائے محض اور عدم مُطلق سمجھا جائے اور اس سے عقیدہ جزا و سزا اور اچھے یا برے افعال کے انجام نیک یا بد کے نظریہ کی بھی نفی

الجملہ تائید ہوتی ہے ۔ لیکن ظاہر ہے کہ جو عقیدہ عقل وعلم کے خلاف ہے اور تہذیب وتمدّن کی ترقی میں مانع ومزاحم ہو (عقیدہ اور رہبانیت دراصل اعتقاد تناسخ کی پیداوار ہیں ۔ فتدبر) اس کی گرفت انسانی دل ودماغ پر کبھی مضبوط نہیں ہوسکتی، بلکہ یہ عقیدہ اپنے آخری نتیجہ کے اعتبار سے اپنی اخلاقی قیمت بھی کھو دیتا ہے ۔ کیونکہ جب کسی انسان کو یہ یقین ہو کہ تناسخ کا چکّر بالکل ایک مشین کی طرح چل رہا ہے اور اس میں ہر ایک فعل کا جو نتیجہ مقرر ہے وہ ظاہر ہو کر ہی رہے گا اور کسی توبہ واستغفار یا کفارہ سے اس نتیجہ کو بدلا نہیں جاسکتا تو اس عقیدہ کا اثر یہ ہوگا کہ ایک مرتبہ گناہ کرنے کے بعد ایسا شخص ہمیشہ کے لیے گناہ کے پھیر میں آجائے گا ۔ اور سمجھ لے گا کہ جب مجھے جانور بننا ہی ہے تو کیوں نہ اس انسانی جون میں تمام لذتوں سے دل کھول کر فائدہ اٹھالوں ۔

اِسلامی تہذیبؒ اور اس کے اصول

ان دلائل وبراہین سے واضح ہوگیا کہ عقیدہ تناسخ بالکل غیر معقول نظریہ ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ یہ نظریہ ایک زمانہ میں بہت مقبول رہا ہے، یونان میں مسیح سے کئی صدیاں پہلے فیثاغورث وغیرہ اس کے قائل تھے ۔ رُوم میں بھی مسیحیت سے پہلے اس کا چرچا تھا ۔ مصر قدیم کی تاریخ میں بھی اس کے کچھ آثار ملتے ہیں ۔ لیکن اب تو یہ اعتقاد یا تو ہندی الاصل مذہب برہمیت، بودھ مت اور جین مت میں پایا جاتا ہے، یا پھر مغربی وجنوبی افریقہ، وسطی آسٹریلیا اور انڈونیشیا وغیرہ کی بعض یا نیم وحشی اقوام میں یہ خیال پایا جاتا ہے ۔ باقی تمام مہذب قومیں اس کو رد کر چکی ہیں ۔

قد جاء کم برھان من ربکم

وانزلنا الیکم

نوراً مبینا

○

باب الاعتقاد

اُنیسواں بابؒ

فی البعث بعد الموت

مرنے کے بعد قیامت کبریٰ میں اٹھنے کے بارے میں اعتقاد

قال الشیخ ابوجعفر اعتقادنا فی البعث بعد الموت انه حق

جناب شیخ ابوجعفر علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ مرنے کے بعد "دوبارہ زندہ ہونے کی بابت ہمارا اعتقاد" یہ ہے کہ وہ برحق ہے

انیسواں بابؒ

قیامتِ کبریٰ کا بیان

قیامتؒ کے شرعی مفہوم کی تعیین اور اسؒ کے جسمانی ورُوحانی ہونے کا بیانؒ

معاد (جسے قیامت کبریٰ بھی کہا جاتا ہے) کا اِصطلاحِ شریعت میں مطلب یہ ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ جس میں خلاقِ عالم تمام لوگوں کی روحوں کو ان کے اصل بدنوں میں داخل کر کے حساب وکتاب اور جزا و سزا کے لیے زندہ کر کے محشور فرمائے گا۔ جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے: "ان الاولین والآخرین لمجموعون الی میقات یوم معلوم" (واقعہ: ۵۰) سب اولین و آخرین ایک مقررہ تاریخ پر جمع کیے جائیں گے۔ ایک اور مقام پر فرماتا ہے: "هذا یوم الفصل جمعناکم والاولین" (مرسلات: ۳۸) یہ فیصلہ کا دن ہے، اس لیے ہم نے تم کو اور تمام گزشتگان کو جمع کر دیا ہے۔ اس عقیدہ پر تمام اہلِ اسلام بلکہ تمام سماوی ادیانِ عالم کے ماننے والوں کا اتفاق ہے۔ اور یہ عقیدہ ضروریاتِ دین اسلام میں سے ہے، جس کے منکر کے لیے دائرہ اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہاں ملاحدہ، دہریہ، اور ہنود و آریہ سماج قیامت کے قائل نہیں ہیں۔ اول الذکر حضرات تو چونکہ کسی مذہب وملت اور مبدأ کو مانتے ہی نہیں، اس لیے وہ کسی جزاوسزا کے بھی قائل نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کے قیامت کو تسلیم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور ثانی الذکر اس ضرورت کو عقیدۂ تناسخ کے ذریعہ پورا کر لیتے ہیں۔ ہاں معاد کے قائلین میں صرف یہ اختلاف ہے کہ آیا معاد فقط جسمانی ہوگی یا صرف روحانی، یا جسمانی و روحانی ہوگی۔ فقط جسمانی کا مطلب یہ ہے کہ مرنے کے بعد روح کو نہ کوئی ثواب ملتا ہے اور نہ کوئی عذاب ہوتا ہے۔ ہاں بروز قیامت اس کو اپنے اصلی بدن میں داخل کر کے اس کا حساب وکتاب لیا جائے گا، اور اس کے بعد جزا یا سزا کا سلسلہ شروع ہوگا۔ اور صرف روحانی معاد کا مفہوم یہ ہے کہ مرنے کے بعد

قال النبی ﷺ یا بنی عبد المطلب ان الرائد لا یکذب اھلہ و الذی بعثنی بالحق	جناب سرور کائنات ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: اے بنی عبد المطلب مناسب منزل کا نشان بتانے والا کبھی اپنے اہل سے جھوٹی بات بیان نہیں کرتا۔ اس ذات کی قسم جس نے مجھے برحق مبعوث

روح اپنے اچھے اعمال و معلومات سے متنعم و متلذذ یا اپنے برے اعمال و معلومات سے معذب و معاقب رہتی ہے۔ یہی اس کی جزا یا سزا ہے۔ جسمانی بدن کبھی محشور نہ ہوگا۔ مقصد یہ کہ جزا یا سزا صرف روحانی ہے۔

اسی بیان سے تیسرے نظریہ یعنی معاد جسمانی و روحانی کا مطلب ومفہوم بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے۔ چنانچہ بعض متکلمین اسلام فقط معاد جسمانی کے قائل ہیں اور بعض حکماء فقط روحانی کے۔ لیکن علمائے محققین بلکہ جمہور مسلمین معاد جسمانی و روحانی ہر دو کے قائل ہیں۔ قرآن کریم اور احادیث معصومینؑ سے بھی اسی عقیدہ کی تائید وتصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ اپنی کتاب "حق الیقین" میں اس آخری نظریہ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں: "مؤلف گوید ایں مذہب اقوی مذاہب است و منافاتی میان لذاتِ جسمانی و روحانی نیست و احادیث نیز دلالت برایں وارد"۔ یعنی مؤلف کہتا ہے کہ یہ نظریہ تمام نظریات سے زیادہ قوی ہے۔ جسمانی و روحانی لذات کے حاصل ہونے میں ہرگز کوئی باہمی منافات نہیں ہے۔ اور احادیث بھی اس مطلب پر دلالت کرتی ہیں۔
اسی طرح علامہ سید عبد اللہ شبر اپنی کتاب "حق الیقین" میں فرماتے ہیں: "اقول القول بالمعاد الجسمانی و الروحانی معًا اقوی المذاهب و هو الذی دلت علیه الأیات القرآنیه و الاحادیث المعصومیة و ایدته المؤیدات العقلیة"۔ یعنی میں کہتا ہوں کہ معاد جسمانی ورُوحانی والا نظریہ تمام نظریات سے زیادہ قوی ہے اور اسی پر آیاتِ قرآنیہ، احادیث معصومیہ دلالت کرتی ہیں اور عقلی مؤیدات بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔

بہرکیف یہاں دو دعوے ہیں۔ ایک اصل معاد کی ضرورت اور اس کا اثبات دوسرا جسمانی و روحانی معاد کی صحت اور اس کا احقاق، ذیل میں بالترتیب ان ہر دو دعووں کو دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ سے ثابت کیا جاتا ہے۔ فاستمع لما یتلی علیك۔

قیامت کے ضروری ہونے کا اثبات

معاد کے ضروری و لازمی ہونے اور عقیدۂ اسلامیہ کی صحت وصداقت پر بیسیوں عقلی ونقلی دلائل و

فبيا لموتن كما تنامون	بہ نبوت کیا ہے کہ تم ضرور مرجاؤ گے۔ جس طرح کہ
و لتبعثن كما تستيقظون	سویا کرتے ہو، اور پھر ضرور تم زندہ کیے جاؤ گے،
و ما بعد الموت دار	جس طرح تم بیدار ہوتے ہو۔ اور مرنے کے بعد

براہین موجود ہیں لیکن ہم اپنے طریقہ کے مطابق بنظر اختصار یہاں اسی سلسلہ میں فقط چند دلائل ساطعہ پیش کرتے ہیں، جن کو بنظر غائر وبہ نگاہِ انصاف دیکھنے سے یہ امر روشن ہوجائے گا کہ قیامت کا ہونا اشد ضروری ہے، ورنہ اس کے بغیر تشریع شرائع وارسالِ رسل و رسائل کا سلسلۂ جلیلہ عبث اور بے کار محض ہوکر رہ جائے گا۔ نیز ہمارے ان دلائل و براہین سے یہ امر بھی واضح ہوجائے گا کہ معاد کا جو اصلی مقصد ہے وہ تناسخ کے ذریعہ حاصل نہیں ہوسکتا۔

ضرورتِ معاد پر پہلی دلیل

جس طرح ہر عاقل وعادل اور مہربان بادشاہ اپنی رعایا کی صلاح و فلاح کے لیے ایک قانون مقرر کرتا ہے اور پھر عدالت قائم کرتا ہے، تاکہ اس میں قانون شکنی کرنے والوں کے خلاف تادیبی کارروائی کی جاسکے، اور ظالم و مظلوم کے درمیان فیصلہ ہوسکے۔ مدعی و مدعا علیہ کی پیشی کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ جس میں وہ مع گواہان پیش ہوتے ہیں اور سماعت کے بعد علیٰ رؤس الاشہاد فیصلہ سنایا جاتا ہے اور مجرم کو قرار واقعی سزا دی جاتی ہے۔ بلاتشبیہ اسی طرح عادل حقیقی احکم الحاکمین نے اپنے بندوں کی اصلاح احوال کے لیے دنیا میں اپنے انبیاء ومرسلین اور قانون کی مختلف کتابیں بھیجیں۔ سب سے آخر میں سرکار ختمی مرتبت ﷺ کو ایک کامل واکمل شریعت دے کر مبعوث فرمایا۔ قانونِ قدرت کی پوری پوری وضاحت کردی گئی۔ لہٰذا اب ایک ایسا دن ضروری ہے جس میں لوگوں کا محاسبہ ہوسکے اور محسن ومسی کو جزا یا سزا دی جاسکے۔ اسی دن کا نام اِصطلاحِ شریعت میں قیامت ہے۔ "ھذا یوم الفصل جمعناکم والاولین" (مرسلات: ۳۸)

دُوسری دلیل

خداوند عالم نے جو تکالیف اپنے بندوں پر عائد کی ہیں ان کے ماننے اور نہ ماننے کی وجہ سے تمام لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہوگئے ہیں۔ کچھ مُطیع وفرمانبردار ہیں، اور کچھ عاصی و نافرمان۔ عدل وحکمت خداوندی کا تقاضا یہ ہے کہ مُطیع کو اجر وثواب ملنا چاہیے اور عاصی کو عقاب و عذاب ہونا چاہیے تاکہ

الا الجنة والنار و خلق جميع الخلق و بعثهم على الله عز و جل كخلق نفس واحدة

سوائے جنّت یا جہنم اور کوئی گھر نہیں ہے۔ تمام مخلوق کو پیدا کرنا اور پھر سب کو زندہ کرنا، خدائے قادر و توانا کے لیے ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک آدمی کو پیدا کرنا، چنانچہ خداوند عالم کا ارشاد

نیک و بد میں امتیاز ہو سکے۔ اور یہ امر مشاہدہ سے ثابت ہے کہ دنیا میں ان تمام لوگوں کو نہیں تو اکثر تو اپنے اعمال کی جزا یا سزا نہیں ملتی۔ ہزاروں مُطیع و فرمانبردار حضرات مصائب و محن اور رنج و الم سے لبریز زندگی گزارنے کے بعد یہاں سے سدھار گئے اور لاکھوں سرکش و نافرمان انسان ایسے ہیں جو نہایت شاہانہ جاہ و جلال اور شان و شکوہ کی زندگی گزار کر چلے گئے۔ عقلِ سلیم فیصلہ کرتی ہے کہ ان کی جزا و سزا کے متعلق کوئی مکمل انتظام ہونا لازم ہے۔ جن میں صالح و طالح، شقی و سعید اور ظالم و مظلوم کا فرق ظاہر ہو، ورنہ پھر یہ سب گروہ برابر ہو جائیں گے۔ بلکہ بروں کی حالت اچھوں کی حالت سے بھی بہتر رہے گی۔ اور اس طرح تکالیف شرعیہ کا عبث و فضول ہونا لازم آئے گا، جو کہ خلاقِ حکیم کی شان کے سراسر منافی ہے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ معاد کا ہونا اشد ضروری ہے۔ ارشادِ قدرت ہے:

أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ ﴿٢٨﴾ (سورة صٓ:۲۸)

آیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور عمل صالح کیے مُفسدین کی طرح بنا دیں گے؟ یا کیا ہم مُتقین کو فجار و فاسقین کی طرح قرار دیں گے؟ (ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا)

ایک اور جگہ قرآن مجید میں اس مطلب پر تنبیہ کی گئی ہے:

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ (سورة الجاثیہ:۲۱)

جن لوگوں نے دل کھول کر بدکاریاں اور بدمعاشیاں کی ہیں، کیا وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کو اپنے ان نیک بندوں کی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے اور ان کا جینا و مرنا اور انجام ایک جیسا اور یکساں ہوگا؟ ان کا یہ خیال بالکل غلط اور بیہودہ ہے۔

بہر حال جب ہم یہ بات کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ انسان کے مادی اعمال کا نتیجہ اور ثمر تو یہاں ظاہر ہوتا ہے لیکن اس کے اخلاقی اور روحانی اعمال کا کوئی اثر اور نتیجہ یہاں ظاہر نہیں ہوتا تو

ذلك قوله تعالیٰ ما خلقكم و لا بعثكم الا كنفس واحدة ہے: تم سب کا پیدا کرنا اور (مارنے کے بعد دوبارہ) زندہ کرنا نہیں ہے مگر ایک آدمی کی خلقت وبعثت کے مانند۔ (سورۃ لقمان: ۲۸)

ہماری عقل و دنات فیصلہ کرتی ہے کہ اس دنیوی زندگی کے بعد کوئی اور زندگی ایسی ہونی چاہیے جس میں اچھے یا برے اخلاقی وروحانی اعمال کے آثار وخواص اور نتائج ظاہر ہوں اور انسانوں کو ان کی نیکوکاریاں یا بدکاریوں کی جزا اور سزا مل سکے۔

تیسری دلیل

اطاعت وفرمانبرداری کرنے پر بندگانِ خدا سے اجروثواب عطا کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس کے پورا کرنے کے لیے معاد کا ہونا ضروری ہے، ورنہ خداوند عالم کا کذب اور بندوں پر ظلم و جور لازم آئے گا۔ جس سے خالق عالم کا دامن ربوبیت منزہ ہے۔ اس کا ارشاد ہے: "وما ربك بظلام للعبيد" (فصلت:۴۶) "وان الله لا يخلف الميعاد" (رعد:۳۱) اسی طرح نافرنوں کو عذاب وعقاب کی تہدید کی گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ دارِ دنیا میں یہ مقصد حاصل نہیں ہوا۔ کیونکہ مشاہدہ شاہد ہے کہ دنیا میں کئی ظالم و کافر لوگ اہل ایمان وایقان پر مُسلّط رہے ہیں۔ اور کئی مومن مظلُوم ومقہُور اور اسی حالت پر ہر دو کا خاتمہ ہوا ہے۔ پس اگر معاد اور لوگوں کا حشر ونشر نہ ہو اور ظالموں سے مظلُوموں کا اِنتقام نہ لیا جائے تو خلاقِ عالم کی طرف سے یہ ظلم عظیم ہوگا۔ جس سے اس کی شان اجل وارفع ہے۔ لہٰذا معاد کا ہونا واجب ولازم ہے، ورنہ وعد ووعید کا یہ سلسلہ غلط ہو کر رہ جائے گا۔ اسلام عدل کامل پر مبنی ہے۔ حشر ونشر کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان کے ساتھ عدل کامل ہو، جو ظلم انسان کے ساتھ دنیوی زندگی میں ہوا ہے، ظالم کو اس کی سزا اور مظلُوم کو اس کی جزا مل جائے۔ اسی لیے قرآن میں اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے کہ قیامت کے دن عدل ہوگا۔ "ولا يظلمون فتيلا" (اسراء:۷۱) ان پر ذرہ بھی ظلم وزیادتی نہ ہوگی۔ "ومن يعمل مثقال ذرة خيرا يره ومن يعمل مثقال ذرة شرا يره" (زلزال:۷) جو شخص ذرہ برابر اچھا کام کرے گا اس کا اچھا ثمرہ پائے گا اور جو ذرہ برابر برائی کرے گا اس کا برا نتیجہ بھی دیکھے گا۔

چوتھی دلیل

اتنا تو ہر شخص جانتا ہے کہ انسان اس دارِ دنیا میں امتحان وآزمائش میں مُبتلا ہے۔ کیونکہ خالق

کائنات نے اسے احکام شریعت ماننے کی تکلیف دی ہے ۔لہٰذا ان تکالیف شرعیہ کی اسے کہیں نہ کہیں جزاوسزا ضرور ملنی چاہیے ۔اب اس کے دو طریقے ہیں ۔اہل تناسخ نے اس مقصد کے لیے تناسخ ارواح کا عقیدہ اختراع کیا ہے اور پیغمبر اسلام ﷺ اور دیگر انبیاء علیہم السلام نے اس کا طریقہ معاد اور حشر ونشر بیان فرمایا ہے ۔لیکن چونکہ تناسخ باطل ہے ۔کیونکہ اس کے ابطال پر ہم سابقہ باب میں دلائل قاطعہ قائم کر چکے ہیں، جن میں سے ایک عام فہم اور آسان دلیل یہ بھی تھی کہ عقل حاکم ہے کہ جزا یا سزا اس طرح ہونی چاہیے کہ انسان کو اس امر کا احساس ہو کہ اسے فلاں عمل خیر یا فلاں عمل بد کی جزا یا سزا دی جا رہی ہے ۔لیکن اگر وہ اس امر کو سمجھ ہی نہ سکے تو پھر جزاوسزا بے کار ہو کر جائے گی ۔ظاہر ہے کہ تناسخ ارواح میں یہ احساس نہیں ہوتا۔مثلاً ایک شخص بادشاہ کے گھر میں ہو کر بادشاہ بن جاتا ہے اور نہایت عیش وعشرت سے زندگی بسر کرتا ہے، اسے ہرگز یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ اسے گزشتہ زندگی کے کس عمل صالح کے معاوضہ میں بادشاہی ملی ہے ۔اسی طرح ایک بندر یا بلی کو کیا خبر ہے کہ کس عمل بد کی پاداش میں اسے بندر یا بلی بنایا گیا ہے ۔پس جب تناسخ باطل ہے تو اس سے خود بخود دوسرے طریقہ جزاوسزا یعنی معاد کی صحت ثابت ہو جاتی ہے ۔

"ولا یلزم من هذا البیان الدور نعوذ بالله من الحور بعد الکور" ۔ فتدبر

پانچویں دلیل

یہ بات ہر قسم کے شک وشبہ سے بالا ہے کہ خداوند عالم سے بڑا اور کوئی سلطان وشہنشاہ نہیں ہے ۔وہی ہر چیز کا خالق و مالک ہے ۔کائنات میں اس کا کوئی ہمسر ونظیر نہیں ہے، وہ اپنی ذات و صفات میں واحد ویگانہ ہے ۔اسی طرح یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ تمام مخلوقاتِ خداوندی میں حضرتِ انسان سے بڑھ کر کوئی اشرف واعلیٰ مخلوق نہیں ہے ۔حضرتِ انسان کو ہی اشرفیت و افضلیت کا تاج پہنایا گیا ہے ۔اب اگر یہ اشرف المخلوقات خالق کائنات کی اطاعت یا معصیت کرے تو اس کو عوض کیسے ملنا چاہیے؟ قاعدہ یہ ہے کہ ہمیشہ جزاوسزا دہندہ وگیرندہ کی حیثیت کے مطابق ہوا کرتی ہے جو شخص جس مرتبہ کا مالک ہو گا وہ جزاوسزا بھی ویسی ہی دے گا اور پانے والا جس منزلت کا ہو گا جزا یا سزا بھی اس کو ایسی ہی دی جائے گی ۔اس امر کی وضاحت اس حکایت سے بخوبی ہو جاتی ہے جو رسالہ "ابطالِ تناسخ" میں منقول ہے کہ:

سکندر اعظم ایک مرتبہ کسی آدمی سے خوش ہوا، اور اس سے کہا: مجھ سے انعام طلب کر ۔

اس نے کہا: ایک درہم دے دو۔ سکندر نے کہا: یہ تو میری شان کے خلاف ہے۔ اس نے کہا: اچھا تو پھر ایک ملک دے دو۔ سکندر نے کہا: یہ تیری حیثیت سے زیادہ ہے۔

معلوم ہوا کہ ہمیشہ جزا یا سزا دہندہ اور گیرندہ کی حیثیت کے مطابق ہوتی ہے۔ بنابریں لازم ہے کہ خالق و مخلوق کی جزا و سزا کے سلسلہ میں اس قاعدہ کو ملحوظ رکھا جائے۔ اب ناظرین کرام انصاف سے بتائیں کہ اس جزا و سزا کا وہ طریقہ ٹھیک ہے جو اہلِ تناسخ نے تجویز کیا ہے یا وہ طریقہ انسب و اولیٰ ہے جو اسلام اور دیگر آسمانی ادیان نے پیش کیا ہے؟

کسے انکار ہے کہ دنیا کا راحت و رنج اور آسائش و غم دونوں فانی و بے حقیقت ہیں۔ اس میں نہ عیش و راحت کو دوام حاصل ہے اور نہ رنج والم کو بقاء۔ ایک شخص آج بادشاہ ہے کل گدا۔ آج غریب ہے کل امیر۔ ایک آدمی آج تندرست ہے کل مریض۔ آج مریض ہے کل تندرست۔ یہ زندگی نہیں بلکہ ایک کھیل ہے۔ جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے:

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِىَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۴﴾ (سورۃ العنکبوت: ۶۴)

تو بھلا مالک الملوک اور شہنشاہوں کا شہنشاہ جو کہ ازلی و ابدی اور غیر فانی ہے، انسان ایسے اشرف المخلوقات کو ایسی بے حقیقت جزا یا سزا دے سکتا ہے؟ حاشا وکلا، یہ امر تو قانون عقل و حکمت کے بالکل خلاف ہے۔ پس ماننا پڑے گا کہ کوئی ایسا طریقہ ہونا چاہیے جس کے ذریعہ جزا یا سزا عقل و قانون کے مطابق دی جا سکے، اور وہ طریقہ سوائے معاد کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ جس میں جزا و سزا دینے اور لینے والے کی حیثیت کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔

بحمدہٖ تعالیٰ ان دلائل و براہین سے واضح و لائح ہو گیا کہ معاد کا ہونا عقلاً ضروری ہے، اور کوئی عقلمند انسان اس کی ضرورت کا انکار نہیں کر سکتا اور شرع انور بھی اس کے اثبات کے تذکرہ سے مملو و مشحون ہے۔ مخبر صادق ﷺ نے اس کے وقوع کی خبر دی ہے۔ قرآن مجید میں شاید ہی کوئی ایسا سورہ ہو جس میں چند بار معاد کا اجمالاً یا تفصیلاً ذکر نہ کیا گیا ہو۔ ارشادِ قدرت ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِى الْكِتٰبِ مِنْ شَىْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۸﴾ (سورۃ الانعام: ۳۸)

زمین میں جو چلنے پھرنے والا (حیوان) یا اپنے دونوں پروں سے اڑنے والا پرندہ ہے ان کی بھی تمہاری طرح جماعتیں ہیں (اور سب کے سب لوح محفوظ میں موجود

ہیں) ہم نے کتاب (قرآن) میں کوئی بات فروگزاشت نہیں کی ہے۔ پھر سب کے سب (چرند ہوں یا پرند) اپنے پروردگار کے حضور میں لائے جائیں گے۔

وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ۞ (سورۃ الحج: ۷)

اور بے شک جو لوگ قبروں میں ہیں ان کو خدا دوبارہ زندہ کرے گا۔

وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۞ (سورۃ الانعام: ۳۶)

اور مردوں کو تو خدا قیامت ہی میں اٹھائے گا۔

زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۭ (سورۃ التغابن: ۷)

کافروں کا خیال یہ ہے کہ یہ لوگ دوبارہ نہ اٹھائے جائیں گے (اے رسولؐ) تم کہہ دو ہاں اپنے پروردگار کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے پھر جو جو کام تم کرتے رہے وہ تمھیں بتادے گا۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۞ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۞

(سورۃ الزلزال: ۷و۸)

تو جس شخص نے ذرہ برابر نیکی کی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس شخص نے ذرہ برابر بدی کی ہے تو اسے دیکھ لے گا۔

وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ (سورۃ الحج: ۷)

اور قیامت یقیناً آنے والی ہے جس میں کوئی شک نہیں۔

فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ (سورۃ الاسراء: ۵۱)

تو یہ لوگ عنقریب ہی تجھ سے پوچھیں گے کہ بھلا ہمیں دوبارہ کون زندہ کرے گا۔ تم کہہ دو کہ وہی (خدا) جس نے تم کو پہلی دفعہ پیدا کیا۔

وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ (سورۃ الروم: ۲۷)

اور وہ ایسا (قادر مطلق) ہے جو مخلوقات کو پہلی بار پیدا کرتا ہے پھر دوبارہ (قیامت کے دن) پیدا کرے گا اور یہ اس پر آسان ہے۔

اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ (سورۃ یونس: ۴)

تم سب کو (آخر) اسی کی طرف لوٹنا ہے، خدا کا وعدہ سچا ہے وہی یقیناً مخلوق کو پہلی مرتبہ پیدا کرتا ہے۔ پھر (مرنے کے بعد) وہی دوبارہ زندہ کرے گا تاکہ جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اچھے اچھے کام کیے ان کو انصاف کے ساتھ جزائے (خیر) عطا فرمائے۔

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخۡفِيۡهَا لِتُجۡزٰى كُلُّ نَفۡسٍۢ بِمَا تَسۡعٰى ﴿۱۵﴾ (سورۃ طٰہٰ:۱۵)

(کیونکہ) قیامت ضرور آنے والی ہے اور میں اسے لامحالہ چھپائے رکھوں گا، تاکہ ہر شخص (اس کے خوف سے نیکی کرے اور) جیسی کوشش کی ہے اس کا اسے بدلہ دیا جائے۔

وَ مَا خَلَقۡنَا السَّمَآءَ وَ الۡاَرۡضَ وَ مَا بَيۡنَهُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا (سورۃ صٓ:۲۷)

اور ہم نے آسمان اور زمین اور جو چیزیں ان دونوں کے درمیان ہیں بیکار نہیں پیدا کیا۔ یہ ان لوگوں کا خیال ہے جو کافر ہو بیٹھے۔

اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰكُمۡ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمۡ اِلَيۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۱۱۵﴾ (سورۃ المومنون:۱۱۵)

تو کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو (یوں ہی) بیکار پیدا کیا اور یہ کہ تم ہمارے حضور میں لوٹا کر نہ لائے جاؤ گے۔

اَمۡ نَجۡعَلُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالۡمُفۡسِدِيۡنَ فِى الۡاَرۡضِ ۫ اَمۡ نَجۡعَلُ الۡمُتَّقِيۡنَ كَالۡفُجَّارِ ﴿۲۸﴾ (سورۃ صٓ:۲۸)

کیا جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اچھے کام کیے ان کو ہم ان لوگوں کے برابر کردیں جو روئے زمین میں فساد پھیلایا کرتے ہیں، یا ہم پرہیزگاروں کو مثل بدکاروں کے بنادیں۔

لِيَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيۡبَ فِيۡهَا (سورۃ الکھف:۲۱)

تاکہ وہ لوگ دیکھ لیں کہ خدا کا وعدہ یقیناً سچا ہے۔ اور یہ (بھی سمجھ لیں) کہ قیامت (کے آنے) میں کچھ بھی شبہ نہیں۔ (ترجمہ فرمان ؒ)

الیٰ غیر ذلك من الآیات الکثیرة

ان آیاتِ مبارکہ میں غور وفکر کرنے سے قیامت کے قائم ہونے کے بعض اسرار ورموز کا انکشاف اور اس کے ضروری الوقوع ہونے کا فلسفہ بھی معلوم ہوجاتا ہے۔

ان فی ذلك لآیات لقوم یعقلون

اِعتقادِ آخرت کے اخلاقی پہلو

اب تک جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس سے عالم آخرت کا از روئے عقل و شرع ضروری ہونا معلوم ہوگیا۔ اب اس لحاظ سے بھی غور کرنا چاہیے کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی انسانی زندگی کے سدھارنے میں عقیدۂ آخرت کو کتنا دخل ہے؟ دنیا کی تاریخ سے واقفیت اور غور و فکر کی کچھ صلاحیت رکھنے والا انسان اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ برائیوں اور بداخلاقیوں سے جس طرح آخرت کا عقیدہ بچاتا ہے اور بچا سکتا ہے، اس طرح کوئی دوسری چیز نہیں بچا سکتی۔ اس طرح اسلام نے یومِ آخر کے اعتقاد کو اپنے ضابطۂ اخلاق اور نظام شرعی کے لیے ایک زبردست پشت پناہ بنا دیا ہے۔ جس میں صلاح و تقویٰ پر عمل کرنے اور شر و فساد سے اجتناب کرنے کے لیے عقلی ترغیب بھی موجود ہے اور نیکی و بدی پر یقینی جزا و سزا کا خوف بھی دامن گیر ہے۔ تجربہ و مشاہدہ شاہد ہے کہ بدکاریوں اور عیاریوں کی گنجائش اسی معاشرہ میں ہوتی ہے جو آخرت اور مرنے کے بعد خدا کی بارگاہ میں حاضر ہونے اور جزا و سزا کے تصور سے خالی ہو۔ آخرت کا انکار کرنے سے انسانی اخلاق و اقدار کا نقشہ ہی بدل جاتا ہے اور خیر و شر کا معیار و میزان ہی ختم ہوجاتا ہے۔ کیونکہ ایسا انسان جو قیامت کا قائل نہیں وہ دو حال سے خالی نہیں یا حالات اس کے ناموافق ہوں گے تو اس عقیدے سے وہ شدید قسم کی مایوسی اور پست ہمتی میں مُبتلا ہوجائے گا۔ جب وہ اپنی نیکی کا کوئی نتیجہ دنیا میں نہ دیکھے گا تو اس کی قوتِ عمل سرد پڑ جائے گی اور جب وہ شرپرور اور ظالموں کو برسر اقتدار دیکھے گا تو وہ یہ خیال کرے گا کہ عالم ہستی میں شر ہی کا بول بالا ہے اور خیر صرف نیچا دیکھنے کے لیے ہے۔ اور اگر اس کے حالات موافق و مساعد ہوئے تو اس اعتقاد سے انسان ایک نفس پرست حیوان ہو کر رہ جائے گا، وہ یہی خیال کرے گا کہ جو دن عیش و عشرت میں بسر ہوجائیں، وہی غنیمت ہیں۔ کما قیل:

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

ایسا انسان ظلم و ستم کرے گا، لوگوں کے حقوق غصب کرے گا، ان کی آبروریزی میں عار محسوس نہیں کرے گا۔ اور اپنی جنسی اور ذاتی خواہشات کی تکمیل میں بدسے بدتر فعل کرنے میں اس کو باک نہ ہوگا۔ اس کی نگاہ میں جرائم بس وہی ہوں گے جن کا نتیجہ کوئی دنیوی سزا یا کسی مادی نقصان کی شکل میں ظاہر ہو۔ اور اس کی نظر میں نیکیاں وہی ہوں گی جن کا نفع اور فائدہ اسے دنیا میں مل جائے۔ غرض کہ اس طرح اخلاقی تصورات بدل جائیں گے اور اس کا پورا نظام اخلاق خودغرضی اور نفسانیت

کی بنیاد پر تعمیر ہوگا۔ نیکی وبدی دنیوی فائدہ اور نقصان کی ہم معنی ومترادف ہوگی۔ بنابریں جھوٹ اگر دنیا میں نقصان کا موجب ہو تو گناہ اور اگر فائدہ کا ذریعہ بن جائے تو عین صواب ہوگا۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ ظاہر ہے کہ ایسے نظریات رکھنے والا خودغرض انسان ہرگز کسی مہذب انسانی سوسائٹی کے لیے مُفید نہیں ہوسکتا۔ لیکن ایسے اخلاقی معیار پر جو انسان ابھرے گا وہ جانوروں سے بھی بدتر ہوگا۔ اور پوری طرح "اولئك كالانعام بل هم اضل" (اعراف:۱۷۹) کا مصداق ہوگا۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اس مقام پر یہ کہا جاسکتا ہے بلکہ کہا بھی جاتا ہے کہ جو فوائد اعتقاد آخرت سے حاصل ہوتے ہیں دنیوی قانون اور حکومت کے زور سے بھی حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حکومت کا اثر صرف انسان کے ظاہر پر ہوتا ہے۔ یعنی جہاں انسان کو خیال ہو کہ حکومت کا کوئی آدمی اس کی حرکات وسکنات کو دیکھ رہا ہے، وہاں تو وہ ضرور جسمانی سزا کے ڈر سے حرکات ناشائستہ سے اجتناب کرے گا، بلکہ خلوت وغیرہ میں جونہی اسے یہ خیال ہوگا کہ یہاں حکومت کا کوئی آدمی نہیں دیکھ رہا تو وہ سب کچھ کر گزرے گا، جو آئین حکومت کے خلاف ہوگا، اور یہی حشر قانون کا ہوگا۔ علاوہ بریں وہ جرم کرے گا اور دنیوی قانون کی زد سے بچنے کے لیے جھوٹی شہادتیں فراہم کرے گا، ناجائز اثر و رسوخ سے کام لے گا، رشوت دے کر گلو خلاصی کرالے گا۔ پولیس کی نگاہوں سے بچ کر شرارت کر گزرے گا۔ لیکن آخرت کا اعتقاد وہ چیز ہے جو انسانی قلب وضمیر پر پہرہ بٹھا دیتا ہے۔ اس لیے خلوت وجلوت برابر ہوتی ہے۔

اس عقیدہ والا انسان یقین رکھتا ہے کہ نہ قدرت کی پولیس (کراماً کاتبین) کی نگاہ سے بچ سکتا ہے اور نہ خدا کی عدالت، کوئی دنیوی عدالت ہے کہ جھوٹی شہادتوں یا دیگر ناجائز ذرائع سے اس کی گرفت سے بچ جائے گا، بلکہ یہ ایسی پولیس ہے جو ہر حال میں اس کی نگرانی کر رہی ہے۔ اور یہ ایسی عدالت ہے جس کے گواہوں کی نظر سے وہ کسی طرح بچ نہیں سکتا اور نہ اس میں کوئی غلط حربہ کارآمد ہوسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں خدا و آخرت کے یقین وایمان کا نور موجود ہو ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ بُرے اعمال کرنا تو بجائے خود، بُرے خیالات کو بھی دل میں پیدا نہیں ہونے دیتے اور ان سے گھبراتے ہیں، وہ اپنے آئینہ قلب کو خیالِ گناہ کے غبار سے بھی پاک وصاف رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ الغرض یہی یقین ہے جو آدمی کو وہاں بھی گناہ کرنے سے روکتا ہے جہاں کوئی

دیکھنے والا نہ ہو، اور دنیا کے کسی قانون کی پکڑ اور سزا کا خطرہ و اندیشہ نہ ہو، اور یہ اعتقاد و ایمان انسان کے اندر ایک طاقتور ضمیر تشکیل کرتا ہے، جو کسی بیرونی لالچ اور خوف کے بغیر انسان کو نیکیوں کی طرف راغب اور برائیوں سے اجتناب پر آمادہ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں جگہ جگہ اسی عقیدہ کو مکارم اخلاق کی تعلیم کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ (سورة البقرة: ۲۲۳)

اللہ سے ڈرو اور یقین رکھو کہ تم کو اس کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔

سخت سے سخت مشکلات کے مقابلہ میں ڈٹ جانے کی قوت یہ کہہ کر پیدا کی جاتی ہے:

قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا (سورة التوبة: ۸۱)

جہنم کی آگ دنیا کی حرارت سے زیادہ گرم ہے۔

صدقات وغیرہ دینے پر یہ کہہ کر آمادہ کیا جاتا ہے:

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (سورة البقرة: ۲۷۲)

تم جو کچھ خیرات کرو گے اس کا تمھیں پورا پورا اجر و ثواب ملے گا اور تم پر ظلم نہ کیا جائے گا۔

سود خوری کے دنیوی فائدوں سے یہ کہہ کر دست برداری اختیار کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے:

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ (سورة البقرة: ۲۸۱)

اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کی بارگاہ میں لوٹ کر جاؤ گے۔

الیٰ غیر ذٰلک من الاٰیات الکثیرة ...... هٰذه تذکرة فمن شاء اتخذ الیٰ ربه سبیلا

معادِ جسمانی و رُوحانی کا اِثبات

جب بعونہ تعالیٰ ہم اپنے دو دعووں میں سے پہلے دعویٰ کے اثبات سے بطریق احسن فارغ ہو چکے ہیں تو اب دوسرے دعویٰ کو ثابت کرتے ہیں۔ یعنی یہ کہ معاد جسمانی و روحانی طور پر ہوگی، اس کے متعلق ذیل میں چند دلائل پیش کیے جاتے ہیں۔

اثباتِ معادِ جسمانی و رُوحانی پر پہلی اجمالی دلیل

سابقہ مباحث میں ہم موت کے بعد روح کی بقاء اور عالم برزخ میں اس کے مُنعم یا معذب ہونے کے متعلق جس قدر دلائل لکھ چکے ہیں وہ سب کے سب ہمارے اس دعویٰ کی پہلی دلیل قرار

دیے جاسکتے ہیں اور ان سے صرف معادِ جسمانی والے نظریہ کا بطلان بخوبی واضح وعیاں ہوجاتا ہے۔ اور یہاں جو ادلہ قائم کیے جارہے ہیں، ان سے صرف معاد روحانی والے قول کی نفی ہوجاتی ہے۔لہٰذا بعد ازیں معادِ جسمانی وروحانی والا قول بالکل بے غبار ہوکر رہ جاتا ہے۔ و ھو المقصود

دوسری اجمالی دلیل

اس میں کوئی شک نہیں کہ نیک یا بد اعمال کے کرنے میں جسم وروح دونوں کا تعلق ہے۔ ان دونوں کے بغیر کوئی انسان دنیا میں کوئی اچھا یا برا کام انجام نہیں دے سکتا۔لہٰذا عدل وانصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جزاو سزا بھی دونوں کو ملنی چاہیے۔ اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ حشر ونشر بھی دونوں کا ہو۔اسی کا نام معادِ جسمانی وروحانی ہے۔

تیسری دلیل

جو فرقے حشر ونشر کے قائل ہیں وہ کم از کم اتنا ضرور تسلیم کرتے ہیں کہ انسان محشور ہوگا اور ظاہر ہے کہ درحقیقت انسان جسم وروح دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ حقیقۃً نہ تنہا جسم انسان ہے اور نہ فقط روح۔ جیسا کہ یہ امر سابقاً روح کی بحث میں مُحقّق و مبرہن کیا جاچکا ہے۔لہٰذا ماننا پڑے گا کہ جب انسان محشور ہوگا تو لامحالہ جسم وروح دونوں ہی محشور ہوں گے۔ و ھو اوضح من ان یخفی۔ارشادِ قدرت ہے:

كَمَا بَدَأْنَآ أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُۥ (سورۃ الانبیا:۱۰۴)

جس طرح ہم نے پیدا کیا اسی طرح دوبارہ اس کو لوٹادیں گے۔

ظاہر ہے کہ دارِ دنیا میں نہ تنہا جسم آیا ہے اور نہ تنہا روح، بلکہ دونوں اکٹھے آئے ہیں۔لہٰذا معاد میں بھی دونوں اکٹھے ہوں گے۔

چوتھی دلیل

اگر یہ کہا جائے کہ معاد میں تنہا روح عود کرے گی، اس کے ساتھ جسم نہ ہوگا تو ہم دریافت کرتے ہیں کہ بدن کیوں محشور نہ ہوگا؟ آیا اس لیے کہ حشر کنندہ اس سے عاجز وقاصر ہے؟ یا اس لیے کہ بدن حشر کے قابل نہیں ہے۔ جواب میں جو شق بھی اختیار کی جائے وہی باطل ہے۔ کیونکہ خداوند عالم "علی کل شی قدیر" ہے جو پہلے انسان کو نیستی سے نکال کر عرصہ ہستی میں لاسکتا ہے وہ مُتفرّق اجزا کو جمع کرکے دوبارہ زندہ بھی کرسکتا ہے۔ بلکہ یہ کام زیادہ آسان ہے۔ جیسا کہ خود ارشادِ قدرت ہے: "وھو

اھون علیہ" (سورۂ روم: ۲۷) دوبارہ زندہ کرنا زیادہ آسان ہے۔ اور جو بدن پہلے باوجود عدم محض ہونے کے قابل ایجادوابداع تھا، وہ دوبارہ عود کرنے کے بطریق اولیٰ قابل ہوگا۔

قَالَ مَنۡ يُّحۡيِ الۡعِظَامَ وَهِىَ رَمِيۡمٌ ۞ قُلۡ يُحۡيِيۡهَا الَّذِىۡۤ اَنۡشَاَهَاۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ خَلۡقٍ عَلِيۡمُ ۞ (سورۂ یٰس: ۷۸ و ۷۹)

لہٰذا جب بدن کا حشر ممکن ہے اور ضرورت کا تقاضا بھی ہے کہ وہ محشور ہو، اور کوئی عقلی یا شرعی مانع بھی موجود نہیں ہے (موانع مزعومہ کا ہم ذیل میں بطلان ظاہر کریں گے انشاء اللہ) تو پھر بدن کیوں محشور نہ ہوگا؟

معاد کے متعلق ایک عام استبعاد

بعض منکرین معاد تو وہ ہیں جو اپنے اس انکار پر سوائے استبعاد کے اور کوئی دلیل یا شبہ پیش نہیں کرتے۔ چنانچہ کفار کی یہی کیفیت قرآن میں نقل کی گئی ہے۔ جیسا کہ خداوند عالم نے ان کے قول کو نقل فرمایا ہے:

وَقَالُوۡۤا ءَاِذَا ضَلَلۡنَا فِى الۡاَرۡضِ ءَاِنَّا لَفِىۡ خَلۡقٍ جَدِيۡدٍ ؕ (سورۃ السجدۃ: ۱۰)

کہتے ہیں: آیا جب ہم زمین میں گم ہوجائیں گے تو پھر ہم ایک خلق جدید (دوبارہ زندہ ہونے) سے دوچار ہوں گے؟

ءَاِذَا مِتۡنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيۡنُوۡنَ ۞ (سورۃ الصافات: ۵۳)

آیا جب ہم مرجائیں گے اور گل سڑ کر مٹی اور بوسیدہ ہڈیوں کی شکل میں ہوجائیں گے تو ہمیں جزا یا سزا دی جائے (یہ کیسے ہوسکتا ہے)

اسی طرح ایک اور مقام پر ان کا اس طرح قول نقل کیا گیا ہے:

قَالَ مَنۡ يُّحۡيِ الۡعِظَامَ وَهِىَ رَمِيۡمٌ ۞ (سورۂ یٰس: ۷۸)

ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا؟

ءَاِذَا مِتۡنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجۡعٌ ۢ بَعِيۡدٌ (۳) (سورۃ قٓ: ۳)

کیا جب ہم مرکر مٹی ہوجائیں گے (تو دوبارہ اٹھائے جائیں گے) یہ اٹھنا تو بہت دور ہے۔

اس استبعاد کا جواب

ظاہر ہے کہ اس قسم کا استبعاد وہی شخص کرسکتا ہے جو خداوند عالم کو قادر مطلق نہیں سمجھتا، ورنہ جو شخص خالق کو قادرِ علی الاطلاق تسلیم کرتا ہے، وہ ہرگز ایسے استبعاد کی بنا پر انکارِ معاد نہیں کرسکتا۔ اس لیے ایسے حضرات کو پہلے معرفت صانع عالم حاصل کرنا چاہیے۔ چنانچہ خداوند عالم نے اس قول کے قائلین کی مذمت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: "وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ" (یٰس: ۷۸) یعنی جو یہ کہتے ہیں کہ ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون پیدا کرے گا، وہ اپنی خلقت کو بھول چکے ہیں، ورنہ اگر انھیں اپنی خلقت کا ماجرا یاد ہوتا تو یہ ہرگز استبعاد پیش کر کے انکارِ معاد کرنے کی جسارت نہ کرتے۔

"قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ" اے رسولؐ! تم ان سے کہہ دو کہ ان ہڈیوں کو وہی (خدا) دوبارہ زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی مرتبہ کتم عدم سے نکال کر عرصہ وجود میں داخل کیا تھا"۔ اور اگر وہ اس پر یہ کہیں کہ کچھ اجزاء پریشان ہوگئے، کچھ کسی اور چیز کے ساتھ مخلوط ہوگئے، ان کو کس طرح اکٹھا کیا جائے گا؟ تو تم جواب میں کہہ دو: "وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ" ﴿۷۹﴾ (سورۃ یٰس: ۷۹) خدا تعالیٰ اپنی تمام مخلوق کا کما حقہ علم رکھتا ہے۔ اسے ہر چیز کے اجزاء اصلیہ کا علم ہے۔ تمھیں اشتباہ ہوسکتا ہے۔ لیکن اسے اشتباہ نہیں ہوتا۔ اور اگر بایں ہمہ وہ یہ کہیں کہ یہ کام تو بڑا مشکل ہے تو ان سے کہہ دو: "أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَن يَخْلُقَ مِثْلَهُم ۚ بَلَىٰ وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ" ﴿۸۱﴾ (سورۃ یٰس: ۸۱) کہ (تمھاری عقلوں پر کیوں پتھر پڑ گئے ہیں) بھلا وہ قادر مطلق جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا ہے وہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ان لوگوں کو دوبارہ پیدا کرے؟ ہاں وہ یقیناً اس پر قادر ہے اور وہ خلاق اور علیم ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے: "أَفَعَيِينَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ ۚ بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ" (سورۃ قٓ: ۱۵) کیا ہم ایک مرتبہ پیدا کر کے تھک گئے ہیں؟ (اور دوبارہ زندہ نہیں کرسکتے؟) دراصل بات یہ ہے کہ ان (کفار) کو نئی پیدائش میں شک ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ جس ذات نے اس تمام کارخانہ کائنات کو بلا کسی مثال کے نیستی سے ہست اور معدوم سے موجود کیا ہے، کیا وہ اسے معدوم کرنے کے بعد دوبارہ زندہ و موجود نہیں کرسکتا؟ جس نے نقش اول کھینچا تھا کیا وہ نقش ثانی کھینچنے پر قادر نہیں؟ مالکم کیف تحکمون؟

منکرینِ قیامت کے چند شبہات مع جوابات

بعض منکرین قیامت نے چند بودے شکوک و شبہات کی بنا پر اس کا انکار کیا ہے۔ ذیل میں ان کے شبہات کو مع ان کے تحقیقی جوابات کے ذکر کرتے ہیں۔

پہلا شبہ اعادۂ معدوم محال ہے

جب انسان مرجاتا ہے تو اس کا جسم امتدادِ زمانہ سے بالکل گل سڑ کر معدوم اور ملیامیٹ ہوجاتا ہے۔ لہٰذا اسے دوبارہ کس طرح زندہ کیا جاسکتا ہے؟ بالفاظِ دیگر اعادۂ معدوم ناممکن ہے، کوئی معدوم چیز موجود نہیں ہوسکتی۔ یہ ہے وہ شبہ جسے مختلف الفاظ و عبارات کے ساتھ بہت کچھ بار و برگ دے کر بڑے طمطراق کے ساتھ منکرین معاد پیش کیا کرتے ہیں۔ حکماء اسلام اور علمائے اعلام نے اس شبہ کے کئی طرح جواب باصواب دیے ہیں۔ نیز قرآن مجید میں بھی اس شبہ کو کئی مقامات پر اجمالاً ذکر کرکے باطل کیا گیا ہے۔

اس شبہ کا پہلا جواب باصواب

کسی چیز کے معدوم ہونے کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ شے بالکل فنا ہوجائے، اور اس کے اجزاء بھی باقی نہ رہیں۔ دوسرے یہ کہ اس شے کے اجزاء ترکیبیہ متفرق ہوجائیں اور اپنی اجتماعی ہیئت و صورت پر باقی نہ رہیں۔ جیسے اگر کسی درخت کو کاٹ کر ریزہ ریزہ کردیا جائے تو وہ درخت درخت نہ رہے گا، اور اسے معدوم کہا جائے گا۔ لیکن اس کے اجزاء موجود ہیں۔ اس مختصر تمہید کے بعد یہ امر واضح ہوجانا چاہیے کہ اہل اسلام کے قول کے مطابق جو اعادۂ معدوم لازم آتا ہے اور جس کے علماء محققین قائل ہیں، وہ معدوم اسی دوسرے معنی کے اعتبار سے ہے۔ کیونکہ جو انسان قیامت کو محشور ہوں گے وہ اس سے قبل ہرگز معدوم محض نہیں ہوں گے، بلکہ صرف ان کے اجزاء ترکیبیہ متفرق ہوگئے تھے۔ کیونکہ مرنے کے بعد عناصر جسمیہ اپنے اپنے عنصر میں چلے جاتے ہیں۔ مٹی مٹی میں اور پانی پانی میں، وعلیٰ ہذا القیاس۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ بالکل ہی نیست و نابود ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا ان متفرق شدہ اجزاء کو جمع کرکے دوبارہ صورتِ انسانیہ دے کر ان میں روح داخل کرکے زندہ کردینا خلاقِ عالم کے لیے کوئی دشوار کام نہیں ہے۔ ایک انسان ایک مکان کو گرا کر اسی مٹی اور لکڑی وغیرہ سے دوبارہ ایسا ہی ایک مکان تعمیر کرلیتا ہے، ایسے ہی خداوند عالم انسانوں کو بروز قیامت زندہ کرے گا،

اور اس سے ہرگز کسی محال و ناممکن امر کا ممکن ہونا لازم نہیں آتا بلکہ درحقیقت یہ کام خلقت اولیہ سے بدرجہا آسان ہے۔ کیونکہ خلقت اولیہ میں عدم محض سے چیز کو وجود میں لایا جاتا ہے، اور اس خلقت ثانیہ میں فقط متفرق اجزاء کو جمع کر دیا جائے گا۔ اسی لیے ارشادِ قدرت ہے:

وَهُوَ الَّذِي يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ ط (سورۃ روم: ۲۷)

خدا وہی ہے جس نے مخلوق کو پہلے پیدا کیا اور پھر وہی اس کو دوبارہ لوٹائے گا اور یہ دوبارہ لوٹانا اس کے لیے زیادہ آسان ہے۔

لہٰذا مشکل کا اقرار اور آسان کا انکار کسی عقلمند آدمی کا طریقۂ کار نہیں ہو سکتا۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ ط (سورۃ لقمان: ۲۸)

تمھارا پیدا کرنا اور پھر مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنا نہیں مگر مثل ایک نفس کے پیدا کرنے اور دوبارہ زندہ کرنے کے۔

خداوند عالم نے منکرین قیامت کو عجیب انداز میں ان کی غلطی پر تنبیہ کی ہے۔

إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ تُرَابٍ (سورۃ الحج: ۵)

اگر تمھیں دوبارہ زندہ ہونے میں شک ہے (تو ذرا غور کرو) ہم تم کو اسی مٹی سے پیدا کر چکے ہیں (تو کیا ہم تمھیں دوبارہ اس سے زندہ نہیں کر سکتے؟)

دوسرا جواب

اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ انسان مرنے کے بعد بالکل معدوم محض ہو جاتا ہے جیسا کہ بعض علماء کا خیال ہے، علامہ مجلسیؒ اور دیگر بعض علماء نے اس سلسلہ میں توقف فرمایا ہے کہ موت کے بعد فقط اجزاء متفرق ہو جاتے ہیں جنھیں بروزِ حشر جمع کر کے زندہ کیا جائے گا، یا اجسام بالکل معدوم محض ہو جاتے ہیں۔ لیکن انھوں نے یہ تسلیم کیا ہے کہ اکثر متکلمین امامیہ پہلے قول کے قائل ہیں۔ اس سلسلہ میں اگرچہ اخبار و آثار بادی النظر میں بظاہر قدرے مختلف معلوم ہوتے ہیں، لیکن ہمارے نزدیک پہلا قول ہی زیادہ قابل اعتبار ہے۔ اسی لیے ہم نے اسے جواب اول میں اختیار کیا ہے۔ بہرحال اگر عدم محض والے قول کو بھی اختیار کیا جائے تب بھی جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ اس بنا پر معاد کا انکار کرنا قرین عقل نہیں ہے۔ کیونکہ جو خدائے قدیر پہلی مرتبہ عدم محض سے نکال کر خلعت وجود عطا کر سکتا ہے وہ

لازماً اس بات پر بھی قادر ہے کہ انھیں معدوم کرنے کے بعد دوبارہ نعمت وجود سے مالامال کردے۔ قدرت نے اسی شبہ کا جواب اس طرح دیا ہے: "یحییھا الذی انشا ھا اول مرۃ" یعنی وہی خدا دوبارہ زندہ کرے گا جس نے پہلے انھیں پیدا کیا تھا، جبکہ وہ کچھ نہ تھے۔ اسی طرح وہ دوبارہ بھی اسی حالت سے زندہ کرسکتا ہے۔

ایک توہم کا اِزالہ

بعض بال کی کھال اتارنے والے متکلمین نے جو یہ کہا ہے کہ اعادۂ معدوم اس لیے ناممکن ہے کہ اس کے ساتھ اس کے زمان و مکان کا اعادہ بھی لازم ہے جس میں وہ موجود تھا، اور یہ ناممکن ہے تو اس کا جواب ظاہر ہے کہ یہ امر اپنے مقام پر مبرہن ہو چکا ہے کہ زمان و مکان مشخصات وجود میں سے نہیں ہیں تا کہ اعادہ معدوم کے ساتھ ان کا اعادہ بھی ضروری ہو، چنانچہ منقول ہے کہ شیخ بوعلی سینا کا ایک شاگرد اس بات پر مصر تھا کہ زمان بھی مشخصات میں سے ہے، دوران بحث میں شیخ نے کہا کہ مجھے تمھارے اشکال کا جواب دینا لازم نہیں۔ کیونکہ اب (وقت گزرنے سے) میں وہ نہیں رہا جو تم سے بحث کر رہا تھا۔ اور نہ تم وہ ہو جو بحث کر رہے تھے۔ اس پر وہ شاگرد مبہوت ہو کر ساکت و صامت ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ زمان یا مکان کو کسی انسان کے مخصوص انسان ہونے میں کوئی دخل نہیں ہے، ورنہ دنیا میں بھی لازم آئے گا کہ ایک انسان زمان و مکان کے بدلنے سے بدل جائے جو کہ بالبداہت باطل ہے۔

دوسرا شبہ آکل و ماکول

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ درندے یا پرندے انسان کو کھا جاتے ہیں۔ لہٰذا اس کو دوبارہ کس طرح زندہ کیا جاسکتا ہے؟ یہ اشکال اس وقت اور بھی قوی تر ہو جاتا ہے جب کہ کوئی انسان دوسرے انسان کو کھا جائے اور اس ماکول (کھائے ہوئے) انسان کے اجزاء آکل (کھانے والے) انسان کے اجزاء کے ساتھ مخلوط ہو جائیں۔ اب اگر یہ ماکول انسان دوبارہ زندہ ہو تو دو حال سے خالی نہیں ہے، یا تو آکل کے بدن کے ساتھ محشور ہو گا، اس صورت میں ماکول کے اجزاء باقی نہیں رہیں گے، وہ کس طرح محشور ہو گا؟ یا یہ ماکول اپنے بدن میں محشور ہو گا۔ اس صورت میں آکل کے اجزاء نہ رہیں گے۔ لہٰذا وہ دوبارہ محشور نہیں ہو سکے گا۔ یہ شبہ "آکل و ماکول" کے نام سے مشہور ہے۔

☆

اس شبہ کا پہلا مقنع جواب

اس شبہ کا بھی بچند وجہ جواب دیا جا سکتا ہے ۔ پہلا اقناعی جواب وہی ہے جس کی طرف خداوند عالم نے قرآن مجید کے اندر اشارہ کیا ہے: وھو بکل خلق علیم ۔یعنی خدا اپنی ہر مخلوق کا کما حقہ علم رکھتا ہے ۔ چونکہ اس شبہ کا دارومدار اجزاء کے باہم مخلوط و مشتبہ ہو جانے پر ہے کہ آکل وماکول کے اجزاء باہم اس طرح مل جاتے ہیں کہ اب تمیز نہیں ہو سکتی کہ کون سے اجزا آکل کے ہیں اور کون سے ماکول کے ہیں، تو خداوند عالم نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ تم خداوند عالم کا اپنے اوپر قیاس نہ کرو۔ اگر تمھیں آکل وماکول کے اجزاء کا علم نہیں تو اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ خالق کو بھی اس امر کا علم نہ ہو۔ اگر ایسا ہو تو پھر تم میں اور خالق میں فرق ہی کیا رہ جائے گا؟ ایسا نہیں بلکہ اسے اپنی ہر ہر مخلوق کا پوری طرح علم ہے ۔ لہٰذا وہ آکل وماکول کے اجزاء کو پہچان کر علیحدہ علیحدہ کر کے ان کو دوبارہ محشور کر سکتا ہے اور ضرور ایسا کرے گا۔ اس جواب کی بقدر ضرورت توضیح یہ ہے کہ ہر انسان کے خواہ وہ آکل ہو یا ماکول دو قسم کے اجزاء ہوتے ہیں ۔ ایک اجزاء اصلیہ جو اس کے قوام وجود میں دخیل ہیں اور ابتدائے عمر سے آخر عمر تک بہر حال برقرار رہتے ہیں اور دوسرے اجزء فضلیہ زائد جو اس کے قوام وجود میں دخیل نہیں ہوتے جو صحت ومرض اور صغرو کبر وغیرہ اسباب کی وجہ سے گھٹتے اور بڑھتے رہتے ہیں ۔ لہٰذا جب کوئی درندہ یا پرندہ یا کوئی انسان کسی انسان یا حیوان کو کھا جائے تو ماکول کے اجزاء اصلیہ آکل کے اجزائے فضلیہ بن کر اس کے جسم سے خارج ہو جاتے ہیں اور آکل کے اجزاء اصلیہ بدستور باقی رہتے ہیں اور چونکہ خداوند عالم کو ہر شخص کے اجزاء اصلیہ و فضلیہ کا بخوبی علم ہے اس لیے وہ قیامت کو آکل وماکول کے اجزاء اصلیہ کو جمع کر کے ان میں اس کی روح کو داخل کر کے اسے دوبارہ زندہ کر دے گا اور یہ امر اس کی قدرتِ کاملہ کے سامنے کوئی اہمیت نہیں رکھتا ۔ فعال لما یرید اور علی کل شیء قدیر کا مصداق ہے ۔ اسی لیے وہ ارشاد فرماتا ہے: ایحسب الانسان الن نجمع عظامه بلی قادرین علی ان نسوی بنانه (سورۃ القیامہ) کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کے (مرنے کے بعد) پھر اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کر سکتے؟ ایسا نہیں ہے بلکہ ہم تو اس کے پوروں کو بھی (دوبارہ) درست کر سکتے ہیں ۔

دُوسرا جواب باصواب

یہ قاعدہ ہے کہ جب کسی چیز کے امکان یا عدم امکان میں کلام ہو تو اس چیز کا واقع ہو جانا اس کے ممکن الوجود ہونے کی سب سے قوی دلیل ہوتی ہے ۔ بنابریں ہم کہتے ہیں کہ منکرین معاد کا اس

امر کو ناممکن سمجھنا غلط ہے جبکہ ایسا امر پہلے وقوع پذیر ہو چکا ہے۔ ارشادِ قدرت ہے:

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ۭ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۭ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ۭ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۵۹﴾ (سورۃ البقرۃ:۲۵۹)

(اے رسولؐ! تم نے) مثلاً اس (بندے کے حال) پر بھی نظر کی جو ایک گاؤں (پر سے ہوکر) گزرا اور وہ ایسا اجڑا تھا کہ اپنی چھتوں پر ڈھے کے گر پڑا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ (بندہ) کہنے لگا: اللہ! اب اس گاؤں کو (ایسی) ویرانی کے بعد کیونکر آباد کرے گا؟ اس پر خدا نے اس کو (مار ڈالا) اور سو برس تک مردہ رکھا۔ پھر اس کو جلا اٹھایا (تب) پوچھا تم کتنی دیر پڑے رہے۔ عرض کی ایک دن پڑا رہا یا ایک دن سے بھی کم۔ فرمایا: نہیں تم (اسی حالت میں) سو برس پڑے رہے۔ اب ذرا اپنے کھانے پینے (کی چیزوں) کو دیکھو کہ بسی تک نہیں اور ذرا اپنے گدھے (سواری) کو تو دیکھو (کہ اس کی ہڈیاں ڈھیر پڑی ہیں اور سب اس واسطے کیا ہے) تاکہ لوگوں کے لیے تمھیں قدرت کا نمونہ بنائیں اور (اچھا اب اس گدھے کی) ہڈیوں کی طرف نظر کرو کہ ہم کیونکر ان کو جوڑ جاڑ ڈھانچا بناتے ہیں۔ پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ پس جب ان پر یہ ظاہر ہوا تو بے ساختہ بول اٹھے کہ (اب) میں بہ یقین کامل جانتا ہوں کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ (ترجمہ فرمانؒ)

ان آیات کا شانِ نزول یہ ہے کہ حضرت ارمیاؑ (اور بروایتے حضرت عزیرؑ) نے ان ہلاک شدگان کو دریا کے کنارے اس حالت میں دیکھا تھا کہ ان میں سے بعض کو دریائی جانور کھا رہے تھے اور بعض کو صحرائی جانور کھا رہے تھے۔ جب انھوں نے اپنے اس استبعاد کا اظہار کیا کہ خدا ان کو کیونکر دوبارہ زندہ کرے گا تو خدائے قادر نے خود ان کو سو برس تک مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کرکے واضح کر دیا کہ خدائے بزرگ و برتر کے لیے ان کو دوبارہ زندہ کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ انه علیٰ کل شیء قدیر۔ (تفسیر صافی وغیرہ)

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب دریا کے کنارہ پر ایک مردار کو دیکھا کہ اسے

بحری و بری حیوانات کھا رہے تھے اور پھر وہ حیوانات ایک دوسرے پر حملہ کرکے ایک دوسرے کو ہضم کر رہے تھے۔ خلاصہ یہ کہ شُبہ آکل و ماکول کا مکمل سماں بندھا ہوا تھا۔ آں جنابؑ نے از راہِ تعجب بارگاہِ ایزدی میں استدعا کی: رَبِّ اَرِنِیۡ کَیۡفَ تُحۡیِ الۡمَوۡتٰی؟ (سورۃ بقرۃ: ۲۶۰) بارِ الٰہا! مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے؟ اس پر ارشادِ قدرت ہوا: اَوَلَمۡ تُؤۡمِنۡ؟ اے ابراہیمؑ! کیا تمہارا اس بات پر ایمان نہیں ہے؟ عرض کیا: بَلٰی وَ لٰکِنۡ لِّیَطۡمَئِنَّ قَلۡبِیۡ۔ ایمان تو ضرور ہے لیکن اطمینانِ قلب چاہتا ہوں۔ ارشاد ہوا:

فَخُذۡ اَرۡبَعَۃً مِّنَ الطَّیۡرِ فَصُرۡہُنَّ اِلَیۡکَ ثُمَّ اجۡعَلۡ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنۡہُنَّ جُزۡءًا ثُمَّ ادۡعُہُنَّ یَاۡتِیۡنَکَ سَعۡیًا ؕ وَ اعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴿۲۶۰﴾ (سورۃ البقرۃ: ۲۶۰)

(اچھا اگر یہ چاہتے ہو) تو چار پرندے لو اور ان کو اپنے پاس منگوا لو (اور ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو) پھر ہر پہاڑ پر ان کا ایک ایک ٹکڑا رکھ دو۔ اس کے بعد ان کو بلاؤ (پھر دیکھو تو کیونکر) وہ سب کے سب تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آتے ہیں۔ (ترجمہ فرمانؒ)

چنانچہ روایتوں میں وارد ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چار پرندے یعنی مرغ، کبوتر، مور اور کوے کو پکڑا اور ان کو ذبح کرکے ان کے گوشت کا قیمہ کیا، پھر اسے باہم مخلوط کر دیا۔ پھر ان مخلوط شدہ اجزا کو دس پہاڑوں پر تقسیم کرکے رکھ دیا اور ان کے سروں کو اپنے ہاتھ میں تھام رکھا۔ بعد ازاں جب ان کے نام لے کر ان کو پکارا تو وہ اجزاء جدا جدا ہوکر اپنے اپنے سر کے ساتھ آکر پیوست ہو گئے۔ اور دوبارہ وہ پرندے زندہ ہو گئے۔ اور جب ان کو چھوڑا تو وہ اڑ گئے۔ (تفسیر صافی و برہان وغیرہ)

سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے اس آیت مبارکہ کا یہ شانِ نزول کہ کو حضرت صادق علیہ السلام سے مروی ہے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: یظهر من هذا الخبر و غیره ان ابراهیم علیه السلام اراد بهذا ان یظهر للناس جواب شبهة تمسک بها الملاحدة المنکرون للمعاد۔ یعنی اس حدیث اور دیگر احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اس سوال سے مقصد صرف ان مُلحد و بے دین لوگوں کے شبہ (آکل و ماکول) کا جواب دینا مقصود تھا جو اس شبہ کی بنا پر قیامت کا انکار کرتے ہیں۔ (بحار الانوار جلد ۳) پس جب اسی دنیا میں ایسا ہو چکا ہے اور قادر و قہار پروردگار نے اپنی قدرتِ کاملہ کا مظاہرہ دکھا دیا ہے تو بعد ازاں بھی اس شبہ میں کچھ وزن باقی رہ جاتا ہے؟ اور کوئی عاقل و مُنصف انسان اس شبہ کی وجہ سے قیامت کا انکار کر سکتا ہے؟

تیسرا جوابِ باصواب

آج کل علوم جدیدہ اس قدر ترقی کر گئے ہیں کہ ان کی روشنی میں ایسے شبہات کی ہرگز کوئی وقعت ہی نہیں رہی۔ آج سائنس دان ڈاکٹر کیمیاوی تحلیل سے پانی و ہوا کے اجزاء کی مقدار بتا سکتے ہیں کہ اس میں آکسیجن کس قدر ہے اور ہائیڈروجن کی کتنی مقدار ہے۔ جب مخلوق ایسا باریک تجزیہ کر سکتی ہے تو کیا خالق ایسا تجزیہ نہیں کر سکتا کہ آکل و ماکول کے اجزاء اصلیہ کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر سکے؟ وما قدروا اللہ حق قدرہ (انعام: ۹۱) ڈاکٹروں اور عالموں پر ہی کیا منحصر ہے۔ ایک اَن پڑھ دیہات کے رہنے والی عورت کو خدا نے اس قدر عقل و شعور دیا ہے کہ وہ دودھ کو جمانے کے بعد اسے بلو کر اس سے گھی علیحدہ کر دیتی ہے اور لسی علیحدہ، تو جب ایک جاہل عورت اپنی حکمت عملی سے لسی اور دودھ کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر سکتی ہے تو کیا خالق اپنی مخلوق کے اجزاء کو ایک دوسرے سے تمیز دے کر علیحدہ علیحدہ نہیں کر سکتا؟ ایک معمولی عقل و خرد اور انصاف و ایمان رکھنے والا انسان تو اس میں شک و شبہ نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس پر یہ حقیقت مخفی و مستور رہ سکتی ہے۔ الا علی اکمه لا یبصر القمرا ......یا ایها الانسان ما غرك بربك الکریم (انفطار: ۶)

فنائے عالمِ کبیر کا عقلی اِمکان علومِ جدیدہ کی روشنی میں

جب سابقہ اوراق میں قیامت کی ضرورت اور معادِ جسمانی و روحانی کی حقانیت ثابت ہو چکی اور اس سلسلہ میں منکرین کی طرف سے جو بعض شکوک و شبہات پیش کیے جاتے تھے ان کا ازالہ بھی ہو چکا ہے تو اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عالم کبیر کے فنا ہونے پر بھی کچھ تبصرہ کر دیا جائے۔ کیونکہ کچھ لوگ فنائے عالم کے منکر ہیں۔ سو مخفی نہ رہے کہ افراد کی موت و حیات کا سلسلہ تو بالوجدان جاری و ساری ہے۔ کوئی مر رہا ہے اور کوئی پیدا ہو رہا ہے، اسی طرح صفحۂ ہستی پر قومیں بھی بنتی ہیں اور بگڑتی رہتی ہیں۔ آج ایک قوم نگار خانۂ کائنات پر ابھرتی ہے اور کل حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتی ہے۔ یہ سلسلہ قدیم الایام سے تاحال برابر جاری ہے۔ لیکن اس سے کائنات کے عمومی نظام اور اس کی رونق پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ ع

ہزاروں اٹھ گئے لیکن وہی رونق ہے محفل کی

قابلِ غور و تامل یہ امر ہے کہ آیا کوئی وقت ایسا بھی آئے گا کہ یہ نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے گا اور بساطِ ہستی الٹ دی جائے گی۔ نظامِ شمسی ختم ہو جائے گا، زمین و آسمان پاش پاش ہو جائیں

گے؟ اور ان کی جگہ نیا آسمان، نئی زمین اور نیا نظام ہوگا۔ جسے عرف شرع میں قیامت کبریٰ، یومِ آخر یوم البعث، یوم التلاق، یوم التغابن، یوم الحساب، یوم الدین، یوم الحشر، یوم الفصل اور یوم الخروج وغیرہ اسماء سے یاد کیا جاتا ہے اور اس کے ناموں کی کثرت سے ہی اس کی حقیقت کی فی الجملہ گرہ کشائی ہوجاتی ہے۔

عقلاء وفضلاء روزگار نے ان سوالات کا جواب اثبات میں دیا ہے۔ ان کا بیان یہ ہے کہ جس طرح یہاں افراد کی آمدورفت کا سلسلہ جاری ہے، اسی طرح ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ جب پوری دنیا موت کی لپیٹ میں آجائے گی۔ اہلِ فلسفہ کا بڑا گروہ اس کے امکان پر یقین رکھتا ہے۔ سائنس دان بھی اسے محال نہیں سمجھتے۔ طبیعیات اور ہیئت جدیدہ کے ماہرین تو امکان سے آگے قدم بڑھا کر اس کے وقوع پذیر ہونے کا اقرار کررہے ہیں اور اس عمومی ہلاکت کے طبعی اسباب تلاش کرنے میں مشغول ہیں۔

بعض یہ کہتے ہیں کہ پورے عالم کی گاڑی جس انجن کے زور پر چل رہی ہے وہ گرمی آفتاب ہے، جس کی گرمی روز بروز کم ہوتی جارہی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ یہ انجن بالکل سرد پڑجائے گا، جس سے گاڑی کا چلنا موقوف ہوجائے گا، بلکہ ساری دنیا نیست و نابود ہوجائے گی۔ اور بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ سارا نظام عالم باہمی جذبات وکشش کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے، فضائے ہستی کے تمام سیارے روز بروز برابر کھنچتے چلے آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ ان کا موجودہ توازن برقرار نہیں رہے گا۔ اس وقت تمام کرات ایک دوسرے کے بالکل قریب ہوجائیں گے، اور باہم متصادم ہوکر پاش پاش ہوجائیں گے۔

بعض کا خیال ہے کہ اس فضائے محیط میں کروڑوں ستارے تیر رہے ہیں، اب تک ان میں سے بہت کم کا ہمیں علم ہوسکا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ کسی وقت ہماری یہ زمین کسی نئے سیارے سے ٹکرا کر چور چور ہوجائے، اور اس کی تمام آبادی چشم زدن میں ملیامیٹ ہوجائے۔ (سیرۃ النبیؐ)

بہرحال اس کے طبعی اسباب کچھ بھی ہوں ہمارا مقصد صرف یہ بتلانا ہے کہ سائنس دان بھی فنائے عالم کو ممکن تسلیم کرتے ہیں، بلکہ بعض تو اس کے وقوع کی سرحد تک پہنچ چکے ہیں۔ لہٰذا جب ایسا ہونا عقلاً ممکن ہے اور مخبرین صادقینؑ نے اس کے واقع ہونے کی خبر دی ہے، تو پھر اسے تسلیم کرنے میں کیا امر مانع ہوسکتا ہے؟

بعد از فنائے عالم کبیر قیامتؒ کا سماں روزِ حشر و نشر کی کیفیتؒ

جو کچھ احادیثِ مُعتبرہ سے مُستفاد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ خداوندِ عالم جب دنیا کو ختم کر کے قیامت قائم کرنا چاہے گا تو اسرافیل کو حکم دے گا کہ زمین پر جا کر صور پھونکیں۔ صور کل دو مرتبہ پھونکا جائے گا۔ وہ صور بہت بڑا اور نورانی ہے جس کا ایک سر اور دو شاخیں ہیں۔ چنانچہ جناب اسرافیل زمین پر بمقام بیت المقدس قبلہ رو ہو کر صور پھونکیں گے۔ پس جب اس سرے سے آواز بر آمد ہوگی جو زمین کی طرف ہے تو اہل زمین کی ہلاکت واقع ہو جائے گی اور جب اس طرف سے آواز نکلے گی جو آسمان کی طرف ہے تو آسمان والوں پر موت واقع ہو جائے گی۔ اس کے بعد اسرافیل کو ارشاد قدرت ہوگا کہ تو بھی مرجا۔ چنانچہ وہ بھی مرجائے گا۔ اب نفخ صور کے وقت نظامِ زمین و آسمان کی برہمی، نظامِ شمس و قمر کی ابتری، تمام عالم کے فنا ہو جانے کی جو تصویر قرآن مجید نے کھینچی ہے اس سے بہتر اس حقیقت کا اِظہار ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ہم اس سلسلہ کی چند آیاتِ مبارکہ یہاں پیش کرتے ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ اِذَا وَقَعَتِ الۡوَاقِعَةُ ۝١ لَیۡسَ لِوَقۡعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝٢ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۝٣ اِذَا رُجَّتِ الۡاَرۡضُ رَجًّا ۝٤ وَّ بُسَّتِ الۡجِبَالُ بَسًّا ۝٥ فَكَانَتۡ هَبَآءً مُّنۡۢبَثًّا ۝٦ (سورۃ الواقعۃ:۱تا۶)

جب کہ قیامت واقع ہو جائے جس کے واقع ہونے میں کوئی جھوٹ نہیں (وہ) پست کرنے والی (بھی) ہے اور بلند کرنے والی (بھی) جس وقت زمین ایسی ہلائی جائے گی جیسا کہ ہلائے جانے کا حق ہے۔ اور پہاڑ ایسے اکھاڑ دیے جائیں گے جیسا کہ اکھاڑ دیے جانے کا حق ہے۔

اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَهَا ۝١ وَ اَخۡرَجَتِ الۡاَرۡضُ اَثۡقَالَهَا ۝٢ وَ قَالَ الۡاِنۡسَانُ مَا لَهَا ۝٣ یَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخۡبَارَهَا ۝٤ (سورۃ الزلزال:۱تا۴)

جب زمین بڑے زور سے ہلائی جائے اور زمین اپنے دفینے نکال دے اور انسان یہ کہنے لگے کہ اسے ہو کیا گیا ہے؟ اس دن زمین اپنی خبریں بیان کر دے گی۔

یَوۡمَ تُبَدَّلُ الۡاَرۡضُ غَیۡرَ الۡاَرۡضِ وَ السَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوۡا لِلّٰهِ الۡوَاحِدِ الۡقَهَّارِ ۝٤٨ (سورۃ ابراھیم:۴۸)

جس دن زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان (دوسرے آسمانوں سے) اور سب زبردست و یکتا خدا کے حضور میں کھڑے ہوں گے۔

یَوۡمَ تَرۡجُفُ الۡاَرۡضُ وَ الۡجِبَالُ وَ كَانَتِ الۡجِبَالُ كَثِیۡبًا مَّهِیۡلًا ۝١٤ (سورۃ المزمل:۱۴)

(اس دن کے لیے) جس دن زمین اور پہاڑ لرزنے لگیں اور پہاڑ ریت کے ٹیلے ہو جائیں۔

إِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۞ وَ إِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۞ وَ إِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۞ وَ إِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۞ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ ۞ (سورۃ الانفطار: ۱ تا ۵)

جب کہ آسمان پھٹ جائیں گے اور جب کہ تارے گر کر تتر بتر ہو جائیں گے اور جب کہ دریا بہہ کر مل جائیں گے اور جب کہ قبریں الٹ پلٹ کر دی جائیں گی (اس وقت) ہر نفس جان لے گا کہ اس نے آگے کیا بھیجا ہے اور پیچھے کیا چھوڑا ہے۔

إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۞ وَإِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۞ وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۞ (سورۃ التکویر: ۱ تا ۳)

جب کہ سورج کی روشنی لپیٹ دی جائے گی اور جب کہ تاروں کی روشنی جاتی رہے گی اور جب کہ پہاڑ چلائے جائیں گے۔

وَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۞ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۞ وَ جُمِعَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ ۞ (سورۃ القیامۃ ۷ تا ۹)

تو جب آنکھیں چندھیا جائیں گی اور چاند کو گہن لگ جائے گا اور سورج اور چاند جمع کر دیے جائیں گے۔

اَلْقَارِعَةُ ۞ مَا الْقَارِعَةُ ۞ وَ مَآ اَدْرٰكَ مَا الْقَارِعَةُ ۞ يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۞ وَ تَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۞ (سورۃ القارعۃ: ۱ تا ۵)

کھڑکھڑانے والا (واقعہ) کیا ہے، وہ کھڑکھڑانے والا (واقعہ) اور تم کیا سمجھے کہ وہ کھڑکھڑانے والا (واقعہ) ہے کیا؟ وہ دن ہے جس دن آدمی ایسے ہو جائیں گے جیسے پھیلے ہوئے پتنگے۔ اور پہاڑ ایسے ہو جائیں گے جیسے دھنکی ہوئی اون۔

اور یہ قیامت بالکل ناگہانی طور پر اچانک واقع ہوگی۔ جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے:

لَا تَأْتِيْكُمْ إِلَّا بَغْتَةً (سورۃ الاعراف: ۱۸۷)

یعنی قیامت اچانک آجائے گی۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت رسولِ خدا ﷺ سے مروی ہے، فرمایا: قیامت اس طرح اچانک آجائے گی کہ کوئی شخص اپنے حوض کی اصلاح کر رہا ہوگا اور کوئی اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہا ہوگا، اور کوئی اپنی پونجی بازار میں درست کر رہا ہوگا، اور کوئی ترازو کو اونچا نیچا کر رہا ہوگا۔ (تفسیر صافی وغیرہ)

اس وقت ارشادِ قدرت ہوگا: لمن الملك اليوم۔ آج کس کی بادشاہت ہے؟ کوئی جواب دینے والا نہ ہوگا، خود ہی ارشاد فرمائے گا: لله الواحد القهار۔ آج قہار و جبار خدا کی سلطنت ہے۔ (نہج البلاغہ)

اب جب تک خداوند عالم چاہے گا یہی کیفیت رہے گی۔ اور ہر چیز نیستی کے عالم میں پڑی رہے گی۔ اور جب مشیّت ایزدی دوبارہ زندہ کرنے کے متعلق ہوگی تو چالیس دن تک بارانِ رحمت کا نزول ہوگا، جس سے مردوں کے متفرق اجزاء جمع ہوں گے اور اب قدرتِ کاملہ سے صور میں دوبارہ آواز پیدا ہوگی جب اس سرے سے آواز نکلے گی جو آسمان کی طرف ہے تو آسمان والی مخلوق زندہ ہوجائے گی اور جب اس طرف سے آواز پیدا ہوگی جو زمین کی طرف ہے تو زمین والی مخلوق زندہ ہوجائے گی۔

آیت مبارکہ: "وان الساعة اتية لا ريب فيها وان الله يبعث من فى القبور" (حج:۷) کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ جناب رسولِ خدا ﷺ نے جناب جبرائیلؑ سے فرمایا کہ مجھے دکھاؤ خداوند عالم بروزِ قیامت بندوں کو کس طرح اٹھائے گا (مقصد دوسرے لوگوں کو یہ منظر دکھلانا تھا) جبرائیلؑ مقبرۂ بنی ساعدہ میں گئے اور ایک قبر کے پاس پہنچ کر کہا خدا کے حکم سے اٹھو۔ چنانچہ ایک شخص سر سے مٹی جھاڑتا ہوا نکلا۔ جو ہائے افسوس ہائے ہلاکت کہہ رہا تھا۔ جناب جبرائیلؑ نے اس کہا پھر قبر میں داخل ہوجاؤ۔ اس کے بعد ایک اور قبر کے پاس پہنچے اور فرمایا: خدا کے اذن سے نکلو۔ اس سے ایک نوجوان سر سے مٹی جھاڑتا ہوا باہر نکلا، جو یہ کلمات پڑھ رہا تھا: "اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له واشهد ان محمدا عبده ورسوله واشهد ان الساعة اتية لا ريب فيها وان الله يبعث من فى القبور" جبرائیلؑ نے کہا: قیامت کے دن اسی طرح لوگ اٹھائے جائیں گے۔ (تفسیر صافی بحوالہ قرب الاسناد حمیری)

"يخرجون من الاجداث كانهم جراد منتشر" (سورۃ القمر:۷)

لوگ قبروں سے مٹی جھاڑتے ہوئے یوں نکل پڑیں گے جیسے ٹڈی دل لشکر پھیلا ہوا ہو۔

اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ ① یَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّاۤ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰی وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰی وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِیْدٌ ② (سورۃ الحج: ۱و۲)

بے شک قیامت کا زلزلہ بہت بڑی چیز ہے۔ جس دن تم اس (قیامت) کو دیکھو گے ہر دودھ پلانے والی اس سے غافل ہوجائے گی، جسے وہ دودھ پلایا کرتی تھی اور ہر حمل والی اپنا حمل گرادے گی اور تم لوگوں کو نشہ کی سی حالت میں دیکھو گے۔ حالانکہ وہ متوالے نہ ہوں گے، بلکہ خدا کا عذاب ہی سخت ہوگا۔

وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِیْدٌ ㉑ (سورۃ ق:۲۱)

اور ہر نفس اس شان سے آئے گا کہ ایک ہانکنے والا اور ایک گواہ اس کے ساتھ ساتھ آئے گا۔ (ترجمہ مقبولؒ)

تلك من انباء الغيب نوحيها اليك

تفاصیل قیامت پر اجمالی ایمان رکھنا چاہیے

باقی رہ گئیں قیامت کی تفاصیل کہ مردے کس حال میں محشور ہوں گے؟ کس شکل و صورت میں عرصہ محشر میں آئیں گے؟ وہاں کن کن مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کتنا طویل عرصہ وہاں ٹھہرنا ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ۔

علماء اعلام نے ان امور پر اجمالی ایمان و ایقان رکھنے کی تاکید فرمائی ہے۔ چنانچہ سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: اقول الاحوط و الاولی التصدیق بما تواتر فی النصوص و علم ضرورة من ثبوت الحشر الجسمانی و سائر ما ورد فیها من خصوصیاته و عدم الخوض فی امثال ذلك اذلم نكلف بذلك و ربما ادی التفكر فيها الی القول بشئ لم یطابق الواقع و لم نكن معذورین فی ذلك و الله الموفق للحق و السداد فی المبدأ و المعاد (بحار الانوار جلد ۳) میں کہتا ہوں احوط و اولیٰ یہ ہے کہ یہ جو کچھ بالتواتر و بالضرورت حشر جسمانی اور اس کی دیگر بعض خصوصیات ثابت ہیں ان پر ایمان لایا جائے اور دوسری عام باریکیوں میں زیادہ غور و خوض نہ کیا جائے۔ کیونکہ اس امر کی ہمیں تکلیف ہی نہیں دی گئی اور بسا اوقات ان امور میں غور و خوض کرنا بعض ایسے نظریات تک پہنچا دیتا ہے جو واقع کے مطابق نہیں ہوتے اور ہم اس غلطی میں شرعاً معذور بھی نہ ہوں گے۔ خدا ہی آغاز و انجام میں حق و راستی کی توفیق دینے والا ہے۔

آخرت کی تفصیلات میں شبہ محض عقل و علم کی نارسائی کی وجہ سے ہوتا ہے

اس مبحث کے اختتام پر اس امر کی وضاحت بھی مناسب ہے کہ چونکہ عالم آخرت کی چیزیں نہ ہماری دیکھی بھالی ہوئی ہیں اور نہ ہی تجربہ و مشاہدہ میں آئی ہیں، اس لیے وہ ہمیں اچنبے کی سی معلوم ہوتی ہیں اور بعض لوگوں کے لیے ان کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہے جیسا کہ کسی بچہ سے جو ابھی ماں کے پیٹ سے باہر نہ آیا ہو کسی آلہ کے ذریعہ یہ کہا جائے کہ اے بچے تو عنقریب ایک ایسی دنیا میں آنے والا ہے جہاں لاکھوں میل کی زمین ہے اور اس سے بھی بڑے بڑے سمندر ہیں۔ آسمان ہے، چاند، سورج اور لاکھوں ستارے ہیں اور وہاں ہوائی جہاز اڑتے ہیں، ریلیں دوڑتی ہیں،

لڑائیاں ہوتی ہیں، توپیں گرجتی ہیں، ایٹم بم چلتے ہیں ۔ وہ اگر بالفرض ان باتوں کو سن لے اور سمجھ بھی لے تو اس کے لیے ان باتوں پر یقین کرنا بہت مشکل ہوگا۔ کیونکہ وہ اس وقت جس دنیا میں ہے جسے وہ دیکھتا اور جانتا ہے وہ تو اس کی ماں کی بالشت بھر پیٹ کی دنیا میں ہے، بالکل ایسا ہی معاملہ آخرت کے بارے میں اس دنیا کے رہنے والے انسانوں کا ہے ۔ کیونکہ عالم آخرت اس دنیا کے مقابلہ میں اسی طرح بے حد وسیع وعریض اور بے انتہا ترقی یافتہ ہے جس طرح ماں کے پیٹ کے مقابلہ میں ہماری یہ دنیا اور زمین و آسمان بے حد وسیع اور ترقی یافتہ ہیں اور جس طرح بچہ ماں کے پیٹ سے باہر آنے کے بعد وہ سب کچھ دیکھ کر تسلیم کر لیتا ہے جس کو ماں کے پیٹ کے زمانہ میں سمجھنا اس کے لیے مشکل تھا۔ اسی طرح عالم آخرت میں پہنچنے کے بعد انسان وہ سب کچھ دیکھ لیں گے جو ہادیان دین نے وہاں کے متعلق بتایا ہے ۔ یہ بالکل عقلی وفطری بات ہے کہ جس چیز کو ہم نہیں جانتے اور جسے ہم نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا اس کے متعلق ان صادق القول بزرگواروں کے بیان پر اعتماد کرنا چاہیے، جن کی صداقت و پاکبازی دلائل و معجزات سے ثابت ہو چکی ہے اور ان کا یہ بیان وحی والہام پہ مبنی ہے ۔ اسی لیے تو قیامت کا نام اصول دین میں سب کے آخر میں آتا ہے ۔ مقصد یہ ہے کہ جب خدا کو خدا، رسول کو رسول اور امام کو امام تسلیم کر لیا جائے تو اس وقت ان کی فرمائشات کے سامنے سر تسلیم خم کرنا آسان ہو جاتا ہے ۔ *انا ھدینٰہ السبیل اما شاکرا واما کفورا* ۔

باب الاعتقاد

فی الحوض

قال ابوجعفر اعتقادنا فی الحوض انه حق و ان عرضه ما بین

بیسواں بابؒ

حوضِ کوثر کے متعلّق اعتقاد

حضرت شیخ ابو جعفر علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ حوض کوثر کے متعلّق ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ وہ حق ہے اور اس کی چوڑائی

بیسواں بابؒ

حوضِ کوثر کا بیان

حوضِ کوثر پر ایمان وایقان رکھنے کی اہمیت کا بیان

حوضِ کوثر کے متعلّق احادیث کثیرہ و مستفیضہ وارد ہوئی ہیں۔ صاحبِ "حق الیقین" نے وسیلہ، لواء الحمد، حوضِ کوثر اور شفاعت والی احادیث کو متواتر قرار دیا ہے۔ حوض پر ایمان و اعتقاد رکھنے کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے جناب رسولِ خداؐ کی یہی حدیث کافی ہے جسے مُصنّف علام نے اپنی کتاب امالی اور عیون اخبار الرضا میں جناب رضا علیہ السلام سے اور انھوں نے اپنے آباء و اجداد طاہرینؑ کے سلسلہ سند سے جناب رسولِ خداؐ سے روایت کیا ہے، فرمایا: من لم یومن بحوضی فلا اوردہ اللہ حوضی و من لم یومن بشفاعتی فلا انالہ اللہ شفاعتی۔ جو شخص میرے حوض پر ایمان نہ رکھے خدا اسے میرے حوض پر وارد نہ کرے اور جو شخص میری شفاعت پر ایمان نہ رکھے خدا اسے میری شفاعت نصیب نہ کرے۔

سورۃ مبارکہ الکوثر میں جو لفظ کوثر وارد ہے "انا اعطینٰک الکوثر" اے رسولؐ! ہم نے تمھیں کوثر عطا کیا ہے، اس کی تفسیر میں مُتعدّد ایسی روایتیں موجود ہیں جن میں کوثر کی تفسیر حوضِ کوثر سے کی گئی ہے۔ ہاں بعض روایتوں میں اس کی تفسیر کثرتِ اولاد سے بھی کی گئی ہے، چونکہ کفار آنحضرتؐ کو "ابتر" (نسل بریدہ) کہتے تھے، خداوند عالم نے ان کی تردید کرتے ہوئے فرمایا: ہم نے تمھیں اولادِ کثیر عطا کی ہے۔ ابن عباسؓ سے اس کی تفسیر "خیر کثیر" کے ساتھ کی گئی ہے اور بعض مُفسّرین نے "نبوت" اور بعض نے قرآن اور بعض نے شفاعت سے بھی اس کی تفسیر کی ہے۔

فی الحقیقت ان تمام تفاسیر میں کوئی تعارض و اختلاف نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ طبرسی نے اپنی

ایلة و صنعا و هو للنبیّ و ان فیه	ایلہ (جو کہ ینبوع اور مصر کے درمیان ایک شہر ہے) اور صنعا
من الاباریق عدد نجوم السماء	(جو کہ یمن کا ایک شہر ہے) کے درمیانی فاصلہ کے برابر ہے۔ یہ
و ان الساقی علیه یوم القیٰمة	حوض خاص سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ہے اور

تفسیر مجمع البیان جلد۲ بذیل تفسیر کوثر یہ سب مختلف تفسیریں لکھنے کے بعد لکھا ہے:

و اللفظ محتمل للکل فیجب ان یحمل علی جمیع ما ذکر من الاقوال فقد اعطاه الله سبحانه الخیر الکثیر و وعده الخیر الکثیر فی الأخرة و جمیع هذه الا قوال تفصیل الجملة التی هی الخیر الکثیر فی الدارین

یعنی لفظ "کوثر" ان سب معانی کا متحمل ہے لہٰذا واجب ہے کہ اسے ان تمام معانی پر حمل کیا جائے۔ چنانچہ خداوند عالم نے آنحضرت ﷺ کو دنیا میں خیر کثیر عطا فرمایا اور آخرت میں بھی خیر کثیر عطا فرمانے کا وعدہ کیا ہے اور درحقیقت یہ سب اقوال خیر کثیر فی الدارین والے جملہ کی تفصیل ہیں۔

حوضِ کوثر کی کیفیّت کا بیان

حوض کوثر کی کیفیّت کیا ہے؟ اس کے متعلق کتب فریقین میں بکثرت روایتیں موجود ہیں اور اس کی جو کیفیّت مُصنّف علام علیہ الرحمۃ والرضوان نے بیان کی ہے یہ معمولی اختلاف الفاظ و عبارات کے ساتھ تفسیر قمی، بشارۃ المصطفیٰ میں جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے مُصنّف کی امالی میں ابن عباس سے مناقب شہر ابن آشوب میں بحوالہ حلیۃ الاولیاء حافظ ابو نعیم اصفہانی انس بن مالکؓ سے اور کامل الزیارۃ میں بروایت مسمع جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے۔ اسی سلسلہ میں کتاب مجالس شیخ مُفید علیہ الرحمہ اور بشارۃ المصطفیٰ میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب سورہ انا اعطینک الکوثر نازل ہوئی تو جناب امیرالمومنین علیہ السلام نے عرض کیا یارسول اللہ! اس نہر کی کچھ وصف تو بیان فرمائیں؟ آں جنابؐ نے فرمایا: یا علیؑ! کوثر ایک نہر ہے جو عرشِ اعظم کے نیچے جاری ہے۔ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید، شہد سے زیادہ میٹھا اور گھی سے زیادہ نرم ہے۔ ان کے کنکر زبرجد، یاقوت اور مرجان ہیں۔ اس کا گھاس زعفران اور مٹی مشک اذفر ہے۔ یہ فرما کر آنجنابؐ نے اپنا دست مبارک جناب امیرالمومنین علیہ السلام کے پہلو پر رکھا اور فرمایا: یا علیؑ! یہ نہر میرے اور تمھارے اور تمھارے محبوں کے لیے ہے۔

جعلنا الله من محبیهم و شیعتهم و حشرنا فی زمرتهم بجاههم صلوات الله علیهم

امیرالمومنین علی بن ابی طالب یسقی منه اولیائه و یذود عنه اعدائه و من شرب عنه شربة لم یظما بعدھا ابداً

اس پر آسمانی ستاروں کے برابر کوزے رکھے ہوئے ہیں ۔ بروز قیامت حضرت امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام اس کے ساقی ہوں گے ۔ آنجناب اپنے شیعوں اور دوستوں کو اس سے سیراب کریں گے اور اپنے دشمنوں کو اس سے دور ہٹائیں گے ۔ جو شخص اس کے پانی کا ایک گھونٹ بھی پی لے گا اسے کبھی پیاس نہ لگے گی

حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کے ساقیٔ کوثر ہونے کا اثبات

جناب مُصنّف علام نے جو یہ فرمایا ہے کہ حوضِ کوثر سے پلانے والے جناب امیرالمومنین علیہ السلام ہوں گے، یہ امر کتب فریقین کی بکثرت روایات سے ثابت ہے ۔ چنانچہ امالی شیخ صدوق علیہ الرحمہ میں جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے، فرمایا: یا علی انت اخی و وزیری و صاحب لوائی فی الدنیا و الأخرة و انت صاحب حوضی و من احبك احبنی و من ابغضك ابغضنی ۔ یا علیؑ! تم میرے بھائی، وزیر اور دنیا و آخرت میں میرے جھنڈے کے حامل ہو (دنیا میں آپؑ کا حامل عَلَمِ جنگ ہونا تو واضح ہے اور آخرت میں حامل عَلَم ہونے کا یہ مطلب ہے کہ قیامت کو آنحضرتؐ کا لواء الحمد جو اتنا بڑا وسیع ہے کہ بروزِ قیامت تمام انبیاءؑ و مُرسلینؑ اور ان کے اوصیاءؑ اور کامل مومنین اسی کے زیر سایہ ہوں گے ۔ اس کے علاوہ محشر میں اور کوئی سایہ نہ ہوگا ۔ جناب امیر علیہ السلام کے ہاتھوں میں ہوگا ۔ (جناب امیرؑ کی یہ فضیلت بھی کتب فریقین میں ہے ۔ ملاحظہ ہو مناقب شہر بن آشوب، ینابیع المودۃ، ارجح المطالب وغیرہ) اور تم ہی میرے حوض کے ساقی ہو ۔ تمہارا دوست میرا دوست اور تمہارا دشمن میرا دشمن ہے ۔

نیز اسی کتاب میں آنحضرتؐ کا یہ ارشاد بھی موجود ہے، فرمایا: من اراد ان یتخلص من هول القیامة فلیتول ولی و لیتبع وصی و خلیفتی من بعدی علی بن ابی طالب فانه صاحب حوضی یذود عنه اعدائه و یسقی اولیائه فمن لم یسق منه لم یزل عطشاناً و لم یروا بداً و من سقی منه شربة لم یشق و لم یظما ابداً ۔ جو شخص قیامت کے ہولناک حالات سے نجات چاہتا ہے اسے چاہیے کہ میرے ولی سے دوستی رکھے اور میرے وصی و خلیفہ جناب علیؑ بن ابی طالبؑ کی اتباع و پیروی کرے ۔ کیونکہ یہی میرے حوض کے ساقی ہیں، وہ اس سے اپنے دشمنوں کو دور ہٹائیں گے اور اپنے دوستوں کو اس سے سیراب کریں گے جو شخص اس سے نہیں پی سکے گا وہ ہمیشہ ہی پیاسا رہے گا اور کبھی سیراب نہیں ہوگا اور جو شخص اس سے ایک مرتبہ پی لے گا وہ نہ تکلیف اٹھائے گا اور نہ ہی پھر اسے پیاس لگے گی ۔

و قال النبیؐ لیختلجن قوم من اصحابي دوني و انا علی الحوض فیوخذ بهم ذات الشمال فانادي یا ربي اصحابي اصحابي فیقال لی انك لا تدري ما احدثوا بعدك	جنابِ رسولِ خداؐ فرماتے ہیں میرے صحابہ کی ایک جماعت کو میرے سامنے گرفتار کر کے بائیں طرف لے جایا جائے گا جبکہ میں حوض کوثر پر موجود ہوں گا، وہ شدتِ پیاس کی وجہ سے میرے پاس آنے کے لیے کوشاں ہوں گے اس وقت میں اپنے پروردگار کو آواز دوں گا: خداوندا! یہ تو میرے صحابی ہیں۔ مجھے جواب دیا جائے گا: کیا تمھیں معلوم نہیں ہے کہ انھوں نے تمھارے بعد کیا کیا احداث و بدعات پھیلائے تھے؟

کتاب خصال شیخ صدوق علیہ الرحمہ میں جناب امیر علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: انا مع رسول اللہ و معی عترتی علی الحوض فمن ارادنا فلیاخذ بقولنا و لیعمل بعملنا فان لکل اهل بیت نجیب و لنا شفاعة و لاهل مودتنا شفاعة فتنا فسوا فی لقاءنا علی الحوض فانا نذود عنه اعدائنا و نسقی منه احبائنا و اولیائنا و من شرب شربة لم یظما بعدها ابداً الحدیث۔ میں حوضِ کوثر پر رسولِ خداؐ کے ساتھ ہوں گا اور میری عترت بھی وہاں میرے ساتھ ہوگی۔ پس جو شخص ہماری ملاقات کا خواہشمند ہے اسے چاہیے کہ ہمارے قول و فعل پر عمل کرے۔ کیونکہ ہر گھر سے کچھ نجیب و شریف ہوتے ہیں (جو ہماری کامل اتباع کرے گا وہ نجیب متصور ہوگا) ہمارے لیے اور ہمارے محبوں کے لیے شفاعت ثابت ہے۔ پس حوض پر ہم سے ملاقات کرنے کی کوشش کرو۔ کیونکہ ہم وہاں سے اپنے دشمنوں کو دور ہٹائیں گے اور اپنے محبوں کو سیراب کریں گے۔ جو شخص اس کا ایک گھونٹ پی لے گا اسے کبھی پیاس نہ لگے گی۔

ایسی احادیث سے ہماری کتب حدیث مملوو مشحون ہیں۔

نیز برادرانِ اسلامی کی کتب میں بھی بکثرت ایسی روایات موجود ہیں جن سے جناب امیر علیہ السلام کا ساقی کوثر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں کتاب ارجح المطالب، ینابیع المودة، مطالب السئول اور ارشاد القلوب دیلمی وغیرہ کتب قابلِ ملاحظہ ہوں۔

آنجنابؑ کی یہ صفت اس قدر مُسَلّم ہے کہ آپ کا لقب ہی "ساقی کوثر" مشہور ہوگیا ہے اور شعراء نے بھی جابجا آپ کے حق میں اس لقب کو استعمال کیا ہے۔ اگر خوفِ طوالت دامن گیر نہ ہوتا تو ہم یہاں مختلف شعراء کرام کا کچھ کلام بطور نمونہ پیش کرتے۔

حوضِ کوثر سے بعض اصحاب کے دُور ہٹائے جانے کا بیان

مُصنّف علام نے اس مبحث کے آخر میں جو روایت نقل فرمائی ہے کہ بروزِ قیامت جناب شفیع امم علیہ وعلیٰ آلہ افضل السلام اپنے بعض صحابہ کو حوضِ کوثر سے دور ہٹائیں گے۔ اس قسم کی روایتیں کتب اہلِ سُنّت بالخصوص صحاح ستہ میں بھی بکثرت موجود ہیں۔ چنانچہ صحیح مُسلم میں جلد ۲ صفحہ ۲۴۹ مطبوعہ دہلی، نیز بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۰۴۵ مطبوعہ مُجتبائی دہلی کتاب الفتن میں بروایت ابی حازم مروی ہے، وہ سہل بن سعد سے روایت کرتے ہیں، ان کا بیان ہے: سمعت النبی یقول انا فرطکم علی الحوض من ورده شرب منه و من شرب منه لم یظما ابداً و لیردن علی اقوام اعرفهم و یعرفونی ثم یحال بینی و بینهم...... اللهم منی یقال انك لا تدری ما بدلوا (احدثوا) بعدك فاقول سحقا سحقا لمن بدل بعدی۔

یعنی میں نے جناب رسولِ خدا ﷺ کو فرماتے ہوئے سناوہ فرمارہے تھے: میں تم سے پہلے حوضِ کوثر پر موجود ہوں گا۔ جو شخص وہاں پہنچے گا وہ اس سے پیے گا، اور جو پیے گا پھر وہ ہرگز پیاسا نہ ہوگا۔ اس اثنا میں حوض پر کچھ لوگ وارد ہوں گے جنھیں میں پہچانتا ہوں گا، اور وہ مجھے پہچانتے ہوں گے، پھر یکایک ان کے اور میرے درمیان پردہ حائل ہوجائے گا (الی ان قال) اس وقت میں کہوں گا کہ یہ تو میری جماعت سے تھے؟ جواب میں کہا جائے گا کہ تمھیں پتا نہیں کہ انھوں نے تمھارے بعد کیا کیا عمل کیے؟ تب میں کہوں گا: دوری اور ہلاکت ہو اس شخص کے لیے جس نے میرے بعد میرے دین میں تغیّر و تبدل کیا۔

اس مضمون کی بخاری و مُسلم میں کئی روایتیں موجود ہیں۔ بعض میں یہ الفاظ موجود ہیں: جب انھیں دور ہٹایا جائے گا تو میں کہوں گا: یا رب اصحابی اصحابی۔ یا اللہ یہ تو میرے اصحاب ہیں۔ فیقال لا تدری ما احدثوا بعدك۔ (بخاری جلد ۲ صفحہ ۹۷۴ مطبوعہ دہلی) کیا تمھیں علم نہیں کہ انھوں نے تمھارے بعد کیا کیا احداث و بدعات پھیلائے۔

اسی طرح مُسلم مع شرح نووی جلد ۲ صفحہ ۲۴۹، بخاری جلد ۲ صفحہ ۹۷۵ پر آنحضرت ﷺ نے اس واقعہ کا نقشہ بایں الفاظ کھینچا ہے: انی علی الحوض حتی انظر من یرد علی منکم و سیؤخذ اناس من دونی فاقول یا رب منی و من امتی فیقال اما شعرت ما علموا بعدك و الله ما برحوا بعد یرجعون علی اعقابهم۔ یعنی میں حوض کوثر پر موجود ہوں گا تاکہ دیکھوں کہ تم میں سے کون لوگ میرے پاس پہنچتے ہیں، اس اثناء میں میرے سامنے سے کچھ لوگوں کو پکڑ لیا جائے گا۔ میں کہوں گا: یا اللہ! یہ میرے آدمی

ہیں ۔ جواب میں جائے گا: کیا تمھیں معلوم نہیں کہ انھوں نے تمھارے بعد کیا کیا عمل کیے؟ بخدا آپ کے بعد یہ اپنے پچھلے پاؤں پلٹ گئے تھے ۔

بخاری کے اسی صفحہ پر ایک حدیث کا تتمہ ان الفاظ کے ساتھ مذکور ہے: "ارتدوا بعدك على ادبارهم القهقرىٰ" کہ لوگ تمھارے بعد بالکل مرتد ہو گئے تھے ۔

نووی نے شرح مُسلم جلد۲ صفحہ ۲۴۹ طبع دہلی میں کہا ہے :قال القاضی عیاض احادیث الحوض صحیحة و الایمان به فرض و التصدیق به من الایمان و هو علی ظاهره عند اهل السنة و الجماعت بلا تاویل و لا یختلف فیه و قال القاضی حدیثه متواتر النقل رواه خلائق من الصحابة ۔ خلاصہ یہ کہ احادیث حوض صحیح اور متواتر ہیں ۔ انھیں بہت سے صحابہ نے نقل کیا ہے ۔ لہٰذا ان پر بلا تاویل ایمان لانا فرض ہے ۔

لمحۂ فکریہ: ان احادیث سے برادرانِ اسلامی کے بہت سے مزعومہ مُسلمات کے قصر مسمار ہو کر رہ جاتے ہیں اور کئی ایک جعلی احادیث سے دجل وفریب اور وضع وجعل کے پردے چاک ہو جاتے ہیں ۔ جیسے :اصحابی کالنجوم بایهم اقتدیتم اهتدیتم ۔ اور الصحابة کلهم عدول وغیرہ وغیرہ ۔ کیونکہ بنص رسولؐ جب کئی صحابہ یقیناً جہنّمی ہیں تو پھر یہ عمومی نظر یہ کہ سب صحابہ عادل ہیں اور سب کی اتباع موجب دخولِ جنّت اور باعث رشد و ہدایت ہے ۔ کسی طرح بھی درست اور قابلِ قبول نہیں ہو سکتا ۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ جو خود جہنّمی اور راہ گم کردہ ہو، وہ دوسروں کو کس طرح راہِ راست کی ہدایت کر کے جنّت میں پہنچا سکتا ہے؟ ع

آں خویشتن گم است کرا رہبری کند

ان اصحابؓ کی مزید نشاندہی

اگر چہ ان احادیث میں ان جہنمیوں کی نشاندہی کر دی گئی ہے کہ یہ وہی اصحاب ہوں گے جنھوں نے آنحضرتؐ کے بعد دین اسلام میں اپنی رائے وقیاس سے تغیّر و تبدل کیے ہوں گے ۔ لہٰذا طالبانِ تحقیق حق آئینہ سیر و تواریخ میں بآسانی دیکھ سکتے ہیں کہ صحابۂ رسولؐ میں سے ایسے لوگ کون تھے جنھوں نے اپنے اجتہادات سے دین میں بدعات واحداث پھیلائے؟ اس سلسلہ میں "تاریخ الخلفاء" سیوطی کے باب اولیاتِ فلاں وفلاں اور الفاروق شبلی وغیرہ کتب سے کافی مدد مل سکتی ہے ۔ تاہم مزید وضاحت کے لیے ہم ایک دو روایتیں بھی ان کی تشخیص کے لیے پیش کیے دیتے ہیں ۔ جن سے معلوم

ہوگا کہ یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے رسولؐ کے بعد ثقلین یعنی قرآن وعترت کے ساتھ برا سلوک کیا تھا اور ان کی حرمت وعزت کا کچھ بھی پاس ولحاظ نہیں کیا تھا۔ چنانچہ "حق الیقین" علامہ شبر میں بروایت حضرت ابوذر غفاری رضوان اللہ علیہ ایک طویل حدیث مذکور ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حوضِ کوثر پر مختلف لوگ وارد ہوں گے اور آپ ان سے برابر یہی سوال کریں گے کہ تم نے میرے بعد ثقلین کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ مختلف حضرات جو مختلف جواب دیں گے وہ یہ ہوں گے: " کذبنا الاکبر و مزقناہ و اضطھدنا الاصغر و ابتززناہ فقل کذبنا الاکبر ومزقناہ و قلنا الاصغر و قتلناہ...... کذبنا الاکبر و عصیناہ و خذلنا الاصغر و خذلناہ "۔ ہم نے ثقل اکبر کو جھٹلایا، اور اس کے ٹکڑے کیے، اور اس کی نافرمانی کی اور ثقل اصغر کو کمزور کیا۔ اس کے حق کو غصب کیا۔ اس سے جنگ کی اور اسے قتل کیا۔ حکم رسولؐ ہوگا: ان سب گروہوں کو جہنم میں جھونک دو۔

پھر شیعیانِ علیؑ کا ورود ہوگا۔ ان سے بھی سوال کیا جائے گا، وہ جواب میں عرض کریں گے: "اتبعنا الاکبر و صدقناہ و وازونا الاصغر و نصرناہ و قتلنا معہ "۔ ہم نے ثقل اکبر کی اتباع اور اس کی تصدیق کی اور ثقل اصغر کی نصرت واعانت کی اور اس کی حمایت میں جنگ کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا...... ارشاد ہوگا: سیر ہوکر کوثر پیو۔ اس وقت ان کے امام (علی علیہ السلام) کا نورِ شمس طالعہ کی طرح لامع وساطع ہوگا اور ان مومنین کے چہرے بدرِ مُنیر کی طرح روشن و درخشاں ہوں گے۔

کنز العمال جلد ۶ صفحہ ۴۶ باب الفتن حدیث نمبر ۸۲۱ میں مذکور ہے کہ: قیامت کے دن قرآن وعترت بارگاہِ ایزدی میں امت کی بدسلوکی کا بایں الفاظ شکوہ کریں گے۔ قرآن کہے گا: یا رب حرقونی و مزقونی۔ یا اللہ لوگوں نے مجھے جلایا تھا اور میرے ٹکڑے ٹکڑے کیے تھے۔ عترتِ رسول یوں فریاد کرے گی: یا رب طردونا و قتلونا و شردونا۔ یا اللہ ان لوگوں نے ہمیں جلا وطن کیا، ہمیں قتل کیا اور ہمیں مُتفرّق کیا۔ (رواہ احمد فی المسند و الطبرانی فی الکبیر) و یقول الرسول یا رب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجوراً۔ بارِ الٰہا! ان لوگوں نے قرآن کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ (سورۃ فرقان: ۳۰)

طالبانِ تحقیق کے لیے ان لوگوں کا معلوم کرنا کچھ مُشکل نہیں جنھوں نے قرآن وعترت کے ساتھ یہ سلوک کیا اور نہ یہ معلوم کرنا مُشکل ہے کہ وہ کس مذہب سے تعلّق رکھتے تھے یا کس مذہب کے پیشوا تھے۔

و سیعلموا الذین ظلموا ایّ منقلب ینقلبون

باب الاعتقاد	اکیسواں بابؒ
فی الشفاعة	شفاعت کے بارے میں اِعتقاد
قال الشیخ ابوجعفر اعتقادنا فی الشفاعة انه لمن ارتضیٰ	جناب شیخ ابوجعفر علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ شفاعت کے متعلق ہمارا اِعتقاد یہ ہے کہ (وہ برحق ہے) اور ہوگی صرف ان لوگوں کی جن کے

اکیسواں بابؒ

شفاعت کا بیان

سلسلہ شفاعت میں چند امور قابلِ غور ہیں

اول: اثباتِ شفاعت۔ **دوم:** کون حضرات شفاعت کریں گے۔ **سوم:** کن لوگوں کی شفاعت کی جائے گی۔ **چہارم:** شفاعت پر بعض عائد کردہ شبہات کے جوابات۔

شفاعت کا شرعی مفہوم اور اس کا اثباتؒ

شفاعت کا غلط یا صحیح تصور وتخیل ہر زمانہ میں، ہر مذہب و دین میں رہا ہے، اور ہے۔ اس وقت اس امر کی تفصیل بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ اسلام نے شفاعت کا جو تصور پیش کیا ہے وہ ان تصورات سے جداگانہ ہے۔ اس سے خدا کا مجبور ومقہور ہونا لازم نہیں آتا۔ اسلام نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ کچھ ذواتِ مقدسہ ایسے ہیں جو بروزِ قیامت بارگاہِ ایزدی میں صحیح العقیدہ گنہگاروں کی شفاعت وسفارش کرکے ان کو عذابِ خداوندی سے نجات دلائیں گے۔ مگر یہ شفاعت خداوند عالم کے اذن سے ہوگی۔ جیسا کہ ارشاد قدرت ہے: "من ذالذی یشفع عندہ الا باذنہ" (بقرہ: ۲۵۵) کون ہے جو خدا کے اذن کے بغیر سفارش کرے؟ ایک اور مقام پر ارشاد ہے: "و لا یشفعون الا لمن ارتضیٰ" (الانبیاء: ۲۸) یہ بزرگوار اس شخص کی شفاعت کریں گے جس کے متعلق خدا چاہے گا۔ اسی بنا پر ہمارے علماء اعلام نے اس حقیقت کی تصریحات فرمائی ہیں کہ شفاعت اذنِ خدا سے ہوگی۔ چنانچہ محقق شیخ بہاء الدین عاملی اپنے رسالہ "اعتقادات الامامیہ" میں فرماتے ہیں: "شفاعة اصحاب الکبائر باذن اللہ تعالیٰ" ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ گناہانِ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والوں کی شفاعت باذن اللہ ہوگی۔ جہاں تک شفاعت کے اثبات کا تعلق ہے، یہ مسئلہ تمام مکاتیب فکر کے ساتھ تعلق رکھنے والے

دینہ من اھل الکبائر و الصغائر فاما التائبون من الذنوب فغیر محتاجین الی الشفاعۃ قال النبیؐ

دین ومذہب کو خداوند عالم پسند فرمائے گا اور انھوں نے صغیرہ وکبیرہ گناہ کیے ہوں گے باقی رہے وہ لوگ جنھوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کر لی ہوگی تو وہ محتاجِ شفاعت نہیں ہوں گے جناب رسولِ خداؐ

مُسلمانوں کے درمیان مُتفق علیہ ہے۔ کسی فرقہ نے اس میں اختلاف نہیں کیا۔ آیاتِ قرآنیہ اور احادیث متواترہ اس کے ثبوت پر دلالت کرتی ہیں، بلکہ یہ عقیدہ ضروریاتِ مذہب اہل بیتؑ بلکہ ضروریات دین اسلام میں سے ہے اور اس کی اہمیت کا اندازہ جناب رسولِ خداؐ کے اس ارشاد سے بخوبی ہوسکتا ہے جو کتاب عیون اخبار الرضاؑ میں جناب امام رضا علیہ السلام سے بسلسلۂ سند ان کے آباء و اجداد سے منقول ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: "من لم یؤمن بشفاعتی فلا انا لہ اللہ شفاعتی" جو شخص میری شفاعت پر ایمان نہیں رکھتا خدا اسے میری شفاعت نصیب نہ کرے۔ اسی طرح امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: "من انکر ثلاثۃ اشیاء فلیس من شیعتنا المعراج و المسائلۃ فی القبر و الشفاعۃ"۔ جو شخص تین چیزوں کا انکار کرے وہ ہمارے شیعوں میں سے نہیں ہے۔ معراج، قبر میں سوال وجواب اور شفاعت (حق الیقین کتاب خصال وغیرہ) لہٰذا اصل شفاعت میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے، بلکہ اس پر ایمان رکھنا واجب و لازم ہے۔ قال العلامۃ المجلسیؒ و یجب ان تومن بشفاعۃ النبیؐ و الائمۃ (رسالہ اعتقادیہ) جناب رسولِ خداؐ اور ائمۂ ہدیٰؑ کی شفاعت پر ایمان رکھنا واجب ہے۔

ہاں اگر اس سلسلہ میں کچھ اختلاف ہے تو وہ اس کی شرعی حقیقت میں ہے کہ آیا شفاعت نیکو کاروں کی زیادتیٔ درجات اور گنہ گاروں کے عفو سیئات ہر دو میں ہوگی؟ یا فقط زیادتی درجات کے متعلّق ہوگی؟ چنانچہ بعض "وہابیہ" اور "مُعتزلہ" میں سے فرقہ "وعیدیہ" اور "خوارج" کا یہ خیال ہے کہ شفاعت فقط زیادتیٔ درجات کے متعلّق ہوگی۔ لیکن باقی جمہور مُسلمین کا اس پر اتفاق ہے کہ شفاعت رفع درجات اور عفو سیئات ہر دو کے متعلّق ہوگی اور یہی حق ہے۔ چنانچہ جناب مُحقق طوسی علیہ الرحمہ "تجرید" میں فرماتے ہیں: "و الحق صدق الشفاعۃ فیھما" یعنی حق یہ ہے کہ شفاعت دونوں معنوں (زیادتیٔ ثواب اور اسقاطِ عذاب) کے اعتبار سے برحق ہے اور ان دونوں پر شفاعت کا اطلاق صحیح ہے۔

طریقہ: جو حضرات شفاعت کو صرف بلندیٔ درجات کی سفارش کے معنی میں مراد لیتے ہیں ان کے شبہات کے جوابات تو اس بحث کے آخر میں ذکر کیے جائیں گے، یہاں صرف اس قدر بیان کر دینا

من لم یومن بشفاعتی فلا اناله الله شفاعتی و قال لا شفیع انجح من التوبۃ و الشفاعۃ

ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص میری شفاعت پر ایمان نہیں رکھتا خدا اسے میری شفاعت نصیب نہ کرے۔ نیز فرمایا: حاجت براری اور کامیابی کے لیے توبہ سے بڑھ کر کوئی شفیع نہیں ہے

کافی ہے کہ اگر فقط رفع درجات کی سفارش کو ہی شفاعت قرار دیا جائے تو اس سے مطلب برعکس ہوجائے گا۔ یعنی بجائے اس کے کہ جناب رسولِ خدا ﷺ ہمارے شفیع قرار پائیں الٹا ہم ان کے شفیع بن جائیں گے۔ کیونکہ ہم ہمیشہ ان کے درجات کی بلندی اور ان پر رحماتِ الٰہیہ کے نزول کی دعائیں کرتے رہتے ہیں جن کا ہمیں حکم بھی دیا گیا ہے۔ "یٰٓاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَیۡہِ وَسَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا" (سورۃ الاحزاب:۵٦) حالانکہ یہ امر بالبداہت غلط ہے، لہٰذا ماننا پڑے گا کہ شفاعت کا فقط بمعنی رفع درجات ہونا غلط ہے۔ وھوالمقصود۔

شفاعتِ مُطلقہ کے ثبوت پر بکثرت آیاتِ قرآنیہ و احادیثِ معصومیہ دلالت کرتی ہیں، ان کا ایک شمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ ارشادِ قدرت ہے: "من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنہ" (سورۃ البقرۃ: ۲۵۵) کون ایسا ہے جو بلا اس کی اجازت کے، اس کے پاس (کسی کی) سفارش کرے۔ وَلَا یَشۡفَعُوۡنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارۡتَضٰی (سورۃ الانبیاء:۲۸) اس شخص کے سوا جس سے خدا راضی ہو کسی کی سفارش نہیں کرتے۔

نیز ارشاد فرماتا ہے: مَا مِنۡ شَفِیۡعٍ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اِذۡنِہٖ (سورۃ یونس:۳) اس کے سامنے کوئی کسی کا سفارشی نہیں ہوسکتا مگر اس کی اجازت کے بعد۔

ان آیاتِ مبارکہ سے روزِ روشن کی طرح واضح و آشکار ہے کہ کچھ ذواتِ مقدسہ ضرور سفارش کریں گے مگر یہ سفارش خداوند عالم کے اذن کے بعد ہوگی اور یہی اہلِ حق کا عقیدہ ہے۔

اسی طرح خلاقِ عالم ارشاد فرماتا ہے: عَسٰۤی اَنۡ یَّبۡعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا ﴿۷۹﴾ (سورۃ الاسراء:۷۹) وَلَسَوۡفَ یُعۡطِیۡکَ رَبُّکَ فَتَرۡضٰی ﴿۵﴾ (سورۃ والضحیٰ : ۵) اے رسول! عنقریب تمھیں تمھارا پروردگار مقامِ محمود پر فائز فرمائے گا اور اتنا دے گا کہ تم راضی ہوجاؤ گے۔

اس آیت مبارکہ کے متعلق تقریباً تمام مُفسّرینِ عامہ و خاصہ کا اِتفاق ہے کہ یہ آں حضرت ﷺ کی شفاعت کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اور یہ کہ "مقامِ محمود" سے "مقامِ شفاعتِ کبریٰ" مراد ہے۔

للانبیاء و الاوصیاء و فی المومنین من یشفع مثل ربیعۃ و مضر و اقل المومنین من یشفع لثلثین الفا

شفاعت انبیاء علیہم السلام اور ان کے اوصیاء کریں گے اور خالص اہل ایمان میں سے کچھ ایسے مومن بھی ہوں گے جو ربیعہ و مضر ایسے (کثیر التعداد) قبیلوں کی تعداد کے برابر گنہگاروں کی شفاعت کریں گے۔ کم سے کم شفاعت

مقامِ محمود کی توضیح

تفسیر فرات بن ابراہیم کوفی میں حضرت صادق علیہ السلام کے سلسلہ سند سے جناب رسالت مآب ﷺ سے ایک طویل حدیث مروی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آنجنابؐ نے فرمایا: چونکہ خلاقِ عالم نے مجھ سے مقامِ محمود کا وعدہ فرمایا ہے وہ اسے ضرور پورا کرے گا۔ چنانچہ قیامت کے دن جب وہ تمام لوگوں کو جمع کرے گا تو میرے لیے ایک منبر نصب کیا جائے گا، جس کے ایک ہزار درجے ہوں گے۔ میں اس کے آخری درجہ پر چڑھ جاؤں گا۔ اس وقت جبرئیلؑ میرے پاس آکر لواء الحمد میرے ہاتھ میں دے گا اور کہے گا: یا محمدؐ! یہ وہ مقامِ محمود ہے جس کا پروردگارِ عالم نے آپؐ سے وعدہ کیا تھا۔ اس وقت میں جناب علیؑ سے کہوں گا: یا علیؑ! تم اوپر چڑھو۔ چنانچہ وہ منبر پر چڑھیں گے اور مجھ سے ایک درجہ نیچے بیٹھ جائیں گے۔ تب میں لواء الحمد ان کے ہاتھ میں دے دوں گا۔ پھر میرے پاس "رضوانِ جنت" جنت کی کنجیاں لے کر آئے گا، اور میرے حوالے کر کے کہے گا: یا محمدؐ! یہ وہ مقامِ محمود ہے جس کا پروردگار نے تم سے وعدہ کیا ہے۔ میں یہ کنجیاں لے کر علیؑ کے حوالے کر دوں گا۔ اسی طرح "مالک" (داروغہ جہنم) جہنم کی کنجیاں میرے سامنے پیش کرے گا۔ میں یہ کنجیاں بھی علیؑ کے حوالے کر دوں گا۔ پس اس وقت جنت و جہنم میری و علیؑ کی اس سے زیادہ اطاعت گزار ہوں گی جتنی کوئی فرمانبردار دلہن اپنے شوہر کی اطاعت کرتی ہے اور یہ ہے مطلب ارشادِ ایزدی "القیا فی جھنم کل کفار عنید" (سورۃ ق: ۲۴) کا۔ یعنی (اے محمدؐ و علیؑ) تم دونوں ہر کافر و سرکش کو جہنم میں جھونک دو۔ اس وقت میں اٹھ کر خداوند عالم کی تعریف و توصیف بیان کروں گا۔

اسی طرح تفسیر قمی میں جناب سماعہ سے روایت ہے کہ کسی نے حضرت صادق آلِ محمد علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ قیامت کے دن جناب پیغمبر اسلامؐ کی شفاعت کس طرح ہوگی؟ آپؑ نے فرمایا کہ جب لوگ پسینہ کی کثرت سے نہایت مضطرب و پریشان ہو جائیں گے تو تنگ ہو کر جناب آدم علیہ السلام کی خدمت میں بغرض شفاعت حاضر ہوں گے، وہ اپنے ترک اولیٰ کا عذر پیش کر کے

و الشفاعة لا یکون لاھل الشك و الشرك و لا لاھل الکفر و الجحود بل یکون للمذنبین من اھل التوحید۔	کرنے والا مومن بھی تیس ہزار انسانوں کی شفاعت کرے گا۔ دین میں شک اور شرک و کفر اور انکار کرنے والوں کی شفاعت نہیں ہوگی، بلکہ صرف گنہگار اہل توحید کی ہوگی۔

معذرت طلب کریں گے۔ پھر ان کی ہدایت کے مطابق جناب نوح علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ وہ بھی اپنے ترکِ اَولیٰ کی وجہ سے معذرت خواہی کریں گے۔ اسی طرح ہر سابق نبی ان کو اپنے بعد والے نبی کی خدمت میں بھیجے گا۔ حتی کہ جناب عیسیٰؑ کی خدمت میں پہنچیں گے۔ وہ ان کو سرکارِ ختمی مرتبت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کا مشورہ دیں گے۔ چنانچہ جو لوگ ان کی خدمت میں سفارش کی درخواست پیش کریں گے تو آنجنابؐ ان کے ہمراہ جنّت کے دروازۂ باب الرحمٰن تک تشریف لائیں گے اور وہاں بارگاہِ رب العزت میں سجدہ ریز ہوجائیں گے۔ اس وقت ارشاد رب العزت ہوگا: ارفع راسك واشفع تشفع واسئل تعطی۔ اے حبیبؐ! سر اٹھاؤ اور شفاعت کرو۔ تمھاری شفاعت مقبول ہے اور جو کچھ مانگنا ہے مانگو۔ تمھیں عطا کیا جائے گا۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: یہ مطلب ہے قولِ خداوندی: "عسی ان یبعثك ربك مقاما محمودا" کا (کذا فی الشفا للقاضی عیاض جلد ۱ صفحہ ۱۲۴، ۱۲۶ طبع مصر)

کون حضرات شفاعت کریں گے؟

سابقہ بیان حقیقت ترجمان سے جناب رسولِ خدا ﷺ کا شفیع امت بلکہ شفیع امم ہونا تو واضح و عیاں ہو چکا، لہٰذا اس منصب جلیل کے سب سے پہلے اور بڑے حق دار اور مُختار تو آنحضرت ﷺ ہی ہیں، ان کے بعد حضرات ائمہ طاہرین علیہم السلام اور ان کے بعد شہداء و علماء دین اور خالص مومنین کرام کا مرتبہ ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بھی متعدد آیات و روایات موجود ہیں۔ ارشادِ رب العباد ہے:

لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِندَ الرَّحْمَٰنِ عَهْدًا ﴿۸۷﴾ (سورۃ مریم: ۸۷)

ان کو شفاعت کو کوئی اختیار نہ ہوگا سوائے اس شخص کے جس کا کوئی عہد خدا کے رحمٰن کے پاس ہو۔

اس آیتِ مبارکہ کی تفسیر میں وارد ہوا ہے کہ اس سے مراد سرکار محمدؐ و آلِ محمد علیہم السلام ہیں۔ (ملاحظہ ہو: تفسیر صافی و برہان وغیرہ)

ثالث بحار الانوار، کنز الفوائد کراجکی، اور مرآۃ الانوار و مشکوۃ الاسرار (جو کہ مقدمہ تفسیر برہان

کے نام سے مشہور ہے) وغیرہ کتب میں اس مضمون کی بکثرت روایات حضرات ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے مروی ہیں کہ :اذا کان یوم القیامة و جمع اللہ الاولین و الاخرین و لانا حساب شیعتنا فما کان بینہم و بین اللہ سئلنا اللہ ان یھب لنا فھو لھم و ما کان للادمیین سلنا اللہ ان یعوّ منھم بدلہ فھو لھم و ما کان لنا فھو لھم ۔ یعنی جب قیامت کا دن ہوگا اور خداوند عالم تمام اولین و آخرین کو جمع فرمائے گا تو وہ ہمارے شیعوں کے حساب وکتاب کا ہمیں متولی بنائے گا۔ پس ہمارے شیعوں کے جو گناہ حقوق اللہ کے متعلق ہوں گے ان کے متعلق ہم خداوند کریم سے سوال کریں گے کہ ہمارے لیے وہ ان کو معاف فرمادے اور جو گناہ حقوق الناس کے متعلّق ہوں گے، ان کے بارے میں ہم بارگاہِ رب رحیم میں عرض کریں گے کہ لوگوں کو ان کا عوض عطا فرمائے اور جو گناہ ہمارے حقوق میں کوتاہی کے متعلّق ہوں گے ہم خود انھیں معاف کردیں گے۔ یہ مطلب ہے آیت مبارکہ "اِنَّ اِلَیۡنَاۤ اِیَابَہُمۡ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَیۡنَا حِسَابَہُمۡ ﴿۲۶﴾" (سورۃ الغاشیۃ:۲۵ و ۲۶) کا۔ یعنی ہماری ہی طرف ان کی بازگشت ہے۔ اور ہم پر ہی ان کا حساب ہے۔ (ایسی احادیث کی مزید وضاحت اس بحث کے آخر میں کی جائے گی) تفسیر قمی وغیرہ میں جناب امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے مروی ہے، فرمایا:

واللہ لنشفعن فی المذنبین من شیعتنا حتی تقول اعدائنا اذا راوا ذلك فما لنا من شافعین ولا صدیق حمیم فلوان لنا کرۃ فنکون من مومنین (الشعراء:۱۰۰ تا ۱۰۳)

بخدا ہم اپنے گنہگار شیعوں کی اس قدر شفاعت کریں گے کہ ہمارے دشمن جب اس حالت کا مشاہدہ کریں گے تو کہہ اٹھیں گے ہائے ہمارا آج کوئی شفیع اور خیر خواہ دوست نہیں ہے۔ اے کاش اگر ہمیں ایک بار دنیا میں بھیج دیا جائے تو ہم بھی مومن بن جائیں۔

کتاب خصال شیخ صدوقؒ میں جناب رسولِ خداﷺ سے منقول ہے، فرمایا: "ثلاثة یشفعون الی اللہ عزوجل فیشفعون الانبیاء ثم العلماء ثم الشھداء"۔ تین گروہ بارگاہِ الٰہی میں شفاعت کریں گے اور ان کی شفاعت قبول ہوگی۔ انبیاء علماء اور شہداء۔

کتاب علل الشرائع میں جناب صادق آلِ محمد علیہ السلام سے مروی ہے: "اذا کان یوم القیامة یؤتی بعالم و عابد فاذا قیما عند اللہ یقال للعابد امض الی الجنة و یقال للعالم اقم و اشفع للناس الذین ادبتھم بادبك الحسن"۔ کہ بروز محشر جب عابد و عالم بارگاہِ ایزدی میں حاضر کیے جائیں گے تو عابد کو حکم ہوگا کہ تم جنّت میں داخل ہوجاؤ اور عالم کو ارشاد ہوگا تم ان لوگوں کی شفاعت کرو جن کی اپنے علم و ادب سے تربیت کی تھی۔

اسی طرح خالص مومنین کی شفاعت کے متعلق بھی بعض روایتیں متن رسالہ میں درج ہیں۔

مزید برآں ثالث بحارالانوار میں جناب رسولِ خداﷺ سے مروی ہے، فرمایا: لا تستخفوا شیعة علی علیه السلام فان الرجل منهم لیشفع بعدد ربیعه و مضر۔ شیعیانِ علی کو حقیر نہ سمجھو کیونکہ ان میں سے ایک ایک شخص قبیلہ ربیعہ و مضر کی تعداد کے برابر گنہگاروں کی شفاعت کرے گا۔ اسی طرح ملائکہ کرام کا شفاعت کرنا بھی قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ ارشادِ قدرت ہے۔

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَرْضٰى ﴿۲۶﴾ (سورۃ النجم:۲۶)

ایضاح:

متن رسالہ میں جو مذکور ہے کہ کم از کم شفاعت کرنے والا مومن تیس ہزار لوگوں کی شفاعت کرے گا۔ محل تامل ہے۔ جہاں تک اس سلسلہ میں روایات نظر قاصر سے گزری ہیں ان میں صرف "ثلاثین" کا لفظ مذکور ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ سب اہلِ ایمان سے کم شفاعت کرنے والا بھی تیس آدمیوں کی شفاعت کرے گا۔ "ثلثین" کے ساتھ "الف" (ہزار) کی لفظ نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

ان حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ امتِ اسلامیہ میں شفاعت کرنے والے جناب رسولِ خداؐ اور ائمہ ہدیٰؑ اور ان کے خالص اتباع یعنی شیعیانِ علی مرتضیٰؑ بالخصوص علماء و شہداء ہیں۔ چنانچہ علامہ طبرسی علیہ الرحمہ تفسیر مجمع البیان میں فرماتے ہیں:

وهی (الشفاعة) ثابتة عندنا للنبیؐ و لاصحابه المنتجبین و الائمة من اهل بیته الطاهرینؑ و لصالح المومنین و ینجی الله تعالیٰ بشفاعتهم کثیرا من الخاطئین

یعنی ہمارے نزدیک شفاعت جناب رسولِ خداﷺ، ان کے اصحابِ باوفا اور ائمہ ہدیٰؑ اور مومنین باصفا کے لیے ثابت ہے اور خداوند عالم ان کی وجہ سے بہت سے گنہگاروں کو آتش جہنم سے نجات عطا فرمائے گا۔

مولانا السید عبداللہ شبر "حق الیقین" میں فرماتے ہیں: و لا یشفع الا من اذن الله فی الشفاعة و هم الانبیاء و الاوصیاء و الشهداء و العلماء و المومنون۔ سوائے ان بزرگواروں کے جن کو خدا اذن عطا فرمائے گا اور کوئی شفاعت نہیں کرے گا اور (اذن یافتہ) یہ ہیں: انبیاء، اوصیاء، شہداء، علماء، اور مومنین۔ رزقنا الله شفاعتهم فی الدنیا و الاخرة۔

کن لوگوں کی شفاعت ہوگی اور کن کی نہ ہوگی

جو امر قرآن کی آیات وائمۂ اہل بیت علیہم السلام کی روایات اور محققین علماء اعلام کی تحقیقات سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ شفاعت فقط ان لوگوں کی ہوگی جن کے عقائد تو بالکل صحیح ہوں گے لیکن عملی طور پر ان میں کچھ کمزوریاں ہوں گی، لیکن یہ کمزوریاں اور غلطیاں جہالت یا سہو ونسیان یا کسی وقت نفس امارہ یا شیطان رجیم کے غلبہ وتسلط کی وجہ سے سرزد ہوئی ہوں گی۔ لہٰذا غلط عقائد والے اور علماً و عمداً شریعت اسلامیہ کا استہزاء وتمسخر اڑانے والے اور مخالفتِ احکام کرنے والے لوگ اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم رہیں گے۔ باقی وہ لوگ جو صحیح العقیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ صالح الاعمال بھی ہوں گے یا جو اپنے اعمالِ ناشائستہ سے تائب ہوکر مریں گے تو وہ شفاعت کے محتاج نہیں ہوں گے۔ (الا لرفع الدرجات وھم شیء اخر) ان امور کا ثبوت ذیل میں بالاختصار پیش کیا جاتا ہے۔

پہلے امر کے متعلق ارشاد رب العزت ہے: "ولا یشفعون الا لمن ارتضیٰ" (انبیاء:۲۸) شفاعت کرنے والے شفاعت نہیں کریں گے مگر اسی کی جسے خداوند عالم پسند کرے گا۔ اس کی تفسیر ائمہ اہل بیتؑ نے یہ فرمائی ہے کہ جس کے دین کو خدا پسند کرے گا۔ (تفسیر برہان، صافی، قمی وغیرہ)

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے: "یومئذ لا تنفع الشفاعة الا من اذن له الرحمن و رضی له قولا" (سورة طٰہٰ:۱۰۹) اس (قیامت والے) دن شفاعت فائدہ نہیں دے گی مگر اسی کو جس کے لیے خدا اذن دے گا اور اس کے لیے گفتگو کو پسند فرمائے گا۔

پس معلوم ہوا کہ شفاعت اسی کی ہوگی جس کا مذہب پسندیدۂ خدا ہوگا۔ یعنی اس کے عقائد صحیح و درست ہوں گے۔ لہٰذا کفار ومشرکین اور خوارج ونصاب اور دیگر معاندین دین کی شفاعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ ان کا مذہب ہی ناپسندیدہ ہے۔ اور دوسرے امر کے بارے میں وہ ارشاد نبوی کافی ہے جو کہ کتاب بحار الانوار، خصال اور امالی شیخ صدوق وغیرہ کتب میں مذکور ہے، فرمایا: "ان شفاعتی لاهل الکبائر من امتی فاما المحسنون فما علیهم من سبیل"۔ میری شفاعت میری امت کے ان لوگوں کے لیے ہے جو گناہانِ کبیرہ کے مرتکب ہوں گے اور جو نیکوکار ہیں، وہ بے نیاز ہیں۔ اگرچہ لفظ "امتی" میں بڑی وسعت ہے لیکن بموجب "الاحادیث یفسر بعضها بعضاً" جب سابقہ امر کو ملحوظ رکھا جائے کہ شفاعت فقط انہی کی ہوگی جن کا مذہب پسندیدہ ہوگا تو مطلب واضح ہوجاتا ہے کہ گنہگار مومنین کی شفاعت ہوگی۔ و ھوالمقصود۔

اسی طرح کتاب فضائل الشیعہ شیخ صدوق علیہ الرحمہ میں حضرت صادق علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: "اذا کان یوم القیامة نشفع فی المذنب من شیعتنا فاما المحسنون فقد نجاهم الله"۔ یعنی جب قیامت کا روز ہوگا تو ہم اپنے گنہگار شیعوں کی شفاعت کریں گے اور جو نیک ہوں گے انھیں تو خدا نے نجات دے ہی دی ہے۔

بشارۃ المصطفیٰ میں جناب رسولِ خدا ﷺ سے مروی ہے، فرمایا: اربعة انالهم شفيع يوم القيامة المكرم لذريتى ۔ القاضى لهم حوائجهم والساعى فى امورهم والمحب لهم بقلبه ولسانه ۔ میں چار شخصوں کی بروز قیامت ضرور شفاعت کروں گا۔ ایک وہ شخص جو میری ذریت کی عزت و توقیر کرے، دوسرا وہ جو میری ذریت کی حاجات پوری کرے، تیسرا وہ جو ان کی مطلب براری میں جد و جہد کرے چوتھا وہ جو دل و زبان سے ان کے ساتھ محبت کرے۔ (یہ حدیث صواعق محرقہ ابن حجر مکی صفحہ ۲۳۷ طبع جدید میں بھی مذکور ہے)

مخفی نہ رہے کہ علمائے اعلام نے ایسی عمومی احادیث کا مصداق تمام سادات کرام کو قرار دیا ہے۔ صرف ائمہ اہلِ بیتؑ کے ساتھ مختص نہیں کیا۔ لہٰذا جو مومنین کرام عام مستحق تکریم سادات عظام کے ساتھ یہ حُسنِ سلوک کریں گے وہ ضرور شفاعت نبویہ کے مستحق قرار پائیں گے۔ نیز بموجب "وبضدها تتبين الاشياء" ان احادیث سے یہ بھی مُستفاد ہوتا ہے کہ جو لوگ ذریت رسولؐ کو تکلیف و اذیت پہنچائیں گے آں حضرتؐ ان کی ہرگز شفاعت نہیں فرمائیں گے۔ چنانچہ ثالث بحارالانوار میں جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے بسلسلہ سند ان کے آباء و اجداد طاہرینؑ کے جناب رسالت مآب ﷺ کی یہ حدیث مروی ہے، فرمایا: "اذا قمت المقام تشفعت فى اهل الكبائر من امتى فيشفعنى الله فيهم والله لا تشفعت فيمن اذى ذريتى"۔ یعنی جب میں مقام محمود میں کھڑا ہوں گا تو امت کے اہل کبائر کے لیے شفاعت کروں گا۔ اور خدا میری شفاعت کو قبول بھی فرمائے گا، مگر خدا کی قسم میں اس شخص کی ہرگز شفاعت نہیں کروں گا جس نے میری ذریت کو اذیت پہنچائی ہوگی۔ ولنعم ما قیل: ؎

اترجم امة قتلت حسينا شفاعة جده يوم الحساب

یہ حقیقت بھی بالکل واضح ہے کہ دشمنانِ اہل بیتؑ کی ہرگز شفاعت نہیں ہوگی۔ چنانچہ حق الیقین شبر میں حضرت صادق علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: "ان المومن يشفع لحميمه الا ان يكون ناصبيا و ان ناصبيا لو شفع له كل نبى مرسل و ملك مقرب ما شفعوا"۔ یعنی مومن اپنے خالص دوستوں کی شفاعت کرے گا مگر یہ کہ وہ ناصبی ہوں اور اگر ناصبی کے لیے بالفرض تمام نبی مرسل اور

ملک مقرب مل کر بھی شفاعت کریں تو جب بھی ان کی شفاعت قبول نہ ہوگی۔

ایک ضروری وضاحت

واضح رہے کہ احادیث میں جو یہ وارد ہے جیسا کہ ابھی اوپر بیان ہو چکا ہے کہ ائمۂ اہل بیتؑ اپنے شیعوں کی شفاعت کریں گے اور وہی بزرگوار شیعوں کے حساب و کتاب کے متولی ہوں گے، اس سے فساق و فجار اور زبانی جمع خرچ کرنے والوں کو خوش نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ ان سب احادیث میں لفظ "شیعہ" وارد ہے۔ لہٰذا جو شیعہ ہوگا اسی کی شفاعت ہوگی۔ اب قابلِ غور امر یہ ہے کہ شیعہ کون اور کیسے ہوتے ہیں؟ اس سوال کا جواب بھی ائمۂ اہل بیت علیہم السلام سے معلوم کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اصول کافی وغیرہ کتبِ مُعتبرہ میں بکثرت روایاتِ مُعتبرہ شیعیانِ اہل بیتؑ کے اوصافِ حمیدہ و خصائلِ ستودہ کے بارے میں موجود ہیں۔ سب کا ذکر تو موجب طوالت ہے، اس لیے بنظر اختصار فقط دو تین حدیثیں پیش کی جاتی ہیں۔

شیخ صدوق علیہ الرحمۃ کتاب "صفات الشیعہ" میں بروایت ابن ابی بحران جناب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں، آپؑ نے فرمایا: "شیعتنا الذین یقیمون الصلوۃ و یوتون الزکوۃ و یحجون البیت الحرام و یصومون شھر رمضان و یوالون اھل البیت و یتبرؤن من اعدائھم" الخ ...... ہمارے شیعہ وہ ہیں جو نمازیں قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، حج بیت اللہ کرتے ہیں، ماہِ رمضان کے روزے رکھتے ہیں، اور ہم اہل بیتؑ سے تولی کرتے ہیں، اور ہمارے دشمنوں سے تبرا اختیار کرتے ہیں۔ (حدیث بہت طویل ہے، ہم نے بقدر ضرورت اس کا ایک مُختصر حصّہ نقل کیا ہے) پس معلوم ہوا کہ شیعیانِ اہل بیتؑ میں کم از کم واجباتِ شرعیہ کی بجا آوری اور محرماتِ شرعیہ سے اجتناب کا ملکہ صالحہ تو موجود ہونا چاہیے۔

جو لوگ اس معیار پر پورے نہیں اترتے، ائمہ طاہرینؑ نے ان سے اپنی بیزاری ظاہر فرمائی ہے۔ چنانچہ اصولِ کافی میں جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: "من کان للہ مطیعًا فھو لنا ولی و من کان للہ عاصیًا فھو منہ براء" جو لوگ اللہ کے فرمانبردار ہیں وہ ہمارے دوست ہیں۔ اور جو کھلم کھلا اللہ سبحانہ کے نافرمان ہیں ہم ان سے بیزار ہیں۔

نیز فرمایا: "لا تنال و لا یتنا الا بالورع و العمل"۔ ہماری ولایت حاصل ہو ہی نہیں سکتی مگر محرماتِ شرعیہ سے بچنے اور عمل صالح بجا لانے سے۔

نیز جناب باقر العلومؑ فرماتے ہیں: "انما شیعتنا من تابعنا و لم یخالفنا و من اذا خفنا خاف و اذا امنا امن فاولئك شیعتنا"۔ (محاسن برقی) ہمارے شیعہ بس وہی ہیں جو ہماری متابعت کرتے ہیں اور مخالفت نہیں کرتے اور جب ہم خوف زدہ ہوں تو وہ بھی خائف ہوتے ہیں اور جب ہم امن و اطمینان سے ہوں تو وہ بھی امن سے ہوتے ہیں۔ یہی ہیں ہمارے شیعہ۔

یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شخص عمداً احکامِ شرعیہ کی مخالفت پر کمر بستہ ہوجاتا ہے اور واجبات کی بجا آوری اور محرمات کے ارتکاب کی کوئی پروا نہیں کرتا ہے تو اس کا نام شیعیانِ علی علیہ السلام کی فہرست سے خارج ہوجاتا ہے۔ اس لیے وہ ان کی شفاعت کبریٰ کی سعادت سے بھی محروم ہوجاتا ہے۔ چنانچہ جناب صادق علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: "لا تنال شفاعتنا من استخف بصلوته" جو شخص نماز کو خفیف وسبک سمجھے گا اس کو ہماری شفاعت نصیب نہ ہوگی۔ ایسا ہی جناب سرور کائنات ﷺ سے مروی ہے۔ (وسائل الشیعہ وغیرہ)

لہٰذا اس مقام پر نہایت حزم واحتیاط سے کام لینا چاہیے۔ شفاعت یقیناً برحق ہے، وہ ہوگی اور ضرور ہوگی لیکن بموجب "کلمہ حق یراد بہا الباطل" اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ اب ہم آزاد اور مُطلق العنان ہیں، جو جی چاہے کرتے پھریں۔ خواہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال سمجھ لیں۔ محض اس بل بوتے پر کہ ہماری شفاعت ہوجائے گی اور ہم داخل جنّت ہوجائیں گے۔ روایات میں وارد ہے کہ بعض گناہوں کے ارتکاب سے نعمتِ ایمان ہی سلب ہوجاتی ہے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ اس معصیت کاری سے دولتِ ایمان ہی سلب ہوجائے اور (خدانخواستہ) خاتمہ بالخیر نہ ہو اور جو شفعاء ہیں وہ خصماء بن جائیں۔ بہرحال آدمی کو امید وخوف کے درمیان رہنا چاہیے۔

ائمہِ اہل بیتؑ شریعت مقدسہ کی حفاظت کرنے والے ہیں نہ کہ اس کی مخالفت کی اجازت دے کر اس کی تخریب کرنے والے (معاذ اللہ) پس ان حقائق سے معلوم ہوگیا کہ احادیث میں جو اہل کبائر کی شفاعت کا وعدہ کیا گیا ہے ان سے وہی اہل ایمان مراد ہیں جو جہالت یا سہو ونسیان یا کسی وقت بتقاضائے بشریت غلبہ شیطان کی وجہ سے گناہانِ کبیرہ کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ بہرحال اہل ایمان کی یہ صفت ہے کہ ہمیشہ بیم وامید کے درمیان رہیں۔ ارشادِ قدرت ہے: و یرجون رحمته و یخافون عذابه۔ وہ خدا کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وارزقنا حسن العاقبة بحق النبیؐ و عترته الطاهرة

توبہ بھی باعث نجات ہے

آیات و روایات سے واضح ہوتا ہے کہ جس طرح شفاعت ایک ذریعہ بخشش ہے اسی طرح توبہ بھی باعثِ نجات ہے ۔ جناب سرورِ کائنات ﷺ کا ارشاد موجود ہے: "التائب من الذنب کمن لا ذنب له" گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا کہ اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں ۔ (حق الیقین)

نیز انہی کا ارشاد ہے: "لا کبیرة مع الاستغفار و لا صغیرة مع الاصرار" توبہ کرنے سے کوئی گناہ کبیرہ کبیرہ نہیں رہتا (معاف ہوجاتا ہے) اور بار بار کرنے سے گناہِ صغیرہ صغیرہ نہیں رہتا (بلکہ کبیرہ بن جاتا ہے) خداوند عالم نے جہاں توبہ کرنے کا حکم دیا ہے : و توبوا الی الله جمیعا ایها المومنون (سورۃ النور: ۳۱) اے ایمان لانے والو! تم سب بارگاہِ ایزدی میں توبہ کرو، وہاں توبہ قبول کرنے اور گناہ معاف فرمانے کا وعدہ بھی فرمایا ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰی (سورۃ طٰہٰ: ۸۲)

میں اس آدمی کے گناہ معاف کر دیتا ہوں جو تائب ہوجائے ۔ ایمان لائے اور عمل صالح کرے اور پھر طلب ہدایت کرے ۔

نیز ارشاد فرماتا ہے:

وَهُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَ یَعْفُوْا عَنِ السَّیِّاٰتِ (سورۃ الشوریٰ: ۲۵)

خدا وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے، اوران کے گناہوں سے درگزر کرتا ہے ۔

نیز اسی غفار الذنوب وستار العیوب نے گنہگاروں کو یہ مژدہ جانفزا بھی سنایا ہے:

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ؕ (سورۃ الزمر: ۵۳)

اے میرے وہ بندو جنھوں نے اپنے نفسوں پر (گناہ کرکے) ظلم کیا ہے، اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو ۔ کیونکہ خداوند عالم تمام گناہ معاف کر دیتا ہے ۔

اصول کافی میں بروایت جناب محمد بن مُسلم حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: "ذنوب المومن اذا تاب منها مغفورة له فلیعمل المومن لما یستأنف بعد التوبة و المغفرة" ۔ جب مومن توبہ کرتا ہے تو اس کے سب سابقہ گناہ معاف ہوجاتے ہیں ۔ اب مومن کو چاہیے کہ

مغفرت کے بعد آئندہ کے لیے عمل کرے۔

نیز جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: اگر شب تیرہ و تاریک میں کسی آدمی کی زادِ راہ والی سواری گم ہو جائے اور تلاشِ بسیار کے بعد وہ اسے دستیاب ہو جائے تو جس قدر وہ شخص اس وقت مسرور و شادکام ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ خلاقِ عالم اس وقت خوش ہوتا ہے جب کوئی گنہگار بندہ اس کی بارگاہ میں توبہ کرتا ہے۔ (حق الیقین)

انہی حقائق کی وجہ سے تمام اہل اسلام کا اس امر اتفاق ہے کہ توبہ کے بعد انسان سے عقابِ اخروی ساقط ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر جناب مُصنّف علام نے فرمایا ہے کہ تائب آدمی محتاجِ شفاعت نہیں ہے لیکن بایں ہمہ ہمارا ناقص خیال یہ ہے کہ کسی شخص کا خواہ وہ جس قدر بھی مُحسن و مومن اور تائب اور مُستغفر کیوں نہ ہو۔ خداوند عالم کے تفضّل و تکرم اور جناب سید المرسلین وائمۂ طاہرین صلوات اللہ علیہم اجمعین کی شفاعت کے بغیر اس کا جنّت میں داخل ہونا مُشکل ہے اور نہیں تو کم از کم اپنی بلندیٔ درجات کے لیے تو اسے ان کی شفاعت بہر حال درکار ہے۔ (اس امر کی مزید وضاحت چوبیسویں باب میں کی جائے گی) ہماری توبہ واستغفار کیا ہے؟ ع

معصیت را خندہ می آید ز استغفارِ ما

حقیقت یہ ہے کہ عام لوگوں کی توبہ واستغفار خود مُحتاجِ توبہ ہے

واستغفر اللّٰہ مما قلت رزقنا بمنہ و کرمہ شفاعۃ النبیؐ و عترتہ الطاھرۃؑ فی الدنیا و الاخرۃ

شرائط قبولیت توبہ کا اجمالی بیان

بہر کیف توبہ اس وقت بموجب بخشش گناہان اور باعث رضائے رحمٰن ہوتی ہے جب کہ اپنے مقررہ شرائط کے ساتھ عمل میں لائی جائے۔ یہاں تفصیلی شرائط ذکر کرنے کی گنجائش نہیں، البتہ بعض اہم شرائط کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ تمام شرائط قبولیت توبہ کا لب لباب تین چیزیں ہیں:

اول یہ کہ تائب پر لازم ہے کہ وقتِ توبہ تک کیے ہوئے تمام گناہوں سے دل و جان سے اپنی ندامت و پشیمانی کا اظہار کرے۔

دوم یہ کہ آئندہ ان گناہوں کے نہ کرنے کا عزم بالجزم کرے۔

سوم یہ کہ گزشتہ گناہوں کی تلافی بھی کرے، بایں طور کہ اگر وہ گناہ حقوقِ خداوندی کے متعلق ہیں جیسے ترک صوم و صلوٰۃ وغیرہ تو ان کی قضا کرے، اور اگر حقوق الناس سے متعلق ہیں جیسے

چوری اور لوگوں پر ظلم و ستم اور ان کی غیبت وعیب جوئی وغیرہ تو حقوقِ مالیہ کو ادا کرے یا ان سے بخشوائے اور دیگر حق تلفیوں کی ان سے معافی مانگے۔

اگر ایسا نہ کیا گیا وہ توبہ فی الحقیقت توبہ نہ ہوگی۔

اللھم وفقنا للتوبۃ قبل الموت وللعمل قبل الفوت

شفاعت کے بارے میں چند شکوک وشبہات اور ان کے جوابات

جو لوگ شفاعت کو صرف بلندیٔ درجات کی سفارش کے معنوں میں مراد لیتے ہیں اور گنہگاروں کے دفع عذاب وعقاب کے معنوں میں اسے درست نہیں سمجھتے وہ اپنے نظریہ پر چند شبہات پیش کیا کرتے ہیں۔ ان کا ایک شبہ تو عقلی ہے اور باقی شبہات بعض آیاتِ قرآنیہ کے صحیح معنی ومفہوم کے نہ سمجھنے پر مبنی ہیں۔

پہلا عقلی شُبہ

یہ ہے کہ جس طرح کسی عادل و صادق بادشاہ کے لیے وعدہ کی مخالفت قبیح ہے اسی طرح وعید و تہدید کی خلاف ورزی بھی قبیح و شنیع ہے۔ مثلاً خداوند عالم نے عمل صالح کرنے والوں کے ساتھ جنّت کا وعدہ کیا ہے، لہٰذا اگر وہ پورا نہ کرے تو یہ امر یقیناً قبیح اور اس کی شانِ خداوندی کے منافی ہے۔ اسی طرح چونکہ اس نے عمل بد کرنے والوں کو عذابِ جہنم کی وعید و تہدید فرمائی ہے، لہٰذا اس کا پورا کرنا بھی اس پر لازم ہے۔ لہٰذا عقاب کے معاف کرنے کی سفارش کرنا مذموم ہے جو کہ ایک نبی معصومؑ کی شانِ عصمت کے منافی ہے۔

اس شبہ کا جواب

یہ ہے کہ یہ شبہ تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہے اور یہ وعدہ اور وعید میں فرق نہ کرنے اور ان کے درمیان جو نمایاں امتیاز ہے اس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ ورنہ عقلائے روزگار جانتے ہیں اور صاحبانِ اقتدار کا کردار شاہد عادل ہے کہ جس طرح وعدہ کی مخالفت قبیح ہوتی ہے اس کے برعکس وعید کی خلاف ورزی ممدوح ہوتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی حاکم کسی ماتحت کو کسی برے کام کے کرنے پر یا کسی اچھے کام کے نہ کرنے پر تہدید و وعید کرے اور جب وہ شخص اس حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے تو اگر حاکم خود بخود یا کسی کی سفارش کرنے سے اسے اس کا جرم معاف کردے اور سزا نہ دے تو اس کا یہ

فعل یقیناً عقلائے روزگار کی نظر میں قابل مدح و ستائش سمجھا جاتا ہے اور اسے اس کی رحم دلی اور بندہ نوازی پر محمول کیا جاتا ہے۔ مشاہدہ بھی شاہد ہے کہ جب حکام دنیا کسی شخص سے ناراض ہوجائیں تو جس طرح اس مجرم کی عاجزی و انکساری سے اسے معاف کردیتے ہیں، اسی طرح بعض اوقات مقربین بارگاہ کی سفارش سے بھی تقصیریں معاف ہوجاتی ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ شفاعت بایں معنی خداوند عالم کے عفو و درگزر کرنے کا نام ہے، جس کا خدا تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے۔"الا فاعفوا و اصفحوا (سورۃ البقرہ:۱۰۹) یغفر اللہ لکم" مجرموں کو معاف کردو، خدا تمھیں معاف کردے گا۔ خدا تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی مدح و ثنا فرمائی ہے جو غصہ کو پی جاتے ہیں اور مجرموں کو معافی دے دیتے ہیں۔ چنانچہ فرماتا ہے:

وَ الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۴﴾

(سورۃ آلِ عمران:۱۳۴)

خدا کے خالص بندے وہ ہوتے ہیں جو غصہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کردیتے ہیں اور خدا دوست رکھتا ہے ان لوگوں کو جو احسان کرنے والے ہوتے ہیں۔

اولیاء مقتول کو ہدایت کی جاتی ہے:

اَنْ تَعْفُوْۤا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ (سورۃ البقرۃ:۲۳۷)

اگر تم قاتل کو معاف کردو تو یہ امر تقویٰ و پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے۔

در عفو لذتے است کہ در انتقام نیست

تو جو خلاق حکیم ہمیں عفو و درگزر کا حکم دیتا ہے اگر وہ خود اسی امر کا مظاہرہ فرمائے تو یہ امر قبیح کیوں ہونے لگا؟ ان ھٰذا الا اختلاق۔

ہاں اگر کوئی حاکم کسی شخص کو کسی اچھے کام کرنے پر کسی انعام دینے کا وعدہ کرے اور پھر کام انجام دینے پر وہ مقررہ انعام نہ دے تو اس کا یہ فعل یقیناً عقلاء کی نظروں میں مذموم سمجھا جاتا ہے۔ علاوہ بریں وعدہ و وعید کے درمیان ایک فرق یہ بھی ہے کہ وعدہ میں لوگوں کا حق خدا پر ہوتا ہے۔ جس کی ادائیگی کو خدا ہرگز ترک نہیں کرتا۔ مگر وعید و تہدید میں خدا کا حق بندوں پر ہوتا ہے، جس کے متعلق اسے لینے یا معاف کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس سے وعدہ و وعید کا باہمی فرق ہر کہ و مہ پر واضح و آشکار ہوجاتا ہے۔ البتہ اگر یہ شفاعت حقوق الناس کے متعلق ہے تو قدرت اپنی بارگاہ سے ان کے

حقوق کے عوض کی ادائیگی کا انتظام کر سکتی ہے۔ اس طرح کسی کے حقوق کے ضیاع کا بھی اندیشہ نہیں رہتا۔

دوسرے بعض شبہات

جو بعض آیاتِ قرآنیہ کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے سے پیدا ہوئے ہیں، وہ یہ ہیں: ① ارشادِ قدرت ہے: "ما للظالمین من حمیم و لا شفیع یطاع" (سورۃ مومن: ۱۸) ظالموں کے لیے کوئی خیر خواہ اور ایسا شفیع جس کی اطاعت کی جائے نہ ہوگا۔ اور چونکہ ہر فاسق و فاجر ظالم ہے، لہٰذا ان کی شفاعت نہ ہوگی۔ ② "و ما للظالمین من انصار" ظالموں کا کوئی یار و مددگار نہ ہوگا، جو شفاعت کرتا ہے۔ وہ گویا نصرت و امداد کرتا ہے۔ لیکن بنصِّ قرآن جب ظالموں کا کوئی ناصر نہیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ ان کا کوئی شفیع نہیں۔ ③ "یوم لا تجزی نفس عن نفس شیئا" (سورۃ البقرہ: ۱۲۳) اس روز کوئی نفس کسی نفس کو فائدہ نہ پہنچائے گا۔ ④ "فلا تنفعھم شفاعۃ الشافعین" (سورۃ المدثر: ۴۸) انھیں کسی شفیع کی شفاعت کوئی نفع نہ دے گی۔

پہلا جوابؒ باصوابؒ

ان سب آیات مبارکہ کے ساتھ تمسک کرنے کا پہلا جواب باصواب تو یہ ہے کہ اگرچہ فاسق کو ظالم کہا گیا ہے: "و من یتعد حدود اللہ فاولئك ھم الظالمون" (سورۃ البقرہ: ۲۲۹) لیکن یہ امر ظاہر ہے کہ ظالم کی فردِ اکمل یعنی حقیقی اور واقعی ظالم کافر و مشرک لوگ ہیں۔ جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے: "والکافرون ھم الظالمون" (سورۃ البقرۃ: ۲۵۴) یعنی کافر ہی حقیقی ظالم ہیں۔ "ان الشرك لظلم عظیم" (سورۃ لقمان: ۱۳) شرک ایک ظلم عظیم ہے۔ لہٰذا مشرک بڑے ظالم ہیں...... اس لیے اس جگہ "ظالمین" سے مراد کافر و مشرک لوگ ہیں یا وہ نام نہاد مسلمان جو محکوم بکفر ہیں جیسے نواصب و خوارج اور غالی وغیرہم اور یہی جمع بین الآیات کا تقاضا ہے، ورنہ سابقہ آیات (جو اثباتِ شفاعت پر دلالت کرتی ہیں) اور ان آیات میں تعارض و اختلاف پیدا ہو جائے گا جو شانِ قرآن کے خلاف ہے۔

و لو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا

دوسرا جوابِ باصواب

اگر گنہگاروں کو شفاعت سے کچھ فائدہ نہ ہوتا تو خلاقِ عالم کا پیغمبر اسلام ﷺ کو یہ حکم دینا لغو بے معنی ہوکر رہ جائے گا: "واستغفروا لذنبك و للمومنین و المومنات" (سورۃ محمد:۱۹) اے رسولؐ! اہلِ ایمان مردوں اور عورتوں کے گناہوں کی بخشش طلب کرو۔ اسی طرح عام لوگوں کو خلاقِ عالم نے ہدایت فرمائی ہے: و لوانھم اذ ظلموا انفسہم جاؤك و استغفروا اللہ و استغفر لھم الرسول لوجدوا اللہ توابا رحیما" (سورۃ النساء:۶۴)

اس آیت مبارکہ سے بعبارۃ النص واضح و آشکار ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ گنہگارانِ امت کی بخشش طلب کرتے ہیں اور اس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی برآمد ہوتا ہے۔ اس لیے تسلیم کرنا پڑے گا کہ مذکورہ بالا آیات سے کفار و مشرکین اور ان کے اشباہ و امثال ہی مراد ہیں نہ کہ گنہگار مومنین۔

و ھو المطلوب

تتمہ بحث

برادرانِ اسلامی کے مُقتدر عالم علامہ نووی نے شرح صحیح مُسلم جلد۱ صفحہ۱۰۴ میں قاضی عیاض کی تحقیق نقل کی ہے جس سے ہمارے بیان کردہ مطلب کی تائید ہوتی ہے۔ ہم اسے سر دلبراں در حدیث دیگراں سمجھتے ہوئے یہاں نقل کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

قال القاضی عیاض مذھب اھل السنۃ جواز الشفاعۃ عقلا و وجوبھا سمعا بصریح قولہ تعالیٰ یومئذ لا تنفع الشفاعۃ الا لمن اذن لہ و رضی لہ قولا و قولہ تعالیٰ و لا یشفعون الا لمن ارتضی و امثالھا و بخبر الصادق صلی اللہ علیہ و سلم و قد جاءت الاثار التی بلغت بمجموعھا التواتر بصحۃ الشفاعۃ فی الاخرۃ لمذنبی المومنین و اجمع السلف الصالح و من بعدھم من اھل السنۃ علیھا و صنعت الخوارج و بعض المعتزلۃ منھا و تعلقوا بمذھبھم فی تخلید المذنبین فی النار و احتجوا بقولہ تعالیٰ فما تنفعھم شفاعۃ الشافعین و بقولہ تعالیٰ ما للظلمین من حمیم و لا شفیع یطاع و ھذہ الأیات فی الکفار و اما تاویلھم احادیث الشفاعۃ بکونھا فی زیادۃ الدرجات فباطل و الفاظ الاحادیث فی الکتاب و وغیرہ صریحۃ فی بطلان مذھبھم و اخراج من استوجب النار.

خلاصہ مطلب یہ کہ جناب قاضی عیاض نے کہا ہے کہ اہل سنت و جماعت کا مذہب یہ ہے کہ

شفاعت عقلاً جائز اور صریح آیات اور مخبر صادق علیہ السلام کی خبر کے مطابق شرعاً واجب ہے۔ بروز قیامت گنہگار مومنین کی شفاعت کی صحت کے متعلق اس قدر بکثرت آثار و اخبار وارد ہوئے ہیں جو مجموعی طور پر حد تواتر تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور اہل سنت کے سلف صالح اور ان کے بعد والے طبقات نے اس کی صحت پر اجماع کیا ہے۔ ہاں خوارج اور بعض مُعتزلہ (وعیدیہ نہ کہ تفضیلیہ) نے اس کا انکار کیا ہے۔ اور اپنے نظریہ پر گنہگاروں کے ہمیشہ جہنم میں معذب ہونے پر بعض آیاتِ قرآنیہ جیسے یہ کہ ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کچھ فائدہ نہ دے گی، سے تمسک کیا ہے جو کہ غلط ہے۔ کیونکہ یہ آیتیں کفار کے بارے میں ہیں۔ انھوں نے احادیث شفاعت کی جو یہ تاویل کی ہے کہ یہ زیادتی ثواب کے لیے ہے، یہ تاویل باطل ہے۔ کیونکہ کتاب مُسلم وغیرہ میں واردشدہ احادیث کے الفاظ ان کے نظریہ کو بالصراحت باطل کر رہے ہیں۔ نیز انہی احادیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ گنہگار مُسلمان جو مستحق جہنم ہوں گے وہ بالآخر سزا بھگت کر جہنم سے باہر نکالے جائیں گے۔

انتہیٰ کلامہ بالاختصار

☆

باب الاعتقاد

فی الوعد والوعید

قال الشیخ اعتقادنا فی الوعد و الوعید ان من وعدہ اللہ علیٰ عمل ثواباً فھو منجزہ ومن وعدہ علی عمل عقاباً فھو فیہ

بائیسواں باب

خدا تعالیٰ کے وعدہ اور وعید کے متعلق اِعتقاد کا بیان

جناب شیخ ابو جعفر علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں خدا کے وعدہ اور اس کی وعید کے بارے میں ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ خداوند عالم نے جس شخص سے اس کے اعمال صالحہ کے عوض اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا

بائیسواں بابؒ

وعدہ اور وعیدِ خداوندی کے متعلق عقیدہ

ہم ابھی اوپر سابقہ مبحث کے آخر میں بذیل جواب شبہ اولیٰ اس مسئلہ پر تفصیلی روشنی ڈال چکے ہیں ۔ اس کے بغور پڑھ لینے سے اس اعتقاد کی حقانیت و صداقت روزِ روشن کی طرح واضح و آشکار ہوجاتی ہے جو حضرت مُصنّف علام نے بیان فرمایا ہے اور وعدہ و وعید کا باہمی فرق بھی روشن و نمایاں ہوجاتا ہے ۔ ہم نے مذکورہ بالا مقام پر واضح کر دیا ہے کہ جن لوگوں نے وعدہ و وعید کے درمیان فرق نہ کرتے ہوئے وعدہ و وعید ہر دو کی خلاف ورزی کو قبیح قرار دیا ہے اور اسی غلط نظریہ کی بنا پر شفاعت ایسے اہم دینی عقیدہ سے انکار بھی کیا ہے، انھوں نے سخت غلطی کی ہے ۔ نیز انھوں نے سیرتِ سلاطین زمان اور قوانین خدائے رحمٰن نیز فطرتِ انسان کے سمجھنے میں بھی ٹھوکر کھائی ہے ۔ ورنہ ہر صحیح الفطرت انسان سمجھ سکتا ہے کہ کسی اچھے کام کے انجام دینے پر انعام و اکرام کے وعدہ کی مخالفت یقیناً قبیح ہوتی ہے لیکن کسی برے کام پر سزا دینے اور عذاب و عقاب کرنے کی دھمکی دے کر بعد میں معاف کر دینے کو عقلاء روزگار کے نزدیک شفقت و رحم دلی اور لطف و کرم پر محمول کیا جاتا ہے ۔ پس جب وعدہ کی ایفاء اور وعید و تہدید سے درگزر کرنا عقلاً ایک اچھی صفت ہے تو خدائے حکیم اسے کیونکر ترک کر سکتا ہے ۔ علاوہ بریں جب خدا نے اپنی مخلوق کو عفو و درگزر کا حکیمانہ حکم دیا ہے کہ: "واعفوا واصفحوا ان اللہ یحب" (سورۃ البقرۃ: ۱۰۹) عفو و درگزر کرو کہ خدا درگزر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے تو پھر خود کس طرح اس اپنے پسندیدہ اور مرغوب عمل کو نظر انداز کر سکتا ہے؟ دوسروں کو کسی بات کا حکم دینا اور خود نہ کرنا یہ تو بندوں کے لیے بھی معیوب ہے ۔ چنانچہ خلاق عالم واعظانِ غیر متعظ کی سرزنش کرتے

بالخیار ان عذبه فبعدله و ان عفی عنه فبفضله و ما ربك بظلام للعبید و قال عز و جل ان الله لا یغفر ان یشرك به و یغفر ما دون ذلك لمن یشاء والله اعلم

ہے وہ یقیناً اپنا وعدہ پورا کرے گا، اور جس کو اس کے بد اعمال کے عوض عذاب وعقاب کی وعید وتہدید فرمائی ہے تو اس کے متعلق اس کو پورا پورا اختیار ہے، اگر اسے عذاب میں مُبتلا کرے تو یہ اس کا عدل ہے اور اگر اسے معاف کردے تو یہ اس کا فضل وکرم ہے۔ تمھارا پروردگار اپنے بندوں پر ہرگز ظلم نہیں کرتا (حم السّجدہ:۴۶) ارشادِ قدرت ہے کہ خداوند عالم شرک کرنے والوں کو ہرگز معاف نہیں کرے گا، لیکن اس کے علاوہ دیگر گناہ جسے چاہے گا معاف کردے گا (نساء:۱۱۶)

ہوئے فرماتا ہے: "اتامرون الناس بالبر و تنسون انفسکم" (بقرۃ:۴۴) کیا تم دوسرے لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو فراموش کر جاتے ہو؟ تو خود کس طرح اس امر شنیع کا ارتکاب کرسکتا ہے؟ مزید برآں قرآن وحدیث میں اس اعتقاد کی صحت کی طرف جابجا اشارات بلکہ تصریحات موجود ہیں۔ چنانچہ ایفائے عہد کے متعلق اس کا ارشاد ہے: "ان الله لا یخلف المیعاد" (رعد:۱۳) تحقیق خداوند عالم ہرگز وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

اور عفو و درگزر کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا

(سورۃ الزمر:۵۳)

اے میرے وہ بندو جنھوں نے گناہ کرکے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ کیونکہ وہ تمام گناہ معاف کردیتا ہے۔

نیز فرماتا ہے: "وَ یُکَفِّرْ عَنْہُمْ سَیِّاٰتِہِمْ" (سورۃ الفتح:۵) خدا ان کے گناہ معاف کردیتا ہے۔

نیز فرماتا ہے: "عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّکَفِّرَ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ" (سورۃ التحریم:۸) قریب ہے کہ خدا تمھارے گناہ معاف کردے گا۔

وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُکَفِّرَنَّ عَنْہُمْ سَیِّاٰتِہِمْ وَ لَنَجْزِیَنَّہُمْ اَحْسَنَ الَّذِیْ کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۷﴾ (سورۃ العنکبوت:۷)

ثالث بحار الانوار میں بحوالہ محاسن برقی جناب امام جعفر صادق علیہ السلام اور وہ اپنے آباء و اجدادِ طاہرینؑ کے سلسلۂ سند سے جناب رسولِ خداؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

من وعده الله علی عمل ثواباً فهو منزله و من اوعده علی عمل عقاباً فهو فیه بالخیار ۔ (کذا فی تفسیر الوسیط للواحدی) جس شخص سے خداوند عالم نے کسی عمل خیر پر کسی اجر و ثواب کا وعدہ کیا ہے وہ اسے ضرور پورا کرے گا اور جسے اس نے کسی عمل بد پر عقاب کرنے کی تہدید فرمائی ہے اس میں اسے اختیار ہے، چاہے تو عقاب کرے اور چاہے تو اسے معاف کر دے۔

مخفی نہ رہے کہ جس آیت مبارکہ میں یہ وارد ہے کہ خدا ہرگز شرک معاف نہیں کرتا، اور
اس کے علاوہ جسے چاہے اس کے گناہ معاف کر دیتا ہے، (نساء:۱۱۶)
یہ بلا توبہ مرنے والوں کے متعلق ہے۔ ورنہ
توبہ کرنے سے بالاتفاق تمام گناہ
معاف ہو جاتے ہیں
وہ گناہ خواہ کسی
نوعیت کے
ہوں

☆

(شرح تجرید)

اذا وعد السراء انجز وعده
و ان اوعد الضراء فالعفو مانع

☆

باب الاعتقاد

فیما یکتب علی العبد

قال الشیخ اعتقادنا فی ذلك انه ما من عبد الاوله ملكان موكلان علیه یكتبان علیه

تیئیسواں بابؒ

بندوں کی کتابت اعمال کے متعلق اعتقاد

حضرت شیخ صدوق علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ہر بندے کے ساتھ دو فرشتے خدا تعالیٰ کی طرف سے مؤکل و مقرر ہیں جو اس کے سب اعمال کو تحریر کرتے رہتے ہیں۔

تیئیسواں بابؒ

بندوں کے نامہ ہائے اعمال لکھے جانے کے متعلق عقیدہ کا بیان

ملائکہ کے موجود ہونے اور ان کی عبادتؒ کے اقسام کا بیان

جہاں تک ملائکہ کے وجود کے اثبات اور ان کی حقیقت و ماہیت بیان کرنے اور اس سلسلہ میں دہریین کے انکار اور فلاسفہ کی تاویلاتِ علیلہ کے ابطال کا تعلق ہے، اس موضوع پر ہم آئندہ چوبیسویں باب میں مفصل گفتگو کریں گے۔ سردست اجمالاً اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ اس امر پر تمام مُسلمانوں کا اتفاق ہے کہ فرشتے خداوند عالم کی ایک نوری مخلوق ہیں جو یقیناً موجود ہیں اور وہ اس قدر کثیر التعداد ہیں کہ ان کی صحیح تعداد کا علم سوائے علّامُ الغیوب (او من علمه الله) کے اور کسی کو نہیں ہے۔ جن و انس کی طرح ان کی غرض خلقت بھی خداوند عالم کی عبادت کرنا ہے۔ لیکن ان کی عبادت کی نوعیّت ہماری عبادت سے قدرے مختلف ہے۔ ان کے اشغال و اعمال بھی مُتفرّق ہیں۔ کسی کا کام تحمید و تمجید اور کسی کا وظیفہ تہلیل و تکبیر، کسی کا عمل رکوع و سجود اور کسی کا فعل قیام و قعود، کسی کی عبادت بنی نوع انسان کی حفاظت و حراست کرنا ہے، کسی کی اطاعت قبور میں اموات سے سوال کرنا، کسی کا شعار مارنا و جِلانا اور کسی کا وثار تدبیر عالم کرنا۔ اسی طرح ایک گروہ کا وظیفہ مکلّفین کے نیک یا بد اعمال کا لکھنا ہے۔ "والمدبرات امراً والمقسمات امراً" (سورۃ النازعات: ۵) جس گروہ کا جو وظیفہ و کام خدا تعالیٰ نے مقرر کر دیا ہے، اسی کی بجا آوری اور انجام دہی اس کی عبادت قرار دے دی گئی ہے۔ "عباد مکرمون لا یسبقونه بالقول و هم بأمره یعملون" (سورۃ الانبیاء: ۲۷) یہ فرشتے خدا کے وہ مکرم بندے ہیں جو

جمیع اعماله و من هم بحسنة کتب له حسنة و ان عملها کتب له عشر حسنات فان هم بسیئة لم یکتب علیه حتی یعملها و ان عملها اجل سبع ساعات فان تاب قبلها لم یکتب علیه و ان لم یتب کتب علیه سیئة واحدة و الملکان

اگر کوئی شخص نیکی کرنے کا صرف ارادہ ہی کر لے تو اس کے نامۂ اعمال میں ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے اور جب وہ اس نیکی کو بجا بھی لائے تو اس کے لیے دس نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں (مگر اس کے برعکس) جب کوئی شخص کسی بدکاری کا ارادہ کرتا ہے تو جب تک وہ اسے کر نہ لے نامۂ اعمال میں کچھ نہیں لکھا جاتا، بلکہ اِرتکابِ جرم کے بعد بھی اسے سات گھنٹوں تک مہلت دی جاتی ہے۔ پس اگر اس مدت کے اندر اندر توبہ کر لے تو پھر بھی یہ برائی درج نہیں کی جاتی۔ ہاں اس اثنا میں (بوجہ شومیٔ قسمت)

کسی قول و فعل میں اس سے سبقت نہیں کرتے بلکہ وہ ہمیشہ خدا کے حکم سے عمل کرتے ہیں۔ جس کے ذمہ جو کام لگا دیا گیا ہے وہ اس کی انجام دہی میں بموجب ارشادِ قرآنی "لا یفترون" سستی و کاہلی نہیں کرتا۔ "وهم بامره یعملون" اور برابر اس کے حکم کی تعمیل میں مشغول رہتے ہیں۔ خداوند عالم نے ان کے ذمہ جو کام لگائے ہیں یہ تو کوئی مُسلمان کہہ نہیں سکتا کہ خداوند عالم خود ان کاموں کو انجام دینے سے معاذ اللہ قاصر اور ملائکہ کی امداد و اعانت کا محتاج ہے۔ جیسا کہ بعض جہال و ضلال کا خیال ہے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ بعض مصالح و حکم کی بنا پر اس نے ان کی عبادت ان امور کی انجام دہی قرار دی ہے۔ بنابریں کوئی صحیح العقیدہ مُسلمان یہ نہیں کہہ سکتا کہ خداوند عالم نے کتابتِ اعمال اس لیے فرشتوں کے ذمہ لگائی ہے کہ اس طرح اپنے بندوں کے اعمال پر اطلاع حاصل کرے کہ بغیر اس طریقہ کے اسے ان اعمال کی اطلاع نہیں ہو سکتی تھی (معاذ اللہ) کیونکہ جس ذات ذوالجلال کی شان میں وارد ہو: "وهو بکل شیء علیم"۔ "و هو علیم بذات الصدور"۔ "لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ" (سورۃ الحاقہ:۱۸) "لا یعزب عن علمه مثقال ذرة فی الارض و لا فی السماء" (سورۃ یونس:۶۱) جس خدا کا یہ ارشاد واجب الاعتقاد ہو: "نحن اقرب الیه من حبل الورید" (سورۃ ق:۱۶) "ولقد خلقنا الانسان و نعلم ما توسوس به نفسه" (سورۃ ق:۱۶) "عالم الغیب والشهادة"۔ اس کے متعلق کس طرح اس قسم کا تصوّر قائم کیا جا سکتا ہے؟

کراماً کاتبین کے تقرر کا وقت اور ان کا کام

مذکورہ بالا بیان کے پیشِ نظر یہ حقیقت تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ خدائے حکیم نے اپنی صوابدید کے

يكتبان على العبد كل شئ حتى يكتبان النفخ فى الرماد و قال الله و ان عليكم لحافظين كراما كاتبين يعلمون ما تفعلون و مر اميرالمومنينؑ برجل و هو يتكلم بفضول الكلام فقال له يا هذا الرجل انك تملى على ملكيك كتابًا الى ربك فتكلم

توبہ نہ کرے تب صرف ایک گناہ درج کیا جاتا ہے یہ دونوں فرشتے بندے کا ہر فعل ضبطِ تحریر میں لے آتے ہیں حتی کہ اگر وہ راکھ میں پھونک ہی مارے تو وہ اسے بھی لکھ لیتے ہیں۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے تحقیق تم پر کریم فرشتے بطور محافظ مقرر ہیں جو تمہارے اعمال کو لکھتے ہیں اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ اسے جانتے بھی ہیں (انفطار: ۱۰ تا ۱۲) ایک دفعہ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام ایک ایسے شخص کے پاس سے گزرے جو لغو اور فضول باتیں کر رہا تھا آنجناب نے اس سے فرمایا: اے شخص تو اپنے محافظ فرشتوں سے

مطابق بعض ملائکہ کی یہ عبادت قرار دی ہے کہ جب بھی کوئی مرد یا عورت سن بلوغ کو پہنچ جائے تو اس کے پاس دو فرشتے بھیج دیتا ہے، اور وہ اس کے ہر ہر قول و فعل کو خواہ اچھا ہو یا برا، ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں اور فرشتوں کے اس گروہ کو قرآنی اصطلاح میں کراماً کاتبین کہا گیا ہے۔

وَاِنَّ عَلَيۡكُمۡ لَحٰفِظِيۡنَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِيۡنَ ۝ يَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ ۝ (سورۃ الانفطار: ۱۰ تا ۱۲)

حالانکہ تم پر نگران مقرر ہیں، بزرگ (فرشتے سب باتوں کے) لکھنے والے (کراماً کاتبین) جو کچھ تم کرتے ہو ان کے پاس (ان کے اعمال) لکھتے ہیں۔

نیز ارشادِ قدرت ہے:

بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيۡهِمۡ يَكۡتُبُوۡنَ ۝ (سورۃ الزخرف: ۸۰)

ہاں ہمارے فرستادہ (فرشتے) ان کے پاس (ان کے اعمال) لکھتے ہیں۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے:

اِذۡ يَتَلَقَّى الۡمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الۡيَمِيۡنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيۡدٌ ۝ مَا يَلۡفِظُ مِنۡ قَوۡلٍ اِلَّا لَدَيۡهِ رَقِيۡبٌ عَتِيۡدٌ ۝ (سورۃ ق: ۱۷ و ۱۸)

جب (وہ کوئی کام کرتا ہے تو) وہ لکھنے والے (کراماً کاتبین) جو اس کے داہنے بائیں بیٹھے ہیں لکھتے ہیں، کوئی بات اس کی زبان پر نہیں آتی مگر ایک نگہبان اس کے پاس تیار رہتا ہے۔ (ترجمہ فرمانؒ)

اسی بنا پر جناب امیرالمومنین علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: "ما تم عقل امرء الا و قد قل

بما یعنیك ودع ما لا یعنیك و قال علی الرجل المسلم یکتب محسنا ما دام ساکتا فاذا تکلم کتب اما محسنا او مسیئا و موضع الملکین من ابن ادم الترقوان صاحب الیمین یکتب الحسنات و صاحب الشمال

ایک ایسا نامہ لکھوا رہا ہے جو تیرے پروردگار کے سامنے پیش ہونے والا ہے اس لیے تو ایسی باتیں کر جو تیرے لیے مُفید مطلب ہیں اور جو بے فائدہ باتیں ہیں ان سے پرہیز کر۔ پھر فرمایا: ایک مُسلمان اس وقت تک برابر نیک لکھا جاتا ہے جب تک کہ کلام نہیں کرتا، ہاں جب وہ سلسلہ کلام شروع کر دیتا ہے تو (اپنے کلام کے اعتبار سے) نیکوکار لکھا جاتا ہے یا بدکار۔ ان دونوں فرشتوں کے رہنے کی جگہ ہنسلی والی دونوں ہڈیاں ہیں، دائیں طرف والا فرشتہ نیکیاں اور بائیں طرف والا فرشتہ برائیاں

کلامہ" (نہج البلاغہ) جب کسی آدمی کی عقل کامل ہوجاتی ہے تو اس کا کلام کم ہوجاتا ہے۔ (فضول یاوہ گوئی کرکے اپنے دفترِ اعمال کو سیاہ نہیں کراتا)

شب و روز کے کاتبِ اعمال فرشتے علیحدہ علیحدہ ہیں

روایاتِ ائمۂ اہلِ بیتؑ سے یہ بھی مُستفاد ہوتا ہے، جیسا کہ متن رسالہ میں مذکور ہے کہ دن اور رات کے اعمال لکھنے والے فرشتے علیحدہ علیحدہ ہیں، بلکہ بعض روایات سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرشتے اس قدر کثیر التعداد ہیں کہ جو ایک مرتبہ آکر واپس جاتے ہیں انھیں دوبارہ اس شخص کے پاس قیامت تک آنے کا پھر اتفاق نہیں ہوتا۔ (انوارِ نعمانیہ) محدث جزائری مرحوم فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ حدیث سے یہ معلُوم ہوتی ہے کہ ستار العیوب نہیں چاہتا کہ ملائکہ کرام حضرات انسان کے گناہوں پر بار بار مطلع ہوں۔ (جل الخالق)

کراماً کاتبین نامہ اعمال کو جناب رسولِ خداؐ اور ائمہ ہدیٰؑ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں

بہر حال دن والے فرشتے اس کے اعمال کو اسی کیفیت سے جو متن رسالہ میں مذکور ہے، صبح سے لے کر شام تک لکھتے ہیں اور شام کے وقت دفترِ اعمال کو جناب رسولِ خداﷺ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، اور بعد ازاں یکے بعد دیگرے تمام ائمۂ طاہرینؑ کی خدمت میں لے جاتے ہیں۔ اور سب کے آخر میں حضرت امام زمانہؑ کے حضور میں حاضر کرتے ہیں۔ امامِ زمانہؑ نیکی اور بدی کے دونوں دفتروں کو ملاحظہ فرماتے ہیں اور اپنے نام لیواؤں کے صحیفۂ گناہ کو دیکھ کر ان کے لیے استغفار

یکتب السیئات و ملکا النہار یکتبان عمل العبد فی النہار و ملکا اللیل یکتبان علی العبد فی اللیل

لکھتا ہے۔ دن والے فرشتے بندہ کے دن والے اعمال اور رات کے فرشتے اعمالِ شب لکھتے ہیں۔

کرتے ہیں۔ اور جو خطائیں قابلِ اصلاح ہوں ان کی اصلاح فرماتے ہیں۔

انہی سرکارؑ کا اپنے نام لیواؤں کے نام یہ فرمان ہے: "اذا اتتنی صحیفة سیئاتکم فلتکن صحیفة قابلا للاصلاح" جب تمہارا صحیفہ گناہ میرے پاس آئے تو چاہیے کہ وہ قابلِ اصلاح ہو۔ ایسا نہ ہو کہ مجموعہ اغلاط ہونے کی وجہ سے ناقابلِ اصلاح ہو) اس کے بعد نامہ اعمال کو لے کر بارگاہِ قدرت میں پیش کرنے کی غرض سے آسمان پر چلے جاتے ہیں۔ یہ ہے مطلب آیت مبارکہ: "وَقُلِ اعۡمَلُوۡا فَسَیَرَی اللّٰہُ عَمَلَکُمۡ وَرَسُوۡلُہٗ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ" (سورۃ التوبۃ:۱۰۵) کا، یعنی تم عمل کیے جاؤ، تمہارے اعمال کو خدا دیکھ رہا ہے اور اس کا رسول بھی دیکھ رہا ہے اور کچھ خالص مومنین یعنی ائمہ طاہرینؑ بھی دیکھ رہے ہیں۔ اس کے بعد رات والے فرشتے آجاتے ہیں۔ صبح صادق تک وہ اعمالِ شب لکھتے ہیں۔ اول صبح صادق کے وقت چاروں فرشتوں کا مبارک اجتماع ہوتا ہے، رات والے فرشتے جارہے ہوتے ہیں اور دن والے آرہے ہوتے ہیں، جو بندہ مومن نماز صبح کو اول وقت پر ادا کرتا ہے، اس کو شب و روز والے دونوں فرشتے لکھ لیتے ہیں۔ چنانچہ ارشادِ قدرت ہے:

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ وَقُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ ؕ اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ کَانَ مَشۡہُوۡدًا ﴿۷۸﴾

(سورۃ بنی اسرائیل:۷۸)

سورج ڈھلنے سے لے کر (ظہر عصر) رات کی تاریکی چھا جانے تک (مغرب وعشاء) نماز قائم کرو۔ نیز صبح کی نماز پڑھو۔ کیونکہ نماز صبح کے وقت ملائکہ حاضر ہوتے ہیں۔

اور یہ رات والے فرشتے بھی بدستور سابق نامہ ہائے اعمال کو آں حضرتؑ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

ملا محمد صالح مازندرانی قدس سرہ شرح اصول کافی میں عرضِ اعمال والی احادیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ظاهر احادیث هذا الباب ان اعمال کل احد تعرض علی رسول الله صلی الله علیه و اله مفصلة فی کل یوم و هذا تحمل وجهین احدهما ان تعرض علیه اعمال الیوم و اللیلة معا وقت الصبح و یشعر به هذا الخبر و ثانیهما ان تعرض اعمال اللیل فی الصباح و اعمال النهار فی المساء لانهما وقتان لرفع الاعمال و یشعر به خبر عبدالله بن الزیات عن الرضا علیه السلام (شرح اصول کافی جلد ۵ صفحه ۳۳۹)

یعنی اس باب کی احادیث مبارکہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہر شخص کے تمام اعمال آنحضرت ﷺ پر ہر روز پیش ہوتے ہیں۔ اب رہا یہ امر کہ آیا شب و روز کے اعمال صرف ایک بار بوقت صبح پیش ہوتے ہیں، جیسا کہ اس روایت سے ظاہر ہے، یا دو بار پیش ہوتے ہیں۔ بایں طور پر کہ شام کے صبح کے وقت اور دن کے شام کے وقت، جیسا کہ عبداللہ بن زیات کی روایت سے ظاہر ہے۔ کیونکہ یہی رفع اعمال کے دو وقت ہیں۔ یہ دونوں احتمال ہیں۔ بہرکیف یہ سلسلہ مبارکہ انسان کے آخری لمحاتِ حیات تک برابر جاری و ساری رہتا ہے۔ ذلك تقدير العزيز الحكيم۔

تقرر کراماً کاتبین اور کتابت اعمال کے بعض اسرار و رموز کا بیان

اس کتابت اعمال کے حقیقی اسرار و رموز کا علم تو اسی خالق حکیم کو ہے جس نے یہ سلسلہ مبارکہ جاری کیا ہے۔ مگر ہماری مذکورہ بالا احادیث مبارکہ سے بھی بعض اسرار کا سراغ مل جاتا ہے کہ اس سلسلہ کے اجراء کا ایک راز تو یہ ہے کہ نبیؐ و امامؑ کو امت کے اعمال سے آگاہ کیا جاسکے (اگرچہ وہ توجہ فرمائیں تو اس سلسلہ کے بغیر بھی براہِ راست حالات معلوم کر سکتے ہیں) اس کا دوسرا راز جو بعض آیات و روایات سے ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بروز قیامت جو شخص بھی جنّت یا جہنم کا مستحق قرار پائے گا، اس کا یہ استحقاق علیٰ رؤس الاشہاد اس کے اس نامہ اعمال کی روشنی میں جو معصوم فرشتوں کا لکھا ہوا ہے، واضح و آشکار کیا جائے گا، تاکہ کوئی شخص خدائے تعالیٰ یا کراماً کاتبین کے متعلق کسی قسم کی بے جا رعایت یا کسی پر ظلم و زیادتی کا خیال فاسد نہ کر سکے۔ ارشادِ قدرت ہوگا: "اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا" ۝۱۴ (سورۃ الاسراء: ۱۴) اے انسان! اپنے نامۂ اعمال کو پڑھ۔ آج تو خود اپنے حساب وکتاب کے لیے کافی ہے۔ اور جہاں تک ان فرشتوں کے تقرر کی مصلحت کا تعلّق ہے اس سلسلہ میں حضرت صادق آلِ محمد علیہ السلام کی اس حدیث کا بیان کر دینا ہی کافی ہے جسے صاحب تفسیر صافی نے احتجاج طبرسی سے نقل کیا ہے۔ آنجناب سے یہی سوال کیا گیا تھا کہ جب خداوند عالم تمام ظاہری و باطنی امور کو خود جانتا ہے تو پھر اس نے یہ فرشتے کیوں مقرر فرمائے ہیں۔ آنجناب نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ اللہ سبحانہ نے ان فرشتوں سے یہ خدمت لی ہے اور ان کو اپنی مخلوق پر گواہ قرار دیا ہے تاکہ بندے یہ خیال کر کے کہ اللہ تعالیٰ کے ملازم ان کے ساتھ ہیں۔ اطاعت خدا پابندی سے بجا لائیں اور معصیت سے رُکے رہیں۔ اور اکثر بندے ایسے ہیں کہ کسی برائی کا ارادہ کرتے ہیں تو فرشتوں کی موجودگی یاد کر کے رُک جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار ہمیں دیکھتا ہے اور جو ہم پر گواہ مقرر ہیں وہ بھی ہمیں دیکھتے ہیں۔

چالیس برس کے بعد نگرانی کا شدید ہونا

کتابتِ اعمال کا یہ سلسلہ اگرچہ سن بلوغ کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے لیکن بعض احادیث سے مُستفاد ہوتا ہے کہ سن بلوغ سے لے کر چالیس سال تک حکم خداوندی کے تحت گرفت زیادہ شدید نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس عمر میں گناہ کرنے کے داعی و محرکات بہت زیادہ ہوتے ہیں لیکن جب چالیس سال مکمل ہو جائیں اور رخش عمر اس سے آگے بڑھنے لگے تو فرشتوں کو وحی الٰہی ہوتی ہے کہ اب نگرانی کڑی اور گرفت شدید کر دو۔ اور ہرگز اس کی کوئی رعایت نہ کرو اور یہ سختی اس لیے ہے کہ اس عمر کے بعد شہوت اور گناہ کے محرکات طبعاً کم ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو شخص اس کے باوجود بھی اس وقت گناہ کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بہت ہی شقی و بدبخت اور دین کے معاملہ میں سہل انگیز ہے۔ بعض روایات میں وارد ہے کہ جب انسان کی داڑھی سفید ہو جائے اور اب بھی بدستور سابق گناہوں میں مشغول رہے تو شیطان اس کے سامنے آکر کہتا ہے: "بابی وجھا لا یفلح" میرا باپ قربان ہو ایسے چہرہ پر جو کبھی فلاح و رستگاری حاصل نہیں کرے گا اور کہتا ہے تو ہی تو میری امید اور آرزو ہے۔ معصومؑ فرماتے ہیں: "انی لا عجب کل العجب من رجلین و اللہ یبغضھما فقیر متکبر و شیخ زان"۔ مجھے دو شخصوں سے سخت تعجب ہے جنھیں خداوند عالم دشمن سمجھتا ہے۔ ایک وہ جو باوجود فقیر و نادار ہونے کے تکبّر کرے اور دوسرا وہ جو باوجود بڑھاپے کے زنا کرے۔

حالت مرض میں بدستور اعمالِ صالحہ کا لکھا جانا اور گناہوں کا نہ لکھا جانا

خداوند عالم کے انعام و احسان کو کون شمار کرسکتا ہے (و ان تعدوا نعمة اللہ لا تحصوھا۔ ابراھیم: ۳۴) مُتعدد احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب انسان بیمار پڑ جاتا ہے تو خداوند عالم نیکیاں لکھنے والے فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ جب تک یہ بندہ میری قید میں گرفتار ہے اس کے وہ تمام اعمالِ صالحہ بدستور لکھتے رہو جو یہ صحت و سلامتی کے وقت بجا لاتا تھا۔ اور جب تک یہ تندرست نہ ہو جائے اس کی کوئی برائی نہ لکھو۔ اس مضمون کی بکثرت روایات اصول کافی بحار الانوار جلد ۱۴ وغیرہ میں موجود ہیں۔ چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا کہ جب ملائکہ بارگاہِ رب العزت میں جاتے ہیں تو ارشاد ہوتا ہے کہ میرے بندہ کے متعلق کیا لکھ کر لائے ہو۔ فرشتے عرض کرتے ہیں: فقط اس کا شکوہ و شکایت ہی معرض تحریر میں لائے ہیں۔ اس وقت ارشاد باری ہوتا ہے کہ اگر میں اپنے بندے کو قید میں مُبتلا کروں اور پھر اسے شکوہ و شکایت سے بھی روک دوں تو اس طرح میں

نے اپنے بندے کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ اے فرشتو! جب تک وہ بیمار ہے اس کے اعمال صالحہ اسی طرح لکھتے رہو جس طرح اس کی صحت کی حالت میں لکھتے تھے اور جس وقت تک میں اسے قید سے رہا نہ کروں تم اس کی کوئی بدی درج نہ کرو۔

اسی طرح دوسری روایت میں جناب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: "اذا امرض المومن اوحی اللہ عز و جل الی صاحب الشمال لا تکتب علی عبدی ما دام فی حبسی و وثاقی ذنبا و یوحی الی صاحب الیمین ان اکتب لعبدی ما کنت تکتب لہ فی صحتہ من الحسنات"۔ یعنی جب بندۂ مومن بیمار ہو جاتا ہے تو خداوند عالم بائیں طرف والے فرشتے کو حکم دیتا ہے کہ جب تک میرا بندہ میری قید میں مُبتلا ہے اس کا کوئی گناہ نہ لکھ اور دائیں طرف والے فرشتے کو وحی فرماتا ہے کہ تو بدستور اس کی وہ نیکیاں لکھتا رہ جو اس کی صحت کی حالت میں لکھتا تھا۔ ع

اس مرحمت پہ کون نہ مر جائے اے خدا

ایک نیکی کے عوض دس نیکیاں اور سات گھنٹے تک برائی کے نہ لکھے جانے کا بیان

یہ امر بھی مُتعدّد روایات سے ثابت ہے جیسا کہ متن رسالہ میں مذکور ہے کہ خدا نے اپنے خُصوصی مراحم والطاف سے کتابتِ اعمال کا سلسلہ کچھ اس طرح قائم کیا ہے کہ نیکی کرنے سے قبل فقط اس کا ارادہ کرنے سے ہی ایک نیکی نامہ اعمال میں درج کر لی جاتی ہے اور کرنے کے بعد ایک کی دس لکھی جاتی ہیں، اور برائی بجا لانے کے بعد بھی سات گھنٹے تک نہیں لکھی جاتی۔ اگر اس اثناء میں گنہگار توبہ کر لے تو فبہا، ورنہ ایک کی ایک برائی درج کی جاتی ہے۔ (ثالث بحار الانوار ملاحظہ ہو) وغیرہ۔

یا ایھا الانسان ما غرک بربک الکریم

باب الاعتقاد
فی العدل

قال الشیخ ابوجعفران اللہ تبارك و تعالیٰ امرنا بالعدل و عاملنا بما هو فوقه و هو التفضل و ذلك

چوبیسواں باب
عدلِ خداوندی کے متعلق اعتقاد

حضرت شیخ ابوجعفر علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ خداوند عالم نے ہمیں عدل و انصاف کرنے کا حکم دیا ہے اور وہ خود ہمارے ساتھ وہ عمدہ سلوک کرتا ہے جو عدل سے بھی بڑھ کر ہے۔ جس کا نام تفضّل ہے

چوبیسواں باب
خُداوندِ عالم کے عُدل کے متعلق عقیدہ

عدل کے لغوی و اصطلاحی معنی کی وضاحت

عدل کے لغوی معنی ہیں: "وضع الشئ فی محله" یعنی ہر شے کو اس کے محل و مقام پر رکھنا۔ اور اس کے بالمقابل ظلم کے معنی ہیں: "وضع الشئ فی غیر محله" کسی شے کو بے محل رکھنا۔ عرفِ عام میں عدل کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ جو شخص اپنے عمل و کردار پر جس قدر جزا کا مستحق ہے اسے اسی قدر جزا دینا اور ظلم یہ ہے کہ اسے اس کے استحقاق سے کم دینا۔ لہٰذا خداوند عالم کے عادل ہونے کے یہ معنی ہیں کہ عقلاء کی نگاہ میں جو کام عقلاً واجب اور مستحسن ہیں ان کو ترک نہیں کرتا اور نہ ہی کسی فعل شنیع و قبیح کا ارتکاب کرتا ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ فرزند رسولؐ! عدلِ خداوندی کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا: "ان لا تنسب الی ربك مالامك علیه" یعنی اپنے خالق و مالک کی طرف کسی بھی ایسے قول یا فعل کی نسبت نہ دو جس پر اس نے تمھاری ملامت کی ہے۔ (توحید شیخ صدوقؒ)

عقیدۂ عدلِ باری ضروریاتِ مذہبِ شیعہ میں سے ہے

یہ اعتقاد رکھنا کہ خداوند عالم عادل ہے اور ظالم نہیں ہے۔ بایں معنی کہ نہ واجب کو ترک کرتا ہے اور نہ کسی عقلی فعل قبیح کا ارتکاب کرتا ہے، نہ اپنے احکام میں ظلم و جور کرتا ہے اور نہ اپنی قضا و قدر میں زیادتی، نہ کسی کو اس کی طاقتِ برداشت سے زیادہ تکلیف دیتا ہے اور نہ بالکل شترِ بے مہار کی طرح ان کو مُطلق العنان چھوڑتا ہے۔ فرمانبرداروں کو ضرور جزا و ثواب دیتا ہے اور گنہگاروں کو اس نے

انه عزو جل یقول من جاء بالحسنة فله عشر امثالها و من جاء بالسیئة فلا یجزی الا مثلها وهم لا یظلمون والعدل

اس امر کی دلیل یہ ہے کہ وہ خود فرماتا ہے جو شخص ایک نیکی بجالائے گا اسے دس گنا نیکیوں کا ثواب دیا جائے گا اور جو ایک برائی کرے گا اسے صرف ایک ہی بدی کی سزا ملے گی اور ان پر ہرگز ظلم وستم نہیں کیا جائے گا (سورۃ انعام: ۱۶۰) عدل تو یہ تھا کہ ایک نیکی کے عوض

عذاب جہنم کی وعید وتہدید فرمائی ہے۔ اب اسے اختیار ہے چاہے تو ان کو سزا دے (یہ اس کا عین عدل وانصاف ہے) اور چاہے تو معاف کر دے، یہ اس کا لطف وکرم ہے۔ نیز وہ اپنے بندوں کو افعالِ خیر یا شر پر مجبور بھی نہیں کرتا۔ ان ضروریاتِ مذہب شیعہ اور عقائد صحیحہ میں سے ہے جن کا منکر و دائرۂ مذہب سے خارج سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اسی عقیدہ پر توحید کی تکمیل اور دیگر بہت سے عقائد مُہمّہ مثلاً نبوت وامامت اور قیامت کا اثبات موقوف ہے۔ کیونکہ جب تک خالق عالم کو عادل تسلیم نہ کیا جائے اس وقت تک برابر یہ احتمال قائم رہے گا کہ ممکن ہے من جانب اللہ جس قدر انبیاء ومرسلین آتے رہے ہیں وہ (معاذ اللہ) سب کے سب اپنے دعویٰ میں صادق نہ ہوں۔ اور خدا نے (خاک بدہن قائل) فعل قبیح کا ارتکاب کرتے ہوئے ان کے ہاتھوں پر معجزات ظاہر کرکے ان کی غلط تصدیق کر دی ہو۔ اس طرح ان کی نبوت مشکوک ہو کر رہ جائے گی۔ ظاہر ہے کہ جب اس طرح نبوت انبیاء ثابت نہ ہو سکی تو اوصیاء کی وصایت وامامت کیونکر ثابت ہو سکے گی؟ اسی طرح پھر خدا کے وعدہائے جنّت اور وعیدہائے جہنم سے بھی اعتماد اٹھ جائے گا۔ اور یہی انجام عقیدۂ قیامت کا ہوگا۔ جب وہ عادل ہیں نہیں تو پھر نیکوں کو جزا اور بروں کو سزا دینا کیا ضروری ہے۔ **خلاصہ** یہ کہ اس طرح تمام نظامِ شریعت ہی درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ اور انبیاء علیہم السلام کی غرض بعثت فوت ہو جائے گی۔ اور مقصدِ خلقت ضائع ہو جائے گا۔ لیکن بایں ہمہ حضرات مجبرہ اور اشاعرہ خداوند عالم کو عادل نہیں سمجھتے۔ اور نہ وہ کسی ایسے حسن وقبح کے قائل ہیں جن کے ترک یا ارتکاب پر خدا پر اعتراض وارد ہو۔ یہ حضرات مذکورہ بالا مفاسد اور خرابیوں سے ہرگز گلو خلاصی نہیں کرا سکتے اور نہ ہی ان اشکالات کا کوئی معقول جواب دے سکتے ہیں۔ بہرحال اگرچہ عدل باری کے اثبات میں بہت کچھ عقلی ونقلی ادلہ قائم کیے جا سکتے ہیں لیکن چونکہ اختصار مدنظر ہے اور سابقہ مبحث توحید میں اس پر فی الجملہ تبصرہ کیا جا چکا ہے تفصیل کے لیے اس مقام کی طرف رجوع کیا جائے۔ یہاں اسی مقدار پر اکتفا کی جاتی ہے۔

☆

هو ان يثيب بالحسنة الحسنة و يعاقب على السيئة السيئة قال النبي ﷺ لا يدخل رجل الجنة بعمله الا برحمة الله عز و جل ۔	ایک نیکی کا ثواب دیتا، اور ایک بدی کے بدلہ ایک بدی کا عقاب کرتا۔ پیغمبر اسلام ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: کوئی بھی شخص اپنے اعمال کی وجہ سے جنّت میں داخل نہیں ہوسکتا جب تک کہ رحمتِ خداوندی اس کے شامل حال نہ ہو۔

خداوندعالم کے افعال کا مبنی بر تفضّل ہونا

مُتعدّد آیات وروایات سے ثابت ہوتا ہے کہ خداوندعالم اس قدر رؤف و رحیم ہے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ فقط عدل کا برتاؤ ہی نہیں بلکہ تفضّل و لطف والا سلوک کرتا ہے۔ کیونکہ عدل تو اس امر کا نام ہے کہ جو شخص جس قدر جزا یا سزا کا مستحق ہے اسے اسی قدر جزا یا سزا دی جائے اور تفضّل یہ ہے کہ اجر وثواب تو استحقاق سے زائد عطا کیا جائے لیکن سزا استحقاق سے کم دی جائے۔ قرآن و حدیث پر نظر رکھنے والے حضرات پر یہ حقیقت واضح ہے کہ خداوندعالم کے افعال تفضّل پر مبنی ہیں۔ چنانچہ امام زین العابدین علیہ السلام دعائے وداع ماہِ رمضان میں فرماتے ہیں: انك بنيت افعالك على التفضل و اجريت قدرتك على التجاوز (صحیفہ کاملہ) بارِالٰہا! تونے اپنے افعال کی بنا تفضّل ومہربانی پر اوراپنی قدرت کی بناء عفو و درگزر پر رکھی ہے۔ اوراس امر کے ثبوت میں قرآن مجید کی بیسیوں آیات پیش کی جاسکتی ہیں، جن میں سے ایک آیت تو وہی ہے جو متن رسالہ میں مذکور ہے کہ جو شخص ایک نیکی کرتا ہے اسے اس کا دس گنا اجر وثواب ملتا ہے اور جو ایک برائی کرتا ہے اسے ایک ہی برائی کی سزا دی جاتی ہے۔ اس سلسلہ کی دوسری آیت وہ ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ راہِ خدا میں کچھ مال صرف کرتے ہیں انھیں اس کا سات سَو گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ اجر وثواب ملتا ہے۔ چنانچہ ارشادِ قدرت ہے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ (سورۃ البقرۃ:۲۶۱)

جو لوگ اپنے مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان (کے خرچ) کی مثل اس دانہ کی سی مثل ہے جس کی سات بالیاں نکلیں (اور) ہر بالی میں سو (سَو) دانے ہوں اور خدا جس کے لیے چاہتا ہے دونا کردیتا ہے اور خدا بڑی گنجائش والا (اور ہر چیز سے) واقف ہے۔

تیسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ (سورۃ البقرۃ : ۲۴۵)

ہے کوئی جو خدا کو قرضِ حسنہ دے تا کہ خدا اس کے مال کو اس کے لیے کئی گنا بڑھا دے۔

چوتھے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ط (سورۃ یونس: ۲۶)

جن لوگوں نے بھلائی کی ان کے لیے بھلائی ہے اور کچھ بڑھ کر۔

اسی طرح کئی احادیث میں یہ مذکور ہے کہ جب آدمی کسی نیک کام کے انجام دینے کا ارادہ کرتا ہے تو اسی ارادہ پر ایک نیکی اس کے نام لکھ دی جاتی ہے اور جب کر گزرتا ہے تو ایک کی دس لکھی جاتی ہیں۔ اور جب برائی کی انجام دہی کا ارادہ کرے تو جب تک نہ کرلے اس کے نامۂ اعمال میں وہ برائی درج نہیں کی جاتی بلکہ ارتکابِ معصیت کے بعد بھی سات گھنٹے تک مہلت دی جاتی ہے۔ اگر اسی اثناء میں توبہ کر لے تو ہرگز وہ گناہ نہیں لکھا جاتا۔ اور اگر لکھ بھی لیا جائے تب بھی بعد ازاں توبہ و استغفار کرنے یا شفاعت کبریٰ کی وجہ سے اسے وہ جرم معاف کر دیا جاتا ہے۔ (اس مضمون کی بکثرت روایات تفسیر برہان جلد ۴ میں مذکور ہیں) بہر کیف یہ حقیقت اسلامیات پر نگاہ رکھنے والے حضرات پر واضح و عیاں ہے۔ اس لیے اس پر زیادہ شواہد و دلائل پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ؏

آنجاکہ عیاں است چہ حاجت بیان است

تفضّل الٰہی کے بغیر کوئی شخص نجات حاصل نہیں کر سکتا

ہم نے مبحث شفاعت میں اپنے اس نظریہ کا اظہار کیا تھا کہ کوئی بھی شخص خواہ جس قدر متقی و پرہیز گار ہو، اس کا خداوند عالم کے تفضّل و تکرم اور جناب رسولِ خداؐ اور ائمہ ہدیٰؑ کی شفاعتِ کبریٰ کے بغیر داخل جنّت ہونا مشکل ہے۔

اس باب کے آخر میں نیز اٹھارھویں باب میں ایک مقام پر جناب مصنّف علامؒ نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کر لیا ہے۔ اس لیے ہم یہاں اس پر کچھ مزید مختصر سا تبصرہ کرتے ہیں۔ اس امر کی وجہ بالکل ظاہر ہے کہ کوئی شخص چاہے جتنا بھی عبادت گزار و شب زندہ دار ہو مگر جب اس کے حسنات کا خداوند عالم کے احسانات و انعامات کے ساتھ موازنہ کیا جاتا ہے تو یقیناً خدائی نعمات کا پلہ بہت بھاری نظر آتا ہے۔ ارشادِ قدرت ہے:

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (سورۃ ابراھیم: ۳۴)

اگر تم خداوند عالم کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو شمار نہیں کر سکتے۔

لہٰذا جب بنص آیت قرآنی کوئی شخص خداوند عالم کی نعمتوں کو شمار بھی نہیں کر سکتا تو ان کا شکریہ کس طرح ادا کر سکتا ہے؟ اور جب اس کی نعمتوں کا شکریہ نہیں ادا کر سکتا تو جنّت کا استحقاق کس طرح پیدا کر سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر اطاعت الٰہی بجا لاتا ہے تو یہ بھی خدائے کریم کی ایک نعمت ہے جس پر اس کا شکر ادا کرنا واجب ہے۔ چنانچہ بعض اخبار و آثار میں وارد ہے کہ جب حضرت ایوبؑ ضیاع مایہ وشماتت ہمسایہ سے دل تنگ ہو گئے تو بارگاہِ ایزدی میں عرض کیا: یا اللہ! صرف میں ہی تو تیرا ایک عبد شاکر تھا اور تو نے مجھے اس قدر مصائب و آلام میں مُبتلا کر دیا ہے۔ ارشادِ قدرت ہوا: اے ایّوب! یہ بتاؤ یہ شکر ادا کرنے کی تجھے توفیق کس نے دی تھی؟ عرض کیا: بارالٰہا! تو نے۔ ارشاد ہوا: پھر تم یہ احسان کیا جتا رہے ہو کہ میرا شکر ادا کرتے ہو۔ (خزینۃ الجواہر)

ارشادِ قدرت ہے:

يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ۖ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰكُمْ لِلْاِيْمَانِ (سورة الحجرات:۱۷)

اے رسولؐ! یہ لوگ تیرے اوپر احسان دھرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے، ان سے کہہ دو کہ مجھ پر احسان نہ دھرو، بلکہ یہ تو اللہ سبحانہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے ہی ایمان کی طرف راہبری کی۔

منت منه که خدمتِ سلطان همی کنی　　منت ازو شناس که بخدمت گزاشتت

اسی لیے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام اپنی دعائے استقالہ ذنوب وطلب عفو از عیوب میں بطور تعلیم المسئلہ فرماتے ہیں: یا الٰهی لو بكيت اليك حتی تسقط اشفار عينی و انتحبت حتی ينقطع صوتی و قمت لك حتی تنتشر و اقدامی و ركعت لك حتی ينخلع صلبی و سجدت لك حتی تتفقأ حدقتای و اكلت تراب الارض طول عمری و شربت ماء الرماد آخر دهری و ذكرتك فی خلال ذلك حتی يكل لسانی ثم لم ارفع طرفی الی افاق السماء استحياء منك ما استوجبت بذلك محو سيئة واحدة من سيئاتی و ان كنت تغفرلی حين استوجب مغفرتك و تعفو عنی حين استحق عفوك فان ذالك غير واجب لی باستحقاق و لا انا اهل له باستيجاب اذ كان جزائی منك فی اول ما عصيتك النار فان تعذبنی فانت غير ظالم لی الٰهی فاذقد تغمدتنی بسترك فلم تفضحنی و تأنيتنی بكرمك فالم تعاجلنی و حلمت عنی بتفضلك فلم تغير نعمتك علی و لم تكدر معروفك عندی فارحم طول تضرعی و شدة مسكنتی و سوء موقفی (صحیفہ کاملہ صفحہ ۱۷۲ و ۱۷۳ ترجمہ جناب مفتی جعفر حسین صاحب)

بارِ الٰہا! یہ میری گردن ہے، جسے گناہوں نے جکڑ رکھا ہے، تو رحمت نازل فرما محمدؐ اور ان کی آلؑ پر اپنے عفو و درگزر سے، اسے آزاد کردے، اور یہ میری پشت ہے جسے گناہوں نے بوجھل کر دیا ہے تو رحمت نازل فرما محمدؐ اور ان کی آلؑ پر، اور اپنے لطف و انعام کے ذریعہ سے اسے ہلکا کردے۔ بارِ الٰہا! اگر میں تیرے سامنے اتنا روؤں کہ میری آنکھوں کی پلکیں جھڑ جائیں اور اتنا چیخ چیخ کر گریہ کروں کہ آواز بند ہوجائے اور تیرے سامنے اتنی دیر کھڑا رہوں کہ دونوں پیروں پر ورم آجائے اور اتنے رکوع کروں کہ ریڑھ کی ہڈیاں اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں اور اس قدر سجدے کروں کہ آنکھیں اندر کو دھنس جائیں اور عمر بھر خاک پھانکتا رہوں۔ اور زندگی بھر گدلا پانی پیتا رہوں اور اس اثنا میں تیرا ذکر اتنا کروں کہ زبان تھک کر جواب دے جائے۔ پھر شرم و حیا کی وجہ سے آسمان کی طرف نگاہ نہ اٹھاؤں تو اس کے باوجود میں اپنے گناہوں میں سے ایک گناہ کے بخشے جانے کا بھی سزاوار نہ ہوں گا۔ اور اگر تو مجھے بخش دے جب کہ میں تیری مغفرت کے لائق قرار پاؤں، اور مجھے معاف کر دے جب کہ میں تیری معافی کے قابل سمجھا جاؤں تو یہ میرے استحقاق کی بنا پر لازم نہیں ہوگا، اور نہ میں استحقاق کی بنا پر اس کا اہل ہوں۔ کیونکہ میں نے پہلے پہل تیری معصیت کی تو میری سزا جہنم طے تھی۔ لہٰذا تو مجھ پر عذاب کرے تو میرے حق میں ظالم نہیں ہوگا۔ اے میرے معبود! جب کہ تو نے میری سزا جہنم طے کی تھی لہٰذا تو مجھ پر عذاب کرے تو میرے حق میں ظالم نہیں ہوگا۔ اے میرے معبود! جب کہ تو نے میری پردہ پوشی کی اور مجھے رسوا نہیں کیا، اور اپنے لطف و کرم سے نرمی برتی اور عذاب میں جلدی نہیں کی اور اپنے فضل سے میرے بارے میں حلم سے کام لیا ہے اور اپنی نعمتوں میں تبدیلی نہیں کی۔ اور نہ اپنے احسان کو مکدر کیا ہے۔ تو میری اس طویل تضرع و زاری اور سخت احتیاج اور موقف کی بدحالی پر رحم فرما۔

پس معلوم ہوا کہ اگر خداوند عالم لوگوں کے گناہ معاف کرتا ہے یا انہیں نیکیوں کی جزا دیتا ہے تو یہ محض اس کا تفضّل و احسان ہے ورنہ کوئی شخص اپنے اعمال کی وجہ سے مستحق جنّت نہیں قرار پا سکتا۔

اس سلسلہ میں بھی حضرت امام رابعؑ کی دعائے اعترافِ ذنب و طلب توبہ ہماری راہبری کرتی ہے۔ فرماتے ہیں: "یا من وعدهم علی فنسه بتفضله حسن الجزاء"۔ اے وہ خدا جس نے بندوں کو جزائے خیر دینے کا جو ذمہ لیا ہے وہ محض تفضّل کی بنا پر ہے۔ اور جناب سرور کائنات ﷺ کی وہ فرمائش جو متن رسالہ میں اسی باب کے آخر میں مذکور ہے وہ بھی اس مسئلہ میں نص صریح اور دلیل فصیح ہے۔

وفیه کفایة لمن له ادنی درایة

باب الاعتقاد	پچیسواں بابؒ
فی الاعراف	اعراف کے متعلق اعتقاد
قال الشیخ اعتقادنا فی الاعراف انه سور بین الجنة و النار	حضرت شیخ ابن بابویہ فرماتے ہیں کہ اعراف کے متعلق ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ وہ جنّت اور جہنم کے درمیان ایک دیوار

پچیسواں بابؒ

اعراف کے متعلق عقیدہ

فی الجملہ مقامِ اعراف کے موجود ہونے کا عقیدہ اتفاقی ہے۔ ہاں البتہ اس مقام پر تین امور کے متعلق علمائے اسلام کے درمیان قدرے اختلاف ہے۔ ① حقیقتِ اعراف کیا ہے؟ ② اصحابِ اعراف کون حضرات ہیں؟ ③ مقامِ اعراف میں کون لوگ رہیں گے؟ چنانچہ حضرت مُصنّف علام نے ان تینوں امور کی طرف اجمالاً اشارہ فرمایا ہے۔ ہم ذیل میں اسی موضوع پر قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں گے۔

حقیقتِ اعراف کیا ہے؟

اوّل: یہ کہ اس سے مراد وہ "سور" (دیوار) ہے جو جنّت و جہنم کے درمیان ہوگی۔ یہی قول علماء میں مشہور ہے۔ اور اسی قول کو حضرت مُصنّف علام نے اختیار کیا ہے اور اس قول کی تائید آیات وروایات سے بھی ہوتی ہے۔ ارشادِ قدرت ہے: فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُورٍ لَّهُ بَابٌ ۖ بَاطِنُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهُ مِن قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿۱۳﴾ (سورۃ الحدید:۱۳) پھر ان کے بیچ میں ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا (اور) اس کے اندر کی جانب تو رحمت ہے اور باہر کی طرف عذاب۔ اس (سور) کی تفسیر اعراف سے کی گئی ہے۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے: وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ (سورۃ الاعراف:۴۶) یعنی اہلِ جنّت اور اہلِ جہنم کے درمیان حجاب (پردہ) ہوگا۔ اس حجاب کی تفسیر بھی اعراف سے کی گئی ہے۔

دوم: یہ کہ اعراف سے مراد اسی حصار و حجاب کے کنگرے ہیں۔

و علیه رجال یعرفون کلا بسیماھم و الرجال ھم النبی و اوصیائه	ہے جس پر چند مقدس بزرگوار تشریف فرما ہوں گے جو ہر شخص کو اس کی نشانیوں سے پہچان لیں گے (اعراف:۴۶) اور یہ حضرات جناب رسولِ خداؐ اور ان کے اوصیاء برحق ہوں گے۔

سوم: یہ کہ اس سے مراد وہ ٹیلے ہیں جو جنّت و جہنم کے درمیان واقع ہیں۔
چہارم: یہ کہ اس سے مراد پل صراط ہی ہے۔
پنجم: یہ کہ اس سے مراد ائمہ اہلِ بیتؑ ہیں۔

سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے یہ تمام اقوال نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے: "و اول اشہر و اظہر است" (حق الیقین) اگر بنظرِ غائر ان اقوال کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت ان میں کوئی بنیادی اِختلاف نہیں ہے بلکہ سب کا مآل و مرجع ایک ہی حقیقت کی طرف ہے۔ فقط اندازِ بیان مختلف ہے۔ مقصد صرف یہ بیان کرنا ہے کہ جنّت و جہنم کے درمیان ایک ایسا مقام ہے جس میں نہ تو لذائذ جنّت موجود ہیں اور نہ ہی شدائد جہنم، بلکہ وہ ایک بین بین مقام ہے، جسے مختلف اسماء سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے کہ وہ جنّت و جہنم کے درمیان حائل ہے، اسے "سور" و "حجاب" کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اس اِعتبار سے کہ وہ ہماری دیواروں کی طرح باریک نہیں، بلکہ کافی وسیع اور قابلِ رہائش ہے۔ اس کو مکان سے تعبیر کر دیا گیا ہے اور اس وجہ سے کہ وہ بلند و بالا اور ٹیلہ نما ہے، اسے ٹیلہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور چونکہ اعراف جمع ہے عرف (بفتح العین) کی جس کے معنی لغتِ عرب میں یالِ اسپ اور تاجِ خروس کے ہیں۔ اس مناسبت سے سور و حصار کے بالائی حصہ (کنگروں) کو اعراف کہا گیا ہے۔ اس بیان سے معلوم ہوا کہ ان اقوال میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں بلکہ ان سب نظریات کی بازگشت اسی طرف ہے کہ اعراف وہ مقام ہے جس کو نہ تو پوری طرح جنّت کہا جاسکتا ہے اور نہ ہی اسے پوری طرح جہنم قرار دیا جاسکتا ہے۔ کما قیل: ؎

حورانِ بهشتی را اعراف بود دوزخ   از دوزخیاں پرس که اعراف بهشت است

باقی رہا ان اقوال چہارگانہ کا قول پنجم کے ساتھ اختلاف تو یہ فقط تفسیر ظاہری و باطنی والا اختلاف ہے۔ یعنی پہلے چار قول اعراف کی ظاہری تفسیر ہیں اور پانچواں قول اس کی باطنی تفسیر ہے۔ چنانچہ مولانا سید عبداللہ شبر نے حق الیقین میں بعض ایسی روایات نقل کرنے کے بعد جن میں ائمہ اہل بیتؑ کو اعراف سے تعبیر کیا گیا ہے، فرمایا ہے: "و لفهم من هذا الخبر و نحوه ان الاعراف یطلق علی معان

و لا یدخل الجنة الا من عرفهم و عرفوه و لا یدخل النار الامن	جنّت میں وہی شخص داخل ہوگا جس کو یہ بزرگوار پہچانتے ہوں گے اور وہ انھیں پہچانتا ہوگا، اور جہنم میں وہی لوگ جائیں گے جو ان کی معرفت نہیں رکھتے ہوں اور نہ یہ بزرگوار ان سے واقف ہوں گے۔

عدیدۃ و بہ یجمع بین الاخبار و اللہ اعلم "۔ یعنی اس حدیث اور ہمچو قسم کی دیگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اعراف کا اطلاق متعدد معانی پر ہوتا ہے۔ اور اس طرح مختلف احادیث میں جمع ہوجاتی ہے۔ واللہ العالم۔

اصحابِ اعراف کون بزرگوار ہوں گے؟

اتنا تو مسلّم ہے کہ مقامِ اعراف پر کچھ حضرات بروزِ قیامت موجود ہوں گے جو تمام لوگوں کو علامات سے پہچانتے ہوں گے کہ ان میں جنتی کون ہیں اور جہنمی کون؟ جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے:

وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ (سورۃ الاعراف: ۴۶)

یعنی مقامِ اعراف میں کچھ لوگ موجود ہوں گے جو ہر شخص کو اس کی علامات سے پہچان لیں گے کہ (وہ جنتی ہے یا دوزخی ہے)

ہاں اس سلسلہ میں اگر کچھ اختلاف ہے تو یہ ہے کہ وہ بزرگوار کون ہوں گے؟ علماء امامیہ کثرہم اللہ فی البریہ میں زیادہ مشہور یہ قول ہے جیسا کہ متن رسالہ میں اس سلسلہ میں مذکور ہے کہ ان "رجال" سے مراد جناب سید المرسلین اور ائمہ طاہرین صلوات اللہ علیہ وعلیہم اجمعین ہیں، جو وہاں حاکم ہوں گے اور اعراف کے بالائی حصہ پر یاقوت احمر کے دریچہ میں تشریف فرما ہوں گے۔ (جیسا کہ بصائر الدرجات میں حضرت صادق علیہ السلام سے مروی ہے) حقیقی اہل ایمان کو سب سے پہلے بہشت عنبر سرشت کی طرف روانہ فرمائیں گے۔ اور ان کو پل صراط سے بآسانی گزاریں گے اور کفار و مشرکین اور نواصب و خوارج کو سب سے پہلے جہنم میں بھیجیں گے اور باقی گنہگار شیعہ اور عام مستضعفین وہاں رہیں گے اور انجام کار جو قابل شفاعت ہوں گے وہ ان حضرات کی شفاعت سے داخل جنّت ہوں گے اور جو نا قابل شفاعت ہوں گے وہ ہمیشہ اعراف میں رہیں گے۔ یہ مضمون متعدد روایات معتبرہ میں وارد ہے۔ چنانچہ تفسیر "مجمع البیان" اور "بصائر الدرجات" میں جناب اصبغ بن نباتہ سے مروی ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھا کہ ابن کوا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آیت مبارکہ: "وعلی الاعراف رجال" کی تفسیر آپ سے

انکرہم و انکروہ و عند الاعراف المرجون لامراللہ اما یعذبھم و اما یتوب علیھم	مقامِ اعراف میں کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو امرالٰہی کے منتظر ہوں گے کہ آیا خدا انھیں عذاب میں گرفتار کرتا ہے (اور داخل دوزخ کرتا ہے) یا ان پر مہربانی فرماتا ہے (اور جنّت میں داخل فرماتا ہے)

دریافت کی۔ آپؑ نے فرمایا:

ویحك یابن الکواء نحن نوقف یوم القیامة بین الجنة و النار فمن نصرنا عرفناہ بسیماہ فادخلناہ الجنة و من ابغضنا عرفناہ بسیماہ فادخلناہ النار"

افسوس ہے تیرے لیے اے ابن کوا! ہم (اہل بیتؑ) بروزِ قیامت جنّت و جہنم کے درمیان (اعراف پر) کھڑے کیے جائیں گے۔ پس جس شخص نے ہماری نصرت اور ہم سے دوستی کی ہوگی ہم اس کو علامت سے پہچان لیں گے اور اسے جنّت میں داخل کریں گے اور جس نے ہم سے بغض و عداوت کی ہوگی اس کو بھی علامت سے شناخت کرلیں گے اور اسے داخل جہنم کریں گے۔

- دوسرا قول یہ ہے کہ ان سے مراد رضوان جنّت اور خازن جہنم ہیں جو مردوں کی شکل میں متمثل ہوکر وہاں کھڑے ہوں گے۔
- تیسرا قول یہ ہے کہ ان سے مراد کراماً کاتبین ہیں۔ اور......
- چوتھا قول یہ ہے کہ ان سے مراد بعض فضلاء مومنین ہیں۔

ان اقوال میں سے جو قول زیادہ مشہور اور احادیث معصومینؑ سے مؤید و منصور ہے وہ پہلا قول ہی ہے۔ دوسرے اقوال کی تائید چونکہ ارشاداتِ معصومینؑ سے نہیں ہوتی اس لیے وہ نا قابل قبول ہیں۔ کلما لم یخرج عن ھذا البیت فھو زخرف۔

اصحابِ اعراف کی معرفت باعثِ دخولِ جنّت اور عدم معرفت باعثِ دخولِ نار ہے

جب یہ امر ثابت ہوگیا کہ اصحابِ اعراف سے مراد جناب رسولِ خدؐا اور ائمہؑ ہدیٰ ہیں تو اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ جنّت یا جہنم میں جانے کا معیار و میزان ان بزرگواروں کی معرفت یا عدم معرفت ہے۔ جیسا کہ مُصنّف علام نے ذکر فرمایا ہے۔ اس مضمون کی مُتعدّد احادیث شریفہ تفسیر برہان، ہفتم بحار الانوار اور بصائر الدرجات وغیرہ کتب تفسیر و حدیث میں مذکور ہیں۔

رزقنا اللہ معرفتھم و ثبتنا علیھا فی الدنیا و الاخرۃ

اعراف میں کون لوگ رہیں گے؟

اب رہی اس امر کی تحقیق کہ اعراف میں کون لوگ مقیم ہوں گے، اس سلسلہ میں بھی چند قول ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ گنہگار شیعہ ہوں گے۔ دوم یہ کہ وہاں وہ لوگ ہوں گے جن کے حسنات و سیئات برابر ہوں گے۔ لہٰذا وہ اپنے اعمال کی وجہ سے نہ مستحق جنّت ہوں گے اور نہ مستوجب جہنم۔ لہٰذا وہ اس مقام پر رکھے جائیں گے جو نہ پوری طرح جنّت ہے اور نہ جہنم۔ بلکہ ان کے بین بین ہے۔ سوم یہ کہ وہاں وہ لوگ رکھے جائیں گے جو دارِ دنیا میں شرعاً مکلّف ہی نہ تھے، جیسے اطفال (بچے) و مجانین (دیوانے) وامثالہم۔ چہارم یہ کہ وہاں مستضعفین رہیں گے۔ مستضعفین میں چند قسم کے لوگ داخل ہیں: ① جو ضعیف العقل ہونے کی وجہ سے حق و باطل کے درمیان کما حقہ امتیاز نہ کر سکتے ہوں۔ جیسے کمزور عقل والی عورتیں اور سادہ لوح عوام مرد۔ ② وہ لوگ جو زمانہ فترت (دو نبیوں کی بعثت کے درمیان والے زمانہ) میں گزرے ہوں۔ ③ جو لوگ کسی ایسی جگہ پر ہوں جہاں انھیں حجّتِ خدا کے ظہور کی اطلاع ہی نہ ملی ہو۔ ④ وہ لوگ جنھیں اختلافِ مذاہب کا علم نہ ہو، یا اگر ہو بھی تو وہ حق و باطل کے درمیان امتیاز نہ کر سکنے کی وجہ سے کسی غلط مذہب کی اتباع کرتے رہے۔ ⑤ وہ سیدھے سادے کم علم و دانش رکھنے والے مُسلمان جو نہ تو اہلِ بیتؑ کی پوری معرفت اور ان کی حقیقی محبّت رکھتے ہوں اور نہ ہی ان کے مُسلمہ دشمنوں سے دوستی رکھتے ہوں۔ یہی ہیں وہ لوگ جو آیتِ مبارکہ: وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾ (سورۃ التوبۃ: ۱۰۶) "اور کچھ اور لوگ ہیں جو حکم خدا کے امیدوار کیے گئے ہیں (اس کو اختیار ہے) خواہ ان پر عذاب کرے یا ان پر مہربانی کرے اور خدا (تو) بڑا واقف کار حکمت والا ہے" کے مصداق ہیں، اہلِ اعراف کے متعلق یہ چار قول گو بظاہر باہم مختلف ہیں۔ لیکن درحقیقت ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ کیونکہ اخبار و آثار اور علمائے ابرار مثل مُحقق موید حضرت شیخ مُفیدؒ، وحضرت علامہ مجلسیؒ ومولانا سید عبداللہ شبر وغیرہم کی تحقیقاتِ انیقہ سے جو کچھ واضح و آشکار ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ تمام مذکورہ بالا طبقات برو زِحشر پہلے مقامِ اعراف میں ٹھہرائے جائیں گے، پھر ان میں سے جو قابلِ شفاعت ہوں گے وہ جناب رسولِ خدا اور ائمہ ہدیٰ علیہ و علیہم السلام کی شفاعتِ کبریٰ سے جنّت میں داخل کیے جائیں گے اور جو ناقابلِ شفاعت ہوں گے انھیں ہمیشہ ہمیشہ وہیں رکھا جائے گا۔

تفسیر قمی میں بسند مُعتبر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے جس کا ماحصل یہ ہے،

فرمایا: ائمہ طاہرینؑ مقام اعراف میں موجود ہوں گے اور ان کے کامل شیعہ بلاحساب داخلِ جنّت ہو رہے ہوں گے۔ اور وقت حضراتِ ائمہؑ اپنے گنہگار شیعوں سے فرمائیں گے: اپنے بھائیوں کو جنّت میں دیکھو، جو بلاحساب داخل ہو رہے ہیں۔ اس وقت گنہگار شیعہ ان کو خطاب کرکے کہیں گے: سلام علیکم لم یدخلوھا و ھم یطمعون (اعراف: ۴۶) تم پر سلامتی ہو، وہ داخلِ جنّت نہیں ہوں گے لیکن یہ طمع رکھتے ہوں گے (کہ شفاعت نبیؐ و ائمہؑ کے ذریعہ سے داخلِ جنّت ہوں گے) پھر ارشادِ ائمہؑ ہوگا: ذرا جہنم میں اپنے مخالفین کو بھی دیکھو۔ چنانچہ وہ ان کو دیکھ کر پکار اٹھیں گے: ربنا لا تجعلنا مع القوم الظالمین۔ (اعراف: ۴۷) بارِ الہا! ہمیں ظالم قوم کے ساتھ جمع نہ کر۔ نادی اصحاب الاعراف رجالا یعرفونھم بسیماھم قالوا ما اغنی عنکم جمعکم و ما کنتم تستکبرون (اعراف: ۴۸) اس وقت اصحابِ اعراف (یعنی جناب رسولِ خداؐ اور ائمہ ہدیٰؑ) ان (جہنمی) لوگوں کو خطاب کرکے فرمائیں گے جن کو وہ مخصوص علامات سے پہچانتے ہوں گے کہ دیکھو تمھیں تمھاری جمعیّت وکثرت (جس پر تم کو فخر و ناز تھا) اور تمھارے تکبّر اور بڑائی نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ رزقنا اللہ تعالیٰ شفاعۃ النبی و آلہ الطاہرین صلوات اللہ علیہ و علیہم اجمعین۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

اس مقام پر یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک شخص اپنے اعمالِ صالحہ کی وجہ سے جنّت میں داخل ہوتا ہے اور ایک شفاعت نبیؐ و امامؑ کی وجہ سے داخل جنّت ہوتا ہے، حالانکہ اس کے اعمالِ صالحہ بقدر استحقاق نہیں تو اس طرح دونوں کی مساوات لازم آئے گی جو کہ عدلِ خداوندی کے منافی ہے۔ اس شبہ کا جواب بنابرتسلیم ایں کہ کوئی شخص بغیر فضل وکرم ایزدی محض اپنے اعمال سے مستحق جنّت قرار پاسکتا ہے، یہ ہے کہ یہ شبہ اس وقت لازم آتا جب کہ ان ہر دو حضرات کا جنّت میں ایک ہی درجہ و مقام پر ہوتا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ واضح ہے کہ جنّت کے مختلف مراتب و مدارج ہیں۔ ہر شخص اپنے اعمالِ صالحہ کے تفاوت واختلاف کے مطابق مختلف مراتب پر فائز ہوگا۔ اس طرح یہ مزعومہ مساوات لازم نہیں آتی۔ یہی شبہ اصل شفاعت پر بھی عائد ہوسکتا ہے۔ اور اس کا تحقیقی جواب بھی یہی ہے جو صاحبانِ عقل وانصاف کی تسکین اضطراب اور اطمینانِ قلب کے لیے کافی وشافی ہے۔

العاقل یکفیہ الاشارۃ و البلید لا ینفعہ الف عبارۃ

○

باب الاعتقاد

فی الصراط

قال الشیخ ابوجعفر اعتقادنا فی الصراط حق و انه جسر جهنم و انه ممر جمیع الخلق قال الله عزو جل

چھبّیسواں بابؑ

صراط کے متعلّق اِعتقاد

حضرت شیخ ابو جعفر علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ صراط کے متعلّق ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ وہ حق ہے اور یہ کہ وہ جہنم کے اوپر (اس کے عبور کرنے کے لیے) ایک پُل ہے جو تمام مخلوقِ خدا کی گزرگاہ ہے۔ چنانچہ خداوندعالم اس سلسلے

چھبّیسواں بابؑ

پُل صراط کے متعلّق عقیدہ

پُل صراط کے مفہوم کی وضاحتؒ

صراط کے لغوی معنی راستہ کے ہیں اور اِصطلاحِ شریعت میں صراط اس پُل کا نام ہے جو بروزِ قیامت دوزخ کے اوپر قائم کی جائے گی۔ جس کا ایک سرا میدانِ محشر میں اور دوسرا سرا جنّت کے ساتھ ملا ہوا ہوگا، جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہوگی۔ ہر ایک مُکلّف کو خواہ نیک ہو یا بد، نبی ہو یا وصی، غرضیکہ بروزِ قیامت تمام اولین و آخرین کو اسے عبور کرنا پڑے گا۔ یہی مطلب ہے آیت مبارکہ: "وان منکم الا واردھا" (سورہ مریم :۷۱) کا کہ تم سب کو جہنم میں وارد ہونا، پُل صراط کے برحق ہونے کا عقیدہ ضروریاتِ دین میں سے ہے۔ جس پر تمام فرقہائے اِسلام کا باوجود اپنے اِختلافِ فکر ونظر کے اتفاق ہے اور اس پر آیاتِ مبارکہ اور روایاتِ متواترہ دلالت کرتی ہیں۔

پُل صراط کے متعلّق ایک تاویلِ علیل

بعض علماء نے پُل صراط سے وہ دینی راستہ مراد لیا ہے جو مستقیم ہے۔ اور فردوسِ نگاہ و خوشنودیٔ خدا تک پہنچانے والا ہے۔ اس میں نہ افراط ہے اور نہ تفریط۔ اور اس راستہ سے مراد شریعت اسلامیہ محمدیہ ہی ہے جو بتوسط ائمۂ ہدیٰ ہم تک پہنچی ہے۔ اسی پر مومنین موقنین کو چلنا اور اس کے مطابق عمل کرنا آسان ہے۔ مگر کفار و منافقین اور نواصب و خوارج و غلاۃ کو اس پر چلنا اور عمل درآمد

وان منکم الا واردھا کان علی	میں فرماتا ہے تم سب کو جہنم پر ضرور وارد ہونا ہے اس امر کا پورا کرنا
ربك حتما مقضيا والصراط فی	تمہارے پروردگار کے لیے لازمی اور حتمی ہے (سورہ مریم :۷۱) اور
وجه اخر اسم حجج الله فمن	صراط ایک دوسرے معنی کے اعتبار سے حجّت ہائے خداوندی کا نام ہے

کرنا اس طرح مُشکل معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اس راستہ پر چلنا جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہو۔

جن حضرات نے اس اِستبعاد کہ جو پُل بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہوگی، اسے لوگ کس طرح عبور کریں گے، سے گھبرا کر پُل صراط کی یہ تاویل علیل کی ہے اور اس طرح درحقیقت پل صراط والے مُسلمہ اسلامی عقیدہ کا انکار کیا ہے۔ انھوں نے سخت غلطی کی ہے۔ اس استبعاد کا جواب تو ہم بعد میں دیں گے، سردست یہ کہنا ہے کہ ان حضرات نے جو یہ کہا ہے کہ صراط سے مراد وہ راستہ ہے جس میں افراط و تفریط نہ ہو، اور وہ سرکار محمدؐ و آلِ محمد علیہم السلام کا راستہ ہے، یہ درست ہے کہ اہل بیتؑ رسولؐ کا بتلایا ہوا طریقہ و راستہ ہی صراط مستقیم پر گامزن ہونے کی دعا ہر ایک مُسلمان نماز پنجگانہ وغیرہ میں مانگتا ہے۔ "اھدنا الصراط المستقیم" لیکن آلِ رسولؐ کے مسلک کو صراطِ مستقیم تسلیم کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ قیامت والے پُل صراط کا انکار کر دیا جائے۔ بہرحال یہ نظریہ ائمۂ دین بلکہ تمام مُسلمین کے مُسلمہ عقیدہ کے مخالف ہونے کی وجہ سے غلط اور ناقابلِ قبول ہے۔ ہاں اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صراط دو ہیں۔ ایک صراط ظاہری جو کہ قیامت کو ہوگی اور ایک صراط باطنی جو کہ معرفت ائمۂ حق اور ان کی متابعت ہے۔ چنانچہ مولانا سید عبداللہ شبرؒ "حق الیقین" میں فرماتے ہیں: وھو صراطان ظاھری وھو ما ذکر و باطنی وھو النبی والائمة کما ورد عنھم نحن الصراط۔ یعنی صراط دو ہیں۔ ایک ظاہری جو کہ اوپر مذکور ہوئی (جہنم پر ایک مخصوص پُل ہے) اور دوسری باطنی۔ اور اس سے مراد جناب رسولِ خداؐ اور ائمۂ ہدیٰؑ ہیں، جیسا کہ ان کا ارشاد ہے ہم صراط ہیں۔ اس اخروی صراط سے وہی سلامتی کے ساتھ گزر سکیں گے جنھوں نے دنیا میں امام برحق کو پہچان کر ان کی اطاعت کی ہوگی۔ اس امر کے ثبوت میں کہ صراط دو ہیں مُتعدّد روایتیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ لیکن بنظر اختصار فقط ایک مُعتبر روایات درج کی جاتی ہے۔ چنانچہ کتاب معانی الاخبار شیخ صدوق علیہ الرحمہ میں جناب مُفضل بن عمر سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے صراط کے متعلّق سوال کیا، آپؑ نے فرمایا: ھو الطریق الی معرفة الله عزوجل۔ یعنی صراط سے مراد

عرفهم فی الدنیا و اطاعهم اعطاه الله جوازاً علی الصراط الذی هو جسر جس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص دنیا میں ان کی معرفت حاصل کرے گا اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری کرے گا خداوند عالم قیامت اور حسرت و ندامت کے روز اس شخص کو اس صراط سے جو جہنم کا پل ہے گزرنے کا

معرفت خداوندی حاصل کرنے کا راستہ ہے۔ پھر فرمایا: و هما صراطان فی الدنیا و صراط فی الاخرة، واما الصراط الذی فی الدنیا فهو الامام المفترض الطاعة من عرفه فی الدنیا و اقتدی بهداه مر علی الصراط الذی هو جسر جهنم فی الاخرة و من لم یعرفه فی الدنیا زلت قدمه عن الصراط فی الاخرة فتردی فی نار جهنم۔ صراط دو ہیں۔ ایک دنیا میں اور ایک آخرت میں۔ جو صراط دنیا میں ہے اس سے مراد امام مفترض الطاعت ہیں۔ پس جو شخص دنیا میں ان کی معرفت حاصل کرے گا، اور ان کے نقش قدم پر چلے گا وہ اس پل سے بآسانی گزر جائے گا، جو آخرت میں جہنم کے اوپر ہوگی۔ اور جو شخص دنیا میں امام برحق کی معرفت حاصل نہیں کرے گا تو اس کا قدم پُل صراط سے پھسل جائے گا اور وہ آتش جہنم میں گر کر ہلاک ہوجائے گا۔ نیز کتاب "معانی الاخبار" میں حضرت امیرؑ سے مروی ہے، فرمایا: الصراط المستقیم صراطان صراط فی الدنیا و صراط فی الاخرة الصراط المستقیم فی الدنیا فهو ما قصر من الغلو و ارتفع عن التقصیر و استقام فلم یعدل الی شئ من الباطل و اما الصراط فی السفرة فهو طریق المومنین الی الجنة الذی هو مستقیم لا یعدلون عن الجنة۔ صراط مستقیم دو ہیں۔ ایک دنیا میں ہے اور دوسرا آخرت میں۔ جو صراطِ مستقیم دنیا میں ہے اس سے مراد وہ راستہ ہے جو غلو سے کم اور تقصیر سے بلند، بالکل سیدھا ہو، اور باطل کی طرف بالکل جھکا ہوا نہ ہو۔ اور جو صراط آخرت میں ہے اس سے مراد اہلِ ایمان کا وہ راستہ ہے جو سیدھا جنّت کو جاتا ہے جس پر چل کر وہ جنّت سے نہیں بھٹکیں گے۔

پُل صراط سے گزرنے کی وجہ

پل صراط سے اس طرح تمام مکلّفین کو گزارنے کے حقیقی اسرار و رموز کا علم تو اسی ذاتِ ذوالجلال کو ہے جس نے یہ سلسلہ قائم کیا ہے لیکن اس کی وجہ جو کچھ سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس طرح جو لوگ مستوجب دوزخ ہوں گے وہ تو کٹ کر اس میں گر جائیں گے اور جو مستحق جنت ہوں گے وہ جب ان ہولناک منازل اور اندوہ ناک مناظر سے گزر کر جنّت ایسے آرام دہ اور آسائش رساں مقام پر پہنچیں گے تو ان کی نگاہ میں جنّت کی قدر و منزلت اور بڑھ جائے گی اور ان کو حد سے زیادہ فرحت و انبساط حاصل ہوگا۔ کیونکہ یہ مُسلمہ قاعدہ ہے کہ اس نعمت کی قدر و قیمت جو محنت و مُشقت اٹھانے

جھنم یوم القیامة یوم الحسرة و الندامة و قال النبیؐ لعلی یا علی و اذا کان یوم القیامة اقعد انا و انت	پروانہ راہداری مرحمت فرمائے گا۔ حضرت رسولِ خدا ﷺ نے جناب امیرالمومنین علی علیہ السلام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اے علی! قیامت کے روز میں تم اور

کے بعد حاصل کی جائے یقیناً اس نعمت سے زیادہ ہوتی ہے جو بغیر تعب و تکلیف کے حاصل ہو جائے۔ اس طرح ان کو خداوند عالم کے مراحم و الطاف کا بھی صحیح اندازہ ہو جائے۔ نیز اس طرح بعض لوگوں کے باقی ماندہ گناہوں کو کفارہ ادا ہو جائے گا جو شدائد برزخ کے بعد بھی بچ گئے ہوں گے۔

وان تعدوا نعمت اللہ لا تحصوھا واللہ العالم باسرار افعالہ

ایک شُبہ اور اس کا ازالہ

یہاں ایک مشہور شبہ وارد کیا جاتا ہے کہ جب پُل صراط کی حقیقت وہ ہے جو اوپر بیان ہوئی کہ وہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے تو پھر اسے عبور کرنا ناممکن ہو جائے گا اور بنا بر تسلیم امکان جب اس سے انبیاءؑ و اوصیاءؑ اور کامل مومنین گزریں گے تو ان کو آتش جہنم سے اذیت و تکلیف ہوگی۔ حالانکہ ان بزرگواروں کے متعلق عذاب و عقاب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وہ شبہ ہے جس سے متاثر ہو کر بعض اہل علم نے صراط کی کئی مختلف تاویلیں کی ہیں لیکن علماء محققین کے نزدیک یہ طریقہ بالکل غلط اور ناپسندیدہ ہے۔ اگر اس قسم کے شبہات و استبعادات سے متاثر ہو کر حقائق و ظواہر شریعت کی تاویل سازی شروع کر دی جائے تو شریعت اسلام کا مقدس چہرہ مسخ ہو کر رہ جائے گا۔ بہر حال بلا ضرورت شدیدہ یہ تاویل سازی جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے اسی مقام پر بحارالانوار جلد ۳ میں فرمایا ہے: "و تاویل الظواھر الکثیرة بلا ضرورة غیر جائز"۔ ظواہر شرعیہ کی تاویل بلا ضرورت جائز نہیں ہے۔ اسی طرح انہی سرکار نے اپنے رسالہ اعتقادیہ میں فرمایا ہے: "لابد ان تومن بکل ما ورد علی لسان الشرع من الصراط و المیزان و جمیع احوال القیامة و اھوالھا و لا تووله بشئ الا بما ورد تاویله عن صاحب الشرع فان اول الکفر و الالحاد التصرف فی النور حیص الشرعیة بالعقول الضیفة و بالاھواء الروئیة"۔ لازم ہے کہ تمام حقائق پر اسی طرح ایمان رکھا جائے جس طرح وہ زبانِ شریعت میں وارد ہوئے ہیں، جیسے صراط، میزان اور قیامت کے دیگر تمام حالات اور شدائد اور ان کی تاویل کرنا سوائے اس کے جس کی تاویل خود صاحبِ شریعت سے وارد ہو جائز نہیں ہے۔ کیونکہ پہلا کفر و الحاد یہی ہے کہ اپنے عقولِ ناقصہ اور آراء فاسدہ کی بنا پر نصوصِ شریعت

و جبرئیل علی الصراط فلا یجوز علی الصراط الامن کانت معه برائة بولایتك | اور جبرئیلؑ پُل صراط پر بیٹھیں گے۔ پس وہاں سے وہی شخص گزر سکے گا جس کے پاس تمھاری ولایت و محبّت کی سند ہوگی

میں تصرف بے جا کر کے ان کی تاویل کی جائے۔

بہر کیف اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک انبیاءؑ اور اوصیاءؑ کے عبور کرنے کا تعلق ہے تو جو شخص ان ذواتِ قدسی صفات کے احوال و خصائص سے واقف ہے وہ ہرگز ایسا شبہ پیش نہیں کرسکتا۔ کیونکہ جب وہ ہوا میں اڑ سکتے ہیں اور پانی پر چل سکتے ہیں تو پُل صراط سے گزرنے میں انھیں کیا مُشکل در پیش آسکتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ خرقِ عادت ہی ہے جو کہ ان کا ہمیشہ کا معمُول ہے۔ اور جہاں تک دوسرے اہل ایمان کے گزرنے کا تعلق ہے ان کے لیے بھی قدرت اس مُشکل مرحلہ کو یوں آسان کر دے گی کہ مومنین کرام اپنے اپنے اعمالِ صالحہ کی مقدار کے مطابق کچھ بجلی کی طرح، کچھ ہوا کی طرح، کچھ تیز رو گھوڑے کی طرح، اور بعض افتاں وخیزاں وہاں سے گزر جائیں گے۔ یہ تفصیل کوئی اپنی عقلی اختراع نہیں بلکہ احادیثِ معصومینؑ سے مُستفاد ہے۔ چنانچہ امالی شیخ صدوق علیہ الرحمہ وغیرہ کتب میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: "الناس یمرون علی الصراط طبقات و الصراط ادق من الشعرۃ واحد من حد السیف فمنہم من یمر مثل البرق و منہم من یمر مثل عدد الفرس و منہم من یمر حبوا و منہم من یمر مشیئا و منہم من یمر متعلقا قد تاخذ النار منه شیئا و تترك شیئا"۔ یعنی پُل صراط بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے، اور جو لوگ اس سے گزریں گے وہ مختلف قسم کے ہوں گے۔ کچھ تو بجلی کے کوندنے کی طرح تیزی کے ساتھ گزر جائیں گے اور کچھ اسپ رفتاری سے عبور کر جائیں گے اور کچھ لوگ گھٹنے ٹیک کر اور کچھ آہستہ آہستہ چل کر پار ہوں گے۔ اور بعض لوگ اس طرح اس کے ساتھ چمٹ کر گزریں گے کہ آتش جہنم ان کو جھلس دے گی (جو اُن کے باقی ماندہ گناہوں کا کفارہ ہوجائے گا)

پس معلُوم ہوا کہ یہ شبہ قدرتِ خدا سے عدم واقفیّت کا نتیجہ ہے۔ ورنہ جو خدا علیٰ کل شئ قدیر ہے اس کے لیے ایسا کرنا اور لوگوں کو گزرنے کی قدرت عطا کرنا ہرگز کوئی مُشکل کام نہیں ہے۔

ایک اور شبہ اور اس کا جواب

جنّت آسمان اور جہنم زمین پر ہے تو یہ پُل صراط کس طرح رکھی جائے گی اور عبور کی کیا صورت ہوگی؟ اس شبہ کے جواب میں سرکار علامہ مجلسیؒ کی تحقیق انیق کا پیش کر دینا ہی کافی ہے جو انھوں نے

اخبار آلِ رسولؐ کے بحار میں غواصی کر کے پیش فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں: "الذی یظھر لی من الایات و الاخبار ھو ان اللہ تعالیٰ بعد خرق السماوات و طیھا ینزل الجنۃ و العرش قریبا من الارض فیکون سقف الجنۃ العرش لا یبعد ان یکون ھذا ھو المراد بقولہ تعالیٰ و ازلفت الجنۃ للمتقین و تحول البحا رنیراناً فیوضع الصراط من الارض الی الجنۃ و الاعراف درجات و منازل بین الجنۃ و النار و بھذا فیدفع کثیر من الاوھام و الاستبعادات التی یخطر فی اذھان" ۔ آیات و اخبار سے جو کچھ مجھ پر ظاہر ہوا ہے وہ یہ ہے کہ خداوند عالم آسمان کو فنا کرنے کے بعد جنّت اور عرش کو زمین کے قریب اتار دے گا۔ یہاں تک کہ جنّت کی چھت عرش ہوگا اور بعید نہیں کہ اس قولِ خداوندی کہ جنّت متّقیوں کے لیے آراستہ پیراستہ کی جائے گی، (سورہ تکویر: ۱۳) سے یہی مقصود ہو۔ اور اس وقت سمندر آگ بن جائیں گے، (سورہ تکویر: ۶) تب زمین سے جنّت کی طرف پُل صراط رکھی جائے گی۔ اور اعراف جنّت و دوزخ کے درمیان بعض منازل کا نام ہے۔ اس تحقیق سے بہت سے وہ شبہات و استبعادات جو اس سلسلہ میں کئی لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں دُور ہو جائیں گے۔ "وھو جید و لا ینبئک مثل خبیر"۔

حضرت امیرالمومنینؑ کے پروانہ کے بغیر کوئی شخص پُل صراط عبور نہیں کر سکے گا

کتب فریقین میں آیتِ مبارکہ "وقفوھم انھم مسئولون" (سورۃ صافات: ۲۴) کی تفسیر میں جناب رسولِ خداؐ سے منقول ہے کہ جب لوگ پل صراط سے گزرنے لگیں گے تو اچانک یہ ندا آئے گی کہ: "وقفوھم انھم مسئولون ای عن ولایت علی بن ابی طالبؑ"۔ اے فرشتو! ان لوگوں کو روکو، ابھی ان سے حضرت علی بن ابی طالبؑ کی ولایت و امامت کے متعلق سوال کرنا ہے۔ (ملاحظہ ہو ثالث بحار الانوار و صواعق محرقہ ابن حجر مکی صفحہ ۱۴۷ طبع مصر جدید)

اسی طرح یہ مضمون بھی فریقین کی بعض روایات میں موجود ہے کہ: "لا یجوز احد الصراط الا من کتب لہ علی الجواز"۔ سوائے اس کے جس کے لیے جناب علی مرتضیٰ علیہ السلام پروانۂ راہداری لکھ کر دیں گے۔ (صواعق محرقہ صفحہ ۱۲۴ طبع جدید)

بہر حال روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب رسولِ خداؐ جناب علی مرتضیٰؑ اور دیگر ائمۂ ہدےٰؑ علیہم السلام اس کٹھن منزل میں صراط کے پاس تشریف فرما ہوں گے اور اپنے محبوں کو ان شدائد و مصائب سے نجات دلائیں گے۔ وما علینا الا البلاغ

جعفری باش گر خدا خواہی
و رنہ در ہر طریق گمراہی

باب الاعتقاد

فی العقبات

التی علی طریق المحشر

قال الشیخ ابوجعفرؒ اعتقادنا فی ذلك ان لھذہ العقبات اسم علیحدة فرض او امر او نھی فمتی انتھی الانسان الی عقبة اسمھا الفرض و کان قد قصر فی ذلك الفرض حبس عندھا و طولب بحق اللہ فیھا فان اخرج منه بعمل صالح قدمه او برحمة تدارکه

ستائیسواں باب

عقباتِ محشر

یعنی قیامت کی گھاٹیوں کے متعلق اعتقاد

سرکار شیخ ابو جعفر علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ ان گھاٹیوں کے علیحدہ علیحدہ نام ہیں۔ کسی کو فرض کہتے ہیں، کسی کو امر اور کسی کو نہی کہا جاتا ہے۔ جب آدمی فرض کی گھاٹی کے پاس پہنچے گا تو اگر اس نے اس فرض کی ادائیگی میں کچھ کوتاہی کی ہوگی تو اسے وہاں روک کر اس سے خدا کے حق کا سوال کیا جائے گا۔ پس اگر کسی نیک عمل یا رحمتِ الٰہی کی وجہ سے اس مُشکل مرحلہ سے نکل گیا اور وہاں سے نجات حاصل کر لی تو پھر دوسرے عقبہ کے پاس پہنچ جائے گا۔

ستائیسواں باب

عقباتِ محشر کے متعلق عقیدہ

عقباتِ آخرت کا ثبوت

ان دشوار گزار عقبات کا تذکرہ مختلف طرق و اسانید سے متعدد احادیث میں موجود ہے۔ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام فرمایا کرتے تھے: "تجھزو ارحمکم اللہ فقد نودی علیکم بالرحیل فان بین یدیکم عقبة کمودا مخوفة مھولة لابد من الورد و علیھا و الوقوف عندھا"۔ (نہج البلاغہ) "کوچ کی تیاری کرو۔ خدا تم پر رحم کرے۔ کیونکہ کوچ کی ندا دی جا رہی ہے تمھارے سامنے بہت سی دشوار گزار گھاٹیاں اور خوفناک و ہولناک منزلیں ہیں جن پر تمھیں ضرور وارد ہونا ہے۔ اور ان کے پاس ٹھہرنا بھی ہے"۔ انہی عقبات کئودہ و منازل مخوفہ کی تشریح و توضیح کے لیے مع دیگر بعض علماء کے عمدۃ المحدثین جناب شیخ عباس قمی علیہ الرحمۃ نے ایک مکمل رسالہ بنام "منازل الآخرت" تالیف فرمایا ہے جو قابل دید ہے۔ اور اس کی طرز پر ایک رسالہ عربی میں بنام "مرآۃ الآخرۃ فی منازل الآخرۃ" بھی حال ہی میں نجف

نجی منہا الی عقبة اخری فلا یزال یدفع من عقبة و یحبس عند کل عقبة فیسئل عما تصرفیه من معنی اسمھا فان سلم من جمیعھا انتھی الی دارالبقاء فیحیی حیوة لا یموت فیہا ابداً و یسعد سعادة لاشقاوة معھا و سکن

اسی طرح وہ شخص برابر ہر ایک گھاٹی کے پاس روکا جائے گا اور جس جس امر یا نہی کے متعلق وہ گھاٹی ہوگی اس کے بارے میں کوتاہی اور غفلت کا سوال کیا جاتا رہے گا۔ اس طرح اگر وہ ان تمام عقبات سے صحت و سلامتی کے ساتھ گزر گیا تو پھر وہ ایسے مقام پر پہنچ جائے گا جہاں اسے ایسی حیات جاودانی نصیب ہوگی جہاں کبھی نہیں مرے گا، اور اسے ایسی سعادت ابدی حاصل ہوگی کہ اس میں شقاوت و بدبختی نہ ہوگی

اشرف سے شائع ہوا ہے۔ اصول کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: "الا تحاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبوا فان فی القیامة خمسین موقفا کل موقف مثل الف سنة مما تعدون"۔ یعنی اپنے فعلوں کا خود محاسبہ کرو، قبل اس کے کہ تمہارا حساب لیا جائے۔ کیونکہ قیامت میں پچاس مقامات ایسے ہیں جہاں ہر ایک مقام پر تمہارے دنیوی حساب سے ایک ہزار سال تک رکنا پڑے گا۔ پھر امام عالی مقامؑ نے یہ آیت مبارکہ تلاوت فرمائی: "فی یوم کان مقدارہ خمسین الف سنة"۔ یعنی قیامت کا روز پچاس ہزار سال کا ہوگا۔ ان عقبات کی تفصیل متن رسالہ میں مذکور ہے کہ بعض عُقبٰے فرائض و واجبات کے ہوں گے اور بعض محرمات کے۔ لہٰذا اس کی زیادہ توضیح و تشریح کی ضرورت نہیں۔

یہ عقبات جسمانی ہوں گے یا غیر جسمانی؟

یہاں ایک امر کی طرف اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ عقبہ کے لغوی معنی ہیں: "دشوار گزار گھاٹی" لہٰذا اس لفظ سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ یہ عُقبٰے فی الحقیقت کوئی مجسم دشوار گزار گھاٹیاں ہوں، جیسا کہ اکثر علماء محدثین نے سمجھا ہے۔

لیکن حضرت شیخ مُفید علیہ الرحمہ نے اس کی یہ تاویل فرمائی ہے کہ اس سے مراد واجبات و محرمات ہیں۔ چونکہ واجبات کی ادائیگی اور محرمات سے اجتناب بہت مُشکل ہے اور ان کا حساب و کتاب بھی اسی طرح سخت ہوگا اور اس سے گلو خلاصی کرانا اسی طرح مُشکل ہوگا جس طرح دشوار گزار گھاٹی پر چڑھنا۔ اس لیے بطور کنایہ ان امور کو دشوار گھاٹیوں سے تعبیر کیا گیا ہے، نہ یہ کہ وہاں سچ مچ کوئی پہاڑیاں ہوں گی، جن پر چڑھنا پڑے گا اور ان کو عبور کرنا پڑے گا۔

فی جوار اللہ مع انبیائہ و حججہ و الصدیقین و الشھداء و الصالحین من عبادہ و ان حبس علیٰ عقبۃ فطولب بحق قصر فیہ فلم ینجہ عمل صالح قدمہ و لا ادرکتہ من اللہ تعالیٰ رحمۃ زلت بہ قدمہ عن العقبۃ فھوی فی نار جھنم نعوذ باللہ منھا و ھذہ العقبات کلھا علی الصراط اسم عقبۃ منھا الولایۃ یوقف جمیع الخلائق عندھا فیسئلون عن ولایۃ امیر المومنینؑ و الائمۃ علیھم السلام من بعدہ فمن اتی بھا نجی و جاز و من لم یات بھا بقی فھوی و ذلک قول اللہ عز و جل و قفوھم انھم مسئولون و اسم عقبۃ منھا المرصاد و ھو قول اللہ عز و جل ان ربک لبالمرصاد و یقول اللہ عز و جل بعزتی و جلالی لا یجوز بی ظلم

خدا کے جوارِ رحمت میں نبیوں وصیّوں صدیقوں شہیدوں اور نیک بندوں کے ہمراہ قیام پذیر ہوگا۔ اور اگر اسے کسی ایسے عقبہ کے پاس روکا گیا جس میں اس نے کوتاہی کی ہوگی اور اس سے اس حق کا مطالبہ کیا گیا اور عمل صالح اسے نجات نہ دے سکا، اور نہ ہی رحمتِ خداوندی اس کے شامل حال ہوئی تو اس کا قدم اس گھاٹی سے پھسل جائے گا اور آتش جہنم میں گر پڑے گا۔ ہم جہنم سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں اور یہ عقبات تمام کے تمام پُل صراط کے اوپر ہیں۔ انہی گھاٹیوں میں سے ایک گھاٹی کا نام ولایت ہے، اس کے پاس تمام مخلوقات کو ٹھہرایا جائے گا اور ان سے حضرت امیرالمومنینؑ اور دیگر ائمہ طاہرینؑ کی ولایت کی بابت سوال کیا جائے گا۔ جو شخص درست جواب دے گا، وہ اس گھاٹی سے صحیح وسالم گزر جائے گا اور جو صحیح جواب نہ دے سکے گا، وہ وہیں رہ جائے گا اور آتش جہنم میں گر جائے گا۔ اس بات کا ثبوت خدا کا یہ ارشاد ہے: "ان کو روک لو، کیونکہ ان سے سوال کیا جانا ہے"۔ ان عقبات میں سے ایک عقبہ کا نام مرصاد ہے، جیسا کہ خدا فرماتا ہے: "تمھارا رب کمین گاہ میں ہے"۔ خداوند عالم (حدیث قدسی میں) ارشاد فرماتا ہے مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم کسی ظالم کو ظلم مجھ سے چھوٹ نہیں سکے گا۔ اور انہی عقبوں میں سے ایک عقبہ کا نام رحم

بظاہر تو شیخ مرحوم کی یہ تاویل جمیل اور قرین عقل بھی معلوم ہوتی ہے لیکن حضرت محقق مجلسی علیہ الرحمہ اس کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

"تاویل ظواھر الاخبار بمحض الاستبعاد و بعید عن الرشاد وللہ الخیرۃ فی معاقبۃ العافین بای وجہ اراد" (ثالث بحار الانوار)

ظالم و اسم عقبة منها الرحم و اسم عقبة منها الامانة و اسم عقبة منها الصلوة و باسم کل فرض او امر او نهی عقبه یحبس عندها العبد فیسئل عن کل واحد

ہے، ایک کا نام امانت اور ایک کا نام نماز ہے۔ الغرض ہر ایک فرض، ہر ایک امر اور ہر ایک نہی کے لیے علیحدہ علیحدہ عقبہ ہے۔ جن کے نزدیک آدمی کو روکا جائے گا اور ان میں سے ہر ایک کے متعلق اس سے سوال کیا جائے گا۔

؎ یعنی محض استبعادِ عقلی کی وجہ سے ظواہر اخبار کی تاویل کرنا راہ رشد وصواب سے دور ہے۔ خداوند عالم کو کلی اختیار ہے کہ اپنے گناہ گار بندوں کو جس طرح سے چاہے عذاب وعقاب کرے۔ (دشوار گزار گھاٹیوں سے گزار کر یا کسی اور طریقہ کو اختیار فرما کر) لہٰذا بظاہر ان امور کو ظاہری معنوں پر باقی رکھنا ہی اولیٰ وانسب ہے۔ بلکہ بہتر یہ ہے کہ ان امور پر اجمالی ایمان رکھا جائے۔ جیسا کہ قبل ازیں کئی بار اس مطلب کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے

☆

واللہ الھادی الیٰ سواء السبیل

☆

باب الاعتقاد

فی الحساب والموازین

قال الشیخ اعتقادنا فی الحساب انه حق منه ما یتولاہ اللہ عزو جل و منه ما یتولاہ حجه فحساب الانبیاء و الائمة یتولاہ عزوجل و یتولی کل نبی حساب اوصیائه و یتولی الاوصیاء حساب الامم و اللہ تبارک و تعالیٰ ھو الشھید علی الانبیاء والرسل و ھم الشھداء علی الاوصیاء و الائمة

اٹھائیسواں بابؒ

حسابؒ ومیزان کے بارہ میں اعتقاد

حضرت شیخ ابوجعفر علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ بروزِ محشر حساب کتاب ہونا برحق ہے۔ بعض لوگوں کا حساب براہِ راست خداوندعالم لے گا، اور بعض کا حساب حجت ہائے خدالیں گے۔(اس کی تفصیل اس طرح ہے) کہ انبیاءؑ اور ائمہؑ کے حساب کا متولی خود خدا تعالیٰ ہوگا۔ ہر نبی اپنے اپنے اوصیاء کا حساب لے گا اور امتوں کا حساب انبیاء کے اوصیاء لیں گے۔ خداوندعالم اپنے انبیاء و رسل پر گواہ ہوگا۔ انبیاءؑ و رسلؑ اپنے وصیوں کے گواہ ہوں گے، اور ائمہ اطہار علیہم السلام باقی تمام لوگوں پر گواہ ہوں گے۔

اٹھائیسواں بابؒ

حسابؒ ومیزان کے متعلق عقیدہ

اس باب میں کتنے امور قابل بحث ہیں؟

حضرت مصنّف علام علیہ الرحمہ نے چند مسائل مُہمّہ کو اسی ایک ہی باب میں گڈمڈ کردیا ہے۔ اس باب میں چند مسائل قابل تفکر وتامل ہیں۔ ① حساب کا مفہوم کیا ہے۔ ② حساب کون لے گا۔ ③ کن لوگوں سے حساب لیا جائے گا۔ ④ کن کن چیزوں کا حساب ہوگا۔ ⑤ میزان اعمال سے کیا مراد ہے۔ ⑥ انبیاء و اوصیاء کی گواہی کی کیفیت کیا ہوگی۔ ⑦ انسانی اعضاء و جوارح کس طرح شہادت دیں گے۔

ان مسائل پر اگر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جائے تو غیر معمولی طوالت ہوجائے گی، جس کے لیے کتاب کے اوراق متحمل نہیں۔ لہٰذا اختصار کے ساتھ ان امور پر کچھ تبصرہ کیا جاتا ہے۔

شهداء على الناس و ذلك قوله تعالىٰ فكيف اذا جئنا بك على هولاء شهيداً و قال الله تعالى افمن كان على بينة من ربه و يتلوه شاهد منه

اسی سلسلہ میں خداوند عالم قرآن میں فرماتا ہے: "اس وقت کیا حال ہوگا جب کہ ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور اے رسولؐ تمھیں ان گواہوں پر گواہ بنا کر لایا جائے گا" (النساء: ۴۱) نیز خداوند عالم ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے: "کیا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے کھلی دلیل پر ہو، اور اس کے پیچھے پیچھے ایک گواہ آتا ہو، جو اسی کا جزو ہو" (سورۃ ہود: ۱۷)

حسابؒ کا مفہوم کیا ہے؟

حساب و محاسبہ کا مفہوم اگرچہ محتاجِ وضاحت نہیں ہے، تاہم افادہ عوام کے لیے صرف بیان کیا جاتا ہے کہ حساب اس حقیقت کا نام ہے کہ کسی شخص کے اعمال صالحہ وطالحہ کا جائزہ لینا اور پھر اچھے اعمال پر اس کی مدح وثنا اور برے اعمال پر زجر وتوبیخ کرنا، فارسی میں اس مطلب کو باز پرس سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے: "آں راکہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک است"۔

حساب لینے کا متولی کون ہوگا؟

اگرچہ قرآن وحدیث کے عمومات سے یہی مستفاد ہوتا ہے کہ ہر شخص کا حساب خود خداوند عالم لے گا۔ "وھو اسرع الحاسبین" (یونس: ۲۱) لیکن بعض روایات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ملائکہ کرام اس کام کو انجام دیں گے اور بعض اخبار و آثار سے وہی مطلب ثابت ہوتا ہے جو متن رسالہ میں درج ہے کہ انبیاء کا حساب خود خداوند عالم لے گا، اور انبیاء اپنے اوصیاء کا حساب لیں گے اور اوصیاء اپنے اپنے نبی کی امت کا حساب لیں گے۔ "یوم ندعوا کل اناس بامامھم" (اسراء: ۷۱) (بروز قیامت ہم تمام لوگوں کو ان کے امامِ زمانہ کے ساتھ پکاریں گے) بہت سی روایات میں وارد ہے کہ ہر امام اور اس کے ہم عہد لوگوں کو لایا جائے گا، جس جس آدمی کے ایمان کی وہ گواہی دیں گے وہ نجات پائے گا، اور جس جس کے عدم ایمان کی شہادت دیں گے وہ ہلاک و برباد ہوجائے گا۔ چنانچہ اصول کافی میں آیت مبارکہ: "فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشھد و جئنا بك علی ھولاء شھیدا" (سورۃ النساء: ۴۱) کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: "فی کل قرن منھم امام منا شاھد علیھم و محمد شاھد علینا"۔ یعنی امت محمدیہ میں ہر زمانہ کے اندر ہم میں سے ایک امام شاہد ہے اور

و الشاهد امیرالمومنینؑ و قوله تعالیٰ الینا ایابهم ثم ان علینا حسابهم و سئل الصادقؑ عن قول الله تعالیٰ و نضع الموازین القسط

اس آیت میں شاہد (گواہ) سے مراد حضرت امیرالمؤمنینؑ ہیں ۔ ایک اور مقام پر فرماتا ہے: بندوں کی بازگشت ہماری طرف ہوگی ۔ اور ان کا حساب و کتاب بھی ہمارے ذمہ ہے ۔ خداوند عالم کے اس ارشاد کہ روزِ قیامت ہم عدل و انصاف

جناب رسولِ خداﷺ ہم پر شاہد ہیں ۔ اسی طرح تفسیر عیاشی میں جناب امام زین العابدین علیہ السلام اپنے والد ماجد کے سلسلہ سند سے جناب امیرالمؤمنین علیہ السلام سے روایت فرماتے ہیں کہ آنجناب نے فرمایا: یشهد کل امام علی اهل عالما فانه قد قام فیهم بامر الله عز و جل و دعا هم الی سبیل الله ۔ یعنی ہر زمانہ کا امام اس زمانے والے لوگوں پر گواہی دے گا ۔ کیونکہ اس نے اس کے درمیان رہ کر اپنے وظیفہ الٰہیہ کو انجام دیا تھا اور انھیں راہِ خدا کی طرف دعوت دی تھی ۔ (اس لیے مُطیع و نافرمان انسانوں کے متعلق ان کی شہادت بہت وقیع اور مُعتبر ہوگی) (مجالس برقی)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: "انه لیس من قوم ائتموا بامامهم فی الدنیا الا جاء یوم القیامة یلعنهم و یلعنونه الا انتم و من علی مثل حالکم" ۔ اے مالک جہنی! سوائے تمھارے (شیعوں) اور جس قوم نے بھی دارِ دنیا میں کسی امام کی اقتداء کی ہوگی، وہ اس حال میں بروزِ قیامت آئے گی کہ ان کا امام ان پر لعنت کرتا ہوگا اور وہ امام پر لعنت کرتی ہوگی ۔

امالی شیخ مُفیدؒ میں ایک طویل حدیث شریف حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے، اس کا آخری حصّہ یہ ہے: "ثم ینادی ثانیة این خلیفة الله فی ارضه فیقوم امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیه السلام فیاتی النداء من قبل الله عز و جل یا معشر الخلائق هذا علی بن ابی طالب خلیفة الله فی ارضه حجة علی عباده فمن تعلق بحبله فی الدنیا فلیتعلق بحبله فی هذا الیوم لیستضئ بنوره و لیتبعه فی الدرجات العلیٰ من الجنان قال فیقوم الناس الذین تعلقوا بحبله فی الدنیا فیتبعونه الی الجنة ثم یاتی النداء من عندالله جل جلاله الا من ائتم بامام فی دار الدنیا فلیتبعه الی حیث یذهب به الذین اتبعوا من الذین اتبعوا و راوا العذاب و تقطعت بهم الاسباب ۔ و قال الذین اتبعوا لو ان لنا کرة فنتبرأ منهم کما تبرؤ منا کذالک یریهم الله اعمالهم حسرات علیهم و ما هم بخارجین من النار" ۔

اسی طرح حضرات ائمہ طاہرین علیہم السلام کا اپنے شیعوں کے حساب و کتاب کے متولی ہونے کی بعض نصوص مُعتبرہ مسئلہ شفاعت میں گزر چکی ہیں ۔ ان کا یہاں دوبارہ ذکر کرنا موجب

لیوم القیامۃ فلا تظلم نفس شیئا قال الموازین الانبیاء و الاوصیاء و من الخلق من یدخل الجنۃ بغیر حساب و اما السوال فھو	کے میزان قائم کریں گے اور کسی نفس پر ظلم نہیں کیا جائے گا" (انبیاء: ۴۷) کے متعلق حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ اس جگہ میزانوں سے کیا مراد ہے؟ آپؑ نے فرمایا: میزانوں سے مراد انبیاء واوصیاء ہیں۔ اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوں کے جو بغیر کسی حساب و کتاب کے داخل جنّت ہوں گے۔ البتہ (دین کے بارے میں) سوال ہر شخص سے کیا جائے گا۔

طوالت ہے۔ اس مقام کی طرف رجوع کیا جائے۔ اسی طرح آیت مبارک: "ان الینا ایابھم ثم ان علینا حسابھم" (النساء: ۴۱) کی تفسیر میں ایسی بکثرت روایات مروی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حساب لینے کے متولی ائمۂ اطہارؑ ہوں گے۔ چنانچہ تفسیر فرات کوفی میں حضرت امام موسیٰ کاظمؑ سے مروی ہے، فرمایا: "الینا ایاب ھذا الخلق و علینا حسابھم"۔ ان لوگوں کا حساب وکتاب ہمارے ذمہ ہے۔ اس کتاب میں حضرت صادقؑ سے مروی ہے کہ آپ نے یہ بات پڑھنے کے بعد فرمایا: "فینا" یعنی یہ آیت ہمارے حق میں نازل ہوئی ہے۔ اس قسم کی روایات کا اچھا خاصا ذخیرہ کتاب مُستطاب مرآۃ الانوار و مشکوٰۃ الاسرار معروف بمقدمہ تفسیر بُرہان مؤلفہ حضرت مرزا ابوالحسن الشریف میں جمع کر دیا گیا ہے۔

واللہ العالم بحقائق امورہ ان حججہ فی بلادہ و عبادہ

کن لوگوں کا حساب لیا جائے گا؟

گزشتہ مسئلہ کی طرح اس مسئلہ میں بھی اگرچہ قرآن کی مُتعدّد آیات و روایات کے عمومات سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ ہر شخص کا محاسبہ ہوگا۔ اور ہر شخص سے سوال وجواب ہوگا۔ لیکن بموجب قاعدہ "ما من عام الا وقد خص" بعض آیات و روایات مُعتبرہ سے یہ مُستفاد ہوتا ہے کہ بعض کامل مومنین اور خالص کفار ومشرکین کا حساب نہیں لیا جائے گا۔ اول الذکر بلا حساب داخل جنّت ہوں گے اور ثانی الذکر بلا حساب جہنم میں جھونکے جائیں گے۔ ان دوگروہوں کے علاوہ باقی سب لوگوں کا محاسبہ ہوگا۔ چنانچہ آیت مبارکہ: "یومئذ لا یسئل عن ذنبہ انس و لا جان" (سورۃ الرحمٰن) یعنی "بروزِ قیامت کسی جن وانس سے اس کے گناہوں کا سوال نہ کیا جائے گا" کی تفسیر میں مُتعدّد روایات میں ائمہ طاہرینؑ کا یہ ارشاد موجود ہے کہ یہ شرف جن وانس میں سے خالص شیعوں کو حاصل ہے۔ (تفسیر

واقع علی جمیع الخلق لقول اللہ تعالیٰ فلنسئلن الذین ارسل الیھم و لنسئلن المرسلین یعنی عن الدین و اما الذنب فلا یسئل عنہ

جیسا کہ خداوندعالم ارشاد فرماتا ہے: ہم ان لوگوں سے ضرور سوال کریں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور رسولوں سے بھی ضرور سوال کریں گے (اعراف:۶) یعنی دین کے متعلق۔ لیکن گناہوں کا سوال صرف انہی لوگوں سے کیا جائے گا جن کا

مجمع البیان وصافی اور برہان وغیرہ) اگر اس آیت کو اپنے عموم پر باقی رکھا جائے اور اس کے یہ معنی کیے جائیں کہ بروزِ حشر کسی جن و انس سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا تو پھر اس آیت کا مفہوم ان بیسیوں دوسری آیات و روایات کے مفہوم سے مُتصادم ہوگا جن میں ہر چھوٹے بڑے قول و فعل پر محاسبہ ہونے اور ذرہ ذرہ پر جزا و سزا ملنے کا تذکرہ موجود ہے۔ نیز اس صورت میں حشر و نشر کا بے کار محض ہونا لازم آتا ہے۔ تعالی اللہ عن ذلك علوا کبیرا۔ کفار و مشرکین کے عدم حساب کے متعلق کتاب عیون اخبار الرضا میں امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے، اور وہ جناب اپنے آباء و اجداد طاہرینؑ کے سلسلہ سند سے جناب رسولِ خداؐ سے نقل فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: "ان اللہ عزوجل یحاسب کل الخلق الا من اشرك باللہ عزوجل فانہ لا یحاسب و یؤمر بہ الی النار" یعنی خداوند عالم تمام مخلوق کا حساب لے گا سوائے مشرکین کے۔ کیونکہ ان کا حساب نہ ہوگا، بلکہ ان کو بے حساب جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ اسی طرح اصول کافی میں جناب امام زین العابدین علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: اعلموا عباد اللہ ان اھل الشرك لا تنصب لھم الموازین و لا تنشر لھم الدواوین و انما یحشرون الی جھنم زمرا و انما تنصب الموازین و تنشر الدواوین لاھل الاسلام۔ اے اللہ کے بندو! اچھی طرح سمجھ لو کہ (بروزِ قیامت) مشرکین کے لیے نہ کوئی میزان نصب کیا جائے گا اور نہ ہی ان کا دفترِ اعمال کھولا جائے گا۔ بلکہ بلاحساب انھیں گروہ گروہ کرکے داخلِ جہنم کیا جائے گا۔ ہاں اہل اسلام کے لیے میزان نصب کیا جائے گا، دفترِ اعمال کھولا جائے گا اور ان کا حساب و کتاب بھی ہوگا۔

کن کن چیزوں کا حساب ہوگا؟

اس سلسلہ میں روایات مختلف ہیں۔ لیکن اس قدر یقینی ہے کہ حقوق الناس اور بعض حقوق اللہ کی پرسش ضرور ہوگی۔ اصول کافی وغیرہ کتب مُعتبرہ میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے: "اول ما یحاسب بہ العبد الصلوۃ فان قبلت قبل ما سواھا و ان ردت رد ما سواھا"۔ سب سے پہلے بندہ سے نماز کے متعلق محاسبہ ہوگا۔ پس اگر نماز قبول ہوگئی تو باقی تمام اعمال قبول ہوجائیں گے اور اگر

الا من یحاسب قال اللہ تعالیٰ فیومئذ لا یسئل عن ذنبہ انس و لا جان یعنی من شیعۃ النبی و الائمۃ خاصۃ دون غیرھم کماورد فی التفسیر

حساب لیا جائے گا۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے: اس دن کسی انسان اور جن سے اس کے گناہوں سے متعلق سوال نہیں ہوگا۔ (الرحمٰن: ۳۹) مطلب یہ ہے کہ جو رسول ﷺ اور ائمہ ہدےٰ علیہم السلام کے خالص شیعہ ہیں ان سے کسی گناہ کا سوال نہ ہوگا۔ لیکن ان کے سوا دوسرے لوگوں کی یہ کیفیّت نہ ہوگی، جیسا کہ

....

یہ رد کر دی گئی تو دوسرے سب اعمال بھی رد کر دیے جائیں گے۔ ؎

روزِ محشر کہ جاں گداز بود اوّلیں پُرسش نماز بود

کتاب انوارِ نعمانیہ میں انہی حضرت سے مروی ہے، فرمایا:

اول ما یسئل من العبد اذا وقف بین یدی اللہ عزوجل من الصلوت المفروضات و عن الزکوۃ المفروضۃ و عن الصیام المفروض و عن الحج المفروض و من ولایتنا اھل البیت فن اقر بولانتنا ثم مات علیھا قبلت منہ صلواتہ و صومہ و زکوتہ و حجہ و ان لم یقر بولایتنا بین یدی اللہ عزوجل لم یقبل اللہ عزوجل شیئا من اعمالہ۔

یعنی جب بندہ بارگاہِ ایزدی میں حاضر ہوگا تو سب سے پہلے اس سے واجبی نماز، واجبی زکوۃ، واجبی روزہ، واجبی حج اور ہم اہل بیتؑ کی ولایت کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ (توحید و رسالت کے متعلق سوال نہ کرنے کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ حساب و کتاب ہو ہی مُسلمانوں کا رہا ہے۔ اور مُسلمان وہی ہوگا جو توحید و نبوت و معاد کا قائل ہو۔ شارح) پس اگر وہ ہماری ولایت کا مقر و مُعترف تھا اور اسی عقیدہ پر اس کی موت واقع ہوئی تھی تو پھر اس کی نماز، روزہ، زکوۃ، اور حج وغیرہ سب اعمال قبول ہو جائیں گے۔ لیکن اگر بارگاہِ ایزدی میں اس کا اس طرح اقرار و ولایت ثابت نہ ہوا تو خداوند عالم اس کا کوئی عمل بھی قبول نہ فرمائے گا۔ ولنعم ما قیل:

من لم یوال فی البریۃ حیدرا سیّان عند اللہ صلیٰ او زنیٰ

بعض روایات میں یوں وارد ہے: "اول ما یسئل بہ العبد حبنا اھل البیت" (عیون اخبار الرضاؑ) کہ سب سے پہلے ہم اہل بیتؑ کی محبّت کے متعلق سوال ہوگا۔

"صحیفہ المؤمن ولایۃ علیؑ بن ابی طالبؑ" مومن کے صحیفۂ اعمال کا عنوان ہی ولایتِ علیؑ ہوگا۔

(مودۃ القربیٰ ہمدانی وغیرہ)

و کل محاسب معذب و لو بطول الوقوف و لا ینجو من النار و لا یدخل الجنة احد الا برحمة الله تعالیٰ و ان الله تبارك و تعالیٰ یخاطب عبادہ من الاولین و الآخرین بجمل	اس آیت کی تفسیر میں وارد ہے۔ اور ہر اس شخص کو جس کا کہ حساب ہوگا عذاب کیا جائے گا، اگرچہ یہ عذاب عرصہ محشر میں زیادہ دیر ٹھہرنے کے ذریعہ سے ہی ہو۔ کوئی شخص اپنے اعمال کی بناء پر عذابِ دوزخ سے نجات حاصل نہ کر سکے گا، اور نہ ہی جنّت میں داخل ہو سکے گا، جب تک کہ رحمتِ خداوندی اس کے شامل حال نہ ہوگی۔ خداوندعالم اپنے تمام اولین و

ازالۂ اشتباہ

یہاں یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ پہلی روایت میں قبولیت اعمال کا دارومدار نماز پر رکھا گیا ہے، اور دوسری روایت میں قبولیت اعمال کا معیار ولایتِ اہلِ بیتؑ کو قرار دیا گیا ہے۔ یہ دونوں باتیں کس طرح درست ہو سکتی ہیں؟ اس شبہ کا جواب ظاہر ہے کہ ولایت اہلِ بیت علیہم السلام تمام اعمال (جن میں خود نماز بھی داخل ہے) کی قبولیت کی شرطِ اعظم ہے۔ لیکن نماز فقط دوسرے اعمال کی شرط۔ لہٰذا جب ان دونوں کا مقام و مورد علیحدہ علیحدہ ہے یعنی ولایت کا دائرہ عام اور نماز کا خاص ہے، لہٰذا ان دونوں روایتوں میں کسی قسم کا کوئی تضاد و اختلاف نہیں ہے۔

خصال شیخ صدوق علیہ الرحمہ میں بسلسلۂ سند ائمۂ طاہرین علیہم السلام جناب رسولِ خدا ﷺ سے مروی ہے، فرمایا: "لا تزول قدما عبد یوم القیامة حتی یسئل عن اربع عن عمرہ فیما افناہ و عن شبابه فیما ابلاہ و عن ماله من این کسبه و فیما انفقه و عن حبنا اهل البیت"۔ بروزِ قیامت کسی آدمی کے اس وقت تک دونوں قدم اپنی جگہ سے حرکت نہیں کریں گے جب تک اس سے چار چیزوں کے متعلق سوال نہیں کر لیا جائے گا: ① عُمر کے متعلق کہ اسے کن باتوں میں صرف کیا تھا، ② جوانی کے متعلق کہ اسے کن امور میں کہنہ کیا تھا، ③ مال کے متعلق کہ اسے کہاں سے حاصل کیا تھا اور کہاں خرچ کیا تھا۔ ④ اور ہم اہلِ بیتؑ کی محبت کے متعلق۔

سبحان اللہ! آنحضرت ﷺ نے اپنے ان مختصر مگر جوامع الکلم میں بموجب "دریا بحباب اندر" تمام انسانی اعمال و افعال کے متعلق باز پرس ہونے کا تذکرہ کس عمدہ طریقہ سے بیان کیا ہے۔ زندگی کا وہ کون سا شُعبہ ہے جو ان حدود اربعہ سے خارج ہو؟ اسی طرح آیات و روایات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آنکھ، کان اور دل کے متعلق بھی سوال کیا جائے گا۔ ارشادِ قدرت ہے: "لا تقف ما لیس لك به

حساب عملهم مخاطبة واحدة يسمع منها كل واحد قضيته دون غيرها و يظن انه المخاطب دون غيره و لا تشغلة تعالىٰ مخاطبة عن مخاطبة و يفرغ من حساب الاولين و الأخرين في مقدار نصف ساعة

آخرین بندوں سے ان کے اعمال کے بارے میں ایک ہی خطاب کے ذریعہ ان کا اجمالی طور پر حساب لے لے گا۔ اس خطاب سے ہر شخص اپنا ذاتی معاملہ اچھی طرح سمجھ لے گا کہ (مجھ سے فلاں عمل کے بارے میں پوچھا گیا ہے) اور اسے یہی گمان ہوگا کہ یہ خطاب کسی اور سے نہیں ہے بلکہ مجھ سے ہی ہے۔ خداوند کریم کو ایک شخص سے خطاب کرنا دوسرے کے ساتھ خطاب کرنے سے مانع نہیں ہوتا۔ خلاقِ عالم اپنی اولین و آخرین سب مخلوق کے حساب سے دنیوی ساعات کے اعتبار سے آدھ گھنٹہ میں فارغ ہوجائے گا۔

علم فان السمع و البصر و الفواد كل اولئك كان عنه مسئولا" (سورۃ بنی اسرائیل:۳۶) جس چیز کا علم نہ ہو اس کے متعلق کچھ نہ کہو۔ کیونکہ کان، آنکھ اور دل ان سب کے متعلق سوال ہوگا۔ تفسیر عیاشی وغیرہ میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: "يسئل السمع عما سمع و البصر عما يطرف و الفواد عما عقد عليه"۔ یعنی کان کے متعلق سوال ہوگا کہ اس نے کیا سنا تھا، اور آنکھ کے متعلق یہ پوچھا جائے گا کہ اس نے کیا دیکھا تھا، اور دل کے متعلق یہ دریافت کیا جائے گا کہ اس نے کیا نظریات قائم کیے تھے۔

حقوق الناس کی شدت کا بیان

انوارِ نعمانیہ میں مرقوم ہے کہ بعض روایات میں وارد ہے کہ آدمی کو عرصۂ محشر میں برملا لاکر کھڑا کیا جائے گا، اور ایک منادی ندا کرے گا کہ اے لوگو! جس جس نے اس شخص سے کوئی حق لینا ہو، وہ آئے اور آکر لے جائے۔ اس وقت اہل محشر کے لیے اپنے پہچاننے والوں کو دیکھنے سے زیادہ سخت کوئی چیز نہ ہوگی کہ مبادا اس سے کوئی مطالبہ کریں۔ وارد ہے کہ اربابِ خمس اس کے دامن کو پکڑ لیں گے اور بارگاہِ ایزدی میں عرض کریں گے: "ربنا ان هذا الرجل قد اكل خمسنا و تصرف فيه و لم يدفعه الينا"۔ کہ اس نے ہمارا خمس کھایا اور ہمیں ہمارا حق نہ دیا۔ "و كذلك اهل الزكوة" اسی طرح مستحقین زکوٰۃ اس کے دامن کو پکڑ کر اپنی حق تلفی کی فریاد کریں گے۔ "فيدفع الله اليوم عوضه من حسنات هذا الرجل"۔ خداوند عالم ان حقوق مالیہ کے عوض ان کو اس شخص کی نیکیاں دے گا۔ اسی طرح اگر اس نے کسی اور شخص کی کوئی حق تلفی کی ہوگی تو وہ اٹھ کر اپنے حقوق کا مطالبہ کرے گا۔ اور معاملہ اس قدر سخت

من ساعات الدنیا و یخرج الله تعالیٰ لکل انسان کتاباً یلقه منشورا ینطق علیه بجمیع اعماله لایغادر صغیرة و لا کبیرة الا احصیها فیجعله الله حسیب نفسه و الحاکم علیه بان یقال له اقــرا کتابك کفی بنفسك الیوم علیك

اور اللہ تعالیٰ ہر ایک شخص کا اعمالنامہ اس کے سامنے پیش کرے گا جس کو وہ کھلی ہوئی کتاب کی شکل میں اپنے سامنے دیکھ لے گا۔ وہ کتاب ہر انسان کو اس کی کارروائیوں سے آگاہ کردے گی ۔ اور وہ کتاب اس کے تمام چھوٹے اور بڑے اعمال کو احاطہ کیے ہوئے ہوگی (سورہ کہف:۴۹) اس طرح خداوندعالم ہر شخص کو خود اپنا محاسب اور حکم قرار دے گا۔ اس سے کہا جائے گا کہ تو اپنے اعمال نامے کو پڑھ۔ آج کے دن تو اپنا حساب لینے کے لیے خود ہی کافی ہے ۔ (سورہ بنی اسرائیل:۱۴)

ہوگا کہ محدث جزائری انوار میں فرماتے ہیں: ”وفی الاخبار انه یؤخذ بدانق فضة سبع ماة صلوة مقبولة فیعطاها الخصم“ ۔ یعنی اگر کسی شخص نے کسی کا بقدر چاندی کے ایک ”دانق“ کے (درہم کے چھٹے حصّے کا ایک سکہ۔ مصباح اللغات) نقصان کیا ہوگا تو اس کے معاوضہ میں صاحبِ حق کو اس شخص کی سات سَو مقبول شدہ نمازیں دے دی جائیں گی۔

اللہ اللہ! یہ تو ایک ”دانق“ کے برابر نقصان کرنے اور مخلوقِ خدا کو گزند پہنچانے والوں کی سزا ہے لیکن جن بدبختوں کی تمام عمر گزر اوقات ہی حقوق الناس پر ڈاکا ڈالنے پر رہی ہو، ان کا انجام کیا ہوگا؟ خُصُوصًا جب کہ نیکیوں کا پلہ بھی ہلکا ہو۔ ع

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے؟

اللھـم عفوك عفوك

علل الشرائع وغیرہ میں اس قسم کی بعض احادیث وارد ہیں کہ جب بروزِ قیامت قرض خواہ اپنے مقروض سے تقاضا کرے گا تو اگر مقروض کے پاس نیکیاں ہوئی تو ان سے بمقدار قرضہ قرض خواہ کو دے دی جائیں گی، اور اگر اس کے پاس نیکیاں نہ ہوئی تو قرض خواہ کے گناہ کم کر کے مقروض کے پلے میں ڈال دیے جائیں گے ۔ ایسا ہی ایک طویل حدیث کے ضمن میں مرقوم ہے جو بحوالہ اصول کافی حق الیقین علامہ مجلسی میں مرقوم اور امام زین العابدین علیہ السلام سے منقول ہے، آپ نے ایک سائل کے اس سوال کے جواب میں فرمایا کہ ”فرزندِ رسولؐ! اگر کسی مُسلمان نے کسی کافر سے کوئی حق لینا ہو تو اس کی تلافی کیونکر ہوگی۔ کیونکہ کافر تو جہنمی ہے ۔ اس کے پاس حسنات تو ہیں نہیں؟ آپ نے فرمایا: اس

حسیبا و یختم تبارک و تعالیٰ علی قوم علی افواھھم و تشھد ایدیھم و ارجلھم و جمیع جوارحھم بما کانوا یکتمون و قالوا لجلودھم شھدتم علینا قالوا انطقنا اللہ الذی انطق کل شئ و ھو خلقکم اول مرۃ و الیہ ترجعون و ما کنتم

خداوند عالم ایک گروہ کے موہنوں پر مہر لگا دے گا۔ ان کے ہاتھ پاؤں بلکہ تمام اعضا ان کے اعمال پر جنھیں وہ لوگ چھپا کر کیا کرتے تھے، گواہی دیں گے۔ وہ لوگ اپنے اعضاء سے کہیں گے تم نے کیوں ہمارے خلاف شہادت دی ہے؟ اعضاء کہیں گے ہم کو اسی خدا نے بولنے کی طاقت دی ہے جس نے ہر چیز کو قوتِ گویائی بخشی ہے۔ اسی نے تمھیں پہلی بار پیدا کیا اور اسی کی طرف تمھاری بازگشت ہوگی۔

حق کی مقدار کے مطابق اس کافر کے عذاب و عقاب میں اضافہ کر دیا جائے گا۔ سائل نے عرض کیا اگر کسی نے کسی پر ظلم کیا ہو تو ظلم کا انصاف کیونکر کیا جائے گا؟ فرمایا: ظالم کی نیکیاں بقدرِ ظلم مظلوم کو دیدی جائیں گی۔ سائل نے پھر عرض کیا: اگر اس ظالم کے پاس نیکیاں نہ ہو تو پھر کیا کیا جائے گا؟ فرمایا: مظلوم کے گناہوں کا بوجھ ظالم پر ڈال دیا جائے گا۔

جناب امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں: "ان الذنوب فذنب مغفور و ذنب غیر مغفور و ذنب موجولصاحبہ و نخاف علیہ اما الذنب المغفور فعبد عاقبہ اللہ تعالیٰ علی ذنبہ فی الدنیا فاللہ احکم و اکرم ان یعاقب عبدہ مرتین و اما الذی لا یغفر فظلم العباد بعضھم لبعض فان اللہ تعالیٰ اقسم قسما علی...... نفسہ فقال و عزتی و جلالی لا یجوز لی ظلم ظالم و لو کف بکف و اما الذنب الثالث فذنب سترہ اللہ و رزقہ التوبۃ فاصبح خاشعا من ذنبہ واجیا لہ بہ "۔ (نہج البلاغہ) گناہ تین قسم کے ہیں۔ ایک گناہ وہ ہے جو معاف کر دیا جائے گا۔ دوسرا وہ ہے جو ہرگز معاف نہ ہوگا۔ تیسرا وہ گناہ ہے جس کی بخشش کی امید تو ہے مگر اس کا اندیشہ ضرور ہے۔ پہلی قسم سے مراد وہ گناہ ہے جس کی سزا خدا دارِ دنیا میں دے دے۔ خدا کی ذات اس سے اجل و ارفع ہے کہ دوبارا اپنے بندے کو سزا دے۔ دوسری قسم سے مراد بعض بندوں کا بندوں پر ظلم و جور ہے۔ خداوند عالم نے اپنی عزت و جلالت کی قسم کھائی ہے کہ ظالم کا ظلم مجھ سے تجاوز نہیں کرے گا۔ اگرچہ صرف ہاتھ پر ہاتھ مارا گیا ہو۔ تیسری قسم سے مراد وہ گناہ ہے جسے خدا نے پوشیدہ رکھا ہو۔ اور پھر گنہگار کو توفیق توبہ بھی نصیب ہوگئی ہو۔ یہ وہ گناہ ہے جس کا مرتکب اپنے گناہ سے خائف اور رحمتِ پروردگار کا امیدوار رہے۔

کس قدر مُفلس و بے کس اور بے بس ہوگا وہ انسان، جس کے حسنات بروزِ قیامت دوسروں

تستترون ان تشهد علیکم سمعکم ولا ابصارکم ولا جلودکم ولکن ظننتم ان الله لا یعلم کثیرا مما تعملون و ساجرد کیفیة وقوع الحساب فی کتاب حقیقة المعاد ان شاء الله تعالیٰ

تم اپنے اعمال کو چھپا کر اس وجہ سے نہ کرتے تھے کہ تمھارے خلاف تمھارے کان، آنکھیں اور تمھاری کھالیں گواہی دیں گی، بلکہ تمھارا تو گمان یہ تھا کہ جو کچھ تم کرتے ہو خدا کو ان میں سے اکثر کی خبر نہیں ہوتی (حم السجدہ:۲۲) میں ان شاء اللہ تعالیٰ عنقریب "حقیقۃ المعاد" کے نام سے ایک کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں، جس میں حساب وکتاب کی کیفیت علیحدہ لکھوں گا۔

کی طرف چلے جائیں گے یا دوسروں کے سیئات اس کی طرف منتقل ہو جائیں گے۔ اس لیے روایت میں وارد ہے کہ ایک دفعہ جناب رسولِ خدا ﷺ نے اپنے صحابہ سے دریافت فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ مُفلس و نادار کون ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم میں وہ مُفلس کہلاتا ہے جس کے پاس درہم و دینار اور مال و متاع نہ ہو۔ آپؐ نے فرمایا: "المفلس من امتی من اتی یوم القیامة بصلوة و صیام و زکوة و حج و یاتی قد شتم هذا و اکل مال هذا و سفك دم هذا و ضرب هذا فیعطی هذا من حسناته و هذا من حسناته فان فنیت حسناته قبل ان یقضی ما علیه اخذ من خطایاه فطرحت علیه ثم یطرح فی النار"۔ (انوار نعمانیہ) درحقیقت میری امت میں مُفلس و نادار وہ ہے جو بروزِ قیامت نماز و روزہ، حج و زکوٰۃ کے ساتھ آئے گا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے کسی کو گالیاں دی ہوں گی، کسی کا مال کھایا اور دبایا ہوگا، کسی کو قتل کیا ہوگا، کسی کو مارا پیٹا ہوگا، لہٰذا ان مظلوموں میں سے ہر ایک کو اس کی نیکیوں میں سے نیکیاں دی جائیں گی۔ اور اگر ادائیگی حقوق سے پہلے اس کی نیکیاں ختم ہو گئیں تو ان کے گناہ اس کے پلہ میں ڈال دیے جائیں گے اور پھر اسے آتشِ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

ادائیگی حقوق کی ترغیب

چونکہ حقوق الناس کا معاملہ بہت سخت ہے اس لیے حکماء ربانیین یعنی پیغمبر اسلامؐ اور ائمہؑ طاہرین علیہم السلام نے دارِ دنیا میں حقداروں سے حق بخشوانے یا ان کے حقوق ادا کرنے کی بہت تاکید فرمائی ہے اور اس امر کی بہت ترغیب دی ہے۔ چنانچہ انوارِ نعمانیہ میں آنحضرت ﷺ کی یہ حدیث موجود ہے، فرمایا: "درهم یرده العبد الی الخصماء خیر له من عبادة الف سنة و خیر له من عتق الف نسمة و خیر له من الف حجة و عمرة"۔ یعنی کوئی انسان ایک درہم اپنے طلب گاروں کو واپس کر دے تو یہ ہزار برس کی عبادت، ہزار غلام آزاد کرنے، ہزار حج و عمرہ بجالانے سے بہتر ہے۔ نیز

جزائری مرحوم نے ائمہ علیہم السلام سے مرسلاً نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: "من ارضی الخصماء من نفسه و جبت له الجنة بغیر الحساب و یکون فی الجنة رفیق اسماعیل بن ابراهیم علیهما السلام"۔ یعنی جو اپنے طلب گاروں کو راضی کرے، اس کے لیے بلا حساب جنّت واجب ہوجاتی ہے اور جنّت میں اسے حضرت اسماعیلؑ بن ابراہیمؑ کی رفاقت نصیب ہوگی۔ الی غیر ذلك من الاخبار و الاٰثار۔

تذنیبِ عجیبؒ

ضروریاتِ زندگی پر حساب وکتاب کے ہونے یا نہ ہونے کے بارہ میں اخبار و آثار بظاہر مختلف ہیں۔ اس سلسلہ میں درجِ ذیل تحقیق قابلِ دید ہے۔ سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ ثالث بحارالانوار میں مباحث حساب وکتاب لکھنے کے بعد بعنوان "تذنیب" رقمطراز ہیں:

"اعلم ان الحساب حق نطقت به الاٰیات المتکاثرة و الاخبار المتواترة فیجب الاعتقاد به و اما ما یحاسب العبد به و یسئل عنه فقد اختلف فیه الاخبار فمنها ما یدل علی عدم السؤال عما تصرف فیه من الحلال و فی بعضها لحلالها حساب و لحرامها عقاب و یمکن الجمع بحمل الاولی علی المرضیین و لاخری علی غیرهم اولا ولی علی الامور الضروریة کالماکل و الملبس و المسکن و المنکح و الاخری علی ما زاد علی الضرورة کجمع الاموال زائدا علی ما یحتاج الیه او صرفها فیما لا تدعوه الیه ضرورة و لا یستحسن شرعا و یؤیده بعض الاخبار"۔

یعنی جاننا چاہیے کہ اصل حساب حق ہے۔ اس کے متعلق آیات متکاثرہ اور اخبار متواترہ وارد ہوئے ہیں۔ لہٰذا اس کا اعتقاد رکھنا تو واجب ہے، باقی رہا یہ امر کہ آدمی سے کن کن چیزوں کا محاسبہ کیا جائے گا؟ اس سلسلہ میں اخبار مختلف ہیں۔ بعض روایات میں وارد ہے کہ کھانے، پینے، پہننے کے متعلق جن حلال چیزوں میں بندہ نے تصرف کیا ہوگا، اس کے متعلق اس سے سوال نہیں کیا جائے گا۔ لیکن بعض روایات میں وارد ہے کہ حلالِ دنیا میں حساب اور حرام میں عقاب ہوگا۔ ان دونوں قسم کی روایات میں دو طرح پر جمع ہوسکتی ہے۔ اول: اس طرح کہ پہلی قسم کی روایتوں کو مومنین پر محمول کیا جائے، اور دوسری قسم کو غیر مومنین پر۔ یعنی کامل الایمان لوگوں سے ان اشیاء کا حساب نہیں لیا جائے گا، اور دوسروں سے ان کا محاسبہ ہوگا۔ دوئم: اس طرح کہ پہلی قسم کی روایات کو امورِ ضروریہ مثل کھانے پینے پہننے اور نکاح کرنے پر حمل کیا جائے (کہ ان کا حساب نہیں ہوگا) اور دوسری قسم کی روایات کو زائد از ضرورت صرف کرنے یا بلا ضرورت شرعیہ کسی جگہ (بطور اسراف و تبذیر) خرچ

کرنے (اور بلا ضرورت ان کی جمع آوری میں وقت عزیز ضائع کرنے) پر محمول کیا جائے اور بعض اخبار اس جمع بین الاخبار کی تائید کرتی ہیں"۔ سرکار علامہ کی یہ فرمائش بہت متین بلکہ دُرِّ ثمین ہے۔ وبالقبول قمین۔

بروزِ قیامت خداوند عالم کے احتجاج کا بیان

امالی شیخ مُفید علیہ الرحمہ میں روایت ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے آیت مبارکہ: "قل فللّٰه الحجة البالغة" (سورۃ الانعام:۱۴۹) (کہہ دو اللہ کے لیے حجّتِ بالغہ ہے) کا مطلب دریافت کیا گیا۔ آپؑ نے فرمایا: ان اللّٰه يقول للعبد يوم القيامة عبدی كنت عالما فان قال نعم قال له افلا عملت بما علمت و ان قال كنت جاهلا قال افلا تعلمت حتى تعمل فيخصم فتلك الحجة البالغة للّٰه عزو جل على خلقه" یعنی جب قیامت کا دن ہوگا تو خداوند عالم اپنے بندے سے پوچھے گا: اے میرے بندے کیا تو عالم تھا؟ اگر اس نے اثبات میں جواب دیا تو ارشاد ہوگا تو نے اپنے علم پر عمل کیوں نہ کیا۔ اور اگر اس نے یہ کہا کہ میں تو جاہل تھا تو اس سے فرمائے گا تو نے کیوں علم حاصل نہیں کیا تھا، تاکہ عمل کر سکتا۔ اس طرح وہ مغلوب ہو جائے گا۔ یہ مطلب ہے اللہ کی حجّتِ بالغہ کا۔

اصول کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا:

"فيوتى بالمرأة الحسناء يوم القيامة التى قد افتتنت فى حسنها فتقول يا رب حسنت خلقى حتى لقيت ما لقيت فيجاؤ بمريم عليها السلام فيقال انت احسن ام هذه حسناها فلم تفتتن و يجاء بالرجل الحسن الذى افتتن فى حسنه فيقول يا رب حنت خلقى حتى لقيت من النساء ما لقيت فيجاؤ بيوسف عليه السلام فيقال انت احسن او هذه قد حسناه فلم يفتتن و يجاؤ بصاحب البلاء الذى قد اصابة الفتنة فى بلائه فيقول يا رب شددت على البلاء حتى افتتنت فيجاؤ بايوب عليه السلام فيقال ابليتك اشدام بلية هذا فقد ابتلى فلم يفتتن"

یعنی بروزِ قیامت ایسی خوبصورت عورت کو بلایا جائے گا جو اپنے حسن و جمال کی وجہ سے بعض گناہوں میں مُبتلا ہو چکی ہوگی۔ وہ عرض کرے گی: یا اللہ! تو نے مجھے حسن و جمال دیا تھا، اس لیے میں گناہوں میں مُبتلا ہوگئی۔ اس وقت حضرت مریم علیہا السلام کو پیش کر کے اس عورت سے پوچھا جائے گا تو زیادہ خوبصورت تھی یا نہ؟ جسے ہم نے حسن و جمال بھی دیا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس نے گناہ نہیں کیا۔ پھر ایک خوبصورت مرد کو مقامِ حساب میں لایا جائے گا، جس نے بوجہ اپنے حسن و جمال گناہ کیے

ہوں گے۔ عرض کرے گا: بارِالہا! تو نے مجھے حسن دیا تھا جس کی وجہ سے مُبتلائے گناہ ہو گیا۔ اس وقت حضرت یوسفؑ کو پیش کر کے خدا ارشاد فرمائے گا: تو زیادہ خوبصورت ہے یا یہ؟ جسے ہم نے حسن و جمال دیا تھا مگر اس نے گناہ نہیں کیا۔ اس طرح پھر اس مُبتلائے مصیبت کو لایا جائے گا جس نے بوجہ تکلیف گناہ کیے ہوں گے۔ وہ عرض کرے گا: میرے اللہ! تو نے میری تکلیف سخت کی تھی، اس لیے مجھ سے گناہ ہو گیا۔ اس وقت جناب ایوبؑ کو پیش کر کے کہا جائے گا: آیا تیری تکلیف زیادہ تھی یا ان کی؟ دیکھیے! ان کو کس قدر سخت بلا و مصیبت میں گرفتار کیا گیا۔ مگر پھر بھی انھوں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ اسی طرح خدائے حکیم نے تمام شعبہ ہائے زندگی میں اپنی کچھ حجتیں مقرر کر رکھی ہیں جن کے ذریعے سے وہ اتمامِ حجت کرتا ہے۔ جیسے امراء و سلاطین کی بیویوں کے لیے جناب آسیہ، وزراء کے لیے جناب حزقیل...... وعلیٰ ہذا القیاس۔

نامہ ہائے اعمال کا ہاتھوں میں دیا جانا

بکثرت آیات و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مردے قبروں سے اٹھائے جائیں گے تو ان کے ہاتھوں میں ان کے نامہ ہائے اعمال دے دیے جائیں گے۔ سعداء کا نامہ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور اشقیاء کا بائیں ہاتھ میں۔ چنانچہ ارشادِ قدرت ہے: "و نخرج له یوم القیامة کتاباً یلقاه منشورا" (سورۃ بنی اسرائیل:۱۳) ہم بروزِ قیامت ہر بندے کے لیے ایک تاب (نامہ اعمال) نکالیں گے جسے وہ کھلا ہوا پائے گا۔

"فاما من اوتی کتابه بیمینه فسوف یحاسب حساباً یسیرا و اما من اوتی بشماله فسوف یدعوا ثبورا" (سورۃ الانشقاق:۱۱)

یہ نامہ جس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اس کا حساب بہت آسان ہوگا، اور جس کے بائیں ہاتھ میں دیا گیا، وہ ہلاکت کو طلب کرے گا۔

اس وقت ارشاد ہوگا: "اقرأ کتابك کفی بنفسك الیوم علیك حسیبا" (اسراء:۱۴) اے بندہ اپنے نامۂ اعمال کو پڑھ۔ آج اپنے حساب کے لیے تو ہی کافی ہے۔ روایات سے پتا چلتا ہے کہ اس وقت ہر انسان میں پڑھنے کی طاقت آ جائے گی۔ اور حافظہ اس قدر تیز ہو جائے گا کہ فوراً پوری زندگی کے تمام حرکات و سکنات اس کے سامنے آ جائیں گے۔ گویا کہ اس نے ابھی ابھی یہ سب کچھ کیا ہے۔ (تفسیر عیاشی)

چنانچہ ارشادِ قدرت ہے: "علمت نفس ما قدمت و اخرت" ہر نفس کو معلوم ہو جائے گا کہ اس نے آگے کیا (عمل) بھیجا تھا، اور اپنے پیچھے (کیا آثار) چھوڑے تھے (سورۃ الانفطار: ۵) اس وقت بندے بے ساختہ پکار اٹھیں گے:

"ما لھٰذا الکتاب لا یغادر صغیرۃ و لا کبیرۃ الا احصاھا". (سورۃ الکھف: ۴۹)

اس نامۂ اعمال کو کیا ہو گیا ہے، اس نے تو تمام چھوٹے اور بڑے گناہوں کو یہیں شمار کر کے رکھ دیا ہے۔

طریفہ

بعض آیات و روایات سے مُستفاد ہوتا ہے کہ اس وقت کچھ ایسے بے حیا لوگ بھی ہوں گے کہ ایسے وقت میں صاف صاف انکار کر دیں گے کہ بارِ الٰہا! یہ اعمال و افعال جو اس نامہ میں درج ہیں یہ ہمارے نہیں ہیں۔ تفسیر قمی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: اس وقت خداوند عالم کا تبانِ اعمال فرشتوں کو بطور گواہ ان کے خلاف پیش کرے گا تو وہ بے حیا اس وقت کہیں گے کہ بارِ الٰہا! یہ تیرے فرشتے ہیں، اس لیے تیرے ہی حق میں گواہی دے رہے ہیں۔ ورنہ یہ حقیقت ہے کہ ہم نے ہرگز یہ گناہ نہیں کیے۔ اور وہ اپنے اس دعوے پر قسمیں بھی کھائیں گے۔ چنانچہ خداوند عالم ان کی اس کیفیّت کی یوں خبر دیتا ہے:

"یوم یبعثہم اللہ جمیعا فیحلفون لہ کما یحلفون لکم". (سورۃ مجادلہ: ۱۸)

(اعمال بد نہ کرنے پر جھوٹی) قسمیں کھائیں گے جس طرح تمھارے لیے کھاتے ہیں۔

مرزا غالب نے اس مخصوص گروہ کی نمائندگی اپنے مخصوص رنگ میں اس طرح کی ہے: ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

جب ان لوگوں کی ڈھٹائی اور بے حیائی اس حد تک پہنچ جائے گی، اس وقت خدا کے قادر و قہار ان کے مونھوں پر مہریں لگا دے گا، اور ان کے اعضاء و جوارح پکار پکار کر ان کے خلاف شہادت دیں گے۔ ارشادِ قدرت ہے:

"الیوم نختم علیٰ افواھھم و تکلمنا ایدیھم و تشھد ارجلھم بما کانوا یکسبون".

ہم ان کے مونھوں پر مہریں لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے ہم کلام ہوں گے۔

اور جو کچھ وہ کرتے تھے اس کی ان کے پاؤں گواہی دیں گے ۔ (سورۃ یاسین: ۶۵)
ایک دوسرے مقام پر خلاقِ عالم نے اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:
"یوم یحشر اعداء اللہ الی النار فھم یوزعون حتی اذا ما جاؤھا شھد علیھم سمعھم و ابصارھم و جلودھم بما کانوا یعملون"۔ (سورۃ حم سجدۃ: ۲۰)
جس دن اللہ کے دشمن جہنم کے پاس جمع کیے جائیں گے، پھر وہ (جو پہلے پہنچے اوروں کے انتظار میں) روکے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ (سب) جہنم میں پہنچ جائیں گے تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں جو جو بد عملی وہ کیا کرتے تھے، اس کی بابت ان کے برخلاف شہادت دیں گی۔ (ترجمہ مقبولؒ)

تفسیر قمی وغیرہ میں منقول ہے کہ اس وقت خداوند عالم ان کی زبانوں کو گویا کرے گا، اور وہ اپنے ان اعضاء سے کہیں گے: "وقالو لجلودھم لم شھدتم علینا" تم ہم پر کیوں گواہی دے رہے ہو؟ ۔ "قالوا انطقنا اللہ الذی انطق کل شئ"۔ ہمیں اسی خدائے قادر و قیوم نے گویا کیا ہے جو ہر شے کو گویا کرتا ہے۔ اس وقت وہ لاجواب ہو جائیں گے ۔ "قل فللّٰہ الحجۃ البالغۃ" ان کا یہ انکار اور پھر اس پر یہ اصرار ان کی انتہائی حماقت و جہالت کی دلیل ہے۔ ورنہ اگر وہ بجائے انکار کے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیتے تو بعید نہ تھا کہ خدائے رحیم و کریم کی رحمتِ واسعہ ان کے شامل حال ہو جاتی۔ چنانچہ ......
ایک روایت میں ہے کہ جب اعمال تولے جائیں گے اور آدمی کی برائیاں زیادہ ہوں گی تو ملائکہ کو حکم دیا جائے گا کہ اسے جہنم میں ڈال دو۔ جب اسے ملائکہ لے کر چلیں گے تو وہ پیچھے مڑ کر دیکھے گا۔ ارشادِ قدرت ہوگا: پیچھے مڑ کر کیوں دیکھتا ہے؟
وہ عرض کرے گا: "یا رب ماکان حسن ظنی بك ان تدخلنی النار" پالنے والے! مجھے تیری ذات کے متعلق یہ حُسنِ ظن نہ تھا کہ تو مجھے آتش جہنم میں جھونک دے گا۔ ارشادِ قدرت ہوگا: اے میرے ملائکہ! مجھے اپنی عزت و جلالت کی قسم، گو اس نے ایک دن بھی میرے متعلق یہ حُسنِ ظن قائم نہیں کیا تھا، لیکن چونکہ اس نے دعوےٰ کیا ہے، لہٰذا اسے جنّت میں داخل کر دو۔ (انوارِ نعمانیہ)
اسی لیے تو ایک زیرک شاعر نے کہا ہے: ع

مالی اذا وضع الحساب وسیلۃ — انجو بھا من حر نار مرقد
الا اعترافی بالذنوب و اننی — متمسك بولاء آلِ محمد

جب حساب وکتاب شروع ہوگا تو میرے پاس سوائے اپنے گناہوں کے اقرار اور آلِ رسولؐ کی ولایت کے اظہار کے اور کوئی ایسی چیز نہیں جس کی وجہ سے آتش جہنم کے بھڑکتے ہوئے شُعلوں سے نجات حاصل کرسکوں۔

حقیقتِ میزان کا بیان

میزان کے اجمالی عقیدہ پر تمام مُسلمانوں کا اِتفاق ہے، بلکہ اس کا اِعتقاد رکھنا ضروریاتِ اِسلام میں سے ہے۔ اس کے متعلّق آیات متکاثرہ و روایاتِ متواترہ موجود ہیں۔ ہاں البتہ اس کی حقیقت میں قدرے اِختلاف ہے۔

اوّل جو کہ اکثر علماء اسلام نے اختیار کیا ہے کہ بروزِ قیامت دو پلڑے والا ایک جسمانی ترازو قائم کیا جائے گا، جس میں مکلّفین کے اعمال تولے جائیں گے۔

دوم یہ کہ میزان سے مراد عدلِ خداوندی ہے کہ اعمال کے مطابق جزا یا سزا دی جائے گی۔

سوم یہ کہ اس سے مراد انبیاء واوصیاء علیہم السلام ہیں۔

چونکہ لغت میں "میزان" کے معنی "مایعرف بہ مقادیر الاشیاء" وہ چیز جس کے ذریعہ کسی چیز کی مقدار معلُوم کی جائے۔ اسی وجہ سے مختلف چیزوں کی مقدار معلُوم کرنے کے میزان علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ عام مادی اشیاء کا وزن معلُوم کرنے کے لیے مادی ترازو ہوتا ہے اور غیر مادی چیزوں کے لیے غیر مادی۔ جیسے اشعار کے لیے عروض، فلکیات کے لیے اِصطرلاب میزان مقرر ہے۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس۔ بنابریں اگرچہ خدا تعالیٰ کے مظاہر عدل انبیاء واوصیاء کو بھی جن کی اِتباع باعثِ دخولِ جنّت اور مخالفت موجب دخولِ نار ہے، میزان کہا جاتا ہے۔ لیکن ظواہر قرآن وحدیث اور اکثر علمائے اِسلام کے اقوال سے بھی جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ میزان جس کا اعتقاد ضروری ہے، وہ بمعنی اول ہی ہے۔ ارشادِ قدرت ہے:

"و الوزن یومئذ الحق فمن ثقلت موازینہ فاُولٰئک ھم المفلحون و من خفت موازینہ فاُولٰئک الذین خسروا انفسھم بما کانوا بآیاتنا یظلمون" (سورۃ الاعراف:۸)

اور اس دن کی تول برحق ہے۔ پس جس کی نیکیاں بھاری ہوگئیں، وہی تو کامیاب ہیں، اور جس کی نیکیاں ہلکی ہوگئیں وہ وہی ہیں جنھوں نے ہماری نشانیوں پر ظلم کرنے کے سبب اپنے آپ کو نقصان پہنچایا۔ (ترجمہ مقبولؒ)

اس آیت مبارکہ میں وزن اور اس کے اوصاف ثقل وخفت کا تذکرہ اسی ظاہری میزان پر دلالت کرتا ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

"ونضع الموازين القسط ليوم القيامة فلا تظلم نفس شيئا و ان كان مثقال حبة من خردل اتينا بها و كفى بنا حاسبين" (سورۃ الانبیاء:۴۷)

اور قیامت کے دن انصاف کی میزانیں قائم کریں گے، پس کسی نفس پر ذرا بھی ظلم نہ کیا جائے گا۔ اور اگر رائی کے دانہ کے برابر بھی (کوئی عمل) ہوگا تو ہم اسے لا حاضر کریں گے اور حساب لینے کو ہم ہی کافی ہیں۔ (ترجمہ مقبولؒ)

اس آیت میں بھی میزان نصب کرنے اور اس میں چھوٹے یا بڑے عمل کو وزن کرنے کا بالصراحت ذکر موجود ہے۔ اس مضمون کی اخبار جن میں میزان کے نصب کرنے اور اس میں اعمال کے تولے جانے کا تذکرہ موجود ہے، اس قدر زیادہ ہیں کہ یہاں ان کا عدّ و احصاء مُشکل ہے۔ شائقین تفصیل سیوم بحارالانوار وغیرہ کتبِ مفصلہ کی طرف رجوع کریں۔

دو شبہات اور ان کے جوابات

(اول) یہ کہ آیا خداوند عالم کو اس میزان کے بغیر یہ علم نہیں کہ کس انسان کے حسنات کس قدر ہیں اور سیئات کس قدر۔ تاکہ ترازو قائم کرنے کی ضرورت لاحق ہو۔

(دوم) یہ کہ اعمال کس طرح تولے جائیں گے۔ تولی تو وہ چیز جاتی ہے جو جسم دار ہو، جو ہر ہو، اعمال تو عرض اور قائم بالغیر ہیں نہ کہ جوہر۔ تو پھر انھیں کس طرح تولا جائے گا؟

پہلے شبہ کا پہلا جواب

پہلے شبہ کے سلسلہ میں پہلا جواب تو یہ ہے کہ ممکن ہے مختلف لوگوں کے اعتبار سے میزان مختلف ہوں۔ جیسا کہ علامہ جزائری نے اسی نظریہ کو اختیار کیا ہے۔

نیز صاحبِ سبیل النجاۃ نے بھی اسے پسند فرمایا ہے۔ یعنی کامل اہل ایمان کے لیے تو میزان سے مراد عدل خداوندی اور انبیاء واوصیاء علیہم السلام ہوں۔ مگر فساق وفجار اور منافقین واشرار کے لیے ترازو قائم کیا جائے، تاکہ ان کا انجام محسوس ومشاہد ہو جائے۔ اور ان کی کارکردگی ان کے سامنے آجائے، اور دیگر اہل محشر بھی مشاہدہ کر لیں، تاکہ ان کو یقین کامل ہو جائے کہ ان کی سزا انہی کے

عقائد و اعمال ناشائستہ کا نتیجہ ہے۔ اور اس سلسلہ میں خدائے رحمٰن کو موردِ الزام قرار نہ دیں۔

وما یظلم ربك احدا

دوسرا جواب

اس شبہ کا دوسرا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ تمام لوگوں کے لیے یہی ظاہری جسمانی طور پر ترازو قائم کیا جائے، اور اس کی وجہ یہ ہو کہ اہل ایمان کو امتحان میں کامیابی و کامرانی کا مشاہدہ کرکے بے حساب فرحت و انبساط اور اہل جہنم کو دخولِ جہنم سے پہلے انتہائی ذلت و رسوائی اور حسرت و ندامت کا سامنا ہو۔ اس امر کی معقولیت میں کوئی معقول انسان کلام نہیں کر سکتا۔

دُوسرے شبہ کا تحقیقی جواب

دوسرے شبہ کے جواب میں واضح ہونا چاہیے کہ ظاہری میزان کے قائلین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ میزان میں کیا تولا جائے گا۔ چنانچہ ایک قول تو یہ ہے کہ صحائف اعمال تولے جائیں گے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اعمال حسنہ کو ایک خوبصورت شکل میں مُتشکّل کرکے اور اعمالِ سیئہ کو ایک بدصورت ہیئت میں تبدیل کرکے لایا جائے گا اور ان صورتوں کو تولا جائے گا۔ تیسرا قول یہ ہے کہ خود اعمال حسنہ وسیئہ اس عالم میں مجسّم ہو جائیں گے۔ اگرچہ دارِ دنیا میں عرض کا جوہر اور جوہر کا عرض ہو جانا محال ہے لیکن عالم کے بدل جانے سے یہ انقلاب ممکن ہے۔

چنانچہ مُحقّق جلیل علامہ شیخ بہائی علیہ الرحمہ اپنے کتاب "اربعین" میں بذیل شرح حدیث نہم فرماتے ہیں: "الحق ان الموزون فی النشاۃ الاخریٰ ھو نفس الاعمال لا صحائفھا"۔

یعنی حق یہ ہے کہ بروزِ قیامت خود اعمال تولے جائیں گے نہ کہ صحیفہ ہائے اعمال۔ اس کے بعد نشاۃ اخرویہ میں انقلاب ماہیت کے جواز پر دلائل ذکر فرمائے ہیں۔

من شاء فلیرجع الی الکتاب المذکور

اسی طرح محدث سید نعمت اللہ جزائری انوار نعمانیہ میں فرماتے ہیں: "ان الصواب ھو القول تصریح الاخبار المستفیضة بل المتواترة الدالة علی تجسم الاعمال و انها هی التی توزن فی موازین العدل یوم القیامة"۔ یعنی اخبار مستفیضہ بلکہ متواترہ سے جو امر صراحۃً ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ: اعمال مجسّم ہو جائیں گے اور خود یہی اعمال بروزِ قیامت میزانِ عدل میں تولے جائیں گے۔

قیامت میں تجسّم اعمال کے بعض دلائل

اس تجسّم اعمال پر مختلف دلائل قائم کیے گئے ہیں۔ بعض کی طرف یہاں اشارہ کیا جاتا ہے۔

① ارشادِ قدرت ہے: "یوم تجد کل نفس ما عملت من خیر محضرا و ما عملت من سوء" (عمران: ۳۰) بروزِ قیامت ہر شخص اپنے اعمالِ خیر و بد کو حاضر پائے گا۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے: "و وجدوا ما عملوا حاضرا" (کہف: ۴۹) لوگ اپنے اعمال کو وہاں حاضر پائیں گے۔ ان آیات سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ خود ان کے اعمال وہاں موجود ہوں گے۔ اور وہی تولے جائیں گے۔

② جناب سرورِ کائنات ﷺ کا ارشاد ہے، فرمایا: "انما ھی اعمالکم ترد الیکم"۔ یہی تمھارے اعمال بروزِ قیامت تمھیں واپس لوٹا دیے جائیں گے۔

③ آنحضرت ﷺ کی حدیث ذیل سے بھی یہی مطلب ثابت ہوتا ہے۔ جنابؐ نے قیس بن عاصم سے فرمایا: "و انه لا بد لك یا قیس من قرین یدفن معك و هو حی و تدفن معه و انت میت فان كان كریما اكرمك و ان كان لئیما اسلمك ثم لا یحشر الا معك و لا تحشر الا معه و لا تسئل الا عنه فلا تجعله الا صالحا فانه ان صلح آنست به و ان فسد لا تستوحش الا منه و هو فعلك"۔ اے قیس! تیرا ایک یقیناً ہم نشین ہے جو تیرے ساتھ قبر میں زندہ دفن ہوگا، اور تو اس کے ساتھ مردہ دفن ہوگا۔ اگر وہ ہم نشین شریف و کریم ہوا تو تیرا اکرام و احترام کرے گا اور اگر برا ہوا تو تمھیں اپنے حال پر چھوڑ جائے گا۔ اور پھر اس کا حشر تیرے ساتھ اور تیرا اس کے ساتھ ہوگا۔ اور تجھ سے اسی کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ پس اگر وہ صالح ہوا تو تو اس کے ساتھ مانوس ہوگا۔ اور اگر فاسد ہوا تو تجھے اس سے وحشت و گھبراہٹ ہوگی۔ تیرا یہ ہم نشین تیرا عمل ہی ہے۔ (اربعین شیخ بہائی، سبیل النجاۃ وغیرہ)

④ اسی طرح کئی احادیث میں بعض اعمال کے متعلق وارد ہے کہ وہ مجسّم ہوکر انسان کا برزخ اور عرصہ محشر میں غم غلط کریں گے۔ اس قسم کی بعض احادیث حالاتِ قبر و برزخ میں گزر چکی ہیں۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ یہ ادلہ تجسّم اعمال پر نص صریح نہیں ہیں، بلکہ ان میں دوسرے قول یعنی اعمالِ حسنہ کا صورِ جمیلہ میں اور اعمالِ قبیح کا صورِ قبیحہ میں متمثّل ہوجانے کا احتمال برابر قائم رہتا ہے۔ اسی لیے سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ بحار الانوار میں فرماتے ہیں: "جمیع الاحوال و الافعال فی الدنیا تتجسم و تتمثل فی النشاۃ الاخری اما بخلق الامثلة الشبیهة بها بازائها او بتحول الاعراض هناك جواهر و الدول اوفق بحکم العقل و لا ینافیه صریح ما ورد فی النقل"۔ یعنی عالم آخرت میں تمام احوال و افعال متجسّم و متمثّل ہوجائیں

گے ۔ یا تو اس طرح کہ خداوند عالم اعمال کی نوعیّت وکیفیّت کے مطابق اچھی یا بری صورتیں خلق فرمائے گا، یا اس طرح کہ وہاں عرض جوہر کے ساتھ تبدیل ہوجائیں گے ۔ اور خود اعمال مجسّم ہوجائیں گے ۔ اگرچہ پہلا قول زیادہ قرین عقل ہے اور نقل بھی اس کے بالصراحت منافی ومخالف نہیں ہے ۔

پس ان حقائق سے واضح ہوگیا کہ میزان کو اپنے حقیقی معنی پر ہی محمول کرنا اولیٰ وانسب ہے ۔ باقی رہیں میزان کی دیگر تفاصیل کہ آیا قیامت کو ایک ہی میزان نصب ہوگا یا ہر ہر شخص کے لیے الگ الگ میزان نصب کیے جائیں گے ۔ اور بصورتِ تعدد اصولِ دین اور فروعِ دین کے لیے ایک ہی میزان ہوگا یا مختلف ہوں گے ۔ ان تفاصیل کا علم حاصل کرنا ضروری نہیں ہے ۔ بلکہ اجمالی ایمان رکھنا کافی ہے ۔ ان ہی حقائق سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جو قول متن میں اختیار کیا گیا ہے (کہ میزان سے مراد اوصیاء ہیں) یا جو قول اس کی شرح میں حضرت شیخ مُفید علیہ الرحمہ نے اختیار فرمایا ہے کہ اس سے مراد صرف عدلِ خداوندی ہے، اور اپنے اس نظریہ کی بنیاد محض ظاہری میزان کے استبعاد پر رکھی ہے اور اس طرح تمام ظواہر قرآن وحدیث کی تاویل فرمائی ہے ۔ وہ محل نظر واشکال ہے ۔ واللہ العالم بحقیقة الحال ۔

اسی لیے علماء متاخرین نے ان کی فرمائش کو نقد وتبصرہ کی میزان پر جانچتے ہوئے فرمایا ہے:
"لا یمکن الخروج عن ظواهر الایات و الروایات بهذه الوجوه العقلیة و الاعتبارات الوهمیة التی هی اوهن من بیت العنکبوت و انه لاوهن البیوت" ۔

یعنی ان عقلی وجوہ اور وہمی اعتبارات کی وجہ سے جو تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہیں ۔ آیات وروایات کے ظاہری معانی سے دستبرداری اختیار نہیں کی جاسکتی ۔
(حق الیقین مولانا سید عبداللہ شبرؒ)

اسی طرح سرکار مجلسی علیہ الرحمہ نے حضرت شیخ مُفید علیہ الرحمہ کی تاویل نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ: "بایں وجوہ عقلیہ و استبعاداتِ وهمیہ دست از ظواهر آیات برداشتن مشکل است" ۔ یعنی ان عقلی وجوہ اور وہمی استبعادات کی بنا پر ظواہر آیات سے دست بردار ہونا مُشکل ہے" ۔

ہاں اگر حضرت شیخ مرحوم اپنی اس تاویل کی بنیاد بجائے عقلی وجوہات پر قائم کرنے کے، بعض ان احادیث پر رکھتے جو ان کی تائید میں وارد ہوئے ہیں تو کسی حد تک یہ امر درست بھی تھا ۔ کیونکہ بعض روایات میں میزان کی تاویل عدلِ باری، اور انبیاء و اوصیاء علیہم السلام کے ساتھ کی گئی ہے ۔ چنانچہ احتجاج طبرسی میں جناب ہشام بن الحکم سے مروی ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک زندیق نے

جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا: کیا اعمال تولے جائیں گے؟

امامؑ نے فرمایا: نہیں۔ کیونکہ اعمال کوئی جسم نہیں رکھتے۔ نیز تولنے کا محتاج وہ شخص ہوتا ہے جو چیزوں کی تعداد و مقدار سے ناواقف ہو۔ اور ان کے ثقیل یا خفیف ہونے سے آگاہ نہ ہو۔ حالانکہ خدا تعالیٰ پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔

سائل نے کہا: پھر میزان کے کیا معنی ہیں؟

فرمایا: اس کے معنی ہیں خدا کا عدل۔

زندیق نے کہا: پھر آیت "فمن ثقلت موازینه" (القارعہ: ۶) کا کیا مطلب ہے؟

فرمایا: جس کا عمل خیر زیادہ ہوگا وہ نجات پا لے گا۔

اسی طرح کافی اور معانی الاخبار میں آیت مبارکہ: "و نضع الموازین القسط لیوم القیامة فلا تظلم نفس شیئا" (الانبیاء: ۴۷) کی جو تفسیر بروایت جناب ہشام بن سالم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے، وہ یہ ہے کہ آنجنابؑ نے فرمایا کہ میزان سے مراد انبیاء و اوصیاء علیہم السلام ہیں۔

بنابریں یہ مسئلہ فی الجملہ قالب اشکال میں آجاتا ہے اور محتاط علماء کی روش بہت عمدہ ہے کہ میزان کی اجمالی حقانیت پر ایمان رکھا جائے اور اس کی تفصیل و حقیقت کا علم خالق میزان یا اس کے حقیقی نمائندگان علیہم السلام کے سپرد کیا جائے۔ چنانچہ غواص بحار الانوار سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ "حق الیقین" میں میزان کے متعلق مباحث طویلہ کے بعد فرماتے ہیں:

"چوں روایات دریں باب متعارض است باید باصل میزان اعتقاد کردد و معنی آں را بعلم ایشاں گزاشت و جزم باحد طرفین مشکل است"

یعنی چونکہ اس سلسلہ میں روایات باہم متعارض ہیں، اس لیے اصل میزان کا اعتقاد رکھنا چاہیے اور اس کی حقیقت کا علم معادن وحی و تنزیل کے سپرد کرنا چاہیے۔ ان اقوال میں سے کسی ایک کے متعلق جزم و یقین حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔

اسی طرح حضرت مولانا سید عبداللہ شبر فرماتے ہیں:

" و الاحوط و الاولیٰ الایمان بالمیزان و رد العلم بحقیقتها الی الله انبیائه و خلفائه و لا نتکلف علم مالم یوضح لنا بصریح البیان والله العالم بالحال".

احوط و اولیٰ یہ ہے کہ میزان پر اجمالی ایمان رکھا جائے اور اس کی حقیقت کا علم خداوند عالم اور اس کے انبیاء و خلفاء کے سپرد کیا جائے۔ اور جس چیز کی حقیقت

واضح طور پر ہمارے لیے بیان نہیں کی گئی، اس کے معلوم کرنے کے لیے تکلف نہ کیا جائے۔ واللہ العالم بالحال۔

"فنحن نؤمن بالمیزان و نرد علمه الی حملة القرآن و لا نتکلف علم ما لم یوضح لنا بصریح البیان و الله الموفق و علیه التکلان" (ثالث بحار الانوار)

اعضاوجوارح کی شہادت کے متعلق ایک اشکال کا جواب

ابھی اوپر بروزِ قیامت اعضاء وجوارح کا بندوں کے افعال واعمال کے بارے میں شہادت دینے کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ ممکن ہے موجودہ تہذیب وتمدن کے فرزند اس امر پر زبانِ اعتراض دراز کریں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہاتھ پیر وغیرہ اعضا بول کر اعمال کی گواہی دیں، جبکہ ان میں قوتِ گویائی نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ محض ایک استبعاد ہے جس کی بنا پر قرآن وسنت سے ثابت شدہ حقائق کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ خدا کی قدرتِ کاملہ پر ایمان رکھنے والوں کے لیے تو اس مقام پر اطمینانِ قلب حاصل کرنے کے لیے وہی جواب کافی ہے جو اسی آیت میں مذکور ہے، جس کے اندر اعضاء کے شہادت دینے کا تذکرہ ہے: "انطقنا الله الذی انطق کل شئ" (سورۃ حم سجدہ: ۲۱) ہمیں اسی خدائے قادر نے گویا کیا ہے جس نے اپنی قدرت کاملہ سے ہر چیز کو گویا کیا ہے۔ جو قادر مطلق ایک نطفہ گندیدہ میں سے حضرت انسان ایسی کامل مخلوق کو پیدا کر سکتا ہے۔ نیز ایسے ایسے مشکل کام انجام دے سکتا ہے جو تصور انسانی سے بھی باہر ہیں۔ اس کے لیے اعضاء وجوارح کو حیات اور قوتِ نطق عطا فرما کر گویا کر دینا کوئی مشکل امر نہیں ہے۔ ہر چیز کا تسبیح خدا ادا کرنا قرآن کی آیاتِ مبارکہ سے شجر وحجر کا نبی اعظم ﷺ کی نبوت و رسالت کی شہادت دینا روایاتِ معتبرہ سے ثابت ہے۔ لہٰذا اعضاء و جوارح کا بولنا اور شہادت دینا کوئی قابلِ تعجب امر نہیں ہے۔ البتہ اس سائنسی دور میں ایسے حقائق کا محض تعصب یا جہالت کی بنا پر انکار کرنا تعجب خیز اور مستبعد ہے۔

جب انسان خدا کی دی ہوئی طاقت وقدرت سے ایسے آلات ایجاد کر سکتا ہے جو صوت اور حرف اور طریق ادائے مطلب تک کو اپنے اندر محفوظ رکھتے ہیں۔ جیسے فوٹو گراف، ٹیپ ریکارڈر، سی ڈی وغیرہ۔ اس میں بند شدہ الفاظ و مطالب کو جب چاہیں بعینہٖ سماعت کر سکتے ہیں تو اگر خدائے قادر وقیوم یہ خبر دے کہ یہ تمہارے اعضاء وجوارح بھی تمہارے افعال واعمال کے محافظ ونگران ہیں، اور بروزِ قیامت باذن اللہ تمام حالات وکوائف کو بیان کر دیں گے، تو اہلِ عقل وانصاف بتائیں کہ

اس میں کون سی تعجب و استبعاد کی بات ہے۔

"ان فی ذلك ذکرا لمن کان له قلب او القی السمع و هو شهید" (ق:۳۷)

احباط و تکفیر اور موازنہ

اگر چہ مُصنّف علام نے اس موضوع کا تذکرہ نہیں کیا، مگر مناسب معلُوم ہوتا ہے کہ یہاں اختصار کے ساتھ اس موضوع پر کچھ تبصرہ کر دیا جائے۔

علم کلام کی اِصطلاح میں احباط کا یہ مفہُوم ہے کہ بعد والے گناہ کی وجہ سے پہلی نیکی ضائع و اکارت ہو جائے۔ اور تکفیر سے مراد یہ ہے کہ بعد والی نیکی سے پہلی برائی دور ہو جائے اور موازنہ کا مقصد یہ ہے کہ نیکیوں اور برائیوں کا مقابلہ کیا جائے۔ جو چیز (نیکی یا بدی) غالب آجائے اس سے دوسری چیز نیست و نابود ہو جائے۔ اور اگر دونوں مساوی ہوں تو دونوں کالعدم قرار دے دی جائیں۔ حضراتِ مُعتزلہ ان امور کے قائل ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض گناہوں جیسے کفر و شرک سے سابقہ حسنات ضائع ہو جاتے ہیں۔ "اولئك الذین کفروا بأیات ربهم و لقائه فحبطت اعمالهم فلا نقیم لهم یوم القیامة وزنا" (کہف:۱۰۵) یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے آیاتِ اِلٰہی اور لقاء پروردگار کا انکار کیا۔ اس لیے ان کے عمل حبط ہو گئے۔ اب بروزِ قیامت ہم ان کے لیے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے۔ اسی طرح بعض طاعات سے سابقہ سیئات محو ہو جاتے ہیں۔ جیسے: "ایمان بعد الکفر و توبه بعد العصیان یذهبن السیئات"۔ نیکیاں، برائیوں کو لے جاتی ہیں۔ "ان تجتنبوا کبائر ما تنهون عنه نکفر عنکم سیئاتکم" (النساء:۳۱) اگر تم گناہانِ کبیرہ سے اجتناب کرو گے تو ہم تمھارے دوسرے گناہ محو کر دیں گے۔ اس سے معلُوم ہوتا ہے کہ (نام جو چاہو رکھ لو) کہ فی الجملہ معنوی طور پر احباط و تکفیر ثابت ہے۔ مگر غور طلب امر یہ ہے کہ آیا یہ کلیہ درست ہے کہ ہر گناہ کبیرہ موجب حبط اعمال ہوتا ہے۔ اور ہر حسنہ باعثِ تکفیر سیئات۔ مشہُور عندالامامیہ والاشاعرہ یہ ہے کہ یہ باطل ہے، بوجہ لزوم ظلم و جور "و تاثیر عرض در عرض و هو محال" اور موازنہ کا بطلان تو اظہر من الشمس ہے۔

علامہ مجلسی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

"اقول الحق انه لا یمکن انکار سقوط ثواب الایمان بالکفر اللاحق الذی یموت علیه و کذا سقوط عقاب الکفر بالایمان اللاحق الذی یموت علیه و قد دلت الاخبار الکثیرة علی

ان کثیراً من الحسنات یذهبن السیئات و ان کثیراً من الطاعات کفارۃ لکثیر من السیئات و الاخبار فی ذٰلك متواترۃ و قد دلت الأیات علی ان الحسنات یذهبن السیئات و لم یقم دلیل تام علی بطلان ذلك و اما ان ذلك عام فی جمیع الطاعات و المعاصی فغیر معلوم"۔

میں کہتا ہوں حق یہ ہے کہ بعد والے کفر سے ایمانِ سابق کے ثواب کے اکارت ہونے اسی طرح ایمان لاحق کی وجہ سے کفر سابق کے عقاب کے ساقط ہوجانے کا انکار ممکن نہیں ہے۔ اخبارِ کثیرہ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ نیکیاں برائیوں کودور کردیتی ہیں اور بہت سی طاعات بہت سی سیئات کا کفارہ بن جاتی ہیں۔ علاوہ اخبارِ متواترہ کے آیاتِ کثیرہ بھی اسی مطلب پر دلالت کرتے ہیں۔ اور اس بات کے بطلان پر کوئی مکمل دلیل موجود نہیں ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ آیا یہ بات تمام طاعات و سیئات میں جاری ہے، یہ معلوم نہیں ہے۔

ایسا ہی افادہ جناب علامۂ موصوف کے تلمیذِ رشید جناب محدث جزائریؒ نے انوارِ نعمانیہ میں فرمایا ہے۔

باب الاعتقاد

فی الجنة والنار

قال الشیخ ابوجعفر اعتقادنا فی الجنة انها دار البقاء و دار السلامة

انتیسواں باب

جنّت اور دوزخ کے متعلق اعتقاد

حضرت شیخ ابوجعفرؒ فرماتے ہیں کہ بہشت کے متعلق ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ بقاء اور سلامتی کا گھر ہے اور اس میں نہ موت ہوگی

انتیسواں باب

جنّت اور دوزخ کا بیان

عقیدہ جنّت وجہنم کے ضروریاتِ دین سے ہونے کا بیان

مخفی نہ رہے کہ جنّت سے مراد وہ دارِ جزا و ثواب ہے جو اہل ایمان واطاعت کو ان کے حال کے مطابق آخرت میں دیا جائے گا۔ جس میں مختلف قسم کے لذائذ و نعمات ہوں گے اور جہنم سے مراد وہ دارِ عقاب و عذاب ہے جو کفار و اشرار اور فساق و فجار کو ان کے حسبِ حال دیا جائے گا۔ جس میں مختلف انواع و اقسام کے عذاب و عقاب ہوں گے ۔ نیز یہ بہشت و دوزخ جسمانی ہیں اور اس وقت مخلوق و موجود ہیں۔ جو خوش قسمت لوگ بہشت میں داخل ہوں گے وہ ہمیشہ ابدالآباد تک اس میں رہیں گے اور جو بدبخت دوزخ میں داخل ہوں گے ان میں سے بعض تو مخلّد فی النار ہوں گے اور کچھ اپنے گناہ وعصیان کے مطابق سزا بھگتنے کے بعد یا حصولِ شفاعت کی وجہ سے بالآخر اس سے نجات حاصل کریں گے اور بہشت عنبر سرشت میں داخل ہوں گے ۔ اس جسمانی جنّت و جہنم کا اعتقاد ضروریاتِ دینِ مبین میں سے ہے ۔ جس کا انکار کرنے والا یا خلافِ شریعت تاویل کرنے والا دائرۂ اسلام سے خارج ہے ۔ مُسلمانوں میں سے کوئی فرقہ بھی ان کا منکر نہیں ہے ۔ ہاں البتہ ملاحدہ، دہریہ ان کے منکر ہیں ۔ اور فلاسفۂ یونان اس بہشت و دوزخ کی عالم مثال یا لذاتِ عقلیّہ و روحانیہ کے ساتھ تاویل کرتے ہیں، جو بالاتفاق کفر ہے، جنّت وجہنم کے اثبات کے سلسلہ میں آیات مُتکاثرہ اور روایاتِ متواترہ وارد ہوئے ہیں ۔ اس مبحث میں چند امور قابلِ غور ہیں ۔ ① یہ کہ جنّت و جہنم جسمانی ہیں ۔ ② جنّت وجہنم پیدا ہو چکی ہیں اور اس وقت موجود ہیں ۔ ③ ان کی کیفیّت اور ان کے بعض لذائذ یا شدائد کا بیان ۔ ④ ثواب جنّت اور عذابِ جہنم کا خلود و دوام ۔ ⑤ حضرت آدمؑ والی

لا موت فیھا و لا ھرم و لا سقم و لا مرض و لاآفة و لازوال و لازمانة و لا ھم و لا غم و لا حاجة و لا فقر و انھا دار الغنی و دار السعادة و دار المقامة و دار الکرامة لا یمس

اور نہ بڑھاپا، نہ کسی قسم کی بیماری لاحق ہوگی اور نہ کوئی آفت ہوگی نہ زوال (نعمت) ہوگا، نہ کوئی اپاہج ہوگا، نہ وہاں کسی طرح کا رنج وغم ہوگا، اور نہ وہاں مُفلسی اور محتاجی ہوگی، بلکہ وہ تو غنا وتونگری، سعادت ونیک بختی اور دائمی قیام وکرامت کا محل و مکان ہے، اس میں رہنے والوں کو نہ کسی قسم کی کوئی تکلیف

جنّت کی تحقیق۔ ⑥ مومن وکافر کا مرنے سے پہلے جنّت وجہنم میں اپنے اپنے مقام کو دیکھنا۔ ⑦ بعض شکوک وشبہات کا اِزالہ۔ ذیل میں ہم اِن اُمور پر اِختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے تبصرہ کرتے ہیں۔

جسمانی جنّت وجہنم کا اِثبات اور دیگر آراء فاسدہ کا ابطال

ابھی اوپر لکھا جا چکا ہے کہ جسمانی جنّت وجہنم کا اعتقاد ضروریاتِ دین میں سے ہے۔ چنانچہ سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ ثالث بحار الانوار میں فرماتے ہیں: "اعلم ان الایمان بالجنة و النار علی ما ورد تا فی الایات و الاخبار من غیر تاویل من ضروریات الدین و منکر ھما او مؤولھما بما اولت به الفلاسفة خارج من الدین"۔ یعنی: "جاننا چاہیے کہ جنّت وجہنم پر اس طرح ایمان لانا جس طرح ان کی تفصیل آیات واخبار میں وارد ہے ضروریاتِ دین میں سے ہے اور ان کا منکر یا فلاسفہ کی طرح تاویل کرنے والا دینِ اسلام سے خارج ہے"۔ اسی طرح علامہ تفتازانی نے شرح مقاصد میں تحریر فرمایا ہے۔

فلاسفۂ یونان کا خیال ہے کہ جنّت وجہنم فقط روحانی ہیں۔ اور بعض مُتصوّفہ مثل غزالی وغیرہ جسمانی وروحانی ہر دو کے قائل ہیں۔ اور بعض فقط ان کے خیالی وعقلی وجود کے قائل ہیں۔ وہ اسی دوسرے جنم کو ہی جنّت یا جہنم قرار دیتے ہیں۔ چونکہ فلاسفہ یونان کے دو بڑے گروہ ہیں، اشراقیین اور مشائین۔ اشراقیین جن کا رئیس افلاطون ہے، ان کا خیال ہے کہ عالم مثال ہی میں جزا یا سزا دی جاتی ہے اور یہ عالم نہ محض جسمانی ہے اور نہ محض مجرد، بلکہ وہ ان ہر دو عالموں کے بین بین ہے۔ جیسے عالم رویا کی اشیاء یا جیسے آئینہ میں صورت۔ بنا بریں ثواب مثل اچھے خواب کے ہے۔ اور عقاب برے خواب کی مانند ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قول علاوہ اس کے کہ اس سے معاد جسمانی (جسے سابقاً ثابت کیا جا چکا ہے) کا اِنکار لازم آتا ہے۔ قرآن وحدیث کی تصریحات کے مخالف اور انبیاءؑ و مرسلینؑ کی تعلیمات کے منافی ہے۔ لہٰذا کوئی شخص جو اسلام کو صحیح مذہب سمجھتا ہے وہ اس قولِ ضعیف کا قائل نہیں ہوسکتا۔ اور فلاسفہ مشائین جن کا رئیس ارسطو ہے، وہ جنّت وجہنم اور ان کے ثواب وعقاب کو

اھلھا نصب و لا یمسھم فیھا لغوب لھم فیھا ما تشتھی الانفس و تلذ الاعین و ھم فیھا خالدون	ہوگی اور نہ ہی ان کو کوئی تھکاوٹ لاحق ہوگی ۔ اس میں اہل جنّت کے لیے وہ سب کچھ مہیا ہوگا جس کی ان کے نفس خواہش کریں گے اور جس سے آنکھیں لذت اندوز ہوں گی اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے ۔

لذات و آلام عقلیّہ کی قسم سے شمار کرتے ہیں ۔ ان کا خیال ہے کہ جب آدمی کی موت واقع ہوجاتی ہے تو اس کا بدن تو خراب ہوجاتا ہے لیکن اس کی روح باقی رہتی ہے ۔ پس اگر دارِ دنیا میں اس کے عقائد و اعمال اچھے تھے تو وہ اپنے ان اعمال و کمالات کی وجہ سے فرحان وشاداں رہتی ہے ۔ یہی اس کی جنّت ہے اور اگر اس کے عقائد و اعمال برے تھے اور اس نے دارِ دنیا میں کسب کمال نہیں کیا تھا تو مرنے کے بعد اسے اس کا رنج و الم ہوتا ہے ۔ یہی اس کی جہنم ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ تاویل بھی فلاسفہ اشراقیین کی تاویل کی طرح اسلامی عقائد کے ساتھ ہرگز موافق اور سازگار نہیں ہوسکتی ۔ تعجب ہے ان بعض مُسلمان فلاسفروں پر جو باوجودیکہ کلمہ اسلام پڑھتے ہیں اور اس کی صداقت و حقانیت کے قائل بھی ہیں ، لیکن اس کے باوجود فلاسفہ یونان کی ان تاویلاتِ رکیکہ کو تسلیم کرتے ہوئے ظواہر شریعت سے دست بردار ہوجانے میں کچھ جھجک محسوس نہیں کرتے ۔ اور بعض نام نہاد مُسلمان ان کے فلسفیانہ نظریات سے مرعوب ہوکر شریعت اور فلسفہ کے نظریات کے درمیان جمع و توفیق کرنے کی غرض سے جسمانی و روحانی جنّت و جہنم کے قائل ہو گئے ہیں ۔ لیکن ان کی یہ دوغلی پالیسی ہرگز قابل عفو نہیں ہے ۔ ان کو چاہیے کہ یا تو کُھلّم کُھلّا طور پر اسلام کا جوا گردن سے اتار دیں تاکہ معلوم ہوجائے کہ : "یاراں دیگراں رامی پرستند" یا اگر دین اسلام کو برحق سمجھتے ہیں تو پھر بلاچون و چرا اس کے تمام مُسلمہ عقائد و نظریات کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں ۔ اسی بنا پر سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے فرمایا ہے :

"و لا یخفی علی من راجع کلامھم و تتبع اصولھم ان جلھا لا یطابق ما ورد فی شرائع الانبیاء و انما یمضغون ببعض اصول الشرائع و ضروریات الملل علی السنتھم فی کل زمان حذرا من القتل و التکفیر من مومنی زمانھم فھم یومنون بافواھھم و تابی قلوبھم و اکثرھم الکافرون" ۔ (بحار جلد ۳)

"جو شخص ان فلاسفہ کے کلام کو بغور دیکھے گا اور ان کے اصول و قواعد کا تحقیقی جائزہ لے گا اس پر مخفی نہیں رہے گا کہ ان کے اکثر قواعد شریعتِ انبیاءؑ کے مطابق نہیں ہیں ۔ ہاں وہ ہر دور میں بعض عقائد شرعیہ کا اور ضروریاتِ دینیّہ کا زبانی طور پر محض اپنے زمانہ کے اہل ایمان کے ہاتھوں قتل

و انها دار اهلها جیران الله تعالیٰ و اولیائه و احبائه و اهل کرامته و هم انواع علیٰ مراتب منهم المتنعمون بتقدیس الله و تسبیحه و تکبیرہ فی جملة ملئکته و منهم المتنعمون بانواع المآکل و المشارب و الفواکه	بہشت ایسا مقام ہے جس میں رہنے والے خدا کے جوارِ رحمت میں ہوں گے اس کے دوست اور کرامتوں کے مالک ہوں گے اور مراتب کے لحاظ سے بھی وہ جنتی مختلف ہوں گے۔ ان میں سے بعض تو فرشتوں کی طرح خدا کی تقدیس و تسبیح اور تکبیر وغیرہ میں ان کے ہمراہ متنعّم ہوں گے اور بعض مختلف کھانے پینے کی چیزوں اور رنگ برنگ میووں سے

ہونے اور ان کے فتویٰ کفر سے بچنے کے لیے اقرار کرتے رہتے ہیں۔ پس وہ زبان سے ایمان لاتے ہیں لیکن ان کے دل انکار کرتے ہیں۔ اور ان میں سے اکثر کافر ہوتے ہیں"۔ اس کے بعد سرکار علامہؒ نے ان کے بعض اصول کا تذکرہ کرکے ان کا مخالف شریعت مقدسہ ہونا ثابت کیا ہے۔

چونکہ یہ مسئلہ خالص عقلی تو ہے نہیں، تا کہ اس کے متعلق ان فرقہائے باطلہ کے بانیوں کے ساتھ صرف عقلی طور پر گفتگو کی جائے، بلکہ اس کے اثبات کا زیادہ بلکہ تمام تر تعلق نقل وسمع کے ساتھ ہے، اس لیے ان منکرین یا مؤولین حضرات کو پہلے دلائل و براہین کے ساتھ اسلام کی حقانیت و صداقت کو تسلیم کرنا چاہیے، اس کے بعد یہ مسئلہ خود بخود واضح ہوجائے گا۔ اسلام کو صحیح دین تسلیم کرنے کے بعد ان پر یہ حقیقت روشن ہوجائے گی کہ اسلام نے جنّت و جہنم کے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے اس میں ان کی تاویلاتِ رکیکہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور نہ ہی وہ بفضلہٖ تعالیٰ مخالف عقل ہے۔ لہٰذا جب مخبرین صادقین اس کے وجود کی خبر دے رہے ہیں اور یہ امر عقلاً محال و ناممکن بھی نہیں ہے تو پھر اس کا انکار یا اس میں بے جا تاویل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں عقیدۂ قیامت اور اس کے متعلّقات کو آخری مرتبہ پر رکھا گیا ہے، تا کہ پہلے توحید و عدالت اور رسالت و امامت یا کم از کم توحید و رسالت کا دلائل و براہین کے ساتھ اقرار و اعتراف کر لیا جائے۔ اس کے بعد ان کے ارشادات پر ایمان لانا آسان ہوجائے گا۔ اور حشر و نشر اور جنّت و نار ایسے مابعد الطبع اَن دیکھے حقائق کو تسلیم کرنے میں کسی قسم کی اُلجھن محسوس نہ ہوگی۔

جنّت و جہنم کے مخلوق و موجود ہونے کا اثبات

اسلام کے مختلف مکاتیبِ فکر سے تعلق رکھنے والے تمام مسلمانوں کا سوائے بعض معتزلہ کے اس امر پر اتفاق ہے کہ جنّت و جہنم پیدا ہوچکی ہیں، اور اس وقت موجود ہیں۔ اس عقیدہ کی صحت پر

و الاواك و الحور العين و استخدام	اور عمدہ اور سیاہ اور کشادہ چشم والی عورتیں ہمیشہ جوان رہنے
الولدان المخلدين و الجوس على	والے خدمت گزار لڑکوں، تکیوں اور کرسیوں پر بیٹھنے اور ریشم و
النمارق و الزرابي و لباس السندس	دیبا کے کپڑے زیب تن کرنے سے لطف اندوز اور بہرہ مند
كل منهم انما يتلذذ بما يشتهي	ہوں گے (رحمٰن : ۷۲) ان میں سے ہر شخص کو اس کی خواہش و

آیاتِ متکاثرہ وروایاتِ متواترہ دلالت کرتی ہیں ۔ چنانچہ سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں : "واما كونهما مخلوقتان الان فقد ذهب جمهور المسلمين الا شرذمة من المعتزله فانهم يقولون سيخلقان في القيامة و الايات و الاخبر المتواترة دافعة لقولهم و مزيفة لمذهبهم " ۔ یعنی جنّت و جہنم کا بالفعل موجود و مخلوق ہونا سوائے بعض مُعتزلہ کے باقی تمام مُسلمانوں کے نزدیک مُسلّم ہے ۔ ہاں بعض مُعتزلہ یہ کہتے ہیں کہ یہ بروزِ قیامت پیدا ہوں گی ۔ لیکن آیات اور متواتر روایات ان کے نظریہ کو باطل کرتی ہیں ۔ اسی طرح برادرانِ اسلامی کے علامہ تفتازانی شرح مقاصد جلد ۲ صفحہ ۲۱۸ میں فرماتے ہیں : "جمهور المسلمين على ان الجنة و النار مخلوقتان الآن خلافاً لابي هاشم و القاضي عبد الجبار و من يجري مجرا هما من المعتزلة حيث زعموا انهما تخلقان يوم الجزاء " ۔ اس عبارت کا مطلب بھی وہی ہے جو سرکار علامہ مجلسیؒ کی عبارت کا ہے ۔ اس کے بعد فاضل شارح نے اس قولِ ضعیف کا ابطال قرآن اور حدیث پیغمبر اسلام ﷺ سے واضح کیا ہے ۔ من شاء فليرجع اليه ۔

اس مطلب پر پہلی دلیل

اب ہم ذیل میں اس عقیدہ کی صحت پر بعض دلائل کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔ اس سلسلہ میں پہلی دلیل قصہ آدمؑ وحوا اور ان کا جنّت میں سکونت پذیر ہونا ہے ۔ جس کا تذکرہ قرآن میں متعدد مقامات پر موجود ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے : "و اذ قلنا يا آدم اسكن انت و زوجك الجنة و كلا منها" ۔ (بقرہ : ۳۵) "ہم نے آدمؑ سے کہا : اے آدمؑ ! تم اور تمھاری زوجہ جنّت میں رہو، اور اس سے کھاؤ" ۔ ظاہر ہے کہ اگر جنّت و جہنم مخلوق وموجود نہ ہوتیں تو جناب آدمؑ وحوا کو ان میں داخل کرنا اور اس کے پھل کھانے کا حکم دینا بے معنی ہو کر رہ جاتا ۔ حضرات ائمہ طاہرین علیہم السلام نے اس مطلب کے اثبات میں زیادہ تر اسی واقعہ سے تمسّک فرمایا ہے ۔ چنانچہ رجال کشی میں مرقوم ہے کہ جناب امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ فلاں شخص گمان کرتا ہے کہ ابھی جنّت پیدا نہیں ہوئی ۔ یہ سن کر آپؑ نے فرمایا : كذب فاين جنة آدم ...... وہ جھوٹ کہتا ہے ۔ اگر جنّت ہنوز پیدا نہیں ہوئی

و یرید علی حسب ما تعلقت همته و یعطی من عند الله من اجله و قال الصادقؑ ان الناس یعبدون الله علی ثلثة اصناف	طلب کے مطابق خدا کے حضور سے ہر ایک چیز عطا کی جائے گی ۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں : خدا کی عبادت کرنے والے تین قسم کے لوگ ہیں ۔ ایک گروہ تو وہ ہے جو جنّت کے شوق اور

تو پھر آدمؑ والی جنّت کہاں گئی؟ اسی طرح ابن سنان روایت کرتے ہیں کہ میں نے جناب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ یونس کہتا ہے: ابھی تک جنّت وجہنم پیدا نہیں ہوئیں ۔ یہ سن کر آپؑ نے فرمایا: "له لعنه الله فاین جنة آدمؑ؟" ۔ "خدا اس پر لعنت کرے ۔ اسے کیا ہوگیا ہے ۔ جناب آدمؑ کی جنّت کہاں گئی" ۔ کتاب صفات الشیعه مولفه حضرت شیخ صدوق علیہ الرحمہ (علی ما نقل عنہ) حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: "لیس من شیعتنا من انکر اربعة اشیاء المعراج و المسائلة فی القبر و خلق الجنة و النار" ۔ جو شخص چار چیزوں کا انکار کرے وہ ہمارے شیعوں میں سے نہیں ہے ۔ معراج جسمانی، قبر میں سوال وجواب کا ہونا، جنّت وجہنم کا مخلوق ہونا اور شفاعت ۔ اسی دلیل جمیل سے حضرت مُصنّف علام کے بیان کردہ نظریہ کی کمزوری بھی واضح وعیاں ہوجاتی ہے کہ جنّت آدمؑ ایک دنیوی باغ تھا ۔ اس امر کی مزید وضاحت بعد میں آرہی ہے ۔

دوسری دلیل

ارشادِ قدرت ہے: "ولقد رآه نزلة اخریٰ عند سدرة المنتہیٰ عندها جنة الماویٰ" (نجم: ۷۳) آنحضرت ﷺ نے (شب معراج) دوسری بار اس (جبرئیلؑ) کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا ۔ جس کے نزدیک جنّت الماویٰ ہے ۔ تفسیر قمی میں جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: جو لوگ جنّت وجہنم کے مخلوق ہونے کے منکر ہیں، ان کا آیت مبارکہ: "عندها جنة الماویٰ" میں رد موجود ہے (کہ اگر جنّت موجود نہ ہوتی تو خدائے عزوجل کیوں فرماتا کہ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جنّت الماویٰ موجود ہے) امام علیہ السلام نے فرمایا: سدرۃ المنتہیٰ ساتویں آسمان پر ہے اور اس کے پاس (اس کے اوپر) جنّت الماویٰ موجود ہے ۔

تیسری دلیل

خداوند عالم جنّت کے متعلق ارشاد فرماتا ہے: "اعدت للمتقین" (عمران: ۱۳۳) جنّت

فصنف منھم یعبدونہ شوقا الی جنتہ و رجاء ثوابہ فتلک عبادۃ الخدام و صنف منھم یعبدونہ خوفا امن نارہ فتلک عبادۃ العبید

اس کے ثواب کی امید میں خدا کی عبادت کرتا ہے۔ اس گروہ کی عبادت خادموں اور نوکروں کی سی ہے، دوسرا گروہ آتش دوزخ اور عذابِ الٰہی کے خوف سے خدا کی بندگی کرتا ہے۔ یہ عبادت غلاموں کی سی ہے۔

مُتقیوں کے لیے مہیا کی گئی ہے۔ "اعدت للذین اٰمنوا" (حدید: ۲۱) جنّت اہل ایمان کے لیے مہیا کی گئی ہے۔ "اذلفت الجنۃ للمتقین" (شعراء: ۹۰) جنّت اہل تقویٰ کے لیے قریب کی گئی ہے۔ اسی طرح جہنم کے متعلق ارشاد ہوتا ہے: "اعدت للکافرین" (بقرہ: ۲۴) جہنم کافروں کے لیے مہیا کی گئی ہے۔ ان آیات سے مُستفاد ہوتا ہے کہ جنّت و جہنم پیدا ہو چکی ہیں۔ اگر یہ اس وقت موجود نہ ہوتیں تو ان کا قرآن مجید میں صیغہ ماضی کے ساتھ ذکر نہ کیا جاتا۔

چوتھی دلیل

کتبِ فریقین میں بکثرت ایسی روایات موجود ہیں جن میں مروی ہے کہ جناب پیغمبر اسلام علیہ وعلیٰ آلہ السلام نے شبِ معراج جنّت کی سیر فرمائی۔ اس سے قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ جنّت موجود و مخلوق ہے۔ ورنہ اس کی سیر کرنا چہ معنیٰ دارد؟ اسی طرح آنجناب کا جہنم کو ملاحظہ کرنا بھی ثابت ہے۔ پس اس مستند واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ جنّت و جہنم خلق ہو چکی ہیں۔ اس امر کا انکار کرنا پیغمبر اسلام ﷺ کی تکذیب کے مترادف ہے۔ یہی استدلال کتاب عیون الاخبار الرضاؑ میں جناب امام رضا علیہ السلام سے اس سلسلہ میں منقول ہے۔ اس کے آخر میں یوں مروی ہے، فرمایا: جو لوگ جنّت و جہنم کے مخلوق ہونے کا انکار کرتے ہیں، "ما اولئک منا و لا نحن منھم من انکر خلق الجنۃ و النار فقد کذب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ و کذبنا و لیس من ولایتنا علی شئی و خلد فی نار جھنم"۔ وہ ہم سے نہیں ہیں۔ اور نہ ہم ان سے ہیں۔ جو شخص جنّت و نار کے خلق ہونے کا انکار کرتا ہے وہ جناب رسولِ خدا اور ہم کو جھٹلاتا ہے۔ اور ہماری ولایت کا منکر ہے۔ اس لیے آتش جہنم میں رہے گا۔ پس ان حقائق کی روشنی میں ثابت ہو گیا ہے کہ جنّت و جہنم پیدا ہو چکی ہیں۔ اور اس وقت موجود ہیں۔

ازالۂ اوہام

اس سلسلہ میں چند شبہات پیش کیے جاتے ہیں۔ یہاں ان کا ذکر مع ان کے جوابات کے

و صنف منهم يعبدونه حبًا له فتلك عبادة الكرام و هم الامناء ذلك قوله عزوجل و هم من فزع يومئذ أمنون و اعتقادنا فی النار

تیسرا گروہ وہ ہے جو محبّتِ الٰہی سے سرشار ہوکر اس کی عبادت کرتا ہے۔ یہ کریم لوگوں والی عبادت ہے اور یہی گروہ امن و امان پانے والا ہے۔ جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے یہ لوگ اس روز خوف و خطر سے محفوظ رہیں گے (نمل:۸۹) دوزخ کے متعلق ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ وہ ذلت و رسوائی

....

فائدہ سے خالی نہیں ہے۔

پہلا شُبہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جس جنّت میں ٹھہرایا گیا تھا، وہ جنّت الخلد نہ تھی، بلکہ دنیوی باغات میں سے ایک باغ تھا۔ جس میں شمس و قمر طلوع کرتے تھے۔ جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس مضمون کی ایک روایت بھی مروی ہے۔ نیز یہ کہ اگر وہ جنّت الخلد ہوتی تو جناب آدمؑ ہرگز اس سے نہ نکلتے۔ کیونکہ اس جنّت کے ساکنین کے متعلق ارشادِ قدرت ہے: "هم فيها خالدون" جنتی ہمیشہ جنّت میں رہیں گے۔

اس شبہ کے متعلق جواباً عرض ہے کہ اگرچہ متکلمین و مُفسّرین کے درمیان قدرے اختلاف ہے کہ آیا جنّت آدم کوئی دنیوی باغ تھا، یا جنّت الخلد تھی؟ بعض مُفسّرین کا یہی خیال ہے جو اس شبہ میں ذکر کیا گیا ہے، اور حضرت مُصنّف علام نے بھی اس رسالہ میں اسی قول کو اختیار فرمایا ہے۔ لیکن اکثر مُفسّرین و متکلمین نے اس سے جنّت الخلد مراد لی ہے۔ چنانچہ اوپر دلیل اول کے ضمن میں مُتعدّد روایات اس کے ثبوت میں پیش کی جا چکی ہیں۔ وہ حدیث جو اس سلسلہ میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرف منسُوب ہے۔ وہ سند و عدد کے اعتبار سے ان روایات کے مقابلہ و معارضہ سے قاصر ہے۔ لہٰذا انہی روایات کو ترجیح دی جائے گی جو تعداد کے اعتبار سے اکثر اور سند کے لحاظ سے اصح ہیں۔ اور یہ جو کہا گیا ہے کہ اگر وہ جنّت الخلد ہوتی تو آدمؑ اس سے ہرگز نہ نکالے جاتے۔ مُعترض کو معلُوم ہونا چاہیے کہ جنتی جو ہمیشہ جنّت میں رہیں گے یہ اس وقت کے متعلق ہے جب وہ بطور جزا و ثواب اس میں داخل ہوں گے۔ اور ظاہر ہے کہ جناب آدمؑ کو بطور جزا و ثواب اس میں نہیں ٹھہرایا گیا تھا، ورنہ اگر علی الاطلاق کسی صورت میں بھی کوئی شخص ایک مرتبہ جنّت الخلد میں داخل ہونے کے بعد پھر اس سے باہر نہ آسکتا، تو جناب رسولِ خدا ﷺ شبِ معراج کو اس میں داخل ہوکر ہرگز باہر تشریف نہ لاتے۔ اسی طرح جناب جبرئیل امینؑ بھی اس کے باہر کبھی قدم نہ رکھتے۔ لیکن ایسا ہوتا رہتا ہے جس کا انکار نہیں کیا

انها دار الهوان و دار الانتقام من اهل الکفر و العصیان و لا یخلد فیها الا اهل الکفر و الشرك فما المذنبون من اهل التوحید

اور کافر و گنہگاروں سے بدلہ و انتقام لینے کا مقام ہے۔ اس میں ہمیشہ ہمیشہ صرف وہی لوگ رہیں گے جو کافر و مشرک ہوں گے لیکن اہل توحید میں سے گنہگار بندے خدا کی رحمت اور (نبیؐ کی) شفاعت کے ذریعہ جو انھیں نصیب ہوگی جہنم سے نکالے

جاسکتا ہے۔ لہٰذا ماننا پڑتا ہے کہ یہ کلیہ غلط ہے کہ جنّت الخلد میں کسی طرح بھی داخل ہونے کے بعد پھر اس سے کوئی شخص باہر نہیں آسکتا۔

ان حقائق سے معلوم ہوا کہ جنّت آدمؑ جنّت الخلد ہی تھی۔ اسی لیے شارح "مقاصد" نے لکھا ہے: "حملها علی بستان من بساتین الدنیا یجری مجری التلاعب بالدین و المراغمة لاجماع المسلمین"۔ یعنی جنّت آدمؑ کو دنیوی باغ پر محمول کرنا دین کے ساتھ کھیلنے اور مسلمانوں کے اجماع کو ٹھکرانے کے مترادف ہے۔ (جلد ۲ صفحہ ۲۱۸ طبع اسلامبول)

دوسرا شبہ اور اس کا جواب

جب کہ جنّت و جہنم کی ضرورت قیامت کے بعد درپیش آئے گی تو اس وقت ان کا خلق کرنا عبث و بے فائدہ ہے۔ اور خدا عبث کام نہیں کرتا۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اس سے ہرگز کوئی عبث کاری لازم نہیں آتی، بلکہ اس میں چند اسرار و رموز مُضمر ہیں۔ ایک مصلحت تو یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں جنّت کے حاصل کرنے کا اشتیاق اور جہنم سے بچنے کا جذبہ صادق پیدا ہو اور اپنے اس جذبہ صادق و خوف کے تحت طاعتِ الٰہی میں مشغول ہوں، اور معصیتِ الٰہی سے اجتناب کریں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ جنّت و جہنم کا وجود مقرب الی الطاعۃ اور مبعد عن المعصیۃ ہے۔ اور ایسی چیز کو اصطلاحِ متکلمین میں "لطف" کہتے ہیں۔ جسے خداوند عالم ہرگز ترک نہیں کرتا۔ علاوہ بریں اس میں دوسری مصلحت یہ ہے کہ گو ہم نے جنّت و جہنم کو نہیں دیکھا، اور فقط صادقین سے سن کر ان پر ایمان بالغیب لائے ہیں لیکن عقل حاکم ہے کہ جن بزرگواروں کو خداوند عالم کائناتِ عالم کا ہادی و راہبر بنا کر بھیجے کم از کم انھیں تو ان چیزوں کا مشاہدہ کر لینا چاہیے، تاکہ وہ لوگوں کو اپنے مشاہدہ کے مطابق خبر دے سکیں۔ اور ان کی تسکین کرا سکیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو لوگ ان کے اخبار پر اعتماد نہیں کریں گے اور جنّت و نار کے متعلق ان کے اخبار کو سنی سنائی بات کہہ کر ٹال دیں گے۔ اور اس طرح ان کی بعثت کا جو مقصد ہے وہ فوت ہو کر جائے گا۔ اور خدائے حکیم ہرگز کوئی کام نہیں کرتا، جس کی وجہ سے اس کے

فیخرجون منها بالرحمة التی تدرکهم و الشفاعة التی تنالهم وروی انه لا یصیب احدا من اهل التوحید الم فی النار۔

جائیں گے۔ مروی ہے کہ اہل توحید میں سے جو لوگ دوزخ میں داخل ہوں گے انھیں وہاں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

انبیاء ومرسلین کی بعثت عبث وبے کار ہوکر رہ جائے۔ علاوہ بریں یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ اس وقت جنّت وجہنم بالکل خالی اور بے کار پڑی ہوئی ہے، بلکہ ان میں نیکوکار یا بدکار لوگوں کی روحیں موجود ہیں۔ چنانچہ کتاب توحید شیخ صدوقؒ میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: "واللہ ما خلت الجنة من ارواح المومنین منذ خلقها و لا خلت النار من ارواح الکفار و العصاة منذ خلقها"۔ خدا کی قسم جب سے خدا نے جنّت کو خلق فرمایا ہے وہ مومنین کی روحوں سے کبھی خالی نہیں رہی، اور جب سے جہنم کو پیدا کیا ہے وہ بھی کافروں اور گنہگاروں کی روحوں سے خالی نہیں رہی۔

تیسرا شبہ اور اس کا جواب

جنّت کے بارے میں قرآن میں وارد ہے: "عرضها کعرض السماء و الارض" (حدید:۲۱) کہ فقط اس کا عرض زمین و آسمان کے برابر ہے۔ اس سے طول کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ اسی طرح جہنم کی جسامت کے متعلق متعدد آثار واخبار موجود ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ اس وقت خلق ہو چکی ہیں تو وہ کہاں موجود ہیں؟ اور ان کی گنجائش زمین و آسمان میں کس طرح ممکن ہے؟ جواباً واضح ہو کہ اگرچہ جنّت وجہنم کے محل ومقام میں قدرے اختلاف ہے، اور اس سلسلہ میں کوئی قطعی وحتمی بات کہنا ذرا مشکل ہے۔ چنانچہ علامہ سید عبداللہ شبر مرحوم "حق الیقین" میں فرماتے ہیں: "و الالیق الایمان لاجمالی بذلك و لا حاجة فی الخوض عما سکت اللہ عنه و نهی عن الخوض فیه و التفحص عن مکان الجنة و النار"۔ یعنی اولیٰ وانسب یہ ہے کہ ان حقائق پر اجمالی ایمان رکھا جائے اور جن چیزوں کے متعلق خود خداوند عالم نے سکوت اختیار فرمایا ہے، ان میں زیادہ غور وخوض نہ کیا جائے۔ لہٰذا جنّت و جہنم کے محل وقوع کے متعلق زیادہ تتبع وتفحص نہیں کرنا چاہیے۔

اسی طرح شارح مقاصد نے لکھا ہے: "لم یرو نص صریح فی تعین مکان الجنة و النار و الحق تفریض ذلك الی الخبیر"۔ جنّت وجہنم کے مکان کے تعین کے متعلق کوئی نص صریح وارد نہیں ہوئی، اس لیے حق یہ ہے کہ اس امر کی حقیقت کا علم خدائے لطیف وخبیر کے سپرد کیا جائے۔ لیکن جو کچھ بعض آیات وروایات اور اکثر مسلمانوں کے اقوال و آراء سے مستفاد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جنّت ساتویں

اذا دخلوها و انما یصیب هم الا لام عند الخروج منها فتکون تلك لالام جزاء بما کسبت ایدیهم و ما الله بظلام للعبید	ہاں البتہ اس سے نکلتے وقت انھیں اذیت وتکلیف ہوگی۔ یہ تکلیفیں ان کے خودکردہ اعمالِ بد کا بدلہ ہوجائیں گی، خدا اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا (عمران: ۱۸۲)

آسمان کے اوپر اور جہنم ساتویں زمین کے نیچے ہے۔ جن روایات میں لفظ "فی السماء" وارد ہے اس سے مراد "علی السماء" ہے۔ چنانچہ تفسیر قمی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: "والدلیل علی ان الجنان فی السماء قوله تعالیٰ لا تفتح لهم ابواب السماء و لا یدخلون الجنة"۔ یعنی اس بات کی دلیل کہ جنّت آسمانوں پر ہے، خداوند عالم کا یہ ارشاد ہے کہ ان (کفار) کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔ اور نہ وہ جنّت میں داخل ہوسکیں گے۔ نیز سابق آیت مبارکہ "و عندها جنت الماویٰ" (نجم: ۲۳) کے ساتھ بھی استدلال کیا جاچکا ہے کہ جنّت ساتویں آسمان کے اوپر ہے۔ کتاب خصال شیخ صدوقؒ میں ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ دو یہودی جناب امیرالمومنین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جنّت وجہنم کے مقام کے متعلق سوال کیا۔ آپؑ نے فرمایا: "اما الجنة ففی السماء و اما النار ففی الارض"۔ یعنی جنّت آسمانوں پر اور جہنم زمینوں کے نیچے ہے۔ بنا بریں جب جنّت آسمانوں کے اوپر ہے تو وہ شبہ خود بخود ختم ہوکر رہ جاتا ہے کہ جب جنّت کا عرض زمین و آسمان کے برابر ہے تو وہ ان میں کس طرح سما سکتی ہے۔ تفسیر کبیر میں فخرالدین رازی نے انس بن مالک سے جو روایت نقل کی ہے وہ اس مطلب پر نص صریح ہے اور اس سے ہمارے بیان کردہ نظریہ کی تائید مزید ہوتی ہے۔ اس روایت میں وارد ہے کہ ان سے پوچھا گیا کہ جنّت آسمان میں ہے یا زمین میں؟ انھوں نے جواب میں کہا: "ای ارض و سماء تسع الجنة"۔ کس زمین و آسمان میں جنّت کی گنجائش ہے؟ سائل نے کہا تو پھر وہ کہاں ہے؟ کہا: "فوق السموت السبع تحت العرش" عرش کے نیچے اور ساتوں آسمانوں کے اوپر۔ اس سلسلہ میں سرکار علامہ مجلسیؒ کی وہ تحقیق انیق جو مبحث صراط میں نقل ہوچکی ہے بہت مُفید ہے۔ اس مقام کی طرف رجوع کیا جائے۔

بہشت اور اس کے بعض لذائذ کا بیان قرآن کی روشنی میں

جنّت کی کما حقہ تعریف و توصیف تو ممکن نہیں۔ ایک فارسی ضرب المثل ہے: "حلوائے نان تانی تا نخوری نہ دانی" نعماتِ بہشت کی بھی یہی کیفیت ہے۔ "رزقنا الله و جمیع المومنین حورها و قصورها و سرورها"۔ پس اجمالاً اس قدر واضح رہے کہ آیات و اخبار سے جو کچھ مُستفاد ہوتا ہے وہ یہ

و اھل النار ھم المساکین حقا لا یقضی علیھم فیموتوا و لا یخفف عنھم من عذابھا و لا یذوقون فیھا بردا و لا شرابا الا حمیما و غساقا

درحقیقت اہل جہنم ہی محتاج و مسکین ہیں ۔ نہ تو ان کی قضا آئے گی کہ وہ مرہی جائیں ، اور نہ ہی ان کے عذاب میں کچھ کمی کی جائے گی ۔ اور نہ وہ دوزخ میں عمدہ پانی اور ٹھنڈک کا ذائقہ چکھیں گے ، بلکہ اس کے عوض انھیں کھولتا ہوا پانی اور بہتی ہوئی پیپ ان کے اعمال بد کے بدلہ میں دی جائے گی ۔ (نبأ: ۲۴)

ہے کہ جنّت ایک ایسا مقام ہے کہ جس میں جیسا کہ متن رسالہ میں مذکور ہے، نہ بڑھاپا ہوگا، نہ موت، نہ اس میں رنج والم ہوگا، نہ مرض وسقم ۔ نہ وہاں فقروفاقہ ہوگا نہ کوئی آفت ومصیبت ۔ نہ وہاں بغض و حسد ہوگا نہ باہمی دشمنی و عداوت ۔ نہ وہاں نزاع و جدال ہوگا، نہ قتل وقتال ۔ بلکہ وہ سراسر سعادت و کرامت اور ابدی راحت و آرام کا گھر ہے ۔ "لھم فیھا ما تشتھی الانفس و تلذ الاعین و ھم فیھا خالدون" (زخرف: ۷۱) اہل جنّت کے لیے وہاں از قسم خوراک و پوشاک وغیرہ ہر وہ چیز موجود ہوگی جسے ان کے نفوس چاہیں گے ۔ اور جس سے ان کی آنکھیں لذت اندوز ہوں گی ۔ اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے ۔ بہرکیف جنّت وہ ارفع واعلیٰ مقام ہے کہ جس کے متعلق جناب رسولِ خدا ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: "شبر من الجنة خیر من الدنیا و ما فیھا" جنّت کی ایک بالشت جگہ تمام دنیا و مافیہا سے بہتر و برتر ہے ۔ (بحارالانوار جلد ۳) وہاں نہ گرمی ہوگی اور نہ سردی، بلکہ ہمیشہ نہایت خوشگوار موسم رہے گا ۔ ارشادِ قدرت ہے: "لا یرون فیھا شمسا و لا زمھریرا" (دہر: ۱۳) (نہ وہاں آفتاب کی دھوپ دیکھیں گے اور نہ شدت کی سردی ۔) ...... ان امور کے اثبات کے سلسلہ میں نہایت اختصار کے ساتھ ذیل میں چند آیاتِ قرآنیہ وروایاتِ معصومیہ پیش کی جاتی ہیں :

ارشادِ قدرت ہوتا ہے :

لِلَّذِينَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ (آلِ عمران: ۱۵)

جن لوگوں نے پرہیزگاری اختیار کی، ان کے لیے ان کے پروردگار کے ہاں (بہشت کے) وہ باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں (اور وہ) ہمیشہ اس میں رہیں گے ۔ اور اس کے علاوہ ان کے لیے صاف ستھری بیبیاں ہیں ۔ اور (سب سے بڑھ کر) خدا کی خوشنودی ہے ۔

جزآء وفاقا فان استطعموا اطعموا من الزقوم و ان استغاثوا يغاثوا بماء كالمهل يشوي الوجوه بئس الشراب و سائت مرتفقا ينادون	اور اگر وہ کھانا طلب کریں گے تو زقوم (تھوہر) انھیں کھانے کے لیے دیا جائے گا (واقعہ: ۵۲) اور اگر انھوں نے داد و فریاد کی تو ان کی فریاد رسی اس طرح کی جائے گی کہ انھیں ایسا پانی پلایا جائے گا جو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہوگا۔ جو ان کے چہروں کو جلا کر بھون دے گا۔ وہ کیسا برا پانی اور جہنم کیسا برا

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۴۵﴾ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَ نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۴۷﴾ لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّ مَا هُمْ مِّنْهَا (سورۃ الحجر: ۴۵ تا ۴۸)

اور پرہیزگار تو (بہشت کے) باغوں اور چشموں میں یقیناً ہوں گے (داخلہ کے وقت فرشتے کہیں گے کہ) ان میں سلامتی اور اطمینان سے چلے چلو اور (دنیا کی تکلیفوں سے) جو کچھ ان کے دل میں رنج تھا، اس کو بھی ہم نکال دیں گے۔ اور یہ باہم ایک دوسرے کے آمنے سامنے تختوں پر اس طرح بیٹھے ہوں گے جیسے بھائی بھائی۔ ان کو بہشت میں چھوئے گی بھی تو نہیں۔ اور نہ کبھی اس میں سے نکالے جائیں گے۔

وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ؕ وَلَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ (سورۃ محمد: ۱۵)

اور کچھ ندیاں صاف کیے ہوئے شہد کی ہوں گی۔ اور ان لوگوں کے لیے اس (جنّت) میں ہر قسم کے میوے ہوں گے۔

يَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ (سورۃ الکہف: ۳۱)

باریک اور اطلس کے سبز کپڑوں میں ملبوس مسندوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۴۱﴾ فَوَاكِهُ ۚ وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۴۲﴾ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۴۳﴾ عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۴۴﴾ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ﴿۴۵﴾ بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿۴۶﴾ لَا فِيْهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ ﴿۴۸﴾ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿۴۹﴾ (سورۃ الصافات: ۴۰ تا ۴۹)

مگر خدا کے برگزیدہ بندے ان کے واسطے (بہشت میں) مُنفرد رزق ہوگا۔ اور بھی ایسی ویسی نہیں، ہر قسم کے میوے اور وہ لوگ بڑی عزت سے نعمت کے (لدے ہوئے) باغوں میں تختوں پر (چین سے) آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ ان

من مکان بعید و یقولون ربنا	ٹھکانا ہے۔(حم سجدہ:۴۴)اہل جہنم دور سے پکاریں گے: اے
خرجنا منہا فان عدنا فانا	ہمارے پروردگار! ہمیں یہاں سے نکال۔ اگر ہم دوبارہ وہی اعمال
ظالمون فیمسك الجواب عنہم	کریں تو بےشک ہم ظالم وتم گار ہوں گے(حم سجدہ:۴۴) کافی
حیاناً ثم قیل لہم اخسئوا فیہا	مدت تک انھیں کوئی جواب نہیں دیا جائے گا۔ پھر کہا جائے گا کہ تم اسی

میں صاف سفید براق شراب کے جام کا دور چل رہا ہوگا۔ جو پینے والوں کو بڑا مزہ دے گی۔ (اور پھر) نہ اس شراب میں خمار کی وجہ سے دردِ سر ہوگا اور نہ وہ اس (کے پینے) سے متوالے ہوں گے۔ اور ان کے پہلو میں (شرم سے) نیچی نگاہ کرنے والی بڑی بڑی آنکھوں والی (پریاں) ہوں گی۔ (ان کی گوری گوری رنگتوں میں ہلکی سی سرخی ایسی جھلکتی ہوگی) گویا وہ انڈے ہیں۔ جو چھپائے ہوئے رکھے ہوں۔

لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ ۙ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۬ؕ وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ ۝۲۰ (سورۃ الزمر:۲۰)

مگر جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے رہے ان کے اونچے اونچے محل ہیں، (اور) بالا خانوں پر بالا خانے بنے ہوئے ہیں۔ جن کے نیچے نہریں جاری ہیں (یہ) خدا کا وعدہ ہے (اور) خدا وعدہ خلافی نہیں کیا کرتا۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ۝۶۹ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ۝۷۰ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ ۚ وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۷۱ (سورۃ الزخرف: ۶۹ تا ۷۱)

(یہ) وہ لوگ ہیں جو ہماری آیتوں پر ایمان لائے اور (ہمارے) فرمانبردار تھے۔ تو تم اپنی بیبیوں سمیت اعزاز واکرام سے بہشت میں داخل ہوجاؤ۔ ان پر سونے کی رکابیوں اور پیالوں کا دور چلے گا۔ اور وہاں جس چیز کو جی چاہے اور جس سے آنکھیں لذت اٹھائیں (سب موجود ہے) اور تم اس میں ہمیشہ رہوگے۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ؕ وَلَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ؕ (سورۃ محمد: ۱۵)

ولا تکلمون. ونادوا یا مالك لیقض علینا ربك قال انکم ماکثون. و روی بالاسانید الصحیحة انه یأمر الله تعالیٰ برجال الی النار......	آگ میں ذلیل و رسوا ہوکر رہو اور مجھ سے کلام نہ کرو (مومنون:۱۰۸) پھر وہ باآوازِ بلند کہیں گے: اے مالک! (داروغہ جہنم) تمھارے پروردگار کو چاہیے کہ وہ ہمیں موت ہی دیدے تاکہ ہم مرجائیں۔ مالک انھیں جواب دے گا: تم یہاں ہی اسی حالت میں رہوگے (زخرف:۷۷) اسانید

جس بہشت کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا جاتا ہے اس کی صفت یہ ہے کہ اس میں پانی کی نہریں جن میں ذرا بو نہیں اور دودھ کی نہریں ہیں جن کا مزا تک نہیں بدلا۔ اور شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لیے (سراسر) لذت ہے۔ اور صاف شفاف شہد کی نہریں ہیں اور وہاں ان کے لیے ہر قسم کے میوے ہیں۔ اور ان کے پروردگار کی طرف سے بخشش ہے۔

عَلٰی سُرُرٍ مَّوۡضُوۡنَةٍ ﴿۱۵﴾ مُّتَّکِـِٕیۡنَ عَلَیۡہَا مُتَقٰبِلِیۡنَ ﴿۱۶﴾ یَطُوۡفُ عَلَیۡہِمۡ وِلۡدَانٌ مُّخَلَّدُوۡنَ ﴿۱۷﴾ بِاَکۡوَابٍ وَّ اَبَارِیۡقَ ۬ۙ وَ کَاۡسٍ مِّنۡ مَّعِیۡنٍ ﴿۱۸﴾ لَّا یُصَدَّعُوۡنَ عَنۡہَا وَ لَا یُنۡزِفُوۡنَ ﴿۱۹﴾ وَ فَاکِہَةٍ مِّمَّا یَتَخَیَّرُوۡنَ ﴿۲۰﴾ وَ لَحۡمِ طَیۡرٍ مِّمَّا یَشۡتَہُوۡنَ ﴿۲۱﴾ وَ حُوۡرٌ عِیۡنٌ ﴿۲۲﴾ کَاَمۡثَالِ اللُّؤۡلُؤِ الۡمَکۡنُوۡنِ ﴿۲۳﴾ جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۴﴾ لَا یَسۡمَعُوۡنَ فِیۡہَا لَغۡوًا وَّ لَا تَاۡثِیۡمًا ﴿۲۵﴾ اِلَّا قِیۡلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿۲۶﴾ (سورۃ الواقعۃ:۱۵تا۲۶)

موتی اور یاقوت سے جڑے ہوئے سونے کے تاروں سے بنے ہوئے تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے تکیے لگائے (بیٹھے) ہوں گے، نوجوان لڑکے جو (بہشت میں) ہمیشہ (لڑکے ہی بنے) رہیں گے (شربت وغیرہ کے) ساغر اور چمکدار ٹونٹی دار کنٹر اور شفاف شراب کے جام لیے ہوئے ان کے پاس چکر لگاتے ہوں گے۔ جن کے (پینے سے) نہ تو ان کو (خمار سے) دردِ سر ہوگا، اور نہ وہ بدحواس مدہوش ہوں گے۔ اور جس قسم کے میوے پسند کریں گے اور جس قسم کے پرند کا گوشت ان کا جی چاہے (سب موجود ہے) اور بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں جیسے احتیاط سے رکھے ہوئے موتی، یہ بدلا ہے ان کے (نیک) اعمال کا، وہاں نہ تو بیہودہ باتیں سنیں گے اور نہ گناہ کی بات (فحش) بس ان کا کلام سلام ہی سلام ہوگا۔

اِنَّ الۡاَبۡرَارَ یَشۡرَبُوۡنَ مِنۡ کَاۡسٍ کَانَ مِزَاجُہَا کَافُوۡرًا ﴿۵﴾ عَیۡنًا یَّشۡرَبُ بِہَا عِبَادُ اللّٰہِ یُفَجِّرُوۡنَہَا

فیقول لمالك قل للنار لا تحرق لهم اقداما فقد کانوا یمشون الیٰ المساجد و لا تحرق لهم ایدیا فقد کانوا یرفعونها الیٰ بالدعاء و لا تحرق لهم ألسنة

صحیحہ سے منقول ہے کہ خداوندعالم بعض لوگوں کو جہنم میں داخل کرنے کا حکم دینے کے بعد داروغہ جہنم سے فرمائے گا: جہنم سے کہو کہ وہ ان کے قدموں کو نہ جلائے کیونکہ وہ مسجدوں میں ان سے چل کر جاتے تھے۔ ان کے

تَفْجِيرًا ﴿٦﴾ يُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ﴿٧﴾ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ﴿٨﴾ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ﴿٩﴾ إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا ﴿١٠﴾ فَوَقَاهُمُ اللَّهُ شَرَّ ذَٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقَّاهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورًا ﴿١١﴾ وَجَزَاهُم بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيرًا ﴿١٢﴾ مُّتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ ۖ لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَلَا زَمْهَرِيرًا ﴿١٣﴾ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلَالُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا ﴿١٤﴾ وَيُطَافُ عَلَيْهِم بِآنِيَةٍ مِّن فِضَّةٍ وَأَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيرَا ﴿١٥﴾ قَوَارِيرَ مِن فِضَّةٍ قَدَّرُوهَا تَقْدِيرًا ﴿١٦﴾ وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنجَبِيلًا ﴿١٧﴾ عَيْنًا فِيهَا تُسَمَّىٰ سَلْسَبِيلًا ﴿١٨﴾ وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنثُورًا ﴿١٩﴾ وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلْكًا كَبِيرًا ﴿٢٠﴾ عَالِيَهُمْ ثِيَابُ سُندُسٍ خُضْرٌ وَإِسْتَبْرَقٌ ۖ وَحُلُّوا أَسَاوِرَ مِن فِضَّةٍ وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا ﴿٢١﴾ (سورۃ الدھر:۵ تا ۲۱)

بے شک نیکوکار لوگ شراب کے وہ ساغر پئیں گے جس میں کافور کی آمیزش ہوگی۔ یہ ایک چشمہ ہے جس میں خدا کے خاص (بندے) پییں گے۔ اور جہاں چاہیں گے بہالے جائیں گے اور ان کے صبر کے بدلے (بہشت کے) باغ اور ریشم (کی پوشاک) عطا فرمائے گا۔ وہاں وہ تختوں پر تکیے لگائے (بیٹھے) ہوں گے، نہ وہاں (آفتاب کی) دھوپ دیکھیں گے اور نہ شدت کی سردی اور گھنے درختوں کے سائے ان پر جھکے ہوئے ہوں گے۔ اور میووں کے گچھے ان کے بہت قریب ہر طرح ان کے اختیار میں ہوں گے، اور ان کے سامنے ہمیشہ ایک حالت پر رہنے والے نوجوان لڑکے چکر لگاتے ہوں گے کہ جب تم ان کو دیکھو تو سمجھو کہ بکھرے ہوئے موتی ہیں اور ان کا پروردگار انھیں نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا۔

لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ (سورۃ دخان:۵۶)

فقد كانوا يكثرون تلاوة القرآن و لا تحرق لهم وجوها فقد كانوا يسبغون الوضوء فيقول المالك يا اشقياء فما كان حالكم؟

ہاتھوں کو نہ جلائے کہ وہ ان کو دعا کے لیے میری بارگاہ میں بلند کرتے تھے۔ ان کی زبانوں کو بھی نہ جلائے کہ وہ ان کے ذریعے بکثرت تلاوتِ قرآن کیا کرتے تھے، اور ان کے چہروں کو بھی نہ جلائے کیونکہ یہ مکمل طور پر وضو کیا کرتے تھے۔

جنّت میں جنّتی سوائے پہلی موت کے پھر موت کا ذائقہ نہیں چکھیں گے۔

لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ﴿۴۸﴾ (سورۃ الحجر:۴۸)

وہاں ان کو کوئی ہم و غم نہیں چھوئے گا اور نہ ہی ان کو وہاں سے نکالا جائے گا۔

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ؕ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿۶۲﴾ (سورۃ مریم:۶۲)

جنّتی وہاں کوئی لغو اور بے کار بات نہ سنیں گے، سوائے سلام کے اور ان کو اس میں صبح و شام روزی ملے گی۔

وَ سَارِعُوْۤا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

(سورۃ آلِ عمران:۱۳۳)

اور اپنے پروردگار کے (سبب) بخشش اور جنّت کی طرف دوڑ پڑو۔ جس کی وسعت سارے آسمان اور زمین کے برابر ہے۔ اور پرہیزگاروں کے لیے مہیا کی گئی ہے۔

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۲﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۴﴾ (سورۃ الرعد:۲۲ تا ۲۴)

اور وہ لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے (جو مصیبت ان پر پڑی) جھیل گئے اور پابندی سے نماز ادا کی، اور جو کچھ ہم نے انھیں روزی دی تھی، اس میں سے چھپا کر اور دکھلا کر (خدا کی راہ میں) خرچ کیا۔ اور یہ لوگ برائی کو بھی بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت کی خوبی مخصوص ہے (یعنی) ہمیشہ رہنے کے باغ، جن میں وہ آپ جائیں گے، اور ان کے باپ داداؤں اور ان کی بیبیوں اور ان کے اولاد میں سے جو نیکوکار ہیں (وہ سب بھی) اور

فیقولون کنا نعمل لغیر الله فقیل خذوا ثوابکم ممن عملتم له و اعتقادنا فی الجنة و النار انهما مخلوقتان و ان النبیّ قد

داروغہ جہنم ان سے کہے گا: اے بدبختو! تمھاری کیا کیفیت تھی؟ ہم یہ سب اعمال غیر خدا کی خوشنودی کے لیے بجالاتے تھے۔ پس ان سے کہا جائے گا کہ جس کے لیے تم یہ اعمال بجالایا کرتے تھے، اب ان کا بدلہ اور ثواب بھی اسی سے حاصل کرو۔ نیز جنّت اور دوزخ کے بارے میں ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ یہ پیدا ہوچکی ہیں۔ شب معراج کو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

فرشتے (بہشت کے ہر) ہر دروازے سے ان کے پاس آئیں گے اور سلامٌ علیکم (کے بعد کہیں گے) کہ (دنیا میں) تم نے صبر کیا (یہ اسی کا صلہ ہے، دیکھو) تو آخرت کا گھر کیسا اچھا ہے۔

قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّ مَصِيْرًا ﴿۱۵﴾ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ؕ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا ﴿۱۶﴾ (سورۃ الفرقان:۱۵ و ۱۶)

(اے رسولؐ!) تم پوچھو تو کہ یہ جہنم بہتر ہے یا ہمیشہ رہنے کا باغ (بہشت) جس کا پرہیز گاروں سے وعدہ کیا گیا ہے کہ وہ ان (کے اعمال) کا صلہ ہوگا، اور آخری ٹھکانا جس چیز کی وہ خواہش کریں گے، ان کے ہاں موجود ہوگی (اور) وہ ہمیشہ اسی حال میں رہیں گے۔ یہ تمھارے پروردگار پر (ایک لازمی اور) مانگا ہوا وعدہ ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۰﴾ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴿۳۱﴾ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ﴿۳۲﴾ (سورۃ حٰمٓ سجدۃ:۳۰ تا ۳۲)

اور جن لوگوں نے (سچے دل سے) کہا کہ ہمارا پروردگار تو (بس) خدا ہے، پھر وہ اسی پر قائم بھی رہے، ان پر موت کے وقت (رحمت کے) فرشتے نازل ہوں گے، اور کہیں گے کہ کچھ خوف نہ کرو، اور نہ غم کھاؤ، اور جس بہشت کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا، اس کی خوشیاں مناؤ۔ ہم دنیا کی زندگی میں بھی تمھارے دوست تھے اور آخرت میں بھی (رفیق) ہیں۔ اور جس چیز کو تمھارا جی چاہے بہشت میں تمھارے واسطے موجود ہے۔ اور جو چیز طلب کرو گے، وہاں تمھارے لیے (حاضر ہوگی) (یہ) بخشنے

دخل الجنة و رأى النار حين عرج به و اعتقادنا انه لا يخرج احد من الدنيا حتى يرى مكانه من الجنة و من النار و ان المؤمن

نے جنّت کی سیر فرمائی تھی اور دوزخ کا بھی ملاحظہ فرمایا تھا، ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ کوئی شخص دنیا سے اس وقت تک نہیں جاتا جب تک جنّت یا دوزخ میں اپنا مکان دیکھ نہیں لیتا۔ مومن اس وقت تک دنیا سے نہیں جاتا جب تک پہلے دنیا اس کے سامنے اس

والے مہربان (خدا) کی طرف سے (تمھاری) مہمانی ہے۔

فِيهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴿۵۶﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۷﴾ كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ ﴿۵۸﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۹﴾ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴿۶۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۱﴾ وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ﴿۶۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۳﴾ مُدْهَآمَّتٰنِ ﴿۶۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۵﴾ فِيهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ﴿۶۶﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۷﴾ فِيهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ﴿۶۸﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۹﴾ فِيهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ﴿۷۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۱﴾ حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ ﴿۷۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۳﴾ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴿۷۴﴾ (سورة الرحمٰن: ۵۶ تا ۷۴)

اس میں (پاکدامن) غیر کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنے والی عورتیں ہوں گی جن کو ان سے پہلے نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا ہوگا اور نہ جنّ نے۔ تو تم دونوں (جنّ و انس) اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ وہ حوریں ہیں جو خیموں میں چھپی بیٹھی ہیں۔ پھر تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت سے انکار کرو گے۔ ان سے پہلے ان کو کسی انسان نے چھوا تک نہیں اور نہ جنّ نے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِي ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۴۱﴾ وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۴۲﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۴۴﴾ (سورة المرسلات: ۴۱ تا ۴۴)

بے شک پرہیزگار لوگ (درختوں کی) گھنی چھاؤں میں ہوں گے اور چشموں اور میووں میں جو انھیں مرغوب ہوں (دنیا میں) جو عمل کرتے تھے اس کے بدلے میں مزے سے کھاؤ پیو مبارک۔ ہم نیکوکاروں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿۲۲﴾ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴿۲۳﴾ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ﴿۲۴﴾ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ﴿۲۵﴾ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ۭ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴿۲۶﴾

لا يخرج من الدنيا حتى يرفع له الدنيا كاحسن ما راها و يرى مكانه فى الاخرة ثم تخير بين الدنيا و الاخرة و هو يختار الاخرة

کی بہترین دیکھی ہوئی صورت میں پیش نہیں کی جاتی اور اسی حالت میں جنّت میں اپنا مکان دیکھتا ہے پھر اسے دنیا و آخرت کے درمیان اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ جسے چاہے اختیار کرے۔ چنانچہ مومن آخرت کو ہی اختیار کرتا ہے۔

بے شک نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے۔ تختوں پر بیٹھے نظارے کریں گے۔ تم ان کے چہروں ہی سے راحت کی تازگی معلوم کرلو گے۔ ان کو سربمہر خالص شراب پلائی جائے گی، جن کی مُہر مُشک کی ہوگی۔ اور اس کی طرف البتہ شائقین کو رغبت کرنی چاہیے۔

(سورۃ المطففین: ۲۲ تا ۲۶)

فِىۡ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۞ لَّا تَسۡمَعُ فِيۡهَا لَاغِيَةً ۞ فِيۡهَا عَيۡنٌ جَارِيَةٌ ۞ فِيۡهَا سُرُرٌ مَّرۡفُوۡعَةٌ ۞ وَّاَكۡوَابٌ مَّوۡضُوۡعَةٌ ۞ وَّنَمَارِقُ مَصۡفُوۡفَةٌ ۞ وَّزَرَابِىُّ مَبۡثُوۡثَةٌ ۞ (سورۃ الغاشیۃ: ۱۰ تا ۱۶)

ایک عالی شان باغ میں، وہاں کوئی لغویات سنیں گے ہی نہیں۔ اس میں چشمے جاری ہوں گے، اس میں اونچے اونچے تخت (بچھے) ہوں گے اور (ان کے کنارے) گلاس رکھے ہوں گے۔ اور گاؤ تکیے قطار کی قطار لگے ہوئے، اور نفیس مسندیں بچھی ہوں گی۔

اِلَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمۡ اَجۡرٌ غَيۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ۞ (سورۃ التین: ۶)

مگر جو لوگ ایمان لائے اور اچھے (اچھے) کام کرتے رہے ان کے لیے تو بے انتہا اجر و ثواب ہے۔

اُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡوَارِثُوۡنَ ۞ الَّذِيۡنَ يَرِثُوۡنَ الۡفِرۡدَوۡسَ ؕ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ۞

(سورۃ المومنون: ۱۰ و ۱۱)

یہی لوگ سچے اور وارث ہیں جو بہشت بریں کا حصّہ لیں گے (اور) یہی لوگ اس میں ہمیشہ (زندہ) رہیں گے۔

طولِ کلام میں فائدہ نہیں۔ قرآن مجید نے نعمات ولذائذ جنّت کے بارہ میں یہ کہہ کر خاموشی اختیار کی ہے کہ:

فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّاۤ اُخۡفِىَ لَهُمۡ مِّنۡ قُرَّةِ اَعۡيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ۞ (سورۃ السجدۃ: ۱۷)

ان لوگوں کی کارگزاریوں کے بدلے میں کیسی کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لیے

فح يقبض روحه و فی العادة يقول الناس فلان يجود بنفسه و لا يجود الانسان بشئ الا عن طيبة نفس غير مقهور و لا مجبور و لا مکرہ

اس وقت اس کی روح قبض کر لی جاتی ہے (عربی زبان کا) عام محاورہ ہے کہ جب کوئی شخص مر رہا ہوتا ہے تو وہ کہتے ہیں "فلان يجود بنفسه" (کہ یہ اپنی جان کی سخاوت کر رہا ہے) مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی خوشی سے موت قبول کر رہا ہے۔ کیونکہ کوئی انسان جب کسی چیز کی سخاوت کرتا ہے تو جبراً یا قہراً نا پسندیدگی کی صورت میں نہیں کرتا بلکہ بطیبِ خاطر ایسا کرتا ہے

ڈھکی چھپی رکھی ہے۔ اس کو تو کوئی شخص جانتا ہی نہیں۔

(ترجمہ حضرت مولانا فرمان علی صاحب مرحوم)

بہشت کے بعض اوصاف کا بیان احادیث کی روشنی میں

ان آیاتِ مبارکہ میں بہشت عنبر سرشت کے جو اوصافِ جمیلہ بیان کیے گئے ہیں، اگرچہ اس سے زیادہ بیان کرنے کی چنداں حاجت و ضرورت تو نہیں ہے، لیکن تاہم مومنین کی جلاء ایمانی کی خاطر یہاں اس سلسلہ میں چند احادیث شریفہ بھی پیش کی جاتی ہیں۔

مُتعدد روایات میں وارد ہے کہ مکاناتِ جنّت کی ساخت اس طرح عمل میں لائی گئی ہے کہ اس کی ایک اینٹ سونے کی ہے، ایک چاندی کی، اور ایک یاقوت کی، گارا "مسک اذفر" کا ہے۔ مٹی زعفران کی اور کنکر لؤلو کے، کنگرے یاقوتِ سرخ کے اور چھت زبرجد کی ہے۔ (انوارِ نعمانیہ وغیرہ)

ثالت بحار میں بروایت ابی بصیر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے اور وہ جناب اپنے آباء و اجداد طاہرینؑ کے سلسلۂ سند سے جناب رسولِ خدا ﷺ سے نقل فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

ان فی الجنة غرفا یری ظاهرها من باطنها و باطنها من ظاهرها یسکنها من امتی من اطاب الکلام و اطعم الطعام و افشی السلام و صلی باللیل و الناس نیام

جنّت میں ایسے کمرے ہیں جن کا ظاہر باطن سے اور باطن ظاہر سے دکھائی دیتا ہے۔ ان میں میری امت کے وہی لوگ سکونت اختیار کریں گے جو پاکیزہ کلام کرتے ہیں۔ مستحقین کو طعام کھلاتے ہیں، ہر ملنے والے پر سلام کرتے ہیں اور رات کو اس وقت نمازِ خدا پڑھتے ہیں جب لوگ خوابِ غفلت میں سوئے ہوں۔

کتاب مذکور میں جناب پیغمبر اسلامؐ سے مروی ہے، فرمایا:

"جب میں شبِ معراج جنّت میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ملائکہ کی ایک جماعت جنّت

و اما جنة آدم فهی جنة من جنان الدنیا تطلع الشمس فیها و تغیب و لیس بجنة الخلد و لو کانت جنت الخلد ما خرج منها ابداً و اعتقادنا

جس جنّت میں حضرت آدمؑ رہائش پذیر ہوئے تھے وہ دنیا کے باغوں میں سے ایک باغ تھا (جنّت کے لغوی معنی باغ کے ہیں) جس میں سورج طلوع کرتا تھا، اور غروب بھی۔ وہ جنّت الخلد یعنی بقائے دوام والی جنّت نہ تھی۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو حضرت آدمؑ اس سے ہرگز نہ نکلتے۔ ہمارا یہ بھی اعتقاد ہے

میں کچھ مکانات تعمیر کر رہی ہے۔ ایک اینٹ سونے کی ہے اور ایک چاندی کی، وہ بناتے بناتے بعض اوقات رُک جاتے ہیں۔ میں نے ان سے رُکنے کا سبب دریافت کیا، انھوں نے کہا کہ ہم مسالہ کا انتظار کرتے ہیں۔ تمھارا مسالہ کیا ہے؟ ملائکہ نے کہا: مومن کا دارِ دنیا میں تسبیحاتِ اِلٰہیّہ کو پڑھنا۔ "سبحان اللہ و الحمد للہ و لا الہ الا اللہ و اللہ اکبر" جب مومن پڑھتا ہے تو ہم کام شروع کر دیتے ہیں اور جب وہ رک جاتا ہے تو ہم بھی رُک جاتے ہیں"۔

جنّت کے مختلف درجات و طبقات ہیں۔ جن میں اپنے اپنے اعمال و مدارج کے مطابق انبیاءؑ مرسلینؑ، ان کے اوصیاءؑ، ائمہ طاہرینؑ اور مومنین قیام پذیر ہوں گے۔ اور ہر درجہ والا آدمی اپنے درجہ پر یُوں قانع و رضامند ہوگا کہ وہ یہی تصور کرے گا کہ اس سے بڑھ کر کسی کا درجہ ہے ہی نہیں۔

خصائل شیخ صدوق علیہ الرحمہ میں حضرت امیرالمومنین علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا:

ان الجنة ثمانية ابواب، باب یدخل منه النبیون و الصدیقون و باب یدخل منه الشهداء و الصالحون و خمسة ابواب یدخل منها شیعتنا و محبونا فله ازال واقفًا علی الصراط ادعوواقول رب سلم شیعتنی و محبی و انصاری و من تولانی فی دار الدنیا

"جنّت کے ان دروازوں میں ایک دروازہ سے انبیاءؑ وصدّیقینؑ داخل ہوں گے (جن میں گزشتہ اُمّتوں کے مومن بھی شامل ہیں۔ اس امر کی تفصیل کے لیے تفسیر صافی کا مقدمہ ملاحظہ ہو) میں برابر پُل صراط پر ٹھہرا رہوں گا اور برابر یہ کہتا رہوں گا: بارِ اِلٰہا! میرے شیعوں، مُحِبّوں، مددگاروں اور ان کو جنھوں نے دنیا میں مجھ سے محبّت کی ہے۔ سلامت رکھ اور ان کو آتشِ جہنم سے بچالے"۔

بعض روایات میں حضرت امام زین العابدینؑ اور حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے، فرمایا:

ان بالثواب يخلد اهل الجنة فی الجنة و بالعقاب يخلد اهل النار فی النار و ما من احد يدخل الجنة حتی يعرض عليه مكانه من النار

کہ بہشت والے ثواب پانے کی غرض سے ہمیشہ بہشت میں رہیں گے، اور اہل دوزخ بوجہ عذاب ہمیشہ جہنم میں رہیں گے جو شخص بھی جنّت میں داخل ہوگا پہلے اس کا دوزخ والا مکان اس کے سامنے پیش کر کے

"درجات کی تعداد قرآنی آیات کی تعداد کے برابر ہے۔ قاری قرآن کو حکم ہوگا: "اقرأ و ارق"۔ "قرآن پڑھتا جا اور اُوپر بڑھتا جا"۔ اس طرح جنّت میں سوائے انبیاءؑ و صدّیقینؑ کے قاری و عاملِ قرآن سے کسی کا درجہ زیادہ بلند نہ ہوگا"۔ (بحار جلد ۳)

حضرت امیر علیہ السلام درجاتِ جنّت کے بارہ میں فرماتے ہیں:

درجات متفاضلات و منازل متفاوتات لا ينقطع نعيمها و لا يظعن مقيمها و لا يهرم خالدها و لا ييئاس ساكنها

جنّت کے درجے مختلف اور منزلیں مُتفاوت ہیں۔ نہ تو اس کی نعمتیں ختم ہوتی ہیں، نہ اس میں قیام کرنے والے کبھی کوچ کرتے ہیں، نہ ہمیشہ رہنے والے اس میں ملول ہوتے ہیں اور نہ اس کے ساکن کبھی مایوس ہوتے ہیں۔ (نہج البلاغہ)

حضرت صادق آلِ محمد علیہ السلام فرماتے ہیں کہ:

"جنّت کی خُوشبو ہزار سال کے راستہ سے آجاتی ہے۔ کم سے کم درجہ والے مومن کو بھی اس قدر نعمات دی جائیں گی کہ اگر تمام جِنّ و اِنس مل کر اس کے مہمان ہوجائیں تو بآسانی سب کی مہمان نوازی کرسکے گا۔ اور اس کے نعمات میں کچھ کمی بھی واقع نہ ہوگی"۔ (حق الیقین شبرؒ)

لیکن کئی روایات میں وارد ہے کہ:

"بعض لوگ وہ بھی ہیں کہ جن کو جنّت کی خُوشبو بھی نصیب نہ ہوگی۔ ان میں ایک والدین کا عاق، دُوسرا بوڑھا زناکار، تیسرا دُشمنِ اہلِ بیتؑ ہے، چوتھا از رُوئے تکبّر چادر کو زمین پر گھسیٹ کر چلنے والا"۔ (بحار جلد ۳)

اسی طرح کئی روایات میں وارد ہے کہ:

"جب خلاقِ عالم نے جنّت کو خلق فرمایا تو اپنی عزت وجلال کی قسم یاد فرمائی کہ اس

فیقال له هذا مکانك الذی لو عصیت الله لکنت فیه و ما من احد یدخل النار حتی یعرض علیه مکانه من الجنة فیقال له هذا

اس سے کہا جائے گا: اگر تو خدا کی نافرمانی کرتا تو اس مکان میں تیری رہائش ہوتی اور جسے جہنم میں داخل کیا جائے گا، اسے پہلے جنّت والا مکان دکھایا جائے گا۔ اور کہا جائے گا کہ اگر تو خدا کی اطاعت کرتا تو تجھے یہ مکان نصیب ہوتا

میں چند قسم کے لوگ ہرگز داخل نہیں ہوں گے۔ ان میں سے بعض یہ ہیں: ① ہمیشہ شراب خوری کرنے والا۔ ② سکیر، دیگر مُسکرات کو ہمیشہ استعمال کرنے والا۔ ③ نمام (چغل خور) ④ دیّوث و بے غیرت۔ ⑤ نباش، نبشِ قبر کر کے کفن چرانے والا۔ ⑥ عشار (چنگی والا، وصول کرنے والا) ⑦ قاطع الرحم۔ ⑧ قدری، جبر کا قائل، خیر و شر کا فاعل خدا کو سمجھنے والا۔ ⑨ کذاب۔ ⑩ ہمیشہ سود کھانے والا۔

بہر حال جنّت وہ عظیم الشان مقام ہے کہ جناب رسولِ خداؐ کے ارشاد کے مطابق اس کی ایک بالشت، تمام دنیا و مافیہا سے بہتر و برتر ہے۔ (بحار جلد ۳)

امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ جب اہلِ جنّت، جنّت میں داخل ہوں گے......

صاروا علی طول آدم علیه السلام ستین ذراعًا و علی ملا عیسیٰ ثلاثًا و ثلثین سنة و علی لسان محمّد صلی الله علیه و اٰله و سلم و علی صورة یوسفؑ فی الحسن ثم یعلو علی وجوههم النور و علی قلب ایوبؑ فی السلامة من الغل

"اس وقت حضرت آدمؑ کے قد و قامت یعنی ساٹھ ہاتھ (لمبائی پر) جناب عیسیٰؑ کی عمر بتیس سال کی عمر میں، جناب محمد مصطفیٰؐ کی زبان (عربی) اور جناب یوسفؑ کے حسن و جمال پر ہو جائیں گے"۔ پھر فرمایا: "ان کے چہروں پر نور ساطع ہوگا اور جناب ایوبؑ کے قلبِ اقدس کی طرح حقد و کینہ سے سالم ہوں گے"۔ (بحار جلد ۳)

امالی شیخ صدوق علیہ الرحمہ میں اور تفسیر عیاشی میں جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے اور وہ اپنے آباء و اجدادِ طاہرینؑ کے سلسلہ سند سے جناب امیر علیہ السلام سے روایت فرماتے ہیں کہ:

طوبیٰ الشجرة فی الجنة اصلها فی دار النبی و لیس من مؤمن الا وفی داره غصن منها لا تخطر علی قلبه شهوة الا اتاه به ذلك الغصن و لوان راکبا مجداً سار فی ظلها مأة عام ما خرج منها و

مکانك الذی لواطعت اللہ لکنت فیه فیورث ھؤلاء مکان ھؤلاء و ذلك قول اللہ عز و جل اولئك ھم الوارثون الذین یرثون الفردوس ھم فیھا خالدون

الغرض خدا کے نیک اور اطاعت گزار بندوں کو، ان نافرمانوں کے جنتی مکانوں کاوارث بنا دیا جائے گا۔ جیسا کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: یہ لوگ وارث ہیں جو جنّت کے وارث ہوں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے (مومنون:۱۱)

لوطار غواب من اسفلھا ما بلغ اعلیھا حتی یقطھر ما الافقی ھذا ارغبوا

جنّت میں طوبیٰ ایک درخت ہے جس کی اصل جناب رسولِ خدا ﷺ کے گھر میں ہے (بعض روایات میں اس کی اصل جناب امیر علیہ السلام کے گھر میں بیان کی گئی ہے۔ لیکن ان میں کوئی منافات نہیں ہے۔ کما لا یخفیٰ) اور کوئی ایسا مومن نہ ہوگا جس کے گھرمیں اس کی ایک شاخ نہ ہو۔ مومن جس چیز کا ارادہ کرے گا وہ شاخ فوراً اسے حاضر کردے گی۔ اور وہ درخت اس قدر بڑا ہے کہ اگر کوئی تیز رو سوار اس کے سایہ میں سو برس تک چلتا رہے تو اسے عبور نہ کرسکے گا۔ اور اگر کوا، اس کے نچلے حصّہ سے اوپر کی طرف پرواز کرے تو اس کے بالائی حصّہ تک پہنچنے سے پیشتر وہ بہت بوڑھا ہوجانے کی وجہ سے گر پڑے گا۔ ایسی گرانقدر چیز کے حاصل کرنے میں ضرور رغبت کرو۔

بعض روایات میں وارد ہے کہ:

"مومن اس سے جب پھل توڑیں گے تو اس کی جگہ پھر بدستور وہاں وہ پھل لگ جائے گا اور وہاں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی"۔

جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ اس کی دنیا میں بھی کوئی نظیر موجود ہے؟ فرمایا: ہاں اگر ایک چراغ سے سینکڑوں چراغ روشن کرلیے جائیں تو پہلے چراغ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ (احتجاج طبرسی)

مومنین کرام کو کس قدر حور وقصور ملیں گے؟ اس کی تعداد کے سلسلہ میں اخبار و آثار میں اختلاف ہے، جو اہل ایمان کے درجاتِ ایمانی کے اختلاف پر محمول ہے۔ علامہ جزائری انوارِ نعمانیہ میں تحریر فرماتے ہیں: "ورد فی الروایات ان اللہ تعالیٰ ادنی ما یعطی المؤمن سبعین الف حور و لوطلعت و حدۃ منھن الی الدنیا لا شرقت لھا و لمات الناس شوقا الیھا"۔ یعنی روایات میں وارد ہے کہ خداوند عالم مومن کو کم از کم ستر ہزار ایسی خوبصورت حورالعین عطا فرمائے گا کہ اگر ان میں سے ایک دنیا کی طرف

واقل المومنین منزلۃ فی الجنۃ من لہ مثل تلک الدنیا عشر مرات	سب سے کم درجہ کا مومن جنّت میں وہ شخص ہوگا جس کے لیے وہاں اس دنیا کی نعمتوں سے دس گنا زیادہ نعمتیں میسر ہوں گی۔

جھانک لے تو تمام دنیا اس کے انوار سے جگمگا اُٹھے۔ اور دنیا والے اس کے شوقِ وصل میں مرجائیں۔

ایک اور روایت میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

و لو ان حوراء من حور الجنۃ برزت علی اھل الدنیا و ابدت ذوابۃ من ذوائبہا لامانت اھل الدنیا

"اگر جنّت کی حوروں میں سے ایک حور اہل دنیا کے لیے ظاہر ہوجائے یا اپنی مینڈھی کھول دے تو تمام اہلِ دنیا کو (شدّتِ شوقِ وصل میں) مار ڈالے"۔ (ثالث بحار الانوار)

یہ حوریں فخریہ انداز میں اپنے متعلق ہزار عشوہ وناز کے ساتھ کہتی ہیں:

نحن الناعمات فلا نبوس ابداً نحن الطاعمات فلا نجوع ابداً و نحن الکاسیات فلا نعوی ابداً و نحن الخالدات فلا نموت ابداً و نحن الراضیات فلا تسخط ابداً و نحن المقیمات فلا تطعن ابداً فطوبی لمن کنالہ و کان لنا نحن خیرات حسان ازواجنا اقوام کرام (حدیث نبوی)

یعنی ہم وہ نرم ونازک ہیں جو کبھی بوسیدہ نہ ہوں گی، ہم وہ سیر ہیں جو کبھی گرسنہ نہ ہوں گی۔ ہم وہ صاحب پوشاک ہیں جو کبھی عریاں نہ ہوں گی۔ ہم وہ ہمیشہ رہنے والی ہیں جو کبھی نہ مریں گی۔ ہم وہ خوش وخرم ہیں جو کبھی ناراض نہ ہوں گی۔ ہم وہ قیام پذیر ہیں جو کبھی یہاں سے کوچ نہ کریں گی۔ بہت ہی خوش قسمت ہیں وہ جن کے لیے ہم ہیں اور وہ ہمارے لیے ہیں۔ ہم ہی بہترین خوبصورت بیویاں ہیں۔ ہمارے شوہر بہترین شریف لوگ ہوں گے۔ (ثالث بحار الانوار)

اللھم زوجنا من الحور العین بجاہ النبی و آلہ الطاہرین

ان مومنات کی جو داخل جنّت ہوں گی، مومنین کے ساتھ تزویج کی جائے گی۔ روایات میں وارد ہے کہ: "اگر کسی مومنہ کے دارِ دنیا میں مختلف اوقات میں دو یا دو سے زیادہ شوہر تھے، اور حُسنِ اتفاق سے سب کے سب جنّت میں پہنچ گئے تو اس کی تزویج اس کے اس شوہر کے ساتھ کی جائے گی جو دنیا میں اس کے ساتھ زیادہ حُسنِ خلق سے پیش آتا تھا"۔ اور بعض روایات میں ہے کہ: "جو اس سے زیادہ محبّت کرتا تھا"۔ (دونوں کا مطلب ایک ہی ہے) (بحار الانوار جلد ۳ و علل الشرائع)

جنّت کے کھانوں کے متعلق وارد ہے کہ: ایک ایک کھانے میں ہزار ہزار ذائقہ ہوگا۔ اور یہی کیفیت جنّت کے پھلوں کی مروی ہے۔ جو کچھ کھائیں گے اس سے بول و براز کی حاجت لاحق نہ ہوگی، بلکہ خوشبودار پسینے کی صورت میں تحلیل ہوجائے گا۔

جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ آیا اس کی دنیا میں کوئی مثال موجود ہے؟ فرمایا: ہاں! بچہ ماں کے پیٹ میں کھاتا ہے لیکن بول و براز نہیں کرتا۔ اسی طرح وہاں احباب و اصحاب کی ملاقات و صحبت کا لطف بھی حاصل ہوگا۔

حضرت صادق علیہ السلام سے دریافت کیا گیا: اگر کسی مومن کے بعض احباب یا اقرباء جہنم میں ہوئے تو ان کا صدمہ اسے لاحق ہوگا۔ اس طرح اس کی راحت میں لازماً فرق آجائے گا۔ امام نے فرمایا: "ان اللہ ینسیھم حتی لا یغتموا لھم و لفراقھم" خداوند عالم اہلِ جنّت کے ذہنوں سے ایسے لوگوں کو بھلادے گا، تاکہ ان کی مفارقت کی وجہ سے غمناک نہ ہوں۔ اور یہ بات کوئی تعجب خیز نہیں ہے۔ کیونکہ "ان اللہ علی کل شئ قدیر" غرض کہ جنّت میں ہر قسم کی لذّت و آسائش کے سامان مہیا ہوں گے۔ "و رضوان من اللہ اکبر" حتی کہ وہاں غناو سرود بھی ہوگا۔

چنانچہ انوارِ نعمانیہ وغیرہ کتب میں وارد ہے کہ ایک اعرابی نے جنابِ رسولِ خداؐ سے سوال کیا کہ جب جنّت میں سب نعمات ہوں گی تو آیا غنا بھی ہوگا؟ فرمایا: ہاں! جنّت کے درختوں کے ساتھ کچھ جرس لٹکے ہوئے ہوں گے۔ جب انھیں ضرب لگائی جائے گی تو ان سے ایسی مختلف قسم کی عمدہ آوازیں آئیں گی کہ اگر دنیا والے سن لیں تو شدت طرب و سرود سے مرجائیں۔ بعض روایات میں وارد ہے کہ اس غنا و سرود سے وہی مومن لطف اندوز ہوں گے جن کے کان دنیا میں راگ سننے سے ملوث نہیں ہوئے ہوں گے۔ (ثالث بحار)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے آباء و اجداد طاہرینؑ کے سلسلہ سند سے آنحضرت ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

ان فی الفردوس لعیناً احلی من الشھد و الین من الزبد و البرد من الثلج و الطیب من المسك

جنّت میں ایک ایسا چشمہ ہے جو شہد سے زیادہ شیریں، جھاگ سے زیادہ نرم، برف سے زیادہ ٹھنڈا اور مشک عنبر سے زیادہ خوشبودار ہے۔

آیات و روایات سے مُستفاد ہوتا ہے کہ جنّت میں مُتعدّد نہریں ہیں: "جنت تجری من تحتھا

الانهار" جن میں سے کچھ نہریں صاف پانی کی، بعض شہد کی اور بعض دودھ کی ہیں۔ قرآن مجید میں ان کے یہ نام ذکر کیے گئے ہیں: ① کافور: اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ (سورۃ دھر:۵و۶) ② سلسبیل: عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا (سورۃ دھر:۱۸) ③ تسنیم: وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ (سورۃ مطففین:۲۷) ④ زنجبیل: وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا (سورۃ دھر:۱۷) ⑤ رحیق: يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ (سورۃ مطففین:۲۵) ⑥ کوثر: اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ (سورۃ کوثر:۱) (عقل و دین)

کہاں تک جنّت کے حالات و اوصاف کا تذکرہ کیا جائے، جب کہ پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ رب جلیل ارشاد فرماتا ہے: "اعددت لعبادی الصالحین ما لاعین رأت و لا اذن سمعت و لا خطر علی قلب بشر"۔ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے جنّت میں وہ کچھ مہیا کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے اور نہ کسی کان نے سنا ہے اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال آیا ہے۔ (عقل و دین)

اللھم ارزقنا الجنة بحق امام الانس و الجنة

مُصنّف رسالہ کے بیان کردہ مسلکِ لذّتِ رُوحانی کی تضعیف

حضرت مُصنّف علام نے جو یہ فرمایا ہے کہ بعض اہل جنّت ایسے ہوں گے کہ ان کی لذتیں فقط تسبیح و تقدیس الٰہی میں ہوں گی، نہ اکل و شرب یا دیگر جسمانی لذائذ اور بعض جسمانی لذائذ سے لطف اندوز ہوں گے۔ اس پر حضرت شیخ مُفید علیہ الرحمہ نے بڑی عمدہ تنقید فرمائی ہے اور جس روایت میں یہ امر وارد ہے اسے جعلی قرار دیا ہے، اور فرمایا ہے کہ قرآن اس کی تکذیب کرتا ہے۔ کیونکہ اس نے بار بار اکل و شرب اور نکاح وغیرہ لذاتِ جسمانیہ کا تذکرہ کر کے اہل ایمان کو ان کے حاصل کرنے کی ترغیب و تشویق دلائی ہے۔ اور پھر ان آیات میں سے بعض نقل فرمائی ہیں، جو ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔ بعد ازیں یہ کس طرح مُتصوّر ہو سکتا ہے کہ جنّت میں ایک گروہ ایسا بھی ہو گا جو ملائکہ کی طرح نہ کھائے گا نہ پیے گا، اور نہ نکاح کرے گا۔ یہ امر ظاہر قرآن کریم اور اتفاقِ مُسلمین کے خلاف ہے۔ سرکار علامہ مجلسیؒ نے سرکار شیخؒ کی یہ تنقید نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے: "وھو فی غاية المتانة" یعنی جناب شیخ کی تنقید نہایت متین ہے۔ "و ھو فی محله و الانصاف ان الحق فی ھذہ المسئلة مع الشیخؒ"۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ جنّتی لوگ لذائذ و نعماتِ جنّت سے جب لطف اندوز ہوں گے تو خوش ہو کر از خود خدائے عزوجل کی حمد و ثنا بھی کریں گے۔ جیسا کہ قرآن میں وارد ہے: "دعواھم فیھا سبحانك اللھم و

تحیتم فیہا سلام و أخر دعویھم ان الحمد للہ رب العالمین " (سورۃ یونس: ۱۰) یعنی ان باغوں میں ان لوگوں کا بس یہ قول ہوگا: اے خدا تو پاک و پاکیزہ ہے، اور ان میں ان کی باہمی خیر صلاحی سلام سے ہوگی۔ اور ان کا آخری قول یہ ہوگا کہ سب تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے جو سارے جہان کا پالنے والا ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے: "و قال لھم خزنتھا سلام علیکم طبتم فادخلوھا خالدین و قالوا الحمد للہ الذی صدقنا وعدہ و اورثنا الارض نتبوأ من الجنۃ حیث نشاء " (سورۃ زمر: ۷۳) اور اس کے نگہبان اس سے کہیں گے "سلام علیکم" تم اچھے رہے، تم بہشت میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جاؤ۔ اور یہ لوگ کہیں گے خدا کا شکر ہے جس نے اپنا وعدہ ہم کو سچا کر دکھایا۔ اور ہمیں (بہشت کی) سرزمین کا مالک بنایا کہ ہم بہشت میں جہاں چاہیں رہیں۔ (ترجمہ فرمانؒ)

ارشادِ صادقؑ کی توضیح

جناب مُصنّف علیہ الرحمہ نے حضرت صادق علیہ السلام کی جو حدیث نقل فرمائی ہے، جس میں عبادت گزاروں کی مختلف قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ یہ روایت اگرچہ مُعتبر اور قابلِ وثوق ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سوائے ایک قسم کے باقی دونوں قسم کے عبادت گزاروں کی عبادت باطل ہو۔ فقہاء عظام میں سے اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے۔ کیونکہ اگر یہ صحیح ہو کہ شوق جنّت یا خوفِ جہنم کے جذبہ کے تحت عبادت باطل ہوتی ہے تو اس کی ذمہ داری معاذ اللہ خود خدا اور رسولؐ پر عائد ہوگی۔ کیونکہ انھوں نے یہ ترغیب و ترہیب دلائی ہے، ہاں اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ عبادت جو جنّت کی طمع یا جہنم کے خوف سے بالاتر ہو کر محض معبود حقیقی کو لائق عبادت سمجھ کر کی جائے، وہ یقیناً افضل و اعلیٰ ہوگی۔ جیسا کہ جناب امیر علیہ السّلام سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں: "الھی ما عبدتک طمعاً فی جنتک و لا خوفاً من نارک بل وجدتک اھلا للعبادۃ فعبدتک "۔ بارِ الٰہا! میں نے تیری عبادت تیری جنّت کی طمع اور تیری جہنم کے خوف سے متاثر ہو کر نہیں کی، بلکہ میں نے تجھے لائق عبادت سمجھ کر تیری پرستش کی ہے۔ (نہج البلاغہ)

شدائد دوزخ کی اجمالی کیفیّت

جس طرح جنّت کے نعمات کی تعریف و توصیف ہمارے حیطۂ بیان سے باہر ہے، اسی طرح آتش جہنم (اعاذنا اللہ و جمیع المومنین من نارھا و شدائدھا بجاہ النبی و آلہ الطاھرینؑ) کی حقیقی کیفیّت بیان کرنا بھی ہمارے حیطۂ اختیار میں نہیں ہے۔ آیات و روایات کی روشنی میں جہنم کا جو نقشہ

سامنے آتا ہے اس کا لب لباب یہ ہے کہ جہنم وہ دارِ سزا ہے کہ جس میں ہر قسم کی اذیت و تکلیف، رنج و الم و کرب و اضطراب کے اسباب مہیا ہوں گے۔ کھانے پینے کے لیے کھولتا ہوا پانی اور پیپ اور زقوم ملے گا۔ جس سے ان کی آنتوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ جب ایک چمڑا گل سڑ جائے گا تو اسے پھر نئے چمڑے کے ساتھ تبدیل کر دیا جائے گا، نہ ہی موت آئے گی کہ ان کی اس عذاب و عقاب سے گلوخلاصی ہو۔ اور نہ رستگاری ہوگی۔ داد و فریاد کریں گے، مگر کوئی شنوائی نہ ہوگی۔ اسی طرح انتہائی ذلت و رسوائی کے ساتھ ابدالآباد تک اس میں معذب و معاقب رہیں گے۔ نیز دوزخ کے مختلف درکات وطبقات ہوں گے، جس میں کفار و مشرکین اور منافقین و عاصیین اپنے اپنے کردار کے مطابق سزا پائیں گے۔ اس سلسلہ میں نہایت اختصار کے ساتھ چند آیات و روایات پیش کی جاتی ہیں۔ ارشادِ قدرت ہے:

فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ﴿۲۴﴾ (سورۃ البقرۃ:۲۴)

تم اس آگ سے ڈرو جس کے ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے، اور کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ نَارًا أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۚ وَإِنْ يَسْتَغِيثُوا يُغَاثُوا بِمَاءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوهَ ۚ بِئْسَ الشَّرَابُ وَسَاءَتْ مُرْتَفَقًا ﴿۲۹﴾ (سورۃ الکہف:۲۹)

ہم نے ظالموں کے لیے وہ آگ (دہکا کے) تیار کر رکھی ہے جس کی قناتیں گھیر لیں گی۔ اور وہ لوگ دہائی دیں گے تو ان کی فریاد رسی کھولتے ہوئے پانی سے کی جائے گی، جو مثل پگھلے ہوئے تانبے کے ہوگا (اور) وہ منہ کو بھون ڈالے گا۔ کیا برا پانی ہے اور (جہنم بھی) کیا بری جگہ ہے۔

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿۳۴﴾ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ ﴿۳۵﴾ (سورۃ التوبۃ:۳۴ و ۳۵)

اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے جاتے ہیں، اور اس کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو (اے رسولؐ) ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنادو۔ جس دن وہ (سونا چاندی) جہنم کی آگ میں گرم (اور لال) کیا جائے گا۔ پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی (اور ان سے کہا جائے گا) یہ وہ ہے جسے تم نے اپنے لیے (دنیا میں) جمع کر کے رکھا تھا۔ تو (اب) اپنے جمع کیے کا مزہ چکھو۔

یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّخۡرُجُوۡا مِنَ النَّارِ وَ مَا ہُمۡ بِخٰرِجِیۡنَ مِنۡہَا ۫ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ مُّقِیۡمٌ ﴿۳۷﴾

وہ لوگ تو چاہیں گے کہ کسی طرح جہنم کی آگ سے نکل بھاگیں۔ مگر وہاں سے تو وہ نکل ہی نہیں سکتے۔ اور ان کے لیے تو دائمی عذاب ہے۔ (سورۃ المائدۃ:۳۷)

فَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا قُطِّعَتۡ لَہُمۡ ثِیَابٌ مِّنۡ نَّارٍ ؕ یُصَبُّ مِنۡ فَوۡقِ رُءُوۡسِہِمُ الۡحَمِیۡمُ ﴿۱۹﴾ یُصۡہَرُ بِہٖ مَا فِیۡ بُطُوۡنِہِمۡ وَ الۡجُلُوۡدُ ﴿۲۰﴾ وَ لَہُمۡ مَّقَامِعُ مِنۡ حَدِیۡدٍ ﴿۲۱﴾ کُلَّمَاۤ اَرَادُوۡۤا اَنۡ یَّخۡرُجُوۡا مِنۡہَا مِنۡ غَمٍّ اُعِیۡدُوۡا فِیۡہَا ٭ وَ ذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡحَرِیۡقِ ﴿۲۲﴾ (سورۃ الحج:۱۹تا۲۲)

غرض جو لوگ کافر ہو بیٹھے ان کے لیے تو آگ کے کپڑے قطع کیے گئے ہیں، اور انھیں پہنائے جائیں گے (اور) ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی انڈیلا جائے گا۔ جس (کی گرمی) سے جو کچھ ان کے پیٹ میں ہے (آنتیں وغیرہ) اور کھالیں سب گل جائیں گی۔ اور ان کے مارنے کے لیے لوہے کے گرز ہوں گے کہ جب صدمے سے بچنے کے لیے چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل بھاگیں تو گرز مار کے پھر اسی کے اندر دھکیل دیے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ جلانے والے عذاب کے مزے چکھو۔

کُلَّمَا نَضِجَتۡ جُلُوۡدُہُمۡ بَدَّلۡنٰہُمۡ جُلُوۡدًا غَیۡرَہَا لِیَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ (سورۃ النساء:۵۶)

(اور) جب ان کی کھالیں (جل کر) گل جائیں گی تو ہم ان کے لیے دوسری کھالیں بدل کر پیدا کر دیں گے تاکہ وہ اچھی طرح عذاب کا مزا چکھیں۔

اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ فِی الدَّرۡکِ الۡاَسۡفَلِ مِنَ النَّارِ (سورۃ النساء:۱۴۵)

اس میں تو کچھ شک ہی نہیں کہ منافقین جہنم کے سب سے نیچے والے طبقہ میں ہوں گے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَنۡ تُغۡنِیَ عَنۡہُمۡ اَمۡوَالُہُمۡ وَ لَاۤ اَوۡلَادُہُمۡ مِّنَ اللّٰہِ شَیۡئًا ؕ وَ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۱۱۶﴾ (سورۃ آلِ عمران:۱۱۶)

بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا، خدا (کے عذاب) سے بچانے میں ہرگز نہ ان کے مال ہی کچھ کام آئیں گے نہ ان کی اولاد۔ اور یہی لوگ جہنمی ہیں اور ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡیَتٰمٰی ظُلۡمًا اِنَّمَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِہِمۡ نَارًا ؕ وَ سَیَصۡلَوۡنَ سَعِیۡرًا ﴿۱۰﴾

جو لوگ یتیموں کے مال ناحق چٹ کر جایا کرتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں بس انگارے بھرتے ہیں۔ اور عنقریب جہنم واصل ہوں گے۔ (سورۃ النساء:۱۰)

وَ مَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ یَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ یُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِیْهَا ۪ وَ لَهٗ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ﴿۱۴﴾

(سورۃ النساء: ۱۴)

اور جس شخص نے خدا و رسولؐ کی نا فرمانی کی اور اس کی حدوں سے گزر گیا تو بس خدا اس کو جہنم میں داخل کرے گا۔ اور وہ اس میں ہمیشہ (اپنا کیا بھگتتا) رہے گا۔ اور اس کے لیے بڑی رسوائی کا عذاب ہے۔

وَ مَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِیْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِیْمًا ﴿۹۳﴾ (سورۃ النساء: ۹۳)

اور جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر مار ڈالے (تو غلام کی آزادی وغیرہ اس کا کفارہ نہیں، بلکہ) اس کی سزا دوزخ ہے اور وہ ہمیشہ اس میں رہے گا۔ اس پر خدا نے اپنا غضب ڈھایا ہے، اور اس پر لعنت کی ہے۔ اور اس کے لیے بڑا سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اَلَمْ یَعْلَمُوْۤا اَنَّهٗ مَنْ یُّحَادِدِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِیْهَا ؕ ذٰلِكَ الْخِزْیُ الْعَظِیْمُ ﴿۶۳﴾ (سورۃ التوبۃ: ۶۳)

کیا یہ لوگ یہ بھی نہیں جانتے کہ جس شخص نے خدا اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کی تو اس میں شک ہی نہیں کہ اس کے لیے جہنم کی آگ تیار کر رکھی ہے۔ جس میں وہ ہمیشہ (جلتا بھنتا) رہے گا۔ یہی تو بڑی رسوائی ہے۔

ثُمَّ قِیْلَ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۵۲﴾

پھر (قیامت کے دن) ظالم لوگوں سے کہا جائے گا کہ اب ہمیشہ کے عذاب کے مزے چکھو۔ (دنیا میں) جیسی تمہاری کرتوتیں تھیں (آخرت میں) ویسا ہی بدلا دیا جائے گا۔ (سورۃ یونس: ۵۲)

فَادْخُلُوْۤا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِیْنَ (سورۃ نحل: ۲۹)

(اچھا تو لو) جہنم کے دروازوں میں جا داخل ہو۔ اور اس میں ہمیشہ رہو گے۔ غرض تکبّر کرنے والوں کو بھی کیا بُرا ٹھکانا ہے۔

وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۴۳﴾ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿۴۴﴾ (سورۃ حجر: ۴۳ و ۴۴)

اور یقیناً جہنم ان سب کی وعدہ گاہ ہے۔ جس کے سات دروازے ہیں۔ ان میں سے ہر دروازہ کے لیے بٹا ہوا حصہ مقرر ہے۔

إِنَّ لَدَيْنَآ أَنكَالًا وَجَحِيمًا ﴿١٢﴾ وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَعَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٣﴾ (سورة المزمل: ۱۲ و ۱۳)

بے شک ہمارے پاس بھاری بھاری بیڑیاں بھی ہیں اور جلانے والی آگ بھی اور گلے میں پھنسنے والا کھانا بھی اور دردناک عذاب بھی۔

إِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّومِ ﴿٤٣﴾ طَعَامُ الْأَثِيمِ ﴿٤٤﴾ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِي فِي الْبُطُونِ ﴿٤٥﴾ (سورة الدخان: ۴۳ تا ۴۵)

یقیناً تھوہر کا درخت گنہگاروں کی خوراک ہوگا (جو) پگھلے ہوئے تانبے کی مانند ہے۔ معدوں میں ایسی کھلبلی مچادے گا جیسے گرم پانی کا اونٹنا۔

وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ﴿١٥﴾ مِّن وَرَآئِهِ جَهَنَّمُ وَيُسْقَىٰ مِن مَّآءٍ صَدِيدٍ ﴿١٦﴾ يَتَجَرَّعُهُ وَلَا يَكَادُ يُسِيغُهُ وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ (سورة ابراهيم: ۱۵ تا ۱۷)

اور وہ (پیغمبرؑ) طالب فتح ہوئے اور ہر کینہ جو ظالم ناامید ہوا، آگے اس کے جہنم ہے اور پیپ کے پانی میں سے اس کو پلایا جائے گا۔ وہ گھونٹ گھونٹ کرکے اس کو پیے گا اور پھر بھی حلق سے نہ اتار سکے گا۔ اور موت اس کو ہر طرف سے آئے گی۔ حالانکہ وہ مرنے والا نہ ہوگا۔

فِي جَنَّاتٍ يَتَسَاءَلُونَ ﴿٤٠﴾ عَنِ الْمُجْرِمِينَ ﴿٤١﴾ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ﴿٤٢﴾ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ﴿٤٣﴾ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ﴿٤٤﴾ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ﴿٤٥﴾ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ﴿٤٦﴾ (سورة مدثر: ۴۰ تا ۴۶)

جو جنتوں میں گنہگاروں سے یہ دریافت کرتے ہوں کہ تم کو بھڑکتی آگ میں کس چیز نے پہنچا دیا؟ وہ کہیں گے ہم نہ تو نمازیوں میں سے تھے اور نہ ہم مسکین کو کھانا کھلایا کرتے تھے اور ہم باطل میں گھس پڑنے والوں کے ساتھ گھس پڑا کرتے تھے اور ہم فیصلے کے دن کو جھٹلایا کرتے تھے۔ (ترجمہ مقبولؒ)

وَأَعْتَدْنَا لِمَن كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيرًا ﴿١١﴾ إِذَا رَأَتْهُم مِّن مَّكَانٍ بَعِيدٍ سَمِعُوا لَهَا تَغَيُّظًا وَزَفِيرًا ﴿١٢﴾ وَإِذَا أُلْقُوا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِينَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُورًا ﴿١٣﴾ لَّا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُورًا وَاحِدًا وَادْعُوا ثُبُورًا كَثِيرًا ﴿١٤﴾ (سورة الفرقان: ۱۱ تا ۱۴)

اور جس شخص نے قیامت کو جھوٹ سمجھا اس کے لیے ہم نے جہنم کو (دہکا کے) تیار کر

رکھا ہے کہ جب جہنم ان لوگوں کو دور سے دیکھے گی تو (جوش کھائے گی اور) اور لوگ اس کے جوش وخروش کی آواز سنیں گے اور جب یہ لوگ زنجیروں سے جکڑ کر اس کی کسی تنگ جگہ میں جھونک دیے جائیں گے تو اس وقت موت کو پکاریں گے ۔ (اس وقت ان سے کہا جائے گا) آج ایک ہی موت کو نہ پکارو، بلکہ بہتیری موتوں کو پکارو (مگر اس سے کچھ ہونے والا نہیں)

وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ فَسَقُوۡا فَمَاۡوٰىہُمُ النَّارُ ؕ کُلَّمَاۤ اَرَادُوۡۤا اَنۡ یَّخۡرُجُوۡا مِنۡہَاۤ اُعِیۡدُوۡا فِیۡہَا وَ قِیۡلَ لَہُمۡ ذُوۡقُوۡا عَذَابَ النَّارِ الَّذِیۡ کُنۡتُمۡ بِہٖ تُکَذِّبُوۡنَ ﴿۲۰﴾ (سورۃ السجدۃ:۲۰)

اور جن لوگوں نے بدکاری کی ان کا ٹھکانا تو (بس) جہنم ہے، وہ جب اس میں سے نکل جانے کا ارادہ کریں گے تو اسی میں پھر دھکیل دیے جائیں گے۔ اور ان سے کہا جائے گا کہ دوزخ کے جس عذاب کو تم جھٹلاتے تھے، اب اس (کے مزے) کو چکھو۔ جہنّمی عرض کریں گے:

رَبِّ ارۡجِعُوۡنِ (۹۹) لَعَلِّیۡۤ اَعۡمَلُ صَالِحًا فِیۡمَا تَرَکۡتُ (سورۃ المومنون:۹۹ و ۱۰۰)

پروردگارا! تو مجھے (ایک بار) اس مقام (دنیا) میں جسے میں چھوڑ آیا ہوں پھر واپس کردے تاکہ میں (اب کی دفعہ) اچھے اچھے کام کروں۔

جواب ملے گا:

اَوَلَمۡ نُعَمِّرۡکُمۡ مَّا یَتَذَکَّرُ فِیۡہِ مَنۡ تَذَکَّرَ وَ جَآءَکُمُ النَّذِیۡرُ ؕ فَذُوۡقُوۡا فَمَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ نَّصِیۡرٍ ﴿۳۷﴾ (سورۃ الفاطر: ۳۷)

کیا ہم نے تم کو اس قدر عمر عطا نہیں کی تھی کہ جو شخص اس میں نصیحت حاصل کرنا چاہتا تو کرسکتا تھا۔ اور کیا تمھارے پاس میرے ڈرانے والے نہیں آ چکے تھے۔ آج عذاب کا مزہ چکھو۔ ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِیۡ سَیَدۡخُلُوۡنَ جَہَنَّمَ دٰخِرِیۡنَ ﴿۶۰﴾ (سورۃ المومن:۶۰)

جو لوگ ہماری عبادت سے اکڑتے ہیں وہ عنقریب ہی ذلیل و خوار ہو کر یقینی جہنم واصل ہوں گے ۔

اِنَّ الۡمُجۡرِمِیۡنَ فِیۡ عَذَابِ جَہَنَّمَ خٰلِدُوۡنَ ﴿۷۴﴾ لَا یُفَتَّرُ عَنۡہُمۡ وَ ہُمۡ فِیۡہِ مُبۡلِسُوۡنَ ﴿۷۵﴾ وَ مَا ظَلَمۡنٰہُمۡ وَ لٰکِنۡ کَانُوۡا ہُمُ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۷۶﴾ وَ نَادَوۡا یٰمٰلِکُ لِیَقۡضِ عَلَیۡنَا رَبُّکَ ؕ قَالَ اِنَّکُمۡ مّٰکِثُوۡنَ ﴿۷۷﴾ لَقَدۡ

جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿۷۸﴾ (سورۃ زخرف: ۷۴ تا ۷۸)

گنہگار (کفار) تو یقیناً جہنم کے عذاب میں ہمیشہ رہیں گے، جو ان سے کبھی ناغہ نہ کیا جائے گا۔ اور وہ اسی عذاب میں نا امید ہو کر رہیں گے۔ اور ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا، بلکہ وہ لوگ خود اپنے اوپر ظلم کرتے رہے۔ اور (جہنمی) پکاریں گے کہ اے مالک (داروغۂ جہنم! کوئی ترکیب کرو) تمھارا پروردگار ہمیں موت ہی دیدے۔ وہ جواب دے گا کہ تم کو اسی حال میں رہنا ہے (اے کفارِ مکہ) ہم تو تمھارے پاس حق لے کر آئے ہیں۔ مگر تم میں سے بہتیرے حق (بات) سے چڑتے ہیں۔

وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ ﴿۱۵﴾ (سورۃ محمد: ۱۵)

اور ان کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا تو وہ آنتوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴿۶﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ۖ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۷﴾ (سورۃ التحریم: ۶ تا ۷)

اے ایماندارو! اپنے آپ کو اپنے لڑکے بالوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ جس کے ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔ اور ان پر وہ تندخو اور سخت مزاج فرشتے (مقرر) ہیں کہ خدا جس بات کا حکم دیتا ہے اس کی نافرمانی نہیں کرتے۔ اور جو حکم انھیں ملتا ہے اسے بجا لاتے ہیں (جب کفار دوزخ کے سامنے آئیں گے تو کہا جائے گا) کافرو! آج بہانے نہ ڈھونڈو، جو کچھ تم کرتے تھے تمھیں انھیں کی سزا دی جائے گی۔

فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿۳۷﴾ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۳۸﴾ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۳۹﴾ (سورۃ النازعات: ۳۷ تا ۳۹)

تو جس نے (دنیا میں) سر اٹھایا تھا اور دنیاوی زندگی کو ترجیح دی تھی، اس کا ٹھکانا تو یقیناً دوزخ ہے۔

اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ﴿۳۲﴾ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ﴿۳۳﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۴﴾

(سورۃ مرسلات: ۳۲ تا ۳۴)

اس سے اتنے بڑے بڑے انگار برستے ہوں گے جیسے محل گویا زرد رنگ کے اونٹ ہیں۔ اس دن جھٹلانے والوں کی خرابی ہے۔

(ترجمہ مولانا فرمان علی صاحب مرحوم)

عذابِ جہنم کا مختصر بیان بزبان حضرات ائمہ علیہم السلام

جناب رسولِ خدا اور ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کی سینکڑوں احادیث میں جہنم کے شدائد و مصائب و آلام کا تفصیلی بیان موجود ہے۔ اس مختصر کتاب میں ان کے ذکر کرنے کی نہ گنجائش ہے اور نہ ہی بظاہر مذکورہ بالا آیات کے بعد اس کی ضرورت ہے۔ اس لیے صرف دو چار احادیث پیش کی جاتی ہیں۔

حضرت امیر المومنین علیہ السلام ایک خطبہ میں فرماتے ہیں:

و اعلموا انه لیس لهذا الجلد الرقیق صبر علی النار فارحموا نفوسکم فانکم جربتموها فی مصائب الدنیا افرأیتم جزع احدکم من الشوکة تصیبه و العثرة تدمیه و الرمضاء تحرقه فکیف اذا کان بین طابقین من نار ضجیع حجر و قرین شیطان اعلمتم ان مالکا اذا غضب علی النار حطم بعضها بعضا لغضبه و اذا زجرها توثبت بین ابوابها جزعا من زجرته ایها الیفن الکبیر الذی قد لهزه القتیر کیف انت اذا التحمت اطواق النار بعظام الاعناق و نشبت الجوامع حتی اکلت لحوم السواعد (نهج البلاغة)

تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمھارا یہ نرم و نازک چمڑا آتش جہنم برداشت نہیں کر سکتا۔ اپنے نفوس پر رحم کرو۔ کیونکہ تم اپنے نفوس کو مصائب و آلام دنیا میں آزما چکے ہو۔ تم نے کسی کو دیکھا ہوگا کہ اگر کسی وقت اسے کانٹا چبھ جائے تو وہ کس طرح جزع وفزع کرتا ہے۔ اسے تھوڑا سا لڑکھڑانا خون آلودہ کر دیتا ہے۔ گرم ریت اسے جلا دیتی ہے۔ اس کی اس وقت کیا کیفیت ہوگی۔ جب آتش جہنم کے دو پاٹوں کا ہم خواب اور شیطان کا ہم نشین ہوگا۔ کیا تمھیں علم ہے کہ جب داروغۂ دوزخ (مالک) آتش دوزخ پر غضب ناک ہوتا ہے تو اس کے قہر و غضب کی وجہ سے جہنم کے بعض حصے دوسرے بعض حصوں کو توڑ دیتے ہیں۔ اور جب وہ فرشتہ آتش کو زجر و توبیخ کرتا ہے تو اس کے شعلے دوزخ کے دروازوں پر لپک کر پناہ لیتے ہیں۔ اے بوڑھے انسان جس کے ساتھ بڑھاپا ممزوج و مخلوط ہو گیا ہے اس وقت تیری کیا حالت ہوگی، جب آتش دوزخ کے طوق تیری گردن کی ہڈیوں میں گوشت کی طرح پیوست ہو جائیں گے۔ اور زنجیر و ہتھکڑیاں تیرے ہاتھوں میں گڑ جائیں گی۔ یہاں تک کہ بازوؤں کا گوشت کھا جائیں گی۔ اعاذنا اللہ منہ۔

کتاب امالی میں بروایت عمرو بن ثابت حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے، آپؑ نے فرمایا:

ان اهل النار يتعاوون كما يتعاوى الكلاب و الذئاب مما يلقون من اليم العذاب فما ظنك يا عمرو بقوم لا يقض عليهم فيموتوا و لا يخفف عليهم من عذابها عطاش فيها جياع كليلة ابصارهم صم بكم عمى سودة و جوها بهم خاسئين فيها نادمين مغضوب عليهم فلا يرحمون و لا يخفف عنهم و فى النار يسجرون و من الحميم يشربون و من الزقوم يأكلون و بكلاليب النار يحطمون و با لمقامع يضربون و الملائكة الغلاظ لا يرحمون فهم فى النار يسحبون على وجوههم مع الشياطين يقرنون و فى الانكال و الاغلال يصفدون ان دعوا لم يستجب لهم و ان سئلوا حاجة لم تقض لهم هذه حال من دخل النار

یعنی اہل دوزخ شدتِ عذاب وعقاب کی وجہ سے کتوں اور بھیڑیوں کی طرح آواز نکالیں گے۔ اے عمرو! تمھارا اس گروہ کے متعلق کیا خیال ہے جن کو نہ تو ان کی قضا آئے گی کہ مر ہی جائیں اور نہ ہی ان کے عذاب وعقاب میں کوئی تخفیف کی جائے گی وہ پیاسے ہوں گے اور بھوکے بھی۔ ان کی آنکھیں درماندہ ہوں گی، بلکہ وہ گونگے، بہرے اور اندھے ہوں گے۔ ذلیل ہوں گے، پشیمان ہوں گے، اور مورِدِ قہر وغضب نہ ان پر رحم کیا جائے گا اور نہ ہی ان کے عذاب میں کچھ کمی کی جائے گی۔ اور انھیں آتشِ جہنم میں ڈالا جائے گا۔ وہ پئیں گے تو گرم پانی اور کھائیں گے تو زقوم (تھوہر) کا درخت، انھیں آتشِ دوزخ کے ہتھوڑوں کے ساتھ توڑا جائے گا۔ اور گرزوں کے ساتھ مارا جائے گا۔ اور سخت درشت قسم کے فرشتے ان کے حالِ زار پر رحم نہیں کریں گے۔ پس وہ آتشِ دوزخ میں مُنھ کے بَل گھسیٹے جائیں گے اور شیاطین کے ساتھ قید کیے جائیں گے اور بیڑیوں میں جکڑے جائیں گے۔ اگر دعا وپکار کریں گے تو ان کی دعا مستجاب نہیں ہوگی۔ اور اگر کسی حاجت کا سوال کریں گے تو ان کی حاجت براری نہیں کی جائے گی۔ یہ حالت وکیفیت اس شخص کی ہے جو داخلِ جہنم ہوگا۔

ثالث بحار میں بحوالہ تفسیر فرات کوفی آیتِ مبارکہ "و لیس لهم طعام الا من ضریع" (غاشیہ:۶) کہ سوائے ضریع کے ان کی اور کوئی غذا نہ ہوگی۔ "ضریع" کی تفسیر "عرق اهل النار و ما یخرج من فروج الزوانی" (دوزخیوں کا پسینہ اور زانیوں کی شرم گاہوں کی غلاظت) کے ساتھ کی گئی ہے۔

جناب رسولِ خدا ﷺ در" زقوم غسلین " جو کہ جہنمیوں کو بطور غذا دی جائے گی، فرماتے ہیں کہ اگر ان کا ایک ایک قطرہ دنیا کے پہاڑوں پر ڈالا جائے تو وہ تحت الثریٰ تک پگھل جائیں۔ اسی طرح وہ گرز جن سے اہلِ دوزخ کو مارا جائے گا پہاڑوں پر مارا جائے تو وہ ریزہ ریزہ ہوجائیں۔ (ثالث بحار)

خصائل شیخ صدوقؒ میں حضرت امیرالمومنین علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: " جہنم میں ایک چکی ہے جو پانچ قسم کے لوگوں کو پیسے گی۔ کیا تم مجھ سے سوال نہیں کرتے کہ وہ کن کو پیسے گی؟ پس عرض کیا گیا: یا امیرالمومنینؑ! وہ کن لوگوں کو پیسے گی؟ فرمایا: وہ پانچ قسم کے لوگ یہ ہیں: ① فاجر علماء دین، ② فاسق قاریٔ قرآن کریم ③ ظالم حاکم ④ خائن وزیر، اور ⑤ جھوٹے عارف لوگ۔

جناب امیرالمومنین علیہ السلام عذابِ جہنم کے بارہ میں فرماتے ہیں:

"احذروا نارا قعرها بعيد و حرها شديد و عذابها جديد دار ليس فيها رحمة و لا تسمع فيها دعوة و لا تفرج فيها كربة" (نہج البلاغه)

اس آتشِ جہنم سے ڈرو جس کی گہرائی دُور، حرارت سخت اور عذاب نوع بنوع ہے۔ جہنم وہ گھر ہے جس میں نہ رحمت ہے اور نہ اس میں کوئی دعا و پکار سنی جاتی ہے اور نہ ہی اس میں کوئی رنج والم دُور کیا جاتا ہے۔

آخر بیان میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے کلام حقیقت ترجمان کا ایک اقتباس پیش کر کے اس سلسلہ کلام کو ختم کیا جاتا ہے۔ آنجنابؑ نماز کے بعد جو دعا پڑھتے تھے وہ یہ ہے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ نَّارٍ تَغَلَّظْتَ بِهَا عَلٰى مَنْ عَصَاكَ وَ تَوَعَّدْتَ بِهَا مَنْ صَدَفَ عَنْ رِضَاكَ وَ مِنْ نَّارٍ نُوْرُهَا ظُلْمَةٌ وَ هَيِّنُهَا اَلِيْمٌ وَ بَعِيْدُهَا قَرِيْبٌ وَ مِنْ نَّارٍ يَّاْكُلُ بَعْضُهَا بَعْضًا وَ يَصُوْلُ بَعْضُهَا عَلٰى بَعْضٍ وَمِنْ نَّارٍ تَذَرُ الْعِظَامَ رَمِيْمًا وَ تَسْقِيْ اَهْلَهَا حَمِيْمًا وَ مِنْ نَّارٍ لَا تُبْقِيْ عَلٰى مَنْ تَضَرَّعَ اِلَيْهَا وَ لَا تَرْحَمُ مَنِ اسْتَعْطَفَهَا وَ لَا تَقْدِرُ عَلَى التَّخْفِيْفِ عَمَّنْ خَشَعَ لَهَا وَ اسْتَسْلَمَ اِلَيْهَا تَلْقٰى سُكَّانَهَا بِاَحَرِّ مَا لَدَيْهَا مِنْ اَلِيْمِ النَّكَالِ وَ شَدِيْدِ الْوَبَالِ وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَقَارِبِهَا الْفَاغِرَةِ اَفْوَاهُهَا وَ حَيَّاتِهَا الصَّالِقَةِ بِاَنْيَابِهَا وَ شَرَابِهَا الَّذِيْ يُقَطِّعُ اَمْعَآءَ وَ اَفْئِدَةَ سُكَّانِهَا وَ يَنْزِعُ قُلُوْبَهُمْ وَاَسْتَهْدِيْكَ لِمَا بَاعَدَ مِنْهَا وَ اَخَّرَ عَنْهَا

بارِ الہا! میں اس آگ سے پناہ مانگتا ہوں جس کے ذریعے تو نے اپنے نافرمانوں کی سخت گرفت کی ہے، اور جس سے تو نے ان لوگوں کو جنھوں نے تیری رضا و خوشنودی سے رُخ موڑ لیا، ڈرایا دھمکایا ہے، اور اس آتشِ جہنم سے پناہ مانگتا ہوں جس میں

روشنی کے بجائے اندھیرا ہے، جس کا خفیف لپکا بھی انتہائی تکلیف دہ ہے، اور جو کوسوں دور ہونے کے باوجود (گرمی وتپش کے لحاظ سے) قریب ہے اور اس آگ سے پناہ مانگتا ہوں جو آپس میں ایک دوسرے کو کھالیتی ہے اور ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتی ہے اور اس آگ سے پناہ مانگتا ہوں جو ہڈیوں کو خاکستر کردے گی، اور دوزخیوں کو کھولتا ہوا پانی پلائے گی۔ اور اس آگ سے کہ جو اس کے آگے گڑگڑائے گا اس پر ترس نہیں کھائے گی اور جو اس سے رحم کی التجا کرے گا اس پر رحم نہیں کرے گی۔ اور جو اس کے سامنے فروتنی کرے گا اور خود کو اس کے حوالے کر دے گا اس پر کسی طرح کی تخفیف کا اسے اختیار نہیں ہوگا۔ وہ دردناک عذاب اور شدید عقاب کی شعلہ سامانیوں کے ساتھ اپنے رہنے والوں کا سامنے کرے گی۔ (بارِ الٰہا!) میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں جہنم کے بچھوؤں سے جن کے مُنھ کھلے ہوئے ہوں گے اور ان سانپوں سے جو دانتوں کو پیس پیس کر پھنکار رہے ہوں گے اور اس کے کھولتے ہوئے پانی سے جو انتڑیوں اور دلوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا اور (سینوں کو چیر کر) دلوں کو نکال لے گا۔ خدایا! میں تجھ سے توفیق مانگتا ہوں ان باتوں کی جو اس آگ سے دور کریں اور اس سے پیچھے ہٹا دیں۔ (صحیفہ کاملہ ترجمہ مفتی جعفر حسین صاحبؒ)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: ایک مرتبہ جناب جبرئیلؑ جناب رسولِ خدا ﷺ کی خدمت میں اس حال میں حاضر ہوئے کہ افسردگی کے آثار چہرہ بشرہ سے آشکار تھے۔ آنحضرتؐ نے پریشانی کا سبب دریافت فرمایا۔ جبرئیلؑ نے عرض کیا کہ خدائے قہار کے حکم سے آتش جہنم کو ایک ہزار سال تک دہکایا گیا۔ یہاں تک کہ سفید ہوگئی۔ پھر ایک ہزار سال تک اسے روشن کیا گیا، یہاں تک کہ سیاہ و تاریک ہوگئی۔ اب اس کی کیفیت یہ ہے کہ اگر اس کے آبِ گرم و بدبودار کا ایک قطرہ دنیوی پانیوں میں ملادیں تو اہل دُنیا اس کی حرارت سے ہلاک ہوجائیں اور اگر اس کے ستر ہاتھ لمبے زنجیروں کی صرف ایک کڑی پہاڑوں پر رکھ دی جائے تو سب پہاڑ ریزہ ریزہ ہوجائیں، اور اگر جہنمی کپڑوں میں سے کوئی کپڑا زمین و آسمان کے درمیان آویزاں کر دیا جائے تو دنیا والے اس کی بدبو سے جاں سپاری ہوجائیں۔ اس کے بعد جناب رسولِ خداؐ اور جبرئیلؑ ہر دو رونے لگے۔ رب جلیل نے ایک فرشتہ کے ذریعے تُحفۂ درود وسلام کے بعد کہلا بھیجا کہ: میں نے تم دونوں کو اس سے محفوظ رکھا ہے کہ کوئی ایسا گناہ نہ کرو جو باعث دخولِ جہنم ہو۔ بایں ہمہ امام عالی مقامؑ فرماتے ہیں کہ

اس کے بعد جناب رسولِ خداؐ اور جبرئیل امینؑ کو مُسکراتے ہوئے نہ دیکھا گیا۔ پھر امامؑ نے فرمایا کہ: جہنم اس قدر گہری ہے کہ جب جہنمی اس میں داخل ہوں گے تو ستر برس کی مسافت تک برابر نیچے چلے جائیں گے۔ جب اوپر آئیں گے تو آہنی ہتھوڑوں سے مار مار کر پھر ان کو نیچے دھکیل دیا جائے گا۔ برابر اُن کی یہی کیفیّت رہے گی۔ چنانچہ خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے: "كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۗ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ" (سورۃ الحج:۲۲) جب ان کے چمڑے گل سڑ جائیں گے تو ان کو تبدیل کر دیا جائے گا۔ (ثالث بحار)

جنّت و دوزخ کا خلود و دَوام

جنّت اور اس کے ثواب کے خلود کے بارے میں تو تمام اہلِ اِسلام کا اتفاق ہے کہ جو صالح و سعید اور نیک بخت بندے اس میں داخل ہوں گے، وہ ابدالآباد تک اس میں رہیں گے۔ اسی لیے اس کا نام ہی "جنّت الخلد" (بقائے دوام کا باغ) ہے۔ "جنت الخلد وُعد المتقون" (فرقان:۱۵) اس سلسلہ میں آیاتِ مُتظافرہ اور روایاتِ متواترہ موجود ہیں۔ ارشادِ قدرت ہے: "طبتم فادخلوها خالدين" (سورۃ زمر:۷۳) جب جنتی لوگ جنت کے قریب پہنچیں گے تو آواز آئے گی: "تم پاک و پاکیزہ ہو، اب ہمیشہ کے لیے جنّت میں داخل ہو جاؤ"۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۞ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ (سورۃ بینۃ:۷ و ۸)

جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیے، وہ تمام مخلوق سے بہتر ہیں۔ ان کے پروردگار کے نزدیک ان کی جزا یہ ہے کہ رہائش کے لیے باغات ہیں، جن میں نہریں جاری ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۞ (سورۃ آلِ عمران:۱۰۷)

جن کے چہرے سفید ہوں گے، وہ خدا کی رحمت میں ہوں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

کہاں تک ایسی آیات کو شمار کیا جائے، جن میں جنتیوں کا جنّت میں ہمیشہ قیام پذیر رہنا مذکور ہے۔ بعض آیات میں "عطاء غیر مجذوذ" (سورۃ ہود:۱۰۸) وارد ہے، جس کے معنی ہیں نہ قطع ہونے والی عطاء و بخشش۔

حقیقت یہ ہے کہ نعماتِ جنّت میں سے جو نعمت سب سے گراں قدر ہے وہ بقائے دوام کی دولت ہے۔ اس موجودہ دنیا میں بھی گو لذتیں اور مسرتیں ہیں مگر جو چیز یہاں نہیں وہ بقائے دوام ہے۔ یہاں کی ہر لذت عارضی اور ہر مسرت آنی ہے، یہاں خوشی کا کوئی ایسا ترازو نہیں جس کے بعد غم وماتم کا کوئی نالہ نہ ہو۔ یہاں ہر پھول کے ساتھ کانٹے، ہر روشنی کے ساتھ تاریکی، ہر وجود کے ساتھ فنا، ہر سیری کے بعد بھوک، ہر سیرابی کے بعد پیاس اور ہر غنا کے بعد محتاجی ہے۔ انسان ہزاروں مشکلیں اٹھانے اور ہزاروں صدمے سہنے کے بعد ایک مسرت کا پیام سنتا ہے اور خوشی کا منظر دیکھتا ہے۔ مگر ابھی اس سے سیر حاصل ہونے کی نوبت بھی نہیں آتی کہ اس کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ غرض اس موجودہ عالم فانی کی ہر شے آنی جانی ہے۔ اور یہی یہاں کی سب سے بڑی کمی ہے۔ لیکن جنّت اس مملکت کا نام ہے جہاں کی لذتیں جاودانی، اور جہاں کی مسرتیں غیر فانی ہیں، جہاں حیات ہے مگر موت نہیں، راحت ہے مگر تکلیف نہیں، لذت ہے مگر الم نہیں، مسرت ہے مگر غم نہیں، جہاں وہ سکون ہے جس کے ساتھ اضطراب نہیں۔ اور وہ شادمانی ہے جس کے بعد حزن واندوہ نہیں۔ پھر اس جنۃ الخلد اور غیر فانی ملک کا اِستحقاق ان (آدمؑ) اور ان کی نسل کے اعمال صالحہ کا صلہ قرار پایا۔ چنانچہ فرمایا:

اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ كَانَتْ لَهُمْ جَزَاۗءً وَّ مَصِيْرًا ﴿۱۵﴾ (سورۃ الفرقان:۱۵)

یہ ہمیشگی کا باغ وہ غیر فانی مملکت ہے جہاں کا آرام دائم، اور جہاں کی سلامتی ابدی، جہاں کی لذت بے انتہا، جہاں کی زندگی غیر منقطع، جہاں کا سرور غیر مختتم اور جہاں کا عیش جاوداں ہے۔ دنیا میں شخصی راحت و آرام کا بلند سے بلند تخیل ایک لفظ "بادشاہی" کے اندر بخوبی ادا ہوسکتا ہے۔ اگر انسان کو اس کی انتہائی آرزوؤں کے بر آنے کی خوشخبری کے دینے کے لیے کوئی لفظ ہوسکتا ہے تو یہی ہے۔ تو یا بادشاہی اس کیفیّت کا نام ہے جس میں انسان کی کوئی آرزو کامیابی سے محروم نہ رہے۔ سامانِ راحت اور اسبابِ شادمانی کی فراوانی سے اس کی مسرت میں کسی غم کا شائبہ نہ ہو۔ اونچے اونچے محل، ہرے بھرے باغ، بہتی نہریں، سرسبز و شاداب تختے، سونے چاندی کے اسباب، زر و جواہر کے برتن، کمر بند غلام و خدام، ریشمی لباس، طلائی تخت، موتیوں کے ہار، سونے کے کنگن، شراب، اور بلوری پیالے، حسین ومہ جبین بیگمات۔ غرض ایک لفظ بادشاہی کے یہ تمام ضروری لازمے ہیں۔ جنّت کی مختصر ترین لیکن سچّی تعریف آدمؑ کے دشمن نے آدمؑ کے سامنے کی تھی۔ "ملك لا يبلىٰ" (طٰہٰ: ۱۲۰) اور "غیر فانی بادشاہی" (سیرۃ النبیؐ جلد ۴)

یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ اخروی لذائذ و نعمات دنیوی نعمتوں کے ساتھ سوائے رسمی

اشتراک وتشابہ کے اور کوئی مشابہت نہیں رکھتیں۔ ع

"آں زمیں را آسمانے دیگر است"

ارشادِ قدرت ہے: "كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوا هَٰذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِن قَبْلُ ۖ وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا" (سورۃ البقرۃ:۲۵)

اسی طرح کفار ومشرکین ومنافقین اور بعض نام نہاد مسلمین مثل غالی وناصبی اور خارجی کے دائمی طور پر عذابِ جہنم میں معذب ومعاقب ہونے پر سوائے بعض متصوفہ مثل ابن عربی وغیرہ کے اتفاق ہے۔ ہاں وہ صحیح العقیدہ مگر گنہگار مسلمان جو دنیا اور برزخ کے شدائد میں مکمل طور پر لوثِ گناہ سے پاک نہیں ہو سکے، کچھ عرصہ عذابِ دوزخ میں مبتلا رہنے کے بعد رحمتِ الٰہیہ کے شامل حال ہونے یا شفاعتِ نبیؐ وامامؑ کے نصیب ہونے کی بنا پر اس سے نکل کر داخل جنت کیے جائیں گے۔ دوام وخلود جہنم کے سلسلہ میں بھی آیاتِ متکاثرہ اور روایاتِ متواترہ موجود ہیں۔ بطور نمونہ مشتے از خروارے دو چار آیات پیش کی جاتی ہیں۔ ارشادِ قدرت ہے:

إِنَّ اللَّهَ لَعَنَ الْكَافِرِينَ وَأَعَدَّ لَهُمْ سَعِيرًا ۝ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ (سورۃ الاحزاب:۶۴ و ۶۵)

خدا تعالیٰ نے کافروں پر لعنت کی ہے، اور ان کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

دوسرے مقام پر ارشاد فرماتا ہے:

وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۝ (سورۃ جن:۲۳)

جو لوگ خدا اور رسولؐ کے حقیقی نافرمان ہیں وہ آتشِ جہنم میں ہمیشہ ابدالآباد تک رہیں گے۔

ان آیات میں عذابِ دوزخ کے دوام کی جس طرح صراحت ووضاحت موجود ہے، وہ اربابِ بصیرت پر مخفی ومستور نہیں ہے۔ اولا: تو لفظ "خلود" کے حقیقی معنی ہی دوام کے ہیں، اگرچہ اس میں قیامِ طویل والے معنی کا بھی احتمال ہے۔ مگر...... ثانیاً: اس کے ساتھ "ابد" کی قید موجود ہے۔ اس نے معنی دوام کی اور بھی تاکید مزید کر دی ہے۔ ثالثاً: اس مطلب کو قرآن مجید میں مختلف عناوین سے بیان کیا گیا ہے۔

☆ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے: "وماھم بخارجین من النار" (سورۃ بقرہ:۱۶۷) وہ اس سے کبھی نہیں نکل سکیں گے۔

☆ ایک اور مقام پر وارد ہے: "ان الظالمین فی عذاب مقیم" (سورۃ شوریٰ:۴۵) ظالم (کافر و

مشرک) ہمیشہ قائم رہنے والے عذاب میں مُبتلا رہیں گے۔

☆ ایک جگہ ہے: "اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ" (سورۃ مائدہ:۷۲) جو شخص اللہ سبحانہ کے ساتھ شرک کرے گا، خدا نے اس پر جنّت حرام کر دی ہے، اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

☆ ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے: "اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ" (سورۃ اعراف:۴۰) اور نہ وہ بہشت ہی میں داخل ہونے پائیں گے، یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکا میں ہو کر نکل جائے۔ یعنی جس طرح یہ محال ہے اسی طرح ان کا بہشت میں داخل ہونا بھی محال ہے۔

لہٰذا بعد ازیں بھی اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ عذاب جہنم غیر دائمی ہے اور منقطع ہونے والا ہے اور یہ کہتا ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ جہنم ختم کر دی جائے گی (ابن قیم در شفاء العلیل، حاوی الارواح) یا ایک وقت آئے گا کہ جہنم میں ڈھونڈنے سے کوئی نہیں ملے گا، بلکہ اس میں گھاس اگ آئے گی، یا دوزخی اس سے مانوس ہو جائیں گے کہ ان کو کوئی اذیت نہ ہوگی (ابن عربی در فتوحات مکیّہ) تو اہل انصاف بتائیں کہ ایسے شخص کا نظریہ اسلامی عقائد و مُسلمات کے ساتھ کہاں تک مطابق ہو سکتا ہے؟ جہاں بعض آیات میں "الا ماشاء اللہ" کا اِستثنا موجود ہے۔ اس سے مراد یہی ہے کہ بعض گنہگار صحیح العقیدہ مُسلمانوں کو سزا بھگتنے اور گناہوں کی آلائش و آلودگی سے پاک ہو جانے یا رحمتِ ایزدی کے شامل ہونے یا شفاعت کبریٰ کے نصیب ہو جانے کے بعد دوزخ سے نکال لیا جائے گا، اور انھیں داخل جنّت کر دیا جائے گا، یا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ خدا کی مشیّت کے سوا ان کو جنّت سے کوئی الگ نہیں کر سکے گا۔ لیکن اس کی مشیّت یہی ہوگی کہ ان کے لیے یہ بخشش دائمی اور غیر منقطع طریقہ سے ہمیشہ قائم رہے۔ پھر جس کے متعلق اس کی مشیّت کا یہ اعلان ہو وہ فنا کیونکر ہو سکتی ہے۔

سببِ خلودِ اہل جنّت و جہنم

باقی رہی اس بات کی تحقیق کہ اہلِ جنّت کے اعمالِ صالح کم اور جزائے دائمی زیادہ اور اہلِ نار کے اعمالِ طالح کم اور سزائے دائمی زیادہ ہے۔ تو اس کی وجہ جو کچھ اخبارِ اہلِ بیتؑ وحی سے معلوم ہوتی ہے وہ "نیت" ہے کہ اہلِ جنّت کی نیت ہمیشہ اِطاعتِ خدا اور اہلِ جہنم کی نیت ہمیشہ معصیت خدا کرنے کی تھی۔ جس کی بدولت وہ ثوابِ ابدی پر فائز ہوئے اور یہ دائمی عذاب میں گرفتار۔ چنانچہ امام جعفر

صادق علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا:

انما خلّد اهل الجنة فی الجنة لان نیاتهم کانت فی الدنیا لو بقوا ان یطیعوا الله ابداً ما بقوا و انما خلد اهل النار فی النار لان نیاتهم کانت فی الدنیا لو خله و افیها ان یعصوا الله ابداً فالنیات تخلد (تفسیر صافی)

مطلب کا خلاصہ وہی ہے جو اوپر بیان کر دیا گیا ہے۔ اسی لیے وارد ہے: "نیة المومن خیر من عمله و نیة الکافر شر من عمله و انما الاعمال بالنیات"۔

استدراک ضروری الاظہار

حضرت مُصنّف علامؒ نے جو یہ فرمایا ہے کہ جو گنہگار مُسلمان دوزخ میں داخل ہوں گے، ان کو اس میں کوئی تکلیف واذیّت نہ ہوگی، ہاں نکلتے وقت کچھ تکلیف محسوس ہوگی۔ مُتعدّد آثار و اخبار اس کے خلاف موجود ہیں۔ منجملہ ان کے ایک تو وہی حدیث ہے جو سابقاً اسی رسالہ اعتقادیہ میں گزر چکی ہے کہ کچھ گنہگار ایسے بھی ہوں گے جنھیں تین تین لاکھ سال تک آتش دوزخ میں مُبتلائے عذاب رہنے کے بعد شفاعت ائمۂ اہلِ بیتؑ نصیب ہوگی۔ دوسری وہ روایت جو کتب فریقین میں موجود ہے کہ جب گنہگاروں کو میعادِ عذاب ختم ہونے یا شفاعت وغیرہ اسبابِ مغفرت کی وجہ سے آتش دوزخ سے نکالا جائے گا تو وہ جل کر کوئلہ کی مانند ہو چکے ہوں گے۔ (حق الیقین مجلسیؒ، بخاری کتاب الایمان وغیرہ) علاوہ بریں جہنم کے جو عذاب وعقاب کتاب وسنت میں مذکور ہیں، ان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جو شخص اس میں داخل ہوگا ضرور ان عذابوں میں گرفتار ہوگا۔ (نعوذ باللہ منہا) بنابریں جناب مُصنّف نے ایک خبر واحد کا جو مضمون بیان کیا ہے اس پر اذعان ویقین نہیں کیا جا سکتا۔ واللہ العالم۔

بعض اہم شکوک واوہام کا ازالہ

جسمانی جنّت و دوزخ کی جو کیفیّت ہم نے بالاجمال ذکر کی ہے اس پر قریباً قریباً تمام فرقہائے اسلام کا اتفاق واجماع ہے۔ مگر ملاحدہ ومُنکرین کی طرف سے اس پر خصُوصاً عذابِ دوزخ کے متعلّق بڑی شد ومد کے ساتھ بعض اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ جن کا ذکر مع ان کے جوابات کے فائدے سے خالی نہیں ہے۔ اس لیے باوجود اس مبحث کے غیر معمُولی طور پر طویل ہو جانے کے ہم ان ایرادات کو مع جوابات یہاں ذکر کرتے ہیں۔

پہلا اعتراض

اس سلسلہ میں ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ سزا یا انتقام وہ شخص لیتا ہے جسے کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچا ہو۔ یا اس کے پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ مگر خدا کی ذات تو اس سے اجل وارفع ہے۔ اگر تمام دنیا فسق و فجور پر ایکا کرلے، تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ لہٰذا انتقام لینا عبث ہے۔ نیز خدا بہت رحیم و کریم ہے اور یہ دوزخ کا عذاب و عقاب جو بہت شدید ہے اس کی شانِ رحیمیت و رؤفیت کے منافی ہے۔

اس اعتراض کا پہلا جواب

اس اعتراض کا کئی طرح سے جواب دیا جاسکتا ہے۔ پہلا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ خداوند عالم یقیناً رحمٰن و رحیم اور رؤف و کریم ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا وہ فقط کافروں و مشرکوں، زانیوں اور قاتلوں اور چوروں و ظالموں کے لیے ہی رؤف و رحیم ہے یا مظلوموں و مقتولوں اور بے کسوں اور بے بسوں کے لیے بھی رحیم و کریم ہے؟ اگر ہے اور یقیناً ہے تو پھر اہلِ عقل و انصاف بتائیں کہ آیا اسے مظلوموں کا بدلہ، ظالموں سے لینا چاہیے یا نہیں؟ عدل و انصاف کا تقاضا کیا ہے؟ آیا دار الجزاء میں ظالم و مظلوم، قاتل و مقتول میں فرق ہونا چاہیے یا دونوں کی حالت یکساں ہو؟ مختلف ادوار و اعصار میں بعض انسان نما درندہ صفت لوگوں نے جو قیامت خیز مظالم اپنے ہی بنی نوع انسان پر ڈھائے ہیں اور ڈھا رہے ہیں، جن کے تصور سے کلیجہ مُنھ کو آتا ہے، اور جبین انسانیت عرقِ انفعال سے شرابور ہوجاتی ہے، کیا ان مظالم کی باز پرس نہ ہوگی؟ کیا مظلوم کی دادرسی نہ کی جائے گی؟ کیا ظالم کو اس کے ظلم و جور کی سزا نہ دی جائے گی؟ معترضین کو معلوم ہونا چاہیے کہ جہاں خداوند عالم رحمٰن و رحیم ہے، وہاں وہ جبار و قہار بھی ہے۔ اس کی گرفت بڑی سخت ہے۔ "ان بطش ربك لشديد" (بروج: ۱۲) اور اس نے بتلا دیا کہ اس کی صفت غفاریت کن لوگوں سے متعلق ہوتی ہے اور صفت قہاریت کا کہاں ظہور ہوتا ہے؟ صاحبِ "فلسفۂ اسلام" نے اس مقام پر ایک بہت اچھا جملہ لکھا ہے: "یہ تعجب نہیں کہ جہنم کیوں پیدا کیا گیا، بلکہ تعجب یہ ہے کہ ان ظالموں کو قیامت تک کی مہلت کیوں دی گئی"۔

اسی طرح حقوق اللہ کا معاملہ ہے۔ اگر یہ جزا و سزا کا سلسلہ نہ ہو تو پھر مُحسن و مسی، صالح و طالح، سعید و شقی، مُطیع و عاصی، مصلح و مُفسد، برو فاجر کا مساوی ہونا لازم آئے گا۔ جو عند العقلاء قبیح و شنیع ہے۔ اور شانِ حکمت و ربوبیت کے خلاف ہے۔ اسی بناء پر اس کا ارشاد ہے: "افنجعل المسلمين كالمجرمين"

(سورۃ ن:۳۵) "کیا ہم مُسلمانوں کو مجرموں کی مانند بنائیں گے؟" ۔"ام نجعل المقتین کالفجار" (سورۃ ص:۲۸) "کیا ہم مُتقیوں کو فاسقوں اور فاجروں کی طرح قرار دیں گے؟"۔ قانونِ شریعت کی تشریع عبث و بے کار رہ جاتی ہے۔ اس پر وہی شخص اعتراض کر سکتا ہے جس کی فطرت میں فتور ہو اور نعمتِ عقل و دانش سے محروم۔

دوسرا جواب

بعض علماء نے اس اعتراض کا یہ جواب دیا ہے کہ: جس طرح عالم جسمانیات میں اسباب و مسببات، علل و معلُولات، اثر اور موثر کا سلسلہ ہے، مثلاً سنکھیا قاتل ہے، گلاب محرک نزلہ ہے، املتاس مُسہل ہے۔ اسی طرح یہ سلسلہ رُوحانیات میں بھی قائم ہے۔ نیک و بد جس قدر افعال ہیں، ان کا نیک یا بد اثر روح پر مترتب ہوتا ہے۔ یہ عذاب و ثواب ان افعال کا لازمی اثر ہے۔ جو ان سے جدا نہیں ہوتا۔ یہ کوئی انتقام نہیں ہے۔ امام غزالی نے اپنے رسالہ "مضنون به علی غیر اهله" میں لکھا ہے، جس کا حاصل مطلب یہ ہے کہ امر و نہی کی خلاف ورزی پر جو عذاب ہوگا، اس کے یہ معنی نہیں کہ خدا کو غصہ آئے گا، اور وہ انتقام لے گا۔ بلکہ اس کی مثال یہ ہے کہ جو شخص عورت کے پاس نہیں جائے گا اس کے ہاں اولاد نہ ہوگی۔ طاعت یا معصیت کی وجہ سے قیامت میں جو ثواب و عذاب ہوگا اس کی بالکل یہی مثال ہے۔ لہٰذا یہ سوال کرنا کہ گناہ سے عذاب کیوں ہوتا ہے۔ گویا یہ سوال کرنا ہے کہ زہر کھانے سے جاندار کیوں مر جاتا ہے؟ خدا نے جن باتوں کا حکم دیا ہے، جن باتوں سے روکا ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ جس طرح ایک طبیب کسی بیمار کو دوا کھانے اور مضر چیزوں سے پرہیز کرنے کا حکم دیتا ہے، مریض اس کے حکم کی تعمیل نہیں کرتا تو اس کو ضرر ہوتا ہے۔ یہ ضرر صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس نے بد پرہیزی کی۔ لیکن عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مریض نے چونکہ حکیم کی نافرمانی کی ہے اس لیے اسے ضرر ہوا۔ حالانکہ ضرر کی علت بد پرہیزی ہے۔ بالفرض اگر طبیب بد پرہیزی سے منع نہ بھی کرتا تو بھی بد پرہیزی کرنے سے ضرر ہوتا۔ یہی حال گناہوں کے ارتکاب کرنے کا ہے۔ اگر خدا ان سے نہ بھی روکتا تو بھی روح کو ان کے ارتکاب سے صدمہ پہنچتا ہے۔ (الکلام شبلی)

الغرض اشخاص کی نیکوکاری و بدکاری اور افراد کی سعادت و شقاوت کے جو اصول ہیں، وہی جماعتوں اور قوموں کی صلاح و فساد اور سعادت و شقاوت پر بھی حاوی ہیں۔ جس طرح ایک سائنٹسٹ (حکیم) کا کام ان مادی فزیکل اصول کو جاننا اور بتانا ہے اور اس کی تعلیم کا نام ہماری

اصطلاح میں حکمت (سائنس) ہے۔ اسی طرح ان روحانی اسباب وعلل و آثار ونتائج کو جاننا اور بتانا انبیاء علیہم السلام کا کام ہے اور ان کی اس تعلیم کا نام شریعت ہے۔ انبیاء کی اس تعلیم کے مطابق ہم کو اعمال کے روحانی آثار ونتائج کا وہی یقین ہونا چاہیے جو ایک حکیم کی تعلیم کے مطابق ہم کو جسمانی اشیاء کے خواص و آثار کا ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ "یہ مادی وجسمانی دنیا علّت ومعلول اور عمل و ردعمل کے جس اصول پر مبنی ہے، اس کی وسعت کے دائرہ میں انسان کا ہر قول اور ہر عمل داخل ہے۔ یہی سبب ہے کہ گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام اسلام میں عقاب اور اعمالِ صالحہ کے لازمی نتیجہ کا نام ثواب رکھا گیا ہے۔ "عقاب" کا لفظ "عقب" سے نکلا ہے۔ جس کے معنی پیچھے کے ہیں۔ اس لیے "عقاب" اس اثر کا نام ہے جو کسی فعل کے کرنے کے بعد لازم آتا ہے۔ اور "ثواب" کا لفظ "ثوب" سے لیا گیا ہے۔ جس کے معنی لوٹنے کے ہیں۔ اس لیے یہ کسی اچھے کام کے لوٹنے والے نتیجہ اور جزا کے معنی میں بولا گیا ہے"۔ (سیرۃ النبیؐ)

اس طرح بھی اس اعتراض کا قلع قمع ہوجاتا ہے۔ بعض آیاتِ قرآنیہ سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے۔ "اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ" (جاثیہ:۲۸) آج تمھیں اسی کا بدلہ ملے گا جو کچھ تم کرتے تھے۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے: "لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى" (طٰہٰ:۱۵) تاکہ ہر نفس کو اس کی کوشش کی جزا دی جائے۔ ایک اور جگہ وارد ہے: "فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ" (نحل:۳۴) "پس انھوں نے جو عمل کیے تھے ان کو ان کی سزائیں ملیں گی اور جس عذاب کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے اس نے ان کو گھیر لیا"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جزا وسزا ہمارے ہی اعمال کے ردعمل کا نام ہے۔ چنانچہ بعض روایات میں وارد ہے کہ قیامت کے دن خدا فرمائے گا: "اے میرے بندو! یہ تمھارے ہی عمل ہیں جو تم کو واپس مل رہے ہیں"۔ تو جو نیکی پائے وہ خدا کا شکر ادا کرے، اور جو برائی پائے وہ اپنے آپ کو ملامت کرے۔ سچ ہے: ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی — یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

دوسرا اعتراض اور اس کا پہلا جواب

گناہ کی مدت بلکہ خود انسانی دنیاوی زندگی کی مدت بہت مختصر اور عذاب وعقاب کی مدت بہت طویل ہے۔ یہ بات شانِ خداوندی کے مناسب نہیں ہے کہ مختصر مدت میں کیے گئے گناہ کا

عذاب اس قدر طویل ہوا۔ اس اعتراض کا بھی کئی طرح جواب دیا جاسکتا ہے۔ ایک جواب یہ ہے کہ یہ امر ظاہر ہے کہ سزا کی کمیت مقدار جرم کی کمیت کے برابر نہیں ہوا کرتی۔ دنیوی قوانین میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ اور کوئی عقل مند ان پر اعتراض نہیں کرتا۔ مثلاً ایک قاتل چند منٹ بلکہ چند سیکنڈ میں کسی کو قتل کر دیتا ہے۔ مگر اس کی سزا اسے حبس دوام کی صورت میں دی جاتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ چونکہ جرم کا ارتکاب چند منٹ یا چند سیکنڈ میں کیا گیا ہے، لہٰذا سزا بھی چند منٹ یا چند سیکنڈ ہونی چاہیے۔ تو کیا عقلائے روزگار ایسے شخص کی حماقت و جہالت میں شک کر سکتے ہیں؟ اسی حبس دوام کا نام "خلود فی النار" ہے۔ "وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ" (سورۃ البقرہ:۳۹)

اسی طرح کھانے پینے میں تھوڑی سی بد پرہیزی یا دیگر اصول حفظانِ صحت میں ذرہ بھی غلط کاری کے نتیجہ میں کئی کئی ماہ بلکہ کئی کئی سال کی بیماری کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو زندگی بھر کے کسی ایسے مرض میں مُبتلا ہوتا ہے کہ باوجود علاج معالجہ بالآخر جانِ عزیز سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ غلطی کے مقابلہ میں اصلاح و تلافی کی مدت کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔

دوسرا جواب

یہ درست ہے کہ انسانی زندگی کی مدتِ ثواب و عقاب کی مدت کے مقابلہ میں بہت ہی قلیل ہے۔ مگر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ انسان اکثر اوقات اسی مختصر سی زندگی میں بعض ایسے گناہوں کا ارتکاب کر جاتا ہے کہ صدیوں تک ان کے برے آثار و نتائج موجود رہتے ہیں۔ اور بعد میں آنے والی نسلوں کو ان کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ جیسے کفر و شرک یا دیگر برے امور کی تاسیس و بنیاد یا قتل نفس وغیرہ۔ اسی لیے خداوند عالم فرماتا ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ

(سورۃ المائدۃ:۳۲)

جس شخص نے ایک شخص کو ناحق قتل کر دیا یا زمین پر فتنہ و فساد پھیلایا وہ ایسا ہے گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کر ڈالا۔

وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ (سورۃ المائدۃ: ۳۲)

اور جس شخص نے ایک نیک آدمی کو بچایا تو گویا اس نے تمام لوگوں کو بچالیا۔

اندریں حالات اگر سزا کی مدت طویل ہو تو اس میں کون سی قباحت لازم آتی ہے۔ "فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ" (سورۃ التوبۃ:۷۰)(فلسفۂ اسلام)

تیسرا جواب

جناب رسولِ خداؐ کا ارشاد ہے: "نیۃ المومن خیر من عملہ و نیۃ الکافر شر من عملہ"۔ کہ "مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر اور کافر کی نیت اس کے عمل سے بدتر ہے"۔ بنابریں اگرچہ ان کے اعمال قلیل ہیں۔ مگر ان کی جزا یا سزا کی مدت کا طویل ہونا، ان کی نیات کا ثمرہ و نتیجہ ہے۔ مومن کا یہ ارادہ تھا کہ اگر خدا اسے ابدالآباد تک زندہ رکھے گا تو وہ اس کی عبادت واطاعت ہی کرتا رہے گا، اور کافر کا عزم ہمیشہ معصیت و نافرمانی کا تھا، اس لیے ان کی نیتوں کے مطابق ان کے ثواب یا عقاب کی مدت طویل ہوگی۔ یہ جواب باصواب حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے کلام حق ترجمان سے ماخوذ ہے۔(علل الشرائع جلد ۲)

تیسرا اعتراض اور اس کا جواب

یہ چیز سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک انسان آگ میں رہے، گرم پانی سر پر پڑے، لہو اور پیپ پیے اور پھر زندہ رہے؟ اس اعتراض کا مختصر جواب یہ ہے: ابھی انسانی عقل ناقص ہے۔ ہزاروں اشیاء کی حقیقت تاحال مجہول ہے۔ کیا معترض نے باقی سب کچھ سمجھ لیا ہے اور صرف یہی ایک بات باقی رہ گئی ہے؟ جہاں اور اشیاء ان سمجھی موجود ہیں، وہاں ایک یہ بھی سہی۔ اگر "ان اللہ علیٰ کل شئ قدیر" پر ایمان کامل ہو تو ایسے شبہات پیدا ہی نہیں ہوتے۔ حالانکہ ایسی مثالیں دنیا کے اندر بھی موجود ہیں۔ پتھر شگافتہ کرنے سے ان کے اندر بعض کیڑے مکوڑے نکلتے ہیں، جہاں کسی قسم کا کوئی آب و دانہ موجود نہیں ہوتا، اسی طرح سنا گیا ہے کہ ایک خاص قسم کا کیڑا ہے جو آگ میں نہیں مرتا، تو جو خدا اِس بات پر قادر ہے، وہ اُس پر بھی قادر ہے، جو سوال میں پیش کی گئی ہے۔

باب الاعتقاد

فی کیفیة نزول الوحی من عند اللہ تعالیٰ بالکتب فی الامر والنہی

قال الشیخ ابوجعفرؒ اعتقادنا فی ذلك ان بین عینی اسرافیل لوحا اذا اراد اللہ ان یتکلم بالوحی ضرب اللوح جبین اسرافیل فینظر فیه فیقرء ما فیه فیلقیه الیٰ میکائیل و یلقیه میکائیل الیٰ جبرئیل فیلقیه جبرئیل الی الانبیاء

تیسواں بابؒ

نزولِ وحی کی کیفیّت کے متعلّق اعتقاد

جناب شیخ ابو جعفرؒ فرماتے ہیں کہ ہمارا اعتقاد اس سلسلہ میں یہ ہے کہ جناب اسرافیلؑ کی دونوں آنکھوں کے سامنے ایک تختی ہے۔ خداوندعالم جب کسی امر کے متعلّق وحی کے ذریعہ سے کلام کرنا چاہتا ہے تو وہ تختی اسرافیلؑ کی پیشانی پر لگتی ہے، وہ جناب اس میں نگاہ کرتے ہیں اور جو کچھ اس میں لکھا ہوتا ہے اسے پڑھ کر جناب میکائیلؑ تک پہنچا دیتے ہیں، میکائیلؑ اس کی اطلاع حضرت جبرئیلؑ کو دے دیتے ہیں اور جبرئیل امین علیہ السلام اس وحی خداوندی کو انبیاء علیہم السلام تک پہنچا دیتے ہیں۔

تیسواں بابؒ

کیفیّتؒ نزولِ وحی کا بیانؒ

وحی کے معانی اور اس کے موارِدِ استعمال کا بیان

لغت عرب میں لفظ "وحی" مُتعدّد معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ منجملہ ان کے چند معنی یہ ہیں: اشارہ، کتابت، رسالت (پیغام) الہام، اور کلام خفی، راز و نیاز۔ (ملاحظہ ہوں: لسان العرب، قاموس، اقرب الموارد وغیرہ) آیاتِ قرآنیہ میں انہی لغوی معنوں کے اعتبار سے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ آیۂ مبارکہ: "واوحینا الی ام موسیٰ ان ارضعیه" (سورۃ القصص: ۷) (ہم نے مادرِ موسیٰ کو وحی کی کہ موسیٰؑ کو دودھ پلا) یہاں وحی بمعنی الہام والقاء فی القلب ہے۔ اور آیت مبارکہ: "واوحینا الی النحل" (نحل: ۶۸) (ہم نے شہد کی مکھی کو وحی کی) میں وحی بمعنی تسخیر ہے (کہ ہم نے اسے مسخر کر دیا) یا بقول بعض یہاں بھی بمعنی القاء درقلب ہے۔ اور آیت مبارکہ "فخرج علیٰ قومه من المحراب فاوحی

و ما الغشوة التی کانت تاخذ النبی فانها کان تکون عند مخاطبة الله ایاه حتی ینتقل و یعرق فاما جبرئیل فانه کان لا یدخل علیه حتی یستاذنه اکراما له و کان یقعد بین یدیه قعدة العبید	وحی کے وقت آنحضرت ﷺ پر غشی کی جو کیفیت طاری ہوجاتی تھی تو یہ خداوند عالم کے آنحضرتؐ سے خطاب فرمانے (نہ کہ جناب جبرئیلؑ کی آمد) کی وجہ سے عارض ہوتی تھی۔ حتی کہ آنحضرتؐ کا جسم مبارک بھاری ہوجاتا، اور آپؐ پسینہ سے شرابور ہوجاتے تھے۔ جناب جبرئیلؑ تو آنحضرتؐ کا اس حد تک احترام کرتے کہ وہ حضورؐ کی خدمت اقدس میں غلاموں کی طرح بیٹھا کرتے تھے۔

الیھم " (سورۃ مریم :۱۱) (جناب زکریاؑ اپنی قوم پر برآمد ہوئے اور ان کی طرف اشارہ کیا) میں وحی بمعنی اشارۂ خُفیہ ہے۔ آیت مبارکہ "یُوْحِیْ بَعْضُھُمْ اِلٰی بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا " (سورۃ انعام: ۱۱۲) (ان میں سے بعض دوسرے بعض کی طرف بطور راز جھوٹے قول نقل کرتا ہے) میں وحی بمعنی راز و نیاز استعمال ہوتی ہے۔ الغرض لغوی اعتبار سے وحی کی جامع تعریف ہے: "القاء الشئ الی الغیر علی وجه السر " لیکن اصطلاح شریعت میں جیسا کہ مجمع البحرین وغیرہ کتب میں مذکور ہے: "غلب استعمال الوحی فیما یلقی الی الانبیاء من عند الله عز و جل " اس لفظ کا غلبۂ استعمال اس (کلام) پر ہوگیا ہے جو خداوند عالم کی طرف اس کے انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتا ہے۔ اس لیے جب اسلامی کتب میں یہ لفظ بولا جائے تو بلا قرینہ اس سے یہی معنی متبادر ہوتے ہیں۔

وحی کی فلسفی و شرعی حیثیت

چونکہ وحی ہی نبی وغیر نبی نیز نبوت کے سچے اور جھوٹے مدعی کے درمیان فارق ہے۔ جیسا کہ آیت مبارکہ: "قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یُوْحٰٓى اِلَیَّ " (سورۃ الکھف: ۱۱۰) وغیرہ سے مُستفاد ہوتا ہے۔

لہٰذا اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اس پر قدرے مزید تبصرہ کیا جاتا ہے۔ سو مخفی نہ رہے کہ حکماء اسلام نے وحی کو "ملکہ نبوت " سے تعبیر کیا ہے۔ اور اس کی تشریح وہ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ انبیاء و مرسلین میں علم و عقل کی ایسی قوت موجود ہوتی ہے، جو عام انسانوں میں نہیں ہوتی۔ حواس صرف مادیات کو دریافت کرتے ہیں، دماغی قویٰ اس سے بلند ذہنیات و عقلیات کو، مگر ملکہ نبوت اس سے بھی بلند تر ہے۔ وہ عقلیات سے بھی بلند تر حقائق کا درک کرتا ہے۔ اور یہ ادراک حقائق اس قدر مکمل اور صحیح ہوتا ہے کہ نہ اس میں غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ منطقی ترتیب مقدمات کی حاجت ہوتی

ہے، بلکہ حقائق اس طرح پیشِ نظر ہوتے ہیں جس طرح وجدانیات بدیہیات اور محسوسات۔ چونکہ یہ معلومات عام انسانی ذرائع و وسائط علم کے بغیر خود علام الغیب عطا کرتا ہے اس لیے شرعی زبان میں اسے وحی والہام کا نام دیا جاتا ہے۔ حکماء کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی کسی خارجی حقیقت (براہِ راست وقتاً فوقتاً تعلیم ربانی) کا نام نہیں بلکہ پیغمبر کے مافوق ذہنی قویٰ اور وہبی علم و فہم کا نتیجہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتدائے آفرینش سے انبیاءؑ کو فطرۃً مخصوص قویٰ و کمالات سے نوازا جاتا ہے اور منشائے قدرت کو سمجھنے کی استعداد ان میں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے، جس سے غیر انبیاء محروم ہوتے ہیں۔ تاہم اسی استعداد کو وحی قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس جبلی استعداد کو ملکہ نبوت یا مایۃ النبوّۃ کہا جاسکتا ہے، لیکن وحی بہرحال اس خارجی حقیقت کا نام ہے جس کے ذریعہ خلاقِ عالم اپنے انبیاء و مرسلین کو گاہ بگاہ اپنے احکام وعزائم بتلانے کے لیے براہِ راست الہام والقا یا بذریعہ فرشتوں کے آگاہ کرتا رہتا ہے۔

قرآن و حدیث قدسی اور عام حدیث کا باہمی فرق

بنابریں یہ بات محتاجِ بیان نہیں رہتی کہ انبیاءؑ کے معلومات، تعلیمات، و ارشادات سب وحی الٰہی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہوتا ہے کہ اگر الفاظ و معانی ہر دو منجانب اللہ اور وہ بھی مُعجزانہ شان لیے ہوئے ہوں تو اس کے مجموعہ کو صحیفہ یزدان یا قرآن یا زبور و توراۃ وانجیل کہا جاتا ہے۔ اور اگر الفاظ و معانی ہر دو ہوں تو منجانب اللہ۔ مگر مُعجزانہ حیثیت کے حامل نہ ہوں تو اسے "حدیثِ قدسی" کا نام دیا جاتا ہے۔ اور اگر معانی منجانب اللہ ہوں اور الفاظ نبی کے ہوں تو اسے اصطلاح میں عام "حدیث" یا سنت کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔

وحی متلو و غیر متلو

اسی لیے بعض علمائے اصول نے کتاب اللہ کو وحی متلو (یعنی وہ وحی جس کی تلاوت کی جاتی ہے) اور سنت کو وحی غیر متلو (وہ وحی جس کی تلاوت نہیں کی جاتی) قرار دیا ہے۔ سچ ہے: ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

وحی شیطانی کا تذکرہ

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ تو وحی ربانی کے متعلق تھا، اس کے بالمقابل ایک "وحی شیطانی" بمعنی "وسوسۂ ابلیسی" بھی ہے۔ چنانچہ ارشادِ قدرت ہے: "ان الشیطان لیوحون الی اولیائھم"۔ شیطان اپنے دوستوں کی طرف وحی کرتے ہیں۔ یعنی ان کو وسوسہ میں مُبتلا کرتے ہیں۔ (یوسوس فی صدود الناس من الجنة و الناس) لہٰذا اگر کوئی یبوست و دماغی خشکی کا مریض یا کوئی چلہ زدہ نیم پاگل یا غیر شرعی ریاضت کرنے والا یا مالیخولیا میں مُبتلا شخص کبھی شیطانی القاآت یا ذاتی پریشان خیالات و خزعبلات کو وحی الٰہی سمجھتا ہے، بلکہ بعض اوقات بر بنائے فاسد اپنی نبوت کا ادعا بھی کرنے لگتا ہے تو اہل اسلام و ایمان کو چاہیے کہ ان کو نبی ماننے کی بجائے کسی دماغی امراض کے ماہر کے پاس لے جائیں، اور اس کا شافی علاج کرائیں۔ اس میں اس کے علاوہ اور بہتوں کی بھلائی ہے۔ ایسا کرنے والوں کو خدا جزائے خیر دے گا۔

فان اللہ لا یضیع اجر المحسنین

شرعی وحی کے اقسام سہ گانہ کا بیان

انبیاء کی یہ وحی کئی طرح پر ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشادِ قدرت ہوتا ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ (سورۃ الشوریٰ: ۵۱)

مُصنّف کے بیان کردہ مسلک کی تائید مزید

جناب مُصنّف علام علیہ الرحمہ نے طریقہ وحی کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے یہ مضمون چند احادیث میں وارد ہوا ہے۔ اور عقلاً بھی یہ امر ممکن ہے۔ لہٰذا محض استبعاد کی بنا پر اس کا انکار یا اس میں تردد کا اظہار کرنا جیسا کہ حضرت شیخ مُفید علیہ الرحمہ نے "ھذا اخذہ ابوجعفرؒ من شواذ الحدیث" لکھ کر اس کا مظاہرہ فرمایا ہے۔ بظاہر درست نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ اس مقام پر تو حضرت شیخ مُفید علیہ الرحمہ اس مطلب کو شواذ احادیث سے ماخوذ قرار دیتے ہوئے مسترد فرما رہے ہیں۔ لیکن مبحث لوح و قلم میں جہاں مُصنّف علام نے یہ فرمایا ہے کہ لوح و قلم دو فرشتے ہیں۔ وہاں مُصنّف کے کلام کی رد کرتے ہوئے جناب شیخ علیہ الرحمہ وحی کے اسی طریقہ کو مُتعدد اخبار و آثار کا حاصل قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فاذا اراد الله ان یطلع الملائکة علی غیب الله او یرسلهم الی الانبیاء بذلك امرهم بالاطلاع فی اللوح المحفوظ فحفظوا منه ما یؤدونه الی من ارسلوا و عرفوا منه ما یعملون، و قد جاءت بذلك آثار عن النبیؐ و من الائمة"

یعنی جب خداوند عالم یہ ارادہ فرمائے کہ فرشتوں کو کسی غیب پر مطلع فرمائے یا کسی غیبی بات کے بتانے کے لیے ان کو انبیاء کے پاس بھیجے تو ان (فرشتوں) کو حکم دیتا ہے کہ وہ لوح محفوظ میں نگاہ کریں ۔ چنانچہ فرشتے لوحِ محفوظ دیکھ کر وہ کچھ یاد کر لیتے ہیں جو انھوں نے رسولوں تک پہنچانا ہوتا ہے اور وہ کچھ سمجھ لیتے ہیں جس پر انھوں نے عمل کرنا ہوتا ہے ۔ اس امر کے متعلق پیغمبر اسلامؐ اور حضرات ائمہؑ اہل بیت علیہم السلام سے کئی آثار و اخبار وارد ہوئے ہیں ۔

اسی قسم کے امور کے متعلق حضرت علامہ مجلسی علیہ الرحمہ بحار الانوار جلد ۱۴ میں فرماتے ہیں :

"ما ورد فی الکتاب و السنة من امثال ذلك لا یجوز تاویله و التصرف فیه بمحض استبعاد الوهم بلا برهان و حجة و نص معارض یدعوا الی ذلك"

یعنی قرآن و حدیث میں اس قسم کے جو امور وارد ہوئے ہیں،
بلا دلیل و برہان اور بغیر کسی معارض نص کے محض
استبعاد وہمی کی بنا پر ان کی تاویل
کرنا جائز نہیں
ہے

وھو الحق الحقیق بالاتباع و الحق احق ان یتبع

☆

باب الاعتقاد

نزول القرآن فی لیلۃ القدر

قال الشیخ اعتقادنا فی ذلک ان القرآن نزل فی شھر رمضان فی لیلۃ القدر جملۃ واحدۃ الی البیت المعمور

اِکتیّسواں بابؒ

قرآن کے لیلۃ القدر میں نازل ہونے کے متعلّق اِعتقاد

حضرت شیخ ابو جعفرؒ فرماتے ہیں کہ اس بارے میں ہمارا اِعتقاد یہ ہے کہ ماہِ رمضانُ المبارک کی لیلۃ القدر میں پُورا قرآن مجید بیتُ المعمور میں یک دفعہ نازل ہوا۔

اِکتیّسواں بابؒ

لیلۃ القدر میں نزولِ قرآن کا بیانؒ

نزولِ قرآن کے سلسلہ میں جو کچھ مُصنّف علام نے ذکر فرمایا ہے یہ مُتعدّد آیات واحادیث سے مُستفاد ہے۔ چنانچہ خداوند عالم ایک جگہ ارشاد فرماتا ہے: "شھر رمضان الذین انزل فیه القرآن" (سورۃ البقرہ:۱۸۵) ماہِ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن مجید نازل کیا گیا ہے۔ اس آیت مبارکہ سے اجمالاً اتنا معلُوم ہوجاتا ہے کہ قرآن مجید بارہ مہینوں میں سے ماہِ رمضان میں نازل ہوا ہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہوا: "انا انزلناہ فی لیلۃ مبارکۃ" (دخان:۳) ہم نے قرآن کو ایک مبارک رات میں نازل کیا ہے۔ اس آیت سے معلُوم ہوا کہ نزولِ قرآن ماہِ مبارک کی کسی خاص رات میں ہوا ہے۔ تیسرے مقام پر ارشاد فرمایا کہ: "انا انزلناہ فی لیلۃ القدر" (سورۃ القدر:۱) ہم نے قرآن کو لیلۃ القدر میں نازل کیا ہے۔ اس سے نزولِ قرآن کی مکمل تاریخ کا علم ہوگیا کہ پورا قرآن شب قدر میں لوح محفوظ سے بیت المعمور پر اترا تھا۔ اس کے بعد موقع محل کے لحاظ سے جیسی جیسی ضرورت پیش آتی رہی جبرئیل امینؑ ویسی آیت یا سورۃ آنحضرتؐ کی خدمت میں لے کر آتے رہے۔ اور عرصہ بیس سال تک یہ سلسلہ برابر جاری وساری رہا۔ ارشاد ہوتا ہے: "نزل به الروح الامین علی قلبك لتکون من المنذرین" (سورۃ شعراء:۱۹۴)

اسی طرح یہ تفصیل مُتعدّد احادیث میں مذکور ہے۔ چنانچہ تفسیر قمی میں بذیل آیت مبارکہ:

ثم نزل من بيت المعمور فی مدة عشرين سنة و ان الله عزو جل اعطی نبيه العلم جملة ثم قال له و لا تعجل بالقرآن من قبل ان يقضی اليك وحيه و قل

پھر برابر بیس سال کی مدت دراز میں (تھوڑا تھوڑا حسبِ ضرورت) آنحضرت ﷺ پر نازل ہوتا رہا۔ خداوندعالم نے اپنے نبی کو قرآن کا پورا علم اجمالی عطا فرمادیا تھا۔ اس نے فرمایا: اے میرے حبیبؐ! جب تک میری وحی پوری نہ ہوجائے تم قرآن کے پڑھنے میں جلدی نہ کیا کرو۔ اور یہ دعا مانگا کرو:

"انا انزلناہ فی لیلة مبارکة" حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے روایت ہے، فرمایا: "انزل الله سبحانه القرآن فيها الى البيت المعمور و على رسول الله فی طول عشرين سنة" ۔ یعنی خداوندعالم نے لیلۃ القدر میں قرآن کو (لوح محفوظ سے) بیت المعمور کی طرف نازل فرمایا۔ اوراس سے بیس سال کی مدت میں جناب رسولِ خدا ﷺ پر اُتارا۔

اصول کافی میں حفص بن غیاث سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا: باوجودیکہ قرآن مجید بیس سال کے عرصہ میں اترا ہے، پھر اس قرآنی آیت کا کیا مفہوم ہے: "شهر رمضان الذی انزل فيه القرآن" (سورۃ بقرہ: ۱۸۵) (ماہِ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن اترا) فرمایا: "نزل القرآن جملة واحدة فی شهر رمضان الى البيت المعمور ثم نزل فی طول عشرين سنة" یعنی ایک بار تمام قرآن (شب قدر کو) ماہِ رمضان میں بیت معمُور کی طرف نازل ہوا۔ اور پھر وہاں سے بیس سال کی مدت میں نازل ہوا۔ اس قسم کی مُتعدّد روایات اصول کافی، من لایحضرہ الفقیہ اور تفسیر صافی کے مقدمہ تاسعہ میں مذکور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اکثر علمائے مُفسّرین ومحدثین اور متکلمین نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ اور یہی قول مشہُور ہے۔

صاحب تفسیر لوامع التنزیل مقدمہ دوازدہم میں لکھتے ہیں:

"وهم چنیں مشهور است که در ماهِ رمضان در لیلة القدر نازل شد"۔

صاحب حدیقہ سلطانیہ رقمطراز ہیں: "از روایات دریں مفهوم می شود که مجموع قرآن بیک مرتبه از لوح محفوظ درماه رمضان بیت المعمور درشب قدر فرود آمده و از آنجا بتدریج در مدت بست و سه سال برجناب رسالتمآب صلی الله علیه و آله فرود آمده"۔ یعنی مُتعدّد روایات سے مُستفاد ہوتا ہے کہ تمام قرآن یک بارگی ماہِ رمضان کی شب قدر میں لوحِ محفوظ سے بیت المعمور کی طرف نازل ہوا، اور پھر وہاں سے تدریجاً تیئیس سال کی مدت میں آنحضرت ﷺ پر نازل ہوتا رہا۔

رب زدنی علماً و قال لا تحرك به لسانك لتعجل به ان علینا جمعه و قرأنه فاذا قرأناه فاتبع قرأنه ثم ان علینا بیانه	اے میرے پروردگار! میرے علم میں اضافہ فرما (طٰہٰ:۱۱۴) اور ارشاد فرمایا: (اے نبیؐ!تم) اپنی زبان کو اس لیے حرکت نہ دو کہ تم اسے جلدی جلدی یاد کرلو۔ کیونکہ اس کا جمع کرنا اور پڑھانا تو ہمارے ذمہ ہے۔اس لیے جب ہم پڑھائیں تو تم اسے پڑھتے رہو۔ پھر اس کے بعد اس کی توضیح وتشریح کرنا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے (قیامہ:۱۶)

دو شبہوں کا اِزالہ

بایں ہمہ یہ امر کس قدر تعجب خیز ہے کہ بعض علماء نے بعض بے بنیاد شکوک وشبہات کی بنا پر اس حقیقت کا اِنکار کر دیا ہے۔ ان شبہات میں سے **پہلا شُبہ** یہ ہے کہ نزول کے اسباب دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مختلف اسباب، حوادث اور حالاتِ حاضرہ کے مطابق تدریجاً نازل ہوتا تھا۔ مثلاً خداوند عالم نے کفار کا یہ قول نقل کیا ہے: "و قولهم قلوبنا غلف" (سورۃ النساء:۱۵۵) وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں پر غلاف ہیں۔

یا جیسے خلاقِ عالم نے مشرکین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ انھوں نے شرک ترک کر کے اِسلام قبول کرنے کی دعوت کے جواب میں کہا تھا: "و قالوا لو شاء الرحمن ما عبدناهم" (سورۃ زُخرف:۲۰) اگر اللہ چاہتا تو ہم بتوں کی پرستش نہ کرتے۔

اسی طرح قصۂ ظہار میں ارشادِ قدرت ہے: "قد سمع الله قول التی تجادلك فی زوجها" (سورۃ مجادلہ:۱) خداوند عالم نے اس عورت کا قول سنا جو اپنے شوہر کے بارہ میں تجھ سے مجادلہ کرتی تھی۔ لہٰذا یہ کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ کسی وقت قرآن بتمامہ سب یک جا موجود تھا؟

پہلے شبہ کا جوابؒ

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ بظاہر قرآن کریم کا نزول انہی اسبابِ جدیدہ اور حالاتِ حاضرہ کے مطابق ہوتا رہا ہے اور یہ سلسلہ تیئیس سال میں جا کر مکمل ومختتم ہوا۔ آخر میں "الیوم اکملت لکم دینکم" (سورۃ مائدہ:۳) کی سند ملی۔ لیکن اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ خداوند عالم کو ان واقعات وحادثات کے ظہور سے پہلے ان کا علم نہ تھا۔ کیا کوئی مُسلمان اس کا قائل ہو سکتا تھا؟ سب اہل اسلام کا مُتفقہ عقیدہ ہے کہ "علمه بالاشیاء قبل خلقها کعلمه بها بعد خلقها"۔ خلقت اشیاء سے قبل خداوند عالم

کو ان کا اسی طرح علم ہوتا ہے جس طرح ان کی خلقت کے بعد ہوتا ہے۔ (اصول کافی وغیرہ)

ہاں بعض فلاسفۂ یونان کا یہ نظریۂ فاسدہ ہے کہ خلقتِ اشیاء سے قبل خدا کو ان کا اصلاً علم نہیں ہوتا یا کم از کم تفصیلی علم نہیں ہوتا (معاذ اللہ) متکلمین اسلام نے اپنے مقام پر دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ سے اس نظریہ فاسدہ کو باطل کر دیا ہے۔ پس جب یہ امر ثابت ہے کہ خداوند عالم کو ان واقعات کا ان کے ظہور و بروز سے پہلے علم تھا تو پھر ظاہری نزول سے پہلے قرآن کے موجود ہونے میں کیا اشکال لازم آتا ہے؟ اور اس میں کون سا استبعاد ہے؟

دُوسرا شُبہ:

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قرآن مجید اس ظاہری نزول سے قبل موجود تھا تو اس سے مخالفین کا "کلام نفسی" والا قول صحیح ثابت ہو جائے گا۔ حالانکہ اہل حق کے نزدیک وہ باطل ہے۔ لہٰذا ظاہری نزول سے پہلے قرآن کے موجود ہونے والا قول درست نہیں ہے۔

اس شبہ کا جواب

قطع نظر اس امر سے کہ "کلام نفسی" کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ جسے نہ اس کے قائل خود کما حقہ آج تک سمجھ سکے ہیں اور نہ ہی سمجھا سکے ہیں۔ اربابِ عقل و ہوش کے لیے ان کا یہ عقیدہ ایک لاینحل مُعمہ بنا ہوا ہے۔ بہرکیف جو لوگ اس کلامِ نفسی کے قائل ہیں، وہ اسے خداوند عالم کی طرح قدیم تسلیم کرتے ہیں، اور چونکہ ہمارے نزدیک سوائے خداوند عالم کے اور کوئی چیز قدیم نہیں ہے۔ اس لیے یہ نظریہ ہمارے نزدیک باطل ہے۔ کیونکہ اس سے "تعدد قدما" (ایک سے زائد قدیم کا وجود) لازم آتا ہے۔ لیکن اگر ظاہری نزول سے پیشتر قرآن کو لوحِ محفوظ یا بیت المعمور میں موجود مان لیا جائے تو اس سے ہرگز قرآن کا قدیم ہونا لازم نہیں آیا۔ کیونکہ حقیقی قدیم تو اسے کہتے ہیں جس کی کوئی ابتداء نہ ہو۔ لیکن جس امر کی کوئی ابتداء موجود ہو تو اسے اگرچہ ظاہری نزول سے ہزار سال نہیں بلکہ لاکھ سال، بلکہ کروڑ یا اس سے بھی زیادہ عرصہ پہلے موجود فرض کر لیا جائے۔ پھر بھی جب تک اس کی کوئی ابتداء ہے تو اسے کسی طرح بھی قدیم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بھلا جب خود لوحِ محفوظ اور بیت المعمور ہی حادث ہیں، نہ کہ قدیم۔ تو جو چیز ان میں موجود ہوگی، وہ کیونکر قدیم ہو سکتی ہے؟ اسی لیے حضرت مُصنّف علامؒ نے تصریح فرمائی ہے کہ خداوند عالم قرآن کا ایجاد کرنے والا، اور اس کا محافظ و نگران اور اس کے ساتھ کلام کرنے والا ہے۔

ان حقائق سے معلوم ہوا کہ ایسے شبہات کی بنا پر قرآن و حدیث سے ایک ثابت شدہ حقیقت کا انکار کرنا، ایک مسلمان خصوصاً مدعیٔ ایمان کے لیے کسی صورت بھی روا نہیں ہے۔

تنبیہ

مخفی نہ رہے کہ آیتِ مبارکہ: "لا تعجل بالقرآن" الآیۃ...... (سورۃ طٰہٰ: ۱۱۴) کی جو تفسیر مُصنّف علام نے بیان فرمائی ہے وہی صحیح اور شانِ رسالت کے مطابق ہے۔ اسے بعض احادیث کی تائید بھی حاصل ہے۔ اس کے علاوہ اس آیت کی جو تفسیریں بیان کی گئی ہیں وہ شانِ رسالت کے منافی ہونے کی وجہ سے نا قابلِ قبول ہیں۔ اس لیے ہم بوجہ خوفِ طوالت انھیں یہاں ذکر کر کے ان پر کچھ مزید نقد و تبصرہ نہیں کرنا چاہتے۔

ایضاح و افصاح

اوپر نزولِ قرآن کے متعلق جو بعض آثار و اخبار نقل کیے گئے ہیں ان میں بظاہر ایک اختلاف دکھائی دیتا ہے کہ بعض روایات میں مدتِ نزول بیس سال مذکور ہے اور بعض میں تئیس سال۔ لیکن اگر حقیقتِ حال کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں درحقیقت کوئی تعارض و تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ جناب رسولِ خدا کے ظاہری نبوت کے ابتدائی تین سال کا دور سری و مخفی تھا، نہ کہ جہری اور نزولِ قرآن بھی اس دَوران میں بالکل برائے نام تھا۔ لیکن نزول کی ابتداء ہو چکی تھی۔ ہاں نزول کی کثرت تین سال کے بعد شروع ہوئی۔ لہٰذا اگر دقت سے کام لیا جائے تو نزول کی مدت تئیس سال ثابت ہوتی ہے۔ اور اگر ظاہری طور پر حالات کا جائزہ لیا جائے تو بیس سال ظاہر ہوتی ہے۔ واللہ العالم۔

باب الاعتقاد

فی القرآن

قال الشیخؒ اعتقادنا فی القرآن انه کلام الله و وحیه و تنزیله و قوله و کتابه و انه لا یاتیه الباطل من بین یدیه و لا من خلفه تنزیل

بتّیسواں باب
قرآنِ کریم کے متعلّق اعتقاد

جناب شیخ ابو جعفر علیہ الرحمہ ارشاد فرماتے ہیں کہ قرآن کے بارے میں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ اس کی وحی اسی کی طرف سے نازل شدہ ہے، اسی کا قول اور اسی کی (وہ سچّی) کتاب ہے کہ جھوٹ نہ تو اس کے آگے ہی بھٹک سکتا ہے، نہ اس کے پیچھے سے راہ پا سکتا ہے (حم السّجدہ: ۴۱) (یعنی اس کے گزشتہ و آئندہ سب

بتّیسواں باب
اِعتقاد بقرآن کا بیان

قرآن حضرت رسُولِ خدا کا مُعجزۂ خالدہ ہے

اس سلسلہ میں اِختصار کے ساتھ جو کچھ حضرت مُصنّف علام نے افادہ فرمایا ہے وہی مذہب شیعہ بلکہ تمام مُسلمانوں کا عقیدہ ہے۔ اربابِ بصیرت جانتے ہیں کہ خداوندعالم ہمیشہ اپنے انبیاء و مُرسلین کو ان کے زمان و مکان کے تقاضوں کے مطابق مُختلف مُعجزات عطا کرتا رہا ہے۔ کسی کے لیے آتشِ نمرود کو گلزار بنایا، کسی کو ید بیضا عطا فرمایا، کسی کو مادرزاد اندھوں کو آنکھ دینے اور مبروص و مجذوم کو شفا دینے کا اعجاز مرحمت فرمایا، کسی کے ہاتھوں میں لوہے کو موم بنایا، کسی کے لیے درند و پرند اور ہوا کو مسخر کیا۔ و ھکذا۔ مگر یہ تمام مُعجزات ایسے تھے کہ جب مُعجز نما دارِ فانی سے دارِ جاودانی کی طرف مُنتقل ہوگئے تو یہ مُعجزات بھی ختم ہوگئے۔ اسی طرح خلاقِ عالم نے اپنی سنتِ جاریہ کے مطابق حضرت ختمی مرتبت ﷺ کو بھی مُتعدد مُعجزات عطا فرمائے جن کی تعداد کتبِ مناقب و سیر میں چار ہزار تک مذکور ہے۔ یہ مُعجزات بھی اکثر و بیشتر ایسے ہی تھے کہ جن کا تعلّق آپ کی حیاتِ طیبہ کے ساتھ تھا۔ آپ کے سانحۂ ارتحال کے بعد ان کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ اب سوائے اوراقِ کتب کے اور کہیں ان کا وجود نہیں ہے۔ چونکہ سرکار خاتم الانبیاء ﷺ کی شریعتِ مطہرہ قیامِ قیامت تک قائم و دائم رہنے والی تھی، نیز ان کی نبوت و

من حکیم علیم و انه القصص الحق و انه لقول فصل و ما هو بالهزل و ان الله تبارك و تعالیٰ محدثه و منزله و ربه و حافظه و المتكلم به

واقعات درست ہیں) اور صاحب حکمت وعلم (خدا) کی بارگاہ سے نازل ہوا ہے۔ اس کے تمام قصے برحق ہیں (عمران: ٦٢) یہ قول فیصل ہے (طارق: ١٣) بیکار افسانہ نہیں ہے۔ خدا ہی اس کا نازل کرنے والا، ایجاد کرنے والا، نگرانی کرنے والا، حفاظت کرنے والا ہے۔ اور وہی اس کے ساتھ کلام کرنے والا ہے۔

رسالت کی حدود تمام عالمین کو محیط تھیں، اور وہ ہر سفید و سیاہ کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ لہٰذا ضرورت تھی کہ ان کا کوئی مُعجزہ بھی قیامت تک باقی رہنے والا ہو۔ اس لیے خدائے حکیم نے ان کو ایک ایسا مُعجزہ بھی مرحمت فرمایا جو قیامِ قیامت تک قائم و دائم رہنے والا ہے۔ یہ مُعجزۂ خالدہ قرآن ہے۔

قرآن کی مُعجزانہ حیثیت کیا ہے؟

اس امر میں اہل علم وفضل کے درمیان قدرے اختلاف ہے کہ اس کی وجہِ اعجاز کیا ہے؟ آیا اس کی وہ فصاحت مفرطہ ہے جو طاقت بشری سے مافوق ہے؟ یا اس کا انوکھا اسلوبِ بیان اور اچھوتا طرز ادا ہے؟ یا اس کا اعجاز "صرف" کا مرہونِ منت ہے؟۔ چنانچہ جمہور علمائے اسلام کی رائے یہ ہے کہ قرآن مجید اپنی فصاحت و بلاغت اور نظم و ترتیب کے اعتبار سے مُعجزہ ہے اور بعض حضرات اخبار عن الغیب کی وجہ سے اسے مُعجزہ سمجھتے ہیں۔ اور بعض اہل علم اس کی بے مثل تاثیر اور ہدایت کی بنا پر اسے مُعجزہ قرار دیتے ہیں، اور بعض علماء صرف "صرفہ" کے سبب سے اسے مُعجزہ تسلیم کرتے ہیں۔ یعنی خدا نے کفار و مشرکین کی ہمتوں کو پست کر دیا کہ وہ قرآن کا معارضہ و مقابلہ کریں۔ خلاصہ یہ کہ اس نظریہ کی بنا پر اعجاز صرف صرفِ ہمت کی وجہ سے ہے، نہ کہ اس کی فصاحت و بلاغت کے سبب سے۔ لیکن محققین کی رائے یہ ہے کہ قرآن کریم اپنے الفاظ و معانی ہر دو کے اعتبار سے مُعجزہ ہے۔ یہاں اس امر کی زیادہ تفصیل و تحقیق کی گنجائش نہیں ہے کہ قرآن کی مُعجزانہ فصاحت و بلاغت اور اس کی مافوق العادت رشد و ہدایت اور اس کی محیر العقول تعلیمات و ہدایات پر تبصرہ کیا جائے، اور ثابت کیا جائے کہ کس طرح اس نے اپنی مُعجزانہ شان سے فصحاء و بلغاء عرب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا اور کس طرح وہ اس کے مقابلہ و معارضہ سے عاجز و قاصر ہو گئے اور کس طرح اس نے مُشکل سے مُشکل مسائل و عقائد جیسے توحید و صفات باری حشر و نشر اور جنّت و دوزخ وغیرہ کو کس احسن و عمدہ طریقہ سے سمجھایا اور کس عمدہ انداز میں اخلاقی نصیحتیں پیش کیں اور عبادات و معاملات کے متعلق کس طرح

فطرتِ انسانی کے مطابق قانون پیش کیا، اور کس طرح اس کی مُعجزانہ علمی شان کی بدولت مختصر عرصہ میں عرب کا اجڈ خطّہ علم وعرفان اور تہذیب وتمدّن کا گہوارہ بن گیا۔ ع

سفینہ چاہیے اس بحرِ بے کراں کے لیے

بہر حال وجہ اعجاز میں اس جزوی اختلاف کے باوجود اس امر پر تمام اہلِ اسلام کا اتفاق ہے کہ قرآن جناب پیغمبر اسلام علیہ وآلہ السلام کا مُعجزۂ خالدہ ہے۔ جس طرح اس نے آج سے تقریباً چودہ سو سال پیشتر کفارِ عرب کو یہ تحدی اور چیلنج دیا تھا کہ "اِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ" (سورۃ البقرہ:۲۳) کہ اگر تمھیں اس قرآن کی صداقت وحقانیت میں کچھ شک وشبہ ہے تو ذرا اس کے مثل ایک سورۃ ہی بنا کر لا دو۔ اور خدا کے سوا اپنے تمام حمایتیوں کو بھی بلا لو اگر تم سچے ہو۔

اسی طرح آج بھی منکرین کو چیلنج دے رہا ہے اور ان کے جو ادطبع کو مہمیز کرنے کے لیے یہ تازیانہ بھی لگا رہا ہے کہ:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿۸۸﴾ (سورۃ الاسراء:۸۸)

اے میرے حبیبؐ! کہہ دو کہ اگر تمام جن وانسان جمع ہو کر اس قرآن کا مثل بنا کر لانا چاہیں تو نہیں لا سکتے۔ اگرچہ ایک دوسرے کی مدد بھی کریں۔

باوجود فصحاء وبلغاء اور ادباء وفضلاء کی کثرت کے اس طویل مدت میں کسی شخص کا قرآن کے اس چیلنج کو قبول نہ کرنا اور اسے نہ توڑ سکنا اس کے اعجاز کی بین دلیل ہے۔ اور پیغمبر اسلامؐ کی نبوت ورسالت کی صداقت کا زندہ ثبوت ہے۔ " فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ " (سورۃ البقرہ:۲۴) ان تمام حقائق سے واضح ہو گیا کہ جس طرح قرآن مجید آج سے قریباً چودہ سو سال قبل کا مُعجزہ تھا، اسی طرح آج بھی دنیا کے لیے مُعجزہ ہے۔

ہم آج بڑے فخر کے ساتھ اسے ہاتھ میں لے کر کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ پیغمبر اسلامؐ کی نبوت قیامت تک ہے، جسے اس میں شک ہے وہ اس میں غور وفکر کرکے اطمینانِ قلب حاصل کر سکتا ہے اور اس کی صداقت وحقانیت کا آنکھوں سے مشاہدہ کر سکتا ہے۔ ے

کلامِ پاک یزداں کا نہیں ثانی کوئی ہرگز — اگر لؤلوئے عماں ہے دگر لعل بدخشاں ہے
خدا کے قول سے قولِ بشر کیونکر برابر ہو — وہاں قدرت، یہاں درماندگی فرق نمایاں ہے

فضائل قرآن اور اس کے ساتھ تمسک کرنے کی وصیت

مقدمہ تفسیر صافی میں بحوالہ اصول کافی و تفسیر عیاشی جناب رسولِ خداؐ سے روایت ہے، فرمایا:

فاذا التسبت علیکم الفتن کقطع اللیل المظلم فعلیکم بالقرأن فانه شافع مشفع و ما حل مصدق و من جعله امامه قادة الجنة و من جعله خلفه ساقه الی النار و هو الدلیل یدل علی خیر سبیل و هو کتاب فیه تفصیل و بیان و تحصیل و هو الفصل ولیس بالهزل و له ظهر و بطن فظاهره حکم و باطنه علم ظاهره انیق و باطنه عمیق له تخوم و علی التخوم لا تحصی عجائبه و لا تبلی غرائبه فیه مصابیح الهدیٰ و منار الحکمة و دلیل علی المعرفة لمن عرف الصفة

جب تمہارے اوپر فتنے و فساد تاریک رات کی طرح چھا جائیں تو تم دامن قرآن کو مضبوطی سے پکڑو۔ کیونکہ وہ شفاعت کرنے والا اور مقبول الشفاعہ ہے۔ اور (اپنے اوپر عمل کرنے والوں کے حق میں) وہ جھگڑا کرنے والا ہے کہ جو کچھ وہ کہے گا اس کی تصدیق کی جائے گی۔ جو شخص اسے اپنے گلے لگائے گا (اسے قائد بنائے گا) وہ اسے کھینچ کر جنّت کی طرف لے جائے گا اور جو اسے پس پشت ڈالے گا یہ اسے دوزخ کی طرف ہانک کر لے جائے گا۔ یہ وہ ہادی و راہبر ہے جو بہترین راستہ (اسلام) کی طرف ہدایت کرتا ہے، یہ وہ کتاب ہے جس میں ہر شے کا تفصیلی بیان موجود ہے۔ یہ سراسر حق و حقیقت ہے۔ اس میں تمسخر و استہزا کا نام و نشان نہیں۔ اس کا ظاہر اور باطن بھی، اس کا ظاہر حکم اور باطن علم ہے۔ اس کا ظاہر خوش آئند اور باطن بہت گہرا ہے۔ اس کی انتہا ہے اور اس انتہا کے اوپر انتہا ہے۔ اس کے عجائب کا احصاء و شمار نہیں ہو سکتا، اور اس کے غرائب کبھی کہنہ نہیں ہوتے۔ اس میں رشد و ہدایت کی کنجیاں اور علم و حکمت کے منارے ہیں۔ جو شخص معرفت حاصل کرنے کے طریقہ کار سے واقف ہو اس کے لیے یہ معرفت کا راہبر ہے۔

حدیث ثقلین بھی اسی سلسلہ جلیلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔

نیز تفسیر صافی میں بحوالہ اصول کافی جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے، فرمایا: جب قیامت کا دن ہوگا، اور انبیاءؑ و مرسلینؑ، ملائکہ مقربینؑ اور تمام اولین و آخرین موجود ہوں گے تو قرآن مجید

ایک دلکش وخوبصورت شکل میں آئے گا، اور مُسلمانوں کے پاس سے گزرے گا۔ وہ خیال کریں گے کہ شاید یہ ہم میں سے کوئی مُسلمان ہے۔ مگر قرآن ان کی صفوں سے آگے نکل کر صفوفِ انبیاء سے گزرے گا۔ وہ یہ کہیں کہ یہ ہم میں سے ہے۔ مگر وہ ان سے بھی آگے گزر کر ملائکہ مقربین کے پاس پہنچے گا، وہ خیال کریں گے کہ یہ ہم سے ہے۔ مگر وہ ان کی صفوں کو چیرتا ہوا بارگاہِ قدس تک پہنچے گا۔ اور عرض کرے گا: بارالٰہا! فلاں فلاں آدمی دنیا میں رہ کر دن کو روزہ رکھتے اور رات کو میری تلاوت کرتے تھے۔ ارشادِ رب العزت ہوگا: اے قرآن! آج ان سب لوگوں کو جنّت میں اپنے اپنے منازل پر پہنچا۔ چنانچہ قرآن ان لوگوں سے کہے گا: پڑھتے جاؤ اور مدارج عالیہ پر چڑھتے جاؤ۔ یہاں تک کہ ان سب لوگوں کو مناز ل ومراتب پر پہنچادے گا۔

تلاوتِ قرآن کا ثوابؒ

جناب رسولِ خداﷺ نے فرمایا: "نوّروا بیوتکم بتلاوۃ القرآن" اپنے گھروں کو تلاوتِ قرآن سے منور و درخشاں کرو۔ (صافی) کئی روایات میں وارد ہے کہ جو شخص کسی سے قرآن کا ایک حرف سنے یا خود بغیر پڑھے ایک حرف پر نگاہ کرے، اس کے نامۂ اعمال میں ایک نیکی درج کر لی جاتی ہے۔ اور اس کے ایک گناہ معاف ہوجاتا ہے۔ اور جو اس کا ایک حرف سیکھے اسے دس حسنے ملتے ہیں، اور دس گناہ معاف ہوجاتے ہیں، اور دس درجے بلند ہوتے ہیں۔ اور جو شخص بیٹھ کر نماز میں اس کی تلاوت کرے، اس کے لیے پچاس نیکیاں لکھی جاتی ہیں، اور پچاس گناہ معاف کردیے جاتے ہیں، اور پچاس درجے بلند ہوجاتے ہیں۔ اور اگر نماز میں کھڑے ہوکر اس کی تلاوت کرے تو ہر ہر حرف کے عوض سَو نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ اور سَو گناہ معاف ہوجاتے ہیں اور سَو درجے بلند ہوجاتے ہیں۔ (تفسیر صافی مقدمہ اولیٰ)

قرآن حادث ہے نہ کہ قدیم

حضرت مُصنّف علامؒ نے اس باب کے آخر میں ایک معرکۃ الآراء اختلافی مسئلہ میں ماھوالحق عندالامامیہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے، اور مسئلہ حدوث وقدم قرآن ہے۔ تمام امامیہ اور اہلِ سنت میں سے فرقہ مُعتزلہ قرآن کے حادث ہونے کے قائل ہیں۔ مگر اشعری العقیدہ اہل سنت اسے قدیم جانتے ہیں اور "کلام نفسی" کے قائل ہیں۔ یہاں اختصار کے پیشِ نظر اہل حق کے نظریہ کی صداقت و حقانیت پر چند دلائل وبراہین اجمالاً بیان کیے جاتے ہیں۔

دلیل اول: کلام حروف سے مرکب ہے اور حروف مقدم و مؤخر اور محذوف الذکر ہوتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ علاماتِ حدوث ہیں۔ لہٰذا قرآن جو کلام اللہ ہے حادث ہی ہوگا۔

دلیل دوم: تمام مُسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ الحمد سے لے کر والناس تک جو قرآن مجید موجود ہے یہ خدا کا کلام ہے اور یہ حروف والفاظ سے مرکب ہے۔ اور یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ جو چیز مرکب ہو وہ حادث ہوتی ہے، نہ کہ قدیم۔ لہٰذا قرآن کو حادث کہنا پڑے گا۔

دلیل سوم: تمام فضلاء بلکہ جہلاء بھی یہ جانتے ہیں کہ الٰہی حروف والفاظ کے مجموعہ کا نام قرآن ہے جو مرکب و متلو اور موجود ہیں اور حادث ہیں اور وہ ایک معنی قدیم موسوم "بکلام نفسانی" کا نام نہیں ہے۔ لہٰذا ان حروف محسوسہ و معلومہ کو کلام نفسانی قرار دینا سراسر دھوکا اور فریب کاری ہے۔ سید معین الدین شافعی نے اپنے رسالہ اعتقادیہ میں لکھا ہے: "(علی ما نقلہ فی معارف الملۃ) ما تلفظ بالکلام النفسی احد الا فی المأۃ الثالثۃ و لم یکن قبل ذلک فی لسان احد"۔ یعنی کلام نفسانی والے مسئلہ کو اشاعرہ نے تیسری صدی ہجری میں ایجاد کیا ہے۔ اس سے قبل اس کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔

دلیل چہارم: خود قرآن مجید اپنے حادث ہونے پر بالصراحت دلالت کرتا ہے۔ ارشادِ قدرت ہے: "ما یأتیہم من ذکر من ربہم محدث الا استمعوہ و ہم یلعبون" (سورۃ الانبیاء:۳) کوئی نئی نصیحت اس کے پاس ان کے پروردگار کی طرف سے نہیں آتی مگر یہ کہ وہ اسے کان لگا کر سنتے تو ہیں اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہاں ذکر سے مراد بالاتفاق قرآن ہے۔ جسے خداوند عالم نے حادث قرار دیا ہے۔ فماذا بعد الحق الا الضلال و اللہ الہادی۔

قرآنی عظمت کا اقرار بزبانِ اغیار

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قارئین کرام کے جلاء ایمان کی خاطر بعض غیر مُسلم محققین کے وہ زرّیں اقوال پیش کر دیے جائیں جو انھوں نے قرآن کی عظمت و جلالت اور اس کے مطالب و مفاہیم کی بلندی اور حد اعجاز تک پہنچی ہوئی فصاحت و بلاغت کا اِعتراف کرتے ہوئے لکھے ہیں۔

☆ ریورینڈ جی ایم لڑ ڈویل صاحب اپنے ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں قرآنی تعلیمات کی تاثیر کی نسبت لکھتے ہیں: "عرب کے سیدھے سادے خانہ بدوش بدو ایسے بدل گئے جیسے کسی نے سحر کر دیا ہے۔ یہودی حقانی باتیں عرصہ سے اہل مدینہ کے گوش گزار ہو چکی تھیں۔ مگر وہ بھی اس

وقت تک خوابِ گردش سے نہ چونکے جب تک کہ روح کو کپکپا دینے والا کلام نبی عربیؐ کا نہیں سنا۔ تب البتہ دفعتاً ایک نئی اور سرگرم زندگانی میں دم بھرنے لگے"۔

☆ گبن یہ کہتا ہے کہ: " قرآن خدا کی وحدانیت پر ایک عمدہ شہادت ہے۔ مکہ کے پیغمبرؐ نے بتوں کی انسانوں کی، ثوابت اور سیاروں کی پرستش کو اس معقول دلیل سے رد کیا کہ جو شے طلوع ہوتی ہے غروب ہو جاتی ہے۔ اور جو حادث ہے وہ فانی ہے، اور جو قابلِ زوال ہے وہ معدوم ہو جاتی ہے۔ اس نے اس معقول سرگرمی سے کائنات کے بانی کو ایک ایسا وجود تسلیم کیا جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا ہے۔ نہ کسی شکل میں محدود نہ کسی مکان میں اور نہ کوئی اس کا ثانی موجود ہے۔ جس سے اس کو تشبیہ دے سکیں۔ وہ ہمارے نہایت خُفیہ ارادوں پر بھی آگاہ رہتا ہے۔ بغیر کسی اسباب کے موجود ہے۔ اخلاق اور عقل کا جو کمال اس کو حاصل ہے وہ اس کو اپنی ہی ذات سے حاصل ہے۔ ان بڑے بڑے حقائق کو پیغمبرؐ نے مشہور کیا اور اس کے پیروؤں نے ان کو نہایت مستحکم طور پر قبول کیا، اور قرآن کے مُفسّروں نے معقولات کے ذریعے سے تشریح و تصریح کی۔ ایک حکیم جو خدا تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفات پر اعتقاد رکھتا ہو مُسلمانوں کے مذکورہ بالا اعتقاد کی نسبت یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ ایسا عقیدہ ہے جو ہمارے موجودہ ادراک اور قوائے عقلی سے بہت بڑھ کر ہے۔ اس لیے کہ جب ہم نے اس لا معلُوم (یعنی خدا) کو زمان اور مکان اور حرکت اور مادہ اور حس اور تفکر کے اوصاف سے مبرا کر دیا تو پھر ہمارے خیال کرنے اور سمجھنے کے لیے کیا چیز باقی رہی۔ وہ اصل اول (یعنی توحید ذات وصفات باری تعالیٰ) جس کی بنا عقل اور وحی پر ہے، محمدؐ کی شہادت سے استحکام کو پہنچی۔ چنانچہ اس کے مُعتقد ہندوستان سے لے کر مراکش تک موحد کے لقب سے ممتاز ہیں۔ تصویروں کے ممنوع کر دینے سے بت پرستی کا خطرہ مٹا دیا گیا"۔ (دیکھو تاریخ زوال سلطنتِ روم جلد پنجم باب پچاسواں صفحہ ۴۴۹، ۴۷۰)

☆ جارج سیل صاحب اپنے ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ " یہ بات علی العموم مُسلّم ہے کہ قرآن قریش کی زبان میں جملہ اقوام عرب میں شریف ترین و مہذب ترین قوم ہے، انتہا کی لطیف اور پاکیزہ زبان میں لکھا گیا ہے۔ لیکن اور زبانوں کی بھی کس قدر آمیزش ہے۔ بہت ہی قلیل ہے۔ وہ کلام عربی زبان کا نمونہ ہے۔ اور زیادہ پکے عقیدہ کے لوگوں کا یہ قول ہے۔ اور نیز اس کتاب سے بھی ثابت ہے کہ کوئی انسان اس کا مثل نہیں لکھ سکتا (گو بعض فرقوں کی

مُختلف رائے ہے) اور اسی واسطے اسے لازوال مُعجزہ قرار دیا گیا ہے۔ جو مردہ کے زندہ کرنے سے بڑھ کر ہے۔ اور تمام دنیا کو اپنے ربانی الاصل ہونے کا ثبوت دینے کے لیے اکیلا کافی ہے۔ اور خود محمدؐ نے بھی اپنی رسالت کے ثبوت کے لیے اسی مُعجزہ کی طرف رجوع کیا تھا۔ اور بڑے بڑے فصحائے عرب کو (جہاں کے اس زمانہ میں اس قسم کے ہزار ہا آدمی موجود تھے جن کا محض یہ شغل اور حوصلہ تھا کہ طرزِ تحریر اور عبارت کی لطافت میں لائق و فائق ہوجائیں) علانیہ کہلا بھیجا تا کہ اس کے مقابلہ کی ایک سورۃ ہی بنا دو۔ اس بات کے اظہار کے واسطے کہ اس کتاب کی خوبی تحریر کی ان ذی لیاقت لوگوں نے فی الواقع تعریف و توصیف کی تھی، جن کا اس کام میں مبصر ہونا مُسلّم ہے۔ منجملہ بے شمار مثالوں کے ایک مثال کو بیان کرتا ہے لبید بن ربیعہ عامری جو محمدؐ کے زمانہ میں سب سے بڑے زبان آوروں میں سے تھا، اس کا ایک قصیدہ خانہ کعبہ کے دروازہ پر چسپاں تھا (یہ رتبہ نہایت اعلیٰ تصنیف کے لیے مرعی تھا) اور کسی شاعر کو اس کے مقابل میں کسی اپنی تصنیف کے پیش کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ لیکن جب کہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد قرآن کی دوسری سورہ بقرہ کی آیتیں اس کے مقابلہ میں لگائی گئیں تو خود لبید (جو اس زمانے میں مشرکین میں سے تھا) شروع ہی کی ایک آیت پڑھ کر بحر تحیر میں غوطہ زن ہوا اور فی الفور مذہب اسلام قبول کر لیا۔ اور بیان کیا کہ ایسے الفاظ صرف نبی ہی کی زبان سے برآمد ہوسکتے ہیں۔ اور مُتّصلاً لکھتے ہیں کہ قرآن کا طرز تحریر عموماً خوشنما اور رواں ہے۔ بالخصوص اس جگہ کو جہاں وہ پیغمبرانہ وضع اور توریتی جملوں کو نقل کرتا ہے۔ وہ مُختصر اور بعض مقامات میں مبہم ہے اور ایشیائی ڈھنگ کے موافق پر حیرت انگیز صنعتوں سے مرصع اور روشن اور پُر معنی جملوں سے مزین ہے اور اوصاف کا بیان ہے وہ نہایت عالی مرتبہ اور رفیع الشان ہے۔"

☆ مسٹر جان ڈیون پورٹ، یہ بھی ایک بڑے عالم اور غیر مُتعصب شخص ہیں۔ فرماتے ہیں: "منجملہ ان بہت سی اعلیٰ درجہ کی خوبیوں کے جو قرآن کے لیے واجب طور پر باعثِ فخر و ناز ہوسکتی ہیں، دو خوبیاں نہایت عمدہ ہیں۔ یعنی اول تو اس کا وہ مؤدبانہ اور ہیبت و رعب سے بھرا ہوا طرزِ بیان جو ہر ایک مقام پر جہاں خدا تعالیٰ کا ذکر یا اس کی ذات کی طرف اشارہ ہے، اختیار کیا گیا ہے اور جس میں خداوند عالم کو ان جذبوں اور اخلاقی نقصوں سے منسوب نہیں کیا جو انسان میں پائے جاتے ہیں۔ دوسرے اس کا نام تمام خیالات و الفاظ اور قصوں سے مبرا ہونا جو فحش اور خلاف اخلاق اور نا مہذب ہوں، حالانکہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ یہ عیوب

توریت وغیرہ کتب مقدسہ یہود میں بکثرت پائے جاتے ہیں، فی الحقیقت قرآن ان سخت عیوب سے مبرا ہے کہ اس میں خفیف سے خفیف ترمیم کی بھی ضرورت نہیں اور اول سے آخر تک پڑھ جاؤ تو اس میں کوئی بھی ایسا لفظ نہ پاؤ گے جو پڑھنے والے کے چہرہ پر شرم وحیا کے آثار پیدا کرے۔ (دیکھو کتاب ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ بائی تھامس کارلائل لیکچر دوم)

اصول شرع اسلام میں سے ہر ایک اصل کو دیکھے تو فی نفسہ اعلیٰ عمدہ اور مؤثر ہے کہ شارع اسلام کے شرف وفضیلت کو قیامت تک کافی ہے اور ان سب اصول کے مجموعہ سے ایک ایسا انتظام سیاست قائم ہوگیا ہے جس کی قوت ومتانت کے سامنے اور سب انتظامات سیاست ہیچ ہیں۔

ایک شخص کی حین حیات اور وہ بھی ایسا شخص جو جاہل، وحشی، تنگ مایہ وکم ظرف قوم کے

قابو میں تھا وہ شرع ان ممالک میں شائع ہوگی جو سلطنت قاہرہ روم کبیر

سے کہیں عظیم و وسیع تھیں جب تک اس شرع میں اس کی

اصل کیفیت باقی رہی اس وقت تک

کوئی چیز اس کا مقابلہ

نہ کرسکی

(بحوالہ اعجاز التنزیل)

باب الاعتقاد

فی مبلغ القرآن

قال الشیخ اعتقادنا ان القرآن الذی انزل اللہ تعالیٰ علی نبیہ محمدؐ ھو ما بین الدفتین و ھو ما فی

تینتیسواں بابؒ

قرآن کی مقدار کے متعلق اعتقاد

حضرت شیخ ابن بابویہؒ فرماتے ہیں کہ مقدارِ قرآن کے متعلق ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ وہ قرآن جو خداوند عالم نے اپنے پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل کیا وہ یہی ہے جو دو دفتیوں کے

تینتیسواں بابؒ

مقدارِ قرآن کے متعلق اعتقاد

مسئلہ تحریفؒ قرآن کو اختلافؒ امتؒ کی آماجگاہ بنانے کی وجہؒ

اسلام میں ایسے مسائل کی کمی نہیں ہے، جن پر لوگوں نے نیک نیتی سے کما حقہ غور و فکر نہ کرنے یا تجاہل عارفانہ سے کام لینے نے اختلاف کی آماجگاہ اور معرکۃ الآراء بنا دیا ہے۔ اور بعض ناعاقبت اندیش مُسلمان دیگر بعض اسلامی بھائیوں کو بے جا بدنام کرنے کے لیے انھیں لے اڑے ہیں۔ اور متعصّب مُلّاؤں نے جن کا محبوب مشغلہ ہی فی سبیل اللہ فساد بپا کرنا ہے، ان مسائل کو کچھ اس طرح اُلجھا دیا ہے، اور عوام میں ان کو کچھ اس غلط انداز سے پیش کیا ہے کہ حقیقت حال بالکل مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔ یہاں تک کہ اگر اب کوئی شخص نیک نیتی سے حقیقت حال معلوم کرنا چاہے تو اسے گوناگوں دُشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگرچہ خداوند عالم کا وعدہ ہے کہ: "والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا" (سورۃ العنکبوت:۶۹) "جو حق کو ڈھونڈنے کے لیے کوشش کرتے ہیں ہم انھیں اپنے راستے دکھا دیتے ہیں"۔ لیکن ایسے طالبانِ حقیقت، حق جو، اور حق پسند افراد ہر زمانہ میں کبریتِ اَحمر سے بھی کمیاب ہوتے ہیں (و قلیل ماھم) انھی مسائل میں سے ایک مسئلہ "تحریفِ قرآن" بھی ہے جو کہ قدیمُ الایّام سے محل نقض و ابرام بنا ہوا ہے۔ اور اس سلسلہ میں بلا وجہ سب سے زیادہ یورش مذہب شیعہ خیر البریّہ پر کی جاتی ہے، اور ہمیشہ اہلِ حق کو بلا سبب طعن و تشنیع کا ہدف بنایا جاتا ہے اور ہر چند وہ اس سلسلہ میں اپنی پوزیشن واضح کرتے رہتے ہیں، اور ہزاروں مرتبہ اس نسبتِ قبیحہ سے اپنی براءت

ایدی الناس لیس باکثر من ذلک و مبلغ سورۃ عند الناس مائۃ و اربع عشرۃ سورۃ و عندنا ان الضحی و الم نشرح سورۃ واحدۃ و لایلاف و الم تر کیف سورۃ واحدۃ و من

درمیان لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت موجود ہے، اس سے زیادہ نہیں ہے۔ عامہ کے نزدیک اس کی ایک سو چودہ سورتیں ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک چونکہ سورۃ "وَالضُّحیٰ" اور "اَلَم نَشرَح" ایک سورۃ ہے۔ اسی طرح سورۃ "لِاِیلَافِ" اور "اَلَم تَرَکَیفَ" بھی ایک ہی سورۃ ہے (اس طرح مجموعہ ایک سو بارہ سورتیں ہوں گی) جو شخص

ظاہر کر چکے ہیں۔ مگر برادرانِ یوسف کی بارگاہ میں نہ کوئی شنوائی ہوتی ہے اور نہ کسی عذر کی پذیرائی۔ شریعتِ مقدسہ میں عذر قبول نہ کرنے کے متعلق جس قدر تہدید و وعید وارد ہوئی ہے، اسے بالائے طاق رکھ کر ہر نیا ملا بموجب "آنچہ استاد ازل گفت بگو می گویم" کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہی رٹ لگاتا ہوا نظر آتا ہے کہ شیعوں کا قرآن پر ایمان نہیں ہے۔ اور ان حضرات کے ترکش اعتراض میں جو آخری تیر ہوتا ہے وہ بھی ثقلین کے ساتھ تمسک رکھنے والوں پر بے تحاشا چھوڑا جا رہا ہے۔ والی اللہ المشتکی۔ ہم بالاختصار کوشش کریں گے کہ کذب و افتراء کے جو تہرے پردے اس مسئلہ پر ڈالے گئے ہیں ان کو ادلہ قطعیہ کے تیز حربوں سے چاک کر کے اصل حقیقت کو اپنے ناظرین کرام کے سامنے پیش کریں۔ و باللہ التوفیق۔

تحریف کے حقیقی مطلب و مفہوم کی تعیین

قبل اس کے کہ اصل مطلب پر دلائل پیش کیے جائیں پہلے "تحریف" کا مطلب واضح کر دینا ضروری ہے۔ سو مخفی نہ رہے کہ "تحریف" باب "تفعیل" کا مصدر ہے۔ جس کا مادہ "حرف" بمعنی "طرف" و "کنارہ" ہے۔ لہٰذا تحریف کے لغوی معنی ہوں گے: "اَلاَخذ بِالطَّرَفِ" کسی چیز کو ایک طرف اور کنارہ سے پکڑنا، اور اسے پوری طرح حاصل نہ کرنا، اور اصطلاح میں تحریف کا مطلب یہ ہے کہ "کسی کلام کو مُتغیّر و مُتبدّل کر دینا" خواہ یہ تغیّر و تبدل ① کلام کے اجزاء کو مُقدّم و مُؤخّر کرنے کی وجہ سے ہو، یا ② زیادتی، اور ③ کمی کے سبب سے۔ نیز اس میں یہ بھی کوئی قید نہیں کہ یہ تحریف و تغیّر فقط لفظوں میں واقع ہو، یا صرف معانی و مطالب میں، یا الفاظ و معانی ہر دو میں۔

تحریف کی ان مختلف اقسام و انواع میں سے بعض اقسام کے وقوع اور بعض کے عدم وقوع پر سب کا اتفاق ہے اور بعض کے متعلق شدید اختلاف۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تحریف بمعنی اول،

نسب الینا انا نقول انه اکثر من ذلك فهو کاذب و ماروی من ثواب قرائة کل سورة من القرآن و ثواب من ختم القرآن کله و جواز قرائة سورتین فی رکعة و النهی	ہماری طرف یہ امر منسُوب کرے کہ ہم موجودہ قرآن سے زائد قرآن کے قائل ہیں تو وہ جھوٹا ہے ۔ ہماری وہ روایات جو قرآن کی ایک سورہ پڑھنے اور پورے قرآن کے ختم کرنے کے ثواب (نماز نافلہ) کی ایک رکعت میں دو سورتوں کے پڑھنے کے جواز اور نمازِ فریضہ کی ایک رکعت میں دو سورتوں کی تلاوت

یعنی تقدیم و تاخیر کے وقوع پر تمام اہل اسلام کا اتفاق ہے ۔ کیونکہ مشاہدہ شاہد ہے کہ موجودہ ترتیب قرآن میں مکی سورے مؤخر اور مدنی مقدم ہیں ۔ اور یہ تقدیم و تاخیر فقط سوروں تک ہی محدود نہیں، بلکہ آیاتِ قرآنیہ میں بھی واقع ہے کہ بعض سوروں کی آیات دوسرے بعض سوروں میں شامل ہوگئی ہیں ۔ جیسا کہ علامہ جلالُ الدّین سیوطی وغیرہم نے بھی اعتراف کیا ہے ۔

ملاحظہ ہو تفسیر دُرِّ منثور جلد ۴ صفحہ ۴۲ طبع مصر، راجع بسورۂ رعد، تفسیر کبیر جلد ۵ صفحہ ۲۵۸، راجع بسورہ رعد، تفسیر دُرِّ منثور جلد ۴ صفحہ ۶۹، راجع بسورۂ ابراہیم، تفسیر دُرِّ منثور چہارم صفحہ ۳۴۲، راجع سورہ حج، کذا فی التفسیر الکبیر جلد ۶ صفحہ ۳۰۶، تفسیر دُرِّ منثور جلد ۵ صفحہ ۸۲، راجع بسورہ شعراء، تفسیر کبیر جلد ۶ صفحہ ۲۹۷، راجع بسورہ لقمان وغیرہ ۔

حاشیہ قرآن مجید مترجم مولوی عبدالماجد صاحب دریا آبادی حصّہ اولی صفحہ ۲ مطبوعہ تاج کمپنی لاہور پر مکّی و مدنی سورتوں کی وجہ تسمیہ بیان کرنے کے بعد لکھا ہے: "لیکن یہ تقسیم صرف عمومی حیثیت سے ہے، ورنہ بارہا ایسا ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدنی سورہ کے اندر مکّی آیتیں رکھا دی ہیں یا اس کے برعکس ۔ ربط مضمون و مناسبت مقام کا صحیح تر و لطیف تر احساس رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر اور کس کو ہوسکتا تھا؟ اس لیے کسی مُتعیّن آیت کے باب میں اس کے مکّی یا مدنی ہونے کا فیصلہ حزم کے ساتھ کرنا دشوار ہے ۔ روایتیں جو اس باب میں وارد ہوئی ہیں کوئی درجۂ تواتر کو پہنچی ہوئی نہیں ہیں ۔ محض مُفید ظن ہیں ۔ مُفید یقین نہیں ہیں ۔ اس وقت ہمیں اس امر کے متعلق بحث کرنا مقصُود نہیں کہ آیتوں کا یہ باہمی اختلاط و امتزاج جناب رسول اللہ ﷺ کے حکم سے عمل میں لایا گیا، یا خلیفۂ سوم کے ایماء سے ایسا کیا گیا ۔ (و ان کان الحق ھو الشافی) بلکہ یہاں صرف یہ دکھانا مقصُود ہے کہ مکّی سوروں کی آیات کا مدنی سوروں کی آیات میں اور اس کے برعکس مدنی سوروں کی آیات کا مکّی سوروں کی آیات میں داخل ہونا عند الکل مُسلّم ہے ۔"

عن القرأن بین سورتین فی رکعة فریضة تصدیق لما قلناہ فی امر القرأن و ان مبلغه ما فی ایدی الناس کذالك ما روی من النہی عن قرائة القرأن کله فی لیلة واحدة و انه لا یجوز ان یختم القرأن فی اقل من ثلثة ایام تصدیق لما قلناہ ایضا بل نقول انه قد نزل من الوحی الذی لیس من القرأن مالو

کے ممنوع ہونے کے متعلق وارد ہوئی ہیں ان سے ہمارے قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہم قرآن کی اتنی ہی مقدار کے قائل ہیں جتنی کہ لوگوں کے پاس موجود ہے۔ اسی طرح یہ جو بعض روایات میں وارد ہے کہ ایک رات میں قرآن کو ختم نہ کیا جائے، اور یہ کہ تین دن سے کم عرصہ میں قرآن مجید کا ختم کرنا جائز نہیں ہے، اس سے بھی ہمارے نظریہ کی تصدیق ہوتی ہے۔ ہاں ہم البتہ اس بات کے قائل ہیں کہ قرآن کے علاوہ اس قدر وحی نازل ہوئی ہے

اسی طرح دوسری قسم یعنی تحریف بمعنی "زیادتی" کے عدم وقوع پر سب کا اتفاق ہے۔ چنانچہ مقدمہ تفسیر مجمع البیان اور مقدمہ تفسیر تبیان پر علامہ طبرسیؒ، اور علامہ طوسیؒ نے تصریح فرمائی ہے۔ "اما الزیادة فیه فمجمع علی بطلانها" یعنی قرآن مجید میں زیادتی کے بطلان پر تمام اہل اسلام کا اجماع و اتفاق ہے۔ ہاں اس مسئلہ میں جو کچھ اختلاف ہے وہ تحریف بمعنی سوم میں ہے۔ یعنی کمی کے واقع ہونے یا واقع نہ ہونے میں۔

برادرانِ اسلامی شیعیانِ حیدرِ کو ہمیشہ مطعون کرتے رہتے ہیں کہ وہ موجودہ قرآن میں کمی کے قائل ہیں۔ لہٰذا ان کا اس قرآن پر ایمان نہیں ہے۔ اور اس قسم کے بہت سے بے جا الزامات و اتہامات کا انھیں مورد قرار دے کر اپنی آتشِ غیظ و غضب کو بجھاتے ہیں۔ ؎

مُلحد و کافر و زندیق ہمیں کہتے ہیں　　　نام کیا کیا حُبِ حیدرؑ میں رکھایا ہم نے

حالانکہ ان کو معلوم ہے کہ ہم اسی قرآن کو پڑھتے اور پڑھاتے ہیں اور اسی کے احکام پر عمل کرتے ہیں اور اسی کی تفسیریں لکھتے ہیں اور اسی کے اکرام و احترام کو واجب و لازم اور اس کی ہتک حرمت کو ناجائز و حرام سمجھتے ہیں۔ ائمہ ہُدیٰؑ نے صحیح اور غلط حدیث معلوم کرنے کا معیار اسی قرآن کی مطابقت یا عدم مطابقت کو قرار دیا ہے۔ حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "کل شئ مردود الی الکتاب و السنة و کل حدیث لا یوافق کتاب اللہ فھو زخرف" (اصول کافی) ہر چیز کو کتاب و سنت کی طرف لوٹایا جائے گا اور ہر وہ حدیث جو قرآن کے مطابق نہ ہو وہ باطل ہے۔ نیز انہی حضرتؑ سے مروی ہے، فرمایا: "مالم یوافق من الحدیث القرأن فھو زخرف" جو حدیث قرآن کے موافق نہ ہو وہ باطل ہے۔ (اصول کافی) اور اسی

جمع الی القرآن لکان مبلغه مقدار سبع عشرة الف آیة و ذلك مثل قول جبرئیل للنبیؐ ان الله یقول لك یا محمد دارِ خلقی مثل ما اداری و مثل قوله اتق شحنا الناس و عداوتهم و مثل قوله عش ما شئت فانك مفارقة و اعمل ما شئت فانك ملاقیه و شرف المومن صلوته باللیل و عزه کف الاذی من الناس و مثل قول النبیؐ

کہ اگر اس کو بھی قرآن کے ساتھ جمع کر لیا جائے تو اس مجموعہ کی تعداد سترہ ہزار آیتوں تک پہنچ جائے گی، جیسا کہ حضرت جبرئیلؑ کا پیغمبر اسلامؐ سے یہ کہنا کہ خداوند عالم آپ کو فرماتا ہے: اے محمدؐ! تم میری مخلوق سے اس طرح لطف و مدارات سے پیش آؤ جس طرح کہ میں ان سے مدارات کرتا ہوں، یا (جیسے جبرئیلؑ کے توسط سے) فرمایا کہ تم لوگوں کی عداوت اور ان کے حقد و کینہ سے ڈرتے رہو، یا یہ فرمایا کہ جب تک چاہو زندہ رہو، آخر مرنا ضرور ہے اور جس چیز کو چاہو پسند کرو۔ آخر اس سے جدا ہونا ہے اور جو عمل چاہو کرو، اس کا (نتیجہ و ثمرہ) پاؤ گے۔ یا جیسے یہ ارشاد نمازِ شب پڑھنا مومن کے لیے باعث مجد و شرف ہے اور لوگوں کو تکلیف نہ پہنچانا اس کی عزت وعظمت کا سبب ہے یا جیسے حضرت رسولِ خداؐ کا یہ ارشاد کہ

قرآن کی تلاوت کے ثواب بیان فرمائے ہیں، جن کا ایک شمہ سابقہ باب میں بیان ہو چکا ہے۔

موجودہ قرآن کی توثیق از ائمۂ اہل بیت علیہم السلام

حضرات ائمۂ طاہرین صلوات اللہ علیہم اجمعین نے بھی اسی قرآن کی تصدیق و توثیق فرمائی ہے۔ چنانچہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: "ما بین الدفتین کتاب الله" جو کچھ دو دفتیوں کے درمیان موجود ہے یہ اللہ کی کتاب ہے۔ (نہج البلاغہ)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "اقراوا کما یقرائه الناس" اسی طرح قرآن پڑھو جس طرح دوسرے مسلمان پڑھتے ہیں۔ (مقدمہ تفسیر صافی)

جناب امام علی نقی علیہ السلام فرماتے ہیں: "اجمعت الامة قاطبة علی ان القرآن حق لا ریب فیه و القرآن حق لا اختلاف بینهم فی تنزیله و تصدیقه فاذا شهد القرآن بتصدیق خبر و تحقیقه فانکر الخبر طائفة من الامة لزمهم الاقرار به ضرورة الحدیث"۔ (احتجاج طبرسی) یعنی تمام امت اسلامیہ کا اس امر اتفاق ہے کہ قرآن مجید وہ برحق کتاب ہے کہ جس میں ہرگز کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ قرآن برحق ہے۔ مسلمانوں کے اندر اس کی تنزیل و تصدیق میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ پس جب قرآن کریم کسی

ما زال جبرئیل یوصینی بالسواك حتی خفت ان احفی ارادرد و ما زال یوصینی بالجار حتی ظننت انه سیورثه و زال یوصینی بالمرئة حتی ظننت انه لا ینبغی طلاقها و ما زال یوصینی بالمملوك حتی ظننت انه سیضرب له اجلا یعتق فیه و مثل قول جبرئیل حین فرغ من غزو الخندق یا محمدؐ ان الله تبارك و تعالیٰ یامرك ان لا تصلی

جبرئیل ہمیشہ مجھ کو مسواک کرنے کی وصیّت کرتے رہے۔ حتی کہ مجھے یہ خوف دامنگیر ہوگیا کہ کہیں میرے دانت گر نہ جائیں، اسی طرح جبرئیلؑ برابر مجھے پڑوسیوں کے بارے میں وصیّت کرتے رہے حتی کہ مجھے گمان ہوا کہ شاید ان کو شریکِ وراثت ہی نہ قرار دے دیں۔ جبرئیلؑ ہمیشہ عورت کے متعلق مجھے اس قدر وصیّت کرتے رہے کہ مجھے یہ گمان ہونے لگا کہ عورت کو طلاق نہیں دینی چاہیے۔ اسی طرح ہمیشہ غلام کے متعلق مجھے وصیّت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ مجھے خیال ہوا کہ شاید اس کے آزاد ہونے کی مدت مقرر ہوجائے گی۔ جس کے بعد وہ خود بخود آزاد ہوجائے گا۔ یا جیسے یہ کہ جب آنحضرتؐ غزوۂ خندق سے فارغ ہوچکے تو اس وقت جبرئیلؑ نے آنجنابؐ کی خدمت میں عرض کیا: یا رسول اللہ! خدائے تبارک و تعالیٰ آپ کو حکم دیتا ہے کہ

حدیث کی صحت کی شہادت دے اور بایں ہمہ امت کا کوئی گروہ اس حدیث کا انکار کرے تو (اس کے لیے یہ روا نہیں ہے، بلکہ اسے) اس کی صحت کا اعتراف کرنا لازم ہے۔

ائمۂ معصومینؑ نے اس قرآن کے ساتھ تمسّک کرنے کی اس قدر تاکید اکید فرمائی ہے کہ اس کی مخالفت کو کفر قرار دیا ہے۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "من خالف کتاب الله و سنة محمد فقد کفر" جو شخص کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ کی مخالفت کرے وہ کافر ہے۔ (اصول کافی)

اگرچہ ائمۂ طاہرین علیہم السلام کی ان فرمائشات کے بعد اس سلسلہ میں علماء اعلام کی تصریحات کی ضرورت تو نہیں رہتی مگر منکرین کے اطمینانِ قلب کے لیے بعض اعلام کی تصدیقات بھی پیش کی جاتی ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پیش پیش حضرت مُصنّف علام کا توضیحی بیان ہے جو انھوں نے اسی رسالہ اعتقادیہ میں دیا ہے۔ جس میں سرکار موصوف نے بڑے پُرزور طریقہ پر موجودہ قرآن کو کامل و مکمل اور منزل من اللہ بتایا ہے۔ اور عقیدۂ تحریف کی شدت کے ساتھ رد فرمائی ہے۔

العصر الا ببنی قریضة و مثل قوله امرنی ربی بمداراة الناس کما امرنی باداء الفرائض و مثل قوله انا معاشر الانبیاء امرنا ان لا نکلم الناس الا بقدر عقولهم و مثل قوله ان جبرئیل اتانی من قبل ربی بامر قرت به عینی و فرح به صدری و قلبی قال ان الله عز وجل یقول ان علیاً امیرالمومنین و قائد الغر المحجلین و مثل قوله نزل علی

کہ آپؐ عصر کی نماز قبیلہ بنی قریظہ میں پڑھیں، اسی طرح آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ خدا نے مجھے انسانوں کے ساتھ لطف و مدارات کرنے کا اسی طرح حکم دیا ہے جس طرح فرائض کی ادائیگی کا۔ یا جیسے آپؐ کا یہ فرمان ہے کہ ہم گروہ: انبیاء کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں کے ساتھ ان کی عقل اور فہم کے مطابق کلام کیا کریں۔ یا جیسے آپؐ کا یہ ارشاد کہ ایک دفعہ جبرئیلؑ خدا کی طرف سے ایسی وحی لے کر میرے پاس آئے کہ جس سے میری آنکھیں ٹھنڈی ہوگئیں۔ اور دل خوش و خرم ہوگیا (وہ وحی یہ تھی کہ) حضرت علی بن ابی طالبؑ مومنوں کے امیر اور سفید اعضاء و پیشانی والوں کے قائد و سردار ہیں۔ یا جیسے آپؐ کا یہ فرمان کہ میرے پاس

دیگر شیعہ علمائے اعلام کی تصدیق

شیخ الفرقہ المحقہ جناب شیخ مفید علیہ الرحمہ اپنے رسالہ اوائل المقالات میں رقمطراز ہیں: "وقد قال جماعة من اهل الامامة انه لم ینقص من کلمة و لا من ایة و لا من سورة و لکن حذف ماکان مثبتاً فی المصحف امیرالمومنینؑ من تاویله و تفسیر معانیه علی حقیقة تنزیله ...... و عندی انه هذا القول اشبه من مقال من ادعی نقصان کلمه من نفس القرآن علی الحقیقة دون التاویل و الیه امیل ...... و اما الزیادة فیه فمقطوع علی فسادها"۔ یعنی فرقہ امامیہ کی ایک جماعت کہتی ہے کہ قرآن میں کسی سورہ اور آیت بلکہ ایک حرف کی بھی کمی نہیں ہوئی۔ مصحف امیر المومنینؑ میں اس قرآن کی جو تفسیر و تاویل مذکور تھی، اسے حذف کیا گیا ہے۔ میرے نزدیک یہ قول اس قول سے بہتر ہے جس میں اصل قرآن سے بعض کلمات کا کم ہونا بیان کیا گیا ہے۔ اور میرا میلان اسی کی طرف ہے۔ قرآن میں کسی قسم کی زیادتی کے باطل ہونے کا تو قطعی یقین حاصل ہے۔

حضرت سید مرتضیٰ علم الہدیٰؒ کی اصل کتاب ہمارے پیشِ نظر نہیں ہے۔ مگر ان کے تلمیذِ رشید شیخ الطائفہ طوسی نیز مُفسّرِ جلیل علامہ طبرسی علیہ الرحمہ نے ان کے نظریہ کی تفسیر تبیان اور مجمع البیان میں تصریح فرمائی ہے۔ (و کفی بهما شاهدین عادلین) کہ انھوں نے بھی بڑی وضاحت کے ساتھ قرآن

جبرئیل فقال یا محمدؐ ان اللہ تبارك و تعالیٰ زوج فاطمۃ علیاً من فوق عرشه و اشهد علی ذلك خیار ملائکته فزوجها منه فی الارض و اشهد علی ذلك خیر امتك و مثل هذا کثیر کله وحی لیس بقرآن و لو کان قرآناً

جبرئیلؑ آئے اور کہا: اے محمدؐ! خداوندعالم نے عرش کے اوپر جناب فاطمہؑ کی تزویج حضرت علیؑ سے کر دی ہے۔ اور اس پر اپنے بہترین ملائکہ کو گواہ مقرر کیا ہے۔ لہٰذا آپؐ بھی زمین پر ان کا نکاح کر دیں۔ اور امت کے بہترین لوگوں کو گواہ بنائیں۔ اس قسم کی اور بہت سی احادیث ہیں جو تمام کی تمام وحی خداوندی ہیں، لیکن انھیں قرآن نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اگر وہ قرآن کا حصہ ہوتیں

میں کمی بیشی والے نظریہ کو باطل فرمایا ہے۔ اسی ضمن میں فرمایا ہے کہ: "ان العلم بصحة نقل القرآن کالعلم بالبلدان و الحوادث الکبار و الوقائع العظام و الکتب المشهورة و اشعار العرب المسطورة"۔ موجودہ قرآن کی نقل کی صحت کا اسی طرح علم و یقین حاصل ہے جس طرح بعض دور دراز شہروں اور بڑے بڑے گزشتہ واقعات اور مشہور کتب اور عربوں کے لکھے ہوئے اشعار کا علم و یقین حاصل ہے۔

حضرت شیخ الطائفہؒ اپنی تفسیر تبیان کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: "اما الکلام فی زیادة القرآن و نقصانه فمما لا یلیق به لان الزیادة فیه مجمع علی بطلانها و النقصان منه فالظاهر ایضا من مذهب المسلمین خلافه و هو الالیق بالصحیح من مذهبنا و هو الذی نصره المرتضیٰ و روایاتنا متناصرة بالحث علی قرائة و التمسك به و رد ما یرد من اختلاف الاخبار الیه"۔ قرآن میں کمی بیشی کے متعلق کلام کرنا ہماری کتاب کے موضوع سے خارج ہے (کیونکہ یہ فقط قرآن کی تفسیر ہے) اس لیے کہ قرآن میں زیادتی کے باطل ہونے پر تو تمام مُسلمانوں کا اجماع ہے۔ باقی رہی کمی، بظاہر مُسلمانوں کا مذہب اس کے خلاف ہے۔ اور یہی ہمارا صحیح مذہب ہے اور حضرت سید مرتضیٰ علم الہدیٰ نے بھی اسی نظریہ کی نصرت کی ہے۔

سرکار علامہ طبرسیؒ اپنی تفسیر مجمع البیان کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں: "اما الزیادة فمجمع علی بطلانه و اما النقصان منه فقد روی جماعة من اصحابنا و قوم من حشویة العامة ان فی القرآن تغیرا و نقصاناً و الصحیح من مذهب اصحابنا خلافه و هو الذی نصره المرتضیٰ قدس سره و استوفی الکلام فیه غایة الاستیفاء فی جواب المسائل و الطرابلسیات"۔ اس عبارت کا مطلب وہی ہے جو حضرت شیخ طوسیؒ کی عبارت کا ہے۔ اسی طرح دیگر بہت سے علمائے اعلام مثل علامہ بلاغیؒ (در آلاء الرحمٰن) علامہ السید ابوالقاسم خوئی نجفی مدظلّہ (در مقدمہ تفسیر البیان) علامہ سید ابوالقاسم الرضوی القمی، علامہ السید علی الحائری

لکان مقرونا به و موصولا الیه غیر مفصول عنه کما قال امیر المومنینؑ لما جمعه فلما جاء به فقال لهم هذا کتاب الله ربکم کما انزل علی نبیکم لم یزد فیه حرف و لم ینقص عنه حرف فقالوا لا حاجة لنا فیه عندنا مثل الذی عندك

تو اس سے علیحدہ نہ ہوتیں۔ چنانچہ جب حضرت امیرالمومنینؑ علیہ السلام قرآن جمع کر چکے تو اسے لوگوں کے پاس لاکر فرمایا: اے لوگو! یہ تمھارے پروردگار کی کتاب ہے۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح کہ تمھارے پیغمبرؐ پر نازل ہوئی تھی۔ اس میں نہ کوئی حرف زیادہ ہوا ہے اور نہ کسی حرف میں کمی واقع ہوئی ہے۔ ان لوگوں نے جواب دیا: اے علیؑ! ہمیں اس قرآن کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہمارے پاس ایسا ہی قرآن موجود ہے جیسا کہ آپ کے پاس ہے۔

(در تفسیر لوامع التنزیل) علامہ السید علی نقی النقوی مدظلہ (در مقدمہ تفسیر قرآن) وغیرہم نے اس سلسلہ میں اپنی تحقیقات رائقہ سے اس مطلب کو محقق و مبرہن فرمایا ہے۔ شکر الله سعیهم۔ بہرحال شیعہ خیر البریہ تو ہمیشہ سے ببانگ دُہل یہ کہتے آئے ہیں: ؎

جمال و نورِ قرآں نورِ جانِ ہر مُسلماں ہے　　قمر ہے چاند تاروں کا ہمارا چاند قرآں ہے

ایک اشکال کا ابطال

مخالفین کی عیاری و مکاری بھی قابلِ دید ہے۔ جب انھیں ان اساطین مذہب کی تصریحات دکھائی جاتی ہیں تو بجائے اس کے کہ اسلامی اصول کے مطابق اپنی افترا پردازی سے دست بردار ہوجائیں اور اپنی غلط بیانی کا اقرار کرکے بارگاہِ الٰہی میں تائب ہوں، الٹا وہ یہ راگ الاپنا شروع کر دیتے ہیں کہ علمائے شیعہ کے بیانات تقیہ پر مبنی ہیں۔ ورنہ درحقیقت وہ تحریف کے قائل ہیں۔ "سبحان الله هذا بهتان عظیم"۔ یہ بیان عقل و دانش اور عدل و انصاف سے کس قدر دور ہے؟ اس امر کا اندازہ وہی حضرات لگا سکتے ہیں جن کی نظریں ہمارے علمائے اعلام کی ان کتب پر ہیں، جن میں انھوں نے یہ تصریحات فرمائی ہیں۔ بھلا وہ علماء جو انھیں کتب میں اصحابِ ثلاثہ کی خلافت کے ابطال پر دلائل و براہین کا انبار لگا رہے ہیں، جنھوں نے مذہب شیعہ کی تائید اور دیگر مذاہب کی رد میں متعدد کتب لکھی ہیں، وہ اور تو کسی مسئلہ میں تقیہ سے کام نہیں لیتے، بس اگر انھیں تقیہ یاد آتا ہے تو صرف مسئلہ تحریفِ قرآن میں کہ اس میں اپنے حقیقی نظریات سے دست بردار ہوکر جمہور اہل سنت کی ہمنوائی اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر تقیہ کرتے تو مسئلہ خلافت میں کرتے۔ اور ثلاثہ کی خلافت کا اقرار کر لیتے۔ تاکہ

فانصرف و ھو یقول فنبذوہ وراء ظھورھم و اشتروا بہ ثمنًا قلیلا فبئس ما یشترون و قال الصادقؑ القرآن واحد نزل من عند واحد علی نبی واحد و انما الاختلاف من جھۃ الرواۃ و کلما کان فی القرآن مثل قولہ لئن اشرکت

حضرت یہ فرماتے ہوئے واپس تشریف لے گئے کہ ان لوگوں نے اس کو پس پشت ڈال دیا ہے اور اس کے بدلے بہت ہی کم قیمت کو خریدا ہے۔ اور کیسی ہی بری چیز ہے وہ جو انھوں نے خریدی ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ قرآن ایک ہے ایک خدا کی طرف سے ایک ہی نبی پر نازل ہوا ہے لیکن راویوں کے اختلاف کی وجہ سے اس میں اختلاف (قرائت) رونما ہوگیا ہے۔ قرآن حکیم میں جہاں کہیں اس مضمون کی آیات موجود ہیں، جیسے (اے نبیؐ) اگر تم نے شرک کیا،

باہمی چپقلش ہمیشہ کے لیے ختم ہوجاتی۔ یہ کیا الٹی منطق ہے کہ سب سے بڑے مہم اور نازک مسئلہ پر تو تقیہ کرتے نہیں، اور اگر تقیہ کرتے ہیں تو بعض خفیف اور غیر اہم مسائل میں؟ یہی وہ وجوہ تھیں جن کی بنا پر بعض مُنصف مزاج علمائے اہل سنت یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے کہ شیعہ علماءؒ محققین تحریف قرآن کے قائل نہیں ہیں۔ اور نہ ہی ان علماء اعلام کا کلام حقیقت ترجمان تقیہ پر مبنی ہے۔

بعض مُنصف مزاج علمائے اہل سنت کی زبانی ہمارے مومن بالقرآن ہونے کی تصدیق

چنانچہ حافظ محمد اسلم صاحب جے راج پوری اپنی کتاب تاریخ القرآن صفحہ ۶۲ تا ۶۷ بذیل "شیعہ اور قرآن" شیعہ اکابر و اساطین کے فرامین نقل کرنے کے بعد ان پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"یہ ان علمائے شیعہ کے اقوال ہیں جو اہل تشیع میں مقبول و مستند ہیں، اور ان اقوال میں نہ تاویل کی گنجائش ہے اور نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان لوگوں نے تقیہ سے کہا ہے۔ کیونکہ ان میں سے بعض ایسے ہیں جنھوں نے علمائے اہل سنت کی تردید میں رسائل لکھے ہیں۔ ان کی نسبت تقیہ کا گمان نہیں کیا جاسکتا۔ اور ابو جعفر قمی کی کتاب الاعتقاد اور ملا مُحسن کی تفسیر صافی یہ دونوں کتابیں شیعہ کے نصابِ درس میں داخل ہیں۔ اس سے یہ خیال نہیں ہوسکتا کہ وہ اپنے عقیدہ کے خلاف اپنے فرقہ کو تعلیم دیتے ہیں"۔

اسی طرح فاضل جلیل شیخ رحمت اللہ ہندی اپنی مشہور تصنیف "اظہار الحق" جلد ۲ صفحہ ۸۹ طبع بمبئی میں بعض اعلامِ شیعہ کا کلام حق ترجمان نقل کرکے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں:

"فظھر ان المذھب المحقق عند علماء الفرقۃ الامامیۃ الاثنا عشریۃ ان القرآن الذی انزلہ اللہ علی نبیہ ھو ما بین الدفتین و ھو ما فی ایدی الناس لیس باکثر من ذلک و انہ کان مجموعًا مؤلفًا فی عھد رسول اللہ

لیحبطن عملك و لتكونن من الخاسرین و مثل قوله تعالیٰ لیغفرلك الله ما تقدم من ذنبك و ما تاخر و مثل قوله و لولا ان ثبتناك لقد كدت تركن الیهم شیئا قلیلا اذا لاذقناك ضعف الحیوة و ضعف الممات و ما اشبه ذلك فاعتقادنا فیه انه

تو تمہارے عمل ضائع ہو جائیں گے اور تم خسارہ پانے والوں میں سے ہو جاؤ گے (زمر: ۶۵) خدا نے تمہارے اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دیے ہیں (فتح: ۲) اگر ہم تجھے ثابت قدم نہ رکھتے تو تم ضرور مشرکوں کی جانب کچھ جھک جاتے اور اس وقت ہم تمہیں دنیوی عذاب اور موت کے بعد والے عذاب کا مزہ چکھاتے (اسراء: ۷۴) یا اس قسم کے مضامین پر مشتمل جو اور آیات ہیں ان سب کے متعلق ہمارا

صلی الله علیه و سلم و حفظه و نقله الوف من الصحابة (الی ان قال) و بعض الاخبار الضعیفة التی رویت فی مذهبهم لا یرجع بمثلها عن المعلوم المقطوع علی صحته"۔ یعنی ان حقائق کے پیشِ نظر ثابت ہو گیا کہ فرقہ شیعہ اثنا عشریہ کے علماء اعلام کے نزدیک جو نظریہ مُسلّم ہے وہ یہی ہے کہ وہ قرآن جو خداوند عالم نے اپنے نبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ (وآلہ) وسلم پر نازل فرمایا تھا وہ یہی ہے جو لوگوں کے ہاتھوں میں کتابی شکل میں موجود ہے۔ اور یہ کہ عہد رسالت مآبؐ میں قرآن جمع ہو چکا تھا، جسے ہزاروں صحابہ نے حفظ و نقل کیا اور بعض ضعیف روایات جو ان (شیعہ) کے مذہب میں (تحریف کے سلسلہ میں) مروی ہیں، ان کی وجہ سے ایک ثابت شدہ حقیقت سے دست برداری اختیار نہیں کی جا سکتی ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

والفضل ما شهدت به الاعداء

لیکن بایں ہمہ متعصب مُلا عوام کالانعام میں ہمیشہ شب و روز یہی ڈھنڈورا پیٹا کرتے ہیں کہ شیعوں کا موجودہ قرآن پر ایمان نہیں ہے اور نہ ہی ہو سکتا ہے۔ بلکہ وہ تحریف کے قائل ہیں۔ آہ ؏

کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

ہمیں معلوم ہے کہ ان کے اس اتہام و افتراء کے باطنی علل و اسباب تو کچھ اور ہیں، لیکن اس کا ظاہری سبب وہ بعض روایات ہیں جو ہماری بعض کتبِ حدیث و تفسیر میں موجود ہیں، اور بظاہر موہم تحریف ہیں۔

شیعہ روایاتِ تحریف کا الزامی جوابؒ

اگرچہ اس سلسلہ میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اور خود ہم اپنے بعض علمی مضامین میں اس کے

نزل علی ایاك اعنی و اسمعی یا جارۃ و کلما کان فی القرآن او فصاحبہ فیہ بالخیار و کلما کان فی القرآن یا ایھا الذین اٰمنوا فھو فی التوریۃ یا ایھا المساکین و ما من اٰیۃ اولھا یا ایھا الذین اٰمنوا الا و علی بن ابی طالب قائدھا و امیرھا

اعتقاد یہ ہے کہ یہ ایاك اعنی و اسمعی یا جارۃ کے طریق پر نازل ہوئی ہیں۔کہتا تو تجھ سے ہوں مگر اے پڑوسن تو سُن لے۔ یعنی ان آیات میں خطاب تو بظاہر پیغمبؐر سے ہے مگر مقصد امت کے افراد کو (تنبیہ و تہدید کرنا ہے) قرآن کی جن آیات میں لفظ "او" (یا) آیا ہے وہاں مکلّف کو اختیار ہے کہ وہ جس شق کو چاہے اِختیار کرے (جیسے قسم توڑنے کے کفارہ کے سلسلہ میں وارد ہے: وکفارتہ اطعام عشرۃ مساکین من اوسط ما تطعمون اھلیکم او کسوتھم اور تحریر رقبۃ) (مائدہ:۸۹)اور قرآن میں جہاں "یا ایھا الذین اٰمنوا" آیا ہے "توراۃ" میں اس کی بجائے"یا ایھا المساکین" وارد ہوا ہے۔ اسی طرح جن جن آیات کا سرنامہ"یا ایھا الذین اٰمنوا" ہے وہاں اس

متعلق بہت کچھ لکھ چکے ہیں لیکن ہم یہاں صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر ہماری ان روایات کی وجہ سے ہمیں قائل تحریف اور منکر قرآن قرار دینا صحیح ہے تو پھر کسی طرح بھی خود برادرانِ اسلامی اس الزام سے اپنی گلوخلاصی نہیں کرا سکتے۔ اور نہ ہرگز مومن بالقرآن کہلا سکتے ہیں۔ کیونکہ اس قسم کی بکثرت روایات ان کے ہاں بھی موجود ہیں۔ ہم ذیل میں بطور نمونہ مُشتے از خروارے ان کی بعض روایات کا اجمالاً تذکرہ کرتے ہیں۔ تاکہ تصویر کے دونوں رُخ سامنے آجانے کے بعد باانصاف ناظرین کرام کو حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرنے میں کوئی دقت و زحمت نہ ہو۔ اور یہ حقیقت واضح ہوجائے کہ: ع

ایں گناھیست کہ در شہر شما نیز کنند

روایاتِ اہل سنت سے قرآنی سوروں میں تحریف

تفسیر اتقان مؤلفہ علامہ جلال الدین سیوطی جلد ۲ صفحہ ۲۵ مطبع ازہر مصر میں ام المومنین عائشہ سے مروی ہے: "قالت کانت سورۃ الاحزاب تقرء فی زمن النبی صلی اللہ علیہ و سلم فاتی ایۃ فلما کتب عثمان المصاحف لم نقدر منہا الا علیٰ ما ھو الآن "۔ (کذا فی التفسیر الدر المنثور جلد ۵ صفحہ ۱۸۰ طبع مصر) یعنی سورۃ احزاب کی عہد نبویؐ میں دوسو آیتیں پڑھی جاتی تھیں۔ مگر جب عُثمان نے قرآن لکھے تو ہمیں صرف اسی قدر آیتیں دستیاب ہوئیں، جو اَب موجود ہیں، جو کل تہتر ہیں۔ باقی ایک سو ستائیس آیات غائب۔

و شریفها و اولها و ما من آیة تسوق الی الجنة الا وهی فی النبیؐ و الائمة صلوات الله علیهم اجمعین و فی اتباعهم	گروہِ مومنین کے قائد امیر شریف اور سابق الایمان جناب امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام ہیں۔

اسی طرح تفسیر اتقان کے اسی صفحہ ۲۵ جلد ۲ پر ذر بن حبیش سے منقول ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ ابی بن کعب نے مجھ سے دریافت کیا: "کاین تعد سورة الاحزاب" آج کل موجودہ قرآن میں سورہ احزاب کی کس قدر آیات شمار ہوتی ہیں؟ میں نے کہا: "اثنتین و سبعین آیة او ثلاثة و سبعین آیة" بہتر یا تہتر آیتیں ہیں۔ اس پر انھوں نے کہا: "ان کانت لتعدل سورة البقرة" کہ (عہد نبویؐ میں) یہ سورۃ بقرہ کے برابر ہوتی تھی۔ "وان کنا لنقرأ فیها آیة الرجم" اور ہم اس میں آیت رجم بھی پڑھتے تھے۔ "قلت و ما آیة الرجم" میں نے کہا: وہ آیتِ رجم کیا تھی؟ کہا: وہ یہ ہے: "اذا زنا الشیخ و الشیخة فارجموهما البتة نکالاً من الله و الله عزیز حکیم" (تفسیر در منثور جلد ۳ صفحہ ۲۰۸ طبع مصر میں بحوالہ کتبِ مُعتبرہ جناب حذیفہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: "قال التی تسمون سورة التوبة هی سورة العذاب و الله ما ترکت احداً الا فالت منه و لا تقرؤن منها مما کنا نقرء الاربعها"۔ فرمایا: وہ سورۃ جسے تم سورۂ توبہ کہتے ہو یہ تو سورۂ عذاب ہے۔ بخدا اس نے ہم میں سے کسی کو بھی سلامت نہیں چھوڑا۔ اس میں ہر شخص کے متعلّق کچھ نہ کچھ ضرور نازل ہوا۔ جس قدر ہم اس کی مقدار پڑھتے تھے تو اب تم اس کا صرف چوتھا حصّہ پڑھتے ہو۔

روایاتِ سنّیہ سے قرآنی آیات میں تحریف

برادرانِ اسلامی کی کتب تفسیر و حدیث میں بکثرت ایسی روایات موجود ہیں جن سے آیاتِ قرآنیہ میں تحریف و تغییر ثابت ہوتی ہے۔ بطور نمونہ چند آیات پیش کی جاتی ہیں۔

① موجودہ قرآن میں یہ آیت اس طرح ہے: "حَافِظُوا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰی ق وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ" (سورۃ البقرۃ:۲۳۸) مگر حضرات کی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس میں تحریف واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ در منثور جلد ا صفحہ ۳۰۲ میں کتبِ مُتعدّدہ کے حوالہ سے علامہ سیوطی نے عمرو بن رافع سے روایت کی ہے کہ انھوں نے بیان کیا: "کنت اکتب مصحفاً لحفصة زوج النبیؐ فقالت اذا بلغت هذه الآیة فاذنی حافظوا علی الصلوة و الصلوة الوسطی فلما بلغتها اذنتها فاملت علی " حافظوا علی الصلوة و الصلوة الوسطی و الصلوة العصر و قوموا لله قانتین"۔ کہ میں جناب حفصہ زوجۂ رسولؐ کے قرآن کی کتابت کرتا تھا۔

و اشیاعھم و ما من آیۃ تسوق الی النار الا وھی فی اعدائھم و المخالفین لھم وان کان	جو آیات بہشت کی طرف لے جاتی ہیں (ان میں جنّت کی خوش خبری دی گئی ہے) وہ جناب رسولِ خدؐا اور ائمۂ ہدیٰ علیہم السلام اور ان کے خالص شیعوں و پیروؤں کے بارے میں ہیں اور جو آیتیں دوزخ کی طرف لے جاتی ہیں وہ دشمنانِ رسول و آلِ رسول اور ان کے مخالفین کے حق میں نازل ہوئی ہیں ۔

انھوں نے فرمایا کہ جب تم آیت "حافظوا علی الصلوات" پر پہنچو تو مجھے اطلاع دینا۔ چنانچہ جب میں اس آیت پر پہنچا تو میں نے ان کو اطلاع دی۔ انھوں نے اس آیت کو اس طرح لکھوایا: "حافظوا علی الصلوۃ والصلوۃ الوسطی و صلوۃ العصر" اور کہا کہ میں گواہی دیتی ہوں کہ میں نے آنحضرتؐ سے اس آیت کو اسی طرح سنا ہے"۔ لیکن موجودہ قرآن میں "و صلوۃ العصر" کی لفظ موجود نہیں ہے۔ کتاب مذکور کے مذکورہ بالا صفحہ پر جناب عائشہ کے کاتبِ قرآن ابی یونس سے بھی بعینہٖ یہی روایت منقول ہے۔

② موجودہ قرآن میں یہ آیت اس طرح ہے: "یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ" (سورۃ المائدۃ: ۶۷) مگر ان حضرات کی کتبِ تفسیر سے مُستفاد ہوتا ہے کہ اس میں تحریف واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ تفسیر درمنثور جلد ۲ صفحہ ۲۹۸ طبع مصر پر علامہ سیوطی نے جناب ابن مسعود سے روایت کی ہے، فرمایا: "کنا نقرء علی عھد رسول اللهﷺ: "یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ عَلِیًّا مَوْلَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ؕ"۔ لیکن آج کل جملہ "اِنَّ عَلِیًّا مَوْلَی الْمُؤْمِنِیْنَ" ندارد ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے ساقط کردیا گیا ہے۔

③ تفسیر اتقان جلد ۲ صفحہ ۲۵ طبع مصر اور تفسیر درمنثور جلد ۵ صفحہ ۱۸۰ پر مُتعدد روایات موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید سے آیۃ رجم خارج کردی گئی۔ اُبیّ بن کعب کہتے ہیں: "کنا نقرء فیھا آیۃ الرجم قلت و ما آیۃ الرجم؟ قال اذا زنا الشیخ و الشیخۃ فارجموھما البتۃ نکالا من الله و الله عزیز حکیم"۔ یعنی ہم اس سورۃ (احزاب) میں آیت رجم بھی پڑھتے تھے۔ میں (ذر بن حبیش) نے کہا: آیت رجم کون سی آیت ہے؟ کہا: "اذا زنی۔" "جس وقت بوڑھا مرد یا بوڑھی عورت زنا کرے تو انھیں سنگسار کردو۔ یہ خدائے عزیز و حکیم کی طرف سے ان کے اس جرم کی پاداش ہے"۔ لیکن موجودہ قرآن مجید میں آیت رجم کا کہیں نام ونشان بھی نہیں ملتا۔

④ موجودہ قرآن مجید میں یہ آیت مبارکہ اس طرح ہے: "اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا" (سورۃ الاحزاب: ۵۶) لیکن روایاتِ اہل سنت سے مترشح ہوتا

الآيات فی ذکر الاولین فماکان فیھا من خیر فھو جار فی اھل الخیر و ماکان فیھا من شر فھو جار	جن آیات میں پہلی امتوں کے جن لوگوں کی جس نیکی اور خوبی کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس امت کے صالحین کی شان میں بھی سمجھی جائیں گی ۔ اور اسی طرح جن آیات میں اگلے لوگوں کی جس برائی کا ذکر ہوا ہے وہ اس امت کے بروں کے بارے میں بھی سمجھی جائیں گی ۔

ہے کہ اس آیت میں بھی تحریف ہوئی ہے ۔ چنانچہ تفسیر اتقان جلد ۲ صفحہ ۲۵ اور تفسیر در منثور جلد ۵ صفحہ ۲۲۰ پر کئی روایات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب عائشہ وحفصہ کے مصاحف میں اس آیت کا تتمہ "قبل ان یغیر عثمان المصاحف" قبل اس سے کہ جناب عثمان مصاحف کو متغیر کریں، یوں تھا: "والذین یصلون الصفوف الاول" ۔ مگر آج ندارد ہے ۔

⑤ موجودہ قرآن میں یہ آیت اس طرح ہے: "وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ" (الاحزاب:۲۵) لیکن حضرات کی روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت اصل میں یوں تھی: وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ بِعَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ" (تفسیر دُرمنثور جلد ۵ صفحہ ۱۹۲) مگر موجودہ قرآن میں اس آیت کے اندر حضرت امیر علیہ السلام کا اسم گرامی موجود نہیں ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے عمداً حذف کر دیا گیا ہے ۔ یہاں اسی مختصر مقدار پر اکتفا کی جاتی ہے ۔ ؎

اند کے غمِ دل با تو گفتم و بدل ترسیدم   کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

ان حقائق کی روشنی میں یہ امر روزِ روشن کی طرح واضح و آشکار ہوجاتا ہے کہ برادرانِ اِسلامی کے نزدیک قرآن مجید محرف و مبدل ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جناب عبداللہ بن عمر کہا کرتے تھے: "لا یقولن احد قد اخذت القرآن کلہ و ما یدر یہ ما کلہ قد ذھب منہ قرآن کثیر" ۔ (تفسیر اتقان جلد ۲ صفحہ ۲۵) "ہرگز کوئی شخص یہ نہ کہے کہ میں نے پورا قرآن حاصل کرلیا ہے ۔ اسے کیا خبر کہ پورا قرآن کس قدر تھا ۔ قرآن کا اکثر حصہ تو تلف ہوگیا" ۔ لیکن بایں ہمہ ان حضرات کے شرم و حیا کی داد دینی چاہیے کہ کہتے یہی ہیں کہ شیعوں کا قرآن ناقص ہے اور ان کا اس پر ایمان نہیں ہے ۔ ع

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

دوٹوک فیصلہ

یہ حضرات ہماری چند روایات دیکھ کر ہمیں تحریف قرآن کا الزام دیتے ہیں ۔ اب ہم ان کی ان روایات کی روشنی میں ان کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ جو جواب تم اپنی ان روایات کا

فی اھل الشر و لیس فی الانبیاء خیر من النبی محمدؐ و لا فی الاوصیاء افضل من اوصیائه و لا فی الامم افضل من ھذہ الامة ھم شیعة اھل بیته فی الحقیقة دون غیرھم و لا فی الاشرار شر من اعدائھم و المخالفین لھم من الناس

تمام انبیاء و مرسلین میں کوئی نبی و رسول جناب محمد مُصطفیٰ ﷺ سے افضل و برتر نہیں ہے۔ نہ سلسلہ اوصیاء میں کوئی وصی آنحضرتؐ کے اوصیاء سے افضل و اعلیٰ ہے اور نہ ہی پہلی امتوں میں سے کوئی امت آنحضرتؐ کی امت سے بہتر ہے۔ اور حضرت کی امت سے مراد حقیقت میں وہی لوگ ہیں جو اہل بیتؑ رسولؐ کے صحیح پیرو ہیں نہ کہ دوسرے لوگ۔ اہل بیتؑ کے دشمنوں سے بڑھ کر کوئی شریر نہیں، اور نہ ہی تمام آدمیوں میں ان حضرات کے مخالفین سے بدتر کوئی آدمی ہے۔

دوگے وہی جواب ہماری طرف سے ہماری روایات کا سمجھ لو۔ اگر اپنی روایات پر ضعیف الاسناد ہونے کا فتویٰ صادر کرکے انھیں ناقابلِ اعتماد قرار دو تو ہماری روایات کو بھی ایسا ہی سمجھو۔ اور اگر ان اضافوں کو جو ان روایات میں مروی ہیں تفسیری و توضیحی بیانات پر محمول کرو تو ہماری روایات کا بھی یہی مفہوم سمجھو۔ جیسا کہ مُصنّف علام نے متن رسالہ میں ان روایات کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ ع

بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

ایک تاویل علیل کا ابطال

مُتعصّب مُلّاؤں کا یہ پُرانا وطیرہ ہے کہ جب ان کے بے بنیاد اعتراض کے جواب میں الزامی طور پر ان کی مذکورہ بالا، یا ان جیسی دیگر روایات پیش کرکے ان کا ناطقہ بند کیا جاتا ہے اور پھر ان سے ان روایات کا کوئی معقول جواب نہیں بن پڑتا تو وہ فوراً نسخ کا سہارا لیتے ہوئے اپنی گلو خلاصی کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ یعنی یہ کہتے ہیں کہ یہ آیات منسُوخ ہو چکی ہیں۔ اور یہ روایتیں نسخ پر محمول ہیں۔ ان کی یہ تاویل بچند وجہ ناقابلِ قبول اور علیل ہے۔

اولاً اس لیے کہ خود ان روایات میں ایسی ایسی تصریحات موجود ہیں جو نسخ والی تاویل کا قلع قمع کرتی ہیں۔ کیونکہ "نسخ" فقط عہد نبوی میں نزولِ قرآن کے وقت ہی مُتصوّر ہو سکتی ہے۔ کما لا یخفی۔ چنانچہ تفسیر اتقان جلد ۲ صفحہ ۲۶ طبع مصر پر لکھا ہے: "غیر جائز نسخ شئ من القرآن بعد وفاۃ النبی ﷺ" یعنی "آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد نسخ قرآن جائز نہیں ہے"۔ مگر ان روایات میں تصریح موجود ہے کہ جناب عائشہ و حفصہ فلاں آیت کو اس طرح پڑھتی تھیں۔ اور اسی طرح اپنے

مصاحف میں لکھواتی تھیں اور شہادت دیتی تھیں کہ عہد رسالت میں اسی طرح یہ آیات پڑھی جاتی تھیں۔ اسی طرح بعض صحابہ کرام کی یہ تصریحات موجود ہیں کہ فلاں آیت جناب عثمان کے تغیّر و تبدل سے پہلے اس طرح پڑھی جاتی تھی۔ اہل انصاف بتائیں کہ ان تصریحات کے ہوتے ہوئے "نسخ" والا سہارا کس طرح مُفید مطلب ہوسکتا ہے؟ مگر سچ ہے: "الغریق یتثبت بکل حشیش"۔ "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا"۔

ثانیاً اس لیے کہ "نسخ" کے چند قواعد و ضوابط ہیں۔ جب تک وہ نہ پائے جائیں کسی آیت کے منسُوخ ہونے کا نظریہ قائم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ دھاندلی کسی طرح بھی جائز نہیں ہے کہ جس آیت کے متعلّق چاہا "نسخ" کا فتویٰ صادر کر دیا۔ علامہ جلال الدین سیوطی اپنی کتاب تفسیر اتقان جلد ۲ صفحہ ۲۴ طبع مصر میں نسخ کے متعلّق رقمطراز ہیں: "انما یرجع فی النسخ الی نقل صریح عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم او من صحابی یقول انہ کذا نسخت کذا"۔ یعنی "نسخ کے سلسلہ میں فقط جناب رسولِ خدا کی کسی صریح حدیث یا کسی صحابی کے ایسے قول پر اعتماد کیا جاسکتا ہے کہ جس میں اس نے وضاحت کی ہو کہ فلاں آیت نے فلاں آیت کو منسُوخ کیا ہے"۔ پھر فرماتے ہیں: "ولا یعتمد فی النسخ یتضمن رفع حکم و اثبات حکم تقرر فی عہدہ صلی اللہ علیہ و سلم و المعتمد فیہ النقل و التاریخ دون الرائی و الاجتہاد"۔ یعنی "نسخ کے سلسلہ میں عام مُفسّرین کے قول بلکہ مُجتہدین کے اجتہاد کا کوئی اعتبار نہیں ہے، جب تک اس کے متعلّق کوئی صحیح حدیث یا اس آیت کے معارض کوئی بینہ موجود نہ ہو۔ کیونکہ نسخ ایک حکم کے اٹھنے اور عہد نبویؐ میں اس کی جگہ دوسرے حکم کے مقرر ہونے کا نام ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں فقط نقل صریح اور تاریخ صحیح پر اعتماد کیا جاسکتا ہے، نہ کہ رائے و اجتہاد پر۔

☆ ان حقائق کی روشنی میں واضح ہوگیا کہ جب تک کسی آیت کے منسُوخ ہونے پر آنحضرتؐ کی صحیح السند حدیث پیش نہ کی جائے، اس وقت تک فقط بعض مُفسّرین و مناظرین بلکہ مُجتہدین کے اقوال پر بھی ہرگز اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا اگر ہماری پیش کردہ ان الزامی روایات کے متعلّق یہ حضرات مدعی ہیں کہ وہ منسُوخ ہیں تو وہ اس سلسلہ میں کوئی صریح و صحیح حدیث نبوی پیش کریں۔

ثالثاً ارشادِ قدرت ہے: "ما ننسخ من ایۃ او ننسہا نات بخیر منہا او مثلہا" (بقرہ:۱۰۶) جب بھی ہم کوئی آیت منسُوخ کرتے ہیں یا بھلاتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی آیت لاتے ہیں۔

اس آیت مبارکہ سے بعبارۃ النص ظاہر ہے کہ جس قدر آیتیں منسُوخ ہوں اتنی ہی ناسخ موجود ہوتی ہیں ۔ لہٰذا نسخ کے دعویداروں پر لازم ہے کہ اگر وہ دعوائے نسخ میں سچے ہیں تو ناسخ آیات پیش کریں۔ " ھمیں گود ھمیں میدان " لیکن اگر وہ یہ ثابت نہ کرسکیں اور نہ ہی کرسکتے ہیں تو پھر انھیں دعویٰ بلا دلیل سے دست بردار ہوجانا چاہیے ۔

بعض علماء کے قائل تحریف ہونے سے مذہب کا قائل ہونا لازم نہیں آتا

ہاں یہ درست ہے کہ ہمارے بعض علماء کرام تحریف کے قائل ہیں ۔ لیکن یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ کسی اختلافی مسئلہ میں کسی مذہب کے بعض علماء کا نظریہ خُصُوصًا جب کہ وہ اکابر علماء مذہب کے نظریہ سے مُتصادم ہو، اسے پورے مذہب کا نظریہ قرار نہیں دیا جاسکتا ۔ جو علماء کرام اس نظریہ کے قائل ہیں وہ بھی اپنے اس نظریہ کی صحت پر دلائل رکھتے ہیں ۔ ذیل میں ان کے چند ادلہ کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

قائلین تحریف کی پہلی دلیل

اس سلسلہ میں ان کی پہلی اور محکم دلیل وہ روایات ہیں جو اس مسئلہ کے متعلق کتب فریقین میں موجود ہیں ۔ جو اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ جمع قرآن کے وقت اس میں فی الجُملہ ضرور کچھ کمی واقع ہوئی ہے ۔ یہ روایات اس قدر کثیر التعداد ہیں کہ ان سب کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ علامہ مجلسیؒ نے مرآۃ العقُول میں ان کے تواتر کا اِدّعا فرمایا ہے اور اس قدر صریح الدلالہ ہیں کہ ان میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔

دوسری دلیل

جمع قرآن کی وہ کیفیت ہے جو کتب سیر و تواریخ میں مذکور ہے ۔ پہلے پہل مُسلمانوں کے پہلے خلیفہ کے حکم سے یہ اہم کام زید بن ثابت کے سپرد کیا گیا۔ اور اسے حکم دیا گیا کہ مسجد نبوی کے دروازہ پر بیٹھا کریں ، اور لوگوں میں اعلان کرایا گیا کہ جس شخص کے پاس قرآن کا کوئی حصّہ ہو وہ زید کے پاس لائے اور شرط یہ مقرر کی گئی کہ جو شخص دو گواہ پیش کردے اس کے لائے ہوئے اجزاء لے کر قرآن میں درج کرلیے جائیں ۔ چنانچہ اسی التزام کے مطابق قرآن کریم جمع کیا گیا، اور کچھ اجزاء جو ہڈیوں ، کھجور کی شاخوں، کتّوں اور کاغذوں پر لکھے ہوئے تھے، وہ جمع کرلیے گئے ۔ (تفسیر اتقان جلد ۱ صفحہ ۶۰)

اسی طرح خلیفہ سوم کے عہد میں اس جمع کردہ قرآن میں معمولی تقدیم و تاخیر اور قرائت میں حک و اصلاح کے بعد اسے دوبارہ مُرتّب کیا گیا، جو غیر جانبدار شخص بھی جمع و ترتیب کی یہ کیفیت ملاحظہ کرے گا، اسے ظن غالب بلکہ یقین کامل حاصل ہو جائے گا کہ اس طرح کچھ نہ کچھ حصّہ ضرور جمع ہونے سے رہ گیا ہوگا۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ کسی کے پاس جمع شدہ کچھ مقدار ہو، مگر اس نے اپنا جمع کردہ حصّہ ان حضرات کے حوالہ کرنا مناسب نہ سمجھا ہو، جس طرح جناب عبداللہ بن مسعود وغیرہ کا اپنا قرآن دینے سے اباء و انکار کرنا ثابت ہے۔ اسی طرح ام المؤمنین عائشہ و حفصہ نے بھی اپنے اپنے مصحف نہیں دیئے تھے۔ نیز ممکن ہے کسی کے پاس کچھ اجزاء قرآن مجید ہوں۔ مگر اس کی قرآنیت پر دو گواہ موجود نہ ہوں۔ لہٰذا ان کا لایا ہوا جز قبول نہ کیا گیا ہو۔ اسی طرح تفحّص و تلاش کا جو طریقۂ کار اختیار کیا گیا تھا، قرین عقل ہے کہ اس سے قرآن کے بعض اجزاء باوجود تلاش و تتبع کے دستیاب نہ ہوئے ہوں۔ جیسا کہ مشاہدہ شاہد ہے کہ ایسے مواقع پر ایسا ہوتا ہے۔ بالخصوص جب کہ وہ شخص جو اس جمع و ترتیب کا متصدی ہے غیر معصوم ہو۔

تیسری دلیل

کسی شخص کی جمع کردہ چیز پر اسی وقت یہ وُثوق ہو سکتا ہے کہ اس میں کوئی تغیر و تبدّل نہیں ہُوا جب کہ اس کا جامع کا ایمان و ایقان ایسا مُسلّم ہو کہ ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہو اور اس شخص کی اس جمع و ترتیب سے سوائے دین اسلام کی خدمت کے اور کوئی غرض و غایت وابستہ نہ ہو۔ لہٰذا جن لوگوں کو ان جامعین قرآن کے ایمان میں ہی کلام ہے اور ان کے مساعی و جہود کو کسی جذبہ دینی پر محمول کرنے کے لیے بھی تیار نہیں بلکہ وہ ان کی جمع و ترتیب کو ان کے دنیوی اغراض و مقاصد پر محمول کرتے ہیں۔ اگر وہ اس میں کچھ کمی کے قائل ہوں بھی تو وہ معذور ہیں۔ اور ان کے پاس ان امور کے متعلق دلائل و براہین کا انبار موجود ہے، جن کے ذکر کرنے کا یہ مقام نہیں ہے۔ باقی رہا یہ خیال کہ اس طرح موجودہ قرآن سے اعتماد اٹھ جائے گا۔

یہ خیال غلط ہے۔ کیونکہ یہ اعتماد اس لیے ختم نہیں ہوتا کہ حقیقی محافظانِ اِسلام و قرآن یعنی ائمۂ اہلِ بیت علیہم السلام نے اس کے قرآن ہونے کی تصدیق کردی ہے اور جہاں جہاں جامعین نے تحریف کی تھی، ان مقامات کی نشاندہی بھی فرمادی ہے، لہٰذا اس نظریہ کے قائل بھی، موجودہ قرآن پر دوسرے مُسلمانوں کی طرح ایمان رکھتے ہیں۔

چوتھی دلیل

چوتھی دلیل یہ ہے کہ چونکہ پہلی امتوں میں آسمانی کتب میں تحریف ہوچکی ہے اور پیغمبر اسلاؐم کا ارشاد ہے کہ جو کچھ بھی پہلی امتوں میں واقع ہوا ہے بعینہٖ وہ میری امت میں بھی واقع ہوگا۔ (کنز العمال جلد ا صفحہ ۵۴ تا۵۶، درمنثور جلد ۵ صفحہ۴، نہایہ ابن اثیر جلد ا صفحہ ۲۴۴، مشکوٰۃ صفحہ ۴۵۰ وغیرہ) لہٰذا اس عمومی مشابہت کا تقاضا بھی یہ ہے کہ اس امت میں بھی آسمانی کتاب میں کچھ تحریف واقع ہو۔

پانچویں دلیل

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب مُسلمانوں کے خلیفہ اول ودوم اور بالخصوص حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا جمع کردہ قرآن مجید موجود تھا تو اس کی موجودگی میں جناب خلیفۂ ثالث کو ازسرنو اس کے جمع کرنے کی کیا ضرورت درپیش آئی تھی؟ اور اپنے جمع کردہ مصحف کو رائج کرنے میں اس قدر مبالغہ سے کام کیوں لیا تھا کہ باقی تمام جمع کردہ نسخے (سوائے حضرت امیر علیہ السلام کے نسخے کے) نذرِ آتش کرادیے تھے۔ (بخاری شریف جلد ۲ صفحہ ۷۴۶ طبع دہلی، تفسیر اتقان جلد ا صفحہ ۶۱) اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جامع قرآن کی کوئی خاص غرض پوشیدہ تھی جس کے تحت اس قدر اہتمام کیا گیا تھا اور وہ غرض قانونِ شریعت کی کتاب میں تحریف وتغییر کرکے دین اسلام کو مُتغیّر ومُتبدّل کرنا ہی ہوسکتی ہے۔

اس قسم کی اور بھی بہت سی دلیلیں یہ حضرات پیش کرتے ہیں۔ ہمیں یہاں ان دلائل کی صحت وسقم سے بحث کرنا مقصُود نہیں ہے، بلکہ ان کے یہاں ذکر کرنے سے مقصُود صرف یہ بتانا ہے کہ جو حضرات اس نظریہ کے قائل ہیں وہ بھی کچھ دلائل رکھتے ہیں اور ان کا یہ نظریہ محض بے دلیل نہیں ہے اور یہ کہ ان کے اس نظریہ سے کسی اسلامی مُسلمہ عقیدہ کی مخالفت بھی لازم نہیں آتی۔ کما لا یخفی۔

نظریۂ تحریف کے ابطال پر دو آیتوں کے ساتھ غلط استدلال

نظریہ تحریف کے ابطال پر دو آیتیں پیش کی جاتی ہیں۔ **پہلی آیت** یہ ہے: "انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون" (سورہ حجر:۹) "ہم نے "ذکر" کو نازل کیا ہے، اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں"۔ جب خداوند عالم قرآن کی حفاظت کا وعدہ کرتا ہے تو کون شخص اس میں کچھ تحریف اور تغییر کرسکتا ہے؟ تحریف کے ابطال پر قطع نظر تحریف والے نظریہ کے غلط صحیح ہونے کے ایک بات یہ

ہے کہ اس آیت مبارکہ کے ساتھ تمسک کرنا بچند وجہ صحیح نہیں ہے۔

اولاً قرآنی اصطلاح میں "ذکر" کا اطلاق جس طرح قرآن پر ہوا ہے (ان ھوالا ذکر للعالمین) (سورۃ ص:۸۷) اسی طرح اس کا اطلاق جناب رسولِ خداﷺ کی ذاتِ والاصفات پر بھی ہوا ہے: (قَدْ اَنْزَلَ اللّٰہُ اِلَیْکُمْ ذِکْرًا رَّسُوْلًا) (سورۃ طلاق:۱۰۔۱۱) لہٰذا عین ممکن ہے کہ یہاں اس ذکر سے مراد پیغمبر اسلامؐ کی ذات والاصفات ہو کہ خداوند عالم شر اعداء سے ان کی حفاظت وحراست کا وعدہ فرما رہا ہے۔ (واللہ یعصمك من الناس) (سورۃ مائدہ:۶۷) اسی بنا پر آیت مبارکہ: "فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون" (سورۃ الانبیاء:۷) میں واردشدہ لفظ "اہل الذکر" سے مراد "اہلِ بیتِ رسولؐ" لیے جاتے ہیں۔ بنابریں اس آیت کو ہمارے مُتعلقہ مسئلہ کے ساتھ کوئی ربط ہی نہیں رہتا۔ اور وہ اس موضوع سے بالکل اجنبی قرار پاتی ہے۔ (تفسیر کبیر جلد ۵ صفحہ ۲۵۷ طبع مصر) میں مذکور ہے کہ بعض علمائے اہل سنت مثل فراء اور ابن انباری نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

ثانیاً اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہاں "ذکر" سے مراد قرآن مجید ہی ہے تو غور طلب امر یہ ہے کہ آیا اس سے مراد قرآن مجید کے تمام افراد ہیں یا اس سے مراد مُطلق قرآن ہے؟ (جو کہ ایک فرد کے ضمن میں بھی متحقق ہو سکتا ہے) پہلی شق تو یقیناً غلط ہے۔ کیونکہ جناب عثمان کا قرآنوں کو جلانا (بخاری شریف وغیرہ) اور ولید کا قرآنوں کو تیروں کا نشانہ بنانا (از ادب الدین والدنیا وغیرہ) مُسلمات میں سے ہے۔ اسی طرح طباعت واشاعت میں اغلاط کا رہ جانا بھی بالمشاہدہ ثابت ہے۔ نیز کئی دفعہ قرآن اتفاقاً جل بھی جاتے ہیں۔ کسی اور طریقہ سے تلف بھی ہو جاتے ہیں۔ اگر قدرتِ کاملہ نے ہر ہر فرد کا وعدہ کیا ہوتا تو کوئی شخص کسی قرآن کے ساتھ بے ادبی نہ کر سکتا، اور نہ خود بخود ایسا ہوتا۔ پس ماننا پڑے گا کہ اس امر سے مراد مُطلق قرآن (قرآن کلی) ہے۔ لہٰذا اگر قرآن کا ایک فرد بھی اس تحریف سے محفوظ ہے تو وعدۂ خداوندی پورا ہے۔ اور قائل تحریف کہہ سکتا ہے کہ حضرت امیر المومنینؑ کا جمع کردہ قرآن اس وعدۂ الٰہیہ کی عملی تصویر ہے جو موجود ہے اور ہر قسم کی تحریف سے محفوظ ہے۔ ہاں البتہ جو تحریف کے قائل نہیں ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ حضرت امیر علیہ السلام کے جمع کردہ قرآن مجید اور موجودہ قرآن کریم میں صرف اس قدر فرق تھا کہ آنجنابؑ کا جمع کردہ کلام پاک ترتیب نزول کے مطابق تھا، جبکہ موجودہ کلامِ پاک اس کے مطابق جمع نہیں کیا گیا۔

دوسرے یہ کہ اس قرآن میں تنزیل کے ساتھ ساتھ اس کی تاویل بھی مذکور تھی جو کہ موجودہ قرآن میں نہیں ہے۔ اسی بنا پر ابن سیرین نے کہا تھا کہ اگر جناب امیرؑ کا جمع کردہ قرآن مجید دستیاب ہو جاتا

تو علم کا ایک ذخیرہ مل جاتا۔ (تاریخ الخلفاء صفحہ ۱۲۴ طبع مصر) واللہ العالم

ثالثاً یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ اس حفاظتِ خداوندی سے مراد کیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مراد ہو کہ کوئی شخص دلائل وشبہات سے قرآن کی حقانیت وصداقت کو نہیں جھٹلا سکے گا۔ کیونکہ "الحق یعلوو لا یعلی علیہ"۔ اور بفضلہٖ تعالیٰ یہ امر عیاں راچہ بیاں کا مصداق ہے۔ صدیاں گزر گئیں، اور باوجود قرآن کے چیلنج کے آج تک کوئی شخص بھی اس کی ایک آیت کا مثل نہیں لا سکا۔ پس بموجب "اذا قام الاحتمال بطل الاستدلال" اس آیت کے ساتھ تحریفِ قرآن کے ابطال پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے کہ بعض علماء اہل سنت نے بھی اس کا اعتراف کر لیا ہے۔ چنانچہ علامہ فخرالدین رازی نے قاضی (باقلانی) کے اس آیت کے ساتھ نفی تحریف پر کیے ہوئے استدلال کو بایں الفاظ "احتج القاضی بقولہ انا نحن علی فساد قول بعض الامامیۃ" ذکر کر کے اس استدلال کی رکاکت وکمزوری پر ان الفاظ کے ساتھ تنبیہ کی ہے: "وھذا الاستدلال ضعیف لانہ یجری مجری اثبات الشئی بنفسہ"۔ (تفسیر کبیر جلد ۵ صفحہ ۲۵۸ طبع مصر)

یہ استدلال ضعیف ہے۔ کیونکہ یہ مصادرہ علی المطلوب (دعویٰ کو دلیل قرار دینے کو مستلزم ہے، جو کہ باطل ہے۔ بعد ازیں اس استدلال میں کیا وزن باقی رہ جاتا ہے؟

دوسری آیت یہ ہے: "وانہ لکتاب عزیز لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید" (سورۃ حم سجدہ: ۴۲) "اور یہ قرآن تو یقیناً ایک عالی رتبہ کتاب ہے کہ جھوٹ نہ تو اس کے آگے ہی بھٹک سکتا ہے، نہ اس کے پیچھے سے اور خوبیوں والے دانا خدا کی بارگاہ سے نازل ہوئی ہے۔ (ترجمہ فرمانؒ)

اس سلسلہ میں اس آیت مبارکہ سے بھی تمسک کرنا صحیح نہیں ہے۔

اولاً اس لیے کہ اس پر بھی وہی ایراد وارد ہوتا ہے جو پہلی آیت پر دوسرے نمبر پر وارد کیا گیا ہے کہ اس سے مراد قرآن کے تمام افراد ہیں یا بعض۔ تمام افراد تو مراد لیے نہیں جا سکتے، لہٰذا بعض مراد لینے پڑیں گے تو وہ ایک قرآن کے صحیح موجود ہونے کی صورت میں صادق ہے۔

ثانیاً اس باطل سے مراد کیا ہے جو اس قرآن میں رہ نہیں پا سکتا؟ اگرچہ تحریف بھی امر باطل ہے لیکن عین ممکن ہے کہ قرآن کے آگے پیچھے سے باطل کے نہ آنے کا یہ مطلب ہو کہ اس کی گزشتہ یا آنے والی اخبار میں کوئی اختلاف نہیں جو قرآن کے لیے موجبِ بطلان ہو۔
(مجمع البیان وکذا فی تفسیر البیضاوی صفحہ ۳۸۴ طبع ایران)

اور ممکن ہے کہ مطلب یہ ہو کہ نہ پہلی آسمانی کتب اس کتاب کی تکذیب کرتی ہیں اور نہ بعد میں کوئی ایسی کتاب و شریعت آئے گی جو اسے جھٹلائے۔ اور اس کے احکام کو منسوخ قرار دے۔ جیسا کہ تفسیر قمی میں جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے: "لا یاتیه الباطل من قبل التوراة و لا من قبل الانجیل و الزبور و لا من خلفه ای لا یاتیه من بعده کتاب یبطله" ۔ لہٰذا ان وجوہ سے معلوم ہوگیا کہ یہ آیت مبارکہ بھی تحریف کی نفی پر قطعی دلالت نہیں کرتی۔

(ایسا ہی تفسیر کبیر رازی جلد ۷ صفحہ ۳۶۳ طبع مصر پر مذکور ہے)

ایک وہم کا اِزالہ

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس طرح تحریف کا قول اختیار کرنے سے قرآن سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور تمام قرآن مشکوک ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس وہم کا اوپر بھی اجمالاً ازالہ کیا جا چکا ہے۔ پھر واضح کیا جاتا ہے کہ اگر تحریف کا اس طرح اعتقاد رکھا جائے جس میں مقاماتِ تحریف کی تعیین ونشاندہی نہ کی گئی ہو تو بے شک اس طرح یہ اعتقاد پوری کتاب کو مشکوک اور غیر مُعتبر بنانے کا سبب بن سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ نظریہ اس طرح قائم کیا جائے کہ موارِدِ تحریف اور تحریف کی نوعیت کا کسی طرح علم ہو جائے تو اس سے باقی ماندہ حصص واجزاء کے اعتبار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جو علماء تحریف کے قائل ہیں ان کے نظریہ کی یہی کیفیت ہے۔ روایاتِ تحریف دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جن میں اجمالاً بیان کیا گیا ہے کہ قرآن میں تحریف واقع ہوئی ہے اور دوسری قسم میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ کن سورتوں اور آیتوں میں کس قسم کی تحریف کی گئی ہے۔ مثلاً یہ کہ فلاں جگہ سے فلاں نام ساقط کیا گیا۔ اور فلاں جگہ سے فلاں جملہ حذف کیا گیا۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس۔

اس طرح باقی ماندہ حصّہ پر اعتماد بحال رہتا ہے۔ خُصُوصًا جب کہ موجودہ قرآن کی تصدیق و توثیق ائمۂ طاہرینؑ نے بھی کر دی ہو۔ جیسا کہ اس مبحث کی ابتداء میں ان کی توثیق و تصدیق پیش کی جا چکی ہے۔ هذه تذکرة فمن شاء ذکره۔

سبعہ احرف کی توضیح وتشریح

سرکار مُصنّف علام نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی جو یہ حدیث نقل فرمائی ہے کہ قرآن ایک ہے اور ایک خدا کی طرف سے ایک ہی رسول پر نازل ہوا ہے، اس حدیث شریف میں اس مشہور نظریہ کی رد مقصود ہے، جسے مخالفین کے ہاں بہت شہرت حاصل ہے اور ہماری بعض روایات

سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے ۔ آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "ان القرآن نزل علیٰ سبعة احرف کلها کاف و شاف " یعنی قرآن مجید سات حرفوں پر نازل کیا گیا ہے جن میں سے ایک کافی وشافی ہے ۔ پھران احادیث کا صحیح مفہوم متعین کرنے میں علماء کے درمیان بہت اختلاف ہے ۔ سیوطی نے رسالہ تحبیر میں پندرہ قول نقل کیے ہیں اور بقول صاحب حدیقہ سلطانیہ بعض علمائے اہل سنت نے اس کے متعلق چالیس قول نقل کیے ہیں ۔لیکن ان اقوال میں زیادہ مشہور دو قول ہیں ۔

① اول یہ کہ سبعہ احرف سے مراد قراء سبعہ کا اختلاف قرائت ہے ۔

② دوم یہ کہ اس سے مراد اختلاف لغات ہے ۔ یعنی قرآن مجید عرب کے مختلف لغات پر نازل ہوا ہے ۔ کچھ قریش کی لغت پر، کچھ ہذیل، کچھ ہوازن ،اور کچھ یمن وغیرہ کی لغت پر۔ بنا برصحت حدیث ہماری بعض احادیث میں اس کے ایک اور معنی بیان کیے گئے ہیں ۔ چنانچہ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام سے منقول ہے ،فرمایا: قرآن مجید سات اقسام پر نازل ہوا ہے ۔ وہ سات اقسام یہ ہیں :

① امر ② زجر ③ ترغیب ④ ترہیب ⑤ امثال ⑥ جدل ⑦ قصص (حدیقہ سلطانیہ)

اس معنی کی تائید بعض احادیث عامہ سے بھی ہوتی ہے ۔ چنانچہ بیہقی نے ابن مسعود سے روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا: "کانت الکتب الاول تنزل من باب واحد و نزل القرآن علی سبعة احرف زجر و امر و حلال و حرام و محکم و متشابه و امثال " ۔ یعنی سابقہ آسمانی کتب ایک ہی قسم پر نازل ہوتی تھیں ۔مگر قرآن سات اقسام پر نازل ہوا ہے :

① زجر ② امر ③ حلال
④ حرام ⑤ محکم ⑥ متشابہ
⑦ امثال

بعض روایات منقولہ از ائمہ علیہم السلام میں سبعہ احرف کی تفسیر "سبعہ ابطن" کے ساتھ بھی کی گئی ہے ۔ یعنی قرآن کے سات بطون میں ایک ظاہری معنی ہیں ۔ اور دوسرے باطنی اور پھر باطن کا باطن، و علیٰ ہذا القیاس اس کے سات بطن ہیں ۔

اس نظریہ کا ابطال

مگر ہماری روایاتِ معتبرہ میں اس نظریہ کا رد کیا گیا ہے اور یہ تصریح کی گئی ہے کہ قرآن ایک ہی حرف پر نازل ہوا ہے ۔ چنانچہ صحیحہ فضیل بن یسار میں وارد ہے ،وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت

صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید سات حرفوں پر نازل ہوا ہے۔ آپ نے یہ سُن کر فرمایا: دشمنانِ خدا جھوٹ کہتے ہیں۔ بلکہ قرآن ایک ہی حرف پر اترا ہے۔

اور بروایت جناب زرارہ بن اعین حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: ”ان القرآن واحد نزل من عند واحد ولکن الاختلاف یجیء من قبل الرواۃ“۔ قرآن ایک ہے اور ایک ہی ذات کی طرف سے نازل ہوا ہے لیکن اس میں جو اختلافِ (الفاظ) پایا جاتا ہے، یہ راویوں اور قاریوں کی طرف سے ہے۔

اور یہی نظریہ ہمارے علمائے اعلام میں مشہور و معروف ہے۔ شیخ الطائفہ شیخ طوسیؒ قدس سرہ القدوسی مقدمہ تبیان میں فرماتے ہیں: ”واعلموا ان المعروف من مذھب اصحابنا و الشائع من اخبارھم و روایاتھم ان القرآن نزل بحرف واحد علی نبی واحد“۔ جاننا چاہیے کہ ہمارے علماء کا مشہور نظریہ جس پر ان کی مشہور روایات دلالت کرتی ہیں، یہ ہے کہ قرآن ایک حرف پر اور ایک ہی نبی پر نازل ہوا ہے۔ ویسے قرآن کے اقسام کا ہشتگانہ یا اس سے کم وبیش ہونا یا اس کے ساتھ یا اس سے بھی زائد بطون کا ہونا دوسری روایات سے ثابت ہے۔ اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس قسم کی روایات مقدمہ تفسیر موسوم مرآۃ الانوار و مرآۃ...... اور تفسیر برہان میں موجود ہیں۔ واللہ العالم بحقائق الامور۔

مسئلہ تحریف قرآن کی اہمیت کے پیشِ نظر عنانِ بیان کو قدرے دراز کرنا پڑ گیا، جس کی وجہ سے یہ باب غیر معمولی طور پر طویل ہوگیا۔ اب دوسرے مُتعلقہ مباحث پر تفصیل کے ساتھ گفتگو نہیں کی جاسکتی۔ صرف چند اشارات پر اکتفا کی جاتی ہے۔

حضرت علیؑ امیرالمومنین ہیں

جہاں تک ابوالائمہ حضرت علیؑ کو بحکمِ ایزدی جناب رسولِ خداؐ کے ”امیرالمومنین“ اور ”قائد الغر المحجلین“ جیسے جلیل القدر لقب عطا کرنے کا تعلق ہے اس باب میں کتب فریقین میں بکثرت احادیث موجود ہیں۔ ملاحظہ ہوں: مناقب ابن مردویہ، ینابیع المودۃ وغیرہ۔

بحکمِ الٰہی جناب امیرؑ کا ازدواج

اس طرح رب جلیل کا جناب رسولِ خداؐ کو حکم دینا کہ میں نے آسمانوں پر حضرت علیؑ کا نکاح جناب سیدہ عالمؑ سے کر دیا ہے، تم زمین پر اس کو عملی جامہ پہنادو۔ اس کے متعلق بھی کتب فریقین میں بکثرت اخبار و آثار موجود ہیں۔ (ملاحظہ ہوں: ینابیع المودۃ، ارجح المطالب وغیرہ)

لوگوں سے بلطف و مدارا پیش آنے کا حکم

اگر دینی حقائق و معارف کی کما حقہ توضیح و تشریح کی جائے تو اس کے لیے تو کئی مجلّدات درکار ہیں لیکن اگر اجمال و اختصار سے کام لیا جائے تو حقیقت دین کو صرف دو جملوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔"التعظیم لامر اللّٰہ و الشفقة علیٰ خلق اللّٰہ"۔"حکم خدا کی تعظیم اور مخلوقِ خدا پر شفقت و رأفت"۔ (جیسا کہ جناب امیر علیہ السلام کی طرف منسوب ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کے دو اہم شعبے ہیں۔علم الاخلاق کی اصطلاح کے مطابق ایک کا نام "حقوق اللّٰہ" اور دوسرے کا نام "حقوق الناس" ہے۔اور یہ دوسرا شعبہ پہلے سے زیادہ اہم ہے۔جیسا کہ قبل ازیں مبحثِ حساب میں بھی اس پر تبصرہ کیا جا چکا ہے۔سرکار محمدؐ و آلِ محمدؑ علیہ وعلیہم السلام نے لوگوں کے ساتھ خوشگوار مراسم استوار کرنے اور ان کے حقوق کو ادا کرنے پر بہت زور دیا ہے۔ جناب رسولِ خداؐ فرماتے ہیں:"احب لاخیك ما تحب لنفسك" اور اپنے بھائی کے لیے وہ کچھ ناپسند کرو جو کچھ خود ناپسند کرتے ہو۔(خصائل شیخ صدوقؒ)

جناب امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں:"عاشروا الناس عشرة اذا غبتم حنوا الیکم و اذا متم بکوا علیکم" (نہج البلاغہ) لوگوں کے ساتھ اس طرح زندگی بسر کرو کہ اگر کہیں چند روز کے لیے چلے جاؤ تو ان کے دل تمہاری طرف کھنچتے ہوئے نظر آئیں اور جب مر جاؤ تو اشک غم بہاتے ہوئے دکھائی دیں۔

جناب امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"لا یعرف المرأ بکثرة الصوم و الصلوة بل یعرف بالمعاملات"۔

انسان کی انسانیت کا جوہر نماز و روزہ کی کثرت سے نہیں معلوم ہوتا، بلکہ لوگوں کے ساتھ معاملات کرنے سے ظاہر ہوتا ہے۔(لئالی الاخبار)

خلاصہ کلام اینکہ: ؎

آسائشِ دوگیتی تفسیر ایں دو حرف است　　　با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

آیاتِ متشابہات کی تاویل لازم ہے

کتاب کے ابتدائی مباحث میں آیات متشابہات کی مناسب تاویل کے لزوم پر تبصرہ کیا جا چکا ہے کہ"جب کوئی آیت بظاہر مُسلّماتِ عقل و شرع سے متصادم معلوم ہوتی ہو تو اس کی ایسی تاویل کرنا کہ وہ تصادم و تعارض ختم ہو جائے، واجب و لازم ہے"۔ اسی قاعدہ کلیہ کی ایک فرد کی طرف جناب مُصنّف علامؒ نے اشارہ کیا ہے۔ چونکہ جناب پیغمبر اسلامؐ کی عصمت و طہارت دلائل عقلیہ و نقلیہ سے

ثابت ہے، اس لیے اگر کوئی متشابہ آیت یا روایت بظاہر منافی عصمت معلوم ہو جیسا کہ بعض آیات کی متن رسالہ میں نشاندہی کی گئی ہے، تو اس کی تاویل واجب ہوگی۔ اور وہ تاویل جو جناب مُصنّف نے بیان کی ہے (ایاك اعنی و اسمعی یا جارۃ) یہ کئی روایات میں حضرت امام جعفر صادقؑ اور حضرت امام رضاؑ سے مروی ہے کہ بظاہر خطاب جناب رسول خداؐ کو ہے مگر سمجھانا امت کو مقصود ہے کہ شرک وہ گناہِ عظیم ہے کہ اگر بفرضِ محال رسولِ خداؐ (جو بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر کے مصداق ہیں) بھی اس کا ارتکاب کریں تو اس کے اعمال اکارت ہو جائیں گے۔ تم کس باغ کی مولی ہو۔ ظاہر ہے کہ اس طرزِ بیان سے شرک کی شناعت و فظاعت ظاہر ہوتی ہے اور یہی منشائے قدرت ہے۔

افضلیت خاتم الانبیاءؐ

مُصنّف علامؒ نے اس باب میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ آنحضرتؐ سب انبیاء سے افضل اور ان کی حقیقی امت (یعنی شیعیانِ اہل بیتؑ) تمام امتوں سے افضل ہے۔ اس موضوع پر پینتیسویں باب میں مکمل تبصرہ کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ۔ فانتظروا انی معکم من المنتظرین۔

باب الاعتقاد	چونتیسواں بابؒ
فی الانبیاء و الرسل	انبیاء و رسل ملائکہ اور حجّت ہائے خداوندی
و الحجج و الملائکۃ	کے متعلق عقیدہ
قال الشیخ ابوجعفرؒ اعتقادنا فی	حضرت شیخ ابوجعفر علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ہمارا یہ عقیدہ
الانبیاء و الرسل و الحجج	ہے کہ انبیاءؑ و مرسلینؑ اور حجّت ہائے رب العالمین

چونتیسواں بابؒ

انبیاءؑ واوصیاءؑ کی ملائکہؑ پر افضلیتؑ کا بیانؒ

دیگر اکثر اسلامی مسائل کی طرح مسئلہ افضلیت انبیاءؑ واوصیاءؑ پر ملائکہؑ میں بھی اہل اسلام کے درمیان قدرے اختلاف ہے۔ چنانچہ اہل سنت کا فرقہ معتزلہ ملائکہؑ کو انبیاءؑ سے افضل سمجھتا ہے اور بعض مسلمان (ابوعبداللہ حلیمی، و قاضی ابوبکر باقلانی) تفصیل کے قائل ہیں۔ بایں طور کہ ملائکہ سماوی انبیاءؑ سے افضل ہیں، اور ملائکہؑ ارضی سے انبیاءؑ افضل ہیں۔ اور بعض لوگ اس مسئلہ میں متوقف ہیں۔ یعنی کسی کو کسی پر فضیلت نہیں دیتے۔ لیکن تمام حضرات شیعہ خیر البریہ اور جمہور اہل سنت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ انبیاءؑ و مرسلینؑ تمام ملائکہ کروبیینؑ و روحانیینؑ ارضی و سماوی سے افضل و اشرف ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ مفیدؒ کتاب "اوائل المقالات" میں رقمطراز ہیں: "اتفقت الامامیۃ علی ان انبیاء اللہ تعالیٰ عزوجل و رسلہ من البشر افضل من الملائکۃ و افقھم علی ذلک اصحاب الحدیث"۔ یعنی فرقۂ اثناعشریہ کا اس امر پر اتفاق ہے کہ انبیاءؑ و مرسلینؑ ملائکہؑ سے افضل ہیں۔ اور اہل سنت میں سے اہل حدیث شیعہ کے ساتھ اس عقیدہ میں متفق ہیں۔ اس عقیدہ کی صحت و صداقت پر ان دلائل کے علاوہ جو مصنف علام نے پیش کیے ہیں اور بھی بکثرت دلائل و براہین موجود ہیں۔ بنظر اختصار یہاں بعض ادلہ قاطعہ کی طرف ذیل میں اشارہ کیا جاتا ہے۔

دلیل اول

اس امر پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ خلاقِ عالم نے ملائکہؑ میں قوتِ شہویہ اور قوتِ غضبیہ

انهم افضل من الملائكة و قول (یعنی ائمہ طاہرینؑ صلوات اللہ علیہم اجمعین) فرشتوں سے افضل
الملئكة لِلّٰه عزو جل لما قال واشرف ہیں، اس لیے کہ جب خداوند عالم نے فرشتوں سے
لهم انی جاعل فی الارض خليفة ارشاد فرمایا کہ میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں (تو جوابًا)

غرضیکہ گناہ کرنے کی کوئی قوت پیدا نہیں فرمائی۔ لہٰذا ان کی عصمت اضطراری اور غیر اختیاری ہے۔ مگر انبیاء علیہم السلام میں یہ سب قویٰ موجود ہوتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ عصیاں و گناہ نہیں کرتے۔ لہٰذا ان کی عصمت اختیاری ہوتی ہے۔ وہ اپنے اختیار سے قوتِ شہویہ وغضبیہ کو قوتِ عقلیہ ملکیہ کے ماتحت کر لیتے ہیں۔ اس طرح ان کی اطاعت گزاری وعبادت شعاری میں محنت و مُشقت زیادہ ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ "افضل الاعمال احمزها" تمام اعمال سے افضل وہ عمل ہوتا ہے جس میں مُشقت زیادہ ہو۔ لہٰذا عبادت واطاعت زیادہ دشوار ہوگی۔ وہ یقیناً افضل واشرف ہوں گے۔ اسی بناء پر ہم تو یہاں تک کہہ سکتے ہیں کہ انبیاءؑ وائمہؑ کی شان تو بہت اجل وارفع ہے عام افرادِ امت میں سے جو لوگ مومن کامل ہیں یعنی صحت عقائد کے ساتھ ساتھ خداوند عالم کی عبادت واطاعت کرتے ہیں اور اس کی معصیت ونافرمانی سے اجتناب کرتے ہیں وہ بھی ملائکہ سے افضل ہیں۔ اسی لیے ائمہ طاہرینؑ کا ارشاد ہے: "ان الملائكة لخدامنا و خدام محبينا"۔ (بحار الانوار) فرشتے ہمارے، بلکہ ہمارے خالص محبوں کے بھی خدمت گزار ہیں۔

دلیل دوم

یہ امر اپنے مقام پر مبرہن ہو چکا ہے کہ ملائکہ کے کمالات و مقامات محدود اور ان کے لیے مزید ترقی کے امکانات غیر موجود ہیں۔ جو سجدہ میں ہیں وہ ہمیشہ سربسجود ہیں، جو رکوع میں ہیں وہ ہمیشہ رکوع میں ہیں، وعلیٰ ہذا القیاس۔ چنانچہ قرآن مجید نے ان کی اس کیفیت کی انہی کی زبانی یوں تصویر کشی کی ہے: "و ما منا الا له مقام معلوم و انا لنحن الصافون و انا لنحن المسبحون" (سورۃ صافات ۶۴ تا ۶۷) اور ہم میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کے لیے ایک معین ٹھکانا نہ ہو۔ اور یقیناً ہم صف باندھنے والے ہیں اور بے شک ہم تسبیح کرنے والے ہیں۔ (ترجمہ مقبولؒ) ان میں سے ہر ایک کا ایک مقام معلوم ہے اور ایک عبادت مخصوصہ اور مرتبہ معہودہ ہے۔ جس سے آگے تجاوز نہیں کر سکتا۔ چنانچہ جناب امیر المومنینؑ اسی امر کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں: "منهم سجود لا یرکعون و رکوع لا یرفعون و صافون لا یتزایلون و مسبحون لا یغشاهم نوم العیوم...... الخ" (نہج البلاغہ) بعض سربسجدہ ہیں جو کبھی رکوع نہیں

قالوا اتجعل فیھا من یفسد فیھا و یسفك الدمآء و نحن نسبح بحمدك و نقدس لك قال انی اعلم ما لا تعلمون ھو القنی و المتمنی فیھا	فرشتوں نے کہا: اے پروردگار! تو ایسے شخص کو زمین میں خلیفہ بناتا ہے جو اس میں فساد اور خونریزی کرے گا۔ حالانکہ ہم تیری تسبیح و تقدیس کرتے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے (بقرہ: ۳۰ تا ۳۲) فرشتوں کی اس گفتگو سے ظاہر ہے کہ وہ ایک تمنا رکھتے ہیں اور وہ تمنا

کرتے اور بعض اس طرح رکوع میں ہیں کہ کبھی سربلند نہیں کرتے۔ اور بعض یوں صف بستہ ہیں کہ کبھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹتے۔ اور بعض یوں تسبیح کناں کہ انھیں نیند تسبیح و تقدیس سے باز نہیں رکھتی لیکن انبیاءؑ و مرسلینؑ کی ترقی درجات اور تحصیل کمالات کے امکانات غیر محدود ہیں۔ وہ ترقی کرتے کرتے خالق کے مرتبہ کو تو نہیں پہنچ سکتے (این التراب و رب الارباب) لیکن جناب جبرئیلؑ کو کہنا پڑتا ہے: "لو دنوت انملة لا حترقت" اے رسولؐ! آپ اس مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ اگر میں اپنی جگہ سے ایک پور کے برابر بھی آگے بڑھوں تو میرے پر جل جائیں۔

اگر یك سرِ مُوئے بالا پرم فروغِ تجلّیٰ بسوزد پرم

اربابِ عقل و دانش جانتے ہیں کہ جن کی ترقی کے امکانات غیر محدود ہوں، وہ یقیناً ان سے افضل و اشرف ہوں گے جن کی ترقی کے وسائل و حدود محصور و محدود ہوں گے۔

دلیل سوم

پیغمبر اسلامؐ کی تصریحات موجود ہیں کہ انبیاء ملائکہ سے افضل ہیں۔ چنانچہ علامہ جزائری علیہ الرحمہ "انوارِ نعمانیہ" میں جناب امام رضا علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ جناب امیر المومنینؑ نے جناب رسولِ خدا ﷺ سے دریافت کیا: "انت افضل او جبرئیل؟" "یا رسول اللہ! آپؐ افضل ہیں یا جبرئیلؑ" آپؐ نے فرمایا: "یا علی! ان اللہ فضل انبیائه المرسلین علی ملائکته المقربین و فضلنی علی جمیع النبیین و المرسلین و الفضل بعدی لك. یا علی! و للائمة من بعدك و ان الملائکة لخدامنا و خدام محبینا. یا علی! الذین یحملون العرش و من حوله یسبحون بحمد ربهم و یستغفرون للذین اٰمنوا بولایتنا۔ یا علی! لولا نحن ما خلق اللہ اٰدم و لا حوا و لا الجنة و لا النار و لا السماء و لا الارض فکیف لا نکون افضل من الملائکة (کذا فی عیون اخبار الرضا) یا علیؑ! خداوند عالم نے اپنے تمام انبیاءؑ و مرسلینؑ کو ملائکہؑ مقربینؑ سے افضل قرار دیا ہے اور مجھے تمام انبیاء و مرسلین (علیہم السلام) پر بھی افضلیت عطا فرمائی ہے)

منزلة أدمؑ و لم یتمنوا الا منزلة فرق منزلتهم و العلم یوجب الفضیلة قال الله تعالیٰ و علم أدم الاسماء کلها ثم عرضهم	حضرت آدمؑ کی منزلت اور ان کے مرتبہ کا حاصل کرنا ظاہر ہے کہ فرشتوں نے اسی مرتبہ کی تمنا ظاہر کی تھی جو ان کے اپنے مرتبہ و مقام سے بلند تھا۔

لہٰذا میں تو طریق اولیٰ ملائکہ سے افضل ہوں گا) یا علی! میرے بعد یہ افضلیت تجھےاور تیرے بعد آنے والے دوسرے ائمہ طاہرینؑ کو حاصل ہے۔ بتحقیق ملائکہ ہمارے اور ہمارے محبّت داروں کے خادم ہیں۔ یا علیؑ! جو ملائکہ حامل عرش ہیں اور جو اس کے اردگرد ہیں وہ خدا عزوجل کی تسبیح و تقدیس کرتے ہیں۔ اور ان لوگوں کے لیے طلبِ مغفرت کرتے ہیں جو ہماری ولایت پر ایمان رکھتے ہیں۔ یا علیؑ! اگر ہم نہ ہوتے تو خدا عزوجل آدم و حوا، جنّت و دوزخ اور آسمان و زمین میں سے کسی شے کو پیدا نہ کرتا۔ دریں حالات ہم کس طرح ملائکہ سے افضل نہ ہوں گے"۔

لہٰذا بعد ازیں بھی یہ کہنا کہ ملائکہ انبیاء سے افضل ہیں، یہ تکذیب رسول نہیں تو اور کیا ہے؟ "و ربك لا یومنون حتی یحکموك فیما شجر بینہم ثم لا یجدوا فی انفسہم حرجا مما قضیت و یسلموا تسلیما"۔

دلیل چہارم

خلاقِ عالم سورۂ انعام آیت ۸۶ میں حضرت نوحؑ، لوطؑ، ابراہیمؑ، یعقوبؑ، اسحاقؑ، داؤدؑ، سُلیمانؑ، موسیٰؑ، ہارونؑ، ذکریاؑ، یحییٰؑ، اور عیسیٰ علیہم السلام کا ذکر کرکے ارشاد فرماتا ہے: "و کلا فضلنا علی العالمین" یعنی ان میں سے ہر ایک کو ہم نے تمام جہان والوں پر فضیلت دی۔ ظاہر ہے کہ عالمین میں فرشتے بھی داخل ہیں۔ تو واضح ہے کہ جو تمام عالمین سے افضل ہوگا وہ یقیناً ملائکہؑ سے بھی افضل ہوگا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ انبیاء کرامؑ ملائکہؑ عظام سے افضل ہیں۔ وھو المقصود۔

دلیل پنجم

اربابِ بصیرت جانتے ہیں کہ افضلیت کا معیار و میزان علم و عمل کی کثرت اور زیادتی ہے۔ جیسا کہ قرآن میں قصہ طالوت سے بھی ظاہر و ہویدا ہے کہ جب قوم نے ان کی قیادت و امارت پر اعتراض کیا تو خدائے حکیم نے یہ فرما کر ان کا ناطقہ بند کیا کہ: "ان الله اصطفاہ علیکم و زادہ بسطة فی العلم و الجسم" (سورۃ بقرہ: ۲۴۷) کہ خدا نے ان کو اس لیے منتخب کیا ہے کہ ان کا علم اور جسمانی طاقت زیادہ ہے۔ "ان اکرمکم عند الله اتقاکم" (سورۃ حجرات: ۱۳) کا بھی یہی مفاد ہے۔ اگر اس

علی الملائکۃ فقال انبئونی باسماء هؤلاء ان کنتم صادقین قالوا سبحانك لا علم لنا الا ما علمتنا انك انت العلیم الحکیم	اے فرشتو! اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہوتو ذرا ان کے نام تو بتادو۔ فرشتوں نے عرض کیا: اے مالک! پاک ہے تیری ذات ۔ ہمیں تو اتنا ہی علم ہے جتنا تونے ہمیں بتایا ہے۔ تحقیق تو بڑے علم و حکمت والا ہے۔ (بقرہ: ۳۲)

معیار و میزان پر انبیاءؑ کا موازنہ کیا جائے تو یقیناً انبیاءؑ کا پلہ بھاری نظر آئے گا۔ ان کے عمل کی برتری سطور بالا میں واضح کی جا چکی ہے اور ان کے علم کی برتری قصہ حضرت آدمؑ سے واضح ہے جو کہ متن رسالہ میں مذکور ہے۔

ازالہ شبہ

افضلیت انبیاء کے منکرین عموماً دو شبہے پیش کیا کرتے ہیں۔ ایک تو وہی ہے جس کا مصنف علام نے ذکر کر کے جواب بھی دے دیا ہے۔ اور دوسرا شبہ یہ ہے کہ ملائکہؑ کی خلقت نور سے ہے اور انبیاء کی طین (مٹی) سے اور چونکہ نور طین سے افضل ہے، لہٰذا ملائکہؑ انبیاءؑ سے افضل ہوں گے۔ اس شبہ کا کئی طرح جواب دیا جا سکتا ہے۔

یہ شبہ اسلامی حقائق سے بے بہرہ ہونے کی پیداوار معلوم ہوتا ہے، ورنہ اسلامی حقائق پر وسیع اور عمیق نظر رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ اسلام میں افضلیت کا معیار و میزان کسی چیز کی ماہیت اور ذات نہیں بلکہ اس کی صفات یعنی علم و عمل ہیں۔

(ان اکرمکم عند اللّٰہ اتقاکم)

خداوند عالم نے تو اس امر کا فیصلہ ابتدائے آفرینش میں نوری مخلوق کی گردنیں طینی مخلوق کے سامنے خم کرا کے کر دیا تھا کہ معیار فضیلت ماہیت اور مادۂ خلقت نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ اگر معیار وہی ہوتا جس کا اظہار اس شبہ میں کیا گیا ہے تو معاملہ اس کے برعکس ہوتا۔ یعنی پھر تو حضرت آدمؑ کی گردن فرشتوں کے سامنے خم ہوتی۔ ہاں البتہ اس معیار کا اظہار اس روز شیطان نے ضرور کیا تھا۔ جس کی پاداش میں راندہ بارگاہ قرار پایا اور ابدی لعنت کا طوق گردن میں ڈلوایا۔ البتہ وہ ایک ایسی غلط بنیاد قائم کرنے میں کامیاب ضرور ہو گیا کہ آج تک برابر اکثر لوگ ربانی معیار کو نظر انداز کر کے اسی شیطانی معیار کا راگ الاپتے ہیں۔

قال یا اٰدم انبئهم باسمائهم فلما انبأهم قال الم اقل لکم انی اعلم غیب السمٰوٰت والارض و اعلم ما تبدون و ما کنتم	پھر حضرت آدمؑ کو فرمایا: تم انھیں ان کے ناموں سے آگاہ کرو۔ چنانچہ جب حضرت آدمؑ نے ان کے نام بتا دیے تو خدا تعالیٰ نے فرمایا: اے فرشتو! کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے مخفی امور کو جانتا ہوں اور ان باتوں کو بھی جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو، اور وہ بھی جانتا ہوں جو تم چھپاتے ہو (بقرہ:۳۳)

دوسرا جواب

بنا بر تسلیم اینکہ تمام ملائکہ کی خلقت محض نور سے ہوئی ہے۔ یہ کہنا بہر حال خلافِ حقیقت ہے کہ انبیاء واوصیاء کی خلقت محض طینت سے ہوئی ہے۔ کیونکہ یہ بات اپنے مقام پر عقل ونقل کی روشنی میں ثابت کی جا چکی ہے کہ انبیاء ہوں یا ان کے اوصیاء، یہ چونکہ خالق ومخلوق کے درمیان وسیلہ ہیں اور وسیلہ کے لیے دو جنبیں ہونا ضروری ہے، ان کا ایک جنبہ نورانی ہوتا ہے اور دوسرا جسمانی۔ یعنی ان کی روح مقدس نورانی ہوتی ہے اور قالب جسمانی۔ اور ان کے یہ دونوں جنبے اس قدر مجلی ومُصفّٰی ہوتے ہیں کہ جنبہ نورانی کے اعتبار سے سید الملائکہ نظر آتے ہیں اور جنبہ جسمانی کے لحاظ سے خیر البشر (من ابی فقد کفر) بنا بریں یہ مقابلہ ومفاضلہ صرف نورانی اور جسمانی میں نہیں بلکہ ایک طرف فقط نورانیت ہے اور دوسری طرف نورانیت وجسمانیت دونوں ہیں، اور ظاہر ہے کہ اگر ایک طرف فقط نور اور دوسری طرف نور اور جسم دونوں ہوں، اور جسمانیت روحانیت کے محکوم اور تابع ہو، تو اس صورت میں عقل سلیم محض نورانی کے مقابلہ میں اسی شے کو ترجیح دے گی جو نورانیت وجسمانیت دونوں کی جامع ہو۔ ان حقائق سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام بشریت وملکیت دونوں کے جامع ہوتے ہیں اور ان کی قوتِ نورانیہ وروحانیہ ملائکہ کی نورانیت وروحانیت سے بدرجہا بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ فرشتوں سے افضل ہوں گے۔

تیسرا جواب

بنا بر تنزل ہم کہتے ہیں کہ اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ انبیاء واوصیاء کی خلقت صرف طین سے ہی ہوئی ہے اور اس میں کوئی عنصر نور شامل نہیں ہوتا تو اتنا تو مُعترض کو بھی ماننا پڑے گا کہ ان کے ساتھ روح نبوتی واماتی موجود ہوتی ہے، جو بنصِ قرآنی نورانی ہے۔ "ولکن جعلناہ نوراً نھدی بہ

تکتمون فهذا کله یوجب تفضیل آدمؑ علی الملائکة و هو نبی لهم لقول الله عز و جل انبئهم

ان سب باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ فرشتوںؑ سے افضل ہیں۔ علاوہ بریں وہ فرشتوںؑ کے نبی تھے۔ جیسا کہ خدا تعالیٰ کے اس ارشاد سے ثابت ہے کہ اے آدمؑ! تم فرشتوںؑ کو ان (بزرگوں) کے نام بتاؤ۔

من نشاء" (سورۃ شوریٰ:۵۲) "ہم نے اس کو ایک نور قرار دیا جس کے ذریعہ سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں ہدایت کر دیں"۔ (ترجمہ مقبولؒ) لہٰذا وہ اسی نورِ نبوّتی کی وجہ سے ملائکہؑ سے افضل و اشرف قرار پاتے ہیں۔ حضرت صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں کہ شیطان نے اپنی ناریت کا جناب آدمؑ کی طینت کے ساتھ قیاس کیا تھا۔ اگر وہ اپنی ناریّت کا آدمؑ کی نوریّت کے ساتھ تقابل کرتا تو اس پر آدمؑ کی افضلیت اجاگر ہو جاتی۔ (اصول کافی) یہی کیفیّت افضلیّت انبیاءؑ بر ملائکہؑ کے منکرین کی ہے۔ ان پر شاعر کا یہ شعر پوری طرح منطبق ہوتا ہے۔

و قل للذی یدعی فی العلم فلسفة
حفظت شیئا و غابت عنك اشیاء

تصویر کے دونوں رخ دیکھ کر جو فیصلہ کیا جائے وہ صحیح اور مکمل ہوتا ہے۔ ورنہ ناقص اور ادھورا۔ والله یهدی من یشاء الی صراط مستقیم۔

سجدۂ تعظیمی کا ناجائز ہونا

چونکہ رسالہ اعتقادیہ میں غیر خدا کے لیے سجدۂ تعظیمی کا ضمناً ذکر آ گیا ہے اور یہ ایک عامۃ البلوی مسئلہ ہے، اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس پر یہاں کچھ تبصرہ کر دیا جائے۔ سو مخفی نہ رہے کہ سجدۂ تعبیدی (عبادتی) کے غیر خدا کے لیے ناجائز ہونے پر تو تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ جیسا کہ حضرت غفران مآب اور فخرالدین رازی وغیرہ علماء فریقین نے اس کا اِدّعا کیا ہے۔ ہاں غیر اللہ کے لیے جب کہ وہ غیر اللہ دینی یا دنیوی بالخصوص پہلے اعتبار سے عظیم المرتبت ہو تو اس کے لیے سجدہ تعظیمی کرنے کے جواز یا عدم جواز میں قدرے اختلاف ہے۔ بعض لوگ اس کے جواز کے قائل ہیں۔ مگر تمام شیعہ علمائے محققین اسے ناجائز سمجھتے ہیں۔ قرآن کریم و احادیث سید المرسلینؐ، ارشاداتِ ائمۂ طاہرینؑ اور عقل سلیم سے بھی اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔

باسمائهم و مما یثبت تفضیل أدم علی الملئکة امر الله الملئکة بالسجود لأدم لقوله تعالیٰ فسجد اللملائکة

منجملہ ان چیزوں کے جو جناب آدمؑ کی افضلیت ثابت کرتی ہیں ایک یہ ہے کہ خدا نے فرشتوں کو آدمؑ کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا۔ چنانچہ خدا فرماتا ہے: سب فرشتوں نے سجدہ کیا (سورۃ الحجر: ۳۰)

سجدۂ تعظیمی کا عدمِ جواز از رُوئے قرآنِ کریم

قرآن مجید سے اس سجدہ کے عدم جواز کی تائید اس طرح ہوتی ہے کہ قرآن میں علی الاطلاق جہاں بھی سجدہ کا حکم ہے، وہاں خدا کے لیے ہے (الا فی موضعین سیأتی توضیحها) جیسے: "فاسجدوا لِلّٰه" (سورۂ نجم: ۶۲) اللہ کے لیے سجدہ کرو۔ اور "لله یسجد من فی السموات و من فی الارض" (سورۃ رعد: ۱۵) آسمان وزمین کی مخلوق خدا کے لیے سجدہ کرتی ہے۔ "فاسجدوا الله و اعبدوه" (سورہ نجم: ۶۲) خدا کے لیے سجدہ کرو اور اسی کی عبادت کرو۔ لہٰذا از روئے قرآن ہر قسم کا سجدہ خواہ وہ تعبیدی ہو اور خواہ تعظیمی، ذاتِ ذوالجلال کے ساتھ مختص ہے۔ نیز مندرجہ ذیل آیت مبارکہ ہر قسم کے سجدہ کے ذاتِ ایزدی کے ساتھ مختص ہونے پر بطورِ نص صریح دلالت کرتی ہے۔ ارشادِ قدرت ہے: "وان المساجد لله فلا تدعوا مع الله احدا" (سورۃ جن: ۱۸) "یقیناً سجدہ گاہیں اللہ کے لیے ہیں۔ پس اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو"۔

تفسیر صافی صفحہ ۵۱۳ میں بحوالہ من لایحضرہ الفقیہ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام سے منقول ہے، فرمایا: "المساجد سے مراد اعضائے سجدہ ہیں۔ یعنی پیشانی، دونوں ہتھیلیاں، دونوں گھٹنے، اور پاؤں کے دونوں انگوٹھے"۔ اسی مضمون کی روایات اصول کافی میں جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے اور تفسیر عیاشی میں امام محمد تقی علیہ السلام سے مروی ہیں۔ نیز تفسیر قمی میں بھی یہی مضمون موجود ہے۔

محقق شیخ بہائی علیہ الرحمہ اربعین میں بذیل شرح حدیث ہفتم لکھتے ہیں: "معتصم عباسی نے حضرت امام رضا علیہ السلام سے اس آیت کا مطلب دریافت کیا۔ آپؑ نے فرمایا: "و معنیفلا تدعوا مع الله احدا، فلا تشرکوا معه غیره فی سجودکم علیها"۔ یعنی "فلا تدعوا مع الله احدا کا مطلب یہ ہے کہ ان اعضا پر سجدہ کرنے میں خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو"۔

سجدۂ تعظیمی کا عدمِ جواز از رُوئے احادیث سیّد المرسلینؐ

جو امر قرآن کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے احادیث نبویہؐ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ وہ

كلهم اجمعون و لم يأمر الله عزوجل بالسجود الا لمن هو افضل منهم و كان سجودهم لله

ظاہر ہے کہ خداوندعالم نے اسی کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا تھا جو ان سے افضل تھا۔ فرشتوں کا یہ سجدہ خدا کے لیے بندگی و اطاعت

اس طرح کہ بکثرت روایات میں اس تعظیمی سجدہ کی خصوصی ممانعت وارد ہوئی ہے۔ بنابراختصار دوتین واقعات و روایات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:

① اصول کافی میں ہے کہ ایک مرتبہ ایک اعرابی سوسمار کو بغل میں دبائے ہوئے حضرت رسولِ خدا ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کہنے لگا: اے محمدؐ! اگر میری یہ سوسمار بول کر آپ کی نبوت کی شہادت دے دے تو میں آپ پر ایمان لے آؤں گا۔ چنانچہ اسی وقت سوسمار باعجازِ نبوت گویا ہوئی اور فصیح عربی میں کہا: "اشهد انك رسول الله و خاتم النبيين" اعرابی نے کلمہ شہادت پڑھا اور عربوں کے دستور کے مطابق چاہا کہ آنحضرتؐ کو سجدہ کرے۔ مگر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اگر غیر خدا کو سجدہ جائز ہوتا تو میں عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کیا کریں۔ اسے سجدہ کرنے سے روک دیا۔

پس جب آنحضرت ﷺ ایسی بزرگ و برتر ہستی کو جو **"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"** کی مصداق ہے، حین حیات میں سجدہ تعظیمی جائز نہیں، تو پھر کسی اور بزرگ کو اور وہ بھی بعد از مرگ کس طرح جائز ہوسکتا ہے؟ یہ خیال بھی نہ کیا جائے کہ شاید وہ اعرابی آپؐ کو سجدہ عبادتی کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ یہ خلافِ ظاہر ہے۔ وہ ابھی ابھی کلمہ توحید پڑھ چکا تھا، لہٰذا واضح ہے کہ وہ آنحضرتؐ کو معبود نہیں سمجھتا تھا، بلکہ نبی و رسول ہی سمجھتا تھا۔ لہٰذا اس کا یہ اقدام یقیناً سجدہ تعظیمی پر ہی محمول ہوگا۔

② ایک مرتبہ ایک صحابی نے آپؐ کو سجدہ کرنے کی خواہش کی۔ آپؐ نے اس کو ممانعت کرتے ہوئے فرمایا: "فلا تسجد لی و اسجد للحی الذی لا یموت"۔ "تم مجھے سجدہ نہ کرو بلکہ سجدہ کو اسی ذات کے لیے مخصوص رکھو جو ہمیشہ زندہ رہنے والی ہے اور جس کے لیے کبھی فنا اور موت نہیں ہے۔ (دیلمی، کنز العمال)

③ اسی بنا پر آپ دعا میں فرمایا کرتے تھے: "اللهم لا تجعل قبری وثنا یُعبد" اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بنا جس کی پوجا کی جائے۔ (مؤطا مالک و ششم بحار)

سجدۂ تعظیمی کا عدمِ جواز از روئے ارشاداتِ معصومینؑ

اخبار و آثار سے واضح و آشکار ہوتا ہے کہ کئی مرتبہ بعض لوگوں نے ائمۂ طاہرینؑ کو سجدہ تعظیمی کرنا چاہا۔ مگر معصومینؑ نے بڑی شدت اور سختی کے ساتھ ان کو اس کی ممانعت فرمائی۔ چنانچہ جناب

عز و جل عبودیة و طاعة و لآدم اکراما لما اودع اللہ فی صلبه من النبی و الائمة و قال النبی انا افضل من جبرئیل و میکائیل و اسرافیل

اور آدمؑ کے لیے باعث تکریم تھا۔ کیونکہ ان کی صلب میں جناب رسولِ خداؐ اور ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کے انوار ودیعت کیے گئے تھے۔ جناب رسولِ خداؐ فرماتے ہیں: میں جبرئیلؑ و میکائیلؑ اور اسرافیلؑ

شیخ عباس قمی علیہ الرحمہ نے مفاتیح الجنان میں بذیل زیارت ہفتم جناب امیرؑ بحوالہ کتاب فرحۃ الغری مؤلفہ سید اجل عبدالکریم بن طاؤسؒ ایک طویل روایت درج فرمائی ہے، جس میں جناب ابوحمزہ ثمالی کا مسجد کوفہ میں امام ہمام زین العابدین علیہ السلام کی خدمت میں شرفیاب ہونا مذکور ہے۔ ابوحمزہ بیان کرتے ہیں: "پس خود را انداختم روئے قدمہائے آنحضرتؑ بوسیدم آنرا کہ آنجناب نگزاشت و با دستِ خود سر م را بلند کرد و فرمود مکن سجود نشاید بگر برائے خداوندعالم عزوجل"۔ "میں آپؑ کے پاؤں پر گر گیا (جس سے سجدہ کی شکل بن گئی) اور چاہا کہ آپؑ کے قدم مبارک کو بوسہ دوں۔ مگر آنجنابؑ نے مجھے ایسا نہ کرنے دیا اور میرے سر کو اپنے دستِ حق پرست سے بلند کر کے فرمایا: "ایسا نہ کرو۔ سجدہ سوائے خداوند عالم کے اور کسی کے لیے جائز نہیں ہے"۔

ظاہر ہے کہ جناب ابوحمزہ مومن و موحد تھا۔ وہ یہ اقدام امام کو معبود سمجھ کر تو نہیں کر رہا تھا، بلکہ بغرض تعظیم و تکریم ہی ایسا کرنا چاہتا تھا۔ مگر امام عالی مقامؑ نے اس کی بھی ممانعت کر کے اس کے عدم جواز پر نص قائم کر دی۔ پس جب خود ذاتِ امام عالی مقام کو سجدہ تعظیمی روا نہیں ہے تو ان کے قبور مقدسہ کو کیونکر جائز ہو سکتا ہے؟

بعض روایات میں وارد ہے کہ ایک جاثلیق (پادری) نے حضرت امیرالمومنینؑ کی شخصیت سے متاثر ہو کر آپؑ کو سجدہ کرنا چاہا۔ جناب نے اسے منع کرتے ہوئے فرمایا: "اسجد للہ تعالیٰ و لا تسجد لی" خداوند عالم کو سجدہ کر اور مجھے سجدہ نہ کر۔ (عماد الاسلام جلد ۱ صفحہ ۳۳۵)

بعض دعاؤں میں ہر قسم کے سجدہ کو خداوند عالم کی ذات کے ساتھ مختص قرار دے کر غیر اللہ کے لیے اسے ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ وہ دعا جو سرکار سید الشہداء علیہ السلام کی دو رکعت نمازِ زیارت کے بعد پڑھی جاتی ہے، اس میں وارد ہے: "اللھم انی لك صلیت و لك رکعت و لك سجدت وحدك لا شریك لك فانه لا تجوز الصلوة و الرکوع و السجود الا لك لانك انت اللہ الذی لا الٰه الا انت"۔ (مفاتیح الجنان وغیرہ) "بارِ الہا! میں نے یہ نماز تیرے ہی لیے پڑھی ہے، اور یہ رکوع اور سجود تیرے

و من جمیع الملائکة المقربین و انا خیر البریة و سید ولد آدم و اما قول اللہ عزو جل لن یستنکف المسیح ان یکون عبدا للہ و الملئکة المقربون فلیس ذلک بموجب لتفضیلھم علیٰ عیسی و انما قال اللہ تعالیٰ ذلک لان الناس منھم من کان یعتقد ان الربوبیة لعیسی و یتعبد لہ و ھم صنف من النصاریٰ و منھم من عبد الملائکة و ھم الصائبون وغیرھم و قال اللہ

بلکہ تمام ملائکہ مقربین سے افضل و برتر ہوں۔ نیز فرمایا: میں تمام کائنات سے افضل اور تمام اولادِ آدم کا سید و سردار ہوں۔ خدا کے اس قول" لن یستنکف المسیح "(سورۃ النساء: ۱۷۲) (یعنی عیسیٰ ابن مریم خدا کا بندہ ہونے سے انکار نہیں کرتے۔ اور نہ ہی ملائکہ مقربین اس کا انکار کرتے ہیں) سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ فرشتے حضرت عیسیٰؑ سے افضل تھے۔ یہ تو خدا نے اس وجہ سے فرمایا کہ نصاریٰ میں سے بعض لوگوں کا خیال تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے پروردگار ہیں۔ اور وہ ان کی عبادت بھی کرتے ہیں۔ اور کچھ لوگ صائبین وغیرہم ایسے بھی تھے جو فرشتوں کی پوجا کرتے تھے۔ (لہٰذا ان دونوں فرقوں کے عقائد کی رد کرنا مقصود تھی) خدا نے اپنے اس قول سے جتلا دیا

ہی لیے کیے ہیں۔ کیونکہ سوائے تیرے اور کسی کے لیے نماز، رکوع اور سجود جائز نہیں ہے"۔ چونکہ امام عالی مقام کے مشہدِ مقدس میں نماز پڑھنے سے یہ شبہ ہوتا تھا کہ شاید یہ رکوع و سجود امام کے لیے کیا جا رہا ہے، اس لیے معصومینؑ نے حکم دیا کہ اس شبہ کا یہ دعا پڑھ کر ازالہ کردو۔ پس اگر سجدہ تعظیمی غیر خدا کے لیے جائز ہوتا تو دعا میں علیٰ الاطلاق ہر قسم کے رکوع و سجود کو ذاتِ خداوندی میں منحصر نہ کیا جاتا۔ جس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ غیر اللہ کے لیے کسی قسم کا سجدہ جائز نہیں ہے۔

و ھو المقصود و قد حصل بعون اللہ الودود

سجدۂ تعظیمی کا عدمِ جواز از روئے عقلِ سلیم

عقلِ سلیم کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ کسی بھی قسم کا سجدہ غیر خدا کے لیے جائز نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ سجدہ سے بندے کی انتہائی عاجزی اور تذلل و انکساری ظاہر ہوتی ہے۔ لہٰذا ایسی عاجزی و فروتنی کا اظہار سوائے خالق جبار کے اور کسی بزرگ کے لیے جائز نہیں ہونا چاہیے۔ جب کسی قسم کی عبادت غیر خدا کے لیے جائز نہیں تو سجدہ جو "رأس العبادۃ" ہے، وہ کیونکر روا ہو سکتا ہے؟ اگرچہ آیات و روایات پیش کرنے کے بعد علمائے اعلام کا کلام نقل کرنے کی کوئی خاص ضرورت تو نہیں رہتی۔ مگر

عزو جل لن یستنکف المسیح ان یکون عبدا للہ ای لا یستنکف المسیح و المعبودون دونی ان یکون اعبادًا لی و الملئکۃ روحانیون معصومون لا یعصون اللہ ما امرھم و یفعلون ما یؤمرون لا یأکلون و لا یشربون و لا یألمون و لا یسقمون و لا یشیبون و لا یھرمون طعامھم و شرابھم التسبیح و التقدیس و عیشھم

کہ مسیح اور وہ لوگ جو میرے سوا معبود خیال کیے جاتے ہیں، وہ تمام اپنے آپ کو میرا بندہ ہونے سے انکار نہیں کرتے۔ اور نہ اس میں اپنے لیے کوئی عار محسوس کرتے ہیں۔ ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ تمام فرشتے روحانی اور معصوم مخلوق ہیں۔ خدا نے جن باتوں کا انھیں حکم دیا ہے ان میں وہ اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے (سورۃ تحریم :۶) بلکہ وہ وہی کرتے ہیں جس بات کا انھیں حکم دیا گیا ہے۔ وہ نہ تو کچھ کھاتے ہیں اور نہ کچھ پیتے ہیں۔ نہ انھیں تکلیف ہوتی ہے اور نہ بیمار ہوتے ہیں۔ اور نہ انھیں بڑھاپا آتا ہے، ان کا کھانا پینا خدا کی تسبیح و تقدیس ہے۔ ان کی زندگی کا دار و مدار

مزید اطمینانِ قلب کے لیے یہاں بعض اعلام کا کلام بھی پیش کیا جاتا ہے۔

① عالم ربانی شیخ محمد علی اصفہانی تحفہ امامیہ جلد ۱ صفحہ ۳۷ میں رقمطراز ہیں: "و اما سجود از برائے خیر خدا مطلقًا بہر قصد باش و قصد عبادت ھم نکند آن سجود شرک فعلی است و سجودِ خلق بغیر ذات الٰہی جائز نیست و شرک است"۔

② حجۃ الخاصہ علی العامہ علامہ السید دلدار علی معروف بسرکار غفران مآب اپنی تصنیف لطیف "عماد الاسلام" جلد ۱ صفحہ ۲۰۵ طبع لکھنؤ پر رقمطراز ہیں: "ان السجدۃ لا تجوز لغیر اللہ تعالیٰ مطلقًا و ان کانت بنیۃ التعظیم للانبیاء مثلا لانعقاد الاجماع علی حرمتہا مطلقًا"۔ سجدہ کسی صورت میں بھی غیر خدا کو جائز نہیں ہے اگرچہ بقصدِ تعظیم ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اس کی حرمتِ مُطلقہ پر اجماع قائم ہے۔

حضرت غفران مآبؒ کے کلامِ حق ترجمان سے واضح وعیاں ہوتا ہے کہ غیر خدا کے لیے سجدہ کی حرمت میں تمام علماء کا اتفاق ہے، بعد ازیں بھی اگر کوئی نیم ملا اس کا جواز کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے تو وہ اپنی جہالت و ضلالت کا ثبوت فراہم کرتا ہے، اس کے عدم جواز پر اس کی کٹ حجتیوں سے کچھ اثر نہیں پڑتا۔ والحق احق ان یتبع۔

ایک عظیم شُبہ کا ازالہ

جو لوگ سجدۂ تعظیمی کو غیر خدا کے لیے جائز سمجھتے ہیں، وہ بموجب: "والذین فی قلوبھم زیغ

من نسیم العرش و تلذذھم بانواع العلوم خلقھم اللہ تعالیٰ بقدرتہ انوارا و ارواحا کما شاء و اراد وکل صنف منہم تحفظ نوعا مما خلق و قلنا بتفضیل من فضلنا

عرش کی ہوا پر منحصر ہے، اوران کی لذت وفرحت انواع واقسام کے علوم میں ہے۔ خدا نے جیسا چاہا، اپنی قدرت سے انھیں نور و روح بنا کر پیدا کیا۔ اوران میں سے ہرایک گروہ دیگر مخلوقات کی علیحدہ علیحدہ ہر ہر نوع کے حفاظت کرتا ہے۔ ہم نے جن بزرگواروں (انبیاءؑ و ائمہؑ) کو ملائکہؑ پر فضیلت دی ہے۔

فیتبعون ما تشابه منه ابتغاء الفتنة و ابتغاء تاویله" (سورۃ آل عمران:۷) عموماً حضرت آدمؑ کو ملائکہ کے سجدہ کرنے، نیز حضرت یوسفؑ کوان کے والدین اوران کے بھائیوں کے سجدہ کرنے سے تمسک کیا کرتے رہتے ہیں۔ یہ استدلال بچند وجہ غلط ہے۔

اولاً: یہ آیتیں مجمل ہیں۔ ان سے یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ یہ سجدہ تعبیدی تھا یا تعظیمی۔ یا ان حضرات کو قبلہ سمجھ کر خدا تعالیٰ کا سجدہ کیا گیا تھا۔ یا ان کی تقلید و تاسی میں کیا گیا تھا۔ بایں طور کہ حضرت آدمؑ اور حضرت یوسفؑ نے پہلے بطور شکر نعمت الٰہی سجدہ کیا۔ پھر ملائکہ اور والدین و برادرانِ یوسف کو بھی ان کی تاسی کا حکم دے دیا گیا۔ یا یہ سجود مُطلق انحناء (جھکنے) کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ عجمیوں میں تاحال رواج ہے کہ وہ بزرگوں کی جھک کر تعظیم کرتے ہیں، تو جن آیات میں اس قدر احتمالاتِ کثیرہ موجود ہوں، ان سے کسی مقصد کے اثبات پر استدلال کرنا کیونکر درست ہوسکتا ہے؟ "اذا قام الاحتمال بطل الاستدلال"۔

ثانیاً: ہم کہتے ہیں کہ یہ سجدہ خداوند عالم کی ذات کے لیے تھا۔ مگر جناب آدمؑ و یوسفؑ کو محض قبلہ قرار دیا گیا تھا۔ بنابریں "اسجدوا لآدم او خرواله سجدا" میں "لام" بمعنی "الیٰ" ہے۔ اور عربی زبان میں "لام" بمعنی "الیٰ" استعمال ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ حسان بن ثابت صحابی کے ان اشعار میں جو حضرت امیرؑ کی مدح میں ہیں "لام" بمعنی "الیٰ" ہے۔ ؎

ما کنت احسب ان الامر منصرف	عن ھاشم ثم عنھا من ابی حسن
الیس اول من صلی لقبلتکم	و اعرف الناس بالقرآن و السنن

یہاں "لقبلتکم" میں جو لام ہے یہ بمعنی "الیٰ" ہے۔ یعنی "الیٰ قبلتکم"۔ بعض احادیث اہل بیتؑ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ حیات القلوب جلد ۱ صفحہ ۴۴ پر ایک طویل حدیث کے ضمن میں حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: "نبود سجدۂ ایشان از برائے آدم بلکہ

الحالة التی تصیرون الیھا من انواع ما خلق اللّٰہ اعظم و افضل من حال الملائکۃ واللّٰہ اعلم	اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو ملائکہ اور دیگر مخلوقاتِ خداوندی سے بڑھ کر فضائل وکمالات حاصل ہیں۔ واللّٰہ اعلم۔

قبلۂ ایشان بود از برائے خدا سجدہ می کردند و امرِ نمود حق تعالیٰ کہ بجانب او رو آورند"۔ یعنی ملائکہ کا یہ سجدہ حضرت آدمؑ کے لیے نہ تھا بلکہ سجدہ تو خدا کے لیے تھا البتہ حکم خدا سے آدمؑ کو قبلہ بنایا گیا تھا۔ بہت سے علمائے اعلام نے بھی یہی قول اختیار کیا ہے۔

ثالثاً: اگر اس سجدہ کو تعظیمی بھی قرار دیا جائے جیسا کہ بعض احادیث سے مترشح ہوتا ہے، تاہم اس سے ہمارے مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ جن شریعتوں میں یہ جائز تھا اب وہ شرائع منسوخ ہو چکے ہیں۔ لہٰذا منسوخ شدہ شریعت کے کسی عمل سے اس شریعت کے کسی مسئلہ پر استدلال نہیں کیا جاسکتا، جو تمام شریعتوں کی ناسخ ہے۔ چنانچہ تفسیر معالم التنزیل بغوی اور اسباب النزول سیوطی اور ہماری تفسیر بے نظیر لوامع التنزیل جلد اول صفحہ ۱۸۹ میں تصریح موجود ہے کہ سابقہ شرائع میں تعظیمی سجدہ جائز تھا۔ مگر اسلام میں اسے منسوخ کر دیا گیا اور اس کی جگہ "سلام" مقرر ہوا۔ ارشادِ قدرت ہوتا ہے: "وَاِذَا حُیِّیۡتُمۡ بِتَحِیَّۃٍ فَحَیُّوۡا بِاَحۡسَنَ مِنۡہَاۤ اَوۡ رُدُّوۡہَا" (سورۃ النساء: ۸۶) صاحب لوامع التنزیل فرماتے ہیں: "این سجدہ تعظیمی درامم سلف جاری و ساری الیٰ نزول "واذا حییتم بتحیة" بود۔ پس بسبب آن بجائے آن سلام مقرر شد"۔ یعنی آیت مبارکہ واذا حییتم کے نزول تک سابقہ امتوں میں سجدۂ تعظیمی کا رواج تھا مگر اس آیت کے بعد وہ منسوخ ہو گیا اور اس کی جگہ سلام مقرر ہوا۔

اسی طرح علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے بھی افادہ فرمایا ہے۔ حیات القلوب جلد ۱ صفحہ ۴۶ طبع نولکشور پر مباحث طویلہ کے بعد لکھتے ہیں: "پس ظاہر شد کہ سجدہ از برائے غیر خدا بقصد عبادت کفر است و بقصد تعظیم بدون امرِ خدا فسق است، بلکہ محتمل است کہ سجدۂ تحیت در امم سابقہ مجوز بودہ باشد و دریں امت حرام شدہ باشد و احادیث بسیار بر نہی از سجدہ از برائے غیر خدا وارد شدہ" یعنی غیر خدا کو بقصدِ عبادت سجدہ کرنا کفر ہے اور اگر بقصدِ تعظیم ہو تو بھی بغیر امر خدا موجب فسق ہے۔ احتمال ہے کہ بعض سابقہ امتوں میں یہ سجدہ جائز ہو۔ مگر اس امت میں اسے حرام قرار دے دیا گیا ہو۔ غیر خدا کو سجدہ کرنے کی ممانعت کے متعلق بکثرت احادیث وارد ہوئی ہیں"۔

ولا ینبئك مثل خبیر۔

ملائکہ کے وجود پر ایمان رکھنا ضروری ہے

ملائکہ کے وجود پر ایمان رکھنا ایک مُسلمان کے لیے ضروری و لازمی ہے۔ قرآن مجید کی آیات مُتکاثرہ اور پیغمبر اسلامؐ اور ان کی اولاد اطہارؑ کی روایات متواترہ ان کے وجود پر دلالت کرتی ہیں۔ بلکہ کتب سیرو تواریخ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا کے ہر قدیم و جدید مذہب میں ملائکہ کے وجود پر کسی نہ کسی صورت میں ضرور اعتقاد رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شیطانی وساوس نے دیگر عقائد کی طرح اس عقیدہ میں کچھ تغیرات پیدا کر دیے اور بعض لوگ ملائکہ کو خالقیت و رازقیت وغیرہ صفات میں خدا کا شریک سمجھنے لگے۔ بعض نے ان کو بنات اللہ قرار دے دیا اور بعض لوگوں نے ان کو ایسا "جند اللہ" (خدا کا لشکر) قرار دیا کہ خدا بغیر ان کی مدد کے نہ شیاطین کا مقابلہ کر سکتا ہے اور نہ ان کو شکست دے سکتا ہے۔ لیکن اسلام نے ان تمام نظریاتِ فاسدہ کی تردید کرتے ہوئے یہ فرمایا: "بل عباد مکرمون لا یسبقونه بالقول و هم بامره یعملون" (سورۃ الانبیاء: ۲۶ و ۲۷) یہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کے مکرم و محترم اور عبادت گزار بندے ہیں، جو کسی قول و فعل میں اللہ کے حکم سے تجاوز نہیں کرتے، بلکہ اسی کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ "لا یعصون الله ما امرهم و یفعلون ما یؤمرون" (سورۃ تحریم: ۶) بہرحال ملائکہ کے وجود پر تمام امامیہ بلکہ تمام امتِ اسلامیہ کا اتفاق ہے۔ سوائے بعض متفلسفہ کے۔ چنانچہ سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ بحار جلد ۱۴ میں رقمطراز ہیں: "اعلم انه اجمعت الامامیة بل جمیع المسلمین الا من شذ منهم من المتفلسفین الذین ادخلوا انفسهم بین المسلمین لتخریب امر لهم و تضیع عقائدهم علی وجود الملائکة و انهم اجسام لطیفة نورانیة اولی اجنحة مثنی و ثلاث و رباع و اکثر قادرون علی التشکل بالاشکال المختلفة و انه سبحانه یورد علیهم بقدرته ما یشاء من الاشکال و الصور علی حسب الحکم و المصالح و لهم حرکات صعودا و هبوطا و کانوا یراهم الانبیاء و الاوصیاء و القول بتجردهم و تاویلهم بالعقول و النفوس الفلکیة و القوی و الطبائع و تاویل الایات المتظافرة و الاخبار المتواترة تعویلا علی شبهات واهیة و استبعادات وهمیة زیغ عن سبیل الهدیٰ و اتباع لاهل الغی و العمی"۔ یعنی تمام شیعہ امامیہ بلکہ تمام امتِ اسلامیہ کا سوائے ان بعض فلاسفہ کے جنھوں نے مُسلمانوں کے اصولِ مذہب کو خراب کرنے اور ان کے عقائد کو ضائع کرنے کے لیے اپنے آپ کو مُسلمانوں کے اندر داخل کر رکھا ہے، ملائکہ کے وجود اور اس امر پر اتفاق ہے کہ ملائکہ اجسام نورانیہ رکھتے ہیں۔ بعض کے دو اور بعض کے تین اور بعض کے چار اور بعض کے اس سے بھی زیادہ پر ہوتے

ہیں۔ اور وہ مختلف شکلیں اختیار کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ خداوند عالم حسبِ مصلحت ان پر مختلف شکلوں اور صورتوں کو وارد کرتا رہتا ہے۔ اور وہ صعودی و نزولی حرکات بھی کرتے ہیں۔ ان کو انبیاء و اوصیاء ظاہری آنکھوں سے دیکھتے بھی تھے۔ یہ کہنا کہ یہ جسم و جسمانیات سے بالکل مجرد ہیں، یا عقول یا نفوسِ فلکیہ یا قویٰ اور طبائع کے ساتھ ان کی تاویل کرنا اور بعض بودے شبہات اور وہمی استبعادات کی بنا پر آیاتِ متظافرہ اور اخبارِ متواترہ کی تاویل علیل کرنا راہِ رشد و ہدایت سے کجروی اختیار کرنا اور گمراہی کی اتباع کرنا ہے۔ اعاذنا اللہ منہ۔

محقق دوانی نے بھی شرح عقائد میں ان کی حقیقت کے متعلق ایسا ہی افادہ فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں:

"الملائکۃ اجسام لطیفۃ قادرۃ علی التشکلات المختلفۃ"۔

شارح مقاصد علامہ تفتازانی کے بیان سے بھی اس امر کی تائید مزید ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ظاهر الکتاب و السنة و هو قول اکثر الامه ان الملائکة اجسام لطیفة نورانیة قادرة علی التشکلات المختلفة کاملة فی العلم و القدرة علی الافعال لشاقة شانها الطاعة"۔ (شرح مقاصد جلد ۲ صفحہ ۵۴)

یعنی "جو کچھ ظاہر کتاب و سنت سے مستفاد ہوتا ہے اور جو اکثر امت کا قول بھی ہے وہ یہ ہے کہ ملائکہ اجسام لطیفہ نورانیہ ہیں جو مختلف شکلیں اختیار کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ جو علم اور اعمالِ شاقہ پر قدرت رکھنے میں کامل ہوتے ہیں اور ان کا کام طاعتِ الٰہی ہے"۔

ملائکہ کی خوراک

ملائکہ کی غذا و خوراک جیسا کہ متن رسالہ میں مذکور ہے تسبیح و تقدیس اور عبادتِ الٰہی ہے۔ یہ امر بکثرت احادیث سے مستفاد ہوتا ہے کہ ملائکہ مادی آب و دانہ سے بے نیاز ہیں۔ بلکہ ان روحانیین کی غذا بھی روحانی ہے اور وہ ہے معرفتِ کردگار و تسبیح پروردگار۔ یہ بھی واضح رہے کہ وہ ذکوریت وانوثیت، توالد و تناسل، بول و براز، ضعف و کمزوری اور رنج و بیماری وغیرہ کے ساتھ متصف نہیں ہوتے۔

(ان معارف الملة الناجیة والناریة)

محدث جزائری انوارِ نعمانیہ میں تحریر فرماتے ہیں: "فاعلم ان الاخبار قد تظافرت بان الملائکة طعامهم التحمید و شرابهم التقدیس و لیس لهم شهوة الحیوان و لا میل الی اللذات الدنیویة"۔ "جاننا چاہیے کہ اخبار متظافرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ کی غذا حمد باری اور پانی تقدیس الٰہی ہے اور ان میں حیوانی خواہش نہیں ہے اور نہ ہی ان میں دنیوی لذات کی طرف میلان ہے"۔

ملائکہ کی کثرتِ تعداد

خلاقِ عالم کی مخلوق میں ملائکہ اس قدر کثیر التعداد ہیں کہ سوائے خلاقِ عالم کے اور کوئی ان کی تعداد نہیں جانتا۔ اس سلسلہ میں بکثرت روایات وارد ہیں، جناب امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں: " و ما فی السماء موضع اھاب الا وفیھا ملك "۔ " آسمان میں قدم رکھنے کی کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں کوئی فرشتہ موجود نہ ہو"۔

انوارِ نعمانیہ وغیرہ کتب میں حضرت صادق علیہ السلام سے مروی ہے، آپؑ سے دریافت کیا گیا تھا کہ آیا ملائکہ کی تعداد زیادہ ہے یا بنی آدمؑ کی؟ فرمایا: " والذی نفسی بیدہ ملائکۃ اللہ فی السمٰوٰت اکثر من عدد التراب فی الارض و ما فی السماء موضع قدم الا وفیھا ملك یسبحہ و یقدسہ و لا فی الارض شجر و لا مدر الا وفیھا ملك موکل یاتی اللہ کل یوم بعملھا و ما منھم احد الا و یقیہ کل یوم بولانتنا اھل البیت و یستغفر لمحبینا و یلعن اعدائنا و یسئل اللہ ان ینزل علیھم العذاب "۔ فرمایا: مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے جس قدر زمین میں مٹی کے ذرے ہیں، آسمان میں اس سے زیادہ فرشتے موجود ہیں۔ آسمانوں میں کوئی قدم رکھنے کی جگہ نہیں ہے مگر یہ کہ وہاں فرشتے موجود ہیں، جو اس کی تسبیح وتقدیس کرتے ہیں، اور زمین میں کوئی شجر و مدر نہیں مگر یہ کہ اس کے پاس فرشتے موجود ہیں، جو ہر روز اپنے کام کی رپورٹ بارگاہِ قدرت میں پیش کرتے ہیں اور وہ ہر روز ہماری ولایت کا اقرار کرتے ہیں اور ہمارے دشمنوں پر لعنت کرتے ہیں۔ اور ان پر عذاب کے نازل ہونے کی درخواست کرتے ہیں"۔ بعض روایات سے یہاں تک مُستفاد ہوتا ہے کہ نباتات کے ہر ہر پودے کے ساتھ اور بارش کے ہر ایک قطرہ کے ساتھ ایک ملک مؤکل ہوتا ہے۔ اس کا یہ ارشاد بجا ہے کہ: " ویخلق ما لا تعلمون " (وہ اس قدر مخلوق خلق کرتا ہے کہ تم جانتے ہی نہیں ہو)

ملائکہ کے انواع واقسام کا اجمالی بیان

آیات واخبار سے واضح و آشکار ہوتا ہے کہ اعمال ووظائف اور کاروبار کے لحاظ سے ملائکہ کی کئی قسمیں ہیں۔

① ملائکہ حاملین عرش: " و الذین یحملون العرش و من حولہ یسبحونہ و یستغفرون للذین اٰمنوا "۔ (سورۃ مومن: ۷)

② ملائکہ وحی والہام: " اللہ یصطفی من الملائکۃ رسلا "۔ (سورۃ حج: ۷۵)

③ ملائکہ جنّت: "والملائکۃ یدخلون علیھم من کل باب"۔ (سورۃ رعد:۲۳)

④ ملائکہ دوزخ: "وما جعلنا اصحاب النار الا ملائکۃ علیھا تسعۃ عشر"۔ (سورۃ مدثر:۳۰)

⑤ کراماً کاتبین، جن کی صفت ہے کہ: "یعلمون ما تعملون ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید"۔

⑥ ملائکہ محافظین: "ویرسل علیکم حفظۃ لہ معقبات من بین یدیہ ومن خلفہ یحفظونہ من امر اللہ"۔ (سورۃ ق:۱۸)

⑦ ملائکہ مشیعین جو کہ حجاج و زوار کی مشایعت کرتے ہیں۔ جیسا کہ روایات میں وارد ہے۔

⑧ ملائکہ بحار و قفار و امطار، جو دریا بہاتے اور بارش برساتے ہیں۔

⑨ ملائکہ موت و حیات: "قل یتوفاکم ملک الموت الذی وکل بکم (سورۃ السجدۃ:۱۱) توفتھم الملائکۃ" (سورۃ محمد:۲۷)

⑩ ملائکہ حساب و کتاب جن کو منکر نکیر کہا جاتا ہے۔

ان تمام اقسام کے ملائکہ کو مدبرات الامر کہا جاتا ہے۔ ارشادِ قدرت ہے: "والمدبرات امرا (نازعات:۵) والمقسمات امرا" (سورۃ ذاریات:۴) اگر ان تمام انواع و اقسام کی کما حقہ توضیح و تشریح کی جائے تو اس قدر طوالت ہو جائے گی جس کے لیے اوراقِ کتاب متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس لیے اسی اجمالی بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

بعض شکوک و شبہات کا ازالہ

مذکورہ بالا حقائق پر چند رکیک شکوک و شبہات عائد کیے جاتے ہیں۔ ان کا بیان مع ازالہ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔

شُبہ اُولیٰ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز موجود ہو اور پھر دکھائی نہ دے؟

اس شبہ کا بچند وجہ جواب

وجہ اول: یہ امر اپنے مقام پر مُحقّق و مبرہن ہو چکا ہے کہ کسی چیز کا حاسہ بصر کے ساتھ دکھائی نہ دینا اس کے عدم وجود کی دلیل نہیں بن سکتا۔ جیسے حب و بغض، بھوک و پیاس وغیرہ اشیاء موجود ہیں۔ مگر آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتیں۔

وجہ دوم: بہت سی چیزیں اسی عالم میں موجود ہیں، جو آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتیں۔ جیسے روح اور ایتھر۔ جس کے متعلق ان لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے تمام عالم بھرا پڑا ہے۔ یا جیسے ہوا، تو

کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ملائکہ کا مادہ مادۂ ایتھر یا مادۂ ہوا کی طرح ہو۔

وجہ سوم: ممکن ہے کہ ان کی شفافیت ولطافت کی وجہ سے ہم میں ان کو دیکھنے کی طاقت نہ ہو۔ مگر جن کی قوتِ بصارت زیادہ تیز ہوتی ہے مثل انبیاء واوصیاء، وہ ان ظاہری آنکھوں سے ہی ان کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ لہٰذا جن کی صداقت، دلائل ومُعجزات سے ثابت ہے۔ ان کے دیگر اخبار کی طرح وجود ملائکہ اور ان کی رؤیت کے بارے میں بھی عقلاً ان کی تصدیق کرنا واجب ہے۔

دوسرا شُبہ جب ملائکہ اجسام لطیفہ نورانیہ ہیں تو وہ افعال شاقہ کی انجام دہی پر کس طرح قدرت رکھتے ہیں، جن کی انجام دہی سے انسانی قوتیں عاجز ہیں۔

اس شبہ کا جواب

یہ شبہ بھی حقائق سے جہالت یا تجاہل پر مبنی ہے، ورنہ کون نہیں جانتا کہ ہوا باوجود جسم لطیف ہونے کے کس طرح بڑے بڑے درختوں کو بیخ و بن سے اکھیڑ دیتی ہے اور کس طرح سر بفلک محکم اور مضبُوط عمارتوں کو چشم زدن میں نیست ونابود کر دیتی ہے۔ نیز قوتِ برقی کو دیکھیے کہ کس طرح بڑی بڑی گرانبار اشیاء کہ جنھیں ہزاروں آدمی مل کر حرکت بھی نہیں دے سکتے کس طرح اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اور معمُولی سی کہربائی تار سے بڑے بڑے وزنی جہاز وغیرہ اٹھا لیے جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر خدا تعالیٰ ملائکہ میں اپنی قدرتِ کاملہ سے مافوق العادت طاقت ودیعت کر دے تو اس میں کیا تعجب ہے؟ لہٰذا اسلامی کتب میں جناب لوط علیہ السلام کی بستیوں کو جناب جبرئیلؑ کا اپنے ایک پَر پر اٹھانا اور بلند کرنا کہ اہلِ آسمان ان کے مرغوں کی آواز کو سننے لگے اور پھر وہاں سے الٹ دینا، جو مذکور ہے، اس میں ہرگز کوئی قابلِ تعجب بات نہیں ہے۔ خود انسان کے اندر اس کی نظیر موجود ہے۔ آپ نے بعض لوگوں کو دیکھا ہوگا کہ وہ اپنے ہاتھ کی قوت سے لوہے تک کو توڑ ڈالتے ہیں۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ ہاتھوں کی قوت محض ان کے پٹھوں کا عمل ہے۔ جن کی انتہا ایک نہایت نازک اور پتلے گودے (مبدأ اعصاب جو دماغ کا ایک حصّہ ہے) تک ہوتی ہے۔ جو کہ مبدأ حرکت ہے۔ وہ اس قدر نازک ہے کہ خارجی جسم کے معمُولی سے صدمہ کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس مقدار سے جو اس کے لیے ضروری ہے، خون کا ایک زائد قطرہ بھی اس کے نیست ونابود کرنے کے لیے کافی ہے۔ جس کے بعد انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ اندازہ لگائیے کہ جو خدائے قادر وقیوم ایسی لطیف ونازک شے کو ایسی قوت عطا فرما دیتا ہے جو کثیف اور سخت اشیاء کو بھی حاصل نہیں، تو کیا وہ خدا اپنے ملائکہ کو فوقِ طاقتِ بشری

قوت عطا کرنے پر قادر نہیں ہے؟ مالکم کیف تحکمون۔

تیسرا شُبہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شے چشم زدن میں زمین و آسمان والی مسافت اور دیگر مسافات بعیدہ کو قلیل مدت میں طے کر سکے؟ جیسا کہ ملائکہ کے بارہ میں بیان کیا جاتا ہے۔

اس شبہ کا جواب

یہ شبہ بھی کوئی وزن نہیں رکھتا۔ اس سرعتِ سیر کی نظیریں موجود ہیں۔ ہوا ہی کو لے لیجیے کہ اس کی تیزی و سرعت ایسی مُسلّم ہے کہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔ جدید حکماء و سائنس دانوں کی تحقیق ہے کہ بجلی ایک منٹ میں پانچ سو دفعہ زمین کے گرد گھوم سکتی ہے۔ اور بعض ستارے ایک ساعت میں آٹھ لاکھ اسی ہزار میل حرکت کر لیتے ہیں۔ ستارہ مشتری کو ہی دیکھیے جس کے متعلق علم ہیئت میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ ہماری زمین سے ایک ہزار چار سو گیارہ گنا زیادہ ہے۔ باوجود اس جسامت کے ایک گھنٹے میں تیس ہزار میل اس کی رفتار ہے۔ یعنی توپ کے گولہ سے اسی درجہ تیز۔ چنانچہ جتنی دیر میں انسان سانس لیتا ہے، اتنے عرصہ میں وہ نو میل چل جاتا ہے۔ (از دو قرآن، اسلام اور سائنس)

آج کل انسانوں نے ایسے راکٹ ایجاد کر لیے ہیں جو کئی ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتے ہیں تو کیا خدائے قدیر اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ملائکہ کو یہ طاقت عطا کرے کہ وہ چشم زدن میں مسافت بعیدہ کو طے کر سکیں۔ لہٰذا اسلامی کتابوں میں جو یہ مرقوم ہے کہ جب برادرانِ یوسف نے جناب یوسفؑ کو چاہ میں ڈالا تھا تو آپؑ ابھی ساتویں اینٹ تک نہیں پہنچنے پائے تھے کہ جبرئیل امینؑ نے آ کر نیچے اپنے پر بچھا دیے تھے۔ تو اس میں کوئی قابلِ انکار بات نہیں ہے۔ اس تقریر دلپذیر سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ جناب آصف بن برخیا کا ایک لمحہ میں اقصائے یمن سے اقصائے شام میں تختِ بلقیس کا حاضر کرنا، حضرت امیرؑ کا چشم زدن میں مدینہ سے مدائن پہنچنا، اور جناب سلمانؓ کی تجہیز و تکفین کر کے واپس تشریف لانا اور حضرت عیسیٰؑ کا جسم عنصری کے ساتھ چرخِ چہارم پر چڑھ جانا، اور جناب ختمی مرتبتؐ کا شب معراج سات آسمانوں سے بھی آگے بڑھ جانا اور پھر جلد ہی واپس تشریف لے آنا، کوئی خلافِ عقل بات نہیں ہے۔ ہاں البتہ خارق عادت ضرور ہے۔ اور اسی خارق عادت امر کو ہی مُعجزہ کہا جاتا ہے۔

کما لا یخفی علی اولی الالباب

چوتھا شُبہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ کوئی جسم مختلف شکلیں تبدیل کر سکے؟

اس شبہ کا جواب

یہ شبہ بھی محض وہم کی ایجاد ہے۔ ورنہ عقلمند انسان یہ سمجھ سکتے ہیں کہ جب انسان ضعیف البنیان کیمیاوی عمل سے لطیف کو کثیف اور کثیف کو لطیف بنانے پر قدرت رکھتا ہے تو کیا قادر قیوم ذات ذوالجلال اس بات پر قادر نہیں ہے کہ اپنی ایک عظیم المرتبت مخلوق کو مختلف شکلیں اختیار کرنے کی طاقت مرحمت فرمائے؟ لہٰذا اگر قرآن میں یہ مذکور ہے کہ جناب مریمؑ کے پاس جب جناب جبرئیل آئے تھے تو جامہ بشریت زیب تن کر کے آئے تھے۔ "فتمثل لها بشرا سویا" (سورۃ مریم :۴۳) تو اس میں ذرہ بھر کوئی جائے تحیر و تعجب نہیں ہے۔ واللہ الهادی۔

انتباہ

ہمارے ان بیانات سے جنات کے وجود پر جو ایرادات عائد ہوتے ہیں، ان کے جوابات بھی معلوم ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ جنات بھی ملائکہ کے ساتھ مذکورہ بالا خواص و آثار میں سے اکثر خواص میں شریک ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ ان کی خلقت ناری ہے اور ملائکہ کی نوری۔

فتدبر و تشکر فانہ مفید

باب الاعتقاد

فی عدد الانبیاء والاوصیاء

قال الشیخ ابوجعفرؒ اعتقادنا فی عدد الانبیاء انهم

پینتیسواں بابؒ

انبیاءؑ اور ان کے اوصیاءؑ کی تعداد

جناب شیخ ابوجعفر علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ انبیاءؑ اور ان کے اوصیاءؑ کی تعداد کے بارے میں ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ نبیؑ

پینتیسواں بابؒ

عدد انبیاءؑ واوصیاءؑ کے متعلق اعتقاد

اس بابؒ کے مطالب کا اجمالی بیان

اس باب میں سرکار مُصنّف علامؒ نے چند امور کا ذکر کیا ہے۔ ① انبیاءؑ کی تعداد ② جناب رسولِ خداؐ کی افضلیت بر تمام انبیاءؑ ③ ائمہ ہدیٰؑ کی دیگر تمام مخلوقِ خدا پر افضلیت ④ امامت ائمہ اہلِ بیتؑ کا اثبات ⑤ حضرت امام زمانہ عجّل اللہ فرجہ کے وجود کا اثبات۔ ہم ذیل میں ان امور پر بقدر ضرورت وگنجائش تبصرہ کرتے ہیں۔ لیکن ان مباحث میں داخل ہونے سے قبل اس نبوت اور اس کے شرائط وخواص اور معرفت انبیاءؑ کے معیار پر کچھ تبصرہ کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

حقیقت نبوتؐ کا اجمالی بیان

نبوت کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس کے شرائط ولوازم کیا ہیں؟ کسی نبی کے پہچاننے کا معیار و میزان کیا ہے؟ ان مسائل پر تفصیلی گفتگو کرنے کے لیے نہ وقت ہے اور نہ کتاب میں گنجائش ہے۔ نبوت ایک عطیۂ الٰہیہ اور موہبت ربانیہ ہے۔ جو کسب واکتساب اور تفحص وتلاش سے دستیاب نہیں ہوتی۔ "اللہ اعلم حیث یجعل رسالته" (سورۃ الانعام: ۱۲۴) خدا بہتر جانتا ہے کہ منصب رسالت کہاں قرار دینا ہے۔ "ذلك فضل الله یؤتیه من یشاء والله ذو الفضل العظیم" (سورۃ الجمعہ) یہ خدا کا فضل ہے جسے چاہے عطا کرے۔ وہ فضل عظیم کا مالک ہے۔ "ینزل الملائكة بالروح من امره علی من یشاء من عباده ان انذر انه لا اله الا انا فاتقون"۔ نبوت وہ درجہ خاصہ ہے کہ: "تنفتح فیه عین یدرك بها مدركات خاصة والعقل معزول عنها كعزل السمع عن ادراك الالوان" جس میں وہ آنکھ کھل

مائة الف و اربعة و عشرون الف نبي و مائة الف و اربعة و عشرون الف وصي لكل نبي وصي اوصى اليه بامر الله تعالىٰ و نعتقد	ایک لاکھ چوبیس ہزار ہیں، اور اتنے ہی ان کے وصی ہیں۔ ہر ایک نبی کے لیے ایک وصی ہوتا تھا۔ جسے نبی بحکمِ الٰہی اپنا وصی قرار دیتا تھا۔ ہم ان کے بارے میں یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں

جاتی ہے جس سے وہ چیزیں معلوم ہوتی ہیں جن کے ادراک سے عقل اس طرح محروم ہے جس طرح قوتِ سامعہ رنگ کے ادراک سے قاصر ہے۔ (منقذ من الضلال) ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء

شرائط وخصائص نبوتؑ کا بیانؑ

خداوند عالم جسے یہ منصب عطا فرماتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ حسب ونسب، عقل و دانش، اخلاق وآداب، عادات وخصائل اور فضائل وشمائل۔ غرضیکہ تمام صفاتِ جمیلہ سے مُتّصف ہونے اور تمام صفاتِ رذیلہ مثل حرص وحسد اور بخل وجبن وغیرہ سے منزہ ومبرا ہونے میں یگانۂ روزگار اور تمام افرادِ ملت سے افضل واعلیٰ ہو۔ مختصر لفظوں میں یوں سمجھو کہ اس کے لیے دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک "عصمت" دوسرے "مُعجزہ" اور یہ سب نتیجہ ہے اس بات کا کہ نبی نفس قدسیہ کا مالک ہوتا ہے۔ حضراتِ انبیاء کرام کو اپنے انہی نفوسِ قدسیہ کی وجہ سے تمام انسانوں پر فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ ان کی عقل وفہم عام انسانی عقول وافہام سے بالاتر اور ان کی نزاہت وطہارت تمام لوگوں سے بیشتر ہوتی ہے۔ ان کو منجانب اللہ یہ خُصُوصیت حاصل ہوتی ہے کہ وہ گناہوں کی آلائش سے ملوث نہیں ہوتے۔ وہ لوگوں کو عقائدِ صحیحہ واعمالِ حسنہ اور اخلاقِ جمیلہ کی تعلیم وتلقین کرکے ان کے نفوس کا تزکیہ کرتے ہیں۔ جس طرح انسانوں کے بعض افعال حیوانوں کو عجیب وغریب معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے بعض افعال انسانوں کو مُعجزہ معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ نبی بشریت وانسانیت میں دوسرے انسانوں کے ساتھ شریک ہوتا ہے مگر وہ عقل وفہم اور عصمت وطہارت، اعجاز نمائی اور تلقّی وحی خدائی میں ان سے جدا ہوتا ہے۔ "انما انا بشر مثلكم يوحى الیّ" (سورۃ کہف: ۱۱۰) میں بھی بشر ہوں۔ مگر میری طرف وحی ہوتی ہے۔ اسی وحی نے ان کو دوسرے لوگوں سے ممتاز ومشخص کر دیا ہے۔ نبوّت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ حُسنِ صورت، اِعتدالِ مزاج، نشوونما کی پاکی، حسن تربیت، طہارتِ نسب، کرم اخلاق، حُسنِ اخلاق، نیکی طینت، متانت و سنجیدگی، دوستانِ خدا کے ساتھ تواضع، اور دشمنانِ خدا کے ساتھ شدت، راست گفتار، امانت دار۔ غرضیکہ اوصافِ جمیلہ کا مجموعہ ہو۔ اور تمام صفاتِ رذیلہ سے اس کا دامن پاک وصاف ہو۔

فہم انھم۔ جاؤا بالحق من عند الحق و ان قولھم قول اللہ و امرھم امر اللہ و طاعتھم طاعة اللہ و معصیتھم معصیة اللہ	کہ تمام انبیاء (علیہم السلام) حق کے ساتھ خدائے برحق کی جانب سے تشریف لائے۔ ان کا قول خدا کا قول، اور ان کا حکم خدا کا حکم ہے۔ ان کی اطاعت خدا کی اطاعت، اور ان کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے۔

بشریّتِ انبیاء علیہم السلام

دیگر اکثر مسائل کی طرح نبی آخرالزمان ﷺ کی بعثت سے قبل اس مسئلہ کی حقیقت بھی افراط و تفریط کے دُھندلکے میں گم تھی۔ یہودیوں کی طرح اور بھی بعض اہل مذہب نبیوں کو ایک پیشین گوئی کرنے والے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دیتے تھے۔ بلکہ ان کو عام معمولی اور گنہگار آدمی سمجھتے تھے۔ یہ تفریط کی انتہا تھی۔ ان کے بالمقابل عیسائی تھے جو اپنے منجی کو انسان سے مافوق مخلوق، خدا، خدا کا جزء یا ناسوت و لاہوت کا مقدس مجموعہ سمجھتے تھے۔ اس طرح ہندو بھی اپنے ہادیوں کو دیوتا اور اوتار یعنی خدائے مجسّم، یا انسان کے لباس میں خدا قرار دیتے تھے اور ان کو خدائی طاقتوں کا حامل سمجھتے تھے۔ یہ افراط کی انتہاء تھی۔

اسلام نے ان دونوں نظریوں کے بین بین ایک مُعتدل نظریہ عادلانہ پیش کیا، جو افراط و تفریط کی کجرویوں سے پاک ہے۔ وہ ایک طرف انبیاءؑ و مرسلینؑ کو مخلوق، انسان، بندۂ خدا اور حکم خدا کے سامنے درماندہ و سرنگوں تسلیم کرتا ہے تو دوسری طرف ان کو بہترین خلائق، عصمت و طہارت کا پیکر، سعادت و ہدایت کا مرکز، علم و فضل کا محور اور صاحب اعجاز قرار دیتا ہے۔

عام اہل عرب بھی ہندوؤں، یونانیوں، اور عیسائیوں کی طرح یہ سمجھتے تھے کہ انسان کی ہدایت کے لیے خود انسان نہیں بلکہ انسان سے مافوق کوئی ہستی ہونی چاہیے۔ اور ان کے خیال میں وہ ہستی فرشتوں کی تھی۔

قرآن مجید نے بار بار ان لوگوں کے اس غلط نظریہ کو پیش کرکے اس کی تکذیب کی ہے اور اعلان کیا ہے کہ اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے تو البتہ ان کی طرف کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجا جاتا۔ (سورۃ بنی اسرائیل: ۹۵) مطلب یہ کہ چونکہ زمین میں انسان بستے ہیں اس لیے ضرورت تھی کہ ان کی طرف کسی انسان کو ہی منصبِ نبوت پر فائز کرکے بھیجا جاتا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

☆

و انهم لم ینطقوا الا عن الله و عن وحیه و ان سادات الانبیاء خمسة الذین دارت علیهم الوحی و هم اصحاب الشرائع و هم اولوالعزم نوح و ابراهیم و موسی و عیسی و محمد علیهم السلام و ان محمدا

ان تمام انبیاءؑ نے سوائے خدا کی وحی اور اس کے حکم کے کبھی کوئی حکم اپنی طرف سے نہیں دیا۔ اس تمام گروہ انبیاءؑ میں سے پانچ ایسے نبی ہیں جو سب انبیاءؑ کے سردار (اور وہ قطب آسیائے نبوّت ہیں) جن پر وحی کا دار و مدار ہے۔ اور وہ اولوالعزم پیغمبرؑ اور صاحبِ شریعت رسولؑ ہیں۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور سرکار ختمی مرتبت حضرت محمد مُصطفیٰ علیہ وعلیہم السلام۔ پھر ان تمام میں سے حضرت محمد مُصطفیٰ ﷺ

انبیاء واوصیاء دو جُنبے رکھتے ہیں

اگر بنظر غائر حالات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء و اوصیاء کے دو جُنبے ہوتے ہیں۔ ایک جنبہ خالص بشریت کا ہے کہ وہ انسانوں کی طرح کھاتے پیتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، شادی وغمی میں مُبتلا ہوتے، صحت و مرض کا شکار ہوتے، پیدا ہوتے اور موت کا ذائقہ چکھتے ہیں۔ دوسرا جنبہ ہے روحانیت و نورانیت والا۔ وہ اپنی روحانیت، پاکدامنی، عصمت وطہارت، علم و فضل، رشد و ہدایت، عظمت و جلالت اور اختصاصِ نبوّت میں عام انسانوں سے بلند تر ہیں۔ یہودیوں کی طرح جن لوگوں کی نظر صرف ان کے جنبہ بشری پر پڑی، انھوں نے ان کو معمُولی انسان کہنا شروع کر دیا، اور عیسائیوں کی طرح جن کی نگاہ ان کے صرف رُوحانی جنبہ پر پڑی، انھوں نے ان کو مافوق انسان مخلوق قرار دے کر ان میں اُلوہیّت کے اوصاف ثابت کرنے لگے۔ حالانکہ یہ دونوں نظریے جادۂ اعتدال سے ہٹے ہوئے ہیں۔ حق ان کے وسط میں ہے۔ وہ بشری حالات کے لحاظ سے بلا شک انسان ہوتے ہیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ وہ اپنے مخصوص رُوحانی کمالات کی بنا پر عامۃُ الناس کے سید وسردار بھی ہوتے ہیں۔ مولانا سید محمد سبطین صاحب مرحوم اسی بات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اس میں شک نہیں کہ نبی بشر ہوتا ہے، لیکن اگر ہم خاک ہیں تو وہ اکسیر، ہم پتھر ہیں تو وہ گوہر، ہم سنگ خارا وہ پارس، ہم ذرہ وہ آفتاب، ہم جاہل وہ عالم، ہم ناقص وہ کامل۔ ہم مثل قالب ہیں وہ جانِ عالم۔ وہ بشر ہے مگر روحِ مجسّم، وہ جِسم ہے مگر جِسمِ مُروّح۔ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ جنسیّت یا نوعیّت میں شریک ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ جُملہ کمالات و صفات میں بھی مساوی ہوں۔ (کشف الاسرار صفحہ ۲۹)

سیدھم و افضلھم و انه جاء بالحق و صدق المرسلین و ان الذین کذبوہ لذائقون العذاب الالیم و ان الذین اٰمنوا به و عزروہ و نصروہ و اتبعوا النور الذی انزل معه اولئك ھم المفلحون

افضل واشرف اور ان سب کے سردار ہیں ۔ یہ جناب حق کے ساتھ تشریف لائے اور گزشتہ انبیاء کی تصدیق و تائید فرمائی ۔ جن لوگوں نے آنجنابؐ کی تکذیب کی وہ دردناک عذاب کا ذائقہ چکھیں گے اور جو لوگ آنجنابؐ پر ایمان لائے، ان کا احترام کیا اور ان کی نصرت کی، اور ساتھ ساتھ اس نورِ مقدّس کی اتباع بھی کی جو آنحضرتؐ کے ساتھ نازل ہوا تھا۔ تو بس یہی انسان کامیاب ہونے والے اور رستگاری پانے والے ہیں ۔

کفار کے منشائے اشتباہ کی نشاندہی

جب انبیاء منجانب اللہ اپنے مبعوث نبوت کا اعلان کرتے تو کفار ان کی جنبہ بشری کی مذکورہ بالا خُصُوصیات کو دیکھ کر کہتے تم تو ہماری طرح آدمی ہو، تم نبی کس طرح ہوسکتے ہو۔ "ابعث اللہ بشرا رسولاً" (سورۃ بنی اسرائیل: ۹۴) "کیا خدا نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے"۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ انسان راہنمائی کا فریضہ انجام نہیں دے سکتا۔ "ابشر یھدوننا" (تغابن: ۶) کیا بشر ہمیں ہدایت کریں گے؟ اس شبہ کا شکار ہوکر عیسائی حضرت عیسیٰؑ کی انسانیت کا انکار کر بیٹھے۔ غرضیکہ ہمیشہ کفار نے یہ کہہ کر: "ان انتم الا بشر مثلنا" (ابراہیم: ۱۰) "تم نہیں ہو مگر ہماری طرح بشر"۔

تصویر کے دونوں رُخ

انبیاء علیہم السلام نے ان کے جواب میں ہمیشہ اپنی بشریت کے اقرار کے ساتھ ساتھ اپنے دوسرے جنبہ کی نشاندہی کراتے ہوئے کہا کہ ہم ہیں تو بشر و انسان مگر خدائے رحمٰن کے خاص لطف و کرم اور فضل و احسان یعنی نبوت اور اس کی خُصُوصیات سے سرفراز ہیں ۔ "قالت لھم رسلھم ان نحن الا بشر مثلکم ولکن اللہ یمن علی من یشاء من عبادہ" (ابراہیم: ۱۱) "ان کے رسولوں نے جواب میں کہا: ہم ہیں تو تمھاری طرح بشر۔ لیکن خدا اپنے بندوں میں جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے"۔ اس طرح انبیاء نے تصویر کا دوسرا رُخ پیش کرکے ان کو دعوتِ فکر دی۔ دیگر پیغمبروں کی طرح جناب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی بحکمِ پروردگار بار بار یہ اعلان فرمایا: "انما انا بشر مثلکم یوحی الیّ انما الٰھکم الٰه واحد" (کہف: ۱۱۰) "میں تمھاری طرح بشر ہوں (ہاں اللہ کی طرف سے) مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا معبود ایک ہے"۔

الفائزون و یجب ان یعتقد ان اللہ عزو جل لم یخلق خلقاً افضل من محمد و الائمۃ علیہم السلام و انہم احب الخلق الی اللہ و اکرمہم و اولہم اقراراً بہ لما اخذ اللہ میثاق النبیین و اشہد ھم علی انفسہم الست بربکم

یہ عقیدہ رکھنا واجب ہے کہ خدائے عزوجل نے کوئی ایسی مخلوق پیدا نہیں کی جو جناب سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے افضل ہو۔ یہ حضرات خداوند عالم کو اپنی تمام کائنات سے زیادہ محبوب اور زیادہ محترم ہیں۔ یہی وہ پاک و پاکیزہ ہستیاں ہیں جنھوں نے سب سے پہلے (عہد الست میں) خداوند عالم کی ربوبیت کا اقرار کیا تھا، جبکہ خدا نے تمام نبیوں سے عہد و پیمان لیا اور ان کو اپنے نفوس پر گواہ بنا کر فرمایا تھا: کیا میں تمھارا پروردگار نہیں ہوں؟ (اعراف: ۷۲)

ایک مقام پر کفار کے چند غلط اور ناجائز مطالبات کے جواب میں بتعلیم ایزدی فرماتے ہیں: "سبحان ربی ھل کنت الا بشرا رسولًا" (اسراء: ۹۳) "سبحان اللہ! تو میں تو ایک بشر اور رسول ہوں"۔ اس فرمان واجب الاذعان سے جہاں اس گروہ کے نظریاتِ فاسدہ کی رد مقصود ہے جو نبیوں کو صفاتِ الوہیت کا حامل مانتے تھے۔ وہاں ان لوگوں کے خیالِ باطل کا ابطال بھی مدِّنظر ہے، جو پیغمبروں کو عام انسانوں جیسا ایک انسان سمجھتے تھے۔ ان آیات میں جہاں اعلانِ بشریّت ہے، وہاں اس کے ساتھ رسالت اور وحیٔ نبوّت کا بھی اعلان ہے۔ ظاہر داری میں ان بیبیوں خصائص و لوازم کا بھی اعلان ہے جو حامل وحیٔ نبوّت ہونے کے لیے ضروری ہیں۔ ایک افراط پسند گروہ ایسا ہے جو نبوّت کے ڈانڈے توحید سے ملا دیتا ہے۔ اور دوسرا وہ تفریط پسند گروہ ہے جو برملا یہ کہتا ہے کہ پیغمبروں کو عام انسانوں پر کسی قسم کی کوئی بلندی و برتری حاصل نہیں، سوائے اس کے کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے اور عام انسان اس سے محروم ہیں۔ حالانکہ صاحبانِ عقل و خرد سمجھتے ہیں کہ وحی کے فارق ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نبی القائے ربانی (وحی) سے متّصف ہونے کے علاوہ بقیہ تمام اوصاف و کمالات یا نقائص و عیوب میں عام انسانوں کے برابر ہوتا ہے۔ یہ کہنا تو ایسا ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ عالم و جاہل میں صرف علم کا فرق ہے۔ تو اس کے یہ معنی نہیں علم و جہل کے علاوہ علم و جہل کے متضاد اور اوصاف میں دونوں برابر ہیں۔ اور ان میں عقل، اخلاق، تہذیب و شرافت، حکمت و دانائی میں کوئی فرق نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں علم و جہل کا فرق بیان کر کے ان دونوں کے درمیان علم و جہل کے سینکڑوں لوازم و خصائص کا فرق تسلیم کر لیا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح نبی اور غیر نبی میں "وحی" کا فرق بیان

قالوا بلیٰ و ان اللہ بعث نبیہ محمد للانبیاء فی الذر و ان اللہ عزوجل اعطی ما اعطی کل نبی علی قدر معرفتہ و معرفۃ نبینا محمدا کانت اکبر و اعظم و سبقہ الی الاقرار بہ و نعتقد ان اللہ تبارک و تعالیٰ خلق جمیع الخلق لہ و لاھل بیتہ و انہ لولاھم

تو سب سے پہلے جناب سرکار دو عالم ﷺ اور ائمہ اہل بیتؑ نے اقرار کیا تھا۔ روزِ میثاق خداوند کریم نے تمام انبیاءؑ پر آنجنابؐ کو مبعوث فرمایا۔ اور خدا نے انھیں وہ سب فضائل و کمالات (مع شئ زائد) عنایت فرمائے جو دیگر انبیاءؑ کو ان کی معرفت کے مطابق مرحمت فرمائے تھے۔ کیونکہ ہمارے رسولؐ کی معرفت سب سے بڑھی ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے سب سے پہلے رب العالمین کی ربوبیت کا اقرار کیا تھا۔ ہمارا یہ بھی اعتقاد ہے کہ خداوند عالم نے تمام کائنات اور موجودات کو محمدؐ و آلِ محمدؐ کی خاطر پیدا فرمایا ہے۔ اگر یہ بزرگوار نہ ہوتے تو

کر کے صاحب وحی اور غیر صاحبِ وحی انسانوں کے درمیان ان سینکڑوں لوازم و خصائص اور اوصاف و کمالات کا فرق تسلیم کرنا پڑے گا۔

ایک مشہور غلط فہمی کا ازالہ

جو لوگ انبیاءؑ و رسلؑ کو مافوق انسان کسی اور ہی نوع کے افراد سمجھتے ہیں وہ درحقیقت اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ان کو انسان تسلیم کر لیا تو پھر تمام انسانی اوصاف و کمالات اور نقائص و عیوب میں ان کو عام انسانوں جیسا تسلیم کرنا پڑے گا۔ یہ خیال انتہائی کوتاہ اندیشی و کور باطنی کی پیداوار ہے۔ ورنہ اربابِ نظر و بصیرت جانتے ہیں کہ ہر ہر نوع میں درجات کا تفاوت موجود ہے۔ اور ہر ہر نوع کے افراد میں فاضل و مفضول پائے جاتے ہیں۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایرانی ہیرو رستم و سہراب انسان نہ تھے؟ یا یونانی عقل و علم کے مجسمے ارسطو و افلاطون انسانیت کے مافوق کوئی مخلوق تھے؟ یا باقل و ابن ہبنقہ جو حماقت و بلادت میں ضرب المثل ہیں، وہ انسان نہ تھے؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ اول الذکر حضرات بشریت و انسانیت میں اشتراک کے باوجود اپنے اپنے دائرہ میں اپنے کمالات کی بنا پر عام انسانوں سے بلند تر تھے۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام بھی عام لوگوں کے ساتھ بشریت و انسانیت میں اشتراک کے باوجود وحی اور اس کے خصائص و لوازم میں عام انسانوں کی سطح سے بہت بلند و بالا ہیں اور اخلاقی، روحانی، علمی، عملی اور قلبی و دماغی حیثیت سے عام انسانوں سے اجل و ارفع ہیں۔ بلکہ اگر دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر بعض جسمانی خصائص میں بھی دوسرے لوگوں سے ممتاز و منفرد

لما خلق اللہ سبحانہ السماء و الارض و لا الجنۃ و لا النار و لا ادم و لا حوا و لا الملائکۃ و لا شیئا مما خلق صلوات اللہ علیہم اجمعین و اعتقادنا ان حجج اللہ علی خلقہ بعد نبیہ محمد الائمۃ الاثنی عشر

خدائے عزوجل نہ زمین و آسمان پیدا کرتا نہ جنّت و دوزخ کو نہ آدم و حوا پیدا ہوتے، اور نہ فرشتے عالم وجود میں آتے اور نہ کائنات عالم کی کوئی چیز پیدا ہوتی ہمارا عقیدہ یہ بھی ہے کہ جناب رسولِ خدا ﷺ کے بعد تمام مخلوق پر حجّت ہائے خداوندی بارہ امام ہیں۔

ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ پیغمبر کے قلب و دماغ پر نیند کا اثر نہیں ہوتا۔ ان کا ارشاد ہے: "میری آنکھ سوتی ہے مگر دل نہیں سوتا"۔ ظاہر ہے کہ عام انسانوں کی یہ کیفیت نہیں ہے۔ جناب رسولِ خداؐ فرمایا کرتے تھے کہ صفوں کو سیدھا کیا کرو۔ کیونکہ میں اپنی پیٹھ کے پیچھے سے بھی ایسے ہی دیکھتا ہوں جیسے سامنے سے۔ کیا عام لوگوں کی قوتِ بصارت ایسی ہوتی ہے؟

جب پیغمبر سے معمولی...... کی وجہ سے ان کی ازواج تقویٰ کے بعد عام عورتوں جیسی نہیں رہتیں جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے: "یا نساء النبی لستن کاحد من النساء ان اتقیتن" (احزاب: ۳۲) "اے پیغمبرؐ کی بیویو! تم ایسی نہیں ہو جیسے ہر عورت۔ اگر خدا کا ڈر رکھو"...... تو خود پیغمبر کس طرح "کاحد من الرجال" ہو سکتا ہے؟ الغرض نبی اور غیر نبی میں وحیٔ نبوت کا جو فرق ہے اس کے یہی معنی ہیں کہ ان دونوں میں وحی و رسالت کے تمام لوازم، خصوصیات، اور اوصاف میں فرق و امتیاز ہے۔ لہٰذا کسی انسانِ کامل کو صاحبِ وحی ماننے کے ساتھ ان تمام خصائص و لوازم کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا جن کا ایک نبی یا رسول میں پایا جانا ضروری ہے۔ (سیرۃ النبیؐ)

بعثتِ انبیاءؑ کی ضرورت اور غرض و غایت

بعثتِ انبیاءؑ کی ضرورت اور اس کی غرض و غایت کے سلسلہ میں متعدد وجوہ بیان کیے گئے ہیں۔ یہاں صرف بعض اہم امور کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

① خلاقِ عالم نے انسان میں دو قسم کی قوتیں ودیعت فرمائی ہیں۔ ایک قوتِ ملکیہ روحانیہ، دوسری قوتِ بہیمیہ جسمانیہ۔ اس خالق حکیم نے یہ انتظام فرمایا ہے کہ قوتِ بہیمیہ کے امراض و اسقام کے ازالہ کے لیے ڈاکٹر و حکیم پیدا فرماتے ہیں۔ ضرورت تھی کہ خدائے حکیم قوتِ ملکیہ کی نشو و نما اور اس کے روحانی امراض کے علاج معالجہ کے لیے بھی کچھ ایسے حضرات قدسی صفات مقرر فرمائے جو صورت میں تو انسان ہی ہوں مگر قوتِ ملکیہ کے کامل اور دیگر کمالات کے اتم و اکمل ہونے کی وجہ سے ملائکہ

اولهم امیرالمومنین علیؑ بن ابی طالبؑ ثم الحسنؑ ثم الحسینؑ ثم علیؑ بن الحسینؑ ثم محمدؑ بن علیؑ ثم جعفرؑ بن محمدؑ ثم موسیٰؑ بن جعفرؑ ثم علیؑ بن موسیٰؑ الرضاؑ ثم محمدؑ بن علیؑ ثم علیؑ بن محمدؑ ثم حسنؑ بن علیؑ ثم محمدؑ بن الحسنؑ الحجة القائم

جن سے پہلے امام امیرالمومنین حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ علیہ السلام، دوسرے امام حسنؑ، تیسرے امام حسینؑ چوتھے حضرت امام زین العابدینؑ، پانچویں حضرت امام محمد باقرؑ، چھٹے جناب امام جعفر صادقؑ، ساتویں حضرت امام موسیٰ کاظمؑ، آٹھویں حضرت امام علی رضاؑ، نویں جناب امام محمد تقیؑ، دسویں حضرت امام علی نقیؑ، گیارھویں حضرت امام حسن عسکریؑ اور بارھویں جناب امام مہدی علیہم السلام

سے بھی افضل ہوں۔ انہی کو اصطلاحِ شریعت میں "انبیاءؑ و مرسلینؑ" کہا جاتا ہے۔ ارشادِ قدرت ہے: "یا ایها الناس قد جاءتکم موعظة من ربکم و شفاء لما فی الصدور وهدی و رحمة للمومنین" (سورۃ یونس: ۵۷)

۴ جب ایک عقل مند انسان دلائل عقلیہ فطریہ سے یہ معلوم کر لیتا ہے کہ اس کا ایک خالق و مالک ہے تو وہ یہ سوچتا ہے کہ اس کی غرضِ خلقت کیا ہے؟ نہ تو یہ بارگاہِ رب العزت میں حاضر ہو سکتا ہے اور خداوند عالم اس سے اجل وارفع ہے کہ اس کی بزم میں آئے۔ تو اس امر کے معلوم کرنے کے لیے کہ اس کی خلقت سے خدائے عزوجل کی غرض و غایت کیا ہے؟ کن باتوں سے انھیں قربِ ایزدی حاصل ہوگا؟ اور کن امور کی وجہ سے وہ بارگاہِ قدس سے دور ہو جائے گا؟ خالق کی رضا مندی کن باتوں میں پوشیدہ ہے؟ اور اس کی ناراضی کن چیزوں میں مضمر ہے؟ ان حقائق کو سمجھنے کے لیے ضرورت تھی کہ کچھ وسائط درمیان میں موجود ہوں جو دو جنبے رکھتے ہوں۔ ایک جنبہ وہ ہو جو جمال و کمال احدیت کا پرتو ہو، جس کی وجہ سے خالق عالم سے احکام و تعلیمات حاصل کر سکیں۔ اور دوسرا جنبہ وہ ہو جس میں وہ عام انسانوں کی طرح معلوم ہوں، تاکہ لوگوں کو وہ احکام پہنچا سکیں۔ اور ان کی زندگی اور ان کی سیرت و کردار عام لوگوں کے لیے مشعل راہ بن سکے

اُدھر اللہ سے واصل اِدھر مخلوق میں شاغل
خواص اس برزخِ کبریٰ میں ہے حرفِ مشدد کا

ایسے ہی وسائط اور وسائل کو اصطلاحِ شریعت میں "نبی" و "رسول" کہا جاتا ہے۔ ان کی حیثیت خالق و مخلوق کے درمیان وسائل اور روابط کی مانند ہوتی ہے۔ جس طرح بلاتشبیہ بادشاہ اور رعیت کے درمیان وزراء واسطہ ہوتے ہیں جو بادشاہ کے احکام سے رعایا کو آگاہ کرتے ہیں۔ اسی

بأمر الله صاحب الزمان و خليفة الرحمن في ارضه الحاضر في الامصار الغائب عن الابصار صلوات الله عليهم اجمعين و اعتقادنا فيهم انهم اولو الامر الذين امر الله بطاعتهم و انهم شهداء على الناس و انهم ابواب الله

صاحب العصر والزمان اور خلیفۂ رحمان ہیں، جو حجّتِ خدا اور قائم بامر اللہ ہیں، آنکھوں سے غائب مگر شہروں میں حاضر ہیں۔ صلوات اللہ علیہم اجمعین ۔ ان بزرگواروں کے متعلق ہم یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ وہی اولی الامر ہیں جن کی اطاعت و فرمانبرداری کا خدائے تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ یہ تمام لوگوں کے گواہ، خدا کے (علوم کے) دروازے

طرح خداوند عالم اور اس کے بندوں کے درمیان انبیاء وسیلہ اور سفیر ہوتے ہیں۔ جو لوگوں کو خالق کی مرضی و منشاء کی اطلاع دیتے ہیں۔ تاکہ لوگ اپنے مقصد خلقت کی تکمیل کر کے فلاح و نجاح دارین حاصل کرسکیں۔ ظاہر ہے کہ تنہا عقل انسانی ان حقائق کو سمجھنے سے عاجز و قاصر ہے۔

(۳) یہ امر محتاجِ دلیل نہیں ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے۔ تنہا اپنی تمام ضروریات پورا نہیں کرسکتا۔ بلکہ اپنے بنی نوع انسان کے تعاون اور ان کے ساتھ اجتماع کا محتاج ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس اجتماع میں ذاتی جلب منفعت اور دفع مضرت کی وجہ سے جنگ و جدال اور قتل و قتال کا صرف ظن غالب ہی نہیں بلکہ یقین کامل ہے۔ اس لیے ایک بہترین قانون اور قانون دان حاکم عادل کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانی دماغ کا ساختہ پرداختہ قانون اور عام خطا کار حاکم اس ضرورت کو پورا نہیں کرسکتے۔ اس لیے ضرورت ہے قانونِ الٰہی اور کامل انسان کی جو اسے بلا رو رعایت نافذ کر کے اصلاح معاشرہ کرسکے۔ اسی قانون کو دین اور حاکم کو نبی و رسول کہا جاتا ہے۔

انبیاءؑ کی شناخت کا معیار

مذکورہ بالا بیانات سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کسی مدعی نبوت و رسالت کے پہچاننے کا حقیقی معیار یہ ہے کہ جب کوئی شخص دعوائے نبوت و رسالت کرے اور تمام گناہانِ صغیرہ و کبیرہ سے اس کا دامن عصمت پاک و صاف ہو، اور عقائد صحیحہ، اعمالِ صالحہ، اخلاقِ حسنہ کا مالک ہو، اور وہ کوئی نہ کوئی معجزہ بھی رکھتا ہو، جو عقلاً ممکن ہونے کے ساتھ ساتھ محال عادی اور خارقِ عادت ہو۔ جس کا مثل و نظیر لانے سے تمام دنیا والے عاجز و قاصر ہوں، تو اس سے یقین ہو جائے گا کہ وہ شخص منجانب اللہ بھیجا ہوا ہے۔ اور اپنے دعویٰ میں صادق اور راست باز ہے۔ فمن ذلك الطريق فاطلب اليقين بالنبوة۔

اسی طرح صداقت انبیاء معلوم کرنے کے بعض اور طریقے بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ حقیقی انبیاء کی

و السبیل الیه و الادلاء علیه و انهم عیبة علمـه و تراجمة وجبه و ارکان توحیده و انهم معصومون من الخطاء و الزلل و انهم الذین اذهب الله عنهم الرجس و طهرهم تطهیرا و ان لهم المعجزات والدلائل وانهم	اس تک پہنچنے کا راستہ و ذریعہ ہیں ۔ اور اس کی معرفت کے راہبر ہیں ۔ اس کے علم کے خزانہ، اس کی وحی کے ترجمان اوراس کی توحید کے ارکان ہیں ۔ یہ سب بزرگوار خطا سے منزہ، لغزش سے محفوظ اور گناہ سے معصوم ہیں ۔ یہی وہ حضرات ہیں جن سے خدا نے ہر قسم کی نجاست کو دور رکھا ہے ۔ اور ان کو ایسا پاک رکھا ہے جیساکہ پاک رکھنے کا حق ہے ۔ یہ حضرات صاحبِ مُعجزات و دلائل تھے ۔ نیز یہ بزرگوار

پیشانیوں پر خوف وخشیہ اور تقویٰ الٰہی کے انوار ضوء آفتاب کی طرح واضح و آشکار ہوتے ہیں ۔ رشد و ہدایت اور صلاح وفلاح کے آثار ان کے اعضاء وجوارح سے ہویدا ہوتے ہیں اور وہ اربابِ دول اور امراء وسلاطین سے بے تعلّق، تمام شہوات اور لذائذ دنیا سے مُتنفّر ہوتے ہیں ۔ اہل اللہ کے دل خود بخود ان کی طرف مائل ہوتے ہیں ۔ بخلاف اربابِ مکر وتزویر کے کہ ان کے حالات وکوائف ان کے برعکس ہوتے ہیں ۔ وہ امراء وسلاطین کی طرف مائل، لذائذ وشہوات میں مُنہمک اور حبِ دنیا میں مُستغرق ہوتے ہیں ۔ بہرحال صادقین وکاذبین کے صفات وسمات، اقوال وافعال، صورت وسیرت، ظاہر و باطن میں وہی فرق ہوتا ہے جو نور وظلمت اورلیل ونہار میں ہے ۔ کوئی کاذب ومفتری اور مُتنبّی اپنے اصلی عادات وخصائل اوررذائل کو چھپانے کی ہزار کوشش کرے مگر حقیقت ظاہر ہوکر ہی رہتی ہے ۔ ؎

و مهما تکن عند امرءِ من خلیقة و ان خالها تخفی علی الناس تعلم

اسی طرح انبیاء کی پہچان کا ایک آسان طریقہ یہ بھی ہے کہ جب وہ گزشتہ واقعات اور آئندہ آنے والے حوادث و حالات کی خبر دیں تو وہ بات بلاکم و کاست درست ثابت ہو ۔ پیشگوئیوں کی صداقت پیش گوئی کرنے والے شخص کی صداقت کی بین دلیل ہوتی ہے ۔ کیونکہ ان کا علم وہبی ولدنی ہوتا ہے، نہ کسبی واکتسابی اسی طرح سچے مدعی نبوت کی شناخت کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اس کی شریعت کے احکام ومسائل اورعقائد وتعلیمات کو عقلِ سلیم اور فطرتِ صحیحہ کے میزان پر جانچا جائے ۔ اگر اس کی تعلیمات عقلِ سلیم اور فطرتِ صحیحہ کے مطابق ہوں تو اس کی تعلیمات کا مطابق عقل وفطرت ہونا بھی اس کے منجانب اللہ مبعوث ہونے کی دلیل مُتصوّر ہوگی ۔ اسی طرح سابق مُسلّم النّبوّت نبی کا کسی آنے والے بزرگ کی نبوت کا اعلان کرکے اس کا نام ونشان کی معرفی کرانا بھی پہچان کا ایک

امان لاھل الارض کما ان النجوم امان لاھل السماء و مثلھم فی ھذہ الامة کسفینة نوح من رکبھا نجیٰ و کباب حطة و انھم عباد اللہ المکرمون الذین لا یسبقونہ بالقول و ھم بامرہ یعملون نعتقد فیھم

تمام اہل زمین کے لیے اسی طرح باعث امن وامان ہیں جس طرح آسمان والوں کے لیے ستارے باعثِ امان ہیں۔ ان مقدس حضرات کی مثال اس امت میں کشتی نوح کی سی ہے جو اس پر سوار ہو گیا وہ نجات پا گیا۔ نیز ان کی مثال بنی اسرائیل کے باب حطہ کی مانند ہے (جو اس سے داخل ہوا اس کے سابقہ گناہ معاف ہو گئے) یہ سب کے سب خداوند عالم کے ایسے مکرم و معظم بندے ہیں جو کسی بات میں بھی اس کے حکم سے سرمو تجاوز نہیں کرتے اور اسی کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ ہم ان حضرات کے بارے میں یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں

قطعی طریقہ ہے۔ بہرکیف کسی شخص کے دعوائے نبوت کی صداقت معلوم کرنے کا بہترین معیار عصمت اور معجزہ کا وجود ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ اس معیار کو عوام و خواص سب لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ لہٰذا جس دعویدارِ نبوت کا دامن ان دو نعمتوں سے تہی ہو، تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ متنبّی اور مفتری ہے۔

کائناً من کان کما لا یخفی علی اولی الاذھان

معجزہ کی تعریف

لغوی طور پر معجزہ کے معنی ہیں: "عاجز کنندہ" اور اِصطلاحِ متکلمین میں معجزہ خداوندعالم کے اس خارق عادت فعل کا نام ہے جسے وہ اپنے کسی نبی یا اس کے وصی کی صداقت و حقانیت ثابت کرنے کے لیے ان کے ہاتھوں پر ظاہر کرتا ہے۔ بشرطیکہ اس کا ظہور مقرون بالتحدی ہو (دعوائے نبوت و امامت کے ساتھ ہو) لہٰذا اگر ایسا کوئی فعل نبی و امام سے اعلانِ نبوت و امامت سے قبل ظاہر ہو تو اسے اِصطلاحِ متکلمین میں "ارہاص" اور غیر نبی و امام سے لیکن بندہ صالح سے ظاہر ہو تو اسے "کرامت" اور اگر بندہ گنہگار کے ہاتھوں پر ظاہر ہو تو اسے "استدراج" کہا جاتا ہے۔

معجزہ اور سحر میں فرق

عام طور پر یہ شبہ پیش کیا جاتا ہے کہ جو کام ایک نبی مقام اعجاز میں انجام دیتا ہے، وہی کام ایک شعبدہ باز، جادوگر اور مسمریزم جاننے والا شخص بھی انجام دے سکتا ہے۔ لہٰذا معجزہ کیسے دلیل نبوت بن سکتا ہے؟ اس لیے ضروری ہے کہ معجزہ اور جادو کا باہمی فرق یہاں بیان کر دیا جائے۔ سو مخفی نہ رہے کہ

ان حبهم ايمان و بغضهم كفر و ان امرهم امر الله و نهيهم نهى الله وطاعتهم طاعة الله و معصيتهم معصية الله و وليهم ولى الله و عدوهم عدو الله و نعتقد ان الارض لا يخلو من حجة لله على خلقه اما ظاهرا و اما خائفا

کہ ان کی محبّت عین ایمان، اوران سے عداوت کُھلّم کُھلّا کفر ہے۔ ان کا حکم خدا کا حکم، ان کی نہی خدا کی نہی ہے۔ ان کی اطاعت خدا کی اطاعت، اور ان کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے۔ ان کا دوست خدا کا دوست اور ان کا دشمن خدا کا دشمن ہے۔ ہمارا یہ بھی اعتقاد ہے کہ زمین کبھی ایسے شخص سے خالی نہیں رہ سکتی جو مخلوق پر حجّت خدا ہو۔ خواہ وہ ظاہر و مشہور ہو یا مخفی و مستور۔

مُعجزہ اور جادو میں مُتعدّد فرق ہیں۔ یہاں بعض فروق پیش کیے جاتے ہیں۔

فرق اول: مُعجزہ اور جادو میں فرق یہ ہے کہ جادو ایک فن ہے جو پڑھنے پڑھانے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن مُعجزہ تعلیم و تعلّم اور کسب و اکتساب سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

فرق دوم: جادو کا معارضہ و مقابلہ ممکن ہوتا ہے۔ ایک جادوگر دوسرے ساحر کے سحر کو باطل کر سکتا ہے۔ مگر مُعجزہ کا کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اور کوئی شخص اسے باطل نہیں کر سکتا۔ مُعجزہ کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ سب کو عاجز کر دینے والا ہو۔

فرق سوم: جادو مخصوص مادی اسباب و آلاتِ خُفیہ، نیز اوقاتِ مخصوصہ اور شرائط وقواعدِ معینہ کا محتاج ہوتا ہے۔ مگر مُعجزہ میں کسی سبب یا آلہ یا کسی زمان و مکان کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ حسبِ ضرورت ہر وقت اور ہر جگہ اعجاز نمائی کی جا سکتی ہے۔ وہ صرف امرالٰہی سے صادر ہوتا ہے وبس۔

فرق چہارم: مُعجزہ میں حقیقت و واقعیّت ہوتی ہے مگر جادو اور شُعبدہ وغیرہ میں فقط نظر بندی ہوتی ہے۔ کسی شے کی حقیقت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن مُعجزے میں جو انقلاب وتغیّر ظاہر ہوتا ہے وہ فی الحقیقت اصل شے میں رونما بھی ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی نبی و رسول یا امام کسی سنگریزے کو انگور بنا دے تو اس سے پتھر والے خواص سلب ہو جائیں گے اور وہ سنگریزہ فی الحقیقت انگور بن جائے گا۔ کھانے والا اسے انگور ہی محسوس کرے گا۔ مگر جادوگر کنکری کو انگور بنا کر دکھا تو سکتا ہے مگر وہ اسے کھلا نہیں سکتا۔ وہ کنکری کنکری ہی رہے گی۔ حضرت موسیٰؑ نے جب پتھر سے پانی جاری کیا تو یقیناً تمام قوم نے سیر ہو کر پانی پیا تھا۔ جناب ختمی مرتبت ﷺ نے دعوتِ ذوالعشیرہ میں تھوڑے سے کھانے کو بطور اعجاز جب مدعوین کے سامنے پیش کیا تھا

مغمورا و نعتقد ان حجة اللہ فی ارضہ و خلیفتہ فی عبادہ فی زماننا ھذا ھو القائم المنتظر محمد بن الحسن بن علی بن محمد بن علی بن موسی بن جعفر بن محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب علیھم السلام و انہ

ہم یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس وقت زمین میں حجّتِ خدا اور اس زمانہ میں بندوں پر خلیفۂ ہدیٰ حضرت قائم مُنتظر محمد بن حسن بن علی بن محمد بن علی بن موسیٰ بن جعفر بن محمد بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب علیہم السلام ہیں ۔ یہی وہ بزرگوار ہیں

توسب نے سیر ہو کر کھایا تھا۔ مگر جادو میں ایسا ہونا ممکن نہیں ہے ۔ کیونکہ جادو کا اثر فقط نگاہ پر ہوتا ہے ۔ اصل حقیقت شے پر نہیں ہوتا۔

فرق پنجم: مُعجزہ ہمیشہ اخیار و ابرار لوگوں کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے ۔ اور وہ بھی مقرون بالدعویٰ مگر جادو کا اثر فساق و فجار اور اشرار کے ہاتھوں پر ظاہر ہوتا ہے ۔ و بینھما بون بعید ۔

نبی و رسول میں کیا فرق ہے؟

نبی و رسول کے لغوی معانی میں تو کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ مگر ان کے اصطلاحی معنوں میں فی الجملہ فرق ہے۔ اب وہ فرق کیا ہے؟ اس سلسلہ میں مُتعدّد فرق بیان کیے گئے ہیں ۔ عام طور پر کتب کلامیہ میں مشہُور یہ ہے کہ نبی اس برگزیدۂ خدا بندے کو کہا جاتا ہے جو منجانب اللہ ارشاد وتبلیغ کے عہدہ پر مامور ہو جو اگر چہ کوئی نئی شریعت وکتاب نہ رکھتا ہو۔ بلکہ کسی اور صاحبِ شریعت کی شریعت کا مبلغ ہو۔ اور رسول اس برگزیدہ بندۂ خدا، بندے کو کہا جاتا ہے جو منجانب اللہ عہدۂ پیامبری پر فائز ہو اور مستقل شریعت وکتاب بھی رکھتا ہو۔ اس طرح ان کے درمیان باصطلاح اہل منطق عام خاص مُطلق کی نسبت ہے کہ ہر رسول نبی ضرور ہوتا ہے مگر ہر نبی کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ رسول بھی ہو۔ (اوائل المقالات وغیرہ) مگر جو کچھ احادیث اہل بیتؑ نبویؐ سے مُستفاد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ "نبی" وہ ہے جو خواب میں فرشتہ کو دیکھتا ہے اور آواز کو سنتا ہے۔ مگر عالم بیداری میں، بحالت وحی اس کو نہیں دیکھتا، اور "رسول" وہ ہے جو خواب میں فرشتہ کو دیکھتا ہے، آواز کو سنتا ہے اور بیداری میں بھی بحالت وحی فرشتہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اس قسم کی مُتعدّد احادیث اصول کافی وغیرہ کتب مُعتمدہ میں مذکور ہیں۔

انبیاؑء کی تعداد کتنی ہے؟

انبیاءؑ کی تعداد کے سلسلہ میں اخبار و آثار میں قدرے اختلاف ہے ۔ اس لیے اس سلسلہ میں

هو الذی اخبر به النبیؐ عن الله عزوجل باسمه و نسبه و انه هو الذی یملأ الارض قسطاً و عدلا کما ملئت ظلماً و جوراً و انه هو الذی یظهربه دینه لیظهره علی الدین کله ولو کره المشرکون و انه هو الذی یفتح الله علی یدیه

جن کے نام ونسب کی آنحضرتؐ نے خبردی تھی، آپ ہی دنیا کو عدل و انصاف سے اس طرح بھردیں گے جس طرح کہ وہ اس سے پہلے ظلم و جور سے بھرچکی ہوگی۔ آپ ہی وہ مقدس ہستی ہیں جس کے ذریعے سے خداوند عالم اپنے دین کو تمام ادیانِ عالم پر غالب فرمائے گا، اگرچہ مشرک اسے ناپسند ہی کریں۔ خداوند عالم آنجنابؑ کے ہاتھ پر مشرق و مغرب تک تمام روئے زمین کو فتح کردے گا۔

اگرچہ حتمی و یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے، ہاں مشہور بین الفریقین یہی ہے کہ ان کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔ جس طرح متن رسالہ میں مذکور ہے۔ ان میں ایک سو تیرہ حضرات رسول ہیں اور پانچ اولی العزم اور باقی صرف نبی ہیں۔ قرآن مجید میں بالصراحت یعنی نام بنام تو فقط چھبیس نفوس قادسہ کا تذکرہ موجود ہے جن کی نبوت مُسَلَّم ہے۔ باقی کے متعلق قرآن اجمالاً اتنا بیان کرکے خاموش ہوجاتا ہے کہ: "منهم من قصصنا علیك و منهم من لم نقصص علیك" (سورہ مومن: ۷۸) یعنی "بعض انبیاء کا تذکرہ ہم نے کیا ہے اور بعض کا نہیں کیا"۔ اسی طرح قرآن مجید میں کئی مقامات پر وارد ہے کہ خدا کی رشد و ہدایت اور سلسلہ انبیاء کا اجراء کسی خاص قوم و ملک کے ساتھ مختص نہیں ہے، بلکہ تمام اقوام اور ممالک اس سرچشمۂ فیض سے مُستفیض ہوتے رہے ہیں۔ ارشاد فرماتا ہے: "و لکل امة رسول" (سورۃ یونس: ۴۷) ہر ایک قوم کے لیے رسول ہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد فرماتا ہے: "ولقد بعثنا فی کل امة رسولا" (سورۃ نحل: ۳۶) ہم نے ہر قوم کی طرف رسول بھیجا۔ ایک اور جگہ وارد ہے: "و ان من امة الا خلافیها نذیر" (سورۃ فاطر: ۲۴) کوئی ایسی قوم نہیں جس پر ڈرانے والا نہ آیا ہو۔ ایک اور مقام پر یوں مرقوم ہے: "و کم ارسلنا من نبی فی الاولین" (سورۃ زخرف: ۶) ہم نے پہلی قوموں میں کتنے ہی پیغمبر بھیجے۔ ایک اور جگہ فرمایا: "و لکل قوم هاد" (سورۃ رعد: ۷) ہر قوم کے لیے ہادی آیا۔ ان آیاتِ مبارکہ سے اس منصب جلیل کے عہدہ داروں کی کثرت کا اجمالی علم تو ہوجاتا ہے۔ نیز یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ آنحضرتؐ سے پہلے تمام بڑے بڑے ممالک و اقوام میں نبی مبعوث ہوچکے تھے۔ اسی بنا پر بعض علماء کا خیال ہے کہ ہندوستان کے "کرشن" اور "رام چندر" بلکہ ایران کے "زرتشت" بلکہ بعض نے "بدھ" تک کو پیغمبر کہا ہے۔ اگرچہ امکان میں کلام نہیں، لیکن یقین

مشارق الارض و مغاربها حتی لا یبقی فی الارض مکان الا نودی فیه بالاذان و یکون الدین کله لله و انه هو المهدی اخبر به النبیؐ و انه اذا نزل عیسی ابن مریم فصلی خلفه و یکون المصلی اذا صلی خلفه کمن کان مصلیا خلف رسول الله

یہاں تک کہ روئے زمین پر کوئی ایسی جگہ باقی نہ رہے گی جہاں سے اذان کی آواز نہ آئے گی۔ ساری دنیا میں بس خدا کے دین کا ہی ڈنکا بجے گا۔ یہ وہی مہدی موعود ہیں جن کی بطور پیشین گوئی حضرت رسولِ خدا ﷺ نے خبر دی تھی۔ جب آپؑ ظہور فرمائیں گے، اس وقت حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام بھی (آسمان سے) اتریں گے اور ان کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔ آنجنابؑ کے پیچھے نماز پڑھنے والا جنابِ رسولِ خداؐ کے پیچھے نماز پڑھنے والے کی مانند ہوگا۔

کے ساتھ تعیین نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ ایسے امور میں یقین کا ذریعہ وحی ہے، اور وہ اس تشخیص و تعیین سے خاموش ہے۔ (سیرۃ النبیؐ) اور تفصیل میں اگرچہ فی الجملہ اختلاف ہے۔ جیسا کہ اوپر اشارہ ہو چکا ہے۔ مگر مشہور و منصور وہی نظریہ ہے جو متن رسالہ میں مذکور ہے کہ ان کی مجموعی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے جن میں پانچ بزرگوار اولوالعزم ہیں۔ "تلك الرسل فضلنا بعضهم علی بعض"۔ (سورۃ بقرہ: ۲۵۳)

اولوالعزم کا مطلب کیا ہے؟

اس امر کے بارے میں جو کچھ احادیث معصومین علیہم السلام سے مُستفاد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اولوالعزم سے مراد وہ بزرگوار ہیں جو شریعت مستقلہ کے حامل تھے۔ نیز ان میں سے ہر لاحق کی شریعت سابق کی شریعت کی ناسخ تھی۔ اور وہ اپنی دعوت میں صاحبِ عزیمت و استقامت اور اس سلسلہ میں مصائب و شدائد برداشت کرنے میں بہت زیادہ متحمل مزاج اور بلند حوصلہ تھے۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: ① حضرت نوحؑ ② حضرت ابراہیمؑ ③ حضرت موسیٰؑ ④ حضرت عیسیٰؑ اور ⑤ سرکار خاتم الانبیاء علیہ وعلیٰ آلہ افضل التحیۃ والثناء۔ "فشریعة محمد صلی الله علیه و آله لا تنسخ الی یوم القیامة و لا نبی بعده الی یوم القیامة فمن ادعیٰ النبوة بعد نبینا اداعی بعد القرآن بکتاب فدمه مباح لکل من سمع ذلك منه"۔ (علل الشرائع جلد ۱ صفحہ ۱۱۷)

افضلیت رسولِ خداؐ بر جمیع انبیاءؑ

جناب سرکار ختمی مرتبت ﷺ کی تمام انبیاء و مرسلین بلکہ تمام کائناتِ عالم پر افضلیت و اشرفیت

لانه خليفته و نعتقد انه لا يجوز ان يكون القائم غيره بقي في غيبة ما بقي و لو بقي غيبة عمر الدنيا لم يكن القائم غيره لان النبیؐ و الائمة دلوا عليه باسمه و نسبه و به نصوا و به بشروا صلوات الله عليهم اجمعين	کیونکہ وہ جناب رسولِ خداؐ کے خلیفہ اور انؐ کے وصی ہیں۔ ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ آنجنابؑ کے سوا کوئی اور شخص قائم (آلِ محمدؐ) نہیں ہوسکتا۔ اگرچہ مدتِ دراز تک ہی کیوں نہ غائب رہیں۔ بلکہ اگر ان کی غیبت کا سلسلہ زندگانیٔ دنیا تک بھی دراز ہوجائے، تب بھی ان کے علاوہ کوئی اور شخص قائم (آلِ محمدؐ) نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ جناب رسولِ خداؐ اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے ان ہی کا نام و نسب بتایا ہے اور انہی (کی خلافت) پر نص فرمائی ہے۔ اور انہی (کے ظہور) کی بشارت دی ہے۔ صلوات اللہ علیہم اجمعین

امت اسلامیہ کا مُسلّمہ مسئلہ ہے مُسلمان اس عقیدہ کے اثبات کے سلسلہ میں دیگر اربابِ مِلل و مذاہب سے بہت مناظرے کرچکے ہیں۔ اور اس موضوع پر بہت کچھ لکھا بھی جاچکا ہے۔ اور دلائل قاطعہ سے اسے مُحقّق و مبرہن کیا جاچکا ہے۔ یہاں تفصیل میں جانے کی تو گنجائش نہیں ہے، اس لیے اختصار کے ساتھ بعض اجمالی دلائل ذکر کیے جاتے ہیں۔

① دلیل اول: یہ امر اپنے مقام پر پایہ ثبوت تک پہنچ چکا ہے کہ جناب رسالت مآب اور ان کی عترتِ اطیابؑ باعثِ خلقتِ کائنات ہیں۔ جیسا کہ حضرت شیخ صدوق علیہ الرحمہ نے اپنے اسی رسالہ اعتقادیہ میں فرمایا ہے۔ "ان الله خلق الخلق (النبیؐ) و لاهل بيته و لولا هم لما خلق الله آدم و لا حوا و لا الجنة و لا النار و لا الارض و لا السماء و لا شيئا مما خلق صلوات الله عليهم اجمعين"۔ ایسا ہی حضرت علامہ مجلسیؒ نے اپنے رسالہ اعتقادیہ میں افادہ فرمایا ہے کہ: "فهم المقصودون في ايجاد علم الوجود" اور یہی مشہور حدیث قدسی "لولاك لما خلقت الافلاك" کا مفاد ہے۔ پس معلوم ہوا کہ از حوت تا ملکوت اور از عرش یا فرش اور از سماک تا سمک تمام حیوانات و جمادات اور نباتات بلکہ حضرت انسان بلکہ افتخارِ انسانیت انبیاء و مرسلین علیہم السلام کا وجود بھی سرکار محمد و آلِ محمد علیہم السلام کے وجود ذی جود کے طفیل ہے۔ اور ان بزرگواروں کا وجود بالذات مقصود ہے۔ ظاہر ہے کہ مقصود بالذات کو مقصود بالتبع پر افضلیت حاصل ہوتی ہے۔

② دلیل دوم: یہ امر بھی روزِ روشن کی طرح واضح و آشکار ہے کہ خلاقِ عالم نے جس قدر فضائل و محامد اور مناقب و معاجز تمام انبیاءؑ و مرسلینؑ کو فرداً فرداً مرحمت فرمائے تھے، وہ تمام کمالات و مُعجزات

وقد اخرجت هذا الفصل من کتاب الهدایة میں نے اس فصل کو اپنی کتاب ہدایہ سے اخذ کیا ہے۔

مع شے زائد جناب سرور کائنات ﷺ کی ذات مجمع کمالات میں سمیٹ کر ودیعت فرمائے۔ اگر خوفِ طوالت دامنگیر نہ ہوتا تو یہاں بعض انبیاءؑ کے ساتھ جناب کا تقابل کرکے اس امر کو مبرہن کیا جاتا۔ مگر "آنجاکه عیاں است چه حاجت بیاں است" تفصیل کے شائقین کتب مفصلہ مثل بحارالانوار جلد ششم اور کتاب انوارالمواہب حصہ اول وغیرہ کی طرف رجوع کرکے تسکین قلب حاصل کر سکتے ہیں۔ ولنعم ما قیل ؎

حُسنِ یُوسف دمِ عیسٰی یدِ بیضا داری آنچه خوباں همه دارند تو تنها داری

اس امر کا بیان فائدہ سے خالی نہیں ہے کہ خداوند عالم نے انبیاؑء کو جس قدر مُعجزات عطا فرمائے وہ سب انبیاءؑ کے دار دنیا سے تشریف لے جانے کے ساتھ ہی رخصت ہو گئے۔ آج نہ "ید بیضا" ہے نہ "دمِ عیسیٰ" نہ "تسخیر سُلیمانی" ہے نہ "تکلم موسوی"۔ خدائے تعالیٰ نے جہاں ایسے ہزاروں مُعجزات آنحضرت ﷺ کو مرحمت فرمائے وہاں ان کو ایک ایسا مُعجزہ بھی عطا کیا کہ آپؐ کو دنیا سے تشریف لے گئے تقریبًا چودہ سَو سال ہو رہے ہیں مگر وہ مُعجزہ بدستور سابق اب بھی موجود و مشہور ہے۔ اور قیامِ قیامت تک برقرار رہے گا، ان شاء اللہ۔ وہ ہے قرآن مجید۔ جو اس فصاحت وبلاغت اور مطالب ومعانی کی عظمت وبلندی کی وجہ سے مُعجزہ ہے اور روزِ نزول سے اہلِ عالَم کو پکار پکار کر کہہ رہا ہے: "ان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا فاتوا بسورة من مثله" (سورۃ بقرہ:۲۳) بلکہ وہ منکرین رسالت کو یہاں تک تحدی وچیلنج کرتا ہے، اور ان کے جذبات کو ابھارتا ہے کہ: "قل لئن اجتمعت الجن والانس علیٰ ان یاتوا بمثل هذا القراٰن لا یاتون بمثله ولوکان بعضهم لبعض ظهیرا" (سورۃ بنی اسرائیل:۸۸) اس کی تفصیل بعض سابقہ ابواب میں گزر چکی ہے۔

③ دلیل سوم: جناب رسولِ خداؐ تمام عالمین کی طرف مبعوث کیے گئے ہیں۔ تبارك الذی نزل الفرقان علی عبده لیکون للعالمین نذیرا۔ (سورۃ الفرقان:۱) اور سلسلہ انبیاء کو آپ کی ذات بابرکات پر ختم کر دیا گیا ہے۔ اور ان کی شریعت مقدسہ تمام شرائع وادیان سے افضل واکمل ہے اور قیامت تک کے لیے ہے۔ بخلاف باقی انبیاءؑ و مرسلینؑ کے کہ ان کی نبوتیں ورسالتیں محدود ہوا کرتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ جس کی نبوت و رسالت کے حدود زیادہ وسیع ہوں گے اور جس کی شریعت زیادہ مکمل ہوگی، وہ یقینًا دوسرے حضرات سے افضل وبرتر ہوگا۔ کما لا یخفی۔

شریعتؐ اسلامیہ کی بعض خُصُوصیاتؐ

یہاں نہایت اختصار کے ساتھ آپ کی شریعت مقدسہ کی بعض خُصُوصیات پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

① شریعت مقدسہ اسلامیہ کی پہلی اور بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر اعتبار سے مکمل ہے۔ زندگی کا کوئی ایسا شُعبہ نہیں ہے جس کے متعلق اس کے اندر تفصیلی احکام موجود نہ ہوں۔ اسلام کے علاوہ موجودہ ادیانِ عالم میں سے کوئی بھی ایسا دین و مذہب نہیں ہے جسے مکمل ضابطہ حیات و نظامِ زندگی کہا جاسکے۔ یہ اسلام ہی کی خُصُوصیت ہے کہ تمام بنی نوعِ انسان وغیرہ کے لیے ایک مکمل نظامِ حیات پیش کرتا ہے جو اس کے تمام فطری و عقلی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

② دوسری خُصُوصیت دینِ اسلام کی یہ ہے کہ اس میں فقط روحانی ترقی پر ہی زور نہیں دیا گیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مادی ترقی کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ تاکہ دین و دنیا کا صحیح امتزاج ہو اور انسانی زندگی میں اعتدال پیدا ہو، تاکہ نہ تو انسان محض مادیات میں مُبتلا ہو کر حیوانات کے زمرہ میں داخل ہو کر انھیں میں سے ہو، بلکہ ان سے بھی بدتر ہو جائے۔ اور نہ ہی فقط روحانی بن کر ترکِ دنیا کر کے خانہ نشین ہو کر بیٹھ جائے۔ (لا رھبانیۃ فی الاسلام) مگر باقی اَدیان میں بالعموم یہ نقص ہے کہ وہ فقط مادی یا روحانی ایک ہی پہلو پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ کما لا یخفی۔

③ شریعت اسلامیہ کے احکام و مسائل میں اتنی لوچ اور لچک ہے کہ وہ ہر ملک و قوم کے لیے قابلِ عمل اور قابلِ قبول ہیں۔ یہ عالمی اور بین الاقوامی شریعت ہے۔

④ شریعت اسلامیہ اتنی سہل و آسان ہے کہ ہر امیر و غریب، صحیح و بیمار، حاضر و مسافر بآسانی ان پر عمل کر کے راہِ نجات تلاش کر سکتا ہے۔ اس میں ہرگز کوئی عسر و حرج نہیں ہے۔

⑤ اس کی پانچویں خُصُوصیت یہ ہے کہ شریعت مقدسہ اسلامیہ کے تمام احکام فطرتِ صحیحہ کے عین مطابق ہیں۔ کسی جگہ بھی احکامِ شریعت اور احکامِ فطرت کے درمیان تصادم واقع نہیں ہوتا۔

④ دلیل چہارم: فریقین کی کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاؑء کو جناب ختمی مرتبتؐ کی نبوت و رسالت کا اقرار و اعتراف کرنے کے بعد نبوت ملی تھی۔ جیسا کہ آیت مبارکہ: "واسئل من ارسلنا من قبلك من رسلنا" (سورۃ زخرف: ۴۵) کی تفسیر میں وارد ہے۔ (سابع بحار، بصائر اور ینابیع وغیرہا) لہٰذا جب باقی انبیاءؑ کی نبوتیں ہی آنحضرتؐ کی اقرار نبوت کی ممنونِ احسان و مرہونِ منت ہیں تو یقیناً آپ ان سے اشرف و افضل ہوں گے۔

⑤ دلیل پنجم: متعدّد روایات سے ثابت ہے کہ انبیاءؑ و مرسلینؑ نے اپنی مشکلات کے وقت آنحضرتؐ کی ذات والاصفات کے ساتھ توسل کرکے بارگاہِ رب العزت سے اپنے مصائب و آلام کو دور کرایا ہے۔ اس قسم کی بکثرت روایات سابع بحارالانوار و بصائرالدرجات وغیرہ میں موجود ہیں۔ لہٰذا خود انبیاءؑ کا آپؐ کی ذات کے ساتھ توسل کرنا اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ وہ حضرات جانتے تھے کہ آنحضرتؐ ان سے افضل ہیں۔ وھوالمطلوب۔

ختمِ نبوّتؐ

مسئلہ ختم نبوت یعنی یہ کہ سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے بعد کوئی نیا یا پرانا نبی بحیثیت نبی و رسول تشریعی یا غیر تشریعی، ظلی یا بروزی نہیں آسکتا۔ ان مُسلّم الثبوت اسلامی مسائل میں سے ہے کہ جن پر تمام فرقہائے اسلام کا اجماع و اتفاق ہے، بلکہ ان ضروریاتِ دین میں سے ہے جن کا منکر دائرہ اسلام سے خارج متصوّر ہوتا ہے۔ یہاں بڑے ایجاز و اختصار کے ساتھ اس موضوع پر تھوڑا سا تبصرہ کیا جاتا ہے، تاکہ اس اہم مبحث سے ہماری یہ علمی کتاب خالی نہ رہ جائے۔

ختم نبوتؐ قرآن کی روشنی میں

قرآن مجید میں اس قسم کی بکثرت آیات مبارکہ موجود ہیں جو بالصراحت یا بالاشارہ اس مطلب پر دلالت کرتی ہیں۔ ہم اختصار کے پیشِ نظر دو تین آیاتِ مبارکہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

پہلی آیتؐ مبارکہ

ارشادِ قدرت ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (سورۃ الاحزاب: ۴۰)

"محمد ﷺ تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں بلکہ اللہ کے رسول اور تمام نبیوںؑ کے ختم کرنے والے ہیں"۔

تقریب استدلال

یہاں دو چیزیں قابلِ غور ہیں۔ ایک لفظ "خاتم" کی تحقیق، دوسرے لفظ "النبیین" کی تحقیق۔ خاتم کی قرائت میں اختلاف ہے۔ قراء سبعہ میں سے صرف دو قاریوں حسن اور عاصم نے

اسے "خاتَم" (ت کی زبر کے ساتھ) پڑھا ہے۔ باقی تمام قاریوں کے نزدیک "خاتِم" (ت کی زیر کے ساتھ) ہے۔ (ابن جریر جلد ۲۲ صفحہ ۱۱)

لفظ خاتم کی لغوی تحقیق

اگر اس لفظ کو "خاتَم" (ت کی زبر کے ساتھ) پڑھا جائے تو اس کے یہ معانی لغت میں مرقوم ہیں: ① مہر کا نگینہ جس پر نام وغیرہ کندہ ہوتا ہے ② انگوٹھی ③ آخر قوم۔ کہا جاتا ہے: "خاتم القوم ای أخرھم" (قاموس، لسان العرب، المنجد، تاج العروس)

اور اگر اسے "خاتِم" (ت کی زیر کے ساتھ) پڑھا جائے تو اس کا اسم فاعل کے معنوں میں "کسی چیز کا ختم کرنے والا" اس قدر واضح اور روشن مفہوم ہے کہ جس کی تشریح محتاجِ بیان نہیں ہے۔ یہاں حقیقی طور پر پہلے اور دوسرے معنی تو مراد ہو نہیں سکتے۔ لہٰذا تیسرے اور چوتھے معنی کے صحیح تسلیم کر لینے کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ اس اعتبار سے آیت کا مفہوم "آخر النبیین" اور سلسلۂ انبیاء کے ختم کرنے والے ہوتا ہے...... اور اگر مجازاً پہلے اور دوسرے معنی کو مراد لیا جائے تو بھی مطلب یہی نکلتا ہے کہ آنحضرتؐ خدا کے آخری نبی ہیں۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ مہر کسی مطلب کے خاتمہ پر ہی لگائی جاتی ہے۔ جب کسی تحریر کے خاتمہ پر مہر لگ جائے تو اس کے بعد کچھ لکھا نہیں جا سکتا۔ اگر لکھا گیا تو وہ تحریر جعلی تصور کی جائے گی۔ اور جس لفافہ پر لگ جائے اس میں اب کچھ داخل نہیں کیا جا سکتا۔ کما لا یخفی۔

باقی رہی دوسرے لفظ "النبیین" کی تحقیق: "نبیین" لفظ "نبی" کی جمع ہے۔ اس پر تعریف کا الف لام داخل ہے۔ علم اصول عربیت کے علمائے اعلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ الف لام تعریف جب جمع پر داخل ہو، اور وہاں معہود و مخصوص افراد کے لیے کوئی قطعی قرینہ موجود نہ ہو تو یہ عموم و استغراق پر دلالت کرتی ہے۔ لہٰذا "النبیین" سے مراد تمام انبیاءؑ ہوں گے۔ لہٰذا قطع نظر پیغمبر اسلامؐ، صحابہ کرامؓ، تابعین اور ائمۂ طاہرین علیہم السلام کی تصریحاتِ جلیلہ کے صرف لغت عرب کے اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو اس آیتِ مبارکہ سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ آنحضرتؐ سلسلۂ انبیاءؑ کی آخری کڑی ہیں، جن کے بعد کوئی نیا یا پرانا شخص بحیثیت رسول و نبی نہیں آسکتا۔

دوسری آیتِ مبارکہ

ارشادِ قدرت ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا

"آج کے دِن میں نے دِین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور دین اسلام کو تمھارے لیے منتخب کیا ہے۔" (سورۃ المائدہ:۳)

یہ آیت مبارکہ بہ بانگ دُہل پکار کر اعلان کر رہی ہے کہ جس قصر دین کا سنگ بنیاد حضرت آدمؑ نے اپنے دستِ حق پرست سے رکھا تھا اور جس کی تعمیر میں تمام سابقہ انبیاءؑ حصّہ لیتے رہے، اس کی تکمیل حضرت محمدؐ بن عبداللہ نبی خاتم کے ہاتھوں پر ہوگئی۔ اب اس دین کے عقائد، اعمال، اخلاق و آداب اور فرائض و سنن، محرمات و مباحات اور سب احکام حلال و حرام کو کامل مقدس کر دیا گیا۔ "حلال محمد حلال الی یوم القیامة و حرامه حرام الی یوم القیامة" (اصول کافی) لہٰذا جب دین مکمل ہو چکا ہے، سب احکام العباد نازل ہو چکے، بانیٔ اسلامؐ ان کی توضیح و تشریح فرما چکے، قرآن و سنت میں جمیع مایحتاج الیہ الامت کا مفصّل بیان موجود ہے، تو پھر اب کسی نبی کی ضرورت کیا ہے؟

وَمَنۡ يَّبۡتَغِ غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِيۡنًا فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡهُ ۚ وَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۸۵﴾ (سورۃ آلِ عمران:۸۵)

تیسری آیتِ مبارکہ

تَبٰرَكَ الَّذِىۡ نَزَّلَ الۡـفُرۡقَانَ عَلٰى عَبۡدِهٖ لِيَكُوۡنَ لِلۡعٰلَمِيۡنَ نَذِيۡرَا ۙ﴿۱﴾ (سورۃ الفرقان:۱)

"بابرکت ہے وہ خدا جس نے اپنے بندۂ خاص پر قرآن نازل کیا، تاکہ وہ عالمین کے لیے ڈرانے والے قرار پائیں"۔

یہ آیت بعبارۃ النص دلالت کرتی ہے کہ آنحضرتؐ عالمی نبی ہیں۔ ان کی بعثت تمام عالمین کے لیے ہوئی ہے اور آپ کے فیوض و برکات سے تمام عالمین مستفیض ہو رہے ہیں اور یہی آیت مبارکہ "وما ارسلناك الا رحمة للعالمین" (سورۃ الانبیاء:۱۰۷) کا مفاد ہے۔ جب آنحضرتؐ عالمین کے نذیر اور ان کے لیے باعث رحمت ہیں اور نجاتِ دارین و سعادتِ کونین حاصل کرنے کے لیے آپ پر ایمان لانا اور آپ کی اتباع کرنا کافی ہے تو پھر کسی اور نبی کو ماننے کی آخر ضرورت کیا ہے؟ کیا کسی نبی کو بھیجنا عبث کام نہیں؟ کیا خدا کا دامن ربوبیت عبث کاری سے منزہ و مبرا نہیں ہے؟ مالکم کیف تحکمون۔

ختمِ نبوّت احادیثِ خاتم النّبیینؐ کی روشنی میں

اس سلسلہ میں احادیثِ نبویّہ کا اس قدر وافر ذخیرہ موجود ہے کہ جن کے عددِ احصاء کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ ہم یہاں بطور "مُشتے نمونہ از خروارے" دو چار احادیث شریفہ درج کرتے ہیں۔

پہلی حدیث:

آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں: "ان مثلی و مثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنی بیتاً فاحسنه و اجمله الا موضع لبنة من زاویة فجعل الناس یطوفون به و یعجبون له و یقولون هلا وضعت هٰذه اللبنة قال فانا اللبنة و انا خاتم النبیین"

"میرے اور مجھ سے پہلے گزرے ہوئے انبیاءؑ کی مثال اس شخص جیسی ہے جس نے ایک گھر بنایا اور اس کی خوب آرائش و زیبائش کی مگر ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی۔ اب لوگ اس گھر کو دیکھ دیکھ خوش ہوتے ہیں اور اس کی تعریف کرتے وقت کہتے ہیں: یہ اینٹ کیوں نہ لگادی گئی؟۔ فرمایا: وہ (آخری) اینٹ میں ہوں اور میں خاتم الانبیاءؑ ہوں"۔ (بخاری و مسلم جلد ۲ صفحہ ۲۴۸، مسند احمد جلد ۲ صفحہ ۲۹۸ وغیرہ)

اس سے بڑھ کر کس طرح ختم نبوت کے مسئلہ کی وضاحت و صراحت کی جاسکتی ہے؟

دُوسری حدیث:

فرمایا: "لا تقوم الساعة حتی یبعث دجالون کذابون کلھم یزعم انه نبی و انا خاتم النبیین لا نبی بعدی" (سنن ابی داوٗد، ترمذی وغیرہ)

"اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک کئی جھوٹے دجال نہ اٹھائے جائیں، جن میں سے ہر ایک یہ خیال کرتا ہوگا کہ وہ نبی ہے، حالانکہ میں خاتم النّبیینؐ ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے"۔

اس حدیث شریف میں سرکارِ ختمی مرتبت نے وضاحت فرمادی ہے کہ خاتم النّبیینؐ کا مطلب یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا۔ ظاہر ہے کہ اگر آنحضرت ﷺ کے بعد سلسلہ انبیاءؑ جاری و ساری ہوتا تو آنحضرتؐ سابقہ انبیاءؑ کے دستور کے مطابق اس آنے والے نبی کا تعارف کراتے، نہ یہ کہ ہر مُدّعیٔ نبوّت کو دجّال و کذّاب قرار دیتے۔

تیسری حدیث:

فرمایا: "کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء کلما هلك نبی خلفه نبی و انه لا نبی بعدی و سیکون خلفاً" (بخاری جلد ا صفحہ ۴۹، مسلم جلد ۲ صفحہ ۲۴۷، مسند احمد جلد ۲ صفحہ ۲۹۷، ابن ماجہ وغیرہ)

"بنی اسرائیل کا طریقہ یہ تھا کہ ان کی قیادت ان کے نبی کرتے تھے۔ جب ایک نبی کی وفات ہوتی تو اس کی جگہ دوسرا نبی آجاتا۔ لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ البتہ خلیفے ضرور ہوں گے"۔

اس حدیث شریف میں بھی ہر قسم کی تشریعی وغیر تشریعی نبوت کے انسداد کا اعلان کیا گیا ہے۔

چوتھی حدیث:

فرمایا: "لا یبقی بعدی من النبوۃ شئ الا المبشرات قالوا یا رسول اللہ! و ما المبشرات؟ قال الرویا الصالحۃ یراھا المسلم او تریٰ لہ" (کنز العمال، مسند احمد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ)

"میرے بعد نبوّت کا کوئی جزء باقی نہیں رہا، سوائے مُبشرات کے۔ صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مُبشرات کیا ہیں؟ فرمایا: وہ اچھا خواب جو کوئی مُسلمان دیکھے یا اس کے لیے کسی اور کو دکھایا جائے"۔

یہ حدیث شریف بھی اسی مطلب پر نص صریح ہے کہ سوائے اچھے خواب کے باقی سب اجزاء نبوّت ختم ہو چکے ہیں۔

پانچویں حدیث:

آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؑ کے متعلق جنگ تبوک میں فرمایا: "اما ترضی ان تکون منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی" (بخاری، مُسلم باب فضائل الصّحابہ)

"اے علیؑ! تمھیں مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی۔ مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا (ورنہ تم ہارونؑ کی طرح ضرور نبی بھی ہوتے"۔

یہ حدیث مبارک بھی آنحضرت ﷺ کے بعد ہر قسم کی نبوّت کے اختتام و انسداد کی دلیل قاطع ہے۔ جب حضرت علیؑ جیسا نفس رسول بوجہ انسداد باب نبوّت درجہ نبوّت پر فائز نہیں ہو سکتا تو اور کس ماں کا بیٹا ہو سکتا ہے؟

چھٹی حدیث:

فرمایا: "ان الرسالۃ و النبوۃ قد انقطعت فلا رسول بعدی و لا نبی"

"میرے بعد رسالت اور نبوّت کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ اب میرے بعد نہ کوئی رسول آئے گا اور نہ نبی"۔ (ترمذی کتاب الرویا، مسند احمد)

ختمِ نبوّت ارشاداتِ ائمۂ طاہرینؑ کی روشنی میں

اس سلسلہ میں ائمۂ طاہرین علیہم السلام کے بکثرت فرامین موجود ہیں، یہاں صرف تبرکاً دو چار ارشادات پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جاتی ہے۔

① جناب امیرالمومنینؑ نہج البلاغہ (خطبہ دوم) میں ارشاد فرماتے ہیں:

"بعث الله محمدا رسوله لانجاز عدته و تمام نبوته" الخ......

"خداوند عالم نے جنابِ محمّدؐ کو ایفائے عہد اور عہدۂ نبوّت کو تمام کرنے کی خاطر رسول بنا کر بھیجا"۔

② امام محمد باقر علیہ السلام مروی ہے، فرمایا:

"لقد ختم الله بكتابكم الكتب و ختم نبيكم الانبياء" (اصول کافی و وافی)

"خدانے تمھاری کتاب (قرآن) کے ذریعہ کتابوں کو اور تمھارے نبی کے ذریعہ تمام نبیوںؑ کو ختم کر دیا ہے"۔

③ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے، فرمایا:

"ان الله ختم نبيكم النبيين فلا نبي بعده ابدا و ختم بكتابكم الكتب فلا كتاب بعده"

(اصول کافی)

"خداوند عالم نے تمھارے نبی کے ذریعہ تمام نبیوںؑ کو ختم کر دیا ہے۔ اب ان کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا، اور تمھاری کتاب کے ذریعہ تمام کتابوں کو ختم کر دیا، اب اس کے بعد کوئی کتاب نہیں ہے"۔

④ جناب امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا:

"و شريعة محمد صلى الله عليه و اله لا تنسخ الى يوم القيامة و لا نبي بعده الى يوم القيامة فمن ادعى بعده نبوة او اتى بعده بكتاب فدمه مباح لكل من سمع ذالك" (عیون اخبار الرضاؑ)

"جناب رسولِ خداؐ کی شریعت مقدسہ قیامت تک منسوخ نہیں ہوگی، اور نہ ہی قیامت تک آنجنابؐ کے بعد کوئی نبی آئے گا۔ جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد دعوائے نبوّت کرے یا کوئی کتاب لائے تو ہر وہ شخص جو اس کے اس دعوائے باطل کو سنے، اس پر اس مدعی کا خون مباح ہے"۔

ان ارشادات مبارکہ میں بڑے شد و مد کے ساتھ آنحضرت ﷺ پر ہر قسم کی نبوّت کے اختتام کا اعلان کیا گیا ہے۔ اور ہر نئے مدعیٔ نبوّت کو واجب القتل قرار دیا گیا ہے۔ فماذا بعد الحق الا الضلال

ختم نبوّتؐ عقلِ سلیم کی روشنی میں

اگر ہر قسم کے تعصّب و عناد کی پٹی آنکھوں سے اتار کر خداداد عقلِ سلیم کی روشنی میں سوچا جائے تو عقلِ سلیم بھی یہ فیصلہ کرتی ہے کہ اب ہرگز نبی کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ عقل و شرع کی رو سے چار صورتوں میں نبی کے تقرر کی ضرورت درپیش آتی ہے۔

① اول یہ کہ کسی ایسی خاص قوم میں نبی بھیجا جائے جس میں پہلے کوئی نبی نہ آیا ہو۔ اور کسی دوسری قوم میں آئے ہوئے نبی کا پیغام بھی اس تک نہ پہنچا ہو۔

② دوم: سابقہ نبی کی دی ہوئی تعلیم بالکل بھلا دی گئی ہو، یا اس میں اس طرح تحریف کر دی گئی ہو کہ اس کی اتباع ممکن نہ رہی ہو۔

③ سوم: سابقہ نبی کے ذریعہ لوگوں کو مکمل تعلیم و ہدایت نہ ملی ہو۔

④ چہارم: ایک نبی کی امداد و اعانت کے لیے ایک اور نبی کی ضرورت ہو۔

بنظر غائر حالات کا جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان ضرورتوں میں سے کوئی ضرورت بھی سرکار ختمی مرتبت ﷺ کے بعد باقی نہیں رہی ہے۔ قرآن شاہد ہے کہ حضوؐر کو تمام عالمین کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا گیا ہے۔ اور تمدّنِ عالم کی تاریخ بتا رہی ہے کہ آپ کی بعثت کے وقت ہی آپ کی دعوت تمام قوموں تک پہنچ گئی تھی۔ اور اب تک مسلسل پہنچ رہی ہے۔ لہٰذا ہر ہر قوم میں الگ الگ نبی بھیجنے کی حاجت باقی نہیں ہے۔ نیز قرآن مجید اور احادیثِ صحیحہ کی صورت میں آنحضرت ﷺ کی مقدس تعلیمات اپنی صحیح صورت میں موجود ہیں۔ ان میں کسی قسم کی کوئی تغیر و تحریف نہیں ہوئی۔ پھر کسی نبی کی ضرورت کیا ہے؟ نیز یہ بات بھی قرآنی تعلیم کی روشنی میں روزِ روشن کی طرح واضح و آشکار ہے کہ آنحضوؐر کے ذریعہ سے دین کی تکمیل کر دی گئی ہے۔ بنابریں اب تکمیل کے لیے بھی کسی نبی کی احتیاج باقی نہیں ہے۔ باقی رہی چوتھی صورت تو ظاہر ہے کہ اگر اس کے لیے کوئی نبی درکار ہوتا تو وہ حضوؐر کے زمانے میں آپؐ کے ساتھ مقرر کیا جاتا۔ جب اس وقت نہیں ایسا کیا گیا تو اب اس کی کیا ضرورت ہے؟ جب بعثت انبیاءؑ کی یہ چاروں عقلی صورتیں مفقود ہیں تو پھر ہمیں بتایا جائے کہ بعثت نبی کی پانچویں کونسی صورت ہے؟

باقی رہا قوموں کے اخلاق واطوار کا بگاڑ اور اس کی اصلاح، تو صرف اصلاحِ احوال کے لیے نبی کی ضرورت نہیں، بلکہ مخلص مصلحین کی ضرورت ہے۔ اور بفضلہٖ تعالیٰ امتِ مسلمہ میں ایسے متعدد افراد موجود ہیں جو تقریر وتحریر اور وعظ وارشاد کے ذریعہ سے یہ فریضہ بطریق احسن انجام دے رہے ہیں۔

بنابریں حقائق یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ اب کسی نبی کی بعثت امت کے لیے باعث رحمت نہیں بلکہ باعثِ لعنت ہے۔ کیونکہ جب کسی قوم میں نبی آتا ہے تو فوراً کفر وایمان کا سوال پیدا ہوجاتا ہے۔ ماننے والے ایک امت اور نہ ماننے والے دوسری امت قرار پائیں گے۔ اور یہ اختلاف صرف فروعی نہیں بلکہ اصولی ہوگا۔ لہٰذا اس طرح اتحاد واتفاق کی بجائے تفرقہ واختلاف پیدا ہوگا۔ اور پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اس ضلالت وگمراہی کی ذمہ داری خدا اور رسولؐ پر عائد ہوگی کہ اگر آنحضرت ﷺ کے بعد کسی نبی نے آنا تھا، اور اس پر ایمان لانا بھی ضروری تھا تو خدا اور رسولؐ نے اس کے متعلق کیوں خاموشی اختیار فرمائی۔ یہ بات خدا کی حکمتِ بالغہ اور رحمتِ کاملہ سے بالکل بعید ہے کہ وہ اپنے بندوں کو خواہ مخواہ کفر وایمان کی کشمکش میں مبتلا کرے۔ (از رسالہ ختم نبوت)

لہٰذا جب خدا ورسولؐ نے کسی آنے والے نبی کے متعلق کوئی ہدایت نہیں فرمائی بلکہ آنحضرتؐ پر عہدۂ نبوت ورسالت کے اختتام کا اعلان واجب الاذعان فرمایا ہے تو یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ یہ سلسلۂ جلیلہ اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوچکا ہے۔ وھو المطلوب۔

ختمِ نبوّت اجماعِ مسلمین کی روشنی میں

جہاں تک اس مسئلہ پر تمام مکاتیبِ فکر کے ساتھ تعلّق رکھنے والے مسلمانوں کے اتفاق و اجماع کا تعلّق ہے وہ عیاں راچہ بیاں کا مصداق ہے۔ بوجہ شدتِ اختصار اسلامی دنیا کے اکابر علماء کے بیانات شافیہ یہاں پیش نہیں کیے جاسکتے۔

چند شکوک وشبہات کا ازالہ

پہلا شبہ اور اس کا جواب

کہا جاتا ہے کہ "لا نبی بعدی" میں "لا" نفی کمال کے لیے ہے۔ جیسے: "لا صلوٰۃ لجار المسجد الا فی المسجد"۔ "مسجد کے پڑوسی کی نماز نہیں ہوتی مگر مسجد میں"۔ یعنی کامل نہیں ہوتی۔ بنابریں "لا نبی بعدی" کا مطلب یہ ہوگا کہ میرے بعد کوئی کامل نبی نہیں آئے گا۔ اس کا جواب ظاہر ہے کہ یہ "لا" نفی

جنس کے لیے ہے، اس کا حقیقی مفہوم جنس کی نفی ہے۔ اگر کسی جگہ کسی داخلی یا خارجی قرینہ کی وجہ سے نفی کمال میں استعمال ہو تو اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ ہر جگہ یہی مجازی معنی مراد لیے جائیں ۔ ورنہ اسی بنیاد پر کوئی تثلیث یا صنم پرست یہ کہہ دے کہ: "لا الہ الا اللہ" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی کامل معبود نہیں ہے، تو معترض کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟ اسی طرح اگر کوئی منکر قرآن یہ کہہ دے کہ ذلك الكتاب لا ريب فيه میں لانفی کمال کے لیے ہے کہ قرآن میں ریب و شک کامل نہیں ہے۔ یعنی کچھ ناقص اور کمزور قسم کا ریب موجود ہے، تو معترض اس کا کیا جواب دے گا؟ جس دلیل کی بنا پر لا الہ الا اللہ میں "لا" کو نفی کمال کے لیے قرار دینا ممنوع ہے اسی دلیل سے لا نبی بعدی میں بھی ممنوع ہے۔

دُوسرا شبہ اور اس کا جوابؐ

خاتم بمعنی مہر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب جو نبی آئے گا وہ آپ کے زیرنگین ہوگا۔ اور آپ کی مہرتصدیق سے اسے نبوت ملے گی ۔ اس شبہ کی رکاکت محتاجِ بیان نہیں ہے ۔ جب یہ کہا جائے کہ یہ مجسٹریٹ کی مہر ہے یا یہ جج کی مہر ہے تو کوئی صحیح الدماغ آدمی اس کا یہ مطلب لیتا ہے کہ اس مہر کے لگانے سے مجسٹریٹ یا جج بنتے جاتے ہیں؟ ۔ تو یہاں کس طرح یہ مفہوم بیان کیا جاتا ہے ۔ اس معنی کے اعتبار سے جو صحیح مطلب نکلتا ہے اس کو اوپر آیت خاتم النّبیّین کے ذیل میں واضح کر دیا گیا ہے۔

تیسرا شبہ اور اس کا جوابؐ

جب کسی شخص کو خاتم الشعراء یا خاتم الفقہاء کہا جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس شخص کے بعد کوئی شاعر یا فقیہ پیدا نہیں ہوسکتا، بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس فن کے کمالات اس شخص پر ختم ہیں ۔ اس شبہ کا جواب بھی ظاہر ہے کہ اگر کسی جگہ بطور مبالغہ انسانی یہ لفظ کامل یا افضل کے معنی میں استعمال ہو تو اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ لغت کے اعتبار سے لفظ خاتم کے معنی ہی کامل یا افضل ہو جائیں۔ اور اس کے حقیقی معنی (آخری) غلط ہو جائیں ۔ مالكم كيف تحكمون؟

بجز ختمی مرتبتؐ دیگر انبیاءؑ پر ائمہ ہدیٰؑ کی افضلیتؒ

جناب رسولِ خداؐ کی افضلیت پر ابھی اوپر تبصرہ کیا جا چکا ہے ۔ اب یہاں ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی افضلیت پر کچھ تبصرہ کیا جاتا ہے۔ ہمارے علمائے متقدمین کے درمیان افضلیت ائمہؑ بر انبیاءؑ سلف کے بارے میں تین قول تھے ۔ ① پہلا قول: یہ کہ یہ حضرات سوائے جناب ختمی مرتبتؐ کے

دیگر تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل ہیں ۔ ② دوسرا قول یہ کہ انبیاء کرام ائمہ علیہم السلام سے افضل ہیں ۔ ③ تیسرا قول یہ تھا کہ انبیاء کے اولی العزم ان سے افضل ہیں ۔ لیکن دیگر انبیاءؑ سے یہ بزرگوار افضل ہیں ۔ مگر متاخرین علماء اعلام کا پہلے قول پر قریباً اتفاق ہو چکا ہے کہ ائمہ اطہارؑ سوائے جنابِ سرورِ کائنات ﷺ کے دیگر تمام انبیاء اولی العزمؑ وغیرہم سے افضل و اشرف ہیں ۔ اور اس عقیدہ کی صحت پر بکثرت دلائل موجود ہیں ۔ ہم بنظر اختصار ذیل میں چند دلائل کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔

① **دلیل اول:** یہ امر اپنے مقام پر ثابت ہو چکا ہے کہ ائمہ اہل بیتؑ علوم قرآن، نیز رسولِ خدا ﷺ کے علم و فضل کے صحیح وارث و مالک ہیں ، بمطابق آیتِ مبارکہ : "ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا" (سورۃ فاطر : ۳۲) (ینابیع المودۃ ، فرائد السمطین وغیرہ) اور ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کا علم تمام انبیاءؑ و مرسلینؑ کے علم و فضل سے زیادہ اور علومِ قرآنیہ تمام کتبِ سماویہ کے علوم سے افزوں ہیں ۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ معیارِ فضیلت کثرتِ علم مع العمل ہے ۔ "ھل یستوی الذین یعلمون و الذین لا یعلمون" (سورۃ زمر : ۹) بنابریں حضرات ائمہ طاہرینؑ کو انبیاءؑ و مرسلینؑ سابقہ سے افضل و اشرف تسلیم کرنا پڑے گا ۔

② **دلیل دوم:** جناب رسولِ خدا ﷺ کا مشہور ارشاد ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "لولا ان خلق اللہ علیاً لم یکن لابنتی فاطمۃ کفو آدم فمن دونہ" (عیون اخبار الرضاؑ ، ینابیع المودۃ وغیرہ) اگر خداوند عالم علیؑ کو پیدا نہ کرتا تو میری بیٹی فاطمہؑ کا کوئی کفو و ہمسر نہ تھا ۔ خواہ آدمؑ ہوں ، یا دیگر انبیاءؑ ۔ ظاہر ہے کہ جناب رسالت مآبؐ نے رشتۂ ابوت و نبوت سے قطع نظر کر کے یہ ارشاد فرمایا ہے ۔ اس سے روزِ روشن کی طرح واضح ہوتا ہے کہ جناب امیر المؤمنینؑ ان انبیاء کے سلفؑ سے افضل ہیں ۔ اس سے دیگر ائمہ اطہارؑ کی افضلیت بھی ثابت ہو جاتی ہے ۔ "لانھم فی الفضل سواء"

حضرت صادق علیہ السلام نے ابو صباح کنانی سے فرمایا: "یا ابا الصباح انہ لا یجد احد حقیقۃ الایمان حتی یعلم ان لأخرنا ما لاولنا" (سابع بحار الانوار) "اے ابو صباح ! اس وقت تک کوئی شخص حقیقتِ ایمان کو پا ہی نہیں سکتا جب تک وہ یہ یقین حاصل نہ کر لے کہ ہمارے آخری کے لیے وہی فضل و کمال ثابت ہے جو ہمارے پہلے کے لیے ثابت ہے" ۔

③ **دلیل سوم:** یہ دلیل دراصل دلیل دوم کی ہی فرع ہے کہ ائمہ اہل بیتؑ کے علوم و کمالات انبیاءؑ کے علوم و کمالات سے اتم و اکمل ہیں ۔ بکثرت احادیث میں وارد ہے کہ اسم اعظم کے کل تہتر حرف ہیں ۔ جناب آدمؑ کو پچیس حرف عطا ہوئے تھے اور جناب نوحؑ کو پندرہ ، جناب موسیٰؑ کو پانچ حرف اور جناب ابراہیمؑ کو آٹھ حرف اور جناب عیسیٰؑ کو صرف دو حرف ۔ اسی طرح کسی نبی کو ایک حرف اور کسی کو دو ۔

وعلیٰ ہذا القیاس۔ (اور انہی کے ذریعہ سے ان کے کمالات بھی وقوع پذیر ہوتے تھے) لیکن جناب سرورِ کائنات ﷺ کو بہتر حروف مرحمت ہوئے۔ فقط ایک حرف خلّاق عالم نے اپنے علم مخزوں میں رکھا، اور جو اسماء آنحضرتؐ کو عطا ہوئے وہ حضرات ائمۂ معصومین علیہم السلام کی طرف مُنتقل ہوئے۔ (اصول کافی، بحار، بصائر الدرجات وغیرہ) اسی وجہ سے ان کے مُعجزات و کمالات زیادہ ہیں۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ ان کا مقام انبیائے سلف سے بلند تر ہے۔

④ **دلیل چہارم:** جناب ختمی مرتبت ﷺ کی یہ حدیث فریقین کی کتب میں موجود ہے کہ آپ نے فرمایا: "من اراد ان ینظر الی آدم فی علمه والیٰ نوح فی زهده والی ابراهیم فی خلته والی موسیٰ فی هیبته والی عیسیٰ فی تقواه فلینظر الی علی بن ابی طالبؑ"۔ (سنن بیہقی، ینابیع المودۃ وغیرہ) جو شخص چاہتا ہے کہ آدمؑ کا علم وفضل، نوحؑ کا حلم، ابراہیمؑ کی خلت ومحبّت، موسیٰؑ کی ہیبت وجلالت اور حضرت عیسیٰؑ کا تقویٰ و طہارت دیکھے وہ علیؑ بن ابی طالبؑ کو دیکھ لے۔ جس سے افضلیت علیؑ واضح وعیاں ہے۔ کیونکہ جو بزرگوار مُختلف حضرات کے انفرادی کمالات کا جامع ہوگا وہ یقیناً ہر ایک سے افضل واعلیٰ ہوگا۔ اور ابھی اوپر واضح کیا جاچکا ہے کہ سب ائمۂ اہل بیتؑ فضل وکمال میں برابر ہیں۔ (وان کان لعلی مقامه)

⑤ **دلیل پنجم:** بصائرالدرجات، سابع بحارالانوار وغیرہ کتب مُعتبرہ میں اس قسم کی مُتعدّد احادیث موجود ہیں کہ تمام انبیاءؑ کو اس وقت تک نبوّت عطا نہیں ہوئی جب تک کہ انھوں نے خدا کی توحید اور سرورِ کائنات ﷺ کی رسالت کے ساتھ ساتھ ائمۂ طاہرینؑ کی امامت کا اقرار نہیں کیا۔ اسی طرح نام بردہ کتب میں انبیاء کرامؑ کا مُشکلات ومصائب میں ان حضرات قدسی صفات کو بارگاہِ قدرت میں شفیع و وسیلہ بنانا بھی ثابت ہے۔ اس سے بھی ان کی افضلیت ثابت ہوتی ہے۔ ہم اس موضوع پر ایک مفصّل و مدلل مضمون محمدیہ جنتری سرگودھا ۱۹۶۵ء میں لکھ چکے ہیں۔ شائقین تفصیل اس کی طرف رجوع کریں۔

ازالۂ شُبہ

افضلیت ائمۂ بر انبیائے ماسلفؑ کے متعلّق ایک شبہ پیش کیا جاتا ہے کہ انبیاءؑ کے برابر کسی اور کا ثواب نہیں ہوسکتا، لہٰذا کوئی غیر نبی کسی نبیؑ سے افضل بھی نہیں ہوسکتا۔ یہ شبہ بچند وجہ باطل ہے۔

① **اولاً:** یہ مُسلّم ہی نہیں کہ معیار افضلیت کثرتِ ثواب ہے۔ کیونکہ قرآن سے تو معیار افضلیت کثرت علم و طاقت معلُوم ہوتا ہے۔ "ان الله اصطفاه علیکم و زاده بسطة فی العلم و الجسم" (سورۃ البقرہ: ۲۴۷) لہٰذا یہ شبہ "بنا فاسد بر فاسد" کا مصداق ہے۔

② ثانیاً: یہ نظریہ کہ کبھی غیر نبی کا ثواب نبیؑ کے برابر نہیں ہوسکتا۔ خود معترض کی روایات کے خلاف ہے۔ ان کی بکثرت روایات سے غیر انبیاء کے ثواب انبیاءؑ سے زیادہ مرقوم ہیں۔ چنانچہ احیاء العلوم میں مرقوم ہے: "روی عن ابن مسعود من طلب العلم لیحدث الناس ابتغاء وجه الله اتاه الله اجر سبعین نبیا"۔ جو شخص اس غرض سے علم حاصل کرے کہ خدا کی خوشنودی کے لیے لوگوں کو حدیثیں سنائے تو خدا اسے ستر نبیوںؑ کا اجر و ثواب عطا کرے گا۔

شیخ عبد القادر جیلانی اپنی کتاب "غُنیۃُ الطالبین" میں لکھتے ہیں: "من تعلم بابا من العلم لیعلم الناس اعطی ثواب سبعین نبیا و صدیقا" جو شخص علم کا کوئی باب اس مقصد کے تحت حاصل کرے کہ لوگوں کو علم پڑھائے گا، تو خداوند عالم اسے ستر نبیوںؑ اور صدیقینؑ کا ثواب عطا کرے گا۔ پس جب بنا بر روایاتِ اہل سنت بعض عام افراد امت کا اجر و ثواب ستر ستر انبیاءؑ کے برابر ہوسکتا ہے تو ائمہؑ اہل بیتؑ کی افضلیت پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ جو صرف ساداتِ امت ہی نہیں بلکہ خیر البریہ ہیں۔

③ ثالثاً: بنا بر تسلیم آنکہ غیر نبی کا ثواب نبیؑ کے برابر نہیں ہوسکتا، یہ حکم نبیؑ اور اس کی امت کے لوگوں کے ساتھ مختص ہے۔ مطلب یہ کہ نبیؑ جن لوگوں کا نبیؑ ہے وہ ان سب سے ضرور افضل ہوگا۔ اس حکم میں عمومیت نہیں ہے۔ لہٰذا چونکہ حضرات ائمہؑ معصومینؑ ان انبیاء کے ماسلفؑ کی امت میں داخل نہیں ہیں، لہٰذا ان کا اجر و ثواب گزشتہ انبیاءؑ سے زائد ہو۔ اور اس قاعدہ کی رو سے بھی وہ ان سے افضل ہوں، تو اس میں کوئی جائے تعجب نہیں ہے۔

ائمہؑ اہلؑ بیتؑ کی امامتؑ و خلافتؑ کا اثباتؑ

ائمہؑ اہل بیت علیہم السلام کی خلافت و امامت کی نصوص اس قدر کثیر التعداد ہیں کہ ان سب کے لیے ایک ضخیم جلد بھی ناکافی ہے۔ علماء اعلام نے اس سلسلہ میں عربی، فارسی اور اُردو وغیرہ میں بہت سی کتب لکھی ہیں۔ ہم نے بھی اس موضوع پر دو کتابیں بنام: ① "تحقیقات الفریقین فی حدیث الثقلین" ② "اثباتُ الامامۃ الائمۃ الاطہارؑ فی ضوء العقل و الآیات و الاخبار" لکھی ہیں۔ جن میں ان نصوص مبارکہ کا کافی ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے اور عقلی و نقلی ادلہ قاطعہ و براہین ساطعہ سے مخالفین اہل بیتؑ کی خلافت کو باطل کر کے ائمہؑ اہل بیتؑ کی خلافت و وصایت کو ثابت کیا گیا ہے۔ یہاں اس موضوع پر کچھ تفصیلی تبصرہ کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس مطلب کی تحقیق کو ہم اپنی نام بردہ کتب کے حوالہ کرتے ہیں۔ اب جب کہ "احسن الفوائد" طبع ثانی کے لیے پریس میں بھیجی جا رہی ہے، "اثباتُ الامامت" طبع

ہو کر اہلِ ایمان کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے۔ والحمد للہ۔ ہاں محض اس خیال سے کہ یہ کتاب مُستطاب بھی نصوصِ امامت ائمہؑ سے بالکل خالی نہ رہ جائے محض تبرکاً و تیمناً دو آیات اور دو روایات لکھ کر مختصر طور پر ان کی تقریبِ اِستدلال پیش کی جاتی ہے۔

پہلی آیتِ مبارکہ

ارشادِ قدرت ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ (سورۃ النساء: ۵۹)

اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان ذوات کی جو تم میں سے صاحبانِ امر ہیں۔

یہ امر اپنے مقام پر پایۂ ثبوت تک پہنچ چکا ہے کہ صیغۂ امر وجوب میں حقیقت ہے۔ جب تک استحباب کا کوئی قرینہ موجود نہ ہو، اسے وجوب پر ہی محمول کیا جاتا ہے۔ بنا بریں یہاں اسے وجوب پر حمل کرنے کے لیے اگرچہ استحباب کے قرینہ کا نہ ہونا ہی کافی تھا، چہ جائیکہ یہاں تو خود وجوب پر قطعی قرینہ موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا و رسولؐ کی اطاعت بالاتفاق واجب ہے اور چونکہ اطاعتِ اولی الامر بھی اطاعت خدا و رسولؐ کے ساتھ مقرون ہے، لہٰذا وہ بھی واجب و لازم ہی ہوگی۔ نیز یہ حقیقت ظاہر ہے کہ اطاعتِ خدا و رسولؐ کسی خاص زمان و مکان کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ ہر زمان و ہر مکان اور ہر حال میں ہر مکلف پر واجب ہے، اسی طرح اطاعت اولی الامر بھی ہر زمان و ہر مکان اور ہر حال میں ہر شخص پر لازم ہوگی۔ یہ امر بھی محتاجِ دلیل نہیں ہے کہ جس بزرگوار کی اس طرح اطاعت مُطلقہ واجب ہو، اس کے لیے معصوم ہونا ضروری ہے۔ اس حقیقت کا فخر الدین رازی جیسے امام المتکلمین نے بھی اقرار کیا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی تفسیر کبیر جلد ۲ صفحہ ۳۵۷ طبع اسلامبول پر رقمطراز ہیں: "ان اللہ تعالیٰ امر بطاعۃ اولی الامر علی سبیل الجزم فی ھذہ الآیۃ و من امر اللہ بطاعتہ علی سبیل الجزم و القطع لا بد و ان یکون معصوماً عن الخطاء"۔ یعنی خداوند عالم نے اس آیتِ مبارکہ میں وجوبی طور پر اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ اور جس کی اطاعت وجوبیہ کا خداوند عالم حکم دے اس کے لیے معصوم عن الخطاء ہونا ضروری ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں واضح ہو گیا کہ اولی الامر کو مثل رسولؐ عصمت و طہارت کے درجہ رفیعہ پر فائز ہونا چاہیے اور یہ امر روزِ روشن کی طرح واضح و آشکار ہے کہ امت محمدیہ میں سوائے ائمۂ اہلِ بیت

علیہم السلام کے اور کوئی بھی شخص معصوم و مطہر نہیں ہے۔ ہاں ان ذواتِ مقدسہ کی عصمت وطہارت قرآن کریم، احادیث سیّد المرسلینؐ اور عقل سلیم کی روشنی میں مُحقّق و مُسلّم ہے۔ قطع نظر دیگر آیاتِ قرآنیہ کے صرف آیتِ تطہیر (سورۃ الاحزاب:۳۳) ہی اس مقصد کے اثبات کے لیے کافی ہے۔ (ملاحظہ ہوں: صحیح مُسلم جلد۲ صفحہ ۲۵۸، الشرف المؤید صفحہ ۶ و ۷، درمنثور جلد ۵ صفحہ ۱۹۸، صواعق محرقہ صفحہ ۱۴۱، ینابیع المودۃ صفحہ ۲۴۵ طبع بمبئی وغیرہ)

اور جہاں تک احادیث کا تعلق ہے وہ بھی بکثرت ہیں۔ صرف بطور نمونہ ایک حدیث ملاحظہ ہو۔ ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں: "سمعت رسول اللهؐ یقول انا وعلی و الحسن و الحسین و تسعة من ولد الحسین مطهرون معصومون"۔ "میں نے آنحضرتؐ کو فرماتے ہوئے سنا کہ میں اور علیؑ اور حسنؑ اور حسینؑ اور حسینؑ کے نو فرزند سب کے سب مطہر اور معصوم ہیں۔ (فرائد السمطین جلد۲ باب ۳۱، ینابیع المودۃ باب ۷۷ صفحہ ۴۷۷) لہٰذا وہ بزرگوار اولوالامر کے مصداق ہوں گے۔ ان مقدمات کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اس آیۂ وافی ہدایہ کی ائمۂ اہلِ بیتؑ کی خلافت و امامت پر دلالت محتاجِ بیان نہیں رہتی۔ معمولی عقل و دانش رکھنے والا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ جس بزرگ کی اطاعت مُطلقہ واجب و لازم ہو، وہ یا نبی ہو سکتا ہے یا اس کا وصی۔ لیکن چونکہ اولوالامر نبی تو ہیں نہیں، لہٰذا ماننا پڑے گا کہ وہ اوصیاء نبی ہیں۔ و هو المقصود۔

دوسری آیتِ مبارکہ:

ارشادِ رب العزت ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ (سورۃ التوبۃ:۱۱۹)

اے ایمان والو! خدا سے ڈرو، اور صادقین کی معیّت اختیار کرو۔

امامتِ اہلِ بیتؑ پر اس آیت مبارکہ کی دلالت کو واضح کرنے کے لیے چند امور کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

① اول یہ کہ ابھی اوپر بیان ہو چکا ہے کہ صیغہ امر وجوب میں حقیقت ہے۔ بنا بریں جس طرح تقویٰ الٰہی اختیار کرنا واجب ہے اسی طرح صادقین کی معیّت اختیار کرنا بھی لازم ہوگی۔

② دوم یہ کہ چونکہ شریعت مقدسہ اسلامیہ کسی خاص ملک و ملت اور کسی خاص مکان و زمان کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ یوم قیامت تک تمام بنی نوع انس و جن کی صلاح و فلاح کی کفیل ہے۔ لہٰذا

اس کے اوامر ونواہی بھی قیامت تک کے لیے تمام جنّ وانس کو شامل ہوں گے اور صادقین کی معیّت اختیار کرنے کے حکم کے دائرہ میں تمام لوگ داخل ہوں گے۔

③ سوم یہ کہ عقلِ سلیم یہ حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ جن افراد کو یہ حکم دیا جارہا ہے وہ اور ہیں اور جن کی معیّت اختیار کرنے کا ارشاد ہورہا ہے وہ صادقین اور ہیں۔ ورنہ تابع و متبوع کا اِتّحاد لازم آئے گا جو بداہتہً باطل ہے۔

④ چہارم یہ کہ اربابِ دانش پر یہ امر مخفی و مستور نہیں ہے کہ اس معیّت سے مراد معیّت مکانیہ نہیں ہے کہ تمام اطراف واکناف سے تمام مُسلمان اپنے آپ کو صادقین تک پہنچائیں۔ اور ہر وقت ان کے ہمراہ رہیں، جو کہ تکلیف مالایطاق ہونے کی وجہ سے محض غلط ہے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ اس معیّت سے مراد معیّت روحانیہ یعنی معیّت فی القول والعمل ہے۔ یعنی تمام مُسلمانوں پر واجب ہے کہ اعتقاد و عمل میں صادقین کی اتباع کریں۔

⑤ پنجم یہ کہ اس سے یہ بھی مُستفاد ہوتا ہے کہ قیامِ قیامت تک ہر دور و ہر زمانہ میں صادقین میں سے کسی نہ کسی فرد فرید کا وجود ضروری ہے۔ تا کہ اہلِ ایمان اس کی معیّت اختیار کر کے نجات دارین حاصل کرسکیں۔ جیسا کہ مشہُور حدیث "من مات ولم یعرف امام زمانه مات میتة جاهلیة" بھی اس مطلب پر دلالت کرتی ہے۔

⑥ ششم یہ کہ جب معیّت سے مراد اعتقاد و عمل میں اتباع و پیروی کرنا مراد ہے تو ماننا پڑے گا کہ صادقین کو ہر صغیرہ و کبیرہ گناہ سے مطہر و معصوم ہونا چاہیے۔ جیسا کہ آیت بالا کے ضمن میں بیان کیا جا چکا ہے۔

⑦ ہفتم یہ کہ قطع نظر دیگر ادلہ و براہین کے اسی آیت کے الفاظ بتاتے ہیں کہ حقیقی صادقین وہی ہوں گے جو معصوم ہوں گے۔ کیونکہ علیٰ الاطلاق صادق وہی کہلاسکتا ہے جو اول عمر سے لے کر آ کر عمر تک عمداً و سہواً ہر قولی و فعلی کذب سے محفوظ و مصوٗن رہا ہو۔ اور ایسا شخص معصوم ہی ہوسکتا ہے اور نہ ہی کسی نے اس امر کا ادعا کیا ہے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ صادقین کے مصداق ائمۂ اہل بیت علیہم السلام ہی ہوسکتے ہیں۔

⑧ ہشتم یہ کہ اگر اب تک بھی تسلی نہ ہوئی ہو تو بعض تصریحات ملاحظہ ہوں۔

☆ تفسیر درمنثور جلد ۳ صفحہ ۲۹۱ پر جناب ابن عباس سے "کونوا مع الصادقین" کی تفسیر "کونوا مع علیؑ بن ابی طالبؑ" مروی ہے۔

☆ ینابیع المودۃ میں اس کی تفسیر میں لکھا ہے: "الصادقون فی ھذہ محمد صلی اللہ علیہ و سلم واھل بیتہ"۔

☆ مناقب خوارزمی میں (علیٰ ما نقل عنہ) اس کی تفسیر یوں مروی ہے: "الصادقون ھم الائمۃ من اھل البیت"۔

☆ اور کتاب فرائد السمطین حموینی مخطوط باب ۶۸ میں "کونوا مع الصادقین" کی تفسیر اس طرح لکھی ہے: "کونوا مع آل محمد صلی اللہ علیہ و آلہ"۔

ان حقائق کی روشنی میں کالشمس فی رابعۃ النہار واضح و آشکار ہو گیا کہ "صادقین" سے مراد ائمۂ اہل بیتؑ ہی ہیں۔

⑨ نہم یہ کہ اطاعتِ مُطلقہ کا حکم دیا گیا ہے اور یہ حقیقت محتاجِ بیان نہیں ہے کہ جس کی اس طرح اتباع واجب و لازم ہو وہ نبی یا امام ہی ہو سکتا ہے۔ مگر چونکہ یہ بزرگوار نبی تو ہیں نہیں، لہٰذا ان کو لامحالہ امام خلق و خلیفہ مُطلق تسلیم کرنا پڑے گا۔

پہلی روایت

حسب الوعدہ ہم پیغمبر اسلام ﷺ کی ان بے شمار احادیث میں سے جو امامت ائمۂ اطہارؑ پر دلالت کرتی ہیں، بنظر اختصار یہاں صرف دو حدیثیں پیش کرتے ہیں۔ پہلی حدیث وہ ہے جو مُتفق علیہ بین الفریقین ہے۔ اور حدیث ثقلین کے نام سے مشہور ہے کہ جناب پیغمبر اسلام ﷺ نے کئی بار اور بالخصوص اپنے آخری لمحاتِ حیات میں مجمع اصحاب کو خطاب کر کے فرمایا:

"انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی اھل بیتی ما ان تمسکتم بھما لن تضلوا بعدی و انھما لن یفترقا حتی یردا علیّ الحوض" (حدیث نبویؐ متواتر)

اے مُسلمانو! میں تمہاری رشد و ہدایت کے لیے دو گراں قدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب دوسری اپنی عترت اہل بیتؑ۔ جب تک تم ان دونوں کے دامن کے ساتھ متمسک رہو گے، ہرگز میرے بعد گمراہ نہ ہو گے اور یہ دونوں بھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے، یہاں تک کہ حوضِ کوثر پر میرے پاس پہنچ جائیں۔

اس حدیث کی مکمل تشریح و توضیح اس کے تواتر کے اثبات، مصداق عترت اہل بیتؑ کی تعیین اور ائمہ اہل بیتؑ کی خلافت بلافصل پر اس کی وجہ دلالت کی تبیین کے لیے تو ایک دفتر درکار ہے۔ اس کے لیے ہماری کتاب "تحقیقات الفریقین فی حدیث الثقلین" قابلِ دید ہے۔ یہاں فقط دو چار جملوں پر

اکتفا کی جاتی ہے۔ ہر صاحب دانش و بینش جانتا ہے کہ کسی بھی ملکی نظام کو بطریقِ احسن چلانے اور باقی رکھنے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ اس کا ایک جامع دستور العمل اور قانون موجود ہو۔ دوم یہ کہ اس کے نافذ کرنے اور اس کی تشریح و توضیح کرنے والے مخصوص کامل العلم و العمل افراد موجود ہوں۔

اسی طرح جناب ختمی مرتبت ﷺ نے بھی اپنے بعد نظام دینی کو برقرار رکھنے کے لیے دو چیزیں چھوڑی ہیں۔ قرآن دین کا دستور العمل اور قانون ہے اور ائمہ اہل بیتؑ اس کے شارح اور نافذ کرنے والے ہیں۔ اور یہی بات اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ یہی حضرات مسند رسولؐ کے وارث ہیں اور انؐ کے منصب پر ان کے قائم مقام ہیں۔ جنھیں اصطلاحِ شریعت میں خلیفہ و امام کہا جاتا ہے۔ و ھو اوضح من ان یخفی۔

دوسری روایت شریفہ

کتاب کفایۃ الاثر، ینابیع المودۃ وغیرہ میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے روایت ہے، وہ بیان فرماتے ہیں کہ جب آیت مبارکہ اولی الامر نازل ہوئی تو میں نے بارگاہِ نبوی میں عرض کیا:

یا رسول اللہ! عرفنا اللہ و رسولہ فمن اولوا الامر الذین قرن اللہ طاعتہم بطاعتك؟

یارسول اللہ! ہم نے اللہ اور اس کے رسولؐ کو تو پہچان لیا ہے۔ مگر یہ اولوا الامر کون ہیں، جن کی اطاعت کو خداوند عالم نے اپنی اطاعت کے ساتھ مقرون کیا ہے۔

فقال رسول اللہؐ: ھم خلفائی یا جابر و ائمۃ المسلمین بعدی اولھم علی بن ابی طالب ثم الحسن ثم الحسین ثم علی بن الحسین ثم محمد بن علی المعروف فی التوراۃ بالباقر و تدرکہ یا جابر فاذا لقیتہ فاقراہ منی السلام ثم الصادق جعفر بن محمد ثم موسی بن جعفر ثم علی بن موسی ثم محمد بن علی ثم علی بن محمد ثم حسن بن علی ثم سمی و کنی حجۃ اللہ فی ارضہ و بقیتہ فی عبادہ ابن الحسن بن علی ذاك الذین یفتح اللہ علی یدیہ مشارق الارض و مغاربھا

اس حدیث کا مطلب اس قدر واضح و آشکار ہے کہ ترجمہ کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ پس جب سرکار ختمی مرتبتؐ نے اپنے حقیقی خلفاء و اوصیاء کی نام بنام معرفی کرا دی ہے تو اب بھی ان کی خلافت و امامت کا اقرار و اعتراف نہ کرنا "فما ذا بعد الحق الا الضلال" کا مصداق ہی ہو سکتا ہے۔

عقیدۂ مہدیؑ کا اتفاقی ہونا

جہاں تک تاریخ مذاہب وادیانِ عالم کے مطالعہ کا تعلق ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب یہود ہو یا نصاریٰ، ہندو ہو یا زرتشت وغیرہ، غرضیکہ تمام مذاہب و ادیان میں کسی نہ کسی رنگ میں ایک مصلح اعظم کے آنے کا تخیل موجود ہے۔ بالخصوص اہل اسلام کا تو حضرت مہدیؑ کے ظہور پر اتفاق ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ اس کی بعض خصوصیات میں قدرے اختلاف ہے۔ عقل سلیم بھی یہی فیصلہ کرتی ہے کہ جس مذہب کی بنیاد ہی خدا کی قدرت اور عدالت پر ہے، بایں ہمہ دنیا میں ظلم وجور، باطل پرستی اور ناحق کوشی کا دور دورہ ہے۔ اس لیے اسی دنیا میں ایک ایسا دور ضرور آنا چاہیے جس میں صفحہ عالم سے ظلم وجور حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے اور عدل وانصاف کا دور دورہ ہو۔ یہ مقصد آنجنابؑ کے ظہور کے وقت ہی کما حقہ پورا ہو سکتا ہے، جیسا کہ نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ہے: "لولم یبق من الدنیا الا یوم واحد لطول الله ذلك الیوم حتی یبعث رجل من اهل بیتی اسمه اسمی یملا الارض قسطا و عدلا کما ملئت ظلما و جورا"۔ (ترمذی، مشکوٰۃ المصابیح، ابوداؤد، ینابیع المودۃ، وغیرہ) "اگر عمر دُنیا کا فقط ایک ہی دن باقی رہ جائے تو خداوند عالم اسے اس قدر دراز کر دے گا کہ میرے اہل بیتؑ میں سے ایک شخص مبعوث ہو جو میرا ہمنام ہو گا جو زمین کو عدل وانصاف سے اس طرح بھر دے گا جس طرح وہ پہلے ظلم وجور سے بھر چکی ہوگی"۔

دنیا کو ہے اس مہدی برحق کی ضرورت ہو جس کی نگہ زلزلہ عالم افکار

چونکہ جناب رسالت مآبؐ علمِ نبوّت سے جانتے تھے کہ دنیا میں کئی جھوٹے مُدّعیانِ مہدویّت پیدا ہوں گے، لہٰذا ان کا فرضِ منصبی تھا کہ حضرت مہدیٔ دَوران کی معرفی کرانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں، ورنہ جھوٹے مُدّعیوں کے دامِ تزویر میں پھنسنے والوں کی ضلالت وگمراہی کی ذمہ داری خود آنحضرتؐ پر عائد ہوتی۔ (معاذ اللہ) اس لیے انھوں نے جناب مہدی کی ذات و صفات اور شکل وشمائل وغیرہ تمام متعلقہ اُمور تفصیل کے ساتھ بیان کر دیے، تاکہ اتمام حجّت میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ "لیهلك من هلك عن بینة و یحیی من حی عن بینة"۔

حضرتؑ مہدیؑ اہل بیتِؑ رسولؐ سے ہوں گے

آنجنابؑ کس خاندان سے ہوں گے؟ اس سلسلہ میں آنحضرتؐ فرماتے ہیں: "المهدی من عترتی من ولد فاطمة"۔ (ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۱۰۸۳ مع ترجمہ اردو، ہکذا فی سنن ابن ماجہ جلد ۳ صفحہ ۳۴۶)

"مہدیؑ میری عترتِ طاہرہ اولادِ فاطمہ زہرؑا میں سے ہوگا"۔ "المھدی منا اھل البیت" (صواعق محرقہ صفحہ ۱۴۱) "مہدی ہم اہلِ بیتؑ میں سے ہوگا"۔ جناب سلمان فارسی (محمدیؓ) روایت کرتے ہیں کہ جناب رسولِ خدؐا نے فرمایا: "المھدی من اھل بیتی" ۔ "مہدیؑ میری اہل بیتؑ سے ہوگا"۔ اس وقت شہزادہ ہائے کونین جناب امام حسنؑ وحسینؑ بھی موجود تھے۔ میں نے عرض کی: "ای ولدیك ھذین" یارسول اللہ! آپ کے ان دونوں صاحبزادوں میں سے کس کی نسل سے ہوگا؟ آنجنابؐ نے امام حسینؑ کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: "من ولدی ھذا" ۔ "میرے اس بیٹے کی اولاد میں سے"۔ (ینابیع المودۃ جلد ۲ باب ۹۴ صفحہ ۲۱۶ طبع ایران) اسی حدیث شریف سے متنبی قادیان کے اس دعویٰ کا بطلان بھی واضح و عیاں ہوجاتا ہے جو انھوں نے اولادِ سلمانؓ سے ہونے کے ادعا پر اپنے مہدی موعود ہونے کے متعلق کیا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ ان کے اس دعویٰ میں کہاں تک صداقت ہے کہ وہ نسل جناب سلمانؓ سے ہیں۔ جو کہ بظاہر بالکل بلادلیل دعویٰ ہے۔ کجا مغل مرزا، اور کجا خاندانِ سلمانؓ فارسی۔ بہرحال اگر بالفرض اسے صحیح بھی تسلیم کرلیا جائے تو ابھی اس سے ان کی مہدویّت ہرگز ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ جب حضرت سلمانؓ خود راوی ہیں کہ سرکارِ ختمی مرتبتؐ نے فرمایا کہ "مہدی میری ذرّیت اور اولادِ حسینؑ سے ہوگا" تو اس کے بعد اولادِ سلمان کو مہدی ہونے سے کیا رابطہ وتعلّق باقی رہ جاتا ہے؟

حضرتؑ مہدیؑ کے شکل وشمائل

آنجنابؑ کے خصائل وشمائل کیا ہوں گے، اور شکل وصورت کیسی ہوگی؟ اس سلسلہ میں آنجنابؐ فرماتے ہیں کہ:

"الھدی رجل من ولدی لونہ لون عربی و جسمہ جسم اسرائیلی علی خدہ خال کانہ کوکب دری یملأ الارض عدلا کما ملئت ظلما یرضی فی خلافتہ اھل الارض و اھل السماء والطیر فی الھواء" (بحار الانوار جلد ۱۳ صفحہ ۲۲، ینابیع المودۃ جلد ۲ صفحہ ۱۷۹)

"مہدی میری اولاد میں سے ہوگا۔ اس کا رنگ عربی اور جسم اسرائیلی ہے۔ اس کے داہنے رخسار پر ایک خال ہے جو درخشندہ ستارہ کی طرح چمکتا ہے۔ وہ زمین کو عدل و انصاف سے اس طرح بھر دے گا جس طرح وہ ظلم وجور سے بھر چکی ہوگی۔ ان کی خلافت میں زمین والے زمین پر اور آسمان والے آسمان پر حتی کہ پرندے ہوا میں خوش ہوں گے"۔

علاوہ دیگر ادلّہ و براہین کے یہی امور جھوٹے مُدّعیانِ مہدویّت جیسے مرزائے باب و بہاء اور مرزائے قادیان وغیرہم کے دعووں کے باطل کرنے کے لیے کافی ہیں۔ کیونکہ نہ تو ان کی شکل وصورت آنجنابؑ سے ملتی ہے اور نہ ان کے عہد میں عدل وانصاف کا دور دورہ ہوا ہے، بلکہ روز بروز ظلم وستم میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ کما لایخفی۔ بایں ہمہ ان حضرات کو مہدی موعود قرار دینا "برعکس نہند نامِ زنگی کافور" کا مصداق نہیں تو اور کیا ہے؟

حضرت مہدیؑ کی ولادت باسعادت

اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اگرچہ عقیدۂ ظہور مہدیؑ پر تمام مُسلمانوں کا اتفاق ہے مگر بعض جزئی اختلافات موجود ہیں۔ منجملہ ان اختلافات کے ایک یہ بھی ہے کہ آیا آنجنابؑ کی ولادت باسعادت ہو چکی ہے یا آخری زمانہ میں ظہور کے قریب آنجنابؑ متولّد ہوں گے؟ چنانچہ تمام شیعہ خیر البریہ اور بعض علماء اعلام اہل سنت اس امر کے قائل ہیں کہ آپ کی ولادت باسعادت نیمہ شعبان المعظم ۲۵۵ھ میں بمقام سرمن رائے (سامراء) میں واقع ہوئی۔ مگر جمہور اہل سنت کا خیال یہ ہے کہ ان کی ولادت آخری زمانہ میں واقع ہوگی۔ ہم یہاں ان بعض علماء اہل سنت کے نام مع ان کی کتب کے ذکر کرتے ہیں جنھوں نے آنجنابؑ کی ولادت ۲۵۵ھ میں تسلیم کی ہے۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۱ صفحہ ۹۳، جلد ۲ صفحہ ۴۹۰، اسعاف الراغبین مطبوعہ بر حاشیہ نور الابصار صفحہ ۱۰۴، ۱۱۶، شواہد النّبوۃ جامی صفحہ ۲۱۳، فصول مُہمّہ ابن صباغ مالکی، ینابیع المودۃ جلد ۱ صفحہ ۱۸۲ وغیرہ۔ بلکہ بعض مُنصف مزاج علمائے اہل سنت نے تو آنجناب کے حالات پر مستقل کتب تالیف کی ہیں۔ جیسے کتاب البیان تالیف حافظ محمد بن یوسف کنجی، کشف المخفی فی مناقب المہدی، التوضیح فی تواتر ماجاء فی المنتظر المہدی للشوکانی، العرف الوردی فی اخبار المہدی حافظ جلال الدین السیوطی۔

چونکہ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کی شہادت ۲۶۰ھ میں واقع ہوئی تھی، اس طرح پانچ سال کی عمر میں یہ فخر عیسیٰؑ و یحییٰؑ ظاہری درجۂ رفیعہ امامت کبریٰ پر فائز ہوگئے۔ عجل اللہ فرجہ و سہل مخرجہ و جعلنا من اعوانہ و انصارہ بجاہ النبی و آلہ۔

ہر زمانہ میں حجّتِ خدا کا وجود ضروری ہے

اس مطلب پر یہاں تفصیلی تبصرہ کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اجمالاً اس قدر واضح رہے کہ اربابِ علم وبصیرت جانتے ہیں کہ خلاقِ عالم نے موجودہ عالم کو ایسے خاص نظام اور قانون پر بنایا ہے کہ اس

کی ہر ہر چیز علل و اسباب کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ صحت و مرض، موت و حیات، توالد و تناسل، فقر و غنا۔ غرضیکہ کائناتِ عالم کی ہر شے میں یہی قانونِ قدرت جاری و ساری ہے کہ ہر چیز اپنے مخصوص علل و اسباب کے تحت وجود میں آتی ہے۔ اور خاص اسباب کے پیشِ نظر پردۂ عدم میں روپوش ہو جاتی ہے۔ اگر کبھی اس کے خلاف ہو جائے تو اسی کا نام "مُعجزہ" ہے۔ جو خرقِ عادت کا دوسرا نام ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ سلسلۂ علل و اسباب تمام مادیات پر مشتمل ہو یا اس کی بعض کڑیاں مادی اور بعض غیر مادی ہوں۔ بہر کیف اسی قانون کے تحت خدائے حکیم نے اس عالم کی بقاء کو اپنی حجّت (نبی و امام) کے وجود کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے۔ اگر ایک لمحہ کے لیے حجّتِ خدا زمین سے اٹھ جائے تو تمام نظامِ عالم درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ اور دنیا و ما فیہا ہلاکت سے ہمکنار ہو جائے۔ مُتعدّد روایات میں صادقین علیہم السلام سے مروی ہے، فرمایا: "لولا الامام لساخت الارض باھلھا"۔ "اگر حجّتِ خدا کو وجود نہ ہو تو دنیا اپنے اہل سمیت نیچے دھنس جائے"۔ (اصول کافی)

اسی بنا پر پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا تھا: "اھل بیتی امان لاھل الارض کما ان النجوم امان لاھل السماء"۔ (صواعق محرقہ صفحہ ۸۵ طبع جدید) "میرے اہلِ بیتؑ زمین والوں کو ہلاکت سے بچانے کا سبب ہیں، جس طرح ستارے اہل آسمان کے لیے باعثِ امان ہیں"۔

حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"لولم یبق علی الارض الا اثنان لکان احدھما الحجة"۔

"اگر بالفرض تمام روئے زمین پر صرف دو ہی شخص رہ جائیں تو ان میں ضرور ایک حجّتِ خدا ہوگا"۔ (اصول کافی)

کیونکہ حجّتِ خدا کے بغیر کوئی شخص زندہ نہیں رہ سکتا۔ "الحجة قبل الخلق و مع الخلق و بعد الخلق" "حجّت خدا کا وجود مخلوق سے قبل مخلوق کے ساتھ اور مخلوق کے بعد ہونا ضروری ہے"۔ (بحار الانوار)

بنا بریں ضروری ہے کہ اس وقت کسی حجّتِ خدا کا موجود ہونا ضروری ہے۔ جس کے طفیل یہ عالم قائم و دائم ہے۔ اور وہ بالاتفاق سوائے حضرت مہدیِ دَورانؑ صاحب العصر والزمان حضرت حجّت بن الحسن عجّل اللہ تعالیٰ فرجہ کے اور کوئی نہیں ہے۔ "فبیمنہ رزق الوری و بوجودہ ثبت الارض والسماء"

قدم سے مہدیٔ دیں کے زمیں قائم ہے پانی پر قرارِ کشتیٔ دنیا کے لنگر ایسے ہوتے ہیں

اگر وہ تمام دنیا کو دکھائی نہیں دیتے تو اس کا تقاضا یہ تو نہیں کہ ان کے وجود ذی جود کا انکار کر دیا جائے۔ خدائے عزوجل نے اہلِ ایمان کا یہ وصف بیان فرمایا ہے کہ:

"یومنون بالغیب"

وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں ۔ جنّت و دوزخ، حشر و نشر، برزخ و صراط اور ملائکہ حتی کہ خود خدائے قدوس کی ذاتِ بابرکات وغیرہ بیسیوں امور ایسے ہیں جو غائب ہیں ۔ مگر ان پر ایمان ضروری ہے، تو اگر امام زمانہؑ غائب ہیں اور ان پر ایمان لانا ضروری ہے تو اس میں کون سی تعجب والی بات ہے؟

حضرتؑ امام زمانہؑ کے وجودِ مسعود کے متعلّق

بعض شبہاتؑ کے جواباتؑ

اگرچہ مذکورہ بالا حقائق کی بنا پر حضرت امام زمانہؑ کا اس وقت موجود ہونا ایک ایسی حقیقت معلوم ہوتی ہے جس میں ہرگز کوئی عاقل و متدین انسان شک و شبہ نہیں کر سکتا ۔ مگر بموجب: ؎

اذا لم تکن للمرء عین صحیحۃ فلا غرو ان یرتاب و الصبح مصفر

اکثر کور باطن اور کوتاہ اندیش مخالفین و معاندین ہمیشہ امام زمانہؑ کے موجود ہونے پر بعض رکیک شبہات عائد کرتے رہتے ہیں ۔ جن کے بیسیوں مرتبہ مکمل و مدلل جوابات دیے جا چکے ہیں ۔ خود ہم بھی اپنے بعض مضامین میں ان کا تفصیلی رد لکھ چکے ہیں ۔ یہاں بعض شبہات اور ان کے اجمالی جوابات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے ۔

پہلا شبہ اور اس کا جوابؑ

پہلا شبہ جناب امام العصر کی طولِ حیات کے متعلّق ہے کہ ان کی ولادت ۲۵۵ھ سے لے کر ۱۳۸۴ھ تک ۱۱۲۹ سال ہوتے ہیں ۔ اس قدر طویل عرصہ تک کوئی شخص زندہ نہیں رہ سکتا ۔ اس شبہ کا مختصر جواب یہ ہے کہ ایسا اعتراض وہی شخص کر سکتا ہے جو قدرتِ خدا کا منکر ہو ۔ ورنہ جو شخص خدا کو علیٰ کل شئ قدیر جانتا ہے اور یہ بھی اعتقاد رکھتا ہے کہ اس قادر و قیوم نے اپنی قدرتِ کاملہ سے اب تک بعض انبیاء جیسے حضرت خضر و ادریس و الیاس و عیسیٰ علیہم السلام کو زندہ رکھا ہوا ہے جن کی عمریں امام صاحب العصرؑ سے کئی گنا زیادہ ہیں ۔ تو کیا وہی خدائے قادرِ مطلق اپنی آخری حجّت کو اس قدر عرصہ تک زندہ نہیں رکھ سکتا؟ شیخ محمد بن یوسف الکنجی الشافعی نے اپنی کتاب البیان میں امامِ زمانؑ کے اس وقت زندہ و موجود ہونے پر دلائل لکھتے ہوئے لکھا ہے: "وانہ لا امتناع فی بقائہ کبقاء عیسی ابن مریم و الخضر و الالیاس من اولیاء اللہ و بقاء الاعور الدجال اللعین من اعداء اللہ تعالیٰ و ھؤلاء قد ثبت بقائھم

بالکتاب و السنة"۔ یعنی امامِ زمانؑ کا اس قدر طویل عرصہ تک زندہ رہنا ممتنع نہیں ہے۔ جیسا کہ دوستانِ خدا میں سے حضرت عیسیٰؑ وخضرؑ والیاسؑ اور دشمنانِ خدا میں سے اعور دجال اور ابلیس لعین اب تک زندہ ہیں۔جن کا وجود قرآن وسنت سے ثابت ہے۔(ارجح المطالب)

کتب سیر وتواریخ بلکہ قرآن سے مُستفاد ہوتا ہے کہ جس قدر امام زمانہؑ کی عمر ہے اتنی یا اس سے زیادہ طویل العمر لوگ اسی دنیا میں گزر چکے ہیں۔ چنانچہ حضرت آدمؑ کی عمر کتب سیر میں نوسوتیس برس اور جناب شیثؑ کی نوسو بارہ برس لکھی ہے۔ اور حضرت نوحؑ کے متعلق تو خود قرآن میں موجود ہے کہ ساڑھے نوسو برس تک اپنی قوم کو دعوتِ رشد وہدایت دی۔ "لبث فیھم الف سنة الا خمسین عامًا" (سورہ عنکبوت: ۱۴) اس سے قبل کتنا عرصہ گزرا اور ہلاکت قوم کے بعد کتنی مدت تک زندہ رہے؟ اس کے متعلق قرآن خاموش ہے۔ مجموعی طور پر اڑھائی ہزار سال کے اقوال ملتے ہیں۔ بنا بر قاعدہ مُسلّمہ: "اول دلیل علی امکان الشئ وقوع الشئ" کسی چیز کے ممکن ہونے کی بڑی دلیل اس کا وقوع پذیر ہونا ہے۔حضرت حجۃ بن الحسنؑ کی طویل العمری پر اعتراض کرنا بالکل ہی لغو وعبث ہے۔ جبکہ ان سے پہلے اسی عالم میں بہت سے طویل العمر لوگ گزر چکے ہیں۔ موجودہ سائنسی دور میں تو بعض ڈاکٹروں نے تحقیق کی ہے کہ ایک انسان اگر اصولِ حفظانِ صحت کی پابندی کرے تو وہ ہزار ہا سال تک زندہ رہ سکتا ہے۔بنابریں حقائق اس شبہ کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے؟

دوسرا شبہ اور اس کا جواب

ایسے امام غائب کے وجود کا کیا فائدہ ہے جسے نہ ہم دیکھ سکتے ہیں اور نہ ان سے مسائل دریافت کر سکتے ہیں۔اس شبہ کا اجمالی جواب یہ ہے کہ وجود امامؑ کے فائدہ کو فقط مسائل بیان کرنے میں مُنحصر قرار دینا کوتاہ اندیشی کی دلیل ہے۔ ورنہ اربابِ بصیرت جانتے ہیں کہ ان کے وجودِ مسعود کا فائدہ فقط مسائل دینیہ بیان کرنے میں مُنحصر نہیں ہے۔ابھی اوپر بیان ہو چکا ہے کہ زمین وزمان کا قیام ودوام وجود حجّت وامام سے وابستہ ہے۔لہٰذا یہی کیا کم فائدہ ہے کہ ان کے طفیل سب کائنات موجود ہے۔اسی بناء پر مُحقق طوسیؒ نے تجرید میں لکھا ہے:

"وجود الامام لطف و تصرف لطف أخرو عدمه منا"

"امام کا وجود لطف خداوندی ہے، اور ان کا ظاہری تصرف یہ خدا کا دوسرا لطف ہے اور تصرف کا نہ ہونا ہماری وجہ سے ہے"۔ "خود کردہ را علاجے نیست"۔

علاوہ بریں اربابِ دانش و بینش جانتے ہیں کہ ہدایت یا گمراہی کے لیے ہادی یا مُضل کا آنکھوں کے سامنے موجود ہونا ضروری نہیں ہے۔ خداوند عالم غائب رہ کر ہدایت کرتا ہے اور شیطان مخفی رہ کر گمراہ کرتا ہے۔ تو امام زمان مخفی و مستور رہ کر فریضۂ ہدایت کیوں انجام نہیں دے سکتا۔ خود امام العصرؑ سے پوچھا گیا تھا کہ آپ کی غیبت کے زمانہ میں آپ کے وجودِ مسعود سے لوگ کس طرح استفادہ حاصل کریں گے؟ امام عالی مقام نے فرمایا:

"کالشمس اذا غیبتھا السحاب"

جس طرح لوگ آفتاب سے

فائدہ حاصل کرتے ہیں

جبکہ وہ بادل کے

نیچے چلا

جائے

(احتجاج طبرسی، بحار جلد ۱۳، ینابیع المودۃ جلد ۲ صفحہ ۱۶۹)

"فقدمنا الی ما عملوا من عمل فجعلناہ ھباءً منثورا"

★

باب الاعتقاد فی العصمة

چھتیسواں بابؒ

انبیاءؑ، ائمہؑ اور ملائکہؑ کی عصمت کے متعلق اِعتقاد

قال الشیخ ابو جعفرؒ اعتقادنا فی الانبیاء والرسل والائمة والملائکة

جنابِ شیخ ابو جعفرؒ فرماتے ہیں کہ انبیاؑء اور ان کے اوصیاء اور فرشتوں کے متعلق ہمارا عقیدہ یہ ہے

چھتیسواں بابؒ

عصمتِؒ انبیاءؑ وائمہؑ اور ملائکہؑ کا بیان

عصمتِ انبیاؑء میں مُسلمانوں کے اختلافاتؒ کا اجمالی بیان

اگرچہ بعض سابقہ مباحث میں اجمالاً اس مطلب پر روشنی ڈالی جاچکی ہے مگر چونکہ حضرت مُصنّف علام نے اس مطلب کے اثبات کے لیے مستقل عنوان قرار دیا ہے، لہٰذا ہم بھی اس سلسلہ میں قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔ سو واضح ہو کہ عصمت انبیاء کے متعلق مُسلمانوں کے درمیان کئی ایک اختلافات موجود ہیں۔ برادرانِ اسلامی میں سے بعض حضرات تو سرے سے انبیاء کو معصوم ہی نہیں سمجھتے، بلکہ ان کے لیے خطاء و اجتہاد کو جائز سمجھتے ہیں۔ اور بعض کفر و عصیان میں فرق کرتے ہیں کہ انبیاءؑ کے لیے کفر تو جائز نہیں مگر دیگر گناہ کر سکتے ہیں۔ اور بعض گناہِ کبیرہ وصغیرہ میں فرق بتلاتے ہیں کہ ان کے لیے گناہِ کبیرہ کا ارتکاب ناجائز اور صغیرہ کا صدور جائز ہے اور بعض عمد و سہو کا فرق ظاہر کرتے ہیں کہ قبل اظہار نبوت انبیاؑء سے معاذ اللہ ہر گناہ حتی کہ کفر بھی صادر ہو سکتا ہے۔ مگر بعد از دعوائے نبوت ارتکابِ گناہ نہیں کرتے۔ الی غیر ذلك من الهذیانات۔ بہرکیف عصمت انبیاءؑ و ائمہؑ کے بارے میں صحیح اسلامی عقیدہ وہی ہے جو حضرات شیعہ خیر البریہ کا ہے کہ انبیاء کرامؑ کا دامن اول عمر سے لے کر آخر عمر تک تمام گناہانِ کبیرہ وصغیرہ کی آلائش سے منزہ و مبرا ہوتا ہے، وہ نہ عمداً ارتکابِ گناہ کرتے ہیں اور نہ سہواً۔ نہ علماً اور نہ جہلاً، نہ خطاءً نہ تاویلاً، نہ قولاً و فعلاً، نہ قبل اِعلانِ نبوت اور نہ اس کے بعد۔ حضراتِ شیعہ کا یہی عقیدہ ملائکہ کرام اور ائمہٴ طاہرینؑ علیہم السلام کے بارے میں بھی ہے اور اس عقیدہ کی صحت و صداقت پر بیسیوں عقلی و نقلی ادلہ ساطعہ و براہین قاطعہ قائم کیے جاچکے ہیں۔

معصومون مطھرون من کل دنس وانھم لا یذنبون ذنبا لا صغیرا و لا کبیرا و لا یعصون اللہ ما امرھم — کہ وہ سب کے سب معصوم عن الخطا اور ہر قسم کی نجاست (گناہ و عصیان) سے مبرا ہیں۔ وہ نہ تو کوئی گناہِ کبیرہ کرتے ہیں اور نہ صغیرہ۔ یہ بزرگوار امر خداوندی کی نافرمانی نہیں کرتے۔

ہم نے بھی اپنی کتاب "اثبات الامامۃ الائمۃ الاطہارؑ" میں کافی شرح و بسط کے ساتھ اس موضوع پر بحث کی ہے اور اس مطلب کے اثبات پر ادلہ قاطعہ ذکر کیے ہیں۔ شائقین تفصیل اس کتاب کی طرف رجوع فرمائیں۔

عصمتؑ کی اِصطلاحی تعریف

قبل اس کے کہ عصمت انبیاءؑ و ائمہؑ پر دلائل پیش کیے جائیں، پہلے عصمت کے صحیح مفہوم کا بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ عصمت کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں لیکن اس کی سب سے جامع و مکمل تعریف یہ ہے کہ:

"العصمۃ ھی لطف اللہ یفعل اللہ بمن یشاء من عبادہ بحیث لا یکون لہ معھا داع الی ترک الطاعۃ و ارتکاب المعصیۃ"

یعنی "عصمت ایک لطف وعنایتِ خداوندی ہے کہ جب خدا اپنے مخصوص بندوں میں سے کسی کے ساتھ یہ لطف فرماتا ہے تو اس کے سبب سے وہ نہ کوئی اطاعت ترک کرتا ہے اور نہ کسی چھوٹی یا بڑی معصیت کا ارتکاب کرتا ہے"۔

اس تعریف سے معلوم ہوا کہ انبیاءؑ و ائمہؑ کی عصمت و طہارت اختیاری ہوتی ہے، یعنی باوجودیکہ وہ ترکِ طاعت اور ارتکابِ معصیت پر قدرت رکھتے ہیں مگر اسے اپنے ارادہ و اختیار سے عمل میں نہیں لاتے۔ "وھم بامرہ یعملون" (سورۃ الانبیاء: ۲۶) وہ اسی (خدا) کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ اور اسی بنا پر لائق مدح و ستائش ہیں۔

عصمتِ انبیاءؑ کی پہلی دلیل

اب ہم ذیل میں اس موضوع پر چند ادلہ بیان کرتے ہیں۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ اگر انبیاءؑ معصوم و مطہر نہ ہوں تو ان کی بعثت کی غرض و غایت ضائع ہو جائے گی۔ نہ ان کی بات مسموع ہوگی، نہ لوگ اس کے مُطیع و منقاد ہوں گے، بلکہ "آن خویشتن گم است کرا رہبری کند" والا معاملہ ہو جائے

و یفعلون مایؤمرون و من نفی عنہم العصمۃ فی شئ من احوالہم فقد جہلہم و من جہلہم فہو کافر و اعتقادنا فیہم انہم معصومون	(بلکہ) جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے وہ اسی کے مطابق عمل کرتے ہیں، جس شخص نے ان حضرات کی عصمت کا جس حیثیت سے بھی انکار کیا وہ ان کے مرتبہ اور شان سے جاہل ہے اور جو ان سے جاہل ہے (ان کی معرفت نہیں رکھتا) وہ کافر ہے۔ ہم یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ تمام بزرگوار ابتدا سے انتہا تک معصوم

گا، اور ان پر خداوند عالم کی یہ تہدید و وعید منطبق ہوگی: "اتأمرون الناس بالبر و تنسون انفسکم" (سورۃ البقرہ: ۴۴) کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو فراموش کر رہے ہو؟ لوگ یہ کہہ کر کہ کل تک تو تم خود فلاں فلاں گناہ کا ارتکاب کرتے تھے، آج نبوت کا دعویٰ کر کے ہماری ہدایت کا ادعا کرتے ہو۔ ان کے احکام کو ٹھکرا دیں گے اور انبیاءؑ کو مجبوراً خاموش ہونا پڑے گا۔ اور کوئی حکیم ایسا کام نہیں کرتا جس سے اس کا مقصد فوت ہو جائے اور نقض غرض لازم آئے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ انبیاءؑ کو معصوم ہونا چاہیے۔ و ھو المطلوب۔

دُوسری دلیل

اگر انبیاء کرام علیہم السلام سے گناہ صادر ہو تو وہ معاذ اللہ فاسق قرار پائیں گے۔ کیونکہ خدا کی حکم عدولی کرنے والے فاسق ہوتے ہیں۔ اور بنصِ قرآنی فاسق کی شہادت معمولی دنیوی امور میں بھی قابلِ قبول نہیں۔ "کما قال عز من قائل فان جاءکم فاسق بنباء فتبینوا" (سورۃ الحجرات: ۶) چہ جائیکہ دین و شریعت کے معاملہ میں اس کی بات پر اعتماد کیا جائے۔ اور اسے دین و دُنیا کا حاکم علی الاطلاق تسلیم کیا جائے۔ "ان ھذا الا اختلاق" کوئی حکیم اور فہیم انسان ہرگز ایسا کام نہیں کر سکتا چہ جائیکہ حکیم مُطلق و خالقِ عقل، ایسے امرِ قبیح کا اِرتکاب کرے۔ "تعالیٰ عما یقول الظالمون علوا کبیرا"۔

تیسری دلیل

اگر انبیاءؑ سے صدورِ گناہ جائز تسلیم کیا جائے تو چونکہ منجملہ گناہوں کے ایک گناہِ عظیم جھوٹ بولنا بھی ہے۔ لہٰذا اس کا اِرتکاب بھی ان کے لیے جائز ہوگا، اور جب ان کے لیے اِرتکابِ کذب جائز ہوا تو پھر ان کے وعدہ ہائے جنّت اور وعید ہائے دوزخ اور ان کے اوامر و نواہی اور بیانِ ثواب ہائے غیر متناہی پر ہرگز کوئی وثوق و اعتماد نہیں رہ جائے گا۔ کیونکہ اس صورت میں ان سب امور کے متعلق یہ

موصوفون بالکمال و التمام و العلم من اوائل امورھم و اواخرھا لا یوصفون فی شئ من احوالھم بنقص و لا عصیان و لا جھل

اور صفاتِ کمال و تمام و علم و فضل سے مُتّصف ہیں۔ اور یہ اپنے تمام احوال و کوائف میں سے کسی حالت میں بھی نقص، جہالت اور معصیت وغیرہ نقائص سے مُتّصف نہیں ہوتے۔

برابر اِحتمال باقی ہوگا کہ شاید (مَعاذ اللہ) غلط بیانی کر رہے ہوں اور حقیقت کچھ بھی نہ ہو۔ لہٰذا کوئی عقلمند شخص ان کی فرمانبرداری اور مُتابعت کرنے پر آمادہ نہ ہوگا۔ اس طرح ان کی بِعثت کا مقصد بالکل اَکارَت ہوکر رہ جائے گا۔ ایسے کرنا خُدائے حکیم کی شانِ حِکمت کے خلاف ہے۔

چوتھی دلیل

اگر انبیاءؑ سے صُدورِ معصیت جائز ہو تو اس صُورت میں اِجتماعِ ضِدّین لازم آئے گا، اور ایک وقت میں اُن کی اِطاعت و نافرمانی واجب ہوگی جو عقلاً ناممکن ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ چونکہ وہ نبی ہیں، لہٰذا بحیثیت نبی ہونے کے ان کی اِتّباع بموجب آیت:

"ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ"...... (سورۃ آلِ عمران:۳۱)

"و ما ارسلنا من نبی الا لیطاع باذن اللہ"۔ (سورۃ النساء:۶۴)

(ہم نے کوئی نبی نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اللہ سُبحانہ کے حُکم سے اس کی اِطاعت کی جائے)

ہر حال میں واجب و لازم ہوگی اور پھر چونکہ ان کے لیے اِرتکابِ معصیت جائز ہے اور ہر گناہگار بموجب نصِّ قرآن ظالم ہے: "و من یتعد حدود اللہ فاولئك ھم الظالمون" (سورۃ بقرۃ:۲۲۹)

اور حکمِ خُدا ہے کہ: "لا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار"۔

(ظالموں کی طرف مَیلان نہ کرو ورنہ تمھیں آتشِ جہنّم مس کرے گی)

نیز اس کا ارشاد ہے: "ان اللہ یامر بالعدل و الاحسان و ینہی عن الفحشاء و المنکر" (سورۃ نحل: ۹۰) (خُداوند تعالیٰ عدل و احسان کرنے کا حُکم دیتا ہے اور بُرے کاموں سے روکتا ہے۔)

لہٰذا اس طرح ان آیات کی روشنی میں انبیاءؑ کی نافرمانی لازم ہوگی اور ظاہر ہے کہ مُتابعت اور معصیت آپس میں ضِدّیں ہیں۔ "والضدان لا یجتمعان" اِجتماعِ ضِدّین مُحال و ناممکن ہے۔ اور یہ مُحال عصمتِ انبیاءؑ نہ ماننے سے لازم آرہا ہے۔ "و ما یستلزم المحال فھو محال"۔ قاعدہ ہے کہ جو چیز مستلزمِ مُحال ہو وہ خُود مُحال اور باطل ہوا کرتی ہے۔ اس طرح عدمِ عصمت والا نظریہ غلط ٹھہرے گا۔ اس لیے انبیاء کرامؑ کو معصوم و مُطہّر تسلیم کرنا پڑے گا۔

پانچویں دلیل

اگر انبیاءؑ معصیت الٰہی کے مرتکب ہوں تو جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے وہ ظالم قرار پائیں گے اور ارشادِ قدرت ہے کہ: "لا ینال عھدی الظالمین" (سورۃ بقرہ: ۱۲۴) میرا عہدہ نبوّت و امامت ظالموں کو نہیں پہنچ سکتا۔ وہ درجہ نبوت پر فائز ہی نہیں ہو سکیں گے۔ لہٰذا اگر ان کو نبی ماننا ہے تو انھیں معصوم و مطہر ماننا پڑے گا۔ بنظر اختصار یہاں انہی پانچ دلائل پر اکتفا کی جاتی ہے۔

"اگر در خانہ کس است یک حرف بس است"

عِصمتِ ائمہ علیہم السلام کا اجمالی بیان

اُوپر جو اَدِلّہ و بَراہین عصمتِ انبیاءؑ کے متعلق بیان ہوئے ہیں بعینہٖ حرف بحرف یہی دلائل ائمہ معصومینؑ کی عِصمت کے متعلق بھی جاری و ساری ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا ان کی عصمت کے بارے میں ہمیں علیحدہ دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تفصیل کے لیے ہماری کتاب "اِثباتُ الامامت" کی طرف رُجوع کیا جائے۔ اور ملائکہؑ کی عصمت پر تمام مُسلمانوں کا اِتّفاق ہے۔ اس لیے اس سلسلہ میں ہمیں دلائل پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ہارُوت و مارُوت کا قصّہ جس طرح بعض غیر مُعتبر اسلامی کتب میں مرقوم ہے، وہ کتب یہود سے ماخوذ ہے اور دلائل قاطعہ عقلیہ و نقلیہ کے مخالف ہونے کی وجہ سے ناقابلِ اِلتفات و اِعتبار ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں واضح و لائح ہو گیا کہ انبیاء و ائمہؑ اور ملائکہؑ کی عصمت کا اِعتقاد ضروری و لازمی ہے اور جس طرح نبیؐ و امامؑ کے لیے عصمت ضروری ہے، اسی طرح ان کے لیے یہ بھی لازمی ہے کہ وہ علم و فضل، زُہد و تقویٰ، عقل و دانش، فہم و فراست، شجاعت و شہامت، جود و سخاوت، قوّت و طاقت، غیرت و حمیّت، رأفت و رحمت۔ غرضیکہ تمام صفات کمالیہ و نعوت جمالیہ میں سر آمد روزگار ہوں اور تمام افرادِ امت سے افضل و اشرف ہوں۔ نیز مُنفر طبع تمام نقائص و عُیوب خَلقی و خُلقی سے مُنزّہ و مُبرّا ہوں۔ ورنہ ترجیح مرجوح بر راجح اور تقدیم مفضول بر فاضل لازم آئے گی۔ یعنی اگر اُمّت میں کوئی ایسا شخص موجود ہو جو ان فضائل و کمالات میں اس نبی یا امام پر فوقیت رکھتا ہے تو اس افضل کو نظر انداز کر کے غیر افضل کو درجہ نبوّت و امامت پر فائز کرنے کی صُورت میں خُداوند عالم پر ترجیح مرجوح بر راجح اور تقدیم مفضول بر فاضل کا اِلزام عائد ہوگا، جو اُس کی شانِ عدالت و حکمت کے ساتھ منافی ہونے کی وجہ سے عقلاً و نقلاً باطل ہے۔

ارشادِ قدرت ہے:

"افمن یهدی الی الحق احق ان یتبع امن لا یهدی الا ان یهدی مالکم کیف تحکمون"

(سورۃ یونس)

اور اس طرح اگر افرادِ اُمّت میں کوئی ایسا فرد موجود ہو جو تمام فضائل و کمالات میں نبی و امام کا ہم پلہ اور ان کے برابر ہو تو پھر اُسے نظر انداز کر کے اس کے برابر درجہ رکھنے والے کو نبی و امام بنانے سے ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی جو کہ باطل ہے۔ لہٰذا تسلیم کرنا پڑے گا کہ نبی و امام کو ہر لحاظ سے اپنی اُمّت و رعیّت سے افضل و اکمل اور اشرف و اعلیٰ ہونا چاہیے۔

ایک ضروری وضاحت

وہ آیاتِ متشابہات جن کے ساتھ بالعموم مُنکرینِ عصمت بموجب "والذین فی قلوبهم زیغ فیتبعون ما تشابه منه ابتغاء الفتنة و ابتغاء تاویله" (آلِ عمران: ۷) تمسّک کیا کرتے ہیں، کُتبِ مُفصلہ و مبسوطہ میں ان کے مفصّل جوابات مذکور ہیں۔ چونکہ یہ کتاب مُستطاب پہلے ہی غیر معمولی طور پر طویل ہو چکی ہے اس لیے اب ہم یہاں رشتہ بیان کو کوتاہ کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم یہ چاہیں کہ ان تمام آیات کو جو مُوہِم معصیت انبیاء ہیں ذکر کریں اور پھر اُن کے مفصّل جوابات لکھیں تو اس میں اس قدر طوالت ہو جائے گی کہ جس کے لیے اوراقِ کتاب متحمل نہیں ہیں۔ اس لیے ہم ان تفصیلات کو نظر انداز کر کے اسی اجمالی بیان واجب الاذعان پر اکتفا کرتے ہیں۔ جو حضرات تفصیلی دلائل اور مکمل جوابات ملاحظہ کرنا چاہیں وہ کتاب "تنزیہ الانبیاء و الائمہ" مُصنّفہ حضرت علامہ سیّد مُرتضیٰ علم الہُدیٰ قدس سرہ (جس کا اُردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے) اور کتاب مُستطاب "عصمۃ الانبیاءؑ و الائمہؑ" مُصنّفہ مولانا سیّد ابوالقاسم الرضوی وغیرہ کُتبِ مُفصلّہ کی طرف رُجوع کریں۔ ان کُتب میں ان تمام آیاتِ متشابہات کے مفصّل جوابات پیش کیے گئے ہیں، جن سے معصیتِ انبیاءؑ کا توہّم ہوتا ہے اور اس سلسلہ کے تمام شکوک و شبہات کا مکمل اِزالہ کر دیا گیا ہے۔ ان کُتبِ جلیلہ کو دیکھنے کے بعد ایک عاقل و مُنصف ناظر کے لیے اس سلسلہ میں کوئی شکّ و شُبہ باقی نہیں رہتا۔ مگر افسوس: "ام تحسب ان اکثرهم یسمعون او یعقلون ان هم الا کالانعام بل هم اضل سبیلا"۔

باب الاعتقاد

فی نفی الغلو و التفویض

قال الشیخ ابوجعفر اعتقادنا فی الغلاۃ و المفوضۃ انھم کفار باللہ جل اسمہٗ و انھم شر من الیھود و النصاریٰ و المجوس و القدریۃ و الحروریۃ و من جمیع البدع و الاھواء المضلۃ و انہ ما صغر اللہ جل جلالہ تصغیرھم بشئ کما قال اللہ تعالیٰ ما کان لبشر

سینتیسواں باب

غُلوّ اور تفویض کی نفی کے بارے میں اِعتقاد

حضرت شیخ ابوجعفر علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: غالیوں اور مُفوّضہ کے متعلق ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ یہ لوگ (فی الحقیقت) خداوند عالم کی ذات کے منکر ہیں اور یہ لوگ یہود ونصاریٰ، مجوس، قدریہ، اور خوارج بلکہ تمام اہلِ بدعت اور گمراہ کُن نظریات رکھنے والے فرقوں سے بدتر ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے برابر کسی فرقہ نے بھی خُدا کی تحقیر و تصغیر نہیں کی۔ خداوند عالم فرماتا ہے: "کسی ایسے بشر کو

سینتیسواں باب

غُلوّ اور تفویض کا بیان

شرک کی بُوقلمونیاں شخصیت پرستی کا نتیجہ ہیں

تاریخِ مِلَل و مذاہب پر اجمالی نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں شرک کی ابتدا و ترویج اور اس کی بُوقلمونی میں شخصیت پرستی اور افراطِ عقیدت کو بہت کچھ دخل ہے۔ شرک کی ابتدا کب اور کس طرح ہُوئی؟ اور بتدریج اس کے اَوضاع و اَشکال میں کیا کیا تغیّر و تبدّل رُونما ہُوا؟ اس وقت اس موضوع پر سیر حاصل تبصرہ کرنا مقصُود نہیں ہے۔

دُنیا میں شرک کی ابتداء

اجمالاً اس قدر واضح رہے کہ حضرت آدمؑ و نوحؑ کے درمیانی زمانہ میں شرک کی ابتداء ہو چکی تھی اور اس میں بہت حد تک بعض خُدا رسیدہ بزرگوں کے متعلق غلط جذبۂ محبّت اور افراطِ عقیدت کو دخل رہا تھا۔ چنانچہ عرب کے وہ بڑے "اصنامِ خمسہ" جن کے نام: وَدّ، سَوَاع، یَعُوق، یَغُوث، اور نَسر ہیں۔ یہ حضرت آدمؑ اور جناب نوحؑ کے درمیانی زمانہ میں خدا رسیدہ اور عبادت گزار بندے تھے۔ لوگوں کو

ان یؤتیه الله الکتاب و الحکم و النبوة ثم یقول للناس کونوا عباداً لی من دون الله و لکن کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتاب و بما کنتم تدرسون و لا یأمرکم ان تتخذوا الملائکة

جس کو خداوند عالم نے کتاب وحکمت اور نبوّت عطا کی ہو، یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ بلکہ (وہ تو یوں کہتا ہے کہ) تم اللہ والے بن جاؤ جیسا کہ تم کتاب پڑھاتے اور پڑھتے ہو اور وہ تمھیں یہ حکم بھی نہیں دیتا کہ تم فرشتوں

ان سے انتہائی عقیدت ومحبت تھی ۔ جب ان کا انتقال ہُوا تو ان کے عقیدت مندوں پر ان کی جُدائی انتہائی شاق گزری، وہ ان کی حسین یادوں کو سینے سے لگانے کی مختلف تدبیریں سوچ رہے تھے کہ شیطان نے ان کی مُورتیاں بنا کر ان کے سامنے پیش کیں ۔ وہ لوگ ان مُورتیوں کو دیکھ کر بہت خوش ہُوئے اور اس طرح ان کے جذبۂ شوق کی کسی حد تک تسکین ہوگئی ۔ پہلے یہ مُورتیاں کھلی جگہ پر رکھی ہُوئی تھیں ۔ جب سردیوں کا موسم آیا تو وہ لوگ ان کو گھروں کے اندر لے گئے ۔ اسی طرح ایک عرصہ دراز گزر گیا۔ حتیٰ کہ یہ عقیدت مند لوگ دُنیا سے رَختِ سفر باندھ کر چلے گئے ۔

بُت پرستی میں تدریجی ترقی

جب ان کی جگہ نئی پود نے لی، تو حقیقتِ حال سے بے خبری کی وجہ سے انھوں نے ان مُورتیوں کی عبادت و پرستش شروع کر دی ۔ کیونکہ وہ اپنے بزرگوں کو ان مُورتیوں کے آگے بیٹھے اور ان کی تعظیم وتوقیر کرتے ہوئے تو دیکھتے تھے ۔ مگر ان کو حقیقتِ حال کا کوئی علم نہ تھا۔ جُوں جُوں زمانہ گزرتا گیا تُوں تُوں صنم پرستی کو ترقی ہوتی گئی ۔ اور رفتہ رفتہ صنم پرست لوگ اپنے اصنام کو مُشکل کشا، اور حاجت روا سمجھنے لگے ۔ اسی طرح بُتوں میں نبیوں اور ان کے وصیّوں کے مجسّمے بنا کر بھی شامل کر لیے گئے ۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے وقت عرب میں بُت پرستی کا دور دورہ تھا۔ اور اس چیز کا سب سے بڑا مرکز مکّہ مکرّمہ اور اس میں بھی بیتُ اللہ الشریف تھا۔ جہاں کم وبیش تین سو ساٹھ بڑے بڑے بُت رکھے ہُوئے تھے ۔قبائل کے بُت، حضر کے بُت اور سفر کے بُت ان کے علاوہ تھے ۔ جن کی تعداد ہزاروں سے بھی مُتجاوز تھی ۔

بُت پرست، بُتوں کو خُدا نہیں سمجھتے تھے

یہ لوگ تصوّرِ معبود سے بالکل خالی الذّہن نہ تھے، بلکہ توحید کا دُھندلا سا تصوّر اُن کے ذہنوں

و النبیین اربابا ایأمرکم	اور نبیوں کو اپنا رب بنالو کیا وہ تمھارے مُسلمان ہوجانے کے بعد تمھیں کفر
بالکفر بعد اذ انتم	اختیار کرنے کا حکم دے سکتا ہے؟(آل عمران:۷۹) نیز خداوند عالم فرماتا
مسلمون وقال عزوجل	ہے: اپنے دین و مذہب میں غُلُوّ نہ کرو (یعنی مذہب کے حدود کو نہ پھاندو
لا تغلوا فی دینکم	اور خدا کے بارے میں وہی بات کہو جو برحق ہے) (سورۃ النساء:۱۷۱)

میں موجود تھا۔ چنانچہ قرآن مجید خبر دیتا ہے کہ:

وَ لَئِنۡ سَاَلۡتَہُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ لَیَقُوۡلُنَّ اللّٰہُ (سورۃ لقمان:۲۵)

اگر تم ان سے دریافت کرو کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ یقیناً جواب میں یہی کہیں گے اللہ نے۔

بلکہ وہ بتوں کی عبادت و پرستش کی غرض و غایت بھی یہی قرار دیتے تھے کہ یہ شفاعت و سفارش کرکے ان کو خدا کا مُقرّب بنادیں۔ چنانچہ خداوند عالم ان کے نظریہ کی خبر یُوں دیتا ہے:

وَ یَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مَا لَا یَضُرُّہُمۡ وَ لَا یَنۡفَعُہُمۡ وَ یَقُوۡلُوۡنَ ہٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنۡدَ اللّٰہِ

(سورۃ یونس: ۱۸)

وہ خُدا کے علاوہ ایسوں کی پرستش کرتے ہیں جو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ خُدا کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔

ایک اور مقام پر مشرکوں کے قول کو اس طرح نقل کیا ہے:

وَ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ ۘ مَا نَعۡبُدُہُمۡ اِلَّا لِیُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَی اللّٰہِ زُلۡفٰی (سورۃ زمر:۳)

جن لوگوں نے خدا کے سوا کارساز بنا رکھے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم ان کی اس لیے عبادت کرتے ہیں تاکہ یہ ہمیں خُدا کا مُقرّب بنادیں۔

مذکورہ بالا حقائق معلوم کرنے کے لیے درج ذیل شیعہ وسُنّی کُتبِ تفسیر کی طرف رجوع کریں: تفسیر مجمع البیان جلد ۲ صفحہ ۵۳۶، تفسیر برہان جلد ۴ صفحہ ۳۸۸، تفسیر صافی صفحہ ۵۱۲، تفسیر کبیر فخر الدین جلد ۴ صفحہ ۸۱۹، ایضاً جلد ۷ صفحہ ۲۴۲، تفسیر روح المعانی للآلوسی جز ۱۱ صفحہ ۸۸ وغیرہا)

ان حقائق سے یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ یہاں خُود ساختہ شفیع یا سفارشی کام نہیں آسکتے۔ بلکہ وسیلہ و شفیع اسی ذاتِ ذُوالجلال کا بنایا ہوا ہونا چاہیے جس کی بارگاہ میں سفارش و شفاعت کرانا مقصُود ہے۔ اسی لیے خُدائے حکیم فرماتا ہے: "وابتغوا الیہ الوسیلۃ" (سورۃ المائدہ:۳۵) اس کا قُرب

و اعتقادنا فی النبیؐ انہ سم فی غزوۃ خیبر فما زالت ھذہ الاکلۃ تعادہ حتی قطعت ابھرہ فمات منھا و امیرالمومنینؑ

ہمارا یہ بھی اعتقاد ہے کہ جناب سرورِ کونین ﷺ کو غزوہ خیبر میں زہر دیا گیا تھا اور وہ زہر برابر اثر کرتا رہا، یہاں تک کہ آنحضرتؐ کے قلبِ مبارک کی رگوں کو کاٹ دیا اور حضورؐ اس کی وجہ سے انتقال فرما گئے (۲۸ صفر ۱۱ھ) حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام کو

حاصل کرنے کے لیے (اس کے بنائے ہوئے) وسیلہ کو تلاش کرو۔ یہ نہیں فرمایا کہ وسیلہ بناؤ۔

ہمیشہ لوگ بزرگانِ دین کے متعلق افراط و تفریط میں مُبتلا رہے ہیں

اقوامِ عالم کی تاریخ کے تتبع و تفحص سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ امر لوگوں کی جبلّت و سرشت میں داخل ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے بزرگوں کی محبت و عقیدت میں گرفتار ہو کر ان کو اپنے حدود سے بڑھا دیا کرتے ہیں۔ یہی جذبہ تھا جس نے یہودیوں کو آمادہ کیا کہ وہ جناب عزیرؑ کو ابن اللہ کہیں اور اسی جذبے نے نصرانیوں سے جناب عیسٰیؑ کو ابن اللہ کہلوایا۔ چنانچہ خداوند عالم نے اپنے کلام پاک میں اس امر کی خبر دی ہے:

وَ قَالَتِ الْیَهُوْدُ عُزَیْرُ ِ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَی الْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰهِ (سورۃ التوبۃ: ۳۰)

اسی لیے حکیمِ مُطلق نے انھیں اس غلطی پر ٹوکا اور ان کو فہمائش کی ہے: "یا اھل الکتب لا تغلوا فی دینکم" (سورۃ النساء: ۱۷۱) "اے اہلِ کتاب! اپنے دین کے مُعاملہ میں غلُوّ (حد سے تجاوز) نہ کرو"۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ سے دنیا کی عظیم شخصیتیں لوگوں کے افراط و تفریط کا شکار رہی ہیں۔ یعنی ان کے عقیدت مند ہمیشہ انھیں حد سے بڑھاتے رہے اور ان کے مُخالفین انھیں ان کے اصلی مقام و مرتبہ سے گھٹاتے رہے۔ چنانچہ حضرت رسُولِ خُدا ﷺ کے ساتھ بھی یہی سُلوک کیا گیا۔ لوگ ان کے حق میں افراط و تفریط میں مُبتلا ہو گئے۔ چنانچہ بعض نادانوں نے آپؐ کو خُدا قرار دے دیا، اور مُخالفین نے آپؐ کی نبوّت کا بھی انکار کر دیا۔ اور بعض نادان مُسلمان جو بظاہر آپؐ کا کلمہ بھی پڑھتے ہیں مگر اس کے باوجود آپؐ کو اپنے جیسا خطاکار و گنہگار انسان تسلیم کرتے ہیں۔ وہ لوگ آٹے میں نمک کے برابر ہیں، جو اس سلسلہ میں حدِ اعتدال پر قائم ہیں۔ ائمۂ طاہرینؑ کے ساتھ بھی یہی سُلوک کیا گیا کہ بعض نے تو سرے سے ان کی خلافت و امامت کو ہی تسلیم نہیں کیا، اور بعض نے چوتھے مرتبہ پر حضرت امیرؑ کی خلافت کو مانا، اور بعض خوارج نے تو معاذ اللہ ان کو دائرہ اسلام سے بھی خارج کر دیا۔ مگر بعض احمق عقیدت مندوں نے انھیں حُدودِ عبدیّت اور مرتبۂ امامت و خلافت سے بڑھا کر مرتبۂ اُلوہیّت تک

قتله عبد الرحمن بن ملجم لعنه الله و دفن بالغری و الحسن بن علی سمة امرئته جعدة	عبدالرحمٰن بن ملجم المرادی ملعون نے شہید کیا (ضربت ۱۹ ماہِ رمضان ۴۰ھ کو لگی اور شہادت ۲۱ ماہِ رمضان کو ہوئی) اور حضرت کو نجف اشرف میں دفن کیا گیا۔ حضرت امام حسن علیہ السلام کو ان کی زوجہ جعدہ بنت اشعث کندی (خدا باپ بیٹی دونوں پر لعنت کرے)

پہنچا دیا۔ جیسے عبداللہ بن سبا اور بنان بن سمعان النہدی جو جناب امیر المومنینؑ کی اُلوہیّت کے قائل تھے یا جیسے ابوالخطاب محمد بن ابی زینب و بشار الشعیری وغیرہ، جن کا یہ خیال تھا کہ حضرت علی علیہ السلام ہی خدا ہیں۔ جو کبھی بصورت محمدؐ اور کبھی بصورت علیؑ لباسِ بشریت میں نمودار ہوتے ہیں اور بطور امتحان یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ خدا کے بندے ہیں۔ حالانکہ وہ خود خدا ہیں۔ اور ابی الخطاب کے اصحاب کا یہ خیال تھا کہ چار بزرگوار خدا ہیں۔ حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ، اور حسنینؑ شریفین۔ یہ جناب رسالت مآبؐ کی اُلوہیّت کے مُنکر ہیں۔ اور مُخمّسہ پانچ بزرگواروں کی اُلوہیّت کے قائل ہیں۔ پہلے خُدا جناب محمد مُصطفےٰؐ ہیں، پھر ان سے یہ خدائی کا سلسلہ جناب علی علیہ السلام کی طرف پھر ان سے جناب سیدہؑ عالم کی طرف اور ان سے جناب امام حسنؑ کی طرف اور پھر ان سے جناب امام حسینؑ کی طرف مُنتقل ہوا۔ ان کا یہ بھی باطل خیال تھا کہ جناب سلمان فارسیؓ (محمدی) حضرت محمدؐ کے رسول ہیں۔ اور یہ لوگ ترکِ عبادات اور ارتکابِ محرمات کو مباح سمجھتے ہیں اور تناسخ کے بھی قائل ہیں۔ یا جیسے محمد بن بشیر اور اس کے اصحاب جو جناب رسولِ خداؐ کی اُلوہیّت کے قائل تھے۔ اور ان کو "لم یلد و لم یولد" کا مصداق قرار دے کر بطور تناسخ ربوبیت کو دوسرے ائمۂ طاہرینؑ کی طرف مُنتقل ہونے کے قائل تھے۔ مُغیرہ بن سعید صاید نہدی، حارث الشامی، فارس بن حاتم قزوینی، ابن ابی الزرقاء وحسن بن محمد بن باباء قمی، محمد عبرتی، محمد بن بشیر اور منصور حلاج وغیرہم لعنہم اللہ ایسے ہی مذاہبِ فاسدہ اور عقائد کاسدہ کے حامل اور شریعتِ اسلامیہ کے احکام کے مُنکر تھے اور ائمۂ طاہرینؑ کی جانب سے ان کے متعلق خُصوصی طور پر بہت کچھ لعن طعن وارد ہوا ہے۔ معصومینؑ نے ان سب ملاعین اور ان جیسے بدعقیدہ لوگوں کو کافر بلکہ یہود و نصاریٰ اور دیگر کفار و مشرکین سے بھی انجس و اکفر قرار دیا ہے۔ (رجال کشّی وغیرہ کتب ملاحظہ ہوں)

مقامِ معرفت میں میانہ روی لازم ہے

ان حقائق سے یہ حقیقت واضح و آشکار ہو جاتی ہے کہ افراط و تفریط ہر دو مذموم اور قبیح ہیں۔ اور جو طریقہ عقلاً و شرعاً ممدوح اور قابلِ اختیار ہے وہ میانہ روی کا راستہ ہے۔ جیسا کہ حضرت امیر المومنینؑ

بنت الاشعث الکندی لعنہما اللہ فمات	نے زہر دیا (۲۸ صفر ۵۰ھ کو شہادت پائی) حضرت
من ذلک و الحسینؑ بن علیؑ قتل بکربلا	امام حسین علیہ السلام کو میدانِ کربلا میں سنان بن انس نخعی
قاتلہ سنان بن انس النخعی لعنہما اللہ	نے شہید کیا (یہ ۶۱ھ یوم عاشورہ کا واقعہ ہے)

نے افراط و تفریط کی مذمت اور ہلاکت خیزی بیان فرمانے کے بعد فرمایا ہے: "علیکم بالنمط الوسطی" تمہارے اوپر اس سلسلہ میں میانہ روی لازم ہے۔ (نہج البلاغہ) اور حضرت پیغمبر اسلامؐ کا بھی یہی ارشاد ہے: "خیر الامور اوسطھا" سب امور سے بہتر وہ امر ہے جو میانہ روی پر مبنی ہو۔ لہٰذا اربابِ عقل و دین پر واجب و لازم ہے کہ تمام امور کی طرح معرفت و مقام نبی و امام علیہم السلام میں بھی میانہ روی سے کام لیں۔ یہی صراطِ مستقیم ہے۔ "ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ و لا تتبعوا السبل فتفرق بکم من سبیلہ"۔

جعفری باش گر خدا خواہی ورنہ در ہر طریق گمراہی

غالیوں کی مذمت ارشاداتِ معصومینؑ کی روشنی میں

علاوہ ان خصُوصی نصوص و روایات کے جو مذکورہ بالا اشخاص اور ان کے غلط نظریات کے بارہ میں وارد ہوئی ہیں عموی طور پر بھی ایسے نظریاتِ فاسدہ رکھنے والے لوگوں سے ائمہ طاہرینؑ نے اپنی برائت و بیزاری کا بار بار اظہار فرمایا ہے۔ چنانچہ احتجاج طبرسی میں جناب امام رضاؑ سے مروی ہے کہ جناب امیر علیہ السلام نے فرمایا: "لا تجوزوا بنا العبودیۃ ثم قولوا ما شئتم و لن تبلغوا ایاکم و الغلو کغلوا النصاری فانی بری من الغالین"۔ "ہمیں حُدودِ عُبودیّت سے آگے نہ بڑھاؤ۔ پھر جس قدر چاہو ہمارے فضائل بیان کرو۔ خبردار نصاریٰ کی طرح غُلُوّ نہ کرنا۔ کیونکہ میں غالیوں سے بیزار ہوں"۔

ابن مُسکان حضرت صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: "لعن اللہ من قال فینا مالا نقولہ فی انفسنا لعن اللہ من ازا الناعن العبودیت للہ الذی خلقنا و الیہ مآبنا و معادنا و بیدہ نواصینا"۔ "خداوند عالم ان لوگوں پر لعنت کرے جو ہمارے متعلّق وہ کچھ کہتے ہیں جو ہم خود اپنے متعلّق نہیں کہتے۔ خدا ان لوگوں پر لعنت کرے جو ہمیں اس خدا کے تعالیٰ کی عبودیت سے خارج کرتے ہیں جو ہمارا خالق ہے۔ اور جس کی طرف ہماری بازگشت ہے، اور جس کے قبضۂ قدرت میں ہماری جان ہے"۔

ابی بصیر روایت کرتے ہیں کہ جناب صادق علیہ السلام نے مجھ سے فرمایا: "یا ابا محمد ابرء ممن زعم انا ارباب"۔ "اے ابو محمد! ان لوگوں سے بیزاری اختیار کرو جو ہمارے متعلّق یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم رب ہیں"۔ "قلت برأت منہ"۔ "میں نے عرض کیا: میں ایسے لوگوں سے بیزار ہوں"۔ پھر آپؑ نے

و علیؑ بن الحسینؑ السید زین العابدین سمہ الولید بن عبدالملک لعنہ اللہ فقتلہ و الباقرؑ بن علی سمہ ابراھیم بن الولید لعنہ اللہ و الصادقؑ سمہ ابوجعفر المنصور الدوانقی لعنہ اللہ فقتلہ	حضرت امام زین العابدینؑ کو ولید بن عبدالملک لعنہما اللہ نے زہر سے شہید کیا، اور وہ جناب جنّت البقیع میں مدفون ہوئے (۲۵ محرم الحرم ۹۵ھ) امام محمد باقر علیہ السلام کو ابراہیم بن ولید لعنہما اللہ نے زہر سے شہید کیا (۷ ذوالحجہ ۱۱۴ھ) اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کو منصور دوانقی لعنہ اللہ نے زہر سے شہید کیا (۲۵ شوال ۱۴۸ھ)

فرمایا: "ابرأ ممن زعم انا انبیاء"۔ "ان لوگوں سے بھی بیزاری اختیار کرو جو ہمارے متعلق یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم نبی ہیں"۔ "قلت برأت منہ"۔ "میں نے عرض کیا: میں ان سے بھی بیزار ہوں"۔

کتاب مُستطاب عیون اخبار الرضاؑ میں مرقوم ہے کہ ایک مرتبہ مامون عباسی نے حضرت امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا: مجھے اطلاع ملی ہے کہ کچھ لوگ آپ حضرات کے بارہ میں غلو کرتے ہیں اور آپ کو حد سے بڑھاتے ہیں؟ آپؑ نے اپنے آباء و اجداد علیہم السلام کے سلسلہ سند سے فرمایا کہ: حضرت امیرؑ جناب رسولِ خداؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: "لا ترفعونی فوق حقی فان اللہ تبارک و تعالیٰ اتخذنی عبدا قبل ان یتخذنی نبیا"۔ "مجھے میرحق سے زیادہ بلند نہ کرو۔ کیونکہ خدا کے تعالیٰ نے نبی بنانے سے پہلے مجھے اپنا عبد خاص بنایا ہے۔ ارشادِ قدرت: "ماکان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتاب و الحکم و النبوۃ ثم یقول للناس کونوا عباداً لی من دون اللہ"۔ پھر جناب امیر علیہ السلام کا یہ ارشاد نقل فرمایا کہ: "یھلک فی اثنان و لاذنب لی محب مفرط و مبغض مفرط و انا ابرأ الی اللہ تعالیٰ ممن یغلو فینا فوق حدنا کبرائۃ عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام من النصاریٰ"۔ "میرے بارے میں دو قسم کے لوگ ہلاک ہوجائیں گے، حالانکہ میرا اس میں کوئی قصور نہیں۔ ایک محبّت میں افراط کرنے والے، دوسرے عداوت میں افراط کرنے والے۔ میں بارگاہِ ربّ العزّت میں ان لوگوں سے اپنی بیزاری ظاہر کرتا ہوں جو ہمارے متعلّق غلو کرتے ہیں اور ہمیں اپنے حدود سے بڑھاتے ہیں جس طرح جناب عیسٰیؑ نے نصاریٰ سے برائت ظاہر کی تھی"۔ پھر خود فرمایا: "فمن ادعی للانبیاء ربوبیۃ او ادعی للائمۃ ربوبیۃ او نبوۃ اور لغیر الاما م امامۃ فنحن منہ براء فی الدنیا و الأخرۃ"۔ "جو شخص انبیاء کے لیے ربوبیّت یا ائمہؑ کے لیے ربوبیّت یا نبوّت یا غیرامام کے لیے امامت کا دعویٰ کرے۔ ہم اس سے دنیا و آخرت میں بری و بیزار ہیں"۔

و موسیٰ بن جعفر سمه هرون الرشید لعنه الله فقتله و الرضا علیّ بن موسیٰ فقتله المامون لعنه الله بالسم	حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو ہارون الرشید ملعون نے ۲۵ رجب ۱۸۳ھ کو) اور امام علی رضا علیہ السلام کو مامون رشید لعنہ اللہ نے زہر جفا سے شہید کیا (۳۰ صفر اور بروایتے ۲۳ ذی القعدہ ۲۰۳ھ)

ثالث بحار میں بحوالہ کتاب الخصال حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: "ادنی ما یخرج الرجل من الایمان ان یجلس الی غال و یستمع حدیثه و یصدقه علی قوله ان ابی حدثنی عن ابیه عن جده علیهم السلام ان رسول الله صلی الله علیه و آله قال صنفان من امتی لا نصیب لهما فی الاسلام الغلاة والقدریة"۔ "کم از کم وہ چیز جس سے انسان ایمان سے خارج ہوجاتا ہے، یہ ہے کہ وہ کسی غالی کے پاس بیٹھے اور اس کی باتیں سنے اور اس کے قول کی تصدیق کرے۔ کیونکہ میرے والد ماجد نے مجھے اپنے والد ماجد سے انھوں نے اپنے آباء و اجداد سے روایت کی ہے کہ جناب رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: "میری امت کے دو گروہ ایسے ہیں کہ ان کا اسلام میں کوئی حصّہ نہیں ہے۔ ایک غالی، دوسرا قدری"۔

مشکوٰۃ الاسرار میں بحوالہ امالی شیخ طوسی علیہ الرحمہ بروایت فضیل بن یسار حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: "احذروا علی شبابکم الغلاة لا یفسدونهم فان الغلاة شر خلق الله یصغرون عظمة الله و یدعون الربوبیة لعباد الله"۔ "اپنے نوجوانوں پر غالیوں سے ڈرو کہ یہ کہیں انھیں خراب نہ کردیں۔ کیونکہ غالی بدترین خلائق ہیں جو خدائے عزّوجل کی عظمت کو گھٹاتے اور بندگانِ خدا کی ربوبیّت کا اِدّعا کرتے ہیں"۔

اس قسم کی بکثرت احادیث کُتبِ مُعتبرہ میں موجود ہیں۔ اسی افراط و تفریط کے متعلق جناب امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا تھا: "یهلك فی صنفان محب غال و مبغض قال"۔ (نہج البلاغہ) "میرے حق میں دو قسم کے لوگ ہلاک و برباد ہوجائیں گے۔ حد سے بڑھانے والے (نادان) دوست، اور حد سے گھٹانے والے (بدبخت) دشمن"۔

اور ایسا ہی وقوع پذیر ہوا، جیسا کہ مشاہدہ اس امر کا شاہد ہے۔ ع

آنجا کہ عیاں است چہ حاجت بیان است

قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ غَیْرَ الْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ اَضَلُّوْا

و ابو جعفر محمّد بن علیؑ قتله المعتصم لعنه الله بالسم و علیؑ بن محمدؑ قتله المتوکل لعنه الله بالسم	اور جناب امام محمد تقی علیہ السلام کو معتصم عباسی ملعون نے زہر سے شہید کیا (۲۵ جمادی الثانی یا آخر ذوالقعدہ ۲۲۰ھ) اور امام علی نقی علیہ السلام کو متوکل عباسی ملعون نے زہر دغا سے شہید کیا (۳ رجب ۲۵۴ھ)

كَثِيرًا وَضَلُّوا عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ ﴿۷۷﴾ (سورۃ المائدۃ:۷۷)

غلو کے انواع و اقسام

مخفی نہ رہے کہ غلو کے مختلف و متعدد انواع و اقسام ہیں۔ سرکار علامہ مجلسیؒ نے ہفتم بحار صفحہ ۳۶۵ پر ان اقسام کا تذکرہ کیا ہے۔ بنظر اختصار صرف ترجمہ پر اکتفا کی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں: "جاننا چاہیے کہ نبی و امام علیہم السلام کے متعلق کئی طرح غلو متصور ہو سکتا ہے۔

① ان کو خدا قرار دیا جائے۔
② معبود و خالق ہونے میں ان کو خدا کا شریک سمجھا جائے۔
③ یہ کہا جائے کہ خدا نے ان کے اندر حلول کیا ہوا ہے۔
④ خدا ان کے ساتھ متحد ہے۔
⑤ یہ بزرگوار وحی و الہام کے بغیر علم غیب پر اطلاع رکھتے ہیں۔
⑥ حضرات ائمہؑ کو نبی تسلیم کیا جائے۔
⑦ یہ اعتقاد رکھا جائے کہ ان کی روحیں ایک دوسرے میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔
⑧ ان کی معرفت عبادتِ خداوندی سے بے نیاز کر دیتی ہے اور گناہ سے اجتناب کرنے کی تکلیف ختم ہو جاتی ہے۔

مذکورہ بالا اعتقادات میں سے کوئی عقیدہ رکھنا سراسر کفر و الحاد ہے اور دین سے خروج کا باعث ہے۔ جیسا کہ اس امر پر اَدِلّہَ عقلیہ، آیاتِ قرآنیہ، احادیثِ نبویہ، وولویہ دلالت کرتے ہیں۔ سطور بالا سے معلوم ہو چکا ہے کہ ائمہ طاہرینؑ نے ایسے اعتقادات رکھنے والے لوگوں سے اپنی برائت و بیزاری ظاہر فرمائی ہے۔ اور ان کے کفر کا حکم صادر فرما کر ان کے قتل کا حکم دیا ہے۔ پس اگر کوئی ایسی حدیث تمہارے گوش گزار ہو جس سے مذکورہ بالا عقائد باطلہ کا وہم ہوتا ہو تو اس کی کوئی مناسب تاویل کی جائے گی، یا اسے غالیوں کی افترا پردازی کا نتیجہ قرار دیا جائے گا۔ انتہی کلامہ رفع فی الخلد مقامہ

و الحسنؑ بن علیؑ العسکری قتله المعتمد لعنه الله بالسم و اعتقادنا ان ذلك جری علیهم علی الحقیقة

اور حضرت حسن عسکری علیہ السلام کو مُعتمد لعین نے زہر جفا سے شہید کیا (۸ ربیع الاول ۲۶۰ھ) ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ یہ قتل و شہادت کے حادثات ان حضرات معصومینؑ پر حقیقتاً جاری ہوئے

احتفظ بهذا خانه جوهر لطيف، ولا ينبئك مثل خبير۔

ضال ومُضل فرقہ مُفوّضہ کے عقائد کا بیان

کچھ ایسے نادان دعویداران محبّت بھی تھے جن کے اندر آثارِ غلُوّ موجود تھے اور ائمۂ اطہارؑ کو خدا کہنے کا جذبہ چٹکیاں لے رہا تھا۔ مگر کچھ ائمۂ طاہرینؑ کی منع اکید اور لعن شدید اور کچھ ظاہری شریعت کی حدود کا پاس ولحاظ مانع تھا۔ اس لیے کُھلّم کُھلّا طور پر تو ائمہؑ کی اُلُوہیّت کا اِدّعا نہ کیا مگر در پردہ ائمہؑ کے حق میں اکثر اوصافِ ربوبی کے قائل ہو گئے۔ اور یہودیوں کی طرح یہ عقیدہ اختراع کر لیا کہ خداوند عالم نے سرکار محمد و علی علیہما السلام کو خلق فرما کر باقی تمام عالم کے خلق کرنے مارنے اور جلانے، رزق دینے اور نہ دینے اور بارش برسانے، یا نہ برسانے۔ غرضیکہ بیماروں کو شفا دینے یا نہ دینے غرضکہ تمام عالم کے نظام کو برقرار رکھنے اور تدبیر عالم کا اہتمام کرنے کا معاملہ انہی بزرگواروں کے سپرد کر دیا ہے۔

سابقہ عقیدہ فاسدہ کو غلُوّ اور اس نظریہ کاسدہ کو اصطلاحِ شریعت میں "تفویض" کہا جاتا ہے۔ جس کے لغوی معنی سپرد کرنا ہیں۔ جو درحقیقت غلُوّ ہی کا ایک شُعبہ ہے اور اس بدعقیدہ کے شرعی مفاسد و مضار عقیدۂ غلُوّ سے کچھ کم نہیں ہیں۔ دونوں میں فرق اس قدر ہے کہ غالی بالکل خدا کے مُنکر اور مُفوّضہ خدا کے فی الجملہ قائل ہیں۔ اس عقیدہ کے لوگ بھی ائمۂ معصومینؑ کے زمانہ میں بکثرت موجود تھے۔ اس لیے ائمہ طاہرین صلوات اللہ علیہم اجمعین نے بڑی شد مد کے ساتھ اس نظریہ فاسدہ کو بھی رد فرمایا ہے۔ چنانچہ ان احادیث شریفہ کا ایک شمہ متن رسالہ میں مذکور ہے۔ اور کچھ ذیل میں آ رہا ہے۔

فرقہ مُفوّضہ کے عقائد کی رد بچند وجہ اشد ضروری ہے

اور اس کے چند وجوہ ہیں۔

اولاً: سرکار محمد و آلِ محمد علیہم السلام کا خدا نہ ہونا۔ ان میں علاماتِ مخلوقین اور سماتِ مصنُوعین کے پائے جانے کی وجہ سے ایسا بدیہی و ضروری امر ہے کہ اس کی رد محتاجِ بیان نہیں ہے۔ کیونکہ کوئی صحیح الفطرت اور صحیح الدماغ آدمی علاماتِ مخلوقیّت کے ہوتے ہوئے مخلوق کو خالق اور آثارِ عُبودیّت کو

و انه ماشبه للناس امرهم کما یزعمه من یتجاوز الحد فیهم من الناس بل شاهدوا قتلهم علی الحقیقة و الصحة لا علی الحسبان

اور ان کا معاملہ لوگوں پر مشتبہ نہیں ہوا۔ جیسا کہ ان حضرات کے بارے میں حد سے تجاوز کرنے والوں کا گمان ہے، بلکہ لوگوں نے حضرات معصومینؑ کو حقیقتاً اپنی آنکھوں سے شہید ہوتے دیکھا تھا۔

دیکھنے کے باوجود عبد[1] کو معبود نہیں کہہ سکتا۔ ہاں البتہ: ع

اذا لم یکن للمرء عین صحیحة فلا غرو ان یرتاب و الصبح مسفر

ثانیاً: اس وقت غالی فرقے اکثر و بیشتر منقطع اور ختم ہو چکے ہیں۔ اور سوائے بعض مقامات میں خال خال پائے جانے کے کہیں ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا۔ بخلاف مُفوّضہ کے کہ وہ ہر جگہ موجود ہیں اور خود ہمارے ملک میں ایسے بدعقیدہ لوگوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔

ثالثاً: کُھلّم کُھلا اُلُوہیتِ ائمہؑ کا عقیدہ ایسا غیر مانوس اور واضح البطلان ہے کہ لوگوں کا اس کی طرف کوئی خاص میلان و رجحان نہیں ہوتا۔ اس لیے لوگ اس بدعقیدہ کا بہت کم شکار ہوتے ہیں۔ مگر عقیدہ تفویض بظاہر ایسا خوش آیند نظریہ ہے کہ وہ طبائع جو غُلُوّ کی طرف مائل ہیں اسے بہت پسند کرتی ہیں اور جلد اسے قبول کر لیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ایسا کوئی ایک بدعقیدہ آدمی کہیں موجود ہو تو وہ بیسیوں سادہ لَوح اہلِ ایمان کے ایمان پر ڈاکا ڈال کر ان کو گمراہ کر دیتا ہے۔ لہٰذا یہ بدعقیدہ مُتعدّی

[1] بعض آثار و اخبار میں منقول ہے کہ ایک جاثلیق (نصاریٰ کا بڑا عالم) حضرت امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں عبدیّت و معبودیّت عیسیٰؑ کے بارہ میں مناظرہ کرنے کے لیے حاضر ہوا، تو آپ نے فرمایا: اے نصرانی! خدا کی قسم ہم اس عیسیٰؑ کی نبوّت کے ضرور قائل ہیں جو جناب محمد مصطفیٰ ﷺ کی نبوّت کا مُعترف تھا، اور ہمیں آپ کے عیسیٰؑ پر بجز اس کے اور کوئی اعتراض نہیں ہے کہ وہ صوم و صلوٰۃ وغیرہ عبادات کا پابند نہ تھا۔ جاثلیق نے خشمناک ہو کر کہا کہ آپ نے جناب عیسیٰؑ کی طرف وہ بات کس طرح منسُوب کر دی ہے جو ان کے شایانِ شان نہیں۔ حضرت عیسیٰؑ تو ہمیشہ دن کو روزہ رکھتے اور تمام شب عبادت میں گزارتے تھے۔ پس جب آپ نے جاثلیق سے یہ اقرار لے لیا تو فوراً فرمایا: اگر جناب عیسیٰؑ خود خدا و معبود تھے تو پھر یہ عبادت کس کی کرتے تھے؟ اور اگر وہ عبد نہیں تھے تو پھر اپنے لیے ایک معبود تسلیم کر کے اس کی عبادت و اطاعت میں اس قدر تعب و مُشقت کیوں برداشت کرتے تھے؟ کلام امام عالی مقام سُن کر نصرانی عالم مبہوت ہو کر رہ گیا۔ (از حدیقہ سلطانیہ) قطع نظر دیگر ادلّہ و براہین کے یہی اقناعی دلیل ان لوگوں کے زعم باطل کے بطلان کے لیے کافی و وافی ہے، جو جناب رسولِ خدا یا دُوسرے ائمہٴ ہُدیٰ کی اُلُوہیّت کے قائل ہیں کہ اگر یہ حضرات قدسی صفات خود الٰہ و معبود تھے تو یہ روزہ کس ذات کے لیے رکھتے تھے؟ اور علاوہ واجبی نمازوں اور ان کے نوافل مرتبہ کے ہزار ہزار رکعت نماز نوافل کس معبود کے لیے پڑھتے تھے؟ اور دیگر عبادات کس خدا کے لیے کرتے تھے؟ بل عباد مکرمون لا یسبقونه بالقول و هم بامره یعملون۔

و الخيلولة و لا على الشك و التهمة فمن زعم انهم شبهوا او واحد منهم فليس من ديننا على شئ و نحن عنه براء و قد اخبر	نہ یہ کہ صرف گمان وخیال کی بنا پر ان کی شہادت کا نظریہ قائم کیا تھا۔ جو شخص یہ گمان کرے کہ یہ حضرات یا ان میں سے کوئی ایک بزرگ حقیقتاً شہید نہیں ہوا بلکہ ان کی شبیہ کے ساتھ ایسا ہوا تو وہ ہمارے دین سے خارج ہے اور ہم اس سے بیزار ہیں

مرض کی طرح قوم کے رگ و ریشہ میں برابر سرایت کر رہا ہے اور بعض "نیم مُلّا خطرۂ ایمان" کے مصداق نام نہاد مُبلّغین جلتی پر تیل چھڑکنے کا کام کر رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے سادہ لوح افرادِ ملّت بری طرح اس عقیدۂ فاسدہ میں مُبتلا ہو رہے ہیں۔ جس کی روک تھام کا انتظام ہر ہمدرد قوم و ملّت اہلِ علم و ایمان کا اوّلین فرض ہے۔ اس لیے ہم ذیل میں اس فرقہ ضالّہ و مُضِلّہ کے نظریہ کے بطلان کی طرف عنانِ بیان کو پھیرتے ہوئے قدرے تفصیل سے اس پر تبصرہ کرتے ہیں۔

مُفوّضہ کی مذمت ارشاداتِ ائمہؑ کی روشنی میں

① حضرت امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: "من زعم ان الله يفعل افعالنا ثم يعذبنا عليها فقد قال بالجبر و من زعم ان الله عزوجل فوض امر الخلق و الرزق الى حججه فقد قال بالتفويض و القائل بالجبر كافر و القائل بالتفويض مشرك"۔ "جو شخص یہ گُمان کرتا ہے کہ خُدا ہی ہمارے افعال کا فاعل ہے اور پھر ہمیں عذاب بھی کرے گا تو وہ جبر کا قائل ہے اور جو یہ گُمان کرتا ہے کہ خُداوند عالم نے خلق کرنا اور رزق دینا اپنی حُجتوں (ائمہ طاہرینؑ) کے سپرد کر دیا ہے وہ تفویض کا قائل ہے۔ جبر کا قائل کافر اور تفویض کا قائل مُشرک ہے"۔ (عیون اخبار الرضاؑ)

② حُسین بن خالد ایک طویل روایت کے ضمن میں جناب امام رضا علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ آنجنابؑ نے اُن سے فرمایا: "یابن خالد انما وضع الاخبار عنا فی التشبيه و الجبر الغلاة الذين صغروا عظمة الله تعالىٰ فمن احبهم فقد ابغضنا و من ابغضهم فقد احبنا و من والا هم فقد عادانا و من عاداهم فقد والانا و من وصلهم فقد قطعنا و من قطعهم فقد وصلنا و من جفاهم فقد برنا و من برهم فقد جفانا و من اكرمهم فقد اهاننا و من اهانهم فقد اكرمنا و من قبلهم فقد ودنا و من ودهم فقد قبلنا و من احسن اليهم فقد اساء الينا و من اساء اليهم فقد احسن الينا و من صدقهم فقد كذبنا و من كذبهم فقد صدقنا و من اعطاهم فقد حرمنا و من حرمهم فقد اعطانا يابن خالد من كان من شيعتنا فلا يتخذن منهم وليا و لا نصيرا"۔ "اے فرزند خالد! جبر و تشبیہ کے متعلق ہماری طرف جو اخبار منسوب ہیں یہ غالیوں نے

النبی و الائمة انهم مقتولون فمن قال انهم لن یقتلوا فقد کذبهم و من کذبهم فقد کذب اللہ عزوجل و کفر	یہ اس لیے کہ خود سرور کائنات ﷺ اور ائمۂ اطہار علیہم السلام نے پہلے سے خبر دی تھی کہ ہم سب قتل کیے جائیں گے بایں ہمہ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ یہ حضرات قتل نہیں ہوئے تو در حقیقت ایسا شخص خود ان بزرگواروں کو جھٹلاتا ہے اور جس نے ان کو جھٹلایا اس نے گویا خدا کو جھٹلایا اور خدا کو جھٹلانے والا

وضع کی ہیں ۔ وہ غالی جو اللہ سبحانہ کی عظمت وجلالت کو گھٹاتے ہیں ۔ پس جو شخص ان سے محبت کرتا ہے وہ ہم سے بغض رکھتا ہے اور جو ان سے بغض رکھتا ہے وہ ہم سے محبت کرتا ہے جو ان سے دوستی رکھتا ہے وہ ہم سے دشمنی رکھتا ہے اور جو ان سے دشمنی رکھتا ہے وہ ہم سے دوستی رکھتا ہے ۔ جو ان سے وصل کرتا ہے وہ ہم سے قطع کرتا ہے اور جو ان سے قطع تعلق کرتا ہو وہ ہم سے وصل کرتا ہے ۔ جو ان پر جفا کرتا ہے وہ ہم سے نیکی کرتا ہے اور جو ان کے ساتھ نیکی کرتا ہے وہ ہم پر جفا کرتا ہے ۔ جو ان کا اکرام و احترام کرتا ہے وہ ہماری توہین کرتا ہے اور جو ان کی توہین کرتا ہے وہ ہمارا احترام کرتا ہے ۔ جو انھیں قبول کرتا ہے وہ ہمیں رد کرتا ہے اور جو ان کو ٹھکراتا ہے وہ ہمیں قبول کرتا ہے ۔ جو ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے وہ ہم سے برا سلوک کرتا ہے اور جو ان سے برا سلوک کرتا ہے وہ ہم سے اچھا سلوک کرتا ہے ۔ جو ان کی تصدیق کرتا ہے وہ ہماری تکذیب کرتا ہے اور جو ان کی تکذیب کرتا ہے وہ ہماری تصدیق کرتا ہے ۔ جو ان کو دیتا ہے وہ ہمیں محروم کرتا ہے اور جو ان کو محروم کرتا ہے وہ ہمیں عطا کرتا ہے ۔ اے فرزند خالد! جو شخص ہمارے شیعوں میں سے ہے، اس پر لازم ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بنائے ۔ (عیون اخبار الرضاؑ، احتجاج طبرسیؒ)

فرقۂ مُفوّضہ فرقۂ غالیہ کی ایک قسم ہے

شاید کوئی کوتاہ اندیش یہ خیال کرے کہ اس روایت میں تو غالیوں کی مذمت کی گئی ہے، اسے مُفوّضہ کی مذمّت کے ساتھ کیا ربط ہے؟ ازالۂ اشتباہ کے لیے واضح رہے کہ اربابِ بصیرت جانتے ہیں کہ غُلوّ کلّی مُشکّک ہے اور اس کے تحت افرادِ کثیرہ ہیں ۔ بعض ضعیف اور بعض شدید ۔ تفویض بھی اسی غُلوّ کا ایک فرد ہے ۔ بالفاظِ سادہ غالیوں کی کئی قسمیں ہیں ۔ مُفوّضہ بھی انہی کی ایک قسم ہے ۔

① چنانچہ حضرت شیخ مُفید علیہ الرحمہ (شرح عقائد صفحہ ۲۱۱ میں) فرماتے ہیں: "المفوضة صنف من الغلاة و قولهم الذی فارقوا به من سواهم من الغلاة اعترافهم بحدوث الائمة و خلقهم و نفی القدم

به و خرج به عن الاسلام وَمَنۡ يَّبۡتَغِ غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِيۡنًا فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡهُ ۚ وَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ و كان الرضاؑ يقول فى دعائه اللهم انى ابرء اليك من	دائرۂ اسلام سے خارج ہے اور جو شخص دینِ اِسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرے گا اس کا دین قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا (آل عمران :۸۵) جناب امام رضا علیہ السلام اپنی دُعا میں کہا کرتے تھے: بارِالٰہا! میں تیرے حضور میں اپنی ہر قسم کی طاقت وقوّت سے بیزاری ظاہر کرتا ہوں

عنھم"۔ یعنی "مُفوّضہ غالیوں کا ہی ایک گروہ ہے۔ ان میں اور مکمل غالیوں میں صرف اتنا فرق ہے کہ یہ ائمہ اطہار کو قدیم نہیں جانتے اور ان کو مخلوق تسلیم کرتے ہیں۔

۳ شیخ فضل اللہ نوری حاشیہ "اوائل المقالات" مصنّفہ شیخ مُفید صفحہ ۶۷ طبع ایران میں رقمطراز ہیں: "وھم فرقۃ من الغلاۃ" یعنی "مُفوّضہ غالیوں کا ہی ایک فرقہ ہے۔

اسی طرح صاحبِ "معارف الملۃ الناجیہ و الناریہ" نے بھی مُفوّضہ کو غالیوں کی ایک قسم قرار دیا ہے۔ ان کی اصل عبارت یہ ہے: "غلاۃ ایشاں کسانے اندکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مع علیؑ و ائمہؑ دیگر را خدا بدانند چہ عینا چہ باتحاد چہ بتفویض یا علیؑ و ائمہؑ و افضل از رسولؐ بدانند نزد امامیہ اثنا عشریہ کلھم کفار اند و ایں غلاۃ فرقات دارند"۔

صفحہ ۵۹ سے صفحہ ۶۷ تک ان فرقوں کا تذکرہ فرمایا ہے اور صفحہ ۶۱ پر مُفوّضہ کو بھی انہی غلاۃ کے فرقوں میں شمار کیا ہے۔ فراجع۔ بنابریں جن احادیث میں غالیوں کی مذمّت وارد ہوئی وہ مُفوّضہ کو بھی شامل ہے۔

۴ انہی حضرتؑ سے مروی ہے آپؑ کے خادم خاص جناب یاسر بیان کرتے ہیں: "قلت للرضاؑ: ما تقول فى التفويض فقال ان الله تبارك و تعالىٰ فوض الى نبيه امر دينه فقال ما آتاكم الرسول فخذوه و ما نهاكم عنه فانتهوا اما الخلق و الرزق فلا ثم قال ان الله عزوجل خالق كل شئ و هو يقول عزوجل الذى خلقكم ثم رزقكم ثم يميتكم ثم يحييكم هل من شركائكم من يفعل من ذالكم من شئ سبحانه و تعالىٰ عما يشركون"۔ (سابع بحار الانوار) "میں نے جناب امام رضا علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ آپؑ تفویض کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ فرمایا: خداوند عالم نے امورِ دین کو اپنے نبیؐ کے سپرد کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: جس چیز کا رسولؐ تمھیں حکم دیں اس پر عمل کرو اور جس چیز سے روک دیں اس سے باز رہو۔ لیکن پیدا کرنے، رزق دینے اور تقسیم کرنے کا معاملہ اس نے ان کے سپرد نہیں کیا۔ پھر فرمایا:

الحول و القوۃ و لا حول و لاقوۃ الا	کیونکہ تُو ہی ہر قسم کی طاقت و قُوّت کا سرچشمہ ہے۔ یا اللہ!
بك اللھم انی ابرء الیك من الذین	میں ان لوگوں سے اپنی برائت کا اظہار کرتا ہوں جو ہمارے
قالوا فینا ما لم یعلمه فی انفسنا	بارے میں ایسی باتیں کہتے ہیں جو ہم اپنے اندر نہیں پاتے

خدا تعالیٰ ہر شے کا خالق ہے۔ چنانچہ اس کا ارشاد ہے: وہی تمھارا خدا ہے، جس نے تمھیں پیدا کیا، پھر رزق دیا، پھر تمھیں مارے گا، پھر زندہ کرے گا۔ کیا تمھارے مقرر کردہ شریکوں میں سے کوئی ایسا ہے جو ان اُمور میں سے کوئی کام انجام دے سکے؟ خُداوند عالم مُشرکین کے شرک سے پاک و پاکیزہ ہے۔
(سورۂ روم: ۴۰)

④ جناب کشی اپنے رجال میں اپنے سلسلۂ سند سے روایت کرتے ہیں کہ حجر بن زائدہ اور عامر بن خداعہ حضرت صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ فلاں شخص یہ کہتا ہے: "انکم تقدرون ارزاق العباد؟ فقال: واللہ ما یقدر ارزقنا الا اللہ و لقد احتجت الی طعام لعیالی فضاق صدری و ابلغ الی الفکرۃ فی ذلك حتی احرزت قوتھم فعدھا طابت نفسی لعنه اللہ و بری اللہ منه"۔ "کہ آپ لوگوں کے رزق مُقدّر مقرر کرتے ہیں؟ امام نے یہ سُن کر فرمایا: خُدا کی قسم سوائے خُدا کے خود ہمارا رزق اور کوئی مُقدّر نہیں کرتا۔ مجھے اپنے اہل وعیال کے لیے طعام کی ضرورت لاحق ہوئی، یہاں تک کہ میرا سینہ تنگ ہونے لگا۔ جب ان کی قُوت لایمُوت کا اِنتظام کرلیا ہے تب طبیعت میں سُکون پیدا ہُوا ہے۔ خُدا اس شخص پر لعنت کرے اور اس سے بیزار ہو۔ (وہ کتنا غلط عقیدہ رکھتا ہے۔)
(رجال کشی صفحہ ۲۰۷)

ابطالِ تفویض قرآن کی روشنی میں

قرآن مجید میں بکثرت ایسی آیاتِ مبارکہ موجود ہیں جو بعبارۃُ النص اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ خلق کرنا اور رزق دینا، مارنا، جِلانا (زندہ کرنا) اور بیماروں کو شفا دینا وغیرہ امورِ تکوینیّہ کی انجام دہی ذاتِ ایزدی سے وابستہ ہے۔ اس نے یہ امور کسی بھی مخلوق کے سپرد نہیں فرمائے۔ نہ استقلالی طور پر اور نہ غیر استقلالی طور پر۔ صرف بطور نمونہ چند آیاتِ مبارکہ پیش کی جاتی ہیں۔ ارشادِ قدرت ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿٢١﴾ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۖ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٢﴾ (سورۃ البقرۃ: ۲۱و۲۲)

اللھم لك الخلق و منك الامر و ایاك نعبد و ایاك تستعین اللھم انت خالقنا و خالق أبائنا الاولین و أبائنا الأخرین اللھم لا تلیق الربوبیة

اے اللہ! خلق کرنا اور حکم دینا تجھ ہی سے متعلق ہے۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔ تو ہی ہمارا خالق اور ہمارے اوّلین و آخرین آباء واجداد کا خالق ہے۔ اے اللہ! مقام ربوبیت تیرے ہی لائق ہے

اے لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو اور ان لوگوں کو جو تم سے پہلے تھے پیدا کیا۔ عجب نہیں تم پرہیزگار بن جاؤ، جس نے تمھارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا۔ اور آسمان سے پانی برسایا۔ پھر اسی نے تمھارے کھانے کے لیے بعض پھل پیدا کیے۔ پس کسی کو خدا کا ہمسر نہ بناؤ، حالانکہ تم خوب جانتے ہو۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ یُحْیِیْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ یَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَیْءٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۴۰﴾ (سورۃ روم: ۴۰)

خدا وہ (قادر و توانا) ہے جس نے تم کو پیدا کیا۔ پھر اس نے روزی دی، پھر وہی تم کو مار ڈالے گا۔ پھر وہی تم کو (دوبارہ) زندہ کرے گا۔ بھلا تمھارے بنائے ہوئے (خدا کے) شریکوں میں سے کوئی بھی ایسا ہے جو ان کاموں میں سے کچھ بھی کر سکے، جسے یہ لوگ (اس کا) شریک بناتے ہیں۔ وہ اس سے پاک اور برتر ہے۔

اس آیت مبارکہ کے ذیل میں حضرت علامہ مجلسیؒ فرماتے ہیں: "یدل علی عدم جواز نسبة الخلق و الرزق و الاماتة و الاحیاء الی غیرہ سبحانه و تعالیٰ و انه شرك"۔ (ہفتم بحار صفحہ ۳۳)

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ خلق کرنے، رزق دینے اور مارنے و جِلانے (زندہ کرنے) کی نسبت غیر خدا کی طرف دینا جائز نہیں ہے۔

اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَیْهِمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۶﴾ (سورۃ الرعد: ۱۶)

ان لوگوں نے خدا کے کچھ شریک ٹھہرا رکھے ہیں۔ کیا انھوں نے خدا ہی کی سی مخلوق پیدا کر رکھی ہے جن کے سبب مخلوقات ان پر مشتبہ ہوگئی ہے (اور ان کی خدائی کے قائل ہوگئے) تم کہہ دو کہ خدا ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی یکتا اور سب پر غالب ہے۔

الا بك و لا تصلح الالٰهية الا لك	اور معبودیّت و اُلُوہیّت کی صلاحیت فقط تجھ ہی میں ہے۔ اے
فالعن النصاریٰ الذین صغروا	پالنے والے! تو نصاریٰ پر لعنت کر۔ کیونکہ انھوں نے تیری
عظمتك و العن الضاهين	عظمت کو گھٹانے کی کوشش کی اور ان لوگوں پر بھی لعنت کر جو
لقولهم من بريتك	تیری مخلوق میں سے ان (نصرانیوں) کے ہم خیال ہیں

اس آیت مبارکہ کے ذیل میں علامہ مجلسیؒ فرماتے ہیں: "یدل علی عدم جواز نسبة الخلق الی الانبیاء والائمة علیہم السلام"۔ (بحار جلد ۷ صفحہ ۲۷۷)

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انبیاء کرام اور ائمہ علیہم السلام کی طرف خلق کرنے کی نسبت دینا جائز نہیں۔

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ (سورۃ الرعد:۲۶)

خدا ہی جس کے لیے چاہتا ہے روزی کو بڑھا دیتا ہے اور (جس کے لیے چاہتا ہے) تنگ کر دیتا ہے۔

وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ﴿۸۰﴾ (سورۃ الشعراء:۸۰)

اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو وہی مجھے شفا عنایت فرماتا ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِى الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ز وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ط بِيَدِكَ الْخَيْرُ ط اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۶﴾ (سورۃ اٰلِ عمران:۲۶)

(اے رسولؐ!) تم یہ دعا مانگو کہ اے خدا! تمام عالم کے مالک! تو ہی جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے۔ اور تو ہی جس کو چاہے عزّت دے اور تو ہی جسے چاہے ذِلّت دے۔ ہر قسم کی بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ بے شک تو (ہی) ہر چیز پر قادر ہے۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَىَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَىِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ط فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ج فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ج فَمَا ذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ج فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾

(سورۃ یونس:۳۱ و ۳۲)

اے رسول! تم (ان سے ذرا) پوچھو تو کہ تمھیں آسمان و زمین سے کون روزی دیتا

اللھم انا عبیدك و ابناء عبیدك	خداوندا! ہم تیرے بندے ہیں اور تیرے بندوں کی اولاد ہیں۔
لا نملك لانفسنا ضرا و لا نفعا و	ہم نہ اپنے نفع ونقصان کے مالک ہیں اور نہ ہی موت وحیات اور
لا موتا و لا حیوۃ و لا نشورا اللھم	مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر قدرت رکھتے ہیں بارِالٰہا!
من زعم ان لنا الخلق و علینا	جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ ہم پیدا کرتے اور روزی دیتے ہیں

ہے؟ یا (تمھارے) کان اور (تمھاری) آنکھوں کا کون مالک ہے؟ اور کون شخص مردے سے زندہ کو نکالتا ہے۔ اور زندہ سے مردے کو نکالتا ہے۔ اور ہر امر کا بندوبست کون کرتا ہے؟ تو فوراً بول اٹھیں گے کہ خدا۔ (اے رسولؐ!) تم کہو تو کیا تم اس پر بھی (اس سے) نہیں ڈرتے ہو؟ (ترجمہ فرمانؒ)

دلالة تلك الأيات على نفي الغلو و التفويض ظاهرة لا تحتاج الى البيان و الله المستعان۔

و ما يتبع الذين يدعون من دون الله شركاء ان يتبعون الا الظن و ان هم الا يخرصون

دینی امور میں تفویض کا بیان

مذکورہ بالا بعض احادیث مبارکہ میں چونکہ امور شریعت کی تفویض کا تذکرہ موجود ہے، لہٰذا اس پر کچھ تبصرہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سو مخفی نہ رہے کہ تفویض کے متعدد اقسام وانواع ہیں۔ چنانچہ سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے بحار ہفتم اور "مرآۃ العقول" میں اس کے سات اقسام شمار کیے ہیں۔ مگر اس کی بڑی بڑی دو قسمیں ہیں: ① تفویض امور تکوینیہ ② تفویض امور دینیہ۔ بالفاظِ دیگر ایک تفویض کا تعلّق دنیوی امور سے ہے اور دوسری کا تعلّق دینی امور سے۔ مذکورہ بالا حقائق سے دنیوی امور میں تفویض کا بطلان تو روزِ روشن کی طرح واضح وعیاں ہو چکا ہے کہ حضرات معصومینؑ نے اس نظریہ فاسدہ، کہ خدا نے مارنے، جِلانے، خلق کرنے، رزق دینے اور بیماروں کو شفا دینے کا کام ان کے سپرد کرنے کو غلط قرار دیا ہے۔ باقی رہی امور دینی کی تفویض، جس کا مطلب شریعت سازی اور قانون بنانا نہیں۔ کیونکہ شریعت سازی تو خداوند عالم کا کام ہے۔ لہٰذا احکام وضع تو وہ خود کرتا ہے لیکن اس کا بیان کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں حرام، یہ پیغمبر اسلامؐ کا وظیفہ ہے اور اس شریعت کی حفاظت وحراست اور تشریح وتوضیح رسولِ خداؐ کے حقیقی خلفاء علیہم السلام کا کام ہے۔ "و لكن ما يشاؤن الا ان يشاء الله" اسی طرح یہ امر بھی ان کی صوابدید پر منحصر ہے کہ کہاں حکم بیان کرنا ہے اور کہاں بیان نہیں کرنا، کس سائل کو جواب دینا ہے اور کس کو نہیں دینا۔ کہاں ظاہری شریعت کے مطابق حکم دینا ہے اور کہاں اپنے

الرزق فنحن اليك منه براء كبرائة عيسى ابن مريم عن النصارىٰ اللهم انا لم ندعهم الى مايزعمون فلا تواخذنا بما يقولون و اغفرلنا	ہم اس سے اسی طرح بری و بیزار ہیں جس طرح حضرت عیسٰیؑ ابن مریمؑ نصرانیوں سے بیزار تھے۔ یا اللہ! جن باتوں کا یہ لوگ ہمارے متعلق عقیدہ رکھتے ہیں ہم نے ان کو اس کی دعوت نہیں دی، اس لیے جو کچھ وہ کہتے ہیں ہم سے اس کا مواخذہ نہ کرنا اور جو وہ گمان فاسد کرتے ہیں ہمیں معاف فرمانا۔

علم پر عمل کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس کے متعلق متعدد احادیث وارد ہیں کہ اس قسم کی تفویض جناب رسولِ خداؐ اور ائمہ ہدیٰؑ کے حق میں صحیح ہے۔ ان احادیث میں سے ایک حدیث تو اوپر بیان ہو چکی ہے، دو چار مزید احادیث شریفہ پیش کی جاتی ہیں۔

اصول کافی میں تفویضِ احکام کے متعلق ایک پورا باب موجود ہے۔

کتاب کشف الغمہ (کذا فی البحار جلد ۷ صفحہ ۳۶۲) میں بروایت جابر بن عبداللہ انصاریؓ جناب رسولِ خداﷺ سے مروی ہے، فرمایا: "ان الله خلق السموات و الارض و دعاهن فاجبن فوض عليهن نبوتى و ولاية على بن ابى طالب فقبلتهما ثم خلق الخلق و فوض الينا امر الدين فالسعيد من سعد بنا و الشقى من شقى بنا نحن المحللون لحلاله و المحرمون لحرامه"۔ "خداوندعالم نے زمین و آسمان پیدا کیے اور ان کو (بطورِ استعارہ) اپنی طاعت کی طرف بلایا۔ انھوں نے لبیک کہا۔ پس ان پر میری نبوت اور جناب علیؑ بن ابی طالبؑ کی ولایت کو پیش کیا۔ انھوں نے اسے قبول کیا۔ پھر خلق کو پیدا کیا، اور دینی امور کو ہمارے سپرد کیا۔ پس نیک بخت وہ ہے جو ہماری وجہ سے نیک بخت ہوا ہے اور بد بخت وہ ہے جو ہماری وجہ سے بد بخت ہوا۔ ہم ہی اللہ کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام قرار دینے والے ہیں"۔

نیز اصول کافی میں جناب امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: "ان الله ادب نبيه على محبته فقال و انك لعلى خلق عظيم ثم فوض اليه دينه فقال عزوجل و ما اٰتاكم الرسول فخذوه و ما نهاكم عنه فانتهوا و قال عزوجل من يطع الرسول فقد اطاع الله و ان نبى الله فوض الى علىّ و ائتمنه فسلمتم و جحد الناس المخبر"۔ "خداوندعالم نے اپنے نبی کی اپنی محبت پر تربیت فرمائی، یہاں تک کہ ان کے حق میں فرمایا: تم خلق عظیم پر فائز ہو۔ پھر اپنے دین کو ان کے سپرد کیا۔ چنانچہ ارشاد فرماتا ہے: جس چیز کا رسول تمھیں حکم دیں اس کو تسلیم کرو، اور جس چیز سے منع کریں اس سے باز رہو۔ اور جناب رسولِ خداﷺ نے یہ امر علی مرتضیٰؑ کے سپرد کیا۔ پس تم نے (اے شیعو) اسے تسلیم کر لیا۔ مگر دوسرے لوگوں نے انکار کیا"۔

ما یزعمون رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا انک ان تذرھم یضلوا عبادک ولا یلدوا الا فاجرا کفارا و روی عن زرارة انه قال قلت

پالنے والے! تو زمین پر کسی کافِر کو زندہ نہ چھوڑ ۔ کیونکہ اگر تو انھیں زندہ چھوڑے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے (سورۃ نوح :٢٦) اور سوائے کافر اور فاسق و فاجر کے اولاد نہیں جنیں گے ۔ جناب زرارہ سے روایت ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت

اسی طرح بروایت محمد بن سنان جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: "ان اللہ تبارك و تعالیٰ ادب نبیه فلما انتهى به ما راد قال انك لعلى خلق عظيم ففوض اليه دينه فقال و ما اٰتاكم الرسول فخذوه و ما نهاكم عنه فانتهوا " ۔ مطلب وہی ہے جو اوپر ذکر ہو چکا ہے ۔ لقد جاءك الحق من ربك فلا تكونن من الممترين ۔

تفویض استقلالی وغیر استقلالی کا ابطال اور ایک تاویل علیل کی رد

وہ تفویض نواز حضرات جو قدرے محتاط تھے اور اپنی غلطی اور اہلِ ایمان کی گرفت کا اِحساس کرتے تھے، انھوں نے جب دیکھا کہ احادیثِ معصومینؑ میں بِالصّراحت نظریہ تفویض کی رد کی گئی ہے تو انھوں نے بڑے غور وفکر کے بعد اپنے عقیدۂ فاسدہ کی صحت کے لیے ایک تاویل تراش کی اور وہ یہ کہ تفویض کی دو قسمیں ہیں ۔ تفویض اِستقلالی اور تفویض آلی (غیر استقلالی) پھر کہا تفویض ممنوع وہ ہے کہ ان بزرگواروں کو اس طرح مُدبّر بِالذّات اور خالق و رازق بِالاستقلال تسلیم کیا جاوے کہ جس سے خدا کا بےکار اور معطل محض ہونا لازم آئے ۔ لیکن اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ کرتا تو سب کچھ خدا ہے مگر ان بزرگواروں کے ذریعہ سے کرتا ہے، یہ اس کے آلۂ کار ہیں ۔ خلق و رزق اور اماتت و احیاء وغیرہ امور کا ظہور ان سے ہوتا ہے، یہ حضرات جو کچھ کرتے ہیں وہ اذن و مشیّتِ ایزدی کے ماتحت کرتے ہیں ۔ لہٰذا یہ کہنا کہ وہ بِاذنِ اللہ خلق کرتے ہیں اور بِاذنِ اللہ رزق دیتے ہیں اور بمشیتِ الٰہی مارتے اور جلاتے ہیں تو یہ تفویض ممنوع نہیں ہے ۔

یہ تاویل بچند وجہ علیل اور نا قابلِ قبول ہے

وجہ اول: یہ تاویل بلا دلیل ہے اور اگر ایسی بے حقیقت تاویلات پر اعتماد کیا جائے تو دنیا میں کوئی کافر، کافر ہی نہیں رہے گا ۔ کیونکہ قرآن شاہد ہے کہ جب کفار سے پوچھا جاتا تھا کہ تم اللہ کو

للصادق ان رجلا من ولد عبدالله بن سبا یقول بالتفویض فقال ما التفویض؟ فقلت یقول ان الله عزو جل خلق محمدا

میں عرض کیا: کہ عبداللہ بن سبا کی اولاد میں سے ایک شخص تفویض کا عقیدہ رکھتا ہے۔ امامؑ نے فرمایا! تفویض کیا ہے؟ میں نے کہا: وہ کہتا ہے کہ خداوند عالم نے صرف حضرت مُحمّد مُصطفےٰؐ و علی مرتضیٰؑ کو پیدا کیا

چھوڑکر بُتوں کی پرستش کیوں کرتے ہو؟ تو وہ یہ جواب دیتے تھے: "ما نعبدھم الا لیقربونا الی الله زلفی" (سُورۃ زُمر: ۳) (ہم ان بُتوں کو مستقل معبود سمجھ کر ان کی پرستش نہیں کرتے بلکہ اس لیے ان کی عبادت کرتے ہیں کہ وہ ہمیں خدا تعالیٰ کے قریب کر دیں"۔

دیکھیے (کفار و مشرکین) کس صراحت کے ساتھ بتوں کے معبود برحق ہونے کی نفی اور ان کے وسیلہ و واسطہ ہونے کا اقرار کر رہے ہیں۔ مگر بایں ہمہ خدا اور رسولؐ نے ان کے اس عذر کو قبول نہ کیا۔ کیونکہ ان کا یہ نظریہ من گھڑت تھا۔ بلاتشبیہ یہی حال ان حضرات کی اس تاویل کا ہے کہ یہ من گھڑت ہے اور بلا شاہد اور بلا دلیل ہونے کی وجہ سے نا قابلِ قبول ہے۔

وجہ دوم: اُوپر مُتعدّد احادیث ذکر ہو چکی ہیں کہ جن میں اُمورِ دین کی تفویض کے صحیح ہونے کا تذکرہ موجود ہے۔ اور انہی احادیث میں سے بعض کے اندر دُنیوی اُمور کی تفویض کی نفی وارد ہے۔ اس تقابل سے روزِ روشن کی طرح واضح و آشکار ہو جاتا ہے کہ اُمورِ دین میں جس قسم کی تفویض ثابت ہے اسی قسم کی تفویض اُمورِ دُنیا میں باطل ہے۔ پس اگر اُمورِ دین میں تفویض سے مُراد تفویض استقلالی اور بالذّات ہے کہ رسُولِ خُداؐ اور ائمۂ ہدیٰؑ بالذّات اور بالاستقلال احکامِ شریعت بناتے اور بیان کرتے ہیں اور خدوند عالم (معاذ اللہ) بے کار محض اور مُعطّل بحت ہے تب تو دُنیوی اُمور میں جو تفویض ممنوع ہے اس کا بھی وہی مطلب ہو گا جو اس تاویل میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اگر اُمورِ شرعیہ میں تفویض کے یہ معنی ہیں کہ احکام خُدا وضع کرتا اور بناتا ہے، شریعت سازی اسی کا کام ہے۔ ہاں اس کے حلال و حرام کا بیان نبی و امام کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم اُوپر بیان کر چکے ہیں تو اس کے بالمقابل دُنیوی اُمور میں جو تفویض ممنوع ہے اس سے مُراد بھی یہی غیر استقلالی اور آلی تفویض ہوگی اور اس کی نفی سے تفویض استقلالی کا بطلان بطریقِ اَولیٰ واضح و عیاں ہو جائے گا۔ ع

و بضدھا تتبین الاشیاء

اگر اس تفویض استقلالی و غیر استقلالی میں کوئی فرق ہوتا کہ پہلی قسم غلط اور دوسری صحیح ہوتی،

و عليا ثم فوض الامر اليهما	اس کے بعد تمام اُمور کی باگ ڈور اُن کے حوالے کر دی۔ اب
فخلقا و رزقا و احيا و اماتا	یہی دونوں بزرگوار پیدا کرتے ہیں۔ یہی روزی دیتے ہیں،
فقال كذب عدو الله	یہی زندہ کرتے ہیں اور یہی مارتے ہیں (یہ سُن کر) امام
اذا رجعت اليه فاقرء عليه	نے فرمایا: دشمن خدا جھوٹ کہتا ہے۔ جب تم اس کے پاس
الاية التى فى سورة الرعد	واپس جاؤ تو اس کے سامنے سورہ رعد کی یہ آیت تلاوت کرنا

جیسا کہ ان حضرات کا خیال ہے، تو پھر ضروری تھا کہ خُود معصومین علیہم السلام تفویض کی نفی اور مذمت کرتے وقت اس امر کی وضاحت فرما دیتے کہ تفویض ممنوع و مذموم وہ ہے جس سے خدا کی تعطیل لازم آئے۔ اور اگر یہ اعتقاد رکھا جائے کہ حضرات ائمہؑ باذن اللہ یہ سب کچھ کرتے ہیں تو یہ درست ہے لیکن احادیث میں یہ وضاحت موجود نہیں ہے، بلکہ علی الاطلاق دُنیوی اُمور میں تفویض کی نفی کی گئی ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر قسم کی تفویض خواہ استقلالی ہو اور خواہ غیر استقلالی، غلط ہے اور اس کا اعتقاد رکھنا باطل ہے۔

وجہ سوم: یہ تاویل بلا ضرورت اور بلا وجہ ہے۔ کیونکہ ایسی تاویل کی احتیاج اس وقت ہوتی، جب کہ ہمارے پاس دو قسم کی روایات موجود ہوتیں۔ جو سند اور صحت کے لحاظ سے مساوی ہوتیں۔ اور پھر ان میں سے بعض میں دُنیوی تفویض کا اثبات ہوتا اور بعض میں اس کی نفی وارد ہوتی۔ اس وقت البتہ اس قسم کی کسی تاویل کی گنجائش ہوسکتی تھی کہ ان روایات کے درمیان اس طرح جمع و توفیق کی راہ پیدا کی جاتی کہ جن روایات میں تفویض کا اثبات وارد ہے، ان سے مُراد تفویض غیر استقلالی ہے اور جن میں اس کی نفی وارد ہے ان سے مُراد تفویض استقلالی ہے۔ لیکن جب یہاں کوئی تعارض و اختلاف موجود ہی نہیں بلکہ جس قدر روایات مُعتبرہ ہیں وہ سب تفویض کی نفی پر دلالت کرتی ہیں تو پھر اس تاویل کا محل و مقام ہی کیا باقی رہ جاتا ہے؟ جب معصومینؑ نے علی الاطلاق تفویض کی نفی فرما دی ہے تو اس سے اس کے تمام اقسام و انواع کی نفی ہو جاتی ہے۔ لان نفی العام یدل علی نفی الخاص کما لا یخفی علی الخواص۔

وجہ چہارم: اگر بالفرض اخبار و آثار میں اس قسم کا تعارض واقع ہو بھی جاتا (جو کہ نہیں ہے جیسا کہ ہم نے ابھی اوپر بیان کیا ہے) تو بنا بر قانون تعادل و تراجیح نفی تفویض والی روایات ہی کو مقدم کیا جاتا۔ کیونکہ وہ ظاہر قرآن کے مطابق ہیں۔ کیونکہ خلق و رزق اور امانت و احیاء وغیرہ امور

ام جعلوا للہ شرکاء خلقوا کخلقه فتشابه الخلق علیہم قل اللہ خالق کل شئ و ھو الواحد القھار فانصرفت الی الرجل فاخبرته بما قال الصادقؑ	کیا انھوں نے خدا کے لیے کچھ ایسے شریک بنا لیے ہیں جو خدا کی طرح خلق کرتے ہیں اس لیے ان پر خدا اور شرکاء کی مخلوق مشتبہ ہوگئی ہے (اے پیغمبرؐ) تم ان سے کہہ دو کہ ہر چیز کا خالق اللہ ہی ہے جو یگانہ اور قہار ہے (سورۂ رعد:۱۶) زرارہؒ بیان کرتے ہیں کہ جب میں اس آدمی کے پاس گیا اور اسے کلام امام سے آگاہ کیا تو (وہ اس

قرآن میں خداوند عالم کے صفاتِ فعل میں سے شمار کیے گئے ہیں ۔ جیسا کہ بعض آیات مبحثِ توحید میں بیان ہوچکی ہیں اور بعض اسی باب میں متن رسالہ میں مذکور ہیں۔ اور **مسلمہ قاعدہ** ہے کہ اختلاف کے وقت ان روایات کو مقدم سمجھا جاتا ہے جو قرآن کے مطابق ہوں ۔ "کلما خالف کتاب اللہ فھو زخرف" ۔ ہر وہ حدیث جو قرآن کے مخالف ہو وہ باطل ہے ۔ (اصول کافی فرمان امام جعفر صادقؑ)

وجہ پنجم: بعض روایات میں غیر استقلالی تفویض کے ممنوع ہونے کی صراحت موجود ہے ۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: "من زعم انا خالقون بامر اللہ فھو کافر" ۔ "جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ ہم باذن اللہ خالق ہیں وہ کافر ہے"۔ (شرح الخطبۃ مصنفہ سید کاظم رشتی شیخی صفحہ ۳۲۲)

انہی حقائق کی بنا پر علماء اعلام نے تفویض غیر استقلالی کو بھی ممنوع قرار دیا ہے ۔ چنانچہ سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ ہفتم بحار میں تفویض کے اقسام بیان کرتے ہوئے تفویض استقلالی کو کفر و شرک قرار دینے کے بعد لکھتے ہیں کہ تفویض غیر استقلالی اگرچہ عقلاً ممکن ہے مگر احادیثِ معصومینؑ کے پیشِ نظر یہ بھی ممنوع ہے اور اس کا اعتقاد رکھنا غلط ہے ۔ ان کی عین عبارت یہ ہے: "وھذا وان کان العقل لا یعارضه کفافا لکن الاخبار السالفة تمنع من القول به فیما عدا المعجزات ظاھرا بل صراحًا مع ان القول به قول بما لا یعلم اذالم یرد ذلك فی الاخبار المعتبرة فیما نعلم" ۔ یعنی: "اس قسم کی تفویض اگرچہ بالکل عقل کے خلاف نہیں ہے مگر گزشتہ احادیث سوائے مقامِ اعجاز کے صراحۃً یہ اعتقاد رکھنے سے ممانعت کرتی ہیں۔ علاوہ بریں یہ نظریہ ایسا ہے کہ اس کی صحت وحقانیت کا علم و یقین نہیں ہے کیونکہ جہاں تک ہمیں علم ہے اس نظریہ کی صحت پر اخبارِ معتبرہ میں سے کوئی حدیث وارد نہیں ہوئی"۔

انہی سرکار نے اپنے رسالہ اعتقادیہ میں فرمایا ہے: "ولا تعتقد انھم خلقوا العالم بامر اللہ فانا قد نھینا فی صحاح الاخبار من القول به ولا عبرۃ بما رواہ البرسی وغیرہ من الاخبار الضعیفة" ۔ "یہ اعتقاد ہرگز نہ رکھو کہ ائمہ علیہم السلام نے خدا کے اذن سے اس عالم کو پیدا کیا ہے ۔ کیونکہ ہمیں صحیح السند

فکانما القت حجرا فقال و کانما خرس و قد فوض اللہ الی نبیه امر دینه فقال عزوجل و ما آتیکم الرسول فخذوہ و ما نھیکم عنه	طرح مبہوت ہوگیا کہ) گویا کہ میں نے اس کے مُنھ میں پتھر ٹھونس دیا اور گویا وہ گُونگا ہوگیا (کوئی جواب نہ دے سکا) ہاں البتہ خداوند تبارک وتعالیٰ نے اپنے شرعی اُمور اور دینی احکام کو اپنے نبی کے سپرد کیا ہے جیسا کہ وہ ارشاد فرماتا ہے: ہمارا رسول جو احکام تمھارے پاس لائے ان پر عمل کرو اور جن اُمور سے تمھیں روکے ان

احادیث میں یہ اعتقاد رکھنے کی مُمانعت کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں "برسی" وغیرہ نے جو ضعیف روایتیں نقل کی ہیں ان کا کوئی اعتبار نہیں"۔

مُتعلقہ مسئلہ میں صحیح شیعی عقیدہ

ایک وقت وہ تھا کہ اہلِ دین اپنے دینی عقائد واعمال کو معصومین صلوات اللہ علیہم اجمعین کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کرتے تھے۔ اور جن عقائد واعمال کی وہ بزرگوار تائید فرماتے ان پر وہ کاربند رہتے اور جن کی وہ تائید نہ فرماتے ان سے فوراً دست بردار ہوجاتے۔ اس قسم کے بیسیوں واقعات کُتبِ سِیَر وتواریخ کے اندر موجود ہیں۔ (ملاحظہ ہو اصول الشریعہ کا مقدمہ) مگر اب یہ حالت ہوچکی ہے کہ لوگوں نے مذہب وشریعت کو ایک کھلونا سمجھ رکھا ہے۔ جدھر چاہتے ہیں اس کو گیند کی طرح پھیر لیتے ہیں۔ ہر شخص نے اپنی خام عقل، ناقص رائے اور قلیل علم سے علیحدہ علیحدہ عقائد و نظریات تراش رکھے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ میرا خیال یہ ہے کہ فلاں عقیدہ اس طرح ہونا چاہیے۔ کوئی کہتا ہے کہ میری عقل یہ فیصلہ کرتی ہے کہ فلاں نظریہ اس طرح ہونا چاہیے۔ کوئی کہتا ہے کہ میری رائے میں فلاں مسئلہ اس طرح ہونا چاہیے۔ مگر کوئی خدا کا بندہ یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتا کہ شریعت مقدسہ نے اس سلسلہ میں کیا فیصلہ صادر کیا ہے جو کہ ایک مُتدیّن اِنسان کی شان ہونی چاہیے۔ بلکہ ذہنیتیں اس قدر بگڑ چکی ہیں اگر کوئی عالمِ دین شرعی فیصلہ کرے تو لوگ اپنے اوہام وظنون سے اس کی تکذیب کردیتے ہیں اور اپنے مزعومہ نظریات سے دست بردار نہیں ہوتے۔ والی اللہ المشتکی۔ اگر اس قسم کا مظاہرہ وہ لوگ کرتے جن کے مذہب کی اساس ہی قیاس پر قائم ہے تو کوئی جائے تعجب نہ تھی۔ افسوس تو اس امر کا ہے کہ آج کل جہالت و حماقت سے ایسی حرکات کا ارتکاب وہ لوگ بھی کر رہے ہیں جن کے مذہب کی بُنیاد ہی حُرمتِ رائے وقیاس پر قائم ہے اور جن کے دین کا سنگِ بُنیاد قرآن اور سرکار محمد وآل محمد علیہم السلام کے فرمان پر رکھا گیا ہے اور ایمان کا دار و مدار تمام اقوال و

فانتہوا و قد فوض ذلک الی الائمۃ و علامۃ للمفوضۃ و الغلاۃ و اصنافھم نسبتھم الی مشایخھم و علمائھم الی القول

سے باز رہو (سورۃ الحشر: ۷) یہی دینی احکام پیغمبرؐ کے بعد ائمہ اطہارؑ کو سونپے گئے ہیں۔ غالیوں اور تفویض کے قائل لوگوں کی علامت یہ ہے کہ وہ عُلماء و مشائخ قم کی جانب

افعال بلکہ تمام احوال ان بزرگواروں کے اتباع کو قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: "من سرہ ان تستکمل الایمان فلیقل القول منی فی جمیع الاشیاء قول آلِ محمد علیھم السلام فیما اسروا فیما اعلنوا و فیما بلغنی و فیما لم یبلغنی"۔ "جس شخص کو یہ امر پسند ہے کہ وہ کامل الایمان ہوجائے تو اسے چاہیے کہ یوں کہے میرا قول تمام اشیاء میں وہی ہے جو آل محمد علیہم السلام کا قول ہے۔ خواہ وہ قول ان اُمور کے متعلق ہو جن کو ان بزرگواروں نے پوشیدہ رکھا ہے اور خواہ ان کے متعلق ہو جن کو انھوں نے ظاہر فرمایا ہے اور خواہ ان امور کے بارہ میں ہو جو مجھے پہنچے ہیں یا ان کے بارہ میں ہو جو مجھ تک نہیں پہنچے"۔ (اصول کافی)

وہ کون سا عقدہ ہے جو احادیث رسولؐ و آلِ رسولؑ میں وا نہیں کر دیا گیا اور وہ کون سا صحیح عقیدہ ہے جو کھول کر بیان نہیں کر دیا گیا؟ فقط صدق دل سے ان کی بارگاہ قُدسی کی طرف رُجوع کرنا شرط ہے۔ چنانچہ ہمارے مُتعلقہ مسئلہ میں حُجۃُ اللہ علی العباد و بقیۃُ اللہ فی البلاد ولی العصر حضرت امام زمان عجل اللہ تعالیٰ فرجہ نے صحیح شیعی عقیدہ کی بڑی عمدہ وضاحت و صراحت فرمائی ہے۔ احتجاج علامہ طبرسیؒ میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ امام زمانہ کی غَیبتِ صُغریٰ میں جب کہ نوابِ اَربعہ میں سے جناب ابو جعفرؒ آنجنابؑ کے نائب خاص تھے، شیعوں میں اِختلاف ہو گیا کہ: "ان اللہ سبحانہ فوض الی اھل البیت امر الخلق و الرزق ام لا؟"۔ "آیا خلاقِ عالم نے خَلق و رِزق کا معاملہ ائمہ اہلِ بیتؑ کے سپرد کیا ہے یا نہ؟" ان میں سے ایک عمر رسیدہ شخص نے کہا تم جناب ابو جعفر کی طرف کیوں رُجوع نہیں کرتے تاکہ وہ حق و حقیقت کو تمھارے لیے واضح کریں۔ کیونکہ ان کی امام زمانہ تک رسائی ہے۔ سب نے اس رائے کو پسند کیا۔ چنانچہ سوال لکھ کر ان کے حوالہ کیا گیا اور جواب میں ناحیہ مقدسہ سے یہ توقیع مبارک صادر ہوئی: "بسم اللہ الرحمن الرحیم ان اللہ خلق الاجسام و قسم الارزاق لانہ لیس بجسم ولا حال فی جسم لیس کمثلہ شئ و ھو السمیع البصیر و اما الائمۃ فیسئلون اللہ فیخلق و یسئلونہ فیرزق ایجاباً لمسئلتھم و اعظاماً لحقھم"۔ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ...... خداوند عالم جسموں کا پیدا کرنے والا اور رِزقوں کا تقسیم کرنے والا ہے کیونکہ وہ نہ جسم رکھتا ہے اور نہ کسی جسم میں حلول کرتا ہے کوئی شے اس کی مثل و

التقصیر و علامة الحلاجیة من الغلاة دعوی التجلی بالعبادة مع تدینهم تبرك الصلوٰة و جمیع الفرائض و دعوی المعرفة

تقصیر کی نسبت دیتے ہیں۔ اور غالیوں میں سے فرقہ حلاجیہ کی پہچان یہ ہے کہ وہ اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ خداوند عالم عبادت کی وجہ سے بندوں میں ظہور کرتا ہے، بایں ہمہ نماز اور دیگر تمام واجبات شرعیہ کو ترک کرنا اس کا مذہب ہے، ان کا یہ

مانند نہیں۔ وہ سننے اور دیکھنے والا ہے۔ ائمہ اطہارؑ اس کی بارگاہ میں سوال کرتے ہیں، وہ پیدا کرتا ہے۔ یہ سوال کرتے ہیں تو وہ رزق دیتا ہے، وہ ان کے سوال کو قبول کرتے ہوئے اور ان کی شان کو بڑھاتے ہوئے ان کے سوال کو مسترد نہیں فرماتا"۔

حضرت امام زمانؑ کے اس توضیحی و تصریحی بیان حقیقت ترجمان سے واضح و عیاں ہوگیا کہ حضرات ائمہ طاہرینؑ کے متعلق یہ اعتقاد رکھنا کہ خلاقِ عالم نے اُمورِ تکوینیہ مثل خلق و رزق وغیرہ کی انجام دہی ان کے سپرد فرمائی ہے اور یہ ان کو انجام دیتے ہیں۔ یا خداوند عالم یہ اُمور ان کے ذریعہ سے انجام دیتا ہے، بالکل غلط اور باطل ہے اور ان ذواتِ مقدسہ کے حق میں افراط اور تجاوز عن الحد ہے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ ان حضرات کو اُمورِ تکوینیہ میں بالکل کوئی دخل نہیں، حتی کہ وہ ان امور میں شفاعت و سفارش بھی نہیں کرتے، یہ تفریط ہے اور ان کی فضیلت کا انکار اور سابقاً بیان ہو چکا ہے کہ افراط ہو یا تفریط، ہر دو مُہلک ہیں۔ نجاحِ دارین و فلاحِ کونین میانہ روی میں ہیں۔ اس درمیانہ راستہ کی امام عالی مقام نے اپنے بیان واجب الاذعان میں پوری وضاحت فرمادی ہے کہ ائمہ اطہارؑ کی دنیوی امور میں وہی حیثیت ہے جو ایک شفیع و وسیلہ کی ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ یہ بزرگوار بارگاہِ الٰہی میں سفارش کرتے ہیں اور خدائے عزوجل ان کی سفارش کو رد نہیں فرماتا۔ "ولکن ما یشفعون الا لمن ارتضی" (سورۃ الانبیاء: ۲۸) یہی آیتِ وسیلہ: "یا ایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ و ابتغوا الیه الوسیلة"۔ (سورۃ المائدہ: ۳۵) (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور بارگاہِ الٰہی تک پہنچنے کے لیے وسیلہ تلاش کرو) کا مفاد ہے کہ ہر چیز کا مرکز خداوند عالم ہے۔ ہاں البتہ وسیلہ و شفیع سرکار محمد و آلِ محمد علیہم السلام ہیں۔

بارگاہِ ربُّ العزت سے حاجت طلب کرنے کا طریقہ

بنابریں بارگاہِ قاضی الحاجات میں مدعا عرض کرنے کے دو طریقے شرعاً جائز ہیں۔ ایک یہ ہے (اور یہی طریقہ اولیٰ و اسلم ہے) کہ اولاد و رزق، صحت و عافیت اور طول عمر وغیرہ اُمور کا سوال براہِ راست بارگاہِ ربُّ العزت میں کیا جائے۔ مگر جناب رسولِ خداؐ اور دیگر ائمہ ہدیٰؑ کا واسطہ دے

باسماء اللہ العظمی و دعوی انطباع الحق لھم فان الولی اذا خلص و عرف مذھبھم فھو عندھم افضل من الانبیاء

بھی دعویٰ ہے کہ وہ خدا کے اسم اعظم کو جانتے ہیں۔ اس فرقہ کے لوگوں کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ خدا نے ان میں حلول کیا ہوا ہے اور ان کا یہ زعم فاسد بھی ہے کہ جب کوئی شخص مخلص ہو اور ان کے مذہب کی معرفت بھی پیدا کرلے تو وہ ان لوگوں کے نزدیک انبیاءؑ سے

کر مثلاً یوں کہا جائے: "اللھم بجاہ محمد و آلِ محمد وسع علی رزقی یا اعطی ولدا صالحا یا اشفنی و ھکذا" یہ طریقہ انبیاءؑ و مرسلینؑ اور عباداللہ الصالحینؑ کا معمول ہے اور یہی اَولیٰ و احسن ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ خطاب جناب رسولِ خداؐ اور ائمہ ہدیٰؑ علیہم افضل التحیۃ والثناء کو کیا جائے۔ مگر یہ کہا جائے کہ میرے یہ مطالب و مقاصد بارگاہِ ایزدی سے پورے کرادو، یہ طریقہ بھی بعض ادعیہ و زیارات اور روایات سے مُستفاد ہوتا ہے۔ مگر ائمہؑ طاہرینؑ کو مخاطب کر کے براہِ راست یہ کہنا کہ مجھے اولاد و رزق عطا کرو۔ میرے مرض کو دور کرو وغیرہ وغیرہ، کسی طرح بھی روا نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے تفویض ممنوع کی بو آتی ہے۔ و ان اجازہ بعض العلماء اذا کان قصد الداعی التوسل و الاستشفاع و لکن الاولی ترکہ لانہ یشم منہ رائحۃ التفویض و اللہ الھادی الی سواء السبیل۔

منشاء اشتباہ کی نشاندہی اور اس کا ازالہ

یہاں اس امر کا بیان کر دینا بھی فائدہ سے خالی نہیں ہے کہ اس عقیدۂ تفویض کے اختیار کرنے کا سبب اور باعث کیا چیز بنی؟ حالات کا بنظر غائر جائزہ لینے سے اس اشتباہِ عظیم کا منشاء ائمہؑ طاہرینؑ کے وہ کمالات و مُعجزات معلُوم ہوتے ہیں جو وقتاً فوقتاً ان حضرات سے مقامِ اِعجاز میں ظہور پذیر ہوتے رہے کہ کبھی کسی مردہ کو زندہ کر دیا، کبھی کسی مریض کو صحت دے دی وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا کوتاہ اندیش اور ظاہر بین لوگوں نے اس سے یہ سمجھ لیا کہ ان امور کی انجام دہی ان کے سپرد ہے اور یہ بزرگواران امور کو بطور وظیفہ انجام دیتے رہتے ہیں۔

درحقیقت مُعجزہ فعل خدا ہے نہ کہ فعل نبیؐ و امامؑ

مذکورہ بالا خیال بدو وجہ باطل اور محال ہے۔ وجہ اول: اعجاز میں جو کچھ کسی نبی یا ولی سے ظہور پذیر ہوتا ہے وہ اس نبی یا ولی کا فعل نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ "فعل اللہ" ہوتا ہے۔ چنانچہ مُعجزہ کی تعریف ہی یہ ہے: "ھی فعل اللہ یظھرہ اللہ علی ید نبیہ اولیہ اظھارا لصداقتہ"۔ مُعجزہ فعل خداوندی ہے۔ جسے وہ

و من علاماتہم ایضا دعوی علم الکیمیا و لا یعلمون منه الا الدغل تفقیض الشبه و الرصاص علی المسلمین اللهم لا تجعلنا منهم و لعنهم جمیعا ۔

بھی افضل ہوتا ہے۔ ان کے باطل دعووں میں سے ایک دعویٰ یہ بھی ہے کہ وہ علم کیمیا جانتے ہیں، حالانکہ وہ کچھ بھی نہیں جانتے۔ ان کا کام صرف دھوکا دینا (سونے اور چاندی کی شکل میں) پیتل اور قلعی سے مسلمانوں کو فریب دیتے ہیں ۔ اے خدا! ہمیں ان لوگوں میں شامل نہ کر اور ان تمام پر لعنت کر ۔

اپنے کسی نبی یا ولی کے ہاتھوں پر اس لیے ظاہر کرتا ہے اس کی صداقت ظاہر ہو جائے۔ اسی لیے جناب امام رضا علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: "لما ظهر من علی الفقر و الفاقة دل علی ان من هذه صفاته و شارکه فیها الضعفاء و المحتاجون لا تکون المعجزات فعله فعلم بهذا ان الذی اظهره من المعجزات فعل القادر الذی لا یشبه المخلوقین لا فعل المحدث المحتاج المشارك للضعفاء فی صفات الضعف"۔ "جب حضرت علی علیہ السلام سے فقر و فاقہ ظاہر ہوا تو اس سے ظاہر ہوا کہ جس شخص کے یہ صفات ہوں اور ان صفات میں ضعیف و محتاج لوگ اس کے ساتھ شریک ہوں ۔ یہ مُعجزات اس کا فعل نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ جس نے یہ مُعجزات ظاہر کیے ہیں وہ قادر و مُختار ہے جو کسی صفت میں مخلوق کے مشابہ نہیں ہے ۔ یہ اس حادث و محتاج کا فعل نہیں ہے جو صفات ضعف میں ضعفا کا شریک ہے"۔ (سابع بحار الانوار و احتجاج طبرسی)

حضرت صادق آل محمد علیہم السلام فرماتے ہیں: "المعجزة علامة الله لا یعطیها الا انبیائه و رسله و حججه لیعرف به صدق الصادق من کذب الکاذب"۔ (علل الشرائع جلد ۱ صفحہ ۱۱۴) "مُعجزہ خداوند عالم کی ایک خاص علامت ہے جو اپنے انبیاء و اوصیاء کو محض اس لیے عطا فرماتا ہے تاکہ اس کی وجہ سے صادق کا صدق اور کاذب کا کذب معلوم ہو جائے"۔

اس مطلب کی تائید مزید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے جو کتاب انوار نعمانیہ میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے دیکھا کہ حضرت امیرؑ جَو کی خشک روٹی کو گھٹنے پر رکھ کر توڑ رہے ہیں۔ اس نے از راہِ تعجب عرض کیا: یا امیر المؤمنینؑ! کیا یہ وہی کلائی نہیں ہے جس نے قلعہ خیبر کو اکھاڑا تھا؟ آنجنابؑ نے فرمایا: "قلعت باب خیبر بقوة ربانیة لا بقوة جسدانیة"۔ "میں نے بابِ خیبر کو قوتِ ربانی سے اکھاڑا تھا نہ کہ قوتِ جسمانی سے"۔

انہی حقائق کی وجہ سے علماء محققین نے تصریحات فرمائی ہیں کہ مُعجزہ کا فاعل حقیقی خداوند عالم

ہے۔ ہاں البتہ چونکہ اس کا ظہور نبی و امام کے ہاتھوں پر ہوتا ہے اس لیے مجازاً اسے نبی و امام کا فعل بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کا نازل کرنے والا خدا ہے۔ مگر چونکہ نازل جناب رسولِ خداؐ پر ہوا ہے، لہٰذا ان کا مُعجزہ سمجھا جاتا ہے۔

آتشِ نمرودی کو سرد خُدا نے کیا تھا (قلنا یا نار کونی بردا۔ سورۃ الانبیاء:۶۹) مگر چونکہ اس کا ظہور جناب خلیلِ خُداؑ کے ہاتھوں پر ہوا، اس لیے اسے ان کا مُعجزہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح ناقہ صالحؑ کو پتھر سے ظاہر خُدا نے کیا تھا مگر چونکہ بظاہر جناب صالحؑ نے یہ مُعجزہ دکھایا تھا، لہٰذا اسے ان کا فعل سمجھا جاتا ہے۔ حضرت داؤدؑ کے لیے لوہا نرم خدا نے کیا تھا، جبال وطیور کو مُسخّر خُدا نے کیا تھا، چنانچہ خود خدا فرماتا ہے (وکنا فاعلین۔ سورۃ الانبیا:۱۰۴) ہم ہی ان اُمور کے فاعل تھے۔ مگر چونکہ ان باتوں کا ظہور جناب داؤدؑ کے ہاتھ پر ہوا، اس لیے ان کا مُعجزہ کہلایا۔ حضرت مُوسٰیؑ کے لیے عصا کو سانپ خدا نے بنایا، اور پھر سانپ کو اپنی اصلی شکل پر لانے والا بھی خدا ہی تھا۔ (سنعیدھا سیرتھا الاولیٰ۔ سورۃ طٰہٰ:۲۱) مگر اسے مُعجزہ جناب مُوسٰیؑ کا قرار دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس خارق عادت امر کا ظہور آنجنابؑ کے ہاتھوں پر ہوا تھا۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس۔ بعد ازیں بھی اس حقیقت میں کوئی شک وشبہ باقی رہ جاتا ہے کہ مُعجزہ کا فاعل حقیقی خدا ہے؟

سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: "من زعم ان المعجزات والکرامات من فعل الانبیاء و الاولیاء فلیس فی کفرہ شك"۔ جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ مُعجزات اور کرامات انبیاءؑ اور اولیاءؑ کا ذاتی فعل ہیں اس کے کفر میں کوئی شک نہیں ہے۔ (علیٰ مانقلہ فی سبیل النجاۃ طبع ایران صفحہ ۴۱)

پس جب اعجاز کی یہ حقیقت ہے تو اس پر دیگر عام حالات کا قیاس کرنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح حضرت شیخ مُفیدؒ اپنے رسالہ نکت اعتقادیہ میں فرماتے ہیں: "المعجز فعل اللہ" کہ مُعجزہ فعل خدا ہوتا ہے۔

علامہ کراچکی کنز الفوائد میں لکھتے ہیں: "و الأیات التی تظھر علی ایدیھم ھی فعل اللہ دونھم اکرمھم بھا و لا صنع لھم فیھا"۔ "وہ آیات و مُعجزات جو ائمۂ اطہارؑ کے مقدس ہاتھوں پر ظاہر ہوتے ہیں وہ خدا کا فعل ہیں۔ خدا نے ان کے ہاتھوں پر ظاہر کر کے ان کی تکریم فرمائی ہے ان حضرات کو ان میں کوئی دخل نہیں ہے"۔

اور علامہ غفران مآبؒ فرماتے ہیں: "و اللہ سبحانہ ھو المظھر تصدیق النبی و الوصی"۔ (عماد الاسلام) "خداوند عالم نبی اور اس کے وصی کی صداقت ظاہر کرنے کے لیے مُعجزہ ظاہر کرتا ہے"۔

وجہ دوم: ثانیاً اس لیے کہ ہم جو یہ کہتے ہیں کہ خلق و رزق وغیرہ اُمور ائمہ طاہرینؑ کے سپرد نہیں ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ حضرات (باقدارِ الٰہی) ان اُمور کو انجام نہیں دے سکتے۔ تاکہ ان کے مُعجزات پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی لا حاصل سعی کی جائے کہ وہ ان اُمور کو انجام دے سکتے ہیں۔ کیونکہ ائمہ اطہارؑ کی شان تو بہت ارفع و اعلیٰ ہے ہم تو یہاں تک کہنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے کہ اگر قادرِ مُطلق چاہے تو اپنی قدرتِ کاملہ سے کسی معمُولی سی مخلوق کے ذریعہ سے بھی یہ کام کروا سکتا ہے۔ لیکن کلام اس میں ہے کہ کسی وقت بطورِ اعجاز کسی کام کا سرانجام دے دینا اور بات ہے اور کسی کام کو ڈیوٹی اور وظیفہ سمجھ کر ہمیشہ انجام دینا اور بات ہے۔ اس لیے ہم یہ تو کہتے ہیں کہ یہ بزرگوار مقامِ اعجاز میں وہ کام انجام دے سکتے ہیں اور دیتے ہیں جو طاقتِ بشری سے مافوق ہیں۔ مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان امور کی انجام دہی ان کا روز مرّہ کا وظیفہ اور ان کی انجام دہی ان کا منصب ہے۔ و بینہما بون بعید فاین ھذا من ذاک۔ ؎

هزار نکته باریک ترز مو ایں جا است نه هر که سر بتراشد قلندری داند

چند شکوک و شبہات کا ازالہ

اگرچہ اس مقام پر غیر معمُولی طوالت ہو رہی ہے۔ مگر اس خیال سے کہ یہ مبحث کسی طرح تشنۂ تکمیل نہ رہ جائے، یہاں ان شکوک و شبہات کا ذکر اور پھر ان کا ازالہ ضروری معلُوم ہوتا ہے جو وقتاً فوقتاً غلو و تفویض نواز حضرات سے سننے میں آتے ہیں، یا ایسے لوگوں کی کُتب میں مُتفرّق طور پر پائے جاتے ہیں، یا جن کو اس مقام پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے بڑی تحقیق و جستجو سے ان کو یہاں یک جا جمع کر دیا ہے اور پھر ان کے تحقیقی جوابات بھی پیش کر دیے ہیں۔ تاکہ تصویر کے دونوں رُخ سامنے آجائیں۔ لیھلک من ھلک عن بینة و یحیی من حی عن بینة۔

پہلا شُبہ

بظاہر سب سے قوی شبہ ان حضرات کا "خطبۃُ البیان" ہے جو حضرت امیر علیہ السلام کی طرف منسُوب ہے۔ جس میں مذکور ہے کہ آپؑ نے فرمایا: "انا منشی السحاب" یعنی میں ہوں بادلوں کا پیدا کرنے والا۔ "انا مفجر العیون انا مجری الانھار" یعنی میں ہوں چشمے نکالنے والا اور نہروں کا جاری کرنے والا۔ "انا مورق الاشجار" میں ہوں درختوں کو پتے دینے والا اور ان کو سرسبز کرنے والا۔ "انا داحی الارضین انا سماک السموت" میں ہوں زمینوں کا بچھانے والا اور آسمانوں کا بلند کرنے والا۔ "انا مخرج

المومنین من القبور " میں ہوں مومنوں کو ان کی قبروں سے نکالنے والا ۔"انا الذی بعثت النبیین و المرسلین " میں ہوں نبیوں اور رسولوں کو مبعوث کرنے والا ۔"انا فطرت العالمین " میں ہوں جملہ عوالم کو پیدا کرنے والا ۔"انا مضیء الشمس و مطلع الفجر و منشی النجوم و منشی الفلک فی البحر " ۔ میں ہوں سورج کو روشن کرنے والا، صبح کو نکالنے والا، ستاروں کو پیدا کرنے والا اور کشتیوں کو سمندروں میں چلانے والا ۔ "انا الباری انا المصور فی الارحام" میں ہوں پیدا کرنے والا میں ہوں رحموں میں بچوں کی تصویر کشی کرنے والا ۔"انا الذی کسوت العظام لحما" میں ہوں ہڈیوں پر گوشت کا لباس پہنانے والا ۔"انا احیی و امیت انا اخلق و ارزق انا السمیع العلیم انا البصیر" ۔ میں ہوں جِلانے والا اور مارنے والا، میں ہوں پیدا کرنے والا اور میں ہوں رزق دینے والا ۔ میں سمیع و علیم اور بصیر ہوں ۔"انا الذی حملت نوحا فی السفینة انا الذی نجیت ابراھیم " ۔ میں ہوں جناب نوحؑ کی کشتی میں سوار کرنے والا، اور جناب اِبراہیمؑ کو آتشِ نمرود سے نجات دینے والا ۔ الخ ۔

(کوکب دُرّی فی فضائل علیؑ)

پس معلوم ہوا کہ کائناتِ عالم کا نظام آنجنابؑ کے ہاتھ میں ہے ۔ اس کے متعلق جواباً عرض ہے کہ اس خطبہ سے تمسک کرنا اور اس پر اعتقاد کی بنیاد قائم کرنا بچند وجہ غلط اور بے بنیاد ہے ۔

خطبۃ البیان والے شبہ کا بچند وجہ جوابِ باصواب

وجہ اول: یہ خطبہ قانونِ روایت و درایت کی رو سے محض غلط ہے اور آنجنابؑ کا ہرگز کلام نہیں ہے ۔ عقائد و احادیث وغیرہ کی جس قدر ہماری مُعتبر مذہبی کتب ہیں ان میں اس خطبہ کا کہیں نام ونشان ہی نہیں پایا جاتا ۔ بالخصوص آنجنابؑ کے خطبات کے مستند مجموعہ نہج البلاغہ اور اس کے استدراک مُستدرک نہج البلاغہ میں بھی اس خطبہ کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں ۔ ہاں البتہ یہ کوکب دُرّی جیسی کتب میں موجود ہے ۔ جو ہر قسم کے رطب و یابس کا مجموعہ ہیں اور مُولّف کوکب دُرّی نے بھی اسے کسی گمنام شخص مسمّی بہ خواجہ دہدار کے کسی رسالہ مجہولہ سے نقل کیا ہے (ظلمات بعضھا فوق بعض) اس لیے علمائے محققین وفضلاء مدققین نے اس خطبہ اور اس کے ساتھ ملتے جُلتے دیگر خطبات کو غیر مُستند اور ناقابلِ اِستدلال قرار دیا ہے ۔ چنانچہ غواص بحارالانوار، ناشر علوم ائمۂ اطہارؑ سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ ہفتم بحار الانوار صفحہ ۳۶۵ میں "خطبۃ البیان" کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ: "خطبة البیان و امثالھا فلم توجد الا فی کتب الغلاة و اشباھھم " ۔ یعنی "خطبۃ البیان" اور اس کے مثل جو اور خطبے ہیں یہ سوائے غالیوں کی

کتابوں کے اور کہیں نہیں پائے جاتے۔

ایسا ہی فیصلہ محقق خوئی نے "منہاج البراعہ شرح نہج البلاغہ" میں صادر فرمایا ہے۔ اسی طرح استاذ المجتہدین جناب ابوالقاسم معروف بہ محقق قمی صاحب "قوانین الاصول" نے اپنی کتاب جامع الشتات میں اس خطبہ کے متعلق لکھا ہے کہ: "نزد حقیر بصحۃ نرسید کہ ایں کلام از جناب امیر المومنینؑ باشد"۔ حقیر کے نزدیک اس خطبہ کا حضرت امیر المومنینؑ کا کلام ہونا صحیح نہیں ہے۔

عالم ربانی الشیخ محمد علی اصفہانی اپنی کتاب "تحفہ امامیہ فی حقیقۃ مذہب الشیعہ" جلد ۱ صفحہ ۷۱ طبع بمبئی پر رقمطراز ہیں: "و قول بعضے آنکہ حضرت امیر المومنینؑ خالق است و اشیاء را او خلق نمودہ است غلط است و قول باینکہ آں حضرت عالم را باذن خدا خلق کردہ است غلط است و آیات و اخبار بسیار بر خلاف این اقوال است و آنچہ کہ نسبت می دھند بخطبہ مولیٰ متقیان کہ فرمودہ است من خالق آسمان و زمین ھستم ثابت نیست کہ ایں جزء خطبہ ازاں مولیٰ باشد شاید دیگرے ملحق نمودہ باشد"۔ خلاصہ یہ کہ بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ حضرت امیر المومنینؑ خالق ہیں اور انہوں نے باذن اللہ ہم کو پیدا کیا ہے، سراسر غلط ہے۔ اس کے رد میں بکثرت آیات و روایات موجود ہیں اور یہ جو آپؑ کی طرف نسبت دیتے ہیں کہ آپؑ نے ایک خطبہ میں فرمایا ہے کہ میں زمین و آسمان کا خالق ہوں، اس کے متعلق یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ یہ آپؑ کا کلام ہے۔ شاید کسی اور نے اسے آپؑ کے خطبوں کے ساتھ ملحق کر دیا ہے۔

پس جس خطبہ کے غیر معتبر ہونے کی یہ کیفیت ہو، آیا کوئی عقل مند اور دیندار انسان اپنے عقائد کی دیوار کو اس پر استوار کر سکتا ہے؟ ہمیں رہ رہ کر تعجب ہوتا ہے کہ مولانا محمد سبطین صاحب سرسوی مرحوم پر جنھوں نے کوکبِ دُرّی پر ۹۲ صفحات پر مشتمل ایک مبسوط مقدمہ محض اس خطبہ کے فقرات کی تاویلات کے بارہ میں لکھ دیا۔ مگر یہ خیال نہ فرمایا کہ وہ جس خطبہ کے فقروں کی تصحیح و تاویل کے لیے اس قدر سعی بلیغ کر رہے ہیں آیا یہ حضرت امیر علیہ السلام کا خطبہ ہے بھی سہی؟ آیا اس کی کوئی ایسی سند موجود ہے جس پر اعتماد کیا جا سکے؟ کیونکہ عقلائی ضرب المثل ہے: "ثبت العرش ثم انقش" پہلے کوئی تختی ثابت کرو، پھر اس پر کچھ نقش و نگار کرو۔ ورنہ سر بے صاحب تراشیدن والی مثال صادق آئے گی۔

ہاں اگر بسند معتبر کتب معتبرہ میں یہ خطبہ آنجنابؑ سے مروی ہوتا تو چونکہ اس کے ظاہری مطالب نصوصِ قرآنیہ کے مخالف تھے، ہر مومن ان کی تاویل کرنے پر مجبور ہوتا۔ اور ہم حضرت مولانا

مرحوم کی سعی کو مشکور سمجھتے ۔ مگر جب یہ خطبہ سرے سے ثابت ہی نہیں تو اس کے مندرجات کو صحیح ثابت کرنے میں زورِ بیان صرف کرنا چہ معنی دارد ؟ ولکل وجهة هو مولیها......

وجہ دوم: اگر قانون روایت کے اعتبار سے اس کے سلسلہ اسناد سے قطع نظر بھی کرلی جائے اور از روئے قانون درایت اس خطبہ کے مندرجات و مطالب پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو ایک ناظر خبیر اور ناقد بصیر انسان کو یقین کامل ہو جاتا ہے کہ یہ حضرت امیر المومنینؑ کا کلام حقیقت ترجمان نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ حقیقت محتاجِ بیان نہیں ہے کہ کوئی بھی بڑا شاعر ہو یا نثر نگار یا خطیب، ایک مخصوص اندازِ تخیل و طریق نگارش اور اسلوبِ خطابت رکھتا ہے ۔ جس کے ذریعہ اس کا کلام دیگر ہم صنفوں سے ممتاز و مشخص ہوتا ہے ۔ اس نہج پر بھی اگر اس خطبہ کا جائزہ لیا جائے تو جزم و یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حضرت امیر علیہ السلام کا خطبہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ آنجنابؑ کے جو خطبات باسناد معتبر نہج البلاغہ وغیرہ کتب جلیلہ میں مذکور ہیں، یہ خطبہ اپنے اندازِ بیان میں ان خطبات میں سے کسی کے ساتھ بھی کوئی مشابہت و مناسبت نہیں رکھتا۔ آنجنابؑ کے خطبات کا ایک طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ شانِ توحید سے لبریز نظر آتے ہیں ۔ انہی خطبات کو دیکھ کر بعض علمائے مصر بے ساختہ کہہ اٹھے تھے: "لولا خطبه علیه السلام لما عرف المسلمون التوحید" ۔ اگر حضرت امیرؑ کے خطبات نہ ہوتے تو مسلمانوں کو توحید کی حقیقی معرفت حاصل ہی نہ ہوتی ۔ مگر اس خطبہ میں اسی توحید پر ہی ہاتھ صاف کیا گیا ہے ۔ قرآن مجید میں جس قدر اوصاف جلیلہ خداوند عالم کے متعلق بیان کیے گئے ہیں وہ تمام اس خطبہ میں حضرت امیر المومنینؑ کی ذاتِ والاصفات کی طرف منسوب کر دیے گئے ہیں ۔ اگر طوالت کا خوف دامن گیر نہ ہوتا تو یہاں وہ تمام آیات لکھ کر واضح کیا جاتا کہ یہ خطبہ کس طرح قرآن کے ساتھ متصادم ہو رہا ہے ۔ لیکن چونکہ یہ امر عیاں را چہ بیاں کا مصداق ہے ۔ لہٰذا اس کے متعلق مزید توضیح کی ضرورت نہیں ہے ۔ ناظرین کرام خدائے عزوجل کو حاضر ناظر سمجھ کر بتائیں کہ اگر یہ خطبہ صحیح ہو تو پھر حضرت امیر علیہ السلام کے خدا ہونے میں کوئی اشکال باقی رہ جاتا ہے؟ بنا بریں نصیری اور علی اللہی فرقہ کو حق بجانب تسلیم نہیں کر لینا چاہیے ؟ کیا عقائد و اصول کے سلسلہ میں ایسے بے سروپا خطبات پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ مالکم کیف تحکمون...... اللھم اھد قومی انھم لا یعلمون ۔

وجہ سوم: بفرض محال اگر چند لمحات کے لیے اس خطبہ اور اس کے اشباہ و امثال خطبات کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی اس سے تفویض ممنوع ثابت نہیں ہو سکتی ۔ بلکہ لازماً اس کے الفاظ کی ایسی صحیح تاویل کی جائے گی جس کے بعد وہ دیگر نصوصِ قطعیہ شرعیہ کے ساتھ متصادم نہ ہو اور وہ تاویل یہ

ہے کہ چونکہ یہ امرِ مُسلّم و مُبرہن ہو چکا ہے کہ جناب رسولِ خداؐ اور ائمۂ ہُدیٰؑ علّت غائی ممکنات ہیں۔ یعنی اگر یہ حضراتِ قُدسی صفات پیدا نہ ہوتے تو کائنات عالم کی کوئی چیز نیستی سے نکل کر عرصہ ہستی میں قدم نہ رکھتی ۔ ارض و سما، جنّت و نار، انبیاءؑ و اولیاءؑ، غرضیکہ خداوند عالم نے ہر شے ان کے طفیل پیدا فرمائی ہے۔ لہٰذا یہ بزرگوار من باب المجاز یہ کہہ سکتے ہیں کہ گویا ہر شے ہم نے پیدا کی ہے گویا انبیاءؑ ہم نے بھیجے ہیں ۔ گویا بارش ہم برساتے ہیں اور گویا مارتے اور جِلاتے ہم ہیں ۔ کیونکہ اگر ہم نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ اور خدا کچھ بھی پیدا نہ کرتا۔ چونکہ سب کچھ ہماری وجہ سے ہے اس لیے گویا یہ سب کچھ ہم کرتے ہیں ۔ لہٰذا اس سے تفویض ثابت نہیں ہوتی ۔

وجہ چہارم: قطع نظر "نہج البلاغہ" کے خطباتِ شریفہ کے خود حضرت امیر علیہ السلام کی بکثرت ایسی تصریحات موجود ہیں جو اس "خطبۃُ البیان" کی تردید کرتی ہیں ۔ ہم یہاں بنظر اختصار آپؑ کے فقط ایک ارشاد واجب الاعتقاد کو پیش کرتے ہیں جو کہ کتاب مُستطاب عماد الاسلام جلد ۱ صفحہ ۱۸۱ طبع لکھنو میں موجود ہے:

"قال امیرالمومنین علیہ السلام ان معنی اشہد ان لا الٰہ الا اللّٰہ ان لا ھادی الا اللّٰہ و اشہد سکان السموٰت والارضین و ما فیہن من الملائکۃ و الناس اجمعین و ما فیہن من الجبال و الاشجار و لا ناقع و لا قابض و لا باسط و لا معطی و لا مانع و لا دافع و لا ناصح و لا کافی و لا شای و لا مقدم و لا مؤخر اللّٰہ اللّٰہ لہ الخلق و الامر بیدہ الخیر تبارک اللّٰہ رب العالمین" ۔

فرمایا: کلمہ توحید اشہد ان لا الٰہ الا اللّٰہ کے معنی یہ ہیں کہ سوائے خدا کے کوئی ہادی نہیں ہے، پھر فرمایا: میں زمین و آسمان کے درمیان بسنے والی مخلوق از قسم ملائکہ، انسان، جِنّ، وُحُوش اور طُیور وغیرہ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ سوائے خدا کے نہ کوئی خالق ہے نہ اس کے سوا کوئی رازق ہے نہ کوئی معبود ہے اور نہ کوئی نفع وضرر پہنچانے والا ہے اور نہ کوئی قبض و بسط کی قدرت رکھتا ہے اور نہ اس کے علاوہ کوئی عطا و منع کا مالک ہے اور نہ اس کے سوا کوئی دافع و ناصح اور کافی و شافی ہے اور نہ مُقدّم و مُؤخّر کرنے والا ہے، وہی خالق و آمر ہے ۔ تمام خیرات اسی کے قبضۂ قُدرت میں ہیں ۔ بابرکت ہے وہ خدا جو تمام عالموں کا پالنے والا ہے ۔

اہل عقل و انصاف بتائیں کہ جس بزرگوار کا یہ کلام مُعجز نظام ہو "خطبۃُ البیان" جیسے خطبات کو کس طرح اس کا کلام تسلیم کیا جا سکتا ہے ۔ قل ھذہ تذکرۃ فمن شاء اتخذ الیٰ ربہ سبیلا

○

دوسرا شبہ

بعض کتب میں جمہور بن الحکم سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ "رأیت علیؑ بن الحسینؑ و قد بنتت له اجنحة و ریش فطار ثم قال رأیت الساعة جعفر بن ابی طالب فی اعلیٰ علیین قلت فهل تستطیع ان تصعد ها قال نحن صنعنها فکیف نعجز ان نصعد الی صنعتنا نحن حملة العرش و الکرسی" ۔ الخ ۔ میں نے جناب امام زین العابدینؑ کو دیکھا کہ یکبارگی ان کو پَر لگ گئے اور اڑ گئے ۔ کچھ دیر کے بعد واپس تشریف لائے اور فرمایا: میں نے ابھی ابھی جناب جعفرؑ بن ابی طالبؑ کو اعلیٰ علّیین میں دیکھا ہے ۔ میں نے عرض کیا: آپؑ آسمانوں پر چڑھ سکتے ہیں؟ فرمایا: ہم نے ہی تو ان کو بنایا ہے ۔ پھر اپنی بنائی ہوئی چیز پر چڑھنے سے کس طرح عاجز ہو سکتے ہیں؟ ہم ہی عرش و کُرسی کے حامل ہیں ۔

اس شبہ کا جوابٓ

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ روایت مجہولہ ہے۔ کیونکہ اس کا راوی جمہور بن حکم مجہول ہے ۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ مُسلمان ہے یا منافق۔ اور اگر مُسلمان ہے تو مومن ہے یا غیر مومن اور اگر مومن ہے تو پھر عادل ہے یا گنہگار؟ کیونکہ کُتبِ رِجال میں اس کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں ملتا ۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی مجہول روایت فروعِ دین میں بھی نا قابلِ عمل ہوتی ہے ۔ چہ جائیکہ اصولِ اعتقاد میں اس پر اعتماد کیا جائے ۔ انصاف شرط ہے ۔ کیا ایسی بے اصل و بے بنیاد اخبار احاد سے دین و اعتقاد ثابت ہو سکتا ہے؟ جو لوگ ایسی بے سروپا روایات پر وثوق کرتے ہیں، اگر مقام حساب میں ان کو یہ خطاب ہوا (اور یقیناً ہو گا) کہ دین کے معاملہ میں تو صرف ان اشخاص کی روایات قابلِ قبول ہوتی تھیں جو عادل اور ثقہ ہوں ۔ بتاؤ تم نے جمہور بن حکم کی وثاقت کہاں سے معلوم کی تھی؟ تو یہ حضرات کیا جواب دیں گے؟ قل فللّٰه الحجة البالغة حاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبوا ۔

یاد رکھو! دین و اعتقاد کے معاملہ میں ایسی بے اسناد بلکہ بالکل بے بنیاد اخبار احاد پر ہرگز اعتماد نہیں کیا جا سکتا ۔ حدیث کی مُعتبر کُتب میں اس روایت کا کہیں نام و نشان بھی موجود نہیں ہے ۔ ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین ۔

تیسرا شبہ

نہج البلاغہ حصہ سوم میں یہ فرمان وارد ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا: نحن صنائع ربنا و الناس بعد

صنائع لنا ۔ یعنی "ہم خدا کی مخلوق ہیں اور لوگ ہماری مخلوق ہیں"۔ لہٰذا اس سے ثابت ہوگیا کہ کائنات حضرات محمد و آلِ محمد علیہم السلام نے پیدا کی ہے۔

اس شبہ کا جواب

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ ترجمہ سراسر غلط ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ترجمہ ہی غلط ہے تو نتیجہ بھی لامحالہ غلط ہی ہوگا۔ کیونکہ ؎

خشتِ اول چوں نہد معمار کج   تا ثریا می رود دیوار کج

اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ: "ہماری خلقت محض خداوند عالم کے لیے ہے اور لوگوں کی خلقت ہماری وجہ سے ہے"۔ اس سے آنجنابؑ کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ مقصود بالذات اور علتِ غائی ممکنات ہم ہیں۔ اگر خدا ہمیں پیدا نہ کرتا تو کائنات عالم کی کوئی چیز وجود میں نہ آتی۔ جیسا کہ مشہور حدیث قدسی "لولاك لما خلقت الافلاك" اس پر دلالت کرتی ہے۔ اور یہ مطلب بالکل حق وحقیقت پر مبنی ہے اور ہم سابقہ فصول میں اس پر مفصّل تبصرہ کر چکے ہیں۔ قرآن میں وارد ہے: "يٰمُوْسٰى ﴿۴۰﴾ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِىْ ﴿۴۱﴾" (سورۃ طٰہٰ: ۴۰ و ۴۱) اے موسیٰؑ! میں نے تمھیں خاص اپنے لیے پیدا کیا ہے۔ یعنی تیرا وجود بالذات مقصود ہے۔ اور تیری اُمت کا وجود بالتّبع۔ یہی وجہ ہے کہ "نہج البلاغہ" کے خطبہ میں دوسرے فقرہ کا عنوان بدلا ہوا ہے۔ "والناس بعد صنائعنا" نہیں، بلکہ "والناس بعد صنائع لنا"۔ یہ "لنا" میں "لام" موجود ہے اسے لام جنسیّہ و سببیّہ کہا جاتا ہے۔ جس کا وہی مطلب ہوتا ہے جو اوپر لکھ دیا گیا ہے کہ "الناس صنائع لاجلنا" لوگ ہماری وجہ سے پیدا کیے گئے ہیں۔ یعنی لوگوں کا پیدا کرنے والا بہرحال خلاقِ عالم ہی ہے۔ ہاں ان کی خلقت ہماری وجہ سے ہے۔ "لولاهم لما خلق الله ادم و لا حوا و لا الجنة و لا النار و لا السماء و لا الارض و لا شيئا مما خلق"۔ "اگر سرکار محمد و آلِ محمد علیہم السلام نہ ہوتے تو خداوند عالم نہ آدمؑ و حوّاؑ کو پیدا کرتا، نہ جنّت و دوزخ کو نہ ارض و سماء کو اور نہ کسی اور چیز کو"۔ (سابع بحار و بصائر الدرجات وغیرہ)

اس مفہوم کی تائید مزید اس طویل حدیث کے بعض فقروں سے بھی ہوتی ہے جو خود حضرت امیرالمومنینؑ کی طرف منسوب ہے۔ اس میں آپؑ فرماتے ہیں: "ولا جلنا خلق الله عزوجل السماء و الارض و العرش و الكرسى و الجنة و النار"۔ "ہماری وجہ سے خدا نے آسمان و زمین، عرش و کرسی اور جنّت و جہنم کو پیدا کیا ہے"۔ (مجمع النورین صفحہ ۲۲۰ طبع ایران)

صاحبِ "بشارۃ الزائرین" نے غلوّ و تفویض کی رد کرتے ہوئے حدیث "خلق الاشیاء بالمشیۃ" کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے: "و الباء فی حدیث خلق الاشیاء بالمشیۃ للسببۃ و التعلیل لا للاستعانۃ کاللام فی قولہ علیہ السلام و الخلق بعد صنائع لنا الی لاجلنا فلا اشعار فیھما بالتفویض و الا کان المناسب فی الاخران یقول و الخلق صنائعنا من غیر حاجۃ الی ذکر اللام کما فی الفقرۃ الاولی فمفاد الرد ابتین علی حد غیرھا من المستفیض جدا ان محمدا و اھل بیتہ صلی اللہ علیہ و علیھم و سلم الغایۃ الغائۃ فی ایجاد العالم باسرہ من الذرۃ الی الذروۃ و برکاتھم تنزل البرکات و تدرک الفیوضات کما فی المستفیض من الاحادیث"۔ ؎

و لولا ھم لم تخلق الارض و السماء و لا کان دیار و لا ذر شارق

یعنی اس حدیث مبارکہ میں با سببیّت و تعلیل کے لیے ہے (کہ خدا نے مشیّت کی وجہ سے اشیاء کو پیدا کیا) اِستعانت کے لیے نہیں (کہ مشیّت کے ذریعہ سے پیدا کیا) جیسا کہ جناب امیر علیہ السلام کے فرمان "و الناس بعد صنائع لنا" میں لام سببیّت کے لیے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے لوگوں کو ہماری وجہ سے پیدا کیا ہے۔ ان دونوں حدیثوں میں تفویض (ممنوع) کی طرف کوئی اشارہ تک موجود نہیں ہے، ورنہ دوسرے فقرہ میں "لام" نہ ہوتی بلکہ پہلے فقرہ کی طرح "صنائعنا" ہوتا۔ پس ان دونوں روایتوں کا ماحصل و مفاد دوسری روایات کی طرح یہی ہے کہ یہ بزرگوار خلقتِ کائنات کی علّت غائی ہیں۔ انہی کی وجہ سے فیوض و برکات کا نزول ہوتا ہے۔

مفتی محمد عبدہٗ مصری نے اس عبارت کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ ہم خدا کے اسیرِ احسان و مرہونِ منّت ہیں اور لوگ ہمارے اسیرِ احسان اور مرہونِ منّت ہیں۔ اس معنی کی بنا پر بھی اسے تفویض کے ساتھ کوئی ربط و تعلّق نہیں ہے۔

چوتھا شُبہ

بعض کُتب میں ایک روایت جناب مقداد بن اسوڈ کی طرف منسُوب ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں: "قال لی مولائی یوما ایتنی لسیفی فوضعہ علی رکبۃ ثم ارتفع الی السماء و انا انظر الیہ حتی غاب عن عینی فلما قرب الظھر نزل و سیفہ یقطر دما فقلت یا مولائی این کنت فقال ان نفوسا فی الملاء الاعلی اختصمت فصعدت فطھرتھا فقلت یا مولائی امر الملاء الاعلی الیک فقال یابن الاسود انا حجۃ اللہ علی الخلق من سموتہ و ارضہ و ما فی اسمائلک و یخطو قدما علی قدم الا باذنی"۔ یعنی ایک دن میرے آقا (حضرت

علیؑ) نے مجھ سے فرمایا: میری تلوار لاؤ۔ میں نے تلوار پیش کی۔ آپؑ نے اُسے گھٹنوں پر رکھا اور آسمان کی طرف بلند ہونا شروع کیا۔ میں دیکھتا رہا، حتی کہ آنجنابؑ میری آنکھوں سے غائب ہو گئے۔ جب ظہر کا وقت قریب آیا تو اس وقت اترے، درآنحالیکہ آپؑ کی تلوار سے خون ٹپک رہا تھا۔ میں نے عرض کیا: میرے آقا! آپؑ کہاں تشریف لے گئے تھے؟ فرمایا: ملاءِ اعلیٰ میں کچھ نفوس کے درمیان کچھ جھگڑا ہو گیا تھا، میں نے جا کر ان کا فیصلہ کیا۔ میں نے عرض کیا: میرے آقا! کیا آسمانوں کا معاملہ آپؑ کے سپرد ہے؟ فرمایا: اے فرزندِ اسود! میں اللہ کے آسمانوں اور زمینوں میں اُس کی حجت ہوں۔ آسمان میں کوئی فرشتہ میرے اِذن کے بغیر ایک جگہ سے قدم اُٹھا کر دُوسری جگہ رکھ نہیں سکتا۔ پس اس روایت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ عالم کا نظم و نسق سرکار محمد و آلِ محمد علیہم السلام کے سپرد ہے۔

اس شُبہ کا پہلا جوابؔ

یہ روایت بچند وجہ ناقابلِ تمسک و استدلال ہے۔

اوّلاً: اس روایت کا سلسلۂ سند مذکور نہیں تا کہ معلوم ہو کہ اس کے درمیان والے راوی کیسے ہیں۔ فقط ایک جلیل القدر صحابی کا نام لینے سے تو روایت کی صحت ثابت نہیں ہو جاتی؟ جب تک درمیانی وسائط کی وثاقت وجلالت کا علم نہ ہو۔ نیز حدیث کی جس قدر مُستند و مُعتبر کتابیں ہیں، ان میں اس روایت کا کوئی نام ونشان تک مذکور ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ روایت بالکل غیر مُعتبر اور ناقابلِ اعتبار ہے۔ ورنہ عُلماءِ اعلام و مُحدّثینِ کرام اس سے اِعراض ورُوگردانی نہ فرماتے۔

دوسرا جوابؔ

ثانیاً: قطع نظر اُصولِ روایت کے اگر اُصولِ دِرایت کے اِعتبار سے اس روایت کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بالکل جعلی و وضعی ہے۔ کیونکہ اس کے مَوضُوع ہونے کے قرائن و دلائل خود اس کے اندر موجود ہیں۔

(ا) یہ روایت عصمتِ ملائکہؑ کے منافی ہے۔ جن کی عصمت قرآن وحدیث اور اجماعِ مُسلمین سے ثابت ہے۔ ان میں جھگڑا اور فساد کس طرح ہو سکتا ہے؟ اور جھگڑا بھی ایسا جو بعض کے قتل تک مُنتج ہو؟ لاحول و لا قوۃ الا باللہ۔ ان ھذا الا بھتان عظیم۔ ملائکہؑ کے متعلّق تو اِرشادِ قدرت ہے: عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ (سورۃ الانبیاء: ۲۶ و ۲۷)

(ب) یہ امر مُسلماتِ مُسلمین میں سے ہے کہ ملائکہؑ کی خلقت نُور سے ہُوئی ہے۔ جیسا کہ بعض سابقہ ابواب میں حقیقتِ ملائکہؑ کے ضمن میں اس امر پر مفصّل تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا ان میں خُون کا پایا جانا کس طرح متصوّر ہو سکتا ہے؟ ایسے لوگوں کی حالت بڑی قابلِ رحم ہے جو ایسی مہمل و مُزخرف روایات کو بِلا تامّل قبول کر لیتے ہیں۔ ع

بدیں عقل و دانش بباید گریست

(ج) اس روایت میں وارد ہے کہ کوئی فرشتہ بغیر حضرت امیر علیہ السلام کے اذن کے اپنی جگہ سے قدم نہیں اٹھا سکتا۔ یعنی کوئی حرکت نہیں کر سکتا۔ یہ مطلب مُسلماتِ قرآن و حدیث کے مخالف ہے۔ قرآن مجید میں خود ملائکہؑ کا یہ قول موجود ہے: "و ما نتنزل الا بامر ربك له ما بین ایدینا و ما خلفنا و ما بین ذلك" (سورۃ مریم: ۶۴) اے رسولؐ! ہم نہیں اترتے مگر تیرے پروردگار کے حکم سے۔ اسی کے قبضۂ قدرت میں ہمارا سب بست و کشاد ہے۔ اس آیت کا شانِ نزول مُفسّرین نے یہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ جناب رسولِ خداؐ نے جناب جبریلؑ سے فرمایا: آپ جس قدر ہمارے پاس آتے ہیں اس سے زیادہ کیوں نہیں آتے؟ جبریل امینؑ نے عرض کیا: ہمارا آنا یا نہ آنا خداوند عالم کے حکم کے تابع ہے۔ (تفسیر مجمع البیان جلد ۲ و تفسیر صافی صفحہ ۳۱۵ و تفسیر لوامع التنزیل جلد ۱۶ صفحہ ۲۵۰ وغیرہا)

اسی طرح سُورۃُ القدر میں وارد ہے: "تنزل الملائکة و الروح فیها باذن ربهم" لیلۃُ القدر میں ملائکہؑ اور رُوحؑ اپنے پروردگار کے اِذن سے اُترتے ہیں۔ لہٰذا قرآن تو یہ کہتا ہے کہ ملائکہؑ کی حرکت اور ان کا سُکون اِذنِ خداوندی کے تابع ہے اور اس روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی حرکت اور ان کا سُکون حضرت امیرؑ کے تابع ہے۔ اب اہلِ ایمان کا اختیار ہے، خواہ قرآن کی بات تسلیم کریں اور خواہ اس بے بُنیاد روایت پر اعتماد کریں۔

تیسرا جواب

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی صحیفۂ کاملہ میں جو دعا ملائکہؑ پر صلوات کے سلسلہ میں موجود ہے، اس میں آپؑ فرماتے ہیں: "و من او همنا ذکرہ و لم تعلم مکانه منك و بای امر و کلته"۔ بارِ الٰہا! ان ملائکہؑ پر درود بھیج جن کا ذکر ہم نے نہیں کیا اور نہ ہی ان کے متعلق ہمیں علم ہے کہ تیرے نزدیک ان کا مرتبہ کیا ہے اور نہ یہ معلُوم ہے کہ تو نے ان کو کس امر پر مؤکل کیا ہے؟ یہ اس صحیفۂ سجّادیہ کے کلمات ہیں جس کے کلام امامؑ ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ امام تو یہ فرماتے ہیں کہ کچھ ملائکہؑ ایسے بھی

ہیں کہ ہمیں ان کے مکان و مرتبہ اور کام کا بھی علم نہیں۔

علامہ سید علی خان نے ریاض السالکین میں اس فقرہ کی شرح میں لکھا ہے: "فیہ دلالۃ علی انہ لا یعلم اصناف الملائکۃ غیر خالقھا کما قال تعالیٰ و ما یعلم جنود ربك الا ھو" ...... (سورۃ مدثر: ۳۱) یعنی اس فقرہ میں اس مطلب پر دلالت ہے کہ تمام ملائکہ کے اصناف و اقسام کو سوائے ان کے خالق کے اور کوئی نہیں جانتا، جیسا کہ اس کا ارشاد ہے کہ اے رسول! تیرے پروردگار کے لشکروں کو سوائے اس کے اور کوئی نہیں جانتا...... مگر تفویض نواز یہ کہہ رہے ہیں کہ کوئی فرشتہ بغیر اذنِ امامؑ قدم نہیں اٹھا سکتا؟ ان ھذا الا اختلاق

پانچواں شبہ

جناب قنبرؓ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ جناب امیرؑ کے دولت سرا پر حاضر ہوا۔ جناب فضہؑ سے دریافت کیا کہ حضرت علیؑ کہاں ہیں؟ جناب فضہؑ نے بتایا: بروج میں تشریف لے گئے ہیں۔ میں نے کہا: وہ بروج میں کیا کرتے ہیں؟ فضہؑ نے جواب دیا: وہ وہاں جا کر رزق تقسیم کرتے ہیں۔ عمریں مقدر کرتے ہیں۔ مخلوق کو پیدا کرتے ہیں۔ مارتے اور جِلاتے ہیں اور عزت و ذلت تقسیم کرتے ہیں۔ قنبرؓ نے کہا: بخدا میں اپنے آقا کو اس کافرہ کی گفتگو کی ضرور اطلاع دوں گا۔ ابھی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ حضرت امیرؑ نمودار ہو گئے اور فرمایا: اے قنبر! تمھارے اور فضہ کے درمیان کیا بات چیت ہو رہی تھی؟ قنبر نے تمام واقعہ عرض کیا۔ آنجنابؑ نے سن کر فرمایا: مگر تم اس کے منکر ہو؟ قنبر نے عرض کیا: ہاں! اس وقت آنجنابؑ نے کچھ پڑھا اور ہاتھ مبارک قنبر کی آنکھوں پر پھیرا۔ قنبرؓ کہتے ہیں کہ میں نے تمام آسمانوں اور زمینوں کو آنجناب کے سامنے ایسے دیکھا جیسے کسی کے سامنے بادام پڑا ہوا ہو۔ نیز اور بہت سی مخلوق کو دیکھا۔ اس وقت حضرت علیؑ نے فرمایا: اے قنبر! "نحن خلقنا ھما و خلقنا مافیھا و ما بینھما و ما تحتھا"۔ ہم نے ہی زمین و آسمان اور ان کے اندر رہنے والی اور ان کے درمیان والی اور ان کے نیچے بسنے والی مخلوق کو پیدا کیا ہے۔ پھر حضرتؑ نے دوبارہ ہاتھ پھیرا اور یہ سب کچھ آنکھوں سے غائب ہو گیا۔

اس شبہ کا پہلا جوابؑ

اس شبہ کا پہلا جواب یہ ہے کہ یہ روایت بدو وجہ ناقابلِ استدلال و استناد ہے۔

اولاً: یہ روایت مرسل اور مقطوع السند ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی حدیث بالاخص اُصولِ عقائد

میں نا قابلِ التفات وتوجہ ہوتی ہے۔ خصُوصاجب کہ اس کا کُتبِ مُعتبرہ میں کوئی نام ونشان نہ ہو، اور نہ کوئی روایت مُعتبرہ اس کی مؤید ہو۔

دوسرا جواب

ثانیاً: قطع نظر سلسلہ سند سے از روئے قانونِ درایت یہ روایت مثل سابقہ روایت کے بالکل وضعی وجعلی ہے اور اس کے وضعی ہونے کے دلائل وہی ہیں جو خطبۃ البیان کے وضعی ہونے کے ضمن میں اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اس کے مندرجات نصوصِ قرآنیہ کے مناقض ومخالف ہیں اور ائمہ طاہرینؑ کا حکم ہے: "کل حدیث لم یوافق الکتاب فھو زخرف"۔ (اصول کافی) "جو روایت قرآن کے مخالف ہو وہ باطل ہے"۔ قرآن تو یہ کہتا ہے: "ان اللہ خلق السموت و الارض و ما بینھما و ما تحت الثریٰ" (سورۃ طٰہٰ: ۶) "خداوند عالم نے زمین وآسمان اور ان کے درمیان اور تحت الثریٰ والی مخلوق کو پیدا کیا ہے"۔ اور یہ روایت کہتی ہے کہ ان تمام امور کو حضرت علیؑ نے پیدا کیا۔ اب مومنین کو اختیار ہے کہ خواہ قرآن کو مُعتبر سمجھیں اور اس کے ارشاد کو تسلیم کریں یا اس کے بالمقابل اس بے سروپا روایت کو مُعتبر سمجھ کر اس کے مندرجات پر ایمان لائیں۔ یہ روایت ان روایاتِ کثیرہ و مُعتبرہ کے خلاف ہے جن میں ان امور کی ائمہ علیہم السلام سے نفی کی گئی ہے۔ لہٰذا عندالاختلاف ترجیح انہی روایات کو دی جائے گی جو تعداد میں زیادہ اور سند کے اعتبار سے صحیح ہیں۔ کما لا یخفی علی اولی الالباب۔

تیسرا جواب

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ یہ مسئلہ اصول واعتقادات سے تعلق رکھتا ہے اور اربابِ بصیرت جانتے ہیں کہ عقائد کے سلسلہ میں آیاتِ محکمات کارآمد ہوتی ہیں، یا روایاتِ متواترات، جو موجبِ علم ویقین ہوتی ہیں۔ اس قسم کی اخبار احاد اور وہ بھی ایسی بے سروپا جو قانونِ روایت ودرایت کے لحاظ سے بالکل بے بنیاد ہوں۔ یہاں کام نہیں آسکتیں۔ ان فی ذلک لآیات لقوم یعقلون۔

چھٹا شُبہ

قرآن میں وارد ہے: "و ما رمیت اذ رمیت و لکن اللہ رمیٰ" (سورۃ الانفال: ۱۷) "اے رسول! وہ کنکریاں جو تم نے پھینکی تھیں وہ تم نے نہیں پھینکی تھیں، بلکہ خدا نے پھینکی تھیں"۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کا فعل اللہ کا فعل ہے۔ لہٰذا وہ جو کام کرتے ہیں اللہ سبحانہ فرماتا ہے وہ کام میں

کرتا ہوں۔ پس اس سے تفویض ثابت ہے۔

اس شبہ کا پہلا جواب

اس آیت مبارکہ سے اس مقصد کے لیے استدلال کرنا بدو وجہ باطل ہے۔ اولاً: اس لیے کہ اگر اس فقرہ سے تفویض ثابت ہوتی ہے تو پھر یہ تفویض ان تمام لوگوں کے حق میں ثابت ہے جو اس جنگ میں آنحضرتؐ کے ہمراہ شریک تھے۔ کیونکہ ان کے متعلق ارشادِ قدرت ہے: "و لم تقتلوھم و لکن اللہ قتلھم" (سورۃ الانفال: ۱۷) "تم نے کفار کو قتل نہیں کیا تھا، بلکہ اللہ سبحانہ نے ان کو قتل کیا تھا"۔ دونوں جملے ایک جیسے ہیں۔ فما ھو جوابکم فھو جوابنا۔

دوسرا جواب

ثانیاً: اس لیے کہ یہ آیت مقامِ اعجاز کے متعلق ہے۔ چونکہ واقعہ یہ ہوا تھا کہ آنحضرتؐ نے ایک مٹھی کنکریوں کی کفار کی طرف پھینکی تھی اور وہ کنکریاں تمام کفار کے چہروں پر لگیں۔ جن سے ان کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ خدائے عزوجل اسی واقعہ کی طرف اشارہ فرما رہا ہے کہ اے رسول! کنکریاں پھینکی تو تم نے ہی تھیں لیکن ان کا تمام کفار کے چہروں تک پہنچانا، یہ فوق طاقتِ بشری فعل میں نے انجام دیا تھا۔

جناب محدث محسن فیض کاشانی علیہ الرحمہ نے لکھا ہے: "اثبت الرسول اللہ لانہ وجل منہ صورۃ و نفاہ عنہ معنی لان اثرہ الذی لا یدخل فی قدرۃ البشر فعل اللہ سبحانہ فکانہ فاعل الرمیتہ علی الحقیقۃ و کانھا لم توجل من الرسول"۔ الخ۔ (تفسیر صافی صفحہ ۱۹۴ طبع ایران) خدا نے تیر مارنے کا اپنے رسولؐ کے لیے اس لیے اثبات کیا ہے کہ صورتِ رمی آنحضرتؐ سے صادر ہوئی تھی اور نفی اس لیے فرمائی کہ اس کا وہ اثر جو طاقتِ بشری سے خارج ہے، خدا نے پیدا کیا تھا۔ لہٰذا گویا کہ درحقیقت کنکری خدا نے ہی ماری تھی نہ کہ رسولؐ نے۔

اسی طرح دوسرے صحابہ کو خطاب ہے کہ تم یہ فخر و مباہات نہ کرو کہ کفار کو تم نے قتل کیا، یہ ٹھیک ہے کہ تم شمشیر بکف تھے۔ مگر کفار کو مرعوب کرنا، تمھارے دلوں کو قوی کرنا اور ملائکہ کو تمھاری نصرت کے لیے اتارنا، یہ سب کچھ میرا فعل تھا۔ اس لیے درحقیقت کفار کو میں نے قتل کیا۔ (ملاحظہ ہو تفسیر صافی صفحہ ۱۹۴ و تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۷۰)

یہ ارشادِ قدرت یہاں ایسا ہی ہے جیسے سورہ واقعہ میں مذکور ہے: "ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ

الزّٰرِعُوۡنَ " (سورۃ واقعہ:۶۴) تم زراعت نہیں کرتے بلکہ ہم زراعت کرتے ہیں۔ بنابریں واضح ہوجاتا ہے کہ اس آیتِ مبارکہ کو تفویض کے ساتھ کوئی ربط و تعلق ہی نہیں ہے۔ فقدمنا الی ما عملوا من عمل فجعلناہ ھباء منثورا۔

ساتواں شبہ اور اس کے جوابات

ارشادِ قدرت ہے: " فتبارك الله احسن الخالقين " (مومنون:۱۴) " بابرکت ہے وہ خدا جو پیدا کرنے والوں میں سے بہترین پیدا کرنے والا ہے"۔ اس آیت سے مُستفاد ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے علاوہ کچھ اور خالق بھی ہیں۔ پس اس آیت سے بھی تفویض ثابت ہوتی ہے۔

پہلا جواب

اس آیت مبارکہ سے تفویض کے اثبات پر تمسک کرنا تین وجوہ سے غلط ہے۔

اولاً: یہ آیت اسلوبِ عرب کے مطابق ہے، اہلِ عربیت کا دستور ہے کہ جب کسی شخص کا کسی صنعت و حرفت میں کمال ظاہر کرنا مقصُود ہو تو اس صنعت کے ماہروں کو بطور صیغہ جمع لا کر اس مخصوص شخص کے ساتھ لفظ "احسن" یا "خیر" لگا کر اسے سب پر فوقیت دے دیتے ہیں۔ جیسے :احسن التاجرین، احسن النجارین، احسن الحدادین، خیر الخبازین، خیر البقالین وغیرہا۔ اگرچہ اس صنعت کے ماہروں کا خارج میں بالفرض وجود ہی نہ ہو، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرے صنعت کار ضرور موجود ہوں۔ یہی حال "احسن الخالقین" کا ہے۔

دوسرا جواب

ثانیاً: " خلق " بمعی " صنع " بھی استعمال ہوتا ہے۔ (قاموس جلد ۳ صفحہ ۲۲۸ طبع مصر) بنابریں ممکن ہے مفہوم آیت (واللہ اعلم) یہ ہو: "واللہ احسن الصانعین " یعنی اگرچہ صانع (بنانے والے) بہت ہیں، کوئی حداد ہے، کوئی نجار ہے، کوئی دباغ و صباغ ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ان میں سے بعض اپنی صنعت میں بہت ماہر ہوتے ہیں۔ مگر خلّاقِ عالم ان سب صانعین میں سے بہترین صانع ہے، بلکہ ان کو اس سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ "چه نسبت خاك را با عالمِ پاك"۔ " ومن احسن من الله صبغة "۔ بنابریں اس آیت کو اہلِ بیت علیہم السلام کے خالق ہونے کے ساتھ کوئی تعلّق ہی نہیں رہتا۔ کما لا یخفی۔

تیسرا جواب

ثالثاً: لغتِ عرب میں "خلق" بمعنی تقدیر (اندازہ لگانا) بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ المنجد صفحہ ۱۹۳ اور قاموس جلد ۳ صفحہ ۲۲۸ وغیرہ میں مذکور ہے۔ لہٰذا بنا بریں اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تمام اندازہ لگانے والوں اور منصوبہ بندی کرنے والوں سے خداوند عالم بہترین اندازہ لگانے والا، اور منصوبہ بندی کرنے والا ہے۔ لہٰذا اس کا تفویض کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے۔

چوتھا جواب

رابعاً: اسی آیت کے ذیل میں تفسیر صافی وغیرہ میں ایک روایت موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مخلوقین پر بھی من باب المجاز خالق کا اطلاق کیا گیا ہے۔ ان کی تعداد چار تک شمار کی گئی ہے۔ ایک حضرت عیسیٰؑ، دوسرے اور تیسرے وہ فرشتے جو باذنِ خدا لطن مادر میں بچہ کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ چوتھا سامری جس نے گوسالہ بنایا تھا۔ بنا بریں آیت اپنے ظاہری معنی پر رہے گی۔ لیکن پھر بھی اس سے ائمہ طاہرینؑ کا خالق عالم ہونا ثابت نہیں ہوتا، بلکہ اس سے اس امر کی نفی ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر یہ بزرگوار بھی باذنِ خالق کردگار ہی سہی، خالق ہوتے تو جہاں ان مذکورہ بالا چار افراد پر خالق کا اطلاق کیا تھا، وہاں یہ بھی مذکور ہوتا کہ ہم ائمہ اہلِ بیتؑ بھی خالق ہیں۔ لیکن جب یہ وارد نہیں تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خالق نہیں ہیں۔ اب محض قیاس آرائی سے کام نہیں لیا جاسکتا کہ جب فلاں وفلاں پر خالق کا اطلاق ہوا ہے تو ائمہ اطہارؑ پر کیوں نہیں ہوسکتا۔ "فان اول من قاس ابلیس"۔ علاوہ بریں یہ روایت بھی محل نظر ہے: "ولا تدع من دون الله ما لا ينفعك ولا يضرك فان فعلت فانك اذا من الظالمين"۔

آٹھواں شُبہ

مُتعدّد آیات وروایات میں وارد ہے کہ خلّاق عالم نے خلق ورزق اور اماتت واحیاء غرضیکہ نظام عالم کے مُختلف کاموں کی انجام دہی پر مُختلف ملائکہؑ مُوکّل کر رکھے ہیں اور مذہبِ حق کا عقیدہ ہے کہ ملائکہؑ ائمہ طاہرینؑ کے خادم ہیں۔ پس جب خادم ان اُمور کو انجام دے سکتے ہیں تو ان کے مخدوم ان اُمور کو انجام کیوں نہیں دے سکتے؟ عین ممکن ہے کہ مُدبّرات الامر ملائکہؑ ہوں ان کے اوپر حاکم اعلیٰ اولی الامر یعنی ائمہ اطہارؑ ہوں اور اولی الامر کے اوپر خداوند عالم حاکم اعلیٰ ہو۔ جیسا کہ دنیوی نظام

میں بادشاہ اور وزیر اور دیگر عُمّال کی مثال سے یہ مطلب اور بھی واضح ہوجاتا ہے۔ ایسا اعتقاد رکھنے میں کونسی خرابی لازم آتی ہے؟ اس شُبہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ائمۂ اہلِ بیتؑ کی بارگاہِ قدرت میں وہی حیثیت ہے جو ایک وزیر با تدبیر کی کسی شہنشاہ کی بارگاہ میں ہوتی ہے۔

یہ شبہ بچند وجہ درجۂ اعتبار سے ساقط ہے

چونکہ زیرِ بحث مسئلہ اُصول و عقائد سے تعلق رکھتا ہے اس کے اثبات کے لیے دلیل قطعی درکار ہے۔ ظاہر ہے کہ اُمورِ اعتقادیہ میں بلکہ تمام دینی اور دُنیوی معاملات میں فقط امکان عقل کہ ایسا یا ویسا ہونا ممکن ہے اور اس سے کوئی امر محال لازم نہیں آتا۔ کسی امر کے ثبوت کے لیے ہرگز کافی نہیں ہوتا۔ عقلاً بہت سی باتیں ممکن ہیں۔ مگر ان کا نہ اعتقاد رکھنا جائز ہے اور نہ ہی عملاً اس کے مطابق عمل جائز ہے۔ مثلاً کون سا محال لازم آتا ہے۔ اگر سیّد البشرؐ اور ان کی عترتِ طاہرہؑ کو سجدہ روا رکھا جائے بلکہ ان ذواتِ قدسیہ کی عبادت کی جائے۔ مگر شریعت مقدسہ کے قواعد کی رو سے غیر اللہ کو نہ سجدہ جائز ہے اور نہ اس کی عبادت روا۔ یہی کیفیت متعلق مسئلہ کی ہے۔ آیاتِ کثیرہ اور روایاتِ وفیرہ اس عقیدہ کی رد میں وارد ہوئی ہیں، بلکہ ہم تو یہاں تک کہہ سکتے ہیں کہ اگر بالفرض اس عقیدہ باطلہ کی نفی پر کوئی نص نہ بھی موجود ہوتی تو اس سے اس پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا۔ کیونکہ نفی محتاج دلیل نہیں ہوتی۔ البتہ کسی امر کا اثبات خصُوصًا جب کہ وہ امر اُمورِ اعتقادیہ سے متعلق ہو دلیل قطعی شرعی کا محتاج ہوتا ہے۔ واذلیس فلیس

دوسری وجہ

یہ جو کہا گیا ہے کہ اس اعتقاد رکھنے میں کونسی خرابی لازم آتی ہے۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ تقریر سراپا تعزیر عوام النّاس کو مُتاثّر کرنے اور ان کے صحیح عقیدہ پر ڈاکا ڈالنے کے لیے بے حد مُؤثّر ہے۔ مگر اربابِ عقل سمجھتے ہیں کہ یہ تقریر حقیقت سے بالکل خالی ہے۔ غور طلب امر یہ ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ یہ اعتقاد رکھنے سے کونسی خرابی لازم آتی ہے؟ اس خرابی سے کیا مراد ہے؟ اگر اس سے مراد یہ ہے کہ اس سے کونسا نظامِ عالم بگڑتا ہے؟ تو نظامِ عالم میں تو اس لیے خرابی لازم نہیں آسکتی کہ اس کا ناظم و مُدبّر خلّاقِ عالم ہے۔ "ھو حی لا یموت" اور اگر اس سے دینی خرابی مراد ہے تو وہ موجود ہے۔ کیونکہ یہ عقیدہ خُدا و رسولؐ اور ائمۂ طاہرینؑ پر افتراء ہے اور ان کے نصوصِ صریحہ وصحیحہ کے مخالف ہے۔ "وانما یفتری الکذب الذین لا یؤمنون" (سورۃ النحل: ۱۰۵) جس کی وجہ سے نعمتِ ایمان سلب ہوجاتی ہے۔ اعاذنا اللہ منہ۔

تیسری وجہ

نظامِ ربُوبی کو دُنیوی بادشاہوں کے نظام پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ باوجودیکہ اصل قیاس ہمارے اُصول مذہبی کے اعتبار سے باطل و عاطل ہے۔ رسولؐ و آلِ رسولؐ کا اصل وظیفہ نظامِ شرعی کا قیام اور انفاذِ حُدود اور اِجراء احکام ہے نہ کہ نظامِ دُنیوی کا چلانا۔ ہاں ان اُمور میں وہ شفاعت و سفارش فرماتے ہیں اور خُدائے ذُوالمنن ان کی سفارش کو مُسترد نہیں فرماتا۔ جیسا کہ اس امر کی وضاحت کی جاچکی ہے۔ خُدا کا نہ کوئی وزیر ہے اور نہ کوئی مُشیر۔ اس کی ذات اس سے اجل وارفع ہے وہ غنی بالذّات ہے۔ حضرت امیر علیہ السلام دُعائے یستشیر میں فرماتے ہیں: "المدبر بلا وزیر ولا خلق من عبادہ یستشیر"۔ خُدا وہ ہے جو بِلا وزیر عالم کی تدبیر کرتا ہے اور اپنی مخلوق میں سے کسی سے بھی مشورہ نہیں کرتا۔ (مفاتیح الجنان) خُدا فرماتا ہے: "فلا تضربوا لله الامثال" (سورۃ النحل: ۷۴) "خدا کے لیے مثالیں نہ دیا کرو"۔ امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں: "من شبه الخالق بالمخلوق فھو مشرك"۔ "جو خالق کو مخلوق کے ساتھ تشبیہ دے وہ مُشرک ہے"۔ (عُیونُ الاخبار)

چوتھی وجہ

یہ جو کہا گیا ہے کہ اگر ملائکہؑ یہ کام انجام دے سکتے ہیں تو ائمہؑ طاہرینؑ کیوں انجام نہیں دے سکتے، جو کہ مخدوم ملائکہؑ ہیں؟ یہ تقریر سراسر فریب کاری یا جہالت اور مکاری پر مبنی ہے، ورنہ کس نے یہ کہا ہے کہ ائمہ ان اُمور کو انجام نہیں دے سکتے۔ ائمہؑ اطہارؑ تو اشرف الخلائق ہیں۔ خُدا وہ قادرِ مُطلق ہے کہ اگر چاہے تو مچھّر جیسی کمزور مخلوق سے بھی یہ کام لے سکتا ہے[1]۔ نزاع اس میں نہیں ہے کہ ائمہؑ اطہار علیہم السلام ان امور کو انجام دے سکتے ہیں یا نہیں دے سکتے؟ بلکہ تمام تر بحث و نزاع اس امر

---

[1] "احسن الفوائد" کی طبع اول کے بعد بعض اہلِ غرض مخربین دین اس عبارت کو لے اڑے اور ابلہ فریبی سے کام لے کر زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔ اور عامۃ الناس کو علماء اعلام سے بدظن کرنے کے لیے اس انداز میں اسے پبلک میں اچھالا کہ شاید مُعلّم ملکوت بھی ان کی کارستانی دیکھ کر حیران ہو گیا ہوگا۔ باانصاف ناظرین کرام مکرر بنظر غائر اس عبارت کا مطالعہ کریں۔ کیا اس میں ائمہ اہلِ بیت علیہم السلام کی توہین کا کوئی شائبہ بھی پایا جاتا ہے؟ کیا اس عبارت میں ائمہؑ اطہارؑ کو مچھّر کے برابر قرار دیا گیا ہے؟ کیا اس میں ان کو ان اُمور کی انجام دہی سے عاجز بتایا گیا ہے؟ یا اس میں ان کے حامل روح القدس ہونے کی نفی کی گئی ہے؟ حاشا و کلا۔ مالکم کیف تحکمون؟ ظاہر ہے کہ اس عبارت میں صرف خُداوندِ عالم کے علیٰ کل شئی قدیر ہونے کا اِظہار کیا گیا ہے۔ و بس۔ یہ اتنا واضح و آشکار مفہوم ہے کہ کسی بھی صاحبِ عقلِ سلیم و طبعِ مستقیم کو اس کے سمجھنے میں ہرگز کوئی دِقّت محسوس نہیں ہوتی۔ الا من کان فی قلبه مرض فزادھم الله مرضا۔ (منہ عفی عنہ)

میں ہے کہ آیا ان اُمور کی انجام دہی ائمہ علیہم السلام کا وظیفہ اور فرض منصبی ہے، یا یہ ان کا منصب نہیں ہے؟ اگر کسی کا خادم کوئی کام کرتا ہو تو اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ اس کا مخدوم بھی ضرور وہ کام کرے؟ اگرچہ وہ کام مخدوم کے شایانِ شان بھی نہ ہو۔ یاد رکھیں کسی کام کا کر سکنا اور ہے اور فرض منصبی سمجھ کر کرنا اور ہے۔ عاقلاں را اشارتے کافی است۔

نواں شبہ اور اس کا جواب

بعض زیارات میں ایسے فقرات موجود ہیں جن سے تفویض ثابت ہوتی ہے۔ جیسے زیارت رجبیہ میں مروی ہے: "آملکم فیما الیکم التفویض و علیکم التفویض الی غیر ذلک من العبارات"۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ قطع نظر اس سے کہ یہ زیارات مُستند ہیں یا نہیں؟ ان میں وارد شدہ لفظ "تفویض" سے مُراد آخرت میں ثواب عطا کرنا ہے۔ جو کہ ان کی شفاعتِ کبریٰ سے حاصل ہوگا۔ بہر حال اس قسم کی زیارات وعبارات کو ہمارے مُتعلقہ مسئلہ سے کوئی ربط و تعلق نہیں ہے۔ اس کی مزید توضیح کے لیے کتاب "مصابیح الانوار" علامہ شبّر کی طرف رجوع کیا جائے۔ فلا تغفل۔

دسواں شُبہ

بعض روایات میں وارد ہے کہ: "نزلونا عن الربوبیة ثم قولوا فینا ما شئتم لن تبلغوا"۔ ہمیں ربوبیّت سے نیچے رکھو۔ پھر ہمارے حق میں جو چاہو کہو۔ ہرگز ہماری اصل حقیقت تک تم نہیں پہنچ سکتے۔ اس سے معلُوم ہوتا ہے کہ سوائے خُدا اور رب کہنے کے ہم سب کچھ اہلِ بیت علیہم السلام کے حق میں کہہ سکتے ہیں۔ لہٰذا ان کو خالق و رازق وغیرہ کہنا درست ہے، بلکہ اس روایت سے تو معلُوم ہوتا ہے کہ ہم سے غُلُوّ ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ غُلُوّ نام ہے تجاوز عن الحد کا اور جب ہمیں خُدا و رسولؐ اور ائمہؑ اطہارؑ کے حدود معلُوم ہی نہیں تو ان کے حق میں غُلُوّ چہ معنی دارد؟ ان کی شان میں تو ہمارا غُلُوّ بھی قاصر ہے۔ کما قیل: ؎

گویند غالیم بثنائے تو یا علیؑ   حق ایں کہ من ز حق ثنائے تو قاصرم

یہ شبہ بچند وجہ باطل ہے، وجہ اول

یہ روایت خبر واحد ہے۔ کئی بار عرض کیا جا چکا ہے کہ اُصول وعقائد میں اخبار احاد پر بالاتفاق اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اخبار احاد سے زیادہ سے زیادہ ظن حاصل ہوتا ہے، جو کہ عقائد میں ناقابلِ

اعتماد ہے۔عقائد میں علم و یقین ضروری ہے۔ جو کہ آیاتِ محکمات یا روایاتِ مُتواترات سے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ علماء اعلام نے ایسی روایات کا یہی تحقیقی جواب باصواب دیا ہے ۔ چنانچہ جناب سید العُلماء السید حسین بن حضرت غفران مآب قدس سرہٗ نے اپنی کتاب " حدیقہ سلطانیہ " میں اسی شبہ کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے: "فلکونها من اخبار الاحاد و لا تصلح للاعتماد فی اصول الاعتقاد" ۔ (صفحہ ۸۷ طبع لکھنؤ) بوجہ اخبار احاد سے ہونے کے اُصولِ اعتقاد میں ناقابلِ اعتماد ہے ۔

دوسری وجہ

بنابر تسلیم صحت روایت اس کا وہ مطلب نہیں جو لیا جا رہا ہے ۔ یہ تو "کلمة حق یراد بها الباطل" والا معاملہ ہے ۔ اس میں جو وارد ہے کہ ہمیں مرتبہ ربوبیّت سے نیچا رکھو۔ کون عقلمند اور اسالیبِ کلام سے واقف انسان یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بس ہمارے متعلّق لفظ "ربّ" نہ کہو باقی جو جی چاہے کہتے رہو۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو صفات شانِ ربوبیّت سے تعلّق رکھتی ہیں ان سے ہمیں مُتّصف نہ کرو۔ ہم مُتعدّد آیات کے حوالہ جات سے ثابت کر چکے ہیں کہ خلق و رزق اور اماتت و احیاء وغیرہ صفات کا تعلّق ربوبی صفات سے ہے۔ "کما قال عز من قائل الله الذی خلقکم ثم رزقکم ثم یمیتکم ثم یحییکم ثم الیه ترجعون" (سورۂ روم: ۴۰) لہٰذا ائمۂ اطہار علیہم سلام الملک الجبار کو خالق و رازق اور محیی و ممیت کہنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔

تیسری وجہ

اگر بالفرض ایسی روایات کا وہی مطلب ہو جو یہ حضرات مُراد لے رہے ہیں کہ سوائے لفظ رب کے اور سب کچھ کہنا روا ہے، تو کیا یہ حضرات روا رکھیں گے کہ ائمۂ طاہرینؑ کو رسول کہا جائے یا ان کو جناب رسولِ خداؐ سے افضل قرار دیا جائے یا رحمٰن وغیرہ صفاتِ خاصہ کا اسی معنی کے اعتبار سے جس اعتبار سے ذاتِ باری تعالیٰ پر ان کا اطلاق ہوتا ہے، ان ذواتِ مقدسہ پر اطلاق کیا جائے؟ جب یہ جائز نہیں اور یقیناً نہیں، تو ماننا پڑے گا کہ اس کا صحیح مفہوم وہی ہے جو ہم نے بیان کر دیا ہے ۔ پس تسلیم کرنا پڑے گا کہ "قولوا ما شئتم " کے عموم سے مُراد یہ ہے کہ وہ مدح و ثنا جو قواعد شرعیہ کے اعتبار سے جائز ہو وہ دل کھول کر کی جا سکتی ہے ۔ اور پھر بھی ان کے فضائل و محامد کا شمار نہیں ہوسکتا۔ نہ یہ کہ جو کچھ چاہو غلط یا صحیح بلکہ خود تراش کر کے ان ذواتِ قدسی صفات کی طرف منسوب کر دو۔ حاشا و کلا، کلامِ امام کا یہ مطلب نہیں ہوسکتا۔ ایسے خوش فہم حضرات کو کلامِ امام کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کرنی

چاہیے۔ کیونکہ "فهمیدن کلام امام عالی مقام هنر است"۔

چوتھی وجہ

یہ درست ہے کہ ہم خدا و رسولؐ اور ائمہ طاہرینؑ کی کما حقہٗ مدح و ثنا سے قاصر ہیں۔ کما قال الامام الرضاؑ الامام من حیث النجم من ایدی المتناولین۔ امام کا مقام اس طرح بلند ہے جس طرح آسمان کا ستارہ، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ہمیں حدودِ ربوبیت اور حدودِ نبوت و امامت کا کچھ بھی علم و اندازہ نہیں ہے۔ ورنہ خداوند عالم کے صفاتِ ثبوتیہ و سلبیہ کا اعتقاد رکھنے اور خصائص نبوت بیان کرنے اور معارفِ امامت لکھنے کا اور بیان کرنے کا مقصد ہی کیا ہے؟ ہم جو خدا کے لیے چند صفات ثبوتیہ و سلبیہ ثابت کرتے ہیں یا پیغمبر اسلامؐ کے لیے چند خصائص نبوت کا اعتقاد رکھتے ہیں یا چند فضائل امامت کو تسلیم کرتے ہیں، تو اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ ہم نے ان کی اصل حقیقت کو معلوم کر لیا ہے اور وہ محدود ہو گئے ہیں۔ مگر اتنا تو ضرور ہوتا ہے کہ جو صفات خدا کے لیے مانتے ہیں ان میں کسی اور کو شریک قرار نہیں دیتے اور خصائص نبوت میں غیر نبی کو سہیم نہیں مانتے۔ اسی طرح فضائل امام میں غیر امام کو برابر نہیں سمجھتے۔ لہٰذا اگر امام میں خصائص نبوت یا صفاتِ ربوبیت تسلیم کر لی جائیں تو غلو یقیناً لازم آئے گا۔ یا نبی میں صفاتِ الٰہیہ تسلیم کر لیں تب بھی غُلُوّ لازم آئے گا۔ جیسا اوپر اقسامِ غُلُوّ میں اس مطلب کی وضاحت کی جا چکی ہے۔ یہ کیا فضول بات ہے کہ ان حضرات کو سوائے خدا کہنے کے اور کسی طرح ہم سے غُلُوّ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ عقیدۂ تفویض غُلُوّ ہی کا تو ایک شُعبہ ہے، جیسا کہ ابتدائے مبحث میں اسے ثابت کیا جا چکا ہے۔ پس ان حقائق سے ثابت ہوا کہ: "قولوا ما شئتم" کا عموم اپنے عموم پر باقی نہیں ہے، بلکہ مخصص ہے۔ "وما من عام الا وقد خص" مشہور و مسلّم ہے۔ "الا ما شذ ونذر"۔

ان حقائق سے قطع نظر کر کے اس کے عموم کے ساتھ استدلال کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی شخص حدیث نبوی: "قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا" کے ساتھ تمسّک کر کے کہے کہ تمام فرقہائے اسلام ناجی ہیں۔ یا کوئی بدعمل یہ استدلال کرے کہ عمل کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ولا تخفی سخافته۔

گیارھواں شبہ اور اس کا جوابؒ

اگر تفویض کا عقیدہ اس لیے غلط ہے کہ اس سے شرک لازم آتا ہے تو پھر اس خرابی سے کوئی جائے فرار نہیں ہے۔ کیونکہ ملائکہؑ کا ان اُمور کو انجام دینا تو مُسلّم ہے، لہٰذا یہ کیا بات ہے کہ ملائکہؑ انہی اُمور کو انجام دیں تو شرک لازم نہیں آتا، لیکن ائمہ اہلِ بیتؑ ان کو انجام دیں تو شرک لازم آتا ہے؟

اس شبہ کا پہلا جواب

اس شُبہ کے کئی جوابات دیے جاسکتے ہیں ۔ اولاً: یہ کہ بعض اوقات دو فعل بظاہر بالکل باہم مجانس ومشابہ اور ایک جیسے ہوتے ہیں ۔ مگر اس وجہ سے کہ ایک مأذون من اللہ ہے وہ باعثِ قُربِ ایزدی قرار پاتا ہے اور دُوسرا بوجہ غیر مأذون من اللہ ہونے کے باعثِ بُعد اور موجبِ شرک بن جاتا ہے ۔ چنانچہ متعدد روایات میں وارد ہے کہ جو لوگ ائمۂ معصومینؑ کے علاوہ دیگر خُلفائے جَور کی اِطاعت وفرمانبرداری کرتے ہیں ، وہ مُشرک ہیں ، اور جو ائمۂ طاہرینؑ کی اتباع اور پیروی کرتے ہیں وہ مُوحّد و خُدا پرست ۔ حالانکہ بظاہر دونوں صُورتوں میں غیر خُدا کی اتباع ہے ۔ مگر ایک صورت میں شرک ہے اور دُوسری صُورت میں ایمان ۔ یہ تفریق کیوں ہے؟ محض اس لیے کہ چونکہ ائمۂ طاہرینؑ کی اطاعت و پیروی کا منجانب اللہ حکم ہے اور دُوسرے خُلفاء کی اِتباع کا کوئی اِذن نہیں ہے ۔ یہی کیفیت ہمارے مُتعلقہ مسئلہ کی ہے ۔ چونکہ ملائکۂ کا مُدبرِ اُمور ہونا قرآن وسُنّت سے ثابت ہے، لہٰذا ان کو مُدبّر تسلیم کرنے سے شرک لازم نہیں آتا اور ائمۂ طاہرینؑ کا مُدبّر و منظم عالم ہونا قرآن وسُنّت سے ثابت نہیں ہے، اس لیے اگر ان کو مُدبّرِ امر اور ناظمِ عالم مانا گیا تو شرک لازم آئے گا ۔

بارھواں شبہ اور اس کا جواب

سورہ "انا انزلناہ" کی تفسیر میں مُتعدّد روایات کے اندر موجود ہے کہ لیلۃُ القدر کو فرشتے امامِ وقتؑ کی خدمت میں تمام اُمور لے کر حاضر ہوتے ہیں اور اس سال زمین پر جو کُچھ واقع ہونا ہوتا ہے اس کی اِطّلاع امامؑ کو دیتے ہیں ۔ اس سے معلُوم ہوتا ہے کہ زمین کا نظم و نسق امامؑ کے ہی سپرد ہے ۔ ورنہ ملائکۂ کا اُن کی خدمت میں آنا چہ معنی دارد؟

اس شبہ کا تحقیقی جواب جیسا کہ سرکار علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے دیا ہے، اور دوسرے اعلام نے ان کی تائید فرمائی ہے، یہ ہے کہ: "فلیس ذلك لمد خلیھم فی ذلك ولا للاستشارۃ بھم بل له الخلق والامر ولیس ذلك الا لتشریفھم واکرامھم واظھار رفعۃ مقامھم" ۔ (سابع بحار الانوار صفحہ ۲۶۴)

"امامِ وقت پر ملائکۂ کا نزول اس لیے نہیں ہوتا کہ ائمۂ اطہارؑ کو نظامِ عالم کے چلانے میں کچھ دخل ہے یا ان سے خدا کو مشورہ کرنا مقصُود ہے ۔ خدا ہی خالق وحاکم ہے، بلکہ ائمۂ طاہرینؑ کے اکرام واحترام اور ان کی رفعت وعظمتِ مقام ظاہر کرنے کے لیے ایسا کیا جاتا ہے کہ جب ملائکۂ زمین پر آئیں تو پہلے حجتہائے خداوندی کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل کریں ۔

صاحب "مِرآۃُ الانوار و مشکوۃ الاسرار" نے سرکار علامہ کی یہی توجیہ وجیہ نقل کرنے کے بعد بنظرِ اِستحسان دیکھتے ہوئے لکھا ہے: "واقول ما ذکرہ طاب ثراہ فیہ تنبیہ توجیہ وجیہ للاخبار المذکورۃ وغیرھا" الخ۔ (صفحہ ۶۷) میں کہتا ہوں کہ جو کچھ حضرت علامہ مجلسیؒ نے ذکر کیا ہے اس میں ان احادیث کی جو (لیلۃُ القدر میں ائمہؑ پر نزولِ ملائکہ کے بارہ میں وارد ہوئے ہیں) کی بہترین توجیہ وتاویل ہے۔

یہ تھے وہ شکوک وشبہات جن کے ساتھ قائلین تفویض تمسک کرتے ہیں یا تمسک کیا جاسکتا ہے۔ جنھیں تفصیل کے ساتھ ہم نے یہاں یکجا جمع کرکے ان کو بفضلہٖ تعالیٰ ہباءً منثورًا کردیا ہے۔

فقدمنا الی ما عملوا من عمل فجعلناہ ھباء منثورا۔ قد تبین الرشد من الغی۔ فمن شاء فلیؤمن و من شاء فلیکفر۔ وما علینا الا البلاغ۔

ایضاح

حضرت مُصنّف علّامؒ نے غُلاۃ ومُفوّضہ کے جو علاماتِ مخصوصہ شمار کیے ہیں کہ وہ عُلماء ومشائخِ قُم کی طرف تقصیر وکوتاہی کی نسبت دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس کے متعلّق اتنی وضاحت مطلوب ہے کہ یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے کہ ہر غالی ومُفوّض میں یہ علامات ضرور ہی موجود ہوں، بلکہ مُصنّف علّامؒ کی یہ فرمائش اپنے دَور کے مخصوص حالات وکیفیات پر مبنی ہے۔ مکان وزمان کے تغیّر وتبدل سے ایسے علامات میں بھی تغیّر ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ دَورِ حاضر کے "مُفوّضہ" جن کا فردِ اکمل فرقہ "شیخیہ" ہے جو کہ شیخ احمد احسائی کا مُتبع ہے، وہ حوزہ علمیۂ نجفِ اشرف کے علماء اعلام اور دوسرے تمام متبعِ قرآن وسُنّت خیر الانام علماء کرام کو تقصیر کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اور خُود معارفِ ربّانیہ وحقائق سبحانیہ اور دیگر عُلومِ مخفیّہ کی معرفتِ تامّہ رکھنے کا مُدّعی ہے۔ اور یہی کیفیّت ہمارے ملک کے عُلماء نُما جُہّال کی ہے کہ وہ اپنے عقائد کی نشر واشاعت کرنے اور عوام کالانعام سے دادِ تحسین حاصل کرنے کے لیے حقیقی عُلماء ومُجتہدین کی تذلیل وتوہین میں ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے، بلکہ اسے اپنا محبوب مشغلہ سمجھتے ہیں۔ بہر حال ان کی شناخت کا اصل معیار وہی عقائد ونظریاتِ فاسدہ ہیں جو بیان ہوچکے ہیں۔ یہ ظاہری علامات فقط بعض اوقات کاشف ہوتی ہیں۔ اور بعض اوقات ان میں کاشفیّت کا پہلو بھی مفقود ہوتا ہے۔

واللہ العالم وعلمہ اکمل واتم

قل یا ایھا الناس قد جاءکم الحق من ربکم فمن اھتدی فانما یھتدی لنفسہ

ومن ضل فانما یضل علیھا وما انا علیکم بوکیل

باب الاعتقاد

فی الظالمین

قال الشیخ ابوجعفرؒ اعتقادنا فیہم انہم ملعونون و البرائۃ منہم واجبۃ قال اللہ عزوجل و ما للظلمین من انصار و قال اللہ تعالیٰ و من اظلم ممن افتری علی اللہ الکذب اولئک یعرضون علی ربہم و یقول الاشہاد ہؤلاء الذین

اڑتیسواں بابؒ

ظالم لوگوں کے بارے میں اعتقاد

جناب شیخ ابوجعفر علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ظالموں کے متعلق ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ وہ ملعون اور رحمت خداوندی سے دور ہیں۔ ان سے بیزاری اختیار کرنا واجب ہے۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: ظالموں کے لیے (بروز قیامت) کوئی ناصر و مددگار نہ ہوگا (سورۃ البقرہ: ۲۷۰) ایک اور مقام پر فرمایا: جو شخص خدا پر جھوٹ بولے اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے۔ یہ لوگ جب خدا کے دربار میں پیش کیے جائیں گے تو گواہ کہیں گے کہ یہی وہ

اڑتیسواں بابؒ

ظالموں کے متعلق عقیدہ کا بیان

اس باب میں حضرت مصنف علامؒ نے چند امور ذکر کیے ہیں۔ ① ظالمین اور ائمہ طاہرینؑ کے معاندین سے بیزاری اختیار کرنا ② منکرین امامتِ ائمہؑ کا انجام ③ امیرالمومنینؑ کے ساتھ جنگ کرنے والوں کا حشر ④ جناب سیدہ عالمؑ کی تمام زنانِ عالم پر افضلیت ⑤ قاتلین انبیاءؑ و ائمہؑ کا کفر۔

ہم ذیل میں ان تمام مسائل پر اور بعض دوسرے متعلقہ مباحث پر حسب گنجائش کسی قدر تفصیل سے تبصرہ کرتے ہیں۔

حق و باطل کی باہمی معرکہ آرائی

حق و باطل کی معرکہ آرائی اور زور آزمائی ابتدائے آفرینش کائنات سے جاری و ساری ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز　　چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

اور آثار سے واضح و آشکار ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ قیامت تک اسی طرح جاری رہے گا۔ "لایزالون مختلفین الی یوم القیامۃ" (سورۃ ہود: ۱۱۸) دنیا میں ہر شے، ہر حقیقت اور ہر نظریہ کی ضد موجود ہے۔

كذبوا على ربهم الا لعنة الله على الظالمين الذين يصدون عن سبيل الله و يبغونها عوجا و هم بالأخرة هم كافرون قال ابن عباسؓ فى تفسير هذه الأية ان سبيل الله فهذه المواضع على بن ابى طالب و الائمة و فى كتاب الله عزوجل

لوگ ہیں جو اپنے پروردگار پر جھوٹ بولا کرتے تھے۔ خبردار! ان ظالموں پر خدا کی لعنت ہے جنھوں نے خدا کی راہ سے بندوں کو روک کر اس میں کجی ڈالنے کی کوشش کی اور یہی لوگ آخرت کے منکر ہیں (سورۃ ھود: ۱۸ و ۱۹) اس آیت کی تفسیر میں عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہاں "سبیل خداوندی" سے مراد حضرت امیرالمومنین علیؑ بن ابی طالبؑ اور دوسرے ائمہ اطہار علیہم السلام ہیں۔

جب یزدان و رحمٰن کے مقابلے میں اہرمن و شیطان کھڑا ہوگیا تو باقی کیا رہ جاتا ہے؟ ہر خیر کے ساتھ شر اور ہر حقیقت کے ساتھ اس کی ضد موجود ہے۔ ہابیل کے مقابلے کے لیے قابیل، موسیٰؑ کے لیے فرعون، اور محمد مصطفیٰؐ کے خلاف ابوجہل، ابوسفیان اور مسیلمہ کذاب وغیرہ موجود ہیں۔ اسی طرح حقیقی خلافت و امامت کے خلاف مصنوعی خلافت وحکومت موجود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے اندر جتنے خون خرابے اور فتنے فساد اس اختلاف کی وجہ سے ہوئے، اتنے اور کسی وجہ سے نہیں ہوئے۔ حقیقت نے ہمیشہ کذب کو ماننے سے انکار کیا۔ خواہ اس کے سر پر کتنے ہی آرے چلے، اور کذب نے حکومت کی آڑ میں کوئی ایسا ظلم نہیں تھا جو حق اور اہل حق پر نہ کیا ہو۔ اسی تنازعہ نے اسلام کے فقہ و احکام پر بھی بہت برا اثر ڈالا۔ اور یہی اِختلاف تمام اِختلافات اور فقہ اِسلام کے احکام میں ترمیم و تنسیخ کا باعث بنا۔ جن لوگوں کو آنحضرتؐ کے اِنتقالِ پُرملال کے بعد اِقتدار حاصل ہوگیا تھا۔ انھوں نے اِسلامی اِمامت کو یونانی حکومت کے ساتھ بدل دیا۔ اور اس تبدیلی کے لیے انھیں وہ تمام نظریات جن پر حقیقی اِمامت مبنی تھی، بدلنے پڑے اور ان کے بدلنے کے ساتھ اِسلام بدلا گیا۔ غرض کہ بقول صاحب "ملل ونحل" اِمامت کا اِختلاف امت اسلامیہ میں سب سے بڑا اختلاف ہے اور مذہب تشیّع و تسنّن کا بنیادی نقطہ اِختلاف بھی یہی تنازعہ ہے۔ (فلسفہ اسلام)

اُمّت اِسلامیہ میں اِمامت کے دو سلسلے موجود ہیں۔ ایک وہ سلسلہ جلیلہ ہے جو حضرت امیرالمومنین علیؑ بن ابی طالبؑ سے شروع ہوکر بارھویں امام مہدیؑ دوران صاحب العصر والزمان حضرت حجۃ بن الحسنؑ تک منتہی ہوتا ہے۔ اور دوسرا سلسلہ جناب ابوبکر سے شروع ہوکر نہ معلوم مروان الحمار اموی یا معتصم عباسی یا کسی اور پر جاکر منتہی ہوتا ہے۔ (جس کا صحیح علم ان کی خلافت کے علمبرداروں

اماماں امام الھدیٰ و امام الضلالۃ قال اللہ تعالیٰ و جعلناھم ائمہ یھدون بامرنا و قال اللہ تعالیٰ و جعلناھم ائمۃ یدعون الیٰ النار و یوم القیامۃ لا ینصرون و اتبعنا ھم فی ھذہ الدنیا لعنۃ و یوم القیامۃ ھم من المقبوحین فلما نزلت ھذہ الآیۃ و اتقوا فتنۃ لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ

خدائے عزوجل کی کتاب میں دو قسم کے اماموں کا ذکر آیا ہے۔ ایک امامِ ہدایت، دوسرا امامِ ضلالت۔ چنانچہ ارشادِ قدرت ہے: ہم نے انھیں ایسا امام بنایا ہے کہ وہ ہمارے حکم سے ہدایت کرتے ہیں (سورۃ الانبیاء:۷۳) نیز (ائمہ ضلالت کی مذمت میں) خدا فرماتا ہے: ہم نے انھیں ایسا اِمام پیدا کیا ہے جو دوزخ کی طرف (لوگوں کو) دعوت دیتے ہیں۔ قیامت کے روز ان کی امداد نہ کی جائے گی اور ہم نے اس دنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگا رکھی ہے۔ اور بروزِ قیامت ان کا شمار ذلیل و خوار لوگوں میں ہوگا (سورۃ القصص:۴۲) جب یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی کہ: اس فتنہ سے ڈرو جو صرف انہی لوگوں کو نہیں پہنچے گا جو تم میں سے ظالم ہیں (بلکہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا) (سورۃ الانفال:۲۵) تو (اس کی تفسیر میں) جناب رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: جو شخص میری

کو بھی نہیں ہے۔ (تفصیلات معلوم کرنے کے شائقین ہماری کتاب "اثبات الامامت" صفحہ ۲۶۰، ۲۶۱ کی طرف رجوع کریں)

خلافت علیؑ کا اجمالی بیان

حضرات شیعہ خیر البریہ کا یہ عقیدہ ہے کہ جناب سرور کائنات ﷺ سنتِ الٰہیہ کے مطابق حضرت علی علیہ السلام کو اپنا خلیفہ و جانشین مقرر فرما کر دنیا سے تشریف لے گئے۔ اس خلافت کا اعلان دعوت ذوالعشیرہ کے موقع پر کیا۔ (مسند احمد بن حنبل وغیرہ) اور آخر میں غدیر خم کے مقام پر عملاً آنجنابؑ کو اپنا خلیفہ بلافصل مقرر فرمایا، اور ولی عہدی کی رسم ادا فرمائی۔ اور اس درمیانی عرصہ میں بھی آنحضرتؐ برابر حضرت علیؑ کے فضائل و مناقب اور ان کی تقرری کا تذکرہ فرماتے رہے۔ اور باقی گیارہ ائمہ طاہرینؑ کی بھی مع نام و نسب تصریح فرما دی۔ (جیسا کہ باب ۳۵ کے ذیل میں اس مطلب پر فی الجملہ تبصرہ کیا جا چکا ہے) آنحضرتؐ نے اپنے اس اسوۂ حسنہ سے واضح کر دیا کہ خلافت بالنص ہوتی ہے نہ کہ بالاجماع وغیرہ۔ مگر افسوس حسب رسم قدیم ابناء دنیا نے ان وارثانِ زمین کو آنحضرت ﷺ کی ظاہری مسندِ خلافت پر متمکن نہ ہونے دیا، اور زمام حکومت ایسے ہاتھوں میں دے دی جو کسی طرح بھی

قال النبیؐ من ظلم علیا مقعدی هذا بعد وفاتی فکانما جحد نبوتی و نبوة الانبیاء من قبلی و من تولی ظالما فهو ظالم قال الله عز وجل ثنائه یا ایها الذین أمنوا لا تتخذوا أبائکم و اخوانکم اولیاء ان استحبوا الکفر علی الایمان و من یتولهم منکم فاولئك هم الظالمون و قال عز و جل یا ایها الذین أمنوا لا تتولوا قوما غضب الله علیهم قد یئسوا من الأخرة کما

وفات کے بعد میرے مقامِ خلافت کے متعلق علیؑ بن ابی طالبؑ پر ظلم کرے گا گویا اس نے میری اور مجھ سے پہلے گزرے ہوئے تمام انبیاء کی نبوت کا انکار کیا۔ اور جو شخص کسی ظالم سے بھائی چارہ قائم کرے وہ خود بھی ظالم ہے (اس سلسلہ میں) خدا فرماتا ہے: اے ایمان والو! تم اپنے ان باپ بھائیوں سے محبّت اور دوستی نہ رکھو جو ایمان کے مقابلے میں کفر کو ترجیح دیتے ہیں اور تم میں سے جو شخص ان سے دوستی رکھے گا وہ بھی انہی ظالموں میں سے ہوگا (سورة التوبہ:۲۳) نیز خدا فرماتا ہے: اے ایمان والو! اس گروہ سے محبّت نہ کرو جس پر خدا غضب ناک ہے اور وہ آخرت سے اس طرح مایوس ہیں جس طرح

اس منصبِ الٰہی کے اہل نہ تھے۔ لہٰذا ان ائمہ طاہرینؑ کی موجودگی میں جن لوگوں نے ظاہری خلافت وحکومت پر قبضہ کیا، ان کا یہ قبضہ حضرت علیؑ اور اولادِ علیؑ علیہم السلام کی نگاہ میں غاصبانہ و ظالمانہ تھا۔ (والحق مع علیّ و علیّ مع الحق) جیسا کہ یہ امر حضرت امیرالمومنینؑ کے متعدد خطبات و ارشادات اور دوسرے ائمہ طاہرینؑ کے فرمائشات سے واضح وعیاں ہے۔ مثلاً خطبۂ شقشقیہ میں آپ فرماتے ہیں: "لقد تقمصها فلان و هو یعلم ان محلی منها محل القطب من الرحی ینحدر عنی الیل ولا یرقی الی الطیر فلان"۔ (یعنی خلیفہ اول) نے قمیص خلافت کو زیب تن کر لیا۔ حالانکہ اسے علم تھا کہ مجھے خلافت سے وہی تعلق ہے جو قطب آسیا کو آسیا سے ہوتا ہے (میں اس علمی بلند مقام پر فائز ہوں کہ) مجھ سے علم ومعرفت کے چشمے پھوٹ رہے ہیں اور مجھ تک پرندہ بھی پر مار کر نہیں پہنچ سکتا۔

(نہج البلاغہ جلد ۱ صفحہ ۲۵ طبع مصر)

ائمہ اہل بیتؑ اور خلفائے ثلاثہ کی خلافت

نہج البلاغہ میں ایک مکتوب میں جو آپؑ نے معاویہ کے خط کے جواب میں ارسال فرمایا، خلافت ثلاثہ کی ناپسندیدگی کے سلسلہ میں فرماتے ہیں: "واما الکراهة فلا اعتذر للناس من ذلك"۔ یعنی باقی رہا میرا ان لوگوں کی خلافت کو ناپسند کرنا، سو میں اس کی عذر خواہی لوگوں کے سامنے پیش نہیں

يئس الكفار من اصحاب القبور و قال عز و جل لا تجد قوما يومنون بالله و اليوم الأخر يوادون من حاد الله و رسوله و لو كانوا آبائهم او ابنائهم او اخوانهم او عشيرتهم اولئك كتب في قلوبهم الايمان و قال الله تعالیٰ و من يتولهم منكم فانه منهم ان الله لا يهدی القوم الظلمين و قال عز و جل و لا تركنوا الی الذين ظلموا فتمسكم النار و مالكم من دون الله من اولياء ثم لا تنصرون و الظلم هو وضع الشئ فی غير موضعه فمن ادعی

جس طرح کہ کافر لوگ قبروں کے مردوں سے مایوس ہیں (سورۃ ممتحنہ:۱۳) نیز خدا تعالیٰ فرماتا ہے: جو لوگ خدا اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں تم ان کو دشمنانِ خدا و رسولؐ سے محبّت کرتے ہوئے نہیں پاؤ گے۔ خواہ وہ ان کے باپ دادا یا بیٹے یا بھائی یا اپنے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ یہ اس لیے ہے کہ خدا نے ان کے دلوں میں ایمان راسخ کر دیا ہے (سورۃ مجادلہ:۲۲) نیز خدا فرماتا ہے: تم میں سے جو شخص ان (ظالموں) سے دوستی رکھے گا، وہ بھی انھیں میں شمار ہوگا۔ بے شک خداوند عالم ظالموں کو ہدایت نہیں فرماتا (سورۃ مائدہ:۵۱) (اسی سلسلہ میں ایک اور جگہ) ارشاد فرماتا ہے: ظالموں کی طرف مائل نہ ہو، ورنہ تمھیں بھی آتش دوزخ اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ اور خدا کے سوا تمھارا کوئی یار و مددگار نہ ہوگا (سورۃ ہود:۱۱۳) لغت میں کسی چیز کو اس کے اصلی مقام پر نہ رکھنے کا نام ظلم ہے۔ پس جو شخص امامت کا دعویٰ کرے

کرتا۔ (آپؑ کا یہ خط "العقد الفرید" جلد ۲ صفحہ ۲۳۴ اندلسی میں بھی مذکور ہے) خلیفہ دوم کی وفات کے بعد جب مجلس شوریٰ میں عبدالرحمٰن بن عوف نے کتابِ خدا، سنتِ مصطفےٰؐ کے ساتھ ساتھ سیرتِ شیخین پر عمل کرنے کی شرط پر زمامِ خلافت جناب امیرؑ کے حوالہ کرنا چاہی تو جناب امیرؑ نے تختِ حکومت کو پائے اِستحقار سے ٹھکرا دیا۔ مگر سیرتِ شیخین پر عمل کرنے کی شرط کو قبول نہیں فرمایا۔ (الامامۃ و السیاسۃ، شرح فقہ اکبر وغیرہ) اس واقعہ سے بھی یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح و آشکار ہو جاتی ہے کہ آنجنابؑ خلافتِ شیخین کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ بہر حال ان حقائق کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امیر علیہ السلام کا ان لوگوں کو غاصب و جائر سمجھنا ایسا واضح تھا کہ خود ان لوگوں کو بھی اس حقیقت کا اعتراف تھا۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں یہ واقعہ مرقوم ہے کہ خلیفہ ثانی نے حضرت امیرؑ اور جناب عباسؓ کو خطاب کرکے کہا: "رأیتمانی کاذبا أثما، غادرا، خائنا" ۔ تم دونوں مجھے جھوٹا، گنہگار، غدار اور خیانت کار سمجھتے ہو"۔ بلکہ جو شخص مجھ سے بہتر تھا (خلیفہ اول) تم دونوں اسے بھی ہمیشہ کاذب، آثم، خائن، اور

الامامة و هو غیر امام فهو الظالم الملعون و من وضع الامامة فی غیر اهلها فهو ظالم ملعون و قال النبیؐ من جحد علیاً امامته بعدی فقد جحد نبوتی و من جحد نبوتی فقد جحد الله ربوبیته و قال النبیؐ یا علیؑ! انت المظلوم بعدی و من ظلمك فقد ظلمنی و من انصفك فقد انصفنی و من جحدك فقد جحدنی و من والاك فقد والانی و من عاداك فقد عادانی و من اطاعك فقد اطاعنی و من عصاك فقد عصانی و اعتقادنا

حالانکہ وہ امام نہ ہوتو وہ ظالم اور ملعون ہے۔ اسی طرح وہ شخص بھی ظالم وملعون ہے جو نا اہل لوگوں کی امامت کا قائل ہو۔ جناب رسولِ خداؐ فرماتے ہیں جو شخص میرے بعد حضرت علی علیہ السلام کی امامت کا انکار کرے گا وہ ایسا ہے کہ گویا اس نے میری نبوت ورسالت کا انکار کیا اور جس نے میری نبوت کا انکار کیا تو اس نے گویا خدا کی ربوبیت کا انکار کیا۔ نیز آنحضرتؐ نے فرمایا: یا علیؑ! میرے بعد تم پر ظلم و ستم کیا جائے گا (یادرکھو) جو شخص تم پر ظلم کرے گا وہ مجھ پر ظلم کرے گا۔ جو تمہارا منکر ہوگا وہ میرا منکر ہوگا، جوتم سے محبت کرے گا وہ مجھ سے محبت کرے گا اور جوتم سے دشمنی کرے گا وہ میرا دشمن ہوگا جو تمہاری اطاعت کرے گا وہ میرا اطاعت گزار ہوگا، اور جو تمہارا نافرمان ہوگا وہ میرا نافرمان ہوگا۔ ہمارا عقیدہ

غادر سمجھتے رہے۔ (صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۹۱ طبع دہلی) حضرت امیرؑ اور جناب عباسؓ کے سکوت نے اس امر پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے کہ واقعاً وہ ان لوگوں کو ایسا ہی سمجھتے تھے۔ ان حقائق کو ہم نے تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب "اثبات الامامۃ" میں ذکر کیا ہے۔ شائقین تفصیل کے لیے اس کی طرف رجوع کریں۔ یہاں فقط اشارہ مقصود ہے۔ مگر زمانہ کی ستم ظریفی دیکھیے کہ ادھر حضرت امیرؑ آنحضرتؐ کی تجہیز وتکفین اور نماز جنازہ پڑھنے میں مشغول رہے ادھر آنجناب کا حق غصب ہوتا رہا۔ (الملل والنحل وغیرہ)

عرفی نے خوب کہا ہے: ؎

امامےؑ کہ روزِ وفاتِ پیمبرؐ خلافت گزارد بماتم نشیند

برائت و بیزاری کا عقلی ونقلی ثبوت

بنابریں چونکہ ہر معاملہ ومسئلہ میں حق اہل بیت رسولؐ کے ساتھ ہے، لہٰذا ان کی اِقتدا واتباع اوران سے محبت ومؤدت رکھنا بنصِّ قرآن واجب ولازم ہے۔ اور یہ امر اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک ان کے مخالفین ومعاندین سے علیحدگی و بیزاری اختیار نہ کی جائے۔ جس طرح کہ توحید و رسالت کا اقرار واعتقاد اس وقت تک کامل نہیں ہوتا جب تک خدا ورسولؐ کے بالمقابل جھوٹے

فمن جحد امامة امیرالمومنین علیؑ بن ابی طالبؑ و الائمة من بعدہ انه کمن جحد نبوة جمیع الانبیاء و اعتقادنا فمن اقر بامیر المومنینؑ و انکر واحدا من بعدہ من الائمة انه بمنزلة من اقر بجمیع الانبیاء و انکر نبوة نبینا محمدؐ و قال الصادقؑ المنکر لاخرنا کالمنکر لاولنا و قال النبیؐ و الائمة من بعدی اثنا عشر اولھم امیرالمومنین علیؑ بن ابی طالبؑ و أخرھم المھدیؑ القائم طاعتھم طاعتی

اس شخص کے متعلق جو حضرت امیرؑ اور دیگر ائمہ طاہرینؑ کی امامت وخلافت کا مُنکر ہے یہ ہے کہ وہ ایسے شخص کی مانند ہے کہ جس نے تمام انبیاء کی نبوت کا انکار کیا ہو اور جو شخص حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کی امامت کا تو قائل ہو مگر دوسرے گیارہ اماموں میں سے کسی ایک کی امامت کا مُنکر ہو تو اس کے متعلق ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ ایسا شخص اس آدمی کی مانند ہے جو تمام انبیاء ماسلف کی نبوت کا اقرار تو کرتا ہو مگر حضرت محمد مُصطفیٰؐ کی نبوت کا مُنکر ہو۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں جو شخص ہمارے آخری امامؑ کا انکار کرے وہ ایسا ہے کہ گویا اس نے ہمارے پہلے امام کا انکار کر دیا۔ جناب رسولِ خداؐ فرماتے ہیں: میرے بعد (میری مسند خلافت کے وارث) بارہ امام ہوں گے، ان میں سے پہلے حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ ہیں اور آخری حضرت مہدیؑ ہوں گے۔ ان کی اطاعت میری اطاعت

مدعیانِ ربوبیت ونبوت کی ربوبیت ورسالت کا انکار کرکے ان سے بیزاری اختیار نہ کی جائے۔ اور یہی کلمہ توحید "لا اله الا الله محمد رسول الله علی ولی الله" کا مفاد وماحصل ہے اور یہ نظریہ فطرتِ صحیحہ کے عین مطابق ہے۔ اور چونکہ دین اسلام فطری دین ہے بلکہ یہی امر اس دین کا دیگر ادیانِ عالم کے بالمقابل طغرائے امتیاز و مایہ کمال ہے کہ یہ دین فطرت ہے۔ عقل سلیم وطبع مستقیم کے عین مطابق ہے۔ "فطرة الله التی فطر الناس علیھا" (سورۃ روم: ۳۰) جیسا کہ اس مطلب پر بعض سابقہ ابواب میں مفصّل تبصرہ کیا جا چکا ہے، اس لیے دین اسلام نے اس مسئلہ پر بہت زور دیا ہے۔ اربابِ عقل و دانش پر مخفی نہیں ہے کہ عقل سلیم کا یہ فیصلہ نا قابلِ انکار ہے کہ سچا و جھوٹا، عالم و جاہل، مومن ومنافق، مُسلم وکافر، ظالم ومظلوم، مکار وعیار اور متقی وپرہیز گار۔ غرض کہ نیک وبد، نبی ومُتنبّی، امام اہل جنّت و امام اہل نار دونوں مساوی و برابر نہیں ہو سکتے۔ عقل سلیم کا یہ اٹل فیصلہ ہے کہ سچے سے دوستی اور جھوٹے سے بیزاری، عالم سے الفت اور جاہل سے نفرت، مُسلم ومومن سے محبّت اور منافق وکافر سے عداوت، مظلوم سے ہمدردی اور ظالم سے برائت، مکار سے کنارہ کشی اور پرہیز گار سے راہ ورسم رکھنا،

و معصیتہم معصیتی و من انکر واحدا منہم فقد انکرنی و قال الصادق من شك فی کفر اعدائنا و الظالمین لنا فهو کافر و قال امیرالمومنین مازلت مظلومًا منذ ولدتنی امی حتی ان عقیلا کان یصیبه الرمد فیقول لا تدوونی حتی تدووا علیًا فیدوونی و مابی رمد و اعتقادنا فیمن قاتل علیًا قوله من قاتل علیًا فقد قاتلنی و من حارب علیًا فقد حاربنی و من حاربنی فقد حارب الله و قوله لعلیؑ و فاطمةؑ

اور ان کی نافرمانی میری نافرمانی ہے۔ جو شخص ان میں سے کسی ایک کی امامت کا انکار کرے وہ ایسا ہے کہ گویا اس نے میری نبوت کا انکار کیا ہے۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں جو شخص ہمارے دشمنوں اور جنھوں نے ہم پر ظلم کیے ہیں کے کفر میں شک کرے وہ خود کافر ہے۔ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں میری ابتدائے ولادت سے برابر مجھ پر ظلم ہوتا رہا ہے، یہاں تک کہ جب عقیلؓ کی آنکھوں میں درد ہوتا تھا تو وہ کہتے پہلے علیؑ کی آنکھ میں دوا ڈالو، تب میں ڈلواؤں گا۔ اس وقت میری آنکھوں میں دوا ڈال دی جاتی تھی، حالانکہ میری آنکھوں میں قطعاً کوئی درد نہ ہوتا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام سے جنگ کرنے والوں کے متعلق ہمارا عقیدہ پیغمبرؐ کے اس ارشاد کے مطابق یہ ہے کہ جو جناب علیؑ سے جنگ کرے وہ مجھ سے جنگ کرتا ہے اور مجھ سے لڑائی کرنے والا خدا سے لڑنے والا ہے۔ اسی طرح آنحضرتؐ جناب امیرالمومنینؑ حضرت فاطمہؑ

سچے نبی و امام سے تولا اور ان کی اتباع و اقتداء اور جھوٹے مدعیانِ نبوت و امامت سے بغض و عداوت اور ان سے تبرا یعنی علیحدگی و بیزاری اختیار کرنا واجب و لازم ہے۔ کوئی ذوقِ سلیم و عقلِ مستقیم رکھنے والا انسان خواہ جس مذہب و ملت سے تعلق رکھتا ہو، بشرطیکہ تعصب و عناد نے اس کی عقل و فکر کو شل نہ کر دیا ہو، وہ بفضلہ تعالیٰ مذکورہ بالاحقائق میں ہرگز کسی قسم کا شک و شبہ نہیں کر سکتا۔ مذاہبِ اسلام میں سے جو مذہب صحیح اسلامی تعلیمات کا حامل ہے، وہ بحمدہٖ تعالیٰ مذہبِ شیعہ خیر البریہ ہی ہے۔ اس لیے اس میں "تولا" و "تبرا" کو جزوِ مذہب قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ نظریہ قرآن و حدیث کے عین مطابق ہے۔ ارشادِ قدرت ہے: "لا یتخذ المومنین الکافرین اولیاء من دون المومنین" (سورۃ آلِ عمران: ۲۸) یعنی اہل ایمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بنائیں۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے: "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ" (سورۃ ممتحنہ: ۱) اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ خداوند عالم حضرت ابراہیمؑ کے متعلق

و الحسنؑ و الحسینؑ علیہم السلام انا حرب لمن حاربکم و سلم لمن سالمکم و اما فاطمة صلوات اللہ و سلامہ علیہا فاعتقادنا فیہا انہا سیدة نساء العالمین الاولین و الآخرین و ان اللہ عز و جل یغضب لغضبہا و یرضیٰ لرضاہا لان اللہ فطمہا و فطم من احبہا من النار و انہا خرجت من الدنیا ساخطة علی ظالمیہا و غاصبی حقہا و من نفی من ابیہا ارثہا و قال النبیؐ ان فاطمةؑ بضعة منی من اذاہا فقد اذانی و من غاظہا فقد غاظنی و من

اور جناب امام حسنؑ اور امام حسینؑ علیہم السلام کو مخاطب کر کے فرمایا جو شخص تم سے لڑے گا میری بھی اس سے لڑائی ہے اور جو تم سے صلح کرے گا اس سے میری بھی صلح ہے۔ حضرت سیدہ عالم جناب فاطمۃ الزہرا علیہا السلام کے بارے میں ہم عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ مخدرہ تمام زنان اولین و آخرین کی سید و سردار ہیں۔ خدائے عزوجل ان کی ناراضی سے ناراض اور ان کی رضامندی سے رضامند ہوتا ہے۔ کیونکہ اس معصومہ کو خداوند عالم نے مع ان کے شیعوں کے آتش جہنم سے آزاد کر دیا ہے۔ ہم اس بات کا بھی اعتقاد رکھتے ہیں کہ جناب سیدہؑ اس حال میں دنیا سے رخصت ہوئی کہ آپ ان لوگوں پر ناراض تھیں جنھوں نے آپ پر ظلم و ستم کیا۔ آپ کے حق کو غصب کیا اور میراث بدر سے محروم کیا۔ حالانکہ جناب پیغمبر اسلامؐ فرمایا کرتے تھے فاطمہؑ میرا ٹکڑا ہے جس نے ان کو اذیت دی اس نے (درحقیقت) مجھے اذیت دی جس نے ان کو غضب ناک کیا اس نے مجھے غضبناک کیا اور جس نے

فرماتا ہے: "فلما تبین لہ انہ عدو اللہ تبوء منہ" (سورۃ توبہ: ۱۱۴) جب ان کو علم ہوا کہ ان کا چچا آذر دشمن خدا ہے۔ انھوں نے فوراً اس سے بیزاری و علیحدگی اختیار کر لی۔ خدا ان کی مدح فرماتا ہے۔ "ان ابراھیم کان اواہ حلیم" (سورۃ توبہ: ۱۱۴) یہ ہے تبرا و تولیٰ کی اصل حقیقت، جسے صحیح تسلیم کرنے میں ہرگز کوئی عقل سلیم اباء و انکار نہیں کرتی۔ مگر فتنہ پرداز ملاؤں نے اس مسئلہ کو ہمارے خلاف عوام الناس میں کچھ اس طرح غلط انداز میں پیش کیا ہے کہ ان کے اذہان میں راسخ کر دیا ہے کہ: "تبرا کا مفہوم اصحابِ رسول کو سب و شتم کرنا ہے"۔ حالانکہ اربابِ علم و بصیرت جانتے ہیں کہ لغت عرب میں "تبرا" کا مفہوم ہے: "بیزار شدن" یعنی کسی سے علیحدگی و بیزاری اختیار کرنا۔ اور "سب و شتم" کا مفہوم ہے: "دشنام دادن" یعنی کسی کو گالی دینا۔ وبینھما بون بعید

این ھذا من ذاک

؟

سرھا فقد سرنی و قال النبیؐ ان فاطمۃؑ بضعۃ منی و ھی روح التی بین جنبی یسوئنی ما سائھا و یسرنی ما سرھا و اعتقادنا	ان کو خوش کیا اس نے مجھے خوش کیا۔ فاطمہؑ میرا ٹکڑا ہے، فاطمہؑ میری وہ روح ہے جو میرے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے۔ جو چیز ان کو رنج پہنچائے، وہ مجھے رنج پہنچاتی ہے، اور جو چیز ان کو مسرور و شاد کام کرے، وہ مجھے مسرور و شاد کام کرتی ہے۔

مذہبِ شیعہ میں کسی کو گالی دینا جائز نہیں

ہم تو بموجب ارشادِ ربّ العزت: "و لا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم" کفار و مشرکین کو بھی سب و شتم کرنا ناجائز سمجھتے ہیں، چہ جائیکہ مُتظاہرینِ اسلام کو سب و شتم کریں۔ ہاں "لعنت" میں جس کے معنی "رحمت خداوندی سے دُوری" کے ہیں، اور "تبرا" جس کے معنی "بیزاری اِختیار کرنے" کے ہیں، یہ اور چیز ہے۔ جس کا جواز قرآن و حدیث اور اکابر امت کے عمل سے ثابت ہے۔ بہر حال یہ حقیقت ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک درجہ ایمان پر فائز نہیں ہوسکتا جب تک وہ بانیٔ اِسلام ختم رسل ﷺ کی ذاتِ قدسی صفات کو خدا کے بعد ہر شے سے حتی کہ اپنی جان و اولاد سے زیادہ عزیز و محبوب نہ سمجھتا ہو۔ جیسا کہ ارشادِ قدرت ہے: "النبی اولیٰ بالمومنین من انفسہم" (سورۃ احزاب: ۶) اور خود آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: "لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ و ولدہ و نفسہ و الناس اجمعین"۔ (شفاء قاضی عیاض، کنز العمال وغیرہ) کوئی شخص اس وقت تک مومن کہلا نہیں سکتا جب تک میں اسے اس کی اولاد، اس کے والد اور اس کے نفس بلکہ تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔ اور یہ اصولِ فطرت ہے کہ محبوب کی ہر شے محبوب ہوتی ہے۔ اسی لیے دوست کا دوست، دوست، اور دوست کا دشمن، دشمن سمجھا جاتا ہے۔

مُتنبّی کہتا ہے: ؎

انی و ان کان الذین حبیبہ   حبیب الی قلبی حبیب حبیبی

مذہبِ شیعہ میں محبّتِ اصحابِ باصفا جزوِ ایمان ہے

بنا بریں یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کے محبوب صحابہ کو برا سمجھ کر کوئی شخص مومن کہلا سکے؟ صحابہ کرامؓ کی چند وجوہ سے محبّت لازم ہے۔

☆ ایک اس لیے کہ وہ مومن ہیں۔ "و کل مومن اخوۃ" مومن بھائی بھائی ہیں۔ مومن کی محبّت

فی البرائة انها واجبة من الاوثان الاربعة یغوث و یعوق و نسر و ھبل و من الانداد الاربع	برائت کے متعلق ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ چار بتوں سے برائت واجب ہے اور وہ یہ ہیں: یغوث، یعوق، نسر اور ہبل۔ اسی طرح ان چار اصنام سے بھی بیزاری واجب ہے جنھیں خدا کا مثل سمجھا

مومن پر واجب و لازم ہے۔ لہٰذا اصحابہ کرامؓ کی محبّت مومن کا ایمانی فریضہ ہے۔

- دوسرے اس لیے کہ صحابہؓ ناصر اسلام ہیں۔ اور ناصر اسلام، ناصر رسولؐ ہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنے آقا و ہادی کے ناصر کی محبّت فطرتاً لازم ہے۔
- سوم اس لیے کہ صحابہ کرامؓ بوجہ جہاد فی سبیل اللہ محبوبِ خدا ہیں۔ "ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ" (سورۃ صف: ۴) لہٰذا محبوبین خدا کی محبّت لازم ہے۔
- چہارم اس لیے کہ اصحابِ رسولؐ مُتّبعانِ رسولؐ ہیں۔ اور آپؐ کی اِتباع کرنے والے محبوبِ خدا ہیں۔ "قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ"۔ (سورۃ آلِ عمران: ۳۱)

واضح ہے کہ محبوبِ خدا کی محبّت ہر اس بندہ پر جو خدا سے محبّت رکھتا ہے واجب و متحتم ہے۔ ان دلائل سے واضح ہوا کہ جو حقیقی اصحابِ رسولؐ ہیں، ان کی محبّت جزوِ ایمان ہے۔ ان کی محبّت کے بغیر کوئی شخص درجہ ایمان پر فائز و کامران نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ مُحقّق شیخ بہائیؒ اپنے رسالہ اعتقادات الامامیہ میں تحریر فرماتے ہیں: "ونعتقد وجوب محبة اصحاب الرسول الذین اقاموا علی متابعته و لم یخالفوا او امرہ بعد وفاته و انفاذ ما اوصاھم به حال حیوته"۔ ہم یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ ان اصحابِ رسولؐ کی محبّت واجب ہے جو آنحضرت ﷺ کی متابعت پر قائم ودائم رہے اور ان کی وفات کے بعد ان کے احکام و وصایا کی مخالفت نہ کی۔ یہی شیعیانِ حیدرِ کرّارؑ کا عقیدہ و ایمان ہے۔ وہ محبّتِ اصحابِ رسول اور ان کے لیے دعائے خیر اپنے ائمہ اطہار کی تقلید و تاسی میں اپنا ایمان وظیفہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے چوتھے امام حضرت زین العابدین علیہ السلام کے صحیفہ کاملہ میں ایک دعا مخصوص اصحابِ رسول کے لیے موجود ہے۔ اس دعا کا عنوان یہ ہے: "وکان من دعائه علیه السلام فی الصلوۃ علی اتباع الرسل و مصدقیھم" اس دعا میں آپؑ فرماتے ہیں: "اللھم و اصحاب محمد صلی اللہ علیه و اٰله وسلم خاصة الذین احسنوا الصحابة و الذین ابلوا البلاء الحسن فی نصرہ و کانفوہ و اسرعوا الی وفادته و سابقوا الی دعوته"۔ یا اللہ خاص کر حضرت رسولؐ کے ان صحابہ کرامؓ کو نظر انداز نہ فرما، بلکہ ان کو جزائے خیر دے جنھوں نے آپؐ کا اچھا ساتھ دیا اور آپؐ کی نصرت میں خوب جہاد کیا۔ اور جناب کی معاونت

اللات و العزیٰ و منات و	جاتا ہے، اور وہ یہ ہیں: لات، مَنات، عُزّیٰ اور شِعریٰ۔ نیز ان
شعریٰ و ممن عبدھم و من	لوگوں سے بھی برائت و بیزاری اختیار کرنا واجب ہے، جو ان کی
جمیع اشیاعھم و اتباعھم و	عبادت کرتے ہیں، اور ان کے ہم پیالہ و ہم نوالہ ہیں، اور جو ان
انھم شر خلق اللہ و ان	کے فرمانبردار ہیں۔ یہ اعتقاد بھی ضروری ہے کہ مذکورہ بالا لوگ

کی۔ اور ان کی دعوت قبول کرنے میں سبقت کی۔

ظاہر ہے کہ حضراتِ شیعہ آلِ محمدؑ کی محبت کے ساتھ ان کی اتباع واقتداء کو بھی عین ایمان سمجھتے ہیں اور ان کو مفترض الطاعۃ جانتے ہیں۔ لہٰذا وہ بھی اپنے ائمہؑ کی اتباع سے صحابہ کرامؓ کے لیے دعائے خیر کرنا جزوِ ایمان سمجھتے ہیں۔ "اللہ اغفرلنا و لاخواننا الذین سبقونا بالایمان"۔

بعد ازیں بھی جو یہ کہتا ہے کہ شیعہ اصحابِ رسولؐ سے دشمنی کرتے ہیں اور ان کو سب وشتم کرتے ہیں، افتراء پردازی و بہتان تراشی کرتا ہے۔ یا وہ شیعوں کے عقائد و اعمال سے ناواقف ہے۔ (تتمہ کوکب دری)

صحابہ رسولؐ میں ہر قسم کے لوگ موجود تھے

ہاں چونکہ کتب سیر و تواریخ بلکہ خود قرآن کریم اور احادیث سید المرسلین سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ رسولؐ میں کچھ قاتل کچھ مقتول، کچھ ظالم کچھ مظلوم، کچھ عادل اور کچھ غیر عادل، کچھ مومن کچھ منافق، کچھ ثابت و مستقیم اور کچھ مذبذب و مرتاب۔ غرض کہ اصحابِ رسولؐ میں ہر قسم و قماش کے لوگ موجود تھے۔ خلاصہ یہ کہ شیعہ مذہب اس بات کا قائل ہے کہ ان مختلف طبقات کو ایک نگاہ سے دیکھنا اور سب کو "عدول" اور سب کو "کالنجوم" قرار دینا، سب سے یکساں محبت و مودت کرنا، سب کو اپنا پیر و مرشد جاننا عقل سلیم و طبع مستقیم پر ظلم عظیم اور قواعد شرعیہ پر جور جسیم ہے۔ بقول جامی: ؎

ہر کہ روئے بہبود نداشت دیدنِ روائے نبی سود نداشت

بعض مُنصف مزاج علماء اہل سنت کو بھی بادلِ نخواستہ ان حقائق کا اقرار کرنا پڑا ہے۔ چنانچہ علامہ تفتازانی شرح مقاصد میں تحریر فرماتے ہیں: "وما وقع بین الصحابۃ من المحاربات و المشاجرات علی الوجہ المسطور فی کتب التواریخ و المذکور علی السنۃ الثقاۃ یدل بظاھرہ علی ان بعضھم قد حاد من طریق الحق و بلغ حد الظلم و الفسق و کان الباعث علیہ الحقد و العناد و الحسد و اللداد وطلب الملک و الریاسۃ و المیل الی اللذات و الشھوات اذ لیس کل صحابی معصوماً و لا کل من لقی النبی بالخیر

لایتم الاقــرار باللہ و برسولہٖ و بالائمۃ المعصومـینؑ الا بالبرائۃ مـن اعدائھم و اعتقــادنا	بدترین خلائق ہیں ۔خُدا کی وحدانیت، رسول اللہؐ کی رسالت اور ائمہ ہدیٰ کی امامت کا اقرار اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ ان کے دشمنوں سے مکمل برائت و بیزاری اختیار

موسوما" ۔ (شرح مقاصد جلد۲ صفحہ ۳۰۸ طبع استنبول) یعنی" صحابہ میں جو جنگ و جدال اور مشاجرات واقع ہوئے جیسا کہ کتب تواریخ میں اور قابلِ وثوق حضرات کی زبانوں پر مذکور ہیں، اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ بعض صحابہ راہِ راست سے منحرف ہوگئے اور ظلم وجور اور فسق و فجور کی حد تک پہنچ گئے اور ان امور کا سبب باہمی کینہ وعناد اور حسد ولداد، طلب ملک وریاست اور لذات وشہوات کی طرف میلان تھا۔ اس لیے کہ ہر صحابی معصوم نہیں ہوتا ۔ اور ہر وہ شخص جس کو آنحضرتؐ کی ملاقات کا شرف حاصل ہو وہ خیر وخوبی کے ساتھ موسوم نہیں ہوتا" ۔

اسے کہتے ہیں: جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے ۔ ؎

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگراں

حدیث اصحابی کالنجوم وضعی ہے

انہی حقائق سے یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ وہ حدیث جو برادرانِ اسلامی کے ہاں بہت مشہور ہے کہ آنحضرتﷺ نے فرمایا: "اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم" بالکل جعلی و وضعی ہے ۔ اور "رُبّ شھرۃ لا اصل لھا" کی مصداق ہے ۔ کیونکہ ہر صحابی کی اِقتدا باعث رشد و فلاح نہیں ہوسکتی ۔ چنانچہ بعض علمائے اہل سنت نے بھی اس حدیث کی تضعیف کی ہے ۔ ابن تیمیہ نے منہاج السنۃ میں لکھا ہے: "ھذا الحدیث ضعیف ضعّفہ ائمۃ الحدیث" ۔ یہ حدیث ضعیف ہے، ائمہ حدیث نے اس کی تضعیف کی ہے ۔

مولوی عبدالحی صاحب لکھنوی نے رسالہ "تحفۃُ الاخیار" صفحہ ۷۰ میں متعدد جید علماء کے حوالہ سے اس کا ضعیف بلکہ موضوع ہونا ثابت کیا ہے ۔ لکھتے ہیں: "جزم ابن حزم بانہ موضوع (فی رسالتہ الکبریٰ) و قال البزاز (فی الدین الخالص) لا یصح قال الذھبی ھی من الاحادیث الواھیۃ" ۔ ابن حزم نے جزم ویقین کے ساتھ اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے اور بزار نے کہا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے ۔ اور ذہبی نے کہا یہ احادیث واہیہ میں سے ہے ۔

اگر بالفرض اسے صحیح بھی تسلیم کرلیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ اس سے مراد حضرت امیرالمومنین

فی قتلة الانبیاء و قتلة الائمة المعصومینؑ انهم کفار مشرکون مخلدون فی اسفل درك	نہ کی جائے۔ انبیاء و مرسلینؑ اور ائمہ معصومینؑ علیہم السلام کے قاتلوں کے بارے میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ یہ لوگ کافر اور مشرک ہیں جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں دائمی عذابِ الٰہی میں

اور حضرت امام حسنؑ و حسینؑ اور دیگر ائمہ اہل بیتؑ ہیں، جو کہ شرف صحبت کے ساتھ ساتھ شرفِ قرابت سے بھی مشرف و ممتاز ہیں۔ اور درجہ عصمت و طہارت پر فائز ہیں۔ اور بنصِّ آیتِ مؤدت (سورۃ شوریٰ: ۲۳) ان کی مؤدت واجب و لازم ہے (اس پر ہم نے مفصّل بحث اپنی کتاب تحقیقات الفریقین فی حدیث الثقلین میں کی ہے) اسی لیے علامہ تفتازانی نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ: "والجزم بالعدالة یختص بمن اشهر بطول الصحبة علی طریق التتبع و الاخذ عن النبی صلی الله علیه و آله وسلم و الباقون کسائر الناس فیهم عدول و غیر عدول" لہٰ۔ یعنی صرف انہی صحابہ کی عدالت کا یقین کیا جاسکتا ہے جو طولِ صحبت رسولؐ میں مشہور ہیں۔ اور اس دوران میں آپ کا اتباع اور آپؐ سے کسب فضائل کرتے رہے ہیں۔ باقی صحابہ ایسے ہیں جیسے عام لوگ کہ ان میں کچھ عادل ہیں، اور کچھ غیر عادل۔ مزید برآں اس بیان حقیقت ترجمان سے "الصحابة کلهم عدول" والے نظریہ کا بطلان بھی واضح وعیاں ہوجاتا ہے۔ تفصیل کے شائقین سنی اہل قلم جناب حافظ علی بہادر صاحب دہلوی کی کتاب "صحابیت" کا مطالعہ فرمائیں۔

ان حقائق سے معلوم ہوگیا کہ صحابہ میں ہر قسم کے لوگ تھے اور اوپر واضح کیا جاچکا ہے کہ عالم و جاہل، ظالم و مظلوم، عادل و فاسق، صالح، طالح برابر نہیں ہوسکتے۔ "هل یستوی الذین یعلمون و الذین لا یعلمون (سورۃ زمر: ۹) افنجعل المسلمین کالمجرمین (سورۃ قلم: ۳۵) مالکم کیف تحکمون؟ اس لیے مذہب شیعہ سب کو برابر نہیں سمجھ سکتا۔ اصحابِ رسولؐ میں جو لوگ آنحضرت ﷺ کی اتباع میں پورے اترے اور آپ کے انتقال کے بعد رشد و ہدایت کا مرکز اہل بیتؑ نبوی کو قرار دیا، اور ان کی محبّت و مؤدت اختیار کر کے اجر رسالت ادا کیا، ہم ایسے اصحاب کی خاک پا کو اپنے لیے طوطیائے چشم بنانے کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔ مگر جنھوں نے آپؐ کی کامل اتباع نہ کی، اور آپ کی وفاتِ حسرتِ آیات کے بعد مرکز رشد و ہدایت سے علیحدہ ہوگئے، ودائع نبوت کو ضائع کردیا، آلِ محمدؐ کے حقوق پر ڈاکا ڈالا، ان پر ظلم و ستم کیے، ہم ان سے بیزاری کو واجب و لازم سمجھتے ہیں۔ ؎

ان کان ذنبی حب آل محمدؐ

فذلك ذنب لست منه اتوب

من النار و من اعتقد بهم غير ما ذكرناه فليس عندنا من دين الله في شئ ۔

گرفتار رہیں گے جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے جو شخص اس کے علاوہ کچھ اور عقیدہ رکھے وہ ہمارے نزدیک دین خدا سے کچھ بھی حصّہ نہیں رکھتا۔

مُنکرین امامتِ ائمہ اطہارؑ کا انجام

اس سلسلہ میں حضرت مُصنّف علامؒ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے کہ ائمہ اہل بیتؑ کی امامت کا مُنکر گویا تمام انبیاء کی نبوت کا مُنکر ہے۔ یہ امر دلائل عقلیہ و نقلیہ کی روشنی میں واضح ہے۔ بعض سابقہ ابواب میں اس امر پر تبصرہ کیا جا چکا ہے کہ خداوند عالم نے انبیاء کو اس وقت تک مرتبہ نبوت و رسالت پر فائز نہیں فرمایا جب تک ان سے اپنی توحید، سرکار ختمی مرتبتؐ کی رسالت اور ائمہ اہل بیتؑ کی خلافت کا اقرار نہیں لے لیا۔

اب اربابِ عقل و انصاف خود ہی بتائیں کہ اگر کوئی شخص بظاہر انبیاء کی نبوت کا اقرار تو کرتا ہے۔ مگر ان ائمہ اطہارؑ کی امامت کا انکار کرتا ہے جن کے طفیل انبیاءؑ کو خلعتِ نبوت عطا ہوئی تھی۔ تو اس کے اس اِقرار کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے؟ اسی لیے جناب رسالت مآبﷺ فرماتے ہیں: ”جو میرے اوصیاء کی امامت کا انکار کرے گا وہ اس شخص کی مانند ہے جو تمام انبیاء کی نبوت کا مُنکر ہے“۔ جیسا کہ اس قسم کی مُتعدّد روایات رسالہ میں درج ہیں۔ اور تفصیل سابع بحار الانوار میں موجود ہے۔ چونکہ یہ بزرگوار ایک ہی سلسلہ کی مُختلف کڑیاں ہیں، اس لیے بعض کا اقرار اور بعض کا انکار مُتصوّر ہی نہیں ہو سکتا۔ اسی بناء پر معصومین علیہم السلام نے فرمایا ہے: ”من انکر واحدا منا فقد انکر کلنا“۔ جو ہم میں سے کسی ایک کا انکار کرے وہ ایسا ہے جیسے اس نے ہم سب کا انکار کیا ہو۔ (سابع بحار الانوار و بصائر الدرجات وغیرہ)

مخفی نہ رہے کہ ان احادیث میں مُنکر امامت ائمہؑ کو جو مُنکر انبیاءؑ کی مثل قرار دیا گیا ہے اس سے بظاہر آخرت میں سزا کے سلسلہ میں مشابہت مراد ہے، نہ کہ دنیا میں ظاہری حکم نجاست وغیرہ۔ کیونکہ عندالمشہور خُصُوصًا متاخرین کے نزدیک مُنکرین امامت ائمہ علیہم السلام پر اِسلام کے احکام جاری ہوتے ہیں۔ فلا تغفل۔ نیز اس بیان حقیقت ترجمان سے یہ حقیقت بھی واضح و عیاں ہو جاتی ہے کہ چہار امامی ہوں یا شش امامی وغیرہ۔ ہمارے نزدیک یہ اور تمام ائمہؑ کی امامت کے مُنکر ایک جیسے ہیں۔

اہل بیتِؑ رسولؐ کے ساتھ امتؑ کا سلوکؑ

مگر افسوس بجائے اس کے کہ امت رسولؐ ائمہ اہل بیتؑ کی خلافت و امامت کو تسلیم کر کے اپنے لیے رشد و ہدایت کی شمعیں روشن کرتی، اور نجات دارین کے اسباب مہیا کرتی، الٹا اس نے اہل بیتِ رسولؐ پر مصائب و آلام کے پہاڑ ڈھانے شروع کر دیے، اور ان کی شمعہائے حیات کو گل کرنا شروع کر دیا اور ان پر اس قدر ظلم و ستم کیے کہ جناب سیدہ عالم سلام اللہ علیہا کو کہنا پڑا: ؎

صُبّت علیّ مصائب لو انها   صُبّت علی الایّام صِرن لیالیًا

اور سردار اہل بیتؑ نے مصائب و شدائد کا ان الفاظ میں اِظہار کیا: "اری تراثی نهبا و فی العین قذی و فی الحلق شبحی"۔ (نہج البلاغہ) میں دیکھ رہا تھا کہ میری میراث (خلافت) لوٹی جا رہی تھی (شدت رنج و تکلیف کی وجہ سے میری یہ کیفیت تھی کہ جیسے) آنکھ میں کانٹا اور حلق میں ہڈی اٹکی ہوئی ہو۔ جناب امام زین العابدین علیہ السلام نے تو مظالم امت سے متاثر ہو کر یہاں تک فرمایا: ؎

اقادذ لیلا فی دمشق کاننی   من الزنج عبد غاب عنه نصیر

مجھے شام میں اس طرح ذلت کے ساتھ پھرایا جا رہا ہے جیسے کسی حبشی غلام کو پھرایا جاتا ہے۔ جس کے یار و انصار غائب ہوں۔ اور جناب رسولِ خدا ﷺ کو خود با علام الٰہی ان تمام مصائب و نوائب کا علم تھا، جو ان کی عترت اطہارؑ پر وارد ہونے والے تھے۔ انھوں نے ان حالات کی ان کو اطلاع بھی دے دی تھی اور ان کو صبر و شکیبائی اختیار کرنے کی وصیّت فرمائی تھی۔ چنانچہ کنز العمال جلد ۷ صفحہ ۱۸۷، خصائص کبریٰ سیوطی جلد ۲ صفحہ ۱۱۹، صواعق محرقہ صفحہ ۱۴۳ پر مرقوم ہے۔ یہ الفاظ خصائص کے ہیں: "اخرج الحاکم و ابونعیم عن ابن مسعود و اخرج الحاکم عن ابی سعید الخدری قال رسول الله انا اهل بیت اختار الله لنا الأخرة علی الدنیا و اهل بیتی سیلقون بعدی بلاد و نظریدا و تشریدا"۔ فرمایا: ہم وہ خانوادہ ہیں کہ خدا نے ہمارے لیے دنیا کی بجائے آخرت کو اختیار فرمایا ہے۔ میرے اہل بیتؑ میرے بعد آزمائش، مصیبت اور جلاوطنی وغیرہ مصائب سے دوچار ہوں گے اور جناب امیرالمومنینؑ کو خُصوصی وصیّت فرمائی تھی کہ ان جانگسل حوادث و سوانح میں صبر و شکیبائی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور تلوار نہ اٹھائیں۔ چنانچہ "معارج النّبوۃ" رکن رابع صفحہ ۴۴۰ و "روضۃ الاحباب" جلد ۱ صفحہ ۳۹۴ پر مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت امیرؑ کو فرمایا: اے علی! اول کسے کہ برلب کوثر بمن رسد تو باشی۔ بعد از من بسیاری از مکروهات بتو خواهد رسید باید که دل تنگ نه گردی

دوست در عروہ وثقی تحمل زدہ طریق صبر پیش گیری وچوں بینی کی دنیا مرضی و مختار خلق گردد باید کہ تو آخرت را اختیار کنی ۔ یا علیؑ! تم سب سے پہلے حوضِ کوثر پر میرے پاس پہنچو گے، میرے بعد تمھیں بڑے مصائب و آلام درپیش آئیں گے ۔ ان سے دل تنگ نہ ہونا اور نہ صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا۔ اور جب دیکھو کہ لوگوں نے دنیا کو اختیار کرلیا ہے تم آخرت کو اختیار کرنا۔

متغلبین کے ساتھ حضرتؑ کے جنگ نہ کرنے کی وجہ

وفاتِ رسولؐ کے بعد ابتدائی دور میں اگرچہ اس خاندان پر رنج و الم کے کوہ ہائے گراں ڈھائے گئے ۔ مگر سردار اہل بیتؑ نے کبھی بھی دامن صبر کو ہاتھ سے نہ دیا۔ اور تلوار نہ اٹھائی۔ اس کا ایک بڑا سبب تو آنحضرتﷺ کی یہی وصیت تھی جس کی تعمیل آنجنابؑ پر لازم تھی ۔ اور دوسرا سبب وہ تھا جس کا ذکر آپ کے کلام (نہج البلاغہ) میں بار بار آتا ہے کہ اس وقت دین کی بقا آپؑ کے جنگ نہ کرنے میں مضمر تھی ۔ اگر آپ اس وقت تلوار اٹھاتے تو مرکز اسلام خانہ جنگی کا شکار ہوجاتا اور دشمنانِ اسلام کو اس کی بیخ کنی کرنے کا بہترین موقع ہاتھ آجاتا۔ ظاہر ہے کہ حضرت امیرؑ جیسے محبّ و محافظ اسلام کے لیے ایسا موقع فراہم کرنا ممکن نہ تھا۔ لہٰذا اس محافظ اسلام نے بقائے دین کی خاطر سب مصائب و آلام جھیل لیے، مگر جنگ نہ کی۔ تفصیل کے لیے ہماری کتاب "اثبات الامامت" کی طرف رجوع کیا جائے۔

حضرت علیؑ سے جنگ کرنا رسولِ اسلامؐ سے جنگ کے مترادف ہے

چونکہ جناب امیر علیہ السلام بنصِّ قرآن نفس رسول ہیں (وانفسنا و انفسکم ۔ آلِ عمران:۶۱) اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک بزرگوار کے ساتھ جو سلوک کیا جائے گا وہی سلوک دوسرے کے ساتھ متصوّر ہوگا۔ اس کی تائید مزید ان احادیث نبویہؐ سے ہوتی ہے جو کتب فریقین میں موجود ہیں ۔ جن میں سے بعض متن رسالہ میں بھی مذکور ہیں ۔ یہاں بالاختصار مزید دو چار روایات کتب اہل سنت سے پیش کی جاتی ہیں ۔

① صواعق محرقہ صفحہ ۱۲۱ طبع جدید، نیز "تاریخ الخلفاء" صفحہ ۱۷۳ طبع جدید میں آنحضرتﷺ کی یہ احادیث مرقوم ہیں: "من سبّ علیًا فقد سبّنی، و من ابغض علیًا فقد ابغضنی، علیٌ مع القرآن و القرآن مع علیّ" جس نے علیؑ کو گالی دی اس نے مجھے گالی دی، اور جس نے علیؑ کو ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا۔ علیؑ قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن علیؑ کے ساتھ ہے۔

④ اسی طرح صواعق محرقہ کے صفحہ ۷۰ و ۷۱ پر آنحضرتؐ سے منقول ہے، فرمایا: "من أذی علیًا فقد أذانی و من أذانی فقد أذاالله" ۔ جس نے علیؑ کو اذیت دی، اس نے مجھے اذیت دی اور جس نے مجھ کو اذیت دی اس نے خدا کو اذیت دی۔

⑤ مشکوٰۃ صفحہ ۵۶۲، صواعق محرقہ صفحہ ۱۸۵ وغیرہ کتب میں آنحضرتؐ کا یہ ارشاد موجود ہے: "قال لعلی و فاطمة و الحسن و الحسین انا حرب لم حاربھم و سلم لمن سالمھم" ۔ جنابؐ نے پنج تن پاک کے حق میں فرمایا: جو ان سے جنگ کرے گا، اس کی مجھ سے جنگ ہوگی، اور جو ان سے صلح کرے گا، اس کی صلح مجھ سے ہوگی۔

مگر افسوس امت نے ان ارشادات نبویؐ کی اس طرح تعمیل کی قریبًا اسی نوے برس تک منبروں پر حضرت علیؑ پر سب و شتم کیا۔ چنانچہ کتب سیر و تواریخ اس واقعہ ہائلہ کے ذکر سے لبریز ہیں۔ "تاریخ الخلفاء سیوطی" صفحہ ۲۴۳ طبع جدید مصر پر لکھا ہے: "کان بنو امیة یسبون علی بن ابی طالب فی الخطبة" ۔ بنی امیہ خطبوں میں حضرت علیؑ پر سب و شتم کرتے تھے۔ حتی کہ مولانا شبلی نعمانی ایسے مُتعصب مؤرخ نے بھی اس حقیقت کا اِعتراف کیا ہے۔ چنانچہ وہ "سیرت النبیؐ" جلد ا صفحہ ٦٦ پر لکھتے ہیں: "حدیثوں کی تدوین بنوامیہ کے زمانہ میں ہوئی جنھوں نے پورے نوے برس سندھ سے ایشیائے کوچک اور اندلس تک مساجد جامع میں آلِ فاطمہؑ کی توہین کی اور جمعہ میں سر منبر حضرت علیؑ پر لعن کہلوایا۔ سینکڑوں ہزاروں حدیثیں امیر معاویہ وغیرہ کے فضائل میں بنوائیں۔ حالانکہ پیغمبر اسلامؐ کی یہاں تک تہدید و وعید موجود تھی: "من سبّ اھل بیتی فقد خرج من الاسلام و من اذانی فی عترتی فعلیه لعنة الله" (صواعق محرقہ صفحہ ۱۴۳ طبع قدیم) جو شخص میرے اہل بیتؑ پر سب و شتم کرے گا وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ اور جو شخص مجھے میرے اہل بیتؑ کے بارے میں اذیت دے گا اس پر خدا کی لعنت ہوگی۔

قاتلین انبیاءؑ و ائمہؑ کا کفر

اسی پر اکتفا نہیں کی گئی بلکہ ان کے ساتھ جنگ و جدال کیا گیا اور شمشیر جفا یا زہر دغا سے ان کی شمعہائے حیات کو گل کیا گیا۔ قرآن مجید میں عام مومن کے قتل کی سزا دائمی عذاب جہنم، قہر و غضب خداوندی اور لعنت ایزدی میں گرفتاری قرار دی گئی ہے۔ ارشادِ قدرت ہے: "وَمَنۡ يَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيۡهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيۡمًا" (سورۃ النساء: ۹۳)

اربابِ بصیرت جانتے ہیں کہ گناہ و جرم کی نوعیّت زمان و مکان اور افراد و اشخاص کے اعتبار سے بدلتی رہتی ہے۔ جس کی تفصیلات میں جانے کی یہاں گنجائش نہیں۔ بنابریں انبیاءؑ وائمہؑ کے قتل کی نوعیّت عام اہل ایمان کے قتل سے یقیناً جداگانہ ہوگی۔ اسی لیے شریعت مقدسہ میں قتل نبی وامام کو کفر قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا قاتل نبی وامام اگر اس جرم شنیع کے ارتکاب سے پہلے نام نہاد مُسلمان بھی ہو تو بعد ازاں مرتد فطری بن جائے گا اور اگر توبہ کرے تو بوجہ ارتداد و عدم توفیق اس کی توبہ کے قبول ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ واللہ الموفق

افضلیتِ جنابِ سیّدہؑ بر زنانِ عالمیانؑ

کتب فریقین میں متعدد ایسی روایات مُعتبرہ موجود ہیں جن سے جناب مخدومۂ کونین حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی تمام عالمین کی عورتوں پر افضلیت ثابت ہوتی ہے۔ بعض احادیث میں وارد ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: "فاطمۃ سیدۃ نساء اھل الجنۃ" میری بیٹی فاطمہؑ تمام جنّت والی عورتوں کی سردار ہیں۔ (مشکوٰۃ شریف صفحہ ۲۶۰ و ۲۶۳، صواعق محرقہ صفحہ ۱۸۵ طبع جدید)

بعض روایات کے الفاظ یہ ہیں: "فاطمۃ سیدۃ نساء العالمین" میری بیٹی فاطمہؑ تمام عالمین کی عورتوں کی سردار ہیں۔ (ارجح المطالب بحوالہ مُستدرک حاکم)

کتاب "الشرف المؤبد لآلِ محمدؐ" مطبوعہ مصر میں یہ تتمہ بھی مروی ہے کہ جب آنحضرتؐ نے یہ فرمایا کہ میری بیٹی تمام زنانِ عالمین کی سردار ہے تو بعض صحابہ نے عرض کیا: "فاین مریم بنت عمران یارسول اللہ؟" ۔ یارسول اللہ! اگر آپ کی دختر نیک اختر تمام زنانِ عالم کی سردار ہیں تو پھر جناب مریم بنت عمران کیا ہوئیں؟ (جن کے متعلق ارشادِ قدرت ہے: ان اللہ اصطفاك و طھرك و اصطفاك علی نساء العالمین ۔ سورۃ آلِ عمران:۴۲) فرمایا: "ھی سیدۃ نساء عالمھا و ابنتی سیدۃ نساء العالمین من الاولین و الآخرین" ۔ جناب مریم فقط اپنے زمانہ کی عورتوں کی سردار تھیں۔ مگر میری بیٹی تمام اولین و آخرین کی عورتوں کی سردار ہیں۔

اسی طرح مُتعدد روایات کتب فریقین میں مروی ہیں، جن سے یہ بات اظہر من الشمس ہوتی ہے کہ مخدومۂ کونینؑ نساء العالمین سے افضل و برتر ہیں۔ جیسے آنحضرتؐ کا یہ ارشاد: "ابنتی فاطمۃ سیدۃ نساء اھل الجنۃ" (مشکوٰۃ وغیرہ) میری بیٹی فاطمہؑ تمام زنانِ جنّت کی سردار ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان جنّت میں جانے والی مخدرات میں جناب حوا و مریم و آسیہ وغیرہا من خیرۃ

النساء بھی داخل ہیں۔ اور ان سب کی سردار جناب سیدہ ہیں۔ بعد ازیں بھی بعض معاندین کا بعض ازواجِ رسول کو جناب سیدہ کے بالمقابل پیش کرنا یا ان کو حضرت سیدہ عالم سے افضل قرار دینا خدا اور رسول کی تکذیب اور اپنی ناصبیت و خارجیت کا مظاہرہ نہیں تو اور کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ زنانِ عالم تو بجائے خود سرکارِ دوعالم کے ارشاد: "لولم یکن علی لما کان لا بنتی فاطمة کفوا ادم و من دونه" (بحارالانوار، ارجح المطالب بحوالہ کتب متعددہ) سے تو یہ مترشح ہوتا ہے کہ انبیاء ماسلف بھی مقام فضیلت میں جناب سیدہؑ کے بالمقابل نہیں کھڑے ہو سکتے۔ باقی رہیں یہ احادیث کہ جناب سیدہ کی خوشنودی خدا و رسولؐ کی خوشنودی ہے، اور ان کی ناراضی خدا اور رسولؐ کی ناراضی ہے۔ یہ تمام احادیث برادرانِ اسلامی کی کتب صحاح ستہ کے ابواب مناقب اہل بیت النبیؐ میں مذکور ہیں۔ لہٰذا ان احادیث کی صحت میں کوئی مُسلمان شک نہیں کر سکتا۔ یہ احادیث جہاں عمومی طور پر جناب سیدہؑ عالم کی عظمتِ شان و جلالتِ مکان پر دلالت کرتی ہیں، وہاں ان سے خصُوصی طور پر ان کی عصمت و طہارت پر بھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔ علاوہ آیت تطہیر (سورۃ الاحزاب: ۳۳) اور دیگر ادلہ طہارت کے یہ احادیث بجائے خود اس معصومہ کی عصمت و طہارت کی ایک مستقل دلیل ہیں۔ کیونکہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جس ذات کی ہر حال میں خوشنودی خدا اور رسولؐ کی خوشنودی اور ناراضی ہر حال میں خدا اور رسولؐ کی ناراضی ہو، یہ شرف سوائے معصوم ذات کے کسی اور کے لیے ممکن نہیں ہے۔ یہ معصوم ہی کی شان ہے کہ جس کا ہر حال میں ہر قول و فعل منشائے خدا و رسول کے عین مطابق ہو۔

مسئلہ فدک پر مختصر تبصرہ

مگر افسوس امت رسول نے اس معصومہؑ بی بی کی قدر نہ کی۔ آیت مبارکہ "وات ذی القُربیٰ" (سورۃ بنی اسرائیل: ۲۶) کے نزول کے بعد جناب رسولِ خداؐ نے فدک جناب سیدہؑ کو مرحمت فرما دیا تھا۔ جیسا کہ درمنثور جلد ۴ صفحہ ۱۷۷، شرح مواقف صفحہ ۷۳۵، صواعق محرقہ صفحہ ۲۱، کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۱۵۸، مُستدرک الحاکم صفحہ ۱۸۷ میں مذکور ہے۔ مگر بخاری و مُسلم وغیرہ کی روایات شاہد ہیں کہ جب جناب سیدہؑ عالم نے مُسلمانوں کے پہلے خلیفہ کے دربار میں اپنا قضیّہ ہبہ فدک پیش کیا تو دربارِ خلافت سے نفی میں جواب ملا۔

فخرالدین رازی نے تفسیر کبیر جلد ۸ صفحہ ۳۸۶ بذیل آیت "فے" پر لکھا ہے کہ: خلیفہ نے کہا: "لا اعرف صحة قولك "بی بی تیرے دعویٰ کی صداقت معلوم نہیں۔ (کتاب "اکتفا" مؤلفہ ابراہیم بن

عبداللہ یمنی میں علیٰ مانقل عنہ) کی روایت کے مطابق بی بیٔ عالم نے اپنے دعویٰ کی صداقت پر جناب علیؑ مرتضیٰ، حسنین شریفینؑ، اور جناب اُم ایمن کو بطورِ گواہ پیش کیا۔ مگر عدالت نے حسنینؑ کو نابالغ، اُم ایمن کو عورت اور علیؑ مرتضیٰ کو سیدہؑ کا شوہر ہونے کی وجہ سے ان کی شہادتوں کو مسترد کر دیا۔ (کذا فی الصواعق صفحہ ۱۲، ۳۱، والمحلی بتفاوت یسیر) بلکہ جناب سیدہؑ نے وہ وثیقہ بھی پیش کیا، جو آنحضرت ﷺ نے ان کو ہبہ فدک کے وقت لکھ کر دیا تھا۔ مگر اسے بھی قبول نہ کیا گیا۔ (ملاحظہ ہو معارج النبوۃ رکن ۴ صفحہ ۳۱۱ طبع نولکشور، حبیب السیر جلد ا صفحہ ۵۸، روضۃ الصفا جلد ۲ صفحہ ۱۶۰ وغیرہ) جس پر جناب سیدہؑ عالم نے اتمامِ حجّت کے لیے اپنے دعویٰ کا عنوان بدل دیا۔ فرمایا: اگر بطور ہبہ فدک مجھے نہیں دیتے تو بطور میراث ہی دے دو۔ کیونکہ میں بنت رسولؐ ہونے کی وجہ سے ان کی واحد وارث ہوں۔ مگر دربارِ خلافت والے جنھوں نے "کل حسبنا کتاب اللہ" کا نعرہ بلند کیا تھا، آج ایک جعلی حدیث "نحن معاشر الانبیاء لا نرث ولا نورث ما ترکنا فھو صدقۃ" کا سہارا لے رہے تھے۔ اور جناب سیدہ "یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین" (سورۃ النساء: ۱۱) وغیرہ آیاتِ قرآنیہ تلاوت کر رہی تھیں۔ اہل دربار کا یہ رویہ اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ ان کا پہلا نظریہ غلط تھا، بلکہ اس سے صاف صاف عیاں ہو رہا تھا کہ ان کا کوئی اصول ہے ہی نہیں۔ جب احادیث کو اپنے خلاف پایا تو "حسبنا کتاب اللہ" کا نعرہ بلند کر لیا، اور جب دیکھا قرآن سے مطلب برآری نہیں ہوتی تو احادیث (اگرچہ وضعی ہی کیوں نہ ہوں) کا سہارا لے لیا۔ بہر حال بخاری شریف جلد ۲ صفحہ ۹۱ طبع دہلی کے الفاظ ہیں: "ابیٰ ابوبکر ان یدفع الی فاطمۃ شیئا"۔ ابوبکر نے کچھ بھی دینے سے صریح انکار کر دیا۔ اس سے جناب سیدہؑ کو اس قدر اذیت وکوفت ہوئی کہ "فوجدت ای غضبت علی ابی بکر وھجرتہ ولم تتکلمہ حتی توفیت"۔ جناب سیدہؑ ابوبکر سے ناراض ہوگئیں اور اس سے سلسلہ کلام وغیرہ ترک کر دیا اور تازیست اس پر قائم رہیں۔ اس روح فرسا حادثہ سے جناب سیدہؑ کو کس قدر رنج والم پہنچا، اس کا کچھ اندازہ آپ کے اس دردناک شعر سے ہوتا ہے جو آپ نے اپنے بابا کے بزرگوار کو مخاطب کر کے کہا: ؎

صُبَّتْ عَلَیَّ مَصَائِبُ لَوْ اَنَّھَا   صُبَّتْ عَلَی الْاَیَّامِ صِرْنَ لَیَالِیَا

بابا! مجھ پر اس قدر مصائب و آلام ڈھائے گئے کہ اگر یہ مصائب دنوں پر پڑتے تو وہ راتوں میں تبدیل ہو جاتے...... حتی کہ بی بی عالمؑ اسی صدمہ میں رو رو کر اور گھل گھل کر آنحضرتؐ کی وفاتِ حسرت آیات کے بعد پچھتر اور بروایتے پچانوے روز زندہ رہ کر انتقال فرما گئیں۔

بخاری اور مسلم جلد ۲ صفحہ ۹۱ میں لکھا ہے کہ: "فلما توفیت دفنھا زوجھا علیٌ لیلا ولم یؤذن بھا

ابابکر "۔ جب ان کی وفات ہوئی تو ان کے شوہر علیؑ نے ان کو رات کے وقت دفن کیا اور ابوبکر کو اطلاع نہ دی۔

روضۃ الاحباب صفحہ ۴۴۳ پر لکھا ہے: "روزِ دیگر ابو بکر صدیق و عمر فاروق باعلی کرم اللہ وجہہ معاتبہ می کردند کہ چوں مار خبر نہ کردی۔ تا شرف نماز بروے در یافتی۔ علیؑ عذر گفت بنا بر وصیت او چنیں کردم"۔ یعنی "دوسرے روز ابوبکر وعمر صاحبان نے حضرت علیؑ سے شکایت کی کہ آپ نے ہمیں جناب سیدہ کی وفات کی اطلاع کیوں نہ دی۔ تاکہ ہم نماز جنازہ کا شرف حاصل کرتے۔ حضرتؑ نے عذر خواہی کرتے ہوئے کہا کہ: میں نے ان کی وصیت کے مطابق ایسا کیا ہے"۔

اربابِ انصاف بتائیں کہ جن لوگوں سے دختر رسولؐ اس قدر ناراض و نالاں ہوکر دنیا سے تشریف لے جائیں کہ ان کو اپنی نمازِ جنازہ میں شریک نہ کرنے کی وصیت فرمائیں تو ان کا انجام کیا ہوگا؟ بالخصوص جب کہ اس کے ساتھ آنحضرتؐ کی وہ فرمائشات بھی ملحوظ رکھی جائیں جو آپؐ نے جناب سیدہ کے حق میں فرمائی تھیں، جو کہ بخاری وغیرہ میں موجود ہیں کہ "فاطمة بضعة منی من اغضبها فقد اغضبنی و من اذاها فقد اذانی" پھر خدا اور رسولؐ کو اذیت دینے والوں کے متعلق یہ تہدید الٰہی بھی پیش نظر رہے کہ: "ان الذین یوذون اللہ و رسولہ لعنہم اللہ فی الدنیا و الآخرۃ واعدلھم عذابا مھینا" (الاحزاب: ۵۷)

واقعہ فدک وغیرہ پر مولوی نذیر احمد دہلوی کا تبصرہ

یہاں مولانا نذیر احمد صاحب دہلوی حنفی مترجم قرآن کا وہ تبصرہ نقل کرنا فائدہ اور عبرت سے خالی نہیں ہے جو انھوں نے اپنی کتاب "رویائے صادقہ" صفحہ ۱۸۳ طبع چہارم میں وفاتِ رسولِ خداؐ کے بعد اہل بیتؑ نبوی کے ساتھ امت رسولؐ کے ناروا سلوک پر کیا ہے۔ لکھتے ہیں: "جو شخص سب سے زیادہ پیغمبر صاحب کی وفات سے متاذی ہوا وہ جناب فاطمہؑ تھیں، والدہ پہلے انتقال فرما چکی تھیں، اب ماں اور باپ دونوں کی جگہ پیغمبر صاحب صلعم تھے اور باپ بھی کیسے باپ، دین ودنیا کے بادشاہ، ایسے باپ کا سر سے اٹھ جانا، اس پر حضرت علیؑ کا خلافت سے محروم ہونا نمک بر جراحت۔ ترکہ پدری باغِ فدک کا دعویٰ کرنا اور مقدمہ ہار جانا۔ کسی دوسرے کو ایسے پیہم صدمات پہنچتے تو وہ زہر کھا کر مرجاتا۔ مگر ان کے صبر وضبط ان کے ہی ساتھ تھے۔ پھر بھی انہی رنجوں میں گھل گھل کر چھ ہی مہینہ کے اندر اندر انتقال فرما گئیں۔ اور جتنے دن زندہ رہیں ان لوگوں سے جنھوں نے رنج دیے تھے، نہ بولیں

اور نہ بات کی یہاں تک کہ ان لوگوں کو اپنے جنازہ پر آنے کی مناہی کر دی اور شب کے وقت مدفون ہوئیں ۔انا للہ و انا الیہ راجعون ۔ مانا کہ ان کا غصہ کسی قدر بے جا بھی تھا (معاذ اللہ) تاہم ان کے باپ کے حقوق کیا چاہتے تھے ۔ جناب فاطمہؑ کے دل غمزدہ کو خوش کرنے کے لیے جناب علیؑ کو اگر وہ اہل بھی نہ تھے، برائے نام خلافت دے دی ہوتی اور آپ انتظام کیا ہوتا، خیر خلافت تو کون دیتا ۔ مگر باغِ فدک کے دینے میں آخر کونسی قباحت تھی ۔ غایتہ ما فی الباب حدیث شریف نحن معاشر الانبیاء لا نرث و لا نورث ما ترکناہ صدقۃ کے خلاف ہوتا ۔ اگر گناہ ہوتا تو جناب فاطمہؑ کو ہوتا کہ وہ سیدانی ہو کر صدقہ کھاتیں ۔ سخت افسوس کی بات ہے کہ اہل بیتؑ نبوی کو پیغمبر صاحبؐ کی وفات کے بعد ہی سے ایسے ناملائم اتفاقات پیش آئے کہ ان کا وہ ادب اور لحاظ جو ہونا چاہیے تھا اس میں ضعف آ گیا اور وہ شدہ شدہ منجر ہوا، اس نا قابلِ برداشت واقعہ کربلا کی طرف جس کی نظیر تاریخ میں ملنی مُشکل ہے، وہ ایسی نالائق حرکت مُسلمانوں سے ہوئی ہے کہ اگر سچ پوچھو تو دنیا میں مُنھ دکھانے کے قابل نہیں ہیں"۔ اِنتہیٰ کلامہ

☆

باب الاعتقاد

فی اٰباء النبیؐ

قال الشیخ رحمه الله تعالیٰ اعتقادنا فیهم انهم مسلمون من آدم الی ابیه

اُنتالیسواں بابؒ

حضرت رسولِ خدؐا کے آباء و اجداد کے متعلّق اِعتقاد

جناب شیخ ابوجعفر فرماتے ہیں کہ ان بزرگواروں کے متعلّق ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ حضرت آدمؑ سے لے کر آنحضرتؐ کے والد جناب عبداللہ تک سب کے سب مُسلمان اور موحد تھے

اُنتالیسواں بابؒ

اسلام آباء النبیؐ والوصی کا بیان

مسئلہ اِسلامِ آباء النبیؐ میں اِختلاف

اس مسئلہ میں مُسلمانوں کے اندر اختلافِ عظیم پایا جاتا ہے۔ اکثر اہل سنت والجماعت انبیاءؑ کے آباء واجداد کے کفر کے قائل ہیں۔ اور وہ اس سلسلہ میں مختلف اقاویل فاسدہ و تاویلاتِ کاسدہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ بالخصوص جناب رسالت مآبﷺ کے والدین شریفین اور جناب وصایت مآب کے والد ماجد کے کفر صریح کے قائل ہیں۔ جیسا کہ فقہ اکبر مع شرح پر مذکور ہے: "و مات والدا رسول الله علی الکفر و مات ابوطالب علی الکفر" یعنی جناب رسولِ خدؐا کے والدین اور جناب ابوطالبؑ کی بحالت کفر وفات ہوئی۔ (معاذ اللہ) اسی طرح دیگر کتب میں ان کے ہاں اس امر کی تصریحات موجود ہیں۔ مگر حضرات شیعہ خیرالبریہ کا اس امر پر اتفاق ہے کہ جناب رسولِ خدؐا کے والدین و جناب علی مرتضیٰؑ کے والد ماجد بلکہ آدمؑ تک ان کے تمام آباء واجداد نہ صرف مُسلم و موحد بلکہ بعض انبیاءؑ اور بعض اوصیاء تھے۔ اسی طرح اُمہات کا سلسلہ بھی مُسلمات بلکہ مومنات موقنات پر مشتمل ہے اور تمام انبیاءؑ کے والدین مُسلم و موحد ہوتے ہیں۔ بعض مُنصف مزاج علمائے اہل سنت بھی اس عقیدۂ صحیحہ میں شیعوں کے ہمنوا ہیں۔ بہرحال یہ عقیدہ مذہب شیعہ کے مُسلمات بلکہ ضروریات میں سے ہے۔ اِسلام آباء النبیؐ اور اسلام ابوطالبؑ کے موضوع پر علماء شیعہ اور بعض علمائے اہل سنت نے مُتعدّد کتب و رسائل لکھے ہیں۔ جن میں عقلی و سمعی ادلۂ قاطعہ و براہین ساطعہ سے اس مطلب کو ثابت کیا ہے۔ ہم نہایت اِختصار کے ساتھ یہاں چند دلائل عقلیہ و نقلیہ پیش کرتے ہیں۔

عبداللّٰہ و ان ابا طالبؑ کان مسلمًا و امه أمنة بنت وھب کانت مسلمۃ و قال النبیؐ اخرجت

اسی طرح حضرت ابوطالبؑ مُسلمان تھے اور جناب رسولِ خداؐ کی والدہ گرامی حضرت آمنہؑ بنت وہب بھی مُسلمان تھیں۔ جناب رسولِ خدا ﷺ فرماتے ہیں

اسلام آباءِ النبیؐ پر ادلۂ نقلیہ

پہلی دلیل :

خداوندعالم ارشادفرماتا ہے: "وتقلبك فی الساجدین" (سورۃ شعراء:۲۱۹) اے رسولؐ! ہم ہمیشہ تجھے سجدہ کنندگان میں الٹتا پلٹتا دیکھتے رہے۔

علامہ فخرالدین رازی نے اپنی تفسیر کبیر جلد ۶ میں بذیل آیت مذکورہ اور تفسیر نیشاپوری میں آنحضرتؐ کا یہ ارشاد مذکور ہے: "و لم یزل ینقلنی اللّٰہ من اصلاب الطاھرین الی ارحام المطھرات حتی اخرجنی فی عالمکم ھذا"۔ خداوند عالم ہمیشہ مجھے پاک صلبوں سے پاک رحموں کی طرف مُنتقل کرتا رہا۔ یہاں تک کہ مجھے تمھارے اس عالم آب وگل میں پیدا کیا۔

اسی طرح علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی تفسیر درمنثور جلد ۵ صفحہ ۹۸ پر اسی آیت کی تفسیر میں مُتعدّد ایسے اخبار و آثار لکھے ہیں جن سے بالصراحت آباء النبیؐ کا اسلام و ایمان ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ مجاہد سے اس آیت کے معنیٰ نقل کیے ہیں: "قال من نبی الی نبی حتی اخرجت نبیا" "میں یکے بعد دیگرے انبیاء کی صلبوں میں مُنتقل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ نبی بن کر دنیا میں آیا"۔

اسی طرح ابن عباسؓ سے بھی یہی معنیٰ نقل کیے ہیں: "قال ما زال النبی صلی اللّٰہ علیه و سلم ینقلب فی اصلاب الانبیاء حتی ولدته امه"۔

اور اس سلسلہ میں خود آنحضرت ﷺ کی ایک طویل حدیث نقل فرمائی ہے جس میں آپؐ فرماتے ہیں: "لم یزل اللّٰہ ینقلنی من الاصلاب الطیبة الی الارحام الطاھرۃ"۔ ہمیشہ خلاقِ عالم مجھے پاک صلبوں سے پاکیزہ رحموں کی طرف مُنتقل کرتا رہا۔

اس سے بڑھ کر آباء النبیؐ کے اسلام و ایمان کی اور کیا صراحت ہوسکتی ہے۔ اگر معاذ اللّٰہ اس سلسلہ میں کوئی ایک فرد بھی کافر ہوتا تو آپ اسے طیب وطاہر کے مقدس الفاظ کے ساتھ یاد نہ کرتے۔ کیونکہ کافر و مشرک بموجب آیت: "انما المشرکون نجس" (سورۃ توبہ:۲۸) نجس اور ناپاک ہیں۔

من نکاح و لم اخرج من سفاح	کہ میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اپنے والدین تک
من لدن آدمؑ و قد روی ان	ہمیشہ بذریعہ نکاح پیدا ہوا ہوں نہ کہ بذریعہ زنا

دوسری دلیل:

کتاب مؤدۃ القربیٰ وغیرہ میں یہ حدیث قدسی موجود ہے کہ ایک مرتبہ جبرئیل امینؑ جناب ختمی مرتبتؐ پر نازل ہوئے، اور کہا: "یا محمدؐ! ان اللہ یقرأك السلام و یقول انی قد حرمت النار علی صلب انزلك و علی بطن حملك و حجر کفلك قال یا جبرئیل بین لی ذالك قال اما الصلب الذی انزلك فعبد اللہ بن عبد المطلب و اما البطن الذی حملك فامنة بنت وھب و اما الحجر الذی کفلك فحجر ابی طالب بن عبدا لمطلب و فاطمة بنت اسد"۔ اے حبیب خدا محمدؐ! خداوند عالم تحفہ درود و سلام کے بعد ارشاد فرماتا ہے کہ میں نے آتش جہنم حرام کر دی ہے اس پشت پر جس میں تو رہا اور اس شکم پر جس نے تجھے اٹھایا اور اس گود پر جس نے تیری کفالت و پرورش کی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: جبریل! اس کی وضاحت کرو۔ جبرئیلؑ نے کہا: صلب سے مراد حضرت عبد اللہ بن عبد المطلبؑ۔ شکم سے مراد جناب آمنہ بنت وہب اور گود سے مراد حضرت ابو طالبؑ اور فاطمہ بنت اسدؑ ہیں۔ یہی روایت ہماری کتب مثل معانی الاخبار صفحہ ۴۶ وغیرہ میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے۔

تیسری دلیل:

قرآن مجید شاہد ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو تعمیر کعبہ کا حکم ہوا اور انھوں نے اپنے فرزند جناب اسماعیلؑ کے ساتھ مل کر اس فریضہ کو ادا کیا۔ عین اس وقت جب کہ مزدور مزدوری کا مستحق ہوتا ہے ان دونوں باپ بیٹا نے بارگاہِ احدیت میں چند درخواستیں پیش کیں:

① "رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا" (سورۃ بقرہ: ۱۲۷) بارِالٰہا! ہمارے اس عمل کو قبول فرما۔

② "وَاجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَيۡنِ لَكَ" ہمیں اپنا خالص مُسلمان یعنی مُطیع و منقاد بنا۔

③ "وَمِنۡ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسۡلِمَةً لَّكَ" ہماری ذریت میں ہمیشہ ایک امت مُسلمہ قرار دے۔

④ "رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ" یا اللہ! اور اس امت مُسلمہ میں سے ایک رسول مبعوث فرما۔

⑤ "وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا" اور ہمیں ہمارے مناسک و ارکان حج دکھا۔

خلیل الرحمٰن و ذبیح اللہ کی زبانِ حق ترجمان سے نکلی ہوئی دعائیں کس طرح مسترد ہو سکتی تھیں؟

عبد المطلبؑ کان حجۃ و ابا طالبؑ کان وصیہ۔ مروی ہے کہ آنحضرتؐ کے دادا جناب عبد المطلبؑ حجّتِ خدا تھے اور (عمِ رسول) جناب ابو طالبؑ ان کے وصی تھے۔

فوراً بابِ اجابت سے ٹکرائیں ، اور قبولیت کا شرف حاصل کیا۔ ان مطالب کی تفصیل قرآن کے مُختلف سور و آیات میں مذکور ہے۔ اور یہ امت مُسلمہ سوائے آنحضرتؐ کے آباء و اجداد اور ان کی ذریت طاہرہ کے اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ کما لا یخفی۔

یہ دلیل سابقہ دلیل کی طرح اگرچہ ہمارے دعویٰ (تمام انبیاء کے آباء و امہات کے مُسلمان و موحد ہونے) سے خاص ہے۔ کیونکہ یہ فقط حضرت ابراہیمؑ تک جناب سرورِ کائنات کے سلسلہ آباء و اجداد کے اسلام پر دلالت کرتی ہے۔ مگر ہم نے اس لیے اسے پیش کیا ہے کہ ہمارا اصل مقصد اس مبحث میں جناب رسالت مآبؐ کے والدین اور حضرت امیر المومنینؑ کے والد ماجد کے اسلام و ایمان کا اثبات کرنا ہے، اور یہ دلیلیں اس مطلب پر بطور نص صریح دلالت کرتی ہیں۔ حضرت خلیلؑ و ذبیحؑ کی یہ طویل استدعا چند امور کو متضمن ہے۔

اول: یہ کہ ذریت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کا ایسا گروہ ہونا چاہیے جس کا اسلام مجبول بجبلِ ایزدی ہو۔ جس سے ختمی مرتبت مبعوث ہوں۔

دوم: یہ کہ یہ مُسلم گروہ زمانِ حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ سے لے کر زمانِ بعثت رسول اکرمؐ تک برابر ہمیشہ موجود ہونا چاہیے۔ ایک لمحہ کے لیے بھی اس میں انقطاع واقع نہیں ہونا چاہیے۔

سوم: یہ کہ وہ آخری رسولؐ ذریت ابراہیمؑ سے ہونا چاہیے۔

چہارم: یہ کہ امت مُسلمہ ایسی قدیم الاسلام ہونی چاہیے کہ جن افراد کو آخری نبی دعوتِ اسلام دیں تو وہ کہہ اٹھیں: "وکنا من قبل مسلمین" (سورۃ قصص: ۵۳) ہم تو پہلے سے مُسلمان ہیں۔

اب اہل عقل و دانش بتلائیں وہ کونسا خاندان و گروہ ایسا تھا جس سے آنحضرتؐ مبعوث برسالت ہوئے۔ اگر وہی لوگ حضرت خلیلؑ و ذبیحؑ کی دعاؤں کے مصداق نہیں تو پھر کون بزرگوار اس کے مصداق ہیں؟ نہیں نہیں سوائے آنحضرتؐ کے دودمان کے اور کوئی خاندان نہیں مل سکتا اور نہ کوئی ہوسکتا ہے۔ یہی امت مُسلمہ ہے کہ آنحضرتؐ کی بعثت تک ملت ابراہیمؑ پر قائم تھی اور آپ کی بعثت کے وقت جو حضرات زندہ تھے وہ شریعت مُصطفویؐ پر ایمان لائے اور یہ ایمان آوری معاذ اللہ کفر سے اسلام کی طرف انتقال نہ تھا، بلکہ ملت ابراہیمؑ سے دین محمدیؐ کی طرف رجوع تھا۔ کما لا یخفی۔ پس

معلوم ہوا کہ یہ آیاتِ مبارکہ اسلام آباء النبی والوصی پر نص صریح ہیں ۔ ولکن من لم یجعل اللہ لہ نورا فمالہ من نور (سورۃ النور:۴۰)

چوتھی دلیل :

یہ دلیل حضرت ابوطالبؑ کے اسلام کے ساتھ مختص ہے ۔ مُسلمانوں کی ذہنیت پر افسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے خلفاء کے آباء واجداد کے کفر پر پردہ ڈالنے، ان کی فضیحت کو ہلکا کرنے اور اپنے بزرگوں کی کمزور پوزیشن کو سہارا دینے کے لیے مربی رسولؐ ومحسن اسلام یعنی جناب امیر علیہ السلام کے والد ماجد جناب ابوطالبؑ کی ردائے ایمان کو کفر کے بدنما دھبوں سے داغدار کرنے کی پوری پوری سعی نافرجام کی، بلکہ ان کے سنانِ اقلام کے زخم آنحضرتؐ کے والدین شریفین تک بھی پہنچ گئے ۔ لاشکر اللہ سعیہم ۔ اس کتاب میں اتنی گنجائش تونہیں کہ آنجنابؑ کے اسلام کے مکمل دلائل پیش کیے جائیں ۔ اس مطلب کے لیے تو ایک مستقل کتاب درکار ہے ۔ شائقین تفصیل "اسنی المطالب فی نجات ابی طالب" یا "شیخ الابطح" یا "انوار الواہب فی ایمان ابی طالب" یا "ابوطالب مومن قریش" وغیرہ رسائل وکتب کی طرف رجوع کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص تعصب وعناد کی پٹی آنکھوں سے اتار کر ابتدائے بعثت رسولؐ میں (جبکہ اسلام ومُسلمان بالکل کمزور وناتواں تھے) دین اسلام کو پروان چڑھانے اور جناب رسولِ خداؐ کی شر اعداء سے حفاظت کرنے کے سلسلہ میں حضرت ابوطالبؑ کے مساعی جمیلہ کا سرسری نگاہ سے بھی جائزہ لے تو وہ آنجنابؑ کے ایمان میں ہرگز کسی قسم کا شک وشبہ نہیں کرسکتا ۔ بعض کوتاہ اندیش مُتعصب لوگ یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ شفقت عموی کا تقاضا تھا، اس میں کوئی جذبہ ایمانی کارفرما نہ تھا ۔ مگر بموجب "دروغ گورا حافظہ نہ باشد" وہ یہ بات کہتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے چچے مثل ابی لہب وغیرہ اور بھی تو تھے ۔ اگر اس جدوجہد میں کوئی جذبہ ایمانی کارفرما نہ تھا بلکہ صرف شفقت عموی کا تقاضا تھا تو دوسرے چچاؤں نے اپنے بھتیجے کی نصرت کیوں نہ کی، جبکہ خونی رشتہ میں سب برابر تھے ۔ بلکہ اُلٹا ان کو اتنی اذیتیں پہنچائیں کہ قرآن کے پورے پورے سورے ان کی مذمت میں موجود ہیں ۔ فطرت بتلاتی ہے کہ کوئی رشتہ دار جس قدر بھی عزیز کیوں نہ ہو، تاہم وہ اپنی حقیقی اولاد سے زیادہ عزیز نہیں ہوسکتا ۔ مگر تاریخ اسلام کے طالب علم جانتے ہیں کہ جناب ابی طالبؑ کی یہ حالت تھی کہ رسولؐ کے بستر پر اپنے بیٹوں کو لٹا دیتے تھے اور رسول کو اپنے ہمراہ رکھتے، تاکہ اگر خدانخواستہ کوئی

دشمن قتلِ نبی کے ارادہ سے آئے تو ابوطالبؑ کی اولاد قتل ہو جائے مگر محمدؐ پر کوئی آنچ نہ آئے۔
(سیرت حلبیہ و سیرۃ النبیؐ)

کیا ایک بابصیرت انسان ان حقائق کو دیکھنے کے بعد یہ یقین نہیں کر سکتا کہ یہاں جسمانی رشتہ کے علاوہ کوئی ایسا ایمانی رشتہ کارفرما تھا جس کے سامنے اولاد بھی ہیچ معلوم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنابِ رسولِ خداؐ کو بھی حضرت ابوطالبؑ کی وفات حسرت آیات پر اس قدر رنج و الم ہوا کہ ان کے انتقال کے سال کا نام ہی "عام الحزن" رکھ دیا۔ ولنعم ما قال ابن ابی الحدید المعتزلی: ؎

و لو لا ابو طالبؑ و ابنہ لما مثل الدین شخصًا فقاما

پانچویں دلیل:

جنابِ ابوطالبؑ کے بکثرت ایسے اشعار آبدار کتبِ فریقین میں موجود ہیں جو ان کے کامل الاسلام والایمان ہونے پر صراحۃً دلالت کرتے ہیں۔ بطور نمونہ مُشتے از خروارے، یہاں فقط چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔ شائقین تفصیل، ان کے مطبوعہ دیوان کی طرف رجوع کریں جو کہ مصر و عراق میں شائع ہو چکا ہے۔ کفار کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

الم تعلموا انا وجدنا محمدا نبیا کموسیٰ خط فی اول الکتب

کیا تمھیں معلوم نہیں کہ ہم نے محمدؐ کو ایسا ہی نبی پایا ہے جیسے موسیٰؑ نبی تھے۔ اس کی نبوت پہلی کتابوں میں مذکور ہے۔ (مواہب لدنیہ وغیرہ)

و لقد علمت بان دین محمد من خیر ادیان البریۃ دینا

مجھے یقین ہے کہ محمدؐ کا دین تمام ادیانِ عالم سے بہتر و برتر ہے۔ (دیوانِ ابی طالبؑ)

چھٹی دلیل:

اہل بیتؑ رسولؐ کا جنابِ ابوطالبؑ کے ایمان پر اجماع و اتفاق ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ بنصِ آیتِ تطہیر و حدیثِ ثقلین تالیِ قرآن اور معصوم و مطہر ہیں۔ اس لیے ان کا اجماع و اتفاق یقینًا صحیح و درست ہے۔ ان کے نظریات میں غلطی کا امکان ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ "لانھم مع القرآن و القرآن معھم" علمائے اہل سنت نے بھی اہل بیتِ رسولؐ کے اس اجماع کا اعتراف کر لیا ہے۔ چنانچہ ابن اثیر جزری جامع الاصول میں رقمطراز ہیں: (علی ما نقل عنہ) "و اھل البیت یزعمون ان ابا طالب مات مسلمًا"۔ اہل

بیت نبوی کا خیال ہے کہ ابو طالبؑ کا بحالتِ اسلام انتقال ہوا"۔

اسی طرح صاحب "سیرۃ علویہ" نے بقیۃ السلف عبد السلام بن محمد کے متعلق انھوں نے لکھا ہے: "اتفق اھل البیت علی ان اباطالب مات مسلمًا"۔ یعنی تمام اہل بیتؑ کا اس امر پر اتفاق ہے کہ حضرت ابو طالبؑ کا بحالتِ اسلام انتقال ہوا۔

یہاں گنجائش نہیں کہ تمام ائمہ اطہارؑ کے ارشادات پیش کیے جائیں ۔ ہاں تبرکًا فقط جناب امیرالمومنینؑ کا ایک ارشاد نقل کیا جاتا ہے۔ کتاب "بشارت المصطفیٰ" میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ آنجنابؑ کوفہ کے محلہ رحبہ میں تشریف فرما تھے اور لوگ آپ کی خدمت میں حاضر تھے۔ ایک گستاخ کھڑا ہو کر کہنے لگا: آپ تو اس مرتبہ عظمیٰ پر فائز ہیں، اور آپ کا والد آتش جہنم میں گرفتار ہے۔ آپ نے فرمایا: خدا تیرے مُنہ کو توڑے، مجھے اس ذاتِ ذوالجلال کی قسم جس نے محمد مصطفیٰ کو صدق و راستی کے ساتھ درجہ نبوت پر فائز کیا۔ میرے والد ماجد کا وہ مرتبہ ہے کہ اگر تمام گنہگاروں کے حق میں شفاعت کریں تو خداوند عالم ان کی شفاعت کو ضرور قبول فرمائے گا۔ بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ میں قسیم الجنۃ والنار ہوں اور میرے والد بزرگوار جہنم میں ہوں۔ بروزِ قیامت سوائے خمسہ نجباء کے انوار کے باقی تمام انوار کو میرے والد کا نور ماند کر دے گا۔

مخفی نہ رہے کہ اہل بیتِ رسولؐ کا اتفاق فقط اسلام ابو طالبؑ پر ہی نہیں ہے بلکہ تمام انبیاء و اوصیاء کے آباء و امہات کے اسلام پر بھی ہے۔ لہٰذا ہمارے مدعا پر یہ خود ایک مستقل دلیل ہے۔

ساتویں دلیل:

جناب ابو طالبؑ کا وہ خطبہ جو آپؑ نے جناب خدیجۃ الکبریٰؑ کے ساتھ جناب رسولِ خداؐ کے عقد نکاح کے موقع پر پڑھا تھا، آپ کے اسلام و ایمان کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔ اس خطبہ جلیلہ کے ابتدائی جملے یہ ہیں: "الحمد للہ الذی جعلنا من ذریۃ ابراھیم و زرع اسماعیل و جعل لنا بلدا حراما و بینا محجوجا و جعلنا الحکام علی الناس"۔ (کامل للمبرد جلد ۲ صفحہ ۲۵۲ طبع مصر) تمام تعریفیں اس خدا کے لیے ہیں جس نے ہمیں ذریت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ سے بنایا ہے اور ہمارے لیے بلد محترم (مکہ) اور وہ گھر مقرر کیا جس کی حج کی جاتی ہے۔ نیز ہمیں تمام لوگوں کا حاکم و سردار بنایا۔

آٹھویں دلیل:

شیخ علی بن برہان الدین الحلبی الشافعی اپنی کتاب سیرتِ حلبیہ میں لکھتے ہیں: "عن مقاتل ان

اباطالبؑ قال عند موته یا معشر نبی هاشم اطیعوا محمدا و صدقوا ترشدوا"۔ یعنی جناب ابوطالبؑ نے اپنی وفات کے وقت بنی ہاشم کو وصیت فرمائی کہ اے بنی ہاشم! جناب محمدؐ کی اطاعت کرو، اور ان کی تصدیق کرو، رستگاری پا جاؤ گے۔ اس سے روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ جناب ابوطالبؑ آنحضرتؐ پر ایمان لا چکے تھے۔ ورنہ دوسروں کو یہ وصیت کس طرح کر سکتے تھے؟ اور اگر بالفرض کرتے بھی تو وہ بموجب " خود میاں فضیحت و دیگراں را نصیحت " اس کا کوئی اثر نہ ہوتا۔

نویں دلیل:

مؤرخ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں صاف طور پر لکھ دیا ہے: "اِنَّهُ اَسْلَمَ" کہ جناب ابوطالبؑ اسلام لا چکے تھے۔

ادلۂ عقلیہ بر اسلام آباء النبیؐ

پہلی دلیل:

اگر انبیاء کا (معاذ اللہ) کفار کے اصلاب اور کافرات کے ارحام میں رہنا تسلیم کر لیا جائے تو جب ان کے والدین بتوں کو سجدہ کریں گے تو ان کے سجدہ کے ضمن میں خود انبیاء کا بھی بتوں کو سجدہ کرنا لازم آئے گا۔ کیونکہ اولاد جزوِ والدین ہوتی ہے "ويجعلون له جزءً" اور یہ امر عصمتِ انبیاءؑ کے منافی ہے۔

دوسری دلیل:

اگر نبی و امام کافر مردوں کی پشت اور کافر عورتوں کے رحم میں رہیں تو علاوہ اس کے کہ ان کی عزت و عظمت مسلمانوں کے دلوں سے ساقط ہو جائے گی۔ خود انبیاءؑ بھی والدین کے کفر و شرک سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ بنصِ قرآنی: "انما المشركون نجس" (سورۃ توبہ: ۲۸) مشرک نجس اور بنصِ آیت "وان الشرك لظلم عظيم" (سورۃ لقمان: ۱۳) شرک ظلم عظیم ہے، تو جو شرک ایسی نجاست و کثافت اور شرک ایسے ظلم عظیم سے متاثر ہو، وہ نبی بننے کی اہلیت نہیں رکھ سکتا۔ "و لا ينال عهدی الظالمين" (سورۃ بقرہ: ۱۲۴)

تیسری دلیل:

قاعدہ کلیہ ہے کہ مظروف کے مطابق ظرف ہوتا ہے۔ پانی کا برتن اس کے حسب حال ہوگا

اور دودھ کا ظرف اس کے موافق ۔ سونا رکھنے کی ڈبیہ اور ہوگی اور لوہا رکھنے کی جگہ اور ۔ جب یہ مُسلّم ہے تو بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ خدائے حکیم اپنے انبیاء و اوصیاء کے مقدس سلسلہ کو کفر وشرک کے ظروف میں رکھے؟ غور طلب بات ہے کہ خدائے قدیر وحکیم یہاں مظروف کے مطابق پاکیزہ ظرف بنانے پر قادر تھا یا نہ؟ اگر یہ کہا جائے کہ پاکیزہ ظرف بنانے پر قادر نہ تھا تو یہ امر اس کی قدرتِ کاملہ کے منافی ہے اور اگر قادر تھا مگر ایسا نہیں کیا تو یہ فعل اس کی حکمت کاملہ کے خلاف ہے ۔"فعل الحکیم لا یخلوا عن الحکمة "اس لیے تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس نے مظروف کے مطابق ظرف بنائے تھے ۔

ازالۂ شُبہ

بعض معاندین اس سلسلہ میں حضرت ابراہیمؑ کے چچا آزر کی وجہ سے شبہ پیش کیا کرتے ہیں ۔ جسے قرآن میں حضرت ابراہیمؑ کا "اب" کہا گیا ہے ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ میں مؤرخین کا اختلاف ہے ۔ تحقیقی قول یہ ہے کہ آزر آنجنابؑ کے چچا تھے ۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بڑے بڑے مؤرخین کی تصریحات موجود ہیں ۔ ہاں البتہ چچا اور تربیت کنندہ ہونے کی وجہ سے محاورۂ عرب کے مطابق ان کو "اب" (باپ) کہہ دیا گیا ہے ۔"لان العم صنو الاب" ورنہ ان کے والد حقیقی کا نام جناب "تارخ" تھا ۔

زجاج کہتے ہیں :"لا خلاف بین النسابین ان اسمه تارخ" ۔ اہل سنت میں کوئی اختلاف نہیں کہ ان کا نام "تارخ" تھا ۔ (تفسیر کبیر علامہ فخرالدین رازی جلد ۴ صفحہ ۷۰ وتفسیر مظہری جلد ۵ صفحہ ۲۲۵)

اسی امر پر مذہب شیعہ کا اتفاق ہے ۔

لہٰذا یہ شُبہ دلائل قطعیۃ عقلیۃ
اور نقلیۃ کے بالمقابل کوئی
حیثیت نہیں
رکھتا

☆

باب الاعتقاد

فی التقیة

قال الشیخ اعتقادنا فی التقیة انها واجبة من ترکها کان بمنزلة من ترک الصلوة و قیل للصادقؑ

چالیسواں باب

تقیہ کے متعلق عقیدہ

حضرت شیخ ابو جعفرؒ فرماتے ہیں کہ تقیہ کے بارے میں ہمارا اعتقاد ہے کہ یہ واجب ہے اور اس کا ترک کرنے والا تارکِ نماز کی مانند ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کی

چالیسواں باب

تقیہ کا بیان

تقیہ کے مفہوم کی تعیین اور اس کا اِثبات

اس مقام پر حضرت شیخ مُفید علیہ الرحمہ کا یہ ایراد کسی حد تک درست ہے کہ حضرت مُصنّف علام کا کلام تقیہ کے متعلق (دیگر اکثر مسائل کی طرح) بہت مجمل ہے۔ اس میں نہ تقیہ کے مفہوم و معنی بیان کیے گئے ہیں اور نہ ہی یہ تفصیل بیان کی گئی ہے کہ تقیہ کہاں واجب ہے اور کہاں حرام۔ کہاں راجح ہے اور کہاں مرجوح؟ اس لیے ہم ذیل میں اس مسئلہ پر قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔ تقیہ کے لغوی معنی ہیں "ڈر، خوف" اور اصطلاح میں تقیہ کا مطلب یہ ہے کہ کسی شرعی ضرورت مثل خوفِ عرض و ناموس اور خطرۂ مال و جان کے وقت حق کو پوشیدہ رکھ کر خلافِ حق بات کا اِظہار کرنا۔ یہ مسئلہ منجملہ ان مسائل کے ہے کہ جن کی وجہ سے مخالفین ہمیشہ اہل حق پر زبانِ طعن و تشنیع دراز کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک فطری امر ہے جسے بلا امتیاز مذہب و ملت ہر ضعیف و کمزور انسان اپنی نگہداشت اور مال و جان کی حفاظت کے لیے ضرور عمل میں لاتا رہتا ہے۔ "و من ینکرہا باللسان و قلبہ مطمئن بالایمان"۔ اگر کمزور و ناتواں انسان بوقت ضرورت تقیہ سے کام نہ لیں تو وہ ختم ہو جائیں۔ اسلام جو کہ دین فطرت ہے، اس کے متعلق یہ کس طرح متصوّر ہو سکتا ہے کہ وہ انسان کے اس فطری حق کو اس سے سلب کرلے۔ اور اس فطری تقاضے کو حرام قرار دے دے؟ یہی وجہ ہے کہ بانئ اسلامؐ اور ان کے اوصیاء علیہم السلام نے تقیہ کو فقط جائز ہی نہیں بتایا بلکہ اس کی اہمیت پر بہت کچھ زور بھی دیا ہے۔

یا ابن رسول اللہ انا نری فی المسجد من یعلن بسب اعدائکم و یسمیھم فقال مالہ لعنہ اللہ یعرض بنا و قال تعالیٰ لا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم و قال الصادق فی التفسیر

خدمت میں عرض کیا گیا: فرزند رسولؐ! ہم مسجد میں ایک ایسے شخص کو دیکھتے ہیں جو کھلم کھلا آپؑ کے دشمنوں کا نام لے کر ان پر سب وشتم کرتا ہے۔ حضرت نے فرمایا: اس ملعون کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ہمیں معرض خطر میں ڈال کر لوگوں کو ہمارے خلاف برانگیختہ کرتا ہے۔ حالانکہ خداوند عالم کا ارشاد ہے جو لوگ خدا کے سوا کسی کو پکارتے ہیں (ان کے سامنے) ان کے معبودوں کو برا نہ کہو، ورنہ یہ لوگ جہالت اور دشمنی کی وجہ سے خدائے تعالیٰ کو برا کہنے لگیں گے (سورۃ انعام:۱۰۸) حضرت صادق علیہ السلام

چنانچہ جناب امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "واللہ ما علی وجہ الارض من شئ احب الی من التقیۃ"۔ بخدا روئے زمین پر مجھے تقیہ سے زیادہ کوئی چیز بھی محبوب نہیں ہے۔ (اصول کافی) بلکہ یہاں تک فرما دیا کہ "لا دین لمن لا تقیۃ لہٗ"۔ (اصول کافی) جس میں تقیہ نہیں اس میں کوئی دین نہیں ہے۔

تقیہ کے جواز پر آیاتِ متکاثرہ اور اخبارِ متظافرہ بلکہ متواترہ کتب فریقین میں موجود ہیں۔ بنابر اختصار ہم ذیل میں چند آیات و اخبار پیش کرتے ہیں۔

جوازِ تقیہ کی پہلی آیتؑ

ارشادِ قدرت ہے:

مَنۡ کَفَرَ بِاللّٰہِ مِنۡۢ بَعۡدِ اِیۡمَانِہٖۤ اِلَّا مَنۡ اُکۡرِہَ وَ قَلۡبُہٗ مُطۡمَئِنٌّۢ بِالۡاِیۡمَانِ وَ لٰکِنۡ مَّنۡ شَرَحَ بِالۡکُفۡرِ صَدۡرًا فَعَلَیۡہِمۡ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰہِ ۚ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۰۶﴾ (سورۃ النحل:۱۰۶)

اس شخص کے سوا (جو کلمہ کفر پر) مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کی طرف سے مطمئن ہو، جو شخص بھی ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرے بلکہ خوب سینہ کشادہ (جی کھول کر) کفر کرے تو ان پر خدا کا غضب ہے۔ اور ان کے لیے بڑا (سخت) عذاب ہے۔ (ترجمہ فرمانؒ)

اس آیت مبارکہ کے متعلق تمام مفسرین اسلام کا اتفاق ہے کہ جوازِ تقیہ پر دلالت کرتی ہے۔ چنانچہ تفسیر بیضاوی جلد ۱ صفحہ ۳۹۶، تفسیر کشاف جلد ۲ صفحہ ۳۴۵ طبع مصر، تفسیر کبیر جلد ۵ صفحہ ۳۵۵ میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ کفار نے جناب عمارؓ اور ان کے والدین شریفین (جناب یاسرؓ و سمیہؓ) کو

هذه الاية فلا تسبوهم فلانهم يسبوا عليكم و قال الصادقؑ من سب ولی الله فقد سب الله و من سب الله اكبه الله على منخريه فی نار جهنم قال النبیؐ لعلیؑ من سبك يا علیؑ فقد سبنی و من سبنی فقد سب الله تعالیٰ و التقية و اجبة لايجوز رفعها الیٰ ان يخرج القائم فمن تركها قبل خروجه فقد خرج عن دين الله تعالیٰ و عن دين الامامية و خالف الله و رسوله و الائمة

اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ان لوگوں پر سب وشتم نہ کرو، ورنہ یہ لوگ تمھارے علیؑ پر سب وشتم کریں گے۔ پھر فرمایا جو شخص ولی اللہ کو برا کہے اس نے گویا خداوند عالم کو برا کہا۔ اور جس نے خدا کو برا کہا خدا تعالیٰ اسے ناک کے بل آتش جہنم میں اوندھا ڈالدے گا۔ جناب رسولِ خداؐ نے حضرت امیر علیہ السلام سے فرمایا: یا علی! جو شخص تم پر سب کرتا ہے وہ مجھ پر سب کرتا ہے اور جو مجھ پر سب کرتا ہے وہ خدا پر سب کرتا ہے۔ تقیہ واجب ہے اور حضرت قائم آلِ محمدؑ کے ظہور تک اس کا ترک کرنا جائز نہیں، جو شخص آپؑ کے ظہور سے پہلے تقیہ ترک کرے گا وہ دین خدا یعنی مذہب امامیہ سے خارج ہوجائے گا، اور خدا اور رسولؐ اور ائمہ ہدےٰ

گرفتار کرلیا۔ اور ان کو چند کلماتِ کفر کہنے پر مجبور کیا۔ جناب یاسر و سمیہ کے انکار پر ظالموں نے ان کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا۔ لیکن جناب عمارؓ نے وہ کلماتِ کفر کہہ کر اپنی جان بچالی۔ بعض لوگوں نے آنحضرتؐ کی خدمت میں شکایت کی کہ عمار کافر ہوگیا ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: اس طرح نہ کہو۔ عمارؓ تو سر سے قدم تک ایمان سے لبریز ہے۔ اور ایمان اس کے گوشت و پوست کے ساتھ مخلوط ہے۔ اس اثنا میں جناب عمارؓ بھی باچشم گریاں و دل بریاں بارگاہِ نبویؐ میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے فرمایا (کوئی بات نہیں) "ان عادوا لك فعدلهم بما قلت" اگر کفار دوبارہ تجھ سے یہی کلمات کہلوائیں تو دوبارہ کہہ دینا۔ اس کے بعد یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی۔ یہ آیت مبارکہ عندالضرورت ایمان کو قلب میں پوشیدہ رکھ کر بظاہر کلمہ کفر کہنے کے جواز پر ایسی نص صریح ہے کہ کوئی کلمہ گوئے اسلام اس کا انکار نہیں کرسکتا۔ چنانچہ قاضی بیضاوی نے جلد ۱ صفحہ ۳۹۶ پر اس آیت کے ذیل میں لکھ دیا ہے: "وهو دليل جواز التكلم بالكفر عند الاكراه" یعنی یہ اکراہ کے وقت کلمہ کفر کہنے کے جواز کی دلیل ہے اور تفسیر جامع البیان، اکلیل اور معالم التنزیل میں بذیل ارشادِ قدرت: "وقلبه مطمئن بالايمان" لکھا ہے: "والاجماع على جواز كلمة الكفر عند الاكراه"۔ مجبوری کے وقت کلمہ کفر کہنے پر اجماع ہے۔ (فلک النجاۃ)

و سئل الصادقؑ عن قول اللہ عز و جل ان اکرمکم عند اللہ اتقیکم قال اعملکم بالتقیۃ و قد اطلق اللہ تبارک و تعالیٰ اظہار موالاۃ الکافرین فی حال التقیۃ و قال عز و جل لا یتخذ المومنون الکافرین اولیاء من دون المومنین و من یفعل ذالک فلیس من اللہ فی شئ الا ان تتقوا منہم تقاۃ و قال اللہ عز وجل لاینہیکم اللہ عن الذین

کا مخالف متصوّر ہوگا۔ حضرت امام جعفر صادقؑ سے قولِ خدا "ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم" خدا کے نزدیک سب سے زیادہ مکرم وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ متقی و پرہیز گار ہے (سورۃ حجرات: ۱۳) کی تفسیر پوچھی گئی، فرمایا کہ "اتقاکم" سے مراد وہ شخص ہے جو تقیّہ پر سب سے زیادہ عمل کرے۔ خدا نے تقیّہ کی حالت میں کفار سے دوستی ظاہر کرنے کی اجازت دی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتا ہے: مومنین کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایمان والوں کو چھوڑ کر کفار کو دوست نہ بنائیں۔ اور جو ایسا کرے گا اس کو خدا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہاں اگر تم ان سے خوف رکھتے ہو تو فقط اظہارِ دوستی میں کوئی حرج نہیں ہے (سورۃ آل عمران: ۲۸) نیز فرماتا ہے خدا نے تمھیں ان کافروں سے نیکی اور انصاف کرنے کی

جوازِ تقیّہ کی دُوسری آیتؐ

خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ؕ وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸﴾

(سورۃ آلِ عمران:۲۸)

مومنین کے لیے لازم ہے کہ مومنین کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں۔ مگر جب کہ ان سے خوف و ڈر ہو۔ خدا تمھیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور تمھاری بازگشت اسی کی طرف ہے۔

یہ آیت مبارکہ بطور نص صریح اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ کفار کی دوستی حرام ہے۔ ہاں جب ان سے جان و مال کا خوف دامن گیر ہو تو پھر ان کی عداوت کو پوشیدہ رکھ کر بظاہر ان سے اظہارِ محبّت اور میل جول رکھنا جائز ہے۔ یہاں بالکل واضح اور صریح لفظ "الا ان تتقوا منہم تقاۃ" مذکور ہیں۔ قراء سبعہ میں سے یعقوب نے اس لفظ "تقاۃ" کو "تقیۃ" پڑھا ہے۔ (بیضاوی جلد ۱ صفحہ ۱۱۲)

نیز قتادہ اور ابو رجاء بھی اسے تقیّہ ہی پڑھتے تھے۔ (تفسیر درمنثور جلد ۲ صفحہ ۱۶۴)

لم یقاتلوکم فی الدین و لم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم و تقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین انما ینھیکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین و اخرجوکم من دیارکم و ظاھروا علی اخراجکم ان تولوھم و من یتولھم فاؤلئک ھم الظالمون و

ممانعت نہیں کی، جو تمھارے دین کے معاملہ میں تم سے برسرِ پیکار نہیں ہوئے اور نہ ہی انھوں نے تم کو تمھارے گھروں سے نکالا ہے یقیناً خدا تو انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ ہاں جن کافروں نے دین کے بارے میں تم سے لڑائی لڑی اور تمھیں گھروں سے نکالا، یا تمھارے گھروں سے نکالنے میں (دشمنوں کی) مدد کی، ان سے محبت کرنے کی خدا نے ممانعت فرمائی ہے۔ جو شخص ان سے دوستی اور محبت رکھے گا وہ ضرور ظالم ہوگا۔ (سورۃ ممتحنہ:۸۔۹)

اس آیت مبارکہ کے ذیل میں قاضی بیضاوی نے جلد ۱ صفحہ ۱۱۲ طبع مصر پر لکھا ہے:

"منع عن موالاتھم ظاھرا و باطنا فی الاوقات کلھا الا وقت المخافۃ فان اظھا الموالاۃ حینئذ جائز"۔

یعنی خداوند عالم نے تمام اوقات میں ظاہری و باطنی طور پر کفار کی دوستی کی ممانعت فرمائی ہے۔ ہاں جب ان سے خوف (جان یا مال) ہو تو اس وقت ان سے اظہارِ محبت جائز ہے۔ (کذا فی تفسیر معالم التنزیل)

اسی طرح تفسیر نیشا پوری جلد ۳ صفحہ ۱۷۰ مطبوعہ برحاشیہ تفسیر ابن جریر پر بھی حفظ جان و مال کے لیے تقیّہ کو جائز بتلایا ہے۔

"و منھا انھا جائزۃ لصون المال علی الاصح کما انھا جائزۃ لصون النفس لقولہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم حرمۃ مال المسلم کدمہ"۔

صحیح یہ ہے کہ جس طرح حفاظت جان کے لیے تقیّہ جائز ہے اسی طرح حفاظت مال کے لیے بھی جائز ہے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: "مُسلمان کے مال کا احترام اس کے خون کی طرح ہے"۔

جوازِ تقیّہ کی تیسری آیت

خداوند عالم نے مومن آلِ فرعون کی مدح وثنا کرتے ہوئے فرمایا ہے:

وَ قَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ق صلے مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَكْتُمُ اِیْمَانَهٗ (سورۃ مومن:۲۸)

آلِ فرعون میں سے ایک مردِ مومن نے کہا جو کہ اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھتا تھا۔

خداوند عالم کا اس کے فعل (کتمانِ ایمان و اظہارِ کفر) کو مقامِ مدح میں بیان کرنا اس بات کی قطعی

قال الصادقؑ انی لاسمع الرجل فی المسجد و هو یشتمنی فاستر منه بالساریة کیلا یرانی و قال الصادق خالطوا الناس بالبرانیه و خالفوهم بالجرانیة ما دامت الامرة حسبانیة و قال الصادقؑ ان الریا مع المومن شرك و مع المنافق فی داره عبادة

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: میں اپنے کانوں سے سنتا ہوں کہ ایک شخص مسجد میں مجھے گالیاں دے رہا ہوتا ہے مگر میں اس خیال سے کہ وہ مجھے دیکھ نہ لے۔ ستون کے پیچھے چھپ جاتا ہوں۔ نیز آپؑ فرماتے ہیں: جہاں تک ممکن ہو سکے اپنے مخالفین سے ظاہر میں رواداری کرو اور ان سے میل ملاپ رکھو مگر اندرونی طور پر ان کے مخالف رہو۔ فرمایا: مومن سے ریاکاری کرنا شرک کے مترادف ہے اور منافق سے اس کے گھر میں ریاکاری کرنا بمنزلہ عبادت ہے

دلیل ہے کہ ایسے حالات میں ایسا کرنا نگاہِ قدرت میں محبوب و مرغوب امر ہے۔ اگرچہ یہ شریعت موسویؑ کا واقعہ ہے مگر شریعت مصطفویؐ میں اس کی دلیل نسخ کا نہ ہونا اس کے بقاء دوام کی بین دلیل ہے۔

دلیل چہارم:

فضیلت تقیہ کی جن اخبار کی وجہ سے مخالفین ہم پر زبانِ اعتراض دراز کرتے رہتے ہیں، ایسی روایات خود ان کی کتب میں موجود ہیں۔ چنانچہ کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۲۲ پر مرقوم ہے: "لا دین لمن لا تقیة له"۔ جو شخص عند الضرورت تقیہ نہیں کرتا وہ بالکل بے دین ہے۔ لہٰذا جو اعتراض ہم پر کیا جاتا ہے وہی خود ان حضرات پر بھی عائد ہوتا ہے۔ فما هو جوابکم فهو جوابنا۔

بخاری شریف جلد ۲ صفحہ ۱۰۲۶ طبع دہلی پر "تقاة" کی تفسیر تقیہ کے ساتھ کرنے کے بعد لکھا ہے: "و قال الحسن التقية الى يوم القيامة"۔ یعنی حسن بصری کہتے ہیں کہ تقیہ قیامت تک باقی ہے۔ "لان حلال محمّد حلال الى يوم القيامة و حرامه حرام الى يوم القيامة"۔

دلیل پنجم:

دوسروں پر بوجہ تقیہ کذب بیانی کا الزام لگانے والے اگر اپنی کتب حدیث و فقہ کا مطالعہ کریں تو انھیں معلوم ہوگا کہ ان کے مذہب میں عند الضرورت جھوٹ بولنا فقط جائز ہی نہیں بلکہ واجب لکھا ہے۔ چنانچہ علامہ نووی شرح مسلم جلد ۲ صفحہ ۲۶۶ پر لکھتے ہیں: "و قد اتفق الفقهاء على انه لوجاء ظالم يطلب انسانا مختفيا ليقتله او يطلب وديعة لانسان لياخذها غصبا سئل عن ذلك وجب على من علم

و قال من صلی معهم فی الصف الاول فکانما صلی مع رسول اللہ فی الصف الاول و قال عودوا مرضاهم و اشهدوا جنائزهم و صلوا فی مساجدهم و قال کونوا لنا زینا و لا تکونوا علینا

نیز فرمایا: جو شخص مخالفین کے ساتھ ان کی پہلی صف میں نماز پڑھے تو وہ ایسا ہے کہ گویا اس نے جناب رسولِ خداؐ کے ساتھ صف اول میں نماز پڑھی۔ [1] آپ ہی سے منقول ہے کہ ان (مخالفین) کے بیماروں کی بیمار پرسی کیا کرو اور ان کے جنازوں میں شریک ہوا کرو، اور ان کی مسجدوں میں نماز پڑھا کرو۔ نیز فرمایا ہمارے لیے باعثِ زینت بنو باعثِ ننگ و عار نہ بنو۔

ذلك اخفائه و انكار العلم به و هذا كذب جائز بل واجب"۔ یعنی " فقہاء کا اتفاق ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس کوئی شخص چھپا ہوا موجود ہو اور کوئی ظالم اسے قتل کرنے کی غرض سے وہاں پہنچ جائے یا کسی شخص کی امانت کسی کے پاس پڑی ہو اور کوئی غاصب وہاں پہنچ کر اس سے سوال کرے کہ وہ انسان یا مالِ امانت کہاں ہے تو جسے بھی حقیقتِ حال کا علم ہو اس پر واجب ہے کہ اسے مخفی رکھے اور اپنی لاعلمی کا اظہار کرے۔ یہ جھوٹ جائز، بلکہ واجب ہے"۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ تقیہ عند الکل جائز ہے۔ اور سب اس پر عامل بھی ہیں۔ اگر کچھ اختلاف ہے تو فقط اس کے نام میں۔ ہم اس کو تقیہ کہتے ہیں اور تنگ نظر مخالفین ہماری ضد میں اسے تقیہ کی بجائے کذب کہتے ہیں اور اسے نہ صرف جائز بلکہ واجب قرار

---

[1] مخالفین کی جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی فضیلت کے بارہ میں متعدد روایات وارد ہوئی ہیں۔ ایک مرتبہ ہم نے ان کو شمار کیا تھا۔ ان کی تعداد تیس سے زائد تھی۔ ان اخبار کے متعلق علماء اعلام کے دو نظریے ہیں۔ اکثر علماء تو ان کو حالتِ تقیہ پر محمول کرتے ہیں کہ یہ حکم حالتِ تقیہ کے ساتھ مختص ہے اور بعض علماء مثل عالم ربانی مولانا شیخ یوسف البحرانی صاحبِ حدائق ناظرہ اور حضرت آقائے سید حسین بروجردی اعلی اللہ مقامہ علی الاطلاق اس امر کو مستحب و مستحسن سمجھتے ہیں۔ "و هذا القول لا يخلو من القوة و ليس هذا محل تحقيق ما هو الحق في المقام" مگر یہ یاد رہے کہ اقتداء کی نیت نہیں کرنی چاہیے، بلکہ ہاتھ کھول کر اپنی علیحدہ اذان و اقامت کہہ کر ان کے ساتھ کھڑا ہو کر فرادی نماز کی طرح قرائت وغیرہ وظائف خود انجام دے کر نماز کو ان کے ساتھ تمام کرنا چاہیے۔ خلاصہ یہ کہ بحسب صورت اقتداء اور باعتبار حقیقت فرادی ہو۔ اس کا فلسفہ یہ ہے کہ لوگوں سے میل ملاقات کی جائے اور تعلقات بڑھائے جائیں۔ کیونکہ ائمہ اطہارؑ فرماتے ہیں: لوگوں کو اپنی طرف رغبت دلاؤ، نفرت نہ دلاؤ۔ اسی لیے ان حکماء اسلامؑ نے فرمایا ہے کہ مخالفین کے مریضوں کی عیادت اور ان کے جنازوں کی مشایعت کرو، تاکہ ان سے تمہارے تعلقات خوشگوار ہوں اور اس طرح تبلیغ حق کا بہترین موقع ہاتھ آجائے گا۔ یہی اسلام کا تقاضا ہے۔ المسلم من سلم المسلمون من یدہ و لسانہ اللهم وفق المسلمين للاتفاق و الاتحاد بجاه النبي و آله الامجادؑ۔ (منہ عفی عنہ)

شیئا و قال رحم الله امرا احبنا الی الناس و لم یبغضنا الیھم و ذکر القصاصون عند الصادقؑ فقال لعنھم الله انھم یشنعون	فرمایا: خدا اس شخص پر رحمت نازل فرمائے جو مخالفین کے دلوں میں ہماری محبت پیدا کرتا ہے اور ہمیں ان کی نظروں میں دشمن نہیں بناتا۔ جناب صادقؑ کے سامنے قصہ گویوں کا تذکرہ کیا گیا، آپ نے فرمایا: خدا ان پر لعنت کرے کہ یہ ہم پر طعن و تشنیع کرتے ہیں

دے رہے ہیں۔ حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ چنانچہ بعض مُنصف مزاج علمائے اہل سنت نے اس کی تصریح کی ہے۔

صاحب النصائح الکافیہ صفحہ ۱۹۰ طبع بمبئی پر لکھتے ہیں: "قلت اتفق اصحابنا علیٰ جواز الکذب عند الضرورۃ بل و للمصلحۃ و ھو عین التقیۃ لکن ان عبرت عنه بلفظ التقیۃ صنعه کثیر منھم لکونه من تعبیرات الشیعۃ فالخلاف فیما یظھر لفظی و الله اعلم"۔ یعنی میں کہتا ہوں ہمارے علماء (اہل سنت) کا اس پر اتفاق ہے کہ ضرورت بلکہ کسی مصلحت کے وقت بھی جھوٹ بولنا جائز ہے اور یہی بعینہٖ تقیہ ہے۔ ہاں البتہ اگر اسے لفظ تقیہ کے ساتھ تعبیر کیا جائے تو بہت سے علماء نے اس کی ممانعت کی ہے۔ کیونکہ یہ تعبیر شیعوں کے ساتھ مختص ہے۔ بنابریں بظاہر یہ سب اختلاف لفظی ہے۔ واللہ اعلم

ان حقائق سے واضح ہو جاتا ہے کہ دونوں فریقوں میں بظاہر لفظی اختلاف ہے (ایک فریق اسے تقیہ کہتا ہے اور دوسرا اسے جواز الکذب عند الضرورت سے تعبیر کرتا ہے) ورنہ حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

الحمد للہ علیٰ وضوح الحق۔ ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

تقیہ پر بعض عائد شدہ شکوک و شبہات کے جوابات

مذکورہ بالا بیاناتِ شافیہ سے یہ امر محقق و مبرہن ہو چکا ہے کہ تقیہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جو شیعوں کے ساتھ مختص ہو، تاکہ اس پر عائد کردہ شبہات کی جوابدہی کا فریضہ ان پر عائد ہو، بلکہ واضح کیا جا چکا ہے کہ یہ مسئلہ مشترکہ ہے، اور عند الضرورت سب اس پر عمل کرتے رہتے ہیں۔ "من انکرھا فقد انکرھا باللسان و قلبه مطمئن بالایمان"۔

مگر تاہم چونکہ ہمیشہ تنگ نظر ملاّ ہمیں اس سلسلہ میں مطعون کرتے رہتے ہیں اور ابلہ فریبی کے لیے اس پر مختلف اعتراضات کرتے رہتے ہیں، اس لیے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ یہاں اختصار کے

علينا و سئل الصادقؑ عن القصاص ايحل الاستماع لهم فقال لا و قال الصادقؑ من اصغى ناطق فقد عبده فان كان الناطق عن الله فقد عبدالله و ان كان	پھر آپ سے سوال کیا گیا کہ ایسے قصہ گویوں کے قصص و حکایات کو سننا جائز ہے؟ فرمایا: ہرگز نہیں۔ نیز انہی حضرتؑ سے مروی ہے فرمایا: جو شخص کسی بات کرنے والے کی طرف کان لگا کر اس کی باتوں کو غور سے سنتا ہے تو گویا وہ اس کی عبادت کرتا ہے۔ لہٰذا اگر بات کرنے والا خدا اور دین خدا کی باتیں کر رہا ہے تو سننے والا خدا کا عبادت گزار ہوگا۔

ساتھ ان کے ایرادات مع جوابات ذکر کردیں، تاکہ یہ مسئلہ کسی لحاظ سے بھی تشنۂ تکمیل نہ رہ جائے۔ جیسا کہ ہماری ہر ہر مسئلہ میں یہی روش ورفتار ہے۔

پہلا شبہ اور اس کا جواب

تقیہ مثل نفاق ہے۔ کیونکہ ان ہر دو میں یہ قدر مشترک ہے کہ دل میں کچھ ہوتا ہے اور ظاہر کچھ اور کیا جاتا ہے اور چونکہ نفاق حرام و ناجائز ہے، لہٰذا تقیہ بھی ناجائز ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ قیاس بالکل بے اساس ہے۔ تقیہ ونفاق کو ایک قرار دینا عین جہالت یا تجاہل ہے، ورنہ معمولی عقل و علم رکھنے والے حضرات بھی جانتے ہیں کہ تقیہ ونفاق میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ تقیہ میں ایمان کو چھپا کر کفر کو ظاہر کیا جاتا ہے اور نفاق میں کفر وشرک کو پوشیدہ رکھ کر اسلام و ایمان کو ظاہر کیا جاتا ہے۔

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ① (سورۃ المنافقون:۱)

پس جب یہ دونوں الگ الگ حقیقتیں ہیں تو پھر ایک کے حکم کا دوسرے پر چسپاں کرنا کس قانون و آئین میں جائز ہے؟ یہ قیاس مع الفارق تو ان لوگوں کے نزدیک بھی غلط ہے اور ناجائز ہے جو قیاس کو درست سمجھتے ہیں۔ فما لكم كيف تحكمون؟

دوسرا شبہ اور اس کا جواب

ابتدائے اسلام میں جب کہ اسلام کمزور تھا، بے شک تقیہ جائز تھا۔ مگر فتح مکہ کے بعد جب کہ اسلام و مسلمین طاقتور ہو گئے تھے، یہ حکم منسوخ ہوگیا۔ لہٰذا اب ناجائز ہے۔ یہ شبہ فریب کاری عیاری کا شاہکار ہے، ورنہ معمولی عقل وفکر رکھنے والا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ کسی حکم کا منسوخ ہوجانا اور بات ہے اور کسی چیز کو کچھ عرصہ تک بوجہ عدم ضرورت استعمال میں نہ لانا چیزے دیگر است۔ یہ ٹھیک ہے

الناطق عن ابلیس فقد عبده و سئل الصادقؑ قول الله تعالیٰ و الشعراء یتبعهم الغاون قال هم القصاصون و قال النبیؐ من اتی

اور اگر لغویات اور شیطانی قصے بیان کر رہا ہے تو سننے والا بھی ابلیس کا عبادت گزار متصوّر ہوگا۔کسی نے امامؑ سے قولِ خداوندی و الشعراء یتبعهم الغاون (سورۃ شعراء:۲۲۴) کی تفسیر پوچھی ، آپؑ نے فرمایا: یہاں شاعروں سے مراد وہ لوگ ہیں جو عموماً جھوٹے قصے کہانیاں بیان کیا کرتے ہیں۔جناب رسولِ خداﷺ نے فرمایا جو

کہ فتح مکہ کے بعد ایک مرتبہ تقیہ کی ضرورت نہ رہی تھی۔کیونکہ اس وقت خوف نہ تھا۔مگر یہ کہنا کہ اس وقت تقیہ ہمیشہ کے لیے منسُوخ ہوگیا تھا، یہ خدا اور رسولؐ پر کھلم کھلا افترا ہے۔ظاہر ہے کہ کسی حکم کا نسخ بغیر نص صریح کے ثابت نہیں ہوسکتا۔ ارشادِ قدرت ہے: "ماننسخ من اٰیة او ننسها نات بخیر منها او مثلها" (بقرہ:۱۰۶) کہ ہم جب کوئی آیت منسُوخ کرتے ہیں تو اس کی مثل یا اس سے بہتر ناسخ آیت لاتے ہیں۔

علامہ سیوطی اپنی تفسیر اتقان جلد ۲ صفحہ ۲۴ پر رقمطراز ہیں: "انما یرجع فی النسخ الی نقل صریح عن رسول الله صلعم او عن صحابی یقول" الخ۔ یعنی نسخ کے سلسلہ میں جناب رسولِ خداﷺ یا ان کے کسی صحابی کی روایت صریح پر اعتماد کیا جاسکتا ہے جب کہ ناسخ آیت بھی موجود ہو، بلکہ یہاں تک تصریح کردی ہے کہ: "و لا یعتمد فی النسخ علی قول عوام المفسرین بل و لا اجتهاد المجتهدین من غیر نقل صحیح"۔ نسخ کے بارے میں عوام مُفسّرین کا قول بلکہ ائمہ مُجتہدین کا اجتہاد بھی کافی نہیں ہے، جب تک کہ نقل صریح موجود نہ ہو(صفحہ ۲۴) بنا بریں ہم نے اس کے جواز کے دلائل تو قرآن و حدیث سے ذکر کردیے ہیں اگر مدعی نسخ میں ہمت ہے تو اس کے منسُوخ ہونے پر کوئی نص قرآنی پیش کرے، ورنہ اس طرح بلا دلیل قرآنی دعویٰ کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔

تیسرا شبہ اور اس کا جوابؑ

اگر تقیہ جائز تھا تو پھر حضرت امام حسین علیہ السلام نے میدانِ کربلا میں کیوں تقیہ نہ کیا؟ اور اپنا سب گھر بار راہِ خدا میں اعلاء کلمۃ الحق کے لیے کیوں قربان کردیا۔ آپ کے بیعت یزید نہ کرنے سے معلُوم ہوتا ہے کہ تقیہ جائز نہیں ہے۔ یہ شبہ بھی حقیقت الامر کو نہ سمجھنے پر مبنی ہے، ورنہ کوئی حقیقت بین اور معاملہ شناس آدمی یہ اعتراض نہیں کرسکتا۔ اگرچہ اس شبہ کے جواب میں الزاماً اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ اگر تقیہ جائز نہ ہوتا تو حضرت امیرالمومنینؑ خلافت شیخین کے وقت اور حضرت امام حسن مجتبیٰؑ صلح معاویہ کے وقت اس پر عمل نہ کرتے۔ مگر چونکہ اس طرح خدشہ ہے کہ ایک ظاہر بین ائمہ طاہرینؑ

ذا بدعة فوقره فقد سعی فی هدم الاسلام و اعتقادنا فیمن خالفنا فی شئ واحد من امور الدین کاعتقادنا فیمن خالفنا فی جمیع امور الدین۔	شخص کسی بدعتی انسان کے پاس جائے اور جا کر اس کی تعظیم وتکریم کرے تو اس نے (ارکان) اسلام کے گرانے کی کوشش کی۔ ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جو شخص دین (برحق) کی باتوں میں سے کسی ایک بات میں بھی ہمارا مخالف ہے وہ ان لوگوں کی مانند ہے جو ہمارے دین کی تمام باتوں میں ہمارے مخالف ہیں۔

کے افعال میں اختلاف کا خیال فاسد کرے۔ حالانکہ ان کے افعال واقوال میں فی الحقیقت کوئی اختلاف نہیں ہوتا، لہٰذا اس امر کی قدرے وضاحت کر دی جاتی ہے۔

تقیہ کی اقسام:

اصل حقیقت بیان کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ متن رسالہ میں جو یہ مذکور ہے کہ تقیہ واجب ہے۔ یہ امر علی الاطلاق صحیح نہیں ہے، بلکہ بنا بر تحقیق محققین تقیہ احکام خمسہ پر منقسم ہوتا ہے۔ بعض اوقات واجب ہوتا ہے، بعض اوقات حرام، بعض اوقات راجح یعنی مُستحب ہوتا ہے، بعض اوقات مرجوح ومکروہ اور بعض اوقات فقط مباح ہوتا ہے۔ بنابریں ہم کہتے ہیں کہ خواہ حضرت امیر علیہ السلام کا بوقت خلافت شیخین تقیہ ہو، یا جمل وصفین کی جنگ، اسی طرح حضرت امام حسنؑ کی پہلے جنگ ہو یا بعد میں صلح، خواہ امام حسینؑ کا جہاد ہو یا امام زین العابدینؑ کی قید وبند، حضرت امام محمد باقرؑ و امام جعفر صادقؑ کی خانہ نشینی ہو یا امام موسیٰ کاظمؑ کی قید، یا امام رضاؑ کی ولی عہدی (وھلم جرا) یہ سب حفاظت دین اور حراستِ شریعت سید المرسلینؐ کے مختلف مظاہر ہیں۔ مقصد ومآل سب کا ایک ہی ہے۔ حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

ائمہ طاہرینؑ کے افعال میں ظاہری اِختلاف کی وجہ

یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ حالات کے بدلنے سے ایک ہی مقصد کے حاصل کرنے کے طور وطریقے بدلتے رہتے ہیں۔ سرورِ کائنات ﷺ کے انتقال پُرملال کے وقت اسلام داخلی وخارجی دشمنوں کے نرغہ میں گھرا ہوا تھا، اگر اس وقت جناب امیرؑ اپنا حق خلافت حاصل کرنے کے لیے شمشیر بکف ہو کر میدان میں اتر آتے تو دار الخلافت میں خانہ جنگی کی وجہ سے اسلام مٹ جاتا، جیسا کہ آپ خود فرماتے ہیں: "ان لم انصر الاسلام و اھلہ لاری فیہ ثلما" لخ۔ میں نے دیکھا کہ اگر میں اس وقت اسلام اور مُسلمانوں کی خاموش رہ کر نصرت و امداد نہ کروں تو اسلام میں ایسا رخنہ پڑ جائے گا کہ اس کا

صدمہ مجھے خلافت کے چھن جانے سے بھی زیادہ ہوگا۔ (نہج البلاغہ)

معلوم ہوا کہ اس وقت دین کی بقا تقیہ کر کے بساطِ صبر پر بیٹھنے میں تھی۔ ہاں جب ظاہری خلافت جناب کو مل گئی، اور آپ کو اصلاحِ احوال کرنے کا موقع دستیاب ہو گیا اور بعض شرپسند عناصر نے راستے میں روڑے اٹکانے کی مذموم حرکت شروع کر دی تو اس وقت دین کی فلاح و بہبودی ایسے عناصر کی سرکوبی کرنے میں تھی۔ اس لیے جنگ جمل، صفین اور نہروان ظہور میں آئیں۔ اسی طرح جب حضرت امیرؑ کی شہادت کے بعد حضرت امام حسنؑ مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو امیر شام نے سازشوں کے جال بچھانے شروع کر دیے اور اپنی ریشہ دوانیاں تیز سے تیز تر کر دیں۔ امام عالی مقامؑ نے اس کو درمیان سے ہٹانے کے لیے ظاہری کوششیں کیں مگر اس نے بڑے بڑے لطائف الحیل سے آپ کے فوجی جرنیلوں کو ورغلا کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ حتی کہ نوبت بایں جا رسید کہ عین حالت نماز میں آنجنابؑ پر حملہ کر دیا گیا اور جناب کے خیمہ میں جو کچھ مال و اسباب تھا حتی کہ وہ سجادہ جس پر آپ نماز پڑھ رہے تھے لوٹ لیا گیا اور جناب کی رانِ مبارک زخمی کر دی گئی۔ اس کے باوجود امیر شام آپ کو حسب دلخواہ شرائط پر صلح کی پیش کش بھی کر رہا تھا۔ اندریں حالات آنجنابؑ نے دین کی بقاء اور اپنے نام لیواؤں کی فلاح اور مسلمانوں کی صلاح اسی امر میں دیکھی کہ تقیہ کر کے معاویہ سے صلح کر لیں۔ یہ امور تاریخ اسلام کے ایسے مسلمہ حقائق ہیں کہ کوئی شخص ان کی تکذیب نہیں کر سکتا۔ انہی حقائق کے پیشِ نظر منصف مزاج علمائے اہل سنت یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ: "اللہ تعالیٰ اس بات کا گواہ ہے کہ ہمارے امام و شہزادے نے اپنی خوشی کے ساتھ یہ خلافت معاویہ کو نہیں دی بلکہ مجبوری سے آپ نے دیکھا کہ میرے ساتھی لوگ در پردہ معاویہ سے سازش رکھتے ہیں اور امیر معاویہ جنگ پر تلا ہوا ہے...... (الحان قال) آپ معاویہ کو ظالم و غاصب جانتے تھے اور ہرگز خلافت کا مستحق نہیں جانتے تھے۔ (انوار اللغۃ پ ۱۶ صفحہ ۱۱۹ از علامہ وحید الزمان مترجم صحاح ستہ)

سرکار سید الشہداءؑ کا معاملہ اپنے بزرگوں سے مختلف تھا

مگر امام حسین علیہ السلام کی حالت ان سب سے جدا تھی۔ ان کے سابقہ بزرگوں کے وقت اگرچہ دین میں بہت کچھ تغیر و تبدل شروع ہو گیا تھا۔ مگر پھر بھی نماز روزہ وغیرہ ظاہری احکام اسلام بہت حد تک بحال تھے۔ اور ان پر عمل بھی ہو رہا تھا۔ لیکن جناب سید الشہداءؑ کو جس شقی ازلی یعنی یزید عنید سے واسطہ پڑا تھا، وہ علانیہ شارب الخمر و تارک الصلوٰۃ و ناکح المحارم اور شعائر الاسلام کی ہتک حرمت کرنے والا تھا۔ (تاریخ الخلفاء سیوطی وغیرہ) بلکہ کھلم کھلا طور پر اپنے کفر کا اظہار بایں طور کرتا تھا: ؎

بنو ہاشم بالملك   فلا خبر جاء و لا وحی نزل

(تذکرۃ خواص الامۃ وغیرہ)

اس لیے وہ دین اسلام کو مٹانے کا تہیہ کر چکا تھا۔ ان حالات میں تو اہل سنت کے اصول کے مطابق بھی امام حسینؑ کے لیے اعلاء کلمۃ الحق کی خاطر جہاد واجب تھا۔ شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی لکھتے ہیں: "اذا کفر الخلیفۃ بانکار ضروری من ضروریات الدین حل قتالہ بل وجب فصار قتالہ من الجھاد فی سبیل اللہ" لخ...... جب کوئی خلیفہ ضروریاتِ دین میں سے کسی چیز کا انکار کرنے کی وجہ سے کافر ہو جائے تو اس وقت اس سے جنگ کرنا جائز بلکہ واجب ہو جاتا ہے۔ اور یہ جنگ کرنا جہاد فی سبیل اللہ میں شمار ہو جاتا ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۳۳۶) لہٰذا اگر اس وقت جناب سید الشہداء تقیہ پر عمل پیرا ہو جاتے تو دین اسلام مٹ جاتا۔ اور ان کے جد نامدارؐ پدر عالی مقدارؑ اور برادر بزرگوارؑ بلکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاءؑ خالق کردگار کی مساعی جمیلہ و جہود جلیلہ پر پانی پھر جاتا۔ ایسے حالات میں تقیہ کا واجب ہونا تو درکنار جائز بھی نہیں، بلکہ حرام ہے۔ لہٰذا جناب امام حسینؑ کس طرح تقیہ کر سکتے تھے؟ امام عالی مقام سے بڑھ کر کون شخص معاملہ شناس ہو سکتا ہے، وہ سمجھتے تھے کہ اس وقت دین خدا کی بقاء اور شریعتِ مصطفویہ کی اصلاح آپ کی شہادتِ عظمیٰ میں مضمر ہے۔ اسی لیے جناب نے فرما کر کہ: ؎

ان کان دین محمد لم یستقم   الا بقتلی یا سیر فخذینی

تن من دھن کی بازی لگا دی اور اپنے تمام اعزہ و انصار کو راہ خدا میں شہید کرا کے اسلام کو زندہ جاوید بنا دیا۔ ؎

سر داد نہ داد دست در دستِ یزید   حقا کہ بنائے لا الٰہ ہست حسینؑ

حضرت سید الشہداء اور ان کے پیشرووں میں ایک ظاہری فرق یہ بھی نمایاں تھا کہ ان بزرگواروں کو خلفائے وقت کی طرف سے برابر صلح کی پیش کش کی جاتی تھی۔ مگر جناب سید الشہداء کے لیے دو ہی راستے تھے۔ بیعتِ یزید یا شہادت۔ لہٰذا بیعت کرنے میں دین جاتا تھا، اور نہ کرنے میں جان جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب معاملہ کی نزاکت اس حد تک پہنچ جائے تو ایسے حالت میں قانونِ شریعت کے مطابق دین کی بقاء کا انتظام کرنا واجب و لازم ہوتا ہے۔ لہٰذا فرض شناس امام علیہ السلام نے وہی کچھ کیا جو ان کو کرنا چاہیے تھا۔ ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن   خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ان حقائق سے روزِ روشن کی طرح واضح و آشکار ہو گیا کہ جناب سید الشہداء کے جہاد کو تقیہ کے

عدم جواز کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایسا اعتراض وہی لوگ کرتے ہیں جو بات سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے، ورنہ الحال تغنی عن المقال۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ: ؎

اذا لم تکن للمرء عین صحیحة　　فلا عز و ان یرتاب و الصبح سفر

ایضاح:

مذکورہ بالا حقائق سے واضح ہوگیا کہ تقیہ کا جواز بالکل بے غبار ہے، بلکہ یہ اس شریعت مقدسہ اسلامیہ کے محاسن ومحامد میں داخل ہے۔ اس کے جواز کا انکار سراسر جہالت و ضلالت ہے، جو کسی دیندار انسان کا شیوہ و شعار نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ لوگ اس کو محل بے محل استعمال کر کے اسے عامۃ الناس کی نظروں میں معیوب بنا دیں۔ ع "ہر سخن جائے و ہر نکتہ مقامے دارد"

ایسے سہل انگیز اور آرام پسند حضرات کے لیے محقق قلمکار جناب محمد سلطان صاحب مرزا مرحوم کا یہ افادہ آویزہ گوش بنانے کے قابل ہے۔ موصوف لکھتے ہیں: "یہ ہوتا آیا ہے کہ انسان کے ہاتھوں میں اچھی سے اچھی شے بگڑ جاتی ہے اور تقیہ اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل شیعہ اپنے تئیں شیعہ کہنے سے گریز کرتے ہیں۔ فقط اس وجہ سے کہ شاید اگر ان کا شیعہ ہونا معلوم ہو جائے تو ان کے افسر اور پبلک ان کو بری نگاہ سے دیکھیں گے اور جو شیعہ افسران ہیں وہ شیعہ افراد کو ان کا حق دینا بھی پسند نہیں کرتے تاکہ لوگوں کی نگاہوں میں وہ غیر جانبدار سمجھے جائیں (حالانکہ ان کی اس ملازمت کی وجہ جواز ہی یہی ہے کہ ابنائے ملت کو فائدہ پہنچائیں (شارح) اس کو وہ تقیہ کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ تقیہ نہیں ہے، ان کو نہ جان کا خوف ہے اور نہ قانوناً شیعہ ہونے سے ان کو نقصان پہنچتا ہے۔ غیر شیعہ ان کو غیر جانبدار ہونے کا لقب دینے کے بجائے صحیح طور سے بزدل اور حریص سمجھتے ہیں۔ اور وہ ایسا سمجھنے میں حق بجانب بھی ہیں۔ ایسے لوگوں نے تقیہ کو بدنام کیا ہے"۔ انتہیٰ کلامہ (فلسفہ اسلام حصہ دوم)

وھو جید متین

معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات یہ حقیقت فراموش کر چکے ہیں کہ ؎

حوادث کے طوفاں سے دامن بچانا　　علیؑ کے غلاموں کی عادت نہیں ہے

وفقنا اللہ لما یحب و یرضیٰ [1]

---

[1] باقی جن امور کا مصنف علامؒ نے اس باب میں اجمالی تذکرہ کیا ہے ان پر سیر حاصل تبصرہ دیکھنے کے لیے ہمارے رسالہ اصلاح المجالس والمحافل یا مقدمہ سعادۃ الدارین کی طرف رجوع کیا جائے۔ (منہ عفی عنہ)

باب الاعتقاد

فی العلویۃ

قال الشیخ ابوجعفرؒ اعتقادنا فی العلویۃ انھم آل رسول اللہ و ان مؤدتھم واجبۃ لانھا اجرالرسالۃ قال اللہ تعالیٰ قل لا اسئلکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربیٰ و الصدقۃ علیھم محرمۃ لانہ اوساخ ما فی ایدی الناس و طھارۃ لھم الا صدقتھم لعبید ھم و امائھم

اکتالیسواں بابؒ

اولادِ علی کے متعلّق اعتقاد

حضرت شیخ ابو جعفر علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کی اولاد امجاد کے بارے میں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ یہ آلِ رسولؐ ہیں اور ان کی مودت و محبت تمام مُسلمانوں پر واجب ہے ۔ کیونکہ وہ اجر رسالت ہے جیسا کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: اے رسولؐ (جو لوگ مال کی پیشکش کر رہے ہیں) ان سے کہہ دو میں تبلیغ رسالت کے سلسلہ میں تم سے کوئی مزدوری نہیں مانگتا سوائے اس کے کہ میرے قرابتداروں سے محبّت کرو (سورۃ شوریٰ: ۲۳) صدقہ چونکہ لوگوں کے ہاتھوں کی میل کچیل ہوتا ہے اور ان کے لیے باعث طہارت (باطنی) ہوتا ہے اس لیے وہ ان (سادات) پر حرام کر دیا گیا ہے ۔ مگر اولادِ رسولؐ میں بعض کا صدقہ بعض پر نیز ان کا صدقہ ان کے غلاموں اور کنیزوں پر حلال ہے ۔

اِکتالیسواں بابؒ

ساداتِ کرام کے متعلّق اِعتقاد کا بیان

اس باب میں حضرت مُصنّف علامؒ نے اجمالاً چند امور ذکر کیے ہیں جن پر تفصیلاً تو ہم بھی تبصرہ نہیں کر سکتے، ہاں بقدر ضرورت ان امور کی ذیل میں کچھ وضاحت کی جاتی ہے ۔

اولادِ علیؑ اولادِ نبیؐ ہیں

یہ مذہب جعفریہ کا مُسلمہ نظریہ ہے اور بہت سے علماء اہل سنت بھی ہمارے ہم خیال ہیں کہ اولادِ علیؑ اولادِ نبیؐ ہیں ۔ فریقین کی روایات اور قرآنی آیات اس دعویٰ کی حقانیت پر دلالت کرتی ہیں ۔

اس امر پر پہلی دلیل :

ایک مرتبہ عباسی خلیفہ مامون الرشید نے حضرت امام رضا علیہ السلام سے دریافت کیا کہ آپؑ

و صدقة بعضهم علی بعض و اما الخمس فانه یحل لهم عوضا عن الزکوٰة لانهم قد منعوا منه و اعتقادنا فی المسیٔ منہم ان علیه ضعف العقاب و فی المحسن منہم ان له ضعف الثواب و بعضهم اکفاء بعض لقول النبی حین نظر الی بنی ابی طالبؑ علیؑ و جعفرؑ الطیار قال بناتنا کبنینا و بنونا کبناتنا و قال الصادقؑ من خالف دین الله و تولی اعدائه

چونکہ مال زکوٰۃ ان پر حرام ہے۔ اس لیے اس کے عوض میں مال خمس اولادِ رسولؐ کے لیے حلال قرار دیا گیا ہے۔ سادات کے بارے میں ہمارا یہ بھی اعتقاد ہے کہ جو شخص ان میں سے بدعمل ہوگا اس کو بہ نسبت غیر سادات کے دوگنا عذاب ہوگا اور ان میں سے جو نیکوکار ہوگا اسے دوگنا ثواب ملے گا۔ سادات کرام آپس میں ایک دوسرے کے کفو اور ہمسر ہیں۔ اس امر کی تائید پیغمبر اسلامؐ کے اس فرمان سے ہوتی ہے جو آپؐ نے جناب ابوطالبؑ کی اولاد یعنی حضرت علیؑ اور جناب جعفر طیارؑ کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا تھا۔ ہماری بیٹیاں ہمارے بیٹوں کے مثل اور ہمارے بیٹے ہماری بیٹیوں کی مانند ہیں۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: جو شخص دین خدا کی مخالفت کرے اور دشمنانِ خدا سے محبّت کرے۔

کے اولادِ رسولؐ ہونے پر قرآنی دلیل کیا ہے؟ جس سے یہ ثابت ہو کہ بیٹی کی اولاد بھی بمنزلہ حقیقی اولاد کے ہوتی ہے؟ آپؐ نے فرمایا: اس دعویٰ کی صداقت پر یہ آیت دلالت کرتی ہے۔ ارشادِ قدرت ہے:

وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِہٖ دَاوٗدَ وَ سُلَیۡمٰنَ وَ اَیُّوۡبَ وَ یُوۡسُفَ وَ مُوۡسٰی وَ ہٰرُوۡنَ ؕ وَ کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۸۴﴾ وَ زَکَرِیَّا وَ یَحۡیٰی وَ عِیۡسٰی وَ اِلۡیَاسَ ؕ کُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۸۵﴾ (سورۃ انعام)

اس آیہ مبارکہ میں خداوند عالم نے حضرت عیسیٰؑ کو ذریت حضرت ابراہیمؑ سے شمار کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا یہ انتساب اپنی والدہ ماجدہ کی ہی طرف سے ہے۔ یہ اتنی مضبوط دلیل ہے کہ مامون جیسا فاضل عربیت اس کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ (ہفتم بحار)

دوسری دلیل:

فریقین کی بکثرت روایات میں وارد ہے کہ جناب رسولِ خداؐ نے فرمایا: "ان الله جعل ذریة کل نبی فی صلبه و جعل ذریتی فی صلب علی بن ابی طالبؑ" (الشرف المؤبد للنبہانی وصواعق محرقہ صفحہ ۲۳۹ طبع جدید) خداوند عالم نے ہر نبی کی اولاد اس کی پشت سے قرار دی ہے مگر میری ذریت جناب علیؑ بن ابی طالبؑ کی صلب سے مقرر فرمائی ہے۔

او عادی اولیاء الله فالبرائة منه واجبة کائنا من کان من ای قبیلة کان و قال امیرالمومنینؑ لابنه محمد بن الحنفیة تواضعك فی شرفك اشرف لك من شرف أبائك و قال الصادقؑ و لایتی لامیر المومنینؑ احب الیّ من ولادتی منه وسئل الصدقؑ عن آل محمد فقال آل محمد من حرم علی رسول الله نکاحه و قال	یا خدا تعالیٰ کے اولیاء سے دشمنی رکھے۔ اس سے بیزاری اختیار کرنا واجب ہے۔ وہ کوئی بھی ہو اور جس قوم اور قبیلہ سے ہو۔ حضرت امیر علیہ السلام نے اپنے فرزند محمد بن حنفیہؒ سے فرمایا: تمہارا وہ شرف جو تواضع وانکساری سے حاصل کردہ ہو اس سے بہتر ہے جو تم کو اپنے باپ دادا کی نسبت سے حاصل ہو۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کی ولایت کا اعتقاد رکھنا مجھے ان کی اولاد میں سے ہونے سے زیادہ محبوب ہے۔ حضرت صادق آلِ محمد علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ آلِ رسولؐ سے کون لوگ مراد ہیں فرمایا: جن میں رسولِ خدا کے لیے نکاح کرنا حرام ہے۔

صواعق محرقہ صفحہ ۷۵ او ۷۶ اپر آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد بایں الفاظ مذکور ہے: "کل نبی انثی ینتمون الی عصبتھم الا ولد فاطمة فانی ولیھم و انا عصبتھم و انا ابوھم"۔ ہر عورت کی اولاد اپنے پدری رشتہ داروں کی طرف منسوب ہوتی ہے، سوائے (حضرت) فاطمہؑ کی اولاد کے کہ میں ان کا سرپرست، پدری رشتہ دار اور باپ ہوں۔

تیسری دلیل:

آنحضرت ﷺ نے جناب امام حسن وحسین علیہما السلام کو متعدد بار ابن (فرزند) کے لفظ کے ساتھ یاد کیا ہے۔ جیسے جناب امام حسن علیہ السلام کے بارے میں یہ فرمایا: "ابنی ھذا سید" میرا یہ بیٹا سردار ہے۔ (صواعق محرقہ صفحہ ۱۹۰) دونوں شہزادوں کے متعلق ارشاد فرمایا: "ھذان ابنائی و ابناء بنتی اللھم انی احبھما فاحبھما۔ (ترمذی جلد ۲ صفحہ ۲۱۸) یہ دونوں میرے بیٹے اور میری بیٹی کے بیٹے ہیں۔ بارِ الٰہا! میں ان سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان سے محبت کر۔ نیز ان کے متعلق فرمایا: "ابنای ھذان الحسن و الحسین سیدا شباب اھل الجنة"۔ (صواعق محرقہ صفحہ ۱۸۹ طبع جدید) اسی طرح متعدد احادیث میں اس خانوادۂ عصمت وطہارت پر لفظ "ذریت، اہل بیت، ولد" کا اطلاق کیا گیا ہے۔ جس سے ہمارا مدعا ثابت ہوتا ہے۔ نیز ملائکہ کا بحکمِ خدائے عزوجل امام حسینؑ کو ابن رسولؐ کہنا بھی کتب میں مذکور ہے۔ چنانچہ صواعق محرقہ صفحہ ۱۹۰ طبع جدید پر لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے

عز و جل و لقد ارسلنا نوحا و ابراھیم و جعلنا فی ذریتھما النبوۃ و الکتاب فمنھم مھتد و کثیر منھم فاسقون و سئل الصادقؑ عن قول اللہ عز و جل ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا فمنھم ظالم لنفسہ و منھم مقتصد و منھم	خداوند عالم فرماتا ہے ہم نے نوحؑ اور ابراہیمؑ کو رسول بنا کر بھیجا اور ان کی اولاد میں نبوت اور کتاب قرار دی۔ ان میں سے بعض تو ہدایت یافتہ ہیں۔ مگر ان میں سے اکثر فاسق و فاجر ہیں (سورۃ حدید:۲۶) حضرت صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر پوچھی گئی کہ خلاقِ عالم فرماتا ہے: پھر ہم نے ان لوگوں کو اپنی کتاب کا وارث قرار دیا ہے جنھیں ہم نے اپنے تمام بندوں سے چن لیا ہے۔ ان میں سے بعض تو اپنے آپ پر ظلم کرنے والے ہیں، بعض میانہ رو۔

فرمایا: آج میرے پاس ایک ایسا فرشتہ آیا ہے جو اس سے قبل کبھی نہیں آیا تھا۔ یہ مجھے خبر دیتا ہے: "ان ابنك هذا حسینا مقتول"۔ کہ آپ کا یہ بیٹا حسینؑ شہید کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ جب تک مجاز کی دلیل نہ ہو الفاظ اپنے حقیقی معنوں پر محمول ہوتے ہیں۔

آلِ رسولؐ کی محبّت واجب و لازم ہے

اس سلسلہ میں جو آیت مؤدۃ (سورۃ شوریٰ:۲۳) حضرت مُصنّف علامؒ نے پیش فرمائی ہے وہ اس مدعا پر بطور نص صریح دلالت کرتی ہے۔ اگرچہ اس کا ظاہری نزول حضرات معصومینؑ کے حق میں ہے چنانچہ تفسیر کشاف جلد ۳ صفحہ ۴۰۲ طبع مصر پر لکھا ہے کہ جب یہ آیۂ مبارکہ نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے بارگاہِ رسالت میں عرض کیا: "من قرابتك هولاء الذین وجبت علینا محبتھم یا رسول اللہ؟" یا رسول اللہؐ! آپؐ کے وہ قرابتدار کون ہیں جن کی محبت ہم پر واجب کی گئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: "ھم علیؑ و فاطمۃ و ابناھما" (کذا فی تفسیر درمنثور و تفسیر جامع البیان و تفسیر الخازن و المدارك و الحقانی و رُوح المعانی وغیرھا) مگر بالتبع اس میں تمام ساداتِ کرام داخل ہیں۔

صواعق محرقہ صفحہ ۲۲۶ طبع جدید پر جناب امیرؑ سے مروی ہے، فرمایا: "فینا اھل البیت فی الرحم أیته لا یحفظ مودتنا الا کل مومن ثم قرء قال لا اسئلکم علیه اجرا الا المودة فی القربیٰ"۔ آلِ رسولؐ کی محبّت کے وجوب اور اس کی فضیلت کے متعلق احادیثِ رسولؐ حد شمار سے باہر ہیں۔ بطور تبرک یہاں چند احادیث لکھی جاتی ہیں:

① "من مات علیٰ حب الِ محمّد مات شهیدا"۔ جو شخص آلِ محمدؐ کی محبّت پر مرجائے وہ شہادت کی

سابق بالخیرات باذن الله قال الظالم لنفسه هنا من لم یعرف حق الامامؑ و المقتصد من عرف حقه و السابق بالخیرات باذن الله هو الامامؑ و سئل اسماعیل اباه الصادقؑ قال ما حال المذنبین منا فقال لیس بامانیکم و لا امانی اهل الکتاب من یعمل سوء یجزبه

اور بعض خدا کے حکم سے نیکیوں کی طرف سبقت کرنے والے ہیں (سورۃ الفاطر: ۳۲) امام علیہ السلام نے فرمایا: اس آیت میں ظالم سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے امام برحق کے حق کی معرفت نہیں رکھتا اور مقتصد (میانہ رو) سے مراد وہ شخص ہے جو امامؑ کے حق کو پہچانتا ہو اور بحکمِ خدا نیکیوں میں سبقت کرنے والے سے مراد خود امامؑ ہیں۔ جناب اسماعیل نے اپنے والد ماجد جناب امام جعفر صادقؑ سے دریافت کیا کہ ہم میں سے جو لوگ گنہگار ہیں ان کا انجام کیا ہوگا؟ فرمایا: تمھاری اور اہل کتاب کی آرزوئیں پوری نہیں ہوسکتیں۔ جو شخص بھی برے کام کرے گا اسے اس کی سزا

موت مرتا ہے۔

۲) "من مات علیٰ حب آلِ محمّد مات مغفورًا"۔ جو شخص آلِ محمدؐ کی محبّت کی مرے اس کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔

۳) "من مات علیٰ حب آلِ محمّد مات مومنا مستکمل الایمان"۔ جو شخص محبّت اہل بیتؑ پر مرے وہ کامل الایمان ہوکر مرتا ہے۔

۴) "من مات علیٰ حب آلِ محمّد بشرہ ملك الموت بالجنة ثم منکر و نکیر"۔ جو شخص مُحبّ اہل بیتؑ پر مرے پہلے اسے ملک الموت اور پھر مُنکر و نکیر جنّت کی بشارت دیتے ہیں۔
(تفسیر کشاف جلد ۳ صفحہ ۴۰۳)

نیز ان احادیث سے بھی محبّت کا وجوب ثابت ہوتا ہے جن میں اہل بیتؑ کی عداوت و دشمنی کو حرام اور اسے باعث دخولِ جہنم قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا:

۵) "من ابغض احدا من اهل بیتی حرم شفاعتی"۔ (صواعق محرقہ صفحہ ۲۳۷) یعنی جو شخص میرے اہل بیتؑ سے بُغض رکھے گا وہ میری شفاعت سے محروم رہے گا۔

۶) "من مات علیٰ بغض آلِ محمد جاء یوم القیامة مکتوب بین عینیه آئس من رحمة الله"۔ جو شخص میرے اہل بیتؑ سے بُغض رکھے گا وہ بروزِ قیامت اس حال میں آئے گا کہ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان لکھا ہوگا: "رحمتِ خدا سے مایوس ہے"۔ (صواعق محرقہ صفحہ ۲۳۷)

و لا یجد من دون الله ولیا و لا نصیرا و قال ابوجعفر فی حدیث طویل لیس بین الله و بین احد قرابة ان احب الخلق الی الله اتقیہم لها و اعملهم بطاعة الله و الله ما یتقرب العبد الی الله عزو جل الا بالطاعة ما معنا برائة من النار و لا علی الله لاحد من حجة من کان لله مطیعا فهو لنا ولی و من کان لله عاصیا فهو لنا

دی جائے گی۔ اور وہ اپنے لیے خدا کے سوا کوئی ناصر و مددگار نہیں پائے گا۔ ایک طویل حدیث میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: خدا اور اس کی مخلوق کے درمیان کسی قسم کی کوئی رشتہ داری نہیں ہے۔ تمام مخلوقات میں وہی شخص خدا کو زیادہ محبوب ہے جو سب سے زیادہ اس سے ڈرتا ہے اور سب سے زیادہ اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرتا ہے۔ خدا کی قسم! خدا کی بارگاہ میں بغیر اس کی اطاعت و بندگی کے کوئی شخص بھی اس کا تقرب حاصل نہیں کرسکتا۔ ہمارے پاس دوزخ سے نجات حاصل کرنے کا کوئی پروانہ نہیں ہے اور نہ ہی کسی کے پاس خدا کے بالمقابل کوئی حجّت ہے۔ جو شخص خدا کا اِطاعت گزار ہے وہ ہمارا دوست ہے اور جو خدا کا نافرمان ہے وہ ہمارا

---

⑦ نیز تفسیر کشاف جلد ۳ صفحہ ۴۰۳ پر ہے: "من مات علی بغض آلِ محمد مات کافرا"۔ جو شخص بغض اہل بیتؑ پر مرے وہ کفر کی موت مرتا ہے۔

⑧ "من مات علیٰ بغض آلِ محمد لم یشم رائحة الجنة"۔ جو شخص بغض آلِ محمد پر مرے گا وہ جنّت کی خوشبو بھی نہیں سونگھ سکے گا۔

⑨ نیز فرمایا: "اربعة انا شفیع لهم یوم القیامة و لو اتوا بذنوب اهل الارض معین اهل بیتی و القاضی لهم حوائجهم عند ما اضطروا الیه و المحب لهم بقلبه و لسانه و الدافع عنهم بیده"۔ (عیون الاخبار، وصواعق محرقہ صفحہ ۲۳۷) چار شخص ایسے ہیں کہ اگرچہ تمام اہل زمین کے برابر گناہوں کا بوجھ لے کر بھی میرے پاس آئیں جب بھی میں ان کی ضرور شفاعت کروں گا ایک وہ جو میرے اہل بیتؑ کی اعانت و امداد کرے، دوسرا وہ جو ان کے اضطراب کے وقت ان کی حاجتیں برلائے، تیسرا وہ جو قلب و زبان سے ان کے ساتھ محبّت کرے، چوتھا وہ جو ہاتھ سے ان کی طرف سے دفاع کرے۔

⑩ "من لایحضرہ الفقیہ" میں جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا کہ: جب قیامت کا روز ہوگا تو جناب رسالت مآب کی طرف سے ندا آئے گی: جس جس آدمی کا مجھ

عدو و لا تنال و لا تینا الا بالورع و العمل الصالح و قد قال نوحؑ رب ان ابنی من اھلی و ان وعدك الحق و انت احکم الحاکمین قال یا نوحؑ انه لیس من اھلك انه عمل غیر صالح فلا تسئلن ما لیس لك به علم انی اعظك ان تکون من الجاھلین	دشمن ہے۔ ہماری ولایت اور دوستی حرام سے بچنے اور عمل صالح بجالانے کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے بارگاہِ خدا میں عرض کیا: اے پالنے والے! یہ میرا بیٹا میرے اہل میں سے ہے۔ اور تیرا وعدہ برحق ہے اور تو تمام حاکموں سے بڑا حاکم اور فیصلہ کرنے والا ہے۔ خداوند عالم نے فرمایا: اے نوحؑ! یہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بدعمل ہے تو دیکھو جس چیز کا تمھیں علم نہیں ہے اس کے متعلق مجھ سے سوال نہ کرو۔ میں تمھیں پند و نصیحت کرتا ہوں کہ کہیں تم جاہلوں میں سے نہ ہوجاؤ۔ (سورۃ ہود: ۴۵ و ۴۶)

پر کوئی احسان ہو آج مجھ سے آکر اس کا عوض لے لے۔ لوگ عرض کریں گے: ہمارے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ ہمارا آپؐ پر کس طرح احسان ہوسکتا ہے، بلکہ آپؐ کا ہم پر احسان ہے۔ آپؐ فرمائیں گے: میری مراد یہ ہے کہ "من اویٰ احدا من اھل بیتی او برھم او کساھم من عری او اشبع جائعھم"۔ جس شخص نے میرے اہل بیتؑ میں سے کسی کو پناہ دی ہو، یا ان میں سے کسی سے کوئی نیکی کی ہو، یا ان میں سے کسی عریان کو کپڑے پہنائے ہوں، یا ان میں سے کسی بھوکے کو کھانا کھلایا ہو وہ کھڑا ہوجائے اور مجھ سے اپنا عوض لے۔ اس وقت کچھ لوگ اٹھیں گے اور اپنے اپنے خدمات کا ذکر کریں گے۔ اس وقت بارگاہِ احدیت سے ندا آئے گی: "یا محمد یا حبیبی! اسکنھم الجنة حیث شئت"۔ میرے حبیب محمدؐ! جنت میں جہاں چاہو ان کو ٹھہراؤ۔ اس وقت آنحضرت ﷺ ان کو جنت کے ایک عالی مقام بنام "وسیلہ" میں ٹھہرائیں گے، جہاں ان اہل ایمان اور آنحضرت ﷺ اور ان کی اہل بیتؑ کے درمیان کوئی حجاب نہ ہوگا۔ ؎

من لم یکن علویا حسین تنسبه　　　فما له فی قدیم الدھر مفتخر

ایک اِشتباہ کا ازالہ

اوپر ہم نے جو احادیث بیان کی ہیں ان میں سے بعض احادیث اگرچہ فقط ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے ساتھ خاص ہیں مگر اکثر احادیث عام ذریت رسولؐ کو شامل ہیں، جو یقیناً غیر معصوم ہیں۔ ان میں نیکوکار بھی ہیں اور بدکار بھی۔ مگر بعض کم توفیق اور کوتاہ اندیش حضرات یہ کہتے ہیں کہ گنہگار

قال رب اعوذبك ان اسئلك ما ليس لى به علم و ان لم تغفر لى و ترحمنى اكن من الخاسرين و سئل الصادقؑ عن قول الله عز و جل و يوم القيامة ترى الذين كذبوا على الله وجوههم مسودة اليس فى جهنم مثوى للمتكبرين قال من زعم انه

حضرت نوحؑ نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! میں ایسی بات کا سوال کرنے سے جس کا مجھے علم نہیں ہے تیرے حضور میں پناہ مانگتا ہوں۔ اگر تو نے میرے حال پر رحم نہ کیا اور معافی نہ دی تو میں ضرور خسارا پانے والوں میں سے ہو جاؤں گا (سورۃ ہود: ۴۷) حضرت صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر پوچھی گئی: جن لوگوں نے خدا پر جھوٹ بولا ہے روزِ قیامت تم دیکھو گے کہ ان کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ کیا متکبر لوگوں کا ٹھکانا جہنم نہیں ہے (سورہ زمر: ۶۰) امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا کہ اس سے وہ شخص مراد ہے جو امامت کا دعویٰ کرے

سادات کی تعظیم وتکریم کا شرعاً کوئی حکم نہیں ہے، بلکہ بعض لا ابالی قسم کے لوگ تو ایسے گنہگار افراد کی سیادت میں بھی شک وشبہ کرنے لگتے ہیں اور اس سلسلہ میں حضرت نوحؑ اور ان کے ناخلف فرزند والا واقعہ پیش کیا کرتے ہیں۔

اس توہم فاسد کا جواب یہ ہے کہ اربابِ بصیرت جانتے ہیں کہ عمل بد کرنے سے سلسلہ نسب منقطع نہیں ہوتا۔ قرآن شاہد ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے بارگاہِ رب العزت میں اپنی ذریت کے اندر عہدۂ امامت باقی رکھنے کی استدعا کی تھی کہ: "ومن ذریتی" تو جواب ملا تھا: "لا ینال عھدی الظالمین" (سورۃ بقرہ: ۱۲۴) اے ابراہیمؑ! تیری ذریت میں سے جو لوگ ظالم ہوں گے ان کو میرا عہدۂ امامت نہیں ملے گا۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ظالم اولاد ذریت ابراہیمؑ میں داخل تو رہے گی، ہاں عہدۂ امامت ان کو نہیں مل سکے گا۔

اسی طرح ارشادِ خداوندی ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۶﴾ (سورۃ الحدید: ۲۶)

ہم نے جناب نوحؑ و ابراہیمؑ کو رسالت دے کر بھیجا اور ان کی ذریت میں نبوت و کتاب کو برقرار رکھا۔ پس ان کی ذریت میں سے بعض ہدایت یافتہ اور اکثر فاسق و فاجر ہیں۔

امام و لیس بامام قیل و ان کان علویاً قال و ان کان علویاً فاطمیاً و قال الصادق لاصحابه لیس بینکم و بین من خالفکم الا المضمر قیل فای شئ المضمر قال الذی تسمونه	حالانکہ امام نہ ہو۔کسی نے عرض کیا: اگر چہ وہ جھوٹا مدعی امامت علوی بھی ہو؟ فرمایا: اگر چہ وہ علوی ہونے کے ساتھ ساتھ فاطمی بھی کیوں نہ ہو۔ حضرت نے اپنے اصحاب سے فرمایا: تمہارے اور تمہارے مخالفین کے درمیان صرف مُضمر کا ہی فرق ہے۔ عرض کیا گیا وہ مُضمر کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: مُضمر وہی چیز ہے جسے تم برائت کے نام سے یاد کرتے ہو۔

یہ آیت بھی اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ بدعمل بھی ذریت میں داخل ہو سکتے ہیں۔

اسی طرح آیت مبارکہ "منہم ظالم لنفسه و منهم مقتصد و منهم سابق بالخیرات" (سورۃ فاطر: ۳۲) کی تفسیر میں وارد ہے کہ پہلی قسم ظالم سے مراد گنہگار سادات ہیں۔

اسی طرح جناب رسولِ خدا کا یہ فرمان بھی گنہگاروں کی سیادت اور ان کی تعظیم وتکریم کے لزوم پر دلالت کرتا ہے: "اکرموا اولادی الصالحین لله والطالحین لی"۔ میری اولاد کی عزت کرو اگر نیکوکار ہوں تو خدا کے لیے اور اگر بدکار ہوں تو میرے لیے۔ (بحارالانوار جلد ۱، جامع الاخبار)

بدعقیدہ ہونے سے شرفِ سیادت ختم ہو جاتا ہے

حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کے قصہ میں یہ قیاس کرنا کہ گناہ کرنے سے انسان شرفِ سیادت سے محروم ہو جاتا ہے، بالکل غلط ہے۔ البتہ اس واقعہ سے اس مطلب پر استدلال کیا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص بدعقیدہ ہو جائے اور اپنے معصوم آباء و اجداد کے مذہب کو ترک کر دے تو اس سے یہ شرف سلب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ نوحؑ کے بیٹے کا فقط یہ جرم نہ تھا کہ وہ نماز روزہ وغیرہ فروعِ دین کا پابند نہ تھا بلکہ وہ اصولی طور پر بھی شریعت نوحؑ کا منکر تھا۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کا یہ ارشاد اس پر دلالت کرتا ہے: "یا بنی ارکب معنا و لا تکن من الکافرین" (سورۃ ہود: ۴۲) لہٰذا قرآن مجید میں اس کے متعلق جو وارد ہے کہ "انه عمل غیر صالح" (سورۃ ہود: ۴۶) اس سے مقصود یہی ہے کہ اس کا اعتقاد غلط تھا۔ اسی بناء پر ہم ایسے نام نہاد سادات کو کسی شرف و فضیلت کا اہل نہیں سمجھتے جو ائمہ طاہرینؑ کے مذہب حق کے قائل نہیں، بلکہ دشمنانِ دین اور ائمہ طاہرینؑ کے مخالفین کے ساتھ عقیدت و محبت رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعظیم وتکریم تو بجائے خود ان سے برائت و بیزاری اختیار کرنا واجب ہے۔ اس طرح وہ کسی اکرام واحترام کے حق دار نہیں رہتے۔ جیسا کہ اس قسم کے متعدد احادیث متن

بالبرائة و من خالفکم و جاوزه فابرؤا منه و ان کا علویا فاطمیا و قال الصادقؑ لاصحابه فی ابنه عبدالله انه لیس علی شئ مما انتم علیه و انی ابرأ منه برأ الله عزوجل منه

جو شخص مذہب میں تمھارا مخالف ہو اور (مذہب حق سے) تجاوز کر جائے، تم اس سے بیزاری اختیار کرو، اگر چہ وہ علوی اور فاطمی ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح آپ نے اپنے بیٹے عبداللہ (افطح) کے بارے میں اپنے اصحاب سے فرمایا: جس مذہب پر تم لوگ ہو، یہ اس پر نہیں ہے۔ میں اس سے بیزار ہوں۔ خدا بھی اس سے بیزار ہو۔

رسالہ اعتقادیہ میں درج ہیں اور اس کی تائید مزید حضرت امام رضا علیہ السلام کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے جو وسائل الشیعہ میں مذکور ہے کہ آپ نے فرمایا: "النظر الی ذر یتنا عبادة قلت هل النظر الی الائمة عبادة او النظر الی جمیع ذر یة النبی صلی الله علیه و آله فقال النظر الی جمیع ذر یة النبیؐ عبادة مالم یفارقوا منهاجه"۔ "ہماری ذریت کی طرف نگاہ کرنا عبادت ہے۔ راوی نے عرض کیا: فقط ائمہؑ کی طرف نگاہ کرنا عبادت ہے یا تمام اولادِ رسولؐ کی طرف دیکھنا عبادت ہے؟ فرمایا: تمام ذریت رسولؐ کی طرف دیکھنا عبادت ہے۔ جب تک وہ آنحضرتؐ کے منہاج و مذہب سے خارج نہ ہو جائیں"۔

بنابریں جو لوگ بدعقیدہ اور مذاہب باطلہ کے پیروکار ہیں اور پھر دعوائے سیادت بھی کرتے ہیں، وہ کسی قسم کی تعظیم و تکریم کے حق دار نہیں ہیں۔ اس طرح ان کا یہ شرف ختم ہو جاتا ہے۔ مگر جو حضرات من حیث الاعتقاد مذہب حق کے قائل ہیں، ہاں عملی طور پر ان سے کچھ فروگزاشتیں ہو جاتی ہیں، ان کی تعظیم و تکریم بہر حال لازم ہے اور ان کے حقوق کی رعایت واجب ہے۔ ایسے حضرات کی حالت بلاتشبیہ بداعمال والدین جیسی ہے۔ جس طرح والدین اگر چہ غیر صالح ہوں مگر ان کا احترام بہر حال ملحوظ رکھنا لازم ہوتا ہے۔ یہی کیفیت غیر صالح سادات کی ہے کہ بوجہ انتساب الی النبیؐ والائمہؑ بہر حال ان کا احترام ملحوظ رکھنا واجب ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

بعض ایسے سادات بھی گزرے ہیں جیسے جناب زید اور ان کے فرزند یحییٰ، جعفر وغیر ہم۔ جنھوں نے ائمہ حق کے بالمقابل اپنی امامت کا دعویٰ کیا، تو کیا ایسے لوگوں کی تعظیم و تکریم بھی لازم ہے؟

اس کے متعلق گزارش ہے کہ اگر چہ ایسے سادات کی مذمت میں جنھوں نے ائمہ طاہرینؑ کے بالمقابل دعوائے امامت کیا، بکثرت روایات وارد ہیں اور ائمہ طاہرینؑ نے ایسے لوگوں سے بیزاری

ظاہر فرمائی ہے اور دوسرے لوگوں کو بھی ان سے بیزاری اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ ان روایات کا شمہ اسی رسالہ اعتقادیہ میں مذکور ہے۔ لیکن تاہم حزم واحتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ چونکہ یہ ائمہ کرام اوران مُسلّم الثبوت سادات عظام کا جن کی سیادت میں کلام نہیں ہوسکتا، داخلی معاملہ ہے۔ اس لیے ہمیں اس سلسلہ میں خاموشی اختیار کرنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ ائمہ طاہرینؑ نے ان کو اپنے حقوق معاف کردیے ہوں، بلکہ آثار سے ایسا ہی ہونا مترشح ہوتا ہے۔ چنانچہ جناب زید اور جناب جعفر وغیرہ کے متعلق ایسی روایات مل جاتی ہیں۔ چنانچہ احتجاج طبرسی میں مروی ہے کہ امام زمانہ سے چند مسائل دریافت کیے گئے۔ جن میں سے ایک مسئلہ سید جعفر کے متعلق بھی تھا۔ آپؑ نے جواب میں فرمایا: "واما عمی جعفر و بنوه فسبیله سبیل اخوة یوسف" یعنی میرے چچا جعفر اوران کے بیٹوں کا معاملہ برادرانِ یوسف والا ہے۔ اس سے علماء نے یہی سمجھا ہے کہ جس طرح ابتدا میں برادرانِ یوسف سے بہت کچھ لغزشیں واقع ہوئی تھیں۔ مگر بالآخر توفیق الٰہی ان کے شامل حال ہوئی اور وہ تائب ہوئے۔ چنانچہ حضرت یوسفؑ نے ان کو معاف کرتے ہوئے فرمایا: "لا تثریب علیکم الیوم یغفر اللہ لکم" (سورۃ یوسف: ۹۲) تم پر کوئی حرج نہیں۔ خدا تمھیں معاف کرے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سادات کا خاتمہ بھی یقیناً توبہ پر ہوا ہوگا۔ ان شاء اللہ۔ اسی طرح جناب زید کی مدح میں بھی مُتعدّد روایات وارد ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ فی الحقیقت انھوں نے اپنی امامت کا کوئی دعویٰ ہی نہیں کیا تھا۔ (بحار الانوار، سفینۃ البحار وغیرہ) اسی لیے جناب جعفر کو "جعفر تواب" کہا جاتا ہے۔ بنابریں کم ازکم غیر سادات کو تو چاہیے کہ وہ ان کو بہرحال برائی کی بجائے اچھائی کے ساتھ یاد کریں۔

ہمارے اس بیان کی تائید امام عالی مقامؑ کے فرمان سے ہوتی ہے۔ کتاب سفینۃ البحار جلد ۲ صفحہ ۵۴ پر بروایت ابی سعید مکاری موجود ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ ہم امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ بعض نے جناب زید کو برے لفظوں کے ساتھ یاد کیا۔ "فانتہرہ الامام و قال مہلا لیس لکم ان تدخلوا فیما بیننا الا بسبیل خیر"۔ امام عالی مقام نے اس کو جھڑک دیا اور فرمایا: خبردار! تمھیں ہمارے داخلی معاملات میں بجز خیر وخوبی کے دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

صحیح النسب سادات کا تائب ہوکر مرنا

بعض اخبار و آثار سے واضح و آشکار ہوتا ہے جو صحیح النسب سید ہوں اور کسی وقت کسی بد اعتقادی یا بدعملی میں مُبتلا ہوئے ہوں تو توفیق الٰہی ضرور ان کے شامل حال ہوتی ہے اور وہ بالآخر

تائب ہوکر دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔

چنانچہ سفینۃ البحار جلد ۲ صفحہ ۲۵۴ پر مذکورہ بالا روایت کے ذیل میں جناب امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: "انہ لم یمت نفس منا الا و تدرکہ السعادۃ قبل ان تخرج من الدنیا و لوبفواق ناقۃ"۔ "ہمارے خاندان میں سے کوئی شخص نہیں ہوتا مگر یہ کہ سعادتِ الٰہی ضرور اس کے شامل حال ہوجاتی ہے۔ اگرچہ اس کی موت میں اتنا وقت باقی ہو کہ جتنا ناقہ کے دو مرتبہ دودھ دوہنے کے درمیان ہوتا ہے"۔

اسی طرح سفینۃ البحار جلد ۲ صفحہ ۲۵۴ اور تاریخ قم میں جناب احمد بن اسحاق (وکیل حضرت امام حسن عسکری) اور سید حسین قمی کا جو واقعہ مذکور ہے، اس سے بھی اس امر کی تائید مزید ہوتی ہے۔ اس واقعہ کا اجمالی بیان یہ ہے کہ جناب احمد مذکور سادات کرام کی بہت خدمت اور ان کا بہت اکرام و احترام کرتے تھے۔ انہی سادات قم میں سے ایک سید حسین قمی بھی تھے۔ جناب احمد کو معلوم ہوا کہ سید موصوف شراب پیتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ان کا مشاہرہ بند کردیا اور جب سید حسین ان کی ملاقات کے لیے حاضر ہوئے تو جناب احمد نے ان کو ملاقات کا وقت نہ دیا۔ وہ مایوس ہوکر واپس چلا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب جناب احمد حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے اور اس سے فراغت کے بعد مدینہ منورہ میں امامؑ کے دولت سرا پر حاضر ہوئے تو امام عالی مقام نے ملاقات سے انکار کردیا۔ اور فرمایا: اگر تمھارے پاس ہماری اولاد کی ملاقات کے لیے وقت نہیں تو ہمارے پاس بھی تمھاری ملاقات کے لیے وقت نہیں ہے۔ (اتفاقاً کسی طرح جب شرفِ زیارت حاصل ہوا تو) جناب احمد نے معذرت کرتے ہوئے عرض کیا کہ میں نے تو محض اس لیے ان کے ساتھ یہ سلوک کیا تھا کہ وہ شراب خواری کی عادتِ بد میں مُبتلا تھے۔ امام علیہ السلام نے فرمایا: "ولکن لا بد من اکرامھم و احترامھم علی کل حال و ان لا تحقرھم و لا تستھین بھم لانتسابھم الینا فتکون من الخاسرین"۔ جو کچھ بھی ہو ہر حال میں سادات کا اکرام واحترام لازم ہے اور ہرگز کبھی ان کو حقیر نہ سمجھو اور نہ ان کی توہین وتذلیل کرو۔ کیونکہ ان کی نسبت ہماری طرف ہے، ورنہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوجاؤ گے۔

جب جناب موصوف واپس قم پہنچے اور ملاقات کے لیے اصحاب واحباب آئے تو ان میں سید حسین قمی بھی تھے۔ اب کی مرتبہ خلافِ توقع جناب احمد نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ اپنے پاس بٹھایا، بڑی توجہ سے مزاج پُرسی کی۔ جب دوسرے لوگ اٹھ کر چلے گئے تو سید موصوف نے جناب احمد سے دریافت کیا کہ یا تو میرے لیے ملاقات کا وقت بھی نہ تھا، اور یا آج یہ لطف و مدارا

اس کی وجہ کیا ہے ۔ جناب احمد نے حقیقت الامر کے اظہار میں قدرے توقف کیا ۔ مگر سید صاحب کے اصرار پر انھوں نے وہ تمام ماجرا بیان کر دیا جو سید صاحب کے بارے میں ان کے اور امام علیہ السلام کے درمیان گزرا تھا ۔ سید صاحب سُن کر زار و قطار رونے لگے اور کہا کہ ہم اعمالِ بد کا ارتکاب کرتے ہیں مگر ہمارے بزرگوں کو پھر بھی ہمارا اس قدر پاس ولحاظ ہے ۔ یہ کہہ کر اٹھے اور گھر جا کر شراب کے برتن وغیرہ توڑ ڈالے اور ایسی توبۃ النصوح کر لی کہ عابد و زاہد بن گئے ۔ ان حقائق سے واضح ہو گیا کہ صحیح النسب سادات کرام ابتدائی ایام میں جس قدر بد عقیدہ یا بد اعمال ہوں مگر وہ بالآخر ضرور تائب ہو کر دنیا سے رحلت کرتے ہیں ۔ اگر کوئی شخص باوجود مدعی سیادت ہونے کے آخری دم تک عقائد فاسدہ پر اڑا رہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ در حقیقت سید ہی نہیں ہے ۔ واللہ اعلم

آلِ رسولؐ پر صدقہ حرام ہے

اس امر میں تمام مُسلمانوں کا اتفاق ہے، اور اس صدقہ سے مراد زکوٰۃ و فطرہ ہے، نہ کہ مستحبّی صدقات وخیرات اور عقیقہ وغیرہ ۔ اور اس حرمت کی وجہ احادیث میں وہی بیان کی گئی ہے جو متن رسالہ میں مذکور ہے: "انہا اوساخ ایدی الناس" کہ یہ زکوٰۃ و فطرہ لوگوں کے ہاتھوں کی میل کچیل ہے ۔ خداوند عالم نے سادات کی عظمت کے پیشِ نظر ان کو اس ذلت و رسوائی سے محفوظ رکھا ہے ۔ اس امر میں سادات وغیر سادات کے درمیان مساوات مُطلقہ کے قائل حضرات کے لیے لمحۂ فکریہ اور تازیانۂ عبرت موجود ہے ۔ "ولکن ما اکثر العبر وا قل الا عتبار" بلکہ جس طرح بادشاہوں اور شہزادوں کے اصل مال سے حصص مقرر ہوتے ہیں، اسی طرح سادات کے لیے بھی اصل مال کا پانچواں حصّہ مقرر کیا گیا ہے ۔ جسے خمس کہا جاتا ہے ۔ مگر افسوس اکثر مُسلمانوں نے سادات کو اپنے اس جائز حق سے محروم کر دیا ۔ غیر سادات کا فطرہ و زکوٰۃ پہلے ہی سادات پر حرام تھی اور خمس امت رسولؐ نے بند کر دیا اور جو وجوب کے قائل بھی ہیں، ان میں بہت سے لوگ باقاعدگی کے ساتھ اسے ادا نہیں کرتے اور جو نکالتے بھی ہیں وہ اسے صحیح مصرف میں صرف نہیں کرتے ۔ اس لیے اب سادات کرام کا خدا ہی حافظ و ناصر ہے ۔ کیونکہ ؏

یہ ہی تھے دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

یہی وجہ ہے کہ آج ساداتِ کرام کی اکثریت نان شبینہ کی محتاج نظر آتی ہے اور مُسلمانوں کی دینی حمیّت اور مذہبی حرارت کو چیلنج کر رہی ہے ۔ اللھم نبھنا من نومۃ الغفلۃ و الغرور

سادات کے لیے ثواب وعقاب دوگنا ہوتا ہے

ہم نے اوپر ساداتِ کرام کے جس قدر فضائل ومناقب بیان کیے ہیں، ان کی تعظیم وتکریم کے وجوب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اگرچہ "قطرہ از دریا ودانہ از انبار" کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سلسلہ میں اس سے کہیں زیادہ تاکیدی روایات موجود ہیں۔ مگر بموجب "کلمة حق یراد بها الباطل" ان احادیث سے یہ بھی نہیں سمجھنا چاہیے کہ نجات اخروی کا معاملہ بھی اسی طرح ہے کہ سادات جس طرح چاہیں شریعتِ مصطفویؐ کا تمسخر ومذاق اڑاتے پھریں۔ حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دیتے رہیں اور لوگوں کی عزتوں سے کھیلتے رہیں۔ وہ ضرور ہی بلا حساب جنت میں چلے جائیں گے اور بقول بعض جہال، گناہوں کی کثافت ونجاست ان کے ٹخنوں سے اوپر جاتی ہی نہیں۔ یہ زعم بالکل باطل اور قواعد شرعیہ کے مخالف ہے۔ اس طرح توبانی شریعت پر جنبہ داری اور کنبہ پروری کا الزام عائد ہوتا ہے۔ اور اغراء بالقبیح ایسے فعل شنیع کی ذمہ داری معاذ اللہ آنجنابؐ پر عائد ہوتی ہے جس سے ان کی ساحت عصمت وطہارت اجل وارفع ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک اخروی نجاح وفلاح کا تعلق ہے وہ صحت اعتقاد اور عمل صالح پر موقوف ہے۔ اس میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ امر مُسلماتِ قطعیہ میں سے ہے۔ ہاں اس سلسلہ میں سادات کو دیگر افرادِ امت سے یہ امتیاز ضرور حاصل ہے کہ ان کو نیکیوں پر دوگنا ثواب اور برائیوں پر دوگنا عذاب وعقاب ہوتا ہے۔ اس قسم کی بکثرت احادیث اصول کافی وغیرہ کتبِ مُعتبرہ میں مذکور ہیں اور یہ شرف انتساب کی وجہ سے ہے۔ اس میں کوئی امر قابلِ تعجب نہیں ہے۔ جب ازواجِ رسولؐ بوجہ سببی رشتہ داری کے اس قابل ہو سکتی ہیں کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: "یٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ" (سورة الاحزاب: ۳۲) اے نبیؐ کی بیبیو! تم اور عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اگر اللہ کی پرہیزگاری اختیار کرو۔ یعنی تمھارا مرتبہ بلند اور ثواب دوچند ہوگا۔ اس کے برعکس ناشائستہ اعمال بجالانے کی صورت میں قرآن ان کو یہ تہدید کرتا ہے: "یٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ" (سورة الاحزاب: ۳۰) اگر تم نے بد اعمال کیے تو تمھیں دوگنا عذاب کیا جائے گا۔ تو آنحضرت ﷺ سے نسبی رشتہ داری کی وجہ سے یہ امتیاز کیوں نہیں حاصل ہو سکتا؟

باب الاعتقاد

في الاخبار المفسرة والمجملة

قال الشيخ اعتقادنا في الاخبار المفسرة انه يحمل على المجمل كما قال الصادقؑ

بیالیسواں بابؒ

مجمل اور مُفسّر احادیث کے بارے میں اعتقاد

جناب شیخ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں جن احادیث میں تفصیلی احکام مذکور ہیں وہ مجمل احادیث کی تفسیر متصوّر ہوں گی اور مجمل احادیث کو ان پر محمول کیا جائے گا، جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے

بیالیسواں بابؒ

مجمل اور مُفسّر احادیث کے بارے میں اعتقاد

مجمل و مفصّل حدیث کی تعریف

جس طرح سند کے اعتبار سے متاخرین کے نزدیک حدیث کی دو قسمیں ہیں، خبر متواتر اور خبر واحد، اور پھر خبر واحد کے کئی اقسام ہیں۔ مثل صحیح، حسن، مؤثق اور ضعیف وغیر ہا۔ اسی طرح باعتبار معنی و مفہوم کے بھی اس کی چند قسمیں ہیں۔ جیسے محکم، متشابہ، عام و خاص، مُطلق و مُقیّد اور مجمل و مُفسّر وغیر ہا۔ مجمل اس حدیث کو کہتے ہیں جس سے مُتکلّم کی مراد واضح نہ ہو۔ اور مُفسّر و مفصّل اس روایت کو کہا جاتا ہے کہ جس میں کسی قسم کی کوئی معنوی پیچیدگی نہ ہو، بلکہ مُتکلّم کی مراد واضح و آشکار ہو۔

مجمل و مُفسّر احادیث کا حکم

یہ امر اپنے مقام پر مُحقّق و ثابت ہو چکا ہے کہ قرآن مجید کی طرح احادیث میں بھی عام و خاص، مُطلق و مُقیّد اور مجمل و مفصّل وغیرہ اقسام موجود ہیں۔ علم اصولِ فقہ میں یہ مطلب مبرہن کیا جا چکا ہے کہ عام و خاص مُطلق و مُقیّد اور مجمل و مفصّل میں فی الحقیقت کسی قسم کا کوئی اختلاف و تعارض نہیں ہوتا، بلکہ عام کو خاص پر، مُطلق کو مُقیّد پر اور مجمل کو مفصّل پر محمول کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اربابِ علم و عقل جانتے ہیں کہ خاص مُقیّد اور مفصّل آیات و روایات میں عام، مُطلق اور مجمل آیات و روایات کی تفسیر و توضیح کرتی ہیں۔ جیسا کہ وارد ہے: "الأيات يفسر بعضها بعضا"۔ بعض (مفصّل) آیات دوسری بعض (مجمل) آیات کی توضیح کرتی ہیں۔ اسی طرح وارد ہے: "الاحاديث يفسر بعضها بعضا" بعض

احادیث دوسری بعض کی تشریح کرتی ہیں۔ مثلاً اگر کوئی حاکم اپنے کسی ماتحت کو حکم دے کہ "اکرم العلماء" (علماء کا اکرام کرو) پھر یہ حکم دے کہ "لا تکرم الفساق منهم" (ان علماء میں سے جو فاسق ہیں ان کا اکرام نہ کرو) تو ظاہر ہے کہ ان دونوں حکموں میں ہرگز کسی قسم کا کوئی تعارض و تضاد نہیں ہے، بلکہ دوسرے حکم میں پہلے حکم کی وضاحت موجود ہے کہ ان علماء سے مراد جن کا اکرام کرنا ہے غیر فاسق علماء ہیں۔

مذکورہ بالا حقائق میں علماء اعلام کے درمیان ہرگز کوئی اختلاف نہیں ہے۔
اسی پر علماء کا عمل ہے، اور اسی طریقہ مرضیہ پر محاورات
عرفیہ کا دار و مدار ہے۔ لہٰذا اس امر کے
اثبات پر مزید کچھ ادلہ و براہین
پیش کرنے کی ضرورت
نہیں ہے۔
کیونکہ:

آنجاکه عیان است چه حاجت بیان است؟

☆

باب الاعتقاد

فی الحظر والاباحة

قال الشیخ اعتقادنا فی ذلك ان الاشیاء کلها مطلقة حتی یرد فی شئ منها نهی

تینتالیسواں باب

حرمت اور جواز کے متعلق عقیدہ

جناب شیخ ابوجعفر علیہ الرحمہ فرماتے ہیں اس بارے میں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ جب تک کسی چیز کے متعلق خدا کی طرف سے نہی وارد نہ ہو اس وقت تک تمام چیزیں جائز اور مباح سمجھی جائیں گی۔

تینتالیسواں باب

حرمت اور اباحت کے متعلق اعتقاد کا بیان

اس مسئلہ میں اختلافِ انظار

اس مسئلہ میں علمائے اصولیین واخباریین کے درمیان یہ معمولی سا اختلاف ہے کہ جن امور کے متعلق کوئی عمومی یا خصوصی نص وارد نہ ہو آیا ان کو مباح سمجھنا چاہیے یا حرام؟

خلاصہ کلام یہ کہ اس میں اختلاف ہے کہ آیا اشیاء میں اصل حرمت ہے یا اباحت؟ چنانچہ تمام علماء اصولیین اور بعض اخباریین اس مسئلہ میں جواز واباحت کے قائل ہیں۔ مگر اکثر اخباریین حضرات حظر وحرمت کے قائل ہیں۔

مُصنّف کے بیان کردہ نظریہ کی تائید مزید

حق یہ ہے کہ جن امور کے متعلق بالخصوص کوئی نص وارد نہ ہو ان کو مُطلق اور مباح ہی سمجھا جائے گا۔ اس مسئلہ میں علاوہ دیگر دلائل کے حضرت صادق علیہ السلام کا یہ ارشاد نص صریح ہے جو کہ من لایحضرہ الفقیہ وغیرہ کتب مُعتبرہ میں موجود ہے۔ فرمایا: "کل شئ مطلق حتی یرد فیه نهی"۔ ہر چیز اس وقت تک مباح ہے جب تک اس کے متعلق ممانعت وارد نہ ہو۔

اور یہی امر شریعتِ اسلامیہ سہلہ کا طغرائے امتیاز ہے اور یہی اس کے قوانین کلیہ و آئین جلیلہ کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔

ایک ضروری وضاحت

لیکن اس سلسلہ میں یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ یہ فیصلہ ان امور کے متعلق ہے جن کے حسن و قبح کو معلوم کرنے میں عقل مستقل نہ ہو۔ جیسے وہ عادی امور جن کے مصالح و مفاسد حالات و اشخاص کے بدلنے سے بدلتے رہتے ہیں اور اختلاف شرائع سے ان میں مناسب حال حکم و اصلاح اور ترمیم و تنسیخ ہوتی ہے۔ مگر وہ امور جن کے قبح پر عقل مستقل ہے، جیسے ظلم کرنا، جھوٹ بولنا اور چوری کرنا وغیرہ، تو اگرچہ ان امور کی حرمت پر کوئی نص وارد نہ بھی ہو تو بھی ان کو حرام ہی سمجھا جائے گا۔ ان کے جواز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ مسئلہ اشیاء کے حسن و قبح کو عقلی تسلیم کر لینے کے بعد
جیسا کہ اہل حق کا نظریہ ہے، مزید کسی
توضیح و تشریح کا محتاج
نہیں رہتا۔

فتدبر

باب الاعتقاد

في الاخبار الواردة في الطب

قال الشيخ اعتقادنا في الاخبار الواردة في الطب انها على وجوه منها ما قيل على هواء مكة والمدينة فلا يجوز استعماله في سائر الاهوية

چالیسواں بابؒ

طب کے متعلق واردشدہ احادیث کے بارے میں اعتقاد

حضرت شیخ صدوق علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان کی چند قسمیں ہیں۔ ان میں سے بعض تو ایسی ہیں جو صرف مکہ اور مدینہ کی ہوا کے مطابق ہیں، لہٰذا ان کو دوسرے ممالک کی آب و ہوا میں استعمال کرنا درست نہیں ہے۔

چالیسواں بابؒ

طب کے بارہ میں واردشدہ احادیث کے متعلق اعتقاد کا بیان

مرض وشفا کا مِن جانب اللہ ہونا

کئی آیات واحادیث میں وارد ہے کہ مرض اور شفا منجانب خدائے عزوجل ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کی زبانی وارد ہے: "واذا مرضت فهو يشفين" (سورۃ شعراء: ۸۰) میں جب مریض ہوتا ہوں تو خداوند عالم مجھے شفا عطا فرماتا ہے۔

علل الشرائع جلد ۲ صفحہ ۲۱۲ میں حضرت صادق علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: اگلے زمانہ میں طبیب کو معالج کہا جاتا تھا۔ اسے طبیب کہنے کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک بار حضرت موسیٰؑ نے بارگاہِ رب العزت میں سوال کیا: "یا رب ممن الداء" بارِالٰہا! مرض کس کی طرف سے ہے؟ "فقال منی" ارشاد ہوا: میری طرف سے۔ پھر پوچھا: "ممن الدواء" شفا کس کی طرف سے ہے۔ جواب ملا: میری طرف سے۔ حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا: "فما يصنع الناس بالمعالج" پھر لوگ معالج کے پاس کیوں جاتے ہیں؟ ارشاد ہوا: "يطيب بذالك انفسهم" اس سے ان کے نفوس خوش ہوجاتے ہیں۔ "فسمي الطبيب لذالك" حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: اس وجہ سے معالج کا نام طبیب رکھا گیا۔ ان امراض میں انسان کے لیے کئی جسمانی اور روحانی فوائد مُضمر ہوتے ہیں کہ جن کی وضاحت کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ مرض کو موت کا قاصد کہا گیا ہے۔ یہ کئی چھوٹے بڑے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے۔

و منها ما اخبربه العالم علی ماعرف من طبع السائل و لم ینغذ موضعه اذا کان اعرف بطبه منه و منها مادلسه المخالفون فی الکتب لتقبیح صورة المذهب عند الناس و منها ما وقع فیه سهو من ناقله و منها ما حفظ بعضه و نسی بعضه و ماروی فی العسل انه شفاء من کل داء فهو صحیح و معناه انه شفاء من کل داء بارد و ما روی فی الاستنجاء بالماء البارد لصاحب البواسیر فان ذالك ان کان بواسیره من حرارة و ما روی فی بادنجان

کچھ حدیثیں ایسی ہیں کہ ان میں امام نے کسی خاص مریض کی طبیعت کے مطابق دوا بتائی ہے اور اس سے آگے تجاوز نہیں فرمایا۔ اس لیے کہ آنجناب بہ نسبت خود مریض کے اس کے مزاج سے زیادہ واقف تھے اور بعض احادیث ایسی ہیں جنھیں مخالفین نے دھوکے سے کتابوں میں داخل کر دیا ہے تاکہ عام لوگوں کی نظروں میں مذہب حق کی صورت بگڑ جائے اور کچھ حدیثیں ایسی ہیں جن کو نقل کرنے والے راویوں سے سہو ہو گیا ہے۔ کچھ حدیثیں ایسی بھی ہیں جن کا کچھ حصّہ تو (راویوں کو) یاد رہا اور کچھ حصّہ فراموش ہو گیا۔ یہ جو شہد کے متعلق حدیث میں وارد ہے کہ وہ ہر مرض کے لیے شفا ہے، یہ حدیث صحیح ہے لیکن اس سے مراد یہ ہے کہ شہد میں ہر اس مرض کی شفا ہے جو سردی کی وجہ سے پیدا ہوا ہو۔ اسی طرح بواسیر کے متعلق حدیث میں وارد ہے کہ اس کے مریض کو ٹھنڈے پانی سے استنجا کرنا چاہیے تو یہ اس صورت میں ہے کہ جب یہ مرض گرم چیزوں کی وجہ سے پیدا ہوا ہو۔ اسی طرح بینگن کے متعلق جو وارد ہے کہ

اطباء کی طرف رجوع کرنے کا حکم

باوجودیکہ شفا خدا کی طرف سے ہے، اور اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے لیکن تاہم اس عالم اسباب میں طبیب کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ انوارِ نعمانیہ میں حضرت صادق علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: "ان نبیا من الانبیاء مرض فقال لا اتداویٰ حتی یکون الذی امرضنی هوالذی یشفینی فاوحی الله عزوجل لا اشفیك حتی تداوی"۔ ایک نبی بیمار ہوگئے، انھوں نے کہا: میں ہرگز علاج نہیں کروں گا، جب تک وہ ذات خود مجھے شفا نہ دے جس نے مجھے مریض کیا ہے۔ ارشادِ قدرت ہوا کہ میں اس وقت تک ہرگز تمھیں شفا نہیں دوں گا جب تک تم علاج نہیں کروگے۔ یہ بھی واضح ہے کہ علم طب بڑا جلیل القدر اور شریف علم ہے اور بطریق وحی والہام اس کی ابتداء ہوئی ہے۔ اطباء نے اسے انبیاء سے اور انبیاء نے خداوند عالم سے حاصل کیا ہے۔ جیسا کہ متن رسالہ کی روایت

من الشفا فانه فی وقت ادراك الرطب لمن یاكل الرطب دون غیره من سائر الاوقات و اما ادویة العلل الصحیحة من الائمةؑ فهی اٰیات القراٰن و سورة و الادعیة علی حسب ما وردت به الاثار بالاسانید القویة و الطرق الصحیحة و قال الصادقؑ كان فیما مضی یسمی الطبیب المعالج فقال موسیٰ بن عمران یا رب ممن داء قال منی و قال یارب ممن الدواء قال من عندی فقال فما یصنع الناس بالمعالج ؟ فقال یطیب بذلك

اس میں شفا ہے تو یہاں بھی یہ حکم خاص اس وقت کے لیے ہے جب کہ خرما پکنا شروع ہوا ہو اور مریض خرما کھائے۔ ہر وقت اور ہر شخص کے لیے نہیں ہے۔ البتہ بیماریوں کی صحیح دوائیں جو ائمہ اطہار علیہم السلام سے منقول ہیں وہ قرآن کی آیات اور سورتیں ہیں اور ایسی دعائیں جو کتب احادیث میں صحیح اور مستند طریقے سے وارد ہیں۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ گزشتہ زمانہ کے لوگ طبیب کو معالج کہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ بن عمران نے دربارِ خداوندی میں عرض کیا میرے پروردگار! بیماری کس کی طرف سے ہے؟ فرمایا میری طرف سے۔ پھر عرض کیا دوا کس کی طرف سے ہے۔ فرمایا وہ بھی میری طرف سے ہے۔ جناب موسیٰؑ نے عرض کیا تو پھر یہ لوگ معالج کے پاس جا کر کیا کرتے ہیں؟ فرمایا اس سے ان کے دل خوش ہو جاتے ہیں۔

بھی اس پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ حقیقت مرض اس کے علاج اور ہر ہر چیز کے خواص و آثار کا حقیقی علم بجز خالق اشیاء کے کسی اور کو ہو ہی نہیں سکتا۔ اگرچہ تجربہ کو بھی بہت حد تک اس میں دخل ہے مگر یہ بھی مسلّم ہے کہ دوا اسی وقت تاثیر کرتی ہے جب اسے اذنِ خداوندی ہوتا ہے، ورنہ تاثیر الٹی ہو جاتی ہے اور بجائے فائدہ کے نقصان پہنچ جاتا ہے۔ کما قیل: ؎

چوں قضا آید طبیب ابله شود روغنِ بادام خشکی می کند

حفظانِ صحت کے بعض زریں اصول

روحانی اطباء یعنی جناب رسولِ خداؐ اور ائمہ ہدیٰ علیہم السلام سے حفظانِ صحت کے بڑے زریں اصول مروی ہیں، جیسے یہ کہ: "المعدة بیت الداء" معدہ تمام امراض کا گھر ہے۔ "والحمیة راس کل دواء" اور کم خوری تمام دواؤں کی سرتاج ہے۔ حضرت امام رضا علیہ السلام سے مروی ہے، فرمایا: "لوان الناس قصدوا فی الطعام لاستقامت ابدانهم"۔ اگر لوگ طعام خوری میں میانہ روی اختیار کرتے تو ان کے بدن تندرست رہتے اور کبھی بیمار نہ ہوتے۔

انفسهم فسمی الطبیب طبیبا بذلك و اصل الطب التداوی و كان داؤد ینبت فی محرابه كل یوم حشیشة فتقول خذنی فانی اصلح لكذا و كذا فرای فی أخر عمره حشیشة تنبت فی محرابه فقال لها ما اسمك فقال انا الخروبیة فقال داؤد اخرب المحراب فلا ینبت فیه

اسی بنا پر معالج کو طبیب کہا جانے لگا اور لغت میں طب کے معنی دوا کرنے کے ہیں۔ روایت ہے کہ حضرت داؤدؑ کی عبادت گاہ کی محراب میں روزانہ ایک گھاس اگتی، قدرتِ ایزدی سے گویا ہوکر کہتی اے داؤد! مجھے حاصل کر لیجیے کہ میں فلاں فلاں مرض کے لیے کام آؤں گی۔ چنانچہ جناب داؤدؑ نے اپنی آخری عمر میں محراب میں ایک گھاس کو اگا ہوا دیکھ کر اس سے پوچھا کہ تیرا کیا نام ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میرا نام خروبیہ ہے۔ اس وقت حضرت داؤدؑ نے فرمایا بس میری محراب تباہ ہوگی۔

بعض روایات میں وارد ہے کہ ایک نصرانی طبیب جناب صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور آنجناب سے دریافت کیا: "یابن رسول الله! فی كتاب ربكم امر فی سنة نبیكم شئ من الطب" اے فرزند رسولؐ! کیا تمھارے رب کی کتاب یا تمھارے نبیؐ کی سنت میں طب کے متعلق بھی کچھ وارد ہے؟ فرمایا: "نعم اما م كتاب ربنا فقوله تعالیٰ كلوا و اشربوا و لا تسرفوا و اما سنة نبینا فقال صلی الله علیه و اله الحمیة من الاكل راس كل دواء و الاسراف فی الاكل رأس كل داء"۔ "ہاں! کتاب اللہ اور سنت نبویہ دونوں میں طب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ کتاب اللہ میں وارد ہے: کھاؤ پیو مگر اسراف نہ کرو۔ اور سنت نبویہ میں وارد ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: کم خوری تمام دواؤں کی اصل اور پرخوری تمام امراض کی جڑ ہے" (سورۃ الاعراف: ۳۱) نصرانی یہ سن کر یہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا: "والله ما ترك كتاب ربكم و لا سنة نبیكم شیئا من الطب لجالینوس" خدا کی قسم تمھارے رب کی کتاب اور تمھارے نبی کی سنت نے جالینوس کے لیے کچھ طب باقی نہیں چھوڑی۔ (انوارِ نعمانیہ)

طبِّ رُوحانی وجِسمانی

اسی طرح ان حکما کے روحانیین سے امراضِ جِسمانیہ سے شفا حاصل کرنے کے بڑے عمدہ روحانی اور جِسمانی معالجات و مداوات مروی ہیں۔ جِسمانی معالجات کا مُعتد بہ ذخیرہ طب الائمہ، طب الامام الصادق، طب الرضا اور زمزا لصحت وغیرہ رسائل شریفہ میں موجود ہے اور رُوحانی علاج آیات وسُوَرِ قرآنیہ اور ادعیہ مبارکہ کی شکل میں موجود ہے۔ از سرتا قدم تمام انسانی امراض کے متعلق ان بزرگوں سے آیات وادعیہ منقول ہیں اور اکثر و بیشتر مجرب بھی ہیں۔ ہاں یہ مقصد حاصل کرنے کے

شیٔ بعدہ و قال النبیؐ من لم یشفہ الحمد فلا شفاہ اللہ | اب اس کے بعد یہاں کوئی چیز نہیں اگے گی ۔ جناب رسولِ خداؐ نے فرمایا جس شخص کو سورہ حمد شفانہ دے اس کو خدا بھی شفانہ دے۔

لیے صدق مقال واکل حلال اور یقین کامل شرطِ اولین ہے۔ کما قیل: ؎

قرآن تو قرآن دعاؤں میں ہے تاثیر　　جو ہر جو نہیں کھلتے یہ عامل کی ہے تقصیر

ائمہ اطہارؑ کی تعلیم کردہ ادویہ سب لوگوں کے لیے مُفید ہیں

یہ رُوحانی طریقِ علاج، علاوہ ارزاں ہونے کے سب کے لیے یکساں مُفید بھی ہے، باقی رہے جِسمانی معالجات اور وہ دوائیں جو ائمہ طاہرینؑ سے مختلف امراض کے سلسلہ میں منقول ہیں، آیا وہ تمام ممالک اور تمام اشخاص کے لیے یکساں طور پر مُفید اور کارآمد ہیں یا اس میں ممالک کی آب وہوا اور افراد کے اختلاف امزجہ وطبائع کو کچھ دخل ہے کہ بعض افراد کے لیے مُفید اور بعض کے لیے غیر مُفید بعض ممالک کے لیے مُفید اور بعض کے لیے مضر ہیں؟ اس سلسلہ میں علمائے اعلام کے نظریات قدرے مختلف ہیں ۔ اگرچہ حضرت مُصنّف علامؒ کے اس سلسلہ میں افادات عمدہ ہیں اور متشکّکین حضرات کے رفع شکوک وشبہات کے لیے کافی ہیں، اور طبی نقطہ نگاہ سے بھی درست ہیں ۔ مگر ہمیں جناب محدث سید نعمت اللہ جزائری علیہ الرحمہ کی تحقیق انیق زیادہ پسند ہے ۔"و للناس فیما یعشقون مذاھب" چنانچہ یہ بزرگوار اپنی کتاب انوارِ نعمانیہ میں حضرت شیخ صدوق علیہ الرحمۃ والے بیان کردہ احتمالات ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"ولکن الحق ان فی بعض الاخبار ما یدل علی العموم مثل ما روی فی غیر واحد من الاحادیث من الاستشفاء و المداواۃ بالعسل لقولہ تعالیٰ فیہ شفاء للناس فان القرآن لم ینزل لخصوص بلد دون اخری و ح فالحق فی الجواب ھو ماورد عنھم علیھم السلام من انواع الدواء لانواع الامراض عام شامل للابدان و البلدان نعم ینبغی للمریض ان یتعاطی تلک الادو یۃ من عزائم القلب و صمیمہ و ان لا یتوھم من شیٔ منھا فانک قد تحققت ان من تطیر من شیٔ ضرہ ذلک الشیٔ و قد شاھدنا جماعۃ من الافاضل ممن ساعدھم و فور الاخلاص یتداوون فی خراسان بالادو یۃ المذکورۃ فی طب الائمۃ وغیرہ التی لو تداوی اھل تلک البلاد لنا لوامنھا انواع الضرر بزعمھم و حصل اولئک الافاضل الشفاء العاجل فلیس السبب الاما عرفت"

یعنی حق یہ ہے کہ بعض اخبار عموم (بلاد وعباد) پر دلالت کرتے ہیں جیسا کہ کئی حدیثوں میں شہد سے علاج کرنے کا ذکر ہے۔ کیونکہ ارشادِ قدرت ہے کہ اس میں لوگوں کے لیے شفا موجود ہے (سورۃ النحل :۶۹) ظاہر ہے کہ قرآن مجید کسی خاص شہر (یا کہ خاص فرد) کے لیے نازل نہیں ہوا۔ لہٰذا حقیقی جواب یہ ہے کہ ائمہ طاہرین علیہم السلام سے مختلف امراض کے لیے جو مختلف ادویہ وعلاج منقول ہیں، یہ تمام شہروں اور تمام لوگوں کو شامل ہیں۔ ہاں البتہ مریض کو چاہیے کہ ان ادویہ کو صدقِ دل اور یقین کامل کے ساتھ استعمال کرے اور ان کے استعمال کرنے میں کسی قسم کے ضرر ونقصان کا وہم و گمان بھی نہ کرے۔ کیونکہ انسان جس اچھی چیز کے متعلق بھی شگونِ بد لے لے، وہ اسے ضرر پہنچاتی ہے۔ ہم نے خود فضلاء کی ایک ایسی جماعت کو دیکھا ہے جس کا دامن نعمت اخلاص سے پُر تھا کہ وہ خراسان میں رہ کر ان ادویہ کے ساتھ اپنا علاج معالجہ کرتے تھے جو رسالہ "طب الائمہ" وغیرہ میں مذکور ہیں کہ لوگوں کے گمان کے مطابق اگر ان شہروں والے لوگ ان کو اِستعمال کریں تو انھیں کئی قسم کے ضرر ونقصان حاصل ہوں۔ مگر ان فضلاء کرام نے انہی ادویہ سے شفاء کامل حاصل کی ہے۔ اور یہ سب کچھ اسی یقین کامل کا نتیجہ ہے۔ انتھی کلامہ رفع فی الخلد مقامہ و ھو جوھر ثمین و بالقدر قمین۔

ولنعم ما قیل: ع

جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

باب الاعتقاد

فی الحدیثین المختلفین

قال الشیخ اعتقادنا فی الاخبار الصحیحة من الائمة انها موافقة لکتاب اللّٰه متفــقة المعانی غیر مختلفة لانه اماخوذة من طریق الوحی عن اللّٰه سبحانه و لوکانت من عند غیر اللّٰه لکانت مختلفة و لا یکون اختلاف ظواهر الاخبار الا لعلل مختلفة مثل ما جاء فی کفارة الظهار عتق وقبة و جاء فی خبر أخر اطعــام ستین مسکینا و کلها صحیحة فالصیام لمن لم یجد العتق و الاطعــام لمن لم یستطع الصیام و قد روی

پینتالیسواں بابؒ

دو مُختلف حدیثوں کے متعلّق اعتقاد

حضرت شیخ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ جو حدیثیں صحیح طرق و اسانید کے ساتھ ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے مروی ہیں وہ سب کی سب قرآن کے موافق ہیں اور معنوی طور پر وہ سب باہم مُتفق ہیں۔ ان میں کوئی باہمی اختلاف و تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ وہ بذریعہ وحی و الہام خداوند عالم سے ماخوذ ہیں۔ ہاں اگر وہ خدا کے علاوہ کسی اور کی جانب سے ہوتیں تو ان میں ضرورت اختلاف ہوتا اور جن احادیث میں ظاہری طور پر کچھ اختلاف پایا جاتا ہے تو اس کے مُختلف علل و اسباب ہیں۔ مثلاً "ظہار" کے کفارہ کے بارے میں ایک حدیث میں ایک بندہ آزاد کرنے کا حکم ہے۔ دوسری روایت میں دو ماہ کے متواتر روزے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اور تیسری حدیث میں ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا وارد ہے۔ (ان احادیث میں بظاہر اختلاف معلُوم ہوتا ہے) حالانکہ یہ تینوں احادیث اپنے اپنے مقام پر بالکل درست ہیں۔ روزے اس شخص پر واجب ہیں جسے آزاد کرنے کے لیے غلام نہ مل سکے۔ کھانا کھلانے کا حکم اس شخص کے لیے ہے جو روزہ رکھنے کی قدرت نہیں رکھتا۔

پینتالیسواں بابؒ

مُختلف حدیثوں کے بارے میں اِعتقاد کا بیان

حدیث کی تعریف: لغوی معنی کے اعتبار سے حدیث و کلام باہم مترادف ہیں اور اصطلاحِ محدثین میں بنابر مشہور حدیث اس چیز کا نام ہے جس میں قول یا فعل یا تقریر معصوم کی حکایت کی جائے۔

انه یتصدق بما یطیق و ذلك محمول علی من لم یقدر علی الاطعام و منها ما یقوم کل واحد منها مقام الأخر مثل ما جاء فی کفارة الیمین اطعام عشرة مساکین من اوسط ما تطعمون اهلیکم او کسوتهم او تحریر رقبة و من لم یجد فصیام ثلثة ایام فاذا ورد فی کفارة الیمین ثلثة اخبار احدها الاطعام و ثانیها الکسوة و ثالثها تحریر رقبة کان ذالك عند الجاهل مختلفًا و لیس بمختلف بل کل واحدة من هذه الکفارات تقوم مقام الاخری و فی الاخبار ما ورد للتقیة و روی عن سلیم بن قیس الهلالی

اور یہ بھی منقول ہے کہ وہ جتنی قدرت رکھتا ہے اتنا صدقہ دے دے۔ یہ حکم اس آدمی کے لیے ہے جو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ کچھ احادیث ایسی بھی ہیں کہ (بظاہر مُختلف معلوم ہوتی ہیں لیکن فی الحقیقت ان میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا بلکہ ایک حدیث دوسری حدیث کے قائمقام ہوجاتی ہے جیسے ”مخالفت قسم“ کے کفارہ کے متعلق وارد ہوا ہے کہ دس مسکینوں کو وہ اوسط درجے کا کھانا کھلاؤ جو تم اپنے اہل خانہ کو کھلاتے ہو، یا دس مسکینوں کو لباس پہناؤ، یا ایک بندہ آزاد کرو، اور جس کے پاس آزاد کرنے کے لیے غلام نہ ہو وہ تین روزے رکھ لے۔ کفارہ قسم کے سلسلہ میں یہ تین قسم کی احادیث وارد ہوئی ہیں۔ ایک میں کھانا کھلانے کا حکم ہے دوسری میں لباس پہنانے کا اور تیسری میں غلام آزاد کرنے کا۔ اب ایک جاہل آدمی کے نزدیک تو یہ حدیثیں باہم مختلف ہیں، حالانکہ درحقیقت ان میں قطعاً کوئی اختلاف نہیں ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان تین کفاروں میں سے جو بھی ایک ادا کردیا جائے گا وہ باقی دو کفاروں کے قائم مقام ہوجائے گا۔ اور کچھ حدیثیں ایسی بھی ہیں جو حالتِ تقیہ میں وارد ہوئی ہیں۔ اس اختلاف کا ایک اور خاص سبب بھی ہے۔ چنانچہ سلیم بن قیس ہلالی کا بیان ہے کہ:

محدثین کے نزدیک ”خبر“ بھی مجازاً اسی معنی میں استعمال ہوتی ہے، بلکہ سنت کو جس کے اصلاحی حقیقی معنی قول یا فعل یا تقریر معصومؑ کے ہیں، بعض اوقات حدیث کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے (ہدیۃ المحدثین)

ابتدائے اسلام میں لوگ حافظہ کے زور سے زبانی حدیثیں یاد کرکے بیان کرتے تھے۔ مگر مرورِ ایام سے اس کی تدوین و ترویج شروع ہوگئی۔ اس سلسلہ کی ابتدا پہلی صدی ہجری میں ہی ہوگئی تھی اور بعد میں تو اس فن نے بڑی اہمیت حاصل کی اور اسلام میں بڑے بڑے جلیل القدر محدث اور حافظ الحدیث بزرگ پیدا ہوئے اور یہ امر خصائص اسلام میں شمار ہوتا ہے۔ دوسرے ملل و مذاہب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

انه قال قلت لامیر المومنینؑ انی سمعت من سلمان و مقداد و ابی ذر شیئا من تفسیر القرآن و من الاحادیث من النبیؐ غیر ما فی ایدی الناس و سمعت منك تصدیق ما سمعت منهم و رأیت فی ایدی الناس اشیاء کثیرة من تفسیر القرآن و من الاحادیث عن النبیؐ انتم مخالفون فیها و تزعمون ان ذلك کله باطل افتری الناس یکذبون علی رسول اللهؐ متعمدین و یفسرون بآرائهم قال فقال علیؑ قد سئلت فافهم الجواب فان فی ایدی الناس حقا و باطلا و صدقا و کذبا و ناسخا و منسوخا و خاصا و عاما و محکما و

میں نے جناب امیرالمومنین علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ میں نے سلمان، مقداد اور ابوذر رضوان اللہ علیہم سے بعض آیات کی ایسی تفسیر اور جناب رسالت مآبؐ کی بعض ایسی احادیث سنی ہیں جو دوسرے لوگوں کی تفسیر و احادیث کے مخالف ہیں اور پھر میں نے آپؑ سے ان ہر سہ حضرات کی روایات کی تصدیق سنی ہے۔ نیز میں نے لوگوں کے پاس تفسیر قرآنی اور احادیث نبویہ کا ایک ذخیرہ دیکھا ہے جس کی آپ حضرات مخالفت کرتے ہیں۔ اور آپ کا یہ خیال ہے کہ یہ سب کا سب ذخیرۂ تفسیر و حدیث غلط اور باطل ہے۔ کیا ان لوگوں نے عمداً جناب رسالت مآبؐ پر جھوٹ بولا ہے، اور قرآن کی تفسیر بالرائے کی ہے؟ راوی (سلیم بن قیس) بیان کرتا ہے کہ حضرت امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا: اے سلیم! جب تم نے سوال کیا ہے تو اس کا جواب سمجھنے کی کوشش کرو۔ لوگوں کے پاس جو کچھ موجود ہے اس میں حق بھی ہے اور باطل بھی، سچ بھی ہے اور جھوٹ بھی۔ ناسخ بھی ہے اور منسوخ بھی، خاص بھی ہے اور عام بھی اور محکم بھی ہے اور متشابہ بھی۔

فن حدیث کی فضیلت

حقیقت یہ ہے کہ علوم اسلامیہ میں سے علم حدیث بہت ہی عظیم الشان اور جلیل القدر علم ہے اور اس میں نجاتِ دارین، صلاح نشأتین، اور نجاح کونین کے سب اسباب موجود ہیں۔ غواص بحار الانوار حضرت علامہ محمد باقر مجلسی علیہ الرحمہ نے بحار جلد ۱ صفحہ ۳ پر فن حدیث کے متعلق جن زریں خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ قابلِ دید ہیں۔ فاسمع لما یتلیٰ علیك۔ فرماتے ہیں:

"و لعمری لقد وجدتها سفینة نجات مشحونة بذخائر السعادات و الفیها مزینا بالیزات المنجیة من ظلم الجهالات رایت سبلها لائحة و طرقها و اضحة و اعلام الهدایة و الفلاح علی سالکها مرفوعة و اصوات الداعین الی الفوز و النجاح فی مناهجها مسموعة و وصلت فی

متشابها و حفظا و وهما و قد کذب علی رسول الله فی عهده حتی قام خطیبا فقال ایها الناس قد کثرت الکذابة علی فمن کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعده من النار ثم کذب علیه من بعده فانما یاتیکم الحدیث من اربعة لیس لهم خامس رجل منافق اظهر الایمان متصنع بالاسلام و لم یتاثم و لم یتحرج ان یکذب علی رسول الله متعمدا فلو علم الناس انه منافق کذاب لم یقبلوا منه و لم یصدقوه و لکنهم قالوا هذا صحب رسول الله و رأه و سمع عنه فاخذوا عنه و هم لا یعرفون حاله و قد اخبر الله تعالیٰ

ان لوگوں کو بعض چیزیں تو یاد ہیں اور بعض میں انھیں وہم و اشتباہ ہو گیا ہے۔ جناب رسالت مآبؐ کے حین حیات ہی میں آنحضرتؐ پر جھوٹ بولا گیا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ حضرتؐ نے خطبہ دیا اور اس میں فرمایا: اے لوگو! مجھ پر جھوٹ بولنے والے بکثرت ہو گئے ہیں (آگاہ ہو جاؤ) جو شخص بھی مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولے گا وہ اپنا مقام دوزخ میں بنائے گا۔ پھر آپؐ کی وفات کے بعد بھی برابر آپؐ پر جھوٹ بولا گیا، جس قدر حدیثیں تمھارے پاس پہنچی ہیں وہ چار قسم کے راویوں کے ذریعہ پہنچی ہیں، ان میں کوئی پانچواں شخص شامل نہیں ہے۔ ایک تو وہ منافق ہے جو مصنوعی مسلمان ہے، فقط ظاہری لبادۂ ایمان اوڑھ رکھا ہے۔ وہ جناب رسول اللہؐ پر عمداً جھوٹ بولنے میں کسی قسم کا گناہ وحرج محسوس نہیں کرتا۔ اگر لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ یہ شخص فی الواقع منافق اور جھوٹا ہے تو وہ نہ اس کی کسی بات کو قبول کرتے اور نہ اس کی تصدیق کرتے۔ مگر لوگ (بوجہ عدم واقفیت) یہ کہتے ہیں کہ یہ جناب رسولِ خداؐ کا صحابی ہے۔ اس نے آنحضرتؐ کو دیکھا ہے اور ان کا کلام سنا ہے، بدیں وجہ انھوں نے اس سے حدیثیں لیں،

شوارعها الیٰ ریاض نضرة و حدائق خفرة مزینة بازهار و کل علم و ثمار کل حکمة و ابصرت فی طی منازلها طرقا مسلوکة معمورة موصلة الی کل شرف و منزلة فلم اعثر علیٰ حکمة الا وفیها صفوها و لم اظفر بحقیقة الا و فیها اصلها"

"مجھے اپنی زندگی کی قسم! میں نے احادیث کو نجات کی ایسی کشتی پایا ہے جو سعادات کے ذخیروں سے لبریز ہے اور میں نے ان کو منارہائے نور سے اس طرح مزین ومرصع پایا ہے جو جہالت کی تاریکیوں سے نجات دہندہ ہیں۔ میں نے ان کے راستوں کو واضح ولائح دیکھا ہے اور اس راہ کے سالکین کے لیے رشد وہدایت اور نجاح وفلاح کے پرچم بلند دیکھے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ فوز و فلاح کی طرف دعوت دینے والے بزرگوں کی آوازیں ان راستوں کے چلنے والوں کے گوش گزار

عن المنافقین بما اخبر و وصفهم بما وصفهم فقال عز من قائل اذا رایتهم تعجبك اجسامهم و ان یقولوا تسمع لقولهم كانه خشب مسندة الأیة ثم تفرقوا بعده فتقربوا الی ائمة الضلالة و الدعاة الی النار بالزور و الكذب و البهتان فولوهم الاعمال و اكلوا بهم الدنیا و حملوهم علی رقاب الناس انما الناس مع الملوك و الدنیا الا من عصمه الله فهذا احد الاربعة و سمع رجل أخر من رسول الله شیئا و لم یحفظه علی وجهه و وهم فیه و لم یتعمد كذبا فهوفی یده یقول به و یعمل به و یرویه و یقول انا سمعته من رسول الله فلو علم الناس انه وهم لم یقبلوه و لم علم هو انه

حالانکہ خداوند عالم نے صحابۂ رسولؐ میں منافقین کے موجود ہونے کی (قرآن میں) خبر دی ہے اور ان کے اوصافِ مخصوصہ بھی بیان فرمائے۔ چنانچہ فرمایا ہے: اے رسولؐ! جب تم ان لوگوں کو دیکھتے ہو تو تجھے ان کی جسمانی ساخت بھلی معلوم ہوتی ہے اور اگر وہ باتیں کریں تو تم ان کی باتوں کو سنتے ہو (مگر درحقیقت) گویا یہ چند لکڑیاں ہیں جو دیوار کے سہارے کھڑی کردی گئی ہیں۔ (سورۃ المنافقون: ۴) آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد یہ لوگ متفرق ہوگئے اور ائمہ ضلالت اور داعیانِ دوزخ اربابِ اقتدار کی بارگاہ میں جھوٹ بہتان اور مکروفریب کے ذریعے سے تقرب حاصل کیا اور ان ائمۂ ضلالت نے ان کو لوگوں کا حاکم بنادیا اور ان کے ذریعہ سے دنیا کو خوب حاصل کیا۔ حکمرانوں نے ان منافقوں کو لوگوں کی گردنوں پر مسلّط کردیا اور یہ مسلّم ہے کہ عوام الناس ہمیشہ بادشاہوں اور دنیا کا ہی ساتھ دیتے ہیں۔ مگر جسے خداوند عالم محفوظ رکھے۔ حدیث نبویؐ کے چار راویوں میں پہلی قسم یہ ہے۔ راویانِ حدیث میں سے دوسری قسم کا راوی ایسا تھا کہ جس نے رسول اللہﷺ سے کوئی حدیث سنی مگر اسے پوری طرح یاد نہ رکھ سکا، اسے وہم و اشتباہ ہوگیا اور کچھ کا کچھ سمجھ لیا۔ یہ شخص جان بوجھ کر رسول اللہؐ پر جھوٹ نہیں بولتا، جو (غلط یا صحیح) اس کے پاس موجود ہے وہ اس پر عمل بھی کرتا ہے اور اس کو نقل بھی کرتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ میں نے یہ حدیث رسول اللہؐ سے سنی ہے۔ اگر مسلمانوں کو اس بات کا علم ہوجاتا کہ اس شخص کو وہم و اشتباہ ہوگیا ہے تو وہ اس سے ہرگز حدیث قبول نہ کرتے بلکہ اگر خود اس راوی کو بھی یہ معلوم ہو

ہوتی ہیں۔ میں اس شہر کے کوچوں میں چلتے چلتے ایسے تروتازہ اور سرسبز وشاداب باغات تک پہنچ گیا کہ جو ہر علم کے پھولوں اور ہر حکمت کے پھلوں سے مزین اور آراستہ و پیراستہ تھے۔ میں نے ان

وھم لرفضه و رجل ثالث سمع من رسول اللهؐ شيئاً امر به ثم نهى عنه و هو لا يعلم او سمعه نهى عن شئ ثم امر به و هو لا يعلم فحفظ منسوخه و لم يحفظ الناسخ فلو علم انه منسوخ لرفضه و لو علم المسلمون ان ما سمعوه منه انه منسوخ لرفضوه و رجل رابع لم يكذب على الله و لا على رسول الله مبغضا للكذب خوفا من الله عز و جل و تعظيما لرسول اللهؐ لم ينسه بل حفظ ما سمع على وجهه فجاء بما سمع لم يزد و لا ينقص منه و علم الناسخ و المنسوخ فعمل بالناسخ و رفض المنسوخ و ان امر النبيؐ مثل القرآن ناسخ و منسوخ و خاص و عام

جانے کہ اسے وہم ہو گیا ہے تو وہ اسے چھوڑ دے۔ تیسرا شخص راویانِ اخبار میں سے وہ ہے جس نے سنا کہ جناب رسول اللہؐ کسی چیز کا حکم دے رہے تھے مگر بعد میں کسی وقت اس کی ممانعت کر دی، لیکن اس کو اس ممانعت کی خبر نہیں یا اس کے برعکس اس نے رسول اللہؐ سے کسی چیز کی ممانعت سنی مگر آنحضرتؐ نے بعد میں اس کا حکم دے دیا، لیکن اسے اس کا علم نہ ہو سکا۔ اس طرح اس شخص نے منسوخ کو تو یاد کر لیا مگر ناسخ کو (اپنی لاعلمی کی وجہ سے) یاد نہ کر سکا۔ اگر اسے اس بات کا علم ہو جاتا کہ یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے تو وہ ضرور اس کو ترک کر دیتا۔ اسی طرح اگر دوسرے مسلمانوں کو اس بات کا علم ہوتا کہ یہ حکم منسوخ شدہ ہے تو وہ بھی اس کو چھوڑ دیتے۔ چوتھا شخص وہ ہے جس نے کبھی بھی خدا اور رسولؐ پر جھوٹ نہیں بولا، وہ خدا کے خوف اور تعظیم رسولؐ کی وجہ سے جھوٹ سے نفرت کرتا ہے اور اسے برا سمجھتا ہے، اس نے کسی چیز کو فراموش بھی نہیں کیا بلکہ جس طرح اس نے رسول اللہؐ سے کوئی حکم سنا اسے ویسا ہی یاد ہے اور اسی طرح آگے بیان بھی کرتا ہے۔ اس نے اس میں نہ کچھ بڑھایا ہے اور نہ کچھ گھٹایا ہے، اسے چونکہ ناسخ و منسوخ کا علم ہے اس لیے وہ ناسخ پر عمل کرتا ہے اور منسوخ کو نظر انداز کر دیا ہے۔ جناب رسالت مآبؐ کے اوامر و احکام میں کلامِ الٰہی کی طرح ناسخ و منسوخ خاص و عام

منازل کو عبور کرتے وقت چند آباد اور ہر شرف و عظمت تک پہنچانے والے راستوں کو بھی دیکھا ہے۔ میں نے کہیں بھی کوئی حکمت و دانائی کی بات نہیں دیکھی جس کا خلاصہ اور نچوڑ احادیث میں موجود نہ ہو۔ اور کسی ایسی حقیقت و واقعیت پر مطلع نہیں ہوا۔ جس کی اصل احادیث میں مذکور نہ ہو"۔

حدیث کے متعلق یہ اس بزرگوار کے تاثرات ہیں جس کی عمر عزیز انہی دیار میں گشت کرتے اور انہی سرسبز و شاداب باغات کی سیر کرتے ہوئے گزری ہے۔ لا ينبئك مثل خبير۔ مومنین کی

و محکم و متشابہ و قد یکون من رسول اللہؐ کلام لہ وجھان کلام عام و کلام خاص مثل القرآن قال اللہ عزوجل فی کتابہ و ما آتیکم الرسو فخذوہ و ما نھیکم عنہ فانتھوا فاشتبہ علی من لم یعرف ما عنی اللہ و رسولہ و لیس کل اصحاب رسول اللہؐ یسئلونہ و یستفھمونہ لان اللہ تعالیٰ نھاھم عن السوال حیث یقول یا ایھا الذین اٰمنوا لا تسئلوا عنھا حین ینزل القرآن تبدلکم عفا اللہ عنھا و اللہ غفور حلیم قد سئلھا قوم من قبلکم ثم اصبحوا بھا کافرین فمنعوا

اور محکم ومتشابہ کا سلسلہ جاری ہے۔ قرآن کی طرح کبھی رسول اللہؐ کے کلام کے بھی دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک لحاظ سے وہ عام ہوتا ہے اور دوسری حیثیت سے خاص۔ خداوند عالم اپنی کتاب میں فرماتا ہے: رسولِ خداؐ تمھیں جو حکم دیں ان کو لے لو اور جن باتوں سے روکیں ان سے رک جاؤ (سورۃ حشر:۷) ایسے دو پہلو کلام کا صحیح مفہوم کم علم لوگوں پر مشتبہ ہوگیا اور جناب رسول اللہؐ کے صحابی ایسے نہ تھے کہ وہ تمام باتوں کے متعلق رسول اللہؐ سے سوال کرتے اور حقیقت حال معلوم کرسکتے کیونکہ صحابہ میں سے کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو آنحضرتؐ سے سوال نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ خداوند عالم نے انھیں سوال کرنے کی ممانعت کر دی تھی جیسا کہ قرآن میں ارشاد فرماتا ہے: اے ایمان والو! ان چیزوں کی نسبت سوال نہ کرو جو اگر تمھارے لیے کھول کر بیان کی جائیں تو تم کو بری لگیں اور اگر قرآن نازل ہوتے وقت تم ان کی نسبت سوال کرو گے تو وہ تمھارے لیے ظاہر کر دی جائیں گی۔ اللہ نے ان سے درگزر کیا ہے اور اللہ بڑا بخشنے والا (اور) بردبار ہے تم سے پہلے لوگوں نے بھی ان باتوں کو دریافت کیا تھا۔ پھر ان کے منکر ہو گئے۔ (سورۃ مائدہ:۱۰۱و۱۰۲)

جلائے ایمانی کے لیے رسالۂ شریفہ "ہدیۃ المحدثین" طبع ایران صفحہ ۲۶ سے فضیلتِ حدیث کے متعلق چند ایک احادیث شریفہ نقل کی جاتی ہیں: ① حضرت امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: "یا فضیل ان حدیثنا یحی القلوب"۔ اے فضیل! ہماری احادیث دلوں کو زندہ کرتی ہیں۔ ② حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "حدیث تاخذہ من صادق خیر من الدنیا و ما فیھا من ذھب و فضۃ"۔ اگر ایک حدیث کسی صادق القول آدمی سے حاصل کرو تو یہ تمھارے لیے تمام دنیا اور اس کے تمام طلاء ونقرہ سے بہتر و برتر ہے۔
بہرحال اسی زمانۂ غیبتِ کبریٰ میں انہی احادیثِ شریفہ کے ساتھ تمسک کرنا ہی باعثِ نجات ہے۔

من السوال حق کانوا یحبون ان یجیئ اعرابی فیسئل و هم یسمعون و کنت ادخل علی رسول اللّٰہؐ فی کل لیلۃ دخلۃ داخلوبہ کل یوم خلوۃ یحبینی عما اسئل و ادور بہ حیث ما دار و قد علم اصحاب رسول اللّٰہ انہ لم یکن یصنع ذالک باحد غیری و ربما کان ذالک فی بیتی و کنت اذا دخلت علیہ فی بعض منازلہ اخلانی و اقام نسائہ فلم یبق غیری و غیرہ و اذا اتانی ہو للخلوۃ اقام من فی بیتی و لم یقم عنا فاطمۃؑ و لا احد من ابنائی و کنت اذا سئلتہ اجابنی و اذا سکت و نفذت مسائلی ابتدانی فما نزلت علی رسول اللّٰہؐ

خلاصہ یہ کہ ان کو سوال کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی اسی بنا پر وہ لوگ اس بات کے خواہشمند رہتے تھے کہ کوئی بدو آئے اور آنحضرتؐ سے کوئی مسئلہ دریافت کرے اور یہ بھی اسے سن سکیں لیکن میری کیفیت یہ تھی کہ میں ہر رات جناب رسول اللّٰہؐ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا اور ہر روز جنابؐ سے خلوت میں باتیں کرتا۔ جس چیز کا میں آپؐ سے سوال کرتا آنحضرتؐ مجھے اس کا جواب دیتے۔ آپؐ جہاں تشریف لے جاتے میں بھی آپؐ کے ساتھ ہوتا۔ تمام صحابہ رسول کو اس بات کا علم ہے کہ آنحضرتؐ میرے سوا اور کسی کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرتے تھے۔ اکثر اوقات یہ تخلیہ میرے ہی مکان میں ہوتا تھا۔ اور جب کبھی میں آنحضرتؐ کے کسی مکان میں جاتا تو آنجنابؐ میرے لیے تخلیہ کا انتظام کرتے اور اپنی ازواج کو اٹھا دیتے۔ یہاں تک کہ آنجنابؐ اور میرے علاوہ کوئی بھی وہاں نہ رہتا۔ اور جب کبھی آنحضرتؐ میرے یہاں تشریف لاتے تو سب کو اٹھا دیتے مگر فاطمۃ الزہراؑ اور میرے دونوں بیٹوں (حسنؑ اور حسینؑ) کو نہ اٹھاتے۔ جب میں آپؐ سے سوال کرتا تو آپؐ جواب دیتے اور جس وقت میں چپ ہو جاتا اور میرے سوالات ختم ہو جاتے تو آنحضرتؐ از خود ابتدا فرماتے۔ اس لیے قرآن کی کوئی ایسی آیت نہیں جو رسول اللّٰہؐ پر نازل ہوئی ہے

علامہ مجلسی رحمہ اللہ اپنے رسالہ اعتقادیہ میں تحریر فرماتے ہیں: "ثم انہم علیہم السلام ترکوا بنبینا اخبارہم فلیس لنا فی ہذا الزمان الا التمسک باخبارہم و التدبر فی آثارہم فترک اکثر الناس فی زماننا آثار اہل البیت نبیہم و استبدوا بارائہم فضلوا و اضلوا"۔ "پھر ائمہ اہل بیتؑ ہمارے درمیان اپنے اخبار و آثار چھوڑ گئے ہیں۔ بس اس زمانہ میں ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ ہم ان کے اخبار کے ساتھ تمسک کریں اور ان کے آثار میں غور و فکر کریں۔ مگر افسوس کہ اکثر لوگوں نے اہل بیت نبوت کے آثار و اخبار کو پس پشت ڈال کر اپنے آراء ناقصہ پر اعتماد کر لیا جس کی وجہ سے خود گمراہ ہو گئے اور

من القرآن و لا شئ علمه الله تعالیٰ من حلال او حرام او امر و نهی او طاعة او معصية او شئ كان او يكون الا وقد علميه و اقرأه و املاه علی و كتبته بخطی و اخبرنی بتاویل ذالك و ظاهره و باطنه و حفظته ثم لم انس منه حرفا و كان رسول الله اذا اخبرنی بذالك كله يضع يده علی صدری ثم يقول اللهم املأ قلبه علما و فهما و نورا و حلما ايمانا و علمه و لا يجهله و احفظه و لا تنسه فقلت له ذات يوم بابی انت و امی یا رسول الله ! هل تخوف علی النسیان فقال یا اخی لست اتخوف

اور نہ کوئی ایسی دوسری چیز ہے جو خدائے متعال نے ان کو تعلیم دی ہو، خواہ وہ از قسم حلال ہو یا حرام، از قسم امر ہو یا نہی، از نوع طاعت ہو یا معصیت اور اس کا تعلق گزشتہ واقعات سے ہو یا آنے والے حالات سے، مگر یہ کہ آنحضرتؐ نے ان تمام چیزوں کی مجھے تعلیم دے دی۔ اور یہ سب مجھے لکھوا بھی دیں۔ میں نے ان باتوں کو اپنے خط سے لکھ لیا اور آنحضرتؐ نے مجھے ان کی تاویل اور ان کے ظاہری و باطنی حقائق سے آگاہ کر دیا۔ میں نے ان سب باتوں کو حفظ کر لیا اور ایک حرف بھی فراموش نہیں کیا۔ آنحضرتؐ جب مجھے ان باتوں کی تعلیم دیتے تو اس وقت اپنا ہاتھ مبارک میرے سینہ پر رکھ کر بارگاہِ الٰہی میں یوں دعا کرتے: یا اللہ! تو اس (علیؑ) کے دل کو علم و فہم اور نور و حلم اور ایمان سے بھر دے۔ اسے علم وافر عطا کر اور (کسی چیز سے) اس کو بے خبر نہ رکھ۔ اسے حفظ کامل مرحمت کر اور نسیان سے محفوظ رکھ۔ ایک روز میں نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں، کیا آپؐ کو میرے متعلق نسیان کا اندیشہ ہے؟ فرمایا برادرِ من! مجھے تمہارے متعلق نہ تو نسیان کا خوف ہے

دوسروں کو بھی گمراہ کیا"۔ چونکہ سرکار علامہ کی فرمائش میں منکرین حدیث کا ذکر آ گیا اور یہ فتنہ آجکل باقاعدہ ایک مذہب کی شکل اختیار کر چکا ہے، اس لیے مناسب ہے کہ اس فتنہ کے متعلق کچھ تبصرہ کر دیا جائے۔

فتنہ انکارِ حدیث

واضح ہو کہ مسلمانوں میں ایک نام نہاد فرقہ ایسا بھی موجود ہے جو احادیث کا منکر ہے۔ اگرچہ اس فتنہ کا بیج تو خود پیغمبر اسلامؐ کے آخری ایام میں بعض حضرات نے "حسبنا کتاب اللہ" کہہ کر بو دیا تھا۔ چنانچہ یہ پودا اگا، اور مختلف اوقات میں برابر بڑھتا رہا۔ ہاں یہ درست ہے کہ اس پر خزاں کا موسم بھی آتا رہا لیکن ملا کے چکڑالوی اور مسٹر پرویز کے وقت میں وہ بہت تناور ہو گیا اور خوب برگ و بار لے آیا، اور اپنے زہریلے اثرات سے اسلام و ایمان کی صاف ستھری فضا کو بہت کچھ مسموم کیا۔ مقام

عليك النسيان و لا الجهل و قد اخبرني الله عزو جل انه قد اجابني فيك و في شركائك الذين يكونون من بعدك فقلت يا رسول اللّهؐ و من شركائي قال الذين قرن الله طاعتهم بطاعته و طاعتي قلت من هم يا رسول اللّهؐ قال الذين قال الله فيهم يا ايها الذين آمنوا اطيعوا الله و اطيعوا الرسولؐ و اولي الامر منكم قلت يا نبي الله من هم قال الاوصياء الذين هم الاوصياء بعدي فلا يتفرقوا حتى يردوا على حوضي هادين مهديين لايضرهم كيد من كادهم و لا خذلان

اور نہ جہالت کا ڈر، کیونکہ خدائے تعالیٰ نے مجھے اطلاع دی ہے کہ اس نے تمھارے اور تمھارے ان شرکاء کار کے حق میں جو تمھارے بعد ہوں گے میری دعا کو قبول کر لیا ہے۔ مین نے عرض کیا: یا رسول اللہ! وہ میرے شَریک کار کون ہیں؟ فرمایا: وہ ہیں جن کی اطاعت خدا نے اپنی اور میری اطاعت کے ساتھ ملا دی ہے۔ میں نے پھر عرض کیا وہ کون ہیں؟ فرمایا: جن کے حق میں خداوند عالم کا یہ ارشاد ہے: اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی اور ان والیانِ امر کی جو تم میں سے ہی ہیں۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! وہ کون ہیں؟ ان کی مزید نشاندہی فرمائیں۔ فرمایا وہ وصی ہیں جو میرے بعد میرے وصی ہوں گے، جن کے اندر اختلاف و تفرقہ نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ وہ سب کے سب ہدایت یافتہ اور ہدایت کرتے ہوئے میرے پاس حوضِ کوثر پر وارد ہوں گے، جو کوئی ان سے مکر و فریب کرے گا یا ان کی نصرت نہیں کرے گا، وہ انھیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

شکر ہے کہ علماء اسلام نے اس فتنہ کو فرو کرنے اور دبانے کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اور مُتعدد علمی مضامین بلکہ مستقل کتب و رسائل لکھ کر ان حضرات کے نظریاتِ فاسدہ کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ ہم بھی ضرورتِ حدیث پر اپنے بعض مضامین میں تصریحاً بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ یہاں اس امر پر کچھ تفصیلی تبصرہ کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ فقط بطور تنبیہ ضرورتِ حدیث پر دو چار دلائل پیش کیے جاتے ہیں۔

ضرورتِ حدیث کے دلائل

① یہ حقیقت اربابِ بصیرت پر پوشیدہ نہیں ہے کہ کسی بھی فن کی کوئی کتاب بغیر اس فن کے ماہر مُعلّم کی تعلیم و تلقین کے خود اپنے مطالب و مقاصد کو واضح نہیں کر سکتی اور لوگ اس کے حقیقی مفاہیم کو نہیں سمجھ سکتے، تو جس کتاب میں تمام دنیا کے علوم و فنون موجود ہوں، جس میں کائنات کی ہر خشک و تر

من خذلهم هم مع القرآن و القرآن معهم لا يفارقونه و لايفارقهم بهم ينتصر امتي و بهم يمطرون و بهم يدفع البلاء و بهم يستجاب لهم الدعاء فقلت يا رسول الله سمهم لي فقال انت يا علي ثم ابني هذا و وضع يده على رأس الحسنؑ ثم ابني هذا و وضع يده على رأس الحسينؑ ثم سميك يا اخي هو سيد العابدينؑ ثم ابنه سمي محمد باقر علمي و خازن وحي الله و سيولد علي في زمانك يا اخي فاقرئه مني السلام و سيولد محمد في حيوتك يا حسينؑ فاقرئه مني السلام ثم جعفر ثم موسیٰؑ بن جعفرؑ ثم عليؑ بن موسیٰؑ

وہ ہمیشہ قرآن کے ساتھ ہوں گے اور قرآن ان کے ساتھ ہوگا، نہ وہ قرآن سے جدا ہوں گے اور نہ قرآن ان سے علیحدہ ہوگا۔ انہی کی وجہ سے میری امت کی نصرت و امداد کی جاوے گی۔ انہی کے وسیلہ سے بارش برسائی جائے گی، انھیں کے طفیل مصیبتیں دور ہوں گی اور انہی کے ذریعہ سے دعائیں قبول ہوں گی۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! آپ ان کے اسماء گرامی سے مجھے آگاہ فرمادیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: اے علیؑ! ان میں سے پہلے تو تم ہو، تمھارے بعد میرا یہ فرزند ہوگا، یہ فرما کر اپنا دست مبارک حضرت امام حسنؑ کے سر پر رکھا، پھر فرمایا: اس کے بعد میرا یہ دوسرا بیٹا ہوگا۔ یہ فرما کر جناب امام حسینؑ کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اے بھائی! ان کے بعد تمھارا ہم نام امام ہوگا جو کہ سید العابدینؑ ہے۔ اس کے بعد اس کا بیٹا اور میرا ہم نام محمد ہوگا، جو میرے علم کو شگافتہ کرے گا اور خدا کی وحی کا خزینہ دار ہوگا۔ اے بھائی! تمھارے زمانے میں علی زین العابدینؑ پیدا ہوں گے، ان کو میرا سلام کہنا اور اے حسینؑ تمھاری زندگی میں ہی محمدؑ (باقر) پیدا ہوں گے۔ میری طرف سے انھیں سلام کہنا۔ پھر جعفر صادقؑ پھر موسیٰؑ (کاظم) پھر علیؑ بن موسیٰؑ (رضا)

چیز کا ذکر موجود ہو، جس کا یہ دعویٰ ہو: "وما یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم" (آلِ عمران: ۷) تو بغیر کسی مُعلّم ربانی کی تعلیم کے کیوں کر ہر شخص اس کے مفاہیم و معانی اور اس کے مطالب و مقاصد کو سمجھ سکتا ہے؟

(۳) خداوند عالم نے جناب ختمی مرتبتؐ کے دینی وظائف میں سے ایک اہم وظیفہ یہ بیان کیا ہے کہ: "یعلمھم الکتاب والحکمة" (سورة الجمعہ) کہ وہ لوگوں کو قرآن و حکمت کی تعلیم دیتے تھے۔ اگر مُسلمان جو کہ اہل زبان بھی تھے خود مطالب و مقاصد قرآنیہ کو سمجھ سکتے تو آنجنابؐ کے پڑھانے کی کیا ضرورت تھی؟ ظاہر ہے کہ جب وہ تعلیم دیتے ہوں گے تو کچھ الفاظ و عبارات کے ذریعہ دیتے ہوں

ثم محمد بن علی ثم علی بن محمد ثم الحسن بن علی الزکی ثم من اسمه اسمی و لونه لونی القائم بامر الله فی أخر الزمان المھدی الذی یملأ الارض قسطا و عدلاً کما ملئت قبله ظلما و جوراً و الله انی لاعرفه یا سلیم حیث یبایع بین الرکن و المقام و اعرف اسماء انصاره و اعرف قبائلھم قال سلیم بن قیس ثم لقیت الحسن و الحسین علیھما السلام بالمدینة بعد ما ملك معاویة فحدثتھما ھذا الحدیث عن ابیھما قالا صدقت قد حدثك امیرالمومنین بھذا الحدیث و نحن جلوس حفظنا ذالك عن	پھر محمدؑ بن علیؑ (تقیؑ) پھر علیؑ بن محمدؑ (نقیؑ) پھر حسنؑ بن علیؑ ملقب بہ زکیؑ (عسکریؑ) ہوں گے۔ ان کے بعد وہ ہوگا جو میرا ہم نام اور ہم رنگ ہے۔ وہ آخر زمانہ میں خدا کے حکم سے قیام کرے گا، وہ مہدیؑ ہوگا، جو زمین کو عدل وانصاف سے لبریز کردے گا۔ جس طرح وہ اس سے پہلے ظلم وجور سے بھر چکی ہوگی (پھر حضرت علیؑ نے راوی حدیث سے فرمایا) اے سلیم خدا کی قسم میں جانتا ہوں کہ جہاں رکن (حجر اسود) ومقام (ابراہیمؑ) کے درمیان اس کی بیعت کی جائے گی۔ میں اس کے اعوان وانصار کے نام بھی جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ کس کس قبیلہ سے ہوں گے۔ سلیم بن قیس کا بیان ہے کہ ایک مدت کے بعد جب کہ معاویہ حاکم شام تھا، میں مدینہ میں امام حسنؑ اور امام حسینؑ علیہما السلام کی زیارت کے لیے حاضر ہوا اور ان کی خدمت میں ان کے پدر بزرگوار کی یہی حدیث بیان کی۔ انھوں نے سن کر فرمایا تم سچ کہتے ہو۔ جس وقت امیرالمومنین علیہ السلام نے تم سے یہ حدیث بیان فرمائی تھی ہم وہاں موجود تھے اور ہم نے یہ حدیث اسی طرح خود رسول اللہؐ سے بھی سن کر یاد کی ہے۔

گے۔ انھی اقوال واشارات اور تعلیماتِ پیغمبر اسلامؐ کا نام مُسلمان "حدیث" رکھتے ہیں۔ جس کے انکار کرنے کی کوئی مُسلمان جسارت نہیں کرسکتا۔

④ ارشادِ قدرت ہے: "انا انزلنا الیك الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم" (سورۃ النحل: ۴۴)

اے رسول! ہم نے تمھارے پاس یہ قرآن اس لیے نازل کیا ہے کہ تم واضح طور پر لوگوں کے لیے بیان کرو، ان کے لیے کیا نازل کیا گیا ہے، اور منشائے قدرت کیا ہے؟

اس آیتِ مبارکہ سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن رسولِ اسلامؐ کے بیان کا محتاج ہے، وہاں یہ حقیقت بھی آشکار ہوجاتی ہے کہ وہ بیان وشرح رسولؐ اصل قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز ہے۔ تعلیماتِ قرآنیہ کے انھی تشریحات وتوضیحاتِ نبویہ کا دوسرا نام "حدیث" ہے۔

رسول اللّٰہؐ کما حدثك لم یزد فیه حرفاً و لم ینقص منه حرفاً قال سلیم بن قیس ثم لقیت علی بن الحسن علیهما السلام و عنده ابنه محمد الباقر فحدثته بما سمعته عن ابیه فقال سمعت عن امیر المومنینؑ عن رسول اللّٰہ و هو مریض و انا صبی ثم قال ابوجعفرؑ و اقرأ نی جدی عن رسول اللّٰہؐ و انا صبی قال ابان بن ابی عیاش فحدثت علیؑ بن الحسینؑ بهٰذا الحدیث کله عن سلیم بن قیس الهلالیؒ فقال صدق و قد جاء جابر بن عبداللّٰہ الانصاریؓ الی ابنی محمد و هو یختلف الی الکتٰب فقبله و اقرئه

اسی طرح ہمارے والد بزرگوار نے تم سے بلاکم وکاست بیان کی تھی سلیمؒ کہتے ہیں: پھر میں ایک عرصہ کے بعد علیؑ بن الحسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت ان کے پاس آپ کے فرزند محمد باقرؑ بھی موجود تھے۔ میں نے ان کے والد بزرگوار کی یہ حدیث جو میں نے آنجنابؑ سے سنی تھی، بیان کی۔ آپؑ نے فرمایا کہ میں نے بھی اپنے بچپن میں اپنے جد بزرگوار امیرالمومنینؑ سے رسول اللّٰہؐ کی یہ حدیث سنی ہے۔ اس وقت امیرالمومنینؑ بیمار تھے۔ پھر امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: جس وقت میرے جد نامدار (امام حسینؑ) نے مجھے جناب رسول اللّٰہؐ کا سلام پہنچایا تھا، اس وقت میں بچہ تھا۔ ابان بن ابی عیاش کہتے ہیں: میں نے حضرت علی بن الحسین علیہما السلام کی خدمت میں سلیم بن قیس ہلالی کی بیان کردہ تمام حدیث عرض کی۔ آپؑ نے فرمایا: سلیم نے سچ کہا۔ حضرت جابر بن عبداللّٰہ انصاری رضی اللّٰہ عنہ میرے فرزند محمد باقرؑ کے پاس اس وقت آئے تھے جب کہ وہ مکتبہ کی طرف جارہے تھے۔ جابرؓ نے ان کو بوسہ دیا اور ان کو جناب رسالت مآبؐ کا سلام پہنچایا۔

---

④ خلاق عالم ارشاد فرماتا ہے: "انا انزلنا الیك الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراك اللّٰہ" (سورۃ النساء:۱۰۵) "اے رسول! ہم نے یہ حق کتاب تم پر اس لیے نازل کی ہے تاکہ تم اللّٰہ کے عطا کردہ علم کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو"۔ ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ کے فیصلہ اور حکم کے الفاظ وعبارات یقیناً قرآن کے علاوہ ہوتے تھے۔ لہٰذا قرآن کے ساتھ ساتھ ان کی بھی ضرورت ہے، تاکہ ہم جناب رسولِ خداؐ کے ارشادات وتوضیحات کی روشنی میں مطالبِ قرآن کو سمجھ کر اور اس پر عمل کرکے دین اور دنیا میں فوز وفلاح حاصل کرسکیں۔

⑤ اگر احادیث واخبار کو حجت تسلیم نہ کیا جائے تو دین اسلام کا کوئی بھی اصولی وفروعی اور معاشرتی واجتماعی مسئلہ معلوم نہیں ہوسکتا۔ یہ درست ہے کہ قرآن مجید میں ہر چیز کا تذکرہ موجود ہے۔ مگر اس میں

السلام عن رسول اللهؐ قال ابان بن ابی عیاش فحججت بعد موت علی بن الحسینؑ فلقیت ابا جعفر محمد بن علی بن الحسین فحدثته بهذا الحدیث کله عن سلیم فاغرورقت عیناه و قال صدق سلیم و قد اتی الی ابی بعد قتل جدی الحسینؑ و انا عنده فحدثه بهذا الحدیث بعینه فقال له ابی صدقت و الله یا سلیم قد حدثنی بهذا الحدیث ابی عن امیرالمومنین

یہ ابان بن ابی عیاش بیان کرتے ہیں کہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی وفات کے بعد میں حج بیت اللہ کے لیے گیا، وہاں امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوکر سلیم بن قیس ہلالی والی یہ حدیث ان سے بیان کی۔ سن کر آنجنابؑ آبدیدہ ہوگئے اور فرمایا خدا رحم کرے سلیم پر، اس نے سچ کہا ہے۔ وہ میرے جد بزرگوار کی شہادت کے بعد میرے پدر بزرگوار کے پاس آئے تھے۔ اس وقت میں بھی ان کی خدمت میں موجود تھا۔ سلیم نے وہاں بھی بعینہ اسی طرح یہ حدیث بیان کی تھی۔ میرے والد نے فرمایا تھا: اے سلیم بخدا تم سچ کہتے ہو۔ میرے والد ماجد امام حسینؑ نے میرے جد بزرگوار جناب امیرالمومنینؑ کی یہ حدیث اسی طرح مجھ سے بیان کی تھی۔

اس قدر ایجاز و اختصار اور رمز و کنایہ سے کام لیا گیا ہے کہ دوسرے مسائل و حقائق تو ایک طرف اس سے تو نمازِ پنجگانہ اور اس کی رکعتوں کی تعداد اور زکوٰۃ کی مقدار بھی معلوم نہیں ہو سکتی۔ بنابریں بانیٔ اسلامؐ اور ان کے صحیح مسند نشین حضرات کی فرمائشات کی طرف رجوع کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ و هو المقصود فلا و ربك لا یومنون حتی یحکموك فیما شجر بینهم ثم لا یجدوا فی انفسهم حرجا مما قضیت و یسلموا تسلیما۔

ائمہ اہل بیتؑ کی احادیث میں فی الحقیقت کوئی اختلاف نہیں ہے

یہ ایک مُسلمہ حقیقت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ اور ائمہ ہدیٰ علیہم التحیۃ والثنا کی احادیث و اخبار صحیحہ میں ہرگز کسی قسم کا کوئی تعارض و تضاد نہیں ہے۔ آلِ رسولؐ کی یہ وہ خصوصیت ہے جس کا اعتراف بعض علمائے اہل سنت نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ علامہ محمد معین سندھی نے اپنی کتاب "دراسات اللبیب" صفحہ ۲۴۹ طبع لاہور پر تسلیم کیا ہے کہ: "و مذهب واحد منهم مذهب باقیهم" ائمہ اہل بیتؑ علیہم السلام میں سے جو ایک کا مذہب ہو وہی سب کا ہوتا ہے۔ ع

و الفضل ما شهدت به الاعداء

اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اختلاف ان کے کلام میں ہوتا ہے جو جھوٹے ہوں۔ چنانچہ ضرب المثل

ہے کہ " دروغ گو را حافظه نه باشد " جو غیر معصوم ہوں اور جن کی نگاہ حقائق واقعیہ پر نہ ہو مگر جن کی عصمت و طہارت اور صداقت پر آیاتِ قرآنیہ: "انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت (سورۃ الاحزاب:۳۳) و یا ایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ و کونوا مع الصادقین "(سورۃ التوبۃ:۱۱۹) وغیرہا شاہد، اور جن کے سینہ بے کینہ میں علم قرآن کے سمندر موجزن ہوں، "تلک اٰیات بینات فی صدور الذین اوتوا العلم" جو صغرسنی کے عالم میں بھی لوح محفوظ کا مطالعہ کر سکتے ہوں۔ "فان الحسن کان یطالع اللوح المحفوظ فی صغر سنه" (فتح الباری شرح بخاری للعسقلانی علیٰ ما نقل عنه) جو مدرسہ الٰہیہ کے تعلیم یافتہ ہوں۔ "و ما علمناہ من لدنا علما" (سورۃ فاطر:۳۲) جو وارث علومِ قرآنی ہوں۔ "ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا" جو مدینہ علم نبوی کے ابواب ہوں۔ "انا مدینۃ العلم و علی بابھا...... من اراد المدینۃ فلیاتھا من بابھا " جن کے علوم بتوسط جناب رسولِ خداؐ اور روح القدس اور جبرئیل، خود رب جلیل سے ماخوذ ہوں۔ اہل عقل وانصاف بتائیں کہ ان کے کلام حقائق ترجمان میں کیونکر اختلاف و افتراق متصور ہوسکتا ہے؟ انہی حقائق کی بنا پر علامہ محقق حضرت شیخ بہائیؒ نے اپنے رسالہ وجیزہ میں تحریر فرمایا ہے: "وان جمیع احادیثنا الا ما ندر تنتھی الی ائمتنا الاثنا عشر و ھم ینتھون فیھا الی النبیؐ فان علومھم مقتبسۃ من تلک المشکوۃ" (وجیزہ مع شرح نہایۃ الدرایۃ صفحہ ۲۷) ہماری تمام احادیث سوائے بعض شاذ و نادر حدیثوں کے ائمہ اثنا عشر تک پہنچتی ہیں اور ان بزرگواروں کا سلسلہ سبار کہ جناب رسولِ خداؐ تک پہنچتا ہے۔ کیونکہ ان حضرات کے علوم مشکوٰۃِ نبوت سے حاصل شدہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ جناب رسولِ خداؐ کا سلسلہ خدائے عزوجل تک جا کر منتہی ہوتا ہے۔

ولنعم ما قیل ؎

اذا شئت ان ترضی لنفسک مذھبا	ینجیک یوم الحشر من لھب النار
فدع عنک قول الشافعی و مالک	و احمد و المنقول عن کعب بن الاحبار
و وال اناسا قولھم و حدیثھم	روی جدنا عن جبرئیل عن الباری

اِختلافِ احادیث کے علل واسباب

ہاں اگر کسی وقت بظاہر ان احادیث میں اختلاف معلوم ہو تو اس کے کچھ علل و اسباب ہوتے ہیں۔

پہلا سبب:

اس کا ایک سبب تو لوگوں کی عقل کا خام اور فہم کا ناقص ہونا ہے کہ وہ اپنی کمیٔ علم و عقل کی وجہ

سے سمجھتے ہیں کہ ان احادیث میں اختلاف ہے، حالانکہ فی الحقیقت ان میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔
کما قیل: ؎

و کم من عائب قولا صحیحا　　　　و آفته من الفهم السقیم

جیسا کہ مُصنّف علامؒ نے اس باب کے ابتدائی حصّہ میں چند مثالوں سے اس امر کی وضاحت فرمائی ہے اور شیخ الطائفہ شیخ طوسی علیہ الرحمہ کی کتاب "اِستبصار" میں اس کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں۔ خود ائمہ اہل بیتؑ کا ارشاد ہے: "ان حدیثنا صعب مستصعب لا یحتمله الا ملك مقرب او نبی مرسل او مومن امتحن الله قلبه للایمان"۔ (اصول کافی و بصائر الدرجات وغیرہ) ہماری احادیث بہت مُشکل ہیں، ان کا تحمل یا تو ملک مقرب کرسکتا ہے یا نبی مرسل یا پھر مومن مُمتحن۔
اسی طرح بعض احادیث میں وارد ہے: "ان فی حدیثنا محکما کمحکم القرآن و متشابه القرآن"۔ ہماری احادیث میں قرآن کی طرح محکم و متشابہ احادیث موجود ہیں۔ (مرآۃ الانوار و مشکوٰۃ الاسرار وغیرہ) لہٰذا کم عقل و کم علم حضرات جو حقائق اشیاء کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے، وہ اپنی بے سمجھی سے ظاہری اختلاف کو دیکھ کر فوراً یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ فلاں حدیث فلاں حدیث سے متعارض ہے۔ فلاں حدیث عقل سے مُتصادم ہے اور فلاں روایت قرآن کے مناقض ہے۔ حالانکہ درحقیقت ان میں کوئی تعارض و تصادم نہیں ہوتا۔ آہ ع

چوں ندیدند رہِ حقیقت افسانہ زدند

"قال الصادق علیه السلام و یل لاهل الکلام یقولون هذا ینقاد و هذا لا ینقاد و هذا ینساق و هذا لا ینساق"۔ (اصول کافی وغیرہ) افسوس ہے متکلمین پر جو کہتے ہیں کہ یہ (ہمارے عقلی مفروضہ کے تابع ہے اور یہ تابع نہیں یہ ہمارے مقررہ قاعدے کے مطابق چل سکتا ہے اور یہ نہیں) حالانکہ علمائے ربانیین کے نزدیک ان سب احادیث کے معانی صحیحہ موجود ہیں۔ ان کو ان احادیث میں انوارِ حقیقت کا عکس دکھائی دیتا ہے، اور وہ اسے پڑھ کر "کلامُ الامامِ امامُ الکلام" کا لطف حاصل کرتے ہیں۔ سچ ہے: ع　فکرِ ہرکس بقدرِ ہمّت اوست

دوسرا سبب

دوسرا سبب تقیّہ ہے۔ کما قال الصادقؑ: "نحن القینا بینکم الاختلاف حقنا لدمائنا و دمائکم"۔ ہم نے اپنی اور تمھاری جانوں کی حفاظت کے لیے تمھارے اندر اختلاف ڈالا ہے۔ اگر تم سب ایک

ہی نظریہ پر متفق ہو جاتے تو پہچان لیے جاتے اور پھر یہ امر تمھاری ہلاکت کا سبب بن جاتا۔ لہٰذا بعض اوقات یہ حکمائے اسلام و نباضِ فطرت ائمہ علیہم السلام حالات کی کیفیت و نزاکت کو دیکھ کر بعض خاص معتمد اصحاب کو اصل حقیقت سے آگاہ فرما دیتے اور دوسرے حضرات کو تقیہ کے مطابق جواب دیتے تھے۔ جس کی وجہ سے کم علم و استعداد لوگوں پر حقیقت حال مشتبہ ہو جاتی۔ مگر جو حضرات کامل علم و استعداد رکھتے اور کلامِ معصومؑ سے مانوس ہوتے تھے وہ سمجھ جاتے تھے کہ حکم واقعی کونسا ہے اور بناء بر تقیہ حکم ظاہری کونسا ہے؟ لان لکل حق و علیٰ کل حقیقة نوراً۔ و لکن لا یعرفه الا العلماء الراسخون۔

تیسرا اسبب

اس اختلاف کا سب سے بڑا اسبب راویانِ اخبار و ناقلانِ آثار کے حالات کا اختلاف ہے، جس کی پوری پوری وضاحت جناب سلیم بن قیسؒ کی روایت میں موجود ہے، جو متن رسالہ میں مذکور ہے۔ اس پر مزید کچھ تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف اس میں اس قدر اضافہ کر دینا ضروری ہے، اربابِ بصیرت جانتے ہیں کہ جس طرح جناب رسولِ خداؐ کو بعض مخربین دین اور منافقین سے واسطہ پڑا تھا، اسی طرح ائمہ طاہرینؑ کو بھی ہمیشہ بعض اشرار و مفسدین سے سابقہ پڑتا رہا، جنھوں نے دین کے حقائق کو مسخ کرنے اور اسلام کا حلیہ بگاڑنے کے لیے جعلی حدیثیں بنا بنا کر اپنی عیاری اور دسیسہ کاری سے منتشر کر دیں۔ اس واسطے ائمہ طاہرینؑ اور ان کے اصحابِ کاملین نے ان لوگوں کے دجل و فریب کا پردہ چاک کرنے کے لیے نمایاں کارنامے انجام دیے۔ اگرچہ ہمارے اسلاف کی مساعئ جمیلہ سے ایسی احادیث کو کتب معتبرہ سے نکال دیا گیا اور صحیح و سقیم میں تمیز کر دی گئی ہے۔ مگر تاہم اگر کوئی شاذ و نادر ایسی حدیث رہ گئی تھی تو متاخرین نے نقد اخبار و آثار کے لیے کچھ خاص قواعد و ضوابط مرتب کیے، جن کا سرچشمہ فرمائشاتِ معصومین علیہم السلام ہی تھیں۔ ذیل میں ہم ان ضوابط کا اجمالی تذکرہ کرتے ہیں۔ مگر اس سے قبل کچھ تھوڑا سا تبصرہ کتاب سلیم بن قیس ہلالی اور اس کے مؤلف پر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

کتاب سلیم بن قیس اور اس کے مؤلف پر کچھ تبصرہ

مخفی نہ رہے کہ جناب سلیمؒ حضرت امیرالمومنینؑ کے اصحاب میں سے ایک جلیل صحابی ہیں، جن کا تقریباً ۹۰ھ میں جناب امام زین العابدینؑ کے ظاہری دورِ امامت میں انتقال ہوا۔ حضرت علامہ حلی نے "خلاصۃُ الرجال" میں اسی طرح دُوسرے بعض اہل فن نے ان کی عدالت کو بھی تسلیم کیا ہے اور ابان بن ابی عیاش کا یہ بیان قلمبند کیا ہے کہ: "کان شیخنا متعبدا له نور یعلوه" "وہ عبادت گزار

بزرگوار تھے اور ان کے چہرہ بشرہ پر نور ساطع تھا۔ جب حجاج ثقفی نے ان کو قتل کرنا چاہا تو انھوں نے بھاگ کر ابان بن ابی عیاش کے پاس پناہ لی اور بالآخر وہیں ان کا انتقال ہوا۔ اپنی وفات کے وقت انھوں نے ابان سے یہ حدیث بیان کی اور اپنی کتاب بھی انہی کے حوالہ کی، اس لیے ان کی کتاب اصل سلیم بن قیس جس کا اصل نام "کتاب السقیفہ" ہے، کے بارے میں علماء اعلام کے درمیان بہت اختلاف ہے۔ بعض اسے جناب سلیم کی تالیف تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ "منتہی المقال فی علم الرجال" المعروف بہ "رجال شیخ ابی علی حائری" میں بحوالہ "رجال غضائری" لکھا ہے: "موضوع لامریة فیه" یعنی بلاشک وشبہ یہ کتاب وضعی اور من گھڑت ہے۔ مگر یہ کتاب حال ہی میں نجف اشرف میں طبع ہوئی ہے اور اس پر ایک گرانقدر مقدمہ لکھا گیا ہے۔ اس میں دلائل محکمہ سے اس کتاب کا جناب سلیم کی تالیف ہونا اور اس کی وثاقت ثابت کی گئی ہے اور متعدد شواہد سے واضح کیا ہے کہ علمائے اعلام نے ہمیشہ اس کتاب پر اعتماد کیا ہے اور یہ ہمیشہ ان کے لیے مورد استفادہ رہی ہے۔ اسی مقدمہ میں "غیبت نعمانی" کے باب "ائمہ اثنا عشر" سے شیخ نعمانی کی اس کتاب کے متعلق یہ رائے نقل کی ہے: "ولیس بین جمیع الشیعة ممن حمل العلم و رواه عن الائمة علیهم السلام خلاف فی ان کتاب سلیم بن قیس الهلالی اصل من اکبر کتب الاصول التی رواه اهل العلم و حملته حدیث اهل البیت علیهم السلام و اقدمها و هو من الاصول التی ترجع الشیعة الیها و تعول علیها"۔ (صفحہ ۱۱) خلاصہ مطلب یہ کہ تمام شیعہ اہل علم میں اس امر کے اندر کوئی اختلاف نہیں ہے کہ کتاب سلیم بن قیس شیعوں کے ان بڑے اصولِ قدیمہ میں سے ہے جس کی طرف ہمیشہ شیعہ رجوع کرتے رہے ہیں اور اس پر ان کا اِعتماد رہا ہے۔

اسی طرح قاضی بدرالدین سبکی کی کتاب "محاسن الرسائل فی معرفۃ الاوائل" سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے بھی اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ: "ان اول کتاب صنف للشیعة هو کتاب سلیم بن قیس الهلالی"۔ مذہب شیعہ میں جو کتاب سب کتب سے پہلے تصنیف ہوئی وہ کتاب سلیم بن قیس ہے۔

ابن ندیم نے اپنی کتاب فہرست صفحہ ۳۰۷ و ۳۰۸ میں لکھا ہے کہ "اول کتاب ظهر للشیعة کتاب سلیم بن قیس الهلالی"۔ شیعوں کی سب سے پہلی کتاب جو ظاہر ہوئی وہ کتاب سلیم بن قیس ہے۔

علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے مقدمہ بحارالانوار میں اس کے متعلق لکھا ہے: "کتاب سلیم بن قیس فی غایة الاشتهار و قد طعن فیه جماعة و الحق انه من الاصول المعتبرة"۔ یعنی کتاب سلیم بن قیس بہت مشہور ہے۔ بعض لوگوں نے اس پر طعن کیا ہے لیکن حق یہ ہے کہ یہ کتاب اصولِ مُعتبرہ میں سے ہے۔

لیکن حضرت شیخ مُفید علیہ الرحمہ نے "تصحیح الاعتقاد" میں اس کتاب کے متعلق کوئی اچھی رائے

قائم نہیں کی۔ مگر اس حدیث کو انھوں نے بھی مُعتبر تسلیم کیا ہے جسے مُصنّف علامؒ نے یہاں نقل کیا ہے۔ بہر حال جناب سلیم کی بیان کردہ حدیث سے جہاں اختلافِ حدیث کے علل واسباب پر روشنی پڑتی ہے وہاں وہ ائمہ اطہارؑ کی خلافتِ عظمیٰ وامامتِ کبریٰ پر بھی نص صریح ہے۔ کما لا یخفی۔

اقسام وانواعِ حدیث

حدیث کی دو قسمیں ہیں: ① متواتر ② واحد۔ اگر کسی حدیث کو ہر طبقہ میں اس قدر کثیر جماعت نقل کرے جس کا کذب وافتراء پر اتفاق کرنا عادۃً محال ہو، تو اسے "خبر متواتر" کہا جاتا ہے۔ اور جس میں یہ شرائط نہ ہوں وہ "خبر واحد" کہلاتی ہے۔ (ہدیۃ المحدثین، نہایۃ الدرایہ وغیرہ)

اب اس خبر واحد کی مُتقدمین کے نزدیک صرف دو قسمیں تھیں: ① صحیح اور ② غیر صحیح۔ ان کے نزدیک خبر صحیح وہ تھی جس میں کچھ ایسے داخلی وخارجی قرائن موجود ہوں جن کی بناء پر اس حدیث پر اعتماد واعتبار کیا جا سکے اور جو حدیث ایسے قرائن سے خالی وعاری ہوتی تھی وہ اسے غیر صحیح قرار دیتے تھے۔ (بحوالہ کتب مذکورہ)

مُتقدمین میں بوجہ قربِ عہد ائمہؑ بکثرت ایسے قرائن موجود تھے۔ مگر جوں جوں زمانہ گزرتا گیا یہ قرائن مفقود ہوتے گئے۔ اس لیے متاخرین کو صرف راویانِ اخبار کے حالات وصفات اور اخلاق و اطوار پر انحصار کرنا پڑا۔ اس لیے اخبار کی صحت وعدم صحت معلُوم کرنے کے معیار تبدیل ہو گئے۔ ہم ذیل میں حدیث کے بعض اہم اقسام کا تذکرہ کرتے ہیں، ورنہ بعض وجوہ سے اس کی اور بھی بہت سی قسمیں ہیں۔ جن کے ذکر کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

① **حدیث صحیح:** ہر وہ حدیث جس کا سلسلہ سند معصومؑ تک پہنچتا ہو اور اس کے تمام راوی شیعہ اثنا عشری اور عادل ہوں، اسے عند المتاخرین صحیح کہا جاتا ہے۔

② **حدیث حسن:** جس کی سند معصومؑ تک منتہی ہوتی ہو۔ اور تمام راوی شیعہ اثنا عشری اور ممدوح ہوں۔ مگر ان کی عدالت کی صراحت نہ کی گئی ہو۔

③ **حدیث قوی:** حدیث قوی اس حدیث کو کہا جاتا ہے جس کے تمام راوی شیعہ اثنا عشری ہوں مگر ان کی مدح وقدح کے متعلق کوئی نص موجود نہ ہو۔

④ **حدیث موثق:** ہر وہ حدیث جس کا سلسلہ سند ایسے راویوں کے ذریعہ سے معصومؑ تک پہنچے جو اگرچہ صادق القول اور قابلِ اعتماد ہوں مگر ہوں فاسد العقیدہ۔

⑤ **حدیث ضعیف**: جو حدیث مذکورہ بالا تمام اقسامِ حدیث کی شرائط سے خالی ہو، اسے ضعیف کہا جاتا ہے۔

وله اقسام عديدة كالمقطوع و المرسل و المجهول وغيرها۔ (از ہدیۃ المحدثین، نہایۃ الدرایہ، مقیاس الدرایہ وغیرہا) مُتقدمین کی اصطلاح کے اس اختلاف سے یہ عقدہ بھی حل ہوجاتا ہے کہ کتب اربعہ بالخصوص کافی وفقیہ کی تمام احادیث کس طرح مُتقدمین کے نزدیک صحیح اور متاخرین کے نزدیک کچھ صحیح، کچھ حسن اور کچھ ضعیف ہیں۔ ولا مشاحة فی الاصلاح۔ فتدبر۔

(از مقدمہ احقر مُصنّف بر شافی ترجمہ اصول کافی)

وضاحت: اس تقسیم سے یہ امر بھی واضح وعیاں ہوجاتا ہے کہ احادیث میں اختلاف کی صورت میں صحیح حدیث، حسن پر، حسن، قوی پر، قوی، مؤثق پر اور موثق، ضعیف پر مقدم ہوگی۔ کما لایخفیٰ۔

تعادل وتراجیح کا بیان

اس سلسلہ میں ایک امر باقی رہ گیا ہے، جس کی طرف حضرت مُصنّف علام نے کوئی اشارہ نہیں کیا۔ لہٰذا اس امر پر کچھ تبصرہ کرنا ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب کسی وقت احادیث واخبار منقو لہ میں فی الحقیقت تعارض وتضاد پایا جائے تو مقام اعتقاد وعمل میں کیا کرنا چاہیے؟ کس حدیث کو قبول اور کس کو رد کرنا چاہیے۔ اس کا معیار ومیزان کیا ہے؟ یہ ایک طویل الذیل مبحث ہے اور کتب اصولِ فقہ کا ایک مُعتد بہ حصّہ بعنوان "باب التعادل والتراجیح" اس کے بیان کے لیے وقف ہے۔ اس سلسلہ میں ائمہ معصومین صلوات اللہ علیہم اجمعین سے کئی قسم کے مرجحات مثل موافقت قرآن، مخالفتِ عامہ، اور عدالتِ راوی وغیرہ مروی ہیں، جو مُختلف احادیث کے اندر مُتفرق طور پر مذکور ہیں۔ اس سلسلہ میں جو روایت سب سے زیادہ مفصّل و مبسوط اور عند العُلماء مقبول ومعمُول ہے وہ مقبولۂ عمر بن حنظلہ ہے جو امام بحقّ ناطق حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔ یہ حدیث بہت طولانی ہے۔ ہم یہاں اس کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔

اِختیاری صورت میں حکامِ جور کی طرف رجوع کرنا جائز نہیں ہے

راوی: جناب ابن حنظلہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت صادق آلِ محمد علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا: آپ کے بعض نام لیواؤں کا کسی معاملہ میں باہمی جھگڑا ہوجاتا ہے۔ آیا وہ تصفیہ کے لیے حکامِ جور کی طرف رجوع کر سکتے ہیں؟

امام عالی مقام: جو شخص کسی امر حق یا باطل میں ان کی طرف اپنا مقدمہ لے جائے تو گویا وہ شیطان کی طرف اپنا مقدمہ لے گیا اور وہ اگرچہ حق بجانب ہی ہو، لیکن اگر اس نے قاضیانِ باطل کے فیصلہ سے اپنا حق حاصل کیا تو حرام کھائے گا۔

راوی: پھر وہ کیا کریں؟

علماء کرام کی عمومی نیابت کا بیان:

امام ینظران الی من کان منکم روی حدیثنا و نظرفی حلالنا و حرامنا و عرف احکامنا فلیرضوا بہ حکما فانی قد جعلتہ علیکم حکما فاذا حکم بحکمنا فلم یقبلہ منہ فانما استخف بحکم اللہ و علینا رد و الراد علینا الراد علی اللہ و ھو علی حد الشرک باللہ

دیکھیں کہ اپنے ہم عقیدہ لوگوں میں سے جو شخص ہماری احادیث سے واقف ہو ہمارے حلال و حرام پر (استدلالی) نگاہ رکھتا ہو اور ہمارے احکام و مسائل حلال و حرام کی بھی معرفت رکھتا ہو اسے اپنا حاکم تسلیم کرلیں کیوں کہ میں نے (عمومی طور پر) ایسے شخص کو تمہارا حاکم بنا دیا ہے۔ پس جب وہ حاکم شرع ہمارے حکم کے مطابق فیصلہ کرے اور اس کا فیصلہ تسلیم نہ کیا جائے تو رد کرنے والے شخص نے حکم خدا کو خفیف سمجھا ہے اور ہماری بات کو ٹھکرایا ہے اور ہمارا حکم رد کرنے والا گویا خدائے عزوجل کے حکم کو ٹھکرانے والا ہے اور ایسا شخص مشرک ہے۔

راوی: اگر وہ جھگڑا کرنے والے دو شخصوں کو اپنا حاکم تسلیم کریں اور پھر ان کے فیصلہ میں اختلاف ہو جائے اور یہ اختلاف بھی آپ کی احادیث کی وجہ سے ہو تو پھر کیا کریں؟

امام: ان دونوں میں سے جس کی عدالت و ثقاہت اور زہد و اتقا کا پلہ بھاری ہو اس کا حکم نافذ ہوگا۔

راوی: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں! اگر وہ دونوں ان صفات میں مساوی ہوں تو پھر کیا کرنا چاہیے؟

امام: جس کا فیصلہ ان دونوں روایتوں میں سے مشہُور بین العُلماء روایت کے مطابق ہے اس کا فیصلہ قابلِ قبول ہوگا!

راوی: اگر دونوں روایتیں مشہُور ہوں اور ان کے راوی بھی ثقہ ہوں تو پھر کیا کیا جائے؟

امام: جو روایت کتاب خدا و سنتِ رسولؐ کے مطابق اور مخالفین کے مذہب کے خلاف ہو اس پر عمل درآمد کیا جائے۔

راوی: اگر دونوں روایات مخالفین کے نظریات کے موافق ہوں تو پھر کیا صورت ہوگی؟

امام: جس روایت کی طرف مخالف حکام اور قاضیوں کا زیادہ رجحان ومیلان ہو اسے ترک کر کے دوسری پر عمل کیا جائے!

راوی: اگر دونوں روائتوں کی طرف ان کا رجحان برابر ہوتو اس صورت میں کیا کرنا چاہیے؟

امام: اگر نوبت بایں جا رسید، تو پھر توقف کرو، حتی کہ اپنے امام سے ملاقات کرکے حقیقتِ حال معلوم کرو۔ کیونکہ شبہات کے وقت توقف کرنا چاہِ ہلاکت میں چھلانگ لگانے سے یقیناً بہتر و برتر ہے۔ (اصول کافی، تہذیب الاحکام وغیرہ)

جب دو حدیثوں میں تمام مرجحات برابر ہوں تو کیا کرنا چاہیے

جب کبھی ایسا اتفاق ہو کہ دو حدیثیں مذکورہ بالا مرجحات میں بالکل مساوی ہوں تو اب کیا کرنا چاہیے۔ آیا انسان کو اختیار ہے کہ جس حدیث پر چاہے عمل کرے یا اسے توقف کرنا چاہیے؟ اس میں چند قول ہیں۔ چونکہ بعض روایات میں تخییر کا حکم وارد ہے اور بعض میں توقف وتاخیر کا۔ اس لیے ان کے درمیان جمع کئی طرح کی گئی ہے۔ اول: یہ کہ فقیہ کو چاہیے کہ فتوی دینے میں تو توقف کرے مگر مقامِ عمل میں وہ مخیر ہے۔ جس حدیث پر چاہے عمل کرے۔ دوم: جب امام عالی مقامؑ ظاہر ہوں اور ان کی خدمت میں رسائی ممکن ہو تو اس وقت توقف کا حکم ہے مگر جب صورتِ حال اس کے برعکس ہو، جیسے موجودہ زمانہ تو پھر تخییر ہے۔ سوم: اگر وہ احادیث عبادات اور حقوق اللہ کے متعلق ہیں تو وہاں اختیار ہے کہ اگر حقوق الناس کے بارے میں ہیں تو وہاں توقف کرنا چاہیے۔ چہارم: یہ کہ اگر ان دو حدیثوں میں سے کسی ایک پر عمل کرنے میں مجبور ہے تو پھر تخییر ہے اور اگر مجبور نہیں تو پھر توقف کرنا چاہیے۔ پنجم: یہ کہ تخییر جواز اور توقف استحباب پر محمول ہے۔ ششم: یہ کہ جو حدیث مطابق احتیاط ہو اس پر عمل کرنا چاہیے۔

اگر بنظرِ غائر ان اقوالِ متفرقہ پر نگاہ ڈالی جائے تو پہلے اور دوسرے قول کا مآل وانجام ایک ہی ہے۔ کیونکہ فتوی دینے میں توقف اور عمل کرنے میں اختیارِ زمانہ غیبت یا ان تک رسائی نہ ہو سکنے کی صورت میں ہی متصوّر ہو سکتا ہے، ورنہ ان کی طرف اصل حقیقت معلوم کرنے کے لیے رجوع کرنا لازم و متحتم ہے۔

هذا القول لا يخلوا من القوة و الاخير احوط و الله العالم

تتمہ

و فی کتابہ عزو جل ما یحسبہ الجاھل مختلفا متناقضا و لیس بمختلف و لا متناقض و ذالک مثل قولہ تعالیٰ فالیوم ننسٰہم کما نسوا لقاء یومھم ھذا و قولہ تعالیٰ نسوا اللہ فنسیہم ثم یقول بعد ذالک و ما کان ربک نسیا و مثل قولہ عزو جل یوم یقوم الروح و الملٰئکۃ صفا لا یتکلمون الا من اذن لہ الرحمن و قال صوابا و مثل قولہ تعالیٰ و یوم

قرآن میں تناقض وتعارض نہ ہونے کا بیان

شیخ ابو جعفر علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ خداوند عالم کی کتابِ مُقدّس میں بعض ایسی آیات بھی ہیں کہ جن کی نسبت جہال یہ خیال کرتے ہیں کہ ان میں باہم اختلاف وتعارض ہے، حالانکہ ان میں کوئی اختلاف اور تناقض نہیں ہے۔ بطور مثال یہاں چند آیات درج کی جاتی ہیں۔ خدا فرماتا ہے: پس آج کے دن ہم بھی ان کو ایسا ہی بھلا دیں گے جیسا کہ وہ اس دن کے آنے کو بھولے ہوئے ہیں۔ وہ خدا کو بھول گئے۔ اللہ نے ان کو بھلا دیا۔ (سورۃ الاعراف:۵۱) ایک اور جگہ فرماتا ہے کہ تمھارے پروردگار کو نسیان نہیں ہوتا۔ (سورۃ مریم :۶۴) ایک اور مقام پر فرماتا ہے اس دن جس دن روح (جو جبرئیل سے بھی عظیم المرتبہ ہے) اور فرشتے صف بہ صف کھڑے ہوں گے مگر کوئی بات نہ کرے گا سوائے اس کے جسے خدائے رحمٰن اجازت دے گا اور وہ بات بھی صحیح کرے گا۔ (سورۃ نبأ : ۳۸)

تتمہ مُہمّہ

قرآن مجید میں اِختلاف کا نہ ہونا اس کے کلام اللہ ہونے کی بین دلیل ہے

یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ جھوٹے کے کلام میں ضرور اختلاف وتناقض ہوتا ہے اور سچے کے کلام میں اختلاف نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ خلاقِ عالم نے قرآن مجید کو اپنا کلامِ مُعجز نظام ہونے کا ایک بڑا معیار یہ بھی قرار دیا ہے کہ اس میں اختلاف نہیں ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتا ہے: ”ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا“ اگر یہ قرآن غیر خدا کا کلام ہوتا تو اس میں ضرور اختلاف ہوتا۔ لیکن اس میں اختلاف کا نہ ہونا اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ یہ خالق کلام کا کلام صداقت التیام ہے، جو لوگ اس میں تضاد وتعارض کا گمان کرتے ہیں یہ ان کے عقل وادراک کے قصور اور کج فہمی وکوتاہ اندیشی

تدرکه الابصار و هو یدرك الابصار و هو اللطیف الخبیر و قوله عزو جل ما کان لبشر ان یکلمه الله الا وحیا او من وراء حجاب ثم یقول و کلم الله موسیٰ تکلیما و قوله تعالیٰ و نادیهما ربهما الم انهکما عن تلکما الشجرة و قوله تعالیٰ لا یعزب عنه مثقال ذرة فی السموات و لا فی الارض	دوسرے مقام پر فرماتا ہے نظریں ان کو نہیں پا سکتیں، ہاں البتہ وہ بینائیوں کو پاتا ہے اور وہ باریک بین اور خبردار ہے۔ (سورۃ الانعام:۱۰۳) ایک جگہ فرماتا ہے: کسی بشر کے لیے یہ روا نہیں ہے کہ اللہ اس سے بات کرے سوائے اس کے کہ وحی کے ذریعہ سے ہو یا پس پردہ سے۔ (سورۃ شوریٰ:۵۱) پھر فرماتا ہے: موسیٰؑ سے خدا نے اس طرح کلام کیا جو کلام کرنے کا حق ہے۔ (سورۃ النساء:۱۶۴) ان کے پروردگار نے پکار کر ان سے کہا کیا میں نے تم دونوں کو اس کا پھل کھانے سے منع نہیں کیا تھا۔ (سورۃ الاعراف:۲۲) ایک مقام پر فرماتا ہے: تمھارے پروردگار سے زمین و آسمان کی ذرہ بھر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے

کا ثمرہ ونتیجہ ہے، جو ع

کم من عائب قولا صحیحا و أفته من الفهم السقیم

کا مصداق ہے۔ جو لوگ خالق کلام کے حقیقت ترجمان میں نقص وعیب نکالنے کی سعئ لاحاصل کرتے ہیں وہ درحقیقت اپنی خباثتِ نفس، جہالت وضلالت اور قلتِ علم وفہم کا اظہار کرتے ہیں۔ چنانچہ کتبِ سیروتواریخ میں کئی ایک ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ کئی کور باطن لوگوں نے اس قسم کی مذموم حرکتیں کیں۔ مگر کبھی اپنے مقاصدِ مشؤمہ میں کامیاب نہ ہو سکے اور ہو بھی کیونکر سکتے تھے جب کہ خالق اکثر خود اپنے کلام کا محافظ ہے۔ ع

فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

نیز اس کا مقابلہ ومعارضہ طاقت بشری سے مافوق ہے، جیسا کہ قبل ازیں اس پر تبصرہ کیا جا چکا ہے۔

ایک عجیب واقعہ

ان واقعات میں سے صرف ایک واقعہ یہاں پیش کیا جاتا ہے جو حضرت امام علی نقی علیہ السلام کے زمانہ کا ہے۔ ایک زندیق نے جو مختلف علوم میں کامل دسترس رکھتا تھا، بنام "تناقض القرآن" ایک کتاب لکھنا شروع کی جس میں اس نے بزعم خود بعض آیاتِ قرآنیہ میں اختلاف اور تناقض ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ جب امام علیہ السلام کو اس کی اس جسارت کا علم ہوا تو آپؑ نے اپنے

ولا اصغر من ذالك ولا اكبر الا فى كتاب مبين ثم يقول الله تعالىٰ ولا ينظر اليهم يوم القيامة ولا يزكيهم ثم يقول كلا انهم عن ربهم يومئذ لمحجوبون و مثل قوله تعالىٰ اامنتم من فى السماء ان يخسف بكم الارض فاذا هى تمور و قوله تعالىٰ الرحمن على العرش استوى ثم يقول و هو الله فى السموات و فى الارض

اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ بڑی مگر یہ کہ روشن کتاب میں سب موجود ہے (سورۃ سبا:۳) دوسرے مقام پر فرماتا ہے قیامت کے دن نہ ان کی طرف نظر کرے گا، نہ ان کو پاک کرے گا۔ یہ (کافر) لوگ اپنے پروردگار سے حجاب میں رہیں گے (سورۃ مطففین:۱۵) ایک مقام پر فرماتا ہے کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو جو آسمان میں رہتا ہے کہ تم کو زمین میں دھنسادے اور وہ زمین یکایک بھونچال میں آجائے (سورۃ ملک:۱۶) خدا عرش پر غالب ہے (سورۃ طٰہٰ:۵) دوسرے مقام پر فرماتا ہے خدا آسمانوں میں بھی ہے اور زمین میں بھی۔ تمھارے بھیدوں کو بھی جانتا ہے اور ظاہری حالات کو بھی اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ اس سے آگاہ ہے۔

اصحاب میں سے ایک شخص کو حکم دیا کہ تم جاکر اس زندیق کی شاگردی اختیار کرو اور اس کے ساتھ گھریلو روابط پیدا کرکے اس کا اِعتماد حاصل کرو اور جب وہ تم سے اچھی طرح مانوس ہوجائے تو اس سے یہ سوال کرنا کہ آیا یہ ممکن ہے کہ جو مطالب و معانی تم نے قرآن سے سمجھے ہیں وہ صحیح نہ ہوں اور خدا کا منشاء کچھ اور ہو؟ وہ فیلسوف ہے۔ یقیناً جواب اثبات میں دے گا۔ جب وہ اس امر کا اقرار کرلے کہ ہاں ایسا ممکن ہے! تو پھر تم اس سے کہنا: جب یہ ممکن ہے تو پھر تم یہ تناقض القرآن نامی کتاب لکھ کر کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہو۔ کیونکہ ممکن ہے کہ خدا کا منشا کچھ اور ہو اور تم کچھ اور سمجھ رہے ہو؟ چنانچہ اس صحابی نے یہ آخری سوال کیا تو وہ زندیق خاموش ہوگیا اور گہری سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر کے بعد اٹھا اور جس قدر کتاب کے اجزاء لکھ چکا تھا، ان کو پھاڑ ڈالا۔ زندیق نے اصرار کیا کہ بتاؤ تم نے یہ دلیل جمیل کہاں سے حاصل کی ہے۔ صحابی نے بہت کچھ لیت ولعل کے بعد اقرار کیا کہ حضرت امام علی نقی علیہ السلام سے حاصل کی ہے۔ یہ معلوم کرکے زندیق نے کہا: واقعاً وہی بزرگوار ایسی دلیل قائم کرسکتے ہیں۔ (احتجاج طبرسی)

یہ تو خالق اکبر کا کلام ہے اگر لوگ اسے نہیں سمجھ سکتے تو یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔ انسان تو اس قدر کم علم و عقل واقع ہوا ہے کہ وہ اپنے ابنائے نوع اہل علم کے کلام کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکتا۔ محقق عماد جناب میر سید محمد باقر داماد کے کلام پر ایک شخص اعتراض کرتا ہے۔ وہ جواب میں فرماتے ہیں:

يعلم سركم و جهركم و يعلم ما تكسبون و قال تعالیٰ ما يكون من نجوىٰ ثلثة الا هو رابعهم و لا خمسة الا هو سادسهم اينما كانوا و يقول عزوجل و نحن اقرب اليه من حبل الوريد و قال الله تعالیٰ هل ينظرون الا ان تاتيهم الملئكة او ياتي امر ربك

کسی راز میں تین شریک نہیں ہوتا کہ وہ خود ان کا چوتھا نہ ہو، اور پانچ شریک نہیں ہوتے کہ وہ ان کا چھٹا نہ ہو، اور نہ اس سے کم ہوتے ہیں اور نہ اس سے زیادہ مگر یہ کہ جہاں کہیں بھی ہوں خدا خود ان کے پاس ہوتا ہے۔ (سورۃ مجادلہ:۷) نیز فرماتا ہے: ہم اس کی شہ رگِ حیات سے بھی زیادہ قریب ہیں (سورۃ ق:۱۶) اب کیا وہ اس کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا تمھارا رب آئے (سورۃ نحل:۳۳) یا تمھارے پروردگار

"فهميدن کلام ما هنر است نه که بر ما اعتراض نمودن" تمھارے لیے ہمارے کلام کو سمجھ لینا ہُنر اور کمال ہے نہ کہ ہمارے اوپر اعتراض کرنا۔ (فوائد رضویہ)

غالب اور اقبال کا کلام موجود ہے۔ بڑے بڑے ایم اے پاس بلکہ پی ایچ ڈی ان کے بعض اشعار کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکتے بلکہ اپنی ناسمجھی سے ان اشعار کو ہی مُہمل قرار دے دیتے ہیں، حالانکہ عندالتحقیق ان کا ایک شعر بھی مُہمل نہیں۔ ان کے شارحین کلام کا باہمی اِختلاف حقیقت تک عدم رسائی کی قطعی دلیل ہے۔ پس جب عام لوگ اپنے جیسے انسانوں کا کلام نہیں سمجھ سکتے تو خالق کلام کے کلام مُعجز نظام کا صحیح مفہوم سمجھنے کا کیونکر دعویٰ کر سکتے ہیں؟ اس قسم کی مُتعدد آیات کلام پاک کے اندر موجود ہیں، جن کے متعلق زنادقہ ومُلحدین اور بعض کوتاہ اندیش ظاہر بین لوگ باہمی تعارض وتباین کا زعم باطل کرتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے چند آیات کا حضرت مُصنّف علام نے ذکر کر کے ان کی توضیح وتاویل کے سلسلہ میں حضرت امیرالمؤمنینؑ کی اس طولانی حدیث شریف کا حوالہ دیا ہے جو کتاب التوحید اور کتاب احتجاج میں مذکور ہے۔ نیز اس سلسلہ میں ایک مستقل کتاب لکھنے کا ارادہ بھی ظاہر فرمایا ہے۔ نہ معلوم وہ اس مقصد میں کامیاب ہوئے یا نہ؟ بظاہر تو کسی ایسی کتاب کا نام ان کی تالیفات میں نہیں ملتا۔ واللہ العالم۔

بہر حال اگرچہ ان آیات کی متکلمین ومُفسّرین نے بڑی تنقیحات وتوضیحات فرمائی ہیں اور تضاد و تعارض والے شبہ کے بڑے مکمل ومدلل جوابات دیے ہیں جس کے لیے مبسوط کتب کلام وتفسیر کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔ ہم سردست اس سلسلہ میں حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام کی حدیث شریف

او یاتی بعض آیات ربك و مثل قوله قل یتوفیکم ملك الموت الذی وکل بکم ثم یقول توفتهم رسلنا و هم لا یفرطون و قال تعالیٰ الذین یتوفهم الملئکة و قال الله تعالیٰ الله یتوفی الانفس حین موتها و مثل هذا فی القرآن کثیر فقد سئل عنها رجل من الزنادقة عن امیرالمومنین علیه الصلوة و السلام فاخبره بوجوه اتفاق معانی هذه الآیات و بین له تاویلها و قد

کی کچھ نشانیاں آئیں ۔ ایک مقام پر فرماتا ہے کہہ دو کہ وہ ملک الموت جو تم پر معین کیا گیا ہے وہ تم کو وفات دیتا ہے (سورۃ سجدہ:۱۱) پھر فرماتا ہے ان کو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) وفات دیتے ہیں ۔ اور وہ کسی طرح کوتاہی نہیں کرتے (سورۃ انعام:۶۱) نیز فرماتا ہے وہ لوگ جن کو فرشتے وفات دیتے ہیں دوسرے مقام پر فرماتا ہے موت کے وقت خدا نفسوں کو وفات دیتا ہے (سورۃ زمر:۴۲) اس قسم کی آیات قرآنِ مجید میں بکثرت موجود ہیں ۔ ایک مرتبہ ایک زندیق نے اس قسم کی آیات کے متعلق حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام سے استفسار کیا تھا اور آنجنابؑ نے ان آیات کی تاویل و تفسیر اور ان کے متحد المعانی ہونے کے تفصیلی اسباب و وجوہ بیان فرمائے تھے ۔

کے ترجمہ پر اکتفا کرتے ہیں ۔

مخفی نہ رہے کہ یہ حدیث بہت طویل الذیل ہے، جو کتاب التوحید مطبوعہ بمبئی کے قریباً دس صفحات تک پھیلی ہوئی ہے، جس میں اس قرآنِ ناطق کی زبانی قرآنِ صامت کی بیسیوں ایسی آیات کا صحیح حل موجود ہے ۔ ہم بنظر اختصار اس کے صرف اس حصہ کا ترجمہ کرتے ہیں جو ان آیات کے متعلق ہے جو متن رسالہ میں مذکور ہیں ۔

کلامِ امام علیہ السلام سے بعض مجمل آیاتؑ کا بیان

ایک آدمی نے حضرت امیرالمؤمنینؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ: یا امیرالمؤمنینؑ! میں کتاب اللہ کی صداقت کے متعلق بعض شکوک و شبہات میں مُبتلا ہو گیا ہوں ۔ ان کا ازالہ فرمائیں ۔ آنجنابؑ نے دریافت فرمایا کہ تجھے کیونکر شک لاحق ہوا؟ اس نے عرض کیا: بھلا کیونکر مجھے شک نہ ہو، جب کہ قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تکذیب کر رہا ہے ۔ حضرتؑ نے فرمایا: "ان کتاب الله یصدق بعضه بعضا و لا یکذب بعضه بعضا و لکنك لهم ترزق عقلا تنقنع به" ۔ کتاب اللہ کا ایک حصہ تو دوسرے حصہ کی تصدیق کرتا ہے نہ کہ تکذیب ۔ لیکن تجھے اس قدر عقل نہیں دی گئی جس سے تو فائدہ

اخـرجت الخـبر فی ذالك مسند ا لشرحه فی كتاب التوحيد و ساجـرد فی ذالك كتابا بمشيته و عونه تعـالیٰ تم بالخير و العافية

میں نے اپنی کتاب التوحید میں اس حدیث کو پوری سند اور شرح کے ساتھ لکھ دیا ہے اور ارادہ ہے کہ اس موضوع پر ایک مستقل کتاب تحریر کروں گا۔ ان شاء اللہ۔

تمت بالخیر

حاصل کر سکے۔ کلامِ امام سے (معلوم ہوا کہ یہ اختلاف کمیٔ عقل و خرد کا نتیجہ ہے) پھر آپؑ نے فرمایا: وہ آیات پیش کرو جن کے متعلق تجھے شک ہوا ہے۔ چنانچہ اس شخص نے وہ آیات پیش کرنا شروع کیں کہ ایک مقام پر خدا یوں فرماتا ہے: "فاليوم ننسىهم كما نسوا لقاء يومهم هذا" (سورة اعراف: ۵۱) پھر فرماتا ہے: "نسوا الله فنسيهم" ان آیتوں سے مُستفاد ہوتا ہے کہ اللہ کو نسیان لاحق ہوتا ہے۔ مگر ایک مقام پر ارشاد فرماتا ہے کہ: "و ما كان ربك نسيا" (سورة مریم: ۶۴) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم کو نسیان نہیں ہوتا۔ یہ تناقض نہیں تو اور کیا ہے؟ آپؑ نے فرمایا: ان آیات کا صحیح مطلب یہ ہے: "نسوا الله فی دار الدنيا لم يعملوا بطاعته فينساهم فی الأخرة لم يجعل لهم فی ثوابهم شيئا فصاروا منسيين من الخير" یعنی یہ لوگ دنیا میں اللہ سبحانہ کو بھول گئے۔ یعنی اس کی اطاعت و فرمانبرداری نہ کی۔ لہٰذا خدا آخرت میں ان کو بھول جائے گا یعنی ان کو کچھ اجر و ثواب عطا نہ کرے گا۔ گویا کہ وہ فراموش کر دیے گئے۔ خلاصہ یہ کہ ان کے فعل کی ان کو جزا دے گا۔ لہٰذا من باب المشاکلہ قدرت پر نسیان کا اطلاق کیا گیا ہے، ورنہ "ان ربنا تبارك و تعالیٰ علواً كبيرا ليس بالذی ينسى و لا يغفل بل هو الحفيظ العليم"۔ ہمارے پروردگار کی شان غفلت و نسیان سے اجل و ارفع ہے۔ یہ جواب باصواب سن کر یہ شخص بے ساختہ کہہ اٹھا: "فرجت عنی فرج الله عنك و حللت عنی عقدة فعظم الله اجرك" آپؑ نے میرے عقدے حل کر دیے ہیں۔ خداوند عالم آپ کو اس کا اجر عظیم عطا فرمائے۔ حضرت نے فرمایا: دوسرا شبہ کس آیت سے متعلّق ہے؟ اس نے عرض کیا کہ: ایک مقام پر خدا فرماتا ہے: "يوم يقوم الروح و الملائكة صفا لا يتكلمون الا من اذن له الرحمن و قال صوابا" (سورة نبأ: ۳۸) اور دوسرے مقام پر ارشاد فرماتا ہے کہ کفار کہیں گے: "والله ربنا ما كنا مشركين" (سورة انعام: ۲۳) ایک اور جگہ ارشاد فرماتا ہے: "و يوم القيامة يكفر بعضكم ببعض و يلعن بعضكم بعضاً" (سورة عنکبوت: ۲۵) ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بروزِ قیامت مجرم گفتگو کریں گے۔ مگر ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے: "اليوم نختم علىٰ افواههم و تكلمنا ايديهم و تشهد ارجلهم بما كانوا يكسبون"

(سورۃ یٰسین:۶۵) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مجرم نہیں بول سکے گا۔ کیونکہ ان کے مُونھوں پر مہریں لگی ہوئی ہوں گی۔ آنجنابؑ نے فرمایا: "فان ذالك فی مواطن غیر واحد من مواطن ذالك الیوم الذی کان مقدار خمسین الف سنة" یہ مختلف حالات روزِ قیامت کے مختلف مواطن ومقامات میں رونما ہوں گے۔ کیونکہ وہ دن پچاس ہزار سال کا ہوگا (جیسا کہ قرآن میں وارد ہے) بعض مقامات پر وہ باہم گفتگو کریں گے۔ ایک دوسرے سے بیزاری اختیار کریں گے۔ ایک دوسرے پر لعن طعن کریں گے۔ اور بعض ایک دوسرے کے لیے دعاء استغفار کریں گے اور بعض مقامات پر مجرموں کے مُونھوں پر مہریں لگائی جائیں گی۔ لہٰذا فی الحقیقت ان آیات میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ سائل یہ جواب باصواب سن کر بہت خوش ہوا۔ اور پھر وہی فقرے دہرائے جو پہلے کہے تھے۔ یعنی "فرجت عنی فرج الله عنك و حللت عنی عقدة فعظم الله اجرك"۔ پھر آنجنابؑ نے فرمایا: بتاؤ اور کس آیت میں شبہ ہے؟ اس نے عرض کیا کہ ایک مقام پر خدا ارشاد فرماتا ہے: "وجوه یومئذ ناضرة الی ربها ناظرة" (سورۃ قیامہ:۲۳) اس آیت سے مُستفاد ہوتا ہے کہ کچھ لوگ خدا کو بروزِ قیامت دیکھیں گے۔ مگر دوسرے مقام پر ارشاد فرماتا ہے: "لا تدرکه الابصار و هو یدرك الابصار و هو اللطیف الخبیر" (سورۃ الانعام:۱۰۳) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کوئی شخص اسے نہیں دیکھ سکتا۔ آنجنابؑ نے جو مفصّل جواب دیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ: "النظر الی ربهم النظر الی ما وعدهم ربهم فذلك قوله الی ربها ناظرة و انما یعنی بالنظر الیه النظر الی ثوابه تبارك و تعالیٰ"۔ یعنی یہاں اس آیت میں پروردگار کی طرف نگاہ کرنے سے مراد اس کے اجر وثواب کی طرف نگاہ کرنا ہے۔ پس خلاصہ معنی یہ ہوگا کہ "الی ثوابها ناظرة"۔ لہٰذا دونوں آیتوں کے درمیان کوئی تضاد وتعارض نہیں ہے۔ پھر امام عالی مقام نے ارشاد فرمایا: اور کس آیت کے متعلق شک ہے؟ اس نے عرض کیا: ایک مقام پر خلاقِ عالم فرماتا ہے: "وما کان لبشر ان یکلمه الله الا وحیا او من وراء حجاب او یرسل رسولا فیوحی باذنه ما یشآء" (سورۃ شوریٰ:۵۱) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی خدا کسی بندے سے بلا واسطہ کلام نہیں کرتا۔ مگر دوسرے مقام پر فرماتا ہے: "و کلم الله موسیٰ تکلیما (سورۃ النساء:۱۶۴) ربهما الم انهکما (سورۃ الاعراف:۲۲)......یا اٰدم اسکن انت و زوجك الجنة (سورۃ البقرۃ:۳۵) ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعض حضرات سے بلا واسطہ بھی کلام کرتا ہے؟ امام علیہ السلام کے جواب باصواب کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ اعتراض درحقیقت "الا وحیا" میں وحی کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے پر مبنی ہے۔ وحی کلام خدا ہے۔ "وکلام الله لیس علی طریق واحد منه ما کلم الله به الرسل و منه ما قذف فی قلوبهم و منه رؤیا یریٰها

الرسل و منه وحی و تنزیل یتلی و یقراء فھو کلام اللّٰہ "۔ خدا کا کلام ایک طریقہ پر نہیں ہوتا بلکہ اس کی مختلف صورتیں ہیں۔

ایک قسم وہ ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے رسولوں سے کلام کرتا ہے۔

دوسری قسم وہ کلام ہے جو ان کے قلوبِ مطہرہ میں القاو الہام فرماتا ہے۔

تیسری قسم وہ ہے جس میں بذریعہ خواب انبیاؑء سے ہم کلامی ہوتی ہے۔

چوتھی قسم وہ ہے جو بصورت تنزیلی انبیاء پر نازل ہوتی ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے اور اسے پڑھا جاتا ہے۔ لہٰذا بنابریں ان آیات میں ہرگز کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

سائل نے پھر فرطِ مسرت سے والہ و شیدا ہو کر کہا: "فرجت عنی فرج اللّٰہ عنك و حللت عنی عقدۃ فعظم اللّٰہ اجرك یا امیر المومنین"۔

آپؑ نے فرمایا: اور جس آیت میں شک ہے وہ بھی بیان کرو۔

اس نے عرض کیا: ایک مقام پر خدا فرماتا ہے: "وما یعزب عن ربك من مثقال ذرۃ فی الارض ولا فی السماء" (سورۃ سبا: ۳) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم سے کائنات کی کوئی شے مخفی و مستور نہیں ہے۔

مگر ایک اور جگہ فرماتا ہے: "ولا ینظر الیھم یوم القیامة ولا یزکیھم" (سورۃ آلِ عمران: ۷۷)

اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد فرماتا ہے: "کلا انھم عن ربھم یومئذ لمحجوبون" (سورۃ مطففین: ۱۵) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اس سے مخفی و محتجب ہوں گے۔ یہ تناقض نہیں تو اور کیا ہے؟

آنجنابؑ نے فرمایا: آیت مبارکہ "لا ینظر الیھم" سے مراد یہ ہے کہ ان کو کچھ اجر و ثواب عطا نہیں فرمائے گا۔

عرب کہتے ہیں: "لا ینظر الینا فلان" فلاں شخص ہماری طرف نگاہ نہیں کرتا۔ "ای لا یصیبنا منه خیر" یعنی ہمیں کچھ عطا نہیں کرتا۔

اسی طرح "کلا انھم عن ربھم یومئذ لمحجوبون" سے مراد یہ ہے کہ "عن ثواب ربھم محجوبون" وہ اپنے پروردگار کے اجر و ثواب سے محتجب و مستور رہیں گے۔ نہ یہ کہ خود ذاتِ ایزدی سے پوشیدہ ہوں گے۔ پھر فرمایا: اور کسی آیت میں شبہ ہے؟

اس شخص نے عرض کیا: ایک مقام پر خدا فرماتا ہے: "الرحمن علی العرش استوی" (سورۃ طٰہٰ: ۵)

دوسری جگہ فرماتا ہے: "وھواللّٰہ فی السماء الٰہ وفی الارض الٰہ" (سورۃ زخرف: ۸۴)
ایک اور مقام پر فرماتا ہے: "ھومعکم این ماکنتم" (سورۃ الحدید: ۴)
ایک اور جگہ فرماتا ہے: "نحن اقرب الیہ من حبل الورید" (سورۃ ق: ۱۶)

پہلی آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا عرش پر ہے۔ دوسری سے یہ مُستفاد ہوتا ہے کہ وہ آسمان وزمین میں ہے۔ تیسری آیت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ ہر شخص کے ساتھ ہے۔ چوتھی سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شہ رگِ حیات سے بھی زیادہ قریب ہے۔ یہ تضاد نہیں تو اور کیا ہے؟

آنجنابؑ نے فرمایا کہ تم نے صفاتِ خداوندی کا قیاس مخلوق کی صفات پر کیا ہے، حالانکہ اس سے اس کی شان اجل وارفع ہے۔ وہ لا مکان ہے، اس کا کوئی مکان نہیں ہے۔ علی العرش استویٰ کے معنی یہ ہیں کہ وہ عرش پر غالب ہے اور اس کے زمین و آسمان میں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ زمین و آسمان میں معبود ہے اور اس کے ہر جگہ ہونے کا مفہوم ہے کہ وہ علمی اعتبار سے ہر شئے کو محیط ہے۔ وہی تمام اشیاء عالم کا مدبر و منتظم ہے۔

اس کے بعد امام عالی مقام نے فرمایا: اور جس آیتِ مبارکہ میں تجھے شک ہے اس کا بیان کرو۔
سائل نے عرض کیا کہ ایک مقام پر خدا فرماتا ہے: "وجاء ربك والملك صفا صفا" (فجر: ۲۲)
دوسرے مقام پر ارشاد فرماتا ہے: "ھل ینظرون الا ان یاتیھم اللّٰہ فی ظلل من الغمام و الملائکۃ" (سورۃ البقرۃ: ۲۱۰)

ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بروزِ قیامت خود خدا آئے گا۔ دوسرے مقام پر فرماتا ہے: "یوم یاتی بعض أیات ربك لا ینفع نفسا ایمانھا لم تکن أمنت من قبل او کسبت فی ایمانھا خیرا" (سورۃ الانعام: ۱۵۸) ان آیات سے بعض آیاتِ ربانیہ کا آنا ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا ان آیتوں میں کھلا ہوا اختلاف موجود ہے۔ آنجنابؑ نے فرمایا کہ جن آیات میں خدائے عزوجل کا آنا مذکور ہے اس کا اس طرح آنا مراد نہیں جس طرح مخلوق آتی جاتی ہے، بلکہ اس سے خدا کے حکم کا آنا مراد ہے یا اس سے مراد اس کے عذاب کا آنا ہے۔ چنانچہ ایک اور مقام پر ارشاد فرماتا ہے: "فاتھم اللّٰہ من حیث لم یحتسبوا" (سورۃ حشر: ۲) خداوند عالم ان کے پاس اس جگہ سے آیا جہاں سے ان کو گمان بھی نہ تھا۔ اس سے مراد یہی ہے کہ "ارسل علیھم عذابا" کہ ناگہانی طور پر خدا نے ان پر عذاب نازل کیا۔ اسی طرح آیت مبارکہ "فاتی اللّٰہ بنیانھم من القواعد" (سورۃ نحل: ۲۶) سے مراد بھی نزولِ عذاب و عقاب ہے۔ اور تیسری آیت جس میں ملائکہ یا بعض آیات کے آنے کا تذکرہ۔ اس سے مراد یہ ہے

کہ وہ کفار و مشرکین جو خدا اور رسولؐ پر ایمان نہیں لائے وہ ہر وقت اس بات کا انتظار کرتے رہتے ہیں کہ ان کے پاس ملائکہ عذاب یا حکم پروردگار یا بعض آیات یعنی دارِ دنیا میں عذاب نازل ہو۔ اور آخری آیت میں بعض آیات سے آنے سے مغرب سے طلوعِ آفتاب مراد ہے (جو کہ ظہور حضرت قائم آلِ محمدؐ کے وقت ہوگا) پھر آنجنابؑ نے فرمایا اور جس آیت مبارکہ کے بارے میں تمھیں شک ہے اسے بیان کرو۔ سائل نے کہا: ایک مقام پر خداوند عالم فرماتا ہے: "قل یتوفاکم ملك الموت الذی وکل بکم ثم الی ربکم ترجعون" (سورۃ السجدہ: ۱۱) دوسرے مقام پر ارشاد فرماتا ہے: "الله یتوفی الانفس حین موتها" (سورۃ زمر: ۴۲) ایک اور جگہ فرماتا ہے: "قال الذین تتوفاهم الملائکة" (سورۃ النحل: ۲۸) پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک الموت مارتا ہے۔ دوسری آیت سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ مارتا ہے اور تیسری آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ بہت سے ملائکہ مارتے ہیں۔ اس قدر واضح اختلاف کے باوجود میں کس طرح قرآن میں شک نہ کروں۔ اگر آپ میری حالتِ زار پر رحم نہ کریں اور میرے لیے شرح صدر کا انتظام نہ فرمائیں تو میں ہلاک و برباد ہو جاؤں گا۔ امام عالی مقامؑ نے فرمایا کہ ان آیات میں ہرگز کوئی تعارض و اختلاف نہیں ہے۔ کیونکہ خداوند عالم ہی حقیقی مدبر اور ناظم الامور ہے۔ وہ جس طرح چاہتا ہے معاملات کی تدبیر فرماتا ہے۔ جب کسی شخص کو مارنا چاہتا ہے تو بعض کے پاس ملک الموت کو بھیجتا ہے اور بعض کے پاس دوسرے ملائکہ کو۔ "یدبر الامر کیف یشاء" اور چونکہ یہ سب کچھ خدائے حکیم کے حکم سے ہوتا ہے، لہٰذا وہ محی و ممیت کہلاتا ہے۔ سائل نے خوش و خرم ہو کر کہا: "فرجت عنی فرج الله عنك یا امیرالمومنین و نفع الله بك المسلمین"۔ وارد ہے کہ وہ شاک و مرتاب شخص جناب امیر علیہ السلام کے کلام حقائق ترجمان کی برکت سے تائب ہو کر کامل الایمان بن گیا۔

وأخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین و صلی الله علی سید الانبیاء و المرسلین و أله الطیبین الطاهرین المعصومین تم الکتاب و الحمد لله الوهاب الذی وفقنی لاتمام هذا الشرح المستطاب ببرکة النبی و أله الاطیاب و ارجو من الطافه الخفیة و الجلیة ان ینفع به کل مومن و کل جاحد مرتاب و یهدیهم الی جادة الرشد و الصواب و یجعل ذلك ذخرالی و لوالدین و ولدی و اساتیذی و تلامیذی یوم المأب و کان الفراغ من تسویدہ یوم الاثنین الرابع و العشرین من ربیع الاول ۱۳۸۴ سنہ المصارف لثالث الغسطمس ۱۹۶۴ سنہ بالساعة الخامسة بعد الزوال ختم الله سبحانه امورنا بالحسنی بالخمسة النجباء و رزقنا حسن الخاتمة بالنبی المصطفی و الوصی المرتضی و الحسن المجتبی و الحسین سید الشهداء و فاطمة الزهراء و

اولادھا الکرام البررۃ الاتقیاء

و فقنا اللہ لاعادۃ النظر علیہ و اخراجہ من السواد الی البیاض یوم الثلاثا الرابع و العشرین من ذی الحجۃ الحرام ۱۳۸۴ھ یوم المباھلۃ الموافق للسابع و العشرین من ابریل ۱۹۶۵ء بعد الساعۃ الخامسۃ و فرغنا من اجالۃ النظر علیہ و اعدادہ للطبع الثانی بعد الاضافات المفیدۃ یوم الاربعاء السابع و العشرین من جمادی الاولیٰ ۱۳۹۱ھ المطابق لحادی و العشرین من جولائی ۱۹۷۱ء بالساعۃ الحادیۃ عشر و الحمد للہ اولا و آخرا و ظاھرا و باطنا، و صلی اللہ علی خیر خلقہ محمد و آلہ الطاھرین

خاتمۃ العوائد در نقل بعض تقاریظ احسن الفوائد

① مرجع اکبر تقلید شیعیانِ جہان سرکار آیت اللہ السیّد محسن الطباطبائی الحکیم

مدظلہ العالی علیٰ رؤوس المؤمنین

سرکار موصوف ایک احسان نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:

جناب مُستطاب عماد الاعلام ثقۃ الاسلام والمسلمین آقائی شیخ محمد حسین دامت برکاتہ پس از ابلاغ سلام اِنشاء اللہ تعالیٰ مؤیّد مسدّد بودہ خواہید بود تالیف منیف "احسن الفوائد" بوسیلہ جناب مُستطاب ثقۃ الاسلام والمسلمین آقائی آقا صادق علی نقوی دامت برکاتہ واصل گردید، البتّہ خدماتِ حضر تعالی درراہ دین وایمان وتشئیدِ عقائد نزد حضرت ولی عصر اروا حنا فداہ ذخیرہ خواہد بود خداوند بر تائیداتِ حضر تعالیٰ بیفزاید کتاب را در کتابخانہ عمومی ایں جانب جامی وادیم تا مورد استفادہ عموم گردد والتماسِ دُعا داریم کما لا انساکم والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

محسن الطباطبائی الحکیم

(۶ شوال ۱۳۸۶ھ)

② سرکار استاذ العُلماء حضرت مولانا سید محمد باقر صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ

شفقت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:

تسلیم بعد تعظیم کتاب مُستطاب پہنچ گئی، بے حد شکر گزار ہوں۔ خداوند کریم تربیت ایتام آلِ محمد علیہم السلام و اِفادہ و اِعانت سادات و مومنین کے لیے تادیر زندہ وسلامت رکھے۔ بحرمت حبیبہ محمد و آلہ الطاہرین علیہم افضل صلوٰۃ المصلین۔ میں نے آپ کی کتاب مُستطاب کو حرف بحرف سنا تھا، لیکن اِس وقت اِجمالی طور پر اِس قدر یاد ہے کہ کتاب نہایت مُفید ہے، اور اِس سے میری معلومات میں کافی اِضافہ ہوا ہے۔

دعا گو: محمد باقر

از بدھ رجبانہ یکم ستمبر ۱۹۶۵ء

③ سرکار خطیب اعظم جناب مولانا سید محمد صاحب قبلہ دہلوی
صدر مطالبات کمیٹی آل پاکستان

تحریر فرماتے ہیں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم، و الحمد للہ و الصلوٰۃ علی اھلھا اما بعد

حقیر نے حامیانِ ملت جعفریہ کے شاہکار "احسن الفوائد" کا جگہ جگہ سے مطالعہ کیا، اور ناشر و محترم مترجم اور حضرت حجۃ الاسلام مولوی محمد حسین صاحب قبلہ کی جانکاہی کو عبارات میں دیکھا۔ اس زمانہ میں جب کہ مذہبی اُمور پر لوگوں کو عبور نہیں رہا، ضروری مسائل ملت جعفریہ کو جس انداز میں حل کیا گیا ہے وہ لائق ہزار ستائش ہے۔ نیز مکتبہ ہمدانی کی ہمت پر آفرین ہے کہ اُس نے چھوٹے ناتمام رسالوں کی جگہ ایک ضخیم تحقیقی کتاب قوم کے سامنے پیش کر دی۔

حضرت حجۃ الاسلام نے اس مختصر عہد میں جو قلمی جہاد فرمایا ہے اور بلا خوف جس انداز سے مخالفین کے اعتراضات کو دفع فرمایا ہے وہ انہی جناب کا حصّہ ہے۔ عامیانہ اعتراضات کو سنجیدہ اور مہذب طریقہ سے دفع کرنا ان جناب کا امتیازی کارنامہ ہے، جن مومنین کے دِل محبت مذہب حقیقی میں سرشار ہیں جو معلومات مذہبی کو ذریعہ نجات تصور کرتے ہیں جو معصومین علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بتلائے ہوئے مذہب کو عقل و علم و قرآن کی روشنی میں دیکھنا چاہتے ہیں اُن پر اِس کتاب کا مطالعہ واجب ہے کہ جس میں ہر عقیدہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور عقائد کا کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا کہ جس کو شمع تحقیق کی روشنی میں اُجاگر نہ کیا ہو۔ شکر اللہ سعیہم

السیّد محمّد دہلوی
فردوس کالونی کراچی نمبر ۱۸

④ عمدۃ المحققین علامہ مفتی جعفر حسین صاحب گوجرانوالہ
ممبر اسلامی مشاورتی کونسل پاکستان

تحریر فرماتے ہیں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم، الحمد للہ الفرد الصمد الواحد الذی اقام علی فردانیتہٖ الشواھد و تعالیٰ فی علوّ ذاتہٖ من ان تحویہ المشاھد و الصلوٰۃ الزکیۃ البھیۃ علی رسولہ المبعوث بجوامع الکلم و توضیح المقاصد الذی رفع للدین قواعد و انشأ للعلم معاھد و نصب الاعلام لتسدید ما فسد من

العقائد واوجداه و لاقتفاء آثارهم نفائس الفرائد و احسن الفوائد و علی آله الغرّ الالباب الا ماجد اولی الفواضل والفضائل والمحامد ما طلع النجوم و لمع الفراقد

شیعی اصول کی بنیاد عقل پر ہے، عقل ہی ایک خالق وصانع کی طرف راہنمائی کرتی ہے، عقل ہی تصدیق انبیاء کی دعوت دیتی ہے اور عقل ہی حافظان دین کی ضرورت بتاتی ہے ۔ جب عقل اللہ کی الوہیت وحدانیت، پیغمبر اسلام ﷺ کی نبوت وصداقت ائمہ معصومین علیہم السلام کی امامت وولایت کی طرف رہبری کرتی اور توحید ونبوت وامامت کے اقرار پر مجبور کرتی ہے تو ان کی تصدیق کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی صحت، حدیث رسولؐ کی حجیت اور ائمہ معصومینؑ کے اقوال کی صداقت پر یقین کیا جائے ۔ شیعہ اتباع رسولؐ اور قرآن و ائمہ آطہارؑ سے تمسک ووابستگی کو اپنے لیے ذریعہ نجات سمجھتے ہیں اور انہی کو احکام شرعیہ کا سرچشمہ مانتے ہیں اور اُن کے اُصول ومُسلمات کو جہاں عقل کی تائید حاصل ہے وہاں قرآن وحدیث اور آثارِ معصومینؑ بھی اُن سے مُتفق ہیں ۔ مگر کچھ مُتعصب وتنگ نظر افراد نے شیعی مُعتقدات کی غلط تعبیر کر کے اصل عقائد کو بھیانک صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور مُتعہ کو زنا سے، تقیّہ کو جھوٹ سے اور بداء کو عقیدۂ جہل سے تعبیر کر کے اور تحریف قرآن وسب صحابہ وغیرہ کی ان کی طرف نسبت دے کر نہ صرف اُن سے نفرت کدورت کی داغ بیل ڈالی ہے بلکہ بعض حضرات نے انھیں خارج از اسلام قرار دینے میں بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی ۔ یہ کچھ تو ناروا عصبیّت کی بنا پر ہے اور کچھ شیعی کتب وشیعی مُعتقدات سے ناواقفیت کی وجہ سے ہے ۔ ضرورت تھی کہ شیعوں کے عقائد و مُسلمات کو ادلّہ وبراہین کے ساتھ پیش کیا جائے تاکہ شیعیت کا صحیح تعارف ہوسکے، اور طالبانِ حق کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوسکیں ۔ اگرچہ عربی زبان میں کافی ووافی سرمایہ موجود ہے مگر ضرورت تھی کہ عامۃ مسلمین کے لیے اُردو زبان میں ایسا مواد مہیا کیا جائے جو شیعی خدوخال کو واضح کرسکے ۔

الحمد للہ کہ العلامۃ الحجۃ جناب مولانا محمد حسین صاحب دامت برکاتہ صدر مدرس مدرسہ محمدیہ سرگودھا نے اس ضرورت کو محسوس فرمایا اور العلم العلیم الشیخ الاکرم ابو جعفر الصدوق رحمہ اللہ کی مشہور ومعروف کتاب "اعتقادیہ شیخ صدوق" کی اُردو میں بسیط شرح لکھ کر عصر حاضر کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے ۔ حقیر نے اس کتاب مُستطاب کو من الباب اِلیٰ المحراب دیکھا اور اس کے مطالب عالیہ سے مُستفید وشرف یاب ہوا ۔ ہر بحث جامع ومانع اور ہر لحاظ سے مکمل ہے ۔ شارح ممدوح نے ابتداء میں علم کلام کی تدوین وتاریخ پر ایک سیر حاصل تبصرہ فرمایا ہے، اور شیعہ علماء متکلمین کا ایک مختصر ومجمل تعارف بھی تحریر کیا ہے، اگرچہ دیباچہ میں تفصیلی حالات کی گنجائش پیدا نہیں کی جاسکتی، تاہم بعض افراد کی علمی

رفعت وجلالت کا تقاضا یہ ہے کہ آئندہ اِشاعت میں جتنا اِضافہ ان کے متعلق ہو سکے، کر دیا جائے۔ خُصُوصًا حضرت اُستاذ الکل العالم المتکلم مولانا سید ظہور حسین الباہروی طاب ثراہ کے علمی وکلامی خدمات کا مزید تعارف کرایا جائے۔ اور اس سلسلہ میں ان کے بسیط مؤلفات کا تذکرہ کیا جائے تاکہ ان کی عظیم خدمات کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ بہر حال یہ دیباچہ مُفید اور معلُومات افزاء ہے اور چالیس صفحات تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے بعد اصل کتاب کا آغاز توحید باری سے ہوتا ہے، توحید کے معنی ایک واحد ہستی کے اِعتراف کے ہیں۔ اس لیے مُصنّف نے اِثباتِ صانع عالم کے دلائل درج کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی، کیونکہ ہستی باری کے اِعتراف کالازمہ عقیدہ توحید ہے اور عقیدہ کالازمہ اِعتراف ہستی باری ہے۔ اور جن دلائل سے اِثباتِ توحید ہوتا ہے اُنہی دلائل سے ہستی باری کا اِعتراف ناگزیر ہوجاتا ہے۔ مگر شارح دام فضلہ نے "صانع عالم کی ہستی کا ثبوت بدیہی ہے" کے عنوان سے علماء متکلمین عرفاء وسالکین کے دلائل بھی سادہ واضح عبارت میں تحریر فرمادیے ہیں اور مادیین ودہریین کے شکوک وشبہات کا اِزالہ بھی فرمادیا ہے۔ علم کلام میں صفاتِ باری کا مسئلہ بھی جولانگاہ افکار اور محل نزاع رہا ہے۔ اس طرح کہ کوئی ذات وصفات میں تغایر کا قائل ہے، اور کوئی ان دونوں میں مغایرت کا قائل نہیں ہے اور کوئی لاعین ولاغیر کا ناقابلِ فہم عقیدہ رکھتا ہے۔ مولانائے موصوف نے اس مسئلہ کو بھی پوری وضاحت سے تحریر کیا ہے اور عینیّت صفات پر عقل ونقل سے روشنی ڈالی ہے۔ اسی طرح تمام اُصول دین اور اُن سے متعلقہ اُمور پر تفصیلی بحث فرمائی ہے اور ہر مسئلہ کو مُتعدد دلائل وبراہین سے واضح کیا ہے۔ خُصُوصًا غُلُوّ وتفویض کی ردّ احسن طریقہ سے کی گئی ہے، اور خطبۃ البیان اور غالیوں کے دُوسرے تمسّکات کی پوری تردید فرمائی ہے۔ غرض یہ کتاب شیعی عقائد کا آئینہ دار ہے اور مذہب حقہ کی صداقت کا شاہکار ہے۔ ہر پڑھے لکھے شیعہ کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہے، تاکہ وہ اپنے مُعتقدات کو بدلائل جان سکے اور دُوسرے طالبانِ حق کے لیے بھی اِس کا مطالعہ ضروری ہے تاکہ تلاشِ منزل میں یہ صحیفہ ان کے لیے شمع راہ ثابت ہو۔

خداوند عالم مُصنّف ممدوح کے توفیقات میں ازدیاد فرمائے تاکہ وہ تدریسی، منبری مشاغل کے ساتھ ساتھ تحریری مشاغل بھی جاری رکھ کر مذہب حق کی خدمت کرتے رہیں، اور حامیانِ ملت بیضا اور ناصرانِ آلِ طٰہٰ میں محسوب ہوں۔

جزاہ اللہ عنا خیر الجزاء فقد اجاد فیما افاد و اتٰی بما ھو فوق المراد

(علامہ مفتی) جعفر حسین (گوجرانوالہ)

⑤ مجاہد ملت ضیغم پاکستان مولانا مرزا احمد علی صاحب قبلہ مدظلہ

تحریر فرماتے ہیں:

حضرات اہلِ بیت علیہم السلام کے دامن مُقدّس سے متمسکین علماء وفقہاء میں سے جن بزرگواروں کے اسماء گرامی سرفہرست نظر آتے ہیں، ان میں حضرت صدوق علیہ الرحمہ کا اسم مبارک ہے جنھوں نے تقریر و تدریس وتحریر سے مذہب حق کی اشاعت میں حتی الامکان کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ۔آپ کی تصنیفاتِ جلیلہ میں سے رسالہ اعتقادیہ مشہُور ہے، جس میں آپ نے قرن چہارم میں حقانی عقائد کو احسن اسلوب سے بیان کیا ۔مجھے تحقیق سے یہ معلوم ہوا کہ خاندان نبوت کے مبارک افراد کے ذریعہ ابتداء ہی میں ادھر افریقہ میں اسلام کی آواز پہنچ گئی اور ادھر ایران عراق وعلاقہ پاکستان میں بھی حق کی آواز پہنچ گئی ۔اس کے بعد قرونِ وسطیٰ میں پہلے تو حضرت قاضی نور اللہ شوستری اعلیٰ اللہ مقامہ کو شہنشاہ اکبر نے لاہور میں مملکت مغل کا قاضی القضاۃ چیف جسٹس مقرر کیا، خلد آشیاں قضا کے علاوہ راتوں میں اعلیٰ درجہ کی مذہبی کتابیں لکھتے رہے ۔جن میں سے احقاق الحق اول درجہ کی کتاب ہے اور مجالس المؤمنین متمسکین کے کوائف میں ہے ۔ اِشاعتِ حق ہی کی وجہ سے خلد آشیاں درجہ شہادت پر فائز ہوئے ۔پھر ایک دَور آیا جس میں بٹالہ کے ہمدانی سادات کا خاندان تمام لوگوں کے لیے مرکز تعلیم بنا ۔پھر انقلابی دَور میں ارسطو جاہ حضرت علامہ سید رجب علی شاہ صاحب بھاکری نے دین حق کی بڑی خدمت کی اور پاکستان کے سادات ومومنین کی بیداری آپ ہی کی توجہ کا نتیجہ تھی ۔آپ نے اپنے فرزند ارجمند حضرت شریف العُلماء مولانا سید شریف حسین صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ کو اپنا جانشین چھوڑا، جنھوں نے جگراؤں ضلع لدھیانہ میں مُختلف علوم کے درس جاری کیے، اور وہاں سے سینکڑوں مُستفید ہوئے ۔ان میں سے استاذ العُلماء حضرت مولانا سید محمد باقر صاحب قبلہ ابھی تک زندہ ہیں، اور باوجود نابینائی کے خدمت دین کر رہے ہیں ۔انھیں کے تلامذہ نے پنجاب میں دینی علوم کی آبیاری کی اور کر رہے ہیں، جن میں ایسی قابلِ قدر ہستیاں موجود ہیں جن جیسا علوم عربیہ کا مدارس بھارت و پاکستان میں نہیں ملتا ۔موالیانِ اہلِ بیتؑ کے دینی مدارس میں سے سرتاج دار العُلوم محمدیہ سرگودھا ہے، جس کی سرپرستی شروع ہی سے حضرات سادات عظام جہانیاں شاہ فرما رہے ہیں ۔انھی کی سرزمین سے یہ دریے بہا نکلا، جس نے یہاں اور مرکز علوم نجف اشرف سے فیوض علوم پاکر دار العُلوم محمدیہ کو چار چاند لگا دیے ۔حضرت شیخ الجامعہ محمدیہ سرگودھا ان قابلِ قدر و لائق فخر وجودوں میں سے ہیں جن کے وجود ذی جود پر موالیانِ اہلِ بیتؑ جتنا فخر کریں کم ہے ۔آپ کے زیرسایہ کئی افاضل کرام جامعہ میں کام کر رہے ہیں، اور آپ ان کے پرنسپل ہیں ۔طلباء کی تعداد بہت کافی ہے ۔حضرت

شیخ الجامعہ نگرانی کے علاوہ خود بھی اہم علوم کے درس دیتے ہیں، اور لطف پر لطف یہ ہے کہ آپ صرف زبان مبارک ہی سے علوم عربیہ و دینیّہ کی تعلیم نہیں دیتے بلکہ ترویج و تبلیغ دین حق میں آپ کا دست مبارک بھی چلتا رہتا ہے اور دار العُلوم محمدیہ کے ماہوار رسالہ "المبلّغ" میں آپ کے علمی و تبلیغی شاہکار شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس پر مزید یہ ہے کہ اتنی مصروفیتوں کے باوجود آپ نے حال ہی میں مذکور الصدر ضخیم کتاب شائع کی ہے جس کا حجم ۵۲۰ صفحہ ہے۔ ابتداء میں آٹھ صفحوں پر فہرست مضامین ہے، ہر صفحہ میں ۵۸۴ الفاظ، کل کتاب میں قریباً تین لاکھ ساڑھے چار ہزار الفاظ ہیں۔ ترجمہ اِعتقادیہ فاضل کامل جناب مولانا سید منظور حسین صاحب بخاری نے کیا ہے اور مکمل شرح کہف المومنین صدر المحققین سلطان المتکلمین زین المحدّثین حجۃ الاسلام والمسلمین حضرت علامہ محمد حسین صاحب قبلہ مجتہد مدظلّہ علیٰ روٴس المومنین نے فرمائی ہے۔ کتاب کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کتاب کے مواد کو جمع کرنے اور کتاب کو تالیف کرنے میں اپنے آرام و راحت کو قربان کر کے اپنا کتنا قیمتی وقت صرف کیا ہوگا۔ اس چھوٹے سے رسالہ کی شرح میں آپ نے کتنا زور لگایا ہے کتنی دماغی قوت صرف کی ہے، حقیقت ہے کہ اِعتقادیہ کی شرح میں اتنی ضخیم شرح ایک ہزار سال میں بھی نہیں لکھی گئی۔ آپ نے اس شرح میں تمام مذہبی اُصول پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اُصولِ اِسلام و ایمان کو پرانے علوم ہی سے نہیں بلکہ موجودہ زمانہ کی نئی تحقیقات سے بھی مؤید فرمایا ہے، اور اسلام کے اُصول کو براہین عقلیہ و نقلیہ سے ایسا مضبوط و مؤکّد کیا ہے کہ مُنصف مزاج کو قبول کرنے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ زبان اُردو کو بھی شاندار طریق سے اِستعمال کیا ہے، اور پیوست مضامین کو دُور کرنے کے لیے جا بجا موزوں اشعار کا اِنتخاب بھی موجود ہے۔ اپنی قوم کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا، اور دُوسروں کو اپنی باتیں سمجھانے کے لیے "جادلهم بالتی هی احسن" پر عمل کرتے ہوئے احسن طریق پر عمل کیا ہے۔ کاغذ، کتابت، طباعت دیدہ زیب ہیں۔ غرض کتاب اس شعر کی مصداق ہے:

زِ سَر تا پا ہر کجا کہ مے نگرم	کرشمہ دامن دِل می کشد کی جا اینجاست

مکتبہ ہمدانی دار العُلوم محمدیہ بلاک نمبر ۱۹ سرگودھا نے اسے چھپوایا ہے، ہدیہ قسم اول دس روپے، قسم دوم سات روپے ہے۔ ہم جلیل القدر مُصنّف علام کی خدمت میں اس بے نظیر تالیف و تصنیف کے لیے ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے علم و فضل و عمل میں برکت دے اور ان کی زبان اور ان کے قلم سے اہلِ اِسلام کو ہمیشہ مُتمتّع کرے اور ان کو باقیات الصالحات عطا فرمائے۔ آمین

اقل خدام دین مرزا احمد علی ۲۰ جولائی ۱۹۶۵ء

⑥ اُستاذ العُلماء حضرت مولانا سید محمد یار شاہ صاحب قبلہ مدظلّہ

تحریر فرماتے ہیں:

بسم الله الرحمن الرحيم، عونك اللّٰهم و تيسرك و صلّ علیٰ افضل الخلق مطلقا و علی الاصفياء من عترته اما بعد فانا طالعنا اكثر مقامات احسن الفوائد فوجدناه كمتنه كتابا قيما يرتضيه العالم الاواه المنيب و يميل عنه الغمر الجاهل المريب و الذى فلق الحبة و برء والنسمة يعرض على القارى خلاصة الاسلام كما هو عن جانيه بلا افراط و تفريط لا يحبه الا مومن و لا يبغضه الا منافق جزى الله الشارح و وفقه لكل خير و هو الفاضل الالمعى الوعى العالم الكيّس الفقيه المشيل محمد حسين الجهانيان شاهى رئيس الاساتذه فى الكلية المحمديه سرگودها

خطبہ مسنونہ کے بعد ہم نے کتاب "احسن الفوائد"...... کے اکثر مقامات کا مطالعہ کیا ہے اور اسے متن عقائد شیخ صدوق کی طرح ایک گرانقدر کتاب پایا ہے، جسے ہر عالم عامل پسند کرتا ہے اور جاہل مُطلق ناپسند۔ اس ذات کی قسم جس نے دانہ کو شگافتہ کیا اور روح کو پیدا کیا ہے کہ یہ کتاب پڑھنے والے پر بلا کم و کاست بانیٔ اِسلامؑ کے حقیقی اِسلام کا خلاصہ پیش کرتی ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے جسے پسند نہیں کرتا، مگر مومن، اور ناپسند نہیں کرتا مگر منافق۔ خدا اِس کے شارح فاضل المعی عالم عقلی فقیہ الشیخ محمد حسین جہانیاں شاہی کو جو کہ دارالعُلوم محمدیہ سرگودھا میں رئیس المدرسین ہیں، جزائے خیر دے اور ہر عمل خیر کے لیے انھیں موفق فرمائے۔

السّید محمد یار

⑦ اِمدادُ الملّۃ حضرت مولانا سید امداد حسین صاحب قبلہ کاظمی مدظلّہ

تحریر فرماتے ہیں:

رئیس الفقہاء والمحدّثین صدوق الملّۃ والدین سرکار علامہ الشیخ ابو جعفر محمد بن علی بن الحسین بن موسیٰ بن بابویہ القمی اعلی اللہ مقامہ المتوفی ۳۸۱ ہجری کا جو مقام اور مرتبہ مذہب شیعہ اثناعشریہ کثرہم اللہ فی البریہ کے نزدیک ہے، وہ محتاجِ تعارف و بیان نہیں۔ ان کی ذات بابرکات ہر قسم کی تعریف و توصیف سے مُستغنی ہے۔ آپ متکلّم لاثانی مناظر ربانی عالم اجل مُحقّق بے بدل، محدث بے عدیل، فقیہ بے نظیر، فاضل مقبُول اور جامع معقول و منقول گزرے ہیں۔ یوں تو آپ قریباً تین سو کتابوں کے مُصنّف ہیں اور علم کلام میں بھی آپ کی کئی تصنیفات ہیں لیکن علم کلام میں آپ کی ایک تصنیف "اِعتقادیہ" ہے،

جو "اعتقادیہ شیخ صدوق" کے نام سے مشہور ہے، اسے آپ نے ۳۶۸ ہجری یعنی اپنی وفات حسرت آیات سے قریبًا تیرہ سال قبل لکھا تھا، جسے علماء ذوی الاحترام نے آج تک حرزِ جان بنائے رکھا۔ کیوں کہ اس میں مذہب حقہ کے عقائد کا مکمل احصاء کیا گیا ہے۔ ہر دَور میں اس کے مندرجات سے استفادہ کیا جاتا رہا۔ لیکن چونکہ یہ کتاب مستطاب عربی زبان میں ہے اور مجمل ہے، اس لیے عام مومنین اس کے استفادہ سے کُلّیتہً محروم تھے۔ اُردو زبان میں اس کا صرف ایک ہی ترجمہ نظر حقیر سے گزرا ہے، جو مولانا الحاج شیخ محمد اعجاز حسین بدایونی اعلی اللہ مقامہ نے کہیں کہیں نہایت مختصر حواشی کے ساتھ کیا تھا، جسے آپ کی وفات کے بعد مع عربی متن اب مکتبہ امامیہ اُردو بازار لاہور نے شائع کیا ہے، اور اس سے قبل مطبع یوسفی دہلی میں چھپا تھا۔ اب اس کتاب کا ایک اور ترجمہ جناب مستطاب مستغنی عن الصفات مولانا السید منظور حسین صاحب بخاری مدظلہ العالی و دامت برکاتہم نے نہایت شستہ سلیس اور بامحاورہ اُردو زبان میں کیا ہے۔ یوں تو اس نادر روزگار کتاب کی بہت شرحیں لکھی جا چکی ہیں لیکن اُردو زبان میں کوئی شرح نہیں لکھی گئی۔ اب جناب معلی الالقاب رئیس المتکلمین عمدۃ المحققین حضرت سرکار شریعت مدار علامہ محمد حسین مدظلہ العالی علیٰ رؤس الموالی پرنسپل مدرسہ محمدیہ سرگودھا نے مولانا السید منظور حسین صاحب کے ترجمہ کے ساتھ اُردو زبان میں اس کی ایک فصیح و بلیغ شرح الموسوم بہ "احسن الفوائد فی شرح العقائد" تحریر فرما کر قوم شیعہ پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ یہ شرح کیا ہے؟ علوم معقول و منقول کا ایک بحرِ ذخار ہے۔ اصل کتاب تو صرف چالیس ابواب پر مشتمل ہے، جس میں مذہب اہل بیتؑ کے ہر عقیدہ کا مختصر بیان ہے۔ لیکن شارح علام نے اس کو پانچ سَو بیس صفحات اور تین سَو اکانوے عنوانات پر ختم فرمایا ہے۔ مَیں نے اس مجلّہ شریفہ اور عجازہ منیفہ کو بعض مقامات سے بنظرِ امعان دیکھا اور مَیں بلاخوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ مولانا ممدوح نے محنت شاقہ اور کاوش دماغی سے اسے چار چاند لگا دیے ہیں۔ جس سے اصل کتاب کی افادیّت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس جامع کتاب میں جملہ شیعی معتقدات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور ایسے ایسے اچھوتے استدلال اور مباحثات درج کیے گئے ہیں جو فی زمانہ بڑے بڑے علماء کرام کے اذہان میں بھی مستحضر نہ ہوں گے۔ الا ماشاء اللہ۔ آخر میں ثقاہت و صداقت احادیث ائمہ علیہم السلام پر مدلل تبصرہ فرمایا ہے، جو ان نئی روشنی کے دلدادوں کی آنکھیں کھولنے کو کافی ہوگا، جو ایک عرصہ سے اخبارات میں شور مچا رہے ہیں کہ کتب مذہب شیعہ کی بے شمار احادیث بھی وضعی اور پایہ اعتبار سے ساقط ہیں۔

مولانا ممدوح نے حضرت علی علیہ السلام کی طرف منسوب خطبۃ البیان پر بھی محاکمہ فرمایا ہے،

اور اسی قسم کے دیگر شبہات بھی ردّ فرمائے ہیں جو حضرت علی علیہ السلام کی ذات سے آپ کے مافوق العادت واقعات منسوب کیے گئے ہیں۔ نیز غُلُوّ اور تفویض کی بھی تردید فرمائی ہے۔

کتاب مذکور کی صرف فہرست مضامین پورے چھ صفحات پر مشتمل ہے اور شروع کتاب میں علم کلام کی تدوین اور علمائے شیعہ کے عنوان سے ایک مُفید مقالہ سپردِ قلم فرمایا ہے، جس میں علم کلام کی تعریف، اس کی فضیلت، متکلمین کی فضیلت، احادیث ائمہ علیہم السلام کی روشنی میں علم کلام کی تدوین اس پر شبہات اور ان کا ازالہ چند متکلمین مذہب شیعہ کے مُختصر حالات اور ان کی بعض بعض تصانیف کا بھی تذکرہ فرمایا ہے۔

بہر حال یہ شرح ایک ایسی جامع کتاب ہے کہ ہر مومن مُسلمان کو خواہ وہ عالم ہو یا معمُولی اردو خوانندہ، اسے خرید کر حرزِ جان بنانا چاہیے، ورنہ بعد میں کف افسوس ملنا پڑے گا۔ باوجود اس قدر خوبیوں اور عجوبہ روزگار ہونے کے قیمت نہایت قلیل رکھی گئی ہے، تا کہ ہر شخص اس سے مُستفید ہو سکے یعنی قیمت درجہ اول دس روپے اور درجہ دوئم سات روپے۔

السید امداد حسین الکاظمی المشہدی

صدر ادارہ معارفِ اسلام لاہور الحال گجرات ۲۶ جنوری ۱۹۶۶ء

⑧ شمس الواعظین ادیب اعظم حضرت مولانا سید ظفر حسن صاحب قبلہ امروہوی

اپنے مجلّہ علمیّہ "نور" میں تحریر فرماتے ہیں:

"احسن الفوائد فی شرح العقائد" شارح جناب سرکار حجۃ الاسلام مولانا ومُقتدانا علامہ محمد حسین صاحب قبلہ مُجتہد العصر دامت فیوضہ پرنسپل دار العُلوم محمدیہ سرگودھا۔

صدوق علیہ الرحمہ نے شیعوں کے اصول عقائد میں یہ ایک مُختصر مگر نہایت جامع رسالہ عربی زبان میں تحریر فرمایا تھا۔ اس کے جملہ مسائل شرح طلب تھے، خدا جزائے خیر دے سرکار شریعت مدار علامہ محمد حسین صاحب قبلہ کو کہ انھوں نے غیر معمُولی تحقیق وکاوش کے بعد رسالہ مذکور کی ایسی مبسوط اور مکمل شرح تحریر فرمائی کہ کوئی مسئلہ تشنہ تکمیل نہ رہا۔ ارباب علم وفہم جانتے ہیں کہ علم کلام کے مسائل کس قدر دقیق وعمیق و پیچیدہ ہیں، بالخصوص الٰہیات کے مسائل کو عقل وفہم کی ذراسی لغزش اِنسان کو قعر ضلالت میں دھکیل دیتی ہے۔ سرکار علامہ نے کمال کیا ہے کہ ہر مسئلہ کو عقلی ونقلی روشنی میں ۴۵ ابواب کے اندر بے شمار تحتی سرخیوں کے ساتھ قریب الفہم مثالوں سے مستحکم دلائل وبراہین سے دل نشین توضیحات سے ایسے دل کش پیرایہ میں سمجھایا ہے کہ کسی صاحب عقل سلیم کو جائے دم زدن باقی نہیں رہتی۔ ہر مسئلہ

کے متعلق زندیقوں، ملحدوں، حکماء اور فلاسفہ کی طرف سے جو شبہات وارد کیے جاتے رہتے ہیں سرکار علامہ نے ہر شبہ کے جوابات نہایت تسلی بخش تحریر فرمائے ہیں ۔

کتاب مذکور کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شارح علام نے اس شرح کے لکھنے میں بہت سی متعلقہ کتابوں کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے، اور ترتیب مضامین میں ایک خاص سلیقہ سے کام لیا ہے ۔افسوس ہے کہ " نور" کے صفحات میں زیادہ گنجائش نہیں، ورنہ ہم ان تمام مسائل کو درج کرتے جن کا بیان اس کتاب میں ہے ۔یہ کتاب ہر شیعہ کے گھر میں ہونی چاہیے ۔کیونکہ ایسی ہی چیزیں ہمارے لیے سرمایۂ ایمان ہیں، ایسے ضلالت آگین دَور میں جب کہ مادہ پرستی اور دہریت نوازی نے روحِ اسلامی کو مضمحل بنا دیا ہے اور ہر چار طرف سے اِسلامی عقائد پر ڈاکا پڑ رہا ہے، یگانے بیگانے بن رہے ہیں، مُسلمان مغربی تہذیب کے پرستار بن کر اپنا اِیمانی سرمایہ لادینیت کے کھوٹے سکوں سے فروخت کر رہے ہیں ۔ایسی کتابوں کے شائع ہونے کی بڑی ضرورت ہے ۔یہی وقت کی صحیح آواز ہے ۔سرکار علامہ محمد حسین صاحب قبلہ مجتہد دامت فیوضہ ہمارے علماء کرام میں ایک بڑی ممتاز شخصیت کے مالک ہیں، وہ اپنے پر زورِ قلم سے جس طرح نصرتِ دینِ مبین اور حمایت مذہب حقہ فرما رہے ہیں، وہ قابلِ صد تحسین و آفرین ہے ۔جزاکم اللّٰہ خیرا الجزاء

سید ظفر حسن امروہوی کراچی

⑨ بابائے صحافت ابو البشیر حضرت مولانا سید عنایت علی شاہ صاحب مدظلّہ

اپنے جریدہ "دُرِ نجف" میں تحریر فرماتے ہیں:

"احسن الفوائد فی شرح العقائد" یہ ایک ساڑھے پانچ سَو صفحات کی ضخیم کتاب زمانہ حال میں مُنصۂ شہود پر لائی گئی ہے، جسے دیکھ کر کار پردازانِ دارالعلوم مدرسہ محمدیہ سرگودھا کے عزم صمیم کا ثبوت ملتا ہے ۔ہم نے اس کتاب مُستطاب کا اول سے آخر تک کئی دنوں میں مطالعہ کیا ہے اور دیانت داری سے کہا جاتا ہے کہ ایسی جامع علمی کتاب دَورِ حاضر میں شائع نہیں ہوئی ۔

ہم اس پر مفصّل تقریظ اس لیے نہیں لکھ سکے کہ کماحقہ' تقریظ کے لیے بھی ایک کتاب کی ضرورت ہے ۔اس جامع کتاب میں اِسلامی مُعتقدات پر وہ اِستدلال عام فہم عبارات میں پیش کیے گئے ہیں کہ بڑے بڑے فلاسفروں، ملحدوں اور دہریوں کو بھی لاجواب کر دیا ہے ۔کتاب ہذا کے عناوین کی فہرست بھی پورے چھ صفحات پر مشتمل ہے، اس نادر روزگار کارنامہ پر آفرین و تحسین کے لیے بھی قلم میں پوری طاقت درکار ہے ۔

آخر میں مسئلہ تحریف پر بھی نہایت معقول و مدلل بحث کی گئی ہے۔ بہر حال کتاب احسن الفوائد کی حقیقت بیان کرنے کی بجائے صرف اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ ہر ایک مومن جو اپنے اعتقاد کے حصار کو مستحکم کرنا چاہے، یا اپنے مذہب و ایمان کے حقائق سے واقفیت کا خواہاں ہے ہماری سفارش ہے کہ ایک ایک جلد حاصل کرے۔ اگر خدانخواستہ اسے معلومات علمیہ کا بیش بہا خزانہ محسوس نہ ہو تو ہم سے قیمت واپس لے سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ ناقدری دُنیا کا یہ عالم ہے کہ جب کوئی کتاب ختم ہو جاتی ہے اور دس گنا قیمت پر بھی دستیاب نہیں ہوتی تو دست تاسف مل مل کر حرمان نصیبی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ہم یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ "احسن الفوائد" کی موجودگی میں کسی دُوسری کتاب کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ویسے بھی آپ کے کتب خانہ کی زینت ہوگی۔ آخر میں ہم حضرت گرامی منزلت سرکار عالی وقار مولانا الشیخ محمد حسین قبلہ پرنسپل مدرسہ محمدیہ سرگودھا کے قلم حقیقت رقم کی داد دیتے ہوئے ان کے اس علمی کارنمایاں پر مبارک باد عرض کرتے ہیں۔

⑩ جریدہ فریدہ "رضا کار" لاہور کے تبصرہ نگار رقمطراز ہیں:

"احسن الفوائد فی شرح العقائد" مُصنّف رسالہ سرکار صدوق العُلماء حضرت شیخ ابو جعفر بن علی بن حسین بن موسیٰ بن بابویہ رحمۃ اللہ علیہ مترجم عمدۃ المحققین مولانا سید منظور حسین شاہ بخاری، شارح علامہ محمد حسین صاحب پرنسپل دار العُلوم محمدیہ سرگودھا ضخامت ۵۲۰ صفحات کاغذ سفید، کتابت وطباعت پسندیدہ، قیمت قسم اول دس روپے، قسم دوم سات روپے، ملنے کا پتا: مکتبہ الہدانی دار العُلوم محمدیہ سرگودھا

یہ کتاب حضرت شیخ صدوق رحمۃ اللہ علیہ کے عربی رسالہ اعتقادیہ کی اُردو شرح ہے۔ مترجم نے عربی متن بھی ساتھ دے دیا ہے۔ شروع میں پیش لفظ کے طور پر سرکار صدر المحققین علامہ محمد حسین صاحب پرنسپل دار العُلوم محمدیہ کا پر مغز مقالہ علم کلام کی تدوین اور علماء شیعہ کے خدمات کے عنوان سے شامل ہے۔ علم کلام کی تعریف، علم کلام کی فضیلت، علم کلام کی بلاغت، احادیث معصُومین علیہم السلام کی روشنی میں علم کلام کی تدوین حضرت امام صادق علیہ السلام کے علم کلام کی تدوین، حضرت امام صادق علیہ السلام کے علم کلام کو زیادہ ترقی دینے کے علل واسباب پر عالمانہ تبصرہ کیا گیا ہے۔ اور بیاسی با کمال علمائے کرام جنھوں نے علم کلام کی تدوین میں مُختلف ادوار میں گرانقدر خدمات سرانجام دی ہیں ان کا مُختصر تذکرہ بھی شامل اشاعت ہے۔ یہ ایک علمی وتاریخی کارنامہ ہے جس کے لیے ہم علامہ ممدوح کو ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔

کتاب کے پینتالیس ابواب ہیں، ان ابواب کے تحت ۳۸۶ مُختلف عنوان قائم کر کے ان پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ چند ابواب یہ ہیں: توحید باری تعالیٰ کے متعلق شیعہ امامیہ فرقے کا اعتقاد، خداوند عالم

کے صفات، بندوں کی شرعی تکلیف کس قدر ہے، افعال العباد کے متعلق جبر و تفویض، خدا کی مشیئت اور ارادہ، قضا و قدر کے متعلق عقیدہ، فطرت اور ہدایت اور استطاعت کے متعلق عقیدہ، مسئلہ بداٗ اور اس کی حقیقت، لوح و قلم کے متعلق عقیدہ، کرسی و عرش کے متعلق عقیدہ، نفس اور روح کے متعلق عقیدہ، موت اور اس کی حقیقت، قبر میں سوال و جواب کے متعلق عقیدہ، رجعت کے متعلق اعتقاد، عدل خداوندی، صراط، عقبات، محشر، حساب و میزان، جنّت اور دوزخ، نزول وحی کی کیفیت، قرآن کی مقدار کے متعلق اعتقاد، عصمت انبیاء، تقیّہ، اولادِ علی کے متعلق اعتقاد، مجمل اور مفسّر احادیث کے متعلق، احادیث اور ائمہ معصومینؑ۔ ان تمام مسائل پر عالمانہ نقد و نظر اس کتاب میں موجود ہے۔

اس کتاب میں شیعہ عقائد اور مسلمات سے بحث کی گئی ہے۔ احادیث ائمہ معصومین علیہم السلام اور عقل سلیم کی روشنی میں مذہب شیعہ امامیہ کے عقائد شرح و بسط سے بیان کیے گئے ہیں۔ ہر موضوع پر ملاحدہ اور منکرین کے شکوک و شبہات کو عقلی و نقلی دلائل سے ردّ ہی نہیں کیا گیا، بلکہ بصیرت افروز نتائج برآمد کر کے پیش کیے گئے ہیں۔ پوری کتاب حکمت و دانش اور علمی مباحث سے لبریز ہے۔ مثالیں دل نشین، وزنی، اسلوبِ نگارش دل میں اتر جانے والا، کیسے کیسے مغالطوں کا فاضل مصنّف اور شارح نے ازالہ کیا ہے، اور ایسے علمی اور عقلی دلائل پیش کیے ہیں جن کے مطالعہ سے عہد حاضرہ کا ذہن مطمئن ہو جاتا ہے۔ طرزِ بیان خالص علمی اور سائنٹفک ہے۔ شارح نے مشکل سے مشکل مسئلہ کی شرح بڑی قابلیت سے کی ہے، جس سے مشکل مقامات کے سمجھنے میں ذرا بھی دشواری پیش نہیں آتی۔ جگہ جگہ نقد و احتساب کیا گیا ہے۔ اصل میں ایسی ہی کتابوں سے عقیدہ فکر اور سیرت کی ایک طرف اصلاح ہوتی ہے اور دوسری طرف مذہب ائمہ معصومین علیہم السلام کی حقیقت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔

یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک عظیم شاہکار ہے۔ شیعہ مذہب کے سمجھنے کے لیے اس کا مطالعہ اشد ضروری ہے۔ اُردو زبان میں یہ کتاب اپنے موضوع پر جامع و مدلل ہے۔ ادارہ ہر پہلو سے اس گراں قدر تصنیف کی اشاعت پر تبریک و تحسین کا مستحق ہے اور ساتھ ہی مترجم اور شارح کی محنت اور جستجو قابلِ داد ہے۔ ایسی کتابیں بار بار نہیں چھپتیں۔ معزز قارئین کی خدمت میں پر زور سفارش کی جاتی ہے کہ وہ خود بھی اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں اور اپنے اعزہ و احباب کو بھی اس کے مطالعہ کی تحریک کریں، تاکہ جس مقصد وحید کے تحت یہ کتاب لکھی گئی ہے وہ زیادہ سے زیادہ حاصل ہو سکے۔

باسمہ سبحانہ

کتاب مُستطاب "احسن الفوائد فی شرح العقائد" مدت سے ختم ہوگئی تھی، اور مارکیٹ میں نہیں ملتی تھی۔ اِنتظار تھا کہ کوئی مُخَیِّر مؤمن آگے بڑھے اور اس کی طباعت کا بیڑا اُٹھائے۔ چنانچہ اب جبکہ میں نے گیارہ فروری سے لے کر گیارہ مارچ ۲۰۱۷ء تک برطانیہ کا دَورہ کیا تو اس اثنا میں نیو پورٹ جانے کا بھی اِتفاق ہوا، اور وہاں جناب **الحاج عابد علی** صاحب آف ٹوبہ حال وارد نیو پورٹ برطانیہ سے ملاقات ہوئی اور ان کے سامنے "احسن الفوائد" کی طباعت کا تذکرہ ہوا، تو انھوں نے خندہ پیشانی سے اس کی طباعت واشاعت کے اخراجات برداشت کرنے کا وعدہ کیا۔ لہٰذا اب یہ کتاب جس احسن انداز میں طبع ہوکر مدت دراز کے مُشتاق ہاتھوں تک پہنچ رہی ہے یہ انھیں کے مومنانہ تعاون کا نتیجہ ہے۔ جزاہ اللہ فی الدارین خیر الجزاء۔ دُعا ہے کہ خالق اکبر ان کی اس عظیم نیکی کی دُنیا و آخرت میں ان کو بہترین جزاء خیر عطا فرمائے اور ان کے مرحومین کی مغفرت فرمائے اور اولاد امجاد کو حوادثِ روزگار سے محفوظ فرمائے۔

آمین بجاہ النبی و اھل بیتہ الطیبین الطاھرین

واناالاحقر محمد حسین النجفی بقلمہ

یکم اگست ۲۰۱۷

از جامعہ علمیہ سلطان المدارس الاسلامیہ

زاہد کالونی سرگودھا

اہل ایمان کے لیے عظیم خوشخبری

ہم انتہائی مسرت کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ حضرت آیت اللہ علامہ شیخ محمد حسین نجفی کی شہرہ آفاق تصانیف بہترین طباعت کے ساتھ منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔

- **قرآن مجید مترجم** اردو مع خلاصۃ التفسیر منصۂ شہود پر آ گئی ہے جس کا ترجمہ اور تفسیر فیضان الرحمن کا روح رواں اور حاشیہ تفسیر کی دس جلدوں کا جامع خلاصہ ہے جو قرآن فہمی کے لیے بے حد مفید ہے۔ اور بہت سی تفسیروں سے بے نیاز کر دینے والا ہے۔
- **فیضان الرحمن فی تفسیر القرآن** کی مکمل 10 جلدیں موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق ایک ایسی جامع تفسیر ہے جسے بڑے مباحات کے ساتھ برادران اسلامی کی تفاسیر کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے مکمل سیٹ کا ہدیہ صرف دو ہزار روپے۔
- **زاد العباد لیوم المعاد** اعمال و عبادات اور چہاردہ معصومین کے زیارات، سر سے لیکر پاؤں تک جملہ بدنی بیماریوں کے روحانی علاج پر مشتمل مستند کتاب منصۂ شہود پر آ گئی ہے۔
- **سعادۃ الدارین فی مقتل الحسین** زیور طبع سے آراستہ ہو کر مومنین کے لیے آ گئی ہے۔
- **اعتقادات امامیہ** ترجمہ رسالہ لیلیہ سرکار علامہ مجلسیؒ جو کہ دو بابوں پر مشتمل ہے پہلے باب میں نہایت اختصار و ایجاز کے ساتھ تمام اسلامی عقائد و اصول کا تذکرہ ہے اور دوسرے باب میں مبدء سے لیکر لحد تک زندگی کے کام انفرادی اور اجتماعی اعمال و عبادات کا تذکرہ ہے تیسری بار بڑی جاذب نظر اشاعت کے ساتھ مزین ہو کر منظر عام پر آ گئی ہے ہدیہ صرف تیس روپے۔
- **اثبات الامامت** آئمہ اثنا عشری کی امامت و خلافت کے اثبات پر عقلی و نقلی نصوص پر مشتمل بے مثال کتاب کا پانچواں ایڈیشن
- **اصول الشریعہ** کا نیا پانچواں ایڈیشن اشاعت کے ساتھ مارکیٹ میں آ گیا ہے ہدیہ ڈیڑھ سو روپے۔
- **تحقیقات الفریقین اور اصلاح الرسوم** کے نئے ایڈیشن قوم کے سامنے آ گئے ہیں۔
- **قوانین الشریعہ فی فقہ الجعفریہ** (دو جلد)۔
- **وسائل الشیعہ** کا ترجمہ تیرہویں جلد بہت جلد بڑی آب و تاب کے ساتھ قوم کے مشتاق ہاتھوں میں پہنچنے والا ہے۔
- **اسلامی نماز** کا نیا ایڈیشن بڑی شان و شکوہ کے ساتھ منظر عام پر آ گیا ہے۔